بیان فرمودہ

حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی

مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام

جلد اوّل

سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بقرۃ

سیّدنا حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السّلام نے اپنی تصانیف اور تقاریر میں قرآن کریم کی جن آیات کی تفسیر بیان فرمائی ہے ہم اُسے یکجا کرکے احباب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ابوالمنیر نورالحق
مینجنگ ڈائریکٹر ادارۃ المصنّفین ربوہ

بعض فنی ضروریات کے پیشِ نظر سابقہ جلد اوّل اور دوم کو ایک ہی جلد میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ناشر)

اَلْفِہْرِسْ

فہرست مضامین سُورۃ الفاتحۃ

تمت

فہرست مضامین سورۃ البقرۃ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

تفسیر سورۃ فاتحہ

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

اِعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَهَا اَسْمَاءٌ كَثِيْرَةٌ فَاَوَّلُهَا فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَسُمِّيَتْ بِذَالِكَ لِاَنَّهٗ يُفْتَتَحُ بِهَا فِي الْمُصْحَفِ وَفِي الصَّلٰوةِ وَفِي مَوَاضِعِ الدُّعَاءِ مِنْ رَّبِّ الْاَرْبَابِ. وَعِنْدِيْ اَنَّهَا سُمِّيَتْ بِهَا لِمَا جَعَلَهَا اللّٰهُ حَكَمًا لِّلْقُرْاٰنِ وَ مُلِئَ فِيْهَا مَا كَانَ فِيْهِ مِنْ اَخْبَارٍ وَّمَعَارِفَ مِنَ اللّٰهِ الْمَنَّانِ. وَاَنَّهَا جَامِعَةٌ لِّكُلِّ مَا يَحْتَاجُ الْاِنْسَانُ اِلَيْهِ فِيْ مَعْرِفَةِ الْمَبْدَءِ وَالْمَعَادِ كَمِثْلِ الْاِسْتِدْلَالِ عَلٰى وُجُوْدِ الصَّانِعِ وَضَرُوْرَةِ النُّبُوَّةِ وَ الْخِلَافَةِ فِي الْعِبَادِ. وَمِنْ اَعْظَمِ الْاَخْبَارِ وَاَكْبَرِهَا اَنَّهَا تُبَشِّرُ بِزَمَانِ الْمَسِيْحِ

سورۃ فاتحہ کا پہلا نام فاتحۃ الکتاب اور اس کی وجہ (ترجمہ از مرتّب) جاننا چاہیے کہ سورۃ فاتحہ کے بہت سے نام ہیں جن میں سے پہلا نام فاتحۃ الکتاب ہے اور اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ قرآن مجید اسی سورۃ سے شروع ہوتا ہے۔ نماز میں بھی پہلے یہی سورۃ پڑھی جاتی ہے اور خدا تعالیٰ سے جو ربّ الارباب ہے دُعا کرتے وقت اسی (سورۃ) سے ابتدا کی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک اس سورۃ کو فاتحہ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کو قرآن کریم کے مضامین کے لیے حَکَم قرار دیا ہے۔ اور جو اخبارِ غیبیہ اور حقائق و معارف قرآن مجید میں احسان کرنے والے خدا کی طرف سے بیان کیے گئے ہیں وہ سب اس میں بھر دیئے گئے ہیں اور جن امور کا انسان کو مبدء و معاد (دنیا اور آخرت) کے سلسلہ میں جاننا ضروری ہے، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ مثلاً وجود باری، ضرورت نبوّت اور مومن بندوں میں سلسلہ خلافت کے قیام پر استدلال اور اس سورۃ کی سب سے بڑی اور اہم خبر یہ ہے کہ یہ سورۃ مسیح موعود اور مہدی معہود کے زمانہ کی بشارت دیتی ہے اور اسے ہم خدا نے ودود کی

الْمَوْعُوْدِ وَاَيَّامِ الْمَهْدِيِّ الْمَعْهُوْدِ وَسَنَذْكُرُهٗ فِيْ مَقَامِهٖ بِتَوْفِيْقِ اللّٰهِ الْوَدُوْدِ۔

وَمِنْ اَخْبَارِهَا اَنَّهَا تُبَشِّرُ بِعُمُرِ الدُّنْيَا الدَّنِيَّةِ وَسَنَكْتُبُهٗ بِقُوَّةٍ مِّنَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ۔ وَهٰذِهٖ هِيَ الْفَاتِحَةُ الَّتِيْ اَخْبَرَ بِهَا نَبِيٌّ مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ وَقَالَ رَاَيْتُ مَلَكًا قَوِيًّا نَازِلًا مِّنَ السَّمَآءِ وَفِيْ يَدِهٖ الْفَاتِحَةُ عَلٰى صُوْرَةِ الْكِتَابِ الصَّغِيْرِ فَوَقَعَ رِجْلُهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْبَحْرِ وَالْيُسْرٰى عَلَى الْبَرِّ بِحُكْمِ الرَّبِّ الْقَدِيْرِ وَصَرَخَ بِصَوْتٍ عَظِيْمٍ كَمَا يَزْئَرُ الضِّرْغَامُ وَظَهَرَتِ الرُّعُوْدُ السَّبْعَةُ بِصَوْتِهٖ وَكُلٌّ مِّنْهَا وُجِدَ فِيْهِ الْكَلَامُ وَقِيْلَ اخْتِمْ عَلٰى مَا تَكَلَّمَتْ بِهِ الرُّعُوْدُ وَلَا تَكْتُبْ كَذَالِكَ قَالَ الرَّبُّ الْوَدُوْدُ وَالْمَلَكُ النَّازِلُ اَقْسَمَ بِالْحَيِّ الَّذِيْ اَضَآءَ نُوْرُهٗ وَجْهَ الْبِحَارِ وَالْبُلْدَانِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ زَمَانٌ بَعْدَ ذَالِكَ الزَّمَانِ بِهٰذَا الشَّانِ وَقَدِ اتَّفَقَ الْمُفَسِّرُوْنَ اَنَّ هٰذَا الْخَبَرَ يَتَعَلَّقُ بِزَمَانِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ الرَّبَّانِيِّ۔ فَقَدْ جَآءَ الزَّمَانُ وَظَهَرَتِ الْاَصْوَاتُ السَّبْعَةُ مِنَ السَّبْعِ الْمَثَانِيْ۔ وَهٰذَا الزَّمَانُ لِلْخَيْرِ وَالرُّشْدِ كَاٰخِرِ الْاَزْمِنَةِ وَلَا يَاْتِيْ زَمَانٌ بَعْدَهٗ كَمِثْلِهٖ فِي الْفَضْلِ وَالْمَرْتَبَةِ وَاِنَّا اِذَا

دی ہوئی توفیق سے اس کے محل پر بیان کریں گے۔

اسی طرح اس سورۃ میں بیان شدہ خبروں میں سے ایک خبر یہ بھی ہے کہ یہ سورۃ اس دُنیا کی عمر بتاتی ہے اور ہم عنقریب اسے بھی اللہ کی دی ہوئی قوت سے لکھیں گے۔ یہ وہی سورۃ فاتحہ ہے جس کی خبر خدا تعالیٰ کے انبیاء میں سے ایک نبی نے دی۔ اس نبی نے کہا کہ میں نے ایک قوی فرشتہ دیکھا جو آسمان سے اُترا، اس کے ہاتھ میں سورۃ فاتحہ ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں تھی اور خدائے قادر کے حکم سے اُس کا دایاں پاؤں سمندر پر اور بایاں پاؤں خشکی پر پڑا اور وہ شیر کے غرّانے کی مانند بلند آواز میں پکارا، اُس کی آواز سے سات گرجیں پیدا ہوئیں جن میں سے ہر ایک میں ایک مخصوص کلام (جملہ) سُنائی دیا اور کہا گیا کہ ان گرجوں میں سے پیدا ہونے والے کلمات کو سربمہر کردے اور انہیں مت لکھ خدائے مہربان نے ایسا ہی فرمایا ہے اور نازل ہونے والے فرشتہ نے اُس زندہ خدا کی قسم کھا کر جس کے نُور نے سمندروں اور آبادیوں کو روشن کیا ہے کہا کہ اس (مسیح موعود) کے زمانہ کے بعد اس شان و مرتبہ کا زمانہ نہ آئے گا اور مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ پیش گوئی مسیح موعود کے زمانہ سے متعلق ہے۔ سو اب وہ زمانہ آگیا ہے اور سورۃ فاتحہ کی سات آیات سے وہ سات آوازیں ظاہر ہوگئی ہیں اور یہ زمانہ نیکی اور ہدایت کے لحاظ سے آخری زمانہ ہے اور اس کے بعد کوئی زمانہ اس زمانہ کی شان و مرتبہ کا نہیں آئے گا اور جب

وَدَّعْنَا الدُّنْيَا فَلَا مَسِيْحَ بَعْدَنَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَا يَنْزِلُ اَحَدٌ مِّنَ السَّمَآءِ وَلَا يَخْرُجُ رَأْسٌ مِّنَ الْمَغَارَةِ اِلَّا مَا سَبَقَ مِنْ رَّبِّيْ قَوْلٌ فِي الذُّرِّيَّةِ[1] وَاِنَّ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ وَقَدْ نَزَلَ مَنْ كَانَ نَازِلًا مِّنَ الْحَضْرَةِ وَتَشْهَدُ عَلَيْهِ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَلٰكِنَّكُمْ لَا تَطَّلِعُوْنَ عَلٰى هٰذِهِ الشَّهَادَةِ۔ وَسَتَذْكُرُوْنَنِيْ بَعْدَ الْوَقْتِ وَالسَّعِيْدُ مَنْ اَدْرَكَ الْوَقْتَ وَمَا اَضَاعَهٗ بِالْغَفْلَةِ۔ (اعجاز المسیح ص۶۸ تا ۷۱)

اِنَّ لِلْفَاتِحَةِ اَسْمَآءً اُخْرٰى۔ مِنْهَا سُوْرَةُ الْحَمْدِ بِمَا افْتُتِحَ بِحَمْدِ رَبِّنَا الْاَعْلٰى۔

وَمِنْهَا اُمُّ الْقُرْاٰنِ بِمَا جَمَعَتْ مَطَالِبَهٗ كُلَّهَا بِاَحْسَنِ الْبَيَانِ۔ وَتَاَبَّطَتْ كَصَدَفٍ دُرَرَ الْفُرْقَانِ وَصَارَتْ كَعُشٍّ لِّطَيْرِ الْعِرْفَانِ۔ فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ جَمَعَ عُلُوْمًا اَرْبَعَةً فِي الْهِدَايَاتِ۔ عِلْمَ الْمَبْدَءِ وَعِلْمَ الْمَعَادِ وَعِلْمَ النُّبُوَّةِ وَعِلْمَ تَوْحِيْدِ الذَّاتِ وَالصِّفَاتِ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذِهِ الْاَرْبَعَةَ مَوْجُوْدَةٌ

ہم اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو پھر ہمارے بعد قیامت تک کوئی اور مسیح نہیں آئے گا اور نہ ہی کوئی آسمان سے اُترے گا اور نہ ہی کوئی غار سے نکلے گا۔ سوائے اس موعود لڑکے کے[1] جس کے بارہ میں پہلے سے میرے رب کے کلام میں ذکر آچکا ہے۔ یہی بات سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو (مسیح موعود) آنے والا تھا وہ آگیا ہے اور زمین و آسمان اس پر گواہی دے رہے ہیں، لیکن تم اُس گواہی کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے، تم عنقریب وقت نکل جانے کے بعد مجھے ضرور یاد کرو گے۔ سعادت مند وہی شخص ہے جس نے اس وقت کو پایا اور اس کو غفلت میں ضائع نہ کیا۔

سورۃ فاتحہ کا دوسرا نام سورۃ الحمد	سورۃ فاتحہ کے اور نام بھی ہیں جن میں سے ایک سورۃ الحمد بھی ہے، کیونکہ یہ سورۃ ہمارے رب اعلیٰ کی حمد سے شروع ہوتی ہے۔
سورۃ فاتحہ کا تیسرا نام اُمّ القرآن	سورۃ فاتحہ کا ایک نام اُمّ القرآن بھی ہے کیونکہ وہ تمام قرآنی مطالب پر احسن پیرایہ میں حاوی ہے اور اس نے سیپ کی طرح قرآن کریم کے جواہرات اور موتیوں کو اپنے اندر لیا ہوا ہے اور یہ سورۃ

علم و عرفان کے پرندوں کے لیے گھونسلوں کی مانند بن گئی ہے۔ یاد رہے کہ قرآن کریم میں انسانوں کی رہنمائی کے لیے چار مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۔ علم مبدء۔ ۲۔ علم معاد۔ ۳۔ علم نبوت۔ ۴۔ علم توحید ذات و صفات۔ اور لاریب

---

[1] اِلَيْهِ اِشَارَةٌ فِيْ قَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتَزَوَّجُ وَيُوْلَدُ لَهٗ (منہ)

(ترجمہ) اسی کی طرف اشارہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کہ مسیح موعود نکاح کریگا اور اس کو اولاد دی جائے گی (منہ)

فِي الْفَاتِحَةِ. وَمَوْءُوْدَةٌ فِي صُدُوْرِ اَكْثَرِ عُلَمَآءِ الْأُمَّةِ يَقْرَءُوْنَهَا وَهِيَ لَا تُجَاوِزُ مِنَ الْحَنَاجِرِ. لَا يُفَجِّرُوْنَ اَنْهَارَهَا السَّبْعَةَ بَلْ يَعِيْشُوْنَ كَالْفَاجِرِ.

(اعجاز المسیح ص۷۲-۷۳)

سورۃ فاتحہ کا نام اُمّ الکتاب | اس کا نام اُمّ الکتاب بھی ہے کیونکہ قرآن شریف کی تمام تعلیم کا اس میں خلاصہ اور عطر موجود ہے۔ (ایام الصلح ص۱)

وَمِنَ الْمُمْكِنِ اَنْ يَّكُوْنَ تَسْمِيَةُ هٰذِهِ السُّوْرَةِ بِاُمِّ الْكِتٰبِ نَظَرًا اِلٰى غَايَةِ التَّعْلِيْمِ فِيْ هٰذَا الْبَابِ. فَاِنَّ سُلُوْكَ السَّالِكِيْنَ لَا يَتِمُّ اِلَّا بَعْدَ اَنْ يَّسْتَوْلِيَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ عِزَّةُ الرُّبُوْبِيَّةِ وَذِلَّةُ الْعُبُوْدِيَّةِ. وَلَنْ تَجِدَ مُرْشِدًا فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ كَهٰذِهِ السُّوْرَةِ مِنَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ. اَلَا تَرٰى كَيْفَ اَظْهَرَ عِزَّةَ اللّٰهِ وَعَظَمَتَهٗ بِقَوْلِهٖ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اِلٰى مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ. ثُمَّ اَظْهَرَ ذِلَّةَ الْعَبْدِ وَهَوَانَهٗ وَضُعْفَهٗ بِقَوْلِهٖ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ. وَمِنَ الْمُمْكِنِ اَنْ يَّكُوْنَ تَسْمِيَةُ هٰذِهِ السُّوْرَةِ بِهٖ نَظَرًا اِلٰى ضَرُوْرَاتِ الْفِطْرَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ وَاِشَارَةً اِلٰى مَا تَقْتَضِي الطَّبَائِعُ بِالتَّكَسُّبِ اَوِ الْجَوَاذِبِ الْاِلٰهِيَّةِ.

یہ چاروں علوم سورۃ فاتحہ میں موجود ہیں۔ اور یہ علوم اکثر علمائے امت کے سینوں میں زندہ درگور کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ سورۃ فاتحہ کو پڑھتے تو ہیں لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتی اور وہ اس کی ان سات نہروں کو پوری طرح جاری نہیں کرتے (تا وہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی اُن سے فائدہ اُٹھائیں) بلکہ وہ فاجر لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ کا چوتھا نام | اس سورۃ کا نام اُمّ الکتاب رکھنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ امور روحانیہ کے بارے میں اس میں کامل تعلیم موجود ہے، کیونکہ سالکوں کا سلوک اُس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک کہ اُن کے دلوں پر ربوبیت کی عزت اور عبودیت کی ذلت غالب نہ آجائے۔ اس امر میں خدائے واحد و یگانہ کی طرف سے نازل شدہ سورت فاتحہ جیسا رہنما اور کہیں نہیں پاؤ گے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اُس نے کس طرح اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے لیکر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی عزت اور عظمت کو ظاہر فرمایا ہے۔ پھر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہہ کر بندہ کے عجز اور کمزوری کو ظاہر کیا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس سورۃ کو اُم الکتاب اس امر کے پیش نظر کہا گیا ہو کہ اس میں انسانی فطرت کی سب ضرورتیں مدنظر ہیں اور انسانی طبائع کے سب تقاضوں کی طرف اشارہ ہے خواہ وہ کسب سے متعلق ہوں

فَإِنَّ الْإِنْسَانَ يُحِبُّ لِتَكْمِيْلِ نَفْسِهٖ اَنْ يَّحْصُلَ لَهٗ عِلْمُ ذَاتِ اللّٰهِ وَصِفَاتِهٖ وَأَفْعَالِهٖ وَ يُحِبُّ اَنْ يَّحْصُلَ لَهٗ عِلْمُ مَرْضَاتِهٖ بِوَسِيْلَةِ اَحْكَامِهِ الَّتِيْ تَنْكَشِفُ حَقِيْقَتُهَا بِاَقْوَالِهٖ۔ وَكَذَالِكَ تَقْتَضِيْ رُوْحَانِيَّتُهٗ اَنْ تَاْخُذَ بِيَدِهِ الْعِنَايَةُ الرَّبَّانِيَّةُ وَيَحْصُلَ بِإِعَانَتِهٖ صَفَآءُ الْبَاطِنِ وَالْاَنْوَارُ وَالْمُكَاشَفَاتُ الْاِلٰهِيَّةُ۔ وَهٰذِهِ السُّوْرَةُ الْكَرِيْمَةُ مُشْتَمِلَةٌ عَلٰى هٰذِهِ الْمَطَالِبِ بَلْ وَقَعَتْ بِحُسْنِ بَيَانِهَا وَقُوَّةِ تِبْيَانِهَا كَالْجَالِبِ۔ (اعجاز المسیح ص۷۳ تا ۷۵)

وَمِنْ اَسْمَآءِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ ۔ وَسَبَبُ التَّسْمِيَةِ اَنَّهَا مَثْنٰى نِصْفُهَا ثَنَآءُ الْعَبْدِ لِلرَّبِّ وَنِصْفُهَا عَطَآءُ الرَّبِّ لِلْعَبْدِ الْفَانِيْ۔ وَقِيْلَ اِنَّهَا سُمِّيَتِ الْمَثَانِيْ بِمَا اَنَّهَا مُسْتَثْنَاةٌ مِّنْ سَآئِرِ الْكُتُبِ الْاِلٰهِيَّةِ وَلَا يُوْجَدُ مِثْلُهَا فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْاِنْجِيْلِ وَلَا فِي الصُّحُفِ النَّبَوِيَّةِ۔ وَقِيْلَ اِنَّهَا سُمِّيَتْ مَثَانِيْ لِاَنَّهَا سَبْعُ اٰيَاتٍ مِّنَ اللّٰهِ الْكَرِيْمِ وَتَعْدِلُ قِرَآءَةُ كُلِّ اٰيَةٍ مِّنْهَا قِرَآءَةَ سُبْعٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ۔ وَقِيْلَ سُمِّيَتْ سَبْعًا اِشَارَةً اِلَى الْاَبْوَابِ السَّبْعَةِ

یا افضال الٰہیہ سے۔ کیونکہ انسان اپنے نفس کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اسے اس کے ان احکام کے وسیلہ سے اس کی خوشنودی کا علم ہو جائے، جن کی حقیقت اس کے اقوال سے ہی کھلتی ہے اور ایسا ہی اس کی روحانیت چاہتی ہے کہ عنایت ربّانی اس کی دستگیری کرے اور اس کی مدد سے اسے صفاء باطن اور انوار و مکاشفات الٰہیہ حاصل ہوں اور یہ سورۂ کریمہ ان سب مطالب پر مشتمل ہے بلکہ یہ سورۃ اپنے حسنِ بیان اور قوتِ تبیان سے دلوں کو موہ لینے والی ہے۔

سورۃ فاتحہ کا پانچواں نام السبع المثانی

اس سورۃ کے ناموں میں سے ایک نام سبع مثانی ہے اور اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سورۃ کے دو حصّے ہیں، اس کا ایک حصّہ بندہ کی طرف سے خدا کی ثناء اور دوسرا نصف فانی انسان کے لیے خدا تعالیٰ کی عطا اور بخشش پر مشتمل ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اس کا نام السبع المثانی اس لیے ہے کہ یہ سورۃ تمام کتب الٰہیہ میں امتیازی شان رکھتی ہے اور اس کی مانند کوئی سورۃ تورات یا انجیل یا دوسرے صحف انبیاء میں نہیں پائی جاتی اور بعض کا خیال ہے کہ اس کا نام مثانی اس لیے ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ایسی سات آیات پر مشتمل ہے کہ ان میں سے ہر آیت کی قراءت قرآن عظیم کے ساتویں حصّہ کی قراءت کے برابر ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام السبع المثانی

مِنَ النِّيْرَانِ ۔ وَلِكُلٍّ مِّنْهَا جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ يَّدْفَعُ شُوَاظَهَا بِإِذْنِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَّمُرَّ سَالِمًا مِّنْ سَبْعِ أَبْوَابِ السَّعِيْرِ فَعَلَيْهِ أَنْ يَّدْخُلَ هٰذِهِ السَّبْعَ وَيَسْتَأْنِسَ بِهَا وَيَطْلُبَ الصَّبْرَ عَلَيْهَا مِنَ اللّٰهِ الْقَدِيْرِ ۔ وَكُلُّ مَا يُدْخِلُ فِيْ جَهَنَّمَ مِنَ الْأَخْلَاقِ وَالْأَعْمَالِ وَالْعَقَائِدِ فَهِيَ سَبْعٌ مُّوْبِقَاتٌ مِّنْ حَيْثُ الْأُصُوْلِ وَهٰذِهٖ سَبْعٌ لِّدَفْعِ هٰذِهِ الشَّدَائِدِ ۔ وَلَهَا أَسْمَاءٌ أُخْرٰى فِي الْأَخْبَارِ ۔ وَكَفَاكَ هٰذَا فَإِنَّهٗ خَزِيْنَةُ الْأَسْرَارِ ۔ وَمَعَ ذٰلِكَ حَصْرُ هٰذَا التَّعْدَادِ إِشَارَةٌ إِلٰى سَنَوَاتِ الْمَبْدَءِ وَالْمَعَادِ ۔ أَعْنِيْ أَنَّ أٰيَاتِهَا السَّبْعَ إِيْمَاءٌ إِلٰى عُمْرِ الدُّنْيَا فَإِنَّهَا سَبْعَةُ اٰلَافٍ ۔ وَلِكُلٍّ مِّنْهَا دَلَالَةٌ عَلٰى كَيْفِيَّةِ إِيْلَافٍ ۔ وَالْأَلْفُ الْاٰخِرُ فِي الضَّلَالِ كَبِيْرٌ وَّكَانَ هٰذَا الْمَقَامُ يَقْتَضِيْ هٰذَا الْإِعْلَامَ كَمَا كَفَلَتِ الذِّكْرَ إِلٰى مَعَادٍ مِّنِ ائْتِنَافٍ ۔

(اعجاز المسیح ص ۷۶ تا ۷۷)

اس بناء پر رکھا گیا ہے کہ اس میں جہنّم کے سات دروازوں کی طرف اشارہ ہے اور ان میں سے ہر ایک دروازہ کے لیے اس سورۃ کا ایک حصّہ مقرر ہے جو خدائے رحمان کے اذن سے جہنّم کے شعلوں کو دُور کرتا ہے۔ پس جو شخص جہنم کے ان سات دروازوں سے محفوظ گزرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ اس سورۃ کی ساتوں آیات کے حصار میں داخل ہو اور ان سے دل لگائے رکھے اور ان پر عمل کرنے کے لیے خدائے قدیر سے استقلال طلب کرے اور تمام اخلاق، اعمال اور عقائد جو انسان کو جہنم میں داخل کرتے ہیں وہ اصولی طور پر سات مہلک امور ہیں اور سورت فاتحہ کی یہ سات آیات ایسی ہیں جو ان مہلکات کی شدائد کو دفع کرتی ہیں۔

احادیث میں اس سورۃ کے اور بھی کئی نام مذکور ہیں لیکن تیرے لیے اسی قدر بیان کافی ہے کہ یہ الٰہی اسرار کا خزانہ ہے۔ علاوہ ازیں اس سورت کی آیات کا سات کی تعداد میں منحصر ہونا مبدء و معاد کے زمانہ کی طرف اشارہ ہے میری مراد یہ ہے کہ اس کی سات آیات دنیا کی عمر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ سات ہزار سال ہے اور ہر آیت ہزار سال کی کیفیت پر دلالت کرتی ہے اور یہ کہ آخری ہزار سال گمراہی میں بڑھ کر ہوگا اور یہ مقام اسی طرح اظہار کا مقتضی تھا جس طرح یہ سورۃ شروع دنیا سے لیکر آخرت تک کے ذکر کی کفیل ہے۔

سُورۃ فاتحہ کے خواص

واضح ہو کہ اگر کوئی کلام اُن تمام چیزوں میں سے کہ جو خدائے تعالیٰ کی طرف سے صادر اور اُس کے دستِ قدرت کی صنعت ہیں کسی چیز سے مشابہت کُلّی رکھتا ہو یعنی اُس میں عجائبات ظاہری و باطنی ایسے طور پر جمع ہوں کہ جو مصنوعاتِ الٰہیہ میں سے کسی شئی میں جمع ہیں تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ وہ کلام ایسے مرتبہ پر واقع ہے کہ جس کی مثل بنانے سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں کیونکہ جس چیز کی نسبت بے نظیر اور صادر من اللہ ہونا عند الخواص والعوام ایک مسلّم اور مقبول امر ہے جس میں کسی کو اختلاف و نزاع نہیں اُس کی وجوہِ بے نظیری میں کسی شے کی شراکتِ تامہ ثابت ہونا بلاشبہ اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ شئے بھی بے نظیر ہی ہے مثلاً اگر کوئی چیز اُس چیز سے بکلّی مطابق آجائے جو اپنے مقدار میں دس گز ہے تو اس کی نسبت بھی یہ علم صحیح قطعی مفید یقین جازم حاصل ہو گا کہ وہ بھی دس گز ہے۔

سورۃ فاتحہ میں گلاب ایسی وجوہ بے نظیری

اب ہم ان مصنوعاتِ الٰہیہ میں سے ایک لطیف مصنوع کو مثلاً گلاب کے پھول کو بطور مثال قرار دیکر اُس کے وہ عجائبات ظاہری و باطنی لکھتے ہیں جن کی رو سے وہ ایسی اعلیٰ حالت پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اُس کی نظیر بنانے سے انسانی طاقتیں عاجز ہیں پھر اس بات کو ثابت کر کے دکھلائیں گے کہ ان سب عجائبات سے سورہ فاتحہ کے عجائبات اور کمالات ہموزن ہیں بلکہ اُن عجائبات کا پلّہ بھاری ہے اور اس مثال کے اختیار کرنے کا موجب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ اس عاجز نے اپنی نظر کشفی میں سورۃ فاتحہ کو دیکھا کہ ایک ورق پر لکھی ہوئی اس عاجز کے ہاتھ میں ہے اور ایک ایسی خوبصورت اور دلکش شکل میں ہے کہ گویا وہ کاغذ جس پر سورۃ فاتحہ لکھی ہوئی ہے سُرخ سُرخ اور ملائم گلاب کے پھولوں سے اس قدر لدا ہوا ہے کہ جس کا کچھ انتہا نہیں اور جب یہ عاجز اس سورۃ کی کوئی آیت پڑھتا ہے تو اُس میں سے بہت سے گلاب کے پھول ایک خوش آواز کے ساتھ پرواز کر کے اوپر کی طرف اُڑتے ہیں اور وہ پھول نہایت لطیف اور بڑے بڑے اور سندر اور تر و تازہ اور خوشبودار ہیں جن کے اوپر چڑھنے کے وقت دل و دماغ نہایت معطّر ہو جاتا ہے اور ایک ایسا عالم مستی کا پیدا کرتے ہیں کہ جو اپنی بے مثل لذتوں کی کشش سے دُنیا و مافیہا سے نہایت درجہ کی نفرت دلاتے ہیں۔ اس مکاشفہ سے معلوم ہوا کہ گلاب کے پھول کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ ایک روحانی مناسبت ہے سو ایسی مناسبت کے لحاظ سے اس مثال کو اختیار کیا گیا اور مناسب معلوم ہوا کہ اول بطور مثال گلاب کے پھول کے عجائبات کو کہ جو اُس کے ظاہر و باطن میں پائے جاتے ہیں لکھا جائے اور پھر بمقابلہ اُس کے عجائبات کے سورۃ فاتحہ کے عجائبات ظاہری و باطنی قلمبند ہوں تا ناظرین باانصاف کو معلوم ہو کہ جو خوبیاں گلاب کے پھول میں ظاہراً و باطناً پائی جاتی ہیں جن کے رو سے اُس کی نظیر بنانا عادتاً محال سمجھا گیا ہے اُسی طور پر اور اُس سے بہتر خوبیاں سورۃ فاتحہ

ہیں موجود ہیں اور تا اِس مثال کے لکھنے سے اشارہ کشفی پر بھی عمل ہو جائے۔

پس جاننا چاہیے کہ یہ امر ہریک عاقل کے نزدیک بغیر کسی تردّد اور توقف کے مسلّم الثبوت ہے کہ گلاب کا پھول بھی مثل اور مصنوعات الٰہیہ کے ایسی عمدہ خوبیاں اپنی ذات میں جمع رکھتا ہے جس کی مثل بنانے پر انسان قادر نہیں اور وہ دو طور کی خوبیاں ہیں۔ ایک وہ کہ جو اُس کی ظاہری صورت میں پائی جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ اُس کا رنگ نہایت خوشنما اور خوب ہے اور اُس کی خوشبو نہایت دل آرام اور دل کش ہے اور اُس کے ظاہر بدن میں نہایت درجہ کی ملائمت اور ترو تازگی اور نرمی اور نزاکت اور صفائی ہے اور دوسری وہ خوبیاں ہیں کہ جو باطنی طور پر حکیم مطلق نے اُس میں ڈال رکھی ہیں یعنی وہ خواص کہ جو اُس کے جوہر میں پوشیدہ ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وہ مفرح اور مقوّیٔ قلب اور مسکن صفرا ہے اور تمام قُویٰ اور ارواح کو تقویت بخشتا ہے اور صفرا اور بلغم رقیق کا مسہل بھی ہے اور اسی طرح معدہ اور جگر اور گردہ اور امعا اور رحم اور پھیپھڑہ کو بھی قوت بخشتا ہے اور خفقان حار اور غشی اور ضعفِ قلب کے لیے نہایت مفید ہے اور اسی طرح اَور کئی امراض بدنی کو فائدہ مند ہے۔ پس انہیں دونوں طور کی خوبیوں کی وجہ سے اُس کی نسبت اعتقاد کیا گیا ہے کہ وہ ایسے مرتبۂ کمال پر واقعہ ہے کہ ہرگز کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ اپنی طرف سے کوئی ایسا پھول بنا وے کہ جو اُس پھول کی طرح رنگ میں خوشنما اور خوشبو میں دلکش اور بدن میں نہایت ترو تازہ اور نرم اور نازک اور مصفّا ہو اور باوجود اس کے باطنی طور پر تمام وہ خواص بھی رکھتا ہو جو گلاب کے پھول میں پائے جاتے ہیں! اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیوں گلاب کے پھول کی نسبت ایسا اعتقاد کیا گیا کہ انسانی قوتیں اُس کے نظیر بنانے سے عاجز ہیں اور کیوں جائز نہیں کہ کوئی انسان اُس کی نظیر بنا سکے اور جو خوبیاں اُس کی ظاہر و باطن میں پائی جاتی ہیں وہ مصنوعی پھول میں پیدا کر سکے تو اِس سوال کا جواب یہی ہے کہ ایسا پھول بنانا عادتاً ممتنع ہے اور آج تک کوئی حکیم اور فیلسوف کسی ایسی ترکیب سے کسی قسم کی ادویہ کو بہم نہیں پہنچا سکا کہ جن کے باہم مخلوط اور ممزوج کرنے سے ظاہر و باطن میں گلاب کے پھول کی سی صورت اور سیرت پیدا ہو جائے۔ اب سمجھنا چاہیے کہ یہی وجہ بے نظیری کی سورۃ فاتحہ میں بلکہ قرآن شریف کے ہریک حصہ اَقل قلیل میں کہ جو چار آیت سے بھی کم ہو پائی جاتی ہیں پہلے ظاہری صورت پر نظر ڈال کر دیکھو کہ کیسی رنگینی عبارت اور خوش بیانی اور جودتِ الفاظ اور کلام میں کمال سلاست اور نرمی اور روانگی اور آب و تاب اور لطافت وغیرہ لوازمِ حُسنِ کلام اپنا کامل جلوہ دکھا رہے ہیں ایسا جلوہ کہ جس پر زیادت متصور نہیں اور وحشتِ کلمات اور تعقید ترکیبات سے بکلّی سالم اور بری ہے۔ ہریک فقرہ اُس کا نہایت فصیح اور بلیغ ہے اور ہریک ترکیب اُس کی اپنے اپنے موقعہ پر واقعہ ہے اور ہریک قسم کا التزام جس سے حُسنِ کلام بڑھتا ہے اور لطافتِ عبارت کھلتی ہے سب اُس میں پایا جاتا ہے اور جس قدر حُسنِ تقریر کے لیے بلاغت اور خوش بیانی کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ذہن میں آسکتا ہے وہ کامل طور

پر اُس میں موجود اور مشہود ہے اور جس قدر مطلب کے دل نشین کرنے کے لیے حُسنِ بیان درکار ہے وہ سب اُس میں مہیّا اور موجود ہے اور باوجود اِس بلاغتِ معانی اور التزام کمالیّتِ حُسنِ بیان کے صدق اور راستی کی خوشبو سے بھرا ہوا ہے کوئی مبالغہ ایسا نہیں جس میں جھوٹ کی ذرا آمیزش ہو کوئی رنگینی عبارت اِس قسم کی نہیں جس میں شاعروں کی طرح جھوٹ اور ہزل اور فضول گوئی کی نجاست اور بدبو سے مدد لی گئی ہو پس جیسے شاعروں کا کلام جھوٹ اور ہزل اور فضول گوئی کی بدبو سے بھرا ہوا ہوتا ہے یہ کلام صداقت اور راستی کی لطیف خوشبو سے بھرا ہوا ہے اور پھر اِس خوشبو کے ساتھ خوش بیانی اور جودتِ الفاظ اور رنگینی اور صفائی عبارت کو ایسا جمع کیا گیا ہے کہ جیسے گلاب کے پھول میں خوشبو کے ساتھ اُس کی خوش رنگی اور صفائی بھی جمع ہوتی ہے۔

یہ خوبیاں تو باعتبارِ ظاہر کے ہیں اور باعتبار باطن کے اُس میں یعنی سورۃ فاتحہ میں یہ خواص ہیں کہ وہ بڑی بڑی امراض روحانی کے علاج پر مشتمل ہے اور تکمیل قوّتِ علمی اور عملی کے لیے بہت سا سامان اُس میں موجود ہے اور بڑے بڑے بگاڑوں کی اصلاح کرتی ہے اور بڑے بڑے معارف اور دقائق اور لطائف کو جو حکیموں اور فلسفیوں کی نظر سے چھپے رہے اُس میں مذکور ہیں۔ سالک کے دل کو اس کے پڑھنے سے یقینی قوّت بڑھتی ہے اور شک اور شُبہ اور ضلالت کی بیماری سے شفا حاصل ہوتی ہے اور بہت سی اعلیٰ درجہ کی صداقتیں اور نہایت باریک حقیقتیں کہ جو تکمیلِ نفسِ ناطقہ کے لیے ضروری ہیں اُس کے مبارک مضمون میں بھری ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ کمالات بھی ایسے ہیں کہ گلاب کے پھول کے کمالات کی طرح اُن میں بھی عادتاً ممتنع معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی انسان کے کلام میں مجتمع ہوسکیں اور یہ امتناع نہ نظری بلکہ بدیہی ہے کیونکہ جن دقائق و معارفِ عالیہ کو خدائے تعالیٰ نے عین ضرورتِ حقّہ کے وقت اپنے بلیغ اور فصیح کلام میں بیان فرما کر ظاہری اور باطنی خوبی کا کمال دکھلایا ہے اور بڑی نازک شرطوں کے ساتھ دونوں پہلوؤں ظاہر و باطن کو کمالیت کے اعلیٰ مرتبہ تک پُہنچایا ہے یعنی اول تو ایسے معارفِ عالیہ ضروریہ لکھے ہیں کہ جن کے آثار پہلی تعلیموں سے مندرس اور محو ہوگئے تھے اور کسی حکیم یا فیلسوف نے بھی اُن معارفِ عالیہ پر قدم نہیں مارا تھا اور پھر اُن معارف کو غیر ضروری اور فضول طور پر نہیں لکھا بلکہ ٹھیک ٹھیک اُس وقت اور اُس زمانہ میں اُن کو بیان فرمایا جس وقت حالتِ موجودہ زمانہ کی اصلاح کے لیے اُن کا بیان کرنا ازبس ضروری تھا اور بغیر اُن کے بیان کرنے کے زمانہ کی ہلاکت اور تباہی متصوّر تھی اور پھر وہ معارفِ عالیہ ناقص اور ناتمام طور پر نہیں لکھے گئے بلکہ کمّاً و کیفاً کامل درجہ پر واقعہ ہیں اور کسی عاقل کی عقل کوئی ایسی دینی صداقت پیش نہیں کرسکتی جو اُن سے باہر رہ گئی ہو اور کسی باطل پرست کا کوئی ایسا وسوسہ نہیں جس کا ازالہ اُس کلام میں موجود نہ ہو۔ ان تمام حقائق و دقائق کے التزام سے کہ جو دوسری طرف ضروراتِ حقّہ کے التزام کے ساتھ وابستہ ہیں فصاحت بلاغت کے اُن اعلیٰ کمالات کو ادا کرنا جن پر زیادت متصوّر نہ ہو یہ تو نہایت بڑا کام ہے کہ جو بشری طاقتوں سے

یہ بداہت نظر بلند تر ہے مگر انسان تو ایسا بے ہنر ہے کہ اگر ادنی اور ناکارہ معاملات کو کہ جو حقائق عالیہ سے کچھ تعلق نہیں رکھتے کسی رنگین اور فصیح عبارت میں بالتزام راست بیانی اور حق گوئی کے لکھنا چاہے تو یہ بھی اُس کے لیے ممکن نہیں جیساکہ یہ بات ہر عاقل کے نزدیک نہایت بدیہی ہے کہ اگر مثلاً ایک دکاندار جو کامل درجہ کا شاعر اور انشا پرداز ہو یہ چاہے کہ جو اپنی اُس گفتگو کو جو ہر روز اُسے رنگارنگ کے خریداروں اور معاملہ داروں کے ساتھ کرنی پڑتی ہے کمال بلاغت اور رنگینی عبارت کے ساتھ کیا کرے اور پھر یہ بھی التزام رکھے کہ ہر محل اور ہر موقعہ میں جس قسم کی گفتگو کرنا ضروری ہے وہی کرے مثلاً جہاں کم بولنا مناسب ہے وہاں کم بولے اور جہاں بہت مغززنی مصلحت ہے وہاں بہت گفتگو کرے اور جب اُس میں اور اُس کے خریدار میں کوئی بحث آپڑے تو وہ طرز تقریر اختیار کرے جس سے اُس بحث کو اپنے مفید مطلب طے کرسکے یا مثلاً ایک حاکم جس کا یہ کام ہے کہ فریقین اور گواہوں کے بیان کو ٹھیک ٹھیک قلمبند کرے اور ہر یک بیان پر جو واقعی اور ضروری طور جرح قدح کرنا چاہیے وہی کرے اور جیساکہ تنقیح مقدمہ کے لیے شرط ہے اور تفتیش امر متنازعہ فیہ کے لیے قرین مصلحت ہے سوال کے موقعہ پر سوال اور جواب کے موقعہ پر جواب لکھے اور جہاں قانونی وجوہ کا بیان کرنا لازم ہو اُن کو درست طور پر حسب منشاء قانون بیان کرے اور جہاں واقعات کا بہ ترتیب تمام کھولنا واجب ہو اُن کو بہ پابندی ترتیب وصحت کھول دے اور پھر جو کچھ فی الواقعہ اپنی رائے اور تائید اُس رائے کے وجوہات ہیں اُن کو بہ صحت تمام بیان کرے اور باوصف ان تمام التزامات کے فصاحت بلاغت کے اُس اعلیٰ درجہ پر اُس کا کلام ہو کہ اُس سے بہتر کسی بشر کے لیے ممکن نہ ہو تو اِس قسم کی بلاغت کو بانجام پہنچانا بہ بداہت اُن کے لیے محال ہے سو انسانی فصاحتوں کا یہی حال ہے کہ بجز فضول اور غیر ضروری اور واہیات باتوں کے قدم ہی نہیں اُٹھ سکتا اور بغیر جھوٹ اور ہزل کے اختیار کرنے کے کچھ بول ہی نہیں سکتے اور اگر کچھ بولے بھی تو ادھورا ناک ہے تو کان نہیں کان ہیں تو آنکھ ندارد سچ بولے تو فصاحت گئی فصاحت کے پیچھے پڑے تو جھوٹ اور فضول گوئی کے انبار کے انبار جمع کرلیے پیاز کی طرح سب پوست ہی پوست اور بیچ میں کچھ بھی نہیں۔ پس جس صورت میں عقل سلیم صریح حکم دیتی ہے کہ ناکارہ اور خفیف معاملات اور سیدھے سادے واقعات کو بھی ضرورت حقّہ اور راستی کے التزام سے رنگین اور بلیغ عبارت میں ادا کرنا ممکن نہیں تو پھر اِس بات کا سمجھنا کس قدر آسان ہے کہ معارفِ عالیہ کو ضرورت حقّہ کے التزام کے ساتھ نہایت رنگین اور فصیح عبارت میں جس سے اعلیٰ اور اصفی متصوّر نہ ہو بیان کرنا بالکل خارق عادت اور بشری طاقتوں سے بعید ہے اور جیساکہ گلاب کے پھول کی طرح کوئی پھول کہ جو ظاہر وباطن میں اُس سے مشابہ ہو بنانا عادتاً محال ہے ایسا ہی یہ بھی محال ہے کیونکہ جب ادنیٰ ادنیٰ امور میں تجربہ صحیحہ شہادت دیتا ہے اور فطرتِ سلیمہ قبول کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی ضروری اور راست راست بات کو خواہ وہ بات کسی معاملہ خرید و فروخت سے متعلق ہو یا تحقیقات عدالت

وغیرہ سے تعلق رکھتی ہو جب اُس کو اصلح اور انسب طور پر بجالانا چاہے تو یہ بات غیر ممکن ہو جاتی ہے کہ اُس کی عبارت خواہ نخواہ ہر محل میں موزوں اور مقفّٰی اور فصیح اور بلیغ بلکہ اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت پر ہو تو پھر ایسی تقریر کہ جو علاوہ التزام راستی اور صدق کے معارف اور حقائق عالیہ سے بھی بھری ہوئی اور ضرورتِ حقّہ کے رو سے صادر ہو اور تمام حقّانی صداقتوں پر محیط ہو اور اپنے منصب اصلاح حالتِ موجودہ اور اتمام حجت اور الزام منکرین میں ایک ذرا فروگذاشت نہ کرتی ہو اور مناظرہ اور مباحثہ کے تمام پہلوؤں کی کماحقہ رعایت رکھتی ہو اور تمام ضروری دلائل اور ضروری براہین اور ضروری تعلیم اور ضروری سوال اور ضروری جواب پر مشتمل ہو کیوں کر باوجود ان مشکلات پیچ در پیچ کے کہ جو پہلی صورت سے صدہا درجہ زیادہ ہیں ایسی فصاحت اور بلاغت کے ساتھ کسی بشر کی تحریر میں جمع ہو سکتی ہے کہ وہ بلاغت بھی بے مثل و مانند ہو اور اُس مضمون کو اُس سے زیادہ فصیح عبارت میں بیان کرنا ممکن نہ ہو۔

سورۃ فاتحہ کی ایک بزرگ خاصیت یہ تو وہ وجوہ ہیں کہ جو سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف میں ایسے طور سے پائی جاتی ہیں جن کو گلاب کے پھول کی وجوہ بے نظیری سے بکلّی مطابقت ہے لیکن سورۃ فاتحہ اور قرآنِ شریف میں ایک اَور خاصہ بزرگ پایا جاتا ہے کہ جو اُسی کلام پاک سے خاص ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس کو توجہ اور اخلاص سے پڑھنا دل کو صاف کرتا ہے اور ظلمانی پردوں کو اُٹھاتا ہے اور سینے کو منشرح کرتا ہے اور طالبِ حق کو حضرتِ احدیت کی طرف کھینچ کر ایسے انوار اور آثار کا مورد کرتا ہے کہ جو مقرّبانِ حضرتِ احدیت میں ہونی چاہیے اور جن کو انسان کسی دوسرے حیلہ یا تدبیر سے ہرگز حاصل نہیں کرسکتا اور اِس روحانی تاثیر کا ثبوت بھی ہم اِس کتاب میں دے چکے ہیں اور اگر کوئی طالبِ حق ہو تو بالمواجہ ہم اُس کی تسلّی کر سکتے ہیں اور ہر وقت تازہ بتازہ ثبوت دینے کو طیار ہیں۔

سورۃ فاتحہ کی خوبیوں کا کوئی انسان مقابلہ نہیں کرسکا اور نیز اِس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف کا اپنی کلام میں بے مثل و مانند ہونا صرف عقلی دلائل میں محصور نہیں بلکہ زمانہ دراز کا تجربہ صحیحہ بھی اُس کا موید اور مصدق ہے کیونکہ باوجود اِس کے کہ قرآن شریف برابر تیرہ سو برس سے اپنی تمام خوبیاں پیش کر کے ھَلْ مِنْ مُّعَارِضٍ کا نقارہ بجا رہا ہے اور تمام دُنیا کو بآوازِ بلند کہہ رہا ہے کہ وہ اپنی ظاہری صورت اور باطنی خواص میں بے مثل و مانند ہے اور کسی جن یا انس کو اُس کے مقابلہ یا معارضہ کی طاقت نہیں مگر پھر بھی کسی متنفس نے اُس کے مقابلہ پر دم نہیں مارا بلکہ اُس کی کم سے کم کسی سورۃ مثلاً سورۃ فاتحہ کی ظاہری و باطنی خوبیوں کا بھی مقابلہ نہیں کرسکا تو دیکھو اِس سے زیادہ بدیہی اور کُھلا کھلا معجزہ اور کیا ہوگا کہ عقلی طور پر بھی اُس پاک کلام کا بشری طاقتوں سے بلند تر ہونا ثابت ہوتا ہے اور زمانہ دراز

کا تجربہ بھی اُس کے مرتبۂ اعجاز پر گواہی دیتا ہے۔ اور اگر کسی کو یہ دونوں طور کی گواہی کہ جو عقل اور تجربہ زمانہ دراز کے رو سے بہ پایۂ ثبوت پہنچ چکی ہے نامنظور ہو اور اپنے علم اور ہنر پر نازاں ہو یا دُنیا میں کسی ایسے بشر کی انشا پردازی کا قائل ہو کہ جو قرآنِ شریف کی طرح کوئی کلام بنا سکتا ہے تو ہم ...... کچھ بطور نمونہ حقائق دقائق سورۃ فاتحہ کے لکھتے ہیں اُس کو چاہیے کہ بمقابلہ اُن ظاہری و باطنی سورۃ فاتحہ کی خوبیوں کے کوئی اپنا کلام پیش کرے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم ص ۳۳۱ - ۳۲۹ حاشیہ ۱۱)

سورۃ فاتحہ کے بے نظیر ہونے پر بعض مزید دلائل

سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن شریف کی طرح دو قسم کی خوبیاں کہ جو بے مثل و مانند ہیں پائی جاتی ہیں یعنی ایک ظاہری صورت میں خوبی اور ایک باطنی خوبی۔ ظاہری خوبی یہ کہ ..... اس کی عبارت میں ایسی رنگینی اور آب و تاب اور نزاکت و لطافت و ملائمت اور بلاغت اور شیرینی اور روانگی اور حُسنِ بیان اور حُسنِ ترتیب پایا جاتا ہے کہ اُن معانی کو اُس سے بہتر یا اُس سے مساوی کسی دوسری فصیح عبارت میں ادا کرنا ممکن نہیں اور اگر تمام دُنیا کے انشا پرداز اور شاعر متفق ہو کر یہ چاہیں کہ اُسی مضمون کو لے کر اپنے طور سے کسی دوسری فصیح عبارت میں لکھیں کہ جو سورۃ فاتحہ کی عبارت سے مساوی یا اُس سے بہتر ہو تو یہ بالکل محال اور ممتنع ہے کہ ایسی عبارت لکھ سکیں کیونکہ تیرہ سو برس سے قرآن شریف تمام دُنیا کے سامنے اپنی بے نظیری کا دعویٰ پیش کر رہا ہے اگر ممکن ہوتا تو البتہ کوئی مخالف اُس کا معارضہ کر کے دکھلاتا حالانکہ ایسے دعوی کے معارضہ نہ کرنے میں تمام مخالفین کی رسوائی اور ذلّت اور قرآنِ شریف کی شوکت اور عزّت ثابت ہوتی ہے پس چونکہ تیرہ سو برس سے اب تک کسی مخالف نے عبارتِ قرآنی کی مثل پیش نہیں کی تو اس قدر زمانۂ دراز تک تمام مخالفین کا مثل پیش کرنے سے عاجز رہنا اور اپنی نسبت اُن تمام رسوائیوں اور ندامتوں اور لعنتوں کو روا رکھنا کہ جو جھوٹوں اور لاجواب رہنے والوں کی طرف عائد ہوتے ہیں صریح اِس بات پر دلیل ہے کہ فی الحقیقت اُن کی علمی طاقت مقابلہ سے عاجز رہی ہے اور اگر کوئی اِس امر کو تسلیم نہ کرے تو یہ بارِ ثبوت اُسی کی گردن پر ہے کہ وہ آپ یا کسی اپنے مددگار سے عبارتِ قرآن کی مثل بنوا کر پیش کرے مثلاً سورۃ فاتحہ کے مضمون کو لیکر کوئی دوسری فصیح عبارت بنا کر دکھلا دے جو کمال بلاغت اور فصاحت میں اُس کے برابر ہو سکے اور جب تک ایسا نہ کرے تب تک وہ ثبوت کہ جو مخالفین کے تیرہ سو برس خاموش اور لاجواب رہنے سے اہلِ حق کے ہاتھ میں ہے کسی طور سے ضعیف الاعتبار نہیں ہو سکتا بلکہ مخالفین کی سینکڑوں برسوں کی خاموشی اور لاجواب رہنے نے اُس کو وہ کامل مرتبہ ثبوت کا بخشا ہے کہ جو گلاب کے پھول وغیرہ کو وہ ثبوت بے نظیری کا حاصل نہیں کیونکہ دُنیا کے حکیموں اور صنعت کاروں کو کسی دوسری چیز میں اِس طور پر معارضہ کے لیے کبھی ترغیب نہیں دی گئی اور نہ اُس کی مثل بنانے سے عاجز رہنے کی حالت میں کبھی اُن کو یہ خوف دلایا گیا کہ وہ طرح طرح کی تباہی اور ہلاکت میں ڈالے جائیں گے پس ظاہر ہے کہ جس بداہت اور چمک اور دمک

سے قرآن شریف کی بلاغت اور فصاحت کا انسانی طاقتوں سے بلند تر ہونا ثابت ہے اس طرح پر گلاب کی لطافت اور رنگینی وغیرہ کا بے مثل ہونا ہرگز ثابت نہیں پس یہ تو سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف کی ظاہری خوبی کا بیان ہے جس میں اُس کا بے مثل و مانند ہونا اور بشری طاقتوں سے برتر ہونا مخالفین کے عاجز رہنے سے بہ پایۂ ثبوت پُہنچ گیا ہے اب ہم باطنی خوبیوں کو بھی دوہرا کر ذکر کرتے ہیں تا اچھی طرح غور کرنے والوں کے ذہن میں آجائیں سو جاننا چاہیے کہ جیسا خداوند حکیم مطلق نے گلاب کے پھول میں بدن انسان کے لیے طرح طرح کے منافع رکھے ہیں کہ وہ دل کو قوت دیتا ہے اور قویٰ اور ارواح کو تقویت بخشتا ہے اور کئی اور مرضوں کو مفید ہے ایسا ہی خداوند کریم نے سورۃ فاتحہ میں تمام قرآن شریف کی طرح روحانی مرضوں کی شفا رکھی ہے اور باطنی بیماریوں کا اُس میں وہ علاج موجود ہے کہ جو اس کے غیر میں ہرگز نہیں پایا گیا کیونکہ اُس میں وہ کامل صداقتیں بھری ہوئی ہیں کہ جو روئے زمین سے نابود ہو گئی تھیں اور دُنیا میں اُن کا نام و نشان باقی نہیں رہا تھا پس وہ پاک کلام فضول اور بے فائدہ طور پر دُنیا میں نہیں آیا بلکہ وہ آسمانی نور اُس وقت تجلّی فرما ہوا جبکہ دُنیا کو اُس کی نہایت ضرورت تھی اور اُن تعلیموں کو لایا جن کا دُنیا میں پھیلانا دنیا کی اصلاح کے لیے نہایت ضروری تھا غرض جن پاک تعلیموں کی بغایت درجہ ضرورت تھی اور جن معارف حقائق کے شائع کرنے کی شدّت سے حاجت تھی اُنہیں ضروری اور ازلی ابدی اور حقانی صداقتوں کو عین ضرورت کے وقتوں میں اور ٹھیک ٹھیک حاجت کے موقعہ میں ایک بے مثل بلاغت اور فصاحت کے پیرایہ میں بیان فرمایا اور باوصف اس التزام کے جو کچھ گمراہوں کی ہدایت کے لیے اور حالتِ موجودہ کی اصلاح کے لیے بیان کرنا واجب تھا۔ اُس سے ایک ذرا ترک نہ کیا اور جو کچھ غیر واجب اور فضول اور بیہودہ تھا اُس کا کسی فقرہ میں کچھ دخل ہونا نہ پایا غرض وہ انوار اور پاک صداقتیں باوصف اُس شان عالی کے کہ جو اُن کو بوجہ اعلیٰ درجہ کے معارف ہونے کے حاصل ہے ایک نہایت درجہ کی عظمت اور برکت یہ رکھتے ہیں کہ وہ عبث اور فضول طور پر ظاہر نہیں کی گئیں بلکہ جن جن اقسام انواع کی ظلمت دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور جس جس قسم کا جہل اور فساد علمی اور عملی اور اعتقادی امور میں حالتِ زمانہ پر غالب آگیا تھا اُس ہر یک قسم کے فساد کے مقابلہ پر پورے پورے زور سے اُن سب ظلمتوں کو اُٹھانے کے لیے اور روشنی کو پھیلانے کے لیے عین ضروری وقت پر باران رحمت کی طرح اُن صداقتوں کو دُنیا میں ظاہر کیا گیا اور حقیقت میں وہ باران رحمت ہی تھا کہ سخت پیاسوں کی جان رکھنے کے لیے آسمان سے اُترا اور دُنیا کی روحانی حیات اسی بات پر موقوف تھی کہ وہ آبِ حیات نازل ہو اور کوئی قطرہ اُس کا ایسا نہ تھا کہ کسی موجود الوقت بیماری کی دوا نہ ہو اور حالت موجودہ زمانہ نے صدہا سال تک اپنی معمولی گمراہی پر رہ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اُن بیماریوں کے علاج کو خود بخود بغیر اُترنے اُس نور کے حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اپنی ظلمت کو آپ اُٹھا سکتا ہے بلکہ ایک آسمانی نور کا محتاج ہے کہ جو اپنی سچائی کی شعاعوں سے دُنیا کو روشن کرے اور اُن کو

دکھا دے جنہوں نے کبھی نہیں دیکھا اور اُن کو سمجھا دے جنہوں نے کبھی نہیں سمجھا اُس آسمانی نور نے دُنیا میں آکر صرف یہی کام نہیں کیا کہ ایسے معارفِ حقّہ ضرور پیش کیے جن کا صفحۂ زمین پر نشان باقی نہیں رہا تھا بلکہ اپنے روحانی خاصہ کے زور سے اُن جواہرِ حق اور حکمت کو بہت سے سینوں میں بھر دیا اور بہت سے دلوں کو اپنے دلربا چہرہ کی طرف کھینچ لایا اور اپنی قوی تاثیر سے بہتوں کو علم اور عمل کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔ اب یہ دونوں قسم کی خوبیاں کہ جو سورۃ فاتحہ اور تمام قرآنِ شریف میں پائی جاتی ہیں کلامِ الٰہی کی بے نظیری ثابت کرنے کے لیے ایسے روشن دلائل ہیں کہ جیسی وہ خوبیاں جو گلاب کے پھول میں سب کے نزدیک انسانی طاقتوں سے اعلیٰ تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس قدر یہ خوبیاں بدیہی طور پر عادت سے خارج اور طاقتِ انسانی سے باہر ہیں اِس شان کی خوبیاں گلاب کے پھول میں ہرگز نہیں پائی جاتیں۔ اِن خوبیوں کی عظمت اور شوکت اور بے نظیری اُس وقت کھلتی ہے جب انسان سب کو من حیث الاجتماع اپنے خیال میں لاوے اور اُس اجتماعی ہیئت پر غور اور تدبر سے نظر ڈالے مثلاً اوّل اِس بات کے تصور کرنے سے کہ ایک کلام کی عبارت ایسے اعلیٰ درجہ کی فصیح اور بلیغ اور ملائم اور شیریں اور سلیس اور خوش طرز اور رنگین ہو کہ اگر کوئی انسان کوئی ایسی عبارت اپنی طرف سے بنانا چاہے کہ جو بتمام و کمال اُنہیں معانی پر مشتمل ہو کہ جو اُس بلیغ کلام میں پائی جاتی ہیں تو ہرگز ممکن نہ ہو کہ وہ انسانی عبارت اُس پایۂ بلاغت اور رنگینی کو پہنچ سکے۔ پھر ساتھ ہی یہ دوسرا تصوّر کرنے سے کہ اس عبارت کا مضمون ایسے حقائق دقائق پر مشتمل ہو کہ جو فی الحقیقت اعلیٰ درجہ کی صداقتیں ہوں اور کوئی فقرہ اور کوئی لفظ اور کوئی حرف ایسا نہ ہو کہ جو حکیمانہ بیان پر مبنی نہ ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ تیسرا تصوّر کرنے سے کہ وہ صداقتیں ایسی ہوں کہ حالتِ موجودہ زمانہ کو اُن کی نہایت ضرورت ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ چوتھا تصور کرنے سے کہ وہ صداقتیں ایسی بے مثل و مانند ہوں کہ کسی حکیم یا فیلسوف کا پتہ نہ مل سکتا ہو کہ اُن صداقتوں کو اپنی نظر اور فکر سے دریافت کرنے والا ہو چکا ہو۔ پھر ساتھ ہی یہ پانچواں تصوّر کرنے سے کہ جس زمانہ میں وہ صداقتیں ظاہر ہوئی ہوں ایک تازہ نعمت کی طرح ظاہر ہوئی ہوں اور اُس زمانہ کے لوگ اُن کے ظہور سے پہلے اِس راہ راست سے بکلّی بے خبر ہوں۔ پھر ساتھ ہی یہ چھٹا تصوّر کرنے سے کہ اُس کلام میں ایک آسمانی برکت بھی ثابت ہو کہ جو اُس کی متابعت سے طالبِ حق کو خداوند کریم کے ساتھ ایک سچّا پیوند اور ایک حقیقی اُنس پیدا ہو جائے اور وہ انوار اُس میں چمکنے لگیں کہ جو مردانِ خدا میں چمکنے چاہئیں یہ کل مجموعی ایک ایسی حالت میں معلوم ہوتا ہے کہ عقل سلیم بلا توقف و تردّد حکم دیتی ہے کہ بشری کلام کا اِن تمام مراتب کاملہ پر مشتمل ہونا ممتنع اور محال اور خارقِ عادت ہے اور بلاشبہ ان تمام فضائل ظاہری و باطنی کو بہ نظر یکجائی دیکھنے سے ایک رعب ناک حالت اُن میں پائی جاتی ہے کہ جو عقلمند کو اِس بات کا یقین دلاتی ہے کہ اِس کل مجموعی کا انسانی طاقتوں سے انجام پذیر ہونا عقل اور قیاس سے باہر ہے اور ایسی رعب ناک حالت گلاب کے پھول میں ہرگز پائی نہیں جاتی کیونکہ قرآنِ شریف میں یہ خصوصیّت زیادہ ہے کہ اُس کی صفاتِ مذکورہ کہ جو

بے نظیری کا مدار ہیں نہایت بدیہی الثبوت ہیں اور اسی وجہ سے جب معارض کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا ایک حرف بھی ایسے موقعہ پر نہیں رکھا گیا کہ جو حکمت اور مصلحت سے دور ہو اور اُس کا ایک فقرہ بھی ایسا نہیں کہ جو زمانہ کی اصلاح کے لیے اشد ضروری نہ ہو اور پھر بلاغت کا یہ کمال کہ ہرگز ممکن ہی نہیں کہ اُس کی ایک سطر کی عبارت تبدیل کر کے بجائے اُس کے کوئی دوسری عبارت لکھ سکیں تو ان بدیہی کمالات کے مشاہدہ کرنے سے معارض کے دل پر ایک بزرگ رعب پڑ جاتا ہے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم ۳۳۹ تا ۳۴۳ حاشیہ ۱۱)

سورت فاتحہ کی عظیم صفات کا ثبوت | کوئی نادان..... شاید بباعثِ نادانی سوال کرے کہ اِس بات کا ثبوت کیا ہے کہ یہ ساری خوبیاں سورۃ فاتحہ اور تمام قرآن شریف میں متحقق اور ثابت ہیں سو واضح ہو کہ اِس بات کا یہی ثبوت ہے کہ جنہوں نے قرآن شریف کے بے مثل کمالات پر غور کی اور اُس کی عبارت کو ایسے اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور بلاغت پر پایا کہ اُس کی نظیر بنانے سے عاجز رہ گئے اور پھر اُس کے دقائق وحقائق کو ایسے مرتبہ عالیہ پر دیکھا کہ تمام زمانہ میں اُس کی نظیر نظر نہ آئی اور اُس میں وہ تاثیراتِ عجیبہ مشاہدہ کیں کہ جو انسانی کلمات میں ہرگز نہیں ہوا کرتیں اور پھر اُس میں یہ صفت پاک دیکھی کہ وہ بطور ہزل اور فضول گوئی کے نازل نہیں ہوا بلکہ عین ضرورت حقہ کے وقت نازل ہوا تو اُنہوں نے ان تمام کمالات کے مشاہدہ کرنے سے بے اختیار اُس کی بے مثل عظمت کو تسلیم کر لیا اور اُن میں سے جو لوگ بباعث شقاوتِ ازلی نعمت ایمان سے محروم رہے اُن کے دلوں پر بھی اِس قدر ہیبت اور رُعب اُس بے مثل کلام کا پڑا کہ اُنہوں نے بھی مبہوت اور سراسیمہ ہو کر یہ کہا کہ یہ تو سحرِ مبین ہے۔ اور پھر منصف کو اِس بات سے بھی قرآنِ شریف کے بےمثل و مانند ہونے پر ایک قوی دلیل ملتی ہے اور روشن ثبوت ہاتھ میں آتا ہے کہ باوجود اِس کے کہ مخالفین کو تیرہ سو برس سے خود قرآنِ شریف مقابلہ کرنے کی سخت غیرت دلاتا ہے اور لاجواب رہ کر مخالفت اور انکار کرنے والوں کا نام شریر اور پلید اور لعنتی اور جہنمی رکھتا ہے مگر پھر بھی مخالفین نے نامردوں اور مخنثوں کی طرح کمال بے شرمی اور بے حیائی سے اِس تمام ذلت اور بے آبروئی اور بے عزتی کو اپنے لیے منظور کیا اور یہ روا رکھا کہ اُن کا نام جھوٹا اور ذلیل اور بے حیا اور خبیث اور پلید اور شریر اور بے ایمان اور جہنمی رکھا جاوے مگر ایک قلیل المقدار سورۃ کا مقابلہ نہ کر سکے اور نہ اُن خوبیوں اور صفتوں اور عظمتوں اور صداقتوں میں کچھ نقص نکال سکے کہ جن کو کلامِ الٰہی نے پیش کیا ہے حالانکہ ہمارے مخالفین پر درحالت انکار لازم تھا اور اب بھی لازم ہے کہ اگر وہ اپنے کفر اور بے ایمانی کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ قرآنِ شریف کی کسی سورت کی نظیر پیش کریں اور کوئی ایسا کلام بطور معارضہ ہمارے سامنے لاویں کہ جس میں یہ تمام ظاہری و باطنی خوبیاں پائی جاتی ہوں کہ جو قرآنِ شریف کی ہر یک اقل قلیل سورۃ میں پائی جاتی ہیں یعنی عبارت اُس کی ایسی اعلیٰ درجہ کی بلاغت پر باوصف التزام راستی اور صداقت اور باوصف التزام ضرورتِ حقہ کے واقعہ ہو کہ ہرگز کسی بشر کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ معانی کسی دوسری

ایسی ہی فصیح عبارت میں لا سکے اور مضمون اُس کا نہایت اعلیٰ درجہ کی صداقتوں پر مشتمل ہوا ور پھر وہ صداقتیں بھی ایسی ہوں کہ فضول طور پر نہ لکھی گئی ہوں بلکہ کمال درجہ کی ضرورت نے اُن کا لکھنا واجب کیا ہو اور نیز وہ صداقتیں ایسی ہوں کہ قبل اُن کے ظہور کے تمام دُنیا اُن سے بے خبر ہو اور اُن کا ظہور ایک نئی نعمت کی طرح ہو اور پھر اُن تمام خوبیوں کے ساتھ ایک یہ روحانی خاصّہ بھی اُن میں موجود ہو کہ قرآنِ شریف کی طرح ان میں وہ صریح تاثیریں بھی پائی جائیں جن کا ثبوت ہم نے اِس کتاب[1] میں دیدیا ہے اور ہر وقت طالبِ حق کے لیے تازہ سے تازہ ثبوت دینے کو طیار ہیں اور جب تک کوئی معارض ایسی نظیر پیش نہ کرے تب تک اُسی کا عاجز رہنا قرآنِ شریف کی بے نظیری کو ثابت کرتا ہے اور یہ وجوہ بے نظیری قرآنِ شریف کی جو اس جگہ لکھی گئی یہ تو ہم نے بطور تنزّل اور کفایت شعاری کے لکھی ہیں اور اگر ہم قرآنِ شریف کی اُن تمام دوسری خوبیوں کو بھی کہ جو اُس میں پائی جاتی ہیں نظیر طلب کرنے کے لیے لازمی شرط ٹھہراویں مثلاً اپنے مخالفوں کو یہ کہیں کہ جیسا قرآنِ شریف تمام حقائق اور معارف دینی پر محیط اور مشتمل ہے اور کوئی دینی صداقت اُس سے باہر نہیں اور جیسا وہ صدہا امورِ غیبیہ اور پیشگوئیوں پر احاطہ رکھتا ہے اور پیشگوئیاں بھی ایسی قادرانہ کہ جن میں اپنی عزّت اور دشمن کی ذلت اور اپنا اقبال اور دشمن کا ادبار اور اپنی فتح اور دشمن کی شکست پائی جاتی ہے یہ تمام خوبیاں بھی ہمراہ متذکرہ بالا خوبیوں کے اپنے معارضانہ کلام میں پیش کرکے دکھلاویں تو اس شرط سے اُن کو تباہی پر تباہی اور موت پر موت آوے گی مگر چونکہ جس قدر پہلے اِس سے قرآنِ شریف کی خوبیاں لکھی گئی ہیں وُہی دشمنِ کور باطن کے مُلزم اور لاجواب اور عاجز کرنے کے لیے کافی ہیں اور اُنہیں سے ہمارے مخالفوں پر وہ حالت وارد ہوگی جس سے مُردوں سے پرلے پار ہو جائیں گے اِس لیے قرآنِ شریف کی تمام خوبیوں کو نظیر طلب کرنے کے لیے پیش کرنا غیر ضروری ہے اور نیز تمام خوبیوں کے لکھنے سے کتاب میں بھی بہت سا طول ہو جائے گا سو اسی قدر قتلِ موذی کے لیے کافی ہتھیار سمجھ کر پیش کیا گیا۔ اب باوصف اِس کے کہ تمام تر رعایت و تخفیف قرآنِ شریف کی کسی اقل قلیل سورۃ کی نظیر مخالفوں سے طلب کی جاتی ہے مگر پھر بھی ہر یک باخبر آدمی پر ظاہر ہے کہ مخالفین باوجود سخت حرص اور شدّت عناد اور پرلے درجہ کی مخالفت اور عداوت کے مقابلہ اور معارضہ سے قدیم سے عاجز رہے ہیں اور اب بھی عاجز ہیں اور کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں اور باوجود اس بات کے کہ اِس مقابلہ سے اُن کا عاجز رہنا اُن کو ذلیل بناتا ہے جہنمی ٹھہراتا ہے کافر اور بے ایمان کا اُن کو لقب دیتا ہے بے حیا اور بے شرم اُن کا نام رکھتا ہے مگر مُردہ کی طرح اُن کے مونہہ سے کوئی آواز نہیں نکلتی پس لاجواب رہنے کی ساری ذلتوں کو قبول کرنا اور تمام ذلیل ناموں کو اپنے لیے روا رکھنا اور تمام قسم کی بے حیائی اور بے شرمی کی خس و خاشاک کو اپنے سر پر اُٹھا لینا اِس بات پر نہایت روشن دلیل ہے کہ اِن ذلیل چمگادڑوں کی اُس آفتابِ حقیقت کے آگے کچھ پیش نہیں جاتی پس جبکہ اُس آفتابِ صداقت کی اِس قدر تیز شعاعیں چاروں طرف سے

[1] براہین احمدیہ۔

چھوٹ رہی ہیں کہ اُن کے سامنے ہمارے دشمن خفاش سیرت اندھے ہو رہے ہیں تو اس صورت میں یہ بالکل مکابرہ اور سخت جہالت ہے کہ گلاب کے پھول کی خوبیوں کو کہ جو بہ نسبت قرآنی خوبیوں کے ضعیف اور کمزور اور قلیل الثبوت ہیں اس مرتبۂ بے نظیری پر سمجھا جائے کہ انسانی قوتیں اُن کی مثل بنانے سے عاجز ہیں مگر اُن اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کو کہ جو کئی درجہ گلاب کے پھول کی ظاہری و باطنی خوبیوں سے افضل و بہتر اور قوی الثبوت ہیں ایسا خیال کیا جائے کہ گویا انسان اُن کی نظیر بنانے پر قادر ہے حالانکہ جس حالت میں انسان میں یہ قدرت نہیں پائی جاتی کہ ایک گلاب کے پھول کی جو صرف ایک ساعت تر و تازہ اور خوش نما نظر آتا ہے اور دوسری ساعت میں نہایت افسردہ اور پژمردہ اور بدنما ہو جاتا ہے اور اُس کا وہ لطیف رنگ اُڑ جاتا ہے اور اُس کے پات ایک دوسرے سے الگ ہو کر گر پڑتے ہیں نظیر بنا سکے تو پھر ایسے حقیقی پھول کا مقابلہ کیونکر ہو سکے جس کے لیے مالکِ ازلی نے بہارِ جاوداں رکھی ہے اور جس کو ہمیشہ بادِ خزاں کے صدمات سے محفوظ رکھا ہے اور جس کی طراوت اور ملائمت اور حُسن اور نزاکت میں کبھی فرق نہیں آتا اور کبھی افسردگی اور پژمردگی اُس کی ذاتِ بابرکات میں راہ نہیں پاتی بلکہ جس قدر پُرانا ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اُس کی تازگی اور طراوت زیادہ سے زیادہ کھلتی جاتی ہے اور اُس کے عجائبات زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتے جاتے ہیں اور اُس کے حقائق دقائق لوگوں پر بکثرت ظاہر ہوتے جاتے ہیں تو پھر ایسے حقیقی پھول کے اعلیٰ درجہ کے فضائل اور مراتب سے انکار کرنا پرلے درجہ کی کور باطنی ہے یا نہیں بہرحال اگر کوئی ایسا ہی نابینا ہو کہ جو اپنی اِس کور باطنی سے اِن خوبیوں کی شانِ عظیم کو نہ سمجھتا ہو تو یہ بارِ ثبوت اُسی ناداں کی گردن پر ہے کہ جو کچھ ہم نے بے نظیری کلامِ الٰہی کا ثبوت دیا ہے اور جس قدر ہم نے وجوہِ متفرقہ سے اُس پاک کلام کا انسانی طاقتوں سے بلند تر ہونا بہ پایۂ ثبوت پہنچایا ہے اُن سب فضائل قرآنی کی نظیر پیش کرے اور کسی انسان کے کلام میں ایسے ہی کمالات ظاہری و باطنی دکھلاوے جن کا کلامِ الٰہی میں پایا جانا ہم نے ثابت کر دیا ہے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۴۳ تا ۳۴۷ حاشیہ ۱۱)

سورۃ فاتحہ کا ایک عظیم اثر | فاتحہ فتح کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ مومن کو مومن اور کافر کو کافر بنا دیتی ہے یعنی دونوں میں ایک امتیاز پیدا کر دیتی ہے اور دل کو کھولتی۔ سینہ میں ایک انشراح پیدا کرتی ہے۔ اس لیے سورۃ فاتحہ کو بہت پڑھنا چاہیے۔ اور اس دعا پر خوب غور کرنا ضروری ہے۔

(الحکم ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۱-۲)

سورۃ فاتحہ ایک معجزہ ہے | سورۃ فاتحہ تو ایک معجزہ ہے اس میں امر بھی ہے۔ نہی بھی ہے۔ پیشگوئیاں بھی ہیں۔ قرآن شریف تو ایک بہت بڑا سمندر ہے۔ کوئی بات اگر نکالنی ہو تو چاہیے کہ سورۃ فاتحہ میں بہت غور کرے۔ کیونکہ یہ امّ الکتاب ہے۔ اس کے بطن سے قرآن کریم کے مضامین نکلتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ تواتر کے نیچے ہے | قرآن شریف کا تو ایک نکتہ نکتہ تواتر کے نیچے ہے۔ مگر سورۃ فاتحہ بہت ہی بڑے تواتر سے

ثابت ہے۔ ہر روز ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔

سورت فاتحہ میں منطقی رنگ | منطقی لوگ تعریف کرتے وقت فصل جنس وغیرہ تقسیم کیا کرتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں اَلْاِنْسَانُ حَیَوَانٌ نَاطِقٌ۔ سورۃ فاتحہ میں یہ رنگ بھی موجود ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا۔ پھر اس کے آگے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس کی فصل واقع ہوئی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ اس کی حد ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی تعریف نہیں ہے۔

(الحکم ۱۰ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۲)

دوزخ سے حفاظت کا ذریعہ | سورۃ فاتحہ کی سات آیتیں اسی واسطے رکھی ہیں کہ دوزخ کے سات دروازے ہیں۔ پس ہر ایک آیت گویا ایک دروازہ سے بچاتی ہے۔ (الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

اَلْحَقُّ اَنَّ الْفَاتِحَةَ اَحَاطَتْ كُلَّ عِلْمٍ وَّمَعْرِفَةٍ وَّاشْتَمَلَتْ عَلٰى كُلِّ دَقِيْقَةٍ حَقٍّ وَّحِكْمَةٍ وَّهِيَ تُجِيْبُ كُلَّ سَآئِلٍ وَّتُذِيْبُ كُلَّ عَدُوٍّ صَآئِلٍ وَّيُطْعِمُ كُلَّ نَزِيْلٍ اِلَى التَّضْيِيْفِ مَآئِلٍ وَّيَسْقِي الْوَارِدِيْنَ وَالصَّادِرِيْنَ وَلَا شَكَّ اَنَّهَا تُزِيْلُ كُلَّ شَكٍّ خَيَّبَ وَتُجِيْحُ كُلَّ هَمٍّ شَيَّبَ وَتُعِيْدُ كُلَّ هُدُوٍّ تَغَيَّبَ وَتُخْجِلُ كُلَّ خَصِيْمٍ تَيَّبَ وَيُبَشِّرُ الطَّالِبِيْنَ. وَلَا مُعَالِجَ كَمِثْلِهٖ لِسَمِّ الذُّنُوْبِ وَزَيْغِ الْقُلُوْبِ وَهُوَ الْمُوْصِلُ اِلَى الْحَقِّ وَالْيَقِيْنِ۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۰۳)

اِنَّهَا شَجَرَةٌ طَيِّبَةٌ تُؤْتِيْ كُلَّ حِيْنٍ اُكُلًا مِّنَ الْمَعْرِفَةِ وَيُرْوِيْ مِنْ كَاْسِ الْحَقِّ وَالْحِكْمَةِ فَمَنْ فَتَحَ بَابَ قَلْبِهٖ لِقَبُوْلِ نُوْرِهَا فَيَدْخُلُ فِيْهِ نُوْرُهَا

سورۃ فاتحہ ہر علم اور ہر معرفت پر محیط ہے | حق بات یہی ہے کہ سورت فاتحہ ہر علم اور معرفت پر محیط ہے وہ سچائی اور حکمت کے تمام نکات پر مشتمل ہے اور یہ ہر سائل کے سوال کا جواب دیتی اور ہر حملہ آور دشمن کو تباہ کرتی ہے۔ نیز ہر مسافر کو جو مہمان نوازی چاہتا ہے کھلاتی اور آنے اور جانے والوں کو پلاتی ہے۔ بے شک وہ ہر شبہ کو جو ناکامی کی حد تک پہنچانے والا ہو زائل کر دیتی ہے اور ہر غم کو جس نے بوڑھا کر دیا ہو جڑ سے اکھیڑ دیتی ہے اور ہر گم شدہ راہنما کو (راہ راست پر) واپس لاتی ہے اور ہر خطرناک دشمن کو شرمندہ کرتی ہے۔ طالبان ہدایت کو بشارت دیتی ہے۔ گناہوں کے زہر اور دلوں کی کجی کے لیے اس جیسا کوئی اور معالج نہیں۔ اور وہ حق اور یقین تک پہنچانے والی ہے۔

معرفت کا پھل دینے والا درخت | فاتحہ ایک ایسا پاکیزہ درخت ہے جو ہر وقت معرفت کے پھل دیتا ہے اور حق و حکمت کے جام سے سیراب کرتا ہے جب کوئی شخص اپنے دل کے دروازہ کو اس کا نور قبول کرنے کے لیے کھول دیتا ہے تو اس کا نور اس

وَيَطَّلِعُ عَلٰى مَسْتُوْرِهَا وَمَنْ غَلَّقَ الْبَابَ فَدَعَا ظُلْمَتَهٗ اِلَيْهِ بِفِعْلِهٖ وَ رَأَى التَّبَابَ وَلَحِقَ بِالْهَالِكِيْنَ ۔ (کرامات الصادقین ص۱۰۴)

سورت فاتحہ کا تنویر باطن میں دخل | ایک خاصہ روحانی سورہ فاتحہ میں یہ ہے کہ دلی حضور سے اپنی نماز میں اُس کو ورد کر لینا اور اُس کی تعلیم کو فی الحقیقت سچ سمجھ کر اپنے دل میں قائم کر لینا تنویر باطن میں نہایت دخل رکھتا ہے یعنی اُس سے انشراح خاطر ہوتا ہے اور بشریت کی ظلمت دور ہوتی ہے اور حضرت مبدء فیوض کے فیوض انسان پر وارد ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور قبولیتِ الٰہی کے انوار اُس پر احاطہ کر لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ ترقی کرتا کرتا مخاطباتِ الٰہیہ سے سرفراز ہو جاتا ہے اور کشوفِ صادقہ اور الہاماتِ واضحہ سے تمتع تام حاصل کرتا ہے اور حضرت الوہیّت کے مقربین میں دخل پا لیتا ہے اور وہ وہ عجائبات القائے غیبی اور کلام لاریبی اور استجابتِ ادعیہ اور کشف مغیبات اور تائیدِ حضرت قاضی الحاجات اُس سے ظہور میں آتی ہیں کہ جس کی نظیر اُس کے غیر میں نہیں پائی جاتی۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم ۵۲۵ تا ۵۲۷ حاشیہ ۱۱)

سورت فاتحہ مظہر انوار الٰہی ہے | یہ عاجز اپنے ذاتی تجربہ سے بیان کرتا ہے کہ فی الحقیقت سورۂ فاتحہ مظہر انوارِ الٰہی ہے اِس قدر عجائبات اُس سورت کے پڑھنے کے وقت دیکھے گئے ہیں کہ جن سے خدا کے پاک کلام کا قدر و منزلت معلوم ہوتا ہے اُس سورہ مبارکہ کی برکت سے اور اُس کے تلاوت کے التزام سے کشفِ مغیبات اِس درجہ تک پہنچ گیا کہ صدہا اخبارِ غیبیہ قبل از وقوع منکشف ہوئیں اور ہر یک مشکل کے وقت اُس کے پڑھنے کی حالت میں عجیب طور پر رفع حجاب کیا گیا اور قریب تین ہزار کے کشف صحیح اور رویا صادقہ یاد ہے کہ جو اب تک اِس عاجز سے ظہور میں آ چکی اور صبح صادق کے کھلنے کی طرح پوری بھی ہو چکی ہیں اور دو سو جگہ سے زیادہ قبولیّت دُعا کے آثار نمایاں ایسے نازک موقعوں پر دیکھے گئے جن میں بظاہر کوئی صورت مشکل کشائی کی نظر نہیں آتی تھی اور اسی طرح کشفِ قبور اور دوسرے انواع اقسام کے عجائبات اس سورہ کے التزام ورد سے ایسے ظہور پکڑتے گئے کہ اگر ایک ادنی پرتو ان کا کسی پادری یا پنڈت کے دل پر پڑ جائے تو یک دفعہ حبِ دُنیا سے قطع تعلق کر کے اِسلام کے قبول کرنے کے لیے مرنے پر آمادہ ہو جائے اسی طرح بذریعہ الہاماتِ صادقہ کے جو پیشگوئیاں اس عاجز پر ظاہر ہوتی رہی ہیں جن میں سے بعض پیشگوئیاں مخالفوں کے سامنے پوری ہو گئی ہیں اور پوری ہوتی جاتی ہیں اس قدر ہیں کہ اِس عاجز کے خیال میں

میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ اس سورت کے پوشیدہ اسرار سے آگاہ ہو جاتا ہے اور جو شخص اس دروازہ کو بند کرتا ہے وہ خود ہی اپنے فعل سے اپنی گمراہی کو دعوت دیتا ہے اور اپنی تباہی کا مشاہدہ کرتا ہے اور ہلاک ہونے والوں کے ساتھ جا ملتا ہے۔

دو انجیلوں کی ضخامت سے کم نہیں اور یہ عاجز بطفیل متابعت حضرت رسولِ کریم مخاطباتِ حضرت احدیت میں اس قدر عنایات پاتا ہے کہ جس کا کچھ تھوڑا سا نمونہ حاشیہ در حاشیہ ۳ کے عربی الہامات وغیرہ میں لکھا گیا ہے۔ خداوند کریم نے اُسی رسولِ مقبول کی متابعت اور محبت کی برکت سے اور اپنے پاک کلام کی پیروی کی تاثیر سے اِس خاکسار کو اپنے مخاطبات سے خاص کیا ہے اور علوم لدنیہ سے سرفراز فرمایا ہے اور بہت سے اسرار مخفیہ سے اطلاع بخشی ہے اور بہت سے حقائق اور معارف سے اِس ناچیز کے سینہ کو پُر کر دیا ہے اور بارہا بتلا دیا ہے کہ یہ سب عطیات اور عنایات اور یہ سب تفضلات اور احسانات اور یہ سب تلطفات اور توجہات اور یہ سب انعامات اور تائیدات اور یہ سب مکالمات اور مخاطبات بیمن متابعت و محبت حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۳۸ تا ۵۴۱ حاشیہ ۱۱)

سورت فاتحہ کی بلند شان | جس قدر میں نے اب تک لطائف و معارف و خواص سورۃ فاتحہ لکھے ہیں وہ بدیہی طور پر بے مثل و مانند ہیں مثلاً جو شخص ذرا منصف بن کر اول اُن صداقتوں کے اعلیٰ مرتبہ پر غور کرے جو کہ سورۃ فاتحہ میں جمع ہیں اور پھر اُن لطائف اور نکات پر نظر ڈالے جن پر سورہ ممدوحہ مشتمل ہے اور پھر حُسن بیان اور ایجازِ کلام کو مشاہدہ کرے کہ کیسے معانی کثیرہ کو الفاظ قلیلہ میں بھرا ہوا ہے اور پھر عبارت کو دیکھے کہ کیسی آب و تاب رکھتی ہے اور کس قدر روانگی اور صفائی اور ملائمت اُس میں پائی جاتی ہے کہ گویا ایک نہایت مصفّٰی اور شفاف پانی ہے کہ بہتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر اُس کی روحانی تاثیروں کو دل میں سوچے کہ جو بطور خارقِ عادت دلوں کو ظلمات بشریت سے صاف کر کے مورد انوارِ حضرت الوہیت بناتی ہیں جن کو ہم اِس کتاب کے ہر موقعہ پر ثابت کرتے چلے جاتے ہیں تو اُس پر قرآن شریف کی شان بلند جس سے انسانی طاقتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں ایسی وضاحت سے کھل سکتی ہے جس پر زیادت متصوّر نہیں۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۴۴-۵۴۵ حاشیہ ۱۱)

اِنَّ الْفَاتِحَةَ حِصْنٌ حَصِيْنٌ وَّنُوْرٌ مُّبِيْنٌ وَّمُعَلِّمٌ وَّمُعِيْنٌ وَّ اِنَّهَا يُحْصِنُ اَحْكَامَ الْقُرْاٰنِ مِنَ الزِّيَادَةِ وَالنُّقْصَانِ ـ كَتَحْصِيْنِ الثُّغُوْرِ بِاِمْرَارِ الْاُمُوْرِ ـ وَمَثَلُهَا كَمَثَلِ نَاقَةٍ تَحْمِلُ كُلَّمَا تَحْتَاجُ اِلَيْهِ وَ تُوْصِلُ اِلٰى دِيَارِ الْحِبِّ

سورۃ فاتحہ ایک حصن حصین ہے | (ترجمہ) سورۃ فاتحہ ایک محفوظ قلعہ، نور مبین اور استاد و مددگار ہے اور یہ احکام قرآنیہ کو بڑے اہتمام سے کمی بیشی سے محفوظ رکھتی ہے جس طرح سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور اس کی مثال اس اونٹنی کی ہے جس کی پیٹھ پر ہر ضرورت کی ہر چیز لدی ہوئی ہو اور وہ اپنے سوار کو دیار محبوب تک پہنچا دے۔ نیز اس پر ہر قسم کا زادِ راہ، نفقہ اور

مَنْ تَرَكِبَ عَلَيْهِ وَقَدْ حُمِلَ عَلَيْهَا مِنْ كُلِّ نَوْعِ الْأَزْوَادِ وَالنَّفَقَاتِ وَالثِّيَابِ وَ
الْكِسْوَاتِ۔ أَوْ مَثَلُهَا كَمَثَلِ بِرْكَةٍ صَغِيْرٍ فِيْهَا مَاءٌ غَزِيْرٌ۔ كَأَنَّهَا مَجْمَعُ بِحَارٍ
أَوْ مَجْرٰى قَلَهْذَمٍ زَخَّارٍ۔ وَإِنِّيْ أَرٰى أَنَّ فَوَائِدَ هٰذِهِ السُّوْرَةِ الْكَرِيْمَةِ وَ
نَفَائِسَهَا لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰى۔ وَلَيْسَ فِيْ وُسْعِ الْإِنْسَانِ أَنْ يُّحْصِيَهَا وَإِنْ أَنْفَدَ عُمْرًا فِيْ هٰذَا الْهَوٰى۔
وَإِنَّ أَهْلَ الْغَيِّ وَالشَّقَاوَةِ مَا قَدَرُوْهَا حَقَّ قَدْرِهَا مِنَ الْجَهْلِ وَ
الْغَبَاوَةِ۔ وَقَرَءُوْهَا فَمَا رَءَوْا طَلَاوَتَهَا مَعَ تَكْرَارِ التِّلَاوَةِ۔ وَإِنَّهَا سُوْرَةٌ قَوِيٌّ
الصَّوْلِ عَلَى الْكَفَرَةِ۔ سَرِيْعُ الْأَثَرِ عَلَى الْأَفْئِدَةِ السَّلِيْمَةِ۔ وَمَنْ تَأَمَّلَهَا
تَأَمُّلَ الْمُنْتَقِدِ۔ وَدَانَاهَا بِفِكْرٍ مُّنِيْرٍ كَالْمِصْبَاحِ الْمُتَّقِدِ۔ أَلْفَاهَا نُوْرَ
الْأَبْصَارِ وَمِفْتَاحَ الْأَسْرَارِ۔ وَإِنَّهُ الْحَقُّ بِلَا رَيْبٍ۔ وَّلَا رَجْمٌ بِالْغَيْبِ۔ وَ
إِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ فَقُمْ وَجَرِّبْ وَاتْرُكِ اللُّغُوْبَ وَالْأَيْنَ۔ وَلَا تَسْئَلْ
عَنْ كَيْفَ وَأَيْنَ۔ وَمِنْ عَجَائِبِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ أَنَّهَا عَرَّفَ اللّٰهَ بِتَعْرِيْفٍ
لَّيْسَ فِيْ وُسْعِ بَشَرٍ أَنْ يَّزِيْدَ عَلَيْهِ۔ فَنَدْعُوا اللّٰهَ أَنْ يَّفْتَحَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
قَوْمِنَا بِالْفَاتِحَةِ وَإِنَّا تَوَكَّلْنَا عَلَيْهِ۔ اٰمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ۔

(اعجاز المسیح ص۷۷ تا ۷۹)

لباس وپوشاک لدی ہوئی ہو۔ یا پھر اس کی مثال اس چھوٹے سے حوض کی ہے جس میں بہت سا پانی ہو، گویا کہ وہ متعدد دریاؤں کا منبع ہے، یا وہ ایک عظیم دریا کی گذرگاہ ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ اس سورۂ کریمہ کے فوائد اور خوبیاں اَنگنت ہیں اور ان کا شمار انسانی طاقت میں نہیں، خواہ کوئی اس خواہش کی تکمیل میں اپنی عمر گذار دے۔

گمراہ اور بدبخت لوگوں نے اپنی جہالت اور کند ذہنی کی بناء پر اس کی صحیح قدر نہیں کی، اُنھوں نے اسے پڑھا تو سہی لیکن باوجود بار بار پڑھنے کے وہ اس کی خوبی اور خوبصورتی کو نہ پا سکے۔ یہ سورت منکروں پر شدّت سے حملہ کرنے والی اور صحت مند دلوں پر سرعت سے اثر کرنے والی ہے۔ ہر وہ شخص جس نے اس پر ایک پرکھنے والے کی طرح نظر ڈالی اور چمکتے ہوئے چراغ کی مانند روشن فکر کے ساتھ اس کے قریب ہوا اس نے اس کو آنکھوں کا نور اور اسرار کی کلید پایا۔ بلاشک وشبہ یہی بات حق ہے اور نہ یہ کوئی ظنی بات ہے، اگر تمہیں کوئی شک ہو تو اُٹھو اور خود اس کا تجربہ کر لو اور ماندگی وسستی کو چھوڑ دو اور یہ سوال نہ کرو کہ یہ کیسے اور کہاں ہو سکتا ہے۔ اس سورت کے عجائبات میں سے یہ بات بھی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی تعریف ایسے الفاظ میں بیان کی ہے کہ اس سے زیادہ بیان کرنا انسان کی طاقت میں نہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان اس سورۂ فاتحہ کے ذریعہ فیصلہ کر دے۔ ہمارا اسی پر توکّل ہے۔ آمین یا ربّ العالمین۔

سورۃ فاتحہ کا نماز میں پڑھنا لازمی ہے۔ اور یہ دعا ہی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل دعا نماز ہی میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے یوں سکھایا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الیٰ آخرہ۔ یعنی دعا سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جاوے جس سے اللہ تعالیٰ کے لیے روح میں ایک جوش اور محبت پیدا ہو۔ اس لیے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سب کو پیدا کرنے والا اور پالنے والا۔ اَلرَّحْمٰن جو بلا عمل اور بن مانگے دینے والا ہے۔ اَلرَّحِیْم پھر عمل پر بھی بدلہ دیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دیتا ہے۔ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہر بدلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ نیکی بدی سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے پورا اور کامل موحد تب ہی ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کو مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ تسلیم کرتا ہے۔ دیکھو حکام کے سامنے جا کر ان کو سب کچھ تسلیم کر لینا یہ گناہ ہے۔ اور اس سے شرک لازم آتا ہے۔ اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حاکم بنایا ہے۔ ان کی اطاعت ضروری ہے مگر ان کو خدا ہرگز نہ بناؤ۔ انسان کا حق انسان کو اور خدا تعالیٰ کا حق خدا تعالیٰ کو دو۔ پھر یہ کہو اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ الخ ہم کو سیدھی راہ دکھا۔ یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیے اور وہ نبیوں صدیقوں شہیدوں اور صالحین کا گروہ ہے۔ اس دعا میں ان تمام گروہوں کے فضل اور انعام کو مانگا گیا ہے۔ ان لوگوں کی راہ سے بچا جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔

(الحکم ۲۴ جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

دعائے سورۃ فاتحہ میں تمام بنی نوع انسان کو شامل کرنا چاہیے اس (سورۃ) میں تین لحاظ رکھنے چاہئیں (۱) ایک یہ کہ تمام بنی نوع کو اس میں شریک رکھے (۲) تمام مسلمانوں کو (۳) تیسرے ان حاضرین کو جو جماعت نماز میں داخل ہیں۔ پس اس طرح کی نیّت سے کل نوع انسان اس میں داخل ہوں گے اور یہی منشا خدا تعالیٰ کا ہے۔

{مکتوب حضرت مسیح موعود علیہ السلام بنام شیخ غلام نبی صاحبؓ مندرجہ الحکم ۲۸ جولائی / ۷ اگست ۱۹۳۷ء صفحہ ۳}

دعا میں سورت فاتحہ کے تکرار کا اثر نماز میں سورۃ فاتحہ کی دعا کا تکرار نہایت مؤثر چیز ہے۔ کیسی بے ذوقی و بے مزگی ہو۔ اس عمل کو برابر جاری رکھنا چاہیے یعنی کبھی تکرار آیت ایاک نعبد و ایاک نستعین کا اور کبھی تکرار آیت اھدنا الصراط المستقیم کا اور سجدہ میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ۔

(الحکم ۲۰ فروری ۱۸۹۸ء صفحہ ۹)

سورت فاتحہ کا ورد نماز میں بہتر ہے ۔ بہتر ہے کہ نماز تہجد میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ

اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کا بدلی توجہ وخضوع وخشوع تکرار کریں اور اپنے دل کو نزول انوارِ الٰہیّہ کے لیے پیش کریں اور کبھی تکرار آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا کیا کریں۔ ان دونوں آیتوں کا تکرار انشاء اللہ القدیر تنویر قلب وتزکیہ نفس کا موجب ہوگا۔ (الحکم ۲۴ جون ۱۹۰۳ء صـ۳)

ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ اٰیاتِ ھٰذِہِ السُّوْرَۃِ (الفَاتِحَۃِ) سَبْعٌ وَّالنُّجُوْمُ سَبْعٌ فَقَدْ حَاذَا کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھَا نَجْمًا لِّیَکُوْنَ کُلُّھَا لِلشَّیْطٰنِ رَجْمًا ۔

(رجسٹر محاورات العرب۔ تحریر حضرت مسیح موعود علیہ السلام)

(ترجمہ) واضح رہے کہ اِس سورت (فاتحہ) کی آیات سات ہیں اور مشہور ستارے بھی سات ہیں۔ ان آیات میں سے ہر آیت ایک ستارے کے مقابل پڑی ہے تا وہ سب کی سب شیطان کے لیے رجم کا موجب ہوں ۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

اِعْلَمْ يَا طَالِبَ الْعِرْفَانِ أَنَّهٗ مَنْ أَحَلَّ نَفْسَهٗ مَحَلَّ تِلَاوَةِ الْفَاتِحَةِ وَالْفُرْقَانِ فَعَلَيْهِ أَنْ يَّسْتَعِيْذَ مِنَ الشَّيْطٰنِ كَمَا جَاءَ فِي الْقُرْاٰنِ فَإِنَّ الشَّيْطٰنَ قَدْ يَدْخُلُ حِمَى الْحَضْرَةِ كَالسَّارِقِيْنَ - وَيَدْخُلُ الْحَرَمَ الْعَاصِمَ لِلْمَعْصُوْمِيْنَ - فَأَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يُّنَجِّيَ عِبَادَهٗ مِنْ صَوْلِ الْخَنَّاسِ عِنْدَ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ وَكَلَامِ رَبِّ النَّاسِ - وَيَدْفَعَهٗ بِحَرْبَةٍ مِّنْهُ وَيَضَعَ الْفَاسَ فِي الرَّاْسِ وَيُخَلِّصَ الْغَافِلِيْنَ مِنَ النُّعَاسِ - فَعَلَّمَ كَلِمَةً مِّنْهُ لِطَرْدِ الشَّيْطَانِ الْمَدْحُوْرِ إِلٰى يَوْمِ النُّشُوْرِ - وَكَانَ سِرُّ هٰذَا الْأَمْرِ الْمَسْتُوْرِ أَنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ عَادَى الْإِنْسَانَ مِنَ الدُّهُوْرِ - وَكَانَ يُرِيْدُ إِهْلَاكَهٗ مِنْ طَرِيْقِ الْإِخْفَاءِ وَالدُّمُوْرِ - وَكَانَ أَحَبَّ الْأَشْيَاءِ إِلَيْهِ تَدْمِيْرُ الْإِنْسَانِ - وَلِذَالِكَ أَلْزَمَ نَفْسَهٗ أَنْ تُصْغِيَ إِلٰى كُلِّ أَمْرٍ يَّتَنَزَّلُ مِنَ الرَّحْمَانِ لِدَعْوَةِ النَّاسِ إِلَى الْجِنَانِ وَيَبْذُلُ جُهْدَهٗ لِلْإِضْلَالِ وَالْإِفْتِنَانِ - فَقَدَّرَ اللّٰهُ لَهُ الْخَيْبَةَ وَالْقَوَارِعَ بِبَعْثِ الْأَنْبِيَاءِ - وَمَا قَتَلَهٗ بَلْ أَنْظَرَهٗ إِلٰى يَوْمٍ تُبْعَثُ فِيْهِ

استعاذہ کا حکم اور اس کی حکمت اے طالب معرفت جان لو کہ جب کوئی شخص سورۃ فاتحہ اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے لگے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے جیسا کہ قرآن کریم میں حکم ہے۔ کیونکہ کبھی شیطان خدا تعالیٰ کی رکھ میں چوروں کی طرح داخل ہو جاتا ہے اور اس حرم کے اندر آ جاتا ہے جو معصومین کا محافظ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ سورت فاتحہ اور قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اپنے بندوں کو شیطان کے حملہ سے بچائے، اُسے اپنے حربہ سے پسپا کرے، اس کے سر پر تبر رکھے اور غافلوں کو غفلت سے نجات دے۔ پس اس نے شیطان کو دھتکارنے کے لیے جو قیامت تک راندۂ درگاہ ہے اپنے ہاں سے بندوں کو ایک بات سکھائی اور اس مخفی امر یعنی تعوّذ میں یہ راز ہے کہ شیطان قدیم سے انسان کا دشمن ہے اور وہ اسے پوشیدہ اور اچانک طور پر ہلاک اور برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز انسان کو تباہ کرنا ہی ہے اس لیے اس نے اپنے نفس پر یہ لازم کر لیا ہے کہ وہ ہر اُس امر کی طرف کان لگائے رکھے جو خدائے رحمان کی طرف سے لوگوں کو جنت کی طرف بلانے کے لیے نازل ہوتا ہے اور وہ اپنی تمام تر کوشش گمراہی اور فتنہ کے پھیلانے میں خرچ کرے، پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت کے ذریعہ اس کے لیے ناکامی اور تلخیاں مقدر کر رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے (شروع میں) قتل تو نہیں کیا بلکہ اُسے اس وقت تک مہلت دے دی جب مُردے خدا تعالیٰ بزرگ و برتر کی اجازت

اَلْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ذِی الْعِزَّةِ وَالْعَلَآءِ۔ وَبَشَّرَ بِقَتْلِهٖ فِیْ قَوْلِهٖ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ فَتِلْكَ هِیَ الْكَلِمَةُ الَّتِیْ تُقْرَءُ قَبْلَ قَوْلِهٖ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ"۔ وَهٰذَا الرَّجِیْمُ هُوَ الَّذِیْ وَرَدَ فِیْهِ الْوَعِیْدُ۔ اَعْنِی الدَّجَّالَ الَّذِیْ یَقْتُلُهُ الْمَسِیْحُ الْمُبِیْدُ۔ وَالرَّجْمُ اَلْقَتْلُ كَمَا صُرِّحَ بِهٖ فِیْ كُتُبِ اللِّسَانِ الْعَرَبِیَّةِ۔ فَالرَّجِیْمُ هُوَ الدَّاجِلُ الَّذِیْ یُغَالُ فِیْ زَمَانٍ مِّنَ الْاَزْمِنَةِ الْاٰتِیَةِ۔ وَعْدٌ مِّنَ اللّٰهِ الَّذِیْ یَحُوْلُ عَلٰی اَهْلِهٖ وَلَا تَبْدِیْلَ لِلْكَلِمِ الْاِلٰهِیَّةِ۔ فَهٰذِهٖ بَشَارَةٌ لِّلْمُسْلِمِیْنَ مِنَ اللّٰهِ الرَّحِیْمِ وَاِیْمَاءٌ اِلٰی اَنَّهٗ یُقْتَلُ الدَّجَّالُ فِیْ وَقْتٍ كَمَا هُوَ الْمَفْهُوْمُ مِنْ لَّفْظِ الرَّجِیْمِ۔

اشعار

وَمَعْنَی الرَّجْمِ فِیْ هٰذَا الْمَقَامِ — كَمَا عُلِّمْتُ مِنْ رَّبِّ الْاَنَامِ

هُوَ الْاِعْضَالُ اِعْضَالُ اللِّئَامِ — وَاِسْكَاتُ الْعِدَا كَهْفِ الظَّلَامِ

وَضَرْبٌ یَّخْتَلِیْ اَصْلَ الْخِصَامِ — وَلَا نَعْنِیْ بِهٖ ضَرْبَ الْحُسَامِ

سے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اس نے نعوّذ میں الشیطان الرجیم کے الفاظ رکھ کر اس کے قتل کی خبر دی ہے۔ پس یہی وہ کلمہ ہے جو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے قبل پڑھا جاتا ہے۔

لفظ الرجیم میں دجال کے قتل کا ذکر اور یہ رجیم وہی ہے جس کے حق میں ایک خاص وعید آئی ہے۔ اس سے میری مراد وہ دجال ہے جسے مسیح موعود (قاتلِ دجال) ہلاک کرے گا اور رجیم کے معنے قتل کے ہیں۔ جیسا کہ عربی زبان کی کتب لغت میں اس کی تصریح کی گئی ہے پس رجیم وہی دجل کرنے والا ہے جو آیندہ زمانہ میں ہلاک کیا جائے گا۔ یہ اس خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے جو اپنے بندوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے الفاظ اٹل ہوتے ہیں۔ پس خدائے رحیم کی طرف سے مسلمانوں کے لیے یہ بشارت ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک وقت دجال کو ہلاک کیا جائے گا جیسا کہ لفظ رجیم سے واضح ہے۔

رجم کے معنی (ترجمہ اشعار)

(۱) اس مقام میں رجم کے معنے جیسا کہ مجھے مخلوق کے رب کی طرف سے علم دیا گیا ہے۔

(۲) وہ کمینوں کو عاجز کرنا اور ایسے دشمنوں کو لاجواب کرنا ہے جو اندھیرے کی پناہ گاہ ہیں۔

(۳) اور ایسی ضرب لگانا ہے جو خصومت کو جڑ سے اکھیڑ دے میری مراد اس سے تلوار کی ضرب نہیں۔

وَقَدْ اَتٰی زَمَانٌ تَهْلِكُ فِيهِ الْاَبَاطِيلُ وَلَا تَبْقَى الزُّوْرُ وَالظَّلَامُ وَ
تَفْنَى الْمِلَلُ كُلُّهَا اِلَّا الْاِسْلَامَ۔ وَتَمْلَأُ الْاَرْضُ قِسْطًا وَّعَدْلًا وَّنُوْرًا۔ كَمَا كَانَتْ
مُلِأَتْ ظُلْمًا وَّكُفْرًا وَّجَوْرًا وَّزُوْرًا۔ فَهُنَالِكَ تُقْتَلُ مَنْ سَبَقَ الْوَعِيْدُ لِتَدْمِيْرِهٖ
وَلَا نَعْنِيْ مِنَ الْقَتْلِ اِلَّا كَسْرَ قُوَّتِهٖ وَتَنْجِيَةَ اَسِيْرِهٖ۔ فَحَاصِلُ الْكَلَامِ
اَنَّ الَّذِيْ يُقَالُ لَهُ الشَّيْطٰنُ الرَّجِيْمُ۔ هُوَ الدَّجَّالُ اللَّئِيْمُ وَالْخَنَّاسُ الْقَدِيْمُ۔
وَكَانَ قَتْلُهٗ اَمْرًا مَّوْعُوْدًا وَّخَطْبًا مَّعْهُوْدًا۔ وَلِذٰلِكَ اَلْزَمَ اللّٰهُ كَافَّةَ اَهْلِ الْمِلَّةِ۔
اَنْ يَّقْرَءُوْا لَفْظَ الرَّجِيْمِ قَبْلَ قِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ وَقَبْلَ الْبَسْمَلَةِ لِيَتَذَكَّرَ الْقَارِئُ
اَنَّ وَقْتَ الدَّجَّالِ لَا يُجَاوِزُ وَقْتَ قَوْمٍ ذُكِرُوْا فِيْ اٰخِرِ اٰيَةٍ مِّنْ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ السَّبْعَةِ
وَكَانَ قَدَرُ اللّٰهِ كُتِبَ مِنْ بَدْءِ الْاَوَانِ اَنَّهٗ يُقْتَلُ الرَّجِيْمُ الْمَذْكُوْرُ فِيْ اٰخِرِ
الزَّمَانِ وَيَسْتَرِيْحُ الْعِبَادُ مِنْ لَّدْغِ هٰذَا الثُّعْبَانِ۔ فَالْيَوْمَ وَصَلَ الزَّمَانُ اِلٰى
اٰخِرِ الدَّائِرَةِ وَانْتَهٰى عُمُرُ الدُّنْيَا كَالسَّبْعِ الْمَثَانِيْ اِلَى السَّابِعَةِ مِنَ
الْاُلُوْفِ الشَّمْسِيَّةِ وَالْقَمَرِيَّةِ۔ اَلْيَوْمَ تَجَلَّى الرَّجِيْمُ فِيْ مَظْهَرٍ هُوَ لَهٗ كَالْحُلَلِ
الْبُرُوْزِيَّةِ۔ وَاخْتُتِمَ اَمْرُ الْغَيِّ عَلٰى قَوْمٍ اُخْتُتِمَ عَلَيْهِ اٰخِرُ كَلِمِ الْفَاتِحَةِ۔ وَ

دجال کے قتل کا زمانہ اب وہ زمانہ آگیا ہے جس میں باطل ہلاک ہوجائے گا اور جھوٹ اور اندھیرا باقی نہیں رہے گا، تمام مذاہب سوائے
اسلام کے مٹ جائیں گے اور زمین انصاف عدل اور نور سے بھر جائے گی، جیسا کہ وہ پہلے ظلم، کفر، تعدی اور جھوٹ سے پُر تھی پس
اس وقت اس گروہ دجال کو جس کی ہلاکت کا وعدہ پہلے سے دیا گیا ہے قتل کیا جائے گا۔ اس جگہ قتل سے ہماری مراد صرف اس کی طاقت
توڑ دینے اور اس کے قیدیوں کو آزاد کردینے سے ہے۔ پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ جسے شیطان رجیم کہتے ہیں اس سے وہی دجال لئیم خناس
قدیم مراد ہے جس کا قتل کیا جانا ایک موعود امر تھا اور ایسا اہم امر تھا جو پہلے ہی مقدر ہوچکا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں پر
واجب قرار دیا کہ وہ سورت فاتحہ اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنے سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
پڑھیں تاکہ پڑھنے والے کے ذہن نشین رہے کہ دجال کا زمانہ اس قوم کے زمانہ سے تجاوز نہیں کرے گا جس کا ذکر ان سات آیتوں میں سے
آخری آیت میں کیا گیا ہے اور اللہ کی یہ تقدیر ابتدائے زمانہ سے مقرر تھی کہ مذکور شیطان رجیم آخری زمانہ میں قتل ہوگا اور لوگ اس زہریلے
اژدھا کے ڈسنے سے امان پاجائیں گے پس اب زمانہ اپنے انتہائی دور میں پہنچ گیا ہے اور دنیا کی عمر سبع مثانی کی سات آیات کی طرح
شمسی اور قمری حساب سے ساتویں ہزار سال میں پہنچ گئی ہے آج یہ شیطان رجیم ایسے گروہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جو اس کے لیے بروزی
لباس کی حیثیت رکھتا ہے اور گمراہی اس قوم پر ختم ہوگئی ہے جس کا ذکر سورۃ فاتحہ کے آخری الفاظ میں آیا ہے اور اس بات کو وہی سمجھ سکتا

لَا یَفْھَمُ ھٰذَا الرَّمْزَ اِلَّا ذُو الْقَرِیْحَۃِ الْوَقَّادَۃِ۔

وَلَا یُقْتَلُ الدَّجَّالُ اِلَّا بِالْحَرْبَۃِ السَّمَاوِیَّۃِ۔ اَیْ بِفَضْلٍ مِّنَ اللّٰہِ لَا بِالطَّاقَۃِ الْبَشَرِیَّۃِ۔ فَلَا حَرْبَ وَلَا ضَرْبَ وَلٰکِنْ اَمْرٌ نَازِلٌ مِّنَ الْحَضْرَۃِ الْاَحَدِیَّۃِ۔ وَکَانَ ھٰذَا الدَّجَّالُ یَبْعَثُ بَعْضَ ذَرَارِیْہِ فِیْ کُلِّ مِائَۃٍ مِّنْ مِّئِیْنَ لِیُضِلَّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُوَحِّدِیْنَ وَالصَّالِحِیْنَ وَالْقَائِمِیْنَ عَلَی الْحَقِّ وَالطَّالِبِیْنَ وَیَھُدَّ مَبَانِیَ الدِّیْنِ وَیَجْعَلَ صُحُفَ اللّٰہِ عِضِیْنَ۔ وَکَانَ وَعْدٌ مِّنَ اللّٰہِ اَنَّہٗ یُقْتَلُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ۔ وَیَغْلِبُ الصَّلَاحُ عَلَی الطَّلَاحِ وَالطُّغْیَانِ۔ وَتُبَدَّلُ الْاَرْضُ وَیَتُوْبُ اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَی الرَّحْمَانِ۔ وَتُشْرِقُ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّھَا۔ وَتَخْرُجُ الْقُلُوْبُ مِنْ ظُلُمَاتِ الشَّیْطٰنِ۔ فَھٰذَا ھُوَ مَوْتُ الْبَاطِلِ وَمَوْتُ الدَّجَّالِ وَقَتْلُ ھٰذَا الثُّعْبَانِ۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ رَجُلٌ یُّقْتَلُ فِیْ وَقْتٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ۔ کَلَّا بَلْ ھُوَ شَیْطَانٌ رَّجِیْمٌ اَبُو السَّیِّئَاتِ۔ یُرْجَمُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ بِاِزَالَۃِ الْجَھَلَاتِ وَاسْتِیْصَالِ الْخُزَعْبِیْلَاتِ۔ وَعْدٌ حَقٌّ مِّنَ اللّٰہِ الرَّحِیْمِ۔ کَمَا اُشِیْرَ فِیْ

ہے جو روشن طبع ہو۔

دجّال صرف خدا کے فضل سے قتل ہوگا اور یہ دجال صرف آسمانی حربہ سے ہی ہلاک کیا جائے گا یعنی بشری طاقت سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہی قتل ہوگا۔ پس نہ کوئی لڑائی ہوگی نہ مار پیٹ، بلکہ یہ ایک ایسا امر ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے وقوع پذیر ہوگا اور یہ دجال (شیطان) ہر صدی میں اپنی ذرّیت میں سے بعض کو مقرر کرتا رہا تا مومنوں، موحدوں، نیکوکاروں، حق پر قائم لوگوں اور اس کے طالبوں کو گمراہ کرے اور دین کی عمارتوں کو گرا دے اور اللہ تعالیٰ کی کتب کو پارہ پارہ کردے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ وہ دجال آخری زمانہ میں قتل کیا جائیگا اور نیکی ہر قسم کی خرابی اور سرکشی پر غالب آ جائے گی اور زمین بدل دی جائے گی اور اکثر لوگ خدائے رحمان کی طرف رجوع کریں گے، زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو جائے گی اور قلوب شیطانی تاریکیوں سے باہر آجائیں گے۔ یہی باطل کی موت، دجال کی موت اور اس بڑے اژدہا کا قتل ہے۔

دجال سے مراد شخص واحد نہیں کیا لوگ کہتے ہیں کہ دجال ایک شخص ہے جو کسی زمانہ میں قتل کیا جائے گا، ایسا ہرگز نہیں بلکہ دجال تو وہ مردود شیطان ہے جو بدیوں کا سرچشمہ ہے اسے آخری زمانہ میں جہالتوں کے دور کرنے اور بدیوں کے مٹانے کے ذریعہ قتل کیا جائے گا۔ یہ خدائے رحیم کا سچا وعدہ ہے جیسا کہ خدا کے الفاظ الشیطان الرجیم[1] میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پس ہمارے پروردگار

---

[1] آل عمران : ۳۷ اور النحل : ۹۹ ؎

قَوْلِهٖ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ۔ فَقَدْ تَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّنَا صِدْقًا وَّعَدْلًا فِیْ هٰذِهِ الْاَیَّامِ ۔ وَنَظَرَ اللّٰهُ اِلَی الْاِسْلَامِ بَعْدَ مَا عَنَتْ بِهِ الْبَلَایَا وَالْاٰلَامُ فَاَنْزَلَ مَسِیْحَهٗ لِقَتْلِ الْخَنَّاسِ وَقَطْعِ هٰذَا الْخِصَامِ ۔

وَمَا سُمِّیَ الشَّیْطَانُ رَجِیْمًا اِلَّا عَلٰی طَرِیْقِ اِنْبَاءِ الْغَیْبِ فَاِنَّ الرَّجْمَ هُوَ الْقَتْلُ مِنْ غَیْرِ الرَّیْبِ ۔ وَلَمَّا کَانَ الْقَدَرُ قَدْ جَرٰی فِیْ قَتْلِ هٰذَا الدَّجَّالِ عِنْدَ نُزُوْلِ مَسِیْحِ اللّٰهِ ذِی الْجَلَالِ ۔ اَخْبَرَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلِ هٰذِهِ الْوَاقِعَةِ تَسْلِیَةً وَّتَبْشِیْرًا لِّقَوْمٍ یَّخَافُوْنَ اَیَّامَ الضَّلَالِ ۔ (اعجاز المسیح ص ۹، تا ۸۷)

کی پیشگوئی راستی و عدل سے اس زمانہ میں پوری ہوگئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کی طرف نظرِ کرم فرمائی بعد اس کے کہ اس پر مصائب و تکالیف وارد ہوئیں پس اللہ تعالیٰ نے اپنے مسیح کو اس خنّاس شیطان کے قتل اور اس جھگڑے کے چکانے کے لیے نازل کیا۔

شیطان کا نام رجیم رکھنے میں حکمت اور شیطان کا نام رجیم بطور پیشگوئی رکھا گیا ہے، کیونکہ رجم کے معنے بلاشک و شبہ قتل کرنے کے ہیں اور جب مقدر یوں تھا کہ یہ دجّال خدائے ذوالجلال کے مسیح کے نازل ہونے کے زمانہ میں قتل کیا جائے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ سے قبل ہی ان لوگوں کی تسلی اور بشارت کے لیے جو گمراہی کے زمانہ سے ڈرتے ہیں خبر دے دی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ○ اٰمِیْنَ

ترجمہ:- خدا جس کا نام اللہ ہے تمام اقسام تعریفوں کا مستحق ہے اور ہر ایک تعریف اُسی کی شان کے لائق ہے کیونکہ وہ رَبّ العالمین ہے۔ وہ رحمان ہے۔ وہ رحیم ہے۔ وہ مالک یوم الدین ہے۔ ہم (اے صفات کاملہ والے) تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور مدد بھی تجھ سے ہی چاہتے ہیں۔ ہمیں وہ سیدھی راہ دکھلا جو اُن لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرا انعام ہے۔ اور اُن راہوں سے بچا جو اُن لوگوں کی راہیں ہیں جن پر تیرا غضب طاعون وغیرہ عذابوں سے دُنیا ہی میں وارد ہوا اور نیز اُن لوگوں کی راہوں سے بچا کہ جن پر اگرچہ دُنیا میں کوئی عذاب وارد نہیں ہوا مگر اُخروی نجات کی راہ سے وہ دور جا پڑے ہیں اور آخر عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ (ایام الصلح صا۱۸)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

یہ آیت سورۃ حمد و ثنا[1] کی آیتوں میں سے پہلی آیت ہے اور قرآنِ شریف کی دوسری سورتوں پر بھی لکھی گئی ہے اور ایک اور جگہ بھی قرآنِ شریف میں یہ آیت آئی ہے اور جس قدر تکرار اِس آیت کا قرآنِ شریف میں بکثرت پایا جاتا ہے اور کسی آیت میں اِس قدر تکرار نہیں پایا جاتا اور چونکہ اسلام میں یہ سُنت ٹھہر گئی ہے کہ ہر یک کام کے ابتدا میں جس میں خیر اور برکت مطلوب ہو بطریق تبرک اور استمداد اِس آیت کو پڑھ لیتے ہیں اِس لیے یہ آیت دشمنوں اور دوستوں اور چھوٹوں اور بڑوں میں شہرت پاگئی ہے یہاں تک کہ اگر کوئی شخص تمام قرآنی آیات سے بے خبر مطلق ہو تب بھی امید قوی ہے کہ اِس آیت سے ہرگز اُس کو بے خبری نہیں ہو گی۔

اب یہ آیت جن کامل صداقتوں پر مشتمل ہے اُن کو بھی سُن لینا چاہیے سو منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ اصل مطلب اِس آیت کے نزول سے یہ ہے کہ تا عاجز اور بے خبر بندوں کو اِس نکتۂ معرفت کی تعلیم کی جائے کہ ذات واجب الوجود کا اسمِ اعظم جو اللہ ہے کہ جو اصطلاح قرآنی ربّانی کے رو سے ذات مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ اور منزّہ عن جمیع رذائل اور معبودِ برحق اور واحد لاشریک اور مبدءِ جمیع فیوض پر بولا جاتا ہے اِس اسمِ اعظم کی بہت سی صفات میں سے جو دو صفتیں بسم اللہ میں بیان کی گئی ہیں یعنی صفت رحمانیت و رحیمیت اِنہیں دو صفتوں کے تقاضا سے کلامِ الٰہی کا نزول اور اُس کے انوار و برکات

[1] سورۃ فاتحہ۔

کا صدور ہے ۔اِس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا کے پاک کلام کا دُنیا میں اُترنا اور بندوں کو اُس سے مطلع کیا جانا یہ صفت رحمانیت کا تقاضا ہے کیونکہ صفت رحمانیت کی کیفیت (جیسا کہ آگے بھی تفصیل سے لکھا جائے گا) یہ ہے کہ وہ صفت بغیر سبقت عمل کسی عامل کے محض جود اور بخشش الٰہی کے جوش سے ظہور میں آتی ہے جیسا خدا نے سورج اور چاند اور پانی اور ہوا وغیرہ کو بندوں کی بھلائی کے لیے پیدا کیا ہے یہ تمام جود اور بخشش صفتِ رحمانیت کے رو سے ہے اور کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ چیزیں میرے کسی عمل کی پاداش میں بنائی گئی ہیں اسی طرح خدا کا کلام بھی کہ جو بندوں کی اصلاح اور راہ نمائی کے لیے اُترا وہ بھی اِس صفت کے رو سے اُترا ہے اور کوئی ایسا متنفس نہیں کہ یہ دعویٰ کر سکے کہ میرے کسی عمل یا مجاہدہ یا کسی پاک باطنی کے اجر میں خدا کا پاک کلام کہ جو اُس کی شریعت پر مشتمل ہے نازل ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ طہارت اور پاک باطنی کا دم مارنے والے اور زہد اور عبادت میں زندگی بسر کرنے والے اب تک ہزاروں لوگ گزرے ہیں لیکن خدا کا پاک اور کامل کلام کہ جو اُس کے فرائض اور احکام کو دُنیا میں لایا اور اُس کے ارادوں سے خلق اللہ کو مطلع کیا اُنہیں خاص وقتوں میں نازل ہوا ہے کہ جب اُس کے نازل ہونے کی ضرورت تھی ہاں یہ ضرور ہے کہ خدا کا پاک کلام انہیں لوگوں پر نازل ہو کہ جو تقدس اور پاک باطنی میں اعلیٰ درجہ رکھتے ہوں کیونکہ پاک کو پلید سے کچھ میل اور مناسبت نہیں لیکن یہ ہرگز ضرور نہیں کہ ہر جگہ تقدس اور پاک باطنی کلام الٰہی کے نازل ہونے کو مستلزم ہو بلکہ خدائے تعالیٰ کی حقانی شریعت اور تعلیم کا نازل ہونا ضروراتِ حقہ سے وابستہ ہے پس جس جگہ ضروراتِ حقہ پیدا ہو گئیں اور زمانہ کی اصلاح کے لیے واجب معلوم ہوا کہ کلام الٰہی نازل ہو اُسی زمانہ میں خدائے تعالیٰ نے جو حکیم مطلق ہے اپنے کلام کو نازل کیا اور کسی دوسرے زمانہ میں گو لاکھوں آدمی تقویٰ اور طہارت کی صفت سے متصف ہوں اور گو کیسی ہی تقدس اور پاک باطنی رکھتے ہوں اُن پر خدا کا وہ کامل کلام ہرگز نازل نہیں ہوتا کہ جو شریعت حقانی پر مشتمل ہو ہاں مکالمات و مخاطبات حضرت احدیت کے بعض پاک باطنوں سے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اُس وقت کہ جب حکمتِ الٰہیہ کے نزدیک اُن مکالمات اور مخاطبات کے لیے کوئی ضرورتِ حقہ پیدا ہو اور ان دونوں طور کی ضرورتوں میں فرق یہ ہے کہ شریعتِ حقانی کا نازل ہونا اُس ضرورت کے وقت پیش آتا ہے کہ جب دُنیا کے لوگ بباعث ضلالت اور گمراہی کے جادۂ استقامت سے منحرف ہو گئے ہوں اور اُن کے راہِ راست پر لانے کے لیے ایک نئی شریعت کی حاجت ہو کہ جو اُن کی آفاتِ موجودہ کا بخوبی تدارک کر سکے اور اُن کی تاریکی اور ظلمت کو اپنے کامل اور شافی بیان کے نور سے بکلی اٹھا سکے۔ اور جس طور کا علاج حالتِ فاسدہ زمانہ کے لیے درکار ہے وہ علاج اپنے پُرزور بیان سے کر سکے لیکن جو مکالمات و مخاطبات اولیاء اللہ کے ساتھ ہوتے ہیں اُن کے لیے غالباً اِس ضرورتِ عظمیٰ کا پیش آنا ضروری نہیں بلکہ بسا اوقات صرف اسی قدر اُن مکالمات سے مطلب ہوتا ہے کہ تا ولی کے نفس کو کسی مصیبت اور محنت کے وقت صبر اور استقامت کے لباس سے متحلی کیا جائے یا کسی غم اور حزن کے غلبہ میں کوئی بشارت اُس کو دی جائے مگر وہ کامل اور پاک کلام خدائے تعالیٰ کا کہ جو نبیوں اور رسولوں پر نازل ہوتا ہے وہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اُس ضرورتِ حقہ کے پیش آنے پر نزول فرماتا ہے کہ جب خلق اللہ کو اُس کے نزول کی بشدّت حاجت

ہو غرض کلامِ الٰہی کے نازل ہونے کا اصل موجب ضرورتِ حقّہ ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب تمام رات کا اندھیر ہو جاتا ہے اور کچھ نور باقی نہیں رہتا تو اُسی وقت تم سمجھ جاتے ہو کہ اب ماہِ نو کی آمد نزدیک ہے اسی طرح جب گمراہی کی ظلمت سخت طور پر دُنیا پر غالب آجاتی ہے تو عقلِ سلیم اُس روحانی چاند کے نکلنے کو بہت نزدیک سمجھتی ہے ایسا ہی جب امساکِ باراں سے لوگوں کا حال تباہ ہو جاتا ہے تو اُس وقت عقلمند لوگ بارانِ رحمت کا نازل ہونا بہت قریب خیال کرتے ہیں اور جیسا کہ خدا نے اپنے جسمانی قانون میں بھی بعض مہینے برسات کے لیے مقرر کر رکھے ہیں یعنی وہ مہینے جن میں فی الحقیقت مخلوق اللہ کو بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن مہینوں میں جو مینہ برستا ہے اُس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاتا کہ خاص اُن مہینوں میں لوگ زیادہ نیکی کرتے ہیں اور دوسرے مہینوں میں فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ وہ مہینے ہیں جن میں زمینداروں کو بارش کی ضرورت ہے اور جن میں بارش کا ہو جانا تمام سال کی سرسبزی کا موجب ہے ایسا ہی کلامِ الٰہی کا نزول فرمانا کسی شخص کی طہارت اور تقویٰ کے جہت سے نہیں ہے یعنی علّتِ موجبہ اُس کلام کے نزول کی یہ نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص غایت درجہ کا مقدّس اور پاک باطن تھا یا راستی کا بھوکا اور پیاسا تھا بلکہ جیسا کہ ہم کئی دفعہ لکھ چکے ہیں کُتبِ آسمانی کے نزول کا اصلی موجب ضرورتِ حقّہ ہے یعنی وہ ظلمت اور تاریکی کہ جو دنیا پر طاری ہو کر ایک آسمانی نور کو چاہتی ہے کہ تا وہ نور نازل ہو کر اُس تاریکی کو دور کرے اور اسی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ جو خدائے تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں فرمایا ہے اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ[1] یہ لیلۃ القدر اگرچہ اپنے مشہور معنوں کے رو سے ایک بزرگ رات ہے لیکن قرآنی اشارات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی ظلمانی حالت بھی اپنی پوشیدہ خوبیوں میں لیلۃ القدر کا ہی حکم رکھتی ہے اور اُس ظلمانی حالت کے دنوں میں صدق اور صبر اور زہد اور عبادت خدا کے نزدیک بڑا قدر رکھتا ہے اور وہی ظلمانی حالت تھی کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعثت کے وقت تک اپنے کمال کو پہنچ کر ایک عظیم الشان نور کے نزول کو چاہتی تھی اور اُسی ظلمانی حالت کو دیکھ کر اور ظلمت زدہ بندوں پر رحم کر کے صفتِ رحمانیّت نے جوش مارا اور آسمانی برکتیں زمین کی طرف متوجّہ ہوئیں سو وہ ظلمانی حالت دنیا کے لیے مبارک ہو گئی اور دُنیا نے اس سے ایک عظیم الشان رحمت کا حصہ پایا کہ ایک کامل انسان اور سیّد الرُسل کہ جس سا کوئی پیدا نہ ہوا اور نہ ہو گا دُنیا کی ہدایت کے لیے آیا اور دُنیا کے لیے اُس روشن کتاب کو لایا جس کی نظیر کسی آنکھ نے نہیں دیکھی پس یہ خدا کے کمال رحمانیت کی ایک بزرگ تجلّی تھی کہ جو اُس نے ظلمت اور تاریکی کے وقت ایسا عظیم الشان نور نازل کیا جس کا نام فرقان ہے جو حق اور باطل میں فرق کرتا ہے جس نے حق کو موجود اور باطل کو نابود کر کے دکھلا دیا وہ اُس وقت زمین پر نازل ہوا جب زمین ایک موت روحانی کے ساتھ مر چکی تھی اور برّ اور بحر میں ایک بھاری فساد واقعہ ہو چکا تھا پس اُس نے نزول فرما کر وہ کام کر دکھایا جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے آپ اشارہ فرما کر کہا ہے اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يُحۡىِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا[2] یعنی زمین مر گئی تھی اب خدا اُس کو نئے سرے زندہ کرتا ہے اب اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نزول قرآنِ شریف کا کہ جو زمین کے زندہ کرنے کے لیے ہوا

---

[1] القدر: ۲ [2] الحدید: ۱۸

یہ صفت رحمانیت کے جوش سے ہوا وہی صفت ہے کہ جو کبھی جسمانی طور پر جوش مار کر قحط زدوں کی خبر لیتی ہے اور بارانِ رحمت خشک زمین پر برساتی ہے اور وہی صفت کبھی روحانی طور پر جوش مار کر اُن بھوکوں اور پیاسوں کی حالت پر رحم کرتی ہے کہ جو ضلالت اور گمراہی کی موت تک پہنچ جاتے ہیں اور حق اور صداقت کی غذا کہ جو روحانی زندگی کا موجب ہے اُن کے پاس نہیں رہتی پس رحمانِ مطلق جیسا جسم کی غذا کو اُس کی حاجت کے وقت عطا فرماتا ہے ایسا ہی وہ اپنی رحمتِ کاملہ کے تقاضا سے روحانی غذا کو بھی ضرورتِ حقّہ کے وقت مہیا کر دیتا ہے ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا کا کلام انہیں برگزیدہ لوگوں پر نازل ہوتا ہے جن سے خدا راضی ہے اور اُنہیں سے وہ مکالمات اور مخاطبات کرتا ہے جن سے وہ خوش ہے مگر یہ بات ہرگز درست نہیں کہ جس سے خدا راضی اور خوش ہو اُس پر خواہ نخواہ بغیر کسی ضرورتِ حقّہ کے کتاب آسمانی نازل ہو جایا کرے یا خدائے تعالیٰ یونہی بلا ضرورتِ حقّہ کسی کی طہارتِ لازمی کی وجہ سے لازمی اور دائمی طور پر اُس سے ہر وقت باتیں کرتا رہے بلکہ خدا کی کتاب اُسی وقت نازل ہوتی ہے جب فی الحقیقت اُس کے نزول کی ضرورت پیش آجائے اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ وحیٔ اللہ کے نزول کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی رحمانیت ہے کسی عامل کا عمل نہیں اور یہ ایک بزرگ صداقت ہے جس سے ہمارے مخالف برہمّو وغیرہ بے خبر ہیں۔

پھر اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ کسی فردِ انسانی کا کلامِ الٰہی کے فیض سے فی الحقیقت مستفیض ہو جانا اور اُس کی برکات اور انوار سے متمتع ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچنا اور اپنی سعی اور کوشش کے ثمرہ کو حاصل کرنا یہ صفت رحیمیت کی تائید سے وقوع میں آتا ہے اور اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے بعد ذکر صفتِ رحمانیت کے صفت رحیمیت کو بیان فرمایا تا معلوم ہو کہ کلامِ الٰہی کی تاثیریں جو نفوسِ انسانیہ میں ہوتی ہیں یہ صفت رحیمیت کا اثر ہے جس قدر کوئی اعراض صوری و معنوی سے پاک ہو جاتا ہے جس قدر کسی کے دل میں خلوص اور صدق پیدا ہوتا ہے جس قدر کوئی جدوجہد سے متابعت اختیار کرتا ہے اُسی قدر کلامِ الٰہی کی تاثیر اُس کے دل پر ہوتی ہے اور اُسی قدر وہ اُس کے انوار سے متمتع ہوتا ہے اور علاماتِ خاصہ مقبولانِ الٰہی کی اس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دوسری صداقت کہ جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں مودع ہے یہ ہے کہ یہ آیت قرآنِ شریف کے شروع کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے اور اس کے پڑھنے سے مدعا یہ ہے کہ تا اُس ذات مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ سے مدد طلب کی جائے جس کی صفتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ رحمان ہے اور طالبِ حق کے لیے محض تفضّل اور احسان سے اسبابِ خیر اور برکت اور رشد کے پیدا کر دیتا ہے اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ رحیم ہے یعنی سعی اور کوشش کرنے والوں کی کوششوں کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اُن کی جدوجہد پر ثمراتِ حسنہ مترتب کرتا ہے اور اُن کی محنت کا پھل اُن کو عطا فرماتا ہے اور یہ دونوں صفتیں یعنی رحمانیت اور رحیمیت ایسی ہیں کہ بغیر اُن کے کوئی کام دنیا کا ہو یا دین کا انجام کو پہنچ نہیں سکتا اور اگر غور کر کے دیکھو تو ظاہر ہوگا کہ دنیا کی تمام مہمات کے انجام

دینے کے لیے یہ دونوں صفتیں ہر وقت اور ہر لحظہ کام میں لگی ہوئی ہیں خدا کی رحمانیت اُس وقت سے ظاہر ہو رہی ہے کہ جب انسان ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا سو وہ رحمانیت انسان کے لیے ایسے ایسے اسباب بہم پہنچاتی ہے کہ جو اُس کی طاقت سے باہر ہیں اور جن کو وہ کسی حیلہ یا تدبیر سے ہرگز حاصل نہیں کر سکتا اور وہ اسباب کسی عمل کی پاداش میں نہیں دیئے جاتے بلکہ تفضّل اور احسان کی راہ سے عطا ہوتے ہیں جیسے نبیوں کا آنا کتابوں کا نازل ہونا بارشوں کا ہونا سورج اور چاند اور ہوا اور بادل وغیرہ کا اپنے اپنے کاموں میں لگے رہنا اور خود انسان کا طرح طرح کی قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ مشرّف ہو کر اس دنیا میں آنا اور تندرستی اور امن اور فرصت اور ایک کافی مُدت تک عمر پانا یہ وہ سب اُمور ہیں کہ جو صفت رحمانیت کے تقاضا سے ظہور میں آتے ہیں اسی طرح خدا کی رحیمیت تب ظہور کرتی ہے کہ جب انسان سب توفیقوں کو پاکر خدا داد قوتوں کو کسی فعل کے انجام کے لیے حرکت دیتا ہے اور جہاں تک اپنا زور اور طاقت اور قوّت ہے خرچ کرتا ہے تو اس وقت عادتِ الٰہیہ اس طرح پر جاری ہے کہ وہ اُس کی کوششوں کو ضائع ہونے نہیں دیتا بلکہ اُن کوششوں پر ثمراتِ حسنہ مُترتّب کرتا ہے پس یہ اُس کی سراسر رحیمیت ہے کہ جو انسان کی مُردہ محنتوں میں جان ڈالتی ہے۔

اب جاننا چاہیئے کہ آیتِ ممدوحہ کی تعلیم سے مطلب یہ ہے کہ قرآن شریف کے شروع کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جامع صفات کاملہ کی رحمانیت اور رحیمیت سے استمداد اور برکت طلب کی جائے صفت رحمانیت سے برکت طلب کرنا اس غرض سے ہے کہ تا وہ ذاتِ کامل اپنی رحمانیت کی وجہ سے اُن سب اسباب کو محض لُطف اور احسان سے میسّر کر دے کہ جو کلامِ الٰہی کی متابعت میں جد و جہد کرنے سے پہلے درکار ہیں جیسے عمر کا وفا کرنا فرصت اور فراغت کا حاصل ہونا وقت صفا میسّر آجانا طاقتوں اور قُوتوں کا قائم ہونا کوئی ایسا امر پیش نہ آجانا کہ جو آسایش اور امن میں خلل ڈالے کوئی ایسا مانع نہ آپڑنا کہ جو دل کو متوجّہ ہونے سے روک دے غرض ہر طرح سے توفیق عطا کیے جانا یہ سب اُمور صفتِ رحمانیّت سے حاصل ہوتے ہیں اور صفت رحیمیت سے برکت طلب کرنا اس غرض سے ہے کہ تا وہ ذاتِ کامل اپنی رحیمیت کی وجہ سے انسان کی کوششوں پر ثمراتِ حسنہ مُترتّب کرے اور انسان کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچاوے اور اُس کی سعی اور جد و جہد کے بعد اُس کے کام میں برکت ڈالے پس اس طور پر خدائے تعالیٰ کی دونوں صفتوں رحمانیت اور رحیمیت سے کلامِ الٰہی کے شروع کرنے کے وقت بلکہ ہر یک ذی شان کام کے ابتدا میں تبرک اور استمداد چاہنا یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے جس سے انسان کو حقیقت توحید کی حاصل ہوتی ہے اور اپنے جہل اور بے خبری اور نادانی اور گمراہی اور عاجزی اور خواری پر یقینِ کامل ہو کر مبدءِ فیض کی عظمت اور جلال پر نظر جا ٹھہرتی ہے اور اپنے تئیں بکلّی مفلس اور مسکین اور ہیچ اور ناچیز سمجھ کر خداوند قادرِ مطلق سے اُس کی رحمانیّت اور رحیمیت کی برکتیں طلب کرتا ہے اور اگرچہ خدائے تعالیٰ کی یہ صفتیں خود بخود اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں مگر اُس حکیمِ مطلق نے قدیم سے انسان کے لیے یہ قانونِ قُدرت مقرر کر دیا

ہے کہ اُس کی دعا اور استمداد کو کامیابی میں بہت سا دخل ہے۔ جو لوگ اپنی مہمات میں دلی صدق سے دُعا مانگتے ہیں اور اُن کی دُعا پورے پورے اخلاص تک پہنچ جاتی ہے تو ضرور فیضانِ الٰہی اُن کی مُشکل کشائی کی طرف توجّہ کرتا ہے۔ ہریک انسان جو اپنی کمزوریوں پر نگاہ کرتا ہے اور اپنے قصوروں کو دیکھتا ہے وہ کسی کام پر آزادی اور خود بینی سے ہاتھ نہیں ڈالتا بلکہ سچی عبودیت اُس کو یہ سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہ جو متصرف مطلق ہے اُس سے مدد طلب کرنی چاہیئے یہ سچی عبودیت کا جوش ہریک ایسے دل میں پایا جاتا ہے کہ جو اپنی فطرتی سادگی پر قائم ہے اور اپنی کمزوری پر اطلاع رکھتا ہے پس صادق آدمی جس کی روح میں کسی قسم کے غرور اور عُجب نے جگہ نہیں پکڑی اور جو اپنے کمزور اور ہیچ اور بے حقیقت وجود پر خوب واقف ہے اور اپنے تئیں کسی کام کے انجام دینے کے لائق نہیں پاتا اور اپنے نفس میں کچھ قوّت اور طاقت نہیں دیکھتا جب کسی کام کو شروع کرتا ہے تو بلاتصنّع اُس کی کمزور روح آسمانی قوّت کی خواستگار ہوتی ہے اور ہر وقت اُس کو خدا کی مقتدر ہستی اپنے سارے کمال و جلال کے ساتھ نظر آتی ہے اور اُس کی رحمانیّت اور رحیمیت ہریک کام کے انجام کے لیے مدار دکھلائی دیتی ہے۔ پس وہ بلا ساختہ اپنا ناقص اور ناکارہ زور ظاہر کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی دعا سے امدادِ الٰہی چاہتا ہے پس اِس انکسار اور فروتنی کی وجہ سے اس لائق ہو جاتا ہے کہ خدا کی قوت سے قوت اور خدا کی طاقت سے طاقت اور خدا کے علم سے علم پاوے اور اپنی مرادات میں کامیابی حاصل کرے۔ اِس بات کے ثبوت کے واسطے کسی منطق یا فلسفہ کے دلائل پر از تکلّف درکار نہیں ہیں بلکہ ہریک انسان کی روح میں اس کے سمجھنے کی استعداد موجود ہے اور عارف صادق کے اپنے ذاتی تجارب اِس کی صحت پر بہ تواتر شہادت دیتے ہیں۔ بندہ کا خدا سے امداد چاہنا کوئی ایسا امر نہیں ہے جو صرف بیہودہ اور بناوٹ ہو یا جو صرف بے اصل خیالات پر مبنی ہو اور کوئی معقول نتیجہ اُس پر مترتب نہ ہو بلکہ خداوند کریم کہ جو فی الحقیقۃ قیّوم عالم ہے اور جس کے سہارے پر سچ مچ اس عالم کی کشتی چل رہی ہے اُس کی عادتِ قدیمہ کے رو سے یہ صداقت قدیم سے چلی آتی ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں حقیر اور ذلیل سمجھ کر اپنے کاموں میں اُس کا سہارا طلب کرتے ہیں اور اُس کے نام سے اپنے کاموں کو شروع کرتے ہیں تو وہ اُن کو اپنا سہارا دیتا ہے۔ جب وہ ٹھیک ٹھیک اپنی عاجزی اور عبودیت سے روبخدا ہو جاتے ہیں تو اُس کی تائیدیں اُن کے شامل حال ہو جاتی ہیں غرض ہریک شاندار کام کے شروع میں اُس مبدءِ فیوض کے نام سے مدد چاہنا کہ جو رحمان و رحیم ہے ایک نہایت ادب اور عبودیت اور نیستی اور فقر کا طریقہ ہے اور ایسا ضروری طریقہ ہے کہ جس سے توحید فی الاعمال کا پہلا زینہ شروع ہوتا ہے جس کے التزام سے انسان بچوں کی سی عاجزی اختیار کر کے اُن نخوتوں سے پاک ہو جاتا ہے کہ جو دُنیا کے مغرور دانشمندوں کے دلوں میں بھری ہوتی ہیں اور پھر اپنی کمزوری اور امدادِ الٰہی پر یقین کامل کر کے اُس معرفت سے حصہ پا لیتا ہے کہ جو خاص اہل اللہ کو دی جاتی ہے اور بلاشبہ جس قدر انسان اس طریقہ کو لازم پکڑتا ہے

جس قدر اِس پر عمل کرنا اپنا فرض ٹھہرالیتا ہے جس قدر اِس کے چھوڑنے میں اپنی ہلاکت دیکھتا ہے اُسی قدر اُس کی توحید صاف ہوتی ہے اور اُسی قدر عُجب اور خود بینی کی آلائشوں سے پاک ہوتا جاتا ہے اور اُسی قدر تکلّف اور بناوٹ کی سیاہی اُس کے چہرہ پر سے اُٹھ جاتی ہے اور سادگی اور بھولا پن کا نور اُس کے مُنہ پر چمکنے لگتا ہے پس یہ وہ صداقت ہے کہ جو رفتہ رفتہ انسان کو فنا فی اللہ کے مرتبہ تک پُہنچاتی ہے یہاں تک کہ وہ دیکھتا ہے کہ میرا کچھ بھی اپنا نہیں بلکہ سب کچھ میں خدا سے پاتا ہوں۔ جہاں کہیں یہ طریق کسی نے اختیار کیا وہیں توحید کی خوشبو پہلی دفعہ میں ہی اُس کو پُہنچنے لگتی ہے اور دل اور دماغ کا معطّر ہونا شروع ہوتا جاتا ہے بشرطیکہ قوّتِ شامہ میں کچھ فساد نہ ہو غرض اِس صداقت کے التزام میں طالبِ صادق کو اپنے ہیچ اور بے حقیقت ہونے کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور اللہ جل شانہ کے مُتصرّف مطلق اور مبدء فیوض ہونے پر شہادت دینی پڑتی ہے اور یہ دونوں ایسے امر ہیں کہ جو حق کے طالبوں کا مقصود ہے اور مرتبۂ فنا کے حاصل کرنے کے لیے ایک ضروری شرط ہے اِس ضروری شرط کے سمجھنے کے لیے یہی مثال کافی ہے کہ بارش اگرچہ عالمگیر ہو مگر تاہم اُس پر پڑتی ہے کہ جو بارش کے موقعہ پر آکھڑا ہوتا ہے اسی طرح جو لوگ طلب کرتے ہیں وہی پاتے ہیں اور جو ڈھونڈتے ہیں اُنہیں کو ملتا ہے۔ جو لوگ کسی کام کے شروع کرنے کے وقت اپنے ہنر یا عقل یا طاقت پر بھروسا رکھتے ہیں اور خدائے تعالیٰ پر بھروسہ نہیں رکھتے وہ اُس ذات قادرِ مُطلق کا کہ جو اپنی قیّومی کے ساتھ تمام عالم پر محیط ہے کچھ قدر شناخت نہیں کرتے اور اُن کا ایمان اُس خُشک ٹہنی کی طرح ہوتا ہے کہ جس کو اپنے شاداب اور سرسبز درخت سے کچھ علاقہ نہیں رہا اور جو ایسی خُشک ہوگئی ہے کہ اپنے درخت کی تازگی اور پھول اور پھل سے کچھ بھی حصہ حاصل نہیں کرسکتی صرف ظاہری جوڑ ہے جو ذرا سی جنبش ہوا سے یا کسی اور شخص کے ہلانے سے ٹوٹ سکتا ہے پس ایسا ہی خُشک فلسفیوں کا ایمان ہے کہ جو قیّوم عالم کے سہارے پر نظر نہیں رکھتے اور اُس مبدء فیوض کو جس کا نام اللہ ہے ہریک طرفۃ العین کے لیے اور ہر حال میں اپنا محتاج الیہ قرار نہیں دیتے پس یہ لوگ حقیقی توحید سے ایسے دور پڑے ہوئے ہیں جیسے نور سے ظلمت دور ہے اِنہیں یہ سمجھ ہی نہیں کہ اپنے تئیں ہیچ اور لاشئے سمجھ کر قادرِ مطلق کی طاقتِ عظمیٰ کے نیچے آپڑنا عبودیت کے مراتب کی آخری حد ہے اور توحید کا انتہائی مقام ہے جس سے فنا اتم کا چشمہ جوش مارتا ہے اور انسان اپنے نفس اور اُس کے ارادوں سے بالکل کھویا جاتا ہے اور سچّے دل سے خدا کے تصرف پر ایمان لاتا ہے۔ اِس جگہ اُن خُشک فلسفیوں کے اِس مقولہ کو بھی کچھ چیز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جو کہتے ہیں کہ کسی کام کے شروع کرنے میں استمداد الٰہی کی کیا حاجت ہے خدا نے ہماری فطرت میں پہلے سے طاقتیں ڈال رکھی ہیں پس اُن طاقتوں کے ہوتے ہوئے پھر دوبارہ خدا سے طاقت مانگنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ بے شک یہ بات سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے بعض افعال کے بجالانے کے لیے کچھ کچھ ہم کو طاقتیں بھی دی ہیں مگر پھر بھی اُس قیّوم عالم کی حکومت ہمارے سر پر سے دور نہیں ہوئی اور وہ ہم سے الگ نہیں ہوا اور اپنے سہارے سے ہم کو جدا کرنا نہیں چاہا اور

اپنے فیوض غیر متناہی سے ہم کو محروم کرنا روا نہیں رکھا جو کچھ ہم کو اُس نے دیا ہے وہ ایک امر محدود ہے اور جو کچھ اُس سے مانگا جاتا ہے اُس کی نہایت نہیں علاوہ اِس کے جو کام ہماری طاقت سے باہر ہیں اُن کے حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی ہم کو طاقت نہیں دی گئی اب اگر غور کر کے دیکھو اور ذرا پوری فلسفیت کو کام میں لاؤ تو ظاہر ہوگا کہ کامل طور پر کوئی بھی طاقت ہم کو حاصل نہیں مثلاً ہماری بدنی طاقتیں ہماری تندرستی پر موقوف ہیں اور ہماری تندرستی بہت سے ایسے اسباب پر موقوف ہے کہ کچھ اُن میں سے سماوی اور کچھ ارضی ہیں اور وہ سب کے سب ہماری طاقت سے بالکل باہر ہیں اور یہ تو ہم نے ایک موٹی سی بات عام لوگوں کی سمجھ کے موافق کہی ہے لیکن جس قدر درحقیقت وہ قیوم عالم اپنے علت العلل ہونے کی وجہ سے ہمارے ظاہر اور ہمارے باطن اور ہمارے اول اور ہمارے آخر اور ہمارے فوق اور ہمارے تحت اور ہمارے یمین اور ہمارے یسار اور ہمارے دل اور ہماری جان اور ہماری روح کی تمام طاقتوں پر احاطہ کر رہا ہے وہ ایک ایسا مسئلہ دقیق ہے جس کے کُنہ تک عقولِ بشریہ پہنچ ہی نہیں سکتیں اور اُس کے سمجھانے کی اِس جگہ ضرورت بھی نہیں کیونکہ جس قدر ہم نے اوپر لکھا ہے وہی مخالف کے الزام اور افحام کے لیے کافی ہے غرض قیوم عالم کے فیوض حاصل کرنے کا یہی طریق ہے کہ اپنی ساری قوت اور زور اور طاقت سے اپنا بچاؤ طلب کیا جائے اور یہ طریق کچھ نیا طریق نہیں ہے بلکہ یہ وہی طریق ہے جو قدیم سے بنی آدم کی فطرت کے ساتھ لگا چلا آتا ہے جو شخص عبودیت کے طریقہ پر چلنا چاہتا ہے وہ اسی طریق کو اختیار کرتا ہے اور جو شخص خدا کے فیوض کا طالب ہے وہ اسی راستے پر قدم مارتا ہے اور جو شخص مورد رحمت ہونا چاہتا ہے وہ انہیں قوانینِ قدیمہ کی تعمیل کرتا ہے یہ قوانین کچھ نئے نہیں ہیں یہ عیسائیوں کے خدا کی طرح کچھ مستحدث بات نہیں بلکہ خدا کا یہ ایک قانون محکم ہے کہ جو قدیم سے بندھا ہوا چلا آتا ہے اور سنت اللہ ہے کہ جو ہمیشہ سے جاری ہے جس کی سچائی کثرتِ تجارب سے ہر یک طالبِ صادق پر روشن ہے اور کیونکر روشن نہ ہو ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ہم لوگ کس حالتِ ضُعف اور ناتوانی میں پڑے ہوئے ہیں اور بغیر خدا کی مددوں کے کیسے نکمے اور ناکارہ ہیں اگر ایک ذات متصرّف مُطلق ہر لحظہ اور ہر دم ہماری خبر گیراں نہ ہو اور پھر اُس کی رحمانیت اور رحیمیّت ہماری کارسازی نہ کرے تو ہمارے سارے کام تباہ ہو جائیں بلکہ ہم آپ ہی فنا کا راستہ لیں پس اپنے کاموں کو خصوصاً آسمانی کتاب کو کہ جو سب امورِ عظیمہ سے ادق اور الطف ہے خداوند قادرِ مطلق کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے بہ نیّت تبرک و استمداد شروع کرنا ایک ایسی بدیہی صداقت ہے کہ بلا اختیار ہم اُس کی طرف کھینچے جاتے ہیں. کیونکہ فی الحقیقت ہر یک برکت اسی راہ سے آتی ہے کہ وہ ذات جو متصرّف مُطلق اور علت العلل اور تمام فیوض کا مبدء ہے جس کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں اللہ ہے خود متوجّہ ہو کر اول اپنی صفتِ رحمانیّت کو ظاہر کرے اور جو کچھ قبل از سعی درکار ہے اُس کو محض اپنے تفضّل اور احسان سے بغیر توسّطِ عمل کے ظہور میں لاوے پھر جب وہ صفت رحمانیّت کی اپنے کام کو بہ تمام و کمال کر چکے اور انسان توفیق پا کر اپنی قوتوں

کے ذریعہ سے محنت اور کوشش کا حق بجالاوے تو پھر دوسرا کام اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ اپنی صفت رحیمیت کو ظاہر کرے اور جو کچھ بندہ نے محنت اور کوشش کی ہے اُس پر نیک ثمرہ مترتب کرے اور اُس کی محنتوں کو ضائع ہونے سے بچا کر گوہر مراد عطا فرماوے اسی صفتِ ثانی کی رو سے کہا گیا ہے کہ جو ڈھونڈتا ہے پاتا ہے جو مانگتا ہے اُس کو دیا جاتا ہے جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے واسطے کھولا جاتا ہے یعنی خدائے تعالیٰ اپنی صفت رحیمیت سے کسی کی محنت اور کوشش کو ضائع ہونے نہیں دیتا اور آخر جو بندہ یا بندہ ہو جاتا ہے غرض یہ صداقتیں ایسی بیّن الظہور ہیں کہ ہر یک شخص خود تجربہ کر کے ان کی سچائی کو شناخت کر سکتا ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں کہ بشرط کسی قدر عقلمندی کے یہ بدیہی صداقتیں اُس پر چھپی رہیں ہاں یہ بات اُن عام لوگوں پر نہیں کھلتی کہ جو دلوں کی سختی اور غفلت کی وجہ سے صرف اسبابِ معتادہ پر اُن کی نظر ٹھہری ہوتی ہے اور جو ذات متصرّف فی الاسباب ہے اُس کے تصرّفات لطیفہ پر اُن کو علم حاصل نہیں ہوتا اور نہ اُن کی عقل اس قدر وسیع ہوتی ہے کہ جو اس بات کو سوچ لیں کہ ہزارہا بلکہ بے شمار ایسے اسباب سماوی و ارضی انسان کے ہر یک جسم کی آرایش کے لیے درکار ہیں جن کا بہم پہنچنا ہر گز انسان کے اختیار اور قدرت میں نہیں بلکہ ایک ہی ذات مستجمع صفات کاملہ ہے کہ جو تمام اسباب کو آسمانوں کے اوپر سے زمینوں کے نیچے تک پیدا کرتا ہے اور اُن پر ہر طور تصرف اور قدرت رکھتا ہے مگر جو لوگ عقل مند ہیں وہ اس بات کو بلا تردّد بلکہ بدیہی طور پر سمجھتے ہیں اور جو اُن سے بھی اعلیٰ اور صاحب تجربہ ہیں وہ اس مسئلہ میں حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن یہ شبہ کرنا کہ یہ استعانت بعض اوقات کیوں بفائدہ اور غیر مفید ہوتی ہے اور کیوں خدا کی رحمانیت و رحیمیت ہر یک وقت استعانت میں تجلّی نہیں فرماتی پس یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ اُن دعاؤں کو جو خلوص کے ساتھ کی جائیں ضرور سُنتا ہے اور جس طرح مناسب ہو مدد چاہنے والوں کے لیے مدد بھی کرتا ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کی استمداد اور دعا میں خلوص نہیں ہوتا نہ انسان دلی عاجزی کے ساتھ امدادِ الٰہی چاہتا ہے اور نہ اُس کی روحانی حالت درست ہوتی ہے بلکہ اُس کے ہونٹوں میں دُعا اور اُس کے دل میں غفلت یا ریا ہوتی ہے یا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا اُس کی دُعا کو سُن تو لیتا ہے اور اُس کے لیے جو کچھ اپنی حکمتِ کاملہ کے رو سے مناسب اور اصلح دیکھتا ہے عطا بھی فرماتا ہے لیکن نادان انسان خدا کے اُن الطاف خفیہ کو شناخت نہیں کرتا اور بباعث اپنے جہل اور بے خبری کے شکوہ اور شکایت شروع کر دیتا ہے اور اس آیت کے مضمون کو نہیں سمجھتا عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[1] یعنی یہ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بُری سمجھو اور وہ اصل میں تمہارے لیے اچھی ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو دوست رکھو اور وہ اصل میں تمہارے لیے بُری ہو اور خدا چیزوں کی اصل

[1] البقرۃ - ع - ۲۶ ٭

حقیقت کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اب ہماری اس تمام تقریر سے واضح ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کس قدر عالی شان صداقت ہے جس میں حقیقی توحید اور عبودیت اور خلوص میں ترقی کرنے کا نہایت عمدہ سامان موجود ہے جس کی نظیر کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی اور اگر کسی کے زعم میں پائی جاتی ہے تو وہ اُس صداقت کو معہ تمام دوسری صداقتوں کے جو ہم نیچے لکھتے ہیں نکال کر پیش کرے۔

بسم اللہ پر ایک اعتراض اور اُس کا جواب

اس جگہ بعض کوتاہ اندیش اور نادان دشمنوں نے ایک اعتراض بسم اللہ کی بلاغت پر کیا ہے ان معترضین میں سے ایک صاحب تو پادری عماد الدین نام ہیں جس نے اپنی کتاب ہدایت المسلمین میں اعتراض مندرجہ ذیل لکھا ہے دوسرے صاحب باوا نرائن سنگھ نام وکیل امرتسری ہیں جنہوں نے پادری کے اعتراض کو سچ سمجھ کر اپنے دلی عناد کے تقاضا کی وجہ سے وہی پوچ اعتراض اپنے رسالہ ودیا پرکاشک میں درج کر دیا ہے سو ہم اُس اعتراض کو مع جواب اُس کے کے لکھنا مناسب سمجھتے ہیں "تا منصفین کو معلوم ہو کہ فرط تعصّب نے ہمارے مخالفین کو کس درجہ کی کور باطنی اور نابینائی تک پہنچا دیا ہے کہ جو نہایت درجہ کی روشنی ہے وہ اُن کو تاریکی دکھائی دیتی ہے اور جو اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے وہ اُس کو بدبو تصوّر کرتے ہیں سو اب جاننا چاہیئے کہ جو اعتراض بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بلاغت پر مذکورہ بالا لوگوں نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ الرحمن الرحیم جو بسم اللہ میں واقع ہے یہ فصیح طرز پر نہیں اگر رحیم الرحمن ہوتا تو یہ فصیح اور صحیح طرز تھی کیونکہ خدا کا نام رحمان باعتبار اُس رحمت کے ہے کہ جو اکثر اور عام ہے اور رحیم کا لفظ بہ نسبت رحمان کے اُس رحمت کے لیے آتا ہے کہ جو قلیل اور خاص ہے اور بلاغت کا کام یہ ہے کہ قلت سے کثرت کی طرف انتقال ہو نہ یہ کہ کثرت سے قلت کی طرف یہ اعتراض ہے کہ اُن دونوں صاحبوں نے اپنی آنکھیں بند کر کے اُس کلام پر کیا ہے جس کلام کی بلاغت کو عرب کے تمام اہلِ زبان جن میں بڑے بڑے شاعر بھی تھے باوجود سخت مخالفت کے تسلیم کر چکے ہیں بلکہ بڑے بڑے معاند اس کلام کی شانِ عظیم سے نہایت درجہ تعجّب میں پڑ گئے اور اکثر اُن میں سے کہ جو فصیح اور بلیغ کلام کے اسلوب کو بخوبی جاننے پہچاننے والے اور مذاقِ سخن سے عارف اور با انصاف تھے وہ طرزِ قرآنی کو طاقتِ انسانی سے باہر دیکھ کر ایک معجزہ عظیم یقین کر کے ایمان لے آئے جن کی شہادتیں جا بجا قرآن شریف میں درج ہیں اور جو لوگ سخت کور باطن تھے اگرچہ وہ ایمان نہ لائے مگر سراسیمگی اور حیرانی کی حالت میں اُن کو بھی کہنا پڑا کہ یہ سحر عظیم ہے جس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا چنانچہ اُن کا یہ بیان بھی فرقان مجید کے کئی مقام میں موجود ہے اب اُسی کلام معجز نظام پر ایسے لوگ اعتراض کرنے لگے جن میں سے ایک تو وہ شخص ہے جس کو دو سطریں عربی کی بھی صحیح اور بلیغ طور پر لکھنے کا ملکہ نہیں اور اگر کسی اہلِ زبان سے بات چیت کرنے کا اتّفاق ہوا تو بجز ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط اور غلط فقروں کے کچھ بول نہ سکے اور اگر کسی کو شک ہو تو امتحان کر کے دیکھ لے اور دوسرا وہ شخص ہے جو علم عربی سے بکلّی

بے بہرہ بلکہ فارسی بھی اچھی طرح نہیں جانتا اور افسوس کہ عیسائی مقدم الذکر کو یہ بھی خبر نہیں کہ یورپ کے اہلِ علم کہ جو اُس کے بزرگ اور پیش رو ہیں جن کا پورٹ صاحب وغیرہ انگریزوں نے ذکر کیا ہے وہ خود قرآن شریف کی اعلیٰ درجہ کی بلاغت کے قائل ہیں اور پھر دانا کو زیادہ تر اس بات پر غور کرنی چاہیے کہ جب ایک کتاب جو خود ایک اہلِ زبان پر ہی نازل ہوئی ہے اور اُس کی کمال بلاغت پر تمام اہلِ زبان بلکہ سبعہ معلقہ کے شعراء جیسے اتفاق کر چکے ہیں تو کیا ایسا مسلّم الثبوت کلام کسی نادان اجنبی ژولیدہ زبان والے کے انکار سے جو کہ لیاقت فن سخن سے محض بے نصیب اور توغل علوم عربیہ سے بالکل بے بہرہ بلکہ کسی ادنیٰ عربی آدمی کے مقابلہ پر بولنے سے عاجز ہے قابلِ اعتراض ٹھہر سکتا ہے بلکہ ایسے لوگ جو اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کرتے ہیں خود اپنی نادانی دکھلاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اہلِ زبان کی شہادت کے برخلاف اور بڑے بڑے نامی شاعروں کی گواہی کے مخالف کوئی نکتہ چینی کرنا حقیقت میں اپنی جہالت اور خرفطرتی دکھلانا ہے بھلا عماد الدین پادری کسی عربی آدمی کے مقابلہ پر کسی دینی یا دُنیوی معاملہ میں ذرا ایک آدھ گھنٹہ تک ہم کو بول کر تو دکھا دے تا اول یہی لوگوں پر کھلے کہ اُس کو سیدھی سادی اور بامحاورہ اہلِ عرب کے مذاق پر بات چیت کرنی آتی ہے یا نہیں کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ اُس کو ہرگز نہیں آتی اور ہم بہ یقینِ تمام جانتے ہیں کہ اگر ہم کسی عربی آدمی کو اُس کے سامنے بولنے کے لیے پیش کریں تو وہ عربوں کی طرح اور اُن کے مذاق پر ایک چھوٹا سا قصہ بھی بیان نہ کر سکے اور جہالت کے کیچڑ میں پھنسا رہ جائے اور اگر شک ہے تو اُس کو قسم ہے کہ آزما کر دیکھ لے اور ہم خود اِس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اگر پادری عماد الدین صاحب ہم سے درخواست کریں تو ہم کوئی عربی آدمی بہم پہنچا کر کسی مقررہ تاریخ پر ایک جلسہ کریں گے جس میں چند لائق ہندو ہوں گے اور چند مولوی مسلمان بھی ہوں گے اور عماد الدین صاحب پر لازم ہوگا کہ وہ بھی چند عیسائی بھائی اپنے ساتھ لے آویں اور پھر سب حاضرین کے روبرو اول عماد الدین صاحب کوئی قصہ جو اُسی وقت اُن کو تبلایا جائے گا عربی زبان میں بیان کریں اور پھر وہی قصہ وہ عربی صاحب کہ جو مقابل پر حاضر ہوں گے اپنی زبان میں بیان فرماویں پھر اگر منصفوں نے یہ رائے دے دی کہ عماد الدین صاحب نے ٹھیک ٹھیک عربوں کے مذاق پر عمدہ اور لطیف تقریر کی ہے تو ہم تسلیم کر لیں گے کہ اُن کا اہلِ زبان پر نکتہ چینی کرنا کچھ جائے تعجب نہیں بلکہ اُسی وقت پچاس ۵۰ روپیہ نقد بطور انعام اُن کو دئے جائیں گے لیکن اگر اُس وقت عماد الدین صاحب بجائے فصیح اور بلیغ تقریر کے اپنے ژولیدہ اور غلط بیان کی بدبو پھیلانے لگے یا اپنی رسوائی اور نالیاقتی سے ڈر کر کسی اخبار کے ذریعہ سے یہ اطلاع بھی نہ دی کہ میں ایسے مقابلہ کے لیے حاضر ہوں تو پھر ہم بجز اِس کے کہ لعنت اللہ علی الکاذبین کہیں اور کیا کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر عماد الدین صاحب تولدِ ثانی بھی پاویں تب بھی وہ کسی اہلِ زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتے پھر جس حالت میں وہ عربوں کے سامنے بھی بول نہیں سکتے اور فی الفور گونگا بننے کے لیے طیار رہیں تو پھر اُن عیسائیوں اور آریوں کی ایسی سمجھ پر ہزار حیف اور دو ہزار لعنت ہے کہ جو ایسے نادان کی

تالیف پر اعتماد کرکے اُس بے مثل کتاب کی بلاغت پر اعتراض کرتے ہیں کہ جس نے سید العرب پر نازل ہوکر عرب کے تمام فصیحوں اور بلیغوں سے اپنی عظمت شان کا اقرار کرایا اور جس کے نازل ہونے سے سبعہ معلقہ مکہ کے دروازہ پر سے اُتارا گیا اور معلقہ مذکورہ کے شاعروں میں سے جو شاعر اُس وقت بقید حیات تھا وہ بلا توقف اُس کتاب پر ایمان لایا پھر دوسرا افسوس یہ کہ اس نادان عیسائی کو اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ بلاغت حقیقی اِس امر میں محدود نہیں کہ قلیل کو کثیر پر ہر جگہ اور ہر محل میں خواہ نخواہ مقدم رکھا جائے بلکہ اصل قاعدہ بلاغت کا یہ ہے کہ اپنے کلام کو واقعی صورت اور مناسب وقت کا آئینہ بنایا جاوے سو اس جگہ بھی رحمان کو رحیم پر مقدم کرنے میں کلام کو واقعی صورت اور ترتیب کا آئینہ بنایا گیا ہے چنانچہ اس ترتیب طبعی کا مفصل ذکر ابھی سورۃ فاتحہ کی آیندہ آیتوں میں آوے گا۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۴۷ تا صفحہ ۳۶۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِعْلَمْ وَهَبَ لَكَ اللّٰهُ عِلْمَ اَسْمَاءِهٖ وَهَدَاكَ اِلٰى طُرُقِ مَرْضَاتِهٖ وَسُبُلِ رِضَائِهٖ اَنَّ الْاِسْمَ مُشْتَقٌّ مِّنَ الْوَسْمِ الَّذِیْ هُوَ اَثَرُ الْكَیِّ فِی اللِّسَانِ الْعَرَبِيَّةِ يُقَالُ اتَّسَمَ الرَّجُلُ اِذَا جَعَلَ لِنَفْسِهٖ سِمَةً يُّعْرَفُ بِهَا وَيُمَيَّزُ بِهَا عِنْدَ الْعَامَّةِ. وَمِنْهُ سِمَةُ الْبَعِيْرِ وَوِسَامُهٗ عِنْدَ اَهْلِ اللِّسَانِ. وَهُوَ مَا وُسِمَ بِهِ الْبَعِيْرُ مِنْ ضُرُوْبِ الصُّوَرِ لِيُعِيْنَ لِلْعِرْفَانِ. وَمِنْهُ مَا يُقَالُ اِنِّیْ تَوَسَّمْتُ فِيْهِ الْخَيْرَ وَمَا رَاَيْتُ الضَّيْرَ. اَیْ تَفَرَّسْتُ فَمَا رَاَيْتُ سِمَةَ شَرٍّ فِیْ مُحَيَّاهُ وَلَا اَثَرَ خُبْثٍ فِیْ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے اسماء کا علم عطا فرمائے اور اپنی رضاء اور خوشنودی کی راہوں اور طریقوں پر چلائے۔ جان لیں کہ اسم کا لفظ (جو بسم اللہ میں آیا ہے) وَسْمٌ سے مشتق ہے اور وَسْمٌ عربی زبان میں داغ دینے کے نشان کو کہتے ہیں چنانچہ لغت عرب میں اِتَّسَمَ الرَّجُلُ اُس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص اپنے لیے کوئی ایسی علامت مقرر کرلے جس سے وہ پہچانا جا سکے اور عوام الناس اُسے دوسرے اشخاص سے الگ سمجھ سکیں اور اہل زبان کے نزدیک وَسْمٌ کے لفظ سے ہی سِمَةُ الْبَعِيْرِ اور وِسَامُ الْبَعِيْرِ مشتق ہے جس کے معنے اونٹ پر داغ دے کر کوئی شکل بنانے کے ہیں تا وہ شکل اُس کی شناخت میں ممد ہو۔ اور اسی لفظ وَسْمٌ سے اہل عرب کا یہ محاورہ ہے اِنِّیْ تَوَسَّمْتُ فِيْهِ الْخَيْرَ وَمَا رَاَيْتُ الضَّيْرَ یعنی میں نے اس کے چہرے پر غور کیا اور اس پر کوئی شر کی علامت نہ دیکھی اور نہ ہی میں نے اس کی زندگی میں بدی کا کوئی نشان پایا۔

مُحَيَّاهُ - وَمِنْهُ الْوَسْمِيُّ الَّذِىْ هُوَ اَوَّلُ مَطَرٍ مِّنْ اَمْطَارِ الرَّبِيْعِ - لِاَنَّهٗ يَسِمُ الْاَرْضَ اِذَا نَزَلَ كَالْيَنَابِيْعِ - وَيُقَالُ اَرْضٌ مَّوْسُوْمَةٌ اِذَا اَصَابَهَا الْوَسْمِيُّ فِيْ اِبَّانِهٖ وَسَكَّنَ قُلُوْبَ الْكُفَّارِ بِجَرَيَانِهٖ - وَمِنْهُ مَوْسِمُ الْحَجِّ وَالسُّوْقِ وَجَمِيْعُ مَوَاسِمِ الْاِجْتِمَاعِ لِاَنَّهَا مَعَالِمُ يُجْتَمَعُ اِلَيْهَا لِنَوْعِ غَرَضٍ مِّنَ الْاَنْوَاعِ - وَمِنْهُ الْمِيْسَمُ الَّذِىْ يُطْلَقُ عَلَى الْحُسْنِ وَالْجَمَالِ - وَيُسْتَعْمَلُ فِيْ نِسَآءٍ ذَاتِ مَلَاحَةٍ فِيْ اَكْثَرِ الْاَحْوَالِ - وَقَدْ ثَبَتَ مِنْ تَتَبُّعِ كَلَامِ الْعَرَبِ وَدَوَاوِيْنِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَسْتَعْمِلُوْنَ هٰذَا اللَّفْظَ كَثِيْرًا اِلَّا فِيْ مَوَارِدِ الْخَيْرِ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَدِيْنِهِمْ - وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ اسْمَ الشَّيْءِ عِنْدَ الْعَامَّةِ مَا يُعْرَفُ بِهٖ ذَالِكَ الشَّيْءُ - وَاَمَّا عِنْدَ الْخَوَاصِّ وَاَهْلِ الْمَعْرِفَةِ فَالْاِسْمُ لِاَصْلِ الْحَقِيْقَةِ الْفَيْءُ - بَلْ لَا شَكَّ اَنَّ الْاَسْمَآءَ الْمَنْسُوْبَةَ اِلَى الْمُسَمَّيَاتِ مِنَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ قَدْ نَزَلَتْ مِنْهَا مَنْزِلَةَ الصُّوَرِ النَّوْعِيَّةِ وَصَارَتْ كَوُكُنَاتٍ لِطُيُوْرِ الْمَعَانِيْ وَالْعُلُوْمِ الْحِكَمِيَّةِ - وَكَذَالِكَ اسْمُ اللّٰهِ وَالرَّحْمٰنِ وَالرَّحِيْمِ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ الْمُبَارَكَةِ - فَاِنَّ مَحَلَّ

پھر اسی لفظ وَسْمٌ سے وَسْمِیٌّ کا لفظ نکلا ہے جس کے معنی موسم بہار کی پہلی بارش کے ہیں، کیونکہ جب وہ برستی ہے تو زمین پر پانی بہنے کے نشان بناتی ہے جیسے چشمے اپنے بہنے سے نشان بناتے ہیں۔ اسی طرح اَرْضٌ مَّوْسُوْمَۃٌ زمین کو اُس وقت کہتے ہیں جب اس پر موسم بہار کی پہلی بارش بروقت برسے اور بہہ کر کسانوں کے دلوں کو تسکین دے۔ پھر اسی لفظ وَسْمٌ سے مَوْسِمٌ نکلا ہے جیسے مَوْسِمُ الْحَجِّ ہے اور مَوْسِمُ السُّوْقِ اور دوسرے مَوَاسِم ہیں۔ کیونکہ یہ ایسے مواقع ہیں جن میں کسی نہ کسی مقصد کے لیے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور مِیْسَمٌ کا لفظ بھی وَسْمٌ سے ہی مشتق ہے جس کا اطلاق حسن و جمال پر ہوتا ہے اور اکثر حالتوں میں خوبصورت عورتوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان اور عرب شعراء کے دیوانوں کی چھان بین کرنے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ اس لفظ کو زیادہ تر خیر کے مواقع پر ہی استعمال کرتے تھے، خواہ وہ دنیا کی خیر ہو یا دین کی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ عوام الناس کے نزدیک کسی چیز کا اسم وہ ہوتا ہے جس سے وہ چیز پہچانی جاتی ہے لیکن خواص اور اہل علم کے نزدیک اسم شے کی اصل حقیقت کے لیے بطور ظل کے ہے بلکہ یہ امر یقینی ہے کہ اشیاء کے جو نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں یہ تمام نام ان چیزوں کے لیے ان کی نوعی صورتوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ نام معانی اور علوم حکمیہ کے پرندوں کے لیے بمنزلہ گھونسلوں کے ہیں۔ اور اس بابرکت آیت میں اللہ، رحمان اور رحیم ناموں کا یہی حال ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک

وَاحِدٍ مِّنْهَا يَدُلُّ عَلٰى خَصَآئِصِهٖ وَهُوِيَّتِهِ الْمَكْتُوْمَةِ۔ وَاللّٰهُ اسْمٌ لِّلذَّاتِ الْاِلٰهِيَّةِ الْجَامِعَةِ لِجَمِيْعِ اَنْوَاعِ الْكَمَالِ۔ وَالرَّحْمٰنُ وَالرَّحِيْمُ يَدُلَّانِ عَلٰى تَحَقُّقِ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ لِهٰذَا الْاِسْمِ الْمُسْتَجْمِعِ لِكُلِّ نَوْعِ الْجَمَالِ وَالْجَلَالِ۔ ثُمَّ لِلرَّحْمٰنِ مَعْنًى خَاصٌّ يَّخْتَصُّ بِهٖ وَلَا يُوْجَدُ فِي الرَّحِيْمِ۔ وَهُوَ اَنَّهٗ مُفِيْضٌ لِّوُجُوْدِ الْاِنْسَانِ وَغَيْرِهٖ مِنَ الْحَيَوَانَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ الْكَرِيْمِ۔ بِحَسَبِ مَا اقْتَضَى الْحِكَمُ الْاِلٰهِيَّةُ مِنَ الْقَدِيْمِ وَبِحَسَبِ تَحَمُّلِ الْقَوَابِلِ لَا بِحَسَبِ تَسْوِيَةِ التَّقْسِيْمِ۔ وَلَيْسَ فِيْ هٰذِهِ الصِّفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ دَخْلُ كَسْبٍ وَّعَمَلٍ وَّسَعْيٍ مِّنَ الْقُوَى الْاِنْسَانِيَّةِ اَوِ الْحَيَوَانِيَّةِ۔ بَلْ هِيَ مِنَّةٌ مِّنَ اللّٰهِ خَاصَّةً مَّا سَبَقَهَا عَمَلُ عَامِلٍ۔ وَرَحْمَتُهٗ مِنْ لَّدُنْهُ عَامَّةً مَّا مَسَّهَا اَثَرُ سَعْيٍ مِّنْ نَّاقِصٍ اَوْ كَامِلٍ۔ فَالْحَاصِلُ اَنَّ فَيْضَانَ الصِّفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ لَيْسَ هُوَ نَتِيْجَةَ عَمَلٍ وَّلَا ثَمَرَةَ اسْتِحْقَاقٍ۔ بَلْ هُوَ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ اِطَاعَةٍ اَوْ شِقَاقٍ وَيَنْزِلُ هٰذَا الْفَيْضُ دَآئِمًا بِمَشِيَّةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَاِرَادَةٍ مِّنْ غَيْرِ شَرْطِ اِطَاعَةٍ وَّعِبَادَةٍ وَّتُقَاةٍ وَّزَهَادَةٍ۔ وَكَانَ بِنَآءُ هٰذَا الْفَيْضِ قَبْلَ وُجُوْدِ

اپنے خصائص اور اپنی مخفی ماہیت پر دلالت کرتا ہے اور اللہ اُس ذات الٰہی کا نام ہے جو تمام کمالات کی جامع ہے اور اس جگہ اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِیْم دونوں اسمائے پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ دونوں صفتیں اللہ کے لیے ثابت ہیں جو ہر قسم کے جمال اور جلال کا جامع ہے۔ پھر لفظ اَلرَّحْمٰن کے ایک اپنے بھی خاص معنی ہیں جو اَلرَّحِیْم کے لفظ میں نہیں پائے جاتے اور وہ یہ ہیں کہ اذنِ الٰہی سے صفت اَلرَّحْمٰن کا فیضان انسان اور دوسرے حیوانات کو قدیم زمانہ سے حکمتِ الٰہیہ کے اقتضاء اور جوہر قابل کی قابلیت کے مطابق پہنچ رہا ہے۔ نہ کہ مساوی تقسیم کے طور پر اور اس صفتِ رحمانیت میں انسانوں یا حیوانوں کے قویٰ کے کسب اور عمل اور کوشش کا کوئی دخل نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خالص احسان ہے جس سے پہلے کسی کا کچھ عمل بھی موجود نہیں ہوتا اور یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک عام رحمت ہے جس میں ناقص یا کامل شخص کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ صفتِ رحمانیت کا فیضان کسی عمل کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ کسی استحقاق کا ثمرہ ہے بلکہ یہ ایک خاص فضل ایزدی ہے جس میں فرمانبرداری یا نافرمانی کا دخل نہیں اور یہ فیضان ہمیشہ خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے ماتحت نازل ہوتا ہے۔ اس میں کسی اطاعت، عبادت، تقویٰ اور زہد کی شرط نہیں۔ اس فیض کی بنا مخلوق کی پیدائش اس کے اعمال، اس کی کوشش

الْخَلِيقَةِ وَقَبْلَ اَعْمَالِهِمْ وَقَبْلَ جَهْدِهِمْ وَقَبْلَ سُؤَالِهِمْ۔ فَلِاَجْلِ ذَالِكَ تُوْجَدُ اٰثَارُ هٰذَا الْفَيْضِ قَبْلَ اٰثَارِ وُجُوْدِ الْاِنْسَانِ وَالْحَيْوَانِ وَاِنْ كَانَ سَارِيًا فِيْ جَمِيْعِ مَرَاتِبِ الْوُجُوْدِ وَالزَّمَانِ وَالْمَكَانِ وَالطَّاعَةِ وَالْعِصْيَانِ۔ اَلَا تَرٰى اَنَّ رَحْمَانِيَّةَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَسِعَتِ الصَّالِحِيْنَ وَالظَّالِمِيْنَ۔ وَتَرٰى قَمَرَهٗ وَشَمْسَهٗ يَطْلُعَانِ عَلَى الطَّآئِعِيْنَ وَالْعَاصِيْنَ وَاِنَّهٗ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ وَكَفَّلَ اَمْرَ كُلِّهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَلَوْ كَانَ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرَضِيْنَ۔ وَاِنَّهٗ خَلَقَ لَهُمُ الْاَشْجَارَ وَاَخْرَجَ مِنْهَا الثِّمَارَ وَالزَّهْرَ وَالرَّيَاحِيْنَ۔ وَاِنَّهَا رَحْمَةٌ هَيَّأَهَا اللّٰهُ لِلنُّفُوْسِ قَبْلَ اَنْ يَّبْرَءَهَا وَاِنَّ فِيْهَا تَذْكِرَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ وَقَدْ اَعْطٰى هٰذِهِ النِّعَمَ مِنْ غَيْرِ الْعَمَلِ وَمِنْ غَيْرِ الْاِسْتِحْقَاقِ مِنَ اللّٰهِ الرَّاحِمِ الْخَلَّاقِ۔ وَمِنْهَا نَعْمَاءُ اُخْرٰى مِنْ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَاءِ وَهِيَ خَارِجَةٌ مِّنَ الْاِحْصَاءِ كَمِثْلِ خَلْقِ اَسْبَابِ الصِّحَّةِ وَاَنْوَاعِ الْحِيَلِ وَالدَّوَاءِ لِكُلِّ نَوْعٍ مِّنَ الدَّاءِ وَاِرْسَالِ الرُّسُلِ وَاِنْزَالِ الْكُتُبِ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ۔ وَهٰذِهٖ كُلُّهَا رَحْمَانِيَّةٌ مِّنْ رَّبِّنَا اَرْحَمِ الرُّحَمَاءِ۔

اور اس کے سوال کرنے سے پہلے ہی رکھی گئی ہے۔ اس لیے اس فیض کے آثار انسان اور حیوان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پائے جاتے ہیں اگرچہ یہ فیض تمام مراتب وجود اور زمان و مکان اور حالتِ طاعت و عصیان میں جاری و ساری رہتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت نیکوکاروں اور ظالموں سب پر وسیع ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کا چاند اور اس کا سورج اطاعت گزاروں اور نافرمانوں سبھی پر چڑھتا ہے اور خدا تعالیٰ نے ہر چیز کو اس کے مناسب حال قوٰی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس نے ان سب کے معاملات کا ذمہ لیا ہے اور کوئی بھی جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں اُسی نے ان کے لیے درخت پیدا کیے اور ان درختوں سے پھل پھول اور خوشبوئیں پیدا کیں اور یہ ایسی رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے لیے مہیّا فرمایا۔ اس میں متقیوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔ یہ نعمتیں بغیر کسی عمل اور بغیر کسی حق کے اس بے حد مہربان اور عظیم خالقِ عالم کی طرف سے عطا ہوئی ہیں اور اس عالی بارگاہ سے ایسی ہی اور بھی بہت سی نعمتیں بخشی گئی ہیں جو شمار سے باہر ہیں۔ مثلاً صحت قائم رکھنے کے ذرائع پیدا کرنا اور ہر بیماری کے لیے علاج اور دواؤں کا پیدا کرنا، رسولوں کا مبعوث کرنا اور انبیاء پر کتابوں کا نازل

وَفَضْلُ بَحْتٌ لَّيْسَ مِنْ عَمَلِ عَامِلٍ وَّلَا مِنَ التَّضَرُّعِ وَالدُّعَآءِ۔ وَاَمَّا الرَّحِيْمِيَّةُ فَهِيَ فَيْضٌ اَخَصُّ مِنْ فُيُوْضِ الصِّفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ وَمَخْصُوْصَةٌ بِتَكْمِيْلِ النَّوْعِ الْبَشَرِيِّ وَاِكْمَالِ الْخِلْقَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ وَلٰكِنْ بِشَرْطِ السَّعْيِ وَالْعَمَلِ الصَّالِحِ وَتَرْكِ الْجَذَبَاتِ النَّفْسَانِيَّةِ۔ بَلْ لَّا تَنْزِلُ هٰذِهِ الرَّحْمَةُ حَقَّ نُزُوْلِهَا اِلَّا بَعْدَ الْجُهْدِ الْبَلِيْغِ فِي الْاَعْمَالِ وَبَعْدَ تَزْكِيَةِ النَّفْسِ وَتَكْمِيْلِ الْاِخْلَاصِ بِاِخْرَاجِ بَقَايَا الرِّيَآءِ وَتَطْهِيْرِ الْبَالِ وَبَعْدَ اِيْثَارِ الْمَوْتِ لِابْتِغَاءِ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ذِي الْجَلَالِ۔ فَطُوْبٰى لِمَنْ اَصَابَهٗ حَظٌّ مِّنْ هٰذِهِ النِّعَمِ۔ بَلْ هُوَ الْاِنْسَانُ وَغَيْرُهٗ كَالنَّعَمِ۔

وَهٰهُنَا سُؤَالٌ عُضَالٌ نَّكْتُبُهٗ فِي الْكُتُبِ مَعَ الْجَوَابِ لِيُفَكِّرَ فِيْهِ مَنْ كَانَ مِنْ اُولِي الْاَلْبَابِ۔ وَهُوَ اَنَّ اللّٰهَ اخْتَارَ مِنْ جَمِيْعِ صِفَاتِهٖ صِفَتَيِ الرَّحْمَانِ وَالرَّحِيْمِ فِي الْبَسْمَلَةِ وَمَا ذَكَرَ صِفَةً اُخْرٰى فِي هٰذِهِ الْاٰيَةِ۔ مَعَ اَنَّ اسْمَهُ الْاَعْظَمَ يَسْتَحِقُّ جَمِيْعَ مَا هُوَ مِنَ الصِّفَاتِ الْكَامِلَةِ كَمَا هِيَ مَذْكُوْرَةٌ فِي الصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ۔ ثُمَّ اِنَّ كَثْرَةَ الصِّفَاتِ تَسْتَلْزِمُ كَثْرَةَ الْبَرَكَاتِ

کرنا یہ سب ہمارے رب ارحم الراحمین کی رحمانیت ہے۔ یہ خالص فضل ہے جو کسی کام کرنے والے کے کام یا گریہ وزاری یا دعا کے نتیجہ میں نہیں ہے۔ لیکن رحیمیت وہ فیض الٰہی ہے جو صفت رحمانیت کے فیوض سے خاص تر ہے۔ یہ فیضان نوع انسانی کی تکمیل اور انسانی فطرت کو کمال تک پہنچانے کے لیے مخصوص ہے، لیکن اس کے حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا، عمل صالح بجالانا اور جذبات نفسانیہ کو ترک کرنا شرط ہے۔ یہ رحمت پورے طور پر نازل نہیں ہوتی جب تک اعمال بجالانے میں پوری کوشش نہ کی جائے اور جب تک تزکیہ نفس نہ ہو اور ریا کو کلّی طور پر ترک کرکے خلوص کامل اور طہارت قلب حاصل نہ ہو اور جب تک خدائے ذوالجلال کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر موت کو قبول نہ کرلیا جائے۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں ان نعمتوں سے حصہ ملا۔ بلکہ وہی اصل انسان ہیں اور باقی لوگ تو چارپایوں کی مانند ہیں۔

یہاں ایک مشکل سوال ہے جسے ہم اس جگہ مع جواب لکھتے ہیں تاکہ عقلمند اس میں غور و فکر کرسکیں اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بسم اللہ میں اپنی تمام صفات میں سے صرف دو صفات الرحمٰن اور الرحیم کو ہی اختیار کیا ہے اور کسی اور صفت کا اس آیت میں ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم (یعنی اللہ) تمام ان صفات کاملہ کا مستحق ہے جو مقدس صحیفوں میں مذکور ہیں پھر کثرت صفات تلاوت کے وقت

عِنْدَ التِّلَاوَةِ۔ فَالْبَسْمَلَةُ اَحَقُّ وَاَوْلٰى بِهٰذَا الْمَقَامِ وَالْمَرْتَبَةِ۔ وَقَدْ نُدِبَ لَهَا عِنْدَ كُلِّ اَمْرٍ ذِىْ بَالٍ كَمَا جَآءَ فِى الْاَحَادِيْثِ النَّبَوِيَّةِ۔ وَاِنَّهَا اَكْثَرُ وِرْدًا عَلٰى اَلْسُنِ اَهْلِ الْمِلَّةِ وَاَكْثَرُ تَكْرَارًا فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ ذِى الْعِزَّةِ۔ فَبِاَىِّ حِكْمَةٍ وَّمَصْلَحَةٍ لَّمْ يُكْتَبْ صِفَاتٌ اُخْرٰى مَعَ هٰذِهِ الْاٰيَةِ الْمُتَبَرِّكَةِ۔ فَالْجَوَابُ اَنَّ اللّٰهَ اَرَادَ فِىْ هٰذَا الْمَقَامِ اَنْ يَذْكُرَ مَعَ اسْمِهِ الْاَعْظَمِ صِفَتَيْنِ هُمَا خُلَاصَةُ جَمِيْعِ صِفَاتِهِ الْعَظِيْمَةِ عَلَى الْوَجْهِ التَّآمِّ۔ وَهُمَا الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ كَمَا يَهْدِىْ اِلَيْهِ الْعَقْلُ السَّلِيْمُ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ تَجَلّٰى عَلٰى هٰذَا الْعَالَمِ تَارَةً بِالْمَحْبُوْبِيَّةِ وَمَرَّةً بِالْمُحِبِّيَّةِ۔ وَجَعَلَ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ ضِيَآءً يَّنْزِلُ مِنْ شَمْسِ الرُّبُوْبِيَّةِ عَلٰى اَرْضِ الْعُبُوْدِيَّةِ۔ فَقَدْ يَكُوْنُ الرَّبُّ مَحْبُوْبًا وَّالْعَبْدُ مُحِبًّا لِّذٰلِكَ الْمَحْبُوْبِ۔ وَقَدْ يَكُوْنُ الْعَبْدُ مَحْبُوْبًا وَّالرَّبُّ مُحِبًّا لَّهٗ وَ جَاعِلُهٗ كَالْمَطْلُوْبِ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ الْفِطْرَةَ الْاِنْسَانِيَّةَ الَّتِىْ فُطِرَتْ عَلَى الْمَحَبَّةِ وَالْخُلَّةِ وَلَوْعَةِ الْبَالِ۔ تَقْتَضِىْ اَنْ يَّكُوْنَ لَهَا مَحْبُوْبًا يَّجْذِبُهَا اِلٰى وَجْهِهٖ بِتَجَلِّيَاتِ الْجَمَالِ وَالنِّعَمِ وَالنَّوَالِ۔ وَاَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ مُحِبًّا مُّوَاسِيًا يَّتَدَارَكُ

کثرتِ برکات کو مستلزم ہے پس بسم اللہ کی آیت کریمہ اللہ کی کثرتِ صفات کے بیان کے مقام اور مرتبہ کی زیادہ حقدار اور سزاوار ہے اور حدیث نبوی میں ہر اہم کام شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا مستحسن قرار دیا گیا ہے، نیز یہ آیت مسلمانوں کی زبانوں پر اکثر جاری رہتی ہے۔ اور خدائے عزیز کی کتاب قرآن کریم میں بڑی کثرت سے دہرائی گئی ہے۔ تو پھر کس حکمت اور مصلحت کے ماتحت اس مبارک آیت میں خدا تعالیٰ کی دوسری صفات درج نہیں کی گئیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ارادہ فرمایا کہ اپنے اسم اعظم کے ساتھ انہی دو صفات کا ذکر کرے جو اس کی تمام صفات عظیمہ کا پورا پورا خلاصہ ہیں اور وہ دونوں صفات الرحمٰن اور الرحیم ہیں۔ چنانچہ عقل سلیم بھی اسی کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس دنیا پر کبھی بطور محبوب اور کبھی بطور محبّ تجلّی فرمائی ہے اور اس نے ان دونوں صفات کو ایسی روشنی بنایا ہے جو آفتاب ربوبیت سے عبودیت کی زمین پر نازل ہوتی ہے پس کبھی تو خدا تعالیٰ محبوب بن جاتا ہے اور بندہ اس محبوب کا محبّ اور کبھی بندہ محبوب بن جاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کا محبّ ہوتا ہے اور بندہ کو مطلوب کی طرح بنا لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انسانی فطرت جس میں محبت، دوستی اور سوزِ دل ودیعت کیا گیا ہے چاہتی ہے کہ اس کا کوئی محبوب ہو جو اسے اپنی تجلیات جمالیہ اور نعمتوں اور عطایا سے اپنی طرف کھینچے۔

عِنْدَ الْاَهْوَالِ وَتَشَتُّتِ الْاَحْوَالِ - وَيَحْفَظُهَا مِنْ ضَيْعَةِ الْاَعْمَالِ وَيُوْصِلُهَا اِلَى الْاٰمَالِ - فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يُّعْطِيَهَا مَا اقْتَضَتْهَا وَيُتِمَّ عَلَيْهَا نِعْمَهٗ بِجُوْدِهِ الْعَمِيْمِ - فَتَجَلّٰى عَلَيْهَا بِصِفَتَيْهِ الرَّحْمَانِ وَالرَّحِيْمِ - وَلَا رَيْبَ اَنَّ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ هُمَا الْوُصْلَةُ بَيْنَ الرُّبُوْبِيَّةِ وَالْعُبُوْدِيَّةِ - وَبِهِمَا يَتِمُّ دَآئِرَةُ السُّلُوْكِ وَالْمَعَارِفِ الْاِنْسَانِيَّةِ - فَكُلُّ صِفَةٍ بَعْدَهُمَا دَاخِلَةٌ فِيْ اَنْوَارِهِمَا وَقَطْرَةٌ مِّنْ بِحَارِهِمَا - ثُمَّ اِنَّ ذَاتَ اللّٰهِ تَعَالٰى كَمَا اقْتَضَتْ لِنَفْسِهَا اَنْ تَكُوْنَ لِنَوْعِ الْاِنْسَانِ مَحْبُوْبَةً وَّمُحِبَّةً - كَذَالِكَ اقْتَضَتْ لِعِبَادِهِ الْكُمَّلِ اَنْ يَّكُوْنُوْا لِبَنِيْ نَوْعِهِمْ كَمِثْلِ ذَاتِهٖ خُلُقًا وَّسِيْرَةً - وَّيَجْعَلُوْا هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ لِاَنْفُسِهِمْ لِبَاسًا وَّكِسْوَةً لِّيَتَخَلَّقَ الْعُبُوْدِيَّةُ بِاَخْلَاقِ الرُّبُوْبِيَّةِ - وَلَا يَبْقٰى نَقْصٌ فِي النَّشْاَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ - فَخَلَقَ النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ فَجَعَلَ بَعْضَهُمْ مَظْهَرَ صِفَتِهِ الرَّحْمَانِ وَبَعْضَهُمْ مَظْهَرَ صِفَتِهِ الرَّحِيْمِ - لِيَكُوْنُوْا مَحْبُوْبِيْنَ وَمُحِبِّيْنَ وَيُعَاشِرُوْا بِالتَّحَابُبِ بِفَضْلِهٖ

اور یہ کہ اس کا کوئی ایسا غم خوار دوست ہو جو خوف اور پریشان حالی کے وقت اس کا ساتھ دے وہ اس کے اعمال کو ضائع ہونے سے بچائے اور اس کی امیدوں کو پورا کرے پس خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ جو کچھ انسان کی فطرت تقاضا کرتی ہے وہ اسے عطا کرے اور اپنی وسیع بخشش کے طفیل اس پر اپنی نعمتوں کو پورا کرے۔ سو اُس نے اپنی انہی دو صفات الرحمٰن اور الرحیم کے ساتھ اس پر تجلی فرمائی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں صفات ربوبیت اور عبودیت کے درمیان ایک واسطہ ہیں اور انہی دونوں کے ذریعہ انسانی معرفت اور سلوک کا دائرہ مکمل ہوتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ خدا تعالیٰ کی باقی تمام صفات انہی دو صفتوں کے انوار میں شامل ہیں۔ اور ان سمندروں کا ایک قطرہ ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کی ذات نے جس طرح اپنے لیے چاہا ہے کہ وہ نوعِ انسان کے لیے محبوب اور محبّ بنے اسی طرح اُس نے اپنے کامل بندوں کے لیے چاہا کہ وہ بھی دوسرے بنی نوعِ انسان کے لیے اپنے اخلاق اور سیرت کے لحاظ سے اس کی ذات والاصفات کا پرتو ہوں اور ان دونوں صفات کو اپنا لباس اور پوشش بنا لیں تا عبودیت ربوبیت کے اخلاق کا جامہ پہن لے۔ اور انسان کے (روحانی) نشوونما میں کوئی نقص باقی نہ رہ جائے۔ پس اُس نے انبیاء اور مرسلین کو پیدا کیا اور ان میں سے بعض کو اپنی صفتِ رحمانیت کا اور بعض کو اپنی صفتِ رحیمیت کا مظہر بنایا تاکہ وہ محبوب بھی ہوں اور محبّ بھی اور اس کے فضلِ عظیم کے ساتھ آپس میں محبت سے

الْعَظِيْمِ۔ فَاَعْطٰى بَعْضَهُمْ حَظًّا وَّافِرًا مِّنْ صِفَةِ الْمَحْبُوْبِيَّةِ وَ بَعْضًا اٰخَرَ حَظًّا كَثِيْرًا مِّنْ صِفَةِ الْمُحِبِّيَّةِ۔ وَكَذَالِكَ اَرَادَ بِفَضْلِهِ الْعَمِيْمِ وَ جُوْدِهِ الْقَدِيْمِ۔ وَلَمَّا جَآءَ زَمَنُ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ۔ اَرَادَ هُوَ سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّجْمَعَ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ فِيْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَجَمَعَهُمَا فِيْ نَفْسِهٖ عَلَيْهِ اَلْفُ اَلْفِ صَلٰوةٍ وَّ تَحِيَّةٍ۔ فَلِذَالِكَ ذَكَرَ تَخْصِيْصًا صِفَةَ الْمَحْبُوْبِيَّةِ وَالْمُحِبِّيَّةِ عَلٰى رَأْسِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ۔ لِيَكُوْنَ اِشَارَةً اِلٰى هٰذِهِ الْاِرَادَةِ۔ وَسَمّٰى نَبِيَّنَا مُحَمَّدًا وَّ اَحْمَدَ كَمَا سَمّٰى نَفْسَهُ الرَّحْمَانَ وَالرَّحِيْمَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ۔ فَهٰذِهٖ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّهٗ لَا جَامِعَ لَهُمَا عَلَى الطَّرِيْقَةِ الظِّلِّيَّةِ اِلَّا وُجُوْدُ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْبَرِيَّةِ۔ وَ قَدْ عَرَفْتَ اَنَّ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ اَكْبَرُ الصِّفَاتِ مِنْ صِفَاتِ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ۔ بَلْ هُمَا لُبُّ اللُّبَابِ وَحَقِيْقَةُ الْحَقَائِقِ لِجَمِيْعِ اَسْمَآءِهِ الصِّفَاتِيَّةِ۔ وَهُمَا مِعْيَارُ كَمَالِ كُلِّ مَنِ اسْتَكْمَلَ وَ تَخَلَّقَ بِالْاَخْلَاقِ الْاِلٰهِيَّةِ۔ وَمَا اُعْطِيَ نَصِيْبًا كَامِلًا مِّنْهُمَا اِلَّا نَبِيُّنَا خَاتَمُ سِلْسِلَةِ النُّبُوَّةِ۔

زندگی بسر کریں اُس نے ان میں سے بعض کو محبوبیت کی صفت سے حصّہ وافر عطا فرمایا اور بعض دوسروں کو صفت محبیت کا بہت سا حصّہ دیا۔ اور اسی کا خدا تعالیٰ نے اپنے وسیع فضل اور دائمی کرم سے ارادہ فرمایا۔

اور جب ہمارے آقا سید المرسلین و خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا زمانہ آیا تو اللہ تعالیٰ کی پاک ذات نے ارادہ فرمایا کہ ان دونوں صفات کو ایک ہی شخصیت میں جمع کر دے چنانچہ اُس نے آنحضرت کی ذات میں (آپ پر ہزاروں ہزار درود اور سلام ہو) یہ دونوں صفات جمع کر دیں یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ کے شروع میں صفت محبوبیت اور صفت محبیت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے تا اس سے خدا تعالیٰ کے اس ارادہ کی طرف اشارہ ہو اور اُس نے ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد اور احمد رکھا جیسا کہ اُس نے اس آیت میں اپنا نام الرحمان اور الرحیم رکھا۔ پس یہ بات اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں صفات کا ہمارے آقا فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی جامع وجود نہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ دونوں صفات خدا تعالیٰ کی صفات میں سے سب سے بڑی صفات ہیں۔ بلکہ یہ اس کے تمام صفاتی ناموں کے خلاصوں کا خلاصہ اور حقیقتوں کی نچوڑ ہیں۔ یہ ہر اُس شخص کے کمال کا معیار ہیں جو کمال کا طالب ہے اور اخلاق الٰہیہ کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ پھر ان دونوں صفات میں سے کامل حصّہ صرف ہمارے نبی سلسلہ نبوت کے خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیا گیا ہے کیونکہ آپ کو پروردگار دو عالم کے فضل

فَإِنَّهُ أُعْطِيَ اسْمَيْنِ كَمِثْلِ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ۔ اَوَّلُهُمَا مُحَمَّدٌ وَّ الثَّانِيْ
اَحْمَدُ مِنْ فَضْلِ رَبِّ الْكَوْنَيْنِ۔ اَمَّا مُحَمَّدٌ فَقَدِ ارْتَدٰى رِدَآءَ صِفَةِ
الرَّحْمَانِ۔ وَتَجَلّٰى فِيْ حُلَلِ الْجَلَالِ وَالْمَحْبُوْبِيَّةِ وَحُمِّدَ لِبِرِّمِنَّةٍ وَّالْاِحْسَانِ۔
وَاَمَّا اَحْمَدُ فَتَجَلّٰى فِيْ حُلَّةِ الرَّحِيْمِيَّةِ وَالْمُحِبِّيَّةِ وَالْجَمَالِيَّةِ فَضْلًا مِّنَ
اللّٰهِ الَّذِيْ يَتَوَلَّى الْمُؤْمِنِيْنَ بِالْعَوْنِ وَالنُّصْرَةِ۔ فَصَارَ اسْمَا نَبِيِّنَا بِحِذَآءِ
صِفَتَيْ رَبِّنَا الْمَنَّانِ كَصُوَرٍ مُّنْعَكِسَةٍ تُظْهِرُهَا مِرْاٰتَانِ مُتَقَابِلَتَانِ۔ وَ
تَفْصِيْلُ ذَالِكَ اَنَّ حَقِيْقَةَ صِفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ عِنْدَ اَهْلِ الْعِرْفَانِ هِيَ
اِفَاضَةُ الْخَيْرِ لِكُلِّ ذِيْ رُوْحٍ مِّنَ الْاِنْسَانِ وَغَيْرِ الْاِنْسَانِ مِنْ غَيْرِ
عَمَلٍ سَابِقٍ بَلْ خَالِصًا عَلٰى سَبِيْلِ الْاِمْتِنَانِ۔ وَلَا شَكَّ وَلَا خِلَافَ اَنَّ
مِثْلَ هٰذِهِ الْمِنَّةِ الْخَالِصَةِ الَّتِيْ لَيْسَتْ جَزَآءَ عَمَلِ عَامِلٍ مِّنَ الْبَرِيَّةِ۔
هِيَ تَجْذِبُ قُلُوْبَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِلَى الثَّنَآءِ وَالْمَدْحِ وَالْمَحْمَدَةِ۔ فَيَحْمَدُوْنَ
الْمُحْسِنَ وَيُثْنُوْنَ عَلَيْهِ بِخُلُوْصِ الْقُلُوْبِ وَصِحَّةِ النِّيَّةِ۔ فَيَكُوْنُ
الرَّحْمَانُ مُحَمَّدًا يَقِيْنًا مِّنْ غَيْرِ وَهْمٍ يَجُرُّ اِلَى الرِّيْبَةِ۔ فَاِنَّ الْمُنْعِمَ الَّذِيْ
يُحْسِنُ اِلَى النَّاسِ مِنْ غَيْرِ حَقٍّ بِاَنْوَاعِ النِّعْمَةِ۔ يَحْمَدُهٗ كُلُّ مَنْ اُنْعِمَ

سے ان دونوں صفات کی طرح دونام دیئے گئے ہیں، جن میں سے پہلا محمد ہے اور دوسرا احمد، پس اسم محمد نے صفت الرحمان کی چادر پہنی اور جلال اور محبوبیت کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور اپنی نیکی اور احسان کی بنا پر بار بار تعریف بھی کیا گیا۔ اور اسم احمد نے خداتعالیٰ کے فضل سے جو مومنوں کی مدد اور نصرت کا متولّی ہے رحیمیت، محبیت اور جمال کے لباس میں تجلّی فرمائی۔ پس ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں نام (محمد اور احمد) ہمارے رب محسن کی دونوں صفتوں (الرحمان، الرحیم) کے مقابلہ میں منعکسہ صورتوں کی طرح ہیں جن کو دو مقابل کے آئینے ظاہر کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اہل عرفان کے نزدیک اس صفت رحمانیت کی حقیقت یہ ہے کہ ہر ذی روح کو انسان ہو یا غیر انسان بغیر کسی سابقہ عمل کے محض احسان کے طور پر فیض پہنچایا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں اور نہ کسی اختلاف کی گنجایش ہے کہ اس قسم کا خالص احسان جو مخلوق میں سے کسی کام کرنے والے کے کسی کام کا صلہ نہ ہو مومنوں کے دلوں کو ثناء، مدح اور حمد کی طرف کھینچتا ہے۔ لہذا وہ خلوص قلب اور صحت نیت سے اپنے محسن کی حمد وثناء کرتے ہیں۔ اس طرح بغیر کسی وہم کے جو شک وشبہ میں ڈالے خدائے رحمان یقیناً قابلِ تعریف بن جاتا ہے، کیونکہ ایسے انعام کرنے والی ہستی جو لوگوں پر بغیر ان کے کسی حق کے طرح طرح کے احسان کرے اُس ہستی کی ہر وہ

عَلَيْهِ وَهٰذَا مِنْ خَوَآصِّ النَّشْأَةِ الْإِنْسَانِيَّةِ۔ ثُمَّ إِذَا كَمُلَ الْحَمْدُ بِكَمَالِ الْإِنْعَامِ۔ جَذَبَ ذَالِكَ إِلَى الْحُبِّ التَّآمِّ۔ فَيَكُوْنُ الْمُحْسِنُ مُحَمَّدًا وَّ مَحْبُوْبًا فِيْ أَعْيُنِ الْمُحِبِّيْنَ۔ فَهٰذَا مَآلُ صِفَةِ الرَّحْمَانِ فَفَكِّرْ كَالْعَاقِلِيْنَ۔ وَقَدْ ظَهَرَ مِنْ هٰذَا الْمَقَامِ لِكُلِّ مَنْ لَّهٗ عِرْفَانٌ۔ أَنَّ الرَّحْمَانَ مُحَمَّدٌ وَّ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّحْمَانٌ۔ وَلَا شَكَّ أَنَّ مَآلَهُمَا وَاحِدٌ۔ وَقَدْ جَهِلَ الْحَقَّ مَنْ هُوَ جَاحِدٌ۔ وَأَمَّا حَقِيْقَةُ صِفَةِ الرَّحِيْمِيَّةِ۔ وَمَا أُخْفِيَ فِيْهَا مِنَ الْكَيْفِيَّةِ الرُّوْحَانِيَّةِ۔ فَهِيَ إِفَاضَةُ إِنْعَامٍ وَّخَيْرٍ عَلٰى عَمَلٍ مِّنْ أَهْلِ مَسْجِدٍ لَّا مِنْ أَهْلِ دَيْرٍ وَّتَكْمِيْلُ عَمَلِ الْعَامِلِيْنَ الْمُخْلِصِيْنَ۔ وَجَبْرُ نُقْصَانِهِمْ كَالْمُتَلَافِيْنَ وَالْمُعِيْنِيْنَ وَالنَّاصِرِيْنَ۔ وَلَا شَكَّ أَنَّ هٰذِهِ الْإِفَاضَةَ فِيْ حُكْمِ الْحَمْدِ مِنَ اللّٰهِ الرَّحِيْمِ۔ فَإِنَّهٗ لَا يُنْزِلُ هٰذِهِ الرَّحْمَةَ عَلٰى عَامِلٍ إِلَّا بَعْدَ مَا حَمِدَهٗ عَلٰى نَهْجِهِ الْقَوِيْمِ۔ وَرَضِيَ بِهٖ عَمَلًا وَّرَاٰهُ مُسْتَحِقًّا لِّلْفَضْلِ الْعَمِيْمِ۔ أَلَا تَرٰى أَنَّهٗ لَا يَقْبَلُ عَمَلَ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُرَآئِيْنَ وَالْمُتَكَبِّرِيْنَ۔ بَلْ يُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ إِلَيْهِ وَلَا

شخص حمد کرے گا جس پر انعام واکرام کیا جاتا ہے اور یہ بات انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ پھر جب اتمام نعمت کے باعث حمد اپنے کمال کو پہنچ جائے تو وہ کامل محبت کی جاذب بن جاتی ہے اور ایسا محسن اپنے محبّوں کی نظر میں بہت قابل تعریف اور محبوب بن جاتا ہے اور یہ صفت رحمانیت کا نتیجہ ہے۔ پس آپ عقلمندوں کی طرح ان باتوں پر غور کیجیے۔ اب اس بیان سے ہر صاحب عرفان پر واضح ہو گیا ہے کہ الرحمان بہت حمد کیا گیا ہے اور کامل احمد کیا گیا الرحمان ہے بلاشبہ ان دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اور اس سچائی سے ناواقف ہی اس کا انکار کرنے والا ہے۔ لیکن صفت رحیمیت کی حقیقت اور اسکی مخفی روحانی کیفیت یہ ہے کہ اہل مسجد کے اعمال پر انعام وبرکت کا افاضہ ہو نہ کہ گرجا والوں پر۔ اور مخلص کام کرنے والوں کے اعمال کی تکمیل کی جائے اور تلافی کرنے والوں اور معاونوں اور مددگاروں کی طرح ان کی کوتاہیوں کا تدارک کیا جائے۔ بلاشبہ یہ افاضہ (بندوں پر) خدائے رحیم کی طرف سے ان کی تعریف کے حکم میں ہے، کیونکہ وہ اس طرح کی رحمت کسی عمل کرنے والے پر اُسی وقت نازل کرتا ہے جبکہ بندہ صحیح طریق پر اس کی تعریف کرتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کے عمل پر راضی ہوتا ہے اور اسے اپنے وسیع فضل کا مستحق پاتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ خدا تعالیٰ کافروں، مشرکوں، ریاکاروں اور متکبروں کے اعمال قبول نہیں کرتا، بلکہ ان کے عملوں

يَنصُرُهُم بَلْ يَتْرُكُهُم كَالْمَخذُولِينَ - فَلَا شَكَّ أَنَّهُ لَا يَتُوبُ إِلَى أَحَدٍ بِالرَّحِيمِيَّةِ وَلَا يُكَمِّلُ عَمَلَهُ بِنُصْرَةٍ مِّنْهُ وَالْإِعَانَةِ إِلَّا بَعْدَ مَا رَضِيَ بِهِ فِعْلًا وَّحَمِدَهُ حَمْدًا يَّسْتَلْزِمُ نُزُوْلَ الرَّحْمَةِ - ثُمَّ إِذَا كَمُلَ الْحَمْدُ مِنَ اللهِ بِكَمَالِ أَعْمَالِ الْمُخْلِصِينَ. فَيَكُونُ اللهُ أَحْمَدَ وَالْعَبْدُ مُحَمَّدًا فَسُبْحَانَ اللهِ أَوَّلِ الْمُحَمَّدِينَ وَالْأَحْمَدِينَ وَعِنْدَ ذَالِكَ يَكُوْنُ الْعَبْدُ الْمُخْلِصُ فِي الْعَمَلِ مَحْبُوْبًا فِي الْحَضْرَةِ. فَإِنَّ اللهَ يَحْمَدُهُ مِنْ عَرْشِهِ وَهُوَ لَا يَحْمَدُ أَحَدًا إِلَّا بَعْدَ الْمَحَبَّةِ. فَحَاصِلُ الْكَلَامِ أَنَّ كَمَالَ الرَّحْمَانِيَّةِ يَجْعَلُ اللهَ مُحَمَّدًا وَّمَحْبُوْبًا. وَّيَجْعَلُ الْعَبْدَ أَحْمَدَ وَمُحِبًّا يَّسْتَقْرِيْ مَطْلُوْبًا. وَّكَمَالُ الرَّحِيْمِيَّةِ يَجْعَلُ اللهَ أَحْمَدَ وَمُحِبًّا. وَّيَجْعَلُ الْعَبْدَ مُحَمَّدًا وَّحِبًّا - وَسَتَعْرِفُ مِنْ هٰذَا الْمَقَامِ شَانَ نَبِيِّنَا الْإِمَامِ الْهُمَامِ - فَإِنَّ اللهَ سَمَّاهُ مُحَمَّدًا وَّأَحْمَدَ وَمَا سَمّٰى بِهِمَا عِيْسٰى وَلَا كَلِيْمًا. وَّأَشْرَكَهُ فِيْ صِفَتَيْهِ الرَّحْمٰنِ وَالرَّحِيْمِ بِمَا كَانَ

کو ضائع کر دیتا ہے اور نہ تو اپنی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے اور نہ مدد فرماتا ہے بلکہ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کسی کی طرف اپنی صفت رحیمیت کے ساتھ متوجہ نہیں ہوتا اور نہ کسی کے عمل کو اپنی نصرت اور اعانت سے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے بجز اس کے کہ بندہ عملاً خدا سے راضی ہو اور اس کی ایسی حمد کرے جو نزول رحمت کو مستلزم ہو۔ پھر جب مخلصین کے اعمال کے کامل ہونے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حمد کمال کو پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ احمد بن جاتا ہے اور بندہ محمد بن جاتا ہے پس پاک ہے اللہ جو سب سے پہلا محمد اور سب سے پہلا احمد ہے۔ اور اُس وقت وہ بندہ جو اپنے عمل میں مخلص ہو خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں محبوب بن جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش سے اس کی تعریف کرتا ہے اور وہ کسی کی تعریف صرف اُسی وقت فرماتا ہے جب اُسے اُس سے محبت ہو جائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صفتِ رحمانیت کا کمال اللہ تعالیٰ کو محمد اور محبوب بنا دیتا ہے۔ اور بندہ کو احمد بنا دیتا ہے۔ اور ایسا محبّ جو ہر دم اپنے محبوب کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ صفتِ رحیمیت کا کمال اللہ تعالیٰ کو احمد (بندے کی تعریف کرنے والا) اور محب بناتا ہے اور بندہ کو محمد (قابل تعریف) اور محبوب بناتا ہے۔ اے مخاطب اس بیان سے تو ہمارے امام ہمام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو معلوم کر سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام محمد اور احمد رکھا ہے اور یہ دونوں نام حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کو نہیں دیئے اور خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ان دو صفات

فَضْلُهٗ عَلَيْهِ عَظِيْمًا۔ وَمَا ذَكَرَهَا تَيْنِ الصِّفَتَيْنِ فِي الْبَسْمَلَةِ اِلَّا لِيَعْرِفَ النَّاسُ اَنَّهُمَا لِلّٰهِ كَالْاِسْمِ الْاَعْظَمِ وَلِلنَّبِيِّ مِنْ حَضْرَتِهٖ كَالْخِلْعَةِ۔ فَسَمَّاهُ اللّٰهُ مُحَمَّدًا اِشَارَةً اِلٰى مَا فِيْهِ مِنْ صِفَةِ الْمَحْبُوْبِيَّةِ۔ وَسَمَّاهُ اَحْمَدَ اِيْمَاءً اِلٰى مَا فِيْهِ مِنْ صِفَةِ الْمُحِبِّيَّةِ۔ اَمَّا مُحَمَّدٌ فَلِاَجْلِ اَنَّ رَجُلًا لَّا يَحْمَدُهُ الْحَامِدُوْنَ حَمْدًا كَثِيْرًا اِلَّا بَعْدَ اَنْ يَّكُوْنَ ذَالِكَ الرَّجُلُ مَحْبُوْبًا۔ وَاَمَّا اَحْمَدُ فَلِاَجْلِ اَنَّ حَامِدًا لَّا يَحْمَدُ اَحَدًا بِحَمْدٍ كَاثِرٍ اِلَّا الَّذِيْ يُحِبُّهٗ وَيَجْعَلُهٗ مَطْلُوْبًا۔ فَلَا شَكَّ اَنَّ اسْمَ مُحَمَّدٍ يُّوْجَدُ فِيْهِ مَعْنَى الْمَحْبُوْبِيَّةِ بِدَلَالَةِ الْاِلْتِزَامِ۔ وَكَذَالِكَ يُوْجَدُ فِي اسْمِ اَحْمَدَ مَعْنَى الْمُحِبِّيَّةِ مِنَ اللّٰهِ ذِي الْاِفْضَالِ وَالْاِنْعَامِ۔ وَلَا رَيْبَ اَنَّ نَبِيَّنَا سُمِّيَ مُحَمَّدًا لِمَا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَهٗ مَحْبُوْبًا فِيْ اَعْيُنِهٖ وَاَعْيُنِ الصَّالِحِيْنَ۔ وَكَذَالِكَ سَمَّاهُ اَحْمَدَ لِمَا اَرَادَ سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّجْعَلَهٗ مُحِبَّ ذَاتِهٖ وَمُحِبَّ الْمُؤْمِنِيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ فَهُوَ مُحَمَّدٌ بِشَاْنٍ وَّاَحْمَدُ بِشَاْنٍ وَّاخْتُصَّ اَحَدُ هٰذَيْنِ الْاِسْمَيْنِ بِزَمَانٍ وَّالْاٰخَرُ بِزَمَانٍ۔ وَقَدْ

رحمان اور رحیم میں (ظلی طور پر) شریک کیا ہے کیونکہ آپ پر اس کا بڑا افضل تھا اور اُس نے ان دونوں صفات کو بسم اللہ میں صرف اس لیے بیان کیا ہے تا لوگ سمجھ لیں کہ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کے لیے اسم اعظم کے طور پر ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بارگاہ ایزدی سے خلعت کے طور پر ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام محمد رکھا تا کہ اُس سے آپ کی صفت محبوبیت کی طرف اشارہ کرے اور آپ کا نام احمد اس لیے رکھا کہ آپ کی صفت محبیت کی طرف اشارہ ہو۔ محمد نام اس لیے ہے کہ لوگ کسی شخص کی زیادہ تعریف تبھی کرتے ہیں جب وہ ان کے نزدیک محبوب ہوا اور احمد نام اس لیے ہے کہ کوئی شخص کسی کی زیادہ تعریف نہیں کرتا بجز اُس شخص کے جس سے وہ محبت کرتا اور اُسے مطلوب بنا لیتا ہو۔ اور یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ اسم محمد میں بدلالت التزامی محبوبیت کے معنے پائے جاتے ہیں اسی طرح اسم احمد میں خدا تعالیٰ صاحب فضل و انعام کی طرف سے معنے محبیت پائے جاتے ہیں۔ پس بلاشبہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس لیے محمد رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا کہ آپ کو اپنی نگاہ میں بھی اور صالح لوگوں کی نظر میں بھی محبوب بنائے۔ اور ایسا ہی آپ کا نام احمد اس لیے رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات اور مومن مسلمانوں سے محبت کرنے والے ہوں۔ پس آپ ایک پہلو سے محمد ہیں اور ایک پہلو سے احمد ہیں۔ اور ان دونوں ناموں میں سے (ظہور کامل کے لحاظ سے) ایک نام کو ایک زمانہ سے مخصوص

اَشَارَ اِلَیْهِ سُبْحَانَهٗ فِیْ قَوْلِهٖ "دَنٰی فَتَدَلّٰی" وَفِیْ "قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی"۔ ثُمَّ لَمَّا کَانَ یُظَنُّ اَنَّ اخْتِصَاصَ ھٰذَا النَّبِیِّ الْمُطَاعِ السَّجَّادِ۔ بِھٰذِہِ الْمَحَامِدِ مِنْ رَّبِّ الْعِبَادِ۔ یَجُرُّ اِلَی الشِّرْکِ کَمَا عُبِدَ عِیْسٰی لِھٰذَا الْاِعْتِقَادِ۔ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یُّوْرِثَھُمَا الْاُمَّۃَ الْمَرْحُوْمَۃَ عَلَی الطَّرِیْقَۃِ الظِّلِّیَّۃِ لِیَکُوْنَا لِلْاُمَّۃِ کَالْبَرَکَاتِ الْمُتَعَدِّیَۃِ۔ وَلِیَزُوْلَ وَھْمُ اشْتِرَاکِ عَبْدٍ خَاصٍّ فِی الصِّفَاتِ الْاِلٰھِیَّۃِ۔ فَجَعَلَ الصَّحَابَۃَ وَ مَنْ تَبِعَھُمْ مَظْھَرَ اسْمِ مُحَمَّدٍ بِالشُّئُوْنِ الرَّحْمَانِیَّۃِ الْجَلَالِیَّۃِ۔ وَ جَعَلَ لَھُمْ غَلَبَۃً وَّ نَصَرَھُمْ بِالْعِنَایَاتِ الْمُتَوَالِیَۃِ۔ وَجَعَلَ الْمَسِیْحَ الْمَوْعُوْدَ مَظْھَرَ اسْمِ اَحْمَدَ وَبَعَثَہٗ بِالشُّئُوْنِ الرَّحِیْمِیَّۃِ الْجَمَالِیَّۃِ۔ وَکَتَبَ فِیْ قَلْبِہِ الرَّحْمَۃَ وَالتَّحَنُّنَ وَھَذَّبَہٗ بِالْاَخْلَاقِ الْفَاضِلَۃِ الْعَالِیَۃِ۔ فَذَالِکَ ھُوَالْمَھْدِیُّ الْمَعْھُوْدُ الَّذِیْ فِیْہِ یَخْتَصِمُوْنَ۔ وَقَدْ رَءَوُا الْاٰیَاتِ ثُمَّ لَا یَھْتَدُوْنَ۔ وَیُصِرُّوْنَ عَلَی الْبَاطِلِ وَاِلَی الْحَقِّ لَا یَرْجِعُوْنَ۔

کیا گیا اور دوسرے نام کو دوسرے زمانہ سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیت دَنٰی فَتَدَلّٰی[1] اور آیت قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[2] میں اسی (محبوبیت اور محبیت کے مضمون) کی طرف اشارہ کیا ہے پھر چونکہ یہ گمان پیدا ہو سکتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو لوگوں کے مطاع اور اللہ تعالیٰ کے بہت عبادت گزار ہیں پروردگار عالم کا ان دو صفات سے متصف کرنا لوگوں کو شرک کی طرف مائل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ایسے ہی اعتقاد کی بنا پر حضرت عیسیٰؑ کو معبود بنا لیا گیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ وہ امتِ مرحومہ کو بھی (علی حسب مراتب) ظلّی طور پر ان دونوں صفات کا وارث بنا دے۔ تا یہ دونوں نام امت کے لیے برکات جاریہ کا موجب بنیں۔ اور تا صفات الٰہیہ میں کسی خاص بندہ کے شریک ہونے کا وہم بھی دور ہو جائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے صحابہ اور بعد آنے والے مسلمانوں کو رحمانی اور جلالی شان کی بنا پر اسم محمد کا مظہر بنایا اور انہیں غلبہ عطا فرمایا۔ اور متواتر عنایات سے ان کی مدد کی اور مسیح موعود کو اسم احمد کا مظہر بنایا اور اُسے رحیمی اور جمالی صفات کے ساتھ مبعوث فرمایا اور اس کے دل میں رحمت اور شفقت رکھدی اور اُسے بلند اخلاق فاضلہ کے ساتھ آراستہ کیا۔ اور یہ وہی مہدی معہود ہے جس کے بارے میں لوگ جھگڑتے ہیں اور جس کی صداقت کے نشانات دیکھ کر بھی سچائی کو قبول نہیں کرتے اور باطل پر اصرار کرتے ہیں اور حق کی طرف رجوع نہیں کرتے

---

[1] و [2] النجم: ۸ اور ۹

وَذٰلِكَ هُوَ الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ وَلٰكِنَّهُمْ لَا يَعْرِفُوْنَ وَ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ - فَاِنَّ اسْمَ عِيْسٰى وَاسْمَ اَحْمَدَ مُتَّحِدَانِ فِي الْهُوِيَّةِ - وَمُتَوَافِقَانِ فِي الطَّبِيْعَةِ - وَيَدُلَّانِ عَلَى الْجَمَالِ وَتَرْكِ الْقِتَالِ مِنْ حَيْثُ الْكَيْفِيَّةِ - وَ اَمَّا اسْمُ مُحَمَّدٍ فَهُوَ اسْمُ الْقَهْرِ وَالْجَلَالِ - وَكِلَاهُمَا لِلرَّحْمَانِ وَالرَّحِيْمِ كَالْاَظْلَالِ - اَلَا تَرٰى اَنَّ اسْمَ الرَّحْمَانِ الَّذِيْ هُوَ مَنْبَعٌ لِّلْحَقِيْقَةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ - يَقْتَضِي الْجَلَالَ كَمَا يَقْتَضِيْ شَانَ الْمَحْبُوْبِيَّةِ - وَمِنْ رَّحْمَانِيَّتِهٖ تَعَالٰى اَنَّهٗ سَخَّرَ كُلَّ حَيْوَانٍ لِّلْاِنْسَانِ - مِنَ الْبَقَرِ وَ الْمَعْزِ وَالْجِمَالِ وَالْبِغَالِ وَالضَّانِ - وَاَنَّهٗ اَهْرَقَ دِمَاءً كَثِيْرَةً لِّحِفْظِ نَفْسِ الْاِنْسَانِ - وَمَا هُوَ اِلَّا اَمْرٌ جَلَالِيٌّ وَّنَتِيْجَةُ رَحْمَانِيَّةِ الرَّحْمَانِ - فَثَبَتَ اَنَّ الرَّحْمَانِيَّةَ يَقْتَضِي الْقَهْرَ وَالْجَلَالَ - وَمَعَ ذٰلِكَ هُوَ مِنَ الْمَحْبُوْبِ لُطْفٌ لِّمَنْ اَرَادَ لَهُ النَّوَالَ - وَكَمْ مِّنْ دُوْدِ الْمِيَاهِ وَالْاَهْوِيَةِ تُقْتَلُ لِلْاِنْسَانِ - وَكَمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ تُذْبَحُ لِلنَّاسِ اِنْعَامًا مِّنَ الرَّحْمَانِ وَخُلَاصَةُ الْكَلَامِ اَنَّ الصَّحَابَةَ كَانُوْا مَظَاهِرَ لِلْحَقِيْقَةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ

یہ وہی مسیح موعود ہے لیکن لوگ اسے نہیں پہچانتے۔ اور ظاہری آنکھوں سے تو اسے دیکھتے ہیں لیکن بصیرت کی آنکھ سے نہیں دیکھتے کیونکہ اسم عیسیٰ اور اسم احمد اپنی ماہیت میں ایک ہی ہیں اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں اور اپنی کیفیت کے لحاظ سے یہ نام جمال اور ترک قتال پر دلالت کرتے ہیں، لیکن اسم محمدؐ قہر اور جلال کا نام ہے اور یہ ہر دو نام محمدؐ اور احمدؐ رحمان و رحیم کے لیے بطور ظلّ کے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ رحمان نام جو حقیقت محمدیہ کا منبع ہے جلال کا ویسے ہی تقاضا کرتا ہے جیسے کہ وہ شان محبوبیت کو چاہتا ہے اور یہ امر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے انسان کے لیے گائیوں، بکریوں، اونٹوں، خچروں، بھیڑوں اور دوسرے تمام جانوروں کو مسخّر کر دیا۔ اور انسانی جان کی حفاظت کے لیے بہت سے خون گرانے روا رکھے۔ یہ امر صرف ایک جلالی معاملہ اور خدائے رحمان کی رحمانیت کا ہی نتیجہ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ رحمانیت قہر اور جلال کا تقاضا کرتی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ محبوب کی طرف سے اُس شخص کے لیے جس پر وہ نوازش کرنا چاہے مہربانی بن جاتی ہے۔ (دیکھو، پانی اور ہوا کے بہت سے کیڑے انسان کی خاطر مار دیئے جاتے ہیں، بہت سے چوپائے انسان کے لیے خدائے رحمان کی طرف سے بطور انعام ذبح کیے جاتے ہیں۔ پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام حقیقتِ محمدیہ جلالیہ کے مظاہر تھے، اسی لیے انہیں ان لوگوں کو قتل کرنا پڑا جو درندوں

الْجَلَالِيَّةِ - وَلِذَالِكَ قَتَلُوْا قَوْمًا كَانُوْا كَالسِّبَاعِ وَنَعَمِ الْبَادِيَةِ لِيُخَلِّصُوْا فَوْمًا اٰخَرِيْنَ مِنْ سِجْنِ الضَّلَالَةِ وَالْغَوَايَةِ - وَيَجُرُّوْهُمْ اِلَى الصَّلَاحِ وَالْهِدَايَةِ - وَقَدْ عَرَفْتَ اَنَّ الْحَقِيْقَةَ الْمُحَمَّدِيَّةَ هُوَ مَظْهَرُ الْحَقِيْقَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ - وَلَا مُنَافَاةَ بَيْنَ الْجَلَالِ وَهٰذِهِ الصِّفَةِ الْاِحْسَانِيَّةِ - بَلِ الرَّحْمَانِيَّةُ مَظْهَرٌ تَامٌّ لِّلْجَلَالِ وَالسَّطْوَةِ الرَّبَّانِيَّةِ وَهَلْ حَقِيْقَةُ الرَّحْمَانِيَّةِ اِلَّا قَتْلُ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى لِلَّذِيْ هُوَ اَعْلٰى - وَكَذَالِكَ جَرَتْ عَادَةُ الرَّحْمٰنِ مُذْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَمَا وَرَآءَهُ مِنَ الْوَرٰى - اَلَا تَرٰى كَيْفَ تُقْتَلُ دُوْدُ جُرْحِ الْاِبِلِ لِحِفْظِ نُفُوْسِ الْجِمَالِ - وَتُقْتَلُ الْجِمَالُ لِيَنْتَفِعَ النَّاسُ مِنْ لُحُوْمِهَا وَجُلُوْدِهَا وَيَتَّخِذُوْا مِنْ اَوْبَارِهَا ثِيَابَ الزِّيْنَةِ وَالْجَمَالِ - وَهٰذِهٖ كُلُّهَا مِنَ الرَّحْمَانِيَّةِ لِحِفْظِ سِلْسِلَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ وَالْحَيَوَانِيَّةِ فَكَمَا اَنَّ الرَّحْمَانَ مَحْبُوْبٌ كَذَالِكَ هُوَ مَظْهَرُ الْجَلَالِ وَكَمِثْلِهٖ اسْمُ مُحَمَّدٍ فِيْ هٰذَا الْكَمَالِ - ثُمَّ لَمَّا وَرِثَ الْاَصْحَابُ اسْمَ مُحَمَّدٍ مِّنَ اللّٰهِ الْوَهَّابِ - وَاَظْهَرُوْا جَلَالَ اللّٰهِ وَقَتَلُوا الظَّالِمِيْنَ كَالْاَنْعَامِ وَالدَّوَآبِّ - كَذَالِكَ وَرِثَ الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ اسْمَ اَحْمَدَ الَّذِيْ هُوَ مَظْهَرُ

اور جنگلی چوپایوں کی طرح تھے۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو گمراہی اور کجروی کے قیدخانہ سے نجات دیکر صلاح و ہدایت کی طرف لے آئیں۔ آپ جان چکے ہیں کہ حقیقتِ محمدیہ حقیقتِ رحمانیہ کی مظہر ہے۔ اور جلال اور اس صفت احسان کے درمیان کوئی مغایرت نہیں بلکہ صفت رحمانیت جلال اور ربانی دبدبہ کی مظہر کامل ہے۔ صفتِ رحمانیت کی حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے لیے قربان کیا جائے۔ انسان اور اس کے علاوہ دوسری مخلوق کی پیدائش کے وقت سے خدائے رحمان کی یہی سنت جاری ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اونٹوں کی جانوں کی حفاظت کے لیے ان کے زخموں کے کیڑے کس طرح ہلاک کیے جاتے ہیں اور اونٹوں کو اس لیے ذبح کیا جاتا ہے تا لوگ ان کے گوشت اور چمڑوں سے فائدہ اٹھائیں اور زیب و زینت کے لیے ان کے بالوں سے لباس بنائیں۔ یہ سب کچھ نوعِ انسان اور جنس حیوان کی حفاظت کے لیے صفتِ رحمانیت کے ذریعہ ہی کیا جا رہا ہے۔ پس جس طرح رحمان محبوب ہے ویسے ہی وہ مظہر جلال بھی ہے اور اس وصف میں اسم محمد بھی اسی صفت رحمانیت کی مانند ہے پھر جب صحابہ کرام خدائے بخشندہ کی طرف سے اسم محمد کے وارث ہوئے اور انہوں نے جلال الٰہی کو ظاہر کیا اور ظالموں کو چوپایوں اور مویشیوں کی طرح قتل کیا اسی طرح مسیح موعود اسم احمد کا وارث ہوا۔ جو مظہر رحیمیت و جمال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ نام

الرَّحِيْمِيَّةِ وَالْجَمَالِ - وَاخْتَارَ لَهُ اللّٰهُ هٰذَا الْاِسْمَ وَلِمَنْ تَبِعَهُ وَصَارَ لَهُ كَالْاٰلِ - فَالْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ مَعَ جَمَاعَتِهٖ مَظْهَرٌ مِّنَ اللّٰهِ لِصِفَةِ الرَّحِيْمِيَّةِ وَالْاَحْمَدِيَّةِ - لِيَتِمَّ قَوْلُهٗ "وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ" وَلَا رَآدَّ لِلْاِرَادَاتِ الرَّبَّانِيَّةِ وَلِيَتِمَّ حَقِيْقَةُ الْمَظَاهِرِ النَّبَوِيَّةِ - وَهٰذَا هُوَ وَجْهُ تَخْصِيْصِ صِفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ بِالْبَسْمَلَةِ - لِيَدُلَّ عَلٰى اسْمَیْ مُحَمَّدٍ وَّاَحْمَدَ وَ مَظَاهِرِهِمَا الْاٰتِيَةِ - اَعْنِی الصَّحَابَةَ وَمَسِيْحَ اللّٰهِ الَّذِیْ كَانَ اٰتِيًا فِیْ حُلَلِ الرَّحِيْمِيَّةِ وَ الْاَحْمَدِيَّةِ - ثُمَّ نُكَرِّرُ خُلَاصَةَ الْكَلَامِ فِیْ تَفْسِيْرِ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" - فَاعْلَمْ اَنَّ اسْمَ اللّٰهِ اسْمٌ جَامِدٌ لَّا يَعْلَمُ مَعْنَاهُ اِلَّا الْخَبِيْرُ الْعَلِيْمُ وَقَدْ اَخْبَرَ عَزَّ اسْمُهٗ بِحَقِيْقَةِ هٰذَا الْاِسْمِ فِیْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ - وَاَشَارَ اِلٰی اَنَّهٗ ذَاتٌ مُّتَّصِفَةٌ بِالرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ - اَیْ مُتَّصِفَةٌ بِرَحْمَةِ الْاِمْتِنَانِ وَرَحْمَةٍ مُّقَيَّدَةٍ بِالْحَالَةِ الْاِيْمَانِيَّةِ - وَهَاتَانِ رَحْمَتَانِ كَمَآءٍ اَصْفٰی وَغِذَاءٍ اَحْلٰی مِنْ مَّنْبَعِ الرُّبُوْبِيَّةِ - وَكُلُّ مَا هُوَ دُوْنَهُمَا مِنْ صِفَاتٍ فَهُوَ كَشُعَبٍ

اس کے لیے اور اس کے متبعین کے لیے جو اس کی آل کی طرح بن گئے اختیار کیا۔ پس مسیح موعود اپنی جماعت سمیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی صفتِ رحیمیت اور احمدیت کا مظہر ہے۔ تا خدا کا قول وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ[1] پورا ہو (یعنی صحابہ جیسی ایک اور قوم بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملی) اور الٰہی ارادوں کو پورا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ نیز رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مظاہر پیدا ہونے کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے۔ صفتِ رحمانیت و رحیمیت کو بسم اللہ کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہی وجہ ہے تا وہ محمد و احمد دونوں ناموں پر اور ان دونوں کے آیندہ آنے والے مظاہر پر دلالت کرے یعنی صحابہ اور مسیح موعود پر جو رحیمیت اور احمدیت کے لباس میں آنے والے تھے۔

اب ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر کا خلاصہ دوبارہ بیان کرتے ہیں۔ پس واضح ہو کہ اللہ کا لفظ اسم جامد ہے اور اس کے معنے سوائے خدائے خبیر و علیم کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور اللہ تعالیٰ عزّ اسمہ نے اس آیت میں اس اسم کی حقیقت بتائی ہے اور اشارہ کیا ہے کہ اللہ اس ذات کا نام ہے جو رحمانیت اور رحیمیت کی صفات سے متصف ہے یعنی (بلا استحقاق) احسان والی رحمت اور ایمانی حالت سے وابستہ رحمت ہر دو رحمتوں سے (وہ ذات) متصف ہے۔ یہ دونوں رحمتیں صاف پانی اور شیریں غذا کی مانند ہیں جو ربوبیت کے چشمہ سے نکلتی ہیں اور ان دونوں کے علاوہ باقی تمام صفات ان دو صفات کے لیے بمنزلہ شاخوں کے ہیں

---

[1] الجمعة: ۴

لِهٰذِهِ الصِّفَاتِ۔ وَالْاَصْلُ رَحْمَانِيَّةٌ وَّرَحِيْمِيَّةٌ وَّهُمَا مَظْهَرُ سِرِّ الذَّاتِ۔ ثُمَّ اُعْطِيَ مِنْهُمَا نَصِيْبٌ كَامِلٌ لِّنَبِيِّنَا اِمَامِ النَّهْجِ الْقَوِيْمِ فَجُعِلَ اسْمُهُ مُحَمَّدٌ ظِلَّ الرَّحْمَانِ وَاسْمُهُ اَحْمَدُ ظِلَّ الرَّحِيْمِ۔ وَالسِّرُّ فِيْهِ اَنَّ الْاِنْسَانَ الْكَامِلَ لَا يَكُوْنُ كَامِلًا اِلَّا بَعْدَ التَّخَلُّقِ بِالْاَخْلَاقِ الْاِلٰهِيَّةِ وَ صِفَاتِ الرُّبُوْبِيَّةِ۔ وَقَدْ عَلِمْتَ اَنَّ اَمْرَ الصِّفَاتِ كُلِّهَا تَئُوْلُ اِلَى الرَّحْمَتَيْنِ اللَّتَيْنِ سَمَّيْنَاهُمَا بِالرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ۔ وَعَلِمْتَ اَنَّ الرَّحْمَانِيَّةَ رَحْمَةٌ مُّطْلَقَةٌ عَلٰى سَبِيْلِ الْاِمْتِنَانِ۔ وَيَرِدُ فَيْضَانُهَا عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَّ كَافِرٍ بَلْ كُلِّ نَوْعِ الْحَيَوَانِ۔ وَاَمَّا الرَّحِيْمِيَّةُ فَهِيَ رَحْمَةٌ وُّجُوْبِيَّةٌ مِّنَ اللّٰهِ اَحْسَنِ الْخَالِقِيْنَ۔ وَجَبَتْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ خَاصَّةً مِّنْ دُوْنِ حَيَوَانَاتٍ اُخْرٰى وَالْكَافِرِيْنَ۔ فَلَزِمَ اَنْ يَّكُوْنَ الْاِنْسَانُ الْكَامِلُ اَعْنِيْ مُحَمَّدًا مَّظْهَرَ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ۔ فَلِذَالِكَ سُمِّيَ مُحَمَّدًا وَّاَحْمَدَ مِنْ رَّبِّ الْكَوْنَيْنِ۔ وَقَالَ اللّٰهُ فِيْ شَانِهٖ " لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ[۱]"

اور اصل رحمانیت اور رحیمیت ہی ہے ۔ اور یہ دونوں صفات ذات الٰہی کے بھید کی مظہر ہیں ۔ پھر ان دونوں صفات سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صراط مستقیم کے امام ہیں کامل حصّہ عطا کیا گیا ۔ پس آپ کا نام محمد بطور رحمان کے ظلّ کے اور احمد نام بطور رحیم کے ظل کے رکھا گیا ۔ اور اس میں یہ راز ہے کہ کامل انسان الٰہی اخلاق اور ربّانی صفات کے رنگ میں رنگین ہونے کے بعد ہی کامل ہوتا ہے اور آپ جان چکے ہیں کہ تمام صفات کا مآل یہی دو رحمتیں ہیں جن کا نام ہم نے رحمانیت اور رحیمیت رکھا ہے ۔ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ رحمانیت ایک عام رحمت ہے جو بطور احسان ہوتی ہے اور اس کا فیضان ہر مومن ، کافر بلکہ ہر نوع حیوان کو پہنچتا ہے لیکن رحیمیت خدائے احسن الخالقین کی طرف سے ایک رحمت ہے ، جو جانوروں اور کافروں کے علاوہ بالضرور صرف مومنوں سے مختص ہے ۔ پس لازم ہوا کہ انسان کامل یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں صفات کے مظہر ہوتے ۔ اسی لیے پروردگار عالم کی طرف سے آپ کا نام محمد اور احمد رکھا گیا ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی شان میں فرماتا ہے :۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔[۲]

---

[۱] توبہ رکوع ۱۶ ۔ [۲] ترجمہ : (اے مومنو!) تمہارے پاس تمہاری ہی قوم کا ایک فرد رسول ہو کر آیا ہے تمہارا تکلیف میں پڑنا اس پر شاق گذرتا ہے اور وہ تمہارے لیے خیر کا بھوکا ہے اور مومنوں کے ساتھ بہت محبت کرنے والا اور کرم کرنے والا ہے ۔

فَاَشَارَ اللّٰهُ فِیْ قَوْلِهٖ "عَزِیْزٌ" وَفِیْ قَوْلِهٖ "حَرِیْصٌ" اِلٰی اَنَّهٗ عَلَیْهِ السَّلَامُ مَظْهَرُ صِفَتِهِ الرَّحْمَانِ بِفَضْلِهِ الْعَظِیْمِ ـ لِاَنَّهٗ رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِیْنَ کُلِّهِمْ وَلِنَوْعِ الْاِنْسَانِ وَالْحَیْوَانِ وَاَهْلِ الْکُفْرِ وَالْاِیْمَانِ ـ ثُمَّ قَالَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ "رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" فَجَعَلَهٗ رَحْمَانًا وَّرَحِیْمًا کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْفَهِیْمِ ـ وَحَمِدَهٗ وَعَزَا اِلَیْهِ خُلُقًا عَظِیْمًا مِّنَ التَّفْخِیْمِ وَالتَّکْرِیْمِ ـ کَمَا جَآءَ فِی الْقُرْاٰنِ الْکَرِیْمِ ـ وَاِنْ سَئَلْتَ مَا خُلُقُهُ الْعَظِیْمُ ـ فَنَقُوْلُ اِنَّهٗ رَحْمَانٌ وَّرَحِیْمٌ ـ وَّمُنِحَ هُوَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ هٰذَیْنِ النُّوْرَیْنِ وَاٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ ـ وَکَانَ هُوَ نَبِیًّا وَّمَا کَانَ لِاٰدَمَ اَثَرٌ مِّنَ الْوُجُوْدِ وَلَا مِنَ الْاَدِیْمِ ـ وَکَانَ اللّٰهُ نُوْرًا فَقَضٰی اَنْ یَّخْلُقَ نُوْرًا فَخَلَقَ مُحَمَّدَنِ الَّذِیْ هُوَ کَدُرِّ یَتِیْمٍ ـ وَاَشْرَكَ اسْمَیْهِ فِیْ صِفَتَیْهِ فَفَاقَ کُلَّ مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ـ وَّاِنَّهُمَا یَتَلَاْلَئَانِ فِیْ تَعْلِیْمِ الْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ـ وَاِنَّ نَبِیَّنَا مُرَکَّبٌ مِّنْ نُّوْرِ مُوْسٰی وَنُوْرِ عِیْسٰی کَمَا هُوَ مُرَکَّبٌ مِّنْ صِفَتَیْ رَبِّنَا الْاَعْلٰی ـ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عزیز اور حریص کے الفاظ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے فضلِ عظیم سے اسی کی صفت رحمان کے مظہر ہیں کیونکہ آپ کا وجود مبارک سب جہانوں کے لیے رحمت ہے۔ بنی نوع انسان، حیوانات، کافروں، مومنوں سبھی کے لیے۔ پھر فرمایا بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ اور اس میں آپ کو رحمان اور رحیم کے نام دیئے جیسا کہ کسی سمجھ دار شخص سے پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعریف کی اور عظمت اور عزت کی وجہ سے آپ کو خُلُقٍ عَظِیْمٍ پر قرار دیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ اگر آپ سوال کریں کہ آپ کا خلق عظیم کیا تھا، تو ہم کہتے ہیں وہ رحمان اور رحیم ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ دونوں نور اس وقت عطا کیے گئے تھے جبکہ آدمؑ ابھی پانی اور مٹی کے درمیان تھا۔ اور آپ اس وقت بھی نبی تھے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کے گوشت پوست کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود نور ہے اس نے اور نور بھی پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ تب اُس نے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پیدا کیا۔ جو دُرِّ یتیم (یکتا موتی) کی طرح ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے دونوں ناموں محمد اور احمد کو اپنی دونوں صفات رحمٰن ورحیم میں ظلّی طور پر شریک کیا۔ پس آپ ہر اس شخص پر سبقت لے گئے جو قلب سلیم لے کر درگاہ الٰہی میں حاضر ہوا۔ اور آپ کے یہ دونوں نام قرآن حکیم کی تعلیم میں درخشندہ ہیں۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم حضرت موسیٰ کے نور اور حضرت عیسیٰ کے نور کے مرکب ہیں جیسا کہ آپ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی دو نو صفات سے ترکیب یافتہ ہیں۔ پس اسی ترکیب کا تقاضا تھا کہ آپ کو یہ یگانہ

لہ التوبۃ: ۱۲۸ ؎ ۲ القلم: ۵

فَاقْتَضَى التَّرْكِيبُ. أَنْ يُّعْطَى لَهٗ هٰذَا الْمَقَامُ الْغَرِيبُ. فَلِاَجْلِ ذَالِكَ سَمَّاهُ اللّٰهُ مُحَمَّدًا وَّاَحْمَدَ. فَاِنَّهٗ وَرِثَ نُوْرَ الْجَلَالِ وَالْجَمَالِ وَبِهٖ تَفَرَّدَ. وَاِنَّهٗ اُعْطِيَ شَانَ الْمَحْبُوْبِيْنَ وَجَنَانَ الْمُحِبِّيْنَ. كَمَا هُوَ مِنْ صِفَتَيْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ. فَهُوَ خَيْرُ الْمَحْمُوْدِيْنَ وَخَيْرُ الْحَامِدِيْنَ. وَاَشْرَكَهُ اللّٰهُ فِيْ صِفَتَيْهِ وَاَعْطَاهُ حَظًّا كَثِيْرًا مِّنْ رَّحْمَتَيْهِ. وَسَقَاهُ مِنْ عَيْنَيْهِ. وَخَلَقَهٗ بِيَدَيْهِ. فَصَارَ كَقَارُوْرَةٍ فِيْهَا رَاحٌ. اَوْ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ. وَكَمِثْلِ صِفَتَيْهِ اَنْزَلَ عَلَيْهِ الْفُرْقَانَ. وَجَمَعَ فِيْهِ الْجَلَالَ وَالْجَمَالَ وَرَكَّبَ الْبَيَانَ وَجَعَلَهٗ سُلَالَةَ التَّوْرَاتِ وَالْاِنْجِيْلِ وَمِرْاٰةً لِّرُؤْيَةِ وَجْهِ الْجَلِيْلِ وَالْجَمِيْلِ. ثُمَّ اَعْطَى الْاُمَّةَ نَصِيْبًا مِّنْ كَاْسِ هٰذَا الْكَرِيْمِ. وَعَلَّمَهُمْ مِّنْ اَنْفَاسِ هٰذَا الْمُتَعَلِّمِ مِنَ الْعَلِيْمِ. فَشَرِبَ بَعْضُهُمْ مِّنْ عَيْنِ اسْمِ مُحَمَّدٍ الَّتِيْ انْفَجَرَتْ مِنْ صِفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ. وَبَعْضُهُمْ اغْتَرَفُوْا مِنْ يَّنْبُوْعِ اسْمِ اَحْمَدَ الَّذِيْ اشْتَمَلَ عَلَى الْحَقِيْقَةِ الرَّحِيْمِيَّةِ.

مقام عطا ہو۔ اس لیے خدا تعالیٰ نے آپ کا نام محمد بھی رکھا اور احمد بھی، تو آپ خدا تعالیٰ کے جمالی نور اور جلالی نور کے وارث بنے اور اس شان میں آپ منفرد ہیں اور آپ کو محبوبیت کی شان اور محبوں والا دل بھی عطا کیا گیا۔ جیسا کہ محبوبیت اور محبیت رب العالمین کی صفات میں سے ہیں۔ پس آپ بہترین محمود اور بہترین حامد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی ان دونوں صفات میں (ظلی طور پر) شریک کیا ہے اور اپنی ان دونوں رحمتوں سے آپ کو حصہ وافر عطا فرمایا ہے اور اپنے ان دونوں چشموں سے آپ کو سیراب کیا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کو پیدا کیا ہے (یعنی دست جمال و جلال سے) پس آپ اس شیشہ کی طرح ہو گئے جس میں (محبّت الٰہی کی) شراب ہے یا اس طاق کی مانند جس میں ایک عظیم الشان چراغ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفتوں کی طرح آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا اور اس میں جلال و جمال ہر دو کو جمع کیا اور اس کے بیان کو ان ہر دو صفات سے مرکب کیا اور اس میں توریت اور انجیل ہر دو کی تعلیم کا خلاصہ رکھ دیا۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب جلال و جمال کا چہرہ دیکھنے کے لیے قرآن کو آئینہ بنایا اور پھر امت کو بھی اس قرآن کریم کے پیالہ سے حصہ عطا فرمایا۔ اور خدائے علیم کے اس عظیم شاگرد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاس قدسیہ سے انہیں تعلیم دی۔ پس ان میں سے بعض نے اسم محمد کے چشمہ سے پانی پیا جو چشمہ کہ صفت رحمانیت سے پھوٹتا ہے اور بعض نے اسم احمد کے چشمہ سے پیا جو حقیقت رحیمیت پر مشتمل ہے اور

وَكَانَ قَدَرًا مُقَدَّرًا مِّنَ الْاِبْتِدَآءِ وَوَعْدًا مَوْقُوْتًا جَارِيًا عَلٰى اَلْسُنِ الْاَنْبِيَآءِ ۔ اِنَّ اسْمَ اَحْمَدَ لَا تَتَجَلّٰى بِتَجَلٍّ تَامٍّ فِيْ اَحَدٍ مِّنَ الْوَارِثِيْنَ اِلَّا فِي الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ الَّذِيْ يَاْتِي اللّٰهُ بِهٖ عِنْدَ طُلُوْعِ يَوْمِ الدِّيْنِ وَحَشْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ وَيَرَى اللّٰهُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالضُّعَفَآءِ ۔ وَالْاِسْلَامَ كَصَبِيٍّ نُبِذَ بِالْعَرَآءِ فَيَفْعَلُ لَهُمْ اَفْعَالًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيَنْزِلُ لَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ ۔ فَهُنَالِكَ تَكُوْنُ لَهُ السَّلْطَنَةُ فِي الْاَرْضِ كَمَا هِيَ فِي الْاَفْلَاكِ ۔ وَتَهْلِكُ الْاَبَاطِيْلُ مِنْ غَيْرِ ضَرْبِ الْاَعْنَاقِ وَتَنْقَطِعُ الْاَسْبَابُ كُلُّهَا وَتُرْجَعُ الْاُمُوْرُ اِلٰى مَالِكِ الْاَمْلَاكِ ۔ وَعْدٌ مِّنَ اللّٰهِ حَقٌّ كَمِثْلِ وَعْدٍ تَمَّ فِيْ اٰخِرِ زَمَنِ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ ۔ اِذْ بُعِثَ فِيْهِمْ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فَاَشَاعَ الدِّيْنَ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّقْتُلَ مَنْ عَصَى الرَّبَّ الْجَلِيْلَ ۔ وَكَانَ فِيْ قَدَرِ اللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَلِيْمِ ۔ اَنْ يَّجْعَلَ اٰخِرَ هٰذِهِ السِّلْسِلَةِ كَاٰخِرِ خُلَفَآءِ الْكَلِيْمِ ۔ فَلِاَجْلِ ذَالِكَ جَعَلَ خَاتِمَةَ اَمْرِهَا مُسْتَغْنِيَةً مِّنْ نَّصْرِ النَّاصِرِيْنَ وَمَظْهَرًا لِحَقِيْقَةِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔

ابتدا سے یہی الٰہی تقدیر اور مقرر وعدہ تھا۔ جو انبیاء کی زبانوں پر جاری تھا کہ صفتِ احمد کی کامل تجلّی اس کے وارثوں میں سے مسیح موعود کے سوا کسی پر نہ ہوگی جسے اللہ تعالیٰ (اس دنیا میں) جزا سزا کا دن طلوع ہونے اور مومنوں کے جمع کیے جانے کے وقت مبعوث فرمائے گا[1]۔ اس دن اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو کمزور اور اسلام کو اس بچے کی طرح پائے گا جسے جنگل میں پھینک دیا گیا ہو۔ تب ان کے لیے اپنے ہاں سے بہت سے کام بروئے کار لائے گا اور ان کی خاطر خود آسمان سے اتر آئے گا۔ اس وقت زمین پر بھی ویسے ہی اس کی (روحانی) بادشاہت قائم ہو جائے گی جیسا کہ آسمانوں پر ہے (لوگوں کی) گردنیں اڑائے بغیر تمام باطل مٹ جائیں گے اور (کفر کے) سب ذرائع کٹ جائیں گے اور تمام امور بادشاہوں کے بادشاہ (خدا تعالیٰ) کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ اسی وعدہ کی مانند ہے جو بنی اسرائیل کے آخری زمانہ میں پورا ہوا جب ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے اور آپ نے خدا تعالیٰ کے نافرمانوں کو قتل کیے بغیر دین کی اشاعت کی۔ عالم الغیب اور عالی مرتبہ خداوند کی تقدیر میں یہی تھا کہ وہ اس امت محمدیہ کے سلسلہ کے آخری حصّہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلفا کے آخری حصّہ کی طرح بنائے اس لیے اس (امت) کے انجام کو انسانی مددگاروں کی مدد سے مستغنی رکھا اور اُسے "مالک یوم الدین" کی حقیقت کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا جیسا کہ آئندہ مالک یوم الدین کی تفسیر آرہی ہے۔ اس کلام

---

[1] یہاں زمانہ مسیح موعود کو یوم حشر قرار دیا گیا ہے۔ (مترجم)

كَمَا يَأْتِيْ تَفْسِيْرُهٗ بَعْدَ حِيْنٍ۔ وَمِنْ تَتِمَّةِ هٰذَا الْكَلَامِ اَنَّ نَبِيَّنَا
خَيْرَ الْاَنَامِ لَمَّا كَانَ خَاتَمَ الْاَنْبِيَآءِ وَاَصْفَى الْاَصْفِيَاءِ وَاَحَبَّ النَّاسِ اِلٰى
حَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ اَرَادَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ اَنْ يَّجْمَعَ فِيْهِ صِفَتَيْهِ الْعَظِيْمَتَيْنِ
عَلَى الطَّرِيْقَةِ الظِّلِّيَّةِ۔ فَوَهَبَ لَهٗ اسْمَ مُحَمَّدٍ وَّاَحْمَدَ لِيَكُوْنَا كَالظِّلَّيْنِ
لِلرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ۔ وَلِذَالِكَ اَشَارَ فِيْ قَوْلِهٖ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ"۔ اِلٰى اَنَّ الْعَابِدَ الْكَامِلَ يُعْطٰى لَهٗ صِفَاتُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔
بَعْدَ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْعَابِدِيْنَ الْفَانِيْنَ۔ وَقَدْ عَلِمْتَ اَنَّ كُلَّ كَمَالٍ مِّنْ كَمَالَاتِ
الْاَخْلَاقِ الْاِلٰهِيَّةِ مُنْحَصِرٌ فِيْ كَوْنِهٖ رَحْمَانًا وَّرَحِيْمًا وَّلِذَالِكَ خَصَّهُمَا
اللّٰهُ بِالْبَسْمَلَةِ۔ وَعَلِمْتَ اَنَّ اسْمَ مُحَمَّدٍ وَّاَحْمَدَ قَدْ اُقِيْمَا مَقَامَ الرَّحْمَانِ
وَالرَّحِيْمِ۔ وَاُوْدِعَهُمَا كُلُّ كَمَالٍ كَانَ مَخْفِيًّا فِيْ هَاتَيْنِ الصِّفَتَيْنِ مِنَ
اللّٰهِ الْعَلِيْمِ الْحَكِيْمِ۔ فَلَا شَكَّ اَنَّ اللّٰهَ جَعَلَ هٰذَيْنِ الْاِسْمَيْنِ ظِلَّيْنِ
لِصِفَتَيْهِ وَمَظْهَرَيْنِ لِسِيْرَتَيْهِ۔ لِيُرِيَ حَقِيْقَةَ الرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ۔
فِيْ مِرْاٰةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ وَالْاَحْمَدِيَّةِ۔ ثُمَّ لَمَّا كَانَ كُمَّلُ اُمَّتِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ

کا تتمہ یہ ہے کہ چونکہ ہمارے نبی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء برگزیدوں کے برگزیدہ اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ ظلّی طور پر آپ میں اپنی یہ دونوں بڑی صفات جمع کر دے۔ پس آپ کو محمد اور احمد کے نام عطا کیے تا یہ دونوں نام صفت رحمانیت اور صفت رحیمیت کے لیے بمنزلہ ظل کے ہوں، اسی لیے اس نے اپنے قول اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ کامل عبادت گذار کو رب العالمین کی صفات عطا کی جاتی ہیں جبکہ وہ فنا فی اللہ عابدوں کے مقام تک پہنچ جائے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اخلاق الٰہیہ کا ہر کمال اللہ تعالیٰ کے رحمانؐ رحیم ہونے پر منحصر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صفات کو بسم اللہ کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ محمد اور احمد نامؐ الرحمٰن، الرحیمؐ کے مظہر ہیں اور ہر کمال جو ان دونوں صفات الٰہیہ میں مخفی تھا وہ علیم و حکیم خدا کی طرف سے (محمد اور احمد کے) دونوں ناموں میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ناموں (محمد اور احمد) کو اپنی دونوں صفات کے ظلّ اور اپنی دونوں سیرتوں کے مظہر ٹھہرایا ہے۔ تاکہ رحمانیت اور رحیمیت کی حقیقت کو محمدیت اور احمدیت کے آئینہ میں دکھائے۔ پھر جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے کامل افراد جو آنحضرت کی روحانیت کے

مِنَ اَجْزَآءِ الرُّوْحَانِيَّةِ وَكَالْجَوَارِحِ لِلْحَقِيْقَةِ النَّبَوِيَّةِ۔ اَرَادَ اللّٰهُ لِاِبْقَآءِ اٰثَارِ هٰذَا النَّبِيِّ الْمَعْصُوْمِ۔ اَنْ يُّوَرِّثَهُمْ هٰذَيْنِ الْاِسْمَيْنِ كَمَا جَعَلَهُمْ وُرَثَآءَ الْعُلُوْمِ۔ فَاَدْخَلَ الصَّحَابَةَ تَحْتَ ظِلِّ اسْمِ مُحَمَّدِ نِ الَّذِيْ هُوَ مَظْهَرُ الْجَلَالِ۔ وَاَدْخَلَ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ تَحْتَ اسْمِ اَحْمَدَ الَّذِيْ هُوَ مَظْهَرُ الْجَمَالِ۔ وَمَا وَجَدَ هٰٓؤُلَآءِ هٰذِهِ الدَّوْلَةَ اِلَّا بِالظِّلِّيَّةِ۔ فَاِذَنْ مَّا ثَمَّ شَرِيْكٌ عَلَى الْحَقِيْقَةِ وَكَانَ غَرَضُ اللّٰهِ مِنْ تَقْسِيْمِ هٰذَيْنِ الْاِسْمَيْنِ اَنْ يُّفَرِّقَ بَيْنَ الْاُمَّةِ وَيَجْعَلَهُمْ فَرِيْقَيْنِ۔ فَجَعَلَ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ كَمِثْلِ مُوْسٰى مَظْهَرِ الْجَلَالِ۔ وَهُمْ صَحَابَةُ النَّبِيِّ الَّذِيْنَ تَصَدَّوْا اَنْفُسَهُمْ لِلْقِتَالِ۔ وَجَعَلَ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ كَمِثْلِ عِيْسٰى مَظْهَرِ الْجَمَالِ وَجَعَلَ قُلُوْبَهُمْ لَيِّنَةً وَّاَوْدَعَ السِّلْمَ صُدُوْرَهُمْ وَاَقَامَهُمْ عَلٰى اَحْسَنِ الْخِصَالِ۔ وَهُوَ الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ مِنَ النِّسَآءِ وَالرِّجَالِ۔ فَتَمَّ مَا قَالَ مُوْسٰى وَمَا فَاهَ بِكَلَامٍ عِيْسٰى وَتَمَّ وَعْدُ الرَّبِّ الْفَعَّالِ فَاِنَّ مُوْسٰى اَخْبَرَ عَنْ صَحْبٍ كَانُوْا مَظْهَرَ اسْمِ مُحَمَّدٍ نَبِيِّنَا الْمُخْتَارِ۔ وَصُوَرَ

اجزاء اور حقیقت نبویہ کے اعضاء کی طرح ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کو باقی رکھنے کے لیے انہیں (امت کے کامل افراد کو) بھی اسی طرح ان دونوں ناموں کا وارث بنائے جیسے اس نے انہیں علوم نبویہ کا وارث بنایا ہے پس اُس نے صحابہ کو اسم محمد کے ظل کی ذیل میں داخل کر دیا جو اسم کے جلال کا مظہر ہے اور مسیح موعود کو اسم احمد کے ذیل میں داخل کر دیا جو جمال کا مظہر ہے۔ اور ان سب نے اس دولت کو محض ظلیت کے طور پر پایا ہے۔ پس حقیقت کی رُو سے اس مقام پر خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اور ان دوناموں کی تقسیم سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہی تھی کہ وہ امت کو تقسیم کرے اور اس کے دوگروہ کر دے۔ پس اس نے ان میں سے ایک گروہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام مظہر جلال کی مانند بنایا اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جنہوں نے جہاد کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا۔ اور ایک گروہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مظہر جمال کی مانند بنایا اور ان کو دل کا حلیم بنایا۔ ان کے سینوں میں صلح جوئی ودلیعت کی اور ان کو اعلیٰ اخلاق پر قائم کیا اور (امت کا) یہ گروہ مسیح موعود اور اس کے متبعین ہیں خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔

پس جو کچھ حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا وہ بھی اور جو حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) نے فرمایا تھا وہ بھی پورا ہوا۔ اور اس طرح خدا کے

جَلَالِ اللّٰهِ الْقَهَّارِ۔ بِقَوْلِهٖ " اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ "۔ وَاِنَّ عِيْسٰى اَخْبَرَ عَنْ " اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ " وَعَنْ اِمَامِ تِلْكَ الْاَبْرَارِ۔ اَعْنِيْ اَلْمَسِيْحَ الَّذِيْ هُوَ مَظْهَرُ اَحْمَدَ الرَّاحِمِ السَّتَّارِ۔ وَمَنْبَعُ جَمَالِ اللّٰهِ الرَّحِيْمِ الْغَفَّارِ۔ بِقَوْلِهٖ " كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ " اَلَّذِيْ هُوَ مُعْجِبُ الْكُفَّارِ۔ وَكُلٌّ مِّنْهُمَا اَخْبَرَ بِصِفَاتٍ تُنَاسِبُ صِفَاتِهِ الذَّاتِيَّةَ۔ وَاخْتَارَ جَمَاعَةً تُشَابِهُ اَخْلَاقُهُمْ اَخْلَاقَهُ الْمَرْضِيَّةَ۔ فَاَشَارَ مُوْسٰى بِقَوْلِهٖ " اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ " اِلٰى صَحَابَةٍ اَدْرَكُوْا صُحْبَةَ نَبِيِّنَا الْمُخْتَارِ۔ وَاَرَوْا شِدَّةً وَّغِلْظَةً فِي الْمِضْمَارِ۔ وَاَظْهَرُوْا جَلَالَ اللّٰهِ بِالسَّيْفِ الْبَتَّارِ۔ وَصَارُوْا ظِلَّ اسْمِ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ الْقَهَّارِ۔ عَلَيْهِ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَاَهْلِ السَّمَآءِ وَاَهْلِ الْاَرْضِ مِنَ الْاَبْرَارِ وَالْاَخْيَارِ۔ وَاَشَارَ عِيْسٰى بِقَوْلِهٖ " كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ " اِلٰى قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ وَاِمَامِهِمِ الْمَسِيْحِ۔ بَلْ ذَكَرَ اسْمَهٗ اَحْمَدَ بِالتَّصْرِيْحِ۔ وَاَشَارَ بِهٰذَا الْمَثَلِ الَّذِيْ جَآءَ فِي الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ۔

قادر کا وعدہ بھی پورا ہو گیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ[1] کہہ کر ان صحابہ کے متعلق پیشگوئی فرمائی تھی، جو ہمارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم محمد کے مظہر اور خدائے قہار کے جلال کا انعکاس تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صحابہ کے ایک دوسرے گروہ اور ان ابرار کے امام کے متعلق اپنے قول كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ[1] میں اس روئیدگی کی پیشگوئی فرمائی تھی جو کسانوں کو خوش کرتی ہے۔ یعنی اس مسیح کے متعلق جو رحم کرنے والے اور پردہ پوش (اسم) احمد کا مظہر اور رحیم و غفار خدا کے جمال کا منبع ہے۔ پس موسیٰؑ و عیسیٰؑ ہر دو نے پیشگوئی میں ایسی صفات کی خبر دی تھی جو ان کی اپنی صفات ذاتیہ سے مناسبت رکھتی ہیں۔ اور ہر ایک نے اس جماعت کو پیشگوئی کے لیے چُنا جن کے اخلاق اس کے اپنے پسندیدہ اخلاق کے مشابہ تھے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے الفاظ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ[1] میں ان صحابہ کی طرف اشارہ فرمایا جنھوں نے ہمارے نبی اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی اور انہوں نے جنگ کے میدانوں میں سختی و مضبوطی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے جلال کو سیف قاطع کے ذریعہ ظاہر کیا۔ اور خدائے قہار کے رسول کے اسم محمدؐ کے ظل بن گئے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ، اہل آسمان، اور اہل زمین میں سے راستبازوں اور نیکوکاروں کا صلوٰۃ اور سلام ہو۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے قول كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ[1] سے اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ[2] کی قوم اور ان کے امام مسیح کی طرف اشارہ کیا بلکہ اس کے احمد نام کا صراحت سے ذکر کر دیا۔ اور اس مثال سے جو قرآن کریم میں آئی ہے آپ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ مسیح موعود کسی بہت سخت

---

[1] الفتح: ۳۰ [2] الجمعۃ: ۴۔

اِلٰى اَنَّ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ لَا يَظْهَرُ اِلَّا كَنَبَاتٍ لَيِّنٍ لَا كَالشَّيْءِ الْغَلِيْظِ الشَّدِيْدِ۔ ثُمَّ مِنْ عَجَائِبِ الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ۔ اَنَّهٗ ذَكَرَ اِسْمَ اَحْمَدَ حِكَايَةً عَنْ عِيْسٰى وَذَكَرَ اِسْمَ مُحَمَّدٍ حِكَايَةً عَنْ مُوْسٰى لِيَعْلَمَ الْقَارِئُ اَنَّ النَّبِيَّ الْجَلَالِيَّ اَعْنِيْ مُوْسٰى اخْتَارَ اِسْمًا يُشَابِهُ شَانَهٗ اَعْنِيْ مُحَمَّدَ بِالَّذِيْ هُوَ اِسْمُ الْجَلَالِ وَكَذَالِكَ اخْتَارَ عِيْسٰى اِسْمَ اَحْمَدَ الَّذِيْ هُوَ اِسْمُ الْجَمَالِ بِمَا كَانَ نَبِيًّا جَمَالِيًّا وَّمَا اُعْطِيَ لَهٗ شَيْءٌ مِّنَ الْقَهْرِ وَالْقِتَالِ۔ فَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ كُلًّا مِّنْهُمَا اَشَارَ اِلٰى مَثِيْلِهِ التَّامِّ۔ فَاحْفَظْ هٰذِهِ النُّكْتَةَ فَاِنَّهَا تُنْجِيْكَ مِنَ الْاَوْهَامِ۔ وَتَكْشِفُ عَنْ سَاقِ الْجَلَالِ وَالْجَمَالِ وَتُرِي الْحَقِيْقَةَ بَعْدَ رَفْعِ الْفِدَامِ۔ وَاِذَا قَبِلْتَ هٰذَا فَدَخَلْتَ فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَكَلَاءَةٍ مِنْ كُلِّ دَجَّالٍ۔ وَّنَجَوْتَ مِنْ كُلِّ ضَلَالٍ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۸۷ تا ۱۲۴)

کتاب دساتیر مجوس میں یہ فقرات ہیں" بنام ایزد بخشایندہ بخشایشگر مہربان دادگر" جو بظاہر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے مشابہ ہیں لیکن جو لفظ رحمان اور رحیم میں پر حکمت فرق ہے وہ فرق اِن لفظوں میں موجود نہیں اور جو اللّٰہ کا اسم وسیع معنی رکھتا ہے وہ ایزد کے لفظ میں ہرگز پائے نہیں جاتے۔ لہذا یہ ترکیب پارسیوں کی بِسْمِ اللّٰہ سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ غالباً یہ الفاظ پیچھے سے بطور سرقہ لکھے گئے ہیں۔ بہرحال یہ نقص دلالت کرتا ہے کہ یہ انسان کا قول ہے۔
(منن الرحمان حاشیہ در حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۸ صفحہ ۲۴۵)

چیز کی طرح نہیں بلکہ صرف نرم و نازک سبزہ کی طرح ظاہر ہوگا، پھر یہ بھی قرآن کریم کے عجائبات میں سے ہے کہ اس نے احمد نام کا ذکر حضرت عیسٰی علیہ السلام سے نقل کیا اور محمد نام کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نقل کیا تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ جلالی نبی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ نام چُنا جو اُن کی اپنی شان کے مطابق ہے یعنی اسم محمد جو جلالی نام ہے اور اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام نے احمد نام چُنا جو جمالی نام ہے کیونکہ وہ خود جمالی نبی تھے اور انہیں شدت اور جنگ سے کوئی حصّہ نہیں دیا گیا تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک نبی نے اپنے اپنے کامل مثیل کی طرف اشارہ کیا پس (اے مخاطب) اس نکتہ کو یاد رکھو کیونکہ یہ تجھے شکوک و شبہات سے نجات دیگا۔ اور جلال اور جمال کے دونوں پہلوؤں کو آشکار کرے گا اور پردہ اُٹھا کر حقیقت کو واضح کر دے گا۔ اور جب تو اس بیان کو قبول کر لے تو ہر دجّال (کے شر) سے خدا تعالیٰ کی حفظ و امان میں آجائے گا اور ہر گمراہی سے نجات پا جائے گا۔

اللہ جو خدائے تعالیٰ کا ایک ذاتی اسم ہے اور جو تمام جمیع صفات کاملہ کا مستجمع ہے .... کہتے ہیں کہ اسم اعظم یہی ہے اور اس میں بڑی بڑی برکات ہیں۔ لیکن جس کو وہ اللہ یاد ہی نہ ہو وہ اس سے کیا فائدہ اُٹھائے گا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۸)

قرآن کی اصطلاح کی رو سے اللہ اُس ذات کا نام ہے جس کی تمام خوبیاں حُسن و احسان کے کمال کے نقطہ پر پُہنچی ہوئی ہوں اور کوئی منقصت اُس کی ذات میں نہ ہو۔ قرآن شریف میں تمام صفات کا موصوف صرف اللہ کے اسم کو ہی ٹھہرایا ہے تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ کا اِسم تب متحقق ہوتا ہے کہ جب تمام صفات کاملہ اُس میں پائی جائیں۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۹)

اللہ جس کا ترجمہ ہے وہ معبود۔ یعنی وہ ذات جو غیر مدرک اور فوق العقول اور وراء الورا اور دقیق در دقیق ہے جس کی طرف ہر ایک چیز عابدانہ رنگ میں یعنی عشقی فنا کی حالت میں جو نظری فنا ہے یا حقیقی فنا کی حالت میں جو موت ہے رجوع کر رہی ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۳)

اللہ کا نام خدا تعالیٰ کے لیے اسم اعظم ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۱)

اللہ جامع جمیع شیون کا ہے اور اسم اعظم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے ساتھ اسم اعظم کی معیت مع تمام صفات کے پائی جاتی ہے۔

(الحکم ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

قرآن شریف جس خدا کو منوانا چاہتا ہے وہ تمام نقائص سے منزہ اور تمام صفات کاملہ سے موصوف ہے۔ کیونکہ اللہ کا لفظ اسی ہستی پر بولا جاتا ہے جس میں کوئی نقص ہو ہی نہیں اور کمال دو قسم کے ہوتے ہیں یا بلحاظ حسن کے یا بلحاظ احسان کے۔ پس وہ دونوں قسم کے کمال اس لفظ میں پائے جاتے ہیں۔ دوسری قوموں نے جو لفظ خدا تعالیٰ کے لیے تجویز کیے ہیں وہ ایسے جامع نہیں ہیں اور یہی لفظ اللہ کا دوسرے باطل مذاہب کے معبودوں کی ہستی اور اُن کی صفات کے مسئلہ کی پوری تردید کرتا ہے۔

(الحکم ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

قَدْ عَرَفْتَ اَنَّ اللّٰهَ بِصِفَةِ الرَّحْمَانِ يُنَزِّلُ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ مِّنَ الْاِنْسَانِ وَالْحَيَوَانِ وَالْكَافِرِ وَاَهْلِ الْاِيْمَانِ اَنْوَاعَ الْاِحْسَانِ وَالْاِمْتِنَانِ۔ بِغَيْرِ عَمَلٍ يَّجْعَلُهُمْ مُّسْتَحِقِّيْنَ فِيْ حَضَرِ الدَّيَّانِ۔ اِذْ لَا شَكَّ اَنَّ

(ترجمہ) آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت کے نتیجہ میں ہر مخلوق پر وہ انسان ہو یا حیوان کافر ہو یا مومن ہر قسم کے احسانات اور افضال ایسے عمل کے بغیر نازل فرماتا ہے جو ان کو جزا دینے والے خدا کی بارگاہ میں انعامات کا مستحق بنا دے اور بلا شبہ

الْاِحْسَانَ عَلٰی ھٰذَا الْمِنْوَالِ یَجْعَلُ الْمُحْسِنَ مَحْبُوْبًا فِی الْحَالِ فَثَبَتَ اَنَّ الْاِفَاضَۃَ عَلَی الطَّرِیْقَۃِ الرَّحْمَانِیَّۃِ یُظْھِرُ فِیْ اَعْیُنِ الْمُسْتَفِیْضِیْنَ شَاْنَ الْمَحْبُوْبِیَّۃِ۔ وَ اَمَّا صِفَۃُ الرَّحِیْمِیَّۃِ۔ فَقَدْ اَلْزَمَتْ نَفْسُھَا شَاْنَ الْمُحِبِّیَّۃِ۔ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَتَجَلّٰی عَلٰی اَحَدٍ بِھٰذَا الْفَیْضَانِ اِلَّا بَعْدَ اَنْ یُّحِبَّہٗ وَیَرْضٰی بِہٖ قَوْلًا وَّفِعْلًا مِّنْ اَھْلِ الْاِیْمَانِ ؃ (اعجاز المسیحؑ ص۹۶ حاشیہ)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی " وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ[1] "۔ وَلَا یَسْتَقِیْمُ ھٰذَا الْمَعْنٰی اِلَّا فِی الرَّحْمَانِیَّۃِ فَاِنَّ الرَّحِیْمِیَّۃَ یَخْتَصُّ بِعَالَمٍ وَّاحِدٍ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؃ (اعجاز المسیحؑ ص۱۱۴ حاشیہ)

رحمان | پھر اللہ کی صفت الرحمن بیان کی ہے اور اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی فطری خواہشوں کو اس کی دعا یا التجا کے بغیر اور بدوں کسی عمل عامل کے عطا (پورا) کرتا ہے۔ مثلاً جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے قیام و بقاء کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ پیدا پیچھے ہوتا ہے لیکن ماں کی چھاتیوں میں دودھ پہلے آجاتا ہے۔ آسمان۔ زمین۔ سورج۔ چاند ستارے۔ پانی۔ ہوا وغیرہ یہ تمام اشیاء جو اس نے انسان کے لیے بنائی ہیں یہ اس کی صفت رحمانیت ہی کے تقاضے ہیں۔ لیکن دوسرے مذہب والے یہ نہیں مانتے کہ وہ بلا مبادلہ بھی فضل کرسکتا ہے۔

(الحکم ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

الرحمن۔ بغیر کسی عمل کے خود بخود عطاء کرنے والا۔ سناتن دھرم والے ان میں سے ہیں جو ایک رنگ میں مانتے ہیں کہ پرمیشر سے سب کچھ نکلا۔ مگر ساتھ ہی کہتے ہیں۔ کرموں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مرد بنا ہے تو کرموں کی وجہ سے۔ عورت بنی ہے تو کرموں کے سبب۔ غرض گدھا۔ بندر۔ بلا جو کچھ ہوا کرموں سے۔ پس یہ لوگ صفت رحمانیت کے منکر ہیں۔ وہ

اس طرز کا احسان احسان کرنے والے کو فوراً محبوب بنا دیتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ رحمانیت کے ماتحت فیض پہنچانا فیض حاصل کرنے والوں کی نظروں میں شان محبوبیت کو نمایاں کر دیتا ہے لیکن صفت رحیمیت نے اپنے آپ کو شانِ محبیت کے ساتھ لازم کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس فیضان کے ساتھ کسی مومن پر اسی وقت تجلی فرماتا ہے جب وہ اس سے محبت کرنے لگے اور اس پر اپنے قول اور فعل سے اپنی خوشنودی کا اظہار کرے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ اے نبی۔ ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کا رحمۃ للعالمین ہونا صفت رحمانیت کے لحاظ سے ہی درست ہوسکتا ہے۔ کیونکہ رحیمیت تو صرف مومنوں کی دنیا کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

---

[1] الانبیاء: ۱۰۸

خدا جس نے آدمیوں سے پہلے سورج وغیرہ پیدا کیا سانس کے لیے ہوا پیدا کی نیز اس لیے کہ ایک دوسرے تک آواز پہنچے۔ جب یہ سب کچھ قبل از وجود پیدا کیا ہے تو پھر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے کرموں کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ لوگ بھولے ہوئے اور کفر میں گرفتار ہیں۔ سچی بات یہی ہے کہ اللہ کا فضل ہے۔ کئی نعمتیں ایسی ہیں جن میں اعمال کا دخل نہیں اور کئی ایسی جن میں اعمال کا دخل ہے جیسے عابد۔ زاہد بندگی کرتے ہیں اور اس کا اجر ملتا ہے۔

(البدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

رحمٰن کے معنے خدا کے کلام سے یہ ثابت ہوتے ہیں کہ جب وہ بغیر کسی عوض کے اور سوا کسی عمل کے رحمت کرتا اور اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ مثلاً دیکھو خدا نے جب یہ نظام بنا رکھا ہے۔ سورج ہے۔ چاند ہے۔ اناج ہے پانی ہے ہوا ہے ہمارے امراض کے دفعیہ کے لیے قسم قسم کی بوٹیاں ہیں۔ اب کوئی تبلا سکتا ہے کہ یہ اس کے کس عمل کا اجر ہیں۔ ہر ایک شخص جو عمیق فکر کرے۔ اس پر خدا کا رحمان ہونا ثابت ہوتا ہے انسان کی زندگی و آسودگی کے لیے جو کچھ چاہیئے تھا وہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے مہیا کیا۔ جو کچھ آسمان میں ہے اور زمین میں اور پھر جو کچھ ہمارے وجود میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب اس کی رحمانیت کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ جب ہم ماں کے پیٹ میں تھے۔ اس وقت جو کچھ اس کے انعام تھے وہ کسی عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ تناسخ کا مسئلہ یہیں سے ردّ ہو جاتا ہے۔ مگر میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ غرض خدا کی بے شمار نعمتیں ہیں جن کو کسی ترازو میں تول نہیں سکتے ضروری ماننا پڑتا ہے۔ کہ خدا رحمان ہے۔ ہمارے اس ملک میں بہت قسم کے فرقے ہیں کہ جو کچھ انسان کو عطا کیا گیا وہ کسی گزشتہ کرم کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ جو کچھ ہے۔ یہ خدا کے فضل اور اس کی رحمانیت نے مہیّا (کیا) ہے کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرے اعمال کا عوض ہے۔

(البدر ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

فرمایا (کہ) هُوَ الرَّحْمٰنُ۔ یعنی وہ جانداروں کی ہستی اور اُن کے اعمال سے پہلے محض اپنے لطف سے نہ کسی غرض سے اور نہ کسی) کے عمل کی پاداش میں اُن کے لیے سامانِ راحت میسّر کرتا ہے جیسا کہ آفتاب اور (ماہتاب اور) زمین اور (دُوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہمارے لیے بنا دیا اس عطیّہ کا نام خدا کی کتاب میں رحمانیت ہے اور اس کام کے لحاظ سے خدا تعالیٰ رَحْمٰن کہلاتا ہے اور پھر فرمایا (کہ) الرَّحِيْمُ یعنی وُہ خُدا نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے (اور) کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اور اس کام کے لحاظ سے رَحِیْم کہلاتا ہے اور یہ صفت رحیمیت کے نام سے موسوم ہے۔

{رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۲۳
الحکم ۱۷ اکتوبر ۱۸۹۹ء صفحہ ۴،۵}

اللہ تعالیٰ کے دو نام ہیں ایک رحمٰن دوسرا رحیم۔ رحمٰن تو یہی ہے کہ فطرۃً عمدہ اور مناسب حال اہل اللہ کے عطا

کرتا ہے اور رحیم یہ کہ جب یہ خدا تعالیٰ کے عطا کردہ قویٰ سے کام لے تو اس پر نیک نتائج مترتب کر دیتا ہے۔ رحیمیت کے نیچے آ کر کوشش کرنا اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[1]

(الحکم ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صٓ)

اَلرَّحِیْمُ۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کے بدلہ نیک نتیجہ دیتا ہے جیسا کہ نماز پڑھنے والا روزہ رکھنے والا صدقہ دینے والا دنیا میں بھی رحم پاوے گا اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ[2] اور دوسری جگہ فرماتا ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ[3] یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا جو کوئی ذرہ سی بھی بھلائی کرتا ہے وہ اس کا بدلہ پا لیتا ہے۔

(البدر ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صـ۱۸۶)

رحیم۔ یعنی عملوں کی پاداش میں بدلا دینے والا۔ بعض لوگ ایسے ہیں (خود انہی مسلمانوں میں بھی) جو اعمال کو باطل قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ نماز کیا روزہ کیا قسمت ہوئی تو بخ جائیں گے یعنی جو کچھ ہونا ہے ہو جائے گا۔ ہم کیوں خواہ مخواہ تکلیف اٹھائیں۔ یہ فرقہ بڑا بڑھا ہوا ہے۔ جاہل سے جاہل کا اعتقاد یہی ہے۔ قسمت پر چھوڑا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی ولی بننا ہے۔ جو یہ ریاضتیں کریں۔ مگر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا نام رحیم ہے جو صالح الاعمال۔ عشق و محبت میں محو ہو جاتا ہے۔ اس کے مدارج بلند کروں گا جتنے اولیاء اور بڑے بڑے راست باز ہوئے ہیں ان سب نے پہلے ضرور مجاہدات کیے ہیں۔ جب جا کر ان پر یہ دروازہ کھلا۔ قرآن مجید میں ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[1] جوئندہ یابندہ۔ جس نے مجاہدات کیے اسی نے پایا پس یہ رحیم ان لوگوں کے رد میں ہے جو کہتے ہیں کہ جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ ہمیں عبادات کی کیا ضرورت ہے۔ غالباً چوروں ڈاکوؤں کا بھی یہی مذہب ہوتا ہے اور یہی خیالات وہ اندر ہی اندر رکھتے ہیں۔

(بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صـ۵)

خدا نے اسی سورہ فاتحہ میں فرمایا کہ وہ رحیم ہے۔ یعنے کوششوں پر نیک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ مثلاً ایک کسان کاشتکاری کرتا ہے آبپاشی کرتا ہے اب عادت اللہ جاری ہے وہ کسی کی کوشش کو ضائع نہیں کرتا بلکہ ایک دانے کے عوض کئی دانے دیتا ہے۔ کسی پوشیدہ حکمت یا کاشت کار کی بدعملی کی وجہ سے فصل برباد ہو جائے تو یہ علیحدہ بات ہے۔ یہ شاذ و نادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔

(بدر ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صـ۳)

رحمانیت کا مظہر تام محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے کیونکہ محمد کے معنے ہیں بہت تعریف کیا گیا اور رحمان کے معنی ہیں۔ بلا مزد۔ بن مانگے۔ بلا تفریق مومن و کافر دینے والا۔ اور یہ صاف بات ہے کہ جو بن مانگے دیگا اس کی تعریف ضرور کی جاویگی پس محمد میں رحمانیت کی تجلی تھی اور اسم احمد میں رحیمیت کا ظہور تھا۔ کیونکہ رحیم کے معنے ہیں محنتوں اور کوششوں

---

[1] العنکبوت: ۷۰ [2] التوبۃ: ۱۲۰ [3] الزلزال: ۸ اور ۹

کو ضائع نہ کرنے والا اور احمد کے معنے ہیں تعریف کرنے والا۔ اور یہ بھی عام بات ہے کہ وہ شخص جو کسی کا عمدہ کام کرتا ہے وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے اور اس کی محنت پر ایک بدلا دیتا ہے اور اُس کی تعریف کرتا ہے۔ اس لحاظ سے احمد میں رحیمیت کا ظہور ہے۔ پس اللہ محمد (رحمان) احمد (رحیم) ہے۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ان دو عظیم الشان صفات رحمانیت اور رحیمیت کے مظہر تھے۔ (الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

رحم دو قسم کا ہوتا ہے ایک رحمانیت دوسرا رحیمیت کے نام سے موسوم ہے۔ رحمانیت تو ایسا فیضان ہے کہ جو ہمارے وجود اور ہستی سے بھی پہلے ہی شروع ہوا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اپنے علم قدیم سے دیکھ کر اس قسم کا زمین آسمان اور ارضی اور سماوی اشیاء ایسی پیدا کی ہیں جو سب ہمارے کام آنے والی ہیں اور کام آتی ہیں۔ اور ان سب اشیاء سے انسان ہی عام طور پر فائدہ اُٹھاتا ہے۔ بھیڑ۔ بکری۔ اور دیگر حیوانات جب کہ بجائے خود انسان کے لیے مفید شے ہیں تو وہ کیا فائدہ اُٹھاتے ہیں؟ دیکھو جسمانی امور میں انسان کیسی کیسی لطیف اور اعلیٰ درجہ کی غذائیں کھاتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کا گوشت انسان کے لیے ہے ٹکڑے اور ہڈیاں کتّوں کے واسطے۔ جسمانی طور پر جو حظوظ اور لذّات انسان کو حاصل ہیں گو حیوان بھی اس میں شریک ہیں مگر انسان کو وہ بدرجۂ اعلیٰ حاصل ہیں اور روحانی لذات میں جانور شریک بھی نہیں ہیں۔ پس یہ دو قسم کی رحمتیں ہیں۔ ایک وہ جو ہمارے وجود سے پہلے پیش از وقت کے طور پر تقدمہ کی صورت میں عناصر وغیرہ اشیاء پیدا کیں۔ جو ہمارے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ اور یہ ہمارے وجود خواہش اور دعا سے پہلے ہیں جو رحمانیت کے تقاضے سے پیدا ہوئے۔

اور دوسری رحمت رحیمیت کی ہے۔ یعنی جب ہم دعاء کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ قانون قدرت کا تعلق ہمیشہ سے دعاء کا تعلق ہے۔ بعض لوگ آج کل اس کو بدعت سمجھتے ہیں ہماری دعاء کا جو تعلق خدا تعالیٰ سے ہے میں چاہتا ہوں کہ اُسے بھی بیان کروں۔

ایک بچّہ جب بھوک سے بیتاب ہو کر دودھ کے لیے چلاتا ہے اور چیختا ہے تو ماں کے پستان میں دودھ جوش مار کر آجاتا ہے۔ بچّہ دعا کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن اُس کی چیخیں دودھ کو کیونکر کھینچ لاتی ہیں؟ اس کا ہر ایک کو تجربہ ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ مائیں دودھ کو محسوس بھی نہیں کرتیں۔ مگر بچّہ کی چلاہٹ ہے کہ دودھ کو کھینچے لاتی ہے۔ تو کیا ہماری چیخیں جب اللہ تعالیٰ کی حضور ہوں تو وہ کچھ بھی نہیں کھینچ کر لا سکتیں؟ آتا ہے۔ اور سب کچھ آتا ہے۔ مگر آنکھوں کے اندھے جو فاضل اور فلاسفر بنے بیٹھے ہیں وہ دیکھ نہیں سکتے۔ بچہ کو جو مناسبت ماں سے ہے اس تعلق اور رشتہ کو انسان اپنے ذہن میں رکھ کر اگر دعا کی فلاسفی پر غور کرے تو وہ بہت آسان اور سہل معلوم ہوتی ہے۔ دوسری قسم کا رحم یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایک رحم مانگنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ مانگتے جاؤ گے۔ ملتا جاویگا۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] کوئی

[1] المؤمن: ۶۱

لفاظی نہیں۔ بلکہ یہ انسانی سرشت کا ایک لازمہ ہے۔ مانگنا انسان کا خاصہ ہے۔ اور استجابت اللہ تعالیٰ کا۔ جو نہیں سمجھتا اور نہیں مانتا وہ جھوٹا ہے۔ بچہ کی مثال جو مَیں نے بیان کی ہے وہ دعا کی فلاسفی خوب حل کر کے دکھاتی ہے۔ رحمانیت اور رحیمیت دو نہیں ہیں۔ پس جو ایک کو چھوڑ کر دوسری کو چاہتا ہے اُسے مل نہیں سکتا۔ رحمانیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہم میں رحیمیت سے فیض اُٹھانے کی سکت پیدا کرے جو ایسا نہیں کرتا وہ کافر نعمت ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ کے یہی معنے ہیں کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اُن ظاہری سامانوں اور اسباب کی رعایت سے جو تو نے عطا کیے ہیں۔ دیکھو! یہ زبان جو عروق اور اعصاب سے خلق کی ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی تو ہم بول نہ سکتے۔ ایسی زبان دعا کے واسطے عطا کی جو قلب کے خیالات تک کو ظاہر کر سکے۔ اگر ہم دعا کا کام زبان سے کبھی نہ لیں تو یہ ہماری شور بختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر وہ زبان کو لگ جاویں تو یک دفعہ ہی زبان اپنا کام چھوڑ بیٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان گونگا ہو جاتا ہے۔ پس یہ کیسی رحیمیت ہے کہ ہم کو زبان دے رکھی ہے۔ ایسا ہی کانوں کی بناوٹ میں فرق آ جاوے تو خاک بھی سنائی نہ دے۔ ایسا ہی قلب کا حال ہے۔ وہ جو خشوع و خضوع کی حالت رکھی ہے۔ اور سوچنے اور تفکر کی قوتیں رکھی ہیں۔ اگر بیماری آ جاوے تو وہ سب قریباً بیکار ہو جاتی ہیں۔ مجنونوں کو دیکھو کہ اُن کے قویٰ کیسے بیکار ہو جاتے ہیں۔ تو پس کیا یہ ہم کو لازم نہیں کہ ان خداداد نعمتوں کی قدر کریں؟ اگر ان قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال فضل سے ہم کو عطا کیے ہیں بیکار چھوڑ دیں تو لاریب ہم کافر نعمت ہیں۔ پس یاد رکھو کہ اگر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو معطل چھوڑ کر دعا کرتے ہیں تو یہ دعا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ جب ہم نے پہلے عطیہ ہی سے کچھ کام نہیں لیا تو دوسرے کو کب اپنے لیے مفید اور کارآمد بنا سکیں گے؟

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۹-۱۵۰)

رحمت الٰہی نے دو قسم سے اپنی ابتدائی تقسیم کے لحاظ سے بنی آدم پر ظہور و بروز فرمایا ہے۔ اول وہ رحمت جو بغیر وجود عمل کسی عامل کے بندوں کے ساتھ شامل ہوئی جیسا کہ زمین اور آسمان اور شمس اور قمر اور ستارے اور پانی اور ہوا اور آگ اور وہ تمام نعمتیں جن پر انسان کی بقا اور حیات موقوف ہے کیونکہ بلا شبہ یہ تمام چیزیں انسان کے لیے رحمت ہیں جو بغیر کسی استحقاق کے محض فضل اور احسان کے طور پر اُس کو عطا ہوئے ہیں اور یہ ایسا فیض خاص ہے جو انسان کے سوال کو بھی اس میں دخل نہیں بلکہ اُس کے وجود سے بھی پہلے ہے اور یہ چیزیں ایسی بزرگ رحمت ہے جو انسان کی زندگی انہیں پر موقوف ہے اور پھر باوصف اِس کے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کے کسی نیک عمل سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ انسانی گناہ کا علم بھی جو خدا تعالیٰ کو پہلے سے تھا ان رحمتوں کے ظہور سے مانع نہیں ہوا۔ اور کوئی آواگون کا قایل یا تناسخ کا ماننے والا گو کیسا ہی اپنے تعصب اور جہالت میں غرق ہو مگر یہ بات تو وہ منہ پر نہیں لا سکتا۔ کہ یہ انسان ہی کے کاموں کا پھل اور نتیجہ ہے کہ اُس کے آرام کے لیے زمین پیدا کی گئی یا اس کی تاریکی دور کرنے کے لیے آفتاب اور ماہتاب بنایا گیا یا اس کی کسی نیک عمل کی جزا میں

پانی اور اناج پیدا کیا گیا یا اُس کے کسی زہد و تقوی کے پاداش میں سانس لینے کے لیے ہوا بنائی گئی کیونکہ انسان کے وجود اور زندگی سے بھی پہلے یہ چیزیں موجود ہو چکی ہیں۔ اور جب تک ان چیزوں کا وجود پہلے فرض نہ کر لیں تب تک انسان کے وجود کا خیال بھی ایک خیال محال ہے پھر کیونکر ممکن ہے کہ یہ چیزیں جن کی طرف انسان اپنے وجود اور حیات اور بقا کے لیے محتاج تھا وہ انسان کے بعد ظہور میں آئے ہوں پھر خود انسانی وجود جس احسن طور کے ساتھ ابتدا سے تیار کیا گیا ہے یہ تمام وہ باتیں ہیں جو انسان کی تکمیل سے پہلے ہیں اور یہی ایک خاص رحمت ہے جس میں انسان کے عمل اور عبادت اور مجاہدہ کو کچھ بھی دخل نہیں۔

دوسری قسم رحمت کی وہ ہے جو انسان کے اعمال حسنہ پر مترتب ہوتی ہے کہ جب وہ تضرع سے دعا کرتا ہے تو قبول کی جاتی ہے اور جب وہ محنت سے تخم ریزی کرتا ہے تو رحمت الٰہی اُس تخم کو بڑھاتی ہے یہاں تک کہ ایک بڑا ذخیرہ اناج کا اس سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح اگر غور سے دیکھو تو ہمارے ہر یک عمل صالح کے ساتھ خواہ وہ دین سے متعلق ہے یا دُنیا سے رحمت الٰہی لگی ہوئی ہے اور جب ہم ان قوانین کے لحاظ سے جو الٰہی سُنتوں میں داخل ہیں کوئی محنت دُنیا یا دین کے متعلق کرتے ہیں تو فی الفور رحمت الٰہی ہمارے شامل حال ہو جاتی ہے اور ہماری محنتوں کو سرسبز کر دیتی ہے یہ دونوں رحمتیں اِس قسم کی ہیں کہ ہم ان کے بغیر جی ہی نہیں سکتے۔ کیا اُن کے وجود میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ تو اجلیٰ بدیہیات میں سے ہیں جن کے ساتھ ہماری زندگی کا تمام نظام چل رہا ہے پس جبکہ ثابت ہو گیا کہ ہماری تربیت اور تکمیل کے لیے دو رحمتوں کے دو چشمے قادر کریم نے جاری کر رکھے ہیں اور وہ اُس کی دو صفتیں ہیں جو ہمارے درخت وجود کی آبپاشی کے لیے دو رنگوں میں ظاہر ہوئے ہیں تو اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ دو چشمے زبان عربی میں منعکس ہو کر کس کس نام سے پکارے گئے ہیں پس واضح ہو کہ پہلے قسم کی رحمت کے لحاظ سے زبان عربی میں خدا تعالیٰ کو رحمٰن کہتے ہیں اور دوسرے قسم کی رحمت کے لحاظ سے زبان موصوف میں اس کا نام رحیم ہے۔ اِسی خوبی کے دکھلانے کے لیے ہم عربی خطبہ کے پہلی ہی سطر میں رحمان کا لفظ لائے ہیں۔ اب اس نمونہ سے دیکھ لو کہ چونکہ یہ رحم کی صفت اپنی ابتدائے تقسیم کے لحاظ سے الٰہی قانون قدرت کے دو قسم پر مشتمل تھی لہٰذا اس کے لیے زبان عربی میں دو مفرد لفظ موجود ہیں اور یہ قاعدہ طالب حق کے لیے نہایت مفید ہو گا کہ ہمیشہ عربی کے باریک فرقوں کو پہچاننے کے لیے صفات اور افعال الٰہیہ کو جو صحیفہ قدرت میں نمایاں ہیں معیار قرار دیا جائے اور اُن کے اقسام کو جو قانون قدرت سے ظاہر ہوں عربی کے مفردات میں ڈھونڈا جائے اور جہاں کہیں عربی کے ایسے مترادف لفظوں کا فرق ظاہر کرنا مقصود ہو جو صفات یا افعال الٰہی کے متعلق ہیں تو صفات یا افعال الٰہی کی اس تقسیم کی طرف متوجہ ہوں جو نظام قانون قدرت دکھلا رہا ہے کیونکہ عربی کی اصل غرض الٰہیات کی خدمت ہے جیسا کہ انسان کے وجود کی اصل غرض معرفت باری تعالیٰ ہے اور ہر یک چیز جس غرض کے لیے پیدا کی گئی ہے اُسی غرض کو سامنے رکھ کر اُس کے عقدے کھل سکتے ہیں اور اُس کے جوہر معلوم ہو سکتے ہیں۔

(منن الرحمان حاشیہ متعلق صفحہ ۱۸ صفحہ ۲۰ تا ۱۵)

رحم دو قسم کا ہوتا ہے اوّل رحمانیت دوسرا رحیمیت کے نام سے موسوم ہے۔ رحمانیت تو ایسا فیضان ہے کہ جو ہمارے وجود اور ہستی سے بھی پہلے شروع ہوا مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمارے وجود سے پیشتر ہی زمین و آسمان چاند و سورج اور دیگر اشیا ارضی و سماوی پیدا کی ہیں جو سب کی سب ہمارے کام آنے والی ہیں اور کام آتی ہیں۔ دوسرے حیوانات بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر وہ جب کہ بجائے خود انسان ہی کے لیے مفید ہیں اور انسان ہی کے کام آتے ہیں تو گویا مجموعی طور پر انسان ہی ان سب سے فائدہ اٹھانے والا ٹھیرا۔ دیکھو جسمانی امور میں کیسی اعلیٰ درجہ کی غذائیں کھاتا ہے اعلیٰ درجہ کا گوشت انسان کے لیے ہے ٹکڑے اور ہڈیاں کتوں کے واسطے جسمانی طور پر تو کسی حد تک حیوان بھی شریک ہیں مگر روحانی لذت میں جانور شریک نہیں ہیں پس یہ دو قسم کی رحمتیں ہیں ایک وہ جو ہمارے وجود سے پہلے ہی عطا ہوئی ہیں اور دوسری وہ جو رحیمیت کی شان کے نمونے ہیں اور وہ دعا کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور ان میں ایک فعل کی ضرورت ہوتی ہے۔

(الحکم ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ کی صفت رحیم بیان کی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جس کا تقاضا ہے کہ محنت اور کوشش کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اُن پر ثمرات اور نتائج مترتب کرتا ہے اگر انسان کو یہ یقین ہی نہ ہو کہ اس کی محنت اور کوشش کوئی پھل لاوے گی تو پھر وہ سُست اور نکما ہو جاوے گا یہ صفت انسان کی اُمیدوں کو وسیع کرتی اور نیکیوں کے کرنے کی طرف جوش سے لے جاتی ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رحیم قرآن شریف کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ اُس وقت کہلاتا ہے جبکہ لوگوں کی دُعا۔ تضرع اور اعمال صالح کو قبول فرما کر آفات اور بلاؤں اور تضیع اعمال سے اُن کو محفوظ رکھتا ہے۔ رحمانیت تو بالکل عام تھی لیکن رحیمیّت خاص انسانوں سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری مخلوق میں دُعا۔ تضرّع اور اعمال صالحہ کا ملکہ اور قوت نہیں یہ انسان ہی کو ملا ہے۔

رحمانیّت اور رحیمیّت میں یہی فرق ہے کہ رحمانیّت دعا کو نہیں چاہتی مگر رحیمیّت دعا کو چاہتی ہے اور یہ انسان کے لیے ایک خلعت خاصہ ہے اور اگر انسان انسان ہو کر اس صفت سے فائدہ نہ اٹھاوے تو گویا ایسا انسان حیوانات بلکہ جمادات کے برابر ہے۔

یہ صفت بھی تمام مذاہب باطلہ کے رد کے لیے کافی ہے کیونکہ بعض مذہب اباحت کی طرف مائل ہیں اور وہ مانتے ہیں کہ دُنیا میں ترقیات نہیں ہوتی ہیں۔ آریہ جبکہ اس صفت کے فیضان سے منکر ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا کب قائل ہو سکتا ہے۔ سید احمد خاں مرحوم نے بھی دُعا کا انکار کیا ہے۔ اور اس طرح پر وہ فیض جو دعا کے ذریعہ انسان کو ملتا ہے اِس سے محروم رکھا ہے۔

(الحکم ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

جب ہم خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ اپنے بندوں کے لیے مہیا کیا ہے یا کرتا ہے وہ دو قسم کی بخشش ہے ایک تو اُس کے وہ انعام اکرام ہیں جو انسانوں کے وجود سے بھی پہلے ہیں اور ایک ذرّہ انسانوں کے عمل کا اُن میں دخل نہیں جیسا کہ اُس نے انسانوں کے آرام کے لیے سورج ۔ چاند ستارے ۔ زمین ۔ پانی ۔ ہوا ۔ آگ وغیرہ چیزیں پیدا کی ہیں اور کچھ شک نہیں کہ ان چیزوں کو انسانوں کے وجود اور ان کے عملوں پر تقدم ہے اور انسان کا وجود اِن کے وجود کے بعد ہے یہ خدا تعالیٰ کی وہ رحمت کی قسم ہے جس کو قرآنی اصطلاح کی رو سے رحمانیت کہتے ہیں یعنی ایسی جود و عطا جو بندہ کے اعمال کی پاداش میں نہیں بلکہ محض فضل کی راہ سے ہے ۔

دوسری قسم رحمت کی وہ ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں رحیمیت کہتے ہیں یعنی وہ انعام اکرام جو بنام نہاد پاداش اعمال حسنہ انسان کو عطا ہوتا ہے (چشمہ معرفت صفحہ ۱۹-۲۰)

رحمانیت اور رحیمیت میں فرق یہ ہے کہ رحمانیت میں فعل اور عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ مگر رحیمیت میں فعل و عمل کو دخل ہے لیکن کمزوری بھی ساتھ ہی ہے ۔ خدا کا رحم چاہتا ہے کہ پردہ پوشی کرے ۔

(الحکم ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کی اس رحمت کا نام جو بغیر کسی عوض یا انسانی عمل محنت اور کوشش کے انسان کے شامل حال ہوتی ہے رحمانیت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے نظام دنیا بنا دیا ۔ سورج پیدا کیا ۔ چاند بنایا ۔ ستارے پیدا کیے ۔ ہوا ۔ پانی ۔ اناج بنائے ۔ ہماری طرح طرح کی امراض کے واسطے شفا بخش دوائیں پیدا کیں غرض اس طرح کے ہزاروں ہزار انعامات ایسے ہیں کہ بغیر ہمارے کسی عمل یا محنت و کوشش کے اُس نے محض اپنے فضل سے پیدا کر دئے ہیں ۔ اگر انسان ایک عمیق نظر سے دیکھے تو لاکھوں انعامات ایسے پائے گا ۔ اور اس کو کوئی وجہ انکار کی نہ ملے گی اور ماننا ہی پڑے گا کہ وہ انعامات اور سامانِ راحت جو ہمارے وجود سے بھی پہلے کے ہیں ۔ بھلا وہ ہمارے کس عمل کا نتیجہ ہیں دیکھو یہ زمین اور یہ آسمان اور ان میں کی تمام چیزیں اور خود ہماری بناوٹ اور وہ حالت کہ جب ہم ماؤں کے پیٹ میں تھے اور اس وقت کے قویٰ یہ سب ہمارے کس عمل کا نتیجہ ہیں میں ان لوگوں کا یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا جو تناسخ کے قائل ہیں مگر ہاں اتنا بیان کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتا ۔ کہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر اتنے لاتعداد اور انعام اور فضل ہیں ۔ کہ ان کو کسی ترازو میں وزن نہیں کر سکتے ۔ بھلا کوئی بتا تو دے ۔ کہ یہ انعامات کہ چاند بنایا ۔ سورج بنایا ۔ زمین بنائی اور ہماری تمام ضروریات ہماری پیدائش سے بھی پہلے مہیا کر دیں یہ کل انعامات کس عمل کے ساتھ وزن کریں گے ؟

پس ضروری طور سے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا رحمٰن ہے اور اس کے لاکھوں فضل ایسے بھی ہیں ۔ کہ جو محض اس کی رحمانیت کی وجہ سے ہمارے شامل حال ہیں اور اس کے وہ عطایا ہمارے کسی گذشتہ عمل کا نتیجہ نہیں ہیں اور کہ جو لوگ ان امور کو اپنے

کسی گذشتہ عمل کا نتیجہ خیال کرتے ہیں وہ محض کوتہ اندیشی اور جہالت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں خدا کا فضل اور رحمانیت ہماری روحانی جسمانی تکمیل کی غرض سے ہے اور کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا۔ کہ یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہیں۔

الرّحیم۔ انسان کی سچی محنت اور کوشش کا بدلہ دیتا ہے ایک انسان سچی محنت اور کوشش کرتا ہے۔ اس کے مقابل میں یہ عادت اللہ ہے۔ کہ وہ اس کی محنت اور کوشش کو ضائع نہیں کرتا اور بابرگ و بار کرتا ہے شاذ و نادر حکم عدم کا رکھتا ہے۔ (الحکم ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

خدا کی صفت رحمانیت اس فرقہ کی تردید کرتی ہے جو خدا کو بلا مبادلہ یعنی بغیر ہماری کسی محنت اور کوشش کے بعض اشیاء کے عنایت کرنے والا نہیں مانتے۔ اس کے بعد خدا تعالےٰ کی صفت الرحیم کا بیان ہے یعنی محنتوں کوششوں اور اعمال پر ثمرات حسنہ مترتب کرنے والا۔ یہ صفت اس فرقہ کو ردّ کرتی ہے جو اعمال کو بالکل لغو خیال کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں۔ کہ میاں نماز کیا تو روزے کیا اگر غفور الرحیم نے اپنا فضل کیا تو بہشت میں جائیں گے نہیں تو جہنم میں۔ اور کبھی کبھی یہ لوگ اس قسم کی باتیں بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ میاں عبادتاں کر کے ولی تو ہم نے کچھ تھوڑا ہی بننا۔ کچھ کیتا کیتا نہ کیتا نہ سہی۔ غرض الرحیم کہہ کر خدا ایسے ہی لوگوں کا رد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جو محنت کرتا ہے اور خدا کے عشق اور محبت میں محو ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں سے ممتاز اور خدا کا منظور نظر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی خود دستگیری کرتا ہے جیسے فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[1] یعنی جو لوگ ہماری خاطر مجاہدات کرتے ہیں آخر ہم ان کو اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں۔ جتنے اولیا انبیا اور بزرگ لوگ گذرے ہیں۔ انہوں نے خدا کی راہ (میں) جب بڑے بڑے مجاہدات کیے تو آخر خدا نے اپنے دروازے ان پر کھول دئے۔ لیکن وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی اس صفت کو نہیں مانتے عموماً ان کا یہی مقولہ ہوتا ہے کہ میاں ہماری کوششوں میں کیا پڑا ہے۔ جو کچھ تقدیر میں پہلے روز سے لکھا ہے۔ وہ تو ہو کر رہے گا۔ ہماری محنتوں کی کوئی ضرورت نہیں جو ہونا ہے۔ وہ آپ ہی ہو جائے گا اور شاید چوروں اور ڈاکوؤں اور دیگر بدمعاشوں کا اندر ہی اندر یہی مذہب ہوتا ہوگا غرض یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے فعل دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جن میں اعمال کا کوئی دخل نہیں جیسے سورج چاند ہوا وغیرہ جو خدا تعالیٰ نے بغیر ہمارے کسی عمل کے ہمارے وجود میں آنے سے ہی پیشتر اپنی قدرت کاملہ سے تیار کر رکھے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جن میں اعمال کا دخل ہے۔ اور عابد زاہد اور پرہیز گار لوگ عبادت کرتے اور پھر اپنا اجر پاتے ہیں۔

(الحکم ۲ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

---

[1] العنکبوت: ۷۰۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ
مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ تمام محامد اس ذات معبودِ برحق مستجمع جمیع صفات کاملہ کو ثابت ہیں جس کا نام اللہ ہے۔۔۔۔ قرآنِ شریف کی اصطلاح میں اللہ اُس ذاتِ کامل کا نام ہے کہ جو معبودِ برحق مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ اور تمام رذائل سے منزّہ اور واحد لاشریک اور مبدء جمیع فیوض ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام پاک قرآنِ شریف میں اپنے نام اللہ کو تمام دوسرے اسماء و صفات کا موصوف ٹھہرایا ہے اور کسی جگہ کسی دوسرے اِسم کو یہ رتبہ نہیں دیا۔ پس اللہ کے اسم کو بوجہ موصوفیت تامہ ان تمام صفتوں پر دلالت ہے جن کا وہ موصوف ہے اور چونکہ وہ جمیع اسماء اور صفات کا موصوف ہے اِس لیے اُس کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ جمیع صفات کاملہ پر مشتمل ہے پس خلاصہ مطلب الحمد للہ کا یہ نکلا کہ تمام اقسام حمد کے کیا باعتبار ظاہر کے اور کیا باعتبار باطن کے اور کیا باعتبار ذاتی کمالات کے اور کیا باعتبار قدرتی عجائبات کے اللہ سے مخصوص ہیں اور اُس میں کوئی دوسرا شریک نہیں اور نیز جس قدر محامد صحیحہ اور کمالاتِ تامہ کو عقل کسی عاقل کی سوچ سکتی ہے یا فکر کسی متفکر کا ذہن میں لاسکتا ہے وہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ میں موجود ہیں اور کوئی ایسی خوبی نہیں کہ عقل اُس خوبی کے امکان پر شہادت دے۔ مگر اللہ تعالیٰ بدقسمت انسان کی طرح اُس خوبی سے محروم ہو بلکہ کسی عاقل کی عقل ایسی خوبی پیش ہی نہیں کر سکتی کہ جو خدا میں نہ پائی جائے۔ جہاں تک انسان زیادہ سے زیادہ خوبیاں سوچ سکتا ہے وہ سب اُس میں موجود ہیں اور اُس کو اپنی ذات اور صفات اور محامد میں من کل الوجوہ کمال حاصل ہے اور رذائل سے بکلّی منزّہ ہے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۶۴-۳۶۵ حاشیہ ۱۱)

اِعْلَمْ اَنَّ الْحَمْدَ ثَنَاءٌ عَلٰی فِعْلِ الْجَمِیْلِ لِمَنْ یَّسْتَحِقُّ الثَّنَاءَ۔ وَمَدْحٌ لِمُنْعِمٍ اَنْعَمَ مِنَ الْاِرَادَةِ وَاَحْسَنَ کَیْفَ شَاءَ۔ وَلَا یَتَحَقَّقُ حَقِیْقَةُ الْحَمْدِ کَمَا هُوَ حَقُّهَا اِلَّا لِلَّذِیْ هُوَ مَبْدَءٌ لِجَمِیْعِ الْفُیُوْضِ وَالْاَنْوَارِ وَمُحْسِنٌ عَلٰی وَجْهِ الْبَصِیْرَةِ لَا مِنْ غَیْرِ الشُّعُوْرِ وَلَا مِنَ الْاِضْطِرَارِ۔ فَلَا

(ترجمہ) واضح ہو کہ حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی مستحق تعریف کے اچھے فعل پر کی جائے نیز ایسے انعام کنندہ کی مدح کا نام ہے جس نے اپنے ارادہ سے انعام کیا ہو۔ اور اپنی مشیّت کے مطابق احسان کیا ہو۔ اور حقیقت حمد کما حقہٗ صرف اسی ذات کے لیے متحقق ہوتی ہے جو تمام فیوض و انوار کا مبدء ہو اور علی وجہ البصیرت کسی پر احسان کرے نہ کہ غیر شعوری طور پر یا کسی مجبوری سے۔

يُوْجَدُ هٰذَا الْمَعْنٰى اِلَّا فِى اللّٰهِ الْخَبِيْرِ الْبَصِيْرِ۔ وَاِنَّهٗ هُوَ الْمُحْسِنُ وَمِنْهُ الْمِنَنُ كُلُّهَا فِى الْاَوَّلِ وَالْاٰخِيْرِ۔ وَلَهُ الْحَمْدُ فِىْ هٰذِهِ الدَّارِ وَتِلْكَ الدَّارِ۔ وَاِلَيْهِ يَرْجِعُ كُلُّ حَمْدٍ يُّنْسَبُ اِلَى الْاَغْيَارِ ۔

ثُمَّ اِنَّ لَفْظَ الْحَمْدِ مَصْدَرٌ مَّبْنِىٌّ عَلَى الْمَعْلُوْمِ وَالْمَجْهُوْلِ وَلِلْفَاعِلِ وَالْمَفْعُوْلِ۔ مِنَ اللّٰهِ ذِى الْجَلَالِ۔ وَمَعْنَاهُ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ مُحَمَّدٌ وَّهُوَ اَحْمَدُ عَلٰى وَجْهِ الْكَمَالِ۔ وَالْقَرِيْنَةُ الدَّالَّةُ عَلٰى هٰذَا الْبَيَانِ۔ اَنَّهٗ تَعَالٰى ذَكَرَ بَعْدَ الْحَمْدِ صِفَاتًا تَسْتَلْزِمُ هٰذَا الْمَعْنٰى عِنْدَ اَهْلِ الْعِرْفَانِ۔ وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ اَوْمَأَ فِىْ لَفْظِ الْحَمْدِ اِلٰى صِفَاتٍ تُوْجَدُ فِىْ نُوْرِهِ الْقَدِيْمِ۔ ثُمَّ فَسَّرَ الْحَمْدَ وَجَعَلَهٗ مُخَدَّرَةً سَفَرَتْ عَنْ وَجْهِهَا عِنْدَ ذِكْرِ الرَّحْمَانِ وَالرَّحِيْمِ۔ فَاِنَّ الرَّحْمَانَ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ الْحَمْدَ مَبْنِىٌّ عَلَى الْمَعْلُوْمِ۔ وَالرَّحِيْمَ يَدُلُّ عَلَى الْمَجْهُوْلِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى اَهْلِ الْعُلُوْمِ ۔ (اعجاز المسیح ص ۱۲۵ تا ۱۲۷)

اور حمد کے یہ معنی صرف خدائے خبیر و بصیر کی ذات میں ہی پائے جاتے ہیں۔ اور وہی محسن ہے اور اول و آخر میں سب احسان اسی کی طرف سے ہیں۔ اور سب تعریف اسی کے لیے ہے اس دنیا میں بھی اور اُس دنیا میں بھی۔ اور ہر حمد جو اس کے غیروں کے متعلق کی جائے اس کا مرجع بھی وہی ہے۔

پھر یہ بھی یاد رہے کہ لفظ حمد جو اس آیت میں اللہ ذوالجلال کی طرف سے استعمال ہوا ہے مصدر ہے جو بطور مبنی للمعلوم اور مبنی للمجہول ہے یعنی فاعل اور مفعول دونوں کے لیے ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کامل طور پر تعریف کیا گیا اور تعریف کرنے والا ہے۔ اور اس بیان پر دلالت کرنے والا قرینہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حمد کے بعد ایسی صفات کا ذکر فرمایا ہے جو اہل عرفان کے نزدیک ان معنی کو مستلزم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے لفظ حمد میں ان صفات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو اس کے ازلی نور میں پائی جاتی ہیں۔ پھر اس نے اس لفظ حمد کی تفسیر فرمائی ہے اور اسے ایک ایسی پردہ نشین قرار دیا ہے جو رحمان اور رحیم کے ذکر پر اپنے چہرہ سے نقاب اٹھاتی ہے کیونکہ رحمان کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ لفظ حمد مصدر معروف ہے اور اسی طرح رحیم کا لفظ حمد کے مصدر مجہول ہونے پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ - هُوَ الثَّنَآءُ بِاللِّسَانِ عَلَى الْجَمِيْلِ لِلْمُقْتَدِرِ النَّبِيْلِ عَلٰى قَصْدِ التَّبْجِيْلِ - وَالْكَامِلُ التَّآمُّ مِنْ اَفْرَادِهٖ مُخْتَصٌّ بِالرَّبِّ الْجَلِيْلِ - وَكُلُّ حَمْدٍ مِّنَ الْكَثِيْرِ وَالْقَلِيْلِ يَرْجِعُ اِلٰى رَبِّنَا الَّذِىْ هُوَ هَادِى الضَّآلِّ وَمُعِزُّ الذَّلِيْلِ وَهُوَ مَحْمُوْدُ الْمَحْمُوْدِيْنَ -

وَالشُّكْرُ يُفَارِقُ الْحَمْدَ بِخُصُوْصِيَّتِهٖ بِالصِّفَاتِ الْمُتَعَدِّيَةِ عِنْدَ اَكْثَرِ الْعُلَمَآءِ وَالْمَدْحُ يُفَارِقُهٗ فِىْ جَمِيْلٍ غَيْرِ اخْتِيَارِىٍّ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْبُلَغَآءِ وَالْاُدَبَآءِ الْمَاهِرِيْنَ -

وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى افْتَتَحَ كِتَابَهٗ بِالْحَمْدِ لَا بِالشُّكْرِ وَلَا بِالثَّنَآءِ لِاَنَّ الْحَمْدَ يُحِيْطُ عَلَيْهِمَا بِالْاِسْتِيْفَآءِ وَقَدْ نَابَ مَنَابَهُمَا مَعَ الزِّيَادَةِ فِى الرِّفَآءِ وَفِى التَّزْئِيْنِ وَالتَّحْسِيْنِ - وَلِاَنَّ الْكُفَّارَ كَانُوْا يَحْمَدُوْنَ طَوَاغِيْتَهُمْ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيُؤْثِرُوْنَ لَفْظَ الْحَمْدِ لِمَدْحِهِمْ وَيَعْتَقِدُوْنَ اَنَّهُمْ مَّنْبَعُ الْمَوَاهِبِ وَالْجَوَآئِزِ وَمِنَ الْجَوَادِيْنَ - وَكَذٰلِكَ كَانَ مَوْتَاهُمْ يُحْمَدُوْنَ عِنْدَ تَعْدِيْدِ النَّوَادِبِ بَلْ فِى الْمَيَادِيْنِ

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو کسی صاحب اقتدار شریف ہستی کے اچھے کاموں پر اس کی تعظیم و تکریم کے ارادہ سے زبان سے کی جائے - اور کامل ترین حمد رب جلیل سے مخصوص ہے - اور ہر قسم کی حمد کا مرجع خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہمارا وہ رب ہے جو گمراہوں کو ہدایت دینے والا اور ذلیل لوگوں کو عزت بخشنے والا ہے - اور وہ محمودوں کا محمود ہے (یعنی وہ ہستیاں جو خود قابل حمد ہیں وہ سب اس کی حمد میں لگی ہوئی ہیں) - اکثر علماء کے نزدیک لفظ شکر حمد سے اس پہلو میں فرق رکھتا ہے کہ وہ ایسی صفات سے مختص ہے کہ جو دوسروں کو فائدہ پہنچانے والی ہوں اور لفظ مدح لفظ حمد سے اس بات میں مختلف ہے کہ مدح کا اطلاق غیر اختیاری خوبیوں پر بھی ہوتا ہے - اور یہ امر فصیح و بلیغ علما اور ماہر ادباء سے مخفی نہیں -

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو حمد سے شروع کیا ہے نہ کہ شکر اور مدح سے - کیونکہ لفظ حمد ان دونوں الفاظ کے مفہوم پر پوری طرح حاوی ہے - اور وہ ان کا قائمقام ہوتا ہے مگر اس میں اصلاح، آرائش اور زیبائش کا مفہوم ان سے زاید ہے - چونکہ کفار بلا وجہ اپنے بتوں کی حمد کیا کرتے تھے اور وہ ان کی مدح کے لیے حمد کے لفظ کو اختیار کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ معبود تمام عطایا اور انعامات کے سرچشمہ ہیں اور سخیوں میں سے ہیں - اسی طرح ان کے مُردوں کی ماتم کرنے والیوں کی طرف سے مفاخر شماری کے وقت بلکہ میدانوں میں بھی اور ضیافتوں کے مواقع پر بھی اسی طرح حمد کی جاتی تھی جس طرح اس رازق

وَالْمَادِبِ كَحَمْدِ اللّٰهِ الرَّازِقِ الْمُتَوَلِّي الضَّمِيْنِ. فَهٰذَا رَدٌّ عَلَيْهِمْ وَعَلٰى كُلِّ مَنْ اَشْرَكَ بِاللّٰهِ وَذِكْرٌ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ - وَفِيْ ذَالِكَ يَلُوْمُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَبَدَةَ الْاَوْثَانِ وَالْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى وَكُلَّ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. فَكَاَنَّهٗ يَقُوْلُ اَيُّهَا الْمُشْرِكُوْنَ لِمَ تَحْمَدُوْنَ شُرَكَآءَكُمْ وَتُطْرُوْنَ كُبَرَآءَكُمْ اَهُمْ اَرْبَابُكُمُ الَّذِيْنَ رَبَّوْكُمْ وَاَبْنَآءَكُمْ اَمْ هُمُ الرَّاحِمُوْنَ الَّذِيْنَ يَرْحَمُوْنَكُمْ وَيَرُدُّوْنَ بَلَآءَكُمْ وَيَدْفَعُوْنَ مَاسَآءَكُمْ وَضَرَّآءَكُمْ وَيَحْفَظُوْنَ خَيْرًا جَآءَكُمْ وَيَرْحَضُوْنَ عَنْكُمْ قَشْفَ الشَّدَآئِدِ وَيُدَاوُوْنَ دَآءَكُمْ اَمْ هُمْ مٰلِكُ يَوْمِ الدِّيْنِ - بَلِ اللّٰهُ يُرَبِّيْ وَيَرْحَمُ بِتَكْمِيْلِ الرِّفَآءِ وَعَطَآءِ اَسْبَابِ الْاِهْتِدَآءِ وَاسْتِجَابَةِ الدُّعَآءِ وَالتَّنْجِيَةِ مِنَ الْاَعْدَآءِ وَسَيُعْطِيْ اَجْرَ الْعَامِلِيْنَ الصَّالِحِيْنَ -

وَفِيْ لَفْظِ الْحَمْدِ اِشَارَةٌ اُخْرٰى وَهِيَ اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ اَيُّهَا الْعِبَادُ اعْرِفُوْنِيْ بِصِفَاتِيْ وَتَعَرَّفُوْنِيْ بِكَمَالَاتِيْ فَاِنِّيْ لَسْتُ كَالنَّاقِصِيْنَ بَلْ يَزِيْدُ حَمْدِيْ عَلٰى اِطْرَآءِ الْحَامِدِيْنَ - وَلَنْ تَجِدَ

متولی اور ضامن اللہ تعالیٰ کی حمد کی جانی چاہیئے۔ اس لیے یہ (الحمد للہ) ایسے لوگوں اور دوسرے تمام مشرکوں کی تردید ہے اور فراست سے کام لینے والوں کے لیے (اس میں) نصیحت ہے۔ اور ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ بت پرستوں یہودیوں عیسائیوں اور دوسرے تمام مشرکوں کو سرزنش کرتا ہے۔ گویا وہ یہ کہتا ہے کہ اے مشرکو تم اپنے شرکاء کی کیوں حمد کرتے ہو اور اپنے بزرگوں کی تعریف بڑھا چڑھا کر کیوں کرتے ہو؟ کیا وہ تمہارے رب ہیں جنہوں نے تمہاری اور تمہاری اولاد کی پرورش کی ہے یا وہ ایسے رحم کرنے والے ہیں جو تم پر ترس کھاتے ہیں اور تمہاری مصیبتوں کو دور کرتے ہیں اور تمہارے دکھوں اور تکلیفوں کی روک تھام کرتے ہیں۔ یا جو بھلائی تمہیں مل چکی ہے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ یا مصائب کی میل کچیل تمہارے وجود سے دھوتے ہیں اور تمہاری بیماری کا علاج کرتے ہیں۔ کیا وہ جزا سزا کے دن کے مالک ہیں؟ نہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خوشیوں کی تکمیل کرنے، ہدایت کے اسباب مہیا کرنے، دعائیں قبول کرنے اور دشمنوں سے نجات دینے کے ذریعہ تم پر رحم فرماتا اور تمہاری پرورش کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو ضرور اجر عطا کرے گا۔

اور لفظ حمد میں ایک اور اشارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے (میرے) بندو! میری صفات سے مجھے شناخت کرو اور میرے کمالات سے مجھے پہچانو میں ناقص ہستیوں کی مانند نہیں بلکہ میری حمد کا مقام (انتہائی مبالغہ سے) حمد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے۔

مَحَامِدَ لَا فِي السَّمٰوَاتِ وَلَا فِي الْاَرَضِيْنَ اِلَّا وَتَجِدُهَا فِيْ وَجْهِيْ وَاِنْ اَرَدْتَّ
اِحْصَآءَ مَحَامِدِيْ فَلَنْ تُحْصِيَهَا وَاِنْ فَكَّرْتَ بِشِقِّ نَفْسِكَ وَكَلَّفْتَ
فِيْهَا كَالْمُسْتَغْرِقِيْنَ - فَانْظُرْ هَلْ تَرٰى مِنْ حَمْدٍ لَّا يُوْجَدُ فِيْ ذَاتِيْ
وَهَلْ تَجِدُ مِنْ كَمَالٍ بَعُدَ مِنِّيْ وَمِنْ حَضْرَتِيْ فَاِنْ زَعَمْتَ كَذَالِكَ
فَمَا عَرَفْتَنِيْ وَاَنْتَ مِنْ قَوْمٍ عَمِيْنَ - بَلْ اِنَّنِيْ اُعْرَفُ بِمَحَامِدِيْ وَ
كَمَالَاتِيْ وَيُرٰى وَابِلِيْ بِسُحُبِ بَرَكَاتِيْ - فَالَّذِيْنَ حَسِبُوْنِيْ مُسْتَجْمِعَ
جَمِيْعِ صِفَاتٍ كَامِلَةٍ وَّكَمَالَاتٍ شَامِلَةٍ وَّمَا وَجَدُوْا مِنْ كَمَالٍ وَّمَا رَءَوْا
مِنْ جَلَالٍ اِلٰى جَوْلَانِ خَيَالٍ اِلَّا وَنَسَبُوْهَا اِلَيَّ وَعَزَوْا اِلَيَّ كُلَّ عَظَمَةٍ ظَهَرَتْ
فِيْ عُقُوْلِهِمْ وَاَنْظَارِهِمْ وَكُلَّ قُدْرَةٍ تَرَآءَتْ اَمَامَ اَفْكَارِهِمْ فَهُمْ قَوْمٌ
يَّمْشُوْنَ عَلٰى طُرُقِ مَعْرِفَتِيْ وَالْحَقُّ مَعَهُمْ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الْفَآئِزِيْنَ - فَقُوْمُوْا
عَافَاكُمُ اللّٰهُ وَاسْتَقْرُوْا مَحَامِدَهٗ عَزَّ اسْمُهٗ وَانْظُرُوْا وَاَمْعِنُوْا فِيْهَا كَالْاَكْيَاسِ
وَالْمُتَفَكِّرِيْنَ - وَاسْتَنْفِضُوْا وَاسْتَشِفُّوْا اَنْظَارَكُمْ اِلٰى كُلِّ جِهَةٍ

اور تم آسمانوں اور زمینوں میں کوئی قابل تعریف صفات نہیں پاؤ گے جو تمہیں میری ذات میں نہ مل سکیں۔ اور اگر تم میری قابل حمد صفات
کو شمار کرنا چاہو تو تم ہرگز انہیں نہیں گن سکو گے۔ اگرچہ تم کتنا ہی جان توڑ کر سوچو اور اپنے کام میں مستغرق ہونے والوں کی طرح
ان صفات کے بارہ میں کتنی ہی تکلیف اٹھاؤ خوب سوچو کیا تمہیں کوئی ایسی حمد نظر آتی ہے جو میری ذات میں نہ پائی جاتی ہو۔
کیا تمہیں ایسے کمال کا سراغ ملتا ہے جو مجھ سے اور میری بارگاہ سے بعید ہو اور اگر تم ایسا گمان کرتے ہو تو تم نے مجھے پہچانا
ہی نہیں اور تم اندھوں میں سے ہو۔ بلکہ یقیناً میں (اللہ تعالیٰ) اپنی ستودہ صفات اور اپنے کمالات سے پہچانا جاتا ہوں اور میری
موسلادھار بارش کا پتہ میری برکات کے بادلوں سے ہوتا ہے۔ پس جن لوگوں نے مجھے تمام صفات کاملہ اور تمام کمالات کا
جامع یقین کیا اور انہوں نے جہاں جو کمال بھی دیکھا اور اپنے خیال کی انتہائی پرواز تک انہیں جو جلال بھی نظر آیا انہوں نے اُسے
میری طرف ہی نسبت دی۔ اور ہر عظمت جو ان کی عقلوں اور نظروں میں نمایاں ہوئی اور ہر قدرت جو ان کے افکار کے آئینہ
میں انہیں دکھائی دی انہوں نے اسے میری طرف ہی منسوب کیا۔ پس یہ ایسے لوگ ہیں جو میری معرفت کی راہوں پر گامزن ہیں
حق ان کے ساتھ ہے اور وہ کامیاب ہونے والے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ تمہیں عافیت سے رکھے اٹھو خدائے ذوالجلال کی
صفات کی تلاش میں لگ جاؤ اور دانشمندوں اور غور و فکر کرنے والوں کی طرح ان میں سوچ و بچار اور امعان نظر سے کام لو۔
اچھی طرح دیکھ بھال کرو اور کمال کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالو۔ اور اس عالم کے ظاہر میں اور اس کے باطن میں اسے اس طرح

كَمَالِ وَّتَحَسَّسُوْا مِنْهُ فِيْ فَيْضِ الْعَالَمِ وَلُجِّهٖ كَمَا يَتَحَسَّسُ الْحَرِيْصُ اَمَانِيَّهٗ بِشُحِّهٖ فَاِذَا وَجَدْتُّمْ كَمَالَهُ التَّآمَّ وَرَيَّاهُ فَاِذَا هُوَ اِيَّاهُ ۔ وَهٰذَا سِرٌّ لَّا يَبْدُوْ اِلَّا عَلَى الْمُسْتَرْشِدِيْنَ ۔ فَذٰلِكُمْ رَبُّكُمْ وَمَوْلٰكُمُ الْكَامِلُ الْمُسْتَجْمِعُ لِجَمِيْعِ الصِّفَاتِ الْكَامِلَةِ وَالْمَحَامِدِ التَّآمَّةِ الشَّامِلَةِ وَلَا يَعْرِفُهٗ اِلَّا مَنْ تَدَبَّرَ فِي الْفَاتِحَةِ وَاسْتَعَانَ بِقَلْبٍ حَزِيْنٍ ۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ يُخْلِصُوْنَ مَعَ اللّٰهِ نِيَّةَ الْعَقْدِ وَيُعْطُوْنَهٗ صَفْقَةَ الْعَهْدِ وَيُطَهِّرُوْنَ اَنْفُسَهُمْ مِّنَ الضِّغْنِ وَالْحِقْدِ تُفَتَّحُ عَلَيْهِمْ اَبْوَابُهَا فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْمُبْصِرِيْنَ ۔

وَمَعَ ذَالِكَ فِيْهِ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّهٗ مَنْ هَلَكَ بِخَطَاءٍ فِيْ اَمْرِ مَعْرِفَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَوِ اتَّخَذَ اِلٰهًا غَيْرَهٗ فَقَدْ هَلَكَ مِنْ زَّنْفِ رِعَايَةِ كَمَالَاتِهٖ وَتَرْكِ التَّاَنُّقِ فِيْ عَجَائِبَاتِهٖ وَالْغَفْلَةِ عَمَّا يَلِيْقُ بِذَاتِهٖ كَمَا هُوَ عَادَةُ الْمُبْطِلِيْنَ ۔ اَلَا تَنْظُرُ اِلَى النَّصَارٰى اَنَّهُمْ دُعُوْا اِلَى التَّوْحِيْدِ فَمَا اَهْلَكَهُمْ اِلَّا هٰذِهِ الْعِلَّةُ وَسَوَّلَتْ لَهُمُ النَّفْسُ الْمُضِلَّةُ وَالشَّهْوَةُ الْمُزِلَّةُ اَنِ اتَّخَذُوْا

تلاش کرو جیسے ایک حریص انسان بڑی رغبت سے اپنی خواہشات کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ پس جب تم اس کے کمالِ تام کو پہنچ جاؤ اور اس کی خوشبو پاؤ تو گویا تم نے اسی کو پا لیا اور یہ ایسا راز ہے جو صرف ہدایت کے طالبوں پر ہی کھلتا ہے۔ پس یہ تمہارا رب اور تمہارا آقا ہے جو خود کامل ہے اور تمام صفات کاملہ اور محامد کا جامع ہے۔ اس کو وہی شخص پہچان سکتا ہے جو سورۃ فاتحہ میں تدبّر کرے اور درد مند دل کے ساتھ خدا تعالیٰ سے مدد مانگے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے عہد باندھتے وقت اپنی نیت کو خالص کر لیتے ہیں اور اس سے عہد بیعت باندھتے ہیں اور اپنے نفوس کو ہر قسم کے بغض اور کینہ سے پاک کرتے ہیں ان پر اس سورۃ کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ فوراً صاحب بصیرت بن جاتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی الحمد للہ میں ایک یہ اشارہ بھی ہے کہ جو معرفت باری تعالیٰ کے معاملہ میں اپنے بداعمال سے ہلاک ہوا یا اس کے سوا کسی اور کو معبود بنا لیا تو سمجھو کہ وہ شخص خدا تعالیٰ کے کمالات کی طرف سے اپنی توجہ پھیر لینے، اس کے عجائبات کا نظارہ نہ کرنے اور جو امور اس کی شایانِ شان ہیں ان سے باطل پرستوں کی طرح غفلت برتنے کے نتیجہ میں ہلاک ہو گیا۔ کیا تو نصاریٰ کو نہیں دیکھتا کہ انہیں توحید کی دعوت دی گئی تو انہیں اسی بیماری نے ہلاک کیا اور ان کے گمراہ کرنے والے نفس اور پھسلا دینے والی خواہشات نے ان کے لیے (یہ گمراہ کن) خیال خوبصورت کر کے دکھایا اور انہوں نے ایک (عاجز) بندے کو خدا بنا لیا۔

عَبْدًا اِلٰهًا وَّارْتَضَعُوْا عُقَارَ الضَّلَالَةِ وَالْجَهَالَةِ وَنَسُوْا كَمَالَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَا يَجِبُ لِذَاتِهٖ وَنَحَتُوْا لِلّٰهِ الْبَنَاتِ وَالْبَنِيْنَ ـ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَمْعَنُوْا اَنْظَارَهُمْ مِّنْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَمَا يَلِيْقُ لَهٗ مِنَ الْكَمَالَاتِ لَمَا اَخْطَأَ تَوَسُّمُهُمْ وَمَا كَانُوْا مِنَ الْهَالِكِيْنَ ـ فَاَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰهُنَا اَنَّ الْقَانُوْنَ الْعَاصِمَ مِنَ الْخَطَأِ فِيْ مَعْرِفَةِ الْبَارِئِ عَزَّ اسْمُهٗ اِمْعَانُ النَّظَرِ فِيْ كَمَالَاتِهٖ وَتَتَبُّعُ صِفَاتٍ تَلِيْقُ بِذَاتِهٖ وَتَذَكُّرُ مَا هُوَ اَوْلٰى مِنْ جَدْوٰى وَاَحْرٰى مِنْ عَدْوٰى وَتَصَوُّرُ مَا اَثْبَتَ بِاَفْعَالِهٖ مِنْ قُوَّتِهٖ وَحَوْلِهٖ وَقَهْرِهٖ وَطَوْلِهٖ فَاحْفَظْهُ وَلَا تَكُنْ مِّنَ اللَّافِتِيْنَ ـ وَاعْلَمْ اَنَّ الرُّبُوْبِيَّةَ كُلَّهَا لِلّٰهِ وَالرَّحْمَانِيَّةَ كُلَّهَا لِلّٰهِ وَالرَّحِيْمِيَّةَ كُلَّهَا لِلّٰهِ وَالْحُكْمَ فِيْ يَوْمِ الْمُجَازَاتِ كُلَّهٗ لِلّٰهِ فَاِيَّاكَ وَتَابِّيْكَ مِنْ مُّطَاوَعَةِ مُرَبِّيْكَ وَكُنْ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ الْمُوَحِّدِيْنَ ـ وَاَشَارَ فِي الْاٰيَةِ اِلٰى اَنَّهٗ تَعَالٰى مُنَزَّهٌ مِّنْ تَجَدُّدِ صِفَةٍ وَّحُؤُوْلِ حَالَةٍ وَّلُحُوْقِ وَصْمَةٍ وَحَوْرٍ بَعْدَ كَوْرٍ بَلْ قَدْ ثَبَتَ الْحَمْدُ لَهٗ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا اِلٰى اَبَدِ الْاٰبِدِيْنَ ـ وَمَنْ قَالَ خِلَافَ ذَالِكَ فَقَدِ احْرَوْرَفَ

اور گمراہی اور جہالت کی شراب پی لی۔ اللہ تعالیٰ کے کمال اور اس کی صفات ذاتیہ کو بھول گئے اور اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراش لیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے شایان شان کمالات پر گہری نظر ڈالتے تو ان کی عقل خطا نہ کرتی اور وہ ہلاک ہونے والوں میں سے نہ ہو جاتے۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی معرفت کے بارہ میں غلطی سے بچانے والا قانون یہ ہے کہ اس کے کمالات میں پورا غور کیا جائے اور اس کی ذات کے لائق صفات کی جستجو کی جائے اور ان صفات کا ورد کیا جائے جو ہر مادی عطیہ سے بہتر اور ہر مدد سے مناسب تر ہیں اور اس نے اپنے کاموں سے جو صفات ثابت کی ہیں یعنی اس کی قوت اس کی طاقت اس کا غلبہ اور اس کی سخاوت کا تصور کیا جائے۔ پس اس بات کو یاد رکھو اور لاپرواہ مت بنو اور جان لو کہ ربوبیت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔ اور رحمانیت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے۔ اور رحیمیت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے اور جزا سزا کے دن کامل حکومت اللہ کے لیے ہے پس اے مخاطب اپنے پرورش کنندہ کی اطاعت سے انکار نہ کر اور موحد مسلمانوں میں سے بن جا۔ پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ پہلی صفت کے زوال کے بعد کسی نئی صفت کو اختیار کرنے اور اپنی شان کے تبدیل ہونے اور کسی عیب کے لاحق ہونے اور نقص کے بعد خوبی کے پانے سے پاک ہے۔ بلکہ اس کے لیے اول و آخر اور ظاہر و باطن میں ابدالاباد تک حمد ثابت ہے۔ اور جو اس

وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔

وَقَدْ عَلِمْتَ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ رَدٌّ عَلَى النَّصَارٰى وَعَبَدَةِ الْاَوْثَانِ فَاِنَّهُمْ لَا يُوْفُوْنَ اللّٰهَ حَقَّهٗ وَلَا يَرْجُوْنَ لَهٗ بَرْقَهٗ بَلْ يُغْدِنُوْنَ عَلَيْهِ سِتَارَةَ الظَّلَامِ وَيُلْقُوْنَهٗ فِيْ سُبُلِ الْاٰلَامِ وَيُبْعِدُوْنَهٗ مِنَ الْكَمَالِ التَّامِّ وَيُشْرِكُوْنَ بِهٖ كَثِيْرًا مِّنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ۔ فَهٰذَا هُوَ الظَّنُّ الَّذِيْ اَرْدَاهُمْ وَالتَّقْلِيْدُ الَّذِيْ اَبَادَهُمْ وَاَهْلَكَهُمْ بِمَا عَوَّلُوْا عَلٰى اَقْوَالِ الْمُفْتَرِيْنَ۔ وَزَعَمُوْا اَنَّهُمْ مِّنَ الصَّادِقِيْنَ وَقَالُوْا اِنَّ هٰذِهٖ فِي الْاٰثَارِ الْمُنْتَقَاةِ الْمُدَوَّنَةِ عَنِ الثِّقَاتِ وَمَا تَوَجَّهُوْا اِلٰى عَثْرِ اٰبَآءِهِمْ وَجَهْلِ عُلَمَآءِهِمْ وَتَشْرِيْقِهِمْ وَتَغْرِيْبِهِمْ مِّنْ مَّرَاكِزِ تَعَالِيْمِ النَّبِيِّيْنَ۔ وَتَيَهِهِمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ هَآئِمِيْنَ۔ وَالْعَجَبُ مِنْ فَهْمِهِمْ وَعَقْلِهِمْ اَنَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ كَامِلٌ تَامٌّ لَّا يَجُوْزُ فِيْهِ نَقْصٌ وَّشُنْعَةٌ وَّشُحُوْبٌ وَّذُهُوْلٌ وَّتَغَيُّرٌ وَّحُؤُوْلٌ ثُمَّ يُجَوِّزُوْنَ فِيْهِ كَثِيْرًا مِّنْهَا وَيَنْسِبُوْنَ اِلَيْهِ كُلَّ شَقْوَةٍ وَّخُسْرَانٍ وَّعَيْبٍ وَّنُقْصَانٍ وَّ

کے خلاف کہے وہ حق سے برگشتہ ہوکر کافروں میں سے ہوگیا۔

آپ کو معلوم ہوگیا ہے کہ یہ آیت نصاریٰ اور بت پرستوں کی تردید کرتی ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق پوری طرح ادا نہیں کرتے اور اس کی روشنی کے پھیلنے کی امید نہیں رکھتے بلکہ اس پر اندھیرے کا پردہ پھیلا دیتے ہیں۔ اور اس کو دُکھوں کی راہوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اور اس کو پورے کمال سے دور رکھتے ہیں۔ اور مخلوق میں سے ایک کثیر حصّہ کو اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ پس یہ ایسا غلط خیال ہے جس نے ان کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور وہ اندھی تقلید ہے جس نے ان کو برباد کر دیا ہے۔ مفتریوں کے اقوال پر بھروسہ کرنے نے ان کو ہلاک کر دیا اور انہوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ وہ سچے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ باتیں احادیث کی منتخب مدون کتابوں میں ثقہ راویوں سے درج ہیں۔ انہوں نے اپنے آباء کے ٹھوکریں کھانے اور اپنے علماء کے ناواقف ہونے اور ان کے انبیاء کی تعلیموں کے مراکز سے مشرق و مغرب کی طرح دور اور ہر وادی میں حیران و پریشان بھٹکنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کے عقل و فہم پر تعجب ہے کہ وہ جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پوری طرح کامل ہے اس میں کسی کمی یا قباحت یا میلاپن یا فروگذاشت یا تغیر و تبدل کا کوئی جواز نہیں۔ پھر وہ اس میں بہت سی ایسی باتوں کو روا رکھتے ہیں اور اس کی طرف ہر بدبختی، گھاٹے، عیب اور نقصان کو منسوب کرتے ہیں اور اس بات کی خود ہی تکذیب کر رہے ہیں جس کی انہوں نے پہلے تصدیق کی تھی اور پاگلوں کی طرح

يُكَذِّبُوْنَ مَا كَانُوا صَدَّقُوْهُ اَوَّلًا وَّيَهْذُوْنَ كَالْمَجَانِيْنَ۔

وَفِيْ لَفْظِ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" تَعْلِيْمٌ لِّلْمُسْلِمِيْنَ اَنَّهُمْ اِذَا سُئِلُوْا وَقِيْلَ لَهُمْ مَّنْ اِلٰهُكُمْ فَوَجَبَ عَلَى الْمُسْلِمِ اَنْ يُّجِيْبَهٗ اَنَّ اِلٰهِيَ الَّذِيْ لَهُ الْحَمْدُ كُلُّهٗ وَمَا مِنْ نَّوْعِ كَمَالٍ وَّقُدْرَةٍ اِلَّا وَلَهٗ ثَابِتٌ فَلَا تَكُنْ مِّنَ النَّاسِيْنَ. وَلَوْ لَاحَظَ الْمُشْرِكِيْنَ حَظُّ الْاِيْمَانِ وَاَصَابَهُمْ طَلٌّ مِّنَ الْعِرْفَانِ لَمَا طَاحَ بِهِمْ ظَنُّ السَّوْءِ بِالَّذِيْ هُوَ قَيُّوْمُ الْعَالَمِيْنَ۔ وَلٰكِنَّهُمْ حَسِبُوْهُ كَرَجُلٍ شَاخَ بَعْدَ الشَّبَابِ وَاحْتَاجَ بَعْدَ صَمَدِيَّتِهٖ اِلَى الْاَسْبَابِ وَوَقَعَتْ عَلَيْهِ شَدَائِدُ نُحُوْلٍ وَّقُحُوْلٍ وَّقَشَفٌ مُّحُوْلٌ وَّوَقَعَ فِي الْاَتْرَابِ بَلْ قَرُبَ مِنَ التَّبَابِ وَكَانَ مِنَ الْمُتْرَبِيْنَ ۔ (کراماتُ الصادقین صفحہ ۶۴ تا ۶۸)

اس سورۃ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے شروع کیا گیا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک حمد اور تعریف اُس ذات کے لیے مسلّم ہے جس کا نام اللہ ہے اور اس فقرہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے اس لیے شروع کیا گیا کہ اصل مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت روح کے جوش اور طبیعت کی کشش سے ہو اور ایسی کشش جو عشق اور محبت سے بھری ہوئی ہو ہرگز کسی کی نسبت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ وہ شخص ایسی کامل خوبیوں کا جامع ہے جن کے ملاحظہ سے بے اختیار دل تعریف کرنے لگتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ کامل تعریف دو قسم کی خوبیوں کے لیے ہوتی ہے۔ ایک کمالِ حُسن اور ایک کمالِ احسان اور اگر کسی میں دونوں خوبیاں جمع ہوں تو پھر اُس کے لیے دل فدا اور شیدا ہو جاتا ہے۔ اور قرآن شریف کا بڑا مطلب یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی دونوں قسم کی خوبیاں حق کے طالبوں پر ظاہر کرے تا اُس بے مثل و مانند ذات کی طرف

بکواس کرتے رہتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے الفاظ میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب اُن سے سوال کیا جائے اور اُن سے پوچھا جائے کہ اُن کا معبود کون ہے تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ یہ جواب دے کہ میرا معبود وہ ہے جس کے لیے سب حمد ہے اور کسی قسم کا کوئی کمال اور قدرت ایسی نہیں مگر وہ اس کے لیے ثابت ہے۔ پس تو بھولنے والوں میں سے نہ بن۔ اگر مشرکوں پر ایمان کی کچھ بھی جھلک پڑ جاتی اور ان پر عرفان کی ہلکی سی بارش بھی ہو جاتی تو انہیں قیومِ عالمین پر بدظنی کرنا تباہ نہ کرتا۔ لیکن انہوں نے خدا تعالیٰ کو ایسے شخص کی مانند سمجھ لیا جو جوانی کے بعد بوڑھا ہو گیا ہو اور اپنی بے نیازی کے بعد محتاج ہو گیا ہو اس پر بڑھاپا اور لاغری کی مصیبتیں اور قحط کی سختیاں وارد ہوئی ہوں اور وہ مٹی میں مل گیا بلکہ تباہی کے کنارے جا لگا ہو اور بالکل محتاج ہو گیا ہو۔

لوگ کھینچے جائیں اور رُوح کے جوش اور کشش سے اُس کی بندگی کریں۔ اس لیے پہلی سورۃ میں ہی یہ نہایت لطیف نقشہ دکھلانا چاہا ہے کہ وہ خدا جس کی طرف قرآن بُلاتا ہے وہ کیسی خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔ سو اسی غرض سے اس سورۃ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کیا گیا جس کے یہ معنے ہیں کہ سب تعریفیں اُس کی ذات کے لیے لائق ہیں جس کا نام اللہ ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح کی رو سے اللہ اُس ذات کا نام ہے جس کی تمام خوبیاں حُسن و احسان کے کمال کے نقطہ پر پہنچی ہوئی ہوں اور کوئی منقصت اُس کی ذات میں نہ ہو قرآن شریف میں تمام صفات کا موصوف صرف اللہ کے اسم کو ہی ٹھہرایا ہے تا اِس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اللہ کا اِسم تب متحقق ہوتا ہے کہ جب تمام صفات کاملہ اُس میں پائی جائیں۔ پس جبکہ ہر ایک قسم کی خوبی اُس میں پائی گئی تو حُسن اُس کا ظاہر ہے۔ اِسی حُسن کے لحاظ سے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا نام نور ہے جیسا کہ فرمایا ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] یعنی اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے۔ ہر ایک نور اُسی کے نور کا پرتوہ ہے۔ اور احسان کی خوبیاں اللہ تعالیٰ کی بہت ہیں جن میں سے چار بطور اصل الاصول ہیں اور اُن کی ترتیب طبعی کے لحاظ سے پہلی خوبی وہ ہے جس کو سورۃ فاتحہ میں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے فقرہ میں بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ربوبیّت یعنی پیدا کرنا اور کمال مطلوب تک پہنچانا تمام عالموں میں جاری و ساری ہے۔ یعنی عالم سماوی اور عالم ارضی اور عالم اجسام اور عالم ارواح اور عالم جواہر اور عالم اعراض اور عالم حیوانات اور عالم نباتات اور عالم جمادات اور دوسرے تمام قسم کے عالم اُس کی ربوبیت سے پرورش پا رہے ہیں یہاں تک کہ خود انسان پر ابتدا نطفہ ہونے کی حالت سے بلکہ اُس سے پہلے بھی جو جو عالم موت تک یا دوسری زندگی کے زمانہ تک آتے ہیں وہ سب چشمۂ ربوبیت سے فیض یافتہ ہیں پس ربوبیت الٰہی بوجہ اِس کے کہ وہ تمام ارواح و اجسام و حیوانات و نباتات و جمادات وغیرہ پر مشتمل ہے فیضان اعم سے موسوم ہے کیونکہ ہر ایک موجود اس سے فیض پاتا ہے اور اُسی کے ذریعہ سے ہر ایک چیز وجود پذیر ہے۔ ہاں البتہ ربوبیت الٰہی اگرچہ ہر ایک موجود کی موجد اور ہر ایک ظہور پذیر چیز کی مُربّی ہے۔ لیکن بحیثیت احسان کے سب سے زیادہ فائدہ اِس کا انسان کو پہنچتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے انسان فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اس لیے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ تمہارا خدا رَبّ العالمین ہے تا انسان کی امید زیادہ ہو اور یقین کرے کہ ہمارے فائدہ کے لیے خدا تعالیٰ کی قدرتیں وسیع ہیں اور طرح طرح کے عالم اسباب ظہور میں لا سکتا ہے۔ دوسری خوبی خدا تعالیٰ کی جو دوسرے درجہ کا احسان ہے جس کو فیضانِ عام سے موسوم کر سکتے ہیں رحمانیت ہے۔ جس کو سورہ فاتحہ میں الرحمٰن کے فقرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور قرآن شریف کی اصطلاح کی رو سے خدا تعالیٰ کا نام رحمٰن اس وجہ سے ہے کہ اُس نے ہر ایک جاندار کو جن میں انسان بھی داخل ہے اُس کے مناسب حال صورت اور سیرت بخشی یعنے جس طرز کی زندگی اُس کے لیے ارادہ کی گئی اُس زندگی کے مناسب حال جن قوتوں اور طاقتوں کی ضرورت تھی یا جس قسم کی بناوٹ جسم اور اعضا کی حاجت تھی وہ سب اُس کو عطا کیے اور پھر اُس

---

[1] النور : ۳۶

کی بقا کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اُس کے لیے مہیا کیں۔ پرندوں کے لیے پرندوں کے مناسب حال اور چرندوں کے لیے چرندوں کے مناسب حال اور انسان کے لیے انسان کے مناسب حال طاقتیں عنایت کیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ان چیزوں کے وجود سے ہزار ہا برس پہلے بوجہ اپنی صفت رحمانیت کے اجرام سماوی وارضی کو پیدا کیا تا وہ ان چیزوں کے وجود کی محافظ ہوں۔ پس اِس تحقیق سے ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت میں کسی کے عمل کا دخل نہیں۔ بلکہ وہ رحمت محض ہے جس کی بُنیاد ان چیزوں کے وجود سے پہلے ڈالی گئی۔ ہاں انسان کو خدا تعالیٰ کی رحمانیت سے سب سے زیادہ حصہ ہے کیونکہ ہر ایک چیز اُس کی کامیابی کے لیے قربان ہو رہی ہے۔ اس لیے انسان کو یاد دلایا گیا کہ تمہارا خدا رحمان ہے۔

تیسری خوبی خُدا تعالیٰ کی جو تیسرے درجہ کا احسان ہے رحیمیّت ہے جس کو سورۂ فاتحہ میں الرحیم کے فقرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور قرآن شریف کی اصطلاح کے رو سے خدا تعالیٰ رحیم اُس حالت میں کہلاتا ہے جبکہ لوگوں کی دُعا اور تضرع اور اعمال صالحہ کو قبول فرما کر آفات اور بلاؤں اور تضیع اعمال سے اُن کو محفوظ رکھتا ہے یہ احسان دوسرے لفظوں میں فیض خاص سے موسوم ہے اور صرف انسان کی نوع سے مخصوص ہے۔ دوسری چیزوں کو خدا نے دُعا اور تضرع اور اعمال صالحہ کا ملکہ نہیں دیا مگر انسان کو دیا ہے انسان حیوان ناطق ہے اور اپنی نطق کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا فیض پا سکتا ہے دوسری چیزوں کو نُطق عطا نہیں ہوا۔ پس اس جگہ سے ظاہر ہے کہ انسان کا دُعا کرنا اُس کی انسانیت کا ایک خاصہ ہے جو اُس کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ اور جس طرح خدا تعالیٰ کی صفات ربوبیّت اور رحمانیّت سے فیض حاصل ہوتا ہے اسی طرح صفت رحیمیت سے بھی ایک فیض حاصل ہوتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ ربوبیّت اور رحمانیت کی صفتیں دُعا کو نہیں چاہتیں کیونکہ وہ دونوں صفات انسان سے خصوصیت نہیں رکھتیں اور تمام پرند چرند کو اپنے فیض سے مستفیض کر رہی ہیں بلکہ صفت ربوبیت تو تمام حیوانات اور نباتات اور جمادات اور اجرام ارضی اور سماوی کو فیض رساں ہے اور کوئی چیز اُس کے فیض سے باہر نہیں۔ برخلاف صفت رحیمیت کے کہ وہ انسان کے لیے ایک خلعت خاصہ ہے۔ اور اگر انسان ہو کر اُس صفت سے فائدہ نہ اٹھاوے تو گویا ایسا انسان حیوانات بلکہ جمادات کے برابر ہے جبکہ خدا تعالیٰ نے فیض رسانی کی چار صفت اپنی ذات میں رکھی ہیں اور رحیمیت کو جو انسان کی دعا کو چاہتی ہے خاص انسان کے لیے مقرر فرمایا ہے پس اس سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ میں ایک قسم کا وہ فیض ہے جو دُعا کرنے سے وابستہ ہے اور بغیر دُعا کے کسی طرح مل نہیں سکتا۔ یہ سُنت اللہ اور قانون الٰہی ہے جس میں تخلف جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام اپنی اپنی امتوں کے لیے ہمیشہ دُعا مانگتے رہے۔ توریت میں دیکھو کہ کتنی دفعہ بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کو ناراض کر کے عذاب کے قریب پہنچ گئے اور پھر کیونکر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دُعا اور تضرع اور سجدہ سے وہ عذاب ٹل گیا حالانکہ بار بار وعدہ بھی ہوتا رہا کہ میں ان کو ہلاک کروں گا۔

اب ان تمام واقعات سے ظاہر ہے کہ دُعا محض لغو امر نہیں ہے۔ اور نہ صرف ایسی عبادت جس پر کسی قسم

کا فیض نازل نہیں ہوتا ۔ یہ اُن لوگوں کے خیال ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کا وہ قدر نہیں کرتے جو حق قدر کرنے کا ہے اور نہ خدا کی کلام کو نظر عمیق سے سوچتے ہیں ۔ اور نہ قانون قدرت پر نظر ڈالتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ دُعا پر ضرور فیض نازل ہوتا ہے جو ہمیں نجات بخشتا ہے ۔ اسی کا نام فیض رحیمیت ہے جس سے انسان ترقی ترقی کرتا جاتا ہے ۔ اسی فیض سے انسان ولایت کے مقامات تک پہنچتا ہے اور خدا تعالیٰ پر ایسا یقین لاتا ہے کہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے ۔ مسئلہ شفاعت بھی صفت رحیمیت کی بناء پر ہے خدا تعالیٰ کی رحیمیت نے ہی تقاضا کیا کہ اچھے آدمی بُرے آدمیوں کی شفاعت کریں ۔

چوتھا احسان خدا تعالیٰ کا جو قسم چہارم کی خوبی ہے جس کو فیضان اخصّ سے موسوم کر سکتے ہیں مالکیّت یوم الدین ہے جس کو سورہ فاتحہ میں فقرہ مالک یوم الدین میں بیان فرمایا گیا ہے ۔ اور اس میں اور صفت رحیمیت میں یہ فرق ہے کہ رحیمیت میں دعا اور عبادت کے ذریعہ سے کامیابی کا استحقاق قائم ہوتا ہے ۔ اور صفت مالکیت یوم الدین کے ذریعہ سے وہ ثمرہ عطا کیا جاتا ہے ۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے ایک انسان گورنمنٹ کا ایک قانون یاد کرنے میں محنت اور جدوجہد کر کے امتحان دے اور پھر اُس میں پاس ہو جائے ۔ پس رحیمیت کے اثر سے کسی کامیابی کے لیے استحقاق پیدا ہو جانا پاس ہو جانے سے مشابہ ہے اور پھر وہ چیز یا وہ مرتبہ میسّر آجانا جس کے لیے پاس ہوا تھا اس حالت سے مشابہ انسان کے فیض پانے کی وہ حالت ہے جو پرتوہ صفت مالکیّت یوم الدین سے حاصل ہوتی ہے ۔ اِن دونوں صفتوں رحیمیّت اور مالکیّت یوم الدین میں یہ اشارہ ہے کہ فیض رحیمیت خدا تعالیٰ کے رحم سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور فیض مالکیت یوم الدین خدا تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوتا ہے اور مالکیت یوم الدین اگرچہ وسیع اور کامل طور پر عالم معاد میں متجلّی ہو گی مگر اس عالم میں بھی اِس عالم کے دائرہ کے موافق یہ چاروں صفتیں تجلّی کر رہی ہیں ۔ ربوبیت عام طور پر ایک فیض کی بنا ڈالتی ہے اور رحمانیت اُس فیض کو جانداروں میں کُھلے طور پر دکھلاتی ہے اور رحیمیت ظاہر کرتی ہے کہ خط ممتد فیض کا انسان پر جا کر ختم ہو جاتا ہے ۔ اور انسان وہ جانور ہے جو فیض کو نہ صرف حال سے بلکہ مونہہ سے مانگتا ہے اور مالکیّت یوم الدین فیض کا آخری ثمرہ بخشتی ہے ۔ یہ چاروں صفتیں دُنیا میں ہی کام کر رہی ہیں مگر چونکہ دُنیا کا دائرہ نہایت تنگ ہے اور نیز جہل اور بیخبری اور کم نظری انسان کے شامل ہے اس لیے یہ نہایت وسیع دائرے صفات اربعہ کے اس عالم میں ایسے چھوٹے نظر آتے جیسے بڑے بڑے گولے ستاروں کے دور سے صرف نقطے دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن عالم معاد میں پورا نظارہ ان صفات اربعہ کا ہو گا ۔ اس لیے حقیقی اور کامل طور پر یوم الدین وہی ہو گا جو عالم معاد ہے ۔ اُس عالم میں ہر ایک صفت ان صفات اربعہ میں سے دوہری طور پر اپنی شکل دکھائے گی ۔ یعنی ظاہری طور پر اور باطنی طور پر اس لیے اُس وقت یہ چار صفتیں آٹھ صفتیں معلوم ہونگی اِسی کی طرف اشارہ ہے جو فرمایا گیا ہے کہ اِس دنیا میں چار فرشتے خدا تعالیٰ کا عرش اٹھا رہے ہیں اور اُس دن آٹھ فرشتے خدا تعالیٰ کا عرش اُٹھائیں گے ۔ یہ استعارہ کے طور پر کلام ہے ۔ چونکہ خدا تعالیٰ کی ہر صفت کے مناسب حال

ایک فرشتہ بھی پیدا کیا گیا ہے اس لیے چار صفات کے متعلق چار فرشتے بیان کیے گئے ۔ اور جب آٹھ صفات کی تجلی ہوگی تو اُن صفات کے ساتھ آٹھ فرشتے ہوں گے ۔ اور چونکہ یہ صفات الوہیت کی ماہیّت کو ایسا اپنے پر لیے ہوئے ہیں کہ گویا اُس کو اُٹھا رہے ہیں اس لیے استعارہ کے طور پر اُٹھانے کا لفظ بولا گیا ہے ۔ ایسے استعارات لطیفہ خدا تعالیٰ کی کلام میں بہت ہیں جن میں روحانیت کو جسمانی زندگی میں دکھایا گیا ہے ۔ غرض خدا تعالیٰ میں یہ چار صفات عظیمہ ہیں جن پر ہر ایک مسلمان کو ایمان لانا چاہیئے ۔ اور جو شخص دعا کے ثمرات اور فیوض سے انکار کرتا ہے گویا وہ بجائے چار صفتوں کے صرف تین صفتوں کو مانتا ہے ۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۸ تا ۲۳)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے قرآن شریف اسی لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی طرف ایما ہو ۔ (الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

حمد ہی سے محمد اور احمد نکلا ہے صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نام تھے گویا حمد کے دو مظہر ہوئے ۔ (الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳ اور ۴)

تمام محامد جو عالم میں موجود ہیں اور مصنوعات میں پائی جاتی ہیں ۔ وہ حقیقت میں خدا کی ہی تعریفیں ہیں اور اسی کی طرف راجع ہیں کیونکہ جو خوبی مصنوع میں ہوتی ہے وہ حقیقت میں صانع کی ہی خوبی ہے یعنی آفتاب دنیا کو روشن نہیں کرتا حقیقت میں خدا ہی روشن کرتا ہے اور چاند رات کی تاریکی نہیں اٹھاتا حقیقت میں خدا ہی اٹھاتا ہے اور بادل پانی نہیں برساتا حقیقت میں خدا ہی برساتا ہے اسی طرح جو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں وہ حقیقت میں خدا کی طرف سے ہی بینائی ہے اور جو کان سنتے ہیں وہ حقیقت میں خدا کی طرف سے ہی شنوائی ہے اور جو عقل دریافت کرتی ہے وہ حقیقت میں خدا کی طرف سے ہی دریافت ہے اور جو کچھ آسمان کے اور زمین کے عناصر اوصاف جمیلہ دکھا رہے ہیں اور ایک خوبصورتی اور تر و تازگی جو مشہود ہو رہی ہے حقیقت میں وہ اسی صانع کی صفت ہے جس نے کمال اپنی صفت کاملہ سے ان چیزوں کو پہنایا ہے اور پھر بنانے پر ہی انحصار نہیں کیا ۔ بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ ایک رحمت شامل رکھی ہے جس رحمت سے اس کا بقا اور وجود ہے اور پھر صرف اسی پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ ایک چیز کو اپنے کمال اعلیٰ تک پہونچایا ہے ۔ جس سے قدر و قیمت اس شے کی کھل جاتی ہے پس حقیقت میں محسن اور منعم بھی وہی ہے اور جامع تمام خوبیوں کا بھی وہی ہے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ (الحکم ۲۴ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۵)

سورۃ الفاتحہ پر جو قرآن شریف کا باریک نقشہ ہے اور ام الکتاب بھی جس کا نام ہے خوب غور کرو ۔ کہ اس میں اجمال کے ساتھ قرآن کریم کے تمام معارف درج ہیں چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے اس کو شروع کیا گیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ تمام

محامد اللہ ہی کے لیے ہیں اس میں یہ تعلیم ہے کہ تمام منافع اور تمدنی زندگی کی ساری بہبودگیاں اللہ ہی کی طرف سے آتی ہیں کیونکہ ہر قسم کی ستایش کا سزاوار جب کہ وہی ہے تو معطی حقیقی بھی وہی ہو سکتا ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ کسی قسم کی تعریف و ستایش کا مستحق وہ نہیں بھی ہے جو کفر کی بات ہے پس اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں کیسی توحید کی جامع تعلیم پائی جاتی ہے جو انسان کو دنیا کی تمام چیزوں کی عبودیت اور بالذات نفع رساں نہ ہونے کی طرف لے جاتی ہے اور واضح اور بیّن طور پر یہ ذہن نشین کرتی ہے کہ ہر نفع اور سود حقیقی اور ذاتی طور پر خدا تعالیٰ کی ہی طرف سے آتا ہے کیونکہ تمام محامد اُسی کے لیے سزاوار ہیں۔ پس ہر نفع اور سود میں خدا تعالیٰ ہی کو مقدم کرو۔ اُس کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے اگر خلاف ہو تو اولاد بھی دشمن ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ (الحکم ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

بجز اسلام دُنیا میں کوئی بھی ایسا مذہب نہیں ہے کہ جو خدائے تعالیٰ کو جمیع رذائل سے منزہ اور تمام محامد کاملہ سے متّصف سمجھتا ہو عام ہندو اپنے دیوتاؤں کو کارخانۂ ربوبیّت میں شریک سمجھتے ہیں اور خدا کے کاموں میں اُن کو مستقل طور پر دخیل قرار دیتے ہیں بلکہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ خدا کے ارادوں کو بدلنے والے اور اُس کی تقدیروں کو زیروزبر کرنے والے ہیں اور نیز ہندو لوگ کئی انسانوں اور دوسرے جانوروں کی نسبت بلکہ بعض ناپاک اور نجاست خوار حیوانات یعنی خنزیر وغیرہ کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی زمانہ میں اُن کا پرمیشر ایسی ایسی جونوں میں تولد پاکر اُن تمام آلائشوں اور آلودگیوں سے ملوث ہوتا رہا ہے کہ جو اُن چیزوں کے عائد حال ہیں اور نیز انہیں چیزوں کی طرح بھوک اور پیاس اور درد اور دُکھ اور خوف اور غم اور بیماری اور موت اور ذلّت اور رسوائی اور عاجزی اور ناتوانی کی آفات میں گرفتار ہوتا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام اعتقادات خدائے تعالیٰ کی خوبیوں میں بٹہ لگاتے ہیں اور اُس کے ازلی و ابدی جاہ و جلال کو گھٹاتے ہیں اور آریہ سماج والے جو اُن کے مُہذّب بھائی نکلے ہیں جن کا یہ گمان ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک وید کی لکیر پر چلتے ہیں وہ خدائے تعالیٰ کو خالقیت سے ہی جواب دیتے ہیں اور تمام روحوں کو اُس کی ذات کامل کی طرح غیر مخلوق اور واجب الوجود اور موجود بوجود حقیقی قرار دیتے ہیں حالانکہ عقل سلیم خدائے تعالیٰ کی نسبت صریح یہ نقص سمجھتی ہے کہ وہ دُنیا کا مالک کہلا کر پھر کسی چیز کا ربّ اور خالق نہ ہو اور دُنیا کی زندگی اُس کے سہارے سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی وجوب کے رو سے ہو اور جب عقل سلیم کے آگے یہ دونوں سوال پیش کیے جائیں کہ آیا خداوند قادرِ مطلق کے محامد تامہ کے لیے یہ بات اصلح اور انسب ہے کہ وہ آپ ہی اپنی قدرتِ کاملہ سے تمام موجودات کو منصۂ ظہور میں لاکر اُن سب کا ربّ اور خالق ہو اور تمام کائنات کا سلسلہ اُسی کی ربوبیّت تک ختم ہوتا ہو اور خالقیت کی صفت اور قدرت اُس کی ذاتِ کامل میں موجود ہو اور پیدایش اور موت کے نقصان سے پاک ہو یا یہ باتیں اُس کی شان کے لائق ہیں کہ جس قدر مخلوقات اُس کے قبضۂ تصرّف میں آ گئی ہیں یہ چیزیں اُس کی مخلوق نہیں ہیں اور نہ اُس کے سہارے سے اپنا وجود رکھتی ہیں اور نہ اپنے وجود اور بقا میں اُس کی محتاج ہیں اور نہ وہ اُن کا خالق اور ربّ

ہے اور نہ خالقیت کی صفت اور قُدرت اُس میں پائی جاتی ہے اور نہ پیدائش اور موت کے نقصان سے پاک ہے تو ہرگز عقل یہ فتویٰ نہیں دیتی کہ وہ جو دُنیا کا مالک ہے وہ دُنیا کا پیدا کنندہ نہیں اور ہزاروں پُر حکمت صفتیں کہ جو روحوں اور جسموں میں پائی جاتی ہیں وہ خود بخود ہیں اور اُن کا بنانے والا کوئی نہیں اور خدا جو ان سب چیزوں کا مالک کہلاتا ہے وہ فرضی طور پر مالک ہے اور نہ یہ فتویٰ دیتی ہے کہ اُس کو پیدا کرنے سے عاجز سمجھا جاوے یا ناطاقت اور ناقص ٹھہرایا جاوے یا پلیدی اور نجاست خواری کی نالائق اور قبیح عادت کو اُس کی طرف منسوب کیا جائے یا موت اور درد اور دُکھ اور بے علمی اور جہالت کو اُس پر روا رکھا جائے بلکہ صاف یہ شہادت دیتی ہے کہ خدائے تعالیٰ اِن تمام رذیلتوں اور نقصانوں سے پاک ہونا چاہیئے اور اُس میں کمالِ تام چاہیئے اور کمالِ تام قُدرتِ تام سے مشروط ہے اور جب خدائے تعالیٰ میں قُدرتِ تام نہ رہی اور نہ وہ کسی دوسری چیز کو پیدا کر سکا اور نہ اپنی ذات کو ہر یک قسم کے نقصان اور عیب سے بچا سکا تو اُس میں کمالِ تام بھی نہ رہا اور جب کمالِ تام نہ رہا تو محامدِ کاملہ سے وہ بے نصیب رہا۔

یہ ہندوؤں اور آریوں کا حال ہے اور جو کچھ عیسائی لوگ خدائے تعالیٰ کا جلال ظاہر کر رہے ہیں وہ ایک ایسا امر ہے کہ صرف ایک ہی سوال سے دانا انسان سمجھ سکتا ہے یعنی اگر کسی دانا سے پوچھا جائے کہ کیا اُس ذاتِ کامل اور قدیم اور غنی اور بے نیاز کی نسبت جائز ہے کہ باوجود اِس کے کہ وہ اپنے تمام عظیم الشان کاموں میں جو قدیم سے وہ کرتا رہا ہے آپ ہی کافی ہو۔ آپ ہی بغیر حاجت کسی باپ یا بیٹے کے تمام دُنیا کو پیدا کیا ہو اور آپ ہی تمام روحوں اور جسموں کو وہ قوتیں بخشی ہوں جن کی اُنہیں حاجت ہے اور آپ ہی تمام کائنات کا حافظ اور قیوم اور مدبّر ہو بلکہ اُن کے وجود سے پہلے جو کچھ اُن کو زندگی کے لیے درکار تھا وہ سب اپنی صفتِ رحمانیت سے ظہور میں لایا اور بغیر انتظار عمل کسی عامل کے سورج اور چاند اور بے شمار ستارے اور زمین اور ہزارہا نعمتیں جو زمین پر پائی جاتی ہیں محض اپنے فضل و کرم سے انسانوں کے لیے پیدا کی ہوں اور اِن سب کاموں میں کسی بیٹے کا محتاج نہ ہوا ہو لیکن پھر وہی کامل خدا آخری زمانہ میں اپنا تمام جلال اور اقتدار کالعدم کر کے مغفرت اور نجات دینے کے لیے بیٹے کا محتاج ہو جائے اور پھر بیٹا بھی ایسا ناقص بیٹا جس کو باپ سے کچھ بھی مناسبت نہیں جس نے باپ کی طرح نہ کوئی گوشہ آسمان کا اور نہ کوئی قطعہ زمین کا پیدا کیا جس سے اُس کی اُلوہیت ثابت ہو بلکہ مرقس کے ۸ باب ۱۲۔ آیت میں اُس کی عاجزانہ حالت کو اِس طرح بیان کیا ہے کہ اُس نے اپنے دل سے آہ کھینچ کر کہا کہ اِس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اِس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا اور اُس کے مصلوب ہونے کے وقت بھی یہودیوں نے کہا کہ اگر وہ اب ہمارے روبرو زندہ ہو جائے تو ہم ایمان لائیں گے لیکن اُس نے اُن کو زندہ ہو کر نہ دکھلایا اور اپنی خدائی اور قُدرتِ کاملہ کا ایک ذرہ ثبوت نہ دیا اور اگر بعض معجزات بھی دکھلائے تو وہ دکھلائے کہ اُس سے پہلے اَور نبی بکثرت دکھلا چکے تھے بلکہ اُسی زمانہ میں ایک حوض کے

پانی سے بھی ایسے ہی عجائبات ظہور میں آتے تھے (دیکھو باب پنجم انجیل یوحنا) غرض وہ اپنے خدا ہونے کا کوئی نشان دکھلا نہ سکا جیسا کہ آیت مذکورۂ بالا میں خود اُس کا اقرار موجود ہے بلکہ ایک ضعیفہ عاجزہ کے پیٹ سے تولّد پا کر (بقول عیسائیوں) وہ ذلت اور رسوائی اور ناتوانی اور خواری عمر بھر دیکھی کہ جو انسانوں میں سے وہ انسان دیکھتے ہیں کہ جو بدقسمت اور بے نصیب کہلاتے ہیں اور پھر مدّت تک ظلمت خانہ رحم میں قید رہ کر اور اُس ناپاک راہ سے کہ جو پیشاب کی بدرر و ہے پیدا ہو کر ہر یک قسم کی آلودہ حالت کو اپنے او پر وارد کر لیا اور بشری آلودگیوں اور نقصانوں میں سے کوئی ایسی آلودگی باقی نہ رہی جس سے وہ بیٹا باپ کا بدنام کنندہ ملوّث نہ ہوا اور پھر اُس نے اپنی جہالت اور بے علمی اور بے قدرتی اور نیز اپنے نیک نہ ہونے کا اپنی کتاب میں آپ ہی اقرار کر لیا اور پھر درصورتیکہ وہ عاجز بندہ کہ خواہ نخواہ خدا کا بیٹا قرار دیا گیا بعض بزرگ نبیوں سے فضائل علمی اور عملی میں کم بھی تھا اور اُس کی تعلیم بھی ایک ناقص تعلیم تھی کہ جو موسیٰ کی شریعت کی ایک فرع تھی تو پھر کیونکر جائز ہے کہ خداوند قادرِ مطلق اور ازلی اور ابدی پر یہ بہتان باندھا جاوے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذات میں کامل اور غنی اور قادرِ مطلق رہ کر آخر کار ایسے ناقص بیٹے کا محتاج ہو گیا اور اپنے سارے جلال اور بزرگی کو بہ یکبارگی کھو دیا میں ہرگز باور نہیں کرتا کہ کوئی دانا اُس ذاتِ کامل کی نسبت کہ جو مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہے ایسی ایسی ذلتیں جائز رکھے اور ظاہر ہے کہ اگر ابنِ مریم کے واقعات کو فضول اور بیہودہ تعریفوں سے الگ کر لیا جائے تو انجیلوں سے اُس کے واقعی حالات کا یہی خلاصہ نکلتا ہے کہ وہ ایک عاجز اور ضعیف اور ناقص بندہ یعنی جیسے کہ بندے ہوا کرتے ہیں اور حضرت موسیٰ کے ماتحت نبیوں میں سے ایک نبی تھا اور اُس بزرگ اور عظیم الشان رسول کا ایک تابع اور پس رو تھا اور خود اُس بزرگی کو ہرگز نہیں پہنچا تھا یعنی اُس کی تعلیم ایک اعلیٰ تعلیم کی فرع تھی مستقل تعلیم نہ تھی اور وہ خود انجیلوں میں اقرار کرتا ہے کہ میں نہ نیک ہوں اور نہ عالم الغیب ہوں نہ قادر ہوں بلکہ ایک بندہ عاجز ہوں اور انجیل کے بیان سے ظاہر ہے کہ اُس نے گرفتار ہونے سے پہلے کئی دفعہ رات کے وقت اپنے بچاؤ کے لیے دُعا کی اور چاہتا تھا کہ دُعا اُس کی قبول ہو جائے مگر اُس کی وہ دُعا قبول نہ ہوئی اور نیز جیسے عاجز بندے آزمائے جاتے ہیں وہ شیطان سے آزمایا گیا پس اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہر طرح عاجز ہی عاجز تھا مخرج معلوم کی راہ سے جو پلیدی اور ناپاکی کا مبرز ہے تولّد پا کر مدّت تک بھوک اور پیاس اور درد اور بیماری کا دُکھ اُٹھاتا رہا ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ بھوک کے دُکھ سے ایک انجیر کے نیچے گیا مگر چونکہ انجیر پھلوں سے خالی پڑی ہوئی تھی اس لیے محروم رہا اور یہ بھی نہ ہو سکا کہ دو چار انجیریں اپنے کھانے کے لیے پیدا کر لیتا غرض ایک مدّت تک ایسی ایسی آلودگیوں میں رہ کر اور ایسے ایسے دُکھ اٹھا کر بإقرار عیسائیوں کے مر گیا اور اس جہان سے اُٹھایا گیا اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا خداوند قادرِ مطلق کی ذات میں ایسی ہی صفاتِ ناقصہ ہونی چاہیئے کیا وہ اسی سے قدوس اور ذوالجلال کہلاتا ہے کہ وہ ایسے عیبوں اور نقصانوں سے بھرا ہوا ہے اور کیا ممکن ہے کہ ایک ہی ماں یعنی مریم کے پیٹ میں سے پانچ بچے پیدا ہو کر ایک بچہ خدا کا بیٹا بلکہ خدا بن گیا اور چار باقی جو

رہے اُن بے چاروں کو خدائی سے کچھ بھی حصہ نہ ملا بلکہ قیاس یہ چاہتا تھا کہ جب کہ کسی مخلوق کے پیٹ سے خدا بھی پیدا ہو سکتا ہے یہ نہیں کہ ہمیشہ آدمی سے آدمی اور گدھی سے گدھا پیدا ہو تو جہاں کہیں کسی عورت کے پیٹ سے خدا پیدا ہو تو پھر اُس پیٹ سے کوئی مخلوق پیدا نہ ہو بلکہ جس قدر بچے پیدا ہوتے جائیں وہ سب خدا ہی ہوں تا وہ پاک رحم مخلوق کے شرکت سے منزّہ رہے اور فقط خداؤں ہی کے پیدا ہونے کی ایک کان ہو پس قیاس متذکرہ بالا کے روسے لازم تھا کہ حضرت مسیح کے دوسرے بھائی اور بہن بھی کچھ نہ کچھ خدائی میں سے بخرہ پاتے اور ان پانچوں حضرات کی والدہ تو رب الارباب ہی کہلاتی کیونکہ یہ پانچوں حضرات روحانی اور جسمانی قوّتوں میں اسی سے فیض یاب ہیں عیسائیوں نے ابن مریم کی بیجا تعریفوں میں بہت سا افترا بھی کیا مگر پھر بھی اُس کے نقصانوں کو چھپا نہ سکے اور اُس کی آلودگیوں کا آپ اقرار کر کے پھر خواہ نخواہ اُس کو خدائے تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا یوں تو عیسائی اور یہودی اپنی عجیب کتابوں کے رو سے سب خدا کے بیٹے ہی ہیں بلکہ ایک آیت کے رو سے آپ ہی خدا ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بدھ مت والے اپنے افترا اور اختراع میں اُن سے اچھے رہے کیونکہ اُنہوں نے بدھ کو خدا ٹھہرا کر پھر ہرگز اُس کے لیے یہ تجویز نہیں کیا کہ اُس نے پلیدی اور ناپاکی کی راہ سے تولّد پایا تھا یا کسی قسم کی نجاست کھائی تھی بلکہ اُن کا بدھ کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ وہ مونہہ کے راستہ سے پیدا ہوا تھا پر افسوس عیسائیوں نے بہت سی جعل سازیاں تو کیں مگر یہ جعل سازی نہ سوجھی کہ مسیح کو بھی مونہہ کے راستہ سے ہی پیدا کرتے اور اپنے خدا کو پیشاب اور پلیدی سے بچاتے اور نہ یہ سوجھی کہ موت جو حقیقتِ الوہیت سے بالکل منافی ہے اُس پر وارد نہ کرتے اور نہ یہ خیال آیا کہ جہاں مریم کے بیٹے نے انجیلوں میں اقرار کیا ہے کہ میں نہ نیک ہوں اور نہ دانا مطلق ہوں نہ خود بخود آیا ہوں نہ عالم الغیب ہوں نہ قادر ہوں نہ دُعا کی قبولیت میرے ہاتھ میں ہے میں صرف ایک عاجز بندہ اور مسکین آدم زاد ہوں کہ جو ایک مالک رب العالمین کا بھیجا ہوا آیا ہوں اِن سب مقاموں کو انجیل سے نکال ڈالنا چاہیئے۔ اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو عظیم الشان صداقت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے مضمون میں ہے وہ بجز پاک اور مقدس مذہبِ اسلام کے کسی دوسرے مذہب میں ہرگز پائی نہیں جاتی لیکن اگر برہمو لوگ کہیں کہ صداقت مذکورہ بالا کے ہم قائل ہیں تو جاننا چاہیئے کہ وہ بھی اپنے اِس بیان میں جھوٹے ہیں کیونکہ ہم اسی مضمون میں لکھ چکے ہیں کہ برہمو لوگ خدائے تعالیٰ کے لیے گونگا اور غیر متکلم ہونا اور نطق پر ہرگز قادر نہ ہونا اور اپنے علوم کے القا اور الہام سے عاجز ہونا تجویز کرتے ہیں اور جو حقیقی اور کامل ہادی میں صفاتِ کاملہ ہونی چاہیئے اُن صفات سے اُس کو خالی سمجھتے ہیں بلکہ اس قدر ایمان بھی اُنہیں نصیب نہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کی نسبت یہ اعتقاد رکھیں کہ اپنی ہستی اور الوہیت کو اُس نے اپنے ارادے اور اختیار سے دنیا میں ظاہر کیا ہے برخلاف اِس کے وہ تو یہ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ایک مُردہ یا ایک پتھر کی طرح کسی گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا عقلمندوں نے آپ محنتیں کر کے اُس کے وجود کا پتہ لگایا اور اُس کی خدائی کو دنیا میں مشہور کیا پس ظاہر

ہے کہ وہ بھی مثل اپنے اُور بھائیوں کے محامد کاملہ حضرتِ احدیت سے منکر ہیں بلکہ جن تعریفوں سے اُس کو یاد کرنا چاہیئے وہ تمام تعریفیں اپنے نفس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۳۶۵ تا ۳۷۱ حاشیہ ۱۱)

یہ فخر قرآن شریف ہی کو ہے کہ جہاں وہ دوسرے مذاہب باطلہ کا رد کرتا ہے۔ اور ان کی غلط تعلیموں کو کھولتا ہے۔ وہاں اصلی اور حقیقی تعلیم بھی پیش کرتا ہے جس کا نمونہ اس سورہ فاتحہ میں دکھایا ہے کہ ایک ایک لفظ میں مذاہب باطلہ کی تردید کردی ہے مثلاً فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ساری تعریفیں خواہ وہ کسی قسم کی ہوں وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سزاوار ہیں۔ اب اس لفظ کو کہہ کر یہ ثابت کیا کہ قرآن شریف جس خدا کو منوانا چاہتا ہے وہ تمام نقائص سے منزہ اور تمام صفاتِ کاملہ سے موصوف ہے۔ کیونکہ اللہ کا لفظ اسی ہستی پر بولا جاتا ہے جس میں کوئی نقص ہو ہی نہیں۔ اور کمال دو قسم کے ہوتے ہیں یا بلحاظ حسن کے یا بلحاظ احسان کے پس وہ دونوں قسم کے کمال اس لفظ میں پائے جاتے ہیں۔ دوسری قوموں نے جو لفظ خدا تعالیٰ کے لیے تجویز کیے ہیں وہ ایسے جامع نہیں ہیں۔ اور یہی لفظ اللہ کا دوسرے باطل مذاہب کے معبودوں کی ہستی اور ان کی صفات کے مسئلہ کی پوری تردید کرتا ہے مثلاً عیسائیوں کو لو وہ جس کو اللہ مانتے ہیں وہ ایک عاجز ضعیف عورت کا بچہ ہے جس کا نام یسوع ہے جو معمولی بچوں کی طرح دکھ درد کے ساتھ ماں کے پیٹ سے نکلا اور عوارض میں مبتلا رہا۔ بھوک پیاس کی تکلیف سے بے چین رہا۔ اور سخت تکلیفیں اور دکھ اسے اٹھانے پڑے جس قدر ضعف اور کمزوریوں کے عوارض ہوتے ہیں ان کا شکار رہا۔ آخر یہودیوں کے ہاتھوں سے پٹتا گیا اور انہوں نے پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا۔ اب اس صورت کو جو یسوع کی (عیسائیوں نے جس کو خدا بنا رکھا ہے۔) انجیل سے ظاہر ہوتی ہے کسی دانشمند کے سامنے پیش کرو۔ کیا وہ کہہ دیگا کہ بیشک اس میں تمام صفات کاملہ پائی جاتی ہیں اور کوئی نقص اس میں نہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ انسانی کمزوریوں اور نقصوں کا پہلا اور کامل نمونہ اسے ماننا پڑیگا۔ تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے والا کب ایسے کمزور اور مصلوب ملعون کو خدا مان سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن عیسائیوں کے بالمقابل ایسے خدا کی طرف بلاتا ہے جس میں کوئی نقص ہو سکتا ہی نہیں پھر آریہ مذہب کو دیکھو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پرمیشر وہ ہے جس نے ذاتِ عالم اور ارواح عالم کو بنایا ہی نہیں بلکہ جیسے وہ ازلی ابدی ہے ویسے ہی ہمارے ذرات جسم وغیرہ بھی خدا کے بالمقابل اپنی ایک مستقل ہستی رکھنے والی چیزیں ہیں جو اپنے قیام اور بقا کے لیے اس کی محتاج نہیں ہیں بلکہ ایک طرح وہ اپنی خدائی چلانے کے واسطے ان چیزوں کا محتاج ہے وہ کسی چیز کا خالق نہیں اور پھر اس بات کا سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ جو خالق نہیں وہ مالک کیسے ہو سکتا ہے؟ اور ایسا ہی ان کا اعتقاد ہے کہ وہ رازق کریم۔ وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے اس کے کرموں کا پھل ملتا ہے اس سے زائد اسے کچھ مل سکتا ہی نہیں۔

اب بتاؤ اس قدر نقص جس خدا میں پیش کیے جاویں عقل سلیم کب اسے تسلیم کرنے کے لیے رضامند ہو سکتی ہے؟

اسی طرح سے جس قدر مذاہب باطلہ دنیا میں موجود ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا جملہ خدا تعالیٰ کے متعلق ان کے کل غلط اور بیہودہ خیالات ومعتقدات کی تردید کرتا ہے۔ (الحکم ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

ربّ۔ لسان العرب اور تاج العروس میں جو لغت کی نہایت معتبر کتابیں ہیں لکھا ہے کہ زبان عرب میں ربّ کا لفظ سات معنوں پر مشتمل ہے اور وہ یہ ہیں۔ مالک۔ سیّد۔ مدبّر۔ مربّی۔ قیّم۔ منعم۔ متمّم۔ چنانچہ ان سات معنوں میں سے تین معنی خدا تعالیٰ کی ذاتی عظمت پر دلالت کرتے ہیں منجملہ ان کے مالک ہے اور مالک لغت عرب میں اُس کو کہتے ہیں جس کا اپنے مملوک پر قبضہ تامہ ہو اور جس طرح چاہے اپنے تصرّف میں لا سکتا ہو اور بلا اشتراک غیر اُس پر حق رکھتا ہو اور یہ لفظ حقیقی طور پر یعنی بلحاظ اُس کے معنوں کے بجز خدا تعالیٰ کے کسی دوسرے پر اطلاق نہیں پا سکتا۔ کیونکہ قبضہ تامہ اور تصرّف تام اور حقوق تامہ بجز خدا تعالیٰ کے اور کسی کے لیے مسلّم نہیں۔

(منن الرحمان صفحہ ۵، ۶ حاشیہ متعلقہ صفحہ ۵)

اَشَارَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ قَوْلِہٖ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اِلٰی اَنَّہٗ ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّمِنْہُ کُلُّ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِیْنَ۔ وَمِنَ الْعَالَمِیْنَ مَا یُوْجَدُ فِی الْاَرْضِ مِنْ زُمَرِ الْمُھْتَدِیْنَ وَطَوَآئِفِ الْغَاوِیْنَ وَالضَّآلِّیْنَ۔ فَقَدْ یَزِیْدُ عَالَمُ الضَّلَالِ وَالْکُفْرِ وَالْفِسْقِ وَتَرْکِ الْاِعْتِدَالِ حَتّٰی یُمْلَأُ الْاَرْضُ ظُلْمًا وَّ جَوْرًا وَّیَتْرُکُ النَّاسُ طُرُقَ اللّٰہِ ذِی الْجَلَالِ۔ لَا یَفْھَمُوْنَ حَقِیْقَۃَ الْعُبُوْدِیَّۃِ وَلَا یُؤَدُّوْنَ حَقَّ الرُّبُوْبِیَّۃِ۔ فَیَصِیْرُ الزَّمَانُ کَاللَّیْلَۃِ اللَّیْلَآءِ وَیُدَاسُ الدِّیْنُ تَحْتَ ھٰذِہِ اللَّاْوَآءِ۔ ثُمَّ یَاْتِی اللّٰہُ بِعَالَمٍ اٰخَرَ فَتُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَیَنْزِلُ الْقَضَآءُ مُبَدَّلًا مِّنَ السَّمَآءِ وَیُعْطٰی لِلنَّاسِ قَلْبٌ

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنے قول ربّ العالمین میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اسی کی طرف سے ہے اور اس زمین پر جو بھی ہدایت یافتہ جماعتیں یا گمراہ اور خطا کار گروہ پائے جاتے ہیں وہ سب عالمین میں شامل ہیں۔ کبھی گمراہی، کفر، فسق اور اعتدال کو ترک کرنے کا "عالم" بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ زمین ظلم و جور سے بھر جاتی ہے اور لوگ خدائے ذوالجلال کے راستوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ وہ عبودیت کی حقیقت کو سمجھتے ہیں اور نہ ربوبیت کا حق ادا کرتے ہیں۔ زمانہ ایک تاریک رات کی طرح ہو جاتا ہے اور دین اس مصیبت کے نیچے روندا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک اور "عالم" لے آتا ہے تب یہ زمین ایک دوسری زمین سے بدل دی جاتی ہے۔ اور ایک نئی تقدیر آسمان سے نازل ہوتی ہے اور لوگوں کو

عَارِفٌ وَّلِسَانٌ نَّاطِقٌ بِّشُكْرِ النَّعْمَآءِ. فَيَجْعَلُوْنَ نُفُوْسَهُمْ كَمَوْرٍ مُّعَبَّدٍ لِّحَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ وَيَأْتُوْنَهٗ خَوْفًا وَّرَجَآءً بِطَرْفٍ مَّغْضُوْضٍ مِّنَ الْحَيَآءِ وَ وَجْهٍ مُّقْبِلٍ نَّحْوَ قِبْلَةِ الْاِسْتِجْدَآءِ. وَهِمَّةٍ فِي الْعُبُوْدِيَّةِ قَارِعَةٍ ذُرْوَةَ الْعَلَآءِ. وَيَشْتَدُّ الْحَاجَةُ اِلَيْهِمْ اِذَا انْتَهَى الْاَمْرُ اِلٰى كَمَالِ الضَّلَالَةِ وَ صَارَ النَّاسُ كَسِبَاعٍ اَوْ نَعَمٍ مِّنْ تَغَيُّرِ الْحَالَةِ فَعِنْدَ ذَالِكَ تَقْتَضِي الرَّحْمَةُ الْاِلٰهِيَّةُ وَالْعِنَايَةُ الْاَزَلِيَّةُ اَنْ يُّخْلَقَ فِي السَّمَآءِ مَا يَدْفَعُ الظَّلَامَ وَيَهْدِمُ مَا عَمَّرَ اِبْلِيْسُ وَاَقَامَ مِنَ الْاَبْنِيَةِ وَالْخِيَامِ فَيَنْزِلُ اِمَامٌ مِّنَ الرَّحْمَانِ لِيَذُبَّ جُنُوْدَ الشَّيْطَانِ. وَلَمْ يَزَلْ هٰذِهِ الْجُنُوْدُ وَتِلْكَ الْجُنُوْدُ يَتَحَارَبَانِ. وَلَا يَرَاهُمْ اِلَّا مَنْ اُعْطِيَ لَهٗ عَيْنَانِ. حَتّٰى غُلَّ اَعْنَاقُ الْاَبَاطِيْلِ وَانْعَدَمَ مَا يُرٰى لَهَا نَوْعُ سَرَابٍ مِّنَ الدَّلِيْلِ فَمَا زَالَ الْاِمَامُ ظَاهِرًا عَلَى الْعِدَا نَاصِرًا لِّمَنِ اهْتَدٰى. مُعْلِيًا مَّعَالِمَ الْهُدٰى مُحْيِيًا مَّوَاسِمَ التُّقٰى. حَتّٰى يَعْلَمَ النَّاسُ اَنَّهٗ اَسَرَ طَوَاغِيْتَ الْكُفْرِ وَشَدَّ وَثَاقَهَا وَاَخَذَ

عارف رشناسا) دل اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرا دا کرنے کے لیے ناطق (گویا) زبانیں عطا ہوتی ہیں۔ پس وہ اپنے نفوس کو خدا تعالیٰ کے حضور ایک پامال راستہ کی طرح بنا لیتے ہیں۔ اور خوف اور امید کے ساتھ اس کی طرف آتے ہیں۔ ایسی نگاہ کے ساتھ جو حیا کی وجہ سے نیچی ہوتی ہیں اور ایسے چہروں کے ساتھ جو قبلہ حاجات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بندگی میں ایسی ہمت کے ساتھ جو بلندی کی چوٹی کو دستک دے رہی ہوتی ہے۔ ایسے وقتوں میں ان لوگوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے جب معاملہ گمراہی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور حالت کے بدل جانے سے لوگ درندوں اور چوپاؤں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ تو اس وقت رحمت الٰہی اور عنایت ازلی تقاضا کرتی ہے کہ آسمان میں ایسا وجود پیدا کیا جائے جو تاریکی کو دور کرے اور ابلیس نے جو عمارتیں تعمیر کی ہیں اور خیمے لگائے ہیں انہیں منہدم کر دے۔ تب خدائے رحمان کی طرف سے ایک امام نازل ہوتا ہے۔ تاکہ وہ شیطانی لشکروں کا مقابلہ کرے۔ اور یہ دونوں (رحمانی اور شیطانی) لشکر برسرپیکار رہتے ہیں اور ان کو وہی دیکھتا ہے جس کو دو آنکھیں عطا کی گئی ہوں۔ یہاں تک کہ باطل کی گردنوں میں طوق پڑ جاتے ہیں۔ اور امور باطلہ کی سراب نما دلیلیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ پس وہ امام دشمنوں پر ہمیشہ غالب اور ہدایت یافتہ گروہ کا مددگار رہتا ہے۔ ہدایت کے علم بلند کرتا ہے اور پرہیزگاری کے اوقات و اجتماعات کو زندہ کرنے والا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ اس نے کفر کے سرغنوں کو قید کر دیا ہے۔ اور ان کی مشکیں کس دی ہیں۔ اور

سِبَاعَ الْاَکَاذِیْبِ وَغَلَّ اَعْنَاقَهَا وَهَدَمَ عِمَارَةَ الْبِدْعَاتِ وَقَوَّضَ قِبَابَهَا۔
وَجَمَعَ کَلِمَةَ الْاِیْمَانِ وَنَظَمَ اَسْبَابَهَا وَقَوَّی السَّلْطَنَةَ السَّمَاوِیَّةَ وَ
سَدَّ الثُّغُوْرَ وَاَصْلَحَ شَانَهَا وَسَدَّدَ الْاُمُوْرَ وَسَکَّنَ الْقُلُوْبَ الرَّاجِفَةَ وَ
بَکَّتَ الْاَلْسِنَةَ الْمُرْجِفَةَ وَاَنَارَ الْخَوَاطِرَ الْمُظْلِمَةَ وَجَدَّدَ الدَّوْلَةَ الْمُخْلِقَةَ۔
وَکَذٰلِكَ یَفْعَلُ اللّٰهُ الْفَعَّالُ۔ حَتّٰی یَذْهَبَ الظَّلَامُ وَالضَّلَالُ فَهُنَالِكَ
یَنْکُصُ الْعِدَا عَلٰی اَعْقَابِهِمْ وَیُنَکِّسُوْنَ مَا ضَرَبُوْا مِنْ خِیَامِهِمْ وَیَحُلُّوْنَ
مَا اَرَبُوْا مِنْ اُرَابِهِمْ۔ وَمِنْ اَشْرَفِ الْعَالَمِیْنَ وَاَعْجَبِ الْمَخْلُوْقِیْنَ وُجُوْدُ
الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ۔ وَعِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ الصِّدِّیْقِیْنَ فَاِنَّهُمْ فَاقُوْا
غَیْرَهُمْ فِیْ بَثِّ الْمَکَارِمِ وَکَشْفِ الْمَظَالِمِ وَتَهْذِیْبِ الْاَخْلَاقِ وَاِرَادَةِ
الْخَیْرِ لِلْاَنْفُسِ وَالْاٰفَاقِ۔ وَنَشْرِ الصَّلَاحِ وَالْخَیْرِ وَاِجَاحَةِ الطَّلَاحِ وَ
الضَّیْرِ۔ وَاَمْرِ الْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْیِ عَنِ الذَّمَائِمِ وَسَوْقِ الشَّهَوَاتِ کَالْبَهَآئِمِ۔
وَالتَّوَجُّهِ اِلٰی رَبِّ الْعَبِیْدِ وَقَطْعِ التَّعَلُّقِ مِنَ الطَّرِیْفِ وَالتَّلِیْدِ وَالْقِیَامِ

اس نے جھوٹ اور فریب کے درندوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ اور ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں۔ اور اس نے بدعات کی عمارتوں کو گرا دیا ہے اور ان کے گنبدوں کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ اور اس نے ایمان کے کلمہ کو اکٹھا کر دیا ہے اور اس کے اسباب کو منظم کر دیا ہے۔ اس نے آسمانی سلطنت کو مضبوط کیا ہے اور تمام رخنوں کو بند کر دیا ہے۔ اس نے اس (سلطنت) کی شان بہتر بنا دی ہے۔ اور اس کے معاملات کو درست کر دیا ہے۔ اور اس نے بیقرار دلوں کو تسکین دی ہے جھوٹ پھیلانے والی زبانوں کو خاموش کر دیا ہے۔ اور تاریک دلوں کو روشن کر دیا ہے۔ اور بوسیدہ سلطنت کی تجدید کی ہے۔ خدائے کارساز ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اندھیرا اور گمراہی جاتی رہتی ہے۔ اور اس وقت دشمن اپنی ایڑیوں پر پسپا ہو جاتے ہیں۔ اور جو خیمے انہوں نے گاڑے ہوتے ہیں ان کو (خود ہی) سرنگوں کر دیتے ہیں۔ اور جو گرہیں انھوں نے ڈالی ہوتی ہیں انہیں خود کھولتے ہیں۔ تمام جہانوں میں سب سے زیادہ عالی مرتبہ اور مخلوقات میں سے سب سے زیادہ حیرت انگیز وجود نبیوں اور رسولوں اور خدا کے نیک اور صدیق بندوں کا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سب دوسرے لوگوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نیک صفات کے پھیلانے اور ظلم وستم کے دور کرنے اور عادات کے سنوارنے میں اور اپنوں اور بیگانوں کے لیے نیک ارادے رکھنے میں، نیکوکاری اور سلامتی کے پھیلانے میں، بدی اور تباہی کی جڑ اکھاڑنے میں۔ نیکی کی تلقین کرنے اور بُرے کاموں سے منع کرنے میں، بُری خواہشات کو چوپاؤں کی طرح دھتکارنے میں، پروردگار عالم کی طرف رخ کرنے میں، نئے اور پرانے مال سے قطع تعلق کرنے میں پوری قوت اور مکمل تیاری

عَلٰی طَاعَةِ اللّٰهِ بِالْقُوَّةِ الْجَامِعَةِ وَالْعُدَّةِ الْكَامِلَةِ۔ وَالصَّوْلِ عَلٰی ذَرَارِي الشَّيْطَانِ بِالْحُشُوْدِ الْمَجْمُوْعَةِ وَالْجُمُوْعِ الْمَحْشُوْدَةِ۔ وَتَرْكِ الدُّنْيَا لِلْحَبِيْبِ وَالتَّبَاعُدِ عَنْ مَّغْنَاهَا الْخَصِيْبِ۔ وَتَرْكِ مَآءِهَا وَمَرْعَاهَا كَالْهَجْرَةِ وَالْقَآءِ الْجِرَانِ فِي الْحَضْرَةِ۔ اِنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَتَمَضْمَضُ مُقْلَتُهُمْ بِالنَّوْمِ اِلَّا فِي حُبِّ اللّٰهِ وَالدُّعَآءِ لِلْقَوْمِ۔ وَاِنَّ الدُّنْيَا فِي اَعْيُنِ اَهْلِهَا لَطِيْفُ الْبُنْيَةِ مَلِيْحُ الْحِلْيَةِ۔ وَاَمَّا فِي اَعْيُنِهِمْ اَخْبَثُ مِنَ الْعَذِرَةِ وَاَنْتَنُ عَنِ الْمَيْتَةِ۔ اَقْبَلُوْا عَلَى اللّٰهِ كُلَّ الْاِقْبَالِ وَمَالُوْا اِلَيْهِ كُلَّ الْمَيْلِ بِصِدْقِ الْبَالِ۔ وَكَمَا اَنَّ قَوَاعِدَ الْبَيْتِ مُقَدَّمَةٌ عَلٰی طَاقٍ يُّعْقَدُ وَرُوَاقٍ يُّشَيَّدُ۔ كَذٰلِكَ هٰٓؤُلَآءِ الْكِرَامُ مُقَدَّمُوْنَ فِي هٰذِهِ الدَّارِ عَلٰی كُلِّ طَبَقَةٍ مِّنْ طَبَقَاتِ الْاَخْيَارِ۔ وَاُرِيْتُ اَنَّ اَكْمَلَهُمْ وَاَفْضَلَهُمْ وَاَعْرَفَهُمْ وَاَعْلَمَهُمْ نَبِيُّنَا الْمُصْطَفٰى عَلَيْهِ التَّحِيَّةُ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ فِي الْاَرْضِ وَالسَّمٰوَاتِ الْعُلٰى۔ وَاَنَّ اَشْقَى النَّاسِ قَوْمٌ اَطَالُوا الْاَلْسِنَةَ وَصَالُوْا عَلَيْهِ بِالْهَمْزِ وَتَجَسُّسِ الْعَيْبِ۔

کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم رہنے میں جمع کردہ لشکروں اور اکٹھی کی ہوئی جماعتوں کے ساتھ شیطان کی ذریت پر حملہ کرنے میں محبوب کی خاطر دنیا کو ترک کرنے اس کے شاداب مقامات سے کنارہ کشی کرنے اور اس کے پانیوں اور چراگاہوں سے ترک وطن کرنے کی طرح الگ ہو جانے میں، اور بارگاہ الٰہی میں اپنی گردن جھکانے میں وہ دوسروں پر فوقیت لے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ ایسی قوم ہے کہ ان کی آنکھوں میں نیند ایسی حالت میں آتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں (محو) اور قوم کے لیے دعا کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ دنیا داروں کی نظر میں تو دنیا نہایت خوب صورت ہے اور خوش رنگ ہے۔ لیکن نیک لوگوں کی نظروں میں وہ میلے سے بھی زیادہ گندی اور مُردار سے بھی زیادہ بدبودار ہوتی ہے۔ وہ اپنی ساری توجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صدق دل سے وہ اس کی طرف پوری طرح جھک جاتے ہیں۔ اور جس طرح گھر کی بنیادیں بنائے جانے والے طاقوں اور برآمدوں پر تقدم رکھتی ہیں اسی طرح مذکورہ بزرگ ہستیاں اس دنیا میں ہر طبقہ کے نیک لوگوں پر تقدم رکھتی ہیں۔ اور مجھے (کشفاً) دکھایا گیا ہے کہ زمین میں بھی اور بلند پایہ آسمانوں میں بھی ہمارے نبی محمد مصطفےٰ جن پر ہر قسم کی برکت، رحمت اور سلامتی نازل ہو ان سب سے اکمل افضل اور اعرف ہیں اور تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ بدبخت وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ پر زبان درازی کی اور نکتہ چینی اور عیب جوئی کرتے ہوئے آپ پر حملہ آور ہوئے حالانکہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کے پوشیدہ رازوں سے آگاہ نہیں۔ کئی ایسے لوگ ہیں جن پر زمین میں تو

غَيْرَ مُطَّلِعِيْنَ عَلٰى سِرِّ الْغَيْبِ - وَكَمْ مِّنْ مَّلْعُوْنٍ فِي الْاَرْضِ يَحْمَدُهُ اللّٰهُ فِي السَّمَآءِ - وَكَمْ مِّنْ مُّعَظَّمٍ فِيْ هٰذِهِ الدَّارِ يُهَانُ فِيْ يَوْمِ الْجَزَآءِ - ثُمَّ هُوَ سُبْحَانَهٗ اَشَارَ فِيْ قَوْلِهٖ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ - اِلٰى اَنَّهٗ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاَنَّهٗ يُحْمَدُ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِيْنَ - وَاَنَّ الْحَامِدِيْنَ كَانُوْا عَلٰى حَمْدِهٖ دَآئِمِيْنَ - وَعَلٰى ذِكْرِهِمْ عَاكِفِيْنَ - وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُهٗ وَيَحْمَدُهٗ فِيْ كُلِّ حِيْنٍ - وَّاَنَّ الْعَبْدَ اِذَا انْسَلَخَ عَنْ اِرَادَاتِهٖ وَتَجَرَّدَ عَنْ جَذَبَاتِهٖ وَفَنٰى فِي اللّٰهِ وَفِيْ طُرُقِهٖ وَعِبَادَاتِهٖ - وَعَرَفَ رَبَّهُ الَّذِيْ رَبَّاهُ بِعِنَايَاتِهٖ - حَمِدَهٗ فِيْ سَآئِرِ اَوْقَاتِهٖ وَاَحَبَّهٗ بِجَمِيْعِ قَلْبِهٖ بَلْ بِجَمِيْعِ ذَرَّاتِهٖ - فَعِنْدَ ذَالِكَ هُوَ عَالَمٌ مِّنَ الْعَالَمِيْنَ - وَلِذَالِكَ سُمِّيَ اِبْرَاهِيْمُ اُمَّةً فِيْ كِتَابِ اَعْلَمِ الْعَالِمِيْنَ - وَمِنَ الْعَالَمِيْنَ زَمَانٌ اُرْسِلَ فِيْهِمْ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ - وَعَالَمٌ اٰخَرُ فِيْهِ يَاْتِي اللّٰهُ بِاٰخَرِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ - فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ رَحْمَةً عَلَى الطَّالِبِيْنَ - وَاِلَيْهِ اَشَارَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى "لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ" فَاَوْمَا فِيْهِ اِلٰى اَحْمَدَيْنِ

لعنت کی جاتی ہے لیکن آسمان میں اللہ تعالیٰ ان کی تعریف کرتا رہتا ہے۔ اور اسی طرح کئی لوگ ہیں جو اس دنیا میں تو صاحب عظمت سمجھے جاتے ہیں لیکن قیامت کے دن وہ ذلیل ہوں گے۔ پھر اللہ پاک ذات نے اپنے قول ربّ العالمین میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ اور آسمانوں اور زمینوں میں اسی کی حمد ہوتی ہے۔ اور پھر حمد کرنے والے ہمیشہ اس کی حمد میں لگے رہتے ہیں۔ اور اپنی یاد خدا میں محو رہتے ہیں۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں مگر ہر وقت اس کی تسبیح و تحمید کرتی رہتی ہے اور جب اس کا کوئی بندہ اپنی خواہشات کا چولہ اتار پھینکتا ہے اپنے جذبات سے الگ ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کی راہوں اور اس کی عبادات میں فنا ہو جاتا ہے اپنے اس ربّ کو پہچان لیتا ہے جس نے اپنی عنایات سے اس کی پرورش کی وہ اپنے تمام اوقات میں اس کی حمد کرتا ہے اور اپنے پورے دل بلکہ اپنے (وجود کے) تمام ذرات سے اس سے محبت کرتا ہے تو اس وقت وہ شخص عالمین میں سے ایک عالم بن جاتا ہے اسی لیے اعلم العالمین کی کتاب (قرآن کریم) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام امّت رکھا گیا اور عالمین سے ایک عالم وہ بھی ہے جس میں حضرت خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے۔ ایک اور عالم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے طالبوں پر رحم کر کے آخری زمانہ میں مومنوں کے ایک دوسرے گروہ کو پیدا کرے گا اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ[1] میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو احمدوں

---

[1] القصص: ۷۱

وَجَعَلَهُمَا مِنْ نَعْمَآئِهِ الْكَاثِرَةِ۔ فَالْأَوَّلُ مِنْهُمَا أَحْمَدُ الْمُصْطَفٰى وَ رَسُوْلُنَا الْمُجْتَبٰى۔ وَالثَّانِيْ أَحْمَدُ اٰخِرِ الزَّمَانِ الَّذِيْ سُمِّيَ مَسِيْحًا وَّمَهْدِيًّا مِّنَ اللّٰهِ الْمَنَّانِ۔ وَقَدِ اسْتَنْبَطْتُ هٰذِهِ النُّكْتَةَ مِنْ قَوْلِهٖ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"۔ فَلْيَتَدَبَّرْ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُتَدَبِّرِيْنَ ﴿

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۵)

اَلْعَالَمُ مَا يُعْلَمُ وَيُخْبَرُ عَنْهُ وَمَا يَدُلُّ عَلَى الصَّانِعِ الْكَامِلِ الْوَاحِدِ الْمُدَبِّرِ بِالْإِرَادَةِ وَيُلْجِئُ الطَّالِبَ إِلَى الْإِيْمَانِ بِهٖ وَيُوْصِلُهٗ إِلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

(کرامات الصادقین ص ۶۸)

وَعَرَفْتَ أَنَّ الْعَالَمِيْنَ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مَوْجُوْدٍ سِوَى اللّٰهِ خَالِقِ الْأَنَامِ۔ سَوَآءٌ كَانَ مِنْ عَالَمِ الْأَرْوَاحِ أَوْ مِنْ عَالَمِ الْأَجْسَامِ۔ وَسَوَآءٌ كَانَ مِنْ مَّخْلُوْقِ الْأَرْضِ أَوْ كَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَغَيْرِهِمَا مِنَ الْأَجْرَامِ۔ فَكُلٌّ مِّنَ الْعَالَمِيْنَ دَاخِلٌ تَحْتَ رُبُوْبِيَّةِ الْحَضْرَةِ ﴿ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۵-۱۳۶)

کا ذکر فرما کر ہر دو کو اپنی بے پایاں نعمتوں میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پہلے احمد تو ہمارے نبی احمد مصطفٰے اور رسول مجتبٰی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرا احمد احمدِ آخرالزمان ہے جس کا نام محسن خدا کی طرف سے مسیح اور مہدی بھی رکھا گیا ہے۔ یہ نکتہ میں نے خدا تعالیٰ کے قول اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے اخذ کیا ہے۔ پس ہر غور و فکر کرنے والے کو غور کرنا چاہیئے۔

عالَم کے معنے ہیں جس کے متعلق علم اور خبر دی جا سکے اور جو مُدبّر بالارادہ کامل یگانہ صانع پر دلالت کرے۔ اور جو (یعنی عالم) اس (یکتا ہستی) پر ایمان لانے کے لیے طالب حق کو مجبور کر دے اور اس (طالب) کو مومنوں (کے گروہ) تک پہنچا دے۔

اور آپ جان چکے ہیں کہ عالمین سے مراد مخلوق کو پیدا کرنے والے خدا کے سوا ہر ہستی ہے خواہ وہ عالم ارواح سے ہو یا عالم اجسام سے اور خواہ وہ زمینی مخلوق سے ہو یا سورج چاند اور ان کے علاوہ دیگر اجرام کی مانند کوئی چیز ہو پس تمام عالم جناب باری کی ربوبیت کے تحت داخل ہیں۔

یہاں خالق العالمین[1] نہیں فرمایا بلکہ رب العالمین فرمایا اس لیے کہ بعض قومیں ربوبیت کی منکر ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم کو جو کچھ ملتا ہے ہمارے عملوں کے سبب سے ہی ملتا ہے مثلاً اگر دودھ ملتا ہے تو اگر ہم کوئی گناہ کر کے گائے یا بھینس وغیرہ کے جون میں نہ جاتے تو دودھ ہی نہ ہوتا۔ اور خلق چونکہ قطع بُرید کرنے کا نام ہے اس لیے اس موقعہ پر رب العالمین کو جو اس سے افضل تر ہے بیان فرمایا۔ (الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

خدا تمام دنیا کا خدا ہے اور جس طرح اس نے ظاہر جسمانی ضروریات اور تربیت کے واسطے مواد اور سامان تمام قسم کی مخلوق کے واسطے بلاکسی امتیاز کے مشترکہ طور سے پیدا کیے ہیں۔ اور ہمارے اصول کے رو سے وہ ربّ العالمین ہے۔ اور اُس نے اناج۔ ہوا۔ پانی۔ روشنی وغیرہ سامان تمام مخلوق کے واسطے بنائے ہیں اسی طرح سے وہ ہر ایک زمانہ میں ہر ایک قوم کی اصلاح کے واسطے وقتاً فوقتاً مصلح بھیجتا رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ[2] (الحکم ۲ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

بت پرست بھی وجودیوں کی طرح اپنے بتوں کو مظاہر ہی مانتے ہیں قرآن شریف اس مذہب کی تردید کرتا ہے وہ شروع میں ہی یہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اگر مخلوق اور خالق میں کوئی امتیاز نہیں۔ بلکہ دونوں برابر اور ایک ہیں تو ربّ العالمین نہ کہتا۔ (الحکم ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

پھر اس کے بعد ربّ العالمین کا لفظ ہے۔ جیسا پہلے بیان کیا گیا ہے اللہ وہ ذات مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے جو تمام نقائص سے منزہ ہو اور حسن اور احسان کے اعلیٰ نکتہ پر پہنچا ہوا ہو۔ تاکہ اس بےمثل و مانند ذات کی طرف لوگ کھنچے جائیں۔ اور روح کے جوش اور کشش سے اس کی عبادت کریں اس لیے پہلی خوبی احسان کی صفت ربّ العالمین کے اظہار سے ظاہر فرمائی ہے جس کے ذریعہ سے کل مخلوق فیض ربوبیت سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ مگر اس کے بالمقابل باقی سب مذہبوں نے جو اس وقت موجود ہیں اس صفت کا بھی انکار کیا ہے۔ مثلاً آریہ جیسا ابھی بیان کیا ہے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ انسان کو جو کچھ مل رہا ہے وہ سب اس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا کی ربوبیت سے وہ ہرگز ہرگز بہرہ ور نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنی روحوں کا خالق ہی خدا کو نہیں مانتے اور ان کو اپنے بقا و قیام میں بالکل غیر محتاج سمجھتے ہیں۔ تو پھر اس صفت ربوبیت کا بھی انکار کرنا پڑا۔ ایسا ہی عیسائی بھی اس صفت کے منکر ہیں کیوں کہ وہ مسیح کو اپنا رب سمجھتے ہیں اور ربنا المسیح ربنا المسیح کہتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو جمیع ما فی العالم کا رب نہیں مانتے بلکہ مسیح کو اس کے فیض ربوبیت سے باہر قرار دیتے ہیں اور خود ہی اس کو ربّ مانتے ہیں اسی طرح پر عام ہندو بھی اس صداقت سے منکر ہیں کیونکہ وہ تو ہر ایک چیز اور دوسری چیزوں

---

[1] ربّ العالمین اس لیے بھی فرمایا تاکہ یہ ثابت کرے کہ وہ بسائط اور عالَم امر کا بھی رب ہے کیونکہ بسیط چیزیں امر سے ہیں اور مرکب خلق سے۔ منہ

[2] فاطر: ۲۵

کو رب مانتے ہیں۔

برہم سماج والے بھی ربوبیت تامہ کے منکر ہیں کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا نے جو کچھ کرنا تھا وہ سب یکبار کر دیا اور یہ کہ تمام عالم اور اس کی قوتیں جو ایک دفعہ پیدا ہو چکی ہیں مستقل طور پر اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ ان میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ اور نہ کوئی ان میں تغیر و تبدل واقع ہو سکتا ہے ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ اب معطل محض ہے غرض جہاں تک مختلف مذاہب کو دیکھا جاوے اور ان کے اعتقادات کی پڑتال کی جاوے تو صاف طور پر معلوم ہو جاوے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رب العالمین ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ خوبی جو اعلیٰ درجہ کی خوبی ہے اور جس کا مشاہدہ ہر آن ہو رہا ہے صرف اسلام ہی بتاتا ہے اور اس طرح پر اسی ایک لفظ کے ساتھ ان تمام غلط اور بیہودہ اعتقادات کی بیخ کنی کرتا ہے جو اس صفت کے خلاف دوسرے مذاہب والوں نے خود بنا لیے ہیں۔

(الحکم ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲-۳)

خدا نے قرآن شریف کو پہلے اسی آیت سے شروع کیا ہے جو سورہ فاتحہ میں ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمام کامل اور پاک صفات خدا سے خاص ہیں۔ جو تمام عالموں کا رب ہے۔ عالم کے لفظ میں تمام مختلف قومیں اور مختلف زمانے اور مختلف ملک داخل ہیں۔ اور اس آیت سے جو قرآن شریف شروع کیا گیا یہ درحقیقت اُن قوموں کا ردّ ہے جو خدا تعالیٰ کی عام رُبوبیت اور فیض کو اپنی ہی قوم تک محدود رکھتے ہیں۔ اور دوسری قوموں کو ایسا خیال کرتے ہیں کہ گویا وہ خُدا تعالیٰ کے بندے ہی نہیں۔ اور گویا خدا نے اُن کو پیدا کر کے پھر ردّی کی طرح پھینک دیا ہے۔ یا ان کو بُھول گیا ہے۔ اور یا (نعوذ باللہ) وہ اُس کے پیدا کردہ ہی نہیں۔ جیسا کہ مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کا اب تک یہی خیال ہے۔ کہ جس قدر خدا کے نبی اور رسُول آئے ہیں۔ وہ صرف یہود کے خاندان سے آتے ہیں۔ اور خدا دوسری قوموں سے کچھ ایسا ناراض رہا ہے۔ کہ ان کو گمراہی اور غفلت میں دیکھ کر پھر بھی ان کی کچھ پروا نہیں کی جیسا کہ انجیل میں بھی لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ میں صرف اسرائیل کی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں۔ اس جگہ ہم ایک فرض محال کے طور پر کہتے ہیں۔ کہ خدائی کا دعوٰے کر کے پھر ایسا تنگ خیالی کا کلمہ بڑے تعجب کی بات ہے۔ کیا مسیح صرف اسرائیلیوں کا خدا تھا اور دوسری قوموں کا خدا نہ تھا جو ایسا کلمہ اُس کے مُنہ سے نکلا۔ کہ مجھے دوسری قوموں کی اصلاح اور ہدایت سے کچھ غرض نہیں۔ غرض یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی مذہب ہے۔ کہ تمام نبی اور رسول اُنہیں کے خاندان سے آتے رہے ہیں۔ اور اُنہیں کے خاندان میں خدا کی کتابیں اُترتی رہی ہیں۔ اور پھر بموجب عقیدہ عیسائیوں کے وہ سلسلہ الہام اور وحی کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ اور خدا کے الہام پر مُہر لگ گئی۔

انہیں خیالات کے پابند آریہ صاحبان بھی پائے جاتے ہیں یعنی جیسے یہود اور عیسائی نبوت اور الہام کو

اسرائیلی خاندان تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اور دوسری تمام قوموں کو الہام پانے کے فخر سے جواب دے رہے ہیں۔ یہی عقیدہ نوع انسان کی بدقسمتی سے آریہ صاحبان نے بھی اختیار کر رکھا ہے۔ یعنی وہ بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا کی وحی اور الہام کا سلسلہ آریہ ورت کی چار دیواری سے کبھی باہر نہیں گیا۔ ہمیشہ اسی ملک سے چار رشی منتخب کیے جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ وید ہی باربار نازل ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ ویدک سنسکرت ہی اس الہام کے لیے خاص کی گئی ہے۔

غرض یہ دونوں قومیں خدا کو رب العالمین نہیں سمجھتیں۔ ورنہ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ جس حالت میں خدا رب العالمین کہلاتا ہے۔ نہ صرف رب اسرائیلیاں یا صرف ربّ آریاں۔ تو وہ ایک خاص قوم سے کیوں ایسا دائمی تعلق پیدا کرتا ہے جس میں صریح طور پر طرفداری اور یکطرفہ بات پائی جاتی ہے۔ پس ان عقائد کے ردّ کے لیے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو اسی آیت سے شروع کیا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اور جابجا اس نے قرآن شریف میں صاف صاف بتلا دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ کسی خاص قوم یا خاص ملک میں خدا کے نبی آتے رہتے ہیں۔ بلکہ خدا نے کسی قوم اور کسی ملک کو فراموش نہیں کیا۔ اور قرآن شریف میں طرح طرح کی مثالوں میں بتلایا گیا ہے۔ کہ جیسا کہ خدا ہر ایک ملک کے باشندوں کے لیے ان کے مناسب حال اُن کی جسمانی تربیت کرتا آیا ہے۔ ایسا ہی اُس نے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کو روحانی تربیت سے بھی فیضیاب کیا ہے۔ جیسا کہ وہ قرآن شریف میں ایک جگہ فرماتا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ۔[1] یا کوئی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا۔

سو یہ بات بغیر کسی بحث کے قبول کرنے کے لائق ہے کہ وہ سچا اور کامل خدا جس پر ایمان لانا ہر ایک بندہ کا فرض ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ اور اُس کی ربوبیت کسی خاص قوم تک محدود نہیں۔ اور نہ کسی خاص زمانہ تک اور نہ کسی خاص ملک تک بلکہ وہ سب قوموں کا ربّ ہے۔ اور تمام زمانوں کا ربّ ہے۔ اور تمام مکانوں کا ربّ ہے۔ اور تمام ملکوں کا وہی ربّ ہے۔ اور تمام فیضوں کا وہی سرچشمہ ہے۔ اور ہر ایک جسمانی اور روحانی طاقت اُسی سے ہے۔ اور اُسی سے تمام موجودات پرورش پاتی ہیں۔ اور ہر ایک وجود کا وہی سہارا ہے۔ خدا کا فیض عام ہے جو تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو رہا ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ تا کسی قوم کو شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ اور یہ نہ کہیں کہ خدا نے فلاں فلاں قوم پر احسان کیا۔ مگر ہم پر نہ کیا۔ یا فلاں قوم کو اس کی طرف سے کتاب ملی۔ تا وہ اُس سے ہدایت پاویں مگر ہم کو نہ ملی۔ یا فلاں زمانہ میں وہ اپنی وحی اور الہام اور معجزات کے ساتھ ظاہر ہوا۔ مگر ہمارے زمانہ میں مخفی رہا پس اُس نے عام فیض دکھلا کر ان تمام اعتراضات کو دفع کر دیا اور اپنے ایسے وسیع اخلاق دکھلائے کہ کسی قوم کو اپنے جسمانی اور روحانی فیضوں سے محروم نہیں رکھا۔ اور نہ کسی زمانہ کو بے نصیب ٹھہرایا۔

(پیغام صلح صفحہ ۶تا۸)

---

[1] فاطر: ۲۵

سب حمد اس اللہ کے لیے جو تمام دنیا کو پیدا کرنے والا ہے ۔اب بعض لوگ اس قسم کے ہیں جو خدا کے پیدا کرنے سے منکر ہیں۔ جیسے آریہ جیو (روح) پرکرتی (مادہ) کی نسبت کہتے ہیں کہ آپ سے آپ چلے آتے ہیں۔ جیسے پرمیشر آپ سے آپ ہے۔ ان کی کل طاقتیں بھی خود بخود ہیں۔ پرمیشر کا دخل نہیں۔ یہ وہ فرقہ تھا جس کی طرف اللہ نے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے اشارہ کیا اور ان کی تردید بھی کی۔ (البدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صہ)

خدا کا نام ربّ العٰلمین ہے۔ ربّ کے معنے پرورش کرنے والے کے ہیں۔ عالم روحانی و جسمانی کی وہی پرورش کرتا ہے۔ اگر اس نے ایسے قویٰ انسان میں نہ رکھے ہوتے۔ تو انسان ان انعامات سے کہاں متمتع ہو سکتا۔ ایسا ہی روحانی ترقی بغیر اس کے فضل کے ناممکن ہے۔ (البدر ۲۵ جون ۱۹۰۸ء ص۳)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ در اصل مَیں ہی تمہاری پرورش کرتا ہوں۔ جب خدا تعالیٰ کی پرورش نہ ہو تو کوئی پرورش نہیں کر سکتا۔ دیکھو جب خدا تعالیٰ کسی کو بیمار ... ڈال دیتا ہے تو بعض دفعہ طبیب کتنا ہی زور لگاتے ہیں۔ مگر وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ طاعون کی مرض کی طرف غور کرو۔ سب ڈاکٹر زور لگا چکے مگر یہ مرض دفع نہ ہوا۔

اصل یہ ہے کہ سب بھلائیاں اسی کی طرف سے ہیں اور وہی ہے کہ جو تمام بدیوں کو دور کرتا ہے پھر فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور تمام پرورشیں تمام جہان پر اسی کی ہیں۔ (البدر ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صہ۱۸۶)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ..... یعنی تمام محامد اللہ کے لیے ثابت ہیں جو تمام عالموں کا ربّ ہے یعنی اُس کی ربوبیت تمام عالموں پر محیط ہے۔ (جنگ مقدس ص۱۹) (دوسرا پرچہ ص)

اس میں کلام کی جگہ نہیں کہ جو کچھ اجرام فلکی اور عناصر میں جسمانی اور فانی طور پر صفات پائی جاتی ہیں وُہ روحانی اور ابدی طور پر خدا تعالیٰ میں موجود ہیں۔ اور خدا تعالیٰ نے یہ بھی ہم پر کھول دیا ہے کہ سورج وغیرہ بذات خود کچھ چیز نہیں ہیں یہ اُسی کی طاقت زبردست ہے جو پردہ میں ہر ایک کام کر رہی ہے وُہی ہے جو چاند کو پردہ پوش اپنی ذات کا بنا کر اندھیری راتوں کو روشنی بخشتا ہے جیسا کہ وہ تاریک دلوں میں خود داخل ہو کر اُن کو منوّر کر دیتا ہے اور آپ انسان کے اندر بولتا ہے۔ وُہی ہے جو اپنی طاقتوں پر سورج کا پردہ ڈال کر دن کو ایک عظیم الشان روشنی کا مظہر بنا دیتا ہے اور مختلف فصلوں میں مختلف اپنے کام ظاہر کرتا ہے اُسی کی طاقت آسمان سے برستی ہے جو مینہ کہلاتی ہے اور خشک زمین کو سرسبز کر دیتی ہے اور پیاسوں کو سیراب کر دیتی ہے اُسی کی طاقت آگ میں ہو کر جلاتی ہے اور ہوا میں ہو کر دَم کو تازہ کرتی اور پھولوں کو شگفتہ کرتی اور بادلوں کو اُٹھاتی اور آواز کو کانوں تک پہنچاتی ہے یہ اُسی کی طاقت ہے کہ زمین کی شکل میں مجسّم ہو کر نوع انسان اور حیوانات کو اپنی پشت پر اُٹھا رہی

ہے مگر کیا یہ چیزیں خدا ہیں؟ نہیں بلکہ مخلوق مگر اُن کے اجرام ہیں خدا کی طاقت ایسے طور سے پیوست ہو رہی ہے کہ جیسے قلم کے ساتھ ہاتھ ملا ہوا ہے اگرچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قلم لکھتی ہے مگر قلم نہیں لکھتی بلکہ ہاتھ لکھتا ہے یا مثلاً ایک لوہے کا ٹکڑا جو آگ میں پڑ کر آگ کی شکل بن گیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جلاتا ہے اور روشنی بھی دیتا ہے مگر دراصل وہ صفات اُس کی نہیں بلکہ آگ کی ہیں۔ اِسی طرح تحقیق کی نظر سے یہ بھی سچ ہے کہ جس قدر اجرام فلکی و عناصر ارضی بلکہ ذرہ ذرہ عالم سفلی اور علوی کا مشہود اور محسوس ہے یہ سب باعتبار اپنی مختلف خاصیتوں کے جو ان میں پائی جاتی ہیں خدا کے نام ہیں اور خدا کی صفات ہیں اور خدا کی طاقت ہے جو ان کے اندر پوشیدہ طور پر جلوہ گر ہے اور یہ سب ابتداء میں اُسی کے کلمے تھے جو اس کی قدرت نے ان کو مختلف رنگوں میں ظاہر کر دیا۔ نادان سوال کریگا کہ خدا کے کلمے کیونکر مجسّم ہوئے کیا خدا ان کے علیحدہ ہونے سے کم ہوگیا مگر اُس کو سوچنا چاہیئے کہ آفتاب سے جو ایک آتشی شیشہ آگ حاصل کرتی ہے وہ آگ کچھ آفتاب میں سے کم نہیں کرتی۔ ایسا ہی جو کچھ چاند کی تاثیر سے پھلوں میں فربہی آتی ہے وہ چاند کو دُبلا نہیں کر دیتی۔ یہی خدا کی معرفت کا ایک بھید اور تمام روحانی امور کا مرکز ہے کہ خدا کے کلمات سے ہی دُنیا کی پیدائش ہے جبکہ یہ بات طے ہو چکی ہے اور خود قرآن شریف نے یہ علم ہمیں عطا کیا تو پھر میرے نزدیک ممکن ہے کہ وید نے جو کچھ آگ کی تعریف کی یا ہوا کی تعریف کی یا سورج کی مہما اور اُستت کی اُس کا بھی یہی مقصد ہوگا کہ الٰہی طاقت ایسے شدید تعلق سے اُن کے اندر کام کر رہی ہے کہ درحقیقت اُس کے مقابل وہ سب اجرام بطور چھلکے کے ہیں اور وُہ مغز ہے اور سب صفات اُسی کی طرف رجوع کرتی ہیں اس لیے اسی کا نام آگ رکھنا چاہیئے اور اسی کا نام پانی اور اسی کا نام ہوا کیونکہ ان کے فعل ان کے فعل نہیں بلکہ یہ سب اُس کے فعل ہیں اور ان کی طاقتیں اُن کی طاقتیں نہیں بلکہ یہ سب اُس کی طاقتیں ہیں جیسا کہ سورۃ فاتحہ کی اِس آیت میں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اسی کی طرف اشارہ ہے یعنی مختلف رنگوں اور پیرایوں اور عالموں میں جو دنیا کا نظام قائم رکھنے کے لیے زمین آسمان کی چیزیں کام کر رہی ہیں یہ وہ نہیں کام کرتیں بلکہ خدائی طاقت ان کے نیچے کام کر رہی ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں بھی فرمایا صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ[1] یعنی دُنیا ایک شیش محل ہے جس کے شیشوں کے نیچے زور سے پانی چل رہا ہے اور نادان سمجھتا ہے کہ یہی شیشے پانی ہیں حالانکہ پانی ان کے نیچے ہے۔ اور جیسا کہ قرآن شریف میں ایک تیسری جگہ بھی فرمایا وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[2] یعنی یہ مت خیال کرو کہ زمین تمہیں اُٹھاتی ہے یا کشتیاں دریا میں تمہیں اُٹھاتی ہیں بلکہ ہم خود تمہیں اُٹھا رہے ہیں۔

(نسیم دعوت صفحہ ۵۶ تا ۵۹)

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کیسا جامع کلمہ ہے۔ اگر ثابت ہو کہ اجرام فلکی میں آبادیاں ہیں تب بھی وہ آبادیاں

---

[1] النمل: ۴۵ [2] بنی اسرائیل: ۷۱

اس کلمہ کے نیچے آئیں گی۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۸ حاشیہ)

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ یعنی وہ خدا ہر ایک کی جزا اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ اس کا کوئی ایسا کارپرداز نہیں۔ جس کو اُس نے زمین آسمان کی حکومت سونپ دی ہو اور آپ الگ ہو بیٹھا ہو اور آپ کچھ نہ کرتا ہو۔ وہی کارپرداز سب کچھ جزا دیتا ہو یا آئندہ دینے والا ہو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۹)

مالک ایک ایسا لفظ ہے جس کے مقابل پر تمام حقوق مسلوب ہو جاتے ہیں اور کامل طور پر اطلاق اِس لفظ کا صرف خدا پر ہی آتا ہے کیونکہ کامل مالک وہی ہے۔ جو شخص کسی کو اپنی جان وغیرہ کا مالک ٹھہراتا ہے تو وہ اقرار کرتا ہے کہ اپنی جان اور مال وغیرہ پر میرا کوئی حق نہیں اور میرا کچھ بھی نہیں سب مالک کا ہے۔
(چشمہ معرفت صفحہ ۱۵)

ہر ایک بدی کی سزا دینا خدا کے اخلاق عفو اور درگزر کے خلاف ہے کیونکہ وہ مالک ہے نہ صرف ایک مجسٹریٹ کی طرح جیسا کہ اُس نے قرآن شریف کی پہلی سورت میں ہی اپنا نام مالک رکھا ہے اور فرمایا کہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ[1] یعنی خدا جزا سزا دینے کا مالک ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی مالک مالک نہیں کہلا سکتا جب تک دونوں پہلوؤں پر اُس کو اختیار نہ ہو یعنی چاہے تو پکڑے اور چاہے تو چھوڑ دے۔
(چشمہ معرفت صفحہ ۱۶)

قرآن شریف میں اُس کا نام مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان خوش حال ہو۔ مگر ممکن ہے کہ پرند۔ چرند اس سے بھی زیادہ خوش حال ہوں۔ یہ دنیا ایک عالم امتحان ہے اس کے حل کرنے کے واسطے دوسرا عالم ہے۔ اس دنیا میں جو تکالیف رکھی ہیں اس کا وعدہ ہے کہ آئندہ عالم میں خوشی دیگا۔ اگر اب بھی کوئی کہے کہ کیوں ایسا کیا اور ایسا نہ کیا؟ اس کا یہ جواب ہے کہ وہ حاکم اور مالکیت بھی تو رکھتا ہے۔ اُس نے جیسا چاہا کیا۔ کسی کو اس کے کام پر اعتراض کی گنجایش اور حق نہیں۔
(الحکم ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

(انسان) گناہ سے تو جلالی رنگ اور ہیبت ہی سے بچ سکتا ہے جب یہ علم ہو کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کی سزا میں شدید العذاب ہے اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے تو انسان پر ایک ہیبت سی طاری ہو جائے گی جو اس کو گناہ سے بچا لے گی۔ (الحکم ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ قیامت کو جزا سزا ہو گی۔ بلکہ قرآن شریف میں بار بار اور صاف صاف بیان کیا گیا ہے کہ قیامت تو مجازات کبریٰ کا وقت ہے۔ مگر ایک قسم کی مجازات اسی دنیا

[1] یعنی اللہ تعالےٰ۔

میں شروع ہے۔جس کی طرف آیت یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا[1] اشارہ کرتی ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۹)

فرمایا کہ میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہوں جزا و سزا دینا اُسی کے اختیار میں ہے اسی عالم سے جزا و سزا کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو نقب زنی کرتا ہے شاید ایک دفعہ نہیں تو دوسری دفعہ دوسری دفعہ نہیں تو تیسری دفعہ ضرور پکڑا جاتا ہے یا کسی اور رنگ میں اسے سزا مل جاتی ہے (یہ سزا کیا کم ہے کہ چور دولت کے لیے چوری کرتا ہے اور پھر بھی ہمیشہ مفلس اور غریب ذلیل رہتا ہے) ہم نے اس عالم میں خوب غور کر کے دیکھ لیا کہ جو سرگرمی سے نیکی کرتا ہے تو نیک نتیجہ پانے سے خالی نہیں رہتا اور جو بدی کرتا ہے ضرور بد نتیجہ بھگت لیتا ہے دیکھو جو زنا کرتے ہیں اُن کو آتشک ہو جاتی ہے۔ شراب پینے والوں کو رعشہ ہو جاتا ہے۔ کسی کی انتڑیوں میں پھوڑے نکل آتے ہیں۔ القصہ خدا کے اس قدر احسان ہیں کہ کس کی طاقت ہے جو ان احسانوں کو شمار کر سکے انسان جس قدر قویٰ لے کر آیا ہے وہ کس کا عطیہ ہیں۔ انسان اگر سوچ کر دیکھے تو سب قویٰ اللہ کی زیر قدرت ہیں چاہے تو ایک دم میں قلب کی حرکت موقوف ہو جائے اور انسان فوراً ہلاک ہو جائے مگر مرنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔

(البدر ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

جو لوگ قیامت کے منکر ہیں اس میں ان کا رَدّ موجود ہے۔ اس کی تفصیل قرآن شریف میں بہت جگہ آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اِس صفت اور رحیمیت میں فرق یہ ہے کہ رحیمیت میں دُعا اور عبادت کے ذریعہ کامیابی کی راہ پیدا ہوتی اور ایک حق ہوتا ہے مگر مالکیت یوم الدین وہ حق اور ثمرہ عطا کرتی ہے۔

(الحکم ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ مالک ہے جزاء کے دن کا۔ دہریہ اس کے مخالف ہیں جو کہتے ہیں۔ کوئی جزا سزا نہیں۔ صفت رحیمیت سے انکار کرنے والے تو پھر لاپرواہی سے عمل نہیں کرتے اور یہ خدا کے وجود سے منکر ہیں۔ اس لیے عمداً اعمال صالحہ کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ (البدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

اِس جگہ سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چار صفتیں بیان فرمائیں یعنی رب العالمین[1] رحمان[2] رحیم[3] مالک[4] یوم الدین اور اِن ہر چہار صفتوں میں سے رب العالمین کو سب سے مقدم رکھا اور پھر بعد اُس کے صفت رحمان کو ذکر کیا پھر صفت رحیم کو بیان فرمایا پھر سب کے اخیر صفت مالک یوم الدین کو لائے پس سمجھنا چاہیئے کہ یہ ترتیب خدائے تعالیٰ نے کیوں اختیار کی اِس میں نکتہ یہ ہے کہ اِن صفاتِ اربعہ کی ترتیب طبعی یہی ہے اور اپنی واقعی صورت میں اسی ترتیب سے یہ صفتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ دُنیا پر خدا کا چار طور پر فیضان پایا جاتا ہے جو غور کرنے سے ہر یک عاقل اُس کو سمجھ سکتا ہے پہلا فیضان فیضانِ اعم ہے یہ وہ فیضان مطلق ہے کہ جو

[1] الانفال: ۳۰

بلا تمیز ذی روح و غیر ذی روح افلاک سے لیکر خاک تک تمام چیزوں پر علی الاتصال جاری ہے اور ہر یک چیز کا عدم سے صورتِ وجود پکڑنا اور پھر وجود کا حد کمال تک پہنچنا اسی فیضان کے ذریعہ سے ہے اور کوئی چیز جاندار ہو یا غیر جاندار اِس سے باہر نہیں اسی سے وجود تمام ارواح و اجسام ظہور پذیر ہوا اور ہوتا ہے اور ہر یک چیز نے پرورش پائی اور پاتی ہے یہی فیضان تمام کائنات کی جان ہے اگر ایک لحہ منقطع ہو جائے تو تمام عالم نابود ہو جائے اور اگر نہ ہوتا تو مخلوقات میں سے کچھ بھی نہ ہوتا اِس کا نام قرآنِ شریف میں ربوبیّت ہے اور اسی کے رو سے خدا کا نام رب العالمین ہے۔ جیساکہ اُس نے دوسری جگہ بھی فرمایا ہے وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ[۵] الجزو نمبر ۸۔ یعنی خدا ہر یک چیز کا رب ہے اور کوئی چیز عالم کی چیزوں میں سے اُس کی ربوبیت میں سے باہر نہیں سو خدا نے سورۃ فاتحہ میں سب صفات فیضانی میں سے پہلے صفت رب العالمین کو بیان فرمایا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن یہ اِس لیے کہا کہ سب فیضانی صفتوں میں سے تقدم طبعی صفت ربوبیت کو حاصل ہے یعنی ظہور کے رو سے بھی صفت مقدم الظہور اور تمام صفاتِ فیضانی سے اعم ہے کیونکہ ہر یک چیز پر خواہ جاندار ہو خواہ غیر جاندار مشتمل ہے۔ پھر دوسرا قسم فیضان کا جو دوسرے مرتبہ پر واقعہ ہے فیضانِ عام ہے اِس میں اور فیضان اعم میں یہ فرق ہے کہ فیضان اعم تو ایک عام ربوبیت ہے جس کے ذریعہ سے کُل کائنات کا ظہور اور وجود ہے اور یہ فیضان جس کا نام فیضانِ عام ہے یہ ایک خاص عنایت ازلیہ ہے جو جانداروں کے حال پر مبذول ہے یعنی ذی روح چیزوں کی طرف حضرتِ باری کی جو ایک خاص توجہ ہے اُس کا نام فیضانِ عام ہے اور اِس فیضان کی یہ تعریف ہے کہ یہ بلا استحقاق اور بغیر اِس کے کہ کسی کا کچھ حق ہو سب ذی روحوں پر حسب حاجت اُن کے جاری ہے کسی کے عمل کا پاداش نہیں اور اسی فیضان کی برکت سے ہر یک جاندار جیتا جاگتا کھاتا پیتا اور آفات سے محفوظ اور ضروریات سے متمتع نظر آتا ہے اور ہر یک ذی روح کے لیے تمام اسباب زندگی کے جو اُس کے لیے یا اُس کے نوع کے بقا کے لیے مطلوب ہیں میسّر نظر آتے ہیں اور یہ سب آثار اسی فیضان کے ہیں کہ جو کچھ روحوں کو جسمانی تربیت کے لیے درکار ہے سب کچھ دیا گیا ہے اور ایسا ہی جن روحوں کو علاوہ جسمانی تربیت کے روحانی تربیت کی بھی ضرورت ہے یعنی روحانی ترقی کی استعداد رکھتے ہیں اُن کے لیے قدیم سے عین ضرورتوں کے وقتوں میں کلامِ الٰہی نازل ہوتا رہا ہے غرض اسی فیضانِ رحمانیت کے ذریعہ سے انسان اپنی کروڑہا ضروریات پر کامیاب ہے سکونت کے لیے سطح زمین روشنی کے لیے چاند اور سورج دم لینے کے لیے ہوا پینے کے لیے پانی کھانے کے لیے انواع اقسام کے رزق اور علاج امراض

---

[۵] الانعام۔ ع ۲۰

کے لیے لاکھوں طرح کی ادویہ اور پوشاک کے لیے طرح طرح کی پوشیدنی چیزیں اور ہدایت پانے کے لیے صحفِ ربّانی موجود ہیں اور کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ تمام چیزیں میرے عملوں کی برکت سے پیدا ہوگئیں ہیں اور میں نے ہی کسی پہلے جنم میں کوئی نیک عمل کیا تھا جس کی پاداش میں یہ بے شمار نعمتیں خدا نے بنی آدم کو عنایت کیں پس ثابت ہے کہ یہ فیضان جو ہزارہا طور پر ذی روحوں کے آرام کے لیے ظہور پذیر ہو رہا ہے یہ عطیہ بلا استحقاق ہے جو کسی عمل کے عوض میں نہیں فقط ربّانی رحمت کا ایک جوش ہے تا ہر یک جاندار اپنے فطرتی مطلوب کو پہنچ جائے اور جو کچھ اُس کی فطرت میں حاجتیں ڈالی گئیں وہ پوری ہو جائیں پس اِس فیضان میں عنایت ازلیہ کا کام یہ ہے کہ انسان اور جمیع حیوانات کی ضروریات کا تعہد کرے اور ان کی بایست اور نابایست کی خبر رکھے تا وہ ضائع نہ ہو جائیں اور اُن کی استعدادیں حیز کتمان میں نہ رہیں اور اِس صفت فیضانی کا خدائے تعالیٰ کی ذات میں پایا جانا قانونِ قُدرت کے ملاحظہ سے نہایت بدیہی طور پر ثابت ہو رہا ہے کیونکہ کسی عاقل کو اِس میں کلام نہیں کہ جو کچھ چاند اور سورج اور زمین اور عناصر وغیرہ ضروریات دُنیا میں پائی جاتی ہیں جن پر تمام ذی روحوں کی زندگی کا مدار ہے اسی فیضان کے اثر سے ظہور پذیر ہیں اور ہر یک متنفّس بلا تمیز انسان و حیوان و مومن و کافر و نیک و بد حسب حاجت اپنے اِن فیوض مذکورہ بالا سے مستفیض ہو رہا ہے اور کوئی ذی روح اِس سے محروم نہیں اور اِس فیضان کا نام قرآن شریف میں رحمانیت ہے اور اسی کے رو سے خدا کا نام سورۃ فاتحہ میں بعد صفت رب العلمین رحمان آیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ۔ اسی صفت کی طرف قرآن شریف کے کئی ایک اور مقامات میں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے چنانچہ منجملہ اُن کے یہ ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ق اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ○ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ○ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ○ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○[1] یعنی جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے کہ تم رحمان کو سجدہ کرو تو وہ رحمان کے نام سے متنفّر ہو کر بطور انکار سوال کرتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے (پھر بطور جواب فرمایا) رحمان وہ ذات کثیر البرکت اور مصدر خیرات دائمی ہے جس نے آسمان میں بُرج بنائے بُرجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا جو کہ عامہ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر و مومن کے روشنی پہنچاتے ہیں اُسی رحمان نے تمہارے لیے یعنی تمام بنی آدم کے لیے دن اور رات بنائے جو کہ ایک دوسرے کے بعد

[1] فرقان - ع - ۵ و ۶ ۔

دورہ کرتے رہتے ہیں تا جو شخص طالبِ معرفت ہو وہ اُن دقائقِ حکمت سے فائدہ اُٹھاوے اور جہل اور غفلت کے پردہ سے خلاصی پاوے اور جو شخص شکرِ نعمت کرنے پر مستعد ہو وہ شکر کرے۔ رحمان کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بُردباری سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ اُن سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے اُن کا معاوضہ کرتے ہیں یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دُعا دیتے ہیں اور تشبّہ باخلاقِ رحمانی کرتے ہیں کیونکہ رحمان بھی بغیر تفریقِ نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمان کا لفظ اُن معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے کہ اُس کی رحمت وسیع عام طور پر ہر یک بُرے بھلے پر محیط ہو رہی ہے جیسا ایک جگہ اور بھی اسی رحمتِ عام کی طرف اشارہ فرمایا ہے عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِہٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ[1] یعنی میں اپنا عذاب جس کو لائق اُس کے دیکھتا ہوں پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر یک چیز کو گھیر رکھا ہے اور پھر ایک اَور موقعہ پر فرمایا قُلْ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ[2] یعنی اُن کافروں ورنا فرمانوں کو کہہ کہ اگر خدا میں صفت رحمانیّت کی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ تم اُس کے عذاب سے محفوظ رہ سکتے یعنی اسی کی رحمانیّت کا اثر ہے کہ وہ کافروں اور بے ایمانوں کو مُہلت دیتا ہے اور جلد تر نہیں پکڑتا پھر ایک اور جگہ اسی رحمانیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَھُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ ۘ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۭ الجزو ۲۹[3] یعنی کیا ان لوگوں نے اپنے سروں پر پرندوں کو اُڑتے ہوئے نہیں دیکھا کہ کبھی وہ بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں رحمن ہی ہے کہ اُن کو گرنے سے تھام رکھتا ہے۔ یعنی فیضانِ رحمانیّت ایسا تمام ذی روحوں پر محیط ہو رہا ہے کہ پرندے بھی جو ایک پیسہ کے دو تین مل سکتے ہیں وہ بھی اُس فیضان کے وسیع دریا میں خوشی اور سرور سے تیر رہے ہیں۔ اور چونکہ ربوبیّت کے بعد اسی فیضان کا مرتبہ ہے اس جہت سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں رب العالمین کی صفت بیان فرما کر پھر اُس کے رحمان ہونے کی صفت بیان فرمائی تا ترتیبِ طبعی اُن کی ملحوظ رہے۔ تیسری قسم فیضان کی فیضانِ خاص ہے اس میں اور فیضانِ عام میں یہ فرق ہے کہ فیضانِ عام میں مستفیض پر لازم نہیں کہ حصولِ فیض کے لیے اپنی حالت کو نیک بناوے اور اپنے نفس کو حجبِ ظلمانیہ سے باہر نکالے یا کسی قسم کا مجاہدہ اور کوشش کرے بلکہ اُس فیضان میں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں خدائے تعالیٰ آپ ہی ہر یک ذی روح کو اُس کی ضروریات جن کا وہ حسبِ فطرت محتاج ہے عنایت فرماتا ہے اور بن مانگے اور بغیر کسی کوشش کے مہیّا کر دیتا ہے لیکن

---

[1] اعراف ع ۱۹ [2] انبیاء ع ۳ [3] ملک ع ۲

فیضانِ خاص میں جہد اور کوشش اور تزکیہ قلب اور دُعا اور تضرع اور توجّہ الی اللہ اور دوسرا ہر طرح کا مجاہدہ جیسا کہ موقع ہو شرط ہے اور اِس فیضان کو وہی پاتا ہے جو ڈھونڈتا ہے اور اُسی پر وارد ہوتا ہے جو اُس کے لیے محنت کرتا ہے اور اس فیضان کا وجود بھی ملاحظہ قانونِ قدرت سے ثابت ہے کیونکہ یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ خدا کی راہ میں سعی کرنے والے اور غافل رہنے والے دونوں برابر نہیں ہو سکتے بلاشُبہ جو لوگ دل کی سچائی سے خدا کی راہ میں کوشش کرتے ہیں اور ہر یک تاریکی اور فساد سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں ایک خاص رحمت اُن کے شامل حال ہو جاتی ہے اِس فیضان کے رو سے خدائے تعالیٰ کا نام قرآنِ شریف میں رحیم ہے اور یہ مرتبہ صفتِ رحیمیت کا بوجہ خاص ہونے اور مشروط بہ شرائط ہونے کے مرتبہ صفت رحمانیت سے مؤخر ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے اول صفت رحمانیت ظہور میں آئی ہے پھر بعد اُس کے صفت رحیمیت ظہور پذیر ہوئی پس اسی ترتیب طبعی کے لحاظ سے سورۃ فاتحہ میں صفت رحیمیت کو صفت رحمانیت کے بعد میں ذکر فرمایا اور کہا الرحمان الرحیم اور صفت رحیمیت کے بیان میں کئی مقامات قرآنِ شریف میں ذکر موجود ہے جیسا ایک جگہ فرمایا ہے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا[1] یعنی خدا کی رحیمیت صرف ایمانداروں سے خاص ہے جس سے کافر کو یعنی بے ایمان اور سرکش کو حصہ نہیں۔

اس جگہ دیکھنا چاہیئے کہ خدا نے کیسی صفت رحیمیت کو مومن کے ساتھ خاص کر دیا لیکن رحمانیت کو کسی جگہ مومنین کے ساتھ خاص نہیں کیا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ كَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحْمَانًا بلکہ جو مومنین سے رحمتِ خاص متعلق ہے ہر جگہ اس کو رحیمیت کی صفت سے ذکر کیا ہے پھر دوسری جگہ فرمایا ہے إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ[2] یعنی رحیمیتِ الٰہی انہیں لوگوں سے قریب ہے جو نیکوکار ہیں پھر ایک اَور جگہ فرمایا ہے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ[3] یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خدا کے لیے وطنوں سے یا نفس پرستیوں سے جدائی اختیار کی اور خدا کی راہ میں کوشش کی وہ خدا کی رحیمیت کے اُمیدوار ہیں اور خدا غفور اور رحیم ہے یعنی اُس کا فیضانِ رحیمیت ضرور اُن لوگوں کے شامل حال ہو جاتا ہے کہ جو اُس کے مستحق ہیں کوئی ایسا نہیں جس نے اُس کو طلب کیا اور نہ پایا۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ۔۔۔ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

چوتھا قسم فیضان کا فیضانِ اخص ہے یہ وہ فیضان ہے کہ جو صرف محنت اور سعی پر مترتب نہیں ہو سکتا بلکہ اِس کے ظہور اور بروز کے لیے اول شرط یہ ہے کہ یہ عالم اسباب کہ جو ایک تنگ و تاریک جگہ ہے بکلّی معدوم

[1] احزاب۔ ع ۶۔ [2] اعراف۔ ع ۷۔ [3] بقرہ۔ ع ۲۷۔

اور منعدم ہو جائے اور قدرتِ کاملہ حضرتِ احدیت کی بغیر آمیزش اسبابِ معتادہ کے برہنہ طور پر اپنا کامل چمکار دکھلاوے کیونکہ اس آخری فیضان میں کہ جو تمام فیوض کا خاتمہ ہے جو کچھ پہلے فیضانوں کی نسبت عند العقل زیادتی اور کمالیت متصوّر ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ فیضان نہایت منکشف اور صاف طور پر ہو اور کوئی اشتباہ اور خفا اور نقص باقی نہ رہے۔ یعنی نہ مفیض کے بالارادہ فیضان میں کوئی شبہ رہ جائے اور نہ فیضان کے حقیقی فیضان اور رحمت خالصہ اور کاملہ ہونے میں کچھ جائے کلام ہو بلکہ جس مالک قدیم کی طرف سے فیض ہوا ہے اُس کی فیاضی اور جزا دہی روز روشن کی طرح کُھل جائے اور شخص فیضیاب کو بطور حق الیقین یہ امر مشہود اور محسوس ہو کہ حقیقت میں وہ مالک الملک ہی اپنے ارادہ اور توجہ اور قدرتِ خاص سے ایک نعمتِ عظمیٰ اور لذّت کبریٰ اُس کو عطا کر رہا ہے اور حقیقت میں اُس کو اپنے اعمالِ صالحہ کی ایک کامل اور دائمی جزا کہ جو نہایت اصفیٰ اور نہایت اعلیٰ اور نہایت مرغوب اور نہایت محبوب ہے مل رہی ہے کسی قسم کا امتحان اور ابتلا نہیں ہے۔ اور ایسے فیضانِ اکمل اور اتم اور اتقٰی اور اعلیٰ اور اجلیٰ سے متمتع ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ بندہ اِس عالمِ ناقص اور مکدر اور کثیف اور تنگ اور منقبض اور ناپائیدار مشتبہ الحال سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کرے کیونکہ یہ فیضان تجلّیاتِ عظمیٰ کا مظہر ہے جن میں شرط ہے کہ حسنِ حقیقی کا جمال بطور عریاں اور بمرتبۂ حق الیقین مشہود ہو اور کوئی مرتبہ شہود اور ظہور اور یقین کا باقی نہ رہ جائے اور کوئی پردہ اسبابِ معتادہ کا درمیان نہ ہو اور ہر یک دقیقہ معرفتِ تامہ کا مکمن قوت سے حیّز فعل میں آجائے اور نیز فیضان بھی ایسا منکشف اور معلوم الحقیقت ہو کہ اُس کی نسبت آپ خدا نے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ وہ ہر یک امتحان اور ابتلا کی کدورت سے پاک ہے اور نیز اُس فیضان میں وہ اعلیٰ اور اکمل درجہ کی لذّتیں ہوں جن کی پاک اور کامل کیفیت انسان کے دل اور روح اور ظاہر اور باطن اور جسم اور جان اور ہر یک روحانی اور بدنی قوّت پر ایسا اکمل اور اتقٰی احاطہ رکھتی ہو کہ جس پر عقلاً اور خیالاً اور وہماً زیادت متصوّر نہ ہو اور یہ عالم کہ جو ناقص الحقیقت اور مکدّر الصورت اور ہالکۃ الذات اور مشتبہ الکیفیت اور ضیق الظرف ہے اُن تجلّیاتِ عظمیٰ اور انوار اصفیٰ اور عطیاتِ دائمی کی برداشت نہیں کر سکتا اور وہ اشعہ تامہ کاملہ دائمہ اُس میں سما نہیں سکتے بلکہ اس کے ظہور کے لیے ایک دوسرا عالم درکار ہے کہ جو اسبابِ معتادہ کی ظلمت سے بکلّی پاک اور منزّہ اور ذاتِ واحد قہار کی اقتدارِ کامل اور خالص کا مظہر ہے۔ ہاں اِس فیضانِ اخص سے اُن کامل انسانوں کو اسی زندگی میں کچھ حظ پہنچتا ہے کہ جو سچائی کی راہ پر کامل طور پر قدم مارتے ہیں اور اپنے نفس کے ارادوں اور خواہشوں سے الگ ہو کر بکلّی خدا کی طرف جُھک جاتے ہیں کیونکہ وہ مرنے سے پہلے مرتے ہیں اور اگرچہ بظاہر صورت اِس عالم میں ہیں لیکن درحقیقت وہ دوسرے عالم میں سکونت رکھتے ہیں پس چونکہ وہ اپنے دل کو اس دنیا کے اسباب سے منقطع کر لیتے ہیں اور عاداتِ بشریت کو توڑ کر اور یکبارگی غیر اللہ

سے مونہہ پھیر کر وہ طریق جو خارقِ عادت ہے اختیار کر لیتے ہیں اس لیے خداوند کریم اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے اور بطور خارقِ عادت اُن پر اپنے وہ انوارِ خاصہ ظاہر کرتا ہے کہ جو دوسروں پر بجز موت کے ظاہر نہیں ہوسکتے غرض بباعث امورِ متذکرۂ بالا وہ اس عالم میں بھی فیضانِ اخص کے نور سے کچھ حصہ لیتے ہیں اور یہ فیضان ہر یک فیض سے خاص تر اور خاتمہ تمام فیضانوں کا ہے اور اس کو پانے والا سعادتِ عظمیٰ کو پہنچ جاتا ہے اور خوشحالی دائمی کو پالیتا ہے کہ جو تمام خوشیوں کا سرچشمہ ہے اور جو شخص اس سے محروم رہا وہ ہمیشہ کے دوزخ میں پڑا اس فیضان کے رو سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنا نام مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بیان فرمایا ہے دین کے لفظ پر الف لام لانے سے یہ غرض ہے کہ تا یہ معنے ظاہر ہوں کہ جزا سے مراد وہ کامل جزا ہے جس کی تفصیل فرقان مجید میں مندرج ہے اور وہ کامل جزا بجز تجلّی مالکیّت تامہ کے کہ جو ہدم بنیان اسباب کو مستلزم ہے ظہور میں نہیں آسکتی چنانچہ اسی کی طرف دوسری جگہ بھی اشارہ فرما کر کہا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ[1] یعنی اُس دن ربوبیّت الٰہیہ بغیر توسطِ اسبابِ عادیہ کے اپنی تجلّی آپ دکھائیگی اور یہی مشہود اور محسوس ہوگا کہ بجز قوتِ عظمیٰ اور قدرتِ کاملہ حضرتِ باری تعالیٰ کے اور سب ہیچ ہیں تب سارا آرام و سرور اور سب جزا اور پاداش بنظر صاف و صریح خدا ہی کی طرف سے دکھلائی دیگا اور کوئی پردہ اور حجاب درمیان میں نہیں رہے گا اور کسی قسم کے شک کی گنجایش نہیں رہے گی تب جنہوں نے اُس کے لیے اپنے تئیں منقطع کر لیا تھا وہ اپنے تئیں ایک کامل سعادت میں دیکھیں گے کہ جو اُن کے جسم اور جان اور ظاہر اور باطن پر محیط ہو جائے گی اور کوئی حصہ وجود اُن کا ایسا نہیں ہوگا کہ جو اس سعادتِ عظمیٰ کے پانے سے بے نصیب رہا ہو اور اس جگہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے لفظ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس روز راحت یا عذاب اور لذت یا درد جو کچھ بنی آدم کو پہنچے گا اُس کا اصل موجب خدائے تعالیٰ کی ذات ہوگی اور مالک امر مجازات کا حقیقی طور پر وہی ہوگا یعنی اُسی کا وصل یا فصل سعادتِ ابدی یا شقاوتِ ابدی کا موجب ٹھہرے گا اس طرح پر کہ جو لوگ اُس کی ذات پر ایمان لائے تھے اور توحید اختیار کی تھی اور اُس کی خالص محبّت سے اپنے دلوں کو رنگین کر لیا تھا اُن پر انوارِ رحمت اُس ذات کامل کے صاف اور آشکارا طور پر نازل ہوں گے اور جن کو ایمان اور محبّتِ الٰہیہ حاصل نہیں ہوئی وہ اس لذت اور راحت سے محروم رہیں گے اور عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ فیوضِ اربعہ ہیں جن کو ہم نے تفصیل وار لکھ دیا ہے اب ظاہر ہے کہ صفتِ رحمان کو صفتِ رحیم پر مقدم رکھنا نہایت ضروری اور مقتضائے بلاغت کاملہ ہے کیونکہ صحیفۂ قدرت پر جب نظر ڈالی جائے تو پہلے پہل خدائے تعالیٰ کی عام ربوبیت پر نظر پڑتی ہے پھر اُس کی رحمانیت پر پھر اُس کی رحیمیت پر

[1] مؤمن - ع ۲ -

پھر اُس کے مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ہونے پر اور یکمال بلاغت اسی کا نام ہے کہ جو صحیفۂ فطرت میں ترتیب ہو وہی ترتیب صحیفۂ الہام میں بھی ملحوظ رہے کیونکہ کلام میں ترتیب قدرتی کو منقلب کرنا گویا قانون قدرت کو منقلب کرنا ہے اور نظام طبعی کو اُلٹا دینا ہے کلام بلیغ کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ نظام کلام کا نظام طبعی کے ایسا مطابق ہو کہ گویا اُس کی عکسی تصویر ہو اور جو امر طبعاً اور وقوعاً مقدم ہو اُس کو وضعاً بھی مقدم رکھا جائے سو آیات موصوفہ میں یہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہے کہ باوجود کمال فصاحت اور خوش بیانی کے واقعی ترتیب کا نقشہ کھینچ کر دکھلا دیا ہے اور وہی طرز بیان اختیار کی ہے جو کہ ہر یک صاحب نظر کو نظام عالم میں بدیہی طور پر نظر آ رہی ہے کیا یہ نہایت سیدھا راستہ نہیں ہے کہ جس ترتیب سے نعماء الٰہی صحیفۂ فطرت میں واقعہ ہیں اُسی ترتیب سے صحیفۂ الہام میں بھی واقعہ ہوں سو ایسی عمدہ اور پُر حکمت ترتیب پر اعتراض کرنا حقیقت میں اُنہیں اندھوں کا کام ہے جن کی بصیرت اور بصارت دونوں یکبارگی جاتی رہی ہیں۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۷۱ تا صفحہ ۳۸۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

سورہ فاتحہ میں اُس خدا کا نقشہ دکھایا گیا ہے جو قرآن شریف منوانا چاہتا ہے اور جس کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اُس کی چار صفات کو ترتیب وار بیان کیا ہے جو اُمّہات الصّفات کہلاتی ہیں جیسے سورہ فاتحہ ام الکتاب ہے ویسے ہی جو صفات اللہ تعالیٰ کی اس میں بیان کی گئی ہیں وہ بھی ام الصفات ہی ہیں اور وہ یہ ہیں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ[۱] اَلرَّحْمٰنِ[۲] اَلرَّحِیْمِ[۳] مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ[۴] ان صفات اربعہ پر غور کرنے سے خدا تعالیٰ کا گویا چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ ربوبیت کا فیضان بہت ہی وسیع اور عام ہے اور اس میں کل مخلوق کی کل حالتوں میں تربیت اور اس کی تکمیل کے تکفل کی طرف اشارہ ہے۔ غور تو کرو۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر سوچتا ہے تو اُس کی اُمید کس قدر وسیع ہو جاتی ہے اور پھر رحمانیت یہ ہے کہ بدوں کسی عمل عامل کے اُن اسباب کو مہیا کرتا ہے جو بقائے وجود کے لیے ضروری ہیں دیکھو چاند سورج ہوا پانی وغیرہ بدوں ہماری دعا اور التجا کے اور بغیر ہمارے کسی عمل اور فعل کے اُس نے ہمارے وجود کے بقا کے لیے کام میں لگا رکھے ہیں اور پھر رحیمیت یہ ہے کہ اعمال کو ضائع نہ کرے اور مالک یوم الدین کا تقاضا یہ ہے کہ بامراد کر دے جیسے ایک شخص امتحان کے لیے بہت محنت سے طیاری کرتا ہے مگر امتحان میں دو چار نمبروں کی کمی رہ جاتی ہے تو دنیوی نظام اور سلسلہ میں تو اس کا لحاظ نہیں کرتے اور اس کو گرا دیتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی رحیمیت اس کی پردہ پوشی فرماتی ہے اور اس کو پاس کرا دیتی ہے رحیمیت میں ایک قسم کی پردہ پوشی بھی ہوتی ہے عیسائیوں کا خدا ذرا بھی پردہ پوش نہیں ہے ورنہ کفارہ کی کیا ضرورت رہتی ایسا ہی آریوں کا خدا نہ رب ہے نہ رحمان ہے کیونکہ وہ تو

بلا مزد اور بلا عمل کچھ بھی کسی کو عطا نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ ویدوں کے اصول کے موافق گناہ کرنا بھی ضروری معلوم دیتا ہے مثلاً ایک شخص کو اگر کسی اس کے عمل کے معاوضہ میں گائے کا دودھ دینا مطلوب ہے تو بالمقابل یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی برہمنی (اگر یہ روایت صحیح ہو) زنا کرے تاکہ اس فسق و فحش کے بدلہ میں وہ گائے کی جون میں جائے اور اس عامل کو دودھ پلائے خواہ وہ اُس کا خاوند ہی کیوں نہ ہو۔ غرض جب تک ایسا سلسلہ نہ ہوگا کوئی عامل اپنے عمل کی جزا ویدک ایشر کے خزانہ سے پا نہیں سکتا کیونکہ اس کا سارا سلسلہ جوڑ توڑ ہی سے چلتا ہے۔ مگر اسلام نے وہ خدا پیش کیا ہے جو جمیع محامد کا سزاوار ہے اس لیے معطی حقیقی ہے۔ وہ رحمٰن ہے بدوں عمل عامل کے اپنا فضل کرتا ہے۔ پھر مالکیت یوم الدین جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے بامراد کرتی ہے دنیاوی گورنمنٹ کبھی اس امر کا ٹھیکہ نہیں لے سکتی کہ ہر ایک بی اے پاس کرنے والے کو ضرور نوکری دیگی۔ مگر خدا تعالیٰ کی گورنمنٹ کامل گورنمنٹ اور لا انتہا خزائن کی مالک ہے اُس کے حضور کوئی کمی نہیں۔ کوئی عمل کرنے والا ہو وہ سب کو فائز المرام کرتا ہے۔ نیکیوں اور حسنات کے مقابلہ میں بعض ضعفوں اور سقموں کی پردہ پوشی بھی فرماتا ہے۔ وہ توّاب بھی ہے اور ستیر بھی ہے اللہ تعالیٰ کو ہزار ہا عیب اپنے بندوں کے معلوم ہوتے ہیں مگر وہ ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ بے باک ہو کر انسان اپنے عیبوں میں ترقی پر ترقی کرتا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی حیا اور پردہ پوشی سے نفع نہیں اُٹھاتا بلکہ دہریت کی رگ اُس میں زور پکڑتی جاتی ہے۔ تب خدا تعالیٰ کی غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اس بے باک کو چھوڑا جائے اس لیے وہ ذلیل کیا جاتا ہے..... غرض میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ رحیمیت میں ایک خاصہ پردہ پوشی کا بھی ہے مگر اس پردہ پوشی سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی عمل ہو اور اس عمل کے متعلق اگر کوئی کمی یا نقص رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحیمیت سے اُس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ رحمانیت اور رحیمیت میں فرق یہ ہے کہ رحمانیت میں فعل اور عمل کو کوئی دخل نہیں ہوتا مگر رحیمیت میں فعل و عمل کو دخل ہے لیکن کمزوری بھی ساتھ ہی ہے۔ خدا کا رحم چاہتا ہے کہ پردہ پوشی کرے اسی طرح مالک یوم الدین وہ ہے کہ اصل مقصد کو پورا کرے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ امہات الصفات روحانی طور پر خدا نما تصویریں ہیں۔ ان پر غور کرتے ہی معاً خدا سامنے ہو جاتا ہے اور روح ایک لذت کے ساتھ اُچھل کر اُس کے سامنے سر بسجود ہو جاتی ہے چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے جو شروع کیا گیا تھا تو غائب کی صورت میں ذکر کیا ہے لیکن ان صفات اربعہ بیان کے بعد معاً صورت بیان تبدیل ہو گئی ہے کیونکہ ان صفات نے خدا کو سامنے حاضر کر دیا ہے اس لیے حق تھا اور فصاحت کا تقاضا تھا کہ اب غائب نہ رہے بلکہ حاضر کی صورت اختیار کی جاوے۔ پس اس دائرہ کی تکمیل کے تقاضا نے مخاطب کی طرف مُنہ پھیرا اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہا۔

(الحکم ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

وَاعْلَمْ اَنَّ فِیْ تَرْتِیْبِ هٰذِهِ الصِّفَاتِ بَلَاغَةً اُخْرٰی نُرِیْدُ اَنْ نَّذْکُرَهَا لِتَکْتَحِلَ مِنْ کُحْلِ الْمُتَبَصِّرِیْنَ - وَهُوَ اَنَّ الْاٰیَاتِ الَّتِیْ رَصَّعَ اللّٰهُ بَعْدَهَا کُلُّهَا مَقْسُوْمَةٌ عَلٰی تِلْکَ الصِّفَاتِ بِرِعَایَةِ الْمُحَاذَاةِ وَ وَضْعِ بَعْضِهَا تَحْتَ بَعْضٍ کَطَبَقَاتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرَضِیْنَ - وَتَفْصِیْلُهٗ اَنَّهٗ تَعَالٰی ذَکَرَ اَوَّلًا ذَاتَهٗ وَصِفَاتِهٖ بِتَرْتِیْبٍ یُّوْجَدُ فِی الْعَالَمِیْنَ - ثُمَّ ذَکَرَ کُلَّ مَا هُوَ مُنَاسِبُ الْبَشَرِیَّةِ بِتَرْتِیْبٍ یُّشَاهَدُ فِیْ قَانُوْنِ اللّٰهِ وَمَعَ ذٰلِکَ جَعَلَ کُلَّ صِفَةٍ بَشَرِیَّةٍ تَحْتَ صِفَةٍ اِلٰهِیَّةٍ وَّجَعَلَ لِکُلِّ صِفَةٍ اِنْسَانِیَّةٍ مَّشْرَبًا وَّ سُقْیًا مِّنْ صِفَةٍ اِلٰهِیَّةٍ تَسْتَفِیْضُ مِنْهَا وَاَرَی التَّقَابُلَ بَیْنَهُمَا بِتَرْتِیْبٍ وَّضْعِیٍّ یُّوْجَدُ فِی الْاٰیٰتِ فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْمُرَتِّبِیْنَ - وَتَشْرِیْحُهُ التَّامُّ اَنَّ الصِّفَاتِ مَعَ اسْمِ الذَّاتِ خَمْسَةُ اَبْحُرٍ قَدْ تَقَدَّمَ ذِکْرُهَا فِیْ صَدْرِ السُّوْرَةِ اَعْنِیْ اَللّٰهَ - وَرَبَّ الْعَالَمِیْنَ - وَالرَّحْمٰنَ وَ الرَّحِیْمَ - وَمَالِکَ یَوْمِ الدِّیْنِ - فَجَعَلَ اللّٰهُ کَمِثْلِهَا خَمْسَةً مِّنَ الْمُغْتَرَفَاتِ

(ترجمہ) واضح ہو کہ ان صفات الٰہیہ کی ترتیب میں اور بلاغت پائی جاتی ہے جسے ہم (یہاں) بیان کرنا چاہتے ہیں۔ تا صاحب بصیرت لوگوں (کی بینائی) کے سُرمہ سے آپ کی آنکھیں بھی روشن ہوں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کے معاً بعد جو آیات سجائی ہے وہ انہیں صفات پر منقسم ہیں۔ (یعنی ہر آیت ایک خاص صفت سے متعلق ہے) بلحاظ ایک دوسری کے مقابل واقع ہونے کے اور آسمانوں اور زمینوں کے طبقات کی طرح ایک دوسری کے اوپر تلے رکھے جانے کے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے خدا تعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات کا اسی ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جو کائنات عالم میں پائی جاتی ہے۔ پھر ان تمام امور کو جو بشریت کے مناسب حال ہیں اسی ترتیب کے ساتھ بیان کیا جو خدائی قانون میں نظر آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہر بشری صفت کو ایک الٰہی صفت کے تحت رکھ دیا۔ اور ہر انسانی صفت کے لیے ایک صفت الٰہیہ کو گھاٹ یا پینے کا مقام قرار دیا جس سے وہ مستفیض ہو۔ خدا تعالیٰ نے ان آیات میں ایک وضعی ترتیب کے مطابق آپس میں تقابل دکھایا ہے پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ تعالیٰ جو بہترین ترتیب دینے والا ہے۔

اس مضمون کی مکمل تشریح یوں ہے کہ یہ صفات (اللہ تعالیٰ کے) اسم ذات سمیت پانچ سمندر ہیں۔ جن کا ذکر اس سورت کے شروع میں آیا ہے یعنی اَللّٰه - رَبِّ الْعَالَمِیْن - اَلرَّحْمٰن - اَلرَّحِیْم اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کے مطابق ان (سمندروں) سے مستفیض ہونے والی آیات کا ذکر کیا ہے۔ اور ان پانچ کو اُن پانچ کے

مِمَّا ذُكِرَ مِنْ بَعْدُ وَقَابَلَ الْخَمْسَةَ بِالْخَمْسَةِ وَكُلٌّ وَاحِدٍ مِّنَ الْمُغْتَرِفَاتِ يَشْرَبُ مِنْ مَّآءِ صِفَةٍ تُشَابِهُهٗ وَتُنَاوِحُهٗ وَتَأْخُذُ مِمَّا احْتَوَتْ عَلٰى مَعَانٍ تَسُرُّ الْعَارِفِيْنَ - مَثَلًا اَوَّلُهَا بَحْرُ اسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَتَغْتَرِفُ مِنْهُ جُمْلَةُ اِيَّاكَ نَعْبُدُ الَّتِیْ حَذَتْهُ وَصَارَتْ كَالْمُحَاذِيْنَ - وَحَقِيْقَةُ التَّعَبُّدِ تَعْظِيْمُ الْمَعْبُوْدِ بِالتَّذَلُّلِ التَّآمِّ وَالْاِحْتِذَآءُ بِمِثَالِهٖ وَالْاِنْصِبَاغُ بِصِبْغِهٖ وَالْخُرُوْجُ مِنَ النَّفْسِ وَالْاَنَانِيَّةِ كَالْفَانِيْنَ - وَسِرُّهٗ اَنَّ الْعَبْدَ قَدْ خُلِقَ كَالْمَرِيْضِ وَالْعَلِيْلِ وَالْعَطْشَانِ وَشِفَآءُهٗ وَتَسْكِيْنُ غُلَّتِهٖ وَاِرْوَآءُ كَبِدِهٖ فِیْ مَآءِ عِبَادَةِ اللّٰهِ فَلَا يَبْرَءُ وَلَا يَرْتَوِیْ اِلَّا اِذَا يَثْنِیْ اِلَيْهِ انْصِبَابَهٗ وَيُفْرِطُ صَبَابَهٗ وَيَسْعٰى اِلَيْهِ كَالْمُسْتَسْقِيْنَ وَلَا يُطَهِّرُ قَرِيْحَتَهٗ وَلَا يُلَبِّدُ عَجَاجَتَهٗ وَلَا يُحَلِّیْ مُجَاجَتَهٗ اِلَّا ذِكْرُ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ وَيَاْتُوْنَهٗ مُسْلِمِيْنَ - فَفِیْ اٰيَةِ اِيَّاكَ نَعْبُدُ اِقْرَارُ الْمَعْبُوْدِيَّةِ اللّٰهِ الَّذِیْ هُوَ مُسْتَجْمِعٌ لِّجَمِيْعِ صِفَاتِ الْكَامِلَةِ وَلِذَالِكَ وَقَعَتْ

مقابل پر رکھا ہے۔ اور ہر فیض حاصل کرنے والی آیت ایک ایسی صفت سے مستفیض ہوتی ہے جو اس کے مشابہ اور اس کے مقابل ہے۔ اور اس سے وہ مطالب اخذ کرتی ہے جن پر وہ صفت حاوی ہے۔ اور جو اربابِ الٰہی کو بے حد پسندیدہ ہیں۔ مثلاً ان میں سے سب سے پہلا سمندر اللہ (اسم ذات) کا سمندر ہے۔ اس کے مقابل اِیَّاكَ نَعْبُدُ کا فقرہ ہے جو مقابل میں رکھی جانے والی اشیاء کی طرح ہو کر فیض حاصل کرتا ہے۔ اور عبادت کی حقیقت ہے، پوری انکساری سے معبود کی تعظیم کرنا اور اس کے نمونہ کو اختیار کرنا۔ اس کے رنگ سے رنگین ہونا اور فانی فی اللہ لوگوں کی طرح نفسانیت اور انانیت سے الگ ہو جانا۔ اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو بیمار اور روگی اور پیاسے کے مثل پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس کی شفا، اس کی پیاس کی تسکین اور اس کے جگر کی سیرابی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے پانی سے ہوتی ہے۔ وہ تبھی صحت مند اور سیراب ہو سکتا ہے، جب وہ اللہ کی طرف اپنا رخ موڑ لیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اپنے عشق کو بڑھاتا ہے اور وہ اس (معبودِ حقیقی) کی طرف پانی کے طالبوں کی طرح دوڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے سوا کوئی چیز نہ تو اس کی فطرت کو پاک کر سکتی ہے نہ اس کے غبارِ خاطر کو مجتمع کر سکتی ہے۔ اور نہ اس کے منہ کا ذائقہ شیریں بنا سکتی ہے۔ سنو۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ان ہی لوگوں کے دل مطمئن ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے حضور فرماں بردار بن کر آتے ہیں۔ پس آیت مبارکہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اعتراف ہے جو تمام صفات کاملہ کا جامع ہے اور اسی لیے یہ جملہ (اِیَّاكَ نَعْبُدُ) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

هٰذِهِ الْجُمْلَةُ تَحْتَ جُمْلَةِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَانْظُرْ اِنْ كُنْتَ مِنَ النَّاظِرِيْنَ۔

وَثَانِيْهِمَا بَحْرُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَتَغْتَرِفُ مِنْهَا جُمْلَةُ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ فَاِنَّ الْعَبْدَ اِذَا سَمِعَ اَنَّ اللّٰهَ يُرَبِّي الْعَالَمِيْنَ كُلَّهَا وَمَا مِنْ عَالَمٍ اِلَّا هُوَ مُرَبِّيْهِ وَرَاٰى نَفْسَهٗ اَمَّارَةً بِالسُّوْٓءِ فَتَضَرَّعَ وَاضْطَرَّ وَالْتَجَاَ اِلٰى بَابِهٖ وَتَعَلَّقَ بِاَهْدَابِهٖ وَدَخَلَ فِيْ مَاْدُبِهٖ بِرِعَايَةِ اٰدَابِهٖ لِيُدْرِكَهٗ بِالرُّبُوْبِيَّةِ وَيُحْسِنَ اِلَيْهِ وَهُوَ خَيْرُ الْمُحْسِنِيْنَ۔ فَاِنَّ الرُّبُوْبِيَّةَ صِفَةٌ تُعْطِيْ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ الْمَطْلُوْبَ لِوُجُوْدِهٖ وَلَا يُغَادِرُهٗ كَالنَّاقِصِيْنَ۔

وَثَالِثُهَا بَحْرُ اسْمِ الرَّحْمٰنِ وَتَغْتَرِفُ مِنْهُ جُمْلَةُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ لِيَكُوْنَ الْعَبْدُ مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ الْمَرْحُوْمِيْنَ۔ فَاِنَّ الرَّحْمَانِيَّةَ تُعْطِيْ كُلَّمَا يَحْتَاجُ اِلَيْهِ الْوُجُوْدُ الَّذِيْ رُبِّيَ مِنْ صِفَةِ الرُّبُوْبِيَّةِ فَهٰذِهِ الصِّفَةُ تَجْعَلُ الْاَسْبَابَ مُوَافِقَةً لِّلْمَرْحُوْمِ وَاَثَرُ الرُّبُوْبِيَّةِ تَسْوِيَةُ الْوُجُوْدِ وَتَخْلِيْقُهٗ كَمَا يَلِيْقُ وَيَنْبَغِيْ وَاَثَرُ هٰذِهِ الصِّفَةِ اَنَّهَا تُكْسِيْ

کے جملہ کے تحت ہے۔ پس تو غور کر اگر تو غور کرنے والوں میں سے ہے۔

ان میں سے دوسرا سمندر رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کا ہے۔ اور اس سے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا جملہ مستفیض ہوتا ہے۔ کیونکہ بندہ جب یہ بات سنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کی پرورش کرتا ہے اور ایسا کوئی عالم نہیں جس کا وہ مربّی نہ ہو اور وہ (بندہ) اپنے نفس کو بدی کا حکم دینے والا دیکھتا ہے تو وہ گریہ وزاری کرتا ہے اور مجبور ہو کر اس کے دروازہ کی طرف پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اس کے دامن سے لپٹ جاتا ہے اور اس کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کی (روحانی) ضیافت گاہ میں داخل ہو جاتا ہے تا وہ (پاک ذات) اپنی ربوبیت سے اس کی دستگیری کرے اور اس پر احسان فرمائے اور وہ بہترین احسان کرنے والا ہے۔ پس ربوبیت ایک ایسی صفت ہے جو ہر چیز کو اس کے وجود کے مناسب حال خلق عطا کرتی ہے۔ اور اس کو ناقص حالت میں نہیں رہنے دیتی۔

ان میں سے تیسرا سمندر الرحمٰن ہے۔ اور اس سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کا جملہ سیراب ہوتا ہے۔ تا انسان ہدایت اور رحمت پانے والوں میں ہو جائے کیونکہ صفتِ رحمانیت ہر اُس وجود کو جو صفت ربوبیت سے تربیت پا چکا ہے وہ سب کچھ مہیا کرتی ہے جس کی اسے حاجت ہو پس یہ صفت تمام وسائل کو رحم پانے والے کے موافق بنا دیتی ہے اور ربوبیت کا نتیجہ وجود کو کامل قویٰ دینا اور ایسے طور پر پیدا کرنا ہے جو اس کے لائق حال اور مناسب ہے۔ اسی صفت کا اثر یہ ہے

ذَالِكَ الْوُجُوْدَ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْآتَهٗ وَتَهَبُ لَهٗ زِيْنَتَهٗ وَتَكْحُلُ عَيْنَهٗ وَتَغْسِلُ وَجْهَهٗ وَتُعْطِىْ لَهٗ فَرَسًا لِّلرُّكُوْبِ وَتُرِيْهِ طُرُقَ الْفَارِسِيْنَ۔ وَمَرْتَبَتُهَا بَعْدَ الرُّبُوْبِيَّةِ وَهِىَ تُعْطِىْ كُلَّ شَىْءٍ مَّطْلُوْبَ وُجُوْدِهٖ وَتَجْعَلُهٗ مِنَ الْمُوَفَّقِيْنَ۔

وَرَابِعُهَا بَحْرُ اسْمِ الرَّحِيْمِ وَتَغْتَرِفُ مِنْهُ جُمْلَةُ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ لِيَكُوْنَ الْعَبْدُ مِنَ الْمُنْعَمِيْنَ الْمَخْصُوْصِيْنَ۔ فَاِنَّ الرَّحِيْمِيَّةَ صِفَةٌ مُّدْنِيَةٌ اِلَى الْاِنْعَامَاتِ الْخَاصَّةِ الَّتِىْ لَا شَرِيْكَ فِيْهَا لِلْمُطِيْعِيْنَ۔ وَاِنْ كَانَ الْاِنْعَامُ الْعَامُّ مُحِيْطَةً بِكُلِّ شَىْءٍ مِّنَ النَّاسِ اِلَى الْاَفَاعِىْ وَالتِّنِّيْنِ۔

وَخَامِسُهَا بَحْرُ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ وَتَغْتَرِفُ مِنْهُ جُمْلَةُ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ فَاِنَّ غَضَبَ اللّٰهِ وَتَرْكَهٗ فِى الضَّلَالَةِ لَا تَظْهَرُ حَقِيْقَتُهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى وَجْهِ الْكَامِلِ اِلَّا فِىْ يَوْمِ الْمُجَازَاةِ الَّذِىْ

کہ یہ ہر وجود کو اس کے عیوب کو چھپا دینے والا لباس پہناتی ہے۔ اُسے زینت عطا کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہے۔ اس کے چہرہ کو دھوتی ہے۔ اس کو سواری کے لیے گھوڑا دیتی ہے۔ اور اس کو شاہسواروں کے طریق بتاتی ہے اور صفت (رحمانیت) کا درجہ ربوبیت کے بعد ہے وہ ہر چیز کو اس کے وجود کا مطلوب عطا کرکے اسے توفیق یافتہ لوگوں میں سے بنا دیتی ہے۔

ان میں سے چوتھا سمندر صفت اَلرَّحِیْم ہے۔ اور اس سے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کا جملہ مستفیض ہوتا ہے۔ تا بندہ خاص انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہو جائے۔ کیونکہ رحیمیت ایسی صفت ہے جو ان انعامات خاصہ تک پہنچا دیتی ہے جن میں فرمانبردار لوگوں کا کوئی شریک نہیں ہوتا۔ گو (اللہ تعالیٰ کا) عام انعام انسانوں سے لیکر سانپوں، اژدہاؤں تک کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

ان میں سے پانچواں سمندر مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (کی صفت) ہے۔ اور اس سے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کا جملہ مستفیض ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے غضب اور اس کے (انسان کو) ضلالت اور گمراہی میں چھوڑ دینے کی حقیقت لوگوں پر مکمل طور پر جزا اور سزا کے دن ہی ظاہر ہوگی جس دن اللہ تعالیٰ اپنے غضب اور انعام کے ساتھ

يُجَالِيهِمُ اللّٰهُ فِيهِ بِغَضَبِهٖ وَاِنْعَامِهٖ وَيُجَالِحُهُمْ بِتَذْلِيلِهٖ وَاِكْرَامِهٖ وَيُجَلِّيْ عَنْ نَّفْسِهٖ اِلٰى حَدٍّ مَّا جَلّٰى كَمِثْلِهٖ وَتَتَرَآءَ السَّابِقُوْنَ كَفَرَسٍ مُّجَلًّى وَّتَتَرَآءَتِ الْجَالِيَةُ بِغَيِّهِمِ الْمُبِيْنِ ۔ وَفِيْهِ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا مَوْرِدَ غَضَبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَلٰكِنْ عَمَى هٰذِهِ الدُّنْيَا مَخْفِيٌّ وَّيَتَبَيَّنُ فِيْ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ فَالَّذِيْنَ اَبَوْا وَمَا تَبِعُوْا هُدَى رَسُوْلِنَا وَنُوْرَ كِتَابِنَا وَكَانُوْا الطَّوَاغِيْتَهِمْ مُّتَّبِعِيْنَ فَسَوْفَ يَرَوْنَ غَضَبَ اللّٰهِ وَتَغَيُّظَ النَّارِ وَزَفِيْرَهَا وَيَرَوْنَ ظُلُمٰتِهِمْ وَضَلَالَتَهُمْ بِالْاَعْيُنِ وَيَجِدُوْنَ اَنْفُسَهُمْ كَالظَّالِعِ الْاَعْوَرِ وَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَا كَانَ لَهُمْ اَحَدٌ مِّنَ الشَّافِعِيْنَ ۔ وَفِي الْاٰيَةِ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ اسْمَ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ذُوالْجِهَتَيْنِ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ فَاسْئَلُوْهُ اَنْ يَّجْعَلَكُمْ مِّنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۔

هٰذَا مَا اَرَدْنَا مِنْ بَيَانِ بَعْضِ نِكَاتِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَلَطَآئِفِهَا

جلوہ گر ہوگا۔ اوران کو اپنی طرف سے ذلت دیکر یا عزّت دیکر ظاہر کر دے گا۔ اوراس حدتک اپنے آپ کو ظاہر کر دے گا کہ اس طرح کبھی اپنے وجود کو ظاہر نہیں کیا ہوگا۔ اور (خدا کی راہ میں) سبقت لے جانے والے یوں دکھائی دیں گے جیسے میدان میں آگے بڑھا ہوا گھوڑا۔ اور گناہگار اپنی کھلی کھلی گمراہی میں نظر آئیں گے۔ اوراس دن منکروں پر واضح ہو جائے گا کہ وہ درحقیقت غضب الٰہی کے مورد تھے اور اندھے تھے۔ اور جو اس دنیا میں اندھا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ لیکن اس دنیا کی نابینائی مخفی ہے۔ اور جزا سزا کے دن وہ ظاہر ہو جائے گی۔ پس جن لوگوں نے انکار کیا اور ہمارے رسول کی ہدایت اور ہماری کتاب (قرآن کریم) کے نور کی پیروی نہ کی اور اپنے باطل معبودوں کی اتباع کرتے رہے وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے غضب کو دیکھیں گے۔ اور جہنم کے جوش اور اس کی خوفناک آواز کو سنیں گے۔ اور اپنی گمراہی اور کجروی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اپنے آپ کو لنگڑے کانے جیسے پائیں گے۔ اور جہنم میں داخل ہوں گے۔ جہاں وہ لمبا عرصہ رہیں گے اور ان کا کوئی شفیع نہیں ہوگا۔ اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ (خدا کا) اسم مالکِ یوم الدین دو پہلوؤں والا ہے۔ وہ جسے چاہے گمراہ ٹھہراتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ پس تم دعا کرو کہ وہ تمہیں ہدایت یافتہ بنا دے۔

یہی وہ امر ہے جس کو ہم بیان کرنا چاہتے تھے۔ یعنی اس آیت کے بعض نکات اور ادبی لطائف کو جو دیکھنے والوں کے

الْأَدَبِيَّةِ الَّتِيْ هِيَ لِلنَّاظِرِيْنَ كَالْاٰيَاتِ وَبَلَاغَتِهَا الرَّائِعَةِ الْمُبْتَكِرَةِ الْمُحَبَّرَةِ الْمُحْتَوِيَةِ عَلٰى مَحَاسِنِ الْكِنَايَاتِ مَعَ دُرَرٍ حِكْمِيَّةٍ وَّمَعَارِفَ نَادِرَةٍ مِّنْ دَقَائِقِ الْاِلٰهِيَّاتِ فَلَا تَجِدُ نَظِيْرَهَا فِي الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ـ فَلَا شَكَّ اَنَّ مُلَحَ اَدَبِهَا بَارِعَةٌ وَّقَدَمَهَا عَلٰى اَعْلَامِ الْعُلُوْمِ فَارِعَةٌ وَّهِيَ يُصْبِيْ قُلُوْبَ الْعَارِفِيْنَ ـ وَقَدْ عَلِمْتَ تَرْتِيْبَ خَمْسَةِ اَبْحُرٍ الَّتِيْ تَجْرِيْ بَعْضُهَا تِلْوَ بَعْضٍ فَتَسَلَّمْهُ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ ـ وَاَمَّا تَرْتِيْبُ الْمُغْتَرِفَاتِ فَتَعْرِفُهٗ بِتَرْتِيْبِ اَبْحُرِهَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُغْتَرِفِيْنَ ؛

(کرامات الصادقین ص ۴۲ تا ص ۴۷)

اس جگہ لف ونشر مرتب ہے۔ اوّل اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اللہ مستجمع جمیع صفات کاملہ ہر ایک خوبی کو اپنے اندر رکھنے والا اور ہر ایک عیب اور نقص سے منزہ دوم رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سوم اَلرَّحْمٰن چہارم اَلرَّحِیْم پنجم مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اب اس کے بعد جو درخواستیں ہیں وہ ان پانچوں کے ماتحت ہیں اب سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ یہ فقرہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے مقابل ہے یعنی اے اللہ تو جو ساری صفات حمیدہ کا جامع ہے اور تمام بدیوں سے منزہ ہے تیری ہی عبادت کرتے ہیں مسلمان اُس خدا کو جانتا ہے جس میں وہ تمام خوبیاں جو انسانی ذہن میں آسکتی ہیں موجود ہیں اور اس سے بالاتر اور بالاتر ہے کیونکہ یہ سچی بات ہے کہ انسانی عقل اور فکر اور ذہن خدا تعالیٰ کی صفات کا احاطہ ہرگز ہرگز نہیں کرسکتے۔ ہاں تو مسلمان ایسے کامل الصفات خدا کو مانتا ہے تمام قومیں مجلسوں میں اپنے خدا کا ذکر کرتے ہوئے شرمندہ ہو جاتی ہیں اور اُنھیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا خدا جو اُنہوں نے مانا ہے اور کہا ہے کہ ویدوں سے ایسے خدا ہی کا پتہ لگتا ہے جب اُس کی نسبت وہ یہ ذکر

لیے روشن نشانوں کی طرح ہیں۔ اور اس کی حیران کن اچھوتی اور خوب آراستہ بلاغت کو جو کنایات کی خوبیوں حکمت کے موتیوں اور دقائق الٰہیہ کے نادر معارف پر حاوی ہے۔ تم اس بیان کی نظیر نہ تو پہلے لوگوں میں اور نہ بعد میں آنے والے لوگوں میں دیکھو گے۔ بلاشبہ اس کی عمدہ ادبی باتیں بے نظیر فضیلت کی حامل ہیں۔ اس کا قدم علوم کے پہاڑوں سے بھی اونچا ہے اور وہ عارفوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اب تو نے ان پانچ سمندروں کی ترتیب کو معلوم کرلیا ہے۔ جو ایک دوسرے کے پیچھے جاری ہیں۔ پس تو اُنہیں قبول کر اور شکر گذاروں میں سے ہو جا۔ اور اگر تو فیض اٹھانے والوں سے بننا چاہے تو فیض اٹھانے والے جملوں کی ترتیب کو تو ان کے سمندروں کی ترتیب سے پہچان لے گا۔

کریں گے کہ گو اُس نے دنیا کا ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کیا اور نہ اُس نے روحوں کو پیدا کیا ہے تو کیا ایسے خدا کے ماننے والے کے لیے کوئی مفر رہ سکتا ہے۔ جب اُسے کہا جائے کہ ایسا خدا اگر مر جائے تو کیا ہرج ہے کیونکہ جب یہ اشیاء اپنا وجود مستقل رکھتی ہیں اور قائم بالذات ہیں پھر خدا کی زندگی کی ان کی زندگی اور بقا کے لیے کیا ضرورت ہے جیسے ایک شخص اگر تیر چلائے اور وہ تیر ابھی جا ہی رہا ہو کہ اس شخص کا دم نکل جائے تو بتاؤ کہ اس تیر کی حالت میں کیا فرق آئے گا ہاتھ سے نکلنے کے بعد وہ چلانے والے کے وجود کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح پر ہندوؤں کے خدا کے لیے اگر یہ تجویز کیا جائے کہ وہ ایک وقت مر جاوے تو کوئی ہندو اُس کی موت کا نقصان نہیں بتا سکتا۔ مگر ہم خدا کے لیے ایسا تجویز نہیں کر سکتے کیونکہ اللّٰہ کے لفظ سے ہی پایا جاتا ہے کہ اُس میں کوئی نقص اور بدی نہ ہو۔ ایسا ہی جب کہ آریہ مانتا ہے کہ اجسام اور روحیں انادی ہیں یعنی ہمیشہ سے ہیں ہم کہتے ہیں کہ جب تمہارا یہ اعتقاد ہے پھر خدا کی ہستی کا ثبوت ہی کیا دے سکتے ہو؟ اگر کہو کہ اُس نے جوڑا جاڑا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ جب تم پرمانو اور پرکرتی کو قدیم سے مانتے ہو اور ان کے وجود کو قائم بالذات کہتے ہو تو پھر جوڑنا جاڑنا تو ادنیٰ فعل ہے وہ جُڑ بھی سکتے ہیں اور ایسا ہی جب وہ یہ تعلیم بتاتے ہیں کہ خدا نے وید میں مثلاً یہ حکم دیا ہے کہ اگر کسی عورت کے ہاں اپنے خاوند سے بچہ پیدا نہ ہو سکتا ہو تو وہ کسی دوسرے سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کر لے تو بتاؤ ایسے خدا کی نسبت کیا کہا جاوے گا؟ یا مثلاً یہ تعلیم پیش کی جائے کہ خدا کسی اپنے پریمی اور بھگت کو ہمیشہ کے لیے مکتی یعنی نجات نہیں دے سکتا بلکہ مہا پرلے کے وقت اُس کو ضروری ہوتا ہے کہ مکتی یافتہ انسانوں کو پھر اسی تناسخ کے چکر میں ڈالے یا مثلاً خدا کی نسبت یہ کہنا کہ وہ کسی کو اپنے فضل و کرم سے کچھ بھی عطا نہیں کر سکتا بلکہ ہر ایک شخص کو وہی ملتا ہے جو اُس کے اعمال کے نتائج ہیں پھر ایسے خدا کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے غرض ایسا خدا ماننے والے کو سخت شرمندہ ہونا پڑے گا۔

ایسا ہی عیسائی بھی جب یہ پیش کریں گے کہ ہمارا خدا یسوع ہے اور پھر اُس کی نسبت وہ یہ بیان کریں گے کہ یہودیوں کے ہاتھوں سے اُس نے ماریں کھائیں شیطان اُسے آزماتا رہا۔ بھوک اور پیاس کا اثر اُس پر ہوتا رہا۔ آخر ناکامی کی حالت میں پھانسی پر چڑھایا گیا تو کون دانشمند ہو گا جو ایسے خدا کے ماننے کے لیے طیار ہو گا غرض اسی طرح پر تمام قومیں اپنے مانے ہوئے خدا کا ذکر کرتی ہوئی شرمندہ ہوتی ہیں مگر مسلمان کبھی اپنے خدا کا ذکر کرتے ہوئے کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہوتا کیونکہ جو خوبی اور عمدہ صفت ہے وہ اُن کے مانے ہوئے خدا میں موجود اور جو نقص اور بدی ہے اُس سے وہ منزہ ہے جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اللّٰہ کو تمام صفات حمیدہ کا موصوف قرار دیا ہے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے مقابل میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ ہے اس کے بعد ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ربوبیت کا کام

ہے تربیت اور تکمیل جیسے ماں اپنے بچہ کی پرورش کرتی ہے اُس کو صاف کرتی ہے ہر قسم کے گند اور آلایش سے دور رکھتی ہے اور دودھ پلاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ وہ اُس کی مدد کرتی ہے اب اس کے مقابل میں یہاں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہے) پھر اَلرَّحْمٰن ہے جو بغیر خواہش بدوں درخواست اور بغیر اعمال کے اپنے فضل سے دیتا ہے اگر ہمارے وجود کی ساخت ایسی نہ ہوتی تو ہم سجدہ نہ کر سکتے اور رکوع نہ کر سکتے اس لیے ربوبیت کے مقابلہ میں اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ فرمایا جیسے باغ کا نشو و نما پانی کے بغیر نہیں ہوتا اسی طرح پر اگر خدا کے فیض کا پانی نہ پہنچے تو ہم نشو و نما نہیں پا سکتے درخت پانی کو چوستا ہے اس کی جڑوں میں دہانے اور سوراخ ہوتے ہیں۔ طبعی میں یہ مسئلہ ہے کہ درخت کی شاخیں پانی کو جذب کرتی ہیں اُن میں قوت جاذبہ ہے اسی طرح پر عبودیت میں ایک قوت جاذبہ ہوتی ہے جو خدا کے فیضان کو جذب کرتی ہے اور چوستی ہے پس اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہے یعنی اگر اس کی رحمانیت ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی اگر یہ قویٰ اور طاقتیں تو لے عطا نہ کی ہوتیں تو ہم اس فیض سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتے۔

پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل ہے کیونکہ ہدایت پانا کسی کا حق تو نہیں ہے بلکہ محض رحمانیت الٰہی سے یہ فیض حاصل ہو سکتا ہے اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ اَلرَّحِیْم کے بالمقابل ہے کیونکہ اس کا ورد کرنے والا رحیمیت کے چشمہ سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے یہ معنے ہیں کہ اے رحم خاص سے دعاؤں کے قبول کرنے والے ان رسولوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحوں کی راہ ہم کو دکھا جنہوں نے دعا اور مجاہدات میں مصروف ہو کر تجھ سے انواع و اقسام کے معارف اور حقائق اور کشوف اور الہامات کا انعام پایا اور دائمی دعا اور تضرع اور اعمال صالحہ سے معرفت تامہ کو پہنچے۔

رحیمیت کے مفہوم میں نقصان کا تدارک کرنا لگا ہوا ہے حدیث میں آیا ہے کہ اگر فضل نہ ہوتا تو نجات نہ ہوتی۔ ایسا ہی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے آپ سے سوال کیا کہ یا حضرت! کیا آپ کا بھی یہی حال ہے آپ نے سر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا ہاں۔ نادان اور احمق عیسائیوں نے اپنی نافہمی اور ناواقفی کی وجہ سے اعتراض کیے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ آپ کی کمال عبودیت کا اظہار تھا۔ جو خدا تعالیٰ کی ربوبیت کو جذب کر رہا تھا۔ ہم نے خود تجربہ کر کے دیکھا ہے اور متعدد مرتبہ آزمایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ جب انکسار اور تذلل کی حالت انتہا کو پہنچی ہے اور ہماری روح اس عبودیت اور فروتنی میں بہہ نکلتی ہے اور آستانہ حضرت واہب العطایا پر پہنچ جاتی ہے تو ایک روشنی اور نور اوپر سے اُترتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک نالی کے ذریعہ سے مصفا پانی دوسری نالی میں پہنچتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت

جس قدر بعض مقامات پر فروتنی اور انکساری میں کمال پر پہونچی ہوئی نظر آتی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اُسی قدر آپ روح القدس کی تائید اور روشنی سے مؤید اور منور ہیں۔ جیسا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اور فعلی حالت سے دکھایا ہے یہاں تک کہ آپ کے انوار و برکات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ابدالآباد تک اس کا نمونہ اور ظل نظر آتا ہے چنانچہ اس زمانہ میں بھی جو کچھ خدا تعالیٰ کا فیض اور فضل نازل ہو رہا ہے وہ آپ ہی کی اطاعت اور آپ ہی کے اتباع سے ملتا ہے مَیں سچ کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ کوئی شخص حقیقی نیکی کرنے والا اور خدا تعالیٰ کی رضا کو پانے والا نہیں ٹھہر سکتا اور ان انعام و برکات اور معارف اور حقائق اور کشوف سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا جو اعلیٰ درجہ کے تزکیہ نفس پر ملتے ہیں جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں کھویا نہ جائے اور اس کا ثبوت خود خدا تعالیٰ کے کلام سے ملتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1]۔ اور خدا تعالیٰ کے اس دعویٰ کی عملی اور زندہ دلیل میں ہوں اُن نشانات کے ساتھ جو خدا تعالیٰ کے محبوبوں اور ولیوں کے قرآن شریف میں مقرر ہیں مجھے شناخت کرو غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کمال یہاں تک ہے کہ اگر کوئی بڑھیا بھی آپ کا ہاتھ پکڑتی تھی تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے اور اُس کی باتوں کو نہایت توجہ سے سُنتے اور جب تک کہ وہ خود آپ کو نہ چھوڑتی۔ آپ نہ چھوڑتے تھے اور پھر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے بالمقابل ہے۔ اس کا وِرد کرنے والا چشمہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے فیض پاتا ہے جس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ اے جزا و سزا کے دن کے مالک ہمیں اس سے بچا کہ یہودیوں کی طرح جو دنیا میں طاعون وغیرہ بلاؤں کا نشانہ ہوئے اور اُس کے غضب سے ہلاک ہو گئے یا نصاریٰ کی طرح نجات کی راہ کھو بیٹھیں اس میں یہود کا نام مغضوب اس لیے رکھا گیا ہے کہ ان کی شامت اعمال سے دنیا میں بھی اُن پر عذاب آیا کیونکہ اُنہوں نے خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں اور راست بازوں کی تکذیب کی اور بہت سی تکلیفیں پہنچائیں اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے جو یہاں سورہ فاتحہ میں یہودیوں کی راہ سے بچنے کی ہدایت فرمائی اور اسی سورت کو اَلضَّآلِّيْنَ پر ختم کیا یعنی ان کی راہ سے بھی بچنے کی ہدایت فرمائی تو اس میں کیا سر تھا اس میں یہی راز تھا کہ اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایک قسم کا زمانہ آنے والا ہے جب کہ یہود کی تتبع کرنے والے ظاہر پرستی کریں گے اور استعارات کو حقیقت پر حمل کر کے خدا کے راستباز کی تکذیب کے لیے اُٹھیں گے جیسا کہ یہود نے مسیح ابن مریم کی تکذیب کی تھی اور انہیں یہی مصیبت پیش آئی کہ اُنہوں نے اس کی تاویل پر ٹھٹھا کیا اور کہا کہ اگر خدا کا یہی مطلب تھا کہ ایلیا کا مثیل آئے گا تو کیوں خدا نے اپنی پیشگوئی میں اس کی صراحت نہ کی غرض اسی رَوش اور طریق پر اس وقت ہمارے مخالفوں نے بھی قدم مارا ہے اور میری تکذیب اور ایذا دہی میں انہوں نے کوئی دقیقہ

[1] آل عمران ع ۴

باقی نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میرے قتل کے فتوے دئے اور طرح طرح کے حیلوں اور مکروں سے مجھے ذلیل کرنا اور نابود کرنا چاہا اگر خدا تعالیٰ کے فضل سے گورنمنٹ برطانیہ کا اس ملک میں راج نہ ہوتا تو یہ مدت سے میرے قتل سے دل خوش کر لیتے مگر خدا تعالیٰ نے ان کو ان کی ہر مراد میں نامراد کیا اور وہ جو اُس کا وعدہ تھا کہ وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ وہ پورا ہوا۔

غرض اس دعا میں غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ کا فرقہ مسلمانوں کے ایک گروہ کی اس حالت کا پتہ دیتا ہے جو وہ مسیح موعود کے مقابل مخالفت اختیار کریگا اور ایسا ہی اَلضَّآلِّیۡنَ سے مسیح موعود کے زمانہ کا پتہ لگتا ہے کہ اس وقت صلیبی فتنہ کا زور اپنے انتہائی نقطہ پر پہونچ جاوے گا اس وقت خدا تعالیٰ کی طرف سے جو سلسلہ قائم کیا جاویگا وہ مسیح موعود ہی کا سلسلہ ہوگا اور اسی لیے احادیث میں مسیح موعود کا نام خدا تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کاسر الصلیب رکھا ہے کیونکہ یہ سچی بات ہے کہ ہر ایک مجدد فتن موجودہ کی اصلاح کے لیے آتا ہے اب اس وقت خدا کے لیے سوچو تو کیا معلوم نہ ہوگا کہ صلیبی نجات کی تائید میں قلم اور زبان سے وہ کام لیا گیا ہے کہ اگر صفحات عالم کو ٹٹولا جائے تو باطل پرستی کی تائید میں یہ سرگرمی اور زمانہ میں ثابت نہ ہوگی اور جب کہ صلیبی فتنہ کے حامیوں کی تحریریں اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی ہیں اور توحید حقیقی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عفّت عزّت اور حقانیت اور کتاب اللہ کے من جانب اللہ ہونے پر ظلم اور زور کی راہ سے حملے کیے گئے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کی غیرت کا تقاضا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کاسر الصلیب کو اُس وقت نازل کرے؟؟؟ کیا خدا تعالیٰ اپنے وعدہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ[1] کو بھول گیا؟ یقیناً یاد رکھو کہ خدا کے وعدے سچے ہیں اس نے اپنے وعدہ کے موافق دنیا میں ایک نذیر بھیجا ہے دنیا نے اس کو قبول نہ کیا مگر خدا تعالیٰ اس کو ضرور قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اس کی سچائی کو ظاہر کریگا میں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ میں خدا تعالیٰ کے وعدہ کے موافق مسیح موعود ہو کر آیا ہوں چاہو تو قبول کرو چاہو تو رد کرو۔ (الحکم ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲ و الحکم ۱۷ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

خدا تعالیٰ کی چار اعلیٰ درجہ کی صفتیں ہیں جو اُمّ الصفات ہیں اور ہر ایک صفت ہماری بشریت سے ایک امر مانگتی ہے اور وہ چار صفتیں یہ ہیں:۔ ربوبیّت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت یوم الدین۔ (۱) ربوبیّت اپنے فیضان کے لیے عدم محض یا مشابہ بالعدم کو چاہتی ہے اور تمام انواع مخلوق کی جاندار ہوں یا غیر جاندار اُسی سے پیرایہ وجود پہنتے ہیں۔ (۲) رحمانیت اپنے فیضان کے لیے صرف عدم کو ہی چاہتی ہے۔ یعنی اُس عدم محض کو جس کے وقت میں وجود کا کوئی اثر اور ظہور نہ ہو اور صرف جانداروں سے تعلق رکھتی ہے اور چیزوں سے نہیں۔ (۳) رحیمیت اپنے فیضان

---

[1] تذکرہ (طبع ۱۹۵۶ء) صفحہ ۲۸۳۔ ۵۲ حجر: ۱۰۔

کے لیے موجود ذوالعقل کے مُنہ سے نیستی اور عدم کا اقرار چاہتی ہے اور صرف نوع انسان سے تعلق رکھتی ہے۔ (۴) مالکیت یوم الدین اپنے فیضان کے لیے فقیرانہ تضرع اور الحاح کو چاہتی ہے اور صرف اُن انسانوں سے تعلق رکھتی ہے جو گداؤں کی طرح حضرت احدیت کے آستانہ پر گرتے ہیں اور فیض پانے کے لیے دامن افلاس پھیلاتے ہیں۔ اور سچ مچ اپنے تئیں تہی دست پاکر خدا تعالیٰ کی مالکیت پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ چار الہی صفتیں ہیں جو دُنیا میں کام کر رہی ہیں اور ان میں سے جو رحیمیت کی صفت ہے وہ دُعا کی تحریک کرتی ہے اور مالکیت کی صفت خوف اور قلق کی آگ سے گداز کر کے سچا خشوع اور خضوع پیدا کرتی ہے کیونکہ اس صفت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ مالک جزا ہے۔ کسی کا حق نہیں جو دعویٰ سے کچھ طلب کرے اور مغفرت اور نجات محض فضل پر ہے۔

اب خلاصۂ کلام یہ کہ خدا تعالیٰ کی یہ چار صفتیں ہیں جو قرآنی تعلیم اور تحقیق عقل سے ثابت ہوتی ہیں۔ اور منجملہ ان کے رحیمیت کی صفت ہے جو تقاضا کرتی ہے کہ کوئی انسان دُعا کرے تا اُس دُعا پر فیوض الہی نازل ہوں۔ ہم نے براہین احمدیہ اور کرامات الصادقین میں بھی یہ ذکر لکھا ہے کہ کیونکر یہ چاروں صفتیں لف ونشر مرتب کے طور پر سورہ فاتحہ میں بیان کی گئی ہیں اور کیونکر صحیفۂ فطرت پر نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ اسی ترتیب سے جو سورہ فاتحہ میں ہے یہ چاروں صفتیں خدا کی فعلی کتاب قانون قدرت میں پائی جاتی ہیں۔ اب دعا سے انکار کرنا یا اُس کو بے سود سمجھنا یا جذب فیوض کے لیے اس کو ایک محرک قرار نہ دینا گویا خدا تعالیٰ کی تیسری صفت سے جو رحیمیت ہے انکار کرنا ہے۔ مگر یہ انکار در پردہ دہریت کی طرف ایک حرکت ہے کیونکہ رحیمیت ہی ایک ایسی صفت ہے جس کے ذریعہ سے باقی تمام صفات پر یقین بڑھتا اور کمال تک پہنچتا ہے۔ وجہ یہ کہ جب ہم خدا تعالیٰ کی رحیمیت کے ذریعے سے اپنی دعاؤں اور تضرعات پر الہی فیضوں کو پاتے ہیں اور ہر ایک قسم کی مشکلات حل ہوتی ہیں تو ہمارا ایمان خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کی قدرت اور رحمت اور دوسری صفات کی نسبت بھی حق الیقین تک پہنچتا ہے اور ہمیں چشم دید ماجرا کی طرح سمجھ آجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ درحقیقت حمد اور شکر کا مستحق ہے اور درحقیقت اُس کی ربوبیت اور رحمانیت اور دوسری صفات سب درست اور صحیح ہیں۔ لیکن بغیر رحیمیت کے ثبوت کے دوسری صفات بھی مشتبہ رہتی ہیں۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۴ تا ۱۶)

واضح رہے کہ اللہ جل شانہ نے سورہ فاتحہ میں الحمد للہ کے بعد ان صفات اربعہ کو چار سرچشمہ فیض قرار دے کر اس سورۃ کے مابعد کی آیتوں میں بطور لف ونشر مرتب ہر ایک چشمہ سے فیض مانگنے کی طرف اشارہ فرمایا ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ فقرہ الحمد للہ سے فقرہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ تک پانچ جدا جدا امر ہیں (۱) ایک الحمد للہ (۲) دوسرے رب العالمین (۳) تیسرے الرحمن۔ (۴) چوتھے الرحیم۔ (۵) مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ اور مابعد کے پانچ فقرے ان پانچوں کے لحاظ سے

بصورت لف ونشر مرتب ان کے مقابل پر واقع ہیں۔ جیسا کہ فقرہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ فقرہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے مقابل پر ہے جس سے یہ اشارہ ہے کہ عبادت کے لائق وہی ذات کامل الصفات ہے جس کا نام اللہ ہے۔ اور فقرہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ فقرہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے مقابل پر واقع ہے جس میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ سرچشمۂ ربوبیّت سے جو ایک نہایت عام سرچشمہ ہے ہم مدد طلب کرتے ہیں۔ کیونکہ بغیر خدا تعالیٰ کے فیض ربوبیّت کے ظاہری یا باطنی طور پر نشوونما پانا یا کوئی پاک تبدیلی حاصل کرنا اور روحانی پیدائش سے حصہ لینا امر محال ہے۔ اور فقرہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ فقرہ اَلرَّحْمٰن کے مقابل پر واقع ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کا وِرد کرنے والا اَلرَّحْمٰن کے چشمہ سے فیض طلب کرتا ہے کیونکہ ہدایت پانا کسی کا حق نہیں ہے بلکہ محض رحمانیّت الٰہی سے یہ دولت حاصل ہوتی ہے۔ اور فقرہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فقرہ اَلرَّحِيْم کے مقابل پر واقع ہے اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا ورد کرنیوالا چشمہ اَلرَّحِيْم سے فیض طلب کرتا ہے کیونکہ اُس کے یہ معنے ہیں کہ اے دُعاؤں کو رحم خاص سے قبول کرنے والے اُن رسولوں اور صدّیقوں اور شہیدوں کی راہ ہمیں دکھلا۔ جنہوں نے دُعا اور مجاہدات میں مصروف ہو کر تجھ سے انواع اقسام کے معارف اور حقائق اور کشوف اور الہامات کا انعام پایا اور دائمی دعا اور تضرع اور اعمال صالحہ سے معرفت تامّہ تک پہنچ گئے۔ اور فقرہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فقرہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے مقابل پر واقع ہے اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا ورد کرنے والا چشمہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے فیض طلب کرتا ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ اے جزا وسزا کے دن کے مالک ہمیں اس سزا سے بچا کہ ہم دُنیا میں یہودیوں کی طرح طاعون وغیرہ بلاؤں میں تیرے غضب کی وجہ سے مبتلا ہوں یا نصاریٰ کی طرح نجات کی راہ گم کر کے آخرت میں عذاب کے مستحق ہوں۔ اس آیت میں نصاریٰ کا نام ضَآلِّیْنَ اس لیے رکھا ہے کہ دُنیا میں اُن پر کوئی غضب الٰہی کا عذاب نازل نہیں ہوا صرف وہ لوگ اُخروی نجات کی راہ گم کر بیٹھے ہیں اور آخرت میں قابل مواخذہ ہیں مگر یہود کا نام مغضوب علیہم اس واسطے رکھا ہے کہ یہود پر دُنیا میں ہی اُن کی شامت اعمال سے بڑے بڑے عذاب نازل ہوئے ہیں۔ منجملہ اُن کے عذاب طاعون ہے چونکہ یہود نے خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں اور راستباز بندوں کی صرف تکذیب نہیں کی بلکہ بہتوں کو ان میں سے قتل کیا یا قتل کا ارادہ کیا اور بدزبانی سے بھی بہت تکلیفیں پہنچاتے رہے اس لیے غیرت الٰہی نے بعض اوقات جوش میں آکر ان کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کیا۔ بسا اوقات لاکھوں یہودی طاعون کے عذاب سے مارے گئے اور کئی دفعہ ہزاروں اُن میں سے قتل کیے گئے اور یا اسیر ہو کر دوسرے ملکوں میں نکالے گئے۔ غرض وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد ہمیشہ مغضوب علیہم رہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ ایک ٹیڑھی قوم ہے اس لیے توریت میں اکثر دنیا کے عذابوں سے ان کو ڈرایا گیا تھا۔ غرض ان پر ہولناک طور پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا رہا کیونکہ وہ لوگ خدا تعالیٰ کے نیک

بندوں کو ہاتھ اور زبان سے دکھ دیتے تھے اسی وجہ سے دنیا میں ہی اُن پر غضب بھڑکا تا وہ اُن لوگوں کے لیے نمونہ عبرت ہوں کہ جو آیندہ کسی زمانہ میں خدا کے ماموروں اور راست باز بندوں کو عمداً دکھ دیں اور اُن کو ستاویں اور اُن کے قتل کرنے یا ذلیل کرنے کے لیے بد ارادے دل میں رکھیں۔ سو اس دعا کے سکھلانے میں در پردہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تم یہودیوں کے خلق اور خو سے باز رہو اور اگر کوئی مامور من اللہ تم میں پیدا ہو تو یہودیوں کی طرح اُس کی ایذا اور توہین اور تکفیر میں جلدی نہ کرو ایسا نہ ہو کہ تم سچے کو جھوٹا ٹھہرا کر اور پھر طرح طرح کے دُکھ اُس کو دے کر اور بد زبانی سے اُس کی آبروریزی کر کے یہودیوں کی طرح مورد غضب الٰہی ہو جاؤ لیکن افسوس کہ اس امت کے لوگ بھی ہمیشہ ٹھوکر کھاتے رہے اور انہوں نے بدقسمت یہودیوں کے قصّوں سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔

(ایام الصلح صفحہ ۲۳ تا ۲۵)

اِن آیات سورۃ فاتحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا جس نے اللہ کے نام سے قرآن میں اپنے تئیں ظاہر کیا وہ ربّ العالمین ہو کر مبدا ہے تمام فیضوں کا اور رحمان ہو کر مُعطی ہے تمام انعاموں کا۔ اور رحیم ہو کر قبول کرنے والا ہے تمام سُود مند دُعاؤں اور کوششوں کا اور مالک یوم الدین ہو کر بخشنے والا ہے کوششوں کے تمام آخری ثمرات کا۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۸ حاشیہ)

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ...... یعنی وہی خدا ہے جو تمام عالموں کا پرورش کرنے والا رحمان رحیم اور جزا کے دِن کا آپ مالک ہے۔ اِس اختیار کو کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۲)

فَاعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الصِّفَاتِ عُيُوْنٌ لِفُيُوْضِ اللّٰهِ الْكَامِلَةِ النَّازِلَةِ عَلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ وَكُلُّ صِفَةٍ مَّنْبَعٌ لِقِسْمِ فَيْضٍ بِتَرْتِيْبٍ اَوْدَعَ اللّٰهُ اٰثَارَهَا فِي الْعَالَمِ لِيُرِيَ تَوَافُقَ قَوْلِهٖ بِفِعْلِهٖ وَلِيَكُوْنَ اٰيَةً لِلْمُتَفَكِّرِيْنَ ۔ فَالْقِسْمُ الْاَوَّلُ مِنْ اَقْسَامِ الصِّفَاتِ الْفَيْضَانِيَّةِ صِفَةٌ يُسَمِّيْهَا رَبُّنَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ۔ وَهٰذِهٖ

واضح ہو کہ یہ (چاروں) صفات (یعنی ربّ العالمین، الرحمٰن، الرحیم اور مالک یوم الدین) اللہ تعالیٰ کے کامل فیوض کے چشمے ہیں جو زمین و آسمان میں رہنے والوں پر نازل ہوتے اور ہر صفت ایک خاص قسم کے فیض کا منبع ہے (اور یہ صفات) ایک ایسی ترتیب کے ساتھ (بیان کی گئی ہیں) جس کے آثار خدا تعالیٰ نے (اس کارخانۂ) عالم میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ تا وہ اپنے قول کا اپنے فعل سے توافق دکھائے اور تا غور و فکر کرنے والوں کے لیے یہ ایک نشان ہو۔ ان فیضانی صفات کی اقسام میں سے پہلی قسم وہ صفت ہے جس کا نام ہمارا پروردگار ربّ العالمین رکھتا ہے اور یہ صفت فیض رسانی میں دوسری تمام صفات سے

الصِّفَةُ اَوْسَعُ الصِّفَاتِ فِي الْاِفَاضَةِ وَلَا بُدَّ مِنْ اَنْ نُّسَمِّيَ فَيْضَانَهَا فَيْضَانًا اَعَمَّ لِاَنَّ صِفَةَ الرُّبُوْبِيَّةِ قَدْ اَحَاطَتِ الْحَيْوَانَاتِ وَغَيْرَ الْحَيْوَانَاتِ بَلْ اَحَاطَتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرَضِيْنَ وَفَيَضَانُهَا اَعَمُّ مِنْ كُلِّ فَيْضٍ مَا غَادَرَ اِنْسَانًا وَّلَا حَيْوَانًا وَّلَا شَجَرًا وَّلَا حَجَرًا وَّلَا سَمَآءً وَّلَا اَرْضًا بَلْ نَزَلَ مَآءُهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاَحْيَاهُ وَاَحَاطَ بِالْكَآئِنَاتِ كُلِّهَا ظَوَاهِرِهَا وَبَوَاطِنِهَا فَكُلُّ شَيْءٍ صَنِيْعَةٌ مِّنَ اللّٰهِ الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ وَبَدَءَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ وَاسْمُ ذٰلِكَ الْفَيْضِ رُبُوْبِيَّةٌ وَّبِهٖ يَبْذُرُ اللّٰهُ تَعَالٰى بَذْرَ السَّعَادَةِ فِيْ كُلِّ سَعِيْدٍ وَّعَلَيْهِ يَتَوَقَّفُ اسْتِثْمَارُ الْخَيْرَاتِ وَبُرُوْزُ مَادَّةِ السَّعَادَاتِ وَاٰثَارُ الْوَرَعِ وَالْحَزَامَةِ وَالتُّقَاةِ وَكُلُّمَا يُوْجَدُ فِي الرَّشِيْدِيْنَ۔ وَكُلُّ شَقِيٍّ وَّسَعِيْدٍ وَّطَيِّبٍ وَّخَبِيْثٍ يَّاْخُذُ حَظَّهٗ كَمَا شَآءَ رَبُّهٗ فِي الْمَرْتَبَةِ الرُّبُوْبِيَّةِ فَهٰذَا الْفَيْضُ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ اِنْسَانًا وَّيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ حِمَارًا وَّيَجْعَلُ مَا يَشَآءُ نُحَاسًا وَّيَجْعَلُ مَا يَشَآءُ ذَهَبًا وَّمَا كَانَ اللّٰهُ مِنَ الْمَسْئُوْلِيْنَ۔ وَاعْلَمْ اَنَّ هٰذَا الْفَيْضَ جَارٍ عَلَى الْاِتِّصَالِ بِوَجْهِ الْكَمَالِ وَلَوْ فُرِضَ انْقِطَاعُهٗ طَرْفَةَ عَيْنٍ تَفْسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَا فِيْهِنَّ وَلٰكِنْ اَحَاطَ صَحِيْحًا

زیادہ وسیع ہے اسی لیے ضروری ہے کہ ہم اس صفت کے فیضان کا نام فیضان اعم رکھیں کیونکہ صفت ربوبیت تمام حیوانوں اور غیر حیوانوں پر ہی حاوی نہیں بلکہ آسمانوں اور زمینوں پر محیط ہے اور اس کا فیضان ہر فیض سے زیادہ عام ہے جس نے نہ کسی انسان کو چھوڑا اور نہ کسی حیوان کو، نہ کسی درخت کو اور نہ کسی پتھر کو اور نہ کسی آسمان کو نہ کسی زمین کو۔ بلکہ اس کی رحمت کا پانی ہر چیز پر نازل ہوا اور اسے زندگی عطا کی۔ اس فیضان نے تمام کائنات کی آشکارہ اور پوشیدہ اشیاء کا احاطہ کر رکھا ہے پس ہر چیز اُسی اللہ کی صنعت ہے۔ جس نے ہر چیز کو (اس کی ضرورت کے مطابق) بناوٹ دی۔ اور انسان کی پیدائش کا آغاز گیلی مٹی سے کیا۔ اس فیضان کا نام ربوبیت ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ہر سعید انسان میں سعادت کی تخم ریزی کرتا ہے۔ نیکیوں کے ثمرات، نیک بختی کا مادّہ، پارسائی اور حزم وتقویٰ کے آثار اور ہر وہ خوبی جو صاحبِ رشد لوگوں میں پائی جاتی ہے اسی فیض ربوبیت پر موقوف ہے۔ اور ہر بدبخت، نیک بخت، پاک ناپاک اپنا حصّہ پاتا ہے۔ جس طرح اس کے رب نے اپنے مرتبہ ربوبیت میں اس کے لیے چاہا۔ پس یہ فیضان جسے چاہے انسان بنا دیتا ہے۔ جسے چاہے گدھا بنا دیتا ہے جس چیز کو چاہے پیتل بنا دیتا ہے اور جسے چاہے سونا بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ اور یہ بھی واضح ہو کہ یہ فیضان لگاتار پورے کمال کے ساتھ جاری ہے اور اگر ایک لحظہ کے لیے بھی اس کا انقطاع فرض کر لیا جائے تو زمین وآسمان اور ان کی موجودات تباہ وبرباد

وَمَرِيْضًا وَّيَفَاعًا وَّحَضِيْضًا وَّشَجَرًا وَّحَجَرًا وَّكُلَّمَا فِي الْعَالَمِيْنَ۔ وَقَدَّمَ اللّٰهُ هٰذَا الْفَيْضَ فِيْ كِتَابِهٖ وَضْعًا لِتَقَدُّمِهٖ فِيْ عَالَمِ اَسْبَابِهٖ طَبْعًا فَلَيْسَ هٰذَا التَّقْدِيْمُ مَحْدُوْدًا فِيْ تَوْشِيَةِ الْكَلَامِ وَمَحْصُوْرًا فِيْ رِعَايَةِ الصَّفَآءِ التَّآمِّ بَلْ هِيَ بَلَاغَةٌ حِكْمِيَّةٌ لِاِرَآءَةِ النِّظَامِ مِنْ حَيْثُ اَنَّهٗ تَعَالٰى جَعَلَ اَقْوَالَهٗ مِرَاةً لِّرُؤْيَةِ اَفْعَالِهِ الْمَوْجُوْدَةِ فِيْ طَبَقَاتِ الْاَنَامِ لِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُ الْعَارِفِيْنَ۔

وَالْقِسْمُ الثَّانِيْ مِنَ الصِّفَاتِ الْفَيْضَانِيَّةِ صِفَةٌ يُّسَمِّيْهَا رَبُّنَا الرَّحْمٰنَ وَلَا بُدَّ مِنْ اَنْ نُّسَمِّيَ فَيْضَانَهٗ فَيْضَانًا عَآمًّا وَّرَحْمَانِيَّةً وَّلَهٗ مَرْتَبَةٌ بَعْدَ مَرْتَبَةِ الْفَيْضَانِ الْاَعَمِّ وَهُوَ اَخَصُّ مِنَ الْفَيْضَانِ الْاَوَّلِ وَلَا يَنْتَفِعُ مِنْهُ اِلَّا ذُوْ الرُّوْحِ مِنْ اَشْيَآءِ السَّمَآءِ وَالْاَرَضِيْنَ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ فِيْ وَقْتِ هٰذَا الْفَيْضِ لَا يَنْظُرُ الْاِسْتِحْقَاقَ وَ الْعَمَلَ وَالشُّكْرَ بَلْ يُنَزِّلُهٗ فَضْلًا مِّنْهُ عَلٰى كُلِّ ذِيْ رُوْحٍ اِنْسَانًا كَانَ اَوْ حَيَوَانًا مَّجْنُوْنًا كَانَ اَوْ عَاقِلًا مُّؤْمِنًا كَانَ اَوْ كَافِرًا وَّيُنَجِّيْ كُلَّ رُوْحٍ مِّنْ هَلَكَةٍ دَانَتْ مِنْهَا بَعْدَ مَا كَادَتْ تَهْوِيْ فِيْهَا وَيُعْطِيْ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقًا يَّنْفَعُهٗ لِاَنَّ اللّٰهَ جَوَّادٌ بِالذَّاتِ

ہو جائیں۔ لیکن یہ فیضان ہر تندرست اور مریض۔ بلندی اور پستی، درخت اور پتھر اور جو کچھ دونوں جہانوں میں ہے سب پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس فیض کو سب سے پہلے اس لیے بیان فرمایا کہ عالم اسباب میں وہ طبعاً تقدم رکھتا ہے۔ پس یہ ترتیب محض کلام کو سجانے اور سلاست و روانی کے پیش نظر ہی نہیں بلکہ اس میں تو حکیمانہ بلاغت سے نظام کائنات کو دکھانا مقصود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اقوال اس کے ان افعال کے دکھانے کے لیے آئینہ ہیں جو اس کی مخلوق کے مختلف طبقات میں (بلحاظ ترتیب) موجود ہیں۔ تا اس سے عارفوں کے دل تسلی پائیں۔

ان صفات فیضانیہ کی دوسری قسم وہ صفت ہے جس کا نام ہمارا پروردگار "الرحمان" رکھتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ہم بھی اس فیضان کو فیضان عام اور رحمانیت کے نام سے پکاریں۔ اس کا مرتبہ فیضان اعم (ربوبیت) کے بعد ہے اور اس فیضان کا دائرہ عمل اُس پہلے فیضان سے اخص ہے اور اس سے آسمان اور زمینوں کی صرف جاندار اشیاء ہی نفع حاصل کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے اس فیض کے وقت کسی خاص حق، عمل یا شکر کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ محض اپنے فضل سے ہر ذی روح پر اس فیضان کو جاری رکھتا ہے۔ چاہے وہ انسان ہو یا حیوان۔ دیوانہ ہو یا عاقل، مومن ہو یا کافر، اور ہر روح کو ہلاکت سے بچاتا ہے جو اس کے قریب پہنچ چکی ہو۔ اور وہ (روح) اس میں گرنے ہی لگی ہو اور ہر شے کو ایسی شکل و صورت عطا کرتا ہے جو

وَلَيْسَ بِضَنِيْنٍ۔ فَكُلُّ مَا تَرٰى فِي السَّمَآءِ مِنَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُوْمِ وَالْمَطَرِ وَ
الْهَوَآءِ وَمَا تَرٰى فِي الْاَرْضِ مِنَ الْاَنْهَارِ وَالْاَشْجَارِ وَالْاَثْمَارِ وَالْاَدْوِيَةِ النَّافِعَةِ وَ
الْاَلْبَانِ السَّآئِغَةِ وَالْعَسَلِ الْمُصَفّٰى فَكُلُّهَا مِنْ رَّحْمَانِيَّتِهٖ عَزَّوَجَلَّ لَا مِنْ عَمَلِ
الْعَامِلِيْنَ۔ وَاِلٰى هٰذَا الْفَيْضَانِ اَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ قَوْلِهٖ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ[1]
وَفِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ[2] وَفِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ
بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ[3] وَفِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ[4]
تَذْكِرَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ وَلَوْلَمْ يَكُنْ هٰذَا الْفَيْضَانُ لَمَا كَانَ لِطَيْرٍ اَنْ يَّطِيْرَ فِي
الْهَوَآءِ وَلَا لِحُوْتٍ اَنْ يَّتَنَفَّسَ فِي الْمَآءِ وَلَاَبَادَ كُلَّ مُعِيْلٍ ضَفَفُهٗ وَكُلَّ ذِيْ
قَشَفٍ شَظَفُهٗ وَمَا بَقِيَ سَبِيْلٌ لِاِمَاطَتِهٖ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُسْتَطْلِعِيْنَ۔ اَلَا
تَرٰى كَيْفَ يُحْيِ اللّٰهُ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَيُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ
عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اس کے لیے مفید ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بالذات سخی ہے اور ہرگز بخیل نہیں۔ اور جو کچھ تمہیں آسمان میں نظر آتا ہے مثلاً سورج، چاند، ستارے، بارش اور ہوا اور جو کچھ زمین میں نظر آرہا ہے مثلاً نہریں، درخت اور پھل، نفع مند دوائیں، خوشگوار دودھ اور مصفا شہد۔ یہ سب خدائے عزوجل کی رحمانیت سے ہیں۔ نہ کسی عامل کے عمل کی وجہ سے۔ اس فیضان کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنی ان آیات میں اشارہ فرمایا ہے وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ[5]۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ[6]۔ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ[7]۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ[8]۔ یہ سب (آیات) متقیوں کے لیے بطور یاددہانی کے ہیں۔ اگر یہ فیضان نہ ہوتا تو نہ کوئی پرندہ ہوا میں اُڑ سکتا اور نہ کوئی مچھلی پانی میں سانس لے سکتی۔ اور ہر عیال دار کو اس کے مال کی قلت اور اولاد کی کثرت اور ہر تنگ دست کو اس کی روزی کی تنگی ہلاک کر دیتی۔ اور اس کے ازالہ کی کوئی صورت باقی نہ رہ جاتی۔ جیسا کہ (واقف حال لوگوں) پر ظاہر ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ زمین کے مرجانے کے بعد اس کو کس طرح زندہ کرتا ہے اور رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے اور دن کو رات پر اوڑھا دیتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو خدمت پر لگا رکھا ہے (چنانچہ) ہر ایک (سیارہ) ایک معین میعاد

[1] سورۃ الاعراف ع ۱۹ ۔ [2] سورۃ الرحمٰن ع ۱ ۔ [3] سورۃ الانبیاء ع ۴ ۔ [4] سورۃ الملک ع ۲ ۔

[5] ترجمہ: اور میری رحمت ہر ایک چیز کو حاوی ہے۔ [6] ترجمہ:- (وہ) رحمٰن (خدا) ہی ہے جس نے قرآن سکھایا۔ [7] ترجمہ:- رات یا دن کے وقت رحمٰن (خدا) کی گرفت سے تم کو کون بچا سکتا ہے۔ [8] رحمٰن خدا ہی اُن کو روکتا ہے۔

لَاٰيَاتٍ رَحْمَانِيَّةٍ لِّلْمُتَدَبِّرِيْنَ - وَجَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ
مُبْصِرًا وَّجَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ
وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ فَذَا لِكُمُ الرَّحْمٰنُ رَبُّكُمْ مُرَبِّي الْمَسَاكِيْنِ - وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِرَحْمَانِيَّتِهٖ فَجَعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا وَّمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَ
كَانُوْا مِنَ الْغَافِلِيْنَ - اَلَا يَرَوْنَ اِلَى الشَّمْسِ الَّتِيْ تَجْرِيْ مِنَ الْمَشْرِقِ اِلَى الْمَغْرِبِ
اَكَانَ خَلْقُهَا وَجَرْيُهَا مِنْ عَمَلِهِمْ اَوْ مِنْ تَفَضُّلِ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْ وَسِعَتْ رَحْمَانِيَّتُهُ
الصَّالِحِيْنَ وَالظَّالِمِيْنَ - وَكَذَالِكَ يُنَزِّلُ اللّٰهُ مَآءً فِيْ اَوْقَاتِهٖ فَيُنْشِئُ بِهٖ زُرُوْعًا
وَّاَشْجَارًا فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ اَفَهٰذِهِ النَّعْمَآءُ مِنْ عَمَلِ عَامِلٍ اَوْ رَحْمَانِيَّةٍ
خَالِصَةٍ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالَى الَّذِيْ نَجَّانَا مِنْ كُلِّ اعْتِيَاصِ الْمَعِيْشَةِ وَاَعْطَانَا سُلَّمًا
لِّكُلِّ حَاجَةٍ نَّحْتَاجُ فِيْهَا اِلَى الْاِرْتِقَآءِ وَاَرْشِيَةً نَّحْتَاجُ اِلَيْهَا لِلْاِسْتِسْقَآءِ
فَسُبْحَانَ اللّٰهِ الَّذِيْ اَنْعَمَ عَلَيْنَا بِرَحْمَانِيَّتِهٖ وَمَا كَانَ لَنَا مِنْ عَمَلٍ نَّسْتَحِقُّ

تک (اپنے مقررہ راستہ پر) چلا جارہا ہے۔ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے کھلے کھلے نشانات ہیں۔
پھر اس نے تمہارے لیے رات کو اس لیے بنایا ہے کہ تم اس میں آرام پاؤ۔ اور دن کو روشن بنایا ہے اسی طرح اُس نے زمین کو تمہارے
لیے جائے قیام بنایا ہے اور آسمان کو ایک مکان کی صورت میں (حفاظت کے لیے بنایا ہے) اور اس نے تمہیں صورتیں بخشیں اور
تمہاری صورتوں کو اچھا بنایا۔ اور تم کو پاکیزہ رزق بخشا ہے۔ پس یہی رحمان تمہارا پروردگار ہے جو مسکینوں کی پرورش کرنے والا
ہے۔ جو لوگ اس کی رحمانیت کے منکر ہیں انہوں نے اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کو ایک کھلا کھلا ثبوت مہیّا کر دیا ہے۔ انہوں نے
اللہ تعالیٰ کی صفات کا اندازہ اس طرح نہیں کیا جس طرح کرنا چاہیئے تھا، وہ غافل ہی رہے۔ کیا وہ سورج کو نہیں دیکھتے
جو مشرق سے مغرب کو چلا جارہا ہے۔ کیا اس کی پیدائش اور اس کی یہ حرکت ان کے کسی اپنے عمل کا نتیجہ ہے ؟ یا محض اس
خدائے رحمان کے فضل سے ہے کہ جس کی رحمانیت نیکوکاروں اور ظالموں پر یکساں حاوی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ پانی
کو اس کی ضرورت کے وقتوں پر برساتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ کھیتیاں اور درخت اُگاتا ہے جن میں بڑی کثرت سے پھل
(لگتے) ہیں۔ کیا یہ (ساری) نعمتیں کسی کے کسی عمل کے نتیجہ میں ہیں یا اس خدا تعالیٰ کی خالص رحمانیت سے ہیں جس نے ہمیں سامان
زیست کی تنگی سے نجات دی ہے۔ ہمیں ہر ضرورت میں ارتقا کے لیے ایک سیڑھی دی ہے اور رسیاں بھی دی ہیں۔ جن
کی ہمیں پانی حاصل کرنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی رحمانیت کے نتیجہ میں ہم پر انعام کیا۔

بِہٖ بَلْ خَلَقَ نَعْمَآءَہٗ قَبْلَ اَنْ تُخْلَقَ۔ فَانْظُرْ هَلْ تَرٰی مِثْلَہٗ فِی الْمُنْعِمِیْنَ۔
فَحَاصِلُ الْکَلَامِ اَنَّ الرَّحْمَانِیَّۃَ رَحْمَۃٌ عَامَّۃٌ لِّنَوْعِ الْاِنْسَانِ وَالْحَیَوَانِ وَ لِکُلِّ ذِیْ رُوْحٍ وَّکُلِّ نَفْسٍ مَّنْفُوْسَۃٍ مِّنْ غَیْرِ اِرَادَۃِ اَجْرِ عَمَلٍ وَّمِنْ غَیْرِ لِحَاظِ اسْتِحْقَاقِ عَبْدٍ بِصَلَاحِہٖ وَتَوَرُّعِہٖ فِی الدِّیْنِ۔

وَالْقِسْمُ الثَّالِثُ مِنَ الصِّفَاتِ الْفَیْضَانِیَّۃِ صِفَۃٌ یُّسَمِّیْہَا رَبُّنَا اَلرَّحِیْمَ وَلَا بُدَّ مِنْ اَنْ نُّسَمِّیَ فَیْضَانَہَا فَیْضَانًا خَاصًّا وَّ رَحِیْمِیَّۃً مِّنَ اللّٰہِ الْکَرِیْمِ۔ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ وَیُشَمِّرُوْنَ وَلَا یُقَصِّرُوْنَ وَیَذْکُرُوْنَ وَلَا یَغْفُلُوْنَ وَیُبْصِرُوْنَ وَلَا یَتَعَامَوْنَ وَیَسْتَعِدُّوْنَ لِیَوْمِ الرَّحِیْلِ وَیَتَّقُوْنَ سُخْطَ الرَّبِّ الْجَلِیْلِ وَیَبِیْتُوْنَ لِرَبِّہِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا وَّیُصْبِحُوْنَ صَآئِمِیْنَ۔ وَلَا یَنْسَوْنَ مَوْتَہُمْ وَرُجُوْعَہُمْ اِلٰی مَوْلٰہُمُ الْحَقِّ بَلْ یَعْتَبِرُوْنَ بِنَعْیٍ یُّسْمَعُ وَیَرْتَاعُوْنَ لِاِلْفٍ یُّفْقَدُ وَیَذْکُرُوْنَ مَنَایَاہُمْ مِّنْ مَّوْتِ الْاَحْبَابِ وَیَہُوْلُہُمْ هَیْلُ التُّرَابِ عَلَی الْاَتْرَابِ فَیَلْتَاعُوْنَ وَیَتَنَبَّہُوْنَ وَیُرِیْہِمُ اخْتِرَامُ الْاَحِبَّۃِ

ورنہ ہمارا ایسا کوئی عمل نہیں تھا، جو ہمیں اس کا مستحق بنا دیتا۔ بلکہ اس نے اپنی یہ نعمتیں ہماری پیدائش سے بھی پہلے پیدا کر رکھی ہیں۔ پس خوب غور کرو کیا تمہیں اس شان کا کوئی فیاض اور منعم کہیں نظر آتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ رحمانیت بنی نوع انسان اور حیوان کے لیے اور ہر جاندار اور ہر پیدا شدہ جان کے لیے ایک عام رحمت ہے جو کسی عمل پر اجر دینے کے ارادہ کے بغیر نیز کسی شخص کے تقویٰ اور نیکی پر بطور حق کے نہیں۔

فیضانی صفات میں سے تیسری قسم وہ صفت ہے جس کا نام ہمارے پروردگار نے الرحیم رکھا ہے۔ اور ضروری ہے کہ ہم اس فیضان کو فیضان خاص کے نام سے پکاریں اور یہ رحیمیت خدائے کریم کی طرف سے ان لوگوں کے لیے ہے جو نیک کام کرتے ہیں۔ ہر وقت نیک کاموں کے لیے تیار رہتے ہیں اور کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہیں کبھی غافل نہیں ہوتے۔ آنکھوں سے کام لیتے ہیں اندھے نہیں بنتے۔ کوچ کے دن کے لیے تیار رہتے ہیں اور رب جلیل کی ناراضگی سے بچتے ہیں۔ اپنے رب کے لیے سجدہ اور قیام میں راتیں گذارتے ہیں دن کو روزہ رکھتے ہیں۔ اپنی موت اور اپنے مالک حقیقی کی طرف واپس لوٹنے کو نہیں بھولتے۔ کسی کی موت کی خبر سن کر عبرت حاصل کرتے ہیں۔ کسی دوست کے گم ہو جانے پر کانپ اٹھتے ہیں۔ دوستوں کی موت سے اپنی موتوں کو یاد کرتے ہیں۔ اپنے ہم عمر ساتھیوں پر مٹی ڈالنا انہیں خوف دلاتا ہے۔ پس وہ ان

مَوْتَ اَنْفُسِهِمْ فَيَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَهُمْ مِّنَ الصَّالِحِيْنَ۔ فَلَعَلَّكَ فَهِمْتَ اَنَّ هٰذَا الْفَيْضَانَ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ عَلٰى شَرِيْطَةِ الْعَمَلِ وَالتَّوَرُّعِ وَالسَّمْتِ الصَّالِحِ وَالتَّقْوٰى وَالْاِيْمَانِ وَلَا وُجُوْدَ لَهٗ اِلَّا بَعْدَ وُجُوْدِ الْعَقْلِ وَالْفَهْمِ وَبَعْدَ وُجُوْدِ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحُدُوْدِهٖ وَاَحْكَامِهٖ۔ وَكَذَالِكَ الْمَحْرُوْمُوْنَ مِنْ هٰذِهِ النِّعْمَةِ لَا يَسْتَحِقُّوْنَ عِتَابًا وَّمُؤَاخَذَةً مِّنْ قَبْلِ هٰذِهِ الشَّرَآئِطِ فَظَهَرَ اَنَّ الرَّحِيْمِيَّةَ تَوْاَمٌ لِّكِتَابِ اللّٰهِ وَتَعْلِيْمِهٖ وَتَفْهِيْمِهٖ فَلَا يُؤْخَذُ اَحَدٌ قَبْلَهٗ وَلَا يُدْرِكُ اَحَدًا عَطَبُ الْقَهْرِ اِلَّا بَعْدَ ظُهُوْرِ هٰذِهِ الرَّحِيْمِيَّةِ وَلَا يُسْئَلُ فَاسِقٌ عَنْ فِسْقِهٖ اِلَّا بَعْدَهَا فَخُذْ هٰذَا السِّرَّ مِنِّيْ وَهُوَ رَدٌّ عَلَى الْمُتَنَصِّرِيْنَ فَاِنَّهُمْ قَآئِلُوْنَ بِلَسْعِ الذَّنْبِ مِنْ اٰدَمَ اِلٰى انْقِطَاعِ الدُّنْيَا وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّ كُلَّ عَبْدٍ مُّذْنِبٌ سَوَآءٌ عَلَيْهِ بَلَغَهٗ كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاُعْطِيَ لَهٗ عَقْلٌ سَلِيْمٌ اَوْ كَانَ مِنَ الْمَعْذُوْرِيْنَ وَزَعَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يَغْفِرُ اَحَدًا اِلَّا بَعْدَ اِيْمَانِهٖ بِالْمَسِيْحِ وَزَعَمُوْا اَنَّ اَبْوَابَ النَّجَاةِ مُغْلَقَةٌ لِّغَيْرِهٖ وَلَا سَبِيْلَ

کے غم سے جلتے ہیں اور خود ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ دوستوں کی مفارقت انہیں اپنی موت (کا نظارہ) دکھا دیتی ہے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نیکوکار بن جاتے ہیں۔ اب شاید تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس فیضان کا آسمان سے نازل ہونا عمل صالح، پرہیزگاری، راست روی، پارسائی اور ایمان کے ساتھ مشروط ہے اس فیض کا وجود عقل اور فہم کے وجود اور کتاب اللہ اور اس کی حدود اور احکام کے نازل ہونے کے بعد ممکن ہے۔ اسی طرح جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں وہ ان شرائط (کے پورا ہونے) سے قبل کسی عتاب یا مؤاخذہ کے مستحق نہیں ٹھہرتے۔ لہذا ظاہر ہو گیا کہ رحیمیت کی صفت اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی تعلیم و تفہیم کی توأم ہے۔ اور اس (کتاب اللہ کے نزول) سے قبل کسی پر گرفت نہیں ہوتی اور نہ کسی پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب نازل ہوتا ہے جب تک یہ رحیمیت ظاہر نہ ہو کسی بدکار انسان سے اس کی بدکاری کے متعلق مؤاخذہ اس کے بعد ہی ہو گا۔

پس یہ بھید کی بات مجھ سے سمجھ لے اور یہ عیسائیوں کی زبردست تردید ہے۔ کیونکہ وہ تو آدم سے لیکر دنیا کے خاتمہ تک گناہ کی نیش زنی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر انسان گنہ گار ہے خواہ اُسے خدا تعالیٰ کی کتاب پہنچی ہو اور اُسے عقل سلیم عطا ہوئی ہو یا وہ معذوروں میں سے ہو اور ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسیح علیہ السلام (کی صلیبی موت) پر ایمان لائے بغیر کسی کو نہیں بخشتا اور ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ مسیح پر ایمان نہ لانے والے پر نجات کے دروازے بند ہیں۔ اور محض اعمال سے

إِلَى الْمَغْفِرَةِ بِمُجَرَّدِ الْأَعْمَالِ فَإِنَّ اللّٰهَ عَادِلٌ وَّالْعَدْلُ يَقْتَضِي أَنْ يُّعَذَّبَ مَنْ كَانَ مُذْنِبًا وَّكَانَ مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ فَلَمَّا حَصْحَصَ الْيَاسُ مِنْ أَنْ تَطْهُرَ النَّاسُ بِأَعْمَالِهِمْ أَرْسَلَ اللّٰهُ ابْنَهُ الطَّاهِرَ لِيَزِرَ وِزْرَ النَّاسِ عَلٰى عُنُقِهٖ ثُمَّ يُصَلَّبَ وَيُنَجِّيَ النَّاسَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ فَجَآءَ الْإِبْنُ وَقُتِلَ وَنَجَا النَّصَارٰى فَدَخَلُوْا فِيْ حَدَآئِقِ النَّجَاةِ فَرِحِيْنَ۔ هٰذِهٖ عَقِيْدَتُهُمْ وَلٰكِنْ مَّنْ نَّقَدَهَا بِعَيْنِ الْمَعْقُوْلِ وَوَضَعَهَا عَلٰى مِعْيَارِ التَّحْقِيْقَاتِ سَلَكَهَا مَسْلَكَ الْهَذَيَانَاتِ۔ وَإِنْ تَعْجَبْ فَمَا تَجِدُ أَعْجَبَ مِنْ قَوْلِهِمْ هٰذَا لَا يَعْلَمُوْنَ أَنَّ الْعَدْلَ أَهَمُّ وَأَوْجَبُ مِنَ الرَّحْمِ فَمَنْ تَرَكَ الْمُذْنِبَ وَأَخَذَ الْمَعْصُوْمَ فَفَعَلَ فِعْلًا مَّا بَقِيَ مِنْهُ عَدْلٌ وَّلَا رَحْمٌ وَّمَا يَفْعَلُ مِثْلَ ذَالِكَ إِلَّا الَّذِيْ هُوَ أَضَلُّ مِنَ الْمَجَانِيْنِ۔ ثُمَّ إِذَا كَانَتِ الْمُؤَاخَذَاتُ مَشْرُوْطَةً بِوَعْدِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَوَعِيْدِهٖ فَكَيْفَ يَجُوْزُ تَعْذِيْبُ أَحَدٍ قَبْلَ إِشَاعَةِ قَانُوْنِ الْأَحْكَامِ وَتَشْيِيْدِهٖ وَكَيْفَ يَجُوْزُ أَخْذُ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ عِنْدَ صُدُوْرِ مَعْصِيَةٍ

مغفرت تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عادل ہے اور عدل اس بات کا مقتضی ہے کہ جو بھی گنہ گار اور مجرم ہو اس کو سزا دی جائے۔ پس جب اس بارہ میں کامل مایوسی واضح ہوگئی کہ لوگ اپنے اعمال کے ذریعہ (گناہوں سے) پاک ہوسکیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاکیزہ بیٹے کو بھیجا تا وہ لوگوں کے (گناہ کے) بوجھ اپنی گردن پر اُٹھالے اور پھر صلیب دیا جائے۔ اور اس طرح لوگوں کو ان کے (گناہ کے) بوجھوں سے نجات دلائے۔ پس خدا کا بیٹا آیا اور وہ خود قتل ہوا اور عیسائیوں نے نجات پائی اور وہ نجات کے باغیچوں میں خوش وخرم داخل ہوگئے۔ یہ ان کا عقیدہ ہے لیکن جو شخص عقل کی آنکھ سے اس عقیدہ کو پرکھے اور اسے تحقیقات کی کسوٹی پر کسے تو وہ اسے محض غیر معقول باتوں کا سلسلہ قرار دیگا۔ اگر تو اس عقیدہ پر تعجب کرے (تو بجا ہے) کیونکہ تو ان کے اس دعویٰ سے زیادہ عجیب بات اور کہیں نہیں پائے گا۔

وہ نہیں جانتے کہ عدل (ان معنی میں کہ بے گناہ کو سزا نہ دی جائے) رحم سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ پس جو گنہگار کو چھوڑ دے اور بے گناہ کو سزا دے اس نے ایک ایسا فعل کیا جس سے نہ عدل باقی رہ گیا اور نہ رحم اور ایسا کام سوائے اس کے کوئی نہیں کرسکتا جو پاگلوں سے بھی گیا گذرا ہو۔

پھر جبکہ مؤاخذہ خدا تعالیٰ کے وعدہ اور وعید کے ساتھ مشروط ہے تو پھر ضابطہ احکام کی اشاعت اور اس کے استحکام سے قبل کسی کو سزا دینا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ اور پھر کسی معصیت کے سرزد ہونے پر پہلوں، پچھلوں کو گرفت کرنا

مَا سَبَقَهَا وَعِيدٌ عِنْدَ ارْتِكَابِهَا وَمَا كَانَ اَحَدٌ عَلَيْهَا مِنَ الْمُطَّلِعِيْنَ۔ فَالْحَقُّ اَنَّ الْعَدْلَ لَا يُوْجَدُ اَثَرُهٗ اِلَّا بَعْدَ نُزُوْلِ كِتَابِ اللّٰهِ وَوَعْدِهٖ وَوَعِيْدِهٖ وَ اَحْكَامِهٖ وَحُدُوْدِهٖ وَ شَرَآئِطِهٖ وَاِضَافَةُ الْعَدْلِ الْحَقِيْقِيِّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بَاطِلٌ لَّا اَصْلَ لَهَا لِاَنَّ الْعَدْلَ لَا يُتَصَوَّرُ اِلَّا بَعْدَ تَصَوُّرِ الْحُقُوْقِ وَ تَسْلِيْمِ وُجُوْبِهَا وَ لَيْسَ لِاَحَدٍ حَقٌّ عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ اَلَا تَرٰى اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ كُلَّ حَيَوَانٍ لِّلْاِنْسَانِ وَ اَبَاحَ دِمَآءَهَا لِاَدْنٰى ضَرُوْرَتِهٖ۔ فَلَوْ كَانَ وُجُوْبُ الْعَدْلِ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى لَمَا كَانَ لَهٗ سَبِيْلٌ لِّاِجْرَآءِ هٰذِهِ الْاَحْكَامِ وَاِلَّا فَكَانَ مِنَ الْجَائِرِيْنَ۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ فِيْ مَلَكُوْتِهٖ يُعِزُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يُذِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يُحْيِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَيُمِيْتُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْفَعُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضَعُ مَنْ يَّشَآءُ وَوُجُوْدُ الْحُقُوْقِ يَقْتَضِيْ خِلَافَ ذَالِكَ بَلْ يَجْعَلُ يَدَهٗ مَغْلُوْلَةً وَّ اَنْتَ تَرٰى اَنَّ الْمُشَاهَدَةَ تُكَذِّبُهَا وَ قَدْ خَلَقَ اللّٰهُ مَخْلُوْقَهٗ عَلٰى تَفَاوُتِ الْمَرَاتِبِ فَبَعْضُ مَخْلُوْقِهٖ اَفْرَاسٌ وَّحَمِيْرٌ وَّبَعْضُهٗ جِمَالٌ وَّنُوْقٌ وَّ كِلَابٌ وَّذِيَابٌ

کس طرح جائز ہے جبکہ اس سے پہلے یہ وعید موجود نہ ہو کہ مرتکب کو گرفت ہوگی حالانکہ اس سے پہلے اس کے معصیت ہونے پر کسی کو اطلاع نہ تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عدل کا وجود پایا نہیں جاتا۔ مگر خدا تعالیٰ کی کتاب اس کے وعدہ اور اس کی وعید اس کے احکام اور اس کی حدود اور اس کی شرائط کے نزول کے بعد۔

اور اللہ تعالیٰ کی طرف عدل حقیقی کی اضافت قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ عدل کا تصوّر تب ہو سکتا ہے جب اس سے پہلے حقوق کا تصوّر کیا جائے اور ان کے وجوب کو تسلیم کر لیا جائے۔ مگر ربّ العالمین پر تو کسی کا کوئی حق نہیں ہو سکتا کیا تم نہیں دیکھتے کہ اُس نے ہر حیوان کو انسان کی خدمت میں لگایا ہوا ہے۔ اس کی ادنیٰ ضرورت کے لیے بھی اس کا خون بہانے کو جائز رکھا ہے۔ اگر عدل کو بطور حق کے اللہ کے ذمہ واجب قرار دیا جائے تو پھر اس کے لیے ایسے احکام کے جاری کرنے کا کوئی موقعہ نہیں تھا ورنہ اس کا شمار ظالموں میں ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی بادشاہت میں جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کرتا ہے۔ جسے چاہے زندہ رکھتا ہے اور جسے چاہے موت دیتا ہے جسے چاہے وہ بلند کرتا ہے اور جس کو چاہے پست کر دیتا ہے مگر حقوق کے وجود کا تقاضا اس سے الٹ ہے بلکہ یہ تو اس کے ہاتھ کو باندھ دیتا ہے اور تم دیکھتے ہو کہ تمہارا مشاہدہ حقوق کے دعویٰ کو جھٹلاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو مختلف درجوں میں پیدا کیا ہے۔ اس کی مخلوق میں سے کچھ تو گھوڑے اور گدھے ہیں۔ کچھ اونٹ اور اونٹنیاں ہیں۔ کچھ کتے

وَّ ثُمُوْرًا وَّ جَعَلَ لِبَعْضِ مَخْلُوْقِهٖ سَمْعًا وَّ بَصَرًا وَّ خَلَقَ بَعْضَهُمْ صُمًّا وَّ جَعَلَ بَعْضَهُمْ عَمِيْنَ۔ فَلِاَيِّ حَيَوَانٍ حَقٌّ اَنْ يَّقُوْمَ وَيُخَاصِمَ رَبَّهٗ اَنَّهٗ لِمَ خَلَقَهٗ كَذَا وَلَمْ يَخْلُقْهُ كَذَا۔ نَعَمْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلٰى نَفْسِهٖ حَقًّا لِعِبَادِهٖ بَعْدَ اِنْزَالِ الْكُتُبِ وَتَبْلِيْغِ الْوَعْدِ وَالْوَعِيْدِ وَبَشَّرَ بِجَزَاءِ الْعَامِلِيْنَ۔ فَمَنْ تَبِعَ كِتَابَهٗ وَنَبِيَّهٗ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔ وَمَنْ عَصٰى رَبَّهٗ وَاَحْكَامَهٗ وَاَبٰى فَسَيَكُوْنُ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ۔ فَلَمَّا كَانَ مِلَاكُ الْاَمْرِ الْوَعْدُ وَالْوَعِيْدُ لَا الْعَدْلُ الْعَتِيْدُ الَّذِيْ كَانَ وَاجِبًا عَلَى اللّٰهِ الْوَحِيْدِ۔ اِنْهَدَمَ مِنْ هٰذَا الْاُصُوْلِ الْمُنِيْفُ الْمُمَرَّدُ الَّذِيْ بَنَاهُ النَّصَارٰى مِنْ اَوْهَامِهِمْ فَثَبَتَ اَنَّ اِيْجَابَ الْعَدْلِ الْحَقِيْقِيِّ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى خَيَالٌ فَاسِدٌ وَّمَتَاعٌ كَاسِدٌ۔ لَا يَقْبَلُهٗ اِلَّا مَنْ كَانَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ۔ وَمِنْ هُنَا نَجِدُ اَنَّ بِنَاءَ عَقِيْدَةِ الْكَفَّارَةِ عَلٰى عَدْلِ اللّٰهِ بِنَاءٌ فَاسِدٌ عَلٰى فَاسِدٍ فَتَدَبَّرْ فِيْهِ فَاِنَّهٗ يَكْفِيْكَ لِكَسْرِ صَلِيْبِ النَّصَارٰى اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُنَاظِرِيْنَ وَاسْمُ هٰذِهِ الصِّفَةِ فِيْ كِتَابِ

اور بھیڑئیے ہیں اور چیتے ہیں۔ اس نے کچھ مخلوق کو تو کان اور آنکھیں دی ہیں۔ بعض کو بہرا پیدا کیا ہے اور بعض کو اندھا بنایا ہے پس کس جاندار کو یہ حق ہے کہ وہ کھڑا ہو اور اپنے رب سے جھگڑا کرے کہ اُس نے اُسے اس طرح کیوں پیدا کیا؟ اور اُس طرح کیوں پیدا نہیں کیا؟ ہاں اللہ تعالیٰ نے کتابیں بھیجنے اور تبشیر و انذار مکمل کرنے کے بعد خود اپنے اوپر بندوں کا حق قرار دے لیا ہے۔ اور اس نے عمل کرنے والوں کو مناسب جزا کی بشارت دی ہے پس جو شخص اس کی کتاب اور اس کے نبی کی پیروی کرے اور اپنے آپ کو گری ہوئی خواہشات سے روکے رکھے تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے لیکن جو شخص اپنے ربّ اور اس کے احکام کی نافرمانی اور انکار کرے تو اس کو ضرور سزا ملے گی پس جبکہ وعدہ وعید پر ہی جزا کا مدار ہے نہ کہ کسی حقیقی عدل پر جو خدائے وحید پر لازم قرار دیا جائے تو اس اصول سے عیسائیوں کے اوہام سے تعمیر کردہ بلند و طویل عمارت دھڑام سے گر جاتی ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر عدل حقیقی واجب ٹھہرانا ایک فاسد خیال اور کھوٹی جنس ہے۔ جسے جاہلوں کے سوا اور کوئی قبول نہیں کر سکتا۔ اس (بحث) سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد خدا تعالیٰ کے عدل پر رکھنا بناء فاسد علی الفاسد ہے پس اس بارہ میں خوب غور کرو کیونکہ اگر تم مناظرینِ اسلام میں سے ہو تو نصاریٰ کی صلیب کو توڑنے کے لیے یہی چیز تمہارے لیے کافی ہے۔ خدا تعالیٰ کی کتاب میں اس صفت کا نام رحیمیت

اللّٰہِ تَعَالٰی رَحِیْمِیَّۃٌ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْعَزِیْزِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا[1] وَقَالَ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[2] فَھٰذَا الْفَیْضَانُ لَا یَتَوَجَّہُ اِلَّا اِلَی الْمُسْتَحِقِّ وَلَا یَطْلُبُ اِلَّا عَامِلًا وَّ ھٰذَا ھُوَ الْفَرْقُ بَیْنَ الرَّحْمَانِیَّۃِ وَ الرَّحِیْمِیَّۃِ ۔ وَالْقُرْاٰنُ مَمْلُوٌّ مِّنْ نَّظَائِرِہٖ وَلٰکِنْ کَفَاکَ ھٰذَا الْقَدْرُ اِنْ کُنْتَ مِنَ الْعَاقِلِیْنَ ۔

اَلْقِسْمُ الرَّابِعُ مِنَ الْفَیْضَانِ فَیْضَانٌ نُّسَمِّیْہِ فَیْضَانًا اَخَصَّ وَ مَظْھَرًا تَآمًّا لِّلْمَالِکِیَّۃِ ۔ وَھُوَ اَکْبَرُ الْفُیُوْضِ وَاَعْلَاھَا وَاَرْفَعُھَا وَاَتَمُّھَا وَاَکْمَلُھَا وَمُنْتَھَاھَا وَ ثَمَرَۃُ اَشْجَارِ الْعَالَمِیْنَ ۔ وَلَا یَظْھَرُ اِلَّا بَعْدَ ھَدْمِ عِمَارَاتِ ھٰذَا الْعَالَمِ الْحَقِیْرِ الصَّغِیْرِ وَدُرُوْسِ اَطْلَالِہٖ وَ اٰثَارِہٖ وَ شُحُوْبِ سَحْنَتِہٖ وَنُضُوْبِ بَآءِ وَجْنَتِہٖ وَ اُفُوْلِ نَجْمِہٖ کَالْمُغْتَرِبِیْنَ ۔ وَھُوَ عَالَمٌ لَّطِیْفٌ دَقَّتْ اَسْرَارُہٗ وَکَثُرَتْ اَنْوَارُہٗ یَحَارُ فِیْھَا فَھْمُ الْمُتَفَکِّرِیْنَ ۔ وَاِنْ قُلْتَ لِمَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ ھٰذَا الْمَقَامِ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ وَمَا قَالَ عَادِلِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ فَاعْلَمْ اَنَّ السِّرَّ فِیْ ذَالِکَ

ہے ۔جیساکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا[3] اور پھر فرمایا وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[4] پس یہ فیضان صرف اس کے مستحق کی طرف ہی رُخ کرتا ہے اور صرف عمل کرنے والوں کا ہی متلاشی ہے ۔ رحمانیت اور رحیمیت میں یہی فرق ہے اور قرآن کریم اس فرق کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے ۔لیکن اس جگہ اتنا بیان ہی کافی ہے اگر تم عقلمندوں میں سے ہو۔

فیضان کی چوتھی قسم وہ فیضان ہے جسے ہم فیضان اخصّ یا مالکیت کے مظہر تام کے نام سے پکارتے ہیں اور وہ فیوض میں سب سے بڑا ،سب سے اعلیٰ ،سب سے بلند، جامع ،سب سے زیادہ مکمل اور فیوض کا منتہی ہے ۔اور تمام جہانوں کے درختوں کا پھل بھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس فیضان کا ظہور کامل اِس حقیر اور صغیر عالم کی عمارتوں کے مسمار ہونے ، اس کے کھنڈروں اور نشانات کے مٹ جانے ،اس کے رنگ و روپ کے متغیر ہوجانے اور اس کے رخساروں کی آب و تاب زائل ہوجانے اور سب غروب ہونے والوں کی طرح اس کے ستارہ کے ڈوب ہوجانے کے بعد ہوتا ہے ۔ اور مالکیت ایک لطیف عالم ہے جس کے اسرار نہایت دقیق ہیں اور اس کے انوار بہت زیادہ ہیں ۔ اس میں غور و فکر کرنے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔

اور اگر تم پوچھو کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کیوں کہا اور عَادِلِ یَوْمِ الدِّیْنِ

[1] سورۃ الاحزاب ع ۶ ۔ [2] سورۃ البقرۃ ع ۲۷ ۔ [3] ترجمہ: اور وہ مومنوں پر بار بار رحم کرنے والا ہے ۔ [4] ترجمہ: اور اللہ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے ۔

اَنَّ الْعَدْلَ لَا یَتَحَقَّقُ اِلَّا بَعْدَ تَحَقُّقِ الْحُقُوْقِ وَلَیْسَ لِاَحَدٍ مِّنْ حَقٍّ عَلَی اللّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ وَنَجَاۃُ الْاٰخِرَۃِ مَوْھِبَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ تَعَالٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَسَارَعُوْا اِلَی امْتِثَالِہٖ وَتَقَبُّلِ اَحْکَامِہٖ وَعِبَادَتِہٖ وَمَعْرِفَتِہٖ بِسُرْعَۃٍ مُّعْجِبَۃٍ کَاَنَّھُمْ کَانُوْا فِیْ نَجَآءِ حَرَکَاتِھِمْ وَمَسَآئِجِ غَدَوَاتِھِمْ وَرَوْحَاتِھِمْ مُمْتَطِیْنَ عَلٰی ھَوْجَاءَ شِمِلَّۃٍ وَّنُوْقٍ مُّشْمَعِلَّۃٍ وَّاِنْ لَّمْ یُتِمُّوْا اَمْرَ الْاِطَاعَۃِ وَمَا عَبَدُوْا حَقَّ الْعِبَادَۃِ وَمَا عَرَفُوْا حَقَّ الْمَعْرِفَۃِ وَلٰکِنْ کَانُوْا عَلَیْھَا حَرِیْصِیْنَ وَکَذَالِکَ الَّذِیْنَ عَصَوْا رَبَّھُمْ وَاِنْ لَّمْ تَبْلُغْ شِقْوَتُھُمْ مَدَاھَا وَلٰکِنْ کَانُوْا اِلَیْھَا مُسَارِعِیْنَ۔ وَکَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّئَاتِ وَیَزِیْدُوْنَ فِیْ جَرَآءَاتِھِمْ وَمَا کَانُوْا مِنَ الْمُنْتَھِیْنَ۔ فَکُلٌّ یَرٰی مَا کَانَ فِیْ نِیَّتِہٖ رَحْمَۃً مِّنَ اللّٰہِ اَوْ قَھْرًا فَمَنْ تَاَوَّحَ مَھَبَّ نَسِیْمِ الرَّحْمَۃِ فَسَیَجِدُ حَظًّا مِّنْھَا خَالِدًا فِیْھَا وَمَنْ قَابَلَ صَرَاصِرَ الْقَھْرِ فَسَیَقَعُ فِیْ صَدَمَاتِھَا وَمَا ھٰذَا اِلَّا الْمَالِکِیَّۃُ لَا الْعَدْلُ الَّذِیْ یَقْتَضِی الْحُقُوْقَ فَتَدَبَّرْ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ ۔

(کرامات الصادقین صفحہ ۸ ۲ تا ۷۴)

(کیوں) نہیں کہا تو واضح ہو کہ اس میں بھید یہ ہے کہ عدل کا تصور اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک حقوق کو تسلیم نہ کر لیا جائے اور جہانوں کے پروردگار خدا پر تو کسی کا کوئی حق نہیں اور آخرت کی نجات خدا تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے لیے محض ایک عطیہ ہے جو اس پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی اطاعت کرنے اور اس کے احکام کو قبول کرنے، اس کی عبادت کو بجا لانے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے حیران کن تیزی سے قدم بڑھایا گویا وہ اپنی حرکات کی تیزی میں اور صبح و شام کے سفروں میں تیز رفتار اور تیز گام اونٹنیوں پر سوار تھے اور گو وہ اطاعت کے معاملہ کو پورے کمال تک نہ پہنچا سکے اور نہ عبادت کا پورا حق ادا کر سکے ہوں اور نہ ہی معرفت کی حقیقت کو پوری طرح پا سکے ہوں لیکن ان باتوں کے حصول کے شدید خواہشمند رہے ہوں۔ اور اسی طرح وہ لوگ جنہوں نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی۔ اگرچہ ان کی بدبختی اپنی انتہا کو نہیں پہنچی لیکن وہ اس (بدبختی) کی طرف تیزی سے بڑھتے رہے، بُرے عمل کرتے رہے اور بدی کرنے پر اپنی جرأت میں ترقی کرتے گئے اور وہ (بدی کے کاموں سے) رُکنے والے نہ تھے۔ پس (ایسے لوگوں میں سے) ہر شخص اپنی اپنی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اس کا قہر دیکھے گا پس جس نے اپنا رُخ ادھر پھیرا جدھر سے نسیم رحمت آ رہی ہو تو وہ ضرور رحمت سے اپنا حصہ پائیگا۔ اور اس میں رہتا چلا جائیگا۔ اور جو قہر کی تند ہواؤں کی زد میں آ گیا تو وہ ضرور اُن کے تھپیڑے کھائیگا اور یہ مالکیت ہی ہے عدل نہیں جو حقوق کا مقتضی ہوتا ہے پس تم خوب غور کرو اور دیکھو کہیں غافلوں میں شامل نہ ہو جانا۔ (ترجمہ از مرتب)

ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی صِفَاتٍ ذَاتِيَّةً نَاشِئَةً مِّنِ اقْتِضَاءِ ذَاتِهٖ وَعَلَيْهَا مَدَارُ الْعَالَمِيْنَ كُلِّهَا وَهِيَ اَرْبَعٌ رُبُوْبِيَّةٌ وَّرَحْمَانِيَّةٌ وَّرَحِيْمِيَّةٌ وَّمَالِكِيَّةٌ كَمَا اَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰی اِلَيْهَا فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ وَقَالَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ - فَهٰذِهِ الصِّفَاتُ الذَّاتِيَّةُ سَابِقَةٌ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ وَّمُحِيْطَةٌ بِكُلِّ شَيْءٍ وَّمِنْهَا وُجُوْدُ الْاَشْيَاءِ وَاسْتِعْدَادُهَا وَقَابِلِيَّتُهَا وَوُصُوْلُهَا اِلٰی كَمَالَاتِهَا وَاَمَّا صِفَةُ الْغَضَبِ فَلَيْسَتْ ذَاتِيَّةً لِلّٰهِ تَعَالٰی بَلْ هِيَ نَاشِئَةٌ مِّنْ عَدَمِ قَابِلِيَّةِ بَعْضِ الْاَعْيَانِ لِلْكَمَالِ الْمُطْلَقِ وَكَذَالِكَ صِفَةُ الْاِضْلَالِ لَا يَبْدُوْ اِلَّا بَعْدَ زَيْغِ الضَّالِّيْنَ - وَاَمَّا حَصْرُ الصِّفَاتِ الْمَذْكُوْرَةِ فِي الْاَرْبَعِ فَنَظَرًا عَلَی الْعَالَمِ الَّذِيْ يُوْجَدُ فِيْهِ اٰثَارُهَا اَلَا تَرٰی اَنَّ الْعَالَمَ كُلَّهٗ يَشْهَدُ عَلٰی وُجُوْدِ هٰذِهِ الصِّفَاتِ بِلِسَانِ الْحَالِ وَقَدْ تَجَلَّتْ هٰذِهِ الصِّفَاتُ بِنَحْوٍ لَّا يَشُكُّ فِيْهَا بَصِيْرٌ اِلَّا مَنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَمِيْنَ - وَهٰذِهِ الصِّفَاتُ اَرْبَعٌ اِلٰی انْقِرَاضِ النَّشْاَةِ الدُّنْيَوِيَّةِ ثُمَّ تَتَجَلّٰی مِنْ تَحْتِهَا اَرْبَعٌ اُخْرٰی الَّتِيْ مِنْ شَانِهَا اَنَّهَا لَا

پھر واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ذاتی ہیں جو اس کی ذات کے تقاضا سے پیدا ہونے والی ہیں اور اُنہیں پر سب جہانوں کا مدار ہے اور وہ چار ہیں۔ ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت اور مالکیت۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ پس یہ ذاتی صفات ہر چیز پر سبقت رکھتی ہیں اور ہر چیز پر محیط ہیں۔ تمام اشیاء کا وجود، ان کی استعداد یں، ان کی قابلیت اور ان کا اپنے کمالات کو پہنچنا انہیں (صفات) کے ذریعہ سے ہے لیکن غضب کی صفت خدا کی ذاتی (صفت) نہیں ہے بلکہ وہ بعض موجودات کے مطلقاً کمال قبول نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح گمراہ ٹھہرانے کی صفت کا ظہور بھی گمراہ ہونے والوں میں کجی پیدا ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

لیکن صفات مذکورہ کا حصر چار کے عدد میں اس عالم کو مدنظر رکھ کر ہے جس میں ان صفات کے آثار پائے جاتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ عالم سارے کا سارا بزبان حال ان (چاروں) صفات کے وجود پر شہادت دے رہا ہے اور یہ چاروں صفات اس طور سے جلوہ افروز ہیں کہ کوئی صاحب بصیرت ان میں شک نہیں کرسکتا سوائے اس کے جو اندھوں میں سے ہو اور یہ صفات اس دنیا کے اختتام تک چار (کی تعداد میں ہی) رہیں گی۔ پھر ان ہی میں سے چار اور صفات جلوہ گر

تَظْهَرُ اِلَّا فِی الْعَالَمِ الْاٰخِرِ وَ اَوَّلُ مَطَالِعِهَا عَرْشُ الرَّبِّ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ لَمْ یَتَدَنَّسْ بِوُجُوْدِ غَیْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ صَارَ مَظْهَرًا تَامًّا لِاَنْوَارِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ قَوَائِمُهٗ اَرْبَعٌ رُبُوْبِیَّةٌ وَّ رَحْمَانِیَّةٌ وَّ رَحِیْمِیَّةٌ وَّ مَالِکِیَّةُ یَوْمِ الدِّیْنِ وَ لَا جَامِعَ لِهٰذِهِ الْاَرْبَعِ عَلٰی وَجْهِ الظِّلِّیَّةِ اِلَّا عَرْشُ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ قَلْبُ الْاِنْسَانِ الْکَامِلِ وَ هٰذِهِ الصِّفَاتُ اُمَّهَاتٌ لِصِفَاتِ اللّٰهِ کُلِّهَا وَ وَقَعَتْ کَقَوَائِمِ الْعَرْشِ الَّذِی اسْتَوَی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ فِیْ لَفْظِ الْاِسْتِوَآءِ اِشَارَةٌ اِلٰی هٰذَا الْاِنْعِکَاسِ عَلَی الْوَجْهِ الْاَتَمِّ الْاَکْمَلِ مِنَ اللّٰهِ الَّذِیْ هُوَ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔ وَ تَنْتَهِیْ کُلُّ قَائِمَةٍ مِّنَ الْعَرْشِ اِلٰی مَلَكٍ هُوَ حَامِلُهَا وَ مُدَبِّرُ اَمْرِهَا وَ مَوْرِدُ تَجَلِّیَاتِهَا وَ قَاسِمُهَا عَلٰی اَهْلِ السَّمَآءِ وَ الْاَرَضِیْنَ فَهٰذَا مَعْنٰی قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمَانِیَةٌ فَاِنَّ الْمَلٰٓئِکَةَ یَحْمِلُوْنَ صِفَاتًا فِیْهَا حَقِیْقَةٌ عَرْشِیَّةٌ وَّ السِّرُّ فِیْ ذَالِكَ اَنَّ الْعَرْشَ لَیْسَ شَیْئًا مِّنْ اَشْیَآءِ الدُّنْیَا بَلْ هُوَ بَرْزَخٌ بَیْنَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مَبْدَءٌ قَدِیْمٌ لِّلتَّجَلِّیَاتِ

ہونگی جن کی شان یہ ہے کہ وہ دوسرے جہان میں ہی ظاہر ہونگی اور ان کی پہلی جلوہ گاہ رب کریم کا عرش ہوگا۔ جو کبھی غیر اللہ کے وجود سے آلودہ نہیں ہوا اور وہ عرش پروردگار عالم کے انوار کا مظہر تام ہے۔ اور اس کے پائے چار ہیں۔ ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت اور مالکیت یوم الدین۔ اور ظلّی طور پر ان چاروں صفات کا مکمل طور پر جامع اللہ تعالیٰ کے عرش یا انسان کامل کے دل کے سوا اور کوئی نہیں اور یہ (چاروں) صفات اللہ تعالیٰ کی باقی صفات کے لیے اصولی صفات ہیں۔ اور وہ اس عرش کے لیے بمنزلہ پایوں کے ہیں جس پر خدا تعالیٰ مستوی (جلوہ گر) ہے اور خدا کے مستوی ہونے میں ذات باری تعالیٰ کی صفات کے کامل انعکاس کی طرف اشارہ ہے جو بہترین خالق ہے۔ پھر عرش کا ہر پایہ ایک فرشتہ تک پہنچتا ہے جسے وہ اُٹھائے ہوئے ہے اور اسی پایہ کے متعلق امر کا انتظام کرتا ہے۔ وہ اس کی تجلیات کے پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے اور ان تجلیات کو بحصہ رسدی آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والوں پر تقسیم کرتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے قول وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمَانِیَةٌ[1] کے یہی معنے ہیں۔ کیونکہ ملائکہ ان صفات الٰہیہ کو اُٹھائے ہوئے ہیں جو عرش کی حقیقت سے متعلق ہیں۔ اور اس میں بھید یہ ہے کہ عرش اس دنیا کی چیزوں میں سے نہیں بلکہ وہ دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ، اور رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین کی صفات کی تجلیات کا ازلی منبع ہے۔ تا احسانات الٰہیہ

[1] الحاقہ رکوع ۱۔ ترجمہ: اور اس دن تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھا رہے ہوں گے۔

الرَّبَّانِيَّةِ وَالرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ وَالْمَالِكِيَّةِ لِاِظْهَارِ التَّفَضُّلَاتِ وَتَكْمِيْلِ الْجَزَاءِ وَالدِّيْنِ ـ وَهُوَ دَاخِلٌ فِيْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّهٗ كَانَ ذَا الْعَرْشِ مِنْ قَدِيْمٍ وَّلَمْ يَكُنْ مَّعَهٗ شَيْءٌ فَكُنْ مِّنَ الْمُتَدَبِّرِيْنَ ـ وَحَقِيْقَةُ الْعَرْشِ وَاسْتِوَآءِ اللّٰهِ عَلَيْهِ سِرٌّ عَظِيْمٌ مِّنْ اَسْرَارِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحِكْمَةٌ بَالِغَةٌ وَّمَعْنًى رُّوْحَانِيٌّ وَّسُمِّيَ عَرْشًا لِتَفْهِيْمِ عُقُوْلِ هٰذَا الْعَالَمِ وَلِتَقْرِيْبِ الْاَمْرِ اِلٰى اسْتِعْدَادَاتِهِمْ وَهُوَ وَاسِطَةٌ فِيْ وُصُوْلِ الْفَيْضِ الْاِلٰهِيِّ وَالتَّجَلِّي الرَّحْمَانِيِّ مِنْ حَضْرَةِ الْحَقِّ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ وَمِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِلَى الرُّسُلِ وَلَا يَقْدَحُ فِيْ وَحْدَتِهٖ تَعَالٰى تَكَثُّرُ قَوَابِلِ الْفَيْضِ بَلِ التَّكَثُّرُ هٰهُنَا يُوْجِبُ الْبَرَكَاتِ لِبَنِيْٓ اٰدَمَ وَيُعِيْنُهُمْ عَلَى الْقُوَّةِ الرُّوْحَانِيَّةِ وَيَنْصُرُهُمْ فِي الْمُجَاهَدَاتِ وَالرِّيَاضَاتِ الْمُوْجِبَةِ لِظُهُوْرِ الْمُنَاسَبَاتِ الَّتِيْ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَصِلُوْنَ اِلَيْهِ مِنَ النُّفُوْسِ كَنَفْسِ الْعَرْشِ وَالْعُقُوْلِ الْمُجَرَّدَةِ اِلٰٓى اَنْ يَّصِلُوْنَ اِلَى الْمَبْدَءِ الْاَوَّلِ وَعِلَّةِ الْعِلَلِ ثُمَّ اِذَا اَعَانَ السَّالِكَ الْجَذَبَاتُ الْاِلٰهِيَّةُ وَالنَّسِيْمُ الرَّحْمَانِيَّةُ فَيَقْطَعُ كَثِيْرًا مِّنْ حُجُبِهٖ وَيُنْجِيْهِ مِنْ بُعْدِ الْمَقْصَدِ وَكَثْرَةِ عَقَبَاتِهٖ وَاٰفَاتِهٖ

کا اظہار اور جزا سزا کی تکمیل ہو اور یہ عرش اللہ تعالیٰ کی صفات میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ازل سے صاحب عرش ہے اور اس کے ساتھ ازل میں کوئی اور چیز نہ تھی۔ پس ان باتوں پر غور و فکر کرنے والوں میں سے بنو۔

اور عرش کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کا اس پر مستوی ہونا الٰہی اسرار میں سے ایک بہت بڑا سرّ ہے اور ایک بلیغ حکمت اور روحانی معنی پر مشتمل ہے اور اس کا نام عرش اس لیے رکھا گیا ہے تا اس جہان کے اہل عقل کو اس کا مفہوم سمجھایا جائے اور اس بات کا سمجھنا ان کی استعدادوں کے قریب کر دیا جائے۔ اور وہ (عرش) الٰہی فیض اور اللہ تعالیٰ کی رحمانی تجلی کو ملائکہ تک پہنچانے میں واسطہ ہے۔ اور اسی طرح ملائکہ سے رسولوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے خدا کی توحید پر یہ بات حرف نہیں لاتی کہ اس کے فیض کو قبول کرنے والے اور آگے پہنچانے والے وجود بکثرت ہوں۔ بلکہ اس مقام میں (وسائط کی) کثرت بنی آدم کے لیے برکات کا موجب ہے اور روحانی قوت کے حصول میں ان کو مدد دیتی ہے۔ اور انہیں ان مجاہدوں اور ریاضتوں میں مدد دیتی ہے جو ان مناسبتوں کے ظہور کا موجب بنتی ہیں جو بنی آدم اور نفوس عالیہ مثلاً نفس عرش اور عقول مجردہ میں موجود ہیں جن تک بنی آدم نے پہنچنا ہے یہ سلسلہ جاری رہیگا۔ یہاں تک کہ بنی آدم مبدء اول اور علت علل (ذات باری) تک پہنچ جائیں۔ پھر جب الٰہی کشش اور اس کی رحمانیت کی ٹھنڈی ہوا سالک کی مدد کریں تو اللہ تعالیٰ اس کے بہت سے پردے دور کر دیتا ہے اور اُسے مقصد کی دوری

وَ يُنَوِّرُهٗ بِالنُّوْرِ الْاِلٰهِيِّ وَ يُدْخِلُهٗ فِي الْوَاصِلِيْنَ ـ فَيَكْمُلُ لَهُ الْوُصُوْلُ وَ الشُّهُوْدُ مَعَ رُؤْيَتِهٖ عَجَائِبَاتِ الْمَنَازِلِ وَ الْمَقَامَاتِ وَلَا شُعُوْرَ لِاَهْلِ الْعَقْلِ بِهٰذِهِ الْمَعَارِفِ وَ النِّكَاتِ وَلَا مَدْخَلَ لِلْعَقْلِ فِيْهِ وَ الْاِطِّلَاعُ بِاَمْثَالِ هٰذِهِ الْمَعَانِيْ اِنَّمَا هُوَ مِنْ مِّشْكٰوةِ النُّبُوَّةِ وَ الْوَلَايَةِ وَ مَا شَمَّتِ الْعَقْلُ رَائِحَتَهٗ وَمَا كَانَ لِعَاقِلٍ اَنْ يَّضَعَ الْقَدَمَ فِيْ هٰذَا الْمَوْضِعِ اِلَّا بِجَذْبَةٍ مِّنْ جَذَبَاتِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ـ

وَاِذَا انْفَكَّتِ الْاَرْوَاحُ الطَّيِّبَةُ الْكَامِلَةُ مِنَ الْاَبْدَانِ وَ يَتَطَهَّرُوْنَ عَلٰى وَجْهِ الْكَمَالِ مِنَ الْاَوْسَاخِ وَ الْاَدْرَانِ يُعْرَضُوْنَ عَلَى اللّٰهِ تَحْتَ الْعَرْشِ بِوَاسِطَةِ الْمَلَآئِكَةِ فَيَاْخُذُوْنَ بِطَوْرٍ جَدِيْدٍ حَظًّا مِّنْ رُّبُوْبِيَّةٍ يُغَايِرُ رُبُوْبِيَّةً سَابِقَةً وَ حَظًّا مِّنْ رَّحْمَانِيَّةٍ مُّغَايِرٍ رَحْمَانِيَّةٍ اُوْلٰى وَ حَظًّا مِّنْ رَّحِيْمِيَّةٍ وَ مَالِكِيَّةٍ مُّغَايِرٍ مَا كَانَ فِي الدُّنْيَا فَهُنَالِكَ تَكُوْنُ ثَمَانِيَ صِفَاتٍ تَحْمِلُهَا ثَمَانِيَةٌ مِّنْ مَّلٰٓئِكَةِ اللّٰهِ بِاِذْنِ اَحْسَنِ الْخَالِقِيْنَ ـ فَاِنَّ لِكُلِّ صِفَةٍ مَّلَكٌ مُّوَكَّلٌ

اور بہت سی درمیانی روکوں اور آفات سے نجات دے دیتا ہے ۔ اور اُسے (سالک کو) الٰہی نور سے منور کر دیتا ہے ۔ اور زمرہ واصلین میں داخل کر دیتا ہے ۔ اور (راہ سلوک کی) منزلوں اور مقامات کے عجائبات دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ وصال الٰہی اور دیدار الٰہی کے مرتبۂ وصول وشہود کو پالیتا ہے ۔ لیکن فلسفیوں کو ان معارف اور باریکیوں کا کچھ بھی پتہ نہیں اور نہ ہی محض عقل کو اس شعور میں کوئی دخل ہے ۔ اور ایسے مطالب اور معانی پر آگاہی صرف مشکوٰۃ نبوت اور ولایت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کی خوشبو عقل کو نہیں پہنچ سکی ۔ اور نہ کسی عقلمند کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس مقام پر بجز رب العالمین کی کسی کشش کے قدم مار سکے ۔ اور جب نیکوں کی پاک اور کامل روحیں ان مادی جسموں سے الگ ہو جاتی ہیں اور وہ مکمل طور پر (گناہوں کی) میل کچیل سے پاک ہو جاتے ہیں تو وہ فرشتوں کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عرش کے نیچے اس کے حضور پیش کیے جاتے ہیں، تب وہ ایک نئے طور سے ربوبیت سے ایسا حصہ پاتے ہیں جو پہلی ربوبیت سے بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ اور اسی طرح رحمانیت سے حصہ پاتے ہیں جو پہلی رحمانیت سے مختلف ہوتا ہے ۔ پھر وہ رحیمیت اور مالکیت سے ایسا حصہ پاتے ہیں جو دنیا میں ملنے والے حصہ سے مختلف ہوگا ۔ اس وقت ان صفات کی تعداد آٹھ ہو جائے گی ۔ جن کو اللہ تعالیٰ کے آٹھ فرشتے احسن الخالقین کے اذن سے اُٹھائیں گے اور ہر ایک صفت کے لیے ایک فرشتہ مقرر

قَدْ خُلِقَ لِتَوْزِيْعِ تِلْكَ الصِّفَةِ عَلٰى وَجْهِ التَّدْبِيْرِ وَ وَضْعِهَا فِيْ مَحَلِّهَا وَ اِلَيْهِ اِشَارَةٌ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا[۱] فَتَدَبَّرْ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ۔

وَزِيَادَةُ الْمَلَآئِكَةِ الْحَامِلِيْنَ فِي الْاٰخِرَةِ لِزِيَادَةِ تَجَلِّيَاتٍ رَّبَّانِيَّةٍ وَّ رَحْمَانِيَّةٍ وَّرَحِيْمِيَّةٍ وَّمَالِكِيَّةٍ عِنْدَ زِيَادَةِ الْقَوَابِلِ فَاِنَّ النُّفُوْسَ الْمُطْمَئِنَّةَ بَعْدَ انْقِطَاعِهَا وَ رُجُوْعِهَا اِلَى الْعَالَمِ الثَّانِيْ وَالرَّبِّ الْكَرِيْمِ تَتَرَقّٰى فِيْ اسْتِعْدَادَاتِهَا فَتَتَمَوَّجُ الرُّبُوْبِيَّةُ وَالرَّحْمَانِيَّةُ وَالرَّحِيْمِيَّةُ وَالْمَالِكِيَّةُ بِحَسَبِ قَابِلِيَّاتِهِمْ وَاسْتِعْدَادَاتِهِمْ كَمَا تَشْهَدُ عَلَيْهِ كُشُوْفُ الْعَارِفِيْنَ۔

وَاِنْ كُنْتَ مِنَ الَّذِيْنَ اُعْطِيَ لَهُمْ حَظٌّ مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَتَجِدُ فِيْهِ كَثِيْرًا مِّنْ مِّثْلِ هٰذَا الْبَيَانِ۔ فَانْظُرْ بِالنَّظَرِ الدَّقِيْقِ۔ لِتَجِدَ شَهَادَةَ هٰذَا التَّحْقِيْقِ۔ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ (کراماتُ الصّادقین صفو ۸۷ تا ۸۹)

ثُمَّ قَوْلُهٗ تَعَالٰى اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ رَدٌّ لَّطِيْفٌ عَلَى الدَّهْرِيِّيْنَ وَالْمُلْحِدِيْنَ وَالطَّبِيْعِيِّيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِصِفَاتِ اللّٰهِ الْمَجِيْدِ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ كَعِلَّةٍ مُّوْجِبَةٍ وَّلَيْسَ بِالْمُدَبِّرِ

ہوگا۔ جو بڑے منظم طریق سے اس صفت (کی برکات) کو بانٹنے اور اُسے برمحل رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے کلام فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا میں اشارہ ہے پس تو بھی غور کر اور غافلوں میں شامل نہ ہو۔

آخرت میں ملائکہ حاملین عرش کی تعداد کی زیادتی خدا کی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت کی تجلیات کی زیادتی کی وجہ سے ہے جبکہ فیض قبول کرنے والے زیادہ ہوجائیں گے۔ کیونکہ نفس مطمئنہ اس دنیا سے تعلق توڑ کر دوسری دنیا اور رب کریم کی طرف واپس لوٹنے کے بعد اپنی استعدادوں میں ترقی کرتے ہیں۔ پس ان کی قابلیتوں اور استعدادوں کے مطابق (صفات الٰہیہ) ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت موجزن ہوتی ہیں۔ جیسا کہ عارف باللہ لوگوں کے کشوف اس امر پر گواہ ہیں۔ اور اگر تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں قرآن کریم کے فہم کا کچھ حصہ عطا کیا گیا ہے تو تمہیں بھی اس (کتاب مجید) میں ایسے بہت سے بیانات ملیں گے پس تم گہری نظر سے دیکھو تا تمہیں اللہ تعالیٰ پروردگارِ عالم کی کتاب سے (میری اس) تحقیق کی تصدیق مل جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے کلام پاک الحمد للہ رب العالمین سے مالک یوم الدین تک کی آیات میں ایک لطیف پیرایہ میں دہریوں، ملحدوں اور نیچریوں کے خیالات کی تردید ہے۔ جو خدائے بزرگ و برتر کی صفات پر ایمان نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ وہ علت موجبہ کی طرح

---

[۱] سُوْرَةُ النّٰزِعٰت ع ۱

الْمُرِيْدِ وَلَا يُوْجَدُ فِيْهِ اِرَادَةٌ كَالْمُنْعِمِيْنَ وَالْمُعْطِيْنَ فَكَاَنَّهٗ يَقُوْلُ كَيْفَ
لَا تُؤْمِنُوْنَ بِرَبِّ الْبَرِيَّةِ وَتَكْفُرُوْنَ بِرُبُوْبِيَّتِهِ الْاِرَادِيَّةِ وَهُوَ الَّذِيْ
يُرَبِّي الْعَالَمِيْنَ وَيَغْمُرُ بِنَوَالِهٖ وَيَحْفَظُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ بِقُدْرَتِهٖ
وَجَلَالِهٖ وَيَعْرِفُ مَنْ اَطَاعَهٗ وَمَنْ عَصٰى فَيَغْفِرُ الْمَعَاصِيَ اَوْ يُؤَدِّبُ
بِالْعَصَا وَمَنْ جَآءَهٗ مُطِيْعًا فَلَهٗ جَنَّتَانِ وَحَفَّتْ بِهٖ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ
يُصِيْبُهٗ مِنِ اسْمِ الرَّحِيْمِ وَاُخْرٰى مِنَ الرَّحْمٰنِ الْقَدِيْمِ فَيُجْزٰى جَزَآءً
اَوْفٰى مِنَ اللّٰهِ الْاَعْلٰى وَيُدْخَلُ فِي الْفَآئِزِيْنَ ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذِهِ الصِّفَاتِ
تَجْعَلُ اللّٰهَ مُسْتَحِقًّا لِّلْعِبَادَةِ مُعْطِيًا مِّنْ عَطَايَا السَّعَادَةِ وَاَمَّا التَّقْدِيْسُ
وَحْدَهٗ كَمَا ذُكِرَ فِي الْاِنْجِيْلِ فَلَا يُحَرِّكُ الرُّوْحَ لِلْعِبَادَةِ بَلْ يَتْرُكُهَا
كَالنَّآئِمِ الْعَلِيْلِ وَاَمَّا سِرُّ هٰذَا التَّرْتِيْبِ الَّذِي اخْتَارَهٗ فِي الْفَاتِحَةِ رَبُّنَا
الْمَجِيْدُ ذُو الْمَجْدِ وَالْعِزَّةِ وَذَكَرَ الْمَحَامِدَ قَبْلَ ذِكْرِ الدُّعَآءِ وَالْعِبَادَةِ فَاعْلَمْ

تو ہے لیکن وہ مدبر بالارادہ نہیں۔ اور اس میں انعام کرنے والے اور فیاض لوگوں کی طرح ارادہ نہیں پایا جاتا (تو تردید میں) گویا اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ تم کس لیے مخلوقات کے پروردگار پر ایمان نہیں لاتے اور اس کی بالارادہ ربوبیت کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ وہی تو تمام جہانوں کی پرورش کرتا ہے اور وہ (سب کو) اپنے احسانات سے ڈھانپتا اور اپنی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمانوں اور زمین کی حفاظت فرماتا ہے۔ جو لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں ان کو بھی اور جو نافرمانی کرتے ہیں ان کو بھی خوب جانتا ہے۔ پس گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیتا ہے یا سزا سے ان کی اصلاح کرتا ہے۔ لیکن جو شخص فرمانبردار بن کر اس کے پاس آئے۔ اس کے لیے دو جنتیں ہیں اور دو خوشیاں اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ ایک خوشی تو اسے صفت رحیمیت سے ملتی ہے اور دوسری خوشی رحمانیت کی قدیم صفت سے ملتی ہے۔ پس اسے اللہ بلند و برتر کی طرف سے پوری پوری جزا دی جاتی ہے۔ اور وہ بامراد لوگوں میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ لاریب یہ صفات اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق اور سعادت کے انعامات بخشنے والا قرار دیتی ہیں۔ لیکن صرف اس کی تقدیس کا بیان جیسا کہ انجیل میں مذکور ہے روح میں عبادت کے لیے حرکت پیدا نہیں کرتا بلکہ اُسے سوئے ہوئے بیمار کی طرح رہنے دیتا ہے۔ باقی اس بات کا راز کہ بزرگ و برتر خدا تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں جس ترتیب کو اختیار کیا ہے اور دعا اور عبادت کے ذکر سے پہلے اپنے محامد کے ذکر کو بیان فرمایا ہے سو یوں جاننا چاہیے کہ اس نے ایسا اس لیے کیا ہے

أَنَّهُ فَعَلَ ذَالِكَ لِيُذَكِّرَ عِبَادَهُ عَظَمَةَ صِفَاتِ الْبَارِئِ ذِي الْمَجْدِ وَالْعَلَاءِ قَبْلَ الدُّعَاءِ وَيُشِيْرَ إِلَى أَنَّهُ هُوَ الْمَوْلَى لَا مُنْعِمَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَاحِمَ إِلَّا هُوَ وَلَا مُجَازِيَ إِلَّا هُوَ وَمِنْهُ يَأْتِي كُلُّ مَا يَأْتِي الْعِبَادَ مِنَ الْآلَاءِ وَالنَّعْمَاءِ وَهٰذَا التَّرْتِيْبُ أَحْسَنُ وَلِلرُّوْحِ أَنْفَعُ فَإِنَّهُ يُظْهِرُ عَلَى السَّعِيْدِ مِنَنَ اللّٰهِ الرَّحِيْمِ وَيَجْعَلُهُ مُسْتَعِدًّا وَّمُقْبِلًا عَلٰى حَضْرَةِ الْقَدِيْرِ الْكَرِيْمِ وَيَظْهَرُ مِنْهُ تَمَوُّجٌ تَامٌّ فِي أَرْوَاحِ الطُّلَبَاءِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى أَهْلِ الدَّهَاءِ ۔ وَأَمَّا تَخْصِيْصُ ذِكْرِ الرُّبُوْبِيَّةِ وَالرَّحْمَانِيَّةِ وَالْمَالِكِيَّةِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلِأَجْلِ أَنَّ هٰذِهِ الصِّفَاتِ الْأَرْبَعَةَ أُمَّهَاتٌ لِجَمِيْعِ الصِّفَاتِ الْمُؤَثِّرَةِ الْمُفِيْضَةِ ۔ وَلَا شَكَّ أَنَّهَا مُحَرِّكَاتٌ قَوِيَّةٌ لِقُلُوْبِ الدَّاعِيْنَ ۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۹۷، ۹۸)

فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا تَدَبَّرَ فِي صِفَاتٍ جَعَلَهَا اللّٰهُ مُقَدَّمَةً لِدُعَاءِ الْفَاتِحَةِ وَعَلِمَ أَنَّهَا مُشْتَمِلَةٌ عَلٰى صِفَاتِ كَمَالِهِ وَنُعُوْتِ جَلَالِهِ بِاسْتِيْفَاءِ الْإِحَاطَةِ وَمُحَرِّكَةٌ لِأَنْوَاعِ الشَّوْقِ وَالْمَحَبَّةِ وَعَلِمَ أَنَّ رَبَّهُ مَنْبَعٌ لِجَمِيْعِ

تا بزرگ و برتر ذات باری دعا سے قبل اپنے بندوں کو اپنی صفات کی شان یاد دلائے اور اس طرف اشارہ کرے کہ وہی حقیقی آقا ہے اس کے سوا نہ تو کوئی نعمتیں دینے والا ہے اور نہ اس کے سوا رحم کرنے والا اور جزا سزا دینے والا ہے۔ بندوں کو جو بھی انعام و اکرام ملتے ہیں وہ اُسی کی طرف سے آتے ہیں (سورۃ فاتحہ کی) یہ ترتیب بہترین ہے اور روح کے لیے بہت فائدہ بخش ہے۔ وہ سعید انسان پر خدائے رحیم کے احسانوں کو خوب ظاہر کرتی ہے۔ اور اُسے خدائے قدیر و کریم کی بارگاہ میں آنے کے لیے تیار کرتی اور اس کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اور اس ترتیب سے طالبانِ حق کی روحوں میں پورا جوش پیدا ہوتا ہے جیسا کہ عقلمندوں پر پوشیدہ نہیں لیکن ان چاروں صفات ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت کا ذکر جن کا تعلق دنیا و آخرت سے ہے خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ چاروں خدا کی تمام صفات کی اصل ہیں اور بلاشبہ کہ یہ چاروں صفات خدا کی باقی تمام موثر اور مفیض صفات کے لیے بطور اصل کے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ دعا کرنے والوں کے دلوں میں زبردست تحریک پیدا کرنے والی ہیں۔

جب انسان خدا تعالیٰ کی ان صفات کے بارہ میں غور کرتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے سورت فاتحہ کی دعا کے شروع میں بیان فرمایا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کمال اور اس کے جلال کی تمام صفات اور ثناؤں پر مشتمل ہے۔ اور ہر قسم کے شوق اور محبت کے لیے محرک ہے۔ اور یہ بھی جان لیتا ہے کہ اس کا رب تمام فیوض کا سرچشمہ، تمام بھلائیوں کا

الْفُيُوْضِ وَمَنْبَعٌ لِّجَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ وَدَافِعٌ لِّجَمِيْعِ الْاٰفَاتِ وَمَالِكٌ لِّكُلِّ اَنْوَاعِ الْمُجَازَاةِ مِنْهُ يُبْدَءُ الْخَلْقُ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ كُلُّ الْمَخْلُوْقَاتِ وَهُوَ مُنَزَّهٌ عَنِ الْعُيُوْبِ وَالنَّقَآئِصِ وَالسَّيِّاٰتِ وَمُسْتَجْمِعٌ لِّسَآئِرِ صِفَاتِ الْكَمَالِ وَاَنْوَاعِ الْحَسَنَاتِ فَلَاشَكَّ اَنَّهٗ يَحْسَبُهٗ مُنْجِحَ جَمِيْعِ الْحَاجَاتِ وَمُنْجِيًا مِّنْ سَآئِرِ الْمُوْبِقَاتِ فَيُكَابِدُ فِي ابْتِغَآءِ مَرْضَاتِهٖ كُلَّ الْمَصَآئِبِ وَلَوْ قُتِلَ بِالسَّهْمِ الصَّآئِبِ وَلَا يُعْجِزُهُ الْكُرُوْبُ وَلَا يَدْرِيْ مَا اللُّغُوْبُ وَيَجْذِبُهُ الْمَحْبُوْبُ وَيَعْلَمُ اَنَّهٗ هُوَ الْمَطْلُوْبُ وَيَتَيَسَّرُ لَهٗ اسْتِقْرَآءُ الْمَسَالِكِ لِتَطَلُّبِ مَرْضَاتِ الْمَالِكِ فَيُجَاهِدُ فِيْ سُبُلِهٖ وَلَوْ صَارَ كَالْهَالِكِ وَلَا يَخْشٰى هَوْلَ بَلَآءٍ وَّيَنْبَرِيْ لِكُلِّ ابْتِلَآءٍ وَّلَا يَبْقٰى لَهٗ مِنْ دُوْنِ حُبِّهٖ الْاَذْكَارُ وَلَا تَسْتَهْوِيْهِ الْاَفْكَارُ وَيَنْزِلُ مِنْ مَّطِيَّةِ الْاَهْوَآءِ لِيَمْتَطِيَ اَفْرَاسَ الرِّضَآءِ وَيَضْفِرُ اَزِمَّةَ الْاِبْتِغَآءِ لِيَقْطَعَ الْمَسَافَةَ النَّآئِيَةَ لِحَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ وَيَظَلُّ اَبَدًا لَّهٗ مُدَانِيًا وَّلَا يَجْعَلُ لَهٗ ثَانِيًا مِّنَ الْاَحِبَّآءِ وَلَا يَعْتَوِرُ قَلْبُهٗ بَيْنَ الشُّرَكَآءِ

منبع، تمام آفات کو دور کرنے والا اور ہر قسم کی جزا سزا کا مالک ہے نیز یہ کہ (مخلوق کی) پیدائش اسی سے شروع ہوئی ہے اور بالآخر کار تمام مخلوقات اسی کی طرف لوٹائی جائیں گی۔ اور وہ عیوب و نقائص اور برائیوں سے پاک ہے اور تمام صفات کمال اور ہر قسم کی خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ تب انسان لازماً اللہ تعالیٰ کو ہی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والا اور تمام ہلاکتوں سے نجات دینے والا یقین کر لیتا ہے۔ اور اس کی رضا کی تلاش میں ہر قسم کے مصائب کو برداشت کرتا ہے۔ چاہے وہ نشانہ پر بیٹھنے والے تیر سے قتل کیوں نہ کر دیا جائے۔ رنج و غم اسے بے بس نہیں کر سکتے اور نہ وہ جانتا ہے کہ تھکان کیا ہوتی ہے۔ خدائے محبوب اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور بندہ جانتا ہے کہ وہی (اس کا) مطلوب ہے۔ اپنے مالک کی رضا حاصل کرنے کے راستوں کی تلاش اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے لہذا وہ اس کی (طرف لے جانے والی) راہوں میں پوری کوشش کرتا ہے خواہ وہ ہلاک کیوں نہ ہو جائے۔ اور وہ کسی آزمائش کے خوف سے ڈرتا نہیں۔ بلکہ ہر ابتلا کے لیے سینہ سپر ہو جاتا ہے اور اور اس کے لیے اس کی محبت کے تذکرہ کے سوا اور کوئی ذکر باقی نہیں رہتا۔ دوسرے افکار اُسے فریفتہ نہیں کرتے اور وہ خواہشات کی سواری سے اُتر پڑتا ہے تا وہ خدا تعالیٰ کی رضا کے گھوڑوں پر سوار ہو اور وہ جستجو کی باگیں بٹتا ہے تا وہ خدا کے حضور پہنچنے کے لیے دور کی مسافت طے کر لے اور وہ ہمیشہ اس کے قرب میں رہتا ہے۔ اور اپنے پیاروں میں سے کسی کو بھی اس کا ثانی نہیں بناتا اور اس کا دِل (خدا کے) شریکوں (یعنی معبودانِ باطلہ) کے درمیان بھٹکتا نہیں پھرتا۔ وہ یہی دعا

وَيَقُوْلُ يَا رَبِّ تَسَلَّمْ قَلْبِيْ وَ تَكَفَّلْنِيْ لِجَذْبِيْ وَجَلْبِيْ وَلَنْ يُّصْبِيَنِيْ حُسْنُ الْاٰخَرِيْنَ۔ هٰذِهٖ نَتَائِجُ تَمْهِيْدِ دُعَآءِ الْفَاتِحَةِ ۔

(کرامات الصادقین صفحہ ۱۰۱)

جو کچھ خدائے تعالیٰ نے سورۃ حمد و حیہ میں رب العالمین کی صفت سے لے کر مالکِ یوم الدین تک بیان فرمایا ہے یہ حسب تصریحات قرآنِ شریف چار عالی شان صداقتیں ہیں جن کا اِس جگہ کھول کر بیان کرنا قرین مصلحت ہے۔ پہلی صداقت یہ کہ خدائے تعالیٰ رب العالمین ہے یعنی عالَم کے اشیا میں سے جو کچھ موجود ہے سب کا رب اور مالک خدا ہے اور جو کچھ عالم میں نمودار ہو چکا ہے اور دیکھا جاتا ہے یا ٹٹولا جاتا ہے یا عقل اُس پر محیط ہو سکتی ہے وہ سب چیزیں مخلوق ہی ہیں اور ہستی حقیقی بجز ایک ذات حضرتِ باری تعالیٰ کے اَور کسی چیز کے لیے حاصل نہیں غرض عالَم بجمیع اجزا اپنے مخلوق اور خدا کی پیدایش ہے اور کوئی چیز اجزائے عالم میں سے ایسی نہیں کہ جو خدا کی پیدایش نہ ہو اور خدائے تعالیٰ اپنی ربوبیّت تامہ کے ساتھ عالم کے ذرہ ذرہ پر متصرف اور حکمران ہے اور اُس کی ربوبیت ہر وقت کام میں لگی ہوئی ہے یہ نہیں کہ خدائے تعالیٰ دُنیا کو بنا کر اُس کے اِنتظام سے الگ ہو بیٹھا ہے اور اُسے نیچر کے قاعدہ کے ایسا سپرد کیا ہے کہ خود کسی کام میں دخل بھی نہیں دیتا اور جیسے کوئی کل بعد بنائے جانے کے پھر بنانے والے سے بے علاقہ ہو جاتی ہے ایسا ہی مصنوعات صانع حقیقی سے بے علاقہ ہیں بلکہ وہ رب العالمین اپنی ربوبیّتِ تامہ کی آب پاشی ہر وقت برابر تمام عالم پر کر رہا ہے اور اُس کی ربوبیت کا مینہ بالاتصال تمام عالم پر نازل ہو رہا ہے اور کوئی ایسا وقت نہیں کہ اُس کے رشحِ فیض سے خالی ہو بلکہ عالم کے بنانے کے بعد بھی اُس مبدءِ فیوض کی فی الحقیقۃ بلا ایک ذرہ تفاوت کے ایسی ہی حاجت ہے کہ گویا ابھی تک اُس نے کچھ بھی نہیں بنایا اور جیسا دُنیا اپنے وجود اور نمود کے لیے اُس کی ربوبیت کی محتاج تھی ایسا ہی اپنے بقا اور قیام کے لیے اُس کی ربوبیت کی حاجت مند ہے وہی ہے جو ہر دم دُنیا کو سنبھالے ہوئی ہے اور دُنیا کا ہر ذرہ اُسی سے تروتازہ ہے اور وہ اپنی مرضی اور ارادہ کے موافق ہر چیز کی ربوبیت کر رہا ہے یہ نہیں کہ بلا ارادہ کسی شے کے ربوبیت کا موجب ہو غرض آیات قرآنی کی رو سے جن کا خلاصہ ہم بیان کر رہے ہیں اِس صداقت کا یہ منشا ہے کہ ہر یک چیز کہ جو عالم میں پائی جاتی ہے وہ مخلوق ہے اور اپنے تمام کمالات اور اپنے تمام حالات اور اپنے تمام اوقات میں خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کی محتاج ہے اور کوئی روحانی یا جسمانی

مانگتا رہتا ہے کہ اے میرے رب میرے دل کو اپنے قبضہ میں محفوظ رکھ۔ مجھے اپنی طرف کھینچنے اور مائل کرنے کے لیے تو کافی ہو جا اور کسی اور کا حُسن مجھے کبھی فریفتہ نہ کر سکے۔ یہ سب نتائج دعائے فاتحہ کی عمدہ تمہید ہیں۔ (ترجمہ از مرتب)

ایسا کمالی نہیں ہے جس کو کوئی مخلوق خود بخود یا بغیر ارادہ خاص اُس متصرّف مطلق کے حاصل کر سکتا ہو۔ اور نیز حسب توضیح اُسی کلام پاک کے اِس صداقت اولیٰ ایسا ہی دوسری صداقتوں میں یہ معنے بھی ملحوظ ہیں کہ رب العلمین وغیرہ صفتیں جو خدائے تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں یہ اُس کی ذات واحد لاشریک سے خاص ہیں اور کوئی دوسرا اُن میں شریک نہیں جیسا کہ اِس سورۃ کے پہلے فقرہ میں یعنی الحمد للہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ تمام محامد خدا ہی سے خاص ہیں۔

دوسری صداقت رحمٰن ہے کہ جو بعد رب العلمین بیان فرمایا گیا اور رحمٰن کے معنے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ ہیں کہ جس قدر جاندار ہیں خواہ ذی شعور اور خواہ غیر ذی شعور اور خواہ نیک اور خواہ بد اُن سب کے قیام اور بقاء وجود اور بقاء نوع کے لیے اور اُن کی تکمیل کے لیے خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت عامہ کے رو سے ہر یک قسم کے اسباب مطلوبہ میسّر کر دئیے ہیں اور ہمیشہ میسّر کرتا رہتا ہے اور یہ عطیہ محض ہے کہ جو کسی عامل کے عمل پر موقوف نہیں۔

تیسری صداقت رحیم ہے کہ جو بعد رحمٰن کے مذکور ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خدائے تعالیٰ سعی کرنے والوں کی سعی پر بمقتضائے رحمتِ خاصہ ثمراتِ حسنہ مترتّب کرتا ہے توبہ کرنے والوں کے گناہ بخشتا ہے مانگنے والوں کو دیتا ہے کھٹکھٹانے والوں کے لیے کھولتا ہے۔

چوتھی صداقت جو سورۃ فاتحہ میں مندرج ہے مالک یوم الدین ہے یعنی باکمال و کامل جزا سزا کہ جو ہر یک قسم کے امتحان و ابتلا اور توسط اسباب غفلت افزا سے منزّہ ہے اور ہر یک کدورت اور کثافت اور شک اور شبہ اور نقصان سے پاک ہے اور تجلّیاتِ عظمیٰ کا مظہر ہے اُس کا مالک بھی وہی اللہ قادر مطلق ہے اور وہ اِس بات سے ہرگز عاجز نہیں کہ اپنی کامل جزا کو جو دن کی طرح روشن ہے ظہور میں لاوے اور اِس صداقت عظمیٰ کے ظاہر کرنے سے حضرتِ احدیت کا یہ مطلب ہے کہ تا ہر یک نفس پر بطورِ حق الیقین امور مفصّلہ ذیل کھل جائیں۔ اوّل یہ امر کہ جزا سزا ایک واقعی اور یقینی امر ہے کہ جو مالکِ حقیقی کی طرف سے اور اُسی کے ارادۂ خاص سے بندوں پر وارد ہوتا ہے اور ایسا کھل جانا دنیا میں ممکن نہیں کیونکہ اِس عالم میں یہ بات عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی کہ جو کچھ خیر و شر و راحت و رنج پہنچ رہا ہے وہ کیوں پہنچ رہا ہے اور کس کے حکم و اختیار سے پہنچ رہا ہے اور کسی کو اُن میں سے یہ آواز نہیں آتی کہ وہ اپنی جزا پا رہا ہے اور کسی پر بطور مشہود و محسوس منکشف نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ بھگت رہا ہے حقیقت میں وہ اُس کے عملوں کا بدلہ ہے۔ دوسرے اِس صداقت میں اِس امر کا کھلنا مطلوب ہے کہ اسبابِ عادیہ کچھ چیز نہیں ہیں اور فاعل حقیقی خدا ہے اور وہی ایک ذاتِ عظمیٰ ہے کہ جو جمیع فیوض کا مبدء اور ہر یک جزا سزا کا مالک ہے۔ تیسرے اِس صداقت میں اِس بات کا ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ سعادتِ عظمیٰ اور شقاوتِ عظمیٰ کیا چیز ہے یعنی سعادتِ عظمیٰ وہ فوز عظیم کی حالت ہے کہ جب نور اور سرور اور لذت اور راحت انسان کے تمام ظاہر و باطن اور تن و جان

پر محیط ہو جائے اور کوئی عضو اور قوّت اُس سے باہر نہ رہے۔ اور شقاوت عُظمیٰ وہ عذاب الیم ہے کہ جو بباعث نافرمانی اور ناپاکی اور بُعد اور دوری کے دلوں سے مشتعل ہو کر بدنوں پر مستولی ہو جائے اور تمام وجود فی النار والسقر معلوم ہو اور یہ تجلّیات عُظمیٰ اِس عالم میں ظاہر نہیں ہو سکتیں کیونکہ اِس تنگ اور منقبض اور مکدّر عالم کو جو روپوش اسباب ہو کر ایک ناقص حالت میں پڑا ہے اُن کے ظہور کی برداشت نہیں بلکہ اِس عالم پر ابتلا اور آزمایش غالب ہے اور اُس کی راحت اور رنج دونوں ناپایدار اور ناقص ہیں اور نیز اِس عالم میں جو کچھ انسان پر وارد ہوتا ہے وہ زیر پردہ اسباب ہے جس سے مالک الجزا کا چہرہ محجوب اور مکتوم ہو رہا ہے اِس لیے یہ خالص اور کامل اور منکشف طور پر یوم الجزا نہیں ہو سکتا بلکہ خالص اور کامل اور منکشف طور پر یوم الدّین یعنی یوم الجزا وہ عالم ہوگا کہ جو اِس عالم کے ختم ہونے کے بعد آوے گا اور وہی عالم تجلّیات عُظمیٰ کا مظہر اور جلال اور جمال کے پورے ظہور کی جگہ ہے اور چونکہ یہ عالم دُنیوی اپنی اصل وضع کے رو سے دار الجزا نہیں بلکہ دار الابتلا ہے اس لیے جو کچھ عُسر و یسر و راحت و تکلیف اور غم اور خوشی اس عالم میں لوگوں پر وارد ہوتی ہے اُس کو خدائے تعالیٰ کے لُطف یا قہر پر دلالت قطعی نہیں مثلاً کسی کا دولت مند ہو جانا اِس بات پر دلالت قطعی نہیں کرتا کہ خدائے تعالیٰ اُس پر خوش ہے اور نہ کسی کا مفلس اور نادار ہونا اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اُس پر ناراض ہے بلکہ یہ دونوں طور کے ابتلا ہیں تا دولت مند کو اُس کی دولت میں اور مُفلس کو اُس کی مفلسی میں جانچا جائے۔ یہ چار صداقتیں ہیں جن کا قرآن شریف میں مفصل بیان موجود ہے اور قرآن شریف کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اِن صداقتوں کی تفصیل میں آیاتِ قرآنی ایک دریا کی طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور اگر ہم اِس جگہ مفصّل طور پر اُن تمام آیات کو لکھتے تو بہت سے اجزا کتاب کے اِس میں خرچ ہو جاتے سو ہم نے اِس نظر سے کہ انشا اللہ عنقریب براہین قرآنی کے موقعہ پر وہ تمام آیات بہ تفصیل لکھے جائیں گے اِن تمہیدی مباحث میں صرف سورۃ فاتحہ کے قلیل و دلِ کلمات پر کفایت کی۔

اب بعد اِس کے ہم بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ چاروں صداقتیں کہ جو بیّن الثبوت اور بدیہی الصدق ہیں ایسے بے نظیر اور اعلیٰ درجہ کی ہیں کہ یہ بات دلائل قطعیہ سے ثابت ہے کہ حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور فرمانے کے وقت یہ چاروں صداقتیں دُنیا سے گُم ہو چکی تھیں اور کوئی قوم پردۂ زمین پر ایسی موجود نہیں تھی کہ جو بغیر آمیزش افراط یا تفریط کے اِن صداقتوں کی پابند ہو پھر جب قرآن شریف نازل ہوا تو اُس کلامِ مقدس نے نئے سرے اِن گم شدہ صداقتوں کو زاویہ گمنامی سے باہر نکالا اور گمراہوں کو اِن کے حقّانی وجود سے اطلاع دی اور دُنیا میں اِن کو پھیلایا اور ایک عالم کو اِن کے نور سے منوّر کیا لیکن اِس بات کے ثبوت کے لیے کہ کیوں کر

تمام قومیں اِن صداقتوں سے بے خبر اور ناواقف محض تھیں یہی ایک کافی دلیل ہے کہ اب بھی دُنیا میں کوئی قوم بجز دینِ حق اسلام کے ٹھیک ٹھیک اور کامل طور پر اِن صداقتوں پر قائم نہیں اور جو شخص کسی ایسی قوم کے وجود کا دعویٰ کرے تو بارِ ثبوت اُسی کے ذمہ ہے۔ ماسوا اِس کے قرآنی شہادت کہ جو ہریک دوست و دشمن میں شائع ہونے کی وجہ سے ہریک مخاصم پر حجت ہے اِس بات کے لیے ثبوت کافی ہے اور وہ شہادتیں جا بجا فرقان مجید میں بکثرت موجود ہیں۔ اور خود کسی تاریخ دان اور واقف حقیقت کو اِس سے بیخبری نہیں ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تک ہریک قوم کی ضلالت اور گمراہی کمال کے درجہ تک پہنچ چکی تھی اور کسی صداقت پر کامل طور پر اُن کا قیام نہیں رہا تھا چنانچہ اگر اول یہودیوں ہی کے حال پر نظر کریں تو ظاہر ہوگا کہ اُن کو خدائے تعالیٰ کی ربوبیت تامہ میں بہت سے شک اور شبہات پیدا ہو گئے تھے اور اُنہوں نے ایک ذات رب العالمین پر کفایت نہ کر کے صدہا ارباب متفرقہ اپنے لیے بنا رکھے تھے یعنی مخلوق پرستی اور دیوتا پرستی کا بغایت درجہ اُن میں بازار گرم تھا جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اُن کا یہ حال قرآن شریف میں بیان کر کے فرمایا ہے اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ[1] یعنی یہودیوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو کہ جو مخلوق اور غیرِ خدا ہیں اپنے رب اور قاضی الحاجات ٹھہرا رکھے ہیں اور نیز اکثروں کا یہودیوں میں سے بعض نیچریوں کی طرح یہ اعتقاد ہو گیا تھا کہ انتظام دُنیا کا قوانین منضبطہ متعینہ پر چل رہا ہے اور اُس قانون میں مختارانہ تصرف کرنے سے خدائے تعالیٰ قاصر اور عاجز ہے گویا اُس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں نہ اُس قاعدہ کے برخلاف کچھ ایجاد کر سکتا ہے اور نہ فنا کر سکتا ہے بلکہ جب سے کہ اُس نے اِس عالم کا ایک خاص طور پر شیرازہ باندھ کر اُس کی پیدائش سے فراغت پا لی ہے تب سے یہ کل اپنے ہی پُرزوں کی صلاحیت کی وجہ سے خود بخود چل رہی ہے اور رب العالمین کسی قسم کا تصرف اور دخل اُس کل کے چلنے میں نہیں رکھتا اور نہ اُس کو اختیار ہے کہ اپنی مرضی کے موافق اور اپنی خوشنودی ناخوشنودی کے رو سے اپنی ربوبیت کو بہ تفاوتِ مراتب ظاہر کرے یا اپنے ارادۂ خاص سے کسی طور کا تغیر اور تبدل کرے بلکہ یہودی لوگ خدائے تعالیٰ کو جسمانی اور مجسم قرار دیکر عالمِ جسمانی کی طرح اور اُس کا ایک جز سمجھتے ہیں اور اُن کی نظر ناقص میں یہ سمایا ہوا ہے کہ بہت سی باتیں کہ جو مخلوق پر جائز ہیں وہ خدا پر بھی جائز ہیں اور اُس کو من کل الوجوہ منزہ خیال نہیں کرتے اور اُن کی توریت میں جو محرف اور مبدل ہے خدائے تعالیٰ کی نسبت کئی طور کی بے ادبیاں پائی جاتی ہیں چنانچہ پیدائش کے ۳۲ باب میں لکھا ہے کہ خدائے تعالیٰ یعقوب سے تمام رات صبح تک کشتی لڑا کیا۔ اور اُس پر غالب نہ ہوا اسی طرح برخلاف اِس اُصول کے کہ خدائے تعالیٰ ہریک ما فی العالم کا رب ہے بعض مردوں کو اُنہوں نے خدا کے

---

[1] توبۃ - ع - ۵

بیٹے قرار دے رکھا ہے اور کسی جگہ عورتوں کو خدا کی بیٹیاں لکھا گیا ہے اور کسی جگہ بائبل میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ تم سب خدا ہی ہو اور سچ تو یہ ہے کہ عیسائیوں نے بھی انہیں تعلیموں سے مخلوق پرستی کا سبق سیکھا ہے کیونکہ جب عیسائیوں نے معلوم کیا کہ بائبل کی تعلیم بہت سے لوگوں کو خدا کے بیٹے اور خدا کی بیٹیاں بلکہ خدا ہی بناتی ہے تو انہوں نے کہا کہ آؤ ہم بھی اپنے ابن مریم کو انہیں میں داخل کریں تا وہ دوسرے بیٹوں سے کم نہ رہ جائے اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ عیسائیوں نے ابن مریم کو ابن اللہ بنا کر کوئی نئی بات نہیں نکالی بلکہ پہلے بے ایمانوں اور مشرکوں کے قدم پر قدم مارا ہے غرض حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودیوں کی یہ حالت تھی کہ مخلوق پرستی بدرجۂ غایت اُن پر غالب آگئی تھی اور عقاید حقہ سے بہت دور جا پڑے تھے یہاں تک کہ بعض اُن کے ہندوؤں کی طرح تناسخ کے بھی قائل تھے اور بعض جزا سزا کے قطعاً منکر تھے اور بعض مجازات کو صرف دُنیا میں محصور سمجھتے تھے اور قیامت کے قائل نہ تھے اور بعض یونانیوں کے نقش قدم پر چل کر مادہ اور روحوں کو قدیم اور غیر مخلوق خیال کرتے تھے اور بعض دہریوں کی طرح روح کو فانی سمجھتے تھے اور بعض کا فلسفیوں کی طرح یہ مذہب تھا کہ خدائے تعالیٰ رب العلمین اور مدبر بالارادہ نہیں ہے غرض مجذوم کے بدن کی طرح تمام خیالات اُن کے فاسد ہو گئے تھے اور خدائے تعالیٰ کی صفات کاملہ ربوبیت و رحمانیت و رحیمیت اور مالک یوم الدین ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے نہ اِن صفتوں کو اُس کی ذات سے مخصوص سمجھتے تھے اور نہ اِن صفتوں کا کامل طور پر خدائے تعالیٰ میں پایا جانا یقین رکھتے تھے بلکہ بہت سی بدگمانیاں اور بے ایمانیاں اور آلودگیاں اُن کے اعتقادوں میں بھر گئی تھیں اور توریت کی تعلیم کو اُنہوں نے نہایت بدشکل چیز کی طرح بنا کر شرک اور بدی کی بدبو کو پھیلانا شروع کر رکھا تھا پس وہ لوگ خدائے تعالیٰ کو جسمانی اور جسم قرار دینے میں اور اُس کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت وغیرہ صفات کے معطل جاننے میں اور اِن صفتوں میں دوسری چیزوں کو شریک گردانے میں اکثر مشرکین کے پیشوا اور سابقین اولین میں سے ہیں۔

یہ تو یہودیوں کا حال ہوا مگر افسوس کہ عیسائیوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اُس سے بدتر اپنا حال بنا لیا اور مذکورۂ بالا صداقتوں میں سے کسی صداقت پر قائم نہ رہے اور جو خدا کی صفات کاملہ تھی وہ سب ابن مریم پر تھاپ دی اور اُن کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ جمیع مافی العالم کا رب نہیں ہے بلکہ مسیح اُس کی ربوبیت سے باہر ہے بلکہ مسیح آپ ہی رب ہے اور جو کچھ عالم میں پیدا ہوا وہ بزعم باطل اُن کے بطور قاعدۂ کلیہ مخلوق اور حادث نہیں بلکہ ابن مریم عالم کے اندر حدوث پا کر اور صریح مخلوق ہو کر پھر غیر مخلوق اور خدا کے برابر بلکہ آپ ہی خدا ہے اور اُس کی عجیب ذات میں ایک ایسا اعجوبہ ہے کہ باوجود حادث ہونے کے قدیم ہے

اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے ایک واجب الوجود کے ماتحت اور اُس کا محکوم ہے مگر پھر بھی آپ ہی واجب الوجود
اور آزاد مطلق اور کسی کا ماتحت نہیں اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے عاجز اور ناتوان ہے مگر پھر بھی عیسائیوں کے
بے بنیاد زعم میں خدائے مطلق ہے اور عاجز نہیں اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے امور غیبیہ کے بارہ میں نادان
محض ہے یہاں تک کہ قیامت کی بھی خبر نہیں کہ کب آئے گی مگر پھر بھی نصرانیوں کے خوش عقیدہ کے رو سے عالم الغیب ہے
اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے اور نیز صحف انبیا کی گواہی سے ایک مسکین بندہ ہے مگر پھر بھی حضرات مسیحیوں کی
نظر میں خدا ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خود اپنے اقرار سے نیک اور بے گناہ نہیں ہے مگر پھر بھی عیسائیوں کے خیال میں
نیک اور بے گناہ ہے غرض عیسائی قوم بھی ایک عجیب قوم ہے جنہوں نے ضدین کو جمع کر رکھا یا اور تناقض کو جائز سمجھ
لیا اور گو اُن کے اعتقاد کے قائم ہونے سے مسیح کا دروغگو ہونا لازم آیا مگر انہوں نے اپنے اعتقاد کو نہ چھوڑا ایک
ذلیل اور عاجز اور ناچیز بندہ کو رب العالمین قرار دیا اور رب العالمین پر ہر طرح کی ذلت اور موت اور درد اور
دُکھ اور تجسم اور حلول اور تغیر اور تبدل اور حدوث اور تولد کو روا رکھا ہے نادانوں نے خدا کو بھی ایک کھیل بنالیا
ہے عیسائیوں پر کیا حصر ہے اُن سے پہلے کئی عاجز بندے خدا قرار دئے گئے ہیں کوئی کہتا ہے رام چندر خدا
ہے کوئی کہتا ہے نہیں کرشن کی خدائی اُس سے قوی تر ہے اسی طرح کوئی بدھ کو کوئی کسی کو کوئی کسی کو خدا ٹھہراتا
ہے۔ ایسا ہی آخری زمانہ کے اِن سادہ لوحوں نے بھی پہلے مشرکوں کی ریس کر کے ابنِ مریم کو بھی خدا اور خدا کا فرزند
ٹھہرا لیا غرض عیسائی لوگ خداوند حقیقی کو رب العالمین سمجھتے ہیں نہ اُسے رحمان اور رحیم خیال کرتے ہیں اور نہ جزا سزا
اُس کے ہاتھ میں یقین رکھتے ہیں بلکہ اُن کے گمان میں حقیقی خدا کے وجود سے زمین اور آسمان خالی پڑا ہوا ہے اور جو کچھ
ہے ابنِ مریم ہی ہے اگر رب ہے تو وہی ہے اگر رحمان ہے تو وہی ہے اگر رحیم ہے تو وہی ہے اگر مالک یوم الدین
ہے تو وہی ہے۔ ایسا ہی عام ہندو اور آریا بھی اِن صداقتوں سے منحرف ہیں کیونکہ اُن میں سے جو آریہ ہیں وہ تو
خدا تعالیٰ کو خالق ہی نہیں سمجھتے اور اپنی روحوں کا رب اُس کو قرار نہیں دیتے اور جو اُن میں سے بُت پرست
ہیں وہ صفت ربوبیت کو اُس رب العلمین سے خاص نہیں سمجھتے اور تینتیس کروڑ دیوتا ربوبیت کے کاروبار میں
خدائے تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اُن سے مرادیں مانگتے ہیں اور یہ ہر دو فریق خدائے تعالیٰ کی رحمانیت کے بھی
انکاری ہیں اور اپنے وید کے رو سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ رحمانیت کی صفت ہرگز خدائے تعالیٰ میں نہیں پائی
جاتی اور جو کچھ دُنیا کے لئے خدا نے بنایا ہے یہ خود دُنیا کے نیک عملوں کی وجہ سے خدا کو بنانا پڑا ورنہ پرمیشر خود
اپنے ارادہ سے کسی سے نیکی نہیں کر سکتا اور نہ کبھی کی۔ اسی طرح خدائے تعالیٰ کو کامل طور پر رحیم بھی نہیں سمجھتے کیونکہ
اُن لوگوں کا اعتقاد ہے کہ کوئی گنہگار خواہ کیسا ہی سچے دل سے توبہ کرے اور خواہ وہ سالہا سال تضرع اور

زاری اور اعمالِ صالح میں مشغول رہے خدا اُس کے گناہوں کو جو اُس سے صادر ہو چکے ہیں ہرگز نہیں بخشے گا جب تک وہ کئی لاکھ جونوں کو بھگت کر اپنی سزا نہ پالے۔ جب ہی کسی نے ایک گناہ کیا پھر نہ وہاں توبہ کام آوے نہ بندگی نہ خوفِ الٰہی نہ عشقِ الٰہی نہ اور کوئی عمل صالح گویا وہ جیتے جی ہی مرگیا اور خدائے تعالیٰ کی رحیمیت سے بکلی ناامید ہوگیا علیٰ ہذا القیاس یہ لوگ یوم الجزا پر جس کے رو سے خدائے تعالیٰ مالکِ یوم الدین کہلاتا ہے صحیح طور پر ایمان نہیں رکھتے اور جن طریقوں متذکرۂ بالا کے رو سے انسان اپنی سعادتِ عظمیٰ تک پہنچتا ہے یا شقاوتِ عظمیٰ میں پڑتا ہے اُس کامل سعادت اور شقاوت کے ظہور سے انکاری ہیں اور نجاتِ اُخروی کو صرف ایک خیالی اور وہمی طور پر سمجھ رہے ہیں بلکہ وہ نجاتِ ابدی کے قائل ہی نہیں ہیں اور اُن کا مقولہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ کے لیے نہ اِس جگہ آرام ہے اور نہ اُس جگہ اور نیز اُن کے زعم باطل میں دُنیا بھی آخرت کی طرح ایک کامل دار الجزا ہے جس کو دُنیا میں بہت سی دولت دی گئی وہ اُس کے نیک عملوں کے عوض میں کہ جو کسی پہلے جنم میں اُس نے کیے ہوں گے وہ دی گئی ہے اور اُس بات کا مستحق ہے کہ اسی دُنیا میں اپنے نفس امّارہ کی خواہشوں کے پورا کرنے میں اُس دولت کو خرچ کرے لیکن ظاہر ہے کہ اسی جہان میں خدائے تعالیٰ کا کسی کو اِس غرض سے دولت دینا کہ وہ اُس دولت کو فی الحقیقت اپنے اعمال کی جزا سمجھ کر کھانے پینے اور ہر طرح کی عیاشی کے لیے آلہ بناوے یہ ایک ایسا ناجائز فعل ہے کہ جس کو خدائے تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا نہایت درجہ کی بے ادبی ہے کیونکہ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گویا ہندوؤں کا پرمیشر آپ ہی لوگوں کو بدفعلی اور پلیدی میں ڈالنا چاہتا ہے اور قبل اِس کے جو اُن کا نفس پاک ہو نفسانی لذات کے وسیع دروازے اُن پر کھولتا ہے اور پہلے جنموں کے نیک عملوں کا اجر اُن کو یہ دیتا ہے کہ پچھلے جنم میں وہ ہر طرح کے اسباب تنعم پا کر اور نفس امّارہ کے پورے پورے تابع بن کر پھر تحت الثریٰ میں جا پڑیں اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے خیال میں یہ بھرا ہوا ہے کہ میرے ہاتھ میں جس قدر دولت اور مال اور حشمت اور حکومت ہے یہ میرے ہی اعمالِ سابقہ کا بدلہ ہے وہ کیا کچھ نفسِ امّارہ کی پیروی نہیں کریگا لیکن اگر وہ یہ سمجھتا کہ دُنیا دار الجزا نہیں ہے بلکہ دار الابتلاء ہے اور جو کچھ مجھ کو دیا گیا ہے وہ بطور ابتلاء اور آزمایش کے دیا گیا ہے تا یہ ظاہر کیا جاوے کہ میں کس طور پر اُس میں تصرف کرتا ہوں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو میری ملکیت یا میرا حق ہو تو ایسا سمجھنے سے وہ اپنی نجات اِس بات میں دیکھتا کہ اپنا تمام مال نیک مصارف میں خرچ کرے اور نیز وہ غایت درجہ کا شکر بھی کرتا کیونکہ وہی شخص دلی اخلاص اور محبت سے شکر کر سکتا ہے کہ جو سمجھتا ہے کہ میں نے مُفت پایا اور بغیر کسی استحقاق کے مجھ کو ملا ہے غرض آریا لوگوں کے نزدیک خدائے تعالیٰ نہ رب العلمین ہے نہ رحمان نہ رحیم اور نہ ابدی اور دائمی اور کامل جزا دینے پر قادر ہے۔

اب ہم یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ برہمو سماج والوں کا معارف مذکورہ بالا کی نسبت کیا حال ہے یعنی وہ ہر چہار

صداقتیں کہ جو ابھی مذکور ہوئی ہیں برہمو لوگ اُن پر ثابت قدم ہیں یا نہیں سو واضح ہو کہ برہمو لوگ اِن چاروں صداقتوں پر جیسا کہ چاہیئے ثبات اور قیام نہیں رکھتے بلکہ اُن معارفِ عالیہ کے کامل مفہوم پر اُن کو اطلاع ہی نہیں۔ اول خدا کا رب العالمین ہونا کہ جو ربوبیت تامہ سے مراد ہے برہمو لوگوں کی سمجھ اور عقل سے اب تک چھپا ہوا ہے اور وہ لوگ ربوبیتِ الہیہ کا دُنیا پر اِس سے زیادہ اثر نہیں سمجھتے کہ اُس نے کسی وقت یہ تمام عالم معہ اُس کی تمام قوتوں اور طاقتوں کے پیدا کیا ہے لیکن اب وہ تمام قوتیں اور طاقتیں مستقل طور پر اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں اور خدائے تعالیٰ کو قدرت نہیں ہے کہ اُن میں کچھ تصرف کرے یا کچھ تغیّر اور تبدّل ظہور میں لاوے اور اُن کے زعم باطل میں قوانینِ نیچریہ کی مستحکم اور پایدار بنیاد نے قادرِ مطلق کو معطّل اور بیکار کی طرح کر دیا ہے اور اُن میں تصرف کرنے کے لیے کوئی راہ اُس پر کُھلا نہیں اور ایسی کوئی بھی تدبیر اُس کو یاد نہیں جس سے وہ مثلاً کسی مادہ حار کو اُس کی تاثیر حرارت سے روک سکے یا کسی مادّہ بارد کو اُس کی برودت کے اثر سے بند کر سکے یا آگ میں اُس کی خاصیت احراق کی ظاہر نہ ہونے دے اور اگر اُس کو کوئی تدبیر یاد بھی ہے تو صرف اُنہیں حدود تک جن پر علم انسان کا محیط ہے اُس سے زیادہ نہیں یعنی جو کچھ محدود اور محصور طور پر کواِئف و خواص عالم کے متعلق انسان نے دریافت کیا ہے اور جو کچھ تا دمِ حال بشری تجارب کے احاطہ میں آچکا ہے یہیں تک خدا کی قدرتوں کی حد بست ہے اور اِس سے بڑھ کر اُس کی قدرتِ تامہ اور ربوبیّتِ عامہ کوئی کام نہیں کر سکتی گویا خدا کی قدرتیں اور حکمتیں ہمگی تمامی یہی ہیں جن کو انسان دریافت کر چکا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد ربوبیتِ تامہ اور قدرتِ کاملہ کے مفہوم سے بکلّی منافی ہے کیونکہ ربوبیّت تامہ اور قدرتِ کاملہ وہ ہے جو اُس ذات غیر محدود کی طرح غیر محدود ہے اور کوئی انسانی قاعدہ اور قانون اُس پر احاطہ نہیں کر سکتا۔

خدا کی قدرتوں کا حصر دعویٰ ہے خدائی کا نہیں محصور ہرگز راستہ قدرت نمائی کا

جاننا چاہیئے کہ جو امر غیر محدود اور غیر محصور ہے وہ کسی قانون کے اندر آ ہی نہیں سکتا کیونکہ جو چیز اول سے آخر تک قواعدِ معلومہ مفہومہ کے سلسلہ کے اندر داخل ہو اور کوئی جُزاُس کا اُس سلسلہ سے باہر نہ ہو اور نہ غیر معلوم اور نامفہوم ہو تو وہ چیز محدود ہوتی ہے اب اگر خدائے تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ و ربوبیتِ تامہ کو قوانینِ محدودہ محصورہ میں ہی منحصر سمجھا جائے تو جس چیز کو غیر محدود تسلیم کیا گیا ہے اُس کا محدود ہونا لازم آجائے گا پس برہمو سماج والوں کی یہی بھاری غلطی ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی غیر متناہی قدرتوں اور ربوبیتوں کو اپنے تنگ اور منقبض تجارب کے دائرہ میں گھسیڑنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جو اُمور ایک قانون مشخص مقرر کے نیچے آجائیں اُن کا مفہوم محدود ہونے کو لازم پڑا ہوا ہے اور جو حکمتیں اور قدرتیں ذات غیر محدود میں پائی جاتی ہیں اُن کا غیر محدود ہونا واجب ہے۔ کیا کوئی

دانا کہہ سکتا ہے کہ اُس ذاتِ قادرِ مطلق کو اِس اِس طور پر بنانا یاد ہے اور اِس سے زیادہ نہیں کیا اُس کی غیر متناہی قدرتیں انسانی قیاس کے پیمانہ سے وزن کی جا سکتی ہیں یا اُس کی قادرانہ اور غیر متناہی حکمتیں تصرف فی العالم سے کسی وقت عاجز ہو سکتی ہیں بلاشبہ اُس کا پُرزور ہاتھ ذرہ ذرہ پر قابض ہے اور کسی مخلوق کا قیام اور بقا اپنی مستحکم پیدایش کے موجب سے نہیں بلکہ اُسی کے سہارے اور آسرے سے ہے اور اُس کی ربانی طاقتوں کے آگے بے شمار میدان قدرتوں کے پڑے ہیں نہ اندرونی طور پر کسی جگہ انتہا ہے اور نہ بیرونی طور پر کوئی کنارہ ہے جس طرح یہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مشتعل آگ کی تیزی فرو کرنے کے لیے خارج میں کوئی ایسے اسباب پیدا کرے جن سے اُس آگ کی تیزی جاتی رہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اُس آگ کی خاصیت احراق دور کرنے کے لیے اُسی کے وجود میں کوئی ایسے اسباب پیدا کر دے جن سے خاصیت احراق دور ہو جائے کیونکہ اُس کی غیر متناہی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے کوئی بات انہونی نہیں اور جب ہم اُس کی حکمتوں اور قدرتوں کو غیر متناہی مان چکے ہیں تو ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کو بھی مان لیں کہ اُس کی تمام حکمتوں اور قدرتوں پر ہم کو علم حاصل ہونا ممتنع اور محال ہے سو ہم اُس کی ناپیدا کنار حکمتوں اور قدرتوں کے لیے کوئی قانون نہیں بنا سکتے اور جس چیز کی حدود ہمیں معلوم ہی نہیں اُس کی پیمایش کرنے سے ہم عاجز ہیں ہم بنی آدم کی دُنیا کا نہایت ہی تنگ اور چھوٹا سا دائرہ ہیں اور پھر اُس دائرہ کا بھی پورا پورا ہمیں علم حاصل نہیں پس اِس صورت میں ہماری نہایت ہی کم ظرفی اور سفاہت ہے کہ ہم اِس اقل قلیل پیمانہ سے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود حکمتوں اور قدرتوں کو ناپنے لگیں غرض خدائے تعالیٰ کی ربوبیت تامہ اور قدرتِ کاملہ کہ جو ذرّہ ذرّہ کے وجود اور بقا کے لیے ہر دم اور ہر لحظہ آبپاشی کر رہی ہے اور جس کے عمیق در عمیق تصرفات تعداد اور شمار سے باہر ہیں اُس ربوبیت تامہ سے برہمو سماج والے منکر ہیں ماسوا اِس کے برہمو سماج والے ربوبیت الیہ کو روحانی طور پر بھی تام اور کامل نہیں سمجھتے اور خدائے تعالیٰ کو اس قدرت سے عاجز اور درماندہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی ربوبیت تامہ کے تقاضا سے اپنا روشن اور لاریب فیہ کلام انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کرتا۔

اِسی طرح وہ خدائے تعالیٰ کی رحمانیت پر بھی کامل طور پر ایمان نہیں لاتے کیونکہ کامل رحمانیت یہ ہے کہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے ابدان کی تکمیل اور تربیت کے لیے تمام اسباب اپنے خاص دستِ قدرت سے ظاہر فرمائے ہیں اور اِس چند روزہ جسمانی آسایش کے لیے سورج اور چاند اور ہوا اور بادل وغیرہ صدہا چیزیں اپنے ہاتھ سے بنا دی ہیں اسی طرح اُس نے روحانی تکمیل اور تربیت کے لیے اور اُس عالم کی آسایش کے لیے جس کی شقاوت اور سعادت ابدی اور دائمی ہے روحانی نور یعنی اپنا پاک اور روشن کلام دُنیا کے انجام کے لیے بھیجا ہو اور جس علم کی مستعد روحوں کو ضرورت ہے وہ سب علم آپ عطا فرمایا ہو اور جن شکوک اور شبہات میں اُن کی ہلاکت ہے اِن سب شکوک سے آپ نجات

بخشی ہو لیکن اِس کامل رحمانیت کو برہمو سماج والے تسلیم نہیں کرتے اور اُن کے زعم میں گو خدا نے انسان کے شکم پُر کرنے کے لیے ہر یک طرح کی مدد کی اور کوئی دقیقہ تائید کا اُٹھا نہ رکھا مگر وہ مدد روحانی تربیت میں نہ کر سکا گویا خدا نے روحانی تربیت کے بارے میں جو اصلی اور حقیقی تربیت تھی دانستہ دریغ کیا اور اُس کے لیے ایسے زبردست اور قوی اور خاص اسباب پیدا نہ کیے جیسے اُس نے بدنی تربیت کے لیے پیدا کیے بلکہ انسان کو صرف اُسی کی عقل ناقص کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور کوئی ایسا کامل نور اپنی طرف سے اُس کی عقل کی امداد کے لیے پیدا نہ کیا جس سے عقل کی پُرغبار آنکھ روشن ہو کر سیدھا راستہ اختیار کرتی اور سہو اور غلطی کے مُہلک خطرات سے بچ جاتی۔ اسی طرح برہمو سماج والے خدائے تعالیٰ کی رحیمیت پر بھی کامل طور پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ کامل رحیمیت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ مستعد روحوں کو اُن کے فطرتی جوشوں کے مطابق اور اُن کے پُرجوش اخلاص کے اندازہ پر اور اُن کے صدق سے بھری ہوئی کوششوں کے مقدار پر معارف صافیہ غیر محجوبہ سے اُن کو ملبب کرے اور جس قدر وہ اپنے دلوں کو کھولیں اُسی قدر اُن کے لیے آسمانی دروازے کھولے جائیں اور جس قدر اُن کی پیاس بڑھتی جائے اُسی قدر اُن کو پانی بھی دیا جائے یہاں تک کہ وہ حق الیقین کے شربت خوشگوار سے سیراب ہو جائیں اور شک اور شبہ کی موت سے بکلی نجات حاصل ہو لیکن برہمو سماج والے اِس صداقت سے انکاری ہیں اور بقول اُن کے انسان کچھ ایسا بدقسمت ہے کہ گو کیسا ہی دلبر حقیقی کے وصال کے لیے تڑپا کرے اور گو اُس کی آنکھوں سے دریا بہ نکلے اور گو اُس یار عزیز کے لیے خاک میں مل جائے مگر وہ ہرگز نہ ملے۔ اور اُن کے نزدیک وہ کچھ ایسا سخت دل ہے کہ جس کو اپنے طالبوں پر رحم ہی نہیں اور اپنے خاص نشانوں سے ڈھونڈنے والوں کو تسلی نہیں بخشتا اور اپنے دلبرانہ تجلیات سے دردمندوں کا کچھ علاج نہیں کرتا بلکہ اُن کو اُنہیں کے خیالات میں آوارہ چھوڑتا ہے اور اِس سے زیادہ اُن کو کچھ بھی معرفت عطا نہیں کرتا کہ صرف اپنی اٹکلیں دوڑایا کریں اور اُنہیں اٹکلوں میں ہی ساری عمر کھو کر اپنی ظلمانی حالت میں ہی مر جائیں مگر کیا یہ سچ ہے کہ خداوند کریم ایسا ہی سخت دل ہے یا ایسا ہی بیرحم اور بخیل ہے یا ایسا ہی کمزور اور ناتوان ہے کہ ڈھونڈنے والوں کو سراسیمہ اور حیران چھوڑتا ہے اور کھٹکانے والوں پر اپنا دروازہ بند رکھتا ہے اور جو صدق سے اُس کی طرف دوڑتے ہیں اُن کی کمزوری پر رحم نہیں کرتا اور اُن کا ہاتھ نہیں پکڑتا اور اُن سچے طالبوں کو گڑھے میں گرنے دیتا ہے اور خود لطف فرما کر چند قدم آگے نہیں آتا اور اپنے جلوۂ خاص سے مُشکلات کے لمبے قصّہ کو کوتاہ نہیں کرتا سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ[1] اسی طرح برہمو سماج والے خدائے تعالیٰ کے مالک یوم الدین ہونے سے بھی بے خبر ہیں کیونکہ یوم الجزا کے مالک ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ملکیت تامہ کہ جو تجلیات عظمیٰ پر موقوف ہے ظہور میں آ کر پھر اُس ملکیت تامہ کی شان کے موافق پوری پوری جزا

---

[1] الانعام ۔ ع ۔ ۱۲ ۔

بندوں کو دی جائے یعنی اوّل اُس مالک حقیقی کی ملکیت تامہ کا ثبوت ایسے کامل الظہور مرتبہ پر ہو جائے کہ تمام اسباب معتادہ بکلّی درمیان سے اُٹھ جائیں اور زید و عمر کا دخل درمیان میں نہ رہے اور مالک واحد قہار کا وجود عریاں طور پر نظر آوے اور جب یہ معرفت کاملہ اپنا جلوہ دکھا چکی تو پھر جزا بھی بطور کامل ظہور میں آوے یعنی من حیث الورود بھی کامل ہو اور من حیث الوجود بھی۔ من حیث الورود اِس طرح پر کہ ہر یک جزا یاب کو جزا کے وارد ہونے کے ساتھ ہی یہ بات معلوم اور متحقق ہو کہ یہ فی الحقیقت اُس کے اعمال کی جزا ہے اور نیز یہ بھی متحقق ہو کہ اِس جزا کا وارد کنندہ فی الحقیقت کریم ہی ہے جو رب العالمین ہے کوئی دوسرا نہیں اور اِن دونوں باتوں میں ایسا تحقق ہو کہ کوئی اشتباہ درمیان نہ رہ جائے! اور من حیث الوجود اِس طرح پر کامل ہو کہ انسان کے دل اور روح اور ظاہر اور باطن اور جسم اور جان اور ہر یک روحانی اور بدنی قوت پر ایک دائرہ کی طرح محیط ہو جائے اور نیز دائمی اور لازوال اور غیر منقطع ہو تا وہ شخص جو نیکیوں میں سبقت لے گیا ہے اپنی اُس سعادتِ عظمیٰ کو کہ جو تمام سعادتوں کا انتہائی مرتبہ ہے اور وہ شخص کہ جو بدیوں میں سبقت لے گیا ہے اپنی اُس شقاوتِ عظمیٰ کو کہ جو تمام شقاوتوں کی آخری حد ہے پہنچ جائے اور تا ہر یک فریق اُس اعلیٰ درجہ کے مکافات کو پالے جو اُس کے لیے ممکن ہے یعنی اُس کامل اور دائمی مکافات کو پالے کہ جو اِس عالمِ بے بقا اور زوال پذیر میں جس کا تمام رنج و راحت موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے بمنصہ ظہور نہیں آسکتی بلکہ اُس کے کامل ظہور کے لیے مالکِ حقیقی نے اپنے لُطف کامل اور قہر عظیم کے دکھلانے کی غرض سے یعنی جمالی وجلالی صفتوں کی پوری پوری تجلی ظاہر کرنے کے قصد سے ایک اور عالم جو ابدی اور لازوال ہے مقرر کر رکھا ہے تا خدائے تعالیٰ میں جو صفت مجازات ہے جس کا کامل طور پر اِس منقبض اور فانی عالم میں ظہور نہیں ہوسکتا وہ اِس ابدی اور وسیع عالم میں ظہور پذیر ہو جائے اور تا اُن تجلیاتِ تامہ اور کاملہ سے انسان اُس اعلیٰ درجہ کے شہودِ تام تک بھی پہنچ جائے کہ جو اُس کی بشری طاقتوں کے لیے حدِ امکان میں داخل ہے اور چونکہ اعلیٰ درجہ کی مکافات عند العقل اِسی میں منحصر ہے کہ جو امر بطور جزا وارد ہے وہ انسان کے ظاہر و باطن و جسم و جان پر بتمام و کمال دائمی و لازمی طور پر محیط ہو جائے اور نیز اعلیٰ درجہ کا یقین مالکِ حقیقی کے وجود کی نسبت اسی بات پر موقوف ہے کہ وہ مالکِ حقیقی اسبابِ مُعتادہ کو بکلّی نیست و نابود کر کے عریاں طور پر جلوہ گر ہو۔ اِس لیے یہ صداقت قصوی جس سے مطلب انتہائی معرفت اور انتہائی مکافات ہے تبھی متحقق ہو گی کہ جب وہ تمام باتیں مذکورۂ بالا متحقق ہو جائیں کہ جو عند العقل اُس کی تعریف میں داخل ہیں کیونکہ انتہائی معرفت بجز اِس کے عند العقل ممکن نہیں کہ مالکِ حقیقی کا جمال بطور حق الیقین مشہود ہو یعنی ظہور اور بروز تام ہو جس پر زیادت متصوّر نہ ہو علیٰ ہذا القیاس انتہائی مکافات بھی بجز اِس کے عند العقل غیر ممکن ہے کہ جیسے جسم اور جان دونوں دُنیا کی زندگی میں مل کر فرماں بردار یا نافرمان اور سرکش تھے ایسا ہی مکافات کے وقت

وہ دونوں موردِ انعام ہوں یا دونوں سزا میں پکڑے جائیں اور مکافات کاملہ کا بحرِ مّواج یکساں ظاہر و باطن پر اپنے احاطۂ تام سے محیط اور مشتمل ہو جائے لیکن برہمو سماج والے اِس صداقت سے بھی انکاری ہیں بلکہ اِس صداقت قصویٰ کا وجود اُن کے نزدیک متحقّق ہی نہیں اور بزعم اُن کے انسان کی قسمت میں نہ انتہائی معرفت کا پانا مقدّر ہے نہ انتہائی مکافات کا۔ اور مکافات اُن کے نزدیک فقط ایک خیالی پلاؤ ہے جو صرف اپنے ہی بے بنیاد تصوّرات سے پکایا جائے گا نہ حقیقی طور پر کوئی جزا خدائے تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر وارد ہو گی نہ کوئی سزا بلکہ خود تراشیدہ خیالات ہی خوشحالی یا بدحالی کا موجب ہو جائیں گے اور کوئی ایسا ظاہری و باطنی امر نہیں ہوگا کہ جو خاص خدائے تعالیٰ کے ارادہ سے نیک بندوں پر بصورتِ نعمت اور بد بندوں پر بصورتِ عذاب اُترے گا پس اُن کا یہ مذہب نہیں ہے کہ امر مجازات کا خدا مالک ہے اور وہی اپنے نیک بندوں پر اپنے خاص ارادہ سے خوشحالی اور لذتِ دائمی کا فیضان کرے گا جس لذّت کاملہ کو سعید لوگ نہ صرف باطنی طور پر بلکہ صورِ مشہودہ اور محسوسہ میں بھی مشاہدہ کریں گے اور قُویٰ انسانیہ میں سے کوئی قوّت ظاہری ہو یا باطنی اپنے مناسب حال لذت اُٹھانے سے محروم نہیں رہے گی اور جسم اور جان دونوں راحت یا عذابِ اُخروی میں یعنی جیسی کہ صورت ہو شریک ہو جائیں گے غرض برہمو سماج والوں کا اعتقاد بالکل اِس صداقت کے برخلاف اور اِس کے مفہومِ کامل کے منافی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی کور باطنی سے نجاتِ اُخروی کے جسمانی سامان کو کہ جو ظاہری قوتوں کے مناسب حال سعادتِ عظمیٰ کی تکمیل کے لیے قرآنِ شریف میں بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح عذابِ اُخروی کے جسمانی سامان کو کہ جو ظاہری قوّتوں کے مناسب حال شقاوتِ عظمیٰ کی تکمیل کے لیے فرقانِ مجید میں مُندرج ہے موردِ اعتراض سمجھتے ہیں مگر ایسی سمجھ پر پتھر پڑیں کہ جو ایک بدیہی اور کامل صداقت کو عیب کی صورت میں تصوّر کیا جائے افسوس یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ سعادتِ عظمیٰ یا شقاوتِ عظمیٰ کے پانے کے لیے یہی ایک طریق ہے کہ خدائے تعالیٰ توجّہ خاص فرما کر امرِ مکافات کو کامل طور پر نازل کرے اور کامل طور پر نازل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ وہ مکافات تمام ظاہر و باطن پر مستولیٰ ہو جائے اور کوئی ایسی ظاہری یا باطنی قوّت باقی نہ رہے جس کو اُس مکافات سے حصہ نہ پہنچا ہو یہ وہی مکافاتِ عظیمہ کا انتہائی مرتبہ ہے جس کو فرقانِ مجید نے دوسرے لفظوں میں بہشت اور دوزخ کے نام سے تعبیر کیا ہے اور اپنی کامل اور روشن کتاب میں بتلا دیا ہے کہ وہ بہشت اور دوزخ روحانی اور جسمانی دونوں قسم کے مکافات پر کامل طور پر مشتمل ہے اور اُن دونوں قسموں کو کتابِ ممدوح میں مفصّل طور پر بیان فرمایا ہے اور سعادتِ عظمیٰ اور شقاوتِ عظمیٰ کی حقیقت کو بخوبی کھول دیا ہے مگر جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اِس صداقتِ قصویٰ اور نیز دوسری گذشتہ بالا صداقتوں سے برہمو سماج والے ناآشنا محض ہیں۔ (براہین احمدیہ حاشیہ ۱۱ صفحہ ۳۸۲ تا ۴۳۸)

ثُمَّ اِنَّ فَيْضَ الرُّبُوْبِيَّةِ اَعَمُّ وَاَكْمَلُ وَاَتَمُّ مِنْ كُلِّ فَيْضٍ يُتَصَوَّرُ فِي الْاَفْئِدَةِ۔ اَوْ يَجْرِيْ ذِكْرُهٗ عَلَى الْاَلْسِنَةِ۔ ثُمَّ بَعْدَهٗ فَيْضٌ عَامٌّ وَّقَدْ خُصَّ بِالنُّفُوْسِ الْحَيَوَانِيَّةِ وَالْاِنْسَانِيَّةِ وَهُوَ فَيْضُ صِفَةِ الرَّحْمَانِيَّةِ۔ وَذَكَرَهُ اللّٰهُ بِقَوْلِهٖ اَلرَّحْمٰنِ وَخَصَّهٗ بِذَوِي الرُّوْحِ مِنْ دُوْنِ الْاَجْسَامِ الْجَمَادِيَّةِ وَالنَّبَاتِيَّةِ۔ ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ فَيْضٌ خَاصٌّ وَّهُوَ فَيْضُ صِفَةِ الرَّحِيْمِيَّةِ۔ وَلَا يَنْزِلُ هٰذَا الْفَيْضُ اِلَّا عَلَى النَّفْسِ الَّتِيْ سَعٰى سَعْيَهَا لِكَسْبِ الْفُيُوْضِ الْمُتَرَقَّبَةِ۔ وَلِذَالِكَ يَخْتَصُّ بِالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَطَاعُوْا رَبًّا كَرِيْمًا۔ كَمَا صُرِّحَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى "وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا"[1] فَثَبَتَ بِنَصِّ الْقُرْاٰنِ۔ اَنَّ الرَّحِيْمِيَّةَ مَخْصُوْصَةٌ بِاَهْلِ الْاِيْمَانِ۔ وَاَمَّا الرَّحْمَانِيَّةُ فَقَدْ وَسِعَتْ كُلَّ حَيَوَانٍ مِّنَ الْحَيَوَانَاتِ۔ حَتّٰى اِنَّ الشَّيْطَانَ نَالَ نَصِيْبًا مِّنْهَا بِاَمْرِ حَضْرَةِ رَبِّ الْكَائِنَاتِ۔ وَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ الرَّحِيْمِيَّةَ تَتَعَلَّقُ بِفُيُوْضٍ تَتَرَتَّبُ عَلَى الْاَعْمَالِ وَيَخْتَصُّ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ دُوْنِ الْكَافِرِيْنَ وَاَهْلِ الضَّلَالِ ثُمَّ بَعْدَ الرَّحِيْمِيَّةِ فَيْضٌ اٰخَرُ وَهُوَ فَيْضُ الْجَزَاءِ الْاَتَمِّ وَالْمُكَافَاةِ۔ وَاِيْصَالُ الصَّالِحِيْنَ اِلٰى

پھر ربوبیت کا فیض ہر اس فیض سے جس کا دلوں میں تصور کیا جا سکے یا جس کا ذکر زبانوں پر جاری ہو زیادہ وسیع، زیادہ کامل اور زیادہ جامع ہے۔ پھر اس کے بعد ایک فیض عام ہے اور وہ حیوانوں اور انسانوں سے مخصوص ہے۔ اور وہ صفت رحمانیت کا فیض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنے قول اَلرَّحْمٰن میں کیا ہے۔ اور اسے جمادی اور نباتی اجسام کو چھوڑ کر صرف جاندار چیزوں سے وابستہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد ایک فیض خاص ہے اور وہ صفت رحیمیت کا فیض ہے۔ اور یہ فیض صرف اسی انسان پر نازل ہوتا ہے جو فیوض منتظرہ کے حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش کرے۔ اس وجہ سے یہ فیض انہی لوگوں سے مخصوص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور انہوں نے رب کریم کی اطاعت کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا[2] میں تصریح کر دی گئی ہے۔ پس نص قرآن سے ثابت ہوا کہ رحیمیت صرف ایمانداروں سے مخصوص ہے۔ مگر رحمانیت کا دائرہ حیوانات میں سے ہر حیوان تک وسیع ہے۔ یہاں تک کہ شیطان نے بھی پروردگار عالم کے حکم سے اس فیض رحمانیت سے حصہ پایا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ رحیمیت ان فیوض سے تعلق رکھتی ہے جو اعمال پر مترتب ہوتے ہیں۔ اور کافروں اور گمراہوں کو چھوڑ کر یہ صرف مومنوں سے خاص ہے۔ پھر رحیمیت کے بعد ایک اور فیض ہے اور وہ جزائے کامل اور بدلہ دینے کا فیض ہے اور نیک لوگوں کو ان کی نیکیوں اور اعمال حسنہ کے نتیجہ تک پہنچانے

[1] الاحزاب ۴۴ ؛ [2] اور وہ مومنوں پر بار بار رحم کرنے والا ہے۔

نَتِیجَةُ الصَّالِحَاتِ وَالْحَسَنَاتِ۔ وَاِلَیْهِ اَشَارَ عَزَّ اسْمُهٗ بِقَوْلِهٖ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ وَاِنَّهٗ اٰخِرُ الْفُیُوْضِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ وَمَا ذُکِرَ فَیْضٌ بَعْدَهٗ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ اَعْلَمِ الْعَالِمِیْنَ۔

وَالْفَرْقُ فِیْ هٰذَا الْفَیْضِ وَفَیْضِ الرَّحِیْمِیَّةِ۔ اَنَّ الرَّحِیْمِیَّةَ تُبَلِّغُ السَّالِكَ اِلٰی مَقَامٍ هُوَ وَسِیْلَةُ النِّعْمَةِ۔ وَاَمَّا فَیْضُ الْمَالِکِیَّةِ بِالْمُجَازَاةِ۔ فَهُوَ یُبَلِّغُ السَّالِكَ اِلٰی نَفْسِ النِّعْمَةِ وَاِلٰی مُنْتَهَی الثَّمَرَاتِ وَغَایَةِ الْمُرَادَاتِ وَاَقْصَی الْمَقْصُوْدَاتِ۔ فَلَا خَفَآءَ اَنَّ هٰذَا الْفَیْضَ هُوَ اٰخِرُ الْفُیُوْضِ مِنَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِیَّةِ وَلِلنَّشْاَةِ الْاِنْسَانِیَّةِ کَالْعِلَّةِ الْغَائِیَّةِ۔ وَعَلَیْهِ یَتِمُّ النِّعَمُ کُلُّهَا وَتَسْتَکْمِلُ بِهٖ دَآئِرَةُ الْمَعْرِفَةِ وَدَآئِرَةُ السِّلْسِلَةِ۔ اَلَا تَرٰی اَنَّ سِلْسِلَةَ خُلَفَآءِ مُوْسٰی انْتَهَتْ اِلٰی نُکْتَةِ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ فَظَهَرَ عِیْسٰی فِیْ اٰخِرِهَا وَبُدِّلَ الْجَوْرُ وَالظُّلْمُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ مِنْ غَیْرِ حَرْبٍ وَّمُحَارِبِیْنَ۔ کَمَا یُفْهَمُ مِنْ لَّفْظِ الدِّیْنِ فَاِنَّهٗ جَآءَ بِمَعْنَی الْحِلْمِ وَالرِّفْقِ فِیْ لُغَةِ الْعَرَبِ وَعِنْدَ اُدَبَآئِهِمْ اَجْمَعِیْنَ فَاقْتَضَتْ مُمَاثَلَةُ نَبِیِّنَا بِمُوْسَی الْکَلِیْمِ۔ وَمُشَابَهَةُ خُلَفَآءِ مُوْسٰی بِخُلَفَآءِ

کا نام ہے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مالکِ یومِ الدین میں اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ فیض پروردگارِ عالم کی طرف سے آخری فیض ہے۔ اور اس کے بعد سب عالموں سے زیادہ علم رکھنے والے خدا کی کتاب میں کسی اور فیض کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اِس فیض اور رحیمیت کے فیض میں یہ فرق ہے کہ رحیمیت سالک کو اس مقام تک پہنچاتی ہے جو نعمت ملنے کا وسیلہ ہے باقی رہا جزا سزا کے مالک کا فیض، سو وہ سالک کو حقیقی نعمت اور آخری ثمرہ اور مرادوں کی انتہا اور مقاصد کی آخری حد تک پہنچا دیتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ بارگاہ ایزدی کے فیوض میں سے یہ انتہائی فیض ہے اور انسانی پیدائش کی علت غائی ہے۔ اور اسی پر تمام نعمتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اور اس پر دائرہ معرفت اور دائرہ سلسلہ مکمل ہوجاتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خلفائے موسیٰ کا سلسلہ مالکِ یومِ الدین کے نکتہ پر ختم ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ کے آخر میں حضرت عیسیٰ آئے اور ظلم و جور کو بغیر کسی لڑائی اور لڑنے والوں کے عدل و احسان سے بدل دیا گیا۔ جیسا کہ الدّین کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ لغت عرب اور اہل عرب کے سب ادیبوں کے نزدیک یہ لفظ بردباری اور نرمی کے معنوں میں آیا ہے۔ پس ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موسیٰ کلیم اللہ سے مماثلت اور خلفائے موسیٰ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا سے مشابہت نے چاہا کہ اس سلسلہ

نَبِیِّنَا الْکَرِیْمِ - اَنْ یَّظْھَرَ فِیْ اٰخِرِ ھٰذِہِ السِّلْسِلَۃِ رَجُلٌ یُّشَابِہُ الْمَسِیْحَ وَ یَدْعُوْ اِلَی اللّٰہِ بِالْحِلْمِ وَیَضَعُ الْحَرْبَ وَیَقْرِبُ السَّیْفَ الْمُجِیْحَ فَیَحْشُرُ النَّاسَ بِالْاٰیَاتِ مِنَ الرَّحْمَانِ لَا بِالسَّیْفِ وَ السِّنَانِ - فَیُشَابِہُ زَمَانُہٗ زَمَانَ الْقِیَامَۃِ وَیَوْمَ الدِّیْنِ وَالنُّشُوْرِ - وَیَمْلَأُ الْاَرْضَ نُوْرًا کَمَا مُلِئَتْ بِالْجَوْرِ وَ الزُّوْرِ - وَقَدْ کَتَبَ اللّٰہُ اَنَّہٗ یُرِیْ نَمُوْذَجَ یَوْمِ الدِّیْنِ قَبْلَ یَوْمِ الدِّیْنِ - وَ یَحْشُرُ النَّاسَ بَعْدَ مَوْتِ التَّقْوٰی وَذَالِکَ وَقْتُ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَھُوَ زَمَانُ ھٰذَا الْمِسْکِیْنِ - وَاِلَیْہِ اَشَارَ فِیْ اٰیَۃِ یَوْمِ الدِّیْنِ - فَلْیَتَدَبَّرْ مَنْ کَانَ مِنَ الْمُتَدَبِّرِیْنَ - وَحَاصِلُ الْکَلَامِ اَنَّ فِیْ ھٰذِہِ الصِّفَاتِ الَّتِیْ خُصَّتْ بِاللّٰہِ ذِی الْفَضْلِ وَالْاِحْسَانِ حَقِیْقَۃً مَّخْفِیَّۃً وَّ نَبَأً مَّکْتُوْمًا مِّنَ اللّٰہِ الْمَنَّانِ - وَھُوَ اَنَّہٗ تَعَالٰی اَرَادَ بِذِکْرِھَا اَنْ یُّنْبِئَ رَسُوْلَہٗ بِحَقِیْقَۃِ ھٰذِہِ الصِّفَاتِ فَاَرٰی حَقِیْقَتَھَا بِاَنْوَاعِ التَّائِیْدَاتِ - فَرَبَّی نَبِیَّہٗ وَصَحَابَتَہٗ فَاَثْبَتَ بِھَا اَنَّہٗ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ - ثُمَّ اَتَمَّ عَلَیْھِمْ نَعْمَاءَہٗ بِرَحْمَانِیَّتِہٖ مِنْ غَیْرِ عَمَلِ الْعَامِلِیْنَ -

---

(محمدی) کے آخر میں بھی کوئی ایسا مرد کامل پیدا ہو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مثیل ہو اور وہ (لوگوں کو) نرمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے ۔ جنگ کو موقوف کرے ، تباہی پھیلانے والی تلوار کو نیام میں کرے اور لوگوں کو تلوار اور نیزہ کی بجائے خدائے رحمان کے چمکتے ہوئے نشانوں سے ایک نئی زندگی عطا کرے ۔ پس اس کا زمانہ روز قیامت اور یوم جزا و حشر و نشر سے مشابہت رکھتا ہے ۔ اور وہ زمین کو نور سے بھر دیگا جیسا کہ وہ اس سے پہلے ظلم اور جھوٹ سے بھری ہوئی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کر رکھا ہے کہ وہ حقیقی یوم الجزاء سے پہلے لوگوں کو اس کا نمونہ دکھائے اور تقویٰ کے مرجانے کے بعد لوگوں کو نئی زندگی بخشے اور یہی مسیح موعود کا زمانہ ہے ۔ اور وہ (درحقیقت) اس عاجز کا (ہی) زمانہ ہے ۔ اور اس کی طرف (اللہ تعالیٰ نے) آیت یَوْمِ الدِّیْن میں اشارہ کیا ہے پس تدبّر کرنے والے اس بات میں تدبر کریں ۔ اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان صفات میں جو فضل و احسان کے مالک اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہیں ان میں خدا تعالیٰ محسن حقیقی کی طرف سے ایک حقیقت مخفی ہے اور ایک پیشگوئی پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ان صفات کے بیان کرنے سے خدا تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ اپنے رسول (مقبول) کو ان صفات کی حقیقت سے آگاہ کرے اور کئی قسم کی تائیدات کے ذریعہ ان کی حقیقت واضح کرے ۔ پس اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے صحابہؓ کی (خاص رنگ میں) تربیت فرمائی ۔ اور اس کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے ۔ پھر اپنی صفت رحمانیت کے ذریعہ جو بغیر کسی عامل کے عمل کے ظاہر ہوتی ہے ان پر اپنے انعامات

فَاَثْبَتَ بِهَا اَنَّهٗ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔ ثُمَّ اَرَاهُمْ عِنْدَ عَمَلِهِمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ اَيَادِیَ حِمَايَتِهٖ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ بِعِنَايَتِهٖ۔ وَوَهَبَ لَهُمْ نُفُوْسًا مُّطْمَئِنَّةً۔ وَّاَنْزَلَ عَلَيْهِمْ سَكِيْنَةً دَآئِمَةً۔ ثُمَّ اَرَادَ اَنْ يُّرِيَهُمْ نَمُوْذَجَ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ فَوَهَبَ لَهُمُ الْمُلْكَ وَالْخِلَافَةَ وَاَلْحَقَ اَعْدَآءَهُمْ بِالْهَالِكِيْنَ۔ وَاَهْلَكَ الْكَافِرِيْنَ وَ اَزْعَجَهُمْ اِزْعَاجًا۔ ثُمَّ اَرٰى نَمُوْذَجَ النُّشُوْرِ فَاَخْرَجَ مِنَ الْقُبُوْرِ اِخْرَاجًا فَدَخَلُوْا فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا وَّبَدَرُوْا اِلَيْهِ فُرَادٰى وَاَزْوَاجًا۔ فَرَءَى الصَّحَابَةُ اَمْوَاتًا يُّلْفُوْنَ حَيَاتًا وَّرَاَوْا بَعْدَ الْمَحْلِ مَآءً ثَجَّاجًا۔ وَّسُمِّیَ ذٰلِكَ الزَّمَانُ يَوْمَ الدِّيْنِ۔ لِاَنَّ الْحَقَّ حَصْحَصَ فِيْهِ وَدَخَلَ فِی الدِّيْنِ اَفْوَاجٌ مِّنَ الْكَافِرِيْنَ۔ ثُمَّ اَرَادَ اَنْ يُّرِیَ نَمُوْذَجَ هٰذِهِ الصِّفَاتِ فِیْ اٰخِرِيْنَ مِنَ الْاُمَّةِ لِيَكُوْنَ اٰخِرُ الْمِلَّةِ كَمِثْلِ اَوَّلِهَا فِی الْكَيْفِيَّةِ۔ وَلِيَتِمَّ اَمْرُ الْمُشَابَهَةِ بِالْاُمَمِ السَّابِقَةِ۔ كَمَا اُشِيْرَ اِلَيْهِ فِیْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ اَعْنِیْ قَوْلَهٗ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فَتَدَبَّرْ اَلْفَاظَ هٰذِهِ الْاٰيَةِ۔ وَسُمِّیَ زَمَانُ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ يَوْمَ الدِّيْنِ لِاَنَّهٗ زَمَانٌ يُّحْيِی

کو انتہا تک پہنچایا اور اس فیض کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ وہ ارحم الرحمین ہے۔ پھر اُس نے اپنی صفت رحیمیت کے ذریعہ ان کے عمل کے وقت میں انہیں اپنی حمایت کے ہاتھ دکھائے اور اپنی مہربانی سے روح القدس کے ساتھ ان کی مدد کی۔ ان کو نفوس مطمئنہ عطا فرمائے اور ان پر دائمی سکینت نازل کی۔ پھر اس نے ارادہ کیا کہ انہیں اپنی صفت مالکِ یوم الدّین کا نمونہ بھی دکھائے تو اُس نے انہیں حکومت اور خلافت بخشی اور ان کے دشمنوں کو (پہلے) ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ملا دیا۔ کافروں کو تباہ کر دیا اور انہیں پوری طرح ملیا میٹ کر دیا۔ پھر اس نے حشر کا نمونہ دکھایا اور (روحانی لحاظ سے) قبروں میں پڑے ہوئے لوگوں کو باہر نکالا پس وہ فوج در فوج اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اور اس کی طرف فرداً فرداً اور گروہ در گروہ دوڑ پڑے۔ پس صحابہؓ نے مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا، اور امساک باراں کے بعد موسلا دھار بارش دیکھی اور اس زمانہ کا نام یوم الدّین رکھا گیا۔ کیونکہ اس (زمانہ) میں حق ظاہر ہو گیا اور کافروں میں سے فوج در فوج لوگ دین (اسلام) میں داخل ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ امت (محمدیہ) کے آخری دور میں بھی ان صفات کا نمونہ دکھائے، تا بلحاظ کیفیت ملّت کا آخری حصّہ پہلے حصّہ کی طرح ہو جائے اور تا گذشتہ امتوں کے ساتھ (اس امت کی) مشابہت پوری ہو جائے۔ جس کی طرف اس سورت میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی ارشاد باری تعالیٰ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں۔ پس اس آیت کے الفاظ پر غور کریں۔ مسیح موعود کے زمانہ کا نام اس لیے بھی یوم الدین رکھا گیا کہ یہ ایسا زمانہ ہے جس میں دین کو زندہ کیا

فِيْهِ الدِّيْنُ - وَتُحْشَرُ النَّاسُ لِيُقْبِلُوْا بِالْيَقِيْنِ - وَلَا شَكَّ وَلَا خِلَافَ أَنَّهُ رَبّٰى زَمَانَنَا هٰذَا بِأَنْوَاعِ التَّرْبِيَةِ وَأَرَانَا كَثِيْرًا مِّنْ فُيُوْضِ الرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ. كَمَا أَرَى السَّابِقِيْنَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالرُّسُلِ وَأَرْبَابِ الْوَلَايَةِ وَالْخُلَّةِ وَ بَقِيَتِ الصِّفَةُ الرَّابِعَةُ مِنْ هٰذِهِ الصِّفَاتِ أَعْنِي التَّجَلِّي الَّذِيْ يَظْهَرُ فِيْ حُلَّةِ مَلِكٍ أَوْ مَالِكٍ فِيْ يَوْمِ الدِّيْنِ لِلْمُجَازَاةِ - فَجَعَلَهُ لِلْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ كَالْمُعْجِزَاتِ وَجَعَلَهُ حَكَمًا وَّمَظْهَرًا لِّلْحُكُوْمَةِ السَّمَاوِيَّةِ بِتَائِيْدٍ مِّنَ الْغَيْبِ وَالْاٰيَاتِ - وَسَتَعْلَمُ عِنْدَ تَفْسِيْرِ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ هٰذِهِ الْحَقِيْقَةَ - وَمَا قُلْتُ مِنْ عِنْدِ نَفْسِيْ بَلْ أُعْطِيْتُ مِنْ لَّدُنْ رَّبِّيْ هٰذِهِ النِّكَاتِ الدَّقِيْقَةَ. وَمَنْ تَدَبَّرَهَا حَقَّ التَّدَبُّرِ وَفَكَّرَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ عَلِمَ أَنَّ اللّٰهَ أَخْبَرَ فِيْهَا عَنِ الْمَسِيْحِ وَمِنْ زَمَنِهِ الَّذِيْ هُوَ زَمَنُ الْبَرَكَاتِ. ثُمَّ اعْلَمْ أَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ قَدْ وَقَعَتْ كَحَدٍّ مُّعَرِّفٍ لِّلّٰهِ خَالِقِ الْكَائِنَاتِ وَإِنْ كَانَ اللّٰهُ تَعَالٰى ذَاتُهُ عَنِ التَّحْدِيْدَاتِ - وَمِنْ هٰذَا التَّعْلِيْمِ وَالْإِفَادَةِ يَتَّضِحُ مَعْنٰى كَلِمَةِ

جائے گا اور لوگوں کو اس امر پر مجتمع کیا جائے گا کہ وہ (دلی) یقین کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اور اس میں نہ کوئی شبہ ہے اور نہ ہی (کسی کو) کچھ اختلاف (ہو سکتا) ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس زمانہ کی کئی طریق سے تربیت فرمائی ہے اور رحمانیت اور رحیمیت کے بہت سے فیوض ہمیں دکھائے ہیں جیسا کہ اس نے پہلے نبیوں، رسولوں، ولیوں اور اپنے دوستوں کو دکھائے تھے۔

ان صفات میں سے اب صرف چوتھی صفت باقی رہ گئی۔ میری مراد اس سے خدا تعالیٰ کی وہ تجلی ہے جس کا ظہور بادشاہ یا مالک کے لباس میں جزا سزا دینے کے لیے یوم جزا میں ہوگا۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے اس (تجلّی) کو مسیح موعود کے لیے معجزات کی طرح قرار دیا اور اُسے (مسیح موعود کو) غیبی تائید اور چمکتے نشانوں کے ساتھ حکم اور آسمانی حکومت کا نمائندہ بنایا۔ اے مخاطب تجھے عنقریب اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر کے موقع پر اس حقیقت کا علم ہو جائے گا اور مَیں نے یہ باتیں اپنے پاس سے نہیں کہیں بلکہ یہ باریک نکات مجھے اپنے رب کی طرف سے عطا کیے گئے ہیں۔ جو شخص ان (نکات) میں پورا تدبر کریگا اور ان آیات میں غور و فکر سے کام لے گا اُسے معلوم ہو جائے گا کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے مسیح موعود اور اس کے زمانہ کے متعلق خبر دی ہے جو بڑا بابرکت ہے۔ پھر واضح رہے کہ یہ آیات گویا خدا تعالیٰ خالق کائنات کے لیے حدّ معرّف کی طرح ہیں۔ اگرچہ خدا تعالیٰ کی ذات (درحقیقت) ہر قسم کی تحدید سے بالا ہے۔ اس تشریح سے کلمہ شہادت کے معنے بھی واضح

الشَّهَادَةِ الَّتِيْ هِيَ مَنَاطُ الْإِيْمَانِ وَالسَّعَادَةِ - وَبِهٰذِهِ الصِّفَاتِ اسْتَحَقَّ اللّٰهُ
الطَّاعَةَ وَخُصَّ بِالْعِبَادَةِ - فَإِنَّهٗ يُنَزِّلُ هٰذِهِ الْفُيُوْضَ بِالْإِرَادَةِ - فَإِنَّكَ إِذَا
قُلْتَ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَمَعْنَاهُ عِنْدَ ذَوِي الْحَصَاةِ أَنَّ الْعِبَادَةَ لَا يَجُوْزُ لِأَحَدٍ
مِّنَ الْمَعْبُوْدِيْنَ أَوِ الْمَعْبُوْدَاتِ إِلَّا لِذَاتٍ غَيْرِ مُدْرَكَةٍ مُّسْتَجْمِعَةٍ لِّهٰذِهِ
الصِّفَاتِ أَعْنِي الرَّحْمَانِيَّةَ وَالرَّحِيْمِيَّةَ اللَّتَيْنِ هُمَا أَوَّلُ شَرْطٍ لِّمَوْجُوْدٍ
مُّسْتَحِقٍّ لِّلْعِبَادَاتِ - ثُمَّ اعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ اسْمٌ جَامِدٌ لَّا تُدْرَكُ حَقِيْقَتُهٗ لِأَنَّهٗ
اسْمُ الذَّاتِ - وَالذَّاتُ لَيْسَتْ مِنَ الْمُدْرَكَاتِ - وَكُلُّ مَا يُقَالُ فِيْ مَعْنَاهُ
فَهُوَ مِنْ قَبِيْلِ الْأَبَاطِيْلِ وَالْخُزَعْبِيْلَاتِ - فَإِنَّ كُنْهَ الْبَارِئِ أَرْفَعُ مِنَ
الْخَيَالَاتِ وَأَبْعَدُ مِنَ الْقِيَاسَاتِ - وَإِذَا قُلْتَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَمَعْنَاهُ أَنَّ
مُحَمَّدًا مَّظْهَرُ صِفَاتِ هٰذِهِ الذَّاتِ وَخَلِيْفَتُهَا فِي الْكَمَالَاتِ وَمُتَمِّمُ دَائِرَةِ
الظِّلِّيَّةِ وَخَاتَمُ الرِّسَالَاتِ - فَحَاصِلُ مَا أُبْصِرُ وَأَرٰى أَنَّ نَبِيَّنَا خَيْرُ الْوَرٰى
قَدْ وَرِثَ صِفَتَيْ رَبِّنَا الْأَعْلٰى - ثُمَّ وَرِثَ الصَّحَابَةُ الْحَقِيْقَةَ الْمُحَمَّدِيَّةَ الْجَلَالِيَّةَ

ہو جاتے ہیں جس پر ایمان اور سعادت کا دارومدار ہے - اور انہی صفات کی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اطاعت کا مستحق
ہو گیا ہے - اور عبادت کے لیے مخصوص ہو گیا کیونکہ وہ ان فیوض کو ارادۃً نازل فرماتا ہے پس جب تم لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے ہو
تو عقلمندوں کے نزدیک اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ دیوی دیوتاؤں میں سے کسی کی بھی عبادت جائز نہیں عبادت صرف اس ذات
کی ہونی چاہیئے جو ادراک سے بالا اور ان صفات کی جامع ہے - اس جگہ میری مراد رحمانیت اور رحیمیت سے ہے جو کہ
عبادتوں کے مستحق وجود کی پہلی شرط ہیں - پھر جان لو کہ اللہ اسم جامد ہے اور اسکی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اسم ذات
ہے اور ذات ایسے امور میں سے نہیں جن کا ادراک ہو سکے - لفظ اللہ کو مشتق قرار دے کر جو معنے کیے جاتے ہیں وہ سب
جھوٹ اور محض خرافات ہیں - کیونکہ خدا تعالیٰ کی کنہ (حقیقت) کا پانا تمام خیالات سے بالا اور قیاسات سے دُور ہے -
جب تم محمد رسول اللہ کہتے ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ذات باری کی صفات کے مظہر ہیں
کمالات میں اس کے جانشین ہیں اور دائرہ ظلیت کو کامل کرنے والے اور سب رسالتوں کے خاتم ہیں - پس جو کچھ میں
دیکھتا اور پاتا ہوں اس کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے افضل ہیں وہ اللہ تعالیٰ
کی ان ہر دو صفتوں کے وارث ہوئے پھر جیسا کہ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں صحابہؓ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالی حقیقت کے

كَمَا عَرَفْتَ فِيْمَا مَضٰى۔ وَقَدْ سُلِّمَ سَيْفُهُمْ فِيْ قَطْعِ دَابِرِ الْمُشْرِكِيْنَ وَلَهُمْ ذِكْرٌ لَّا يُنْسٰى عِنْدَ عَبَدَةِ الْمَخْلُوْقِيْنَ۔ وَاِنَّهُمْ اَدَّوْا حَقَّ صِفَةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ۔ وَاَذَاقُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الْاَيْدِيْ لَحْرْبِيَّةِ۔ وَبَقِيَتْ بَعْدَ ذَالِكَ صِفَةُ الْاَحْمَدِيَّةِ الَّتِيْ مُصَبَّغَةٌ بِالْاَلْوَانِ الْجَمَالِيَّةِ مُحَرَّقَةٌ بِالنِّيْرَانِ الْمُحِبِّيَّةِ۔ فَوَرِثَهَا الْمَسِيْحُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْ زَمَنِ انْقِطَاعِ الْاَسْبَابِ وَتَكَسُّرِ الْمِلَّةِ مِنَ الْاَنْيَابِ۔ وَفُقْدَانِ الْاَنْصَارِ وَالْاَحْبَابِ وَغَلَبَةِ الْاَعْدَآءِ وَصَوْلِ الْاَحْزَابِ۔ لِيُرِيَ اللّٰهُ نَمُوْذَجَ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ بَعْدَ لَيَالِي الظَّلَامِ وَبَعْدَ انْهِدَامِ قُوَّةِ الْاِسْلَامِ وَسَطْوَةِ السَّلَاطِيْنِ۔ وَبَعْدَ كَوْنِ الْمِلَّةِ كَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ۔ فَالْيَوْمَ صَارَ دِيْنُنَا كَالْغُرَبَآءِ وَمَا بَقِيَتْ لَهٗ سَلْطَنَةٌ اِلَّا فِي السَّمَآءِ۔ وَمَا عَرَفَهٗ اَهْلُ الْاَرْضِ فَقَامُوْا عَلَيْهِ كَالْاَعْدَآءِ۔ فَاُرْسِلَ عِنْدَ هٰذَا الضُّعْفِ وَذَهَابِ الشَّوْكَةِ عَبْدٌ مِّنَ الْعِبَادِ لِيَتَعَهَّدَ زَمَانًا مَّاحِلًا تَعَهُّدَ الْعِهَادِ۔ وَذَالِكَ هُوَ الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ الَّذِيْ جَآءَ عِنْدَ ضُعْفِ الْاِسْلَامِ لِيُرِيَ اللّٰهُ نَمُوْذَجَ الْحَشْرِ وَالْبَعْثِ وَالْقِيَامِ وَنَمُوْذَجَ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اِنْعَامًا مِّنْهُ بَعْدَ

وارث بنے۔ اور مشرکوں کا قلع قمع کرنے میں ان کی تلوار کی دھاک مسلّم ہے اوران کی یاد ایسا امر ہے کہ مخلوق کے پجاری اسے بُھلا نہیں سکتے۔ انہوں نے صفت محمدیت کا پورا پورا حق ادا کردیا ہے اور انہوں نے بہتوں کو اپنے جنگی کارناموں کا مزا چکھایا۔ اب رہی صفتِ احمدیت جو جمالی رنگوں سے رنگین ہے اور عشق و محبت کی آگ سے سوختہ ہے۔ سو مسیح موعود اس صفت (احمدیت) کا وارث ہوا، جو ذرائع (ترقی) کے خاتمہ، دشمنوں کی کچلیوں سے ملّت کی بربادی اور مددگاروں اور دوستوں کے معدوم ہونے اور دشمنوں کے غلبہ اور مخالف جماعتوں کے حملہ کے وقت مبعوث کیا گیا تا اللہ تعالیٰ اندھیری راتوں کے بعد اسلام کی قوت اور (مسلمان) سلاطین کے رعب کے مٹنے کے بعد اور ملّت محمدیہ کے اپاہجوں کی مانند ہو جانے کے بعد اپنی مالکیت یوم الدین کا نمونہ دکھائے۔ پس آج ہمارا دین بے وطنوں کی طرح ہوگیا۔ اس کی حکومت سوائے آسمان کے اورکہیں باقی نہیں رہی (اس وقت کے) اہل زمین نے اس کو نہیں پہچانا۔ اور اس کے خلاف دشمنوں کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پس اس ضعف اور شان و شوکت کے مٹنے کے وقت (خدا تعالیٰ کے) بندوں میں سے ایک بندہ مبعوث کیا گیا۔ تا وہ اس (روحانی پانی کے) قحط زدہ زمانہ کو بارش کی طرح سیراب کرے پس یہ وہی مسیح موعود ہے جو اسلام کے ضعف کے وقت آیا ہے۔ تا اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے لوگوں کو جب کہ وہ چوپایوں کی طرح (روحانی) موت مر چکے تھے

مَوْتِ النَّاسِ کَالْاَنْعَامِ۔ فَاعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْیَوْمَ یَوْمُ الدِّیْنِ۔ وَسَتَعْرِفُ صِدْقَنَا وَلَوْ بَعْدَ حِیْنٍ۔ وَھٰھُنَا نُکْتَۃٌ کَشْفِیَّۃٌ لَّیْسَتْ مِنَ الْمَسْمُوْعِ۔ فَاسْمَعْ مُصْغِیًا وَّعَلَیْکَ بِالْمَوْدُوْعِ۔ وَھُوَ اَنَّہٗ تَعَالٰی مَا اخْتَارَ لِنَفْسِہٖ ھٰھُنَا اَرْبَعَۃً مِّنَ الصِّفَاتِ اِلَّا لِیُرِیَ نَمُوْذَجَھَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا قَبْلَ الْمَمَاتِ۔ فَاَشَارَ فِیْ قَوْلِہٖ "لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ[4]" اِلٰی اَنَّ ھٰذَا النَّمُوْذَجَ یُعْطٰی لِصَدْرِ الْاِسْلَامِ۔ ثُمَّ لِلْاٰخَرِیْنَ مِنَ الْاُمَّۃِ الدَّاخِرَۃِ۔ وَکَذَالِکَ قَالَ فِیْ مَقَامٍ اٰخَرَ وَھُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِیْنَ "ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ"[5]۔ فَقَسَّمَ زَمَانَ الْھِدَایَۃِ وَالْعَوْنِ وَالنُّصْرَۃِ اِلٰی زَمَانِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِلَی الزَّمَانِ الْاٰخِرِ الَّذِیْ ھُوَ زَمَانُ مَسِیْحِ ھٰذِہِ الْمِلَّۃِ۔ وَکَذَالِکَ قَالَ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[6] فَاَشَارَ اِلَی الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَجَمَاعَتِہٖ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ۔ فَثَبَتَ بِنُصُوْصٍ بَیِّنَۃٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اَنَّ ھٰذِہِ الصِّفَاتِ قَدْ

حشر و نشر اور بعث بعد الموت، قیامت اور جزا سزا کے دن کا نمونہ دکھائے۔ پس جان لو کہ یہی زمانہ یوم الدین ہے اور تم یقیناً ہماری سچائی کو جان لو گے۔ اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی سہی۔

یہاں ایک کشفی نکتہ ہے جو پہلے کبھی نہیں سنا گیا۔ پس کان لگا کر اطمینان سے سنو اور وہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی ذات کے لیے چار صفات کو محض اس لیے اختیار کیا ہے کہ تا وہ اس دنیا میں ہی انسان کو (یعنی دنیا کی) موت سے پہلے ان صفات کا نمونہ دکھائے۔ پس اُس نے اپنے کلام لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ[4] میں اشارہ فرمایا کہ یہ نمونہ آغاز اسلام میں بھی عطا کیا جائے گا۔ اور پھر امت کی خواری کے بعد اس کے آخری لوگوں کو بھی عطا کیا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ (قرآن میں) فرمایا ہے اور وہ بات کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ سچا ہے ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ[5]۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہدایت، مدد اور نصرت کے زمانہ کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر اور اس آخری زمانہ پر جو اس امت کے مسیح کا زمانہ ہے تقسیم کر دیا۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[6] اس میں مسیح موعود، اس کی جماعت اور ان کے تابعین کی طرف اشارہ

---

[1] القصص ع ۷۔ [2] الواقعۃ ع ۱۔ [3] الجمعۃ ع ۱۔ [4] ابتدائے آفرینش میں بھی وہی تعریف کا مستحق تھا اور آخرت میں بھی وہی تعریف کا مستحق ہوگا۔ [5] اصحاب الیمین کا یہ گروہ شروع میں ایمان لانے والے لوگوں میں بھی کثرت سے ہوگا۔ اور آخر میں ایمان لانے والے لوگوں میں بھی کثرت سے ہوگا۔ [6] ترجمہ: اور اسی طرح ان کے سوا ایک دوسری قوم میں بھی (وہ اس کو بھیجے گا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملی۔

ظَهَرَتْ فِیْ زَمَنِ نَبِیِّنَا ثُمَّ تَظْهَرُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ۔ وَهُوَ زَمَانٌ یَکْثُرُ فِیْهِ الْفِسْقُ وَ الْفَسَادُ۔ وَیَقِلُّ الصَّلَاحُ وَالسَّدَادُ۔ وَیُجَاحُ الْاِسْلَامُ کَمَا تُجَاحُ الدَّوْحَۃُ۔ وَیَصِیْرُ الْاِسْلَامُ کَسَلِیْمٍ لَدَغَتْهُ الْحَیَّۃُ وَیَصِیْرُ الْمُسْلِمُوْنَ کَاَنَّهُمُ الْمَیْتَۃُ۔ وَیُدَاسُ الدِّیْنُ تَحْتَ الدَّوَاثِرِ الْهَائِلَۃِ وَالنَّوَازِلِ النَّازِلَۃِ السَّائِلَۃِ۔ وَکَذَالِكَ تَرَوْنَ فِیْ هٰذَا الزَّمَانِ۔ وَتُشَاهِدُوْنَ اَنْوَاعَ الْفِسْقِ وَالْکُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالطُّغْیَانِ وَتَرَوْنَ کَیْفَ کَثُرَ الْمُفْسِدُوْنَ۔ وَقَلَّ الْمُصْلِحُوْنَ الْمُوَاسُوْنَ۔ وَکَانَ لِلشَّرِیْعَۃِ اَنْ تُعْدَمَ وَاَنَ لِلْمِلَّۃِ اَنْ تُکْتَمَ۔ وَهٰذَا بَلَاءٌ قَدْ دَهَمَ وَعَنَاءٌ قَدْ هَجَمَ۔ وَشَرٌّ قَدْ نَجَمَ وَنَارٌ اَحْرَقَتِ الْعَرَبَ وَالْعَجَمَ۔ وَمَعَ ذَالِكَ لَیْسَ وَقْتُنَا وَقْتَ الْجِهَادِ وَلَا زَمَنَ الْمُرْهَفَاتِ الْحِدَادِ۔ وَلَا اَوَانَ ضَرْبِ الْاَعْنَاقِ وَالتَّقْرِیْنِ فِی الْاَصْفَادِ۔ وَلَا زَمَانَ قَوْدِ اَهْلِ الضَّلَالِ فِی السَّلَاسِلِ وَالْاَغْلَالِ وَاِجْرَاءِ اَحْکَامِ الْقَتْلِ وَالْاِغْتِیَالِ۔ فَاِنَّ الْوَقْتَ وَقْتُ غَلَبَۃِ الْکَافِرِیْنَ وَاِقْبَالِهِمْ۔ وَضُرِبَتِ الذِّلَّۃُ عَلَی الْمُسْلِمِیْنَ بِاَعْمَالِهِمْ۔ وَکَیْفَ الْجِهَادُ وَلَا یُمْنَعُ اَحَدٌ مِّنَ الصَّوْمِ وَالصَّلٰوۃِ وَلَا الْحَجِّ وَالزَّکٰوۃِ۔

فرمایا ہے پس قرآن کریم کی نصوص بیّنہ سے ثابت ہوا کہ یہ صفات ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوئیں پھر آخری زمانہ میں بھی ظاہر ہوں گی۔ اور آخری زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں بدکاری اور ہر قسم کی خرابیاں بکثرت پھیل جائیں گی اور راستی اور راستبازی بہت ہی کم ہو جائے گی۔ اسلام کی ایسی بیخ کنی ہو گی جیسا کہ درخت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جاتا ہے۔ اور اسلام ایک ایسے شخص کی طرح ہو جائے گا جسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔ مسلمانوں کی یہ حالت ہو جائے گی کہ گویا کہ وہ مُردے ہیں اور (ان کا) دین خوفناک حوادث اور دوسری متواتر نازل ہونے والی مصائب کے نیچے کچلا جائے گا اور یہی حال تم اس زمانہ میں دیکھ رہے ہو۔ اور تم انواع و اقسام کے فسق، کفر، شرک اور سرکشی کا مشاہدہ کر رہے ہو اور دیکھ رہے ہو کہ کس طرح مفسد زیادہ ہو گئے ہیں اور مصلح اور غمخوار کم ہو گئے ہیں۔ اور قریب ہے کہ شریعت نابود ہو جائے اور ملّت پوشیدہ ہو جائے یہ ایسی مصیبت ہے جو ناگہاں وارد ہوئی ہے۔ ایسی بپتا ہے جو ٹوٹ پڑی ہے۔ ایسی بدی ہے جو یکدم پھوٹ پڑی ہے اور ایسی آگ ہے جس نے عرب و عجم کو جلا دیا ہے۔ بایں ہمہ ہمارا زمانہ جہاد کا زمانہ نہیں اور نہ تیز تلواروں کا زمانہ ہے۔ نہ گردنیں مارنے اور زنجیروں میں جکڑنے کا وقت ہے۔ نہ ہی گمراہوں کو زنجیروں اور طوقوں میں گھسیٹنے اور اُن پر قتل اور ہلاکت کے احکام جاری کرنے کا زمانہ ہے۔ یہ زمانہ کافروں کے غلبہ اور ان کے عروج کا زمانہ ہے اور مسلمانوں پر اُن کے اعمال کی وجہ سے ذلّت مسلط کر دی گئی ہے۔ اب جہاد (بالسیف) کیوں کیا جائے جب کہ (اس زمانہ میں) نہ کسی کو نماز اور

وَلَا مِنَ الْعِفَّةِ وَالتُّقَاةِ - وَمَا سَلَّ كَافِرٌ سَيْفًا عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ لِيَرْتَدُّوْا اَوْ يَجْعَلَهُمْ عِضِيْنَ - فَمِنَ الْعَدْلِ اَنْ يُّسَلَّ الْحُسَامُ بِالْحُسَامِ وَالْاَقْلَامُ بِالْاَقْلَامِ - وَاِنَّا لَا نَبْكِيْ عَلٰى جِرَاحَاتِ السَّيْفِ وَالسِّنَانِ وَاِنَّمَا نَبْكِيْ عَلٰى اَكَاذِيْبِ اللِّسَانِ - فَبِالْاَكَاذِيْبِ كُذِّبَتْ صُحُفُ اللّٰهِ وَاُخْفِيَ اَسْرَارُهَا - وَصِيْلَ عَلٰى عِمَارَةِ الْمِلَّةِ وَهُدِمَ دَارُهَا - فَصَارَتْ كَمَدِيْنَةٍ نُقِضَ اَسْوَارُهَا اَوْ حَدِيْقَةٍ اُحْرِقَ اَشْجَارُهَا - اَوْ بُسْتَانٍ اُتْلِفَ زَهْرُهَا وَثِمَارُهَا وَسُقِطَ اَنْوَارُهَا - اَوْ بَلْدَةٍ طَيِّبَةٍ غِيْضَ اَنْهَارُهَا اَوْ قُصُوْرٍ مُّشَيَّدَةٍ عُفِيَ اٰثَارُهَا وَمَزَّقَهَا الْمُمَزِّقُوْنَ - وَقِيْلَ مَاتَتْ وَنَعَى النَّاعُوْنَ وَ طُبِعَتْ اَخْبَارُهَا وَاَشَاعَهَا الْمُشِيْعُوْنَ - وَلِكُلِّ كَمَالٍ زَوَالٌ وَّلِكُلِّ تَرَعْرُعٍ اِضْمِحْلَالٌ - كَمَا تَرٰى اَنَّ السَّيْلَ اِذَا وَصَلَ اِلَى الْجَبَلِ الرَّاسِيْ وَقَفَ - وَاللَّيْلَ اِذَا بَلَغَ اِلَى الصُّبْحِ الْمُسْفِرِ انْكَشَفَ - كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى ”وَ الَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ“[1]

روزہ سے روکا جاتا ہے نہ حج اور زکوٰۃ سے اور نہ پاک دامنی اور پرہیزگاری سے اور نہ ہی کسی کافر نے مسلمانوں کو مرتد کرنے یا انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ان پر تلوار سونتی ہے۔ انصاف تو یہ ہے کہ تلوار کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی جائے اور قلموں کے مقابلہ میں قلمیں۔ ہم آج تلوار اور نیزے کے زخموں پر نہیں روتے۔ ہم تو (ان کی) زبانوں سے پھیلائی ہوئی مفتریات پر روتے ہیں۔ (اس زمانہ میں) انہی مفتریات سے اللہ کے صحیفوں کو جھٹلایا گیا اور ان کے اسرار پر پردے ڈالے گئے ملت (اسلامیہ) کی عمارت پر حملہ کیا گیا اور اس کے گھر کو مسمار کر دیا گیا۔ پس یہ (ملت) ایک ایسے شہر کی مانند ہوگئی ہے جس کی فصیلیں ٹوٹ گئی ہوں یا ایسے باغیچہ کی طرح ہے جس کے درخت جلا دیئے گئے ہوں یا ایسے باغ کی مانند ہے جس کے پھول اور پھل برباد کر دیئے گئے ہوں اور اس کے شگوفے توڑ کر پھینک دیئے گئے ہوں یا ایسے ملک کی مانند ہے جو کبھی بہت برکتوں والا تھا لیکن اب اس کی نہریں خشک ہو چکی ہوں یا ایسے مضبوط محلّات کی مانند ہے جن کے نشان تک مٹا دیئے گئے ہوں۔ برباد کرنے والوں نے انہیں پارہ پارہ کر دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ وہ (ملت) مر چکی ہے اور اس کی موت کی خبر دینے والوں نے اس کی موت کی خبر دے دی ہو۔ اس کے حالات چھپ چکے ہوں اور شائع کرنے والوں نے انہیں شائع کر دیا ہو۔ بے شک ہر کمال کے لیے زوال ہے اور ہر جوانی نے (ایک دن) ڈھلنا ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے جب سیلاب کسی مستحکم پہاڑ تک پہنچتا ہے وہیں رُک جاتا ہے اور رات جب پو پھٹنے کے قریب پہنچتی ہے (اس کی تاریکی خود بخود) چھٹ جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ[2] پس اللہ تعالیٰ نے رات کے اندھیروں کی انتہا کے بعد

[1] التکویر۔ رکوع ۱۔ [2] ترجمہ: اور رات جب وہ خاتمہ کو پہنچ جاتی ہے اور صبح جب وہ روشن ہو جاتی ہے۔

فَجَعَلَ تَنَفُّسَ الصُّبْحِ كَاَمْرٍ لَّازِمٍ بَعْدَ كَمَالِ ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ۔ وَكَذَالِكَ فِيْ قَوْلِهٖ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ [1] جُعِلَ كَمَالُ السَّيْلِ دَلِيْلَ زَوَالِ السَّيْلِ۔ فَاَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّرُدَّ اِلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَّامَهُمُ الْاُوْلٰى۔ وَاَنْ يُّرِيَهُمْ اَنَّهٗ رَبُّهُمْ وَاَنَّهُ الرَّحْمٰنُ وَالرَّحِيْمُ وَ مَالِكُ يَوْمٍ فِيْهِ يُجْزٰى وَيُبْعَثُ فِيْهِ الْمَوْتٰى۔ وَاَنَّكُمْ تَرَوْنَ فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ رُبُوْبِيَّةَ اللّٰهِ الْمَنَّانِ۔ وَرَحْمَانِيَّتَهٗ لِلْاِنْسَانِ وَالْحَيْوَانِ الَّتِيْ تَتَعَلَّقُ بِالْاَبْدَانِ۔ وَتَرَوْنَ اَنَّهٗ كَيْفَ خَلَقَ اَسْبَابًا جَدِيْدَةً وَّوَسَآئِلَ مُفِيْدَةً وَّصَنَآئِعَ لَمْ يُرَ مِثْلُهَا فِيْمَا مَضٰى وَعَجَآئِبَ لَمْ يُوْجَدْ مِثْلُهَا فِي الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى۔ وَتَرَوْنَ تَجَدُّدًا فِيْ كُلِّ مَا يَتَعَلَّقُ بِالْمُسَافِرِ وَالنَّزِيْلِ وَالْمُقِيْمِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَالصَّحِيْحِ وَالْعَلِيْلِ وَالْمُحَارِبِ وَالْمُصَالِحِ الْمُقِيْلِ وَالْاِقَامَةِ وَالرَّحِيْلِ۔ وَجَمِيْعِ اَنْوَاعِ النَّعْمَآءِ وَالْعَرَاقِيْلِ كَاَنَّ الدُّنْيَا بُدِّلَتْ كُلَّ التَّبْدِيْلِ۔ فَلَا شَكَّ اَنَّهَا رُبُوْبِيَّةٌ عُظْمٰى وَرَحْمَانِيَّةٌ كُبْرٰى وَكَذَالِكَ تَرَى الرُّبُوْبِيَّةَ وَالرَّحْمَانِيَّةَ وَالرَّحِيْمِيَّةَ فِي الْاُمُوْرِ الدِّيْنِيَّةِ۔ وَقَدْ يُسِّرَ كُلُّ اَمْرٍ لِطُلَبَآءِ الْعُلُوْمِ الْاِلٰهِيَّةِ وَيُسِّرَ اَمْرُ التَّبْلِيْغِ وَاَمْرُ اِشَاعَةِ الْعُلُوْمِ

صبح کے ظہور کو ایک لازمی امر قرار دیا ہے۔ اوراسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے قول یَا اَرْضُ ابْلَعِیْ میں سیلاب کے کمال کو سیلاب کے زوال کی علامت قرار دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ مومنوں پر ان کا پہلا زمانہ لوٹا دے اوران کو دکھائے کہ وہ ان کا رب ہے اور یہ کہ وہ رحمان اور رحیم ہے اور اس دن کا مالک ہے جب جزا سزا دی جائے گی اور اس میں مُردوں کو (زندہ کرکے) اٹھایا جائیگا۔ اس زمانہ میں تم محسن خدا کی ربوبیت اور انسانوں اور حیوانوں کے لیے اس کی ایسی رحمانیت نمایاں دیکھ رہے ہو جو اجسام سے تعلق رکھتی ہے اور تم پاتے ہو کہ اس نے کس طرح نئے نئے ذرائع اور مفید وسائل پیدا کیے ہیں۔ ایسی صنعتیں جن کی مثال گذشتہ زمانوں میں نہیں دیکھی گئی ایسے عجائبات (پیدا کیے ہیں) جن کا نمونہ قرونِ اولیٰ میں نہیں پایا جاتا اور تمہیں اس زمانہ کی تمام چیزوں میں ایک جدت دکھائی دے رہی ہے جو مسافر یا قیام پذیر، سکونتی یا پردیسی، تندرست یا بیمار، جنگجو یا معاف کرنے والے صلح جُو۔ قیام یا کُوچ کی حالت اور تمام قسم کی نعمتوں اور مشکلات سے تعلق رکھتی ہے گویا آج دنیا مکمل طور پر بدل دی گئی ہے۔ بیشک یہ عظیم ربوبیت اور اعلیٰ رحمانیت (کا فیض) ہے اِسی طرح تم دینی معاملات میں بھی ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت (کے فیوض) دیکھو گے۔ یقیناً علوم الٰہیہ کے طالبوں کے لیے ہر بات آسان کردی گئی ہے اور تبلیغ کا کام اور روحانی علوم کی اشاعت کا کام

---

[1] ھود ع ۴ ؛ [1] ترجمہ: اے زمین تو اب اپنے پانی کو نگل جا۔

الرُّوْحَانِيَّةِ۔ وَاُنْزِلَتِ الْاٰيَاتُ لِكُلِّ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَيَبْتَغِى السَّكِيْنَةَ مِنَ الْحَضْرَةِ۔ وَانْكَسَفَ الْقَمَرُ وَالشَّمْسُ فِىْ رَمَضَانَ وَعُطِّلَتِ الْعِشَارُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا اِلَّا بِالنُّدْرَةِ۔ وَسَوْفَ تَرَى الْمَرْكَبَ الْجَدِيْدَ فِىْ سَبِيْلِ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ۔ وَاُبِّدَ الْعَالِمُوْنَ وَالطَّالِبُوْنَ بِكَثْرَةِ الْكُتُبِ وَاَنْوَاعِ اَسْبَابِ الْمَعْرِفَةِ وَعُمِّرَ الْمَسَاجِدُ وَحُفِظَ السَّاجِدُ۔ وَفُتِحَ اَبْوَابُ الْاَمْنِ وَالتَّبْلِيْغِ وَالدَّعْوَةِ۔ وَمَا هُوَ اِلَّا فَيْضُ الرَّحِيْمِيَّةِ۔ فَوَجَبَ عَلَيْنَا اَنْ نَّشْهَدَ اَنَّهَا وَسَائِلُ لَا يُوْجَدُ نَظِيْرُهَا فِى الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى۔ وَاَنَّهٗ تَوْفِيْقٌ وَّتَيْسِيْرٌ مَّا سَمِعَ نَظِيْرَهٗ اُذُنٌ وَمَا رَاٰى مِثْلَهٗ بَصَرٌ فَانْظُرْ اِلٰى رَحِيْمِيَّةِ رَبِّنَا الْاَعْلٰى۔ وَمِنْ رَّحِيْمِيَّتِهٖ اَنَّا قَدَرْنَا عَلٰى اَنْ نَّطْبَعَ كُتُبَ دِيْنِنَا فِىْ اَيَّامٍ مَّا كَانَ مِنْ قَبْلُ فِىْ وُسْعِ الْاَوَّلِيْنَ اَنْ يَّكْتُبُوْهَا فِىْ اَعْوَامٍ۔ وَاِنَّا نَقْدِرُ عَلٰى اَنْ نَّطَّلِعَ عَلٰى اَخْبَارِ اَقْصَى الْاَرْضِ فِىْ سَاعَاتٍ[1] وَمَا قَدَرَ عَلَيْهِ السَّابِقُوْنَ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ وَبَذْلِ الْجُهْدِ اِلٰى سَنَوَاتٍ وَّقَدْ فُتِحَ عَلَيْنَا فِىْ كُلِّ خَيْرٍ اَبْوَابٌ

بھی آسان بنا دیا گیا ہے اور ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اس کی بارگاہ سے اطمینان قلب کا متلاشی ہے کھلی کھلی نشانیاں اتاری گئی ہیں۔ چاند اور سورج کو رمضان کے مہینہ میں گرہن لگ چکا ہے۔ اونٹنیاں بیکار کردی گئی ہیں اور سوائے شاذ و نادر کے ان سے تیز رفتاری کا کام نہیں لیا جاتا۔ کچھ عرصہ کے بعد تم مدینہ اور مکّہ کے رستہ میں بھی نئی سواری دیکھ لوگے اور علماء اور طلباء کے لیے کتابوں کی کثرت اور حصول علم اور معرفت کے بہت سے ذرائع مہیا کیے گئے ہیں۔ مسجدیں آباد کی گئی ہیں اور عبادت گذاروں کی حفاظت کی گئی ہے اور امن اور دعوت و تبلیغ کے دروازے کھل گئے ہیں اور یہ سب رحیمیت ہی کا فیضان ہے۔ پس ہم پر واجب ہے کہ ہم گواہی دیں کہ یہ وہ وسائل و ذرائع ہیں جن کی مثال پہلے زمانوں میں نہیں ملتی اور یہ ایسی توفیق اور آسانی میسّر آگئی ہے جس کی نظیر نہ کبھی کانوں نے سُنی اور نہ ہی اس کا نمونہ آنکھوں نے کبھی دیکھا پس تم ہمارے ربّ اعلیٰ کی رحیمیت (کی شان) ملاحظہ کرو۔ یہ اسی کی رحیمیت (کی ہی برکت) ہے کہ ہمارے لیے ممکن ہوگیا ہے کہ چند دنوں میں ہی اپنے مذہب کی اس قدر کتابیں طبع کردیں جو اس سے قبل ہمارے بزرگ (کئی) سالوں میں بھی نہیں لکھ سکتے تھے اور اب ہمیں یہ بھی مقدرت ہے کہ ہم دور دور کے ملکوں کی خبریں (چند) گھنٹوں میں معلوم کرلیں[2] جن کا حصول ہم سے پہلے لوگوں کے لیے سالہا سال تک اپنی جانوں کو مشقت میں ڈالنے اور بڑی کوشش کے

[1] الحاشية۔ كَمَا قَالَ تَعَالٰى يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ منه (الزلزال ع)

[2] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ یعنی اس دن وہ (زمین) اپنی (ساری ہی پوشیدہ) خبریں بیان کردیگی۔

الرُّبُوْبِيَّةِ وَالرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ۔ وَكَثُرَتْ طُرُقُهَا حَتّٰى خَرَجَ إِحْصَآءُهَا مِنَ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ۔ وَاَيْنَ تَيَسَّرَ هٰذَا لِلسَّابِقِيْنَ مِنْ اَهْلِ التَّبْلِيْغِ وَالدَّعْوَةِ۔ وَاَنَّ الْاَرْضَ زُلْزِلَتْ لَنَا زِلْزَالًا۔ فَاَخْرَجَتْ اَثْقَالًا۔ وَفُجِّرَتِ الْاَنْهَارُ وَسُجِّرَتِ الْبِحَارُ۔ وَجُدِّدَتِ الْمَرَاكِبُ وَعُطِّلَتِ الْعِشَارُ۔ وَاَنَّ السَّابِقِيْنَ مَا رَءَوْا كَمِثْلِ مَا رَءَيْنَا مِنَ النَّعْمَآءِ وَفِيْ كُلِّ قَدَمٍ نِّعْمَةٌ وَّقَدْ خَرَجَتْ مِنَ الْاِحْصَآءِ۔ وَمَعَ ذَالِكَ كَثُرَتْ مَوْتُ الْقُلُوْبِ وَقَسَاوَةُ الْاَفْئِدَةِ۔ كَاَنَّ النَّاسَ كُلَّهُمْ مَاتُوْا وَلَمْ يَبْقَ فِيْهِمْ رُوْحُ الْمَعْرِفَةِ۔ اِلَّا قَلِيْلٌ اِلَّذِيْ هُوَ كَالْمَعْدُوْمِ مِنَ النُّدْرَةِ۔ وَاِنَّا فَهِمْنَا مِمَّا ذَكَرْنَا مِنْ ظُهُوْرِ الصِّفَاتِ۔ وَتَجَلِّي الرُّبُوْبِيَّةِ وَالرَّحْمَانِيَّةِ وَالرَّحِيْمِيَّةِ كَمِثْلِ الْاٰيَاتِ۔ ثُمَّ مِنْ كَثْرَةِ الْاَمْوَاتِ وَمَوْتِ النَّاسِ مِنْ سَمِّ الضَّلَالَاتِ۔ اَنَّ يَوْمَ الْحَشْرِ وَالنَّشْرِ قَرِيْبٌ بَلْ عَلَى الْبَابِ۔ كَمَا هُوَ ظَاهِرٌ مِّنْ ظُهُوْرِ الْعَلَامَاتِ وَالْاَسْبَابِ۔ فَاِنَّ الرُّبُوْبِيَّةَ وَالرَّحْمَانِيَّةَ وَالرَّحِيْمِيَّةَ تَمَوَّجَتْ كَتَمَوُّجِ الْبِحَارِ۔ وَظَهَرَتْ وَتَوَاتَرَتْ وَجَرَتْ كَالْاَنْهَارِ۔ فَلَا شَكَّ اَنَّ وَقْتَ الْحَشْرِ وَ

بغیر ممکن نہیں ہو سکا۔ یقیناً ہر بھلائی کے (حاصل کرنے کے) لیے ہم پر ربوبیت۔ رحمانیت اور رحیمیت کے دروازے کھل گئے ہیں اور اس کے لیے اس قدر زیادہ راستے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کا شمار انسانی طاقت سے باہر ہے پہلے دعوت و تبلیغ کرنے والوں کو یہ (آسانیاں) کہاں میسر تھیں پس زمین ہماری خاطر خوب جھنجوڑی گئی ہے اور اس نے اپنے بوجھ (یعنی خزانے) باہر نکال پھینکے ہیں۔ نہریں جاری کی گئی ہیں۔ دریا خشک کر دیئے گئے ہیں نئی نئی سواریاں نکل آئی ہیں اور اونٹنیاں بیکار ہو گئی ہیں۔ ہمارے پہلوں نے ایسی نعمتیں نہیں دیکھی تھیں جو ہم نے دیکھی ہیں۔ ہر قدم پر ایک نئی نعمت (موجود) ہے اور یہ (نعمتیں) حد شمار سے باہر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی دلوں کی موت اور ان کی سختی بہت بڑھ گئی ہے گویا کہ تمام لوگ مر چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شناخت کرنے کی روح ان میں باقی نہیں رہی سوائے بہت کم لوگوں کے جو شاذ و نادر ہونے کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر ہیں پس ان صفات کے ظہور سے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کی روشن نشانوں کی طرح تجلّی سے اور پھر کثرت اموات اور گمراہیوں کے زہر سے لوگوں کے مرنے سے ہم نے جان لیا ہے کہ حشر و نشر کا دن قریب ہے بلکہ دروازے پر ہے جیسا کہ ان علامات اور اسباب کے ظہور سے واضح ہو گیا ہے کیونکہ ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت سمندروں کے جوش مارنے کی طرح موجزن ہیں اور ظاہر ہو چکی ہیں اور پے در پے نازل ہو رہی ہیں اور دریاؤں کی طرح جاری ہیں۔ لہٰذا بلا شبہ اب حشر و نشر کا وقت آ گیا ہے۔ یہ سنت اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (کے وقت) میں بھی ہو گذری ہے۔ پس بلا شبہ یہ زمانہ یوم الدین ہے یوم حشر ہے

النُّشُوْرِ قَدْ اَتٰی ۔ وَقَدْ مَضَتْ هٰذِهِ السُّنَّةُ فِیْ صَحَابَةِ خَیْرِ الْوَرٰی ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذَا الْیَوْمَ یَوْمُ الدِّیْنِ وَیَوْمُ الْحَشْرِ وَیَوْمُ مَالِكِیَّةِ رَبِّ السَّمَآءِ وَظُهُوْرِ اٰثَارِهَا عَلٰی قُلُوْبِ اَهْلِ الْاَرَضِیْنَ ۔ وَلَا شَكَّ اَنَّ الْیَوْمَ یَوْمُ الْمَسِیْحِ الْحَکَمِ مِنَ اللّٰهِ اَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ ۔ وَاَنَّهٗ حَشْرٌ بَعْدَ هَلَاكِ النَّاسِ وَقَدْ مَضٰی نَمُوْذَجُهٗ فِیْ زَمَنِ عِیْسٰی وَزَمَنِ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ ۔ فَتَدَبَّرْ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ ؁

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۶ تا صفحہ ۱۵۱)

قرآن کریم نے جو سورۃ فاتحہ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ اسماء سے شروع کیا تو اس میں کیا راز تھا۔ چونکہ بعض قومیں اللہ تعالیٰ کی ہستی پھر اس کی صفات رب۔ رحیم۔ مالک یوم الدین سے منکر تھیں اس لیے اس طرز کو لیا۔ یہ یاد رکھو کہ جس نے قرآن کریم کے الفاظ اور فقرات کو جو قانونی ہیں ہاتھ میں نہیں لیا اُس نے قرآن کا قدر نہیں سمجھا۔ (الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

سورۃ الفاتحہ میں جو خدا تعالیٰ کی یہ چار صفات بیان ہوئی ہیں کہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ اگرچہ عام طور پر یہ صفات اس عالم پر تجلّی کرتی ہیں لیکن ان کے اندر حقیقت میں پیشگوئیاں ہیں جن پر کہ لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں صفتوں کا نمونہ دکھایا کیونکہ کوئی حقیقت بغیر نمونہ کے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ربّ العالمین کی صفت نے کس طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں نمونہ دکھایا آپ نے عین ضعف میں پرورش پائی کوئی موقع مدرسہ مکتب نہ تھا جہاں آپ اپنے روحانی اور دینی قویٰ کو نشوونما دے سکتے۔ کبھی کسی تعلیم یافتہ قوم سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا نہ کسی موٹی سوٹی تعلیم کا ہی موقع پایا اور نہ فلسفہ کے باریک اور دقیق علوم کے حاصل کرنے کی فرصت ملی۔ پھر دیکھو کہ باوجود ایسے مواقع کے نہ ملنے کے قرآن شریف ایک ایسی نعمت آپ کو دی گئی جس کے علوم عالیہ اور حقّہ کے سامنے کسی اَور علم کی ہستی ہی کچھ

آسمانوں کے ربّ کی مالکیت اور اس (مالکیت) کے آثار اہل زمین کے دلوں پر ظاہر ہونے کا دن ہے اور (اس امر میں بھی) کوئی شک نہیں یہ زمانہ اس مسیح کا زمانہ ہے جو خدائے احکم الحاکمین کی طرف سے حَکَم ہے اور لوگوں کی ہلاکت (روحانی) کے بعد ایک حشر کا وقت ہے اور اس کا نمونہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں بھی اور حضرت خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی گذر چکا ہے۔ پس تم بھی غور کرو اور غافلوں (کی صف) میں شامل نہ ہو ؁ (ترجمہ از مرتب)

ؔ نوٹ یہاں یہ بھی فرمایا کہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس لیے بھی فرمایا تاکہ یہ ثابت کرے کہ وہ بسائط اور عالم امر کا بھی رب ہے کیونکہ بسیط چیزیں امر سے ہیں اور مرکب خلق سے۔ منہ

نہیں جو انسان ذراسی سمجھ اور فکر کے ساتھ قرآن کریم کو پڑھے گا۔ اُس کو معلوم ہو جاوے گا کہ دنیا کے تمام فلسفے اور علوم اس کے سامنے ہیچ ہیں اور سب حکیم اور فلاسفر اس سے بہت پیچھے رہ گئے۔

(الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

سورۃ فاتحہ میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات اربعہ بیان ہوئی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چاروں صفات کے مظہر کامل تھے۔ مثلاً پہلی صفت رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بھی مظہر ہوئے جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ[1] جیسے رَبُّ الْعَالَمِیْن تمام ربوبیت کو چاہتا تھا اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات اور آپ کی ہدایت و تبلیغ کل دنیا اور کل عالموں کے لیے قرار پائی۔ پھر دوسری صفت رَحْمٰن کی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت کے بھی کامل مظہر ٹھہرے کیونکہ آپ کے فیوض و برکات کا کوئی بدل اور اجر نہیں مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ[2] پھر آپ رحیمیت کے مظہر ہیں آپ نے اور آپ کے صحابہ نے جو محنتیں اسلام کے لیے کیں اور ان خدمات میں جو تکالیف اُٹھائیں وہ ضائع نہیں ہوئیں بلکہ ان کا اجر دیا گیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف میں رحیم کا لفظ بولا ہی گیا ہے پھر آپ مالکیت یوم الدین کے مظہر بھی ہیں اس کی کامل تجلی فتح مکہ کے دن ہوئی۔ ایسا کامل ظہور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اربعہ کا جو ام الصفات ہیں اور کسی نبی میں نہیں ہوا۔

(الحکم ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کا مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ظہوروں محمد اور احمد میں ہوا۔ اب نبی کامل صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن صفات اربعہ کو بیان کر کے صحابہ کرام کی تعریف میں پورا بھی کر دیا گویا اللہ تعالیٰ ظلی طور پر اپنی صفات دینا چاہتا ہے۔ اس لیے فنا فی اللہ کے یہی معنے ہیں کہ انسان الٰہی صفات کے اندر آ جائے۔

اب دیکھو کہ ان صفات اربعہ کا عملی نمونہ صحابہ میں کیسا دکھایا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو مکہ کے لوگ ایسے تھے جیسے بچہ دودھ پینے کا محتاج ہوتا ہے۔ گویا ربوبیت کے محتاج تھے وحشی اور درندوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کی طرح دودھ پلا کر ان کی پرورش کی۔ پھر رحمانیت کا پرتو کیا وہ سامان دئے کہ جن میں کوشش کو کوئی دخل نہ تھا۔ قرآن کریم جیسی نعمت اور رسول کریم جیسا نمونہ عطا فرمایا۔ پھر رحیمیت کا ظہور بھی دکھلایا کہ جو کوششیں کیں اُن پر نتیجے مترتب کیے ان کے ایمانوں کو قبول فرمایا۔ اور نصاریٰ کی طرح ضلالت میں نہ پڑنے دیا بلکہ ثابت قدمی اور استقلال عطا فرمایا۔ کوشش میں یہ برکت ہوتی ہے کہ خدا ثابت قدم کر دیتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں کوئی مرتد نہ ہوا۔ دوسرے نبیوں کے احباب میں ہزاروں ہوتے تھے۔ حضرت مسیح کے تو

---

[1] الانبیاء۔ ع ۷۔ [2] الفرقان۔ ع ۵ و صٓ۔ ع ۵۔

ایک ہی دن میں پانسو مرتد ہو گئے۔ اور جن پر بڑا اعتبار اور وثوق تھا اُن میں سے ایک نے تو ۳۰ درہم لے کر پکڑوا دیا اور دوسرے نے تین بار لعنت کی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ مربی کے قویٰ کا اثر ہوتا ہے جس قدر مربی قوی التاثیر اور کامل ہوگا ویسی ہی اس کی تربیت کا اثر مستحکم اور مضبوط ہوگا۔

یہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسی کے کامل اور سب سے بڑھ کر ہونے کا ایک اور ثبوت ہے کہ آپ کے تربیت یافتہ گروہ میں وہ استقلال اور رسوخ تھا کہ وہ آپ کے لیے اپنی جان مال تک دینے سے دریغ نہ کرنے والے میدان میں ثابت ہوئے اور مسیح کے نقص کا یہ بدیہی ثبوت ہے کہ جو جماعت طیار کی وہی گرفتار کرانے اور جان سے مروانے اور لعنت کرنے والے ثابت ہوئے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحیمیت کا اثر تھا کہ صحابہ میں ثبات قدم اور استقلال تھا۔ پھر مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا عملی ظہور صحابہ کی زندگی میں یہ ہوا کہ خدا نے ان میں اور ان کے غیروں میں فرقان رکھ دیا یا جو معرفت اور خدا کی محبت دنیا میں ان کو دی گئی یہ ان کی دنیا میں جزا تھی۔ اب قصہ کوتاہ کرتا ہوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان صفات اربعہ کی تجلی چمکی لیکن بات بڑی غور طلب ہے کہ صحابہ کی جماعت اتنی ہی نہ سمجھو جو پہلے گذر چکے بلکہ ایک اور گروہ بھی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ذکر کیا ہے وہ بھی صحابہ میں داخل ہے جو احمد کے بروز کے ساتھ ہوں گے چنانچہ فرمایا ہے وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ یعنی صحابہ کی جماعت کو اسی قدر نہ سمجھو بلکہ مسیح موعود کے زمانہ کی جماعت بھی صحابہ ہی ہوگی۔ اس آیت کے متعلق مفسروں نے مان لیا ہے کہ یہ مسیح موعود کی جماعت ہے۔ مِنْهُمْ کے لفظ سے پایا جاتا ہے کہ باطنی توجہ اور استفاضہ صحابہ ہی کی طرح ہوگا۔ صحابہ کی تربیت ظاہری طور پر ہوئی تھی۔ مگر ان کو کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تربیت کے نیچے ہوں گے۔ اس لیے سب علماء نے اس گروہ کا نام صحابہ ہی رکھا ہے۔ جیسے ان صفات اربعہ کا ظہور اُن صحابہ میں ہوا تھا ویسے ہی ضروری تھا کہ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کی مصداق جماعت صحابہ میں بھی ہو۔

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

یہ چار صفتیں ہیں جو لفظی باتیں نہیں بلکہ اللہ نے تمام دنیا کا نظارہ دکھلایا ہے کہ دنیا میں کوئی خالقیت سے منکر ہے کوئی رحمانیت سے کوئی رحیمیت سے اور کوئی اس کے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونے سے اس قسم کا تفرقہ تمام مذاہب میں ہے مگر اسلام ہی ایسا پاک مذہب ہے جس نے سب صفات کاملہ کو جمع کر دیا۔ پس یہ سورۃ جوامع الکتاب کہلاتی ہے یہ پانچ وقت اسی لیے پڑھی جاتی ہے کہ لوگ سوچیں کہ اسلام نہایت مبارک مذہب ہے اور اس کی یہ تعلیم ہے۔ اسلام کا خدا نہ تو ایسا ہے کہ کسی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ کو خدا بنایا گیا ہے نہ ایسا کہ وہ پیدا نہیں کر سکتا اور مکتی اس واسطے نہیں دیتا کہ آگے پھر بنائے گا کیونکہ چند محدود روحیں ہیں جو آپ سے چلی آتی

ہیں۔ انہیں کو بار بار دنیا میں لاتا ہے۔ اگر سب کو نجات دے تو پھر آگے کیا کرے گا۔

اسلام میں خدا کی ایسی صفات مانی گئی ہیں۔ کہ اگر تمام دنیا مل کر نقص نکالے تو نقص نکال نہ سکے۔ ہم کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں۔ جب اس میں کئی ایک نقص ہیں۔ تو پھر وہ کیونکر سب کی نگہبانی کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ خدا میں تو صفات کاملہ پائی جانی چاہئیں اگر یہ نہ ہوں تو پھر اس پر کیا امید ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسے معبود سے دعا کیا کرے۔ ہمارا معبود تو صفات کاملہ رکھتا ہے۔ پس اس سے دعا مانگو ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا دے جو ان لوگوں کی راہ ہے۔ جن پر تو نے فضل کیا۔ ...... الغرض اللہ تعالیٰ اپنی چار صفات بتلا کر تعلیم دیتا ہے کہ یوں دعا مانگو۔ ان لوگوں کی راہ دکھا جن پر تیرا انعام و اکرام ہے۔ نہ کہ جن پر تیرا غضب ہے نہ ضالین کی۔ یہ قصّہ کے طور پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ پس فرمایا کہ جیسے پہلوں پر غضب ہوا اگر تم ایسا کرو گے تو تم پر بھی غضب ہوگا۔ یعنی تم بھی اگر خدا کی راہ میں مستقیم نہیں رہو گے تو تم پر بھی غضب آئے گا۔ (بدر مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

خدا تعالیٰ کے ان صفات رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین پر توجہ کی جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسا عجیب خدا ہے پھر جن کا رب ایسا ہو کیا وُہ کبھی نامراد اور محروم رہ سکتا ہے رب کے لفظ سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسرے عالم میں بھی ربوبیّت کام کرتی رہے گی۔

(البدر ۲۴ نومبر / یکم دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

قرآن شریف میں جس قدر صفات اور افعال الٰہیہ کا ذکر ہے ان سب صفات کا موصوف اسم اللہ ٹھہرایا گیا ہے مثلاً کہا گیا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ...... (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۲)

خدا تعالیٰ کی چار صفتیں ہیں جن سے ربوبیّت کی پوری شوکت نظر آتی ہے اور کامل طور پر چہرہ اُس ذات ابدی ازلی کا دکھائی دیتا ہے چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُن ہر چہار صفتوں کو سورہ فاتحہ میں بیان کر کے اپنی ذات کو معبود قرار دینے کے لیے ان لفظوں سے لوگوں کو اقرار کرنے کی ہدایت دی ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی اے وہ خدا جو ان چار صفتوں سے موصوف ہے ہم خاص تیری ہی پرستش کرتے ہیں کیونکہ تیری ربوبیّت تمام عالموں پر محیط ہے اور تیری رحمانیت بھی تمام عالموں پر محیط ہے اور تیری رحیمیت بھی تمام عالموں پر محیط ہے اور تیری صفت مالکانہ جزا و سزا کی بھی تمام عالموں پر محیط ہے اور تیرے اس حسن اور احسان میں بھی کوئی شریک نہیں اس لیے ہم تیری عبادت میں بھی کوئی شریک نہیں کرتے۔

اب واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان چار صفتوں کو اپنی الوہیّت کا مظہر اتم قرار دیا ہے اور اسی لیے صرف اس قدر ذکر پر یہ نتیجہ مترتب کیا ہے کہ ایسا خدا کہ یہ چار صفتیں اپنے اندر رکھتا ہے وہی لائق پرستش ہے

اور درحقیقت یہ صفتیں بہروجہ کامل ہیں اور ایک دائرہ کے طور پر الوہیت کے تمام لوازم اور شرائط پر محیط ہیں کیونکہ ان صفتوں میں خدا کی ابتدائی صفات کا بھی ذکر ہے اور درمیانی زمانہ کی رحمانیت اور رحیمیت کا بھی ذکر ہے اور پھر آخری زمانہ کی صفت مجازات کا بھی ذکر ہے اور اصولی طور پر کوئی فعل اللہ تعالیٰ کا ان چار صفتوں سے باہر نہیں پس یہ چار صفتیں خدا تعالیٰ کی پوری صورت دکھلاتی ہیں سو درحقیقت استواء علی العرش کے یہی معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ صفات جب دنیا کو پیدا کر کے ظہور میں آگئیں تو خدا تعالیٰ ان معنوں سے اپنے عرش پر پوری وضع استقامت سے بیٹھ گیا کہ کوئی صفت صفات لازمہ الوہیت سے باہر نہیں رہی اور تمام صفات کی پورے طور پر تجلی ہوگئی جیسا کہ جب اپنے تخت پر بادشاہ بیٹھتا ہے تو تخت نشینی کے وقت اُس کی ساری شوکت ظاہر ہوتی ہے ایک طرف شاہی ضرورتوں کے لیے طرح طرح کے سامان طیار ہونے کا حکم ہوتا ہے اور وہ فی الفور ہو جاتے ہیں اور وہی حقیقتہً ربوبیت عامہ ہیں دوسری طرف خسروانہ فیض سے بغیر کسی عمل کے حاضرین کو جود و سخاوت سے مالامال کیا جاتا ہے تیسری طرف جو لوگ خدمت کر رہے ہیں ان کو مناسب چیزوں سے اپنی خدمات کے انجام کے لیے مدد دی جاتی ہے چوتھی طرف جزا سزا کا دروازہ کھولا جاتا ہے کسی کی گردن ماری جاتی ہے اور کوئی آزاد کیا جاتا ہے یہ چار صفتیں تخت نشینی کے ہمیشہ لازم حال ہوتی ہیں پس خدا تعالیٰ کا ان ہر چہار صفتوں کو دنیا پر نافذ کرنا گویا تخت پر بیٹھنا ہے جس کا نام عرش ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ اس تخت کو چار فرشتے اُٹھا رہے ہیں پس اس کا یہی جواب ہے کہ ان چار صفتوں پر چار فرشتے موکل ہیں جو دنیا پر یہ صفات خدا تعالیٰ کی ظاہر کرتے ہیں اور ان کے ماتحت چار ستارے ہیں جو چار رب النوع کہلاتے ہیں جن کو وید میں دیوتا کے نام سے پکارا گیا ہے پس وہ ان چاروں صفتوں کی حقیقت کو دنیا میں پھیلاتے ہیں گویا اُس روحانی تخت کو اُٹھا رہے ہیں بُت پرستوں کا جیسا کہ وید سے ظاہر ہے صاف طور پر یہ خیال تھا کہ یہ چار صفتیں مستقل طور پر دیوتاؤں کو حاصل ہیں اسی وجہ سے وید میں جا بجا ان کی اُستت اور مہما کی گئی اور ان سے مرادیں مانگی گئیں پس خدا تعالیٰ نے استعارہ کے طور پر یہ سمجھایا کہ چار دیوتا جن کو بُت پرست اپنا معبود قرار دیتے ہیں یہ مخدوم نہیں ہیں بلکہ یہ چاروں خادم ہیں اور خدا تعالیٰ کے عرش کو اُٹھا رہے ہیں یعنی خادموں کی طرح ان الٰہی صفات کو اپنے آئینوں میں ظاہر کر رہے ہیں اور عرش سے مراد لوازم صفات تخت نشینی ہیں جیسا کہ ابھی ہم نے بیان کر دیا ہے۔ ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ رب کے معنے دیوتا ہے پس قرآن شریف پہلے اسی سورۃ سے شروع ہوا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی وہ تمام مہما اور اُستت اُس خدا کی چاہیئے جو تمام عالموں کا دیوتا ہے وہی ہے جو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے اور رَحْمٰنُ الْعٰلَمِيْنَ ہے اور رحیم العٰلمین ہے اور مالک جزاء العالمین

ہے اُس کی برابر اور کوئی دیوتا نہیں کیونکہ قرآن شریف کے زمانہ میں دیوتا پرستی بہت شائع تھی اور یونانی ہر ایک دیوتے کا نام ربّ النوع رکھتے تھے اور ربّ النوع کا لفظ آریہ ورت میں دیوتا کے نام سے موسوم تھا اس لیے پہلے خدا کا کلام ان جھوٹے دیوتاؤں کی طرف ہی متوجہ ہوا جیسا کہ اُس نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی وہ جو سب عالموں کا دیوتا ہے نہ صرف ایک یا دو عالم کا اسی کی پرستش اور حمد وثنا چاہیئے دوسروں کی مہما اور اُستت کرنا غلطی ہے اس صورت میں جو صفتیں بُت پرستوں نے چار دیوتوں کے لیے مقرر کر رکھی تھیں خدا تعالی نے اُن سب کو اپنی ذات میں جمع کر دیا ہے اور صرف اپنی ذات کو ان صفات کا منبع ظاہر فرمایا۔ بُت پرست قدیم سے یہ بھی خیال کرتے تھے کہ خدا کی اصولی صفات یعنی جو اصل جڑ تمام صفات کی ہیں وہ صرف چار ہیں پیدا کرنا پھر مناسب حال سامان عطا کرنا پھر ترقی کے لیے عمل کرنے والوں کی مدد کرنا پھر آخر میں جزا سزا دینا۔ اور وہ ان چار صفات کو چار دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے تھے اسی بنا پر نوح کی قوم کے بھی چار ہی دیوتا تھے اور انہیں صفات کے لحاظ سے عرب کے بُت پرستوں نے بھی لات مناتؔ وعزّیٰ اور ہبل بنا رکھے تھے ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چار دیوتا بالارادہ دنیا میں اپنے اپنے رنگوں میں پرورش کر رہے ہیں اور ہمارے شفیع ہیں اور ہمیں خدا تک بھی یہی پہنچاتے ہیں چنانچہ یہ مطلب آیت لِيُقَرِّبُونَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى[1] سے ظاہر ہے۔

اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں وید بھی ان چاروں دیوتاؤں کی مہما اور اُستت کی ترغیب دیتا ہے اور وید میں اگرچہ اور دیوتاؤں کا بھی ذکر ہے لیکن اصولی دیوتے جن سے اور سب دیوتے پیدا ہوئے ہیں یا یوں کہو کہ ان کی شاخ ہیں وہ چار ہی ہیں کیونکہ کام بھی چار ہی ہیں پس قرآن شریف کی پہلی غرض یہی تھی کہ وید وغیرہ مذاہب کے دیوتاؤں کو نیست و نابود کرے اور ظاہر کرے کہ یہ لوگوں کی غلطیاں ہیں کہ اور اور چیزوں کو دیوتا یعنی ربّ النوع بنا رکھا تھا بلکہ یہ چار صفتیں خاص خدا تعالی کی ہیں اور ان چار صفتوں کے عرش کو خادموں اور نوکروں کی طرح یہ بیجان دیوتے اُٹھا رہے ہیں چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

حمد را با تو نسبتے است درست   بر در ہر کہ رفت بر در تُست

پس یہ اعتراض کہ آریہ صاحبان ہمیشہ سے کرتے ہیں یہ تو درحقیقت ان کے ویدوں پر اعتراض ہے کیونکہ مسلمان تو اُس خدا کی پرستش کرتے ہیں جو مخدوم ہے مگر آریہ صاحبان اُن جھوٹے دیوتاؤں کو خدا سمجھ رہے ہیں جو خادموں اور نوکروں چاکروں کی طرح خدا تعالی کی صفات اربعہ کا عرش اپنے سر پر اُٹھا رہے ہیں بلکہ وہ تو چاکروں کے بھی چاکر ہیں کیونکہ اُن پر اور طاقتیں بھی مسلّط ہیں جو ملائک کے نام سے موسوم ہیں جو ان دیوتاؤں کی طاقتوں کو قائم رکھتے ہیں جن میں سے زبان شرع میں کسی کو جبرئیل کہتے ہیں اور کسی کو میکائیل اور کسی کو عزرائیل اور کسی کو اسرافیل اور سناتن دھرم والے اس قسم کے ملائک کے بھی قائل ہیں اور اُن کا نام جم رکھتے ہیں۔   (نسیم دعوت حاشیہ متعلقہ صفحہ ۸۵)

---

[1] الزمر: ۴

سورۃ فاتحہ میں آریوں اور سناتنیوں کا ردّ

سورۃ فاتحہ میں جو پنج وقت ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اشارہ کے طور پر کل عقائد کا ذکر ہے۔ جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ یعنی ساری خوبیاں اس خدا کے لیے سزاوار ہیں جو سارے جہانوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ الرحمٰن۔ وہ بغیر اعمال کے پیدا کرنے والا ہے اور بغیر کسی عمل کے عنایت کرنے والا ہے۔ الرحیم۔ اعمال کا پھل دینے والا۔ مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ جزا سزا کے دن کا مالک ان چار صفتوں میں کل دنیا کے فرقوں کا بیان کیا گیا ہے۔ بعض لوگ اس بات سے منکر ہیں کہ خدا ہی تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جیو یعنی ارواح اور پرمانوں یعنی ذرات خود بخود ہیں اور جیسے پرمیشر آپ ہی آپ چلا آتا ہے ویسے ہی وہ بھی آپ ہی آپ چلے آتے ہیں۔ اور ارواح اور ان کی کل طاقتیں گن اور خواص جن پر دفتروں کے دفتر لکھے گئے خود بخود ہیں اور ذرات عالم اور ان کی تمام قوتیں بھی خود بخود ہیں اور باوجود اس کے کہ ان میں قوت اتصال اور قوت انفصال خود بخود پائی جاتی ہے۔ وہ آپس میں ملاپ کرنے کے لیے ایک پرمیشر کے محتاج ہیں۔ غرض یہ وہ فرقہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ دوسرا فرقہ وہ ہے جس کی طرف الرحمٰن کے لفظ میں اشارہ ہے۔ اور یہ فرقہ سناتن دھرم والوں کا ہے۔ گو وہ مانتے ہیں کہ پرمیشر سے ہی سب کچھ نکلا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ خدا کا فضل کوئی چیز نہیں وہ کرموں کا ہی پھل دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مرد بنا ہے تو وہ بھی اپنے اعمال سے اور اگر کوئی عورت بنی ہے تو وہ بھی اپنے اعمال سے اور اگر ضروری اشیا حیوانات نباتات وغیرہ بنے ہیں تو وہ بھی اپنے اپنے کرموں کی وجہ سے۔ الغرض یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان سے منکر ہیں۔ وہ خدا جس نے زمین سورج چاند ستارے وغیرہ پیدا کیے اور ہوا پیدا کی تاہم سانس لے سکیں اور ایک دوسرے کی آواز سن سکیں اور روشنی کے لیے سورج چاند وغیرہ اشیا پیدا کیں اور اس وقت پیدا کیں جب کہ ابھی سانس لینے والوں کا وجود اور نام ونشان بھی نہ تھا تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے ہی اعمال کی وجہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ کیا کوئی اپنے اعمال کا دم مار سکتا ہے۔ کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ سورج چاند ستارے ہوا وغیرہ میرے اپنے عملوں کا پھل ہے غرض خدا کی صفت رحمانیت اس فرقہ کی تردید کرتی ہے جو خدا کو بلا مبادلہ یعنی بغیر ہماری کسی محنت اور کوشش کے بعض اشیاء کے عنایت کرنے والا نہیں جانتے۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ کی صفت الرحیم کا بیان ہے یعنی محنتوں کوششوں اور اعمال پر ثمرات حسنہ مترتب کرنے والا۔ یہ صفت اس فرقہ کا رد کرتی ہے جو اعمال کو بالکل لغو خیال کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں۔ کہ میاں نماز کیا تو روزے کیا اگر غفور الرحیم نے اپنا فضل کیا تو بہشت میں جائیں گے نہیں تو جہنم میں۔ اور کبھی کبھی یہ لوگ اس قسم کی باتیں بھی کہہ دیا کرتے ہیں کہ میاں عبادتاں کر کے ولی تو ہم نے کچھ تھوڑا ہی بننا۔ کچھ کیتا کیتا نہ کیتا نہ سہی۔ غرض الرحیم کہہ کر خدا ایسے ہی لوگوں کا رد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ جو محنت کرتا ہے اور خدا کے عشق اور

محبت میں محو ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں سے ممتاز اور خدا کا منظورِ نظر ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی خود دستگیری کرتا ہے۔۔۔۔

اب تین فرقوں کی بابت تو تم سُن چکے ہو۔ یعنی ایک فرقہ تو وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو رب نہیں سمجھتا اور ذرہ ذرہ کو اس کا شریک ٹھہراتا ہے اور مانتا ہے۔ کہ ارواح اور ذرات عالم کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی طاقت سے باہر ہے اور جیسے خدا خود بخود ہے ویسے ہی وہ بھی خود بخود ہے اس لیے رب العالمین کہہ کر اس فرقہ کی تردید کی گئی ہے۔ دوسرا فرقہ وہ ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ خدا اپنے فضل سے کچھ نہیں دے سکتا۔ جو کچھ بھی ہمیں ملا ہے اور ملیگا وہ ہمارے اپنے کرموں کا پھل ہے اور ہوگا۔ اس لیے لفظ رحمٰن کے ساتھ اس کا رد کیا گیا ہے اور اس کے بعد الرحیم کہہ کر اس فرقہ کی تردید کی گئی ہے (جو[1] اعمال کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں اب ان تین فرقوں کا بیان کر کے فرمایا یعنی جزا سزا کے دن کا مالک اور اس سے اُس گروہ کی تردید مطلوب ہے جو کہ جزا سزا کا قائل نہیں۔ کیونکہ ایسا ایک فرقہ بھی دنیا میں موجود ہے۔ جو جزا سزا کا منکر ہے۔ جو خدا کو رحیم نہیں مانتے ان کو تو بے پرواہ بھی کہہ سکتے ہیں مگر جو مالک یوم الدین والی صفت کو نہیں مانتے وہ تو خدا کی ہستی سے بھی منکر ہوتے ہیں اور جب خدا کی ہستی ہی نہیں جانتے تو پھر جزا سزا کس طرح مانیں۔ غرض ان چار صفات کو بیان کر کے خدا فرماتا ہے کہ اے مسلمانو تم کہو کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ یعنی اے چار صفتوں والے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور اس کام کے لیے مدد بھی تجھ سے ہی چاہتے ہیں۔ اور یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے عرش کو چار فرشتوں نے اُٹھایا ہوا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کی ان چاروں صفات کا ظہور موجود ہے۔ اور اگر یہ چار نہ ہوں یا چاروں میں سے ایک نہ ہو تو پھر خدا کی خدائی میں نقص لازم آتا ہے۔

(الحکم ۲ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵-۶)

سورۃ فاتحہ میں مذاہب باطلہ کا ردّ | اللہ تعالیٰ نے الحمد شریف میں اپنی صفات کاملہ کا بیان کر کے اُن تمام مذاہب باطلہ کا رد کیا ہے۔ جو عام طور پر دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ سورت جوامع الکتاب کہلاتی ہے۔ اسی واسطے پانچوں وقت ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے کہ اس میں مذہب اسلام کی تعلیم موجود ہے۔ اور قرآن مجید کا ایک قسم کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی چار صفات بیان کر کے ایک نظارہ دکھانا چاہا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام نہایت ہی مبارک مذہب ہے جو اس خدا کی طرف رہبری کرتا ہے جو نہ تو عیسائیوں کے خدا کی طرح کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اور نہ ہی وہ ایسا ہے کہ آریوں کے پرمیشر کی طرح مکتی دینے پر ہی قادر نہ ہو۔ اور جھوٹے طور پر کہہ دیتا ہے کہ عمل محدود

[1] یہ لفظ غالباً سہو کاتب سے لکھنا رہ گیا ہے (مرتب)

ہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ اس میں نجات دینے کی طاقت ہی نہیں کیونکہ روحیں تو اس کی بنائی ہوئی نہیں۔ جیسے وہ آپ خود بخود ہے ویسے ہی ارواح بھی خود بخود ہیں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اور روحیں پیدا کر لے اس لیے یہ سوچ کر کہ اگر ہمیشہ کے لیے کسی روح کو مکتی دی جاوے تو آہستہ آہستہ وہ وقت آجاویگا کہ تمام روحیں مکتی یافتہ ہو کر میرے قبضہ سے نکل جائیں گی جس سے میرا تمام بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے وہ بہانہ کے طور پر ایک گناہ ان کے ذمہ رکھ لیتا ہے اور اس دور کو چلائے جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا خدا ایسا قدوس اور قادر خدا ہے کہ اگر تمام دنیا مل کر اس میں کوئی نقص نکالنا چاہے تو نہیں نکال سکتی۔ ہمارا خدا تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ وہ ہر ایک نقص اور عیب سے مبرا ہے کیونکہ جس میں کوئی نقص ہو۔ وہ خدا کیوں کر ہو سکتا ہے اور اس سے ہم دعائیں کس طرح مانگ سکتے ہیں۔ اور اس پر امیدیں کیا رکھ سکتے ہیں وہ تو خود ناقص ہے۔ نہ کہ کامل۔ لیکن اسلام نے وہ قادر اور ہر ایک عیب سے پاک خدا پیش کیا ہے جس سے ہم دعائیں مانگ سکتے ہیں اور بڑی بڑی امیدیں پوری کر سکتے ہیں۔ اسی واسطے اس نے اسی سورہ فاتحہ میں دعا سکھائی ہے کہ تم لوگ مجھ سے دعا مانگا کرو۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی یا الٰہی ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا جو ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرے بڑے بڑے فضل اور انعام ہوئے اور یہ دعا اسی واسطے سکھائی کہ تا تم لوگ صرف اس بات پر ہی نہ بیٹھ رہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں بلکہ اس طرح سے اعمال بجا لاؤ کہ ان انعاموں کو حاصل کر سکو جو خدا کے مقرب بندوں پر ہوا کرتے ہیں۔

(الحکم ۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲و۳)

اگر خدا تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا شمار کرنا چاہیں تو ہرگز ممکن نہیں کہ اس خدا کی مہربانیوں اور احسانوں کا شمار کر سکیں اس کے انعامات ہر دو روحانی اور جسمانی رنگ میں محیط ہیں اور جیسا کہ وہ سورہ فاتحہ میں جو کہ سب سے پہلی سورہ ہے اور تمام قرآن شریف اسی کی شرح اور تفسیر ہے اور وہ پنج وقت نمازوں میں بار بار پڑھی جاتی ہے اس کا نام ہے ربّ العالمین یعنی ہر حالت میں اور ہر جگہ اسی کی ربوبیّت سے انسان زندگی اور ترقی پاتا ہے اور اگر نظر عمیق سے دیکھا جاوے تو حقیقت میں انسانی زندگی کا بقا اور آسودگی اور آرام راحت و چین اسی صفت الٰہی سے وابستہ ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمانیت کا استعمال نہ کرے اور دنیا سے اپنی رحمانیت کا سایہ اٹھا لے تو دنیا تباہ ہو جاوے......

اللہ کی ایک صفت ربّ ہے یعنی پرورش کرنے والا اور تربیت کرنے والا کیا روحانی اور کیا جسمانی دونوں قسم کے قویٰ اللہ تعالیٰ نے ہی انسان میں رکھے ہیں۔ اگر قویٰ ہی نہ رکھے ہوتے۔ تو انسان ترقی ہی کیسے کر سکتا۔ جسمانی ترقیات کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم اور انعام کے گیت گانے چاہئیں کہ اس نے قویٰ رکھے اور پھر ان میں ترقی کرنے کی طاقت بھی فطرتاً رکھ دی۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ خدا مالک ہے جزا سزا کے دن کا۔ ایک رنگ میں اسی دنیا

میں بھی جزا سزا ملتی ہے۔ ہم روزمرّہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ چور چوری کرتا ہے ایک روز نہ پکڑا جاوے گا دو روز نہ پکڑا جائیگا آخر ایک دن پکڑا جائے گا اور زندان میں جائے گا اور اپنے کیے کی سزا بھگتے گا۔ یہی حال زانی۔ شراب خور اور طرح طرح کے فسق و فجور میں بے قید زندگی بسر کرنے والوں کا ہے کہ ایک خاص وقت تک خدا کی شان ستاری ان کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ آخر وہ طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دکھوں میں مبتلا ہو کر ان کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس اُخروی دوزخ کی سزا کا نمونہ ہے۔ اس طرح سے جو لوگ سرگرمی سے نیکی کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور فرمانبرداری ان کی زندگی کا اعلیٰ فرض ہوتا ہے تو خدا ان کی نیکی کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ اور مقررہ وقت پر ان کی نیکی بھی پھل لاتی اور باردار ہو کر دنیا میں ہی ان کے واسطے ایک نمونہ کے طور پر مثالی جنت حاصل کر دیتی ہے۔ غرض جتنے بھی بدیوں کا ارتکاب کرنے والے فاسق فاجر شراب خور اور زانی ہیں۔ ان کو خدا کا اور روز جزا کا خیال آنا تو درکنار۔ اس دنیا میں ہی اپنی صحت۔ تندرستی۔ عافیت اور اعلیٰ قویٰ کھو بیٹھتے ہیں اور پھر بڑی حسرت اور مایوسی سے ان کو زندگی کے دن پورے کرنے پڑتے ہیں۔ سل۔ دق۔ سکتہ اور رعشہ اور اور خطرناک امراض ان کے شامل حال ہو کر مرنے سے پہلے ہی مر رہنے اور آخر کار بے وقت اور قبل از وقت موت کا لقمہ بن جاتے ہیں۔

(الحکم ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء صـ۲)

سورۃ فاتحہ میں پہلے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا گیا ہے پھر بتایا ہے کہ وہ رب العالمین ہے الرحمٰن ہے یعنی بغیر اعمال کے رحمت کرتا ہے پھر وہ الرحیم ہے یعنی اس کی رحمت ایسی ہے کہ کوشش پر بھی ثمرات مرتب کرتا ہے۔ مالک یوم الدین ہے جزا و سزا اسی کے ہاتھ میں ہے ان تعریفوں سے لازم آیا کہ بڑا خدا جو رب رحمٰن رحیم ہے وہ حاضر ناظر ہے اس لیے اب دعا کے وقت یہ کہا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا مانگے۔ سیدھی راہ دکھا ان لوگوں کی جن پر تیرے انعام و اکرام ہوئے گویا جو تیری مقبول راہ ہے اور جس پر چل کر تیرے تلطف کا یقین ہے ان لوگوں کی نہیں جن پر کوئی فیض اور فضل مرتب نہیں ہوتا بلکہ مغضوب بنا دیتی ہے۔

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صـ۱۲)

احکام الٰہی کی دو شاخیں | عبادت اور احکام الٰہی کی دو شاخیں ہیں تعظیم لامر اللہ اور ہمدردی مخلوق۔ میں سوچتا تھا کہ قرآن شریف میں تو کثرت کے ساتھ اور بڑی وضاحت سے ان مراتب کو بیان کیا گیا ہے مگر سورۃ فاتحہ میں ان دونوں شقوں کو کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ میں سوچتا ہی تھا کہ فی الفور میرے دل میں یہ بات آئی کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ سے ہی یہ ثابت ہوتا ہے یعنی ساری صفتیں اور تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جو رب العالمین ہے یعنی ہر عالم میں نطفہ میں مضغہ وغیرہ میں سارے عالموں کا رب ہے۔ پھر رحمان ہے پھر رحیم ہے اور مالک یوم الدین ہے۔ اب اس کے

بعد ایاک نعبد جو کہتا ہے تو گویا اس عبادت میں وہی ربوبیّت۔ رحمانیت رحیمیت مالکیت یوم الدین کے صفات کا پرتو انسان کو اپنے اندر لینا چاہیئے کیونکہ کمال عابد انسان کا یہی ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ میں رنگین ہو جاوے پس اس صورت میں یہ دونو امر بڑی وضاحت اور صفائی سے بیان ہوئے ہیں۔

(الحکم ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

محبت کی محرک دو ہی چیزیں ہیں حسن یا احسان اور خدا تعالیٰ کی احسانی صفات کا خلاصہ سورۃ فاتحہ میں پایا جاتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کیونکہ ظاہر ہے کہ احسان کامل اس میں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو محض نابود سے پیدا کرے اور پھر ہمیشہ اس کی ربوبیت ان کے شامل حال ہو اور وہی ہر ایک چیز کا آپ سہارا ہو اور پھر اس کی تمام قسم کی رحمتیں اس کے بندوں کے لیے ظہور میں آئی ہوں اور اس کا احسان بے انتہا ہو جس کا کوئی شمار نہ کر سکے سو ایسے احسانوں کو خدا تعالیٰ نے بار بار جتلایا ہے جیسا کہ ایک اور جگہ فرماتا ہے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا[1] یعنی اگر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز گن نہیں سکو گے۔

{ رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۸۶
اور اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۵۲-۱۵۳ }

قرآن کریم میں یہ تعلیم بیان فرمائی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ جس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ جلّ شانہ تمام عالموں کا رب ہے یعنی علۃ العلل ہر ایک ربوبیت کا وہی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ رحمٰن بھی ہے یعنی بغیر ضرورت کسی عمل کے اپنی طرف سے طرح طرح کے آلاء اور نعماء شامل حال اپنی مخلوق کے رکھتا ہے اور رحیم بھی ہے کہ اعمال صالحہ کے بجا لانے والوں کا مددگار ہوتا ہے اور اُن کے مقاصد کو کمال تک پہنچاتا ہے اور مالک یوم الدین بھی ہے کہ ہر ایک جزا سزا اُس کے ہاتھ میں ہے جس طرح پر چاہے اپنے بندہ سے معاملہ کرے چاہے تو اُس کو ایک عمل بد کے عوض میں وہ سزا دیوے جو اس عمل بد کے مناسب حال ہے اور چاہے تو اُس کے لیے مغفرت کے سامان میسّر کرے۔ (جنگ مقدس صفحہ ۴۳-۴۴)

اُس (اللہ تعالیٰ) کے صفاتی نام جو اصل الاصول تمام صفاتی ناموں کے ہیں چار ہیں اور چاروں جود اور کرم پر مشتمل ہیں یعنی وہی نام جو سورہ فاتحہ کی پہلی تین آیتوں میں مذکور ہیں یعنی رب العالمین اور رحمان اور رحیم اور مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن یعنی مالک یوم جزا۔

ان ہر چہار صفات میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے سراسر نیکی کا ارادہ کیا گیا ہے یعنی

---

[1] ابراھیم ع ۵-۵

پیدا کرنا پرورش کرنا جس کا نام ربوبیت ہے۔ اور بے استحقاق آرام کے اسباب مہیا کرنا جس کا نام رحمانیت ہے۔ اور تقویٰ اور خدا ترسی اور ایمان پر انسان کے لیے وہ اسباب مہیّا کرنا جو آیندہ دکھ اور مصیبت سے محفوظ رکھیں۔ جس کا نام رحیمیّت ہے۔ اور اعمال صالحہ کے بجالانے پر جو عبادت اور صوم اور صلوٰۃ اور بنی نوع کی ہمدردی اور صدقہ اور ایثار وغیرہ ہے وہ مقام صالح عطا کرنا جو دائمی سرور اور راحت اور خوش حالی کا مقام ہے جس کا نام جزاء خیر از طرف مالک یوم الجزا ہے سو خدا نے ان ہر چہار صفات میں سے کسی صفت میں بھی انسان کے لیے بدی کا ارادہ نہیں کیا سراسر خیر اور بھلائی کا ارادہ کیا ہے لیکن جو شخص اپنی بدکاریوں اور بے اعتدالیوں سے ان صفات کے پرتوہ کے نیچے سے اپنے تئیں باہر کرے اور فطرت کو بدل ڈالے اس کے حق میں اسی کی شامت اعمال کی وجہ سے وہ صفات بجائے خیر کے شر کا حکم پیدا کر لیتے ہیں چنانچہ ربوبیّت کا ارادہ فنا اور اعدام کے ارادہ کے ساتھ مبدل ہو جاتا ہے اور رحمانیت کا ارادہ غضب اور سخط کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اور رحیمیت کا ارادہ انتقام اور سخت گیری کے رنگ میں جوش مارتا ہے اور جزاء خیر کا ارادہ سزا اور تعذیب کی صورت میں اپنا ہولناک چہرہ دکھاتا ہے۔ سو یہ تبدیلی خدا کی صفات میں انسان کی اپنی حالت کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ غرض چونکہ سزا دینا یا سزا کا وعدہ کرنا خدائے تعالیٰ کی اُن صفات میں داخل نہیں جو امّ الصّفات ہیں کیونکہ دراصل اس نے انسان کے لیے نیکی کا ارادہ کیا ہے اس لیے خدا کا وعید بھی جب تک انسان زندہ ہے اور اپنی تبدیلی کرنے پر قادر ہے فیصلہ ناطقہ نہیں ہے۔ لہٰذا اُس کے برخلاف کرنا کذب یا عہد شکنی میں داخل نہیں۔ اور گو بظاہر کوئی وعید شروط سے خالی ہو مگر اس کے ساتھ پوشیدہ طور پر ارادہ الٰہی میں شروط ہوتی ہیں بجز ایسے الہام کے جس میں ظاہر کیا جائے کہ اس کے ساتھ شروط نہیں ہیں پس ایسی صورت میں وہ قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے اور تقدیر مبرم قرار پا جاتا ہے۔ یہ نکتہ معارف الٰہیہ میں سے نہایت قابل قدر اور جلیل الشان نکتہ ہے جو سورہ فاتحہ میں مخفی رکھا گیا ہے۔ فتدبّر۔

(انجام آتھم صفحہ ۱۰ حاشیہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ غرض یہ پاک تعلیم جو اسلام کی یگانہ خصوصیت اور مایہ ناز تعلیم ہے ورے ٹھہرتی ہی نہیں جب تک نمازی کو سچا اور یک رنگ مومن نہ بناوے اس دار الکدورت میں ہر شخص کو راحت اور طمانیت کی تلاش ہے کسی نے اس تلاش میں کسی چیز سے پنجہ مارا ہے کسی نے کسی شے سے بڑے بڑے فلاسفروں نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے اور وہ باتیں زور طبع سے بتائی ہیں جن پر عمل کرنے سے خوشحالی ہو سکتی ہے مگر عبث اور بے سود بہتیرے ان راندہ لوگوں میں ایسے ہوئے ہیں جو بڑی تلخ کامی کے ساتھ اس دنیا سے اُٹھے۔ بعضوں نے خودکشی کا کڑوا پیالہ پیا اور بہتوں کی زندگی کے مختلف لمحے اضطراب اور جزع فزع سے معمور نظر آتے ہیں۔

حقیقت میں ایک ہی چیز ہے اور صرف ایک ہی چیز ہے جو زندگی کے کجدار و مریز میں پوری استقامت اور سکینت اور طمانینت بخش سکتی ہے وہ ہے خدا تعالیٰ اور اُس کی صفات پر کامل اور لذیذ ایمان۔ اور اسی ایمان عرفان آمیز کا عملی اظہار ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

(الحکم ۲۴ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

آسمانی پیدائش کا پہلا دن وہ ہوتا ہے جب شیطانی زندگی پر موت وارد ہوتی ہے اور روحانی زندگی کا تولد ہوتا ہے جیسے بچہ کا تولد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ میں اسی تولّد کی طرف ایما فرمایا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ یہ چاروں صفات اللہ تعالیٰ کی بیان کی گئی ہیں یعنی وہ خدا جس میں تمام محامد پائے جاتے ہیں کوئی خوبی سوچ اور خیال میں نہیں آسکتی جو اللہ تعالیٰ میں نہ پائی جاتی ہو بلکہ انسان کبھی بھی اُن محامد اور خوبیوں کو جو اللہ کریم میں پائی جاتی ہیں کبھی بھی شمار نہیں کرسکتا جو خدائے اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہی کامل اور سچا خدا ہے اور اسی لیے قرآن کو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ سے شروع فرمایا ہے۔

(الحکم ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

میرے دل میں یہ بات آئی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان ان صفات کو اپنے اندر لے یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ساری صفتیں سزاوار ہیں جو رب العلمین ہے یعنی ہر عالم میں نطفہ میں مضغہ وغیرہ سارے عالموں میں غرض ہر عالم میں پھر رحمن ہے پھر رحیم ہے اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے۔ اب اِيَّاكَ نَعْبُدُ جو کہتا ہے تو گویا اس عبادت میں وہی ربوبیّت رحمانیت رحیمیت مالکیت صفات کا پرتو انسان کو اپنے اندر لینا چاہیے کمال عابد انسان کا یہ ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں رنگین ہو جاوے جب تک اس مرتبہ تک نہ پہنچ جائے نہ تھکے نہ ہارے۔ اس کے بعد خود ایک کشش اور جذب پیدا ہو جاتا ہے جو عبادت الٰہی کی طرف اسے لیے جاتا ہے۔ اور وہ حالت اس پر وارد ہو جاتی ہے جو یفعلون ما یؤمرون کی ہوتی ہے۔

(الحکم ۲۴ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

سورہ فاتحہ میں انسان کے لیے سبق | سورۂ فاتحہ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پیش کی ہے اور اس میں سب سے پہلی صفت رَبُّ الْعَالَمِيْنَ بیان کی ہے جس میں تمام مخلوقات شامل ہے۔ اسی طرح پر ایک مومن کی ہمدردی کا میدان سب سے پہلے اتنا وسیع ہونا چاہیئے کہ تمام چرند پرند اور کل مخلوق اس میں آجاوے۔ پھر دوسری صفت رَحْمٰن کی بیان کی ہے جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ تمام جاندار مخلوق سے ہمدردی خصوصاً کرنی چاہیئے اور پھر رَحِيْم میں اپنی نوع سے ہمدردی

کا سبق ہے۔ غرض اس سورۂ فاتحہ میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں یہ گویا خدا تعالیٰ کے اخلاق ہیں جن سے بندہ کو حصہ لینا چاہیئے۔ اور وہ یہی ہے کہ اگر ایک شخص عمدہ حالت میں ہے تو اُس کو اپنی نوع کے ساتھ ہر قسم کی ممکن ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے۔ اگر دوسرا شخص جو اس کا رشتہ دار ہے یا عزیز ہے خواہ کوئی ہے اس سے بیزاری نہ ظاہر کی جاوے اور اجنبی کی طرح اس سے پیش نہ آئیں بلکہ ان حقوق کی پروا کریں جو اس کے تم پر ہیں۔ اس کو ایک شخص کے ساتھ قرابت ہے اور اس کا کوئی حق ہے تو اُس کو پورا کرنا چاہیئے۔

(الحکم ۲۴ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

انجیل کی دعا اور سورۂ فاتحہ کی دعا کا تقابل

انجیل کی دعا ہے جو انسانوں کو خدا کی رحمت سے نومید کرتی ہے اور اس کی ربوبیت اور افاضہ اور جزا سزا سے عیسائیوں کو بے باک کرتی ہے اور اس کو زمین پر مدد دینے کے قابل نہیں جانتی جب تک اس کی بادشاہت زمین پر نہ آوے لیکن اس کے مقابل پر جو دعا خدا نے مسلمانوں کو قرآن میں سکھلائی ہے وہ اِس بات کو پیش کرتی ہے کہ زمین پر خدا مسلوب السلطنت لوگوں کی طرح بیکار نہیں ہے بلکہ اس کا سلسلہ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور مجازات زمین پر جاری ہے اور وہ اپنے عابدوں کو مدد دینے کی طاقت رکھتا ہے اور مجرموں کو اپنے غضب سے ہلاک کر سکتا ہے وہ دُعا یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اٰمِيْن۔ ترجمہ۔ وُہ خُدا ہی ہے جو تمام تعریفوں کا مستحق ہے یعنی اس کی بادشاہت میں کوئی نقص نہیں اور اس کی خوبیوں کے لیے کوئی ایسی حالت منتظرہ باقی نہیں جو آج نہیں مگر کل حاصل ہوگی اور اس کی بادشاہت کے لوازم میں سے کوئی چیز بیکار نہیں تمام عالموں کی پرورش کر رہا ہے بغیر عوض اعمال کے رحمت کرتا ہے اور نیز بعوض اعمال رحمت کرتا ہے جزا سزا وقت مقررہ پر دنیا ہے اُسی کی ہم عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے ہم مدد چاہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ہمیں تمام نعمتوں کی راہیں دکھلا اور غضب کی راہوں اور ضلالت کی راہوں سے دور رکھ۔

یہ دعا جو سورۃ فاتحہ میں ہے انجیل کی دعا سے بالکل نقیض ہے کیونکہ انجیل میں زمین پر خدا کی موجودہ بادشاہت ہونے سے انکار کیا گیا ہے[1] پس انجیل کے رو سے نہ زمین پر خدا کی ربوبیت کچھ کام کر رہی ہے نہ رحمانیت نہ رحیمیت نہ قدرت جزا سزا کیونکہ ابھی زمین پر خدا کی بادشاہت نہیں آئی۔ مگر سورۃ فاتحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر خدا کی بادشاہت موجود ہے اسی لیے سورۃ فاتحہ میں تمام لوازم بادشاہت کے بیان کیے گئے ہیں ظاہر ہے کہ بادشاہ میں یہ صفات ہونی چاہئیں کہ وہ لوگوں کی پرورش پر قدرت رکھتا ہو سو سورت فاتحہ میں رب العالمین کے لفظ سے اس صفت

---

[1] متی باب ۶ آیت ۹ و ۱۰

کو ثابت کیا گیا ہے۔ پھر دوسری صفت بادشاہ کی یہ چاہیئے کہ جو کچھ اُس کی رعایا کو اپنی آبادی کے لیے ضروری سامان کی حاجت ہے وہ بغیر عوض اُن کی خدمات کے خود رحم خسروانہ سے بجالا دے سو الرّحمٰن کے لفظ سے اِس صفت کو ثابت کردیا ہے۔ تیسری صفت بادشاہ میں یہ چاہیئے کہ جن کاموں کو اپنی کوشش سے رعایا انجام تک نہ پہنچا سکے اُن کے انجام کے لیے مناسب طور پر مدد دے سو الرحیم کے لفظ سے اس صفت کو ثابت کیا ہے چوتھی صفت بادشاہ میں یہ چاہیئے کہ جزا و سزا پر قادر ہو تا سیاست مدنی کے کام میں خلل نہ پڑے سو مالک یوم الدین کے لفظ سے اس صفت کو ظاہر کردیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سورۃ موصوفہ بالا نے تمام وہ لوازم بادشاہت پیش کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین پر خدا کی بادشاہت اور بادشاہی تصرّفات موجود ہیں چنانچہ اس کی ربوبیت بھی موجود اور رحمانیت بھی موجود اور رحیمیت بھی موجود اور سلسلہ امداد بھی موجود اور سلسلہ سزا بھی موجود غرض جو کچھ بادشاہت کے لوازم میں سے ہوتا ہے زمین پر سب کچھ خدا کا موجود ہے اور ایک ذرہ بھی اُس کے حکم سے باہر نہیں ہر ایک جزا اُس کے ہاتھ میں ہے ہر ایک رحمت اُس کے ہاتھ میں ہے مگر انجیل یہ دعا سکھلاتی ہے کہ ابھی خدا کی بادشاہت تم میں نہیں آئی اُس کے آنے کے لیے خدا سے دعا مانگا کرو تا وہ آجائے یعنی ابھی تک ان کا خدا زمین کا مالک نہیں اور بادشاہ نہیں اس لیے ایسے خدا سے کیا امید ہوسکتی ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۵-۳۷)

ہمارے خدائے عزّوجل نے سورۃ فاتحہ میں نہ آسمان کا نام لیا نہ زمین کا نام اور یہ کہہ کر حقیقت سے ہمیں خبر دیدی کہ وُہ ربّ العالمین ہے یعنی جہاں تک آبادیاں ہیں اور جہاں تک کسی قسم کی مخلوق کا وجود موجود ہے خواہ اجسام خواہ ارواح اُن سب کا پیدا کرنے والا اور پرورش کرنے والا خدا ہے جو ہر وقت ان کی پرورش کرتا ہے اور ان کے مناسب حال ان کا انتظام کر رہا ہے اور تمام عالموں پر ہر وقت ہر دم اس کا سلسلۂ ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیّت اور جزا سزا کا جاری ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۸-۳۹)

سورۃ فاتحہ کی دعا ہمیں سکھلاتی ہے کہ خدا کو زمین پر ہر وقت وہی اقتدار حاصل ہے جیسا کہ اور عالموں پر اقتدار حاصل ہے اور سورۃ فاتحہ کے سرپر خدا کی اُن کامل اقتداری صفات کا ذکر ہے جو دنیا میں کسی دوسری کتاب نے ایسی صفائی سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ الرحمٰن ہے وہ الرحیم ہے وہ مالک یوم الدین ہے پھر اس سے دعا مانگنے کی تعلیم ہے اور دعا جو مانگی گئی ہے وہ مسیح کی تعلیم کردہ دعا کی طرح صرف ہر روزہ روٹی کی درخواست نہیں بلکہ جو جو انسانی فطرت کو ازل سے استعداد بخشی گئی ہے اور اس کو پیاس لگا دی گئی ہے وہ دعا سکھلائی گئی ہے اور وہ یہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے ان کامل صفتوں کے مالک اور ایسے فیاض کہ ذرّہ ذرّہ تجھ سے پرورش پاتا ہے اور تیری رحمانیت اور رحیمیت اور قدرت جزا سزا سے متمتع اُٹھاتا ہے تو

ہمیں گزشتہ راست بازوں کا وارث بنا اور ہر ایک نعمت جو ان کو دی ہے ہمیں بھی دے اور ہمیں بچا کہ ہم نافرمان ہو کر مورد غضب نہ ہو جائیں اور ہمیں بچا کہ ہم تیری مدد سے بے نصیب رہ کر گمراہ نہ ہو جاویں۔ آمین۔

(کشتی نوح صفحہ ۴۰)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

اس میں اللہ تعالیٰ کی چار صفات جوام الصفات ہیں بیان فرمایا ہے۔ رب العالمین ظاہر کرتا ہے کہ وہ ذرہ ذرہ کی ربوبیت کر رہا ہے۔ عالَم اسے کہتے ہیں جس کی خبر مل سکے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں ہے، جس کی ربوبیت نہ کرتا ہو۔ ارواح۔ اجسام وغیرہ سب کی ربوبیت کر رہا ہے وہی ہے جو ہر ایک چیز کے حسب حال اس کی پرورش کرتا ہے جہاں جسم کی پرورش فرماتا ہے وہاں روح کی سیری اور تسلی کے لیے معارف اور حقائق وہی عطا فرماتا ہے پھر فرمایا ہے کہ وہ رحمان ہے یعنی اعمال سے بھی پیشتر اس کی رحمتیں موجود ہیں۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی زمین۔ چاند سورج۔ ہوا۔ پانی وغیرہ جس قدر اشیاء انسان کے لیے ضروری ہیں موجود ہوتی ہیں اور پھر وہ اللہ رحیم ہے۔ یعنی کسی کے نیک اعمال کو ضائع نہیں کرتا بلکہ پاداش عمل دیتا ہے پھر مالک یوم الدین ہے یعنی جزا وہی دیتا ہے اور وہی یوم الجزا کا مالک ہے۔ اس قدر صفات اللہ کے بیان کے بعد دعا کی تحریک کی ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی اور ان صفات پر ایمان لاتا ہے تو خواہ مخواہ روح میں ایک جوش اور تحریک ہوتی ہے اور دعا کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتی ہے اس لیے اس کے بعد اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی ہدایت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تجلیات اور رحمتوں کے ظہور کے لیے دعا کی بہت بڑی ضرورت ہے اس لیے اس پر ہمیشہ کمربستہ رہو اور کبھی مت تھکو۔

(الحکم ۱۷ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲ و ۳)

خدا کی اصلی اخلاقی صفات چار ہی ہیں جو سورہ فاتحہ میں مذکور ہیں۔ (۱) رب العالمین۔ سب کا پالنے والا۔ (۲) رحمان۔ بغیر عوض کسی خدمت کے خود بخود رحمت کرنے والا (۳) رحیم کسی خدمت پر حق سے زیادہ انعام اکرام کرنے والا اور خدمت قبول کرنے والا اور ضائع نہ کرنے والا۔ (۴) اپنے بندوں کی عدالت کرنے والا۔

(اربعین نمبر ۴ صفحہ ۱۶)

عرش الٰہی کی حقیقت اور سورہ فاتحہ کے ذریعہ اس کے مخفی وجود کا ظہور	خدا تعالیٰ اپنے تنزہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جبکہ اس کی صفت تنزہ اُس کی تمام صفات کو روپوش کر کے اس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے۔

جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقول انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اُس کو دریافت کر سکے تب اُس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا

ہے۔ جو دنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں (۱) اوّل ربوبیّت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی روحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے۔ چنانچہ روح اور جسم کا ظہور ربوبیت کے تقاضا سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیت کے تقاضا سے ہے (۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آ چکی ہے یعنی جو کچھ اُس نے بغیر پاداش اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لیے میسّر کی ہیں یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۳) تیسری خدا کی رحیمیت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اول تو صفت رحمانیت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیت کے تقاضا سے نیک اعمال اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر اُن کو آفات سے بچاتا ہے یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (۴) چوتھی صفت مالک یوم الدین ہے یہ بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے یہ چاروں صفتیں ہیں جو اُس کے عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں یعنی اُس کے پوشیدہ وجود کا ان صفات کے ذریعہ سے اس دُنیا میں پتہ لگتا ہے اور یہ معرفت عالم آخرت میں دو چند ہو جائیگی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۶-۲۶۷)

جماعت احمدیہ میں داخل ہونے والے کا فرض | جو شخص عام مسلمانوں میں سے ہماری جماعت میں داخل ہو جائے اُس کا پہلا فرض یہی ہے کہ جیسا کہ وہ قرآن شریف کے سورہ فاتحہ میں پنج وقت اپنی نماز میں یہ اقرار کرتا ہے کہ خدا رب العالمین ہے اور خدا رحمان ہے اور خدا رحیم ہے اور خدا ٹھیک ٹھیک انصاف کرنے والا ہے یہی چاروں صفتیں اپنے اندر بھی قائم کرے ورنہ وہ اس دُعا میں کہ اسی سورہ میں پنج وقت اپنی نماز میں کہتا ہے کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ یعنی اے ان چار صفتوں والے اللہ میں تیرا ہی پرستار ہوں اور تو ہی مجھے پسند آیا ہے سراسر جھوٹا ہے کیونکہ خدا کی ربوبیّت یعنی نوع انسان اور نیز غیر انسان کا مربی بننا اور ادنیٰ سے ادنیٰ جانور کو بھی اپنی مربیانہ سیرت سے بے بہرہ نہ رکھنا یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر ایک خدا کی عبادت کا دعویٰ کرنے والا خدا کی اس صفت کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے یہاں تک کہ کمال محبت سے اس الٰہی سیرت کا پرستار بن جاتا ہے تو ضروری ہوتا ہے کہ وہ آپ بھی اس صفت اور سیرت کو اپنے اندر حاصل کرے تا اپنے محبوب کے رنگ میں آ جائے ایسا ہی خدا کی رحمانیت یعنی بغیر عوض کسی خدمت کے مخلوق پر رحم کرنا یہ بھی ایک ایسا امر ہے کہ سچا عابد جس کو یہ دعویٰ ہے کہ میں خدا کے نقش قدم پر چلتا ہوں ضرور یہ خلق بھی اپنے اندر پیدا کرتا ہے ایسا ہی خدا کی رحیمیت یعنی کسی کے نیک کام میں اس کام کی تکمیل کے لیے مدد کرنا۔ یہ بھی ایک ایسا امر ہے کہ سچا عابد جو خدائی صفات کا عاشق ہے اس صفت کو اپنے اندر حاصل کرتا ہے ایسا ہی خدا کا انصاف جس نے ہر ایک حکم عدالت کے تقاضا سے دیا ہے نہ نفس کے جوش سے یہ بھی ایک ایسی صفت ہے کہ سچا عابد کہ جو تمام الٰہی صفات اپنے اندر لینا چاہتا ہے اس صفت کو چھوڑ نہیں سکتا اور راست باز

کی خود بھاری نشانی یہی ہے کہ جیسا کہ وہ خدا کے لیے ان چار صفتوں کو پسند کرتا ہے ایسا ہی اپنے نفس کے لیے بھی یہی پسند کرے لہٰذا خدا نے سورۃ فاتحہ میں یہی تعلیم کی تھی جس کو اس زمانہ کے مسلمان ترک کر بیٹھے ہیں۔

{ اشتہار واجب الاظہار صفحہ ۲ مورخہ ۴ نومبر ۱۹۰۰ء
(مشمولہ تریاق القلوب) }

آیت ۵ : اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝

چھٹی صداقت جو سورۃ فاتحہ میں مُندرج ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اے صاحب صفات کاملہ اور مبدءِ فیوض اربعہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور پرستش وغیرہ ضرورتوں اور حاجتوں میں مدد بھی تجھ سے ہی چاہتے ہیں یعنی خالصاً معبود ہمارا تو ہی ہے اور تیرے تک پہنچنے کے لیے کوئی اَور دیوتا ہم اپنا ذریعہ قرار نہیں دیتے نہ کسی انسان کو نہ کسی بُت کو نہ اپنی عقل اور علم کو کچھ حقیقت سمجھتے ہیں اور ہر بات میں تیری ذات قادرِ مُطلق سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ صداقت بھی ہمارے مخالفین کی نظر سے چھپی ہوئی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ بُت پرست لوگ بجز ذات واحد خدائے تعالیٰ کے اور اَور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں اور آریہ سماج والے اپنی روحانی طاقتوں کو غیر مخلوق سمجھ کر اُن کے زور سے مکتی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ برہمو سماج والے الہام کی روشنی سے مونہہ پھیر کر اپنی عقل کو ایک دیوی قرار دے بیٹھے ہیں جو کہ اُن کے زعم باطل میں خدا تک پہنچانے میں اختیارِ کُلی رکھتی ہے اور سب الٰہی اسرار پر محیط اور متصرّف ہے سو وہ لوگ بجائے خدا کے پرستش اور استمداد کے اُسی سے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا خطاب کر رہے ہیں اور شرک خفی میں گرفتار اور مُبتلا ہیں اور جب منع کیا جائے تو کہتے ہیں کہ عقل عطیّاتِ الٰہیہ سے ہے اور اسی غرض سے دی گئی ہے کہ تا انسان اپنی معاش اور مہمات میں اُس کو استعمال میں لاوے پس عطیہ الٰہیہ کا استعمال میں لانا شرک نہیں بن سکتا سو واضح ہو کہ یہ ان کی غلطی ہے اور بارہا یہ امر معرضِ بیان میں آ لیا ہے کہ جس یقینِ کامل اور جن معارفِ حقہ پر ہماری نجات موقوف ہے اُن مقاصدِ عالیہ کے حصول کے لیے عقل ذریعہ نہیں بن سکتی ہاں اُن معارف کے حاصل کرنے کے بعد اُن کی صداقت اور سچائی کو سمجھ سکتی ہے لیکن وہ انکشاف صحیح اور کامل فقط اُس پاک اور صاف روشنی سے ہوتا ہے کہ جو خدائے تعالیٰ کی ذات میں موجود ہے اور عقل کی دود آمیز اور ناقص روشنی جو انسان میں موجود ہے اُس جگہ عاجز ہے سو شرک اِس طرح لازم آتا ہے کہ برہمو سماج والے خدا کے اُس روشن کلام سے کہ جو انکشاف صحیح اور کامل کا مدار ہے مونہہ پھیر کر اور اُس سے بکلّی بے نیازی ظاہر کر کے اپنی ہی عقل ناقص کو رہبرِ مُطلق ٹھہراتے ہیں اور بناٹے کار بناتے ہیں سو اُن کمال جمیارہ اِس دھوکہ میں پڑا ہوا ہے کہ جس منزلِ عالی تک الٰہی قوتیں اور ربانی تجلیات پہنچا سکتے ہیں اُس منزل تک

اُن کی اپنی ہی عقل پہنچا دیگی اب ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اَور کیا شرک ہوگا کہ اپنی عقل کی طاقت کو ربّانی طاقت کے مساوی بلکہ اُس سے عُمدہ تر خیال کر رہے ہیں سو دیکھئے وہی بات سچ نکلی یا نہیں کہ وہ بجائے خدا کے عقل سے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پکار رہے ہیں۔ عیسائیوں کا حال بیان کرنا کچھ ضرورت ہی نہیں سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرات عیسائی بجائے اِس کے کہ خداوند تعالیٰ کی خالص طور پر پرستش کریں مسیح کی پرستش میں مشغول ہیں اور بجائے اِس کے کہ اپنے کاروبار میں خدا سے مدد چاہیں مسیح سے مدد مانگتے رہتے ہیں اور اُن کی زبانوں پر ہر وقت رَبُّنَا الْمَسِیْحُ رَبُّنَا الْمَسِیْحُ جاری ہے۔ سو وہ لوگ مضمون اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر عمل کرنے سے محروم اور راندہ درگاہِ الٰہی ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۹ تا ۴۴۵ حاشیہ ۱۱)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں فاصلہ نہیں ہے۔ البتہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں تقدم زمانی ہے کیونکہ جس حال میں اپنی رحمانیت سے بغیر ہماری دعا اور درخواست کے ہمیں انسان بنایا اور انواع و اقسام کی قوتیں اور نعمتیں ہمیں عطا فرمائیں۔ اُس وقت ہماری دعا نہ تھی۔ اُس وقت خدا کا فضل تھا۔ اور یہی تقدم ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۸۔۱۴۹
نیز دیکھیں الحکم ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھ سے ہی امداد چاہتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ کو تقدم اس لیے ہے کہ انسان دعا کے وقت تمام قویٰ سے کام لیکر خدائے تعالیٰ کی طرف آتا ہے۔ یہ ایک بے ادبی اور گستاخی ہے کہ قویٰ سے کام نہ لیکر اور قانونِ قدرت کے قواعد سے کام نہ لے کر آوے مثلاً کسان اگر تخم ریزی کرنے سے پہلے ہی یہ دعا کرے کہ الٰہی اس کھیت کو ہرا بھرا کر! اور پھل پھول لا۔ تو یہ شوخی اور ٹھٹھا ہے۔ اسی کو خدا کا امتحان اور آزمایش کہتے ہیں جس سے منع کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ خدا کو مت آزماؤ جیسا کہ مسیح علیہ السلام کے مائدہ مانگنے کے قصہ میں اس امر کو بوضاحت بیان کیا ہے۔ اس پر غور کرو اور سوچو! یہ سچی بات ہے کہ جو شخص اعمال سے کام نہیں لیتا وہ دعا نہیں کرتا بلکہ خدائے تعالیٰ کی آزمایش کرتا ہے۔ اس لیے دعا کرنے سے پہلے اپنی تمام طاقتوں کو خرچ کرنا ضروری ہے۔ اور یہی معنی اس دعا کے ہیں۔ پہلے لازم ہے کہ انسان اپنے اعتقاد۔ اعمال میں نظر کرے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کی عادت ہے کہ اصلاح اسباب کے پیرایہ میں ہوتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا کر دیتا ہے کہ جو اصلاح کا موجب ہو جاتا ہے وہ لوگ اس مقام پر ذرا خاص غور کریں جو کہتے ہیں کہ جب دعا ہوئی تو اسباب کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نادان سوچیں کہ دعا بجائے خود ایک مخفی سبب ہے جو دوسرے اسباب کو پیدا کر دیتا ہے اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا تقدم اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر جو کلمہ دعائیہ ہے۔ اس امر کی خاص تشریح کر رہا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۵)

قَدَّمَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ قَوْلَهٗ اِیَّاكَ نَعْبُدُ عَلٰی قَوْلِهٖ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِشَارَةً اِلٰی تَفَضُّلَاتِهِ الرَّحْمَانِیَّةِ مِنْ قَبْلِ الْاِسْتِعَانَةِ فَكَاَنَّ الْعَبْدَ یَشْكُرُ رَبَّهٗ وَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اِنِّیْ اَشْكُرُكَ عَلٰی نَعْمَآءِكَ الَّتِیْ اَعْطَیْتَنِیْ مِنْ قَبْلِ دُعَاءِیْ وَمَسْئَلَتِیْ وَعَمَلِیْ وَجَهْدِیْ وَاسْتِعَانَتِیْ بِالرُّبُوْبِیَّةِ وَالرَّحْمَانِیَّةِ الَّتِیْ سَبَقَتْ سُؤْلَ السَّآئِلِیْنَ - ثُمَّ اَطْلُبُ مِنْكَ قُوَّةً وَّصَلَاحًا وَّفَلَاحًا وَّفَوْزًا وَّمَقَاصِدَ الَّتِیْ لَا تُعْطٰی اِلَّا بَعْدَ الطَّلَبِ وَالْاِسْتِعَانَةِ وَالدُّعَآءِ وَاَنْتَ خَیْرُ الْمُعْطِیْنَ - وَفِیْ هٰذِهِ الْاٰیَاتِ حَثٌّ عَلٰی شُكْرِ مَا تُعْطٰی وَالدُّعَاءِ بِالصَّبْرِ فِیْمَا تَتَمَنّٰی وَفَرْطِ التَّهَجِ اِلٰی مَا هُوَ اَتَمُّ وَاَعْلٰی لِتَكُوْنَ مِنَ الشَّاكِرِیْنَ الصَّابِرِیْنَ - وَفِیْهَا حَثٌّ عَلٰی نَفْیِ الْحَوْلِ وَالْقُوَّةِ وَالْاِسْتِطْرَاحِ بَیْنَ یَدَیْ سُبْحَانَهٗ مُتَرَقِّبًا مُّنْتَظِرًا مُّدِیْمًا لِّلسُّؤَالِ وَالدُّعَآءِ وَالتَّضَرُّعِ وَالثَّنَآءِ وَالْاِفْتِقَارِ مَعَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ كَالطِّفْلِ الرَّضِیْعِ فِیْ یَدِ الظِّئْرِ وَالْمَوْتِ عَنِ الْخَلْقِ وَعَنْ كُلِّ مَا هُوَ فِی الْاَرَضِیْنَ - وَ

اللہ تعالیٰ نے جملہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کو جملہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے پہلے رکھا ہے اور اس میں (بندہ کے) توفیق مانگنے سے بھی پہلے اس (ذات باری) کی (صفت) رحمانیت کے فیوض کی طرف اشارہ ہے گویا کہ بندہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور کہتا ہے۔ اے میرے پروردگار میں تیری ان نعمتوں پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں جو تو نے میری دعا، میری درخواست، میرے عمل میری کوشش اور جو (تیری) اس ربوبیت اور رحمانیت سے جو سوال کرنے والوں کے سوال پر سبقت رکھتی ہے۔ میری استعانت سے پیشتر تو نے مجھے عطا کر رکھی ہیں۔ پھر میں تجھ سے ہی (ہر قسم کی) قوت، راستی، خوشحالی اور کامیابی اور ان مقاصد کے حاصل ہونے کے لیے التجا کرتا ہوں جو درخواست کرنے، مدد مانگنے اور دعا کرنے پر ہی عطا کی جاتی ہیں اور تو بہترین عطا کرنے والا ہے۔

اور ان آیات میں ان نعمتوں پر شکر کرنے کی ترغیب ہے جو تجھے دی جاتی ہیں اور جن چیزوں کی تجھے تمنا ہو ان کے لیے صبر کے ساتھ دعا کرنے اور کامل اور اعلیٰ چیزوں کی طرف شوق بڑھانے کی (ترغیب ہے) تا تم بھی مستقل شکر کرنے والوں اور صبر کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ۔ پھر ان (آیات) میں ترغیب دی گئی ہے۔ بندے کے اپنی طرف ہمت اور قوت کی نسبت کی نفی کرنے کی اور (اس سے) آس لگا کر اور امید رکھ کر ہمیشہ سوال، دعا، عاجزی اور حمد کرتے ہوئے (اپنے آپ کو) اللہ سبحانہٗ کے سامنے ڈال دینے کی اور خوف اور امید کے ساتھ اس شیرخوار بچہ کی مانند جو دایہ کی گود میں ہو

فِيْهَا حَثٌّ عَلٰى اِقْرَارٍ وَّ اعْتِرَافٍ بِاَنَّنَا الضُّعَفَاءُ لَا نَعْبُدُ لَكَ اِلَّا بِكَ وَلَا نَتَحَسَّسُ مِنْكَ اِلَّا بِعَوْنِكَ - بِكَ نَعْمَلُ وَبِكَ نَتَحَرَّكُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰى كَالثَّوَاكِلِ مُتَحَرِّقِيْنَ وَكَالْعُشَّاقِ مُتَلَقِّيْنَ - وَفِيْهَا حَثٌّ عَلَى الْخُرُوْجِ مِنَ الْاِخْتِيَالِ وَالزَّهْوِ وَالْاِعْتِصَامِ بِقُوَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَحَوْلِهٖ عِنْدَ اغْتِيَاصِ الْاُمُوْرِ وَهُجُوْمِ الْمُشْكِلَاتِ وَالدُّخُوْلِ فِي الْمُنْكَسِرِيْنَ - كَاَنَّهٗ تَعَالٰى شَانُهٗ يَقُوْلُ يَا عِبَادِ احْسَبُوْا اَنْفُسَكُمْ كَالْمَيِّتِيْنَ وَبِاللّٰهِ اعْتَصِمُوْا كُلَّ حِيْنٍ - فَلَا يَزْدَهِ الشَّابُّ مِنْكُمْ بِقُوَّتِهٖ وَلَا يَتَخَصَّرُ الشَّيْخُ بِهِرَاوَتِهٖ وَلَا يَفْرَحُ الْكَيِّسُ بِدَهَائِهٖ وَلَا يَثِقُ الْفَقِيْهُ بِصِحَّةِ عِلْمِهٖ وَجَوْدَةِ فَهْمِهٖ وَذَكَائِهٖ وَلَا يَتَّكِئُ الْمُلْهَمُ عَلٰى اِلْهَامِهٖ وَكَشْفِهٖ وَخُلُوْصِ دُعَائِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَطْرُدُ مَنْ يَّشَاءُ وَيُدْخِلُ مَنْ يَّشَاءُ فِي الْمَخْصُوْصِيْنَ - وَفِيْ جُمْلَةِ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِشَارَةٌ اِلٰى عَظَمَةِ شَرِّ النَّفْسِ

(اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھنے کی ترغیب ہے) اور تمام مخلوق سے اور زمین کی سب چیزوں سے موت (یعنی پوری لاتعلقی) کی۔

اسی طرح ان (آیات) میں اس امر کا اقرار اور اعتراف کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ ہم تو بہت کمزور ہیں تیری دی ہوئی توفیق کے بغیر تیری عبادت نہیں کر سکتے اور تیری مدد کے بغیر ہم تیری رضا کی راہوں کی تلاش نہیں کر سکتے۔ ہم تیری مدد سے کام کرتے ہیں اور تیری مدد سے حرکت کرتے ہیں اور ہم تیری طرف جلن کے ساتھ ان عورتوں کی طرح جو اپنے بچوں کی موت کے غم میں گھل رہی ہوتی ہیں اور ان عاشقوں کی طرح جو محبت میں جل رہے ہوتے ہیں تیری طرف دوڑتے ہیں۔ پھر ان آیات میں کبر اور غرور کو چھوڑنے کی نیز معاملات کے پیچیدہ ہونے اور مشکلات کے گھیر لینے پر محض اللہ تعالیٰ کی (طرف سے ملنے والی) طاقت اور قوت پر بھروسہ کرنے کی اور منکسر المزاج لوگوں میں شامل ہونے کی ترغیب ہے) گویا کہ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے اے میرے بندو اپنے آپ کو مُردوں کی طرح سمجھو اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے قوت حاصل کرو پس تم میں سے نہ کوئی جوان اپنی قوت پر اترائے اور نہ کوئی بوڑھا اپنی لاٹھی پر بھروسہ کرے اور نہ کوئی عقلمند اپنی عقل پر ناز کرے اور نہ کوئی فقیہہ اپنے علم کی صحت اور اپنی سمجھ اور اپنی دانائی کی عمدگی ہی پر اعتبار کرے اور نہ کوئی ملہم اپنے الہام یا اپنے کشف یا اپنی دعاؤں کے خلوص پر تکیہ کرے کیونکہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے جس کو چاہے دھتکار دیتا ہے اور جس کو چاہے اپنے خاص بندوں میں داخل کر لیتا ہے۔ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں نفس امارہ کی شر انگیزی

الْاَمَّارَةِ الَّتِیْ تَسْعٰی کَالْعَسَّارَةِ فَکَاَنَّهَا اَفْعٰی شَرُّهَا قَدْ طَمَّ فَجَعَلَ کُلَّ سَلِیْمٍ کَعَظْمٍ اِذَا رَمَّ وَتَرَاهَا تَنْفُثُ السَّمَّ اَوْهِیَ ضِرْغَامٌ مَّا یَنْکُلُ اِنْ هَمَّ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ وَلَا کَسْبَ وَلَا لَمَّ اِلَّا بِاللّٰهِ الَّذِیْ هُوَ یَرْجُمُ الشَّیَاطِیْنَ۔

وَفِیْ تَقْدِیْمِ نَعْبُدُ عَلٰی نَسْتَعِیْنُ نِکَاتٌ اُخْرٰی فَنَکْتُبُ لِلَّذِیْنَ هُمْ مَّشْغُوْفُوْنَ بِاٰیَاتِ الْمَثَانِیْ لَا بِرَنَّاتِ الْمَثَانِیْ وَیَسْعَوْنَ اِلَیْهَا شَائِقِیْنَ۔ وَهِیَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یُعَلِّمُ عِبَادَهٗ دُعَاءً فِیْهِ سَعَادَتُهُمْ فَیَقُوْلُ یَا عِبَادِ سَلُوْنِیْ بِالْاِنْکِسَارِ وَالْعُبُوْدِیَّةِ وَقُوْلُوْا رَبَّنَا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلٰکِنْ بِالْمُعَانَاةِ وَالتَّکَلُّفِ وَالتَّجَشُّمِ وَتَفْرِقَةِ الْخَاطِرِ وَتَمْوِیْهَاتِ الْخَنَّاسِ بِالرَّوِیَّةِ الْغَاصِبَةِ وَالْاَوْهَامِ النَّاصِبَةِ وَالْخَیَالَاتِ الْمُظْلِمَةِ کَمَاءٍ مُّکَدَّرٍ مِّنْ سَیْلٍ اَوْ کَحَاطِبِ لَیْلٍ وَّاِنْ نَّتَّبِعُ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ۔ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یَعْنِیْ نَسْتَعِیْنُکَ لِلذَّوْقِ وَالشَّوْقِ وَالْحُضُوْرِ وَالْاِیْمَانِ الْمَوْفُوْرِ وَالتَّلْبِیَةِ الرُّوْحَانِیَّةِ وَالسُّرُوْرِ

کی شدت کی طرف اشارہ ہے جو نیکیوں کی طرف راغب ہونے سے یوں بھاگتا ہے جیسے اَن سدھی اونٹنی سوار کو اپنے اوپر بیٹھنے نہیں دیتی اور بھاگتی ہے۔ یا وہ ایک اژدہا کی طرح ہے جس کا شر بہت بڑھ گیا ہے اور اس نے ہر درست ہوتے کو بوسیدہ ہڈی کی طرح بنا دیا ہے اور تو دیکھ رہا ہے کہ وہ زہر پھونک رہا ہے یا وہ شیر (کی طرح) ہے کہ اگر حملہ کرے تو پیچھے نہیں ہٹتا۔ کوئی طاقت، قوت، کمائی، اندوختہ (کار آمد) نہیں سوائے اس خدا تعالیٰ کی مدد کے جو شیطانوں کو ہلاک کرتا ہے۔

اور نَعْبُدُ کو نَسْتَعِیْنُ سے پہلے رکھنے میں اور بھی کئی نکات ہیں جنہیں ہم ان لوگوں کے لیے یہاں لکھتے ہیں جو سارنگیوں کی رُوں رُوں پر نہیں بلکہ قرآنی آیات مثانی (سورۃ فاتحہ) سے شغف رکھتے ہیں۔ اور مشتاقوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں اور وہ (نکات) یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک ایسی دعا سکھاتا ہے جس میں ان کی خوش بختی ہے اور کہتا ہے اے میرے بندو مجھ سے عاجزی اور عبودیت کے ساتھ سوال کرو اور کہو اے ہمارے رب اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) لیکن بڑی ریاضت، تکلیف، شرمساری، پریشان خیالی اور شیطانی وسوسہ اندازی اور خشک افکار اور تباہ کن اوہام اور تاریک خیالات کے ساتھ ہم سیلاب کے گدلے پانی کی مانند ہیں۔ یا رات کو لکڑیاں اکٹھا کرنے والے کی طرح ہیں اور ہم صرف گمان کی پیروی کر رہے ہیں ہمیں یقین حاصل نہیں۔

(اور پھر) وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہو۔ یعنی ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں ذوق، شوق، حضور قلب، بھرپور ایمان

وَالنُّوْرِ وَلِتَوْشِيْحِ الْقَلْبِ بِحُلِيِّ الْمَعَارِفِ وَحُلَلِ الْحُبُوْرِ لِنَكُوْنَ بِفَضْلِكَ مِنْ
سَبَّاقِيْنَ فِيْ عَرَصَاتِ الْيَقِيْنِ وَاِلٰى مُنْتَهَى الْمَآرِبِ وَاصِلِيْنَ وَفِيْ بِحَارِ الْحَقَآئِقِ
مُتَوَرِّدِيْنَ - وَفِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِيَّاكَ نَعْبُدُ تَنْبِيْهٌ اٰخَرُ وَهُوَ اَنَّهٗ يُرَغِّبُ فِيْهِ عِبَادَهٗ
اِلٰى اَنْ يَّبْذُلُوْا فِيْ مُطَاوَعَتِهٖ جُهْدَ الْمُسْتَطِيْعِ وَيَقُوْمُوْا مُلَبِّيْنَ فِيْ كُلِّ حِيْنٍ
تَلْبِيَةَ الْمُطِيْعِ فَكَاَنَّ الْعِبَادَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّا لَا نَأْلُوْا فِي الْمُجَاهَدَاتِ وَفِي
امْتِثَالِكَ وَابْتِغَآءِ الْمَرْضَاةِ وَلٰكِنْ نَّسْتَعِيْنُكَ وَنَسْتَكْفِيْ بِكَ الْاِفْتِتَانَ
بِالْعُجْبِ وَالرِّيَآءِ وَنَسْتَوْهِبُ مِنْكَ تَوْفِيْقًا قَآئِدًا اِلَى الرُّشْدِ وَالرِّضَآءِ وَاِنَّا
ثَابِتُوْنَ عَلٰى طَاعَتِكَ وَعِبَادَتِكَ فَاكْتُبْنَا فِي الْمُطَاوِعِيْنَ - وَهُنَا اِشَارَةٌ اُخْرٰى
وَهِيَ اَنَّ الْعَبْدَ يَقُوْلُ يَا رَبِّ اِنَّا خَصَّصْنَاكَ بِمَعْبُوْدِيَّتِكَ وَاٰثَرْنَاكَ عَلٰى كُلِّ مَا
سِوَاكَ فَلَا نَعْبُدُ شَيْئًا اِلَّا وَجْهَكَ وَاِنَّا مِنَ الْمُوَحِّدِيْنَ - وَاخْتَارَ عَزَّ وَجَلَّ لَفْظَ
الْمُتَكَلِّمِ مَعَ الْغَيْرِ اِشَارَةً اِلٰى اَنَّ الدُّعَآءَ لِجَمِيْعِ الْاِخْوَانِ لَا لِنَفْسِ الدَّاعِيْ وَحَثَّ

(ملنے) کے لیے۔ روحانی طور پر (تیرے احکام پر) لبیک کہنے (کے لیے) سرور اور نور (کے لیے) اور معارف کے زیورات اور مسرت کے لباسوں کے ساتھ دل کو آراستہ کرنے کے لیے (تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں) تاہم تیرے فضل کے ساتھ یقین کے میدانوں میں سبقت لے جانے والے بن جائیں اور اپنے مقاصد کی انتہا کو پہنچ جائیں اور حقائق کے دریاؤں پر وارد ہو جائیں

پھر اللہ تعالیٰ کے الفاظ اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں ایک اور اشارہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس (آیت) میں اپنے بندوں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت میں انتہائی ہمت اور کوشش خرچ کریں اور اطاعت گذاروں کی طرح ہر وقت لبیک لبیک کہتے ہوئے (اس کے حضور) کھڑے رہیں گویا کہ یہ بندے یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے ربّ ہم مجاہدات کرنے تیرے احکام کے بجالانے اور تیری خوشنودی چاہنے میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے لیکن تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں اور عُجب اور ریا میں مبتلا ہونے سے تیری پناہ مانگتے ہیں اور ہم تجھ سے ایسی توفیق طلب کرتے ہیں جو ہدایت اور تیری خوشنودی کی طرف لے جانے والی ہو اور ہم تیری اطاعت اور تیری عبادت پر ثابت قدم ہیں۔ پس تو ہمیں اپنے اطاعت گذار بندوں میں لکھ لے۔

اور یہاں ایک اور اشارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ بندہ کہتا ہے کہ اے میرے ربّ ہم نے تجھے معبودیت کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے اور تیرے سوا جو کچھ بھی ہے اس پر تجھے ترجیح دی ہے پس ہم تیری ذات کے سوا اور کسی چیز کی عبادت نہیں کرتے اور ہم تجھے واحد اور یگانہ ماننے والوں میں سے ہیں۔ اس آیت میں خدائے عزّ و جل نے متکلم مع الغیر کا صیغہ اس

فِيْهِ عَلٰى مُسَالَمَةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَاتِّحَادِهِمْ وَ وَدَادِهِمْ وَعَلٰى اَنْ يَّعْنُوَ الدَّاعِیْ نَفْسَهٗ لِنُصْحِ اَخِيْهِ كَمَا يَعْنُوْ لِنُصْحِ ذَاتِهٖ وَيَهْتَمُّ وَيَقْلَقُ لِحَاجَاتِهٖ كَمَا يَهْتَمُّ وَيَقْلَقُ لِنَفْسِهٖ وَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَخِيْهِ وَيَكُوْنُ لَهٗ بِكُلِّ الْقَلْبِ مِنَ النَّاصِحِيْنَ۔ فَكَاَنَّهٗ تَعَالٰى يُوْصِیْ وَيَقُوْلُ يَا عِبَادِ تَهَادَوْا بِالدُّعَآءِ تَهَادِی الْاِخْوَانِ وَالْمُحِبِّيْنَ وَ اَمِدُّوْا دَعَوَاتِكُمْ وَتَبَاشُوْا نِيَّاتِكُمْ وَكُوْنُوْا فِی الْمَحَبَّةِ كَالْاِخْوَانِ وَالْاٰبَآءِ وَالْبَنِيْنَ۔

(کرامات الصادقین صفحہ ۷۷ تا صفحہ ۸۰)

اللہ جل شانہٗ نے آیہ کریمہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو مقدم رکھا تا اس بات کی طرف اشارہ کرے کہ جو کچھ عملی اور علمی طور پر ہم کو پہلے توفیق دی گئی ہے چاہیئے کہ ہم اس کو بجا لادیں اور پھر جو ہمارے علم اور طاقت سے باہر ہو اس میں خدا تعالیٰ سے امداد چاہیں۔ (البدر ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۲)

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اے خدا تو جو چار صفتوں کا مالک ہے تیری پرستش کرتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ اللہ کو چار صفتوں سے متصف مان کر صرف اقرار تک محدود نہ رکھے۔ بلکہ عملی طور سے اس بات کو ثابت کرے۔ کہ وہ واقعی اللہ کو اپنا ربّ مانتا ہے۔ اس کی ربوبیت کو اپنے عملوں سے ثابت کرے۔ دیکھو جو خدا کو خدا نہ مانے وہ سب کچھ کرے گا۔ چوری زنا بھی کرے گا جب تک عملی رنگ نہ ہو تو نہ مومن کہلا سکتا ہے نہ وہ فیض پاتا ہے۔ جو اگلے مقربوں اور راستبازوں پر ہوا۔ ایمان خدا کا ایک فضل ہے۔ جب آتا ہے تو وہ شخص عملی طور پر فاسقانہ

امر کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اختیار فرمایا ہے کہ یہ دعا تمام بھائیوں کے لیے ہے نہ صرف دعا کرنے والے کی اپنی ذات کے لیے اور اس میں (اللہ نے) مسلمانوں کو باہمی مصالحت، اتحاد اور دوستی کی ترغیب دی ہے اور یہ کہ دعا کرنے والا اپنے آپ کو اپنے بھائی کی خیر خواہی کے لیے اسی طرح مشقت میں ڈالے جیسا کہ وہ اپنی ذات کی خیر خواہی کے لیے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا ہے۔ اور اس کی (یعنی اپنے بھائی کی) ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایسا ہی اہتمام کرے اور بے چین ہو جیسے اپنے لیے بے چین اور مضطرب ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان کوئی فرق نہ کرے۔ اور پورے دل سے اس کا خیر خواہ بن جائے گویا اللہ تعالیٰ تاکیدی حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے اے میرے بندو بھائیوں اور محبوں کے (ایک دوسرے کو) تحائف دینے کی طرح دعا کا تحفہ دیا کرو (اور انہیں شامل کرلے کے لیے) اپنی دعاؤں کا دائرہ وسیع کرو اور اپنی نیتوں میں وسعت پیدا کرو (اپنے نیک ارادوں میں (اپنے بھائیوں کے لیے بھی) گنجائش پیدا کرو) اور باہم محبت کرنے میں بھائیوں، باپوں اور بیٹوں کی طرح بن جاؤ۔ (ترجمہ از مرتب)

کام نہیں کرتا۔ دراصل زبانی حساب انسان کو نجات نہیں دے سکتا۔

(البدر ۹ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

تدبیر اور دعا دونوں (کو) باہم ملا دینا اسلام ہے اسی واسطے میں نے کہا ہے کہ گناہ اور غفلت سے بچنے کے لیے اس قدر تدبیر کرے جو تدبیر کا حق ہے اور اس قدر دعا کرے جو دعا کا حق ہے۔ اسی واسطے قرآن شریف کی پہلی ہی سورہ فاتحہ میں ان دونوں باتوں کو مدنظر رکھ کر فرمایا ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ اسی اصل تدبیر کو بتاتا ہے اور مقدم اسی کو کیا ہے کہ پہلے انسان رعایت اسباب اور تدبیر کا حق ادا کرے مگر اس کے ساتھ ہی دعا کے پہلو کو چھوڑ نہ دے بلکہ تدبیر کے ساتھ ہی اس کو مدنظر رکھے۔ مومن جب اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہتا ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو معاً اس کے دل میں گذرتا ہے کہ میں کیا چیز ہوں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں جب تک اُس کا فضل اور کرم نہ ہو۔ اس لیے وہ معاً کہتا ہے اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ مدد بھی تجھ ہی سے چاہتے ہیں۔ یہ ایک نازک مسئلہ ہے جس کو بجز اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں سمجھا۔

(الحکم ۱۰ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اس سورۃ میں جس کا نام خاتم الکتاب اور ام الکتاب بھی ہے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے اور اس کے حصول کی کیا راہ ہے؟

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ گویا انسانی فطرت کا اصل تقاضا اور منشاء ہے اور وہ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے بغیر پورا نہیں ہوتا ہے لیکن اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کو اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ پر مقدم کر کے یہ بتایا ہے کہ پہلے ضروری ہے کہ جہاں تک انسان کی اپنی طاقت۔ ہمت اور سمجھ میں ہو خدا تعالیٰ کی رضامندی کی راہوں کے اختیار کرنے میں سعی اور مجاہدہ کرے اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ قوتوں سے پورا کام لے اور اس کے بعد پھر خدا تعالیٰ سے اس کی تکمیل اور نتیجہ خیز ہونے کے لیے دعا کرے۔

الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲
" ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں اگرچہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کو اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ پر تقدم ہے لیکن پھر بھی اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت نے سبقت کی ہوئی ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ بھی کسی قوت نے کہلوایا ہے اور وہ قوت جو پوشیدہ ہی پوشیدہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا اقرار کراتی ہے کہاں سے آئی کیا خدا تعالیٰ نے ہی وہ عطا نہیں فرمائی ہے؟ بیشک وہ خدا تعالیٰ کا ہی عطیہ ہے جو اس نے محض رحمانیت سے عطا فرمائی ہے۔ اس کی تحریک اور توفیق سے یہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ بھی کہتا ہے اس پہلو سے اگر غور کریں تو اس کو تاخر ہے اور دوسرے پہلو سے اس کو

تقدم ہے یعنی جب یہ قوت اس کو اس بات کی طرف لاتی ہے تو یہ تاخر ہو گیا اور بصورت اول تقدم۔ اسی طرح ہر سلسلہ نبوت کی فلاسفی کا خلاصہ یا مفہوم ہے۔ (الحکم ۱۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

خداوند کریم نے پہلی سورہ فاتحہ میں یہ تعلیم دی ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ اس جگہ عبادت سے مراد پرستش اور معرفت دونوں ہیں اور دونوں میں بندہ کا عجز ظاہر کیا گیا ہے۔

(الحکم ۳۰ جون ۱۸۹۹ء صفحہ ۳)

عبادت کے اصول کا خلاصہ اصل میں یہی ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح سے کھڑا کرے کہ گویا خدا کو دیکھ رہا ہے اور یا یہ کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ ہر قسم کی ملونی اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو جاوے اور اسی کی عظمت اور اسی کی ربوبیت کا خیال رکھے۔ ادعیہ ماثورہ اور دوسری دعائیں خدا سے بہت مانگے اور بہت توبہ و استغفار کرے اور بار بار اپنی کمزوری کا اظہار کرے تاکہ تزکیہ نفس ہو جاوے اور خدا سے پکا تعلق پیدا ہو جاوے اور اُسی کی محبت میں محو ہو جاوے۔ اور یہی ساری نماز کا خلاصہ ہے اور یہ سارا سورہ فاتحہ میں ہی آجاتا ہے دیکھو اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں اپنی کمزوریوں کا اظہار کیا گیا ہے اور امداد کے لیے خدا تعالیٰ سے ہی درخواست کی گئی ہے اور خدا تعالیٰ سے ہی مدد اور نصرت طلب کی گئی ہے۔ اور پھر اس کے بعد نبیوں اور رسولوں کی راہ پر چلنے کی دعا مانگی گئی ہے اور ان انعامات کو حاصل کرنے کے لیے درخواست کی گئی ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے اس دنیا پر ظاہر ہوئے ہیں اور جو انہیں کی اتباع اور انہیں کے طریقہ پر چلنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور پھر خدا تعالیٰ سے دعا مانگی گئی ہے کہ ان لوگوں کی راہوں سے بچا جنہوں نے تیرے رسولوں اور نبیوں کا انکار کیا اور شوخی اور شرارت سے کام لیا اور اسی جہان میں ہی ان پر غضب نازل ہوا۔ یا جنہوں نے دنیا کو ہی اپنا اصلی مقصود سمجھ لیا اور راہ راست کو چھوڑ دیا۔ (الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

انسان خدا کی پرستش کا دعویٰ کرتا ہے مگر کیا پرستش صرف بہت سے سجدوں اور رکوع اور قیام سے ہو سکتی ہے یا بہت مرتبہ تسبیح کے دانے پھیرنے والے پرستارِ الٰہی کہلا سکتے ہیں بلکہ پرستش اُس سے ہو سکتی ہے جس کو خدا کی محبت اس درجہ پر اپنی طرف کھینچے کہ اُس کا اپنا وجود درمیان سے اٹھ جائے اوّل خدا کی ہستی پر پورا یقین ہو اور پھر خدا کے حُسن و احسان پر پوری اطلاع ہو اور پھر اُس سے محبت کا تعلق ایسا ہو کہ سوزشِ محبت ہر وقت سینہ میں موجود ہو اور یہ حالت ہر ایک دم چہرہ پر ظاہر ہو اور خدا کی عظمت دل میں ایسی ہو کہ تمام دنیا اُس کی ہستی کے آگے مُردہ متصوّر ہو اور ہر ایک خوف اُسی کی ذات سے وابستہ ہو اور اسی کی درد میں لذت ہو اور اُسی کی خلوت میں راحت ہو اور اُس کے بغیر دل کو کسی کے ساتھ قرار نہ ہو۔ اگر ایسی حالت ہو جائے تو اس کا نام پرستش ہے

مگر یہ حالت بجز خدا تعالیٰ کی خاص مدد کے کیونکر پیدا ہو۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے یہ دعا سکھلائی اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی ہم تیری پرستش تو کرتے ہیں مگر کہاں حق پرستش ادا کر سکتے ہیں جب تک تیری طرف سے خاص مدد نہ ہو خدا کو اپنا حقیقی محبوب قرار دیکر اُس کی پرستش کرنا یہی ولایت ہے جس سے آگے کوئی درجہ نہیں مگر یہ درجہ بغیر اُس کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا اُس کے حاصل ہونے کی یہ نشانی ہے کہ خدا کی عظمت دل میں بیٹھ جائے خدا کی محبت دل میں بیٹھ جائے اور دل اُسی پر توکل کرے اور اُسی کو پسند کرے اور ہر ایک چیز پر اُسی کو اختیار کرے اور اپنی زندگی کا مقصد اسی کی یاد کو سمجھے ...... یہ بہت تنگ دروازہ ہے اور یہ شربت بہت ہی تلخ شربت ہے۔ تھوڑے لوگ ہیں جو اس دروازہ میں سے داخل ہوتے اور اس شربت کو پیتے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی صـ۵۱ و ۵۲)

خدا نے جو انسان کو بنایا اور اُس کے لیے شریعت اور حدود اور قوانین مقرر کیے تو اس سے یہ غرض نہیں کہ انسان کو نجات حاصل ہو بلکہ انسان تو تعبد ابدی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ سو اُس کے تدین سے یہی غرض تعبد ابدی ہے ہاں اس غرض کا نتیجہ ضرور یہ نجات ہے جس کا حصول اصل مقصود کے حصول پر موقوف ہے۔ اور شریعت اور احکام سے یہ غرض بھی نہیں کہ انسان گناہوں سے پاک ہو کیونکہ گناہوں سے پاک ہونا بھی اصل مقصود کا ایک نتیجہ لازمی ہے۔ سو جب انسان تعبّد اور اطاعت کا طریق اختیار کرتا ہے تو بالضرور گناہ سے دور رہ کر پاک ہو جاتا ہے۔ اور جب گناہ سے پاک ہو جاتا ہے تو گناہ کے پھلوں سے نجات پاتا ہے سو طریق نجات یہ ہے کہ صدق اور ثبات کے ساتھ اس مبدء انوار کے سامنے کھڑے ہونا جہاں سے نور کی کرنیں اُترتی ہیں اور وہ کھڑا ہونا دوسرے لفظوں میں استقامت کے نام سے موسوم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ[1] اور کچھ شک نہیں کہ جو شخص اس مبدء انوار کے سامنے کھڑا ہوگا اس پر نور کی کرنیں پڑیں گی اور نور کے اُترنے سے وہ ظلمت دور ہو گی جس کو گناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ کوئی ظلمت بغیر نور کے اُترنے کے دور نہیں ہو سکتی خدا تعالیٰ نور کو کروڑہا کوس سے نیچے اتارتا ہے تا ظلمت کو دور کرے۔ نور کے سامنے ظلمت نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن اگر یہ سوال ہو کہ کس وقت انسان کو کہا جائے گا کہ مبدء انوار کے سامنے کھڑا ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس وقت کہا جاوے گا کہ جب اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں حق کی طرف آجاوے اور سچائی سے پیار کرنے لگے۔ اور گناہ اس کو پیارا معلوم نہ ہو بلکہ نہایت کراہت کی نظر سے اس کو دیکھے اور اس دشمن سے مخلصی پانے کے لیے خدا سے مدد چاہے تب خدائے رحمٰن و رحیم اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اپنی طرف سے نور نازل کر کے اس کو اس ظلمت سے نجات بخشتا ہے اور یہ دعا اسی لیے تعلیم کی گئی۔

[1] هود - ع ۱۰

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی ہم اس بات میں تجھ سے اعانت چاہتے ہیں ہمیں اس راہ پر کھڑا کر جہاں تیرے انعام کی کرنیں اترتی ہیں۔

(الحکم ۱۷ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

استعانت کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل استمداد کا حق اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے اور اسی پر قرآن کریم نے زور دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ پہلے صفات الٰہی ربّ۔ رحمان۔ رحیم۔ مالک یوم الدین کا اظہار فرمایا۔ پھر سکھایا کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ یعنی عبادت بھی تیری کرتے ہیں اور استمداد بھی تجھ ہی سے چاہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اصل حق استمداد کا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے کسی انسان۔ حیوان۔ چرند پرند غرضیکہ کسی مخلوق کے لیے نہ آسمان پر نہ زمین پر یہ حق نہیں ہے۔ مگر ہاں دوسرے درجہ پر ظلی طور سے یہ حق اہل اللہ اور مردان خدا کو دیا گیا ہے۔ (الحکم ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ کے گناہ سے بچنے کے لیے یہ آیت ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ جو لوگ اپنے رب کے آگے انکسار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ شاید کوئی عاجزی منظور ہو جائے تو ان کا اللہ تعالیٰ خود مددگار ہو جاتا ہے۔

(البدر ۳۱ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲۱)

اِعْلَمْ اَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰی اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّ السَّعَادَةَ كُلَّهَا فِی اقْتِدَاءِ صِفَاتِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ وَحَقِیْقَةُ الْعِبَادَةِ الْاِنْصِبَاغُ بِصِبْغِ الْمَعْبُوْدِ وَھُوَ عِنْدَ اَھْلِ الْحَقِّ كَمَالُ السُّعُوْدِ فَاِنَّ الْعَبْدَ لَا یَكُوْنُ عَبْدًا فِی الْحَقِیْقَةِ عِنْدَ ذَوِی الْعِرْفَانِ اِلَّا بَعْدَ اَنْ تَصِیْرَ صِفَاتُهٗ اَظْلَالَ صِفَاتِ الرَّحْمَانِ فَمِنْ اَمَارَاتِ الْعُبُوْدِیَّةِ اَنْ تَتَوَلَّدَ فِیْهِ رُبُوْبِیَّةٌ كَرُبُوْبِیَّةِ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ وَكَذَالِكَ لِرَّحْمَانِیَّةُ وَالرَّحِیْمِیَّةُ وَصِفَةُ الْمُجَازَاةِ اَظْلَالًا لِصِفَاتِ

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام کی تمام سعادت خدائے رب العالمین کی صفات کی پیروی کرنے میں ہے۔ اور عبادت کی حقیقت معبود کے رنگ میں رنگین ہونا ہے۔ اور راستبازوں کے نزدیک کمال سعادت یہی ہے۔ چنانچہ خداشناس بزرگوں کے نزدیک بندہ درحقیقت اسی وقت عبد کہلا سکتا ہے جب اس کی صفات خدائے رحمان کی صفات کا پرتو بن جائیں۔ پس عبودیت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ انسان میں بھی حضرت العزت کے رنگ کی ربوبیت پیدا ہو جائے اور اسی طرح بطور ظلیت اس میں رحمانیت، رحیمیت اور

الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ وَهٰذَا هُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ الَّذِیْ اُمِرْنَا لِنَطْلُبَهٗ وَالشِّرْعَةُ الَّتِیْ اُوْصِیْنَا لِنَرْتَقِبَهَا مِنْ کَرِیْمٍ ذِی الْفَضْلِ الْمُبِیْنِ۔

ثُمَّ لَمَّا کَانَ الْمَانِعُ مِنْ تَحْصِیْلِ تِلْکَ الدَّرَجَاتِ الرِّیَآءُ الَّذِیْ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ وَالْکِبْرُ الَّذِیْ هُوَ رَاْسُ السَّیِّئَاتِ وَالضَّلَالُ الَّذِیْ یُبْعِدُ عَنْ طُرُقِ السَّعَادَاتِ اَشَارَ اِلٰی دَوَآءِ هٰذِهِ الْعِلَلِ الْمُهْلِکَاتِ رَحْمَةً مِّنْهُ عَلَی الضُّعَفَآءِ الْمُسْتَعِدِّیْنَ لِلْخَطِیَّاتِ وَتَرَحُّمًا عَلَی السَّالِکِیْنَ۔ فَاَمَرَ اَنْ یَّقُوْلَ النَّاسُ اِیَّاکَ نَعْبُدُ لِیَسْتَخْلِصُوْا مِنْ مَّرَضِ الرِّیَآءِ وَاَمَرَ اَنْ یَّقُوْلُوْا اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ لِیَسْتَخْلِصُوْا مِنْ مَّرَضِ الْکِبْرِ وَالْخُیَلَآءِ وَاَمَرَ اَنْ یَّقُوْلُوْا اِهْدِنَا لِیَسْتَخْلِصُوْا مِنَ الضَّلَالَاتِ وَالْاَهْوَآءِ فَقَوْلُهٗ اِیَّاکَ نَعْبُدُ حَثٌّ عَلٰی تَحْصِیْلِ الْخُلُوْصِ وَالْعُبُوْدِیَّةِ التَّآمَّةِ وَقَوْلُهٗ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِشَارَةٌ اِلٰی طَلَبِ الْقُوَّةِ وَالثَّبَاتِ وَالْاِسْتِقَامَةِ وَقَوْلُهٗ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ اِشَارَةٌ اِلٰی طَلَبِ عِلْمٍ مِّنْ عِنْدِهٖ وَهِدَایَةٍ مِّنْ لَّدُنْهُ لُطْفًا مِّنْهُ عَلٰی وَجْهِ الْکَرَامَةِ۔ فَحَاصِلُ الْاٰیَاتِ اَنَّ اَمْرَ السُّلُوْکِ لَا یَتِمُّ اَبَدًا وَّلَا

مالکیت یوم الدین کی صفات حضرتِ احدیت پیدا ہو جائیں۔ یہی وہ صراط مستقیم ہے جس کے متعلق ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اسے طلب کریں اور یہی وہ راستہ ہے جس کے متعلق ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ کھلے کھلے فضل والے خدا سے اس (کے ملنے) کی امید رکھیں۔

پھر چونکہ ان درجات کے حصول میں بڑی روک ریا کاری ہے جو نیکیوں کو کھا جاتی ہے اور تکبر ہے جو بدترین بدی ہے اور گمراہی ہے جو سعادت کی راہوں سے دُور لے جاتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے (اپنے) کمزور بندوں پر رحم فرماتے ہوئے جو خطا کاریوں پر آمادہ ہو سکتے ہیں اور اپنی راہ میں قدم مارنے والوں پر ترس کھا کر ان مہلک بیماریوں کی دواء کی طرف اشارہ فرمایا پس اُس نے حکم دیا کہ لوگ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہا کریں تا وہ ریا کی بیماری سے نجات پائیں اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہنے کا حکم دیا تا وہ کبر اور غرور سے بچ جائیں پھر اس نے اِھْدِنَا کہنے کا حکم دیا تا وہ گمراہیوں اور خواہشاتِ نفسانی سے چھٹکارا پائیں۔ پس اس کا قول اِیَّاکَ نَعْبُدُ خلوص اور عبودیت تامہ کے حصول کی ترغیب ہے۔ اور اس کا کلام اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ قوت، ثابت قدمی، استقامت کے طلب کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور اس کا کلام اِھْدِنَا الصِّرَاطَ اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم اور ہدایت طلب کی جائے جو وہ ازراہِ مہربانی بطور اکرام انسان کو عطا کرتا ہے۔ پس ان آیات کا ماحصل یہ ہے کہ خدا کا راہ سلوک اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ نجات کا

يَكُوْنُ وَسِيْلَةً لِّلنَّجَاةِ إِلَّا بَعْدَ كَمَالِ الْإِخْلَاصِ وَكَمَالِ الْجَهْدِ وَكَمَالِ فَهْمِ الْهِدَايَاتِ بَلْ كُلُّ خَادِمٍ لَّا يَكُوْنُ صَالِحًا لِّلْخِدْمَاتِ إِلَّا بَعْدَ تَحَقُّقِ هٰذِهِ الصِّفَاتِ۔

مَثَلًا إِنْ كَانَ خَادِمٌ مُّخْلِصًا وَّمَوْصُوْفًا بِأَوْصَافِ الْأَمَانَةِ وَالْخُلُوْصِ وَالْعِفَّةِ وَلٰكِنْ كَانَ مِنَ الْكُسَالٰى وَالْوَانِيْنَ الْقَاعِدِيْنَ وَكَالضُّجَعَةِ النُّوَمَةِ لَا مِنْ أَهْلِ السَّعْيِ وَالْجُهْدِ وَالْجِدِّ وَالْقُوَّةِ فَلَا شَكَّ أَنَّهٗ كَلٌّ عَلٰى مَوْلَاهُ وَلَا يَسْتَطِيْعُ أَنْ يَّتَّبِعَ هُدَاهُ وَيَكُوْنَ مِنَ الْمُطَاوِعِيْنَ - وَخَادِمٌ اٰخَرُ مُخْلِصٌ أَمِيْنٌ - وَمَعَ ذٰلِكَ مُجَاهِدٌ وَّلَيْسَ بِقَاعِدٍ كَالْاٰخَرِيْنَ - وَلٰكِنَّهٗ جَهُوْلٌ لَّا يَفْهَمُ هِدَايَاتِ مَخْدُوْمِهٖ وَيُخْطِئُ ذَاتَ مِرَارٍ كَالضَّآلِّيْنَ - فَمِنْ جَهْلِهٖ رُبَّمَا يَجْتَرِئُ عَلَى الْمَمْنُوْعَاتِ وَيُوْقِعُ نَفْسَهٗ فِي الْمَخَاطِرَاتِ وَالْمَحْظُوْرَاتِ وَيَبْعُدُ عَنْ مَّرْضَاةِ الْمَوْلٰى مِنْ جَهْلٍ جَاذِبٍ مِّنَ الْجَهَالَاتِ وَرُبَّمَا يُضِيْعُ نَفَآئِسَ الْمَوْلٰى وَدُرَرَهٗ وَجَوَاهِرَهٗ مِنْ كَمَالِ جَهْلِهٖ وَحُمْقِهٖ وَسُوْٓءِ فَهْمِهٖ وَيَضَعُ الْأَشْيَآءَ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهَا مِنْ زَيْغٍ وَهْمِهٖ فَهٰذَا الْخَادِمُ أَيْضًا لَّا

وسیلہ بن سکتا ہے جب تک انتہائی اخلاص، انتہائی کوشش اور ہدایات کے سمجھنے کی پوری اہلیت حاصل نہ ہو جائے بلکہ جب تک کسی خادم میں یہ صفات نہ پائی جائیں وہ درحقیقت خدمات کے قابل نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی خادم مخلص بھی ہے اور دیانت، نیک نیتی اور پاک دامنی کی صفات سے متصف بھی ہے لیکن وہ سست بے ہمت اور (بیکار) بیٹھ رہنے والوں میں سے ہے یا ہر وقت لیٹے رہنے اور سوئے رہنے والے غافل شخص کی طرح ہے اور وہ خادم جو کوشش، جدوجہد اور ہمت کرنے والوں میں سے نہ ہو تو بلاشبہ وہ اپنے مالک پر ایک بوجھ ہی ہوگا۔ اور اپنے آقا کی ہدایت کی پیروی نہیں کر سکے گا۔ اور اس کے فرمانبرداروں میں شمار نہ ہو سکے گا۔ ایک اور خادم جو نیک نیت اور دیانت دار بھی ہو اور ساتھ ہی محنتی بھی ہو اور دوسروں کی طرح بیٹھ رہنے والا نہ ہو لیکن بیوقوف ہو اور آقا کی ہدایت کو نہ سمجھ سکتا ہو اور گمراہوں کی طرح بار بار غلطیاں کرتا ہو، اپنی جہالت کی وجہ سے کئی دفعہ ممنوع کاموں پر جرأت کر بیٹھتا ہو، اپنے آپ کو خطرے کے مقامات اور ممنوع جگہوں میں ڈال دیتا ہو اور انتہائی بے وقوفی کی بنا پر آقا کی خوشنودی حاصل نہ کر سکتا ہو اور بسا اوقات وہ اپنے مالک کی عمدہ عمدہ چیزوں کو، اس کے موتیوں کو اور اس کے جواہرات کو اپنی کمال بے وقوفی، نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے ضائع کر دیتا ہو اور اپنی بدحواسی کی وجہ سے اشیاء کو ان کی اصل جگہ کے علاوہ کہیں اور جگہ رکھ دیتا ہو تو ایسا خادم بھی آقا کی خوشنودی

يَسْتَطِيْعُ اَنْ يَّسْتَحْصِلَ مَرْضَاةَ الْمَخْدُوْمِ وَيُسْقِطُهٗ جَهْلُهٗ كُلَّ مَرَّةٍ عَنْ اَعْيُنِ مَوْلَاهُ فَيَبْكِيْ كَالْمَوْقُوْمِ وَكَذَالِكَ يَعِيْشُ دَآئِمًا كَالْمَلْعُوْنِ الْمَلُوْمِ وَلَا يَكُوْنُ مِنَ الْمَمْدُوْحِيْنَ بَلْ يَرَاهُ الْمَوْلٰى كَالْمَنْحُوْسِ الَّذِيْ لَا يَأْتِيْ بِخَيْرٍ فِيْ سَيْرٍ وَّ يُخْرِبُ بُقْعَتَهٗ وَرِحَالَهٗ وَاَمْوَالَهٗ فِيْ كُلِّ حِيْنٍ ۔

وَاَمَّا الْخَادِمُ الْمُبَارَكُ وَالْعَبْدُ الْمُتَبَرَّكُ الَّذِيْ يُرْضِيْ مَوْلَاهُ وَلَا يَتْرُكُ نُكْتَةً مِّنْ هُدَاهُ وَيَسْمَعُ مَرْحَبَاهُ فَهُوَ الَّذِيْ يَجْمَعُ فِيْ نَفْسِهٖ هٰذِهِ الثَّلٰثَ سَوِيًّا وَّلَا يُؤْذِيْ مَوْلَاهُ بِخِيَانَةٍ وَّجَدَالٍ وَّلَا يُطَخْطِخُهٗ بِكَسَلٍ اَوْ جَهْلٍ فَيَصِيْرُ عَبْدًا مَّرْضِيًّا فَهٰذِهٖ هِيَ الْاَشْرَاطُ الثَّلَاثَةُ لِلَّذِيْنَ يَسْلُكُوْنَ سُبُلَ رَبِّهِمْ مُّسْتَرْشِدِيْنَ۔ وَفِيْ اِيَّاكَ نَعْبُدُ اِشَارَةٌ اِلَى الشَّرْطِ الْاَوَّلِ وَاِلَى الشَّرْطِ الثَّانِيْ فِيْ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ وَاِلَى الثَّالِثِ فِيْ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ فَطُوْبٰى لِلَّذِيْنَ جَمَعُوْا هٰذِهِ الثَّلٰثَ وَرَجَعُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ كَامِلِيْنَ ۔ وَتَاَدَّبُوْا مَعَ رَبِّهِمْ بِكُلِّ الْاَدَبِ وَسَلَكُوْا بِكُلِّ شَرِيْطَةٍ غَيْرَ

حاصل نہیں کرسکتا۔ اور اس کی نادانی اسے ہر بار اپنے مالک کی نظروں سے گرا دیتی ہے۔ پس وہ ذلیل ومحروم انسان کی طرح روتا رہتا ہے اور اس طرح ہمیشہ ایک قابل ملامت ملعون انسان کی مانند زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ وہ کبھی قابل تعریف لوگوں میں شامل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کا مالک اسے (ہمیشہ) منحوس جیسا سمجھتا ہے۔ جو اپنی بھاگ دوڑ سے کبھی بھی کسی بھلائی (کی خبر) نہیں لاتا۔ وہ (خادم) اس کی زمینوں، اس کے مکانات اور اس کے اموال کو ہر وقت برباد کرتا رہتا ہے۔

لیکن مبارک خادم اور متبرک بندہ وہ ہوتا ہے جو اپنے مالک کو راضی رکھتا ہے اور اس کی ہدایت کے کسی نکتہ کو نظر انداز نہیں کرتا۔ مالک کی طرف سے خوش آمدید سنتا ہے تو یہی (ایسا شخص) ہے جو اپنی ذات میں ان تین (صفات) کو کامل طور پر جمع کرتا ہے اور اپنے آقا کو اپنی بددیانتی اور بے انصافی سے دکھ نہیں دیتا اور نہ اُسے کاہلی یا نادانی سے برباد کرتا ہے اور وہ ایک پسندیدہ عبد بن جاتا ہے۔ پس یہی تین شرائط ہیں ان لوگوں کے لیے جو پورے طالب ہدایت ہو کر اپنے رب (تک پہنچنے) کے راستوں پر چلتے ہیں۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں پہلی شرط کی طرف اشارہ ہے اور دوسری شرط کی طرف اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں اور تیسری شرط کی طرف اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں۔ پس سعادت انہی لوگوں کے لیے ہے جو ان تینوں (صفات) کو اپنے اندر جمع کرلیں اور کامل ہو کر اپنے رب کی طرف لوٹیں۔ وہ اپنے رب کے ساتھ پورے ادب کا لحاظ رکھتے ہیں اور منازل

فَاصِرِيْنَ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَدَخَلُوْا حَظِيْرَةَ الْقُدْسِ اٰمِنِيْنَ۔ وَلَمَّا كَانَتْ هٰذِهِ الشَّرَآئِطُ اَهَمَّ الْاُمُوْرِ لِلَّذِيْ قَصَدَ سُبُلَ النُّوْرِ جَعَلَهَا اللّٰهُ الْحَكِيْمُ مِنْ اَجْزَآءِ الدُّعَآءِ لِيَتَدَبَّرَ السَّالِكُ كَالْعُقَلَآءِ وَلِيَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْخَائِنِيْنَ ٭ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۶)

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○

اِعْلَمْ اَنَّ حَقِيْقَةَ الْعِبَادَةِ الَّتِيْ يَقْبَلُهَا الْمَوْلٰى بِاِمْتِنَانِهٖ۔ هِيَ التَّذَلُّلُ التَّامُّ بِرُؤْيَةِ عَظَمَتِهٖ وَعُلُوِّ شَانِهٖ۔ وَالثَّنَآءُ عَلَيْهِ بِمُشَاهَدَةِ مِنَنِهٖ وَاَنْوَاعِ اِحْسَانِهٖ وَاِيْثَارُهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ بِمَحَبَّةِ حَضْرَتِهٖ وَتَصَوُّرِ مَحَامِدِهٖ وَجَمَالِهٖ وَلَمَعَانِهٖ وَتَطْهِيْرُ الْجَنَانِ مِنْ وَسَاوِسِ الْجِنَّةِ نَظْرًا اِلٰى جِنَانِهٖ۔ وَمِنْ اَفْضَلِ الْعِبَادَاتِ اَنْ يَّكُوْنَ الْاِنْسَانُ مُحَافِظًا عَلَى الصَّلَوٰتِ الْخَمْسِ فِيْ اَوَائِلِ اَوْقَاتِهَا۔ وَاَنْ يَّجْهَدَ لِلْحُضُوْرِ وَالذَّوْقِ وَالشَّوْقِ وَتَحْصِيْلِ بَرَكَاتِهَا۔ مُوَاظِبًا عَلٰى اَدَآءِ مَفْرُوْضَاتِهَا

سلوک ہر شرط کے مطابق بغیر کسی کوتاہی کے طے کرتے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن سے خدا تعالیٰ راضی ہے اور وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ وہ بارگاہ قدس میں امن کے ساتھ داخل ہو گئے ہیں۔ پس چونکہ یہ شرائط اس شخص کے لیے اہم امور میں سے تھے جو نور کی راہوں کا قصد کرتا ہے اس لیے حکیم خدا نے ان (شرائط) کو دعا کے حصے بنا دیا ہے۔ تا ہر سالک عقلمندوں کی طرح غور و فکر کرے اور خیانت کرنے والوں کی راہ بھی پوری طرح واضح ہو جائے۔

واضح ہو کہ اس عبادت کی حقیقت جسے اللہ تعالیٰ اپنے کرم و احسان سے قبول فرماتا ہے (وہ درحقیقت چند امور پر مشتمل ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی بلند و بالا شان کو دیکھ کر مکمل فروتنی اختیار کرنا نیز اس کی مہربانیاں اور قسم قسم کے احسان دیکھ کر اس کی حمد و ثنا کرنا اس کی ذات سے محبت رکھتے ہوئے اور اس کی خوبیاں جمال اور نور کا تصور کرتے ہوئے اسے ہر چیز پر ترجیح دینا اور اس کی جنت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے دل کو شیطانوں کے وسوسوں سے پاک کرنا ہے۔

اور سب سے افضل عبادت یہ ہے کہ انسان التزام کے ساتھ پانچوں نمازیں ان کے اول وقت پر ادا کرنے اور فرض اور سنتوں کی ادائیگی پر مداومت رکھتا ہو اور حضور قلب، ذوق، شوق اور عبادت کی برکات کے حصول میں پوری طرح کوشاں رہے

وَمَسْنُوْنَاتِهَا۔ فَاِنَّ الصَّلٰوةَ مَرْكَبٌ يُّوْصِلُ الْعَبْدَ اِلٰى رَبِّ الْعِبَادِ۔ فَيَصِلُ بِهَا اِلٰى مَقَامٍ لَّا يَصِلُ اِلَيْهِ عَلٰى صَهَوَاتِ الْجِيَادِ۔ وَصَيْدُهَا لَا يُصَادُ بِالسِّهَامِ۔ وَسِرُّهَا لَا يَظْهَرُ بِالْاَقْلَامِ۔ وَمَنِ الْتَزَمَ هٰذِهِ الطَّرِيْقَةَ فَقَدْ بَلَغَ الْحَقَّ وَالْحَقِيْقَةَ۔ وَالْفَى الْحِبَّ الَّذِىْ هُوَ فِىْ حُجُبِ الْغَيْبِ وَنَجَا مِنَ الشَّكِّ وَالرَّيْبِ۔ فَتَرٰى اَيَّامَهٗ غُرَرًا وَّ كَلَامَهٗ دُرَرًا وَّ وَجْهَهٗ بَدْرًا وَّ مَقَامَهٗ صَدْرًا۔ وَّمَنْ ذَلَّ لِلّٰهِ فِىْ صَلٰوتِهٖ اَذَلَّ اللّٰهُ لَهُ الْمُلُوْكَ وَيَجْعَلُ مَالِكًا هٰذَا الْمَمْلُوْكَ۔ ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ حَمِدَ ذَاتَهٗ اَوَّلًا فِىْ قَوْلِهٖ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ ثُمَّ حَثَّ النَّاسَ عَلَى الْعِبَادَةِ بِقَوْلِهٖ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ فَفِىْ هٰذِهٖ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ الْعَابِدَ فِى الْحَقِيْقَةِ هُوَ الَّذِىْ يَحْمَدُهٗ حَقَّ الْمَحْمَدَةِ۔ فَحَاصِلُ هٰذَا الدُّعَآءِ وَالْمَسْئَلَةِ اَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ اَحْمَدَ كُلَّ مَنْ تَصَدّٰى لِلْعِبَادَةِ۔ وَعَلٰى هٰذَا كَانَ مِنَ الْوَاجِبَاتِ اَنْ يَّكُوْنَ اَحْمَدُ فِىْ اٰخِرِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى قَدَمِ اَحْمَدَ الْاَوَّلِ الَّذِىْ هُوَ سَيِّدُ

کیونکہ نماز ایک ایسی سواری ہے جو بندہ کو پروردگار عالم تک پہنچاتی ہے۔ اس کے ذریعہ (انسان) ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں گھوڑوں کی پیٹھوں پر (بیٹھ کر) نہ پہنچ سکتا۔ اور نماز کا شکار (ثمرات) تیروں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا اس کا راز قلموں سے ظاہر نہیں ہو سکتا ہے اور جس شخص نے اس طریق کو لازم پکڑا اس نے حق اور حقیقت کو پالیا اور اس محبوب تک پہنچ گیا جو غیب کے پردوں میں ہے اور شک وشبہ سے نجات حاصل کرلی۔ پس تو دیکھے گا کہ اس کے دن روشن ہیں اس کی باتیں موتیوں کی مانند ہیں اور اس کا چہرہ چودھویں کا چاند ہے۔ اس کا مقام صدر نشینی ہے جو شخص نماز میں اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی سے جھکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے بادشاہوں کو جھکا دیتا ہے اور اس مملوک بندہ کو مالک بنا دیتا ہے۔

نیز سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے الفاظ الحمد للہ رب العالمین میں اپنی حمد بیان فرمائی۔ پھر اپنے کلام ایاک نعبد وایاک نستعین میں لوگوں کو عبادت کی ترغیب دی۔ پس اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت عبادت گذار وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی حمد اس طور پر کرے جو حمد کے کرنے کا حق ہے۔ پس اس دعا اور درخواست کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو احمد بنا دیتا ہے جو اس کی عبادت میں لگا رہے اس بنا پر ضروری تھا کہ اس امت کے آخر میں بھی کوئی احمد ظاہر ہو اس پہلے احمدؐ کے نقش قدم پر جو سرور کائنات (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں تا

الْكَائِنَاتِ. لِيُفْهِمَ أَنَّ الدُّعَاءَ اسْتُجِيبَ مِنْ حَضْرَةِ مُسْتَجِيبِ الدَّعَوَاتِ
وَلِيَكُوْنَ ظُهُوْرُهُ لِلْاِسْتِجَابَةِ كَالْعَلَامَاتِ. فَهٰذَا هُوَ الْمَسِيْحُ الَّذِيْ كَانَ
وَعْدُ ظُهُوْرِهٖ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ. مَكْتُوْبًا فِي الْفَاتِحَةِ وَفِي الْقُرْاٰنِ. ثُمَّ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ
اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ الْعَبْدَ لَا يُمْكِنُهُ الْاِتْيَانُ بِالْعُبُوْدِيَّةِ اِلَّا بِتَوْفِيْقٍ مِّنَ الْحَضْرَةِ
الْاَحَدِيَّةِ. وَمِنْ فُرُوْعِ الْعِبَادَةِ اَنْ تُحِبَّ مَنْ يُّعَادِيْكَ كَمَا تُحِبُّ نَفْسَكَ
وَبَنِيْكَ. وَاَنْ تَكُوْنَ مُقِيْلًا لِّلْعَثَرَاتِ مُتَجَاوِزًا عَنِ الْهَفَوَاتِ
وَتَعِيْشَ تَقِيًّا نَّقِيًّا سَلِيْمَ الْقَلْبِ طَيِّبَ الذَّاتِ وَ وَفِيًّا صَفِيًّا
مُنَزَّهًا عَنْ ذَمَائِمِ الْعَادَاتِ. وَاَنْ تَكُوْنَ وُجُوْدًا نَّافِعًا لِّخَلْقِ اللّٰهِ بِخَاصِّيَّةِ
الْفِطْرَةِ كَبَعْضِ النَّبَاتَاتِ مِنْ غَيْرِ التَّكَلُّفَاتِ وَالتَّصَنُّعَاتِ. وَاَنْ لَّا تُؤْذِيَ
اُخَيَّاكَ بِكِبْرٍ مِّنْكَ وَلَا تَجْرَحَهُ بِكَلِمَةٍ مِّنَ الْكَلِمَاتِ. بَلْ عَلَيْكَ اَنْ تُجِيْبَ
الْاَخَ الْمُغْضَبَ بِتَوَاضُعٍ وَّلَا تُحَقِّرَهُ فِي الْمُخَاطَبَاتِ. وَتَمُوْتَ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتَ
وَتَحْسِبَ نَفْسَكَ مِنَ الْاَمْوَاتِ. وَتُعَظِّمَ كُلَّ مَنْ جَاءَكَ وَلَوْ جَاءَكَ فِي الْاَطْمَارِ
لَا فِي الْحُلَلِ وَالْكِسْوَاتِ. وَتُسَلِّمَ عَلٰى مَنْ تَعْرِفُهٗ وَعَلٰى مَنْ لَّا تَعْرِفُهٗ وَتَقُوْمَ
مُتَصَدِّيًا لِّلْمُوَاسَاةِ. (اعجاز المسیح صفحہ ۱۶۱ تا صفحہ ۱۶۵)

معلوم ہو جائے کہ دعاؤں کو قبول فرمانے والی بارگاہ سے اس دعاء فاتحہ کو قبولیت کا شرف حاصل ہے اور تاکہ اس (احمد) کا ظہور قبولیت دعا کے لیے بطور نشانات کے ہو۔ یہی وہ مسیح ہے جس کا آخری زمانہ میں ظہور کا وعدہ سورۃ فاتحہ میں بھی اور قرآن کریم میں بھی لکھا ہوا ہے۔ پھر اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کسی بندہ کے لیے ممکن نہیں کہ اس وحدہٗ لاشریک کی بارگاہ سے توفیق پانے کے بغیر عبادت کا حق ادا کرے اور عبادت کی فروع میں یہ بھی ہے کہ تم اس شخص سے بھی جو تم سے دشمنی رکھتا ہو ایسی ہی محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے اور اپنے بیٹوں سے کرتے ہو اور یہ کہ تم دوسروں کی لغزشوں سے درگذر کرنے والے اور ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنے والے بنو اور نیک دل اور پاک نفس ہو کر پرہیزگاروں والی صاف اور پاکیزہ زندگی گذارو۔ اور تم بُری عادتوں سے پاک ہو کر باوفا اور باصفا زندگی بسر کرو۔ اور یہ کہ خلق اللہ کے لیے بلا تکلف و تصنع بعض نباتات کی مانند نفع رساں وجود بن جاؤ۔ اور یہ کہ تم اپنے کبر سے اپنے کسی چھوٹے بھائی کو دکھ نہ دو۔ اور نہ کسی بات سے اس (کے دل) کو زخمی کرو۔ بلکہ تم پر واجب ہے کہ اپنے ناراض بھائی کو خاکساری سے جواب دو اور اسے مخاطب کرنے میں اس کی تحقیر نہ کرو اور مرنے سے پہلے مر جاؤ اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرلو اور جو کوئی (ملنے کے لیے) تمہارے پاس آئے اس کی عزت کرو خواہ وہ پرانے بوسیدہ کپڑوں میں ہو نہ کہ نئے جوڑوں اور عمدہ لباس میں۔ اور تم ہر شخص کو السلام علیکم کہو خواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔ اور (لوگوں کی) غم خواری کے لیے ہر دم تیار کھڑے رہو۔ (ترجمہ از مرتب)

فرماتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یعنی یہ دُعا کرو کہ ہم تیری پرستش کرتے ہیں۔ اور تجھ سے اُن تمام باتوں میں مدد چاہتے ہیں۔ سو یہ تمام اشارے نیستی اور تذلل کی طرف ہیں تا انسان اپنے تئیں کچھ چیز نہ سمجھے۔

(ست بچن صفحہ ۸۸)

ہریک کام دینی ہو یا دنیوی اُس میں استمداد سے پہلے اپنی خدا داد طاقت اور ہمت کا خرچ کرنا ضروری ہے اور پھر اُس فعل کی تکمیل کے لیے مدد طلب کرنا۔ خدا نے ہم کو ہماری ہر روزہ عبادت میں بھی یہی تعلیم دی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہیں نہ یہ کہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ وَ اِیَّاکَ نَعْبُدُ۔

(اشتہار اسلامی انجمنوں کی خدمت میں التماس ضروری منسلکہ براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ الف)

دیکھو اللہ تعالیٰ نے اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی تعلیم دی ہے۔ اب ممکن تھا کہ انسان اپنی قوت پر بھروسہ کر لیتا اور خدا سے دور ہو جاتا۔ اس لیے ساتھ ہی اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تعلیم دیدی کہ یہ مت سمجھو کہ یہ عبادت جو میں کرتا ہوں اپنی قوت اور طاقت سے کرتا ہوں ہرگز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی استعانت جب تک نہ ہو اور خود وہ پاک ذات جب تک توفیق اور طاقت نہ دے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اِیَّاکَ اَعْبُدُ یا اِیَّاکَ اَسْتَعِیْنُ نہیں کہا اس لیے کہ اس میں نفس کے تقدم کی بُو آتی تھی۔ اور یہ تقوی کے خلاف ہے۔ تقوی والا کل انسانوں کو لیتا ہے۔

(الحکم ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

جو شخص دعا اور کوشش سے مانگتا ہے وہ متقی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یاد رکھو کہ جو شخص پوری فہم اور عقل اور زور سے تلاش نہیں کرتا وہ خدا کے نزدیک ڈھونڈنے والا نہیں قرار پاتا اور اس طرح سے امتحان کرنے والا ہمیشہ محروم رہتا ہے لیکن اگر وہ کوششوں کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور پھر اُسے کوئی لغزش ہوتی ہے تو خدا اُسے بچاتا ہے اور جو آسانی تن کے ساتھ دروازہ پر آتا ہے اور امتحان لیتا ہے تو خدا کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ (البدر ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۴)

اس سے بڑھ کر کوئی نعمت انسان کے لیے نہیں ہے کہ اُسے گناہ سے نفرت ہو اور خدا تعالیٰ خود اُسے معاصی سے بچا لیوے مگر یہ بات نری تدبیر یا نری دعا سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ دونوں سے مل کر حاصل ہو گی جیسے کہ خدا تعالیٰ نے تعلیم دی ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ جس کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ قویٰ خدا تعالیٰ نے انسان کو عطا کیے ہیں اُن سے پورا کام لے کر پھر وہ انجام کو خدا کے سپرد کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے عرض کرتا ہے کہ جہاں تک تو نے مجھے توفیق عطا کی تھی اُس حد تک تو میں نے اس سے کام لے لیا یہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے معنے ہیں اور پھر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

کہ کر خدا سے امداد چاہتا ہے کہ باقی مرحلوں کے لیے میں تجھ سے استمداد طلب کرتا ہوں۔ وہ بہت نادان ہے جو کہ خدا کے عطا کیے ہوئے قویٰ سے تو کام نہیں لیتا اور صرف دعا سے مدد چاہتا ہے ایسا شخص کامیابی کا منہ کس طرح دیکھے گا۔

(البدر یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

مومن..... تدبیر اور دعا دونوں سے کام لیتا ہے۔ پوری تدبیر کرتا ہے اور پھر معاملہ خدا پر چھوڑ کر دعا کرتا ہے اور یہی تعلیم قرآن شریف کی پہلی ہی سورۃ میں دی گئی ہے چنانچہ فرمایا ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ جو شخص اپنے قویٰ سے کام نہیں لیتا ہے وہ نہ صرف اپنے قویٰ کو ضائع کرتا اور ان کی بے حرمتی کرتا ہے بلکہ وہ گناہ کرتا ہے۔

(الحکم ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

قرآن شریف میں جو بڑے بڑے وعدے متقیوں کے ساتھ ہیں وہ ایسے متقیوں کا ذکر ہے جنھوں نے تقویٰ کو وہاں تک نبھایا جہاں تک اُن کی طاقت تھی بشریت کے قویٰ نے جہاں تک اُن کا ساتھ دیا برابر تقویٰ پر قائم رہے حتّٰی کہ اُن کی طاقتیں ہار گئیں اور پھر خدا سے انہوں نے اور طاقت طلب کی جیسے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ سے ظاہر ہے۔ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ یعنی اپنی طاقت تک تو ہم نے کام کیا اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ یعنی آگے چلنے کے لیے اور نئی طاقت تجھ سے طلب کرتے ہیں۔

(الحکم ۱۰ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

انسان میں نیکی کا خیال ضرور ہے پس اسی خیال کے واسطے اس کو امداد الٰہی کی بہت ضرورت ہے۔ اسی لیے پنج وقتہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا حکم دیا۔ اُس میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ۔ فرمایا۔ اور پھر اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ یعنی عبادۃ بھی تیری ہی کرتے ہیں اور مدد بھی تجھ ہی سے چاہتے ہیں۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے یعنی ہر نیک کام میں۔ قویٰ۔ تدابیر۔ جدوجہد سے کام لیں۔ یہ اشارہ ہے۔ نَعۡبُدُ۔ کی طرف۔ کیونکہ جو شخص نری دعاء کرتا اور جدوجہد نہیں کرتا وہ بہریاب نہیں ہوتا جیسے کسان بیج بو کر اگر جدوجہد نہ کرے تو پھل کا امیدوار کیسے بن سکتا ہے۔ اور یہ سنّت اللہ ہے۔ اگر بیج بو کر صرف دعا کرتے ہیں تو ضرور محروم رہیں گے۔

(الحکم ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

جو لوگ اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو چھوڑتے ہیں ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کا نام خدا پر بھروسہ ہے اسباب سے کام لینا اور خدا تعالیٰ کے عطا کردہ قویٰ کو کام میں لگانا یہ بھی خدا تعالیٰ کی قدر ہے جو لوگ ان قویٰ سے کام نہیں لیتے اور منہ سے کہتے ہیں کہ ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں وہ بھی جھوٹے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی قدر نہیں کرتے خدا تعالیٰ کو آزماتے ہیں۔ اور اس کی عطا کی ہوئی قوتوں

اور طاقتوں کو لغو قرار دیتے ہیں اور اس طرح پر اس کے حضور شوخی اور گستاخی کرتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے مفہوم سے دور جا پڑتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا ظہور چاہتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں جہاں تک ممکن اور طاقت ہو رعایت اسباب کرے لیکن ان اسباب کو اپنا معبود اور مشکل کشا قرار نہ دے بلکہ کام لے کر پھر تفویض الی اللہ کرے اور اس بات پر سجدات شکر بجالائے کہ اسی خدا نے وہ قوٰے اور طاقتیں اس کو عطا فرمائی ہیں۔ (الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے یہی معنے ہیں کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اُن ظاہری سامانوں اور اسباب کی رعایت سے جو تو نے عطا کیے ہیں۔ دیکھو! یہ زبان جو عروق اور اعصاب سے خلق کی ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی تو ہم بول نہ سکتے۔ ایسی زبان دعا کے واسطے عطا کی جو قلب کے خیالات تک کو ظاہر کر سکے۔ اگر ہم دعا کا کام زبان سے کبھی نہ لیں تو یہ ہماری شور بختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر وہ زبان کو لگ جاویں تو یک دفعہ ہی زبان اپنا کام چھوڑ بیٹھتی ہے یہاں تک کہ انسان گونگا ہو جاتا ہے پس یہ کیسی رحیمیت ہے کہ ہم کو زبان دے رکھی ہے۔ ایسا ہی کانوں کی بناوٹ میں فرق آجاوے تو خاک بھی سنائی نہ دے۔ ایسا ہی قلب کا حال ہے وہ جو خشوع و خضوع کی حالت رکھی ہے۔ اور سوچنے اور تفکر کی قوتیں رکھی ہیں۔ اگر بیماری آجاوے تو وہ سب قریباً بیکار ہو جاتی ہیں۔ مجنونوں کو دیکھو کہ اُن کے قوٰی کیسے بیکار ہو جاتے ہیں تو پس کیا یہ ہم کو لازم نہیں کہ ان خداداد نعمتوں کی قدر کریں؟ اگر ان قوٰی کو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال فضل سے ہم کو عطا کیے ہیں بیکار چھوڑ دیں تو لاریب ہم کافر نعمت ہیں۔ پس یاد رکھو کہ اگر اپنی قوتوں اور طاقتوں کو معطل چھوڑ کر دعا کرتے ہیں تو یہ دعا کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی کیونکہ جب ہم نے پہلے عطیہ ہی سے کچھ کام نہیں لیا تو دوسرے کو کب اپنے لیے مفید اور کار آمد بنا سکیں گے؟ پس اِیَّاکَ نَعْبُدُ یہ تبلا رہا ہے کہ اے ربّ العالمین! تیرے پہلے عطیہ کو بھی ہم نے بیکار اور برباد نہیں کیا۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں یہ ہدایت فرمائی ہے کہ انسان خدائے تعالیٰ سے سچی بصیرت مانگے کیونکہ اگر اس کا فضل اور کرم دستگیری نہ کرے تو عاجز انسان ایسی تاریکی اور اندھکار میں پھنسا ہوا ہے کہ وہ دعا ہی نہیں کر سکتا۔ پس جب تک انسان خدا کے اُس فضل کو جو رحمانیت کے فیضان سے اُسے پہنچا ہے کام میں لا کر دعا نہ مانگے۔ کوئی نتیجہ بہتر نہیں نکال سکتا۔

میں نے عرصہ ہوا انگریزی قانون میں یہ دیکھا تھا کہ تقاوی کے لیے پہلے کچھ سامان دکھانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح سے قانون قدرت کی طرف دیکھو کہ جو کچھ ہم کو پہلے ملا ہے اُس سے کیا بنایا؟ اگر عقل و ہوش آنکھ کان رکھتے ہوئے نہیں بہکے ہو۔ اور حمق اور دیوانگی کی طرف نہیں گئے تو دعا کرو۔ اور بھی فیض الٰہی ملیگا۔ ورنہ محرومی اور بدقسمتی

کے محسن ہیں۔

بسا اوقات ہمارے دوستوں کو عیسائیوں سے واسطہ پڑیگا۔ وہ دیکھیں گے کہ کوئی بھی بات نادانوں میں ایسی نہیں جو حکیم خدا کی طرف منسوب ہو سکے حکمت کے معنے کیا ہیں؟ وَضْعُ الشَّيْءِ فِي مَحَلِّهِ۔ مگر ان میں دیکھوگے کوئی فعل اور حکم بھی اس کا مصداق نظر نہیں آتا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر جب ہم پر غور نظر کرتے ہیں تو اشارۃ النص کے طور پر پتہ لگتا ہے کہ بظاہر تو اس سے دعاء کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے کہ صراط المستقیم کی ہدایت مانگنے کی تعلیم ہے۔ لیکن اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اس کے سر پر تیلا رہا ہے کہ اُس سے فائدہ اٹھاویں۔ یعنی راہ راست کے منازل کے لیے قوائے سلیم سے کام لیکر استعانت اللٰی کو مانگنا چاہیئے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۵۰-۱۵۱)

جب انسان اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہہ کر صدق اور وفاداری کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک بڑی نہر صدق کی کھول دیتا ہے جو اس کے قلب پر آ کر گرتی ہے اور اسے صدق سے بھر دیتی ہے وہ اپنی طرف سے بضاعۃ مزجاۃ لاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اعلیٰ درجہ کی گراں قدر جنس اس کو عطا کرتا ہے اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس مقام میں انسان یہاں تک قدم مارے کہ وہ صدق اس کے لیے ایک خارق عادت نشان ہو۔ اس پر اس قدر معارف اور حقائق کا دریا کھلتا ہے اور ایسی قوت دی جاتی ہے کہ ہر شخص کی طاقت نہیں ہے کہ اس کا مقابلہ کرے۔

(الحکم ۱۷ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

صدیق کے کمال کے حصول کا فلسفہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی کمزوری اور ناداری کو دیکھ کر اپنی طاقت اور حیثیت کے موافق اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہتا ہے اور صدق اختیار کرتا اور جھوٹ کو ترک کر دیتا ہے اور ہر قسم کے رجس اور پلیدی سے جو جھوٹ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے دور بھاگتا ہے اور عہد کر لیتا ہے کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا نہ جھوٹی گواہی دوں گا۔ اور جذبہ نفسانی کے رنگ میں کوئی جھوٹی کلام نہ کرونگا۔ نہ لغو طور پر نہ کسب خیر کے لیے نہ دفع شر کے لیے یعنی کسی رنگ اور حالت میں بھی جھوٹ کو اختیار نہیں کروں گا۔ جب اس حد تک وعدہ کرتا ہے تو گویا اِيَّاكَ نَعْبُدُ پر وہ ایک خاص عمل کرتا ہے اور وہ عمل اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ سے آگے اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ہے۔ خواہ یہ اس کے مونہہ سے نکلے یا نہ نکلے لیکن اللہ تعالیٰ جو مبدء الفیوض اور صدق اور راستی کا چشمہ ہے اس کو ضرور مدد دے گا اور صداقت کے اعلیٰ اصول اور حقائق اس پر کھول دیگا۔

(الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن شریف نے دو نام پیش کیے ہیں اَلْحَيُّ اور اَلْقَيُّوْمُ۔ اَلْحَيُّ

کے معنے ہیں خود زندہ اور دوسروں کو زندگی عطا کرنے والا۔ اَلْقَیُّوْمُ خود قائم اور دوسروں کے قیام کا اصلی باعث ہر ایک چیز کا ظاہری باطنی قیام اور زندگی انہیں دونوں صفات کے طفیل سے ہے پس حی کا لفظ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے جیسا کہ اس کا مظہر سورۃ فاتحہ میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ ہے اور القیوم چاہتا ہے کہ اس سے سہارا طلب کیا جاوے اس کو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

(الحکم ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے صاف پایا جاتا ہے کہ کچھ نہیں چاہتے تیری عبادت کرتے ہیں اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے دعا کرتے ہیں گویا اِیَّاکَ نَعْبُدُ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] اور لَنَبْلُوَنَّکُمْ[2] کو ملایا ہے نَعْبُدُ تو یہی ہے کہ بھلائی برائی کا خیال نہ رہے سلب اُمید و امانی ہو۔ اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں دعا کی تعلیم ہے۔

(الحکم ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں جہاں الرّبّ الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین کے حسن و احسان کی طرف سے تحریک ہوتی ہے وہاں انسان کی عاجزی اور بے کسی بھی ساتھ ہی محرک ہوتی ہے اور وہ ایاک نستعین کہہ اٹھتا ہے۔

(الحکم ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں تقویٰ ہی کی تعلیم ہے اس سے بڑھ کر کون متقی ہو سکتا ہے جو عبادت کر کے پھر استعانت چاہتا ہے۔

(الحکم ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں لذت نہیں آتی مگر میں بتلاتا ہوں کہ بار بار پڑھے اور کثرت کے ساتھ پڑھے تقویٰ کے ابتدائی درجہ میں قبض شروع ہو جاتی ہے اس وقت یہ کرنا چاہیئے کہ خدا کے پاس اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا تکرار کیا جائے۔ شیطان کشفی حالت میں چور یا قزاق دکھایا جاتا ہے اس کا استغاثہ جناب الٰہی میں کرے کہ یہ قزاق لگا ہوا ہے تیرے ہی دامن کو پنجہ مارتے ہیں جو اس استغاثہ میں لگ جاتے ہیں اور تھکتے ہی نہیں وہ ایک قوت اور طاقت پاتے ہیں جس سے شیطان ہلاک ہو جاتا ہے۔ مگر اس قوت کے حصول اور استغاثہ کے پیش کرنے کے واسطے ایک صدق اور سوز کی ضرورت ہے۔ اور یہ چور کے تصور سے پیدا ہوگا جو ساتھ لگا ہوا ہے وہ گویا ننگا کرنا چاہتا ہے اور آدم والا ابتلاء لانا چاہتا ہے۔ اس تصور سے روح چلا کر بول اٹھے گی اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔

(الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

---

[1] المومن ع ۶۰۔ [2] البقرۃ ع ۱۹۔ و محمد ع ۴۔

نمازوں میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کا تکرار بہت کرو۔ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ خدا کے فضل اور گم شدہ متاع کو واپس لاتا ہے۔ (الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

فقرہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ تمام باطل معبودوں کی تردید کرتا ہے اور مشرکین کا ردّ اس میں موجود ہے۔ کیوں کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کو بیان فرمایا ہے اُس سے مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ یعنی صفات کاملہ والے خدا جو رب العالمین رحمٰن رحیم مالک یوم الدین ہے تیری ہی عبادت ہم کرتے ہیں۔ یہ ہر چہار صفات جو ام الصفات کہلاتی ہیں معبودان باطلہ میں کہاں پائی جاتی ہیں جو لوگ پتھروں یا درختوں یا حیوانات اور اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں ان میں ان صفات کو ثابت نہیں کر سکتے۔

اور اسی طرح اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں ان لوگوں کا رد ہے جو دعا اور اُس کی قبولیت کے منکر ہیں۔

(الحکم ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱-۲)

انسان کو چاہیئے کہ ہر وقت اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کی دعا پر کاربند رہے اور اُسی سے توفیق طلب کرے۔ ایسا کرنے سے انسان خدا کی تجلیات کا مظہر بھی بن سکتا ہے۔ چاند جب آفتاب کے مقابل میں ہوتا ہے تو اُسے نور ملتا ہے مگر جوں جوں اُس سے کنارہ کشی کرتا ہے توں توں اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال ہے انسان کا جب تک اُس کے دروازہ پر گرا رہے اور اپنے آپ کو اُس کا محتاج خیال کرتا رہے تب تک اللہ تعالیٰ اُسے اُٹھاتا اور نوازتا ہے ورنہ جب وہ اپنی قوت بازو پر بھروسا کرتا ہے تو وہ ذلیل کیا جاتا ہے کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ[1] بھی اسی واسطے فرمایا گیا ہے۔ (الحکم ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

توحید تین قسم کی ہے ایک توحید علمی کہ جو تصحیح عقائد سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسری توحید عملی کہ جو قوائے اخلاقی کو خدا کے راستہ میں کرنے سے یعنی فنا فی اخلاق اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ تیسری توحید حالی جو اپنے ہی نفس کا حال اچھا بنانے سے حاصل ہوتی ہے یعنی نفس کو کمال تزکیہ کے مرتبہ تک پہنچانا اور غیر اللہ سے صحن قلب کو بالکل خالی کرنا۔ اور نابود اور بے نمود ہو جانا یہ توحید بوجہ کامل تب میسّر آتی ہے کہ جب جذبہ الٰہی انسان کو پکڑے اور بالکل اپنے نفس سے نابود کر دے اور بجز فضل الٰہی کے نہ یہ علم سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ عمل سے۔ اسی کے لیے عابدین مخلصین کی زبان پر نعرہ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ہے۔

(الحکم ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

---

[1] التوبۃ ع ۱۵۔

آیت ۶-۷ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

اَمَّا الْهِدَايَةُ الَّتِيْ قَدْ اُمِرْنَا لِطَلَبِهَا فِي الْفَاتِحَةِ فَهُوَ اقْتِدَآءُ مَحَامِدِ ذَاتِ اللّٰهِ وَصِفَاتِهِ الْاَرْبَعَةِ وَاِلٰى هٰذَا يُشِيْرُ اللَّامُ الَّذِيْ مَوْجُوْدٌ فِيْ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ وَيَعْرِفُهٗ مَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ الْفَهْمَ السَّلِيْمَ وَلَا شَكَّ اَنَّ هٰذِهِ الصِّفَاتِ اُمَّهَاتُ الصِّفَاتِ وَهِيَ كَافِيَةٌ لِتَطْهِيْرِ النَّاسِ مِنَ الْهَنَاتِ وَاَنْوَاعِ السَّيِّاٰتِ فَلَا يُؤْمِنُ بِهَا عَبْدٌ اِلَّا بَعْدَ اَنْ يَّاْخُذَ مِنْ كُلِّ صِفَةٍ حَظَّهٗ وَيَتَخَلَّقَ بِاَخْلَاقِ رَبِّ الْكَائِنَاتِ فَمَنِ اسْتَفَاضَ مِنْهَا فَيُفْتَحُ عَلَيْهِ بَابٌ عَظِيْمٌ مِّنْ مَّعْرِفَةِ الرَّبِّ الْمَحْبُوْبِ وَتَتَجَلّٰى لَهٗ عَظَمَتُهٗ فَتَحْصُلُ الْاِنَابَةُ وَالتَّنَفُّرُ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالسَّكِيْنَةُ وَالْاِخْبَاتُ وَالْاِمْتِثَالُ الْحَقِيْقِيُّ وَالْخَشْيَةُ وَالْاُنْسُ وَالذَّوْقُ وَالشَّوْقُ وَالْمَوَاجِيْدُ الصَّحِيْحَةُ وَالْمَحَبَّةُ الذَّاتِيَّةُ الْمُفْنِيَةُ الْمُحْرِقَةُ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُرَبِّي السَّالِكِيْنَ ؛

(کرامات الصادقین صفحہ ۱۰۳)

ترجمہ: جس ہدایت کے طلب کرنے کا ہمیں سورۃ فاتحہ میں حکم دیا گیا ہے وہ ذاتِ باری کی خوبیوں اور اس کی چاروں (مذکورہ) صفات کی پیروی کرنا ہے اور اسی کی طرف وہ الف لام اشارہ کر رہا ہے جو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں موجود ہے۔ اس بات کو وہ شخص سمجھ سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عقلِ سلیم عطا فرمائی ہو اور کچھ شک نہیں کہ یہ چاروں صفات ربانی تمام صفات کے لیے بطور اصل کے ہیں اور یہ لوگوں کو قابلِ نفرت باتوں اور قسما قسم کی بُرائیوں سے پاک کرنے کے لیے کافی ہیں۔ پس کوئی بندہ اُس وقت تک ان پر ایمان نہیں لاتا جب تک کہ وہ ان میں سے ہر صفت سے اپنا حصّہ نہ لے اور پروردگارِ عالم کے اخلاق کو اختیار نہ کر لے۔ پس جو کوئی بھی ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اُس پر محبوب رب کی معرفت کا ایک عظیم دروازہ کھولا جاتا ہے اور اس (رب) کی عظمت اس کے لیے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ پس (اسے) اللہ تعالیٰ کے اذن سے جو سالکین کی تربیت کرنے والا ہے رجوع الی اللہ، گناہوں سے نفرت، سکینت، تواضع، حقیقی اطاعت، خشیت، اُنس، ذوق و شوق۔ صحیح وجدانی کیفیات اور (فنا فی اللہ) کرنے والی اور (گناہوں کو) بھسم کر ڈالنے والی ذاتی محبت حاصل ہو جاتی ہے۔

وَكَذٰلِكَ عَلَّمَ اللّٰهُ عِبَادَهٗ دُعَآءَ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔

وَمَعْلُوْمٌ اَنَّ مِنْ اَنْوَاعِ الْهِدَايَةِ كَشْفٌ وَّاِلْهَامٌ وَّرُؤْيَا صَالِحَةٌ وَّمُكَالَمَاتٌ وَّمُخَاطَبَاتٌ وَّتَحْدِيْثٌ لِّيَنْكَشِفَ بِهَا غَوَامِضُ الْقُرْاٰنِ وَيَزْدَادَ الْيَقِيْنُ ۔ بَلْ لَا مَعْنٰى لِلْاِنْعَامِ مِنْ غَيْرِ هٰذِهِ الْفُيُوْضِ السَّمَاوِيَّةِ فَاِنَّهَا اَصْلُ الْمَقَاصِدِ لِلسَّالِكِيْنَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَنْكَشِفَ عَلَيْهِمْ دَقَآئِقُ الْمَعْرِفَةِ وَيَعْرِفُوْا رَبَّهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا وَيَزْدَادُوْا حُبًّا وَّاِيْمَانًا وَّيَصِلُوْا مَحْبُوْبَهُمْ مُّتَبَتِّلِيْنَ فَلِاَجْلِ ذٰلِكَ حَثَّ اللّٰهُ عِبَادَهٗ عَلٰۤى اَنْ يَّطْلُبُوْا هٰذَا الْاِنْعَامَ مِنْ حَضْرَتِهٖ فَاِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِّنْ عَطَشِ الْوِصَالِ وَالْيَقِيْنِ وَالْمَعْرِفَةِ فَرَحِمَهُمْ وَاَعَدَّ كُلَّ مَعْرِفَةٍ لِّلطَّالِبِيْنَ۔ ثُمَّ اَمَرَهُمْ لِيَطْلُبُوْهَا فِي الصَّبَاحِ وَالْمَسَآءِ وَاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا اَمَرَهُمْ اِلَّا بَعْدَ مَا رَضِيَ بِاِعْطَآءِ هٰذِهِ النَّعْمَآءِ بَلْ بَعْدَمَا قَدَّرَ لَهُمْ اَنْ يُّرْزَقُوْا مِنْهَا وَبَعْدَ مَا جَعَلَهُمْ وُرَثَآءَ الْاَنْبِيَآءِ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ كُلَّ نِعْمَةِ الْهِدَايَةِ عَلٰى طَرِيْقِ الْاِصَالَةِ فَانْظُرْ كَيْفَ

ترجمہ: اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی دُعا سکھائی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ ہدایت کی اقسام میں کشف، الہام، رؤیا صالحہ، مکالمات ومخاطبات اور محدّثیت شامل ہیں تاکہ ان کے ذریعہ قرآن کریم کے اسرار کھلیں اور یقین بڑھے۔ ان آسمانی فیوض کے سوا انعام کے اور کوئی معنے نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں اُن سالکوں کا اصل مقصد ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ اُن پر معرفتِ الٰہی کے دقائق کُھلیں اور وہ اپنے ربّ کو اسی دنیا میں پہچان لیں۔ محبّت اور ایمان میں ترقی کریں۔ اور دنیا سے مُنہ موڑ کر اپنے محبوب کا وصال حاصل کرلیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس بات کی ترغیب دلائی ہے کہ وہ اس کی بارگاہ سے یہ انعام طلب کیا کریں کیونکہ وہ (اللہ) ان کے دلوں میں وصال اور یقین اور معرفت کے حصول کی جو پیاس ہے اُسے خوب جانتا ہے پس اُس نے ان پر رحم کیا اور اپنے طالبوں کے لیے ہر قسم کی معرفت تیار کی پھر ان (طالبوں) کو حکم دیا کہ وہ صبح وشام اور رات اور دن معرفت طلب کرتے رہیں اور اُس نے اُنہیں یہ حکم تبھی دیا جب وہ خود ان نعمتوں کے عطا کرنے پر راضی تھا۔ بلکہ اس بات کا فیصلہ کرلیا تھا کہ انہیں ان (نعمتوں) میں سے (کچھ حصّہ ضرور) دیا جائے گا اور انہیں ان نبیوں کا وارث بنانا مقدّر کیا جنہیں ان سے پہلے براہِ راست ہدایت کی ہر نعمت دی

مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَاَمَرَنَا فِیْ اُمِّ الْکِتَابِ لِنَطْلُبَ فِیْہِ ھِدَایَاتِ الْاَنْبِیَآءِ کُلَّھَا لِیَکْشِفَ عَلَیْنَا کُلَّمَا کَشَفَ عَلَیْھِمْ وَلٰکِنْ بِالْاِتِّبَاعِ وَالظِّلِّیَّۃِ وَعَلٰی قَدْرِ ظُرُوْفِ الْاِسْتِعْدَادَاتِ وَالْھِمَمِ فَکَیْفَ نَرُدُّ نِعْمَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ اُعِدَّتْ لَنَا اِنْ کُنَّا طُلَبَآءَ الْھِدَایَۃِ وَکَیْفَ نُنْکِرُھَا بَعْدَ مَا اُخْبِرْنَا عَنْ اَصْدَقِ الصَّادِقِیْنَ ؁

(حَمَامَۃُ البُشْرٰی صفحہ ۸۰ و ۸۱)

اِنَّ تَعْلِیْمَ کِتَابِ اللّٰہِ الْاَحْکَمِ وَرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ مُنْقَسِمًا عَلٰی ثَلٰثَۃِ اَقْسَامٍ۔ اَلْاَوَّلُ اَنْ یَّجْعَلَ الْوُحُوْشَ اُنَاسًا وَّ یُعَلِّمَھُمْ اٰدَابَ الْاِنْسَانِیَّۃِ وَیَھَبَ لَھُمْ مَدَارِکَ وَحَوَآسًا۔ وَالثَّانِیْ اَنْ یَّجْعَلَھُمْ بَعْدَ الْاِنْسَانِیَّۃِ اَکْمَلَ النَّاسِ فِیْ مَحَاسِنِ الْاَخْلَاقِ۔ وَالثَّالِثُ اَنْ یَّرْفَعَھُمْ مِّنْ مَّقَامِ الْاَخْلَاقِ اِلٰی ذُرٰی مَرْتَبَۃِ حُبِّ الْخَلَّاقِ۔ وَیُوْصِلَ اِلٰی مَنْزِلِ الْقُرْبِ وَالرِّضَآءِ وَالْمَعِیَّۃِ وَالْفَنَآءِ وَالذَّوْبَانِ وَالْمَحْوِیَّۃِ اَعْنِیْ اِلٰی مَقَامٍ یَّنْعَدِمُ فِیْہِ اَثَرُ الْوُجُوْدِ وَالْاِخْتِیَارِ۔ وَیَبْقَی اللّٰہُ وَحْدَہٗ کَمَا ھُوَ یَبْقٰی بَعْدَ فَنَآءِ ھٰذَا الْعَالَمِ بِذَاتِہِ الْقَھَّارِ۔ فَھٰذِہٖ اٰخِرُ الْمَقَامَاتِ لِلسَّالِکِیْنَ وَالسَّالِکَاتِ وَاِلَیْہِ تَنْتَھِیْ مَطَایَا الرِّیَاضَاتِ۔ وَفِیْہِ یَخْتَتِمُ سُلُوْکُ الْوِلَایَاتِ۔ وَھُوَ الْمُرَادُ مِنَ الْاِسْتِقَامَۃِ فِیْ دُعَآءِ سُوْرَۃِ الْفَاتِحَۃِ۔ وَکُلَّمَا یَتَضَرَّمُ مِنْ اَھْوَآءِ النَّفْسِ الْاَمَّارَۃِ۔ فَتَذُوْبُ فِیْ ھٰذَا الْمَقَامِ بِحُکْمِ اللّٰہِ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْعِزَّۃِ فَتُفْتَحُ الْبَلْدَۃُ کُلُّھَا وَلَا تَبْقَی الصَّوْضَاۃُ لِعَامَّۃِ الْاَھْوَآءِ۔ وَ یُقَالُ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ ذِی الْمَجْدِ وَالْکِبْرِیَآءِ ؁ (نجم الہدیٰ۔ صفحہ ۷)

گئی تھی۔ پس دیکھیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کتنا احسان کیا ہے اور ہمیں اُمّ الکتاب (یعنی سورۃ فاتحہ) میں حکم دیا ہے کہ ہم اس سورۃ میں انبیاء کی تمام ہدایتیں طلب کریں تاکہ ہم پر بھی وہ تمام امور منکشف کر دے جو ان (نبیوں) پر منکشف کیے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ متابعت اور ظلیت کے طور پر اور استعدادوں اور ہمتوں کے اندازہ کے مطابق ہے۔ پس اگر ہم (سچ مچ) ہدایت کے خواہشمند ہیں تو پھر ہم کس طرح اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو رد کریں جو ہمارے لیے تیار کی گئی ہے اور ہم اللہ اصدق الصادقین (خدا) کی طرف سے اطلاع دئے جانے کے بعد کس طرح اِس نعمت کا انکار کریں۔

(ترجمہ از مرتب)

ترجمہ: قرآن شریف کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تین قسم پر منقسم تھی۔ پہلی یہ کہ وحشیوں کو انسان بنایا جائے اور انسانی آداب اور حواس اُن کو عطا کیے جائیں۔ اور دوسری یہ کہ انسانیت سے ترقی دیکر اخلاق کاملہ کے درجے تک اُن کو پہنچایا جائے۔ اور تیسری یہ کہ اخلاق کے مقام سے اُن کو اٹھا کر محبت الٰہی کے مرتبہ تک پہنچایا جائے اور یہ کہ قرب اور رضا اور معیت اور فنا (اور گدازش) اور محویت کے مقام اُن کو عطا ہوں یعنی وہ مقام جس میں وجود اور اختیار کا نشان باقی نہیں رہتا اور خدا اکیلا باقی رہ جاتا ہے جیسا کہ وہ اس عالم کے فنا کے بعد اپنی ذات قہار کے ساتھ باقی رہے گا۔ پس یہ سالکوں کے لیے کیا مرد اور کیا عورت آخری مقام ہے اور ریاضتوں کے تمام مرکب اسی پر جاکر ٹھہر جاتے ہیں۔ اور اسی میں اولیاء کے ولایتوں کے سلوک ختم ہوتے ہیں۔ اور وہ استقامت جس کا ذکر سورہ فاتحہ کی دعا میں ہے اس سے مراد یہی مرتبہ سلوک ہے۔ اور نفس امّارہ کی جس قدر ہوا و ہوس بھڑکتی ہے وہ اسی مقام میں خدائے ذوالجبروت والعزت کے حکم سے گداز ہوتی ہے۔ پس تمام شہر فتح ہو جاتا ہے اور ہوا و ہوس کے عوام کا شور باقی نہیں رہتا اور کہا جاتا ہے کہ آج کس کا ملک ہے اور یہ جواب ہوتا ہے کہ خدائے ذوالمجد والکبریاء کا۔

(نجم الہدیٰ صے)

خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی راہ پا یوں کہو کہ ہدایت کے اسباب اور وسائل تین ہیں۔ یعنی ایک یہ کہ کوئی گم گشتہ محض خدا کی کتاب کے ذریعہ سے ہدایت یاب ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر خدا تعالیٰ کی کتاب سے اچھی طرح سمجھ نہ سکے تو عقلی شہادتوں کی روشنی اس کو راہ دکھلا دے۔ اور تیسرے یہ کہ اگر عقلی شہادتوں سے بھی مطمئن نہ ہو سکے تو آسمانی نشان اُس کو اطمینان بخشیں۔ یہ تین طریق ہیں جو بندوں کے مطمئن کرنے کے لیے قدیم سے عادۃ اللہ میں داخل ہیں یعنی ایک سلسلہ کتب ایمانیہ جو سماع اور نقل کے رنگ میں عام لوگوں تک پہنچتا ہے جن کی خبروں اور ہدایتوں پر ایمان لانا ہر ایک مومن کا فرض ہے اور اُن کا مخزن اتم اور اکمل قرآن شریف ہے۔ دوسرا سلسلہ معقولات کا جس کا منبع اور ماخذ دلائل عقلیہ ہیں۔ تیسرا سلسلہ آسمانی نشانوں کا جس کا سرچشمہ نبیوں کے بعد ہمیشہ امام الزمان اور مجدد الوقت ہوتا ہے۔ اصل وارث ان نشانوں کے انبیا علیہم السلام ہیں۔ پھر جب اُن کے معجزات اور نشان مدت مدید کے بعد منقول کے رنگ میں ہو کر ضعیف التاثیر ہو جاتے ہیں تو خدا تعالیٰ اُن کے قدم پر کسی اور کو پیدا کرتا ہے تا پیچھے آنے والوں کے لیے نبوت کے عجائب کرشمے بطور منقول ہو کر مُردہ اور بے اثر نہ ہو جائیں۔ بلکہ وہ لوگ بھی بذات خود نشانوں کو دیکھ کر اپنے ایمانوں کو تازہ کریں۔

(کتاب البریہ صفحہ ۲۸ و ۲۹)

وَفِیْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ یُعَلِّمُ اللّٰهُ تَعَالٰی عِبَادَهُ الْمُسْلِمِیْنَ فَکَاَنَّهٗ یَقُوْلُ یَا عِبَادِ اِنَّکُمْ رَئَیْتُمُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی فَاجْتَنِبُوْا شِبْهَ اَعْمَالِهِمْ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ الدُّعَآءِ وَالْاِسْتِقَامَةِ وَلَا تَنْسَوْا نَعْمَآءَ اللّٰهِ کَالْیَهُوْدِ فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبُهٗ وَلَا تَتْرُکُوا الْعُلُوْمَ الصَّادِقَةَ وَالدُّعَآءَ وَلَا تَهِنُوْا مِنْ طَلَبِ الْهِدَایَةِ کَالنَّصَارٰی فَتَکُوْنُوْا مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ وَحَثَّ عَلٰی طَلَبِ الْهِدَایَةِ اِشَارَةً اِلٰی اَنَّ الثَّبَاتَ عَلَی الْهِدَایَةِ لَا یَکُوْنُ اِلَّا بِدَوَامِ الدُّعَآءِ وَالتَّضَرُّعِ فِیْ حَضْرَةِ اللّٰهِ وَمَعَ ذٰلِکَ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّ الْهِدَایَةَ اَمْرٌ مِّنْ لَّدَیْهِ وَالْعَبْدُ لَا یَهْتَدِیْ اَبَدًا مِّنْ غَیْرِ اَنْ یَّهْدِیَهُ اللّٰهُ وَیُدْخِلَهٗ فِی الْمَهْدِیِّیْنَ۔ وَاِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّ الْهِدَایَةَ غَیْرُ مُتَنَاهِیَةٍ وَّتَرَقِّی النُّفُوْسِ اِلَیْهَا بِسُلَّمِ الدَّعَوَاتِ وَمَنْ تَرَکَ الدُّعَآءَ فَاَضَاعَ سُلَّمَهٗ فَاِنَّمَا الْحَرِیُّ بِالْاِهْتِدَآءِ مَنْ کَانَ رَطْبَ اللِّسَانِ بِالدُّعَآءِ وَذِکْرِ رَبِّهٖ وَکَانَ عَلَیْهِ مِنَ الْمُدَاوِمِیْنَ۔ وَمَنْ تَرَکَ الدُّعَآءَ وَادَّعَی الْاِهْتِدَآءَ فَعَسٰی اَنْ یَّتَزَیَّنَ لِلنَّاسِ بِمَا لَیْسَ فِیْهِ وَیَقَعَ فِیْ هُوَّةِ الشِّرْکِ وَالرِّیَآءِ وَ

ترجمہ: اور اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ اپنے مسلمان بندوں کو تعلیم دیتا ہے۔ پس گویا وہ فرماتا ہے اے میرے بندو! تم نے یہود و نصاریٰ کو دیکھ لیا ہے۔ تم اُن جیسے اعمال کرنے سے اجتناب کرو اور دُعاء اور استقامت کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو اور یہود کی مانند اللہ کی نعمتوں کو مت بُھلاؤ ورنہ اُس کا غضب تم پر نازل ہوگا۔ اور تم سچّے علوم اور دُعا کو مت چھوڑو اور نصاریٰ کی طرح طلب ہدایت میں سُست نہ ہو جاؤ۔ ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ اور ہدایت کے طلب کرنے کی ترغیب دی اس (بات کی) طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ہدایت پر ثابت قدمی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء اور گریہ وزاری میں دوام کے بغیر ممکن نہیں۔ مزید برآں اِس طرف بھی اشارہ ہے کہ ہدایت ایک ایسی چیز ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی (ملتی) ہے اور جب تک کہ خدا تعالیٰ خود بندہ کی رہنمائی نہ کرے اور اُسے ہدایت یافتہ لوگوں میں داخل نہ کردے وہ ہرگز ہدایت نہیں پا سکتا۔ پھر اس (امر کی) طرف بھی اشارہ ہے کہ ہدایت کی کوئی انتہاء نہیں اور انسان دعاؤں کی سیڑھی کے ذریعہ ہی اس تک پہنچ سکتے ہیں اور جس شخص نے دُعا کو چھوڑ دیا اس نے اپنی سیڑھی کھو دی۔ یقیناً ہدایت پانے کے قابل وُہی ہے جس کی زبان ذکرِ الٰہی اور دعاء سے تر رہے اور وہ اس پر دوام اختیار کرنے والوں میں سے ہو۔

اور جس کسی نے بھی دُعاء کو چھوڑ کر ہدایت یافتہ ہونے کا دعویٰ کیا تو قریب ہے کہ وہ لوگوں کی خاطر ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو آراستہ ظاہر کرے جو اُس میں نہیں (پائی جاتیں) اور وہ شرک اور ریاکاری کے گڑھے میں گر جائے۔ اور

يَخْرُجَ مِنْ جَمَاعَةِ الْمُخْلِصِينَ - وَالْمُخْلِصُ يَتَرَقّٰى يَوْمًا فَيَوْمًا حَتّٰى يَصِيْرَ مُخْلَصًا بِفَتْحِ اللَّامِ وَتَهَبُ لَهُ الْعِنَايَةُ سِرًّا يَّكُوْنُ بَيْنَ اللّٰهِ وَبَيْنَهٗ وَيَدْخُلُ فِي الْمَحْبُوْبِيْنَ - وَيَتَنَزَّلُ مَنْزِلَةَ الْمَقْبُوْلِيْنَ - وَالْعَبْدُ لَا يَبْلُغُ حَقِيْقَةَ الْاِيْمَانِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّفْهَمَ حَقِيْقَةَ الْاِخْلَاصِ وَيَقُوْمَ عَلَيْهَا وَلَا يَكُوْنُ مُخْلِصًا وَّعِنْدَهٗ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ شَيْءٌ يَتَّكِلُ عَلَيْهِ اَوْ يَخَافُهٗ اَوْ يَحْسَبُهٗ مِنَ النَّاصِرِيْنَ - وَلَا يَنْجُوْا اَحَدٌ مِّنْ غَوَآئِلِ النَّفْسِ وَشُرُوْرِهَا اِلَّا بَعْدَ اَنْ يَّتَقَبَّلَهُ اللّٰهُ بِاِخْلَاصِهٖ وَيَعْصِمَهٗ بِفَضْلِهٖ وَحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ وَيُذِيْقَهٗ مِنْ شَرَابِ الرُّوْحَانِيِّيْنَ لِاَنَّهَا خَبِيْثَةٌ وَّقَدِ انْتَهَتْ اِلٰى غَايَةِ الْخُبْثِ وَصَارَتْ مَنْشَأَ الْاَهْوِيَةِ الْمُضِلَّةِ الرَّدِيَّةِ الْمُرْدِيَةِ فَعَلَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى عِبَادَهٗ اَنْ يَّفِرُّوْا اِلَيْهِ بِالدُّعَآءِ عَآئِذًا مِّنْ شُرُوْرِهَا وَدَوَاهِيْهَا لِيُدْخِلَهُمْ فِيْ زُمَرِ الْمَحْفُوْظِيْنَ - وَاِنَّ مَثَلَ جَذَبَاتِ النَّفْسِ كَمَثَلِ الْحُمَّيَاتِ الْحَادَّةِ فَكَمَا تَجِدُ عِنْدَ تِلْكَ الْحُمَّيَاتِ اَعْرَاضًا هَآئِلَةً مُّشْتَدَّةً مِّثْلَ النَّافِضِ وَالْبَرْدِ وَالْقُشَعْرِيْرَةِ وَمِثْلَ

مخلصوں کی جماعت سے نکل جائے۔ اور مُخلِص بندہ دن بدن ترقّی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ مُخلَص (بفتح لام بمعنی برگزیدہ) بن جاتا ہے اور (باری تعالیٰ) کی عنایت اُسے ایک ایسا راز عطا کرتی ہے جو صرف خدا اور اس کے درمیان ہی ہوتا ہے اور وہ محبوبوں کے زُمرہ میں داخل ہو جاتا ہے اور مقبول بندوں کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے اور کوئی بندہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ اخلاص کی حقیقت کو سمجھ نہ لے۔ اس پر قائم نہ ہو جائے۔ (اسی طرح وہ مُخلِص نہیں بن سکتا جب تک اُس کے نزدیک زمین میں ایسی چیز موجود ہو جس پر بھروسہ کرتا ہو یا وہ اس سے ڈرتا ہو یا اُسے منجملہ دوسرے مددگاروں کے گمان کرتا ہو۔ کوئی شخص نفس کی ہلاکتوں اور شرارتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک اس کے اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُسے قبول نہ کرلے اور اپنے فضل، طاقت اور قوّت سے اس کی حفاظت نہ کرے اور اُسے رُوحانی لوگوں کی شراب نہ چکھائے کیونکہ وہ (یعنی نفس امّارہ) پلید ہے اور وہ اپنی پلیدی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اور ہلاکت خیز اور گمراہ کن بُری خواہشات کے نشوونما پانے کا محل ہے پس اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ دعائیں کرتے ہوئے اور اس (نفس) کی برائیوں اور آفات سے پناہ مانگتے ہوئے اس (خدا تعالیٰ) کی طرف دوڑے چلے آئیں تاکہ وہ انہیں محفوظ لوگوں کے گروہ میں داخل کر دے۔ یقین جانیں کہ نفس کے جذبات کی مثال تیز بخاروں کی مانند ہے۔ پس جس طرح ان بخاروں کے دوران (مختلف قسم کے) خوفناک اور شدید عوارض پائے جاتے ہیں مثلاً تپ لرزہ۔ سردی۔ کپکپاہٹ یا مثلاً بے انتہا پسینہ بہت زیادہ تکسیر۔

الْعَرَقِ الْكَثِيْرِ وَالرُّعَافِ الْمُفْرِطِ وَالْقَيْءِ الْعَنِيْفِ وَالْإِسْهَالِ الْمُضْعِفِ وَالْعَطَشِ الَّذِيْ لَا يُطَاقُ وَمِثْلَ السُّبَاتِ الْكَثِيْرِ وَالْأَرَقِ اللَّازِمِ وَخُشُوْنَةِ اللِّسَانِ وَقَحْلِ الْفَمِ وَمِثْلَ الْعُطَاسِ الْمُلِحِّ وَالصُّدَاعِ الصَّعْبِ وَالسُّعَالِ الْمُتَوَاتِرِ وَسُقُوْطِ الشَّهْوَةِ وَالْفُوَاقِ وَغَيْرِهَا مِنْ عَلَامَاتِ الْمَحْمُوْمِيْنَ۔ كَذَالِكَ لِلنَّفْسِ جَذَبَاتٌ وَّعَلَامَاتٌ مَّوَادُّهَا تَفُوْرُ وَأَمْوَاجُهَا تَمُوْرُ وَأَعْرَاضُهَا تَدُوْرُ وَبَقَرَاتُهَا تَخُوْرُ وَأَسِيْرُهَا يَبُوْرُ۔ وَقَلَّ مَنْ كَانَ مِنَ النَّاجِيْنَ۔ فَطَلَبُ الْهِدَايَةِ كَمِثْلِ الرُّجُوْعِ إِلَى الطَّبِيْبِ الْحَاذِقِ وَالْإِسْتِطْرَاحِ بَيْنَ يَدَيِ الْمُعَالِجِيْنَ وَالْإِنْعَامُ الَّذِيْ أَشَارَ اللّٰهُ إِلَيْهِ لِعِبَادِهٖ هُوَ تَبَتُّلُ الْعَبْدِ إِلَى اللّٰهِ وَإِحْمَاءُ وِدَادِهٖ وَدَوَامُ إِسْعَادِهٖ وَرُجُوْعُ اللّٰهِ إِلَيْهِ بِبَرَكَاتِهٖ وَإِلْهَامَاتِهٖ وَاسْتِجَابَاتِهٖ وَجَعْلُهٗ طَوْدًا مِّنْ أَطْوَادِهٖ وَإِدْخَالُهٗ فِيْ عِبَادِهِ الْمَحْفُوْظِيْنَ۔ وَقَوْلُهٗ يَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰۤى إِبْرَاهِيْمَ[1] وَجَعْلُهٗ مِنَ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ۔ فَهٰذَا هُوَ الشِّفَاءُ مِنْ حُمَّى الْمَعَاصِيْ وَالْعِلَاجُ بِأَوْفَقِ الْأَدْوِيَةِ وَالْأَغْذِيَةِ وَالتَّدْبِيْرُ اللَّطِيْفُ الَّذِيْ لَا يَعْلَمُهٗ إِلَّا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ۞ (کراماتُ الصّادِقِین صفحہ ۸۲، ۸۳)

سخت قے۔ کمزور کر دینے والے اسہال۔ ناقابلِ برداشت پیاس یا مثلاً زیادہ نیند۔ لگاتار بیخوابی۔ زبان کا کھردرا پن۔ منہ سوکھنا یا مثلاً لگاتار چھینکیں سخت سردرد۔ متواتر کھانسی۔ بھوک کی بندش اور ہچکی وغیرہ جو بخار کے مریضوں کی علامات ہیں۔ اسی طرح نفس کے جذبات اور علامات ہیں جس کے مواد جوش مارتے رہتے ہیں اور اس کی موجیں ٹھاٹھیں مارتی رہتی ہیں۔ اس کے عوارض چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس کی گائیں ڈکارتی رہتی ہیں۔ اس کے قیدی ہلاک ہوتے رہتے ہیں اور بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس نفس سے بچے رہتے ہیں۔ پس ہدایت کا طلب کرنا کسی حاذق طبیب کی طرف رجوع کرنے اور اپنے آپ کو معالجوں کے سامنے ڈال دینے کی طرح ہے اور اپنے بندوں کے لیے جس انعام کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے وہ بندے کا دنیا سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف پوری طرح جھک جانا محبتِ الٰہی میں سرگرم ہونا اور اس کی طرف سے ہمیشہ سعادت دیا جانا اور اپنی سعادت مندی کو ہمیشہ قائم رکھنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اس کی طرف اپنی برکات۔ الہامات اور قبولیتِ دعاء سے رجوع کرنا۔ اور اسے اپنے جلیل القدر لوگوں میں سے جلیل القدر بنانا اور اُسے اپنے زیرِ حفاظت بندوں میں داخل کر لینا ہے اور اس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح (یَا نَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰۤى إِبْرَاهِيْمَ) اے آگ تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی کا موجب بن جا) کا حکم جاری کرنا اور اسے اپنے پاک اور مقدس بندوں میں شامل کر لینا ہے پس یہ اُس کے لیے گناہوں کے بخار سے شفاء اور موافق دواؤں اور غذاؤں سے علاج اور ایسی لطیف تدبیر ہے جسے خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا ۞ (ترجمہ از مرتب)

[1] الانبیاء ع ۵

صراط لغت عرب میں ایسی راہ کو کہتے ہیں۔ جو سیدھی ہو یعنی تمام اجزاء اس کے وضع استقامت پر واقع ہوں اور ایک دوسرے کی نسبت عین محاذات پر ہوں۔ (الحکم ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

وَ قِيْلَ إِنَّ الطَّرِيْقَ لَا يُسَمّٰى صِرَاطًا عِنْدَ قَوْمٍ ذَوِيْ قَلْبٍ وَّنُوْرٍ حَتّٰى يَتَضَمَّنَ خَمْسَةَ أُمُوْرٍ مِّنْ أُمُوْرِ الدِّيْنِ۔ وَهِيَ الْإِسْتِقَامَةُ وَ الْإِيْصَالُ إِلَى الْمَقْصُوْدِ بِالْيَقِيْنِ۔ وَ قُرْبُ الطَّرِيْقِ وَسَعَتُهٗ لِلْمَارِّيْنَ وَ تَعْيِيْنُهٗ طَرِيْقًا لِّلْمَقْصُوْدِ فِيْ أَعْيُنِ السَّالِكِيْنَ۔ وَهُوَ تَارَةً يُّضَافُ إِلَى اللّٰهِ إِذْ هُوَ شَرْعُهٗ وَهُوَ سَوِيٌّ سُبُلُهٗ لِلْمَاشِيْنَ۔ وَ تَارَةً يُّضَافُ إِلَى الْعِبَادِ لِكَوْنِهِمْ أَهْلَ السُّلُوْكِ وَالْمَارِّيْنَ عَلَيْهَا وَالْعَابِرِيْنَ۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۹۵)

استقامت سے خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے یہ سچ بات ہے کہ استقامت فوق الکرامت ہے۔

کمال استقامت یہ ہے کہ چاروں طرف بلاؤں کو محیط دیکھیں اور خدا کی راہ میں جان اور عزت اور آبرو کو معرض خطر میں پاویں اور کوئی تسلی دینے والی بات موجود نہ ہو یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی امتحان کے طور پر تسلی دینے والے کشف یا خواب یا الہام کو بند کرے اور ہولناک خوفوں میں چھوڑ دے اس وقت نامردی نہ دکھلاویں اور بزدلوں کی طرح پیچھے نہ ہٹیں اور وفاداری کی صفت میں کوئی خلل پیدا نہ کریں صدق اور ثبات میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں ذلت پر خوش ہو جائیں موت پر راضی ہو جائیں اور ثابت قدمی کے لیے کسی دوسرے دوست کا انتظار نہ کریں کہ وہ سہارا دے نہ اس وقت خدا کی بشارتوں کے طالب ہوں کہ وقت نازک ہے اور باوجود سراسر بیکس اور کمزور ہونے کے اور کسی تسلی کے نہ پانے کے سیدھے کھڑے ہو جائیں اور ہرچہ بادا باد کہہ کر گردن کو آگے رکھ دیں اور قضا و قدر کے آگے دم نہ ماریں اور ہرگز بے قراری اور جزع فزع نہ دکھلاویں جب تک کہ آزمائش کا حق پورا ہو جائے یہی استقامت ہے جس سے خدا ملتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی رسولوں اور نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کی خاک سے اب تک خوشبو آرہی ہے اسی کی طرف اللہ جل شانہ اس دعا میں اشارہ فرماتا ہے

ترجمہ:۔ اور کہتے ہیں کہ صاحب دل اور روشن ضمیر لوگوں کے نزدیک طریق (راستہ) کو اس وقت تک صراط کا نام نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ وہ اُمورِ دین میں سے پانچ اُمور پر مشتمل نہ ہو اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) استقامت (۲) یقینی طور پر مقصود تک پہنچانا (۳) اُس کا نزدیک ترین (راہ) ہونا۔ (۴) گزرنے والوں کے لیے اس کا وسیع ہونا۔ اور (۵) سالکوں کی نگاہ میں مقصود تک پہنچنے کے لیے اس راستہ کا متعین کیا جانا۔

اور صراط کا لفظ کبھی تو خدا تعالیٰ کی طرف مضاف کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اُس کی شریعت ہے اور وہ چلنے والوں کے لیے ہموار راستہ ہے۔ اور کبھی اسے بندوں کی طرف مضاف کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس پر چلنے والے اور گزرنے والے اور اسے عبور کرنے والے ہیں۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یعنی اے ہمارے خدا ہمیں استقامت کی راہ دکھلا وہی راہ جس پر تیرا انعام اکرام مترتب ہوتا ہے اور تو راضی ہو جاتا ہے اور اسی کی طرف اس دوسری آیت میں اشارہ فرمایا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ[1] اے خدا اس مصیبت میں ہمارے دل پر وہ سکینت نازل کر جس سے صبر آجائے اور ایسا کر کہ ہماری موت اسلام پر ہو جاننا چاہیئے کہ دکھوں اور مصیبتوں کے وقت میں خدا تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کے دل پر ایک نور اُتارتا ہے جس سے وہ قوت پاکر نہایت اطمینان سے مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں اور حلاوت ایمانی سے ان زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں جو اس کی راہ میں ان کے پیروں میں پڑیں جب باخدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور موت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے رب کریم سے خواہ نخواہ کا جھگڑا شروع نہیں کرتا کہ مجھے ان بلاؤں سے بچا کیونکہ اس وقت عافیت کی دعا میں اصرار کرنا خدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقت تامہ کے مخالف ہے بلکہ سچا محب بلا کے اُترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبت کو الوداع کہہ کر اپنے مولیٰ کی مرضی کا بکلی تابع ہو جاتا ہے اور اس کی رضا چاہتا ہے اسی کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ[2] یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا کی مرضی خرید لیتا ہے وہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمت خاص کے مورد ہیں غرض وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے اس کی یہی روح ہے جو بیان کی گئی جس کو سمجھنا ہو سمجھے۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۸۷-۱۸۸)

استقامت..... وہی ہے جس کو صوفی لوگ اپنی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں اور اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کے معنے بھی فنا ہی کے کرتے ہیں۔ یعنی روح۔ جوش اور ارادے سب کے سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہو جائیں اور اپنے جذبات اور نفسانی خواہشیں بالکل مرجائیں۔ بعض انسان جو اللہ تعالیٰ کی خواہش اور ارادے کو اپنے ارادوں اور جوشوں پر مقدم نہیں کرتے وہ اکثر دفعہ دنیا ہی کے جوشوں اور ارادوں کی ناکامیوں میں اس دنیا سے اٹھ جاتے ہیں......... نماز جو دعا ہے اور جس میں اللہ کو جو خدائے تعالیٰ کا اسم اعظم ہے مقدم رکھا ہے۔ ایسا ہی انسان کا اسم اعظم استقامت ہے۔ اسم اعظم سے مراد یہ ہے کہ جس ذریعہ سے انسانیت کے کمالات حاصل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اس کی طرف ہی اشارہ فرمایا ہے اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ اَلَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا[3] یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے نیچے آگئے اور اس کے اسم اعظم استقامت کے نیچے جب بیضۂ بشریت رکھا گیا پھر اس میں اس قسم کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ ملائکہ کا نزول اس پر ہوتا ہے اور کسی قسم کا خوف و حزن اُن کو نہیں رہتا۔ میں نے کہا ہے کہ استقامت بڑی چیز ہے۔

---

[1] الاعراف۔ ع ۱۴ [2] البقرۃ۔ ع ۲۵ [3] حٰمٓ السجدۃ۔ ع ۴

استقامت سے کیا مراد ہے؟ ہر ایک چیز جب اپنے عین محل اور مقام پر ہو وہ حکمت اور استقامت سے تعبیر پاتی ہے مثلاً دوربین کے اجزا کو اگر جدا جدا کر کے اُن کو اصل مقامات سے ہٹا کر دوسرے مقام پر رکھ دیں وہ کام نہ دے گی۔ غرض وضع الشیٔ فی محلہ کا نام استقامت ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہو کہ ہیئت طبعی کا نام استقامت ہے۔ پس جب تک انسانی بناوٹ کو ٹھیک اسی حالت پر نہ رہنے دیں اور اسے مستقیم حالت میں نہ رکھیں وہ اپنے اندر کمالات پیدا نہیں کر سکتی۔ دعا کا طریق یہی ہے کہ دونوں اسم اعظم جمع ہوں اور یہ خدا کی طرف جاوے کسی غیر کی طرف رجوع نہ کرے خواہ وہ اس کی ہوا و ہوس ہی کا بت کیوں نہ ہو؟ جب یہ حالت ہو جائے تو اس وقت اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] کا مزا آجاتا ہے۔

{ حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط صفحہ ۱۸ و ۲۱-۲۰ }

اِعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ خَزِيْنَةٌ مَّمْلُوْءَةٌ مِّنَ النِّكَاتِ - وَحُجَّةٌ بَاهِرَةٌ عَلَى الْمُخَالِفِيْنَ وَالْمُخَالِفَاتِ - وَسَنَذْكُرُهَا بِالتَّصْرِيْحَاتِ - وَنُرِيْكَ مَا اَرَانَا اللّٰهُ مِنَ الدَّلَائِلِ وَالْبَيِّنَاتِ فَاسْمَعْ مِنِّيْ تَفْسِيْرَهَا لَعَلَّ اللّٰهَ يُنْجِيْكَ مِنَ الْخُزَعْبِيْلَاتِ اَمَّا قَوْلُهٗ تَعَالٰى اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ - فَمَعْنَاهُ اَرِنَا النَّهْجَ الْقَوِيْمَ وَثَبِّتْنَا عَلٰى طَرِيْقٍ يُّوْصِلُ اِلٰى حَضْرَتِكَ - وَيُنَجِّيْ مِنْ عُقُوْبَتِكَ - ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ لِتَحْصِيْلِ الْهِدَايَةِ طُرُقًا عِنْدَ الصُّوْفِيَّةِ - مُسْتَخْرَجَةً مِّنَ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ - اَحَدُهَا طَلَبُ الْمَعْرِفَةِ - بِالدَّلِيْلِ وَالْحُجَّةِ - وَالثَّانِيْ تَصْفِيَةُ الْبَاطِنِ بِاَنْوَاعِ الرِّيَاضَةِ - وَالثَّالِثُ الْاِنْقِطَاعُ اِلَى اللّٰهِ وَصَفَاءُ الْمَحَبَّةِ وَطَلَبُ الْمَدَدِ مِنَ الْحَضْرَةِ بِالْمُوَافَقَةِ

واضح رہے کہ یہ آیات لطیف نکات سے پُر خزانہ ہیں اور مخالف مردوں اور مخالف عورتوں کے خلاف روشن دلیل ہیں۔ ہم عنقریب ان کا تصریحات کے ساتھ ذکر کریں گے اور ہم تمہیں وہ دلائل اور بیّنات دکھائیں گے جو ہمیں خدا تعالیٰ نے دکھائے ہیں پس تم مجھ سے ان آیات کی تفسیر سنو تا اللہ تعالیٰ تمہیں باطل خیالات سے نجات عطا کرے۔

کلامِ الٰہی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں سیدھا رستہ دکھا اور ہمیں اس راستہ پر قائم رکھ جو تیری جناب تک پہنچاتا ہو اور تیری سزا سے بچاتا ہو۔ پھر واضح ہو کہ صوفیوں کے نزدیک ہدایت کے حصول کے کئی طریق ہیں جو کتاب (الٰہی) اور سنّت (رسول) سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلا طریق دلیل اور برہان کے ساتھ خدا کی معرفت طلب کرنا ہے۔ دوسرا طریق مختلف قسم کی ریاضتوں کے ذریعہ اپنے باطن کو صاف کرنا ہے اور تیسرا (طریق) ہے سب سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رُخ کرنا اور اُس سے اپنی محبت کو خالص کرنا۔ اور اس کی صفات سے پوری موافقت پیدا

[1] المؤمن - ع - ۶ ؀

التَّآمَّةِ وَبِنَفْيِ التَّفْرِقَةِ وَبِالتَّوْبَةِ اِلَى اللّٰهِ وَالْاِبْتِهَالِ وَالدُّعَآءِ وَعَقْدِ الْهِمَّةِ۔ ثُمَّ
لَمَّا كَانَ طَرِيْقُ طَلَبِ الْهِدَايَةِ وَالتَّصْفِيَةِ لَا يَكْفِيْ لِلْوُصُوْلِ مِنْ غَيْرِ تَوَسُّلِ
الْاَئِمَّةِ وَالْمَهْدِيِّيْنَ مِنَ الْاُمَّةِ۔ مَا رَضِيَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ عَلٰى هٰذَا الْقَدْرِ مِنْ تَعْلِيْمِ
الدُّعَآءِ۔ بَلْ حَثَّ بِقَوْلِهٖ صِرَاطَ الَّذِيْنَ عَلٰى تَحَسُّسِ الْمُرْشِدِيْنَ وَالْهَادِيْنَ مِنْ
اَهْلِ الْاِجْتِهَادِ وَالْاِصْطِفَآءِ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ وَالْاَنْبِيَآءِ۔ فَاِنَّهُمْ قَوْمٌ اٰثَرُوْا دَارَ الْحَقِّ
عَلٰى دَارِ الزُّوْرِ وَالْغُرُوْرِ وَجُذِبُوْا بِحِبَالِ الْمَحَبَّةِ اِلَى اللّٰهِ بَحْرِ النُّوْرِ۔ وَاُخْرِجُوْا بِوَحْيٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَجَذْبٍ مِّنْهُ مِنْ اَرْضِ الْبَاطِلِ۔ وَكَانُوْا قَبْلَ النُّبُوَّةِ كَالْجَمِيْلَةِ الْعَاطِلِ۔
لَا يَنْطِقُوْنَ اِلَّا بِاِنْطَاقِ الْمَوْلٰى وَلَا يُؤْثِرُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ هُوَ عِنْدَهُ الْاَوْلٰى۔ يَسْعَوْنَ
كُلَّ السَّعْيِ لِيَجْعَلُوا النَّاسَ اَهْلًا لِّلشَّرِيْعَةِ الرَّبَّانِيَّةِ۔ وَيَقُوْمُوْنَ عَلٰى وَلَدِهَا
كَالْحَانِيَةِ۔ وَيُعْطٰى لَهُمْ بَيَانٌ يُّسْمِعُ الصُّمَّ وَيُنْزِلُ الْعُصْمَ وَجَنَانٌ يَّجْذِبُ بِعَقْدِ
الْهِمَّةِ الْاُمَمَ۔ اِذَا تَكَلَّمُوْا فَلَا يَرْمُوْنَ اِلَّا صَائِبًا۔ وَاِذَا تَوَجَّهُوْا فَيُحْيُوْنَ مَيِّتًا

کرکے اور خدا سے علیحدگی ترک کرکے توبہ، زاری، دُعاء اور عقدِ ہمّت کے ساتھ بارگاہِ ایزدی سے مدد طلب کرنا ہے۔ پھر چونکہ تلاشِ ہدایت اور تصفیۂ نفس کا طریق ائمہ اور اُمت کے ہدایت یافتہ لوگوں کے وسیلہ کے بغیر وصول الی اللہ کے لیے کافی نہیں اس لیے خدا تعالیٰ محض اس قدر (یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تک) دُعاء سکھانے پر راضی نہ ہوا۔ بلکہ اُس نے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہہ کر اُن مُرشدوں اور ہادیوں کی تلاش کی ترغیب دلائی جو صاف باطن اور اجتہاد کرنے والے لوگوں میں سے ہادی اور راہنما ہیں یعنی رسولوں اور نبیوں کی۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جھوٹ اور فریب یعنی دارِ دنیا پر دارالحق (آخرت) کو ترجیح دی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف جو نُور کا سمندر ہے محبت کی تاروں کے ساتھ کھینچے گئے اور اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کی کشش کے ذریعہ باطل کی سرزمین سے نکالے گئے۔ اور وہ نبوّت سے قبل خوبصورت مگر بے زیور عورت کی طرح تھے۔ اب وہ خدا تعالیٰ کے بلائے بغیر نہیں بولتے اور وہ اُسی (چیز) کو پسند کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے نزدیک بہترین ہو۔ اور اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کو شریعت ربّانی کے پابند بنا دیں اور فرزندانِ شریعت کی نگہداشت کرنے کے لیے اس شفیق ماں کی طرح نگرانی کرتے ہیں جو خاوند کے مرنے کے بعد محض بچوں کی خاطر دوسری شادی نہ کرے اور اُنہیں ایسی قوّتِ بیانیہ دی جاتی ہے جو بہروں کو قوّتِ شنوائی بخشتی اور پہاڑی بکروں کو اُتار لاتی ہے اور ایسا دل عطا کیا جاتا ہے جو اپنے عزم کی پختگی سے قوموں اور جماعتوں کو اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو اُن کا تیر خطا نہیں جاتا۔ اور جب توجہ کرتے ہیں تو نامُراد مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کو گناہوں

خَآئِبًا۔ یَسْعَوْنَ اَنْ یَّنْقُلُوا النَّاسَ مِنَ الْخَطِیَّاتِ اِلَی الْحَسَنَاتِ وَمِنَ الْمَنْهِیَّاتِ اِلَی الصَّالِحَاتِ وَمِنَ الْجَهَلَاتِ اِلَی الرَّزَانَةِ وَالْحَصَاةِ وَمِنَ الْفِسْقِ وَالْمَعْصِیَةِ اِلَی الْعِفَّةِ وَالتُّقَاةِ۔ وَمَنْ اَنْکَرَهُمْ فَقَدْ ضَیَّعَ نِعْمَةً عُرِضَتْ عَلَیْهِ۔ وَبَعُدَ مِنْ عَیْنِ الْخَیْرِ وَعَنْ نُّوْرِ عَیْنَیْهِ۔ وَاِنَّ هٰذَا الْقَطْعَ اَکْبَرُ مِنْ قَطْعِ الرَّحِمِ وَالْعَشِیْرَةِ۔ وَاِنَّهُمْ ثَمَرَاتُ الْجَنَّةِ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْ تَرَکَهُمْ وَمَالَ اِلَی الْمِیْرَةِ۔ وَاِنَّهُمْ نُوْرُ اللّٰهِ وَیُعْطٰی بِهِمْ نُوْرٌ لِّلْقُلُوْبِ وَتِرْیَاقٌ لِّسَمِّ الذُّنُوْبِ وَسَکِیْنَةٌ عِنْدَ الْاِحْتِضَارِ وَالْغَرْغَرَةِ وَثَبَاتٌ عِنْدَ الرِّحْلَةِ وَتَرْکِ الدُّنْیَا الدَّنِیَّةِ۔ اَتَظُنُّ اَنْ یَّکُوْنَ الْغَیْرُ کَمِثْلِ هٰذِهِ الْفِئَةِ الْکَرِیْمَةِ۔ کَلَّا وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْعَذْقَ مِنَ الْجَرِیْمَةِ۔ وَلِذٰلِکَ عَلَّمَ اللّٰهُ هٰذَا الدُّعَآءَ مِنْ غَایَةِ الرَّحْمَةِ۔ وَاَمَرَ الْمُسْلِمِیْنَ اَنْ یَّطْلُبُوْا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ مِنَ الْحَضْرَةِ وَقَدْ ظَهَرَ مِنْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ عَلٰی کُلِّ مَنْ لَّهٗ حَظٌّ مِّنَ الدِّرَایَةِ۔ اَنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ قَدْ بُعِثَتْ عَلٰی قَدَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَاِنْ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّا لَهٗ مَثِیْلٌ فِیْ هٰٓؤُلَآءِ۔ وَلَوْلَا هٰذِهِ الْمُضَاهَاةُ وَالسَّوَآءُ۔

سے نکال کر نیکیوں کی طرف اور ممنوع کاموں سے اچھے کاموں کی طرف اور جہالتوں سے ذہانت اور عقلمندی کی طرف اور فسق و معصیت سے عِفّت اور پرہیزگاری کی طرف لے جائیں۔ جو شخص اُن کا انکار کرے تو وہ ایک ایسی نعمت کو ضائع کر دیتا ہے جو (ذاتِ باری کی طرف سے) اس کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ وہ بھلائی کے چشمہ سے اور اپنی دونوں آنکھوں کی بینائی سے دُور ہو گیا۔ اور (انبیاء و مرسلین سے) یہ قطعِ تعلق رشتہ داروں اور قبیلہ سے قطعِ تعلق کرنے سے بھی بڑا ہے۔ یہ لوگ جنت کے پھل ہوتے ہیں۔ پس اس شخص پر افسوس ہے جو انھیں چھوڑ کر صرف کھانے پینے والی چیزوں کی طرف مائل ہو جائے۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا ایک نُور ہیں اور ان کے ذریعہ (لوگوں کے) دلوں کو روشنی اور گناہوں کے زہر کے لیے تریاق دیا جاتا ہے اور جان کندنی اور غرغرہ کے وقت سکینت اور رحلت اور اس حقیر دنیا کو ترک کرنے کے وقت ثبات عطا کیا جاتا ہے۔ کیا تُو خیال کرتا ہے کہ کوئی اَور بھی اس صاحبِ شرف جماعت جیسا ہو سکتا ہے؟ مجھے اُس ذات کی قسم جس نے گٹھلی سے کھجور کا درخت پیدا کیا (اس جماعت جیسا) ہرگز نہیں (ہو سکتا) اس لیے خدا تعالیٰ نے اپنی انتہائی رحمت سے یہ دعا سکھائی اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا تعالیٰ سے اُن لوگوں کا راستہ طلب کریں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے یعنی نبیوں اور رسولوں کا راستہ۔ اِس آیت سے ہر اُس شخص پر جسے سمجھ بوجھ کا کچھ حصّہ ملا ہے واضح ہو جاتا ہے کہ اِس اُمّت کو نبیوں کے قدم پر قائم کیا گیا ہے اور ایسا کوئی نبی نہیں جس کا مثیل اس اُمت میں نہ پایا جاتا ہو۔ اگر یہ مشابہت اور

لَبَطَلَ طَلَبُ کَمَالِ السَّابِقِیْنَ وَبَطَلَ الدُّعَاءُ۔ فَاللّٰہُ الَّذِیْ اَمَرَنَا اَجْمَعِیْنَ۔ اَنْ نَّقُوْلَ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ مُصَلِّیْنَ وَمُمْسِیْنَ وَمُصْبِحِیْنَ۔ وَاَنْ نَّطْلُبَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ۔ اَشَارَ اِلٰی اَنَّہٗ قَدْ قَدَّرَ مِنَ الْاِبْتِدَآءِ۔ اَنْ یَّبْعَثَ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ بَعْضَ الصُّلَحَآءِ عَلٰی قَدَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَاَنْ یَّسْتَخْلِفَھُمْ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلُ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ۔ وَاِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْحَقُّ فَاتْرُکِ الْجِدَالَ الْفُضُوْلَ وَالْاَقَاوِیْلَ۔ وَکَانَ غَرَضُ اللّٰہِ اَنْ یَّجْمَعَ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ کَمَالَاتٍ مُّتَفَرِّقَۃً وَّاَخْلَاقًا مُّتَبَدِّدَۃً۔ فَاقْتَضَتْ سُنَّتُہُ الْقَدِیْمَۃُ اَنْ یُّعَلِّمَ ھٰذَا الدُّعَآءَ۔ ثُمَّ یَفْعَلُ مَا شَآءَ۔ وَقَدْ سُمِّیَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃُ خَیْرَ الْاُمَمِ فِی الْقُرْاٰنِ۔ وَلَا یَحْصُلُ خَیْرٌ اِلَّا بِزِیَادَۃِ الْعَمَلِ وَالْاِیْمَانِ وَالْعِلْمِ وَالْعِرْفَانِ وَابْتِغَآءِ مَرْضَاتِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ۔ وَکَذَالِکَ وَعَدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ بِالْفَضْلِ وَالْعِنَایَاتِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ اَھْلِ الصَّلَاحِ وَالتُّقَاۃِ۔ فَثَبَتَ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَنَّ الْخُلَفَآءَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ وَاَنَّہٗ لَنْ یَّاْتِیَ

مماثلت نہ ہوتی تو پہلوں جیسے کمال کا طلب کرنا بھی عبث ٹھہرتا اور دعاء بھی باطل ہو جاتی۔ پس اللہ تعالیٰ جس نے ہم سب کو نماز پڑھتے وقت اور صبح کے وقت اور شام کے وقت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا مانگنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ منعم علیہ گروہ یعنی نبیوں اور رسولوں کا راستہ طلب کرتے رہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اُس نے شروع سے ہی مقدر کر رکھا ہے کہ بعض نیک لوگوں کو نبیوں کے نقشِ قدم پر اس اُمّت میں مبعوث کرتا رہے گا اور اُنہیں اسی طرح خلیفہ بنا دیگا جیسا کہ اُس نے اس سے پہلے بنی اسرائیل سے خلفاء بنائے تھے۔ اور یقیناً یہی (بات) حق ہے۔ پس تو فضول جھگڑے اور قیل و قال چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ اس اُمّت میں مختلف کمالات اور گوناگوں اخلاق جمع کر دے۔ پس اللہ کی اس قدیم سُنّت نے تقاضا کیا کہ وہ یہ دعاء سکھائے اور پھر اس کے بعد جو چاہے وہ کر دکھائے۔ قرآن کریم میں اس اُمت کا نام خیر الامم (یعنی بہترین اُمّت) رکھا گیا ہے اور خیر اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ عمل، ایمان، علم اور عرفان میں اضافہ ہو اور خدائے رحمان کی خوشنودی طلب کی جائے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنہیں اپنے فضل اور عنایت سے اسی دنیا میں ضرور خلیفہ بنائیگا۔ جیسا کہ اُس نے ان سے قبل نیکوکاروں اور متقیوں کو خلیفہ بنایا تھا پس قرآن کریم سے ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں میں روزِ قیامت تک

أَحَدٌ مِّنَ السَّمَاءِ۔ بَلْ يُبْعَثُوْنَ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ۔ وَمَا لَكَ لَا تُؤْمِنُ بِبَيَانِ الْقُرْقَانِ
أَتَرَكْتَ كِتَابَ اللّٰهِ أَمْ مَّا بَقِيَ فِيْكَ ذَرَّةٌ مِّنَ الْعِرْفَانِ۔ وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ مِنْكُمْ وَ
مَا قَالَ مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ۔ وَكَفَاكَ هٰذَا إِنْ كُنْتَ تَبْتَغِي الْحَقَّ وَتَطْلُبُ الدَّلِيْلَ
أَيُّهَا الْمِسْكِيْنُ اقْرَءِ الْقُرْآنَ وَلَا تَمْشِ كَالْمَغْرُوْرِ۔ وَلَا تَبْعُدْ مِنْ نُّوْرِ الْحَقِّ لِئَلَّا
يَشْكُوَ مِنْكَ إِلَى الْحَضْرَةِ سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ وَسُوْرَةُ النُّوْرِ۔ اِتَّقِ اللّٰهَ ثُمَّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ
لَا تَكُنْ أَوَّلَ كَافِرٍ بِآيَاتِ النُّوْرِ وَالْفَاتِحَةِ۔ لِكَيْلَا يَقُوْمَ عَلَيْكَ شَاهِدَانِ فِي
الْحَضْرَةِ۔ وَأَنْتَ تَقْرَءُ قَوْلَهٗ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ [1] وَتَقْرَءُ قَوْلَهٗ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ [2] فَفَكِّرْ فِيْ قَوْلِهٖ مِنْكُمْ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ وَاتْرُكِ الظَّالِمِيْنَ
وَظَنَّهُمْ۔ أَلَمْ يَأْنِ لَكَ أَنْ تَعْلَمَ عِنْدَ قِرَاءَةِ هٰذِهِ الْآيَاتِ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ جَعَلَ الْخُلَفَاءَ كُلَّهُمْ
مِّنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بِالْعِنَايَاتِ۔ فَكَيْفَ يَأْتِي الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ مِنَ السَّمَاوَاتِ۔ أَلَيْسَ
الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ عِنْدَكَ مِنَ الْخُلَفَاءِ۔ فَكَيْفَ تَحْسَبُهٗ مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ وَ

خلفا آتے رہیں گے اور یہ کہ آسمان سے کوئی نہیں آئیگا بلکہ یہ سب لوگ اِس اُمّت سے مبعوث کیے جائیں گے تمہیں کیا ہوگیا ہے
کہ تم قرآن کریم کے بیان پر ایمان نہیں لاتے۔ کیا تم نے خدا کی کتاب کو چھوڑ دیا ہے یا تم میں عرفان کا ذرہ باقی نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ
نے "مِنْكُمْ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ نہیں کہا۔

اگر تم حق کے طالب اور دلیل کے خواہش مند ہو تو تمہیں اتنا بیان ہی کافی ہے۔ اے مسکین انسان قرآن پڑھ اور
مغروروں کی طرح اکڑ کر نہ چل اور خدا کے نُور سے دُور مت ہو تا سورۃ فاتحہ اور سورۃ نور بارگاہِ ایزدی میں تیری شکایت نہ
کریں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ اور سورہ نور اور سورہ فاتحہ کی آیات کا اوّلین
منکر نہ بن تاکہ یہ تیرے خلاف بارگاہِ ایزدی میں دو گواہ بن کر کھڑے نہ ہوں۔ اور تُو خدا کا قول وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْكُمْ [3] بھی پڑھتا ہے اور اُس کا قول لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ [4] بھی پڑھتا ہے۔ پس تُو سورۂ نور میں خدا تعالیٰ کے لفظ
مِنْكُمْ میں غور کر اور ظالموں اور اُن کے اَوہام کو چھوڑ دے۔ کیا تیرے لیے ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ تُو ان آیات کو پڑھ کر
یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام کے تمام خُلفاء کو اِسی اُمت میں سے بنانا مقدّر کیا ہے تو پھر مسیح موعود کس طرح
آسمانوں سے اُترے گا۔ کیا تمہارے نزدیک مسیح موعود خلفاء میں شامل نہیں۔ پھر تم مسیح موعود کو بنی اسرائیل اور بنی اسرائیل

---

[1] سورہ نور ع ۷ ۔ [2] سورہ نور ع ۷ ۔ [3] ترجمہ: اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں سے وعدہ کیا ہے۔ [4] ترجمہ: انہیں خلیفہ بنائے گا۔

مِنْ تِلْكَ الْاَنْبِيَآءِ - اَتَتْرُكُ الْقُرْاٰنَ وَفِي الْقُرْاٰنِ كُلُّ الشِّفَآءِ - اَوْ تَغَلَّبَتْ عَلَيْكَ شِقْوَتُكَ فَتَتْرُكُ مُتَعَمِّدًا طَرِيْقَ الْاِهْتِدَآءِ - اَلَا تَرٰى قَوْلَهٗ تَعَالٰى كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ[1] فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ - فَوَجَبَ اَنْ يَّكُوْنَ الْمَسِيْحُ الْاٰتِيْ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ - لَا مِنْ غَيْرِهِمْ بِالضَّرُوْرَةِ - فَاِنَّ لَفْظَ كَمَا يَاْتِيْ لِلْمُشَابَهَةِ وَالْمُمَاثَلَةِ - وَالْمُشَابَهَةُ تَقْتَضِيْ قَلِيْلًا مِّنَ الْمُغَايَرَةِ - وَلَا يَكُوْنُ شَيْءٌ مُّشَابِهَ نَفْسِهٖ كَمَا هُوَ مِنْ اَبْدَهِ الْبَدِيْهِيَّاتِ - فَثَبَتَ بِنَصٍّ قَطْعِيٍّ اَنَّ عِيْسَى الْمُنْتَظَرَ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهٰذَا يَقِيْنِيٌّ وَّمُنَزَّةٌ عَنِ الشُّبُهَاتِ - هٰذَا مَا قَالَ الْقُرْاٰنُ وَيَعْلَمُهُ الْعَالِمُوْنَ - فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ تُؤْمِنُوْنَ - وَقَدْ قَالَ الْقُرْاٰنُ اِنَّ عِيْسٰى نَبِيَّ اللّٰهِ قَدْ مَاتَ - فَفَكِّرْ فِيْ قَوْلِهٖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ وَلَا تُحْيِ الْاَمْوَاتَ - وَلَا تَنْصُرِ النَّصَارٰى بِالْاَبَاطِيْلِ وَالْخُزَعْبِيْلَاتِ - وَفِتَنُهُمْ لَيْسَتْ بِقَلِيْلَةٍ فَلَا تَزِدْهَا بِالْجَهَلَاتِ وَاِنْ كُنْتَ تُحِبُّ حَيَاةَ نَبِيٍّ فَاٰمِنْ بِحَيَاةِ نَبِيِّنَا خَيْرِ الْكَائِنَاتِ - وَمَا لَكَ اِنَّكَ تَحْسَبُ مَيِّتًا مَّنْ كَانَ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ - وَتَعْتَقِدُ اَنَّ ابْنَ مَرْيَمَ مِنَ الْاَحْيَاءِ بَلْ مِنَ الْمُحْيِيْنَ - اُنْظُرْ اِلٰى

کے نبیوں میں سے کیوں گمان کرتے ہو۔ کیا تم قرآن کریم کو چھوڑتے ہو حالانکہ ہر قسم کی شفاء قرآن کریم میں ہے۔ کیا تم پر تمہاری بدبختی غالب آگئی ہے اور تم عمداً ہدایت کا رستہ ترک کر رہے ہو۔ کیا تم اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ[2] کو نہیں دیکھتے۔ پس ضروری ہوا کہ آنیوالا مسیح اسی اُمّت میں سے ہو نہ کہ اُمّت کے باہر سے۔ کیونکہ کَمَا کا لفظ مشابہت اور مماثلت کے لیے آتا ہے اور مشابہت کسی قدر مغائرت کو چاہتی ہے اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کوئی چیز اپنے آپ کے مشابہ نہیں ہوا کرتی۔ پس قطعی نصّ سے ثابت ہوگیا کہ جس عیسیٰ کا انتظار کیا جارہا ہے وہ اِسی اُمّت میں سے ہے اور یہ بات یقینی اور شبہات سے پاک ہے یہ قرآن کریم کا فرمودہ ہے اور عالم لوگ اسے خُوب جانتے ہیں۔ پس اس کے بعد تم کونسی بات مانو گے؛ اور قرآن کریم نے تو کہہ دیا ہے کہ عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے نبی فوت ہوگئے ہیں۔ پس تم خدا تعالیٰ کے قول فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ میں غور کرو اور مُردوں کو زندہ قرار نہ دو۔ اور اس طرح فضول باتوں اور بیہودہ کہانیوں سے عیسائیوں کی مدد نہ کرو۔ ان کے فتنے پہلے ہی کچھ کم نہیں ہیں۔ تم اپنی نادانیوں سے ان میں اضافہ نہ کرو۔ اگر تمہیں کسی نبی کا زندہ رہنا پسند ہو تو تم ہمارے نبی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر ایمان لے آؤ اور تمہیں کیا (ہوگیا) ہے کہ تم رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ کو تو فوت شدہ خیال کرتے ہو اور ابن مریم کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ زندوں بلکہ (دوسروں کو) زندہ کرنے والوں میں سے ہے۔ تم سورۃ نور کو دیکھو۔

---

[1] سورۃ النور غ [2] ترجمہ: جس طرح اُس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔

النُّوْرِ ثُمَّ انْظُرْ اِلَى الْفَاتِحَةِ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ لِيَرْجِعَ الْبَصَرُ بِالدَّلَائِلِ الْقَاطِعَةِ اَلَسْتَ تَقْرَءُ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ فَاَنّٰى تُؤْفَكُ بَعْدَ هٰذَا اَتَنْسٰى دُعَآئَكَ اَوْ تَقْرَءُ بِالْغَفْلَةِ۔ فَاِنَّكَ سَأَلْتَ عَنْ رَّبِّكَ فِيْ هٰذَا الدُّعَاءِ وَالْمَسْئَلَةِ۔ اَنْ لَّا يُغَادِرَ نَبِيًّا مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اِلَّا وَيَبْعَثُ مَثِيْلَهٗ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ۔ وَيْحَكَ اَنَسِيْتَ دُعَآئَكَ بِهٰذِهِ السُّرْعَةِ۔ مَعَ اَنَّكَ تَقْرَءُهٗ فِي الْاَوْقَاتِ الْخَمْسَةِ۔ عَجِبْتُ مِنْكَ كُلَّ الْعَجَبِ اَهٰذَا دُعَآءُكَ وَتِلْكَ اٰرَآءُكَ۔ اُنْظُرْ اِلَى الْفَاتِحَةِ وَانْظُرْ اِلٰى سُوْرَةِ النُّوْرِ مِنَ الْفُرْقَانِ۔ وَاَيُّ شَاهِدٍ يُّقْبَلُ بَعْدَ شَهَادَةِ الْقُرْاٰنِ۔ فَلَا تَكُنْ كَالَّذِيْ سَرٰى اِيْجَاسَ خَوْفِ اللّٰهِ وَاسْتِشْعَارَهٗ وَتَسَرْبَلَ لِبَاسَ الْوَقَاحَةِ وَشِعَارَهٗ۔ اَتَتْرُكُ كِتَابَ اللّٰهِ لِقَوْمٍ تَرَكُوا الطَّرِيْقَ وَمَا كَمَّلُوا التَّحْقِيْقَ وَالتَّعْمِيْقَ۔ وَاِنَّ طَرِيْقَهُمْ لَا يُوْصِلُ اِلَى الْمَطْلُوْبِ۔ وَقَدْ خَالَفَ التَّوْحِيْدَ وَسُبُلَ اللّٰهِ الْمَحْبُوْبِ۔ فَلَا تَحْسَبْ وَعْرًا دَمِثًا وَّاِنْ دَمَّثَهٗ كَثِيْرٌ مِّنَ الْخُطَا وَاِنِ اهْتَدَتْ اِلَيْهَا اَبَابِيْلُ مِنَ الْقَطَا۔ فَاِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔

اور پھر سورۃ فاتحہ پر غور کرو۔ پھر نظر دوڑاؤ۔ تا وہ دلائل قاطعہ لے کر آئے۔ کیا تم اِس سورت میں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (کے الفاظ) نہیں پڑھتے تو پھر اس کے بعد تم کدھر بہک رہے ہو؟ کیا تم اپنی دُعاء کو بھول جاتے ہو؟ یا اس کو غفلت کی حالت میں پڑھتے ہو؟ تم نے تو اِس دُعاء اور التجاء میں اللہ تعالیٰ سے یہ مانگا تھا کہ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ایسا کوئی نبی نہ رہنے دے مگر اُس کا مثیل اِس اُمت میں مبعوث فرمائے۔ تم پر افسوس! کیا تم نے اپنی دعاء کو اتنی جلدی بھلا دیا۔ باوجود اس کے کہ تم پانچ وقت یہ دعا پڑھتے ہو۔ مجھے تو تم پر انتہائی تعجب ہے کہ یہ تمہاری دعا ہے اور یہ تمہارے خیالات ہیں۔ ذرا (سورۃ) فاتحہ کی طرف دیکھو اور پھر فرقانِ مجید کی سورۃ نُور پر بھی غور کرو۔ قرآن کی شہادت کے بعد اور کس گواہ (کی گواہی) قبول کی جائے گی۔ تم اُس شخص کی طرح مت بنو جس نے خدا کے خوف کا ظاہری اور باطنی احساس ترک کر دیا، بلکہ بے حیائی کو اپنا لباس اور اپنا شعار بنا لیا ہو۔ کیا تم اُن لوگوں کی خاطر اللہ تعالیٰ کی کتاب کو چھوڑ دو گے جنہوں نے سیدھا راستہ ترک کر دیا اور اپنی تحقیق اور غور و فکر کو مکمل نہ کیا۔ ان کا راستہ مطلوب تک نہیں پہنچاتا بلکہ وہ توحید اور خدائے محبوب کی راہوں کے خلاف ہے۔ پس تو سخت (راستہ) کو نرم خیال نہ کر۔ اگرچہ بظاہر قدموں کی کثرت نے اُسے بالکل ہموار کر دیا ہو اور اگرچہ بھٹ تیتر پرندوں کی قطاریں اُس کی طرف گئی

وَاِنَّ الْقُرْاٰنَ شَهِدَ عَلٰی مَوْتِ الْمَسِیْحِ وَاَدْخَلَهٗ فِی الْاَمْوَاتِ بِالْبَیَانِ الصَّرِیْحِ۔ مَالَكَ مَا تُفَكِّرُ فِیْ قَوْلِهٖ "فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ"[۱] وَفِیْ قَوْلِهٖ "قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ"[۲] وَمَالَكَ لَا تَخْتَارُ سَبِیْلَ الْفُرْقَانِ وَسَرَّكَ السُّبُلُ۔ وَقَدْ قَالَ "فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ"[۳] فَمَا لَكُمْ لَا تُفَكِّرُوْنَ۔ وَقَالَ لَكُمْ فِیْهَا مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ۔ فَكَیْفَ صَارَ مُسْتَقَرُّ عِیْسٰی فِی السَّمَآءِ اَوْ عَرْشَ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ اِنْ هٰذَا اِلَّا كِذْبٌ مُّبِیْنٌ۔ وَقَالَ سُبْحَانَهٗ "اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ"[۴] فَكَیْفَ تَحْسَبُوْنَ عِیْسٰی مِنَ الْاَحْیَآءِ۔ اَلْحَیَآءَ اَلْحَیَآءَ۔ یَا عِبَادَ الرَّحْمٰنِ۔ اَلْقُرْاٰنَ اَلْقُرْاٰنَ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تَتْرُكُوا الْفُرْقَانَ۔ اِنَّهٗ كِتَابٌ یُّسْئَلُ عَنْهُ اِنْسٌ وَّجَانٌّ۔ وَاِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ الْفَاتِحَةَ فِی الصَّلٰوةِ فَفَكِّرُوْا فِیْهَا یَا

ہوں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی ہدایت ہی (اصل) ہدایت ہے اور قرآن کریم نے مسیحؑ کی موت پر شہادت دی ہے اور واضح بیان میں اُسے مُردوں میں داخل قرار دیا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کے الفاظ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ[۵] اور پھر اُس کے قول قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[۶] میں غور نہیں کرتے۔ اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قرآن کریم کے راستہ کو اختیار نہیں کرتے اور دوسرے راستے تمہیں بھلے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ[۷] تم کیوں نہیں سوچتے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمہارے لیے ایک مقررہ وقت تک اسی زمین میں جائے رہائش اور سامانِ معیشت مقدر ہے۔ پھر کیونکر حضرت عیسیٰؑ کا ٹھکانہ آسمان میں یا عرش رب العالمین پر ہو گیا۔ یہ تو ایک واضح جھوٹ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ[۸] فرمایا ہے پھر حضرت عیسیٰؑ کو کس طرح زندہ خیال کرتے ہو؟ اے بندگانِ خدا! باز آؤ باز آؤ۔ قرآن کو (لازم پکڑو) قرآن کو لازم پکڑو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور قرآن کو مت چھوڑو۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کے متعلق انسانوں اور جنوں (سب) سے بازپرس ہو گی اور تم نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہو۔ پس اے عقلمندو اس میں خوب غور کرو۔ کیا تم اس میں آیت

---

[۱] سورۃ المائدۃ ع ۱۶۔ [۲] سورۃ آل عمران۔ ع ۱۵۔ [۳] سورۃ الاعراف ع ۲۔
[۴] سورۃ النحل ع ۲۔

[۵] ترجمہ: جب تو نے میری روح قبض کر لی۔ [۶] ترجمہ: اس سے پہلے سب رسول فوت ہو چکے ہیں۔
[۷] ترجمہ: اسی میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں تم مرو گے۔ [۸] وہ سب مُردے ہیں نہ کہ زندہ۔

ذَوِی الْحَصَاۃِ - اَلَا تَجِدُوْنَ فِیْهَا اٰیَۃَ "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ" - فَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ فَقَدُوْا نُوْرَ عَیْنَیْهِمْ وَذَهَبَ بِمَا لَدَیْهِمْ - وَیْحَکُمْ وَ هَلْ بَعْدَ الْفُرْقَانِ دَلِیْلٌ اَوْ بَقِیَ اِلٰی مَفَرٍّ مِّنْ سَبِیْلٍ - اَیَقْبَلُ عَقْلُکُمْ اَنْ یُّبَشِّرَ رَبُّنَا فِیْ هٰذَا الدُّعَآءِ - بِاَنَّهٗ یَبْعَثُ الْاَئِمَّۃَ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّۃِ لِمَنْ یُّرِیْدُ طَرِیْقَ الْاِهْتِدَآءِ - اَلَّذِیْنَ یَکُوْنُوْنَ کَمِثْلِ اَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ فِی الْاِجْتِبَآءِ وَالْاِصْطِفَآءِ - وَیَاْمُرُنَا اَنْ نَّدْعُوَ اَنْ نَّکُوْنَ کَاَنْبِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ - وَلَا نَکُوْنَ کَاَشْقِیَآءِ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ - ثُمَّ بَعْدَ هٰذَا یَدُعُّنَا وَیُلْقِیْنَا فِیْ وِهَادِ الْحِرْمَانِ وَیُرْسِلُ اِلَیْنَا رَسُوْلًا مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَیَنْسٰی وَعْدَهٗ کُلَّ النِّسْیَانِ - وَهَلْ هٰذَا اِلَّا الْمَکِیْدَۃُ الَّتِیْ لَا یُنْسَبُ اِلَی اللّٰهِ الْمَنَّانِ - وَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ ذَکَرَ فِیْ هٰذِهِ السُّوْرَۃِ ثَلٰثَۃَ اَحْزَابٍ مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ عَلَیْهِمْ وَالْیَهُوْدِ وَالنَّصْرَانِیِّیْنَ - وَرَغَّبَنَا فِی الْحِزْبِ الْاَوَّلِ مِنْهَا وَ نَهٰی عَنِ الْاٰخَرِیْنَ - بَلْ حَثَّنَا عَلَی الدُّعَآءِ وَالتَّضَرُّعِ وَالْاِبْتِهَالِ - لِنَکُوْنَ مِنَ الْمُنْعَمِ عَلَیْهِمْ لَا مِنَ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَاَهْلِ الضَّلَالِ - وَ وَالَّذِیْ اَنْزَلَ الْمَطَرَ

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ نہیں پاتے ؟ پس تم اُن لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اپنی دونوں آنکھوں کی روشنی کھو بیٹھے ہیں اور اُن کے پاس جو کچھ تھا وہ سب اُن سے جاتا رہا۔ تم پر افسوس۔ کیا قرآن کریم کے بعد بھی اَور کوئی دلیل ہے ؟ یا گریز کا کوئی رستہ باقی رہ جاتا ہے ؟ کیا تمہاری عقل قبول کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس دُعاء میں بشارت دے کہ وہ اُن لوگوں کے لیے جو ہدایت کی راہ کے طالب ہیں اسی اُمت میں سے ایسے ائمہ کو مبعوث کرے گا جو پسندیدہ اور برگزیدہ ہونے کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے اور ہمیں حکم دے کہ ہم یہ دُعاء کریں کہ ہم بنی اسرائیل کے نبیوں کی مانند ہو جائیں اور بنی اسرائیل کے بدبختوں کی طرح نہ ہوں اور پھر اس کے بعد ہمیں دھکے دے کر محرومی کے گڑھے میں پھینک دے۔ وہ ہماری طرف بنی اسرائیل میں سے ایک رسول بھیج دے اور اپنا وعدہ پوری طرح بھول جائے۔ یہ ایسی فریب دہی ہے جو ہرگز خدائے مُحسن کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں تین گروہوں کا ذکر کیا ہے یعنی منعم علیہم، یہود اور نصاریٰ کا۔ اور ہمیں ان میں سے پہلے گروہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی ہے اور باقی دونوں گروہوں میں شامل ہونے سے روکا ہے بلکہ ہمیں دعاء، عاجزی اور انکساری کی ترغیب دی ہے تاکہ ہم منعم علیہم (کے گروہ میں) سے ہو جائیں نہ کہ مغضوب علیہم اور ضالین میں سے۔

مِنَ الْغَمَامِ وَ اَخْرَجَ الثَّمَرَ مِنَ الْاَكْمَامِ لَقَدْ ظَهَرَ الْحَقُّ مِنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَلَا يَشُكُّ
فِيْهِ مَنْ اُعْطِيَ لَهٗ ذَرَّةٌ مِّنَ الدِّرَايَةِ۔ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ مَنَّ عَلَيْنَا بِالتَّصْرِيْحِ وَالْاِظْهَارِ۔
وَاَمَاطَ عَنَّا وَعْثَاءَ الْاِفْتِكَارِ۔ فَوَجَبَ عَلَى الَّذِيْنَ يُنَضْنِضُوْنَ نَضْنَضَةَ الصِّلِّ۔
وَيُحَمْلِقُوْنَ حَمْلَقَةَ الْبَازِي الْمُطِلِّ۔ اَنْ لَّا يُعْرِضُوْا عَنْ هٰذَا الْاِنْعَامِ وَلَا يَكُوْنُوْا
كَالْاَنْعَامِ۔ وَقَدْ عَلِقَ بِقَلْبِيْ اَنَّ الْفَاتِحَةَ تَاْسُوْ اَجْرَاحَهُمْ وَتُرِيْشُ جَنَاحَهُمْ۔
وَمَا مِنْ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ اِلَّا هِيَ تُكَذِّبُهُمْ فِيْ هٰذَا الْاِعْتِقَادِ۔ فَاقْرَءْ مِمَّا شِئْتَ
مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ يُرِيْكَ طَرِيْقَ الصِّدْقِ وَالسَّدَادِ۔ اَلَا تَرٰى اَنَّ سُوْرَةَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ
يَمْنَعُ الْمَسِيْحَ اَنْ يَّرْقٰى فِي السَّمَآءِ۔ وَاَنَّ اٰلَ عِمْرَانَ تَعِدُهٗ اَنَّ اللّٰهَ مُتَوَفِّيْهِ وَ
نَاقِلُهٗ اِلَى الْاَمْوَاتِ مِنَ الْاَحْيَآءِ۔ ثُمَّ اِنَّ الْمَآئِدَةَ تَبْسُطُ لَهٗ مَآئِدَةَ الْوَفَاةِ۔
فَاقْرَءْ "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ" اِنْ كُنْتَ فِي الشُّبُهَاتِ۔ ثُمَّ اِنَّ الزُّمَرَ يَجْعَلُهٗ مِنْ زُمَرٍ
لَّا يَعُوْدُوْنَ اِلَى الدُّنْيَا الدَّنِيَّةِ۔ وَاِنْ شِئْتَ فَاقْرَءْ "فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا

اور اُس ذات کی قسم جس نے بادلوں سے بارش اُتاری اور شگوفوں سے پھل نکالے اِس آیت سے حق ظاہر ہو گیا ہے اور جس کو ذرّہ بھر بھی سمجھ عطا کی گئی ہے وہ اس بارہ میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے پوری وضاحت سے (یہ اُمور) کھول کر ہم پر بہت احسان کیا ہے اور ہم سے غور و فکر کی مشقت کو دُور کر دیا ہے۔ پس جو لوگ سانپ کے زبان ہلانے کی طرح زبان ہلاتے ہیں اور شکار کو جھانکنے والے باز کے غصّہ سے دیکھنے کی طرح غضبناک ہو کر دیکھتے ہیں اُن پر واجب ہے کہ اِس انعام سے مُنہ نہ پھیریں اور چوپایوں کی طرح نہ ہو جائیں۔ اور میرے دل میں یہ بات خوب بیٹھ گئی ہے کہ سورت فاتحہ دعا کرنے والوں کے زخموں کا علاج کرتی ہے اور اُن کے (روحانی) بازوؤں پر پَر لگاتی ہے اور قرآن کی کوئی سورت ایسی نہیں جو اُنہیں اس اعتقاد (حیاتِ مسیح) کے بارے میں جھوٹا قرار نہ دیتی ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کی اِس کتاب کو جہاں سے چاہو پڑھ لو۔ وہ تمہیں صدق و سَداد کا راستہ ہی دکھائیگی کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورت بنی اسرائیل مسیح کو اس بات سے روکتی ہے کہ وہ آسمان میں چڑھ جائے اور یہ کہ سورۃ آل عمران مسیح سے وعدہ کرتی ہے کہ خدا اُسے وفات دے گا اور اُسے زندوں سے مُردوں کی طرف منتقل کرنے والا ہے۔ پھر یہ کہ سورۃ مائدہ اس کے لیے موت کا دسترخوان بچھاتی ہے۔ اگر تمہیں شبہات ہوں تو فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (والی آیت) پڑھ لو۔ پھر سورۃ زُمر اسے ایسے گروہ میں شامل کرتی ہے جو اِس حقیر دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ اگر تم چاہو تو فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ[2] پڑھ لو اور معلوم کر لو کہ موت کے بعد اس دنیا کی

[1] سورۃ الزمر ع ۵ ۔ [2] ترجمہ جس کی موت کا حکم جاری کر چکا ہوتا ہے اس کی روح کو روک رکھتا ہے۔

الْمَوْتَ"۔ وَاعْلَمْ اَنَّ الرُّجُوْعَ حَرَامٌ بَعْدَ الْمَنِيَّةِ۔ وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكَهَا اللّٰهُ اَنْ تُبْعَثَ قَبْلَ يَوْمِ النُّشُوْرِ۔ وَاَمَّا الْاِحْيَاءُ بِطَرِيْقِ الْمُعْجِزَةِ فَلَيْسَ فِيْهِ الرُّجُوْعُ اِلَى الدُّنْيَا الَّتِيْ هِيَ مَقَامُ الظُّلْمِ وَالزُّوْرِ۔ ثُمَّ اِذَا ثَبَتَ مَوْتُ الْمَسِيْحِ بِالنَّصِّ الصَّرِيْحِ۔ فَاَزَالَ اللّٰهُ وَهْمَ نُزُوْلِهٖ مِنَ السَّمَاءِ بِالْبَيَانِ الْفَصِيْحِ۔ وَاَشَارَ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ وَالْفَاتِحَةِ۔ اَنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ يَرِثُ اَنْبِيَاءَ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ عَلَى الطَّرِيْقَةِ الظِّلِّيَّةِ۔ فَوَجَبَ اَنْ يَّاْتِيَ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ مَسِيْحٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ كَمَا اَتٰى عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ فِيْ اٰخِرِ السِّلْسِلَةِ الْمُوْسَوِيَّةِ۔ فَاِنَّ مُوْسٰى وَمُحَمَّدًا عَلَيْهِمَا صَلَوَاتُ الرَّحْمَانِ مُتَمَاثِلَانِ بِنَصِّ الْفُرْقَانِ۔ وَاِنَّ سِلْسِلَةَ هٰذِهِ الْخِلَافَةِ تُشَابِهُ سِلْسِلَةَ تِلْكَ الْخِلَافَةِ۔ كَمَا هِيَ مَذْكُوْرَةٌ فِي الْقُرْاٰنِ۔ وَفِيْهَا لَا يَخْتَلِفُ اثْنَانِ۔ وَقَدِ اخْتَتَمَتْ مِئَاتُ سِلْسِلَةِ خُلَفَاءِ مُوْسٰى عَلٰى عِيْسٰى كَمِثْلِ عِدَّةِ اَيَّامِ الْبَدْرِ۔ فَكَانَ مِنَ الْوَاجِبِ اَنْ يَّظْهَرَ مَسِيْحُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ فِيْ مُدَّةٍ هِيَ كَمِثْلِ هٰذَا الْقَدْرِ۔ وَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ الْقُرْاٰنُ فِيْ قَوْلِهٖ "لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ"[1]۔ وَاِنَّ الْقُرْاٰنَ ذُوالْوُجُوْهِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْعُلَمَاءِ

طرف لوٹنا حرام ہے اور اُس بستی کا جسے اللہ تعالیٰ ہلاک کردے قیامت سے پہلے زندہ اُٹھایا جانا حرام ہے۔ لیکن معجزہ کے طور پر زندہ ہونے کا مطلب اس دنیا کی طرف لوٹنا نہیں جو ظلم اور فریب کا گھر ہے۔ پھر جب مسیحؑ کی موت نصِ صریح سے ثابت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے فصیح بیان میں اُس کے آسمان سے اُترنے کے وہم کا ازالہ کردیا۔ اور سورۃ نور اور سورۃ فاتحہ میں اشارہ کیا کہ یہ اُمت ظلی طور پر بنی اسرائیل کے انبیاء کی وارث ہوگی تو یہ بات لازم ہوگئی کہ آخری زمانہ میں اِس اُمت میں بھی مسیح آئے گا جس طرح عیسیٰ بن مریم موسوی سلسلہ کے آخر میں آئے تھے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر دو پر خدائے رحمان کا درود اور سلام ہو قرآنی نص کے رُو سے ایک دوسرے کے مثیل ہیں اور اِس خلافت کا سلسلہ اُس سلسلۂ خلافت سے مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اس سلسلہ کا ذکر موجود ہے اور اس بارہ میں کوئی دو آدمی مختلف نہیں اور خلفاء موسیٰؑ کے سلسلہ کی صدیاں چودھویں کے چاند کی گنتی کے مطابق حضرت عیسیٰؑ پر ختم ہوگئیں۔ پس ضروری تھا کہ اِس اُمت کا مسیح اِسی قدر عرصہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ظاہر ہو اور اس کی طرف قرآن مجید نے آیت کریمہ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ میں اشارہ کیا ہے اور جیسا کہ جلیل القدر عالموں پر مخفی نہیں۔ قرآن کریم ذوالوجوہ ہے۔ سو اس جگہ

[1] آل عمران ع ۱۳ ۔ [2] ترجمہ: اور اس سے پہلے بدر کی جنگ میں جبکہ تم حقیر تھے اللہ یقیناً تمہیں مدد دے چکا ہے۔

الْاٰجِلَةِ - فَالْمَعْنَى الثَّانِيْ لِهٰذِهِ الْاٰيَةِ فِيْ هٰذَا الْمَقَامِ اَنَّ اللّٰهَ يَنْصُرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بِظُهُوْرِ الْمَسِيْحِ اِلٰى مِئِيْنَ تُشَابِهُ عِدَّتُهَا اَيَّامَ الْبَدْرِ التَّامِّ - وَالْمُؤْمِنُوْنَ اَذِلَّةٌ فِيْ تِلْكَ الْاَيَّامِ - فَانْظُرْ اِلٰى هٰذِهِ الْاٰيَةِ كَيْفَ تُشِيْرُ اِلٰى ضُعْفِ الْاِسْلَامِ - ثُمَّ تُشِيْرُ اِلٰى كَوْنِ هِلَالِهٖ بَدْرًا فِيْ اَجَلٍ مُّسَمًّى مِّنَ اللّٰهِ الْعَلَّامِ - كَمَا هُوَ مَفْهُوْمٌ مِّنْ لَّفْظِ الْبَدْرِ - فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى هٰذَا الْاِفْضَالِ وَالْاِنْعَامِ - وَحَاصِلُ مَا قُلْنَا فِيْ هٰذَا الْبَابِ - اَنَّ الْفَاتِحَةَ تُبَشِّرُ بِكَوْنِ الْمَسِيْحِ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّ الْاَرْبَابِ - فَقَدْ بُشِّرْنَا مِنَ الْفَاتِحَةِ بِاَئِمَّةٍ مِّنَّا هُمْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْۤ اِسْرَآئِيْلَ - وَمَا بُشِّرْنَا بِنُزُوْلِ نَبِيٍّ مِّنَ السَّمَآءِ - فَتَدَبَّرْ هٰذَا الدَّلِيْلَ - وَقَدْ سَمِعْتَ مِنْ قَبْلُ اَنَّ سُوْرَةَ النُّوْرِ قَدْ بَشَّرَتْنَا بِسِلْسِلَةِ خُلَفَاءٍ تُشَابِهُ سِلْسِلَةَ خُلَفَاءِ الْكَلِيْمِ - وَكَيْفَ تَتِمُّ الْمُشَابَهَةُ مِنْ دُوْنِ اَنْ يَّظْهَرَ مَسِيْحٌ كَمَسِيْحِ سِلْسِلَةِ الْكَلِيْمِ فِيْ اٰخِرِ سِلْسِلَةِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ - وَاِنَّا اٰمَنَّا بِهٰذَا الْوَعْدِ فَاِنَّهٗ مِنْ رَّبِّ الْعِبَادِ - وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ - وَالْعَجَبُ مِنَ الْقَوْمِ اَنَّهُمْ

اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان صدیوں کے اختتام پر جن کی گنتی بدرِ کامل کے دنوں کے مشابہ ہے مسیح موعود کے ظہور سے مومنوں کی مدد فرمائے گا. درآنحالیکہ مومن اس زمانہ میں حقیر ہوں گے پس اس آیت کو دیکھو کس طرح ترقی کے بعد اسلام کے ضعیف ہوجانے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر یہی آیت خدائے علیم وخبیر کی طرف سے مقرر کردہ مدت میں ہلالِ اسلام کے بدر بن جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے جیسا کہ آیت میں لفظ بدر سے سمجھا جاتا ہے۔ پس اس فضل اور انعام پر خدا تعالیٰ کے لیے ہی سب تعریفیں ہیں۔ اس بارہ میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ بشارت دیتی ہے کہ مسیح موعود اسی اُمت میں سے ہوگا اور یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے بطور فضل واحسان ہوگا۔ پس سورت فاتحہ کے ذریعہ ہمیں خوشخبری دی گئی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی مانند ہم میں ائمہ تو ہوں گے لیکن آسمان سے کسی نبی کے نازل ہونے کی ہمیں کوئی بشارت نہیں دی گئی۔ پس اس دلیل پر پورا غور کرو۔ اور تم قبل ازیں سُن چکے ہو کہ سورت نُور نے ہمیں حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے خلفاء کے سلسلہ کی مانند ایک سلسلۂ خلفاء کی بشارت دی ہے۔ پس یہ مشابہت کس طرح پوری ہوگی سوائے اس کے کہ سلسلۂ موسیٰ کلیم اللہ کے مسیح کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ظاہر ہو۔ ہمارا اس وعدہ پر ایمان ہے کیونکہ یہ وعدہ ربّ عباد کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس قوم پر تعجب ہے

مَا نَظَرُوْا اِلٰی وَعْدِ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ۔ وَهَلْ يُوَفّٰى وَيُنْجَزُ اِلَّا الْوَعْدُ فَلْيَنْظُرُوْا بِالتَّقْوٰى وَالْحَيَآءِ۔ وَهَلْ فِیْ شِرْعَةِ الْاِنْصَافِ۔ اَنْ يُّنَزَّلَ الْمَسِيْحُ مِنَ السَّمَآءِ وَيُخْلَفَ وَعْدُ مُمَاثَلَةِ سِلْسِلَةِ الْاِسْتِخْلَافِ۔ وَاِنَّ تَشَابُهَ السِّلْسِلَتَيْنِ قَدْ وَجَبَ بِحُكْمِ اللّٰهِ الْغَيُوْرِ۔ كَمَا هُوَ مَفْهُوْمٌ مِّنْ لَّفْظِ كَمَا فِیْ سُوْرَةِ النُّوْرِ ؛

(اعجاز المسیحؐ صفحہ ۱۶۶ تا ۱۸۵)

وَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُبَشِّرُ لِاُمَّةِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَاَنَّهٗ يَقُوْلُ يَا عِبَادِ اِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ عَلٰى طَبَائِعِ الْمُنْعَمِيْنَ السَّابِقِيْنَ وَفِيْكُمْ اسْتِعْدَادَاتُهُمْ فَلَا تُضَيِّعُوا الْاِسْتِعْدَادَاتِ وَجَاهِدُوْا لِتَحْصِيْلِ الْكَمَالَاتِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ جَوَادٌ كَرِيْمٌ وَّلَيْسَ بِبَخِيْلٍ ضَنِيْنٍ۔ وَمِنْ هٰهُنَا يُفْهَمُ سِرُّ نُزُوْلِ الْمَسِيْحِ الَّذِیْ يَخْتَصِمُ النَّاسُ فِيْهِ۔ فَاِنَّ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِ اللّٰهِ اِذَا اقْتَدٰى هُدَى الْمُهْتَدِيْنَ وَتَبِعَ سُنَنَ الْكَامِلِيْنَ وَتَاَهَّبَ لِلْاِنْصِبَاغِ بِصِبْغِ الْمَهْدِيِّيْنَ وَعَطَفَ اِلَيْهِمْ بِجَمِيْعِ اِرَادَاتِهٖ وَقُوَّتِهٖ وَجَنَانِهٖ وَاَدّٰى شَرْطَ السُّلُوْكِ بِحَسَبِ اِمْكَانِهٖ وَشَفَعَ الْاَقْوَالَ بِالْاَعْمَالِ وَالْمَقَالَ بِالْحَالِ وَدَخَلَ فِی الَّذِيْنَ يَتَعَاطَوْنَ كَاْسَ

کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے وعدہ کی طرف دھیان نہیں کیا اور خدائی وعدہ تو اٹل ہوتا ہے اور ضرور پورا ہو جاتا ہے پس چاہیئے کہ خوفِ خدا اور حیاء کے ساتھ دیکھیں کہ آیا یہ قانون عدل ہے کہ مسیح آسمان سے نازل کیا جائے اور سلسلۂ خلفاء کی مشابہت کے وعدہ کی خلاف ورزی کی جائے حالانکہ غیور خدا کے حکم سے ان دونوں سلسلوں کی مشابہت واجب قرار پا چکی ہے جیسا کہ سورۃ نُور کی آیت استخلاف کے لفظ کَمَا سے سمجھا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کو خوشخبری دیتا ہے گویا وہ یہ کہتا ہے کہ اے میرے بندو! تم پہلے انعام یافتہ لوگوں کی طبیعتوں پر پیدا کیے گئے ہو اور تم میں اُن کی استعدادیں رکھی گئی ہیں پس تم ان استعدادوں کو ضائع نہ کرو اور کمالات حاصل کرنے کے لیے مجاہدات کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بڑا ہی سخی اور کریم ہے اور وہ بخیل اور کنجوس نہیں اور یہاں سے نزولِ مسیح کا وہ راز سمجھا جا سکتا ہے جس کے بارہ میں لوگ جھگڑتے ہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہدایت یافتہ لوگوں کے طریق کی پیروی کرے اور کامل لوگوں کے طریقوں کا مُتبع ہو اور ہدایت یافتہ لوگوں کے رنگ سے رنگین ہونے کے لیے تیار ہو اور اپنے تمام ارادوں اور قوت اور دل سے اُن کی طرف مائل ہو اور حتی الامکان سُلوک کے شرائط ادا کرے اور اپنے اقوال کو اعمال سے اور مقال کو حال سے مطابق

الْمَحَبَّةِ لِلْقَادِرِ ذِی الْجَلَالِ وَیَقْتَدِحُوْنَ زِنَادَ ذِکْرِ اللّٰہِ بِالتَّضَرُّعِ وَالْاِبْتِھَالِ وَیَبْکُوْنَ مَعَ الْبَاکِیْنَ۔ فَھُنَالِکَ یَفُوْرُ بَحْرُ رَحْمَۃِ اللّٰہِ لِیُطَھِّرَہٗ مِنَ الْاَوْسَاخِ وَالْاَدْرَانِ۔ وَلِیُرْوِیَہٗ بِاِفَاضَۃِ التَّھْتَانِ ثُمَّ یَاْخُذُ یَدَہٗ وَیُرَقِّیْہِ اِلٰی اَعْلٰی مَرَاتِبِ الْاِرْتِقَآءِ وَالْعِرْفَانِ۔ وَیُدْخِلُہٗ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنَ الصُّلَحَآءِ وَالْاَوْلِیَآءِ وَالرُّسُلِ وَالنَّبِیِّیْنَ۔ فَیُعْطٰی کَمَالًا کَمِثْلِ کَمَالِھِمْ وَجَمَالًا کَمِثْلِ جَمَالِھِمْ وَجَلَالًا کَمِثْلِ جَلَالِھِمْ وَقَدْ یَقْتَضِی الزَّمَانُ وَالْمَصْلَحَۃُ اَنْ یُّرْسَلَ ھٰذَا الرَّجُلُ عَلٰی قَدَمِ نَبِیٍّ خَاصٍّ فَیُعْطٰی لَہٗ عِلْمًا کَعِلْمِہٖ وَعَقْلًا کَعَقْلِہٖ وَنُوْرًا کَنُوْرِہٖ وَاسْمًا کَاسْمِہٖ وَیَجْعَلُ اللّٰہُ اَرْوَاحَھُمَا کَمِرْاٰیَا مُتَقَابِلَۃٍ فَیَکُوْنُ النَّبِیُّ کَالْاَصْلِ وَالْوَلِیُّ کَالظِّلِّ مِنْ مَّرْتَبَتِہٖ یَاْخُذُ وَمِنْ رُّوْحَانِیَّتِہٖ یَسْتَفِیْدُ حَتّٰی یَرْتَفِعَ مِنْھُمَا الْاِمْتِیَازُ وَالْغَیْرِیَّۃُ وَتَرِدُ اَحْکَامُ الْاَوَّلِ عَلَی الْاٰخِرِ وَیَصِیْرَانِ کَشَیْءٍ وَّاحِدٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَعِنْدَ مَلَاءِ الْاَعْلٰی وَیَنْزِلُ

کرے اور ان لوگوں میں داخل ہو جائے جو خدائے قادر ذوالجلال کی طرف سے محبّت کا پیالہ لیتے ہیں اور ذکر اللہ کے چقماق سے تضرع اور عاجزی کے ذریعہ روشنی حاصل کرتے ہیں اور رونے والوں کے ساتھ روتے ہیں تب (بندہ کے اس مقام پر پہنچنے پر) اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سمندر جوش مارتا ہے تا اُس شخص کو تمام قسم کی روحانی میل کچیل سے پاک کرے اور تا اُسے مُوسلا دھار (رُوحانی) بارش کے فیضان سے سیراب کرے۔ پھر وہ اُس کی دستگیری کرتا ہے اور اُسے اِرتقاء اور عرفان کے اعلیٰ مراتب پر پہنچاتا ہے۔ اور اُس کو اُن لوگوں میں داخل کر دیتا ہے جو صالحین، اولیٰ رسولوں اور نبیوں میں سے اُس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پس اُسے اُن کے کمالات کی طرح کمال اور اُن کے جمال کی طرح جمال اور اُن کے جلال کی طرح جلال عطا کیا جاتا ہے اور کبھی زمانہ اور مصلحت اِس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ ایسا شخص ایک خاص نبی کے قدم پر بھیجا جائے پھر اُسے اُس نبی کا سا علم، اور اُس کی عقل کی سی عقل، اور اُس کے نُور کا سا نُور، اور اُس کے نام کا سا نام دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُن دونوں کی روحوں کو اُن آئینوں کی طرح بنا دیتا ہے جو آمنے سامنے ہوں۔ پس نبی اصل کی طرح ہوتا ہے اور ولی ظِلّ کی طرح۔ وہ اس کے مرتبہ سے (حصہ) لیتا ہے اور اُس کی رُوحانیت سے استفادہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کے درمیان امتیاز اور غیریّت اُٹھ جاتے ہیں اور پہلے (اصل) کے احکام دوسرے (ظِلّ) پر وارد ہو جاتے ہیں تب وہ دونوں اللہ اور ملاء اعلیٰ کے نزدیک ایک شئی کی طرح ہو جاتے ہیں اور دوسرے پر اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اللہ

عَلَى الْآخِرِ إِرَادَةُ اللّٰهِ وَتَصْرِيْفُهُ إِلٰى جِهَةٍ وَأَمْرُهُ وَنَهْيُهُ بَعْدَ عُبُوْرِهِ عَلٰى رُوْحِ الْأَوَّلِ وَهٰذَا سِرٌّ مِّنْ أَسْرَارِ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا يَفْهَمُهُ إِلَّا مَنْ كَانَ مِنَ الرُّوْحَانِيِّيْنَ۔ (کرامات الصادقین ص۸۵-۸۶)

فَالْحَاصِلُ أَنَّ دُعَاءَ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ يُنَجِّي الْإِنْسَانَ مِنْ كُلِّ أَوَدٍ وَّيُظْهِرُ عَلَيْهِ الدِّيْنَ الْقَوِيْمَ وَيُخْرِجُهُ مِنْ بَيْتٍ قَفْرٍ إِلٰى رِيَاضِ الثَّمَرِ وَالرَّيَاحِيْنِ۔ وَمَنْ زَادَ فِيْهِ إِلْحَاحًا زَادَهُ اللّٰهُ صَلَاحًا وَّالنَّبِيُّوْنَ أَنِسُوْا مِنْهُ أُنْسَ الرَّحْمَانِ فَمَا فَارَقُوا الدُّعَاءَ طَرْفَةَ عَيْنٍ إِلٰى أٰخِرِ الزَّمَانِ وَمَا كَانَ لِأَحَدٍ أَنْ يَّكُوْنَ غَنِيًّا عَنْ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ وَلَا مُعْرِضًا عَنْ هٰذِهِ الْمُنْيَةِ نَبِيًّا أَوْ كَانَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ فَإِنَّ مَرَاتِبَ الرُّشْدِ وَالْهِدَايَةِ لَا تَتِمُّ أَبَدًا بَلْ هِيَ إِلٰى غَيْرِ النِّهَايَةِ وَلَا تَبْلُغُهَا أَنْظَارُ الدِّرَايَةِ فَلِذٰلِكَ عَلَّمَ اللّٰهُ تَعَالٰى هٰذَا الدُّعَاءَ لِعِبَادِهٖ وَجَعَلَهٗ مَدَارَ الصَّلٰوةِ لِيَتَمَتَّعُوْا بِرَشَادِهٖ وَلِيُكْمِلَ النَّاسُ بِهِ التَّوْحِيْدَ وَلِيَذْكُرُوا الْمَوَاعِيْدَ وَلِيَسْتَخْلِصُوْا مِنْ شِرْكِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ وَمِنْ كَمَالَاتِ هٰذَا الدُّعَاءِ أَنَّهٗ يَعُمُّ كُلَّ مَرَاتِبِ النَّاسِ

کا اُسے ایک جہت کی طرف پھرانا اور اس کا امر اور اُس کی نہی پہلے (اصل) کی روح پر عبور کرنے کے بعد اُس دوسرے (ظل) پر اُترتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایسا سِرّ ہے جس کو سوائے روحانی لوگوں کے اور کوئی نہیں سمجھتا۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دُعاء اِنسان کو ہر کجی سے نجات دیتی ہے اور اُس پر دینِ قویم کو واضح کرتی ہے اور اُس کو ویران گھر سے نکال کر پھلوں اور خوشبوؤں بھرے باغات میں لے جاتی ہے اور جو شخص بھی اس دُعاء میں زیادہ آہ وزاری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو خیر و برکت میں بڑھاتا ہے۔ دعا سے ہی نبیوں نے خدائے رحمان کی محبّت حاصل کی اور اپنے آخری وقت تک ایک لحظہ کے لیے بھی دعا کو نہ چھوڑا اور کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس دعاء سے لاپرواہ ہو، یا اس مقصد سے مُنہ پھیرلے خواہ وہ نبی ہو یا رسولوں میں سے کیونکہ رُشد اور ہدایت کے مراتب کبھی ختم نہیں ہوتے بلکہ وہ بے انتہاء ہیں اور عقل و دانش کی نگاہیں ان تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ دعاء سکھائی اور اسے نماز کا مدار ٹھہرایا تا لوگ اس کی ہدایت سے فائدہ اُٹھائیں اور اس کے ذریعہ توحید کو مکمل کریں اور (خدا تعالیٰ کے) وعدوں کو یاد رکھیں اور مشرکوں کے شرک سے نجات پاویں۔ اس دُعاء کے کمالات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کے تمام مراتب پر حاوی ہے اور ہر فرد پر بھی حاوی ہے

وَكُلَّ فَرْدٍ مِّنْ اَفْرَادِ الْاُنَاسِ وَهُوَ دُعَآءٌ غَيْرُ مَحْدُوْدٍ لَّا حَدَّ لَهٗ وَلَا انْتِهَآءَ وَلَا غَايَ وَلَا اَرْجَآءَ فَطُوْبٰى لِلَّذِيْنَ يُدَاوِمُوْنَ عَلَيْهِ بِقَلْبٍ دَامِي الْقُرُحِ وَبِرُوْحٍ صَابِرَةٍ عَلَى الْجُرُحِ وَنَفْسٍ مُّطْمَئِنَّةٍ كَعِبَادِ اللّٰهِ الْعَارِفِيْنَ۔ وَاِنَّهٗ دُعَآءٌ تَضَمَّنَ كُلَّ خَيْرٍ وَّسَلَامَةٍ وَّسَدَادٍ وَّاسْتِقَامَةٍ وَّفِيْهِ بَشَارَاتٌ مِّنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

(کرامات الصّادقین صفحہ ۹۴، ۹۵)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ اَلرَّحْمٰن کے بالمقابل ہے کیونکہ ہدایت پانا کسی کا حق تو نہیں ہے بلکہ محض رحمانیت الٰہی سے یہ فیض حاصل ہو سکتا ہے اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اَلرَّحِیْم کے بالمقابل ہے کیونکہ اس کا ورد کرنے والا رحیمیت کے چشمہ سے فیض حاصل کرتا ہے اور اس کے یہ معنے ہیں کہ اے رحم خاص سے دعاؤں کے قبول کرنے والے ان رسولوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحوں کی راہ ہم کو دکھا جنہوں نے دعا اور مجاہدات میں مصروف ہو کر تجھ سے انواع واقسام کے معارف اور حقائق اور کشوف اور الہامات کا انعام پایا اور دائمی دعا اور تضرع اور اعمال صالحہ سے معرفت تامہ کو پہنچے۔

(الحکم ۷ استمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

ساتویں صداقت جو سورۂ فاتحہ میں درج ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم کو وہ راستہ دکھلا اور اُس راہ پر ہم کو ثابت اور قائم کر کہ جو سیدھا ہے جس میں کسی نوع کی کجی نہیں۔ اس صداقت کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی حقیقی دُعا یہی ہے کہ وہ خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ طلب کرے کیونکہ ہر یک مطلوب کے حاصل کرنے کے لیے طبعی قاعدہ یہ ہے کہ اُن وسائل کو حاصل کیا جائے جن کے ذریعہ سے وہ مطلب ملتا ہے اور خدا نے ہر یک امر کی تحصیل کے لیے یہی قانونِ قدرت ٹھہرا رکھا ہے کہ جو اُس کے حصول کے وسائل ہیں وہ حاصل کیے جائیں اور جن راہوں پر چلنے سے وہ مطلب مل سکتا ہے وہ راہیں اختیار کی جائیں اور جب انسان

وہ ایک غیر محدود دعاء ہے جس کی کوئی حدبندی یا انتہاء نہیں اور نہ اس کی کوئی غایت یا کنارہ ہے۔ پس مبارک ہیں وہ لوگ جو خدا کے عارف بندوں کی طرح اس دعا پر مداومت اختیار کرتے ہیں زخمی دلوں کے ساتھ جن سے خون بہتا ہے اور ایسی رُوحوں کے ساتھ جو زخموں پر صبر کرنے والی ہوں اور نفوسِ مُطمئنّہ کے ساتھ۔

یہ وہ دعاء ہے جو ہر خیر، سلامتی، پختگی اور استقامت پر مشتمل ہے اور اس دُعا میں ربّ العالمین کی طرف سے بڑی بشارتیں ہیں۔

صراط مستقیم پر ٹھیک ٹھیک قدم مارے اور جو حصول مطلب کی راہیں ہیں اُن پر چلنا اختیار کرے تو پھر مطلب خود بخود حاصل ہو جاتا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اُن راہوں کے چھوڑ دینے سے جو کسی مطلب کے حصول کے لیے بطور وسائل کے ہیں یونہی مطلب حاصل ہو جائے بلکہ قدیم سے یہی قانونِ قدرت بندھا ہوا چلا آتا ہے کہ ہر یک مقصد کے حصول کے لیے ایک مقرری طریقہ ہے جب تک انسان اس طریقہ مقررہ پر قدم نہیں مارتا تب تک وہ امر اُس کو حاصل نہیں ہوتا پس وہ شے جس کو محنت اور کوشش اور دُعا اور تضرع سے حاصل کرنا چاہیئے صراط مستقیم ہے جو شخص صراط مستقیم کی طلب میں کوشش نہیں کرتا اور نہ اس کی کچھ پرواہ رکھتا ہے وہ خدا کے نزدیک ایک کج رو آدمی ہے اور اگر وہ خدا سے بہشت اور عالم ثانی کی راحتوں کا طالب ہو تو حکمتِ الٰہی اُسے یہی جواب دیتی ہے کہ اے نادان اول صراطِ مستقیم کو طلب کر پھر یہ سب کچھ تجھے آسانی سے مل جائے گا سو سب دُعاؤں سے مقدم دعا جس کی طالبِ حق کو اشد ضرورت ہے طلب صراط مستقیم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے مخالفین اِس صداقت پر قدم مارنے سے بھی محروم ہیں عیسائی لوگ تو اپنی ہر دُعا میں روٹی ہی مانگا کرتے ہیں اور اگر کھا پی کر اور پیٹ بھر کر بھی گرجا میں آویں پھر بھی جھوٹ موٹ اپنے تئیں بھوکے ظاہر کر کے روٹی مانگتے رہتے ہیں گویا اُن کا مطلوب اعظم روٹی ہی ہے وبس آریہ سماج والے اور دوسرے اُن کے بُت پرست بھائی اپنی دُعاؤں میں جنم مرن سے بچنے کے لیے یعنی اواگون سے جو اُن کے زعم باطل میں ٹھیک اور درست ہے طرح طرح کے اشلوک پڑھا کرتے ہیں اور صراطِ مستقیم کو خدا سے نہیں مانگتے علاوہ اِس کے اللہ تعالیٰ نے تو اِس جگہ جمع کا لفظ بیان کر کے اِس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کوئی انسان ہدایت طلب کرنے اور انعام الٰہی پانے سے ممنوع نہیں ہے مگر بموجب اُصول آریہ سماج کے ہدایت طلب کرنا گنہ گار کے لیے ناجائز ہے اور خدا اُس کو ضرور سزا دیگا اور ہدایت پانا نہ پانا اُس کے لیے برابر ہے۔ برہمو سماج والوں کا دُعاؤں پر کچھ ایسا اعتقاد ہی نہیں وہ ہر وقت اپنی عقل کے گھمنڈ میں رہتے ہیں اور نیز اُن کا یہ بھی مقولہ ہے کہ کسی خاص دُعا کو بندگی اور عبادت کے لیے خاص کرنا ضروری نہیں انسان کو اختیار ہے جو چاہے دُعا مانگے مگر یہ اُن کی سراسر نادانی ہے اور ظاہر ہے کہ اگرچہ جزوی حاجات صدہا انسان کو لگی ہوئی ہیں مگر حاجتِ اعظم جس کا دن رات اور ہر یک دم فکر کرنا چاہیئے صرف ایک ہی ہے یعنی یہ کہ انسان اُن طرح طرح کے حجب ظلمانیہ سے نجات پا کر معرفتِ کامل کے درجہ تک پہنچ جائے اور کسی طرح کی نابینائی اور کور باطنی اور بے مہری اور بے وفائی باقی نہ رہے بلکہ خدا کو کامل طور پر شناخت کر کے اور اُس کی خالص محبت سے پُر ہو کر مرتبہ وصالِ الٰہی کا جس میں اُس کی سعادتِ تامہ ہے پالیوے یہی ایک دُعا ہے جس کی انسان کو سخت حاجت ہے اور جس پر اُس کی ساری سعادت موقوف ہے۔ سو اُس کے حصول کا سیدھا راستہ یہی ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہے

کیونکہ انسان کے لیے ہر یک مطلب کے پانے کا یہی ایک طریق ہے کہ جن راہوں پر چلنے سے وہ مطلب حاصل ہوتا ہے اُن راہوں پر مضبوطی سے قدم مارے اور وہی راستہ اختیار کرے کہ جو سیدھا منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے اور بے راہیوں کو چھوڑ دے اور یہ بات نہایت بدیہی ہے کہ ہر شئے کے حصول کے لیے خدا نے اپنے قانونِ قدرت میں صرف ایک ہی راستہ ایسا رکھا ہے کہ جس کو سیدھا کہنا چاہیئے اور جب تک ٹھیک ٹھیک وہی راستہ اختیار نہ کیا جائے ممکن نہیں کہ وہ چیز حاصل ہو سکے جس طرح خدا کے تمام قواعد قدیم سے مقرر اور منضبط ہیں ایسا ہی نجات اور سعادتِ اُخروی کی تحصیل کے لیے ایک خاص طریق مقرر ہے جو مستقیم اور سیدھا ہے سو دعا میں وضعِ استقامت یہی ہے کہ اُسی طریق مستقیم کو خدا سے مانگا جائے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۴۵-۴۵۶ حاشیہ ۱۱)

حقیقی نیکی پر قدم مارنا صراط مستقیم ہے اور اسی کا نام توسط اور اعتدال ہے کیونکہ توحید فعلی جو مقصود بالذات ہے وہ اسی سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص اس نیکی کے حاصل کرنے میں متساہل رہے وہ درجہ تفریط میں ہے اور جو شخص اس سے آگے بڑھے وہ افراط میں پڑتا ہے ہر جگہ رحم کرنا افراط ہے کیونکہ محل کے ساتھ بے محل کا پیوند کر دینا اصل پر زیادتی ہے اور یہی افراط ہے اور کسی جگہ بھی رحم نہ کرنا یہ تفریط ہے کیونکہ اس میں محل بھی فوت کر دیا اور یہی تفریط ہے وضع شئی کا اپنے محل پر کرنا یہ توسط اور اعتدال ہے کہ جو صراط مستقیم سے موسوم ہے جس کی تحصیل کے لیے کوشش کرنا ہر ایک مسلمان پر فرض کیا گیا ہے اور اُس کی دعا ہر نماز میں بھی مقرر ہوئی ہے جو صراط مستقیم کو مانگتا رہے کیونکہ یہ امر اُس کو توحید پر قائم کرنے والا ہے کیونکہ صراط مستقیم پر ہونا خدا کی صفت ہے علاوہ اس کے صراط مستقیم کی حقیقت حق اور حکمت ہے پس اگر وہ حق اور حکمت خدا کے بندوں کے ساتھ بجا لایا جائے تو اُس کا نام نیکی ہے اور اگر خدا کے ساتھ بجا لایا جائے تو اُس کا نام اخلاص اور احسان ہے اور اگر اپنے نفس کے ساتھ ہو تو اُس کا نام تزکیہ نفس ہے اور صراط مستقیم ایسا لفظ ہے کہ جس میں حقیقی نیکی اور اخلاص باللہ اور تزکیہ نفس تینوں شامل ہیں۔

اب اس جگہ یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ صراط مستقیم جو حق اور حکمت پر مبنی ہے تین قسم پر ہے علمی اور عملی اور حالی اور پھر یہ تینوں تین قسم پر ہیں۔ علمی میں حق اللہ اور حق العباد اور حق النفس کا شناخت کرنا ہے اور عملی میں اُن حقوق کو بجا لانا۔ مثلاً حق علمی یہ ہے کہ اُس کو ایک سمجھنا اور اُس کو مبدء تمام فیوض کا اور جامع تمام خوبیوں کا مرجع اور مآب ہر ایک چیز کا اور منزہ ہر ایک عیب اور نقصان سے جاننا اور جامع تمام صفات کاملہ ہونا اور قابل عبودیت ہونا اسی میں محصور رکھنا یہ تو حق اللہ میں علمی صراط مستقیم ہے۔ اور عملی صراط مستقیم یہ ہے جو اُس کی طاعت اخلاص سے بجا لانا اور طاعت میں اُس کا کوئی شریک نہ کرنا اور اپنی بہبودی کے لیے اسی سے دعا مانگنا اور اُسی پر نظر رکھنا اور اُسی کی محبت میں کھوئے جانا یہ عملی صراط مستقیم ہے کیونکہ یہی حق ہے۔

اور حق العباد میں علمی صراط مستقیم یہ ہے جو اُن کو اپنا بنی نوع خیال کرنا اور اُن کو بندگان خدا سمجھنا اور بالکل ہیچ اور ناچیز خیال کرنا کیونکہ معرفت حقہ مخلوق کی نسبت یہی ہے جو اُن کا وجود ہیچ اور ناچیز ہے اور سب فانی ہیں یہ توحید علمی ہے کیونکہ اس سے عظمت ایک ہی ذات کی نکلتی ہے کہ جس میں کوئی نقصان نہیں اور اپنی ذات میں کامل ہے۔

اور عملی صراط مستقیم یہ ہے کہ حقیقی نیکی بجالانا یعنی وہ امر جو حقیقت میں اُن کے حق میں اصلح اور راست ہے بجالانا یہ توحید عملی ہے کیونکہ موحد کی اس میں یہ غرض ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق سراسر خدا کے اخلاق میں فانی ہوں اور حق النفس میں علمی صراط مستقیم یہ ہے کہ جو جو نفس میں آفات پیدا ہوتے ہیں جیسے عجب اور ریا اور تکبر اور حقد اور حسد اور غرور اور حرص اور بخل اور غفلت اور ظلم اُن سب سے مطلع ہونا اور جیسے وہ حقیقت میں اخلاق رذیلہ ہیں ویسا ہی اُن کو اخلاق رذیلہ جاننا یہ علمی صراط مستقیم ہے اور یہ توحید علمی ہے کیونکہ اس سے عظمت ایک ہی ذات کی نکلتی ہے کہ جس میں کوئی عیب نہیں اور اپنی ذات میں قدوس ہے۔

اور حق النفس میں عملی صراط مستقیم یہ ہے جو نفس سے اُن اخلاق رذیلہ کا قلع قمع کرنا اور صفت تخلی عن رذائل اور تحلّی بالفضائل سے متصف ہونا یہ عملی صراط مستقیم ہے یہ توحید حالی ہے کیونکہ موحّد کی اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ تا اپنے دل کو غیر اللہ کے دخل سے خالی کرے اور تا اُس کو فنافی تقدس اللہ کا درجہ حاصل ہو۔ اور اُس میں اور حق العباد میں جو عملی صراط مستقیم ہے ایک باریک فرق ہے اور وہ یہ ہے جو عملی صراط مستقیم حق النفس کا وہ صرف ایک ملکہ ہے جو بذریعہ ورزش کے انسان حاصل کرتا ہے۔ اور ایک باطنی شرف ہے خواہ خارج میں کبھی ظہور میں آوے یا نہ آوے لیکن حق العباد جو عملی صراط مستقیم ہے وہ ایک خدمت ہے اور تبھی متحقق ہوتی ہے کہ جب افراد کثیرہ بنی آدم کو خارج میں اس کا اثر پہنچے اور شرط خدمت کی ادا ہو جائے غرض تحقق عملی صراط مستقیم حق العباد کا ادائے خدمت میں ہے اور عملی صراط مستقیم حق النفس کا صرف تزکیہ نفس پر مدار ہے کسی خدمت کا ادا ہونا ضروری نہیں یہ تزکیہ نفس ایک جنگل میں اکیلے رہ کر بھی ادا ہو سکتا ہے لیکن حق العباد بجز بنی آدم کے ادا نہیں ہو سکتا اسی لیے فرمایا گیا جو رہبانیت اسلام میں نہیں۔

اب جاننا چاہیئے جو صراط مستقیم علمی اور عملی سے غرض اصلی توحید علمی اور توحید عملی ہے یعنی وہ توحید جو بذریعہ علم کے حاصل ہو اور وہ توحید جو بذریعہ عمل کے حاصل ہو۔ پس یاد رکھنا چاہیئے جو قرآن شریف میں بجز توحید کے اور کوئی مقصود اصلی قرار نہیں دیا گیا اور باقی سب اُس کے وسائل ہیں۔

(الحکم ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳-۴)

وَفِی الْاٰیَۃِ اِشَارَۃٌ اُخْرٰی وَھِیَ اَنَّ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ھُوَ النِّعْمَۃُ الْعُظْمٰی وَرَاْسُ کُلِّ نِعْمَۃٍ وَّبَابُ کُلِّ مَا یُعْطٰی۔ وَیَنْتَابُ الْعَبْدَ نِعَمُ اللّٰہِ مُذْ اُعْطِیَ لَہٗ ھٰذِہِ الدَّوْلَۃُ الْکُبْرٰی وَمُلْکٌ لَّا یَبْلٰی۔ وَمَنْ تَاَھَّبَ لِھٰذِہِ النِّعْمَۃِ وَوُفِّقَ لِلثَّبَاتِ عَلَیْھَا فَقَدْ دُعِیَ اِلٰی کُلِّ اَنْوَاعِ الْھُدٰی وَرَاَی الْعَیْشَ النَّضِیْرَ وَالنُّوْرَ الْمُنِیْرَ بَعْدَ لَیَالِی الدُّجٰی نَجَّاہُ اللّٰہُ مِنْ کُلِّ الْھَفَوَاتِ قَبْلَ الْفَوَاتِ وَ اَدْخَلَہٗ فِیْ زُمَرِ التُّقَاۃِ بَعْدَ مُقَانَاۃِ الْعُصَاۃِ وَاَرَاہُ سُبُلَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ وَاَمَّا حَقِیْقَۃُ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ الَّتِیْ اُرِیْدَتْ فِی الدِّیْنِ الْقَوِیْمِ فَھِیَ اَنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَحَبَّ رَبَّہُ الْمَنَّانَ وَکَانَ رَاضِیًا بِمَرْضَاتِہٖ وَفَوَّضَ اِلَیْہِ الرُّوْحَ وَالْجَنَانَ وَاَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَمَا دَعَا اِلَّا اِیَّاہُ وَصَافَاہُ وَنَاجَاہُ وَسَئَلَہُ الرَّحْمَۃَ وَالْحَنَانَ وَتَنَبَّہَ مِنْ غَشْیِہٖ وَاسْتَقَامَ فِیْ مَشْیِہٖ وَخَشِیَ الرَّحْمَانَ وَشَغَفَہُ اللّٰہُ حُبًّا وَّاَعَانَ وَقَوَّی الْیَقِیْنَ وَالْاِیْمَانَ فَمَالَ الْعَبْدُ اِلٰی رَبِّہٖ بِکُلِّ قَلْبِہٖ وَاِرْبِہٖ وَعَقْلِہٖ وَ

ترجمہ:۔اس آیت میں ایک اور اشارہ ہے کہ صراطِ مستقیم نعمت عظمٰی ہے اور ہر نعمت کی جڑ ہے اور ہر عطاء کا دروازہ ہے اور جب بندہ کو یہ بڑی حکومت اور نہ مٹنے والی بادشاہت عطا کی جاتی ہے تو اُس پر اللہ کی نعمتیں پے درپے نازل ہوتی ہیں۔ اور جو اس نعمت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور اس پر ثابت قدمی کی توفیق پالے تو وہ ہر قسم کی ہدایت کی طرف بُلایا گیا۔ اور اندھیری راتوں کے بعد اُس نے خوشگوار زندگی اور روشن کرنے والے نُور کو پالیا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ضیاع سے قبل ہر قسم کی لغزش سے نجات دیتا ہے۔ نافرمانوں کے اختلاط کے باوجود اللہ تعالیٰ اُسے متقیوں کے زُمرہ میں داخل کردیتا ہے اور اُسے مُنعم علیہم گروہ کی راہیں دکھاتا ہے نہ کہ مغضوب علیہم اور گمراہوں کے راستے)

صراطِ مستقیم کی حقیقت جو دینِ قویم کے مدِنظر ہے وہ یہ ہے کہ جب بندہ اپنے فضل واحسان والے خدا سے محبت کرنے لگے۔ اُس کی رضا پر راضی رہے۔ اپنی رُوح اور دل اُس کے سپرد کردے اور اپنے آپ کو اُس خدا کو سونپ دے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اُس کے علاوہ کسی اور سے دُعاء نہ کرے۔ اُسی سے خاص محبت رکھے۔ اُسی سے مُناجات کرے اور اُسی سے رحمت وشفقت مانگے۔ اپنی بے ہوشی سے ہوش میں آجائے۔ اپنی چال سیدھی کرے اور خدائے رحمان سے ڈرے۔ محبت الٰہی اُس کے رگ وریشہ میں سرایت کرجائے۔ اللہ تعالیٰ اُس کی مدد کرے اور اُس کے یقین اور ایمان کو پختہ کرے۔ تب بندہ اپنے پُورے دل، اپنی خواہشات، اپنی عقل، اپنے اعضاء

جَوَارِحِهٖ وَاَرْضِهٖ وَحَقْلِهٖ وَاَعْرَضَ عَمَّا سِوَاهُ وَمَا بَقِیَ لَهٗ اِلَّا رَبُّهٗ وَمَا تَبِعَ اِلَّا هَوَاهُ وَجَاءَهٗ بِقَلْبٍ فَارِغٍ عَنْ غَيْرِهٖ وَمَا قَصَدَ اِلَّا اللّٰهَ فِیْ سُبُلِ سَيْرِهٖ وَ تَابَ مِنْ كُلِّ اِدْلَالٍ وَّاغْتِرَارٍ بِمَالٍ وَّذِیْ مَالٍ وَّحَضَرَ حَضْرَةَ الرَّبِّ كَالْمَسَاكِيْنِ۔ وَوَذَرَ الْعَاجِلَةَ وَاَلْغَاهَا وَاَحَبَّ الْاٰخِرَةَ وَابْتَغَاهَا وَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ لِلّٰهِ وَفَنٰى فِی اللّٰهِ وَسَعٰى اِلَى اللّٰهِ كَالْعَاشِقِيْنَ۔ فَهٰذَا هُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ الَّذِیْ هُوَ مُنْتَهٰى سَيْرِ السَّالِكِيْنَ وَمَقْصَدُ الطَّالِبِيْنَ الْعَابِدِيْنَ۔ وَهٰذَا هُوَ النُّوْرُ الَّذِیْ لَا يَحِلُّ الرَّحْمَةُ اِلَّا بَعْدَ حُلُوْلِهٖ وَلَا يَحْصُلُ الْفَلَاحُ اِلَّا بَعْدَ حُصُوْلِهٖ وَهٰذَا هُوَ الْمِفْتَاحُ الَّذِیْ يُنَاجِی السَّالِكُ مِنْهُ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ وَتُفْتَحُ عَلَيْهِ اَبْوَابُ الْفِرَاسَةِ وَيُجْعَلُ مُحَدَّثًا مِّنَ اللّٰهِ الْغَفُوْرِ۔ وَ مَنْ نَاجٰى رَبَّهٗ ذَاتَ بُكْرَةٍ بِهٰذَا الدُّعَاءِ بِالْاِخْلَاصِ وَاِمْحَاضِ النِّيَّةِ وَ رِعَايَةِ شَرَائِطِ الْاِتِّقَاءِ وَالْوَفَاءِ فَلَا شَكَّ اَنَّهٗ يَحُلُّ مَحَلَّ الْاَصْفِيَاءِ وَالْاَحِبَّاءِ

اور اپنی زمین اور کھیتی باڑی سب کے ساتھ کُلّی طور پر اپنے رب کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس کے سوا سب سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اُس کی نگاہ میں اپنے ربّ کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔ وہ اپنے محبوب ہی کی پیروی کرتا ہے۔ اپنے دل کو غیروں سے خالی کر کے اُس کے حضور حاضر ہو جاتا ہے اور اپنے راہِ سلوک میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا کوئی مقصود نہیں ہوتا۔ اور وہ مال اور صاحب مال پر کسی قسم کا ناز کرنے یا ان سے دھوکا کھانے سے تائب ہو جاتا ہے۔ اور بارگاہِ ربّ العزّت میں مسکینوں کی طرح حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ دُنیا کو ترک کر دیتا ہے اور اس سے الگ ہو جاتا ہے اور آخرت سے محبّت کرتا ہے اور اُسے ہی چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتا ہے اور اُسی کا ہی ہو رہتا ہے خدا میں ہی فنا ہو جاتا ہے اور عاشقوں کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑتا آتا ہے پس یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو سالکوں کے سُلوک کی انتہاء ہے اور طالبوں اور عابدوں کا آخری مقصود ہے اور یہی وہ نُور ہے کہ جس کے اُترنے کے بغیر رحمتِ الٰہی نازل نہیں ہوا کرتی اور اس کے حصول کے بغیر کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ کلید ہے جس کے ذریعہ سالک راہ اپنے سینے کی باتیں ربّ کے حضور مناجات میں ذکر کرتا ہے۔ اور اس پر فراست کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور خدائے بخشندہ کی طرف سے اُسے مُحدَّث قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو شخص صبح کے وقت اخلاص، خالص نیّت، پرہیزگاری اور وفاداری کی شرائط کی پابندی سے پوشیدہ طور پر خدا تعالیٰ سے یہ دعا مانگے تو بلاشبہ وہ برگزیدہ لوگوں، خدا کے محبوں اور مقربوں کا مقام حاصل کر لیتا

وَالْمُقَرَّبِيْنَ - وَمَنْ تَأَوَّهَ اٰهَةَ الثَّكْلَانِ فِيْ حَضْرَةِ الرَّبِّ الْمَنَّانِ وَطَلَبَ اسْتِجَابَةَ هٰذَا الدُّعَآءِ مِنَ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ خَاشِعًا مُّبْتَهِلًا وَّعَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ فَيُسْتَجَابُ دُعَآءُهٗ وَيُكْرَمُ مَثْوَاهُ وَيُعْطٰى لَهٗ هُدَاهُ وَتُقْوٰى لَهٗ عَقِيْدَتُهٗ بِالدَّلَآئِلِ الْمُنِيْرَةِ كَالْيَاقُوْتِ - وَيُقَوّٰى لَهٗ قَلْبُهُ الَّذِيْ كَانَ اَوْهَنَ مِنْ بَيْتِ الْعَنْكَبُوْتِ - وَيُوَفَّقُ لِتَوْسِعَةِ الذَّرْعِ وَدَقَآئِقِ الْوَرَعِ فَيُدْعٰى اِلٰى قِرَى الرُّوْحَانِيِّيْنَ وَمَطَآئِبِ الرَّبَّانِيِّيْنَ - وَيَكُوْنُ فِيْ كُلِّ حَالٍ غَالِبًا عَلٰى هَوًى مَّغْلُوْبٍ - وَيَقُوْدُهٗ بِرِعَايَةِ الشَّرْعِ حَيْثُ يَشَآءُ كَاَشْجَعِ رَاكِبٍ عَلٰى اَطْوَعِ مَرْكُوْبٍ - وَّلَا يَبْغِي الدُّنْيَا وَلَا يَتَعَنّٰى لِاَجْلِهَا وَلَا يَسْجُدُ لِعِجْلِهَا وَيَتَوَلَّاهُ اللّٰهُ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِيْنَ - وَتَكُوْنُ نَفْسُهٗ مُطْمَئِنَّةً وَّلَا تَبْقٰى كَالْمُبِيْدِ الْمُضِلِّ وَلَا تُحَمْلِقُ حَمْلَقَةَ الْبَازِ الْمُطِلِّ وَيَرٰى مَقَاصِدَ سُلُوْكِهٖ كَالْكِرَامِ وَلَا تَكُوْنُ سُحُبُهٗ كَالْجَهَامِ بَلْ يُشْرِبُ كُلَّ حِيْنٍ مِّنْ مَّآءٍ

ہے اور جو شخص گم کردہ اولاد والے کی طرح خدائے محسن کی جناب میں آہیں بھرے اور خدائے رحمان سے عاجزی، انکساری کرتے ہوئے جبکہ اُس کی آنکھیں بہہ رہی ہوں اُس دعا کی قبولیت کی التجا کرے تو اُس کی دُعا قبول کر لی جاتی ہے اور اُسے عزت والی جگہ ملتی ہے۔ اُس کو اُس کے مناسب حال ہدایت دی جاتی ہے۔ اس کا عقیدہ یاقوت کی مانند روشن دلائل سے پختہ کیا جاتا ہے اُس کا دل جو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور تھا مضبوط کیا جاتا ہے۔ اُسے وسعتِ اخلاق اور تقویٰ کی باریک راہوں کی توفیق دی جاتی ہے۔ اور وہ روحانی لوگوں کی مہمانی اور ربّانی لوگوں کی عمدہ چیزوں کی طرف بلایا جاتا ہے۔ وہ ہر حال میں مغلوب خواہش پر غالب رہتا ہے اور اپنی خواہشِ نفس کو شریعت کی نگرانی میں جدھر چاہے ہانکتا ہے جیسے ایک بہادر ترین سوار مطیع ترین سواری پر سوار ہو کر اسے ہانکتا ہو ۔ وہ دنیا کو نہیں چاہتا۔ نہ اُس کی خاطر اپنے آپ کو مشقّت میں ڈالتا ہے ۔ نہ دنیا کے بچھڑے کو سجدہ کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کا متولّی ہو جاتا ہے اور وہی صالح بندوں کا متولّی ہوا کرتا ہے۔ اس کا نفس مطمئن ہو جاتا ہے اور وہ (نفس) اُس کے لیے ہلاک کنندہ اور گمراہ کُن کی طرح نہیں رہتا۔ اور اُوپر سے شکار پر جھانکنے والے باز کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دنیا کی طرف نہیں دیکھتا۔ ایسا شخص اپنے سلوک کے مقاصد کو سخیوں کی طرح ظاہر دیکھتا ہے۔ اس کی (فیاضی کے) بادل خشک بادلوں کی طرح نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ہر وقت دوسروں کو صاف جاری پانی پلاتا ہے۔

تَعِيْنٍ - وَحَثَّ اللّٰهُ عِبَادَهٗ عَلٰی اَنْ يَّسْئَلُوْهُ اِدَامَةَ ذٰلِكَ الْمَقَامِ وَالتَّثَبُّتَ عَلَيْهِ وَالْوُصُوْلَ اِلٰی هٰذَا الْمَرَامِ لِاَنَّهٗ مَقَامٌ رَّفِيْعٌ وَّمَرَامٌ مَّنِيْعٌ لَّا يَحْصُلُ لِاَحَدٍ اِلَّا بِفَضْلِ رَبِّهٖ لَا بِجُهْدِ نَفْسِهٖ فَلَا بُدَّ مِنْ اَنْ يَّضْطَرَّ الْعَبْدُ لِتَحْصِيْلِ هٰذِهِ النِّعْمَةِ اِلٰی حَضْرَةِ الْعِزَّةِ وَيَسْئَلُهٗ اِنْجَاحَ هٰذِهِ الْمُنْيَةِ بِالْقِيَامِ وَالرُّكُوْعِ وَالسَّجْدَةِ وَالتَّمَرُّغِ عَلٰی تُرْبِ الْمَذَلَّةِ بَاسِطًا ذَيْلَ الرَّاحَةِ وَمُتَعَرِّضًا لِلْاِسْتِمَاحَةِ كَالسَّآئِلِيْنَ الْمُضْطَرِّيْنَ ؏

(کرامات الصادقین صفحہ ۹۱ تا صفحہ ۹۳)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پایا جاتا ہے کہ جب انسانی کوششیں تھک کر رہ جاتی ہیں تو آخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دعا کامل تب ہوتی ہے کہ ہر قسم کی خیر کی جامع ہو اور شر سے بچاوے پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں ساری خیر جمع ہیں اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین میں سب شروں حتیٰ کہ دجالی فتنہ سے بچنے کی دعا ہے۔ مغضوب سے بالاتفاق یہودی اور الضالین سے نصاریٰ مراد ہیں اب اگر اس میں کوئی رمز اور حقیقت نہ تھی تو اس دعا کی تعلیم سے کیا غرض تھی؟ اور پھر ایسی تاکید کہ اس دعا کے بدوں نماز ہی نہیں ہوتی اور ہر رکعت میں اس کا پڑھا جانا ضروری قرار دیا بھید اس میں یہی تھا کہ یہ ہمارے زمانہ کی طرف ایما ہے۔ اس وقت صراط مستقیم یہی ہے جو ہماری راہ ہے۔

(الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

صراط مستقیم...... یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اسلامی ہدایتوں پر قائم ہونے کے لیے تین چیزیں ہیں (۱) قرآن شریف جو کتاب اللہ ہے جس سے بڑھ کر ہمارے ہاتھ میں کوئی کلام قطعی اور یقینی نہیں وہ خدا کا کلام ہے وہ شک اور ظن کی آلائشوں سے پاک ہے۔ (۲) دوسری سنت اور اس جگہ ہم اہل حدیث کی اصطلاحات سے

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ترغیب دلائی ہے کہ وہ اُس سے ان کے اس مقام پر دوام، ثابت قدمی اور اس مقصد تک پہنچنے کے لیے التجا کیا کریں۔ کیوں کہ وہ ایک بہت ہی بلند مقام ہے اور مشکل سے حاصل ہونے والا مقصد ہے جو صرف فضل الٰہی سے ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ نفس کی کوشش سے۔ پس ضروری ہے کہ بندہ اس نعمت کو حاصل کرنے کے لیے بڑے اضطرار سے بارگاہِ ایزدی کی طرف بڑھے اور اُس سے اس آرزو میں کامیابی کے لیے قیام، رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے سوالیوں اور مجبوروں کی طرح ذلت کی خاک میں لتھڑ کر ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا پھیلا کر بخشش مانگتے ہوئے التجائیں کرتا رہے۔

الگ ہو کر بات کرتے ہیں یعنی ہم حدیث اور سنت کو ایک چیز قرار نہیں دیتے جیسا کہ رسمی محدثین کا طریق ہے بلکہ حدیث الگ چیز ہے اور سنت الگ چیز۔ سُنّت سے مراد ہماری صرف آنحضرتؐ کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر رکھتی ہے اور ابتدا سے قرآن شریف کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ساتھ ہی رہے گی یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن شریف خدا تعالیٰ کا قول ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل اور قدیم سے عادت اللہ یہی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام خدا کا قول لوگوں کی ہدایت کے لیے لاتے ہیں تو اپنے فعل سے یعنی عملی طور پر اس قول کی تفسیر کر دیتے ہیں تا اس قول کا سمجھنا لوگوں پر مشتبہ نہ رہے اور اس قول پر آپ بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی عمل کراتے ہیں۔
(۳) تیسرا ذریعہ ہدایت کا حدیث ہے اور حدیث سے مراد ہماری وہ آثار ہیں کہ جو قصوں کے رنگ میں آنحضرتؐ سے قریباً ڈیڑھ سو برس بعد مختلف راویوں کے ذریعوں سے جمع کیے گئے ہیں۔

(ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی صفحہ ۳-۴)

قرآن شریف میں اسؐ کا نام استقامت رکھا ہے جیسا کہ وہ یہ دُعا سکھلاتا ہے اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ یعنی ہمیں استقامت کی راہ پر قائم کر اُن لوگوں کی راہ جنہوں نے تجھ سے انعام پایا اور جن پر آسمانی دروازے کُھلے۔ واضح رہے کہ ہر ایک چیز کی وضع استقامت اُس کی علت غائی پر نظر کر کے سمجھی جاتی ہے۔ اور انسان کے وجود کی علت غائی یہ ہے کہ نوع انسان خدا کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ پس انسانی وضع استقامت یہ ہے کہ جیسا کہ وہ اطاعت ابدی کے لیے پیدا کیا گیا ہے ایسا ہی درحقیقت خُدا کے لیے ہو جائے۔ اور جب وہ اپنے تمام قُویٰ سے خدا کے لیے ہو جائے گا تو بلاشبہ اُس پر انعام نازل ہو گا جس کو دوسرے لفظوں میں پاک زندگی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب آفتاب کی طرف کی کھڑکی کھولی جائے تو آفتاب کی شعاعیں ضرور کھڑکی کے اندر آجاتی ہیں۔ ایسا ہی جب انسان خُدا تعالیٰ کی طرف بالکل سیدھا ہو جائے اور اُس میں اور خُدا تعالیٰ میں کچھ حجاب نہ رہے تب فی الفور ایک نورانی شُعلہ اُس پر نازل ہوتا ہے اور اُس کو منور کر دیتا ہے اور اُس کی تمام اندرونی غلاظت دھو دیتا ہے۔ تب وہ ایک نیا انسان ہو جاتا ہے اور ایک بھاری تبدیلی اُس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ تب کہا جاتا ہے کہ اس شخص کو پاک زندگی حاصل ہوئی۔ اس پاک زندگی کے پانے کا مقام یہی دُنیا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے مَنۡ کَانَ فِیۡ ھٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَھُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیۡلًا[۲] یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا رہا ہے اور خُدا کو دیکھنے کا اُس کو نور نہ ملا وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہی ہو گا۔

(سراج دین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۱۸-۱۹)

---

[۱] یعنی اسلام ۔ [۲] بنی اسرائیل ع ۸ ۔

بے شک الہام صحیح اور سچے کے لیے یہی شرط لازمی ہے کہ اس کے مقامات مجملہ کی تفصیل بھی اُسی الہام کے ذریعہ کی جاوے جیسا کہ قرآن کریم میں یعنی سورۃ فاتحہ میں یہ آیت ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اب اس آیت میں جو اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا لفظ ہے یہ ایک مجمل لفظ تھا اور تشریح طلب تھا تو خدا تعالیٰ نے دوسرے مقام میں خود اس کی تشریح کردی اور فرمایا کہ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (پ ۵ ع ۶) (جنگ مقدس پرچہ ۲۴ مئی)

چار مراتب کمال ہیں جن کو طلب کرنا ہر ایک ایماندار کا فرض ہے اور جو شخص ان سے بکلی محروم ہے وہ ایمان سے محروم ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے سورہ فاتحہ میں مسلمانوں کے لیے یہی دعا مقرر کی ہے کہ وہ ان ہر چہار کمالات کو طلب کرتے رہیں اور وہ دعا یہ ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور قرآن شریف کے دوسرے مقام میں اس آیت کی تشریح کی گئی ہے اور ظاہر فرمایا گیا ہے کہ منعم علیہم سے مراد نبی اور صدیق اور شہید اور صالحین ہیں۔ اور انسان کامل ان ہر چہار کمالات کا مجموعہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۲۵)

انسانی زندگی کا مقصد اور غرض صراط مستقیم پر چلنا اور اس کی طلب ہے جس کو اس سورۃ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یا اللہ ہم کو سیدھی راہ دکھا ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہ وہ دعا ہے جو ہر وقت ہر نماز اور ہر رکعت میں مانگی جاتی ہے اس قدر اس کا تکرار ہی اس کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہماری جماعت یاد رکھے کہ یہ معمولی سی بات نہیں ہے۔ اور صرف زبان سے طوطے کی طرح ان الفاظ کا رٹ دینا اصل مقصود نہیں ہے بلکہ یہ انسان کو انسان کامل بنانے کا ایک کارگر اور خطا نہ کرنیوالا نسخہ ہے جسے ہر وقت نصب العین رکھنا چاہیئے اور تعویذ کی طرح مد نظر رہے اس آیت میں چار قسم کے کمالات حاصل کرنے کی التجا ہے۔ اگر یہ ان چار قسم کے کمالات کو حاصل کریگا تو گویا دعا مانگنے اور خلق انسانی کے حق کو ادا کریگا اور ان استعدادوں اور قویٰ کے بھی کام میں لانے کا حق ادا ہو جائے گا جو اس کو دی گئی ہیں۔

اس بات کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ قرآن شریف کے بعض حصّے دوسرے کی تفسیر اور شرح ہیں ایک جگہ ایک امر بطریق اجمال بیان کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ وہی امر کھول کر بیان کر دیا گیا ہے گویا دوسرا پہلے کی تفسیر ہے پس اس جگہ جو یہ فرمایا۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو یہ بطریق اجمال ہے لیکن دوسرے مقام پر منعم علیہم کی خود ہی تفسیر کردی ہے مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ [1] منعم علیہ چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں نبی۔ صدیق۔ شہدا اور صالح۔ انبیاء علیہم السلام میں چاروں شانیں جمع ہوتی ہیں کیونکہ یہ اعلیٰ کمال ہے ہر ایک انسان

[1] النساء ع ۹

کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کمالات کے حاصل کرنے کے لیے جہاں مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے اس طریق پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے دکھایا ہے کوشش کرے۔

(الحکم ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵-۶)

غور سے قرآن کریم کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پہلی ہی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے دعا کی تعلیم دی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ دعا تب ہی جامع ہو سکتی ہے کہ وہ تمام منافع اور مفاد کو اپنے اندر رکھتی ہو اور تمام نقصانوں اور مضرتوں سے بچاتی ہو۔ پس اس دعا میں تمام بہترین منافع جو ہو سکتے ہیں اور ممکن ہیں وہ اس دعا میں مطلوب ہیں اور بڑی سے بڑی نقصان رساں چیز جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اُس سے بچنے کی دعا ہے میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ منعم علیہ چار قسم کے لوگ ہیں۔ اول نبی دوم صدیق۔ سوم شہید چہارم صالحین۔ پس اس دعا میں گویا ان چاروں گروہوں کے کمالات کی طلب ہے نبیوں کا عظیم الشان کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے خبریں پاتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[1] الآیہ یعنی خدا تعالیٰ کے غیب کی باتیں کسی دوسرے پر ظاہر نہیں ہوتی ہیں ہاں اپنے نبیوں میں سے جس کو وہ پسند کرے۔ جو لوگ نبوّت کے کمالات سے حصہ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو قبل از وقت آنے والے واقعات کی اطلاع دیتا ہے اور یہ بہت بڑا عظیم الشان نشان خدا کے مامور اور مرسلوں کا ہوتا ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہیں۔ (الحکم ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

حسب منطوق آیت ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ[2] خالص محمدی گروہ جو ہر ایک پلید ملونی اور آمیزش سے پاک اور توبہ نصوح سے غسل دیئے ہوئے ایمان اور دقائق عرفان اور علم اور عمل اور تقویٰ کے لحاظ سے ایک کثیر التعداد جماعت ہے یہ اسلام میں صرف دو گروہ ہیں یعنی گروہ اولین و گروہ آخرین جو صحابہ اور مسیح موعود کی جماعت سے مراد ہے اور چونکہ حکم کثرت مقدار اور کمال صفائی انوار پر ہوتا ہے اس لیے اس سورۃ میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے فقرہ سے مراد یہی دونوں گروہ ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مع اپنی جماعت کے اور مسیح موعود مع اپنی جماعت کے۔ خلاصہ کلام یہ کہ خدا نے ابتدا سے اس امت میں دو گروہ ہی تجویز فرمائے ہیں اور انہی کی طرف سورہ فاتحہ کے فقرہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں اشارہ ہے (۱) ایک اولین جو جماعت نبوی ہے (۲) دوسرے آخرین جو جماعت مسیح موعود ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۱،۸۰)

---

[1] الجن۔ ع ۲ ؛ [2] الواقعہ۔ ع ۲۔

اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی کہ تم پنج وقت نمازوں میں یہ دُعا پڑھا کرو کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے ہمارے خدا اپنے منعم علیہم بندوں کی ہمیں راہ بتا وہ کون ہیں نبی اور صدیق اور شہید اور صلحاء۔ اس دعا کا خلاصہ مطلب یہی ہے کہ ان چاروں گروہوں میں سے جس کا زمانہ تم پاؤ اُس کے سایہ صحبت میں آجاؤ اور اُس سے فیض حاصل کرو۔

{ اشتہار بعنوان" قیامت کی نشانی"
مشمولہ آئینہ کمالات اسلام صکہ }

قَالَ اللّٰهُ جَلَّ شَانُهٗ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ[1]۔ وَحَثَّ عِبَادَهٗ عَلٰى دُعَاءِ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فَمَا مَعْنَى الدُّعَاءِ لَوْ كُنَّا مِنَ الْمَحْرُوْمِيْنَ۔ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اَوَّلًا هُمُ الْاَنْبِيَاءُ وَالرُّسُلُ وَمَا كَانَ الْاِنْعَامُ مِنْ قِسْمِ دِرْهَمٍ وَّدِيْنَارٍ۔ بَلْ مِنْ قِسْمِ عُلُوْمٍ وَّمَعَارِفَ وَنُزُوْلِ بَرَكَاتٍ وَّاَنْوَارٍ كَمَا تَقَرَّرَ عِنْدَ الْعَارِفِيْنَ ۞

وَاِذَا اُمِرْنَا بِهٰذِهِ الدُّعَاءِ فِيْ كُلِّ صَلٰوةٍ فَمَا اَمَرَنَا رَبُّنَا اِلَّا لِيُسْتَجَابَ دُعَاؤُنَا وَنُعْطٰى مَا اُعْطِيَ مِنَ الْاِنْعَامَاتِ لِلْمُرْسَلِيْنَ۔ وَقَدْ بَشَّرَنَا عَزَّ اسْمُهٗ بِعِطَاءِ اِنْعَامَاتٍ اَنْعَمَ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ وَالرُّسُلِ مِنْ قَبْلِنَا وَجَعَلَنَا لَهُمْ وَارِثِيْنَ۔ فَكَيْفَ نَكْفُرُ بِهٰذِهِ الْاِنْعَامَاتِ وَنَكُوْنُ كَقَوْمٍ عَمِيْنَ۔ وَ

ترجمہ:۔ اللہ جلّ شانہ' نے فرمایا ہے ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ[1] اور اپنے بندوں کو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اگر ہم نے محروم ہی رہنا تھا تو دعا سکھانے کے کیا معنی؟ اور تمہیں معلوم ہے کہ انعام یافتہ لوگوں میں سے سب سے پہلے نبی اور رسول ہی ہیں اور یہ انعام درہم و دینار کی قسم کا نہیں بلکہ علوم و معارف اور نزولِ برکات و انوار کی قسم کا ہے جیسا کہ عارف لوگوں کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے۔

اور جب ہمیں ہر نماز میں یہ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم محض اس لیے دیا ہے کہ ہماری دعا قبول کی جائے اور ہمیں بھی وہی انعامات دے جائیں جو انعامات رسولوں کو عطا کیے گئے تھے اور اللہ عزّ اسمہ' نے ہمیں اُن انعامات کے دیئے جانے کی بشارت دی ہے جو اُس نے ہم سے پہلے انبیاء اور رسولوں کو دیئے تھے اور ہمیں ان کا وارث ٹھہرایا ہے۔ پس ہم کس طرح ان انعامات کا انکار کریں اور اندھے

[1] الواقعہ ۔ ع ۲۔ [1] (اصحاب الیمین) یہ گروہ شروع میں ایمان لانیوالے لوگوں میں سے بھی بکثرت ہوگا اور آخر میں ایمان لانے والے لوگوں میں سے بھی بکثرت ہوگا۔

كَيْفَ يُمْكِنُ اَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ مَوَاعِيْدَهٗ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَيَجْعَلَنَا مِنَ الْمُخَيَّبِيْنَ ۔

اَنْتَ تَعْلَمُ يَا اَخِيْ اَنَّ سَرَاةَ الْمُنْعَمِيْنَ عَلَيْهِمْ هُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالرُّسُلُ وَقَدْ بَشَّرَنَا اللّٰهُ بِعِطَآءِ هُدٰىهُمْ وَبَصِيْرَتِهِمُ الْكَامِلَةِ الَّتِيْ لَاتَحْصُلُ اِلَّا بَعْدَ مُكَالَمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَوْرُؤْيَةِ اٰيَاتِهٖ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ كَيْفَ زَعَمْتَ اَنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ مَحْرُوْمُوْنَ مِنْ مُّكَالَمَةِ اللّٰهِ وَمُخَاطَبَاتِهٖ وَلَيْسُوْا مِنَ الْمُكَلَّمِيْنَ ۞ (تحفۂ بغداد صفحہ ۱۲و۱۳)

ہم نماز میں یہ دعا کرتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس سے یہی مطلب ہے کہ خدا سے ہم اپنے ترقی ایمان اور بنی نوع کی بھلائی کے لیے چار قسم کے نشان چار کمال کے رنگ میں چاہتے ہیں۔ نبیوں کا کمال۔ صدیقوں کا کمال۔ شہیدوں کا کمال۔ صلحاء کا کمال۔ سو نبی کا خاص کمال یہ ہے کہ خدا سے ایسا علم غیب پاوے جو بطور نشان کے ہو۔ اور صدیق کا کمال یہ ہے کہ صدق کے خزانہ پر ایسے کامل طور پر قبضہ کرے یعنی ایسے اکمل طور پر کتاب اللہ کی سچائیاں اس کو معلوم ہو جائیں کہ وہ بوجہ خارق عادت ہونے کے نشان کی صورت پر ہوں اور اس صدیق کے صدق پر گواہی دیں۔ اور شہید کا کمال یہ ہے کہ مصیبتوں دکھوں اور ابتلاؤں کے وقت میں ایسی قوت ایمانی اور قوت اخلاقی اور ثابت قدمی دکھلاوے کہ جو خارق عادت ہونے کی وجہ سے بطور نشان کے ہو جائے اور مرد صالح کا کمال یہ ہے کہ ایسا ہر ایک قسم کے فساد سے دور ہو جائے اور مجسم صلاح بن جائے کہ وہ کامل صلاحیت اس کی خارق عادت ہونے کی وجہ سے بطور نشان مانی جائے سو یہ چاروں قسم کے کمال جو ہم پانچ وقت خدا تعالیٰ سے نماز میں مانگتے ہیں یہ دوسرے لفظوں میں ہم خدا تعالیٰ سے آسمانی نشان

لوگوں کی طرح ہو جائیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ پکے وعدے کرنے کے بعد ان کی خلاف ورزی کرے اور ہمیں نامرادوں میں سے کر دے۔

اے بھائی! تمہیں معلوم ہے کہ انعام یافتہ لوگوں کے سرخیل انبیاء اور رسول ہیں اور ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے اُنہیں کی ہدایت اور اُنہیں کی کامل بصیرت دیئے جانے کی بشارت دی ہے جو اللہ تعالیٰ سے مکالمہ و مخاطبہ پانے یا اس کے نشانات کو دیکھنے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ تجھے معاف کرے! تو نے یہ کیسے خیال کر لیا کہ اولیاء اللہ اللہ تعالیٰ کے مکالمہ و مخاطبہ سے محروم ہیں اور اُن لوگوں میں شامل نہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمکلام ہوتا ہے۔

طلب کرتے ہیں اور جس میں یہ طلب نہیں اس میں ایمان بھی نہیں۔ ہماری نماز کی حقیقت یہی طلب ہے جو ہم چار رنگوں میں پنج وقت خدا تعالیٰ سے چار نشان مانگتے ہیں اور اس طرح پر زمین پر خدا تعالیٰ کی تقدیس چاہتے ہیں تا ہماری زندگی انکار اور شک اور غفلت کی زندگی ہو کر زمین کو پلید نہ کرے اور ہر ایک شخص خدا تعالیٰ کی تقدیس تبھی کر سکتا ہے کہ جب وہ یہ چاروں قسم کے نشان خدا تعالیٰ سے مانگتا رہے۔

(ضمیمہ تریاق القلوب ص۶۷)

غرض منعم علیہم لوگوں میں جو کمالات ہیں اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ میں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے ان کو حاصل کرنا ہر انسان کا اصل مقصد ہے اور ہماری جماعت کو خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کے قائم کرنے سے یہی چاہا ہے کہ وہ ایسی جماعت تیار کرے جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کی تھی تاکہ اس آخری زمانہ میں یہ جماعت قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے۔ ان کمالات میں سے جو منعم علیہم کو دئے جاتے ہیں پہلا کمال نبوت کا کمال ہے جو بہت ہی اعلیٰ مقام پر واقع ہے ہمیں افسوس ہے کہ وہ الفاظ نہیں ملتے جن میں اس کمال کی حقیقت بیان کر سکیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر کوئی چیز اعلیٰ ہو اس کے بیان کرنے کے واسطے اسی قدر الفاظ کمزور ہوتے ہیں اور نبوت تو ایسا مقام ہے کہ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ نہیں ہے تو پھر یہ کیونکر بیان ہو سکے۔

(الحکم ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء ص۶)

خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے والا اور اُس کے عشق میں گم شدہ قوم نبیوں کی ان جھوٹے اور فانی عاشقوں کے عشق سے کہیں بڑھ کر اپنے اندر جوش رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ خدا وہ ہے جو جھکنے والوں کی طرف جھکتا ہے یہاں تک اس سے زیادہ توجہ کرتا ہے خدا کی طرف آنے والا اگر معمولی چال سے چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے پس ایسے خدا کی طرف جس کی توجہ ہو جائے اور وہ اس کی محبت میں کھویا جاوے وہ محبت اور عشق الٰہی کی آگ ان امانی اور نفسانی خیالات کو جلا دیتی ہے پھر ان کے اندر روح ناطق ہو جاتی ہے اور پاک نطق جو ادھر سے شروع ہوتا ہے وہ خدا تعالیٰ کا نطق ہوتا ہے دوسرے رنگ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دعا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو جواب دیتا ہے پس یہ ایک کمال نبوت ہے اور اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں رکھا گیا ہے۔ اس لیے جب انسان اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کی دعا مانگے تو اس کے ساتھ ہی یہ امر پیش نظر ہے کہ اس کمال نبوت کو حاصل کرے۔ (الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۵ء ص۵)

دوسرا کمال اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ میں صدیقوں کا کمال ہے۔ اس کمال کے حاصل ہونے پر قرآن شریف کے حقائق

اور معارف کھلتے ہیں لیکن یہ فضل اور فیض بھی الہی تائید سے آتا ہے۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید اور فضل کے بغیر ایک انگلی کا ہلانا بھی مشکل ہے۔ ہاں یہ انسان کا فرض ہے کہ سعی اور مجاہدہ کرے جہاں تک اس سے ممکن ہے اور اس کی توفیق بھی خدا تعالیٰ ہی سے چاہیے۔ کبھی اس سے مایوس نہ ہو کیونکہ مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے خود بھی فرمایا۔ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ[1]۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر نا امید ہوتے ہیں۔ نا امیدی بہت ہی بری چیز ہے۔ اصل میں نا امید وہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ پر بدظنی کرتا ہے یہ خوب یاد رکھو کہ ساری خرابیاں اور برائیاں بدظنی سے پیدا ہوتی ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے بہت منع کیا ہے اور فرمایا اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ[2]

(الحکم ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

خدا کا قرب اور نزدیکی بھی اور زندگی بھی انعام (اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ) میں شامل ہے۔ مخالفین اس انعام میں مسیح کو تو شامل کرتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے نصیب رکھتے ہیں کیوں ان کو اس عقیدہ سے شرم نہیں آتی اور لمبی زندگی اس طرح انعام میں شمار ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ[3]

(الحکم ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

افسوس ان لوگوں کی عقلوں کو کیا ہوا یہ کیوں نہیں سمجھتے کیا قرآن میں جو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کہا گیا تھا یہ یونہی ایک بے معنی اور بے مطلب بات تھی۔ اور نرا ایک قصہ ہی قصہ ہے؟ کیا وہ انعام کچھ نہ تھا خدا نے نرا دھوکا ہی دیا ہے؟ اور وہ اپنے سچے طالبوں اور صادقوں کو بدنصیب ہی رکھنا چاہتا ہے؟ کس قدر ظلم ہے اگر یہ خدا کی نسبت قرار دیا جاوے کہ وہ نری لفاظی ہی سے کام لیتا ہے۔

حقیقت یہ نہیں ہے یہ ان لوگوں کی اپنی خیالی باتیں ہیں قرآن شریف درحقیقت انسان کو ان مراتب اور اعلیٰ مدارج پر پہنچانا چاہتا ہے جو اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے مصداق لوگوں کو دیئے گئے تھے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جب خدا تعالیٰ کے کلام کے زندہ ثبوت موجود نہ ہوں۔ ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں ہے کہ آریوں کی طرح کوئی خدا کا پریمی اور بھگت کتنی ہی دعائیں کرے اور رو رو کر اپنی جان کھوئے اور اُس کا کوئی نتیجہ نہ ہو اسلام خشک مذہب نہیں ہے اسلام ہمیشہ ایک زندہ مذہب ہے اور اس کے نشانات اس کے ساتھ ہیں پیچھے رہے ہوئے نہیں ہیں۔

(الحکم ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

اگر یہی سچ ہے کہ خدا تعالیٰ تمام برکتوں اور امامتوں اور ولایتوں پر مہر لگا چکا ہے اور آیندہ کلی وہ راہیں بند ہیں تو خدا تعالیٰ کے سچے طالبوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دل توڑنے والا واقعہ نہ ہوگا گویا وہ جیتے ہی مر گئے اور ان کے ہاتھ میں بجز چند خشک قصوں کے اور کوئی مغز اور بات نہیں اور اگر شیعہ لوگ اس عقیدہ کو سچ مانتے ہیں تو پھر کیوں

[1] یوسف ع ۱۰۔ [2] الحجرات ع ۲۔ [3] الرعد ع ۲۔

پنجوقت نماز میں یہ دعا پڑھتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کیونکہ اس دعا کے تو یہی معنی ہیں کہ اے خدائے قادر ہم کو وہ راہ اپنے قرب کا عنایت کر جو تو نے نبیوں اور اماموں اور صدیقوں اور شہیدوں کو عنایت کیا تھا پس یہ آیت صاف تبلاتی ہے کہ کمالات امامت کا راہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئیے تھا اس عاجز نے اسی راہ کے اظہار ثبوت کے لیے بیس ہزار اشتہار مختلف دیار و امصار میں بھیجا ہے۔ اگر یہ برکت نہیں تو پھر اسلام میں فضیلت ہی کیا ہے۔ (الحکم ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صہ ۲)

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس جگہ تمام مفسر قائل ہیں کہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی ہدایت سے غرض تشبہ بالانبیاء ہے جو اصل حقیقت اتباع ہے..... خدا نے انبیاء علیہم السلام کو اسی لیے دنیا میں بھیجا ہے کہ تا دنیا میں اُن کے مثیل قائم کرے اگر یہ بات نہیں تو پھر نبوت لغو ٹھہرتی ہے۔ نبی اس لیے نہیں آتے کہ اُن کی پرستش کی جائے بلکہ اس لیے آتے ہیں کہ لوگ اُن کے نمونے پر چلیں اور اُن سے تشبہ حاصل کریں اور اُن میں فنا ہو کر گویا وہی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1] پس خدا جس سے محبت کرے گا کونسی نعمت ہے جو اُس سے اٹھا رکھے گا اور اتباع سے مراد بھی مرتبۂ فنا ہے جو مثیل کے درجے تک پہنچاتا ہے اور یہ مسئلہ سب کا مانا ہوا ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کریگا مگر وہی جو جاہل سفیہ یا ملحد بے دین ہوگا۔ (ایام الصلح ۱۶۳-۱۶۴)

انبیاء من حیث الظل باقی رکھے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ ظلی طور پر ہر یک ضرورت کے وقت میں کسی اپنے بندہ کو اُن کی نظیر اور مثیل پیدا کر دیتا ہے جو اُنہیں کے رنگ میں ہو کر اُن کی دائمی زندگی کا موجب ہوتا ہے اور اسی ظلی وجود کے قائم رکھنے کے لیے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے خدا ہمارے ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا جو تیرے اُن بندوں کی راہ ہے جن پر تیرا انعام ہے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا انعام جو انبیاء پر ہوا تھا جس کے مانگنے کے لیے اس دُعا میں حکم ہے وہ درم اور دینار کی قسم میں سے نہیں بلکہ وہ انوار اور برکات اور محبت اور یقین اور خوارق اور تائید سماوی اور قبولیت اور معرفت تامہ کاملہ اور وحی اور کشف کا انعام ہے اور خدا تعالیٰ نے اس امت کو اس انعام کے مانگنے کے لیے تبھی حکم فرمایا کہ اول اس انعام کے عطا کرنے کا ارادہ بھی کر لیا۔ پس اس آیت سے بھی کھلے کھلے طور پر یہی ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ اس امت کو ظلی طور پر تمام انبیاء کا وارث ٹھہراتا ہے تا انبیاء کا وجود ظلی طور پر ہمیشہ باقی رہے اور دنیا اُن کے وجود سے کبھی خالی نہ ہو اور نہ صرف دعا کے لیے حکم کیا بلکہ ایک آیت میں وعدہ بھی فرمایا ہے اور وہ یہ ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[2] یعنی جو لوگ ہماری راہ میں جو صراط مستقیم ہے مجاہدہ کریں گے تو ہم اُن کو اپنی راہیں

[1] آل عمران - ع ۴ [2] العنکبوت ع ۷

تبلا دیں گے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہیں وہی ہیں جو انبیاء کو دکھلائی گئی تھیں۔
(شہادت القرآن ص۵۶)

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ آفتاب وحی الٰہی اگرچہ پہلے زمانوں میں یقینی رنگ میں طلوع کرتا رہا ہے مگر اب وہ صفائی اس کو نصیب نہیں گویا یقینی معرفت تک پہنچنے کا کوئی سامان آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گیا ہے اور گویا خدا کی سلطنت اور حکومت اور فیض رسانی کچھ تھوڑی مدت تک رہ کر ختم ہو چکی ہے لیکن خدا کا کلام اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے کیونکہ وہ یہ دعا سکھلاتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس دُعا میں اُس انعام کی اُمید دلائی گئی ہے جو پہلے نبیوں اور رسولوں کو دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اُن تمام انعامات میں سے بزرگ تر انعام وحی یقینی کا انعام ہے کیونکہ گفتار الٰہی قائم مقام دیدار الٰہی ہے کیونکہ اسی سے پتہ لگتا ہے کہ خدا موجود ہے پس اگر کسی کو اس اُمت میں سے وحی یقینی نصیب ہی نہیں اور وہ اِس بات پر جرأت ہی نہیں کر سکتا کہ اپنی وحی کو قطعی طور پر مثل انبیاء علیہم السلام کے یقینی سمجھے اور نہ اُس کی ایسی وحی ہو کہ انبیاء کی طرح اس کے ترک متابعت اور ترک عمل پر یقینی طور دنیا کا ضرر متصور ہو سکے تو ایسی دعا سکھلانا محض دھوکہ ہوگا کیونکہ اگر خدا کو یہ منظور ہی نہیں کہ بموجب دُعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ انبیاء علیہم السلام کے انعامات میں اِس امت کو بھی شریک کرے تو اس نے کیوں یہ دعا سکھلائی اور ایک ناشدنی امر کے لیے دعا کرنے کی ترغیب کیوں دی پس اگر یہ دعا سکھلانا یقین اور معرفت کا انعام دینے کی نیت سے نہیں بلکہ محض لفظوں سے خوش کرنا ہے پس اسی سے فیصلہ ہو گیا کہ یہ اُمت اپنے نصیبوں میں سب امتوں سے گری ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ کی مرضی نہیں ہے کہ اِس اُمت کو یقینی چشمہ کا پانی پلا کر نجات دے بلکہ وہ ان کو شکوک اور شبہات کے درطہ میں چھوڑ کر ہلاک کرنا چاہتا ہے لیکن یاد رہے کہ ضرور اُن انعامات میں جو نبیوں کو دئے گئے اس امت کے لیے حصہ رکھا گیا ہے کیونکہ اگر مسلمانوں کے کامل افراد کی فطرتوں میں یہ حصہ نہ ہوتا تو ان کے دلوں میں یہ خواہش نہ پائی جاتی کہ وہ خداشناسی کے درجہ میں حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جائیں اور ان انعامات سے سب سے بڑھ کر یقینی مخاطبات اور مکالمات کا انعام ہے جس سے انسان اپنی خداشناسی میں پوری ترقی کرتا ہے گویا ایک طور پر خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتا ہے اور اس کی ہستی پر رویت کے رنگ میں ایمان لاتا ہے۔ (نزول المسیح ص۱۰۹-۱۱۰)

سورۂ فاتحہ میں جو قرآن کے شروع میں ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کو ہدایت کرتا ہے۔ کہ وہ دعا مانگیں۔
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔
(ش) یعنی ہمیں وہ راہ سیدھی تبلا اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام و فضل ہے۔ یہ اس لیے سکھائی گئی ہے کہ

انسان عالی ہمت ہو کر اس سے خالق کا منشاء سمجھے اور وہ یہ ہے کہ یہ امت بہائم کی طرح زندگی بسر نہ کرے۔ بلکہ اس کے تمام پردے کھل جاویں۔ جیسے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ولایت بارہ اماموں کے بعد ختم ہو گئی۔ برخلاف اس کے اس دعا سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے سے ارادہ کر رکھا ہے کہ جو متقی ہو۔ اور خدا کی منشاء کے مطابق ہے تو وہ اُن مراتب کو حاصل کر سکے جو انبیاء اور اصفیا کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انسان کو بہت سے قوٰی ملے ہیں جنھوں نے نشو ونما پانا ہے۔ اور بہت ترقی کرنا ہے۔ ہاں ایک بکرا چونکہ انسان نہیں اُس کے قوٰی ترقی نہیں کر سکتے۔ عالی ہمت انسان جب رسولوں اور انبیاء کے حالات سنتا ہے تو چاہتا ہے کہ وہ انعامات جو اس پاک جماعت کو حاصل ہوئے۔ اُس پر نہ صرف ایمان ہی ہو بلکہ اُسے بہ تدریج اُن نعماء کا علم الیقین۔ عین الیقین اور حق الیقین ہو جائے۔

علم کے تین مدارج ہیں۔ علم الیقین۔ عین الیقین۔ حق الیقین۔ مثلاً ایک جگہ سے دھوآں نکلتا دیکھ کر آگ کا یقین کر لینا علم الیقین ہے۔ بلکن خود آنکھ سے آگ کا دیکھنا عین الیقین ہے۔ ان سے بڑھ کر درجہ حق الیقین کا ہے یعنی آگ میں ہاتھ ڈال کر جلن اور حرارت سے یقین کر لینا کہ آگ موجود ہے۔ پس کیا وہ شخص بدقسمت ہے۔ جس کو تینوں میں سے کوئی درجہ حاصل نہیں۔ اس آیت کے مطابق جس پر اللہ کا فضل نہیں وہ کورانہ تقلید میں پھنسا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ [۱] جو ہمارے راہ میں مجاہدہ کریگا۔ ہم اُس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے اور ادھر یہ دعا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ سو انسان کو چاہیئے کہ اس کو مدنظر رکھ کر نماز میں بالحاح دعا کرے اور تمنا رکھے کہ وہ بھی اُن لوگوں میں سے ہو جاوے جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اٹھایا جاوے چنانچہ فرمایا۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ الآیہ [۲]۔ کہ جو اس جہان میں اندھا ہے۔ وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہے۔ جس کی منشاء یہ ہے کہ اُس جہان کے مشاہدہ کے لیے اسی جہان سے ہم کو آنکھیں لے جانی ہیں۔ آئندہ جہان کو محسوس کرنے کے لیے حواس کی طیاری اسی جہان میں ہو گی۔ پس کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کرے اور پورا نہ کرے۔ اندھے سے مراد وہ ہے جو روحانی معارف اور روحانی لذات سے خالی ہے۔ ایک شخص کورانہ تقلید سے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ مسلمان کہلاتا ہے۔ دوسری طرف اسی طرح ایک عیسائی عیسائیوں کے ہاں پیدا ہو کر عیسائی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شخص کو خدا رسول اور قرآن کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ اُس کی دین سے محبت بھی قابل اعتراض ہے خدا اور رسول کی ہتک کرنے والوں میں اُس کا گذر ہوتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایسے شخص کی روحانی آنکھ نہیں۔ اُس میں محبت دین نہیں۔ ورنہ محبت والا اپنے محبوب کے برخلاف کیا کچھ پسند کرتا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے سکھلایا ہے کہ میں تو دینے کو طیار ہوں اگر تو لینے کو طیار ہے۔ پس یہ دعا کرنا ہی اُس ہدایت کو لینے کی طیاری ہے اس دعا کے بعد سورہ بقرہ

[۱] العنکبوت۔ ع ۷ ۔ [۲] بنی اسرائیل۔ ع ۸۔

کے شروع میں ہی جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کہا گیا۔ تو گویا خدا تعالیٰ نے دینے کی طیاری کی۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۸-۳۹)

اگر نبی کے صرف یہ معنے کیے جائیں کہ اللہ جل شانہٗ اس سے مکالمہ و مخاطبہ رکھتا ہے اور بعض اسرار غیب کے اُس پر ظاہر کرتا ہے تو اگر ایک اُمتی ایسا نبی ہو جائے تو اس میں ہرج کیا ہے خصوصاً جب کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اکثر جگہ یہ اُمید دلائی ہے کہ ایک اُمتی شرف مکالمہ الٰہیہ سے مشرف ہو سکتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کو اپنے اولیاء سے مکالمات اور مخاطبات ہوتے ہیں بلکہ اسی نعمت کے حاصل کرنے کے لیے سورہ فاتحہ میں جو پنج وقت فریضہ نماز میں پڑھی جاتی ہے یہی دُعا سکھلائی گئی ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ تو کسی اُمتی کو اس نعمت کے حاصل ہونے سے کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ کیا سورہ فاتحہ میں وہ نعمت جو خدا تعالیٰ سے مانگی گئی ہے جو نبیوں کو دی گئی تھی وہ درہم و دینار ہیں۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ کی نعمت ملی تھی جس کے ذریعہ سے اُن کی معرفت حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچ گئی تھی اور گفتار کی تجلی دیدار کے قائم مقام ہو گئی تھی پس یہ جو دعا کی جاتی ہے کہ اے خداوند وہ راہ ہمیں دکھا جس سے ہم بھی اُس نعمت کے وارث ہو جائیں۔ اس کے بجز اس کے اور کیا معنی ہیں کہ ہمیں بھی شرف مکالمہ اور مخاطبہ بخش۔ بعض جاہل اس جگہ کہتے ہیں کہ اس دعا کے صرف یہ معنے ہیں کہ ہمارے ایمان قوی کر اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرما اور وہ کام ہم سے کرا جس سے تو راضی ہو جائے۔ مگر یہ نادان نہیں جانتے کہ ایمان کا قوی ہونا یا اعمال صالحہ کا بجا لانا اور خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق قدم اُٹھانا یہ تمام باتیں معرفت کاملہ کا نتیجہ ہیں جس دل کو خدا تعالیٰ کی معرفت میں سے کچھ حصہ نہیں ملا وہ دل ایمان قوی اور اعمال صالحہ سے بھی بے نصیب ہے۔ معرفت سے ہی خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوتا ہے اور معرفت سے ہی خدا تعالیٰ کی محبت دل میں جوش مارتی ہے...

اب چونکہ تمام مدار خوف اور محبّت کا معرفت پر ہے اس لیے خدا تعالیٰ کی طرف بھی پورے طور پر اُس وقت انسان جُھک سکتا ہے جبکہ اُس کی معرفت ہو اوّل اس کے وجود کا پتہ لگے اور پھر اُس کی خوبیاں اور اُس کی کامل قدرتیں ظاہر ہوں اور اس قسم کی معرفت کب میسر آ سکتی ہے بجز اس کے کہ کسی کو خدا تعالیٰ کا شرف مکالمہ اور مخاطبہ حاصل ہو تو پھر اعلام الٰہی سے اس بات پر یقین آ جائے کہ وہ عالم الغیب ہے اور ایسا قادر ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ سو اصلی نعمت (جس پر قوّت ایمان اور اعمالِ صالحہ موقوف ہیں) خدا تعالیٰ کا مکالمہ اور مخاطبہ ہے جس کے ذریعہ سے اوّل اُس کا پتہ لگتا ہے اور پھر اُس کی قدرتوں سے اطلاع ملتی ہے اور پھر اس اطلاع کے موافق انسان ان قدرتوں کو بچشم خود دیکھ لیتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جو انبیاء علیہم السلام کو دی گئی تھی اور پھر اس اُمت کو حکم ہُوا کہ اس نعمت کو تم مجھ سے مانگو کہ میں تمہیں بھی دوں گا...... خدا تعالیٰ کا مکالمہ اور مخاطبہ ہی تو ایک جز ہے معرفت کی

اور تمام برکات کا سرچشمہ ہے۔ اگر اس اُمت پر یہ دروازہ بند ہوتا تو سعادت کے تمام دروازے بند ہوتے۔
(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۳۹-۱۴۱)

یہ ضرور یاد رکھو کہ اس اُمت کے لیے وعدہ ہے کہ وہ ہر ایک ایسے انعام پائے گی جو پہلے نبی اور صدیق پاچکے ہیں پس منجملہ ان انعامات کے وہ نبوتیں اور پیشگوئیاں ہیں جن کی رو سے انبیا علیہم السلام نبی کہلاتے رہے لیکن قرآن شریف بجز نبی بلکہ رسول ہونے کے دوسروں پر علوم غیب کا دروازہ بند کرتا ہے جیسا کہ آیت لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[1] سے ظاہر ہے پس مصفا غیب پانے کے لیے نبی ہونا ضروری ہوا اور آیت اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ گواہی دیتی ہے کہ اس مصفا غیب سے یہ امت محروم نہیں اور مصفا غیب حسب منطوق آیت نبوت اور رسالت کو چاہتا ہے اور وہ طریق براہ راست بند ہے۔ اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ اس موہبت کے لیے محض بروز اور ظلیت اور فنا فی الرسول کا دروازہ کھلا ہے۔
(ایک غلطی کا ازالہ ص۵ حاشیہ)

ثُمَّ انْظُرْ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَدُعَآئِهِ الَّذِىْ عَلَّمَنَا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فَاِنَّهٗ اَمَرَنَا اَنْ نَّقْتَدِىَ الْاَنْبِيَآءَ كُلَّهُمْ وَنَطْلُبَ مِنَ اللّٰهِ كَمَالَاتِهِمْ وَلَمَّا كَانَتْ كَمَالَاتُ الْاَنْبِيَآءِ كَاَجْزَآءٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَّاَمَرَنَا اَنْ نَّطْلُبَهَا كُلَّهَا وَنَجْمَعَ مَجْمُوْعَةَ تِلْكَ الْاَجْزَآءِ فِىْ اَنْفُسِنَا فَلَزِمَ اَنْ يَّحْصُلَ لَنَا شَىْءٌ بِالظِّلِّيَّةِ وَمُتَابَعَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَمْ يَحْصُلْ لِفَرْدٍ فَرْدٍ مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ وَقَدِ اتَّفَقَ عُلَمَآءُ الْاِسْلَامِ اَنَّهٗ قَدْ يُوْجَدُ فَضِيْلَةٌ جُزْئِيَّةٌ فِىْ غَيْرِ نَبِىٍّ لَّا تُوْجَدُ فِىْ نَبِىٍّ ٭
(حَمَامَةُ الْبُشْرٰى صفحہ ۸۰)

ترجمہ:- پھر اللہ تعالیٰ کے کلام اور اُس کی اُس دعاء پر غور کرو جو اُس نے ہمیں سکھلائی ہوئی ہے یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ اس میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سب نبیوں کی پیروی کریں اور اللہ تعالیٰ سے اُن کے کمالات طلب کریں اور جب نبیوں کے کمالات متفرق اجزا کی مانند ہیں اور ہمیں ان سب کے طلب کرنے اور ان سب اجزاء کا مجموعہ اپنے نفوس میں جمع کرنے کا حکم دیا گیا پس لازم ہوا کہ ہمیں ظلی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں ایسی چیز بھی مل سکتی ہے جو انبیاء کے افراد میں سے کسی ایک فرد کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ کبھی کسی غیر نبی میں وہ جُزئی فضیلت بھی پائی جاسکتی ہے جو نبی میں نہیں پائی جاتی ٭

[1] الجن ع ۲۔۲۰

اِنَّ الْمُعْجِزَاتِ تَقْتَضِی لِکَرَامَاتٍ لِیَبْقٰی اَثَرُهَا اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔ وَاِنَّ الَّذِیْنَ وَرِثُوْا نَبِیَّهُمْ یُعْطَوْنَ مِنْ نِّعَمِهٖ عَلَی الطَّرِیْقَةِ الظِّلِّیَّةِ وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَبَطَلَتْ فُیُوْضُ النُّبُوَّةِ فَاِنَّهُمْ کَاَثَرٍ لِّعَیْنٍ اِنْقَضٰی وَکَعَکْسٍ لِّصُوْرَةٍ فِی الْمِرْاٰةِ یُرٰی وَاِنَّهُمْ اکْتَحَلُوْا بِمِرْوَدِ الْفَنَآءِ وَارْتَحَلُوْا مِنْ فِنَآءِ الرِّیَآءِ۔ فَمَا بَقِیَتْ شَیْءٌ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَظَهَرَتْ صُوْرَةُ خَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ فَکُلُّ مَا تَرَوْنَ مِنْهُمْ مِنْ اَفْعَالٍ خَارِقَةٍ لِّلْعَادَةِ اَوْ اَقْوَالٍ مُّشَابِهَةٍ بِالصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ فَلَیْسَتْ هِیَ مِنْهُمْ بَلْ مِنْ سَیِّدِنَا خَیْرِ الْبَرِیَّةِ لٰکِنْ فِی الْحُلَلِ الظِّلِّیَّةِ۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنْ هٰذَا الشَّاْنِ لِاَوْلِیَآءِ الرَّحْمٰنِ فَاقْرَءُوْا اٰیَةَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ بِالْاِمْعَانِ ؎

(اَلْهُدٰی صفحہ ۳۱، ۳۲)

اگر خدا تعالیٰ نے حق کے طالبوں کو کامل معرفت دینے کا ارادہ فرمایا ہے تو ضرور اس نے اپنے مکالمہ اور مخاطبہ کا طریق کھلا رکھا ہے۔ اس بارے میں اللہ جل شانہٗ قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یعنی اے خدا ہمیں وہ استقامت کی راہ بتلا جو راہ اُن لوگوں کی ہے جن پر تیرا انعام ہوا ہے اس جگہ انعام سے مراد الہام اور کشف وغیرہ آسمانی علوم ہیں جو انسان کو براہِ راست ملتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۹۹، ۲۰۰)

(ترجمہ اصل کتاب سے) معجزات چاہتے ہیں کرامات کو تو کہ اُن کا نشان قیامت تک باقی رہے اور اپنے نبی علیہ السلام کے وارثوں کو بطور ظلیت کے آپ کی نعمتیں مرحمت ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ قاعدہ جاری نہ رہتا تو نبوت کے فیض بالکل باطل ہو جاتے اس لیے کہ یہ وارث نقش ہوتے ہیں اُس اصل کے جو گذر چکی ہوتی ہے اور گویا عکس ہوتے ہیں ایک صورت کے جو شیشہ میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں نے فنا کی سلائیوں سے سرمہ آنکھ میں ڈالا ہوتا ہے اور ریا کاری کے آنگن سے کوچ کر چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح پر اُن کا اپنا تو کچھ بھی رہا نہیں ہوتا اور خاتم الانبیاء کی صورت ہی نمودار ہو جاتی ہے۔ سو ان لوگوں سے جو کچھ خارق عادت افعال یا اقوال پاک نوشتوں سے مشابہ تم دیکھتے ہو وہ ان کی طرف سے نہیں بلکہ وہ حضرت سید المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ہاں وہ ظلیت کے لباسوں میں ہوتے ہیں۔ اور نہیں اولیاء الرحمان کی نسبت ایسی بزرگی اور شان میں شک ہے تو پڑھ لو آیت صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کو غور اور فکر سے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے ہمارے خدا ہمیں رسولوں اور نبیوں کی راہ پر چلا جن پر تیرا انعام اور اکرام ہوا ہے۔ اب اس آیت سے کہ جو پنج وقت نمازمیں پڑھی جاتی ہے ظاہر ہے کہ خدا کا روحانی انعام جو معرفت اور محبت الٰہی ہے صرف رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ سے ہی ملتا ہے نہ کسی اور ذریعہ سے۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۳۱-۱۳۲)

چونکہ وہ [1] جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تمام انبیاء کے ہیں اس لیے اُس نے ہماری پنج وقتہ نمازمیں ہمیں یہ دُعا پڑھنے کا حکم دیا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے ہمارے خدا ہم سے پہلے جس قدر نبی اور رسول اور صدیق اور شہید گزر چکے ہیں اُن سب کے کمالات ہم میں جمع کر۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۵۲)

یعنی اے ہمارے خدا ہمیں وہ سیدھی راہ دکھلا جو اُن لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرا فضل اور انعام ہوا۔ اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ وہی فضل اور انعام جو تمام نبیوں اور صدیقوں پر پہلے ہو چکا ہے وہ ہم پر بھی کر اور کسی فضل سے ہمیں محروم نہ رکھ۔ یہ آیت اِس اُمت کو اس قدر عظیم الشان امید دلاتی ہے جس میں گذشتہ اُمتیں شریک نہیں ہیں کیونکہ تمام انبیاء کے متفرق کمالات تھے اور متفرق طور پر اُن پر فضل اور انعام ہوا۔ اب اس اُمت کو یہ دعا سکھلائی گئی کہ اُن تمام متفرق کمالات کو مجھ سے طلب کرو۔ پس ظاہر ہے کہ جب متفرق کمالات ایک جگہ جمع ہو جائیں گے تو وہ مجموعہ متفرق کی نسبت بہت بڑھ جائے گا اسی بنا پر کہا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ [2] ۔یعنی تم اپنے کمالات کے رُو سے سب اُمتوں سے بہتر ہو۔

(چشمہ مسیحی ص۶۵-۶۶)

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس اُمت کے لیے مخاطبات اور مکالمات کا دروازہ کھلا ہے۔ اور یہ دروازہ گویا قرآن مجید کی سچائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر ہر وقت تازہ شہادت ہے اور اس کے لیے خدا تعالیٰ نے سورہ فاتحہ ہی میں یہ دعا سکھائی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی راہ کے لیے جو دعا سکھائی تو اس میں انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے حصول کا اشارہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو کمال دیا گیا وہ معرفت الٰہی ہی کا کمال تھا اور یہ نعمت ان کو مکالمات اور مخاطبات سے ملی تھی اسی کے تم بھی خواہاں رہو۔

(الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۶ء ص۴)

خدا کی کلام کو غور سے پڑھو کہ وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ وہ وہی امر تم سے چاہتا ہے۔ جس کے بارہ میں

---

[1] خدا تعالیٰ۔ [2] آل عمران ع ۱۲۔

سورہ فاتحہ میں تمہیں دعا سکھلائی گئی ہے۔ یعنی یہ دعا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ پس جبکہ خدا تمہیں یہ تاکید کرتا ہے۔ کہ پنج وقت یہ دعا کرو کہ وہ نعمتیں جو نبیوں اور رسولوں کے پاس ہیں۔ وہ تمہیں بھی ملیں پس تم بغیر نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ کے وہ نعمتیں کیونکر پا سکتے ہو۔ لہٰذا ضرور ہوا کہ تمہیں یقین اور محبت کے مرتبہ پر پہونچانے کے لیے خدا کے انبیاء وقتاً بعد وقتٍ آتے رہیں۔ جن سے تم وہ نعمتیں پاؤ۔

(لیکچر سیالکوٹ ص۳۲)

بجز قرآن کس کتاب نے اپنی ابتدا میں ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ دعا سکھلائی اور یہ امید دی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی ہمیں اپنی اُن نعمتوں کی راہ دکھلا جو پہلوں کو دکھلائی گئی۔ جو نبی اور رسول اور صدیق اور شہید اور صالح تھے پس اپنی ہمتیں بلند کرو اور قرآن کی دعوت کو ردّ مت کرو کہ وہ تمہیں وہ نعمتیں دینا چاہتا ہے جو پہلوں کو دی تھیں۔ کیا اُس نے بنی اسرائیل کا ملک اور بنی اسرائیل کا بیت مقدس تمہیں عطا نہیں کیا جو آج تک تمہارے قبضہ میں ہے پس اے سُست اعتقادو اور کمزور ہمتو کیا تمہیں یہ خیال ہے کہ تمہارے خدا نے جسمانی طور پر تو بنی اسرائیل کے تمام املاک کا تمہیں قائم مقام کر دیا۔ مگر روحانی طور پر تمہیں قائم مقام نہ کر سکا بلکہ خدا کا تمہاری نسبت اِن سے زیادہ فیض رسانی کا ارادہ ہے خدا نے اُن کے روحانی جسمانی متاع و مال کا تمہیں وارث بنایا مگر تمہارا وارث کوئی دوسرا نہ ہوگا جب تک کہ قیامت آجاوے خدا تمہیں نعمت وحی اور الہام اور مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ سے ہرگز محروم نہیں رکھے گا وہ تم پر وہ سب نعمتیں پوری کرے گا جو پہلوں کو دی گئیں...... سو تم صدق اور راستی اور تقویٰ اور محبت ذاتیہ الٰہیہ میں ترقی کرو اور اپنا کام یہی سمجھو جب تک زندگی ہے پھر خدا تم میں سے جس کی نسبت چاہے گا اس کو اپنے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف کریگا۔

(کشتی نوح ص۲۵، ۲۶)

جب تک انسان اِن دونوں صفات سے متصف نہیں ہوتا یعنی بدیاں چھوڑ کر نیکیاں حاصل نہیں کرتا وہ اس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتا مومن کامل ہی کی تعریف میں تو اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ فرمایا گیا ہے۔ اب غور کرو کہ کیا اتنا ہی انعام تھا کہ وہ چوری چکاری رہزنی نہیں کرتے تھے یا اس سے بڑھ کر مراد ہے؟ نہیں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں تو وہ اعلیٰ درجہ کے انعامات رکھے گئے ہیں جو مخاطبہ اور مکالمہ الٰہیہ کہلاتے ہیں۔

(الحکم ۱۷ جنوری ۱۹۰۵ء ص۳)

اللہ تعالیٰ کا انتقال نبوت سے یہی منشاء تھا کہ وہ اپنا فضل و کمال دکھانا چاہتا تھا جو اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں یعنی اے اللہ ہم پر

وہ انعام واکرام کر جو پہلے نبیوں اور صدیقوں شہیدوں اور صالحین پر تو نے کیے ہیں ہم پر بھی کر۔ اگر خدا تعالیٰ یہ انعام واکرام کر ہی نہیں سکتا تھا اور ان کا دروازہ بند ہو چکا تھا تو پھر اس دعا کی تعلیم کی کیا ضرورت تھی؟ اسرائیلیوں پر تو یہ دروازہ بند ہو چکا تھا اگر یہاں بھی بند ہو گیا تو پھر کیا فائدہ ہُوا؟ اور کس بات میں بنی اسرائیل پر اس امت کو فخر ہُوا۔ جو خود اندھا ہے وہ دوسرے اندھے پر کیا فخر کر سکتا تھا؟

اگر وحی۔ الہام۔ خوارق یہودیوں پر بند ہو چکے ہیں! تو پھر یہ بتاؤ کہ یہ دروازہ کسی جگہ جا کر کھلا بھی یا نہیں ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ نہیں ہم پر بھی یہ دروازہ بند ہے یہ کیسی بدنصیبی ہے پانچ وقت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا کرتے ہیں اور اس پر بھی کچھ نہیں ملتا! تعجب!!

اللہ تعالیٰ کا خود ایسی دعا تعلیم کرنا تو یہ معنے رکھتا ہے کہ میں تم پر انعام واکرام کرنے کے لیے طیار ہوں جیسے کسی حاکم کے سامنے پانچ امیدوار ہوں اور وہ ان میں سے ایک کو کہے کہ تم یہاں حاضر رہو تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ اس کو ضرور کام دیا جاویگا۔ اس طرح پر اللہ تعالیٰ نے یہ دعا تعلیم کی اور پانچ وقت یہ پڑھی جاتی ہے مگر ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ اس کا کچھ بھی اثر اور نتیجہ نہیں ہوتا؛ کیا یہ قرآن شریف کی ہتک اور اسلام کی ہتک نہیں؟ میرے اور ان کے درمیان یہی امر دراصل متنازعہ فیہ ہے میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کی برکات اور تاثیرات جیسے پہلے تھیں ویسے ہی اب بھی ہیں وہ خدا اپنے تصرفات اب بھی دکھاتا ہے اور کلام کرتا ہے مگر یہ اس کے مقابلہ میں کہتے ہیں کہ اب یہ دروازہ بند ہو چکا ہے اور خدا تعالیٰ خاموش ہو گیا ہے وہ کسی سے کلام نہیں کرتا۔

(الحکم ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵-۶)

ہر یک مسلمان پانچ وقت اپنی نماز میں یہ دُعا پڑھتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور خدائے تعالیٰ نے آپ فرما دیا ہے کہ صراط مستقیم نبیوں کی راہ صدیقوں کی راہ شہیدوں کی راہ ہے پھر ہم سخت نادان ہوں گے اگر ہم اُن راہوں کے طلب گار نہ ہوں جن کی طلب کے لیے خدا تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے اور فلسفیوں کے پیچھے بھٹکتے پھریں۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۲۴۵-۲۴۶ حاشیہ)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اُس نبی کی کامل پیروی سے ایک شخص عیسیٰ سے بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ اندھے کہتے ہیں یہ کفر ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ تم خود ایمان سے بے نصیب ہو پھر کیا جانتے ہو کہ کفر کیا چیز ہے کفر خود تمہارے اندر ہے اگر تم جانتے کہ اس آیت کے کیا معنے ہیں کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو ایسا کُفر منہ پر نہ لاتے۔ خدا تو تمہیں یہ ترغیب دیتا ہے کہ تم اس رسولؐ کی کامل پیروی کی برکت سے تمام

رسولوں کے متفرق کمالات اپنے اندر جمع کر سکتے ہو۔ اور تم صرف ایک نبی کے کمالات حاصل کرنا کفر جانتے ہو۔
(چشمہ مسیحی صفحہ ۲۴ و ۲۵)

ایک بندہ خدا کا عیسیٰؑ نام جس کو عبرانی میں یسوع کہتے ہیں تیس۳۰ برس تک موسیٰؑ رسول اللہ کی شریعت کی پیروی کر کے خدا کا مقرب بنا اور مرتبہ نبوّت پایا اس کے مقابل پر اگر کوئی شخص بجائے تیس۳۰ برس کے پچاس۵۰ برس بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے تب بھی وہ مرتبہ نہیں پاسکتا گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کوئی کمال نہیں بخش سکتی اور نہیں خیال کرتے کہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ خدا کا یہ دعا سکھلانا کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ایک دھوکہ دینا ہے۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۶۵ حاشیہ)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی راہ طلب کی گئی ہے اور میں نے کئی مرتبہ یہ بات بیان کی ہے کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں چار گروہوں کا ذکر ہے نبی صدیق۔ شہید۔ صالح۔ پس جب کہ ایک مومن یہ دعا مانگتا ہے تو اُن کے اخلاق اور عادات اور علوم کی درخواست کرتا ہے۔ اس پر اگر ان چار گروہوں کے اخلاق حاصل نہیں کرتا تو یہ دعا اُس کے حق میں بے ثمر ہوگی اور وہ بے جان لفظ بولنے والا حیوان ہے یہ چار طبقے ان لوگوں کے ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ سے علوم عالیہ اور مراتب عظیمہ حاصل کیے ہیں۔
(الحکم ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ نے جو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی دعا تعلیم کی ہے اور ہر رکعت نماز میں پڑھی جاتی ہے اگر یہ نعمت کسی کو ملنے والی ہی نہ تھی تو اس دعا کی تعلیم کی کیا ضرورت تھی۔ (الحکم ۲۴ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

مکالمہ الٰہی کا اگر انکار ہو تو پھر اسلام ایک مردہ مذہب ہو گا۔ اگر یہ دروازہ بھی بند ہے تو اس اُمت پر قہر ہوا خیر الامم نہ ہوئی۔ اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ دعا بے سود ٹھہری۔ تعجب ہے کہ یہود تو یہ اُمت بن جاوے اور مسیح دوسروں سے آوے۔ (الحکم ۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

نبوت کی علامت مکالمہ ہے لیکن اب اہل اسلام نے جو یہ اپنا مذہب قرار دیا ہے کہ اب مکالمہ کا دروازہ بند ہے اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ خدا کا بڑا قہر اسی امت پر ہے اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی دعا ایک بڑا دھوکہ ہوگی۔ اور اس کی تعلیم کا کیا فائدہ ہوا گویا یہ عبث تعلیم خدا نے دی۔ (البدر ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲)

بھلا اگر خدا تعالیٰ نے اس امت کو اس شرف سے محروم ہی رکھنا تھا تو یہ دعا کیوں سکھائی اِھْدِنَا

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اس دعاء سے تو صاف نکلتا ہے کہ یا الٰہی ہمیں پہلے منعم علیہم لوگوں کی راہ پر چلا اور جو اُن کو الہامات ملے ہمیں بھی وہ انعامات عطا فرما اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کون تھے خدا نے خود ہی فرما دیا ہے کہ نبی صدیق۔ شہید۔ صالح لوگ تھے اور اُن کا برابر انعام یہی الہام اور وحی کا نزول تھا۔ بھلا اگر خدا نے اِس دعاء کا سچا نتیجہ جو ہے اُس سے محروم ہی رکھنا تھا تو پھر کیوں ایسی دعا سکھائی۔

(الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

نبوت کے معنے مکالمہ کے ہیں جو غیب کی خبر دیوے وہ نبی ہے اگر آئندہ نبوت کو باطل قرار دو گے تو پھر یہ امت خیر الامت نہ رہے گی بلکہ کالانعام ہو گی اور سورہ فاتحہ کی تعلیم جس میں اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ہے بے سود ٹھہرے گی کیونکہ انعام اور اکرام تو خدا کا اب کسی پر ہونا نہیں تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہوا اور نعوذ باللہ ماننا پڑا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں قدسی قوت ہی نہ تھی۔

(البدر ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

اگر خدا تعالیٰ نے اپنے فضل کو بند کر دیا ہے اور قفل لگا دیا ہے تو پھر اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعاء تعلیم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک شخص کی مشکیں باندھ دی جاویں اور پھر اس کو ماریں کہ تو اب چل کر کیوں نہیں دکھاتا۔ بھلا وہ کس طرح چل سکتا ہے۔ فیوض اور برکات کے دروازے تو خود بند کر دئے۔ اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا ہر روز ہر نماز میں کئی مرتبہ مانگا کرو۔ اگر قانون قدرت یہ رکھا تھا کہ آپ کے بعد معجزات اور برکات کا سلسلہ ختم کر دیا تھا اور کوئی فیض اور برکت کسی کو ملنا ہی نہیں تھی تو پھر اس دعاء سے کیا مطلب؟

اگر اس دعاء کا کوئی اور نتیجہ نہیں تو پھر نصاریٰ کی تعلیم کے آثار و نتائج اور اس تعلیم کے آثار اور نتائج میں کیا فرق ہُوا لکھا تو انجیل میں یہی ہے کہ میری پیروی سے تم پہاڑ کو بھی ہلا سکو گے مگر اب وہ جوتی بھی سیدھی نہیں کر سکتے۔ لکھا ہے کہ میرے جیسے معجزات دکھاؤ گے مگر کوئی کچھ نہیں دکھا سکتا۔ لکھا ہے کہ زہریں کھاؤ گے تو اثر نہ کریں گی مگر اب سانپ ڈستے اور کتّے کاٹتے ہیں اور وہ ان زہروں سے ہلاک ہوتے ہیں اور کوئی نمونہ وہ دعا کا نہیں دکھا سکتے۔ ان کا وہ نمونہ دعا کی قبولیت کا نہ دکھا سکنا ایک سخت حربہ اور حجّت ہے عیسائی مذہب کے ابطال پر کہ اُس میں زندگی کی روح اور تاثیر نہیں اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اُنہوں نے نبی کا طریق چھوڑ دیا۔

اب اگر ہم بھی یہ اقرار کر لیں کہ اب نشانات اور خوارق نہیں ہوتے اور یہ دعا جو سکھائی گئی ہے اِس کا کوئی

اثر اور نتیجہ نہیں تو کیا اُس کے یہ معنے نہیں ہونگے کہ یہ اعمال معاذ اللہ بے فائدہ ہیں۔ نہیں خدا تعالیٰ جو دانا اور حکمت والا ہے وہ نبوت کی تاثیرات کو قائم رکھتا ہے اور اب بھی اس نے اس سلسلہ کو اس لیے قائم کیا ہے۔ تا وہ اس امر کی سچائی پر گواہ ہو۔ (الحکم ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۰۲)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے اور تعلیم کرتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اور اس کے یہی معنی ہیں کہ یا الٰہی قرب اور محبت اور معرفت کا ہمیں وہ راہ عنایت کر جو تو نے تمام نبیوں اور مقدسوں اور معصوموں کو عنایت فرمایا ہے پس اس سے تو یہی ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ ایں بخل نہیں۔ پس جبکہ انسان ظلی طور پر نبیوں کے مراتب تک پہنچ جاتا ہے تو اس کو اہل بیت یا امام حسین کے مرتبہ تک پہنچنے سے کونسی بات سدِّ راہ ہے اگر ابواب قرب اور محبت و معرفت کے کھلے نہ ہوتے اور صرف حضرت علی یا امام حسین یا چند دوسرے اہل بیت پر ہر یہ کمالات ختم ہو کر آئندہ کو محکم قفل اُن پر لگ جاتا تو اس صورت میں اسلام اسلام نہ تھا اور صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ پڑھنا عبث ہو جاتا خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے بخل نہیں رکھتا جو ڈھونڈے گا پائے گا۔

(البدر ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۳)

خدا اپنی قدرتوں میں کمزور نہیں وہ یقین دلانے کے لیے ایسے خارق عادت طریقے اختیار کر لیتا ہے کہ انسان جیسے آفتاب کو دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ آفتاب ہے ایسا ہی خدا کے کلام کو پہچان لیتا ہے کیا ان کا یہ خیال ہے کہ آدم سے لے کر آنحضرت صلعم تک خدا تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ اپنی پاک وحی کے ذریعے سے حق کے طالبوں کو سرچشمۂ یقین تک پہنچا دے مگر پھر بعد اس کے اس فیضان پر قادر نہ رہا یا قادر تو تھا مگر دانستہ اس امت غیر مرحومہ کے ساتھ بخل کیا اور اس دعا کو بھول گیا جو آپ ہی سکھلائی تھی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ (البدر یکم فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ تو سب کو ولی کہتا ہے اور سب کو ولی بنانا چاہتا ہے اسی لیے وہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم منعم علیہ گروہ کی مانند ہو جاؤ۔ جو کہتا ہے کہ میں ایسا نہیں ہو سکتا وہ اللہ تعالیٰ پر بخل کی تہمت لگاتا ہے اور اس لیے یہ کلمہ کفر ہے۔ (الحکم ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۱)

یاد رکھو کہ خدا کے فیوض بے انتہا ہیں جو اُن کو محدود کرتا ہے وہ اصل میں خدا کو محدود کرتا ہے اور اس کی کلام کو عبث قرار دیتا ہے وہی تبلا دے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں جب وہ اُنہی کمالات اور انعامات کو طلب کرتا ہے جو کہ سابقین پر ہوئے تو اب اُن کو محدود کیسے مانتا ہے اگر وہ محدود ہیں اور بقول شیعہ بارہ امام تک ہی رہے تو پھر سورہ فاتحہ کو نماز میں کیوں پڑھتا ہے وہ تو اُس کے عقیدہ کے خلاف

تعلیم کر رہی ہے اور خدا کو ملزم گردانتی ہے کہ ایک طرف تو وہ خود ہی کمالات کو بارہ امام تک ختم کرتا ہے اور پھر لوگوں کو قیامت تک اُن کے طلب کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دیکھو مایوس ہونا مومن کی شان نہیں ہوتی اور ترقیات اور مراتب قرب کی کوئی حد بست نہیں ہے یہ بڑی غلطی ہے کہ کسی فرد خاص پر ایک بات قائم کر دی جاوے۔

(البدر ۸/۱۶ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ کے حضور آتا ہے وہ خالی نہیں جاتا۔ پاکیزہ قلب ہونے کی ضرورت ہے ورنہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی تعلیم اور تاکید بے فائدہ ہو جاتی ہے اگر وہ انعام اکرام اب کسی کو ملنے ہی نہیں ہیں تو پھر پانچ وقت اس دعا کے مانگنے کی کیا حاجت ہے؟ یہ بڑی غلطی ہے جو مسلمانوں میں پھیل گئی ہے۔ حالانکہ یہی تو اسلام کا حسن اور خوبی تھی کہ اس کے برکات اور فیوض اور اس کی پاک تعلیم کے ثمرات تازہ بتازہ ہمیشہ مل سکتے ہیں۔ تمام صوفیوں اور اکابرانِ امت کا یہی مذہب ہے بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ کامل متبع ہوتا ہی نہیں جب تک بروزی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کو اپنے اندر نہ رکھتا ہو۔ اور حقیقت میں یہ بات صحیح بھی ہے کیونکہ کامل اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لازم ہے کہ اس کے ثمرات اپنے اندر پیدا کرے جب ایک شخص کامل اطاعت کرتا ہے اور گو اطاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں محو اور فنا ہو کر گم ہو جاتا ہے اس وقت اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ایک شیشہ سامنے رکھا ہوا ہو۔ اور تمام و کمال عکس اس میں پڑے۔ میں کبھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور برکات اور ان تاثیرات کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع سے ملتی ہیں محدود نہیں کر سکتا بلکہ ایسا خیال کرنا کفر سمجھتا ہوں۔

(الحکم ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

جبکہ بہر صورت ثابت ہے کہ خضر کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم یقینی اور قطعی دیا گیا تھا تو پھر کیوں کوئی شخص مسلمان کہلا کر اور قرآن شریف پر ایمان لا کر اِس بات سے منکر رہے کہ کوئی فرد بشر اُمّتِ محمدیّہ میں سے باطنی کمالات میں خضر کی مانند نہیں ہو سکتا بلاشبہ ہو سکتا ہے بلکہ خدائے حیّ قیوم اِس بات پر قادر ہے کہ اُمّتِ مرحومہ محمدیّہ کے افرادِ خاصہ کو اُس سے بھی بہتر و زیادہ تر باطنی نعمتیں عطا فرماوے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ کیا اُس خداوند کریم نے آپ ہی اِس اُمّت کو یہ دعا تعلیم نہیں فرمائی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔[۱]

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱)

---

[۱] البقرۃ۔ ع ۱۳۔

یہ تعلیم دے کر کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ تمام سچے طالبوں کو خوش خبری دی کہ وہ اپنے رسولِ مقبول کی تبعیّت سے اُس علم ظاہری اور باطنی تک پہنچ سکتے ہیں کہ جو بالا صالت خدا کے نبیوں کو دیا گیا انہیں معنوں کر کے تو علماء وارث الانبیاء کہلاتے ہیں اور اگر باطنی علم کا ورثہ اُن کو نہیں مل سکتا تو پھر وہ وارث کیوں کر اور کیسے ہوئے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۱ حاشیہ در حاشیہ ۱)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ یہ آیت صاف کہہ رہی ہے کہ اس امت کے بعض افراد کو گذشتہ نبیوں کا کمال دیا جائیگا اور نیز یہ کہ گذشتہ کفار کے عادات بھی بعض منکروں کو دی جائیں گی اور بڑی شد و مد سے آئندہ نسلوں کی گذشتہ لوگوں سے مشابہتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ چنانچہ بعینہٖ یہودیوں کی طرح یہودی پیدا ہو جائیں گے اور ایسا ہی نبیوں کا کامل نمونہ بھی ظاہر ہوگا۔ (نزول المسیح صفحہ ۴-۵ حاشیہ)

اگر یہ کہا جائے کہ اِس اُمّت پر قیامت تک دروازہ مکالمہ مخاطبہ اور وحی الٰہی کا بند ہے تو پھر اس صورت میں کوئی اُمتی نبی کیوں کر کہلا سکتا ہے کیونکہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ خدا اُس سے ہم کلام ہو تو اس کا یہ جواب ہے کہ اِس اُمّت پر یہ دروازہ ہرگز بند نہیں ہے اور اگر اِس اُمّت پر یہ دروازہ بند ہوتا تو یہ اُمّت ایک مُردہ اُمّت ہوتی اور خدا تعالیٰ سے دور اور مہجور ہوتی اور اگر یہ دروازہ اِس اُمّت پر بند ہوتا تو کیوں قرآن میں یہ دعا سکھلائی جاتی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۸۲-۱۸۳)

یاد رکھنا چاہیئے کہ جو مذہب آئندہ کمالات کے دروازے بند کرتا ہے وہ مذہب انسانی ترقی کا دشمن ہے قرآن شریف کی رُو سے انسان کی بھاری دعا یہی ہے کہ وہ روحانی ترقیات کا خواہاں ہو۔ غور سے پڑھنا چاہیئے اس آیۃ کو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵

(الحکم ۸ دسمبر ۱۸۹۸ء صفحہ ۳)

یہ اسلام پر بھی ایک داغ ہے کہ بنی اسرائیل میں تو ایسے یقینی الہام ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کی ماں نے اپنے معصوم بچے کو دریا میں ڈال دیا اور اُس الہام کی سچائی میں کچھ شک نہ کیا اور ظنّی نہ سمجھا اور خضر نے ایک بچہ کو قتل بھی کر دیا۔ مگر اس اُمّت مرحومہ کو وہ مرتبہ بھی نہ ملا جو بنی اسرائیل کی عورتوں کو مل گیا۔ پھر اس آیت کے کیا معنے ہوئے کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کیا اُنہیں ظنّی الہاموں کا نام انعام ہے جو شیطان

اور رحمٰن میں مشترک ہیں جائے شرم۔ (تجلیات الٰہیہ صفحہ ۲۷، ۲۸)

نبوّت محمدیہ اپنی ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اس میں فیض ہے۔ اس نبوت کی پیروی خدا تک بہت سہل طریق سے پہنچا دیتی ہے۔ اور اس کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے مکالمہ مخاطبہ کا اس سے بڑھ کر انعام بھی مل سکتا ہے جو پہلے ملتا تھا .... اور جب کہ وہ مکالمہ مخاطبہ اپنی کیفیت اور کمیّت کی رُو سے کمال درجہ تک پہنچ جائے اور اس میں کوئی کثافت اور کمی باقی نہ ہو۔ اور کھلے طور پر امور غیبیہ پر مشتمل ہو تو وہی دوسرے لفظوں میں نبوّت کے نام سے موسوم ہوتا ہے جس پر تمام نبیوں کا اتفاق ہے پس یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قوم جس کے لیے فرمایا گیا۔ کہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور جن کے لیے یہ دعا سکھائی گئی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ ان کے تمام افراد اس مرتبہ عالیہ سے محروم رہتے اور کوئی ایک فرد بھی اس مرتبہ کو نہ پاتا اور ایسی صورت میں صرف یہی خرابی نہیں تھی کہ اُمت محمدیہ ناقص اور ناتمام رہتی اور سب کے سب اندھوں کی طرح رہتے بلکہ یہ بھی نقص تھا۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت فیضان پر داغ لگتا تھا اور آپ کی قُوّت قدسیہ ناقص ٹھہرتی تھی اور ساتھ اس کے وہ دعا جس کا پانچ وقت نماز میں پڑھنا تعلیم کیا گیا تھا۔ اس کا سکھلانا بھی عبث ٹھہرتا تھا۔

(الوصیت صفحہ ۱۲-۱۳ منقول از اخبار بدر جلد ۲ نمبر ۱۔ مورخہ ۵ جنوری ۱۹۰۶ء)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ .... اگر یہ امت پہلے نبیوں کی وارث نہیں اور اس انعام میں سے ان کو کچھ حصہ نہیں تو یہ دعا کیوں سکھلائی گئی۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۱ حاشیہ)

چھٹی آیت اس سورت کی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہے گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھٹے ہزار کی تاریکی آسمانی ہدایت کو چاہے گی اور انسانی سلیم فطرتیں خدا کی جناب سے ایک ہادی کو طلب کریں گی یعنی مسیح موعود کو۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۲ حاشیہ)

اِعْلَمْ اَنَّ فِیْ اٰیَۃِ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ تَبْشِیْرٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَاِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّ اللّٰہَ اَعَدَّ لَھُمْ کُلَّمَا اَعْطٰی لِلْاَنْبِیَآءِ السَّابِقِیْنَ وَلِذَالِکَ عَلَّمَ ھٰذَا

ترجمہ: واضح ہو کہ آیت اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں مومنوں کے لیے ایک خوش خبری ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہ سب کچھ تیار کر رکھا ہے جو اس نے گذشتہ نبیوں کو دیا تھا اور اسی لیے اس

[۵] آل عمران ع ۱۲۔

الدُّعَآءَ لِيَكُوْنَ بِشَارَةً لِّلطَّالِبِيْنَ فَلَزِمَ مِنْ ذَالِكَ اَنْ يَّخْتَتِمَ سِلْسِلَةُ الْخُلَفَآءِ الْمُحَمَّدِيَّةِ عَلٰى مَثِيْلِ عِيْسٰى ـ لِيَتِمَّ الْمُمَاثَلَةُ بِالسِّلْسِلَةِ الْمُوْسَوِيَّةِ وَالْكَرِيْمُ اِذَا وَعَدَ وَفٰى۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۶۶ حاشیہ)

وَاللّٰهِ لَيْسَ فِي الْقُرْاٰنِ الَّذِيْ هُوَ اَهْلُ الْفَصْلِ وَالْقَضَآءِ اِلَّا خَبَرُ ظُهُوْرِ خَاتَمِ الْخُلَفَآءِ مِنْ اُمَّةِ خَيْرِ الْوَرٰى فَلَا تَقْفُوْا مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ قَدْ اُعْطِيْتُمْ فِيْهِ مِنَ الْهُدٰى وَلَا تُخْرِجُوْا مِنْ اَفْوَاهِكُمْ كَلِمَاتٍ شَتّٰى الَّتِيْ لَيْسَتْ هِيَ اِلَّا كَسَهْمٍ فِي الظُّلُمٰتِ يُرْمٰى - وَاِنَّ هٰذَا الْوَعْدَ وَعْدٌ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمْ مَا تَسْمَعُوْنَ مِنْ اَهْلِ الْهَوٰى - وَقَدْ اُشِيْرَ اِلَيْهِ فِي الْفَاتِحَةِ مَرَّةً اُخْرٰى وَتَقْرَءُوْنَ فِي الصَّلٰوةِ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ثُمَّ تَسْتَنْقِرُوْنَ سُبُلَ الْاِنْكَارِ وَتُسِرُّوْنَ النَّجْوٰى - مَا لَكُمْ تَدُوْسُوْنَ قَوْلَ اللّٰهِ تَحْتَ الْاَقْدَامِ اَلَا تَمُوْتُوْنَ اَوْ تُتْرَكُوْنَ سُدًى ؕ

(خُطْبَۂ اِلْہَامِیَہ صفحہ ۶۳، ۶۴)

نے یہ دعا سکھائی تا طالبوں کے لیے خوش خبری ہو۔ پس اس سے لازم آیا کہ محمدی خلفاء کا سلسلہ مثیل عیسےٰ پر ختم ہو تا موسوی سلسلہ کے ساتھ اس کی مماثلت مکمل ہو جائے اور کریم جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا کیا کرتا ہے۔

(ترجمہ اصل کتاب سے) خدا کی قسم قرآن شریف میں جو تمام اختلافوں کا فیصلہ کرنے والا ہے کہیں ذکر نہیں ہے کہ خاتم الخلفاء سلسلہ محمدیہ کا موسوی سلسلہ سے آئے گا اُس کی پیروی مت کرو کہ کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے تم کو دلیل دی گئی اور کلمات متفرقہ اپنے منہ سے نہ نکالو کہ وہ کلمات اُس تیر کی طرح ہیں جو اندھیرے میں چلایا جائے اور یہ وعدہ جو مذکور ہوا سچا وعدہ ہے اور تم کو کوئی دھوکا نہ دے اور سورہ فاتحہ میں دوسری بار اس وعدہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ آیت سورہ فاتحہ یعنی صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں پھر حیلہ وبہانہ اختیار کرتے ہیں اور حجت الٰہی کے رفع دفع کے لیے مشورے کرتے ہیں۔ تمہیں کیا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کے فرمودہ کو اپنے پیروں میں روندتے ہو کیا ایک دن تم نہیں مرو گے یا کوئی تم کو نہیں پوچھے گا۔

اگر بروزی معنوں کے رُو سے بھی کوئی شخص نبی اور رسول نہیں ہو سکتا۔ تو پھر اس کے کیا معنے ہیں۔ کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔

(ایک غلطی کا ازالہ ص۵)

قرآن شریف بھی سلسلہ موسویہ کے بالمقابل ایک سلسلہ قائم کرتا ہے۔ اسی کی طرف علاوہ اور آیات قرآنی کے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ بھی اشارہ کرتا ہے۔ یعنی جو پہلے نبیوں کو دیا گیا ہے ہم کو بھی عطا کر۔

(الحکم ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء ص۴)

نیکوں کے اور بدوں کے بروز ہوتے ہیں نیکوں کے بروز میں جو موعود ہے وہ ایک ہی ہے یعنی مسیح موعود ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے نیکوں کا بروز اور ضَالِّيْنَ سے عیسائیوں کا بروز اور مغضوب سے یہودیوں کا بروز مراد ہے اور یہ عالم بروزی صفت میں پیدا کیا گیا ہے جیسے پہلے نیک یا بد گزرے ہیں ان کے رنگ اور صفات کے لوگ اب بھی ہیں خدا تعالیٰ ان اخلاق اور صفات کو ضائع نہیں کرتا ان کے رنگ میں اور آجاتے ہیں جب یہ امر ہے تو ہمیں اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ابرار اور اخیار اپنے اپنے وقت پر ہوتے رہیں گے۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک چلا جاویگا جب یہ سلسلہ ختم ہو جاویگا تو دنیا کا بھی خاتمہ ہے لیکن وہ موعود جس کے سپرد عظیم الشان کام ہے وہ ایک ہی ہے کیونکہ جس کا وہ بروز ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی ایک ہی ہے۔

(الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء ص۱۰)

خدا تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو سورہ فاتحہ میں دعا سکھلائی ہے کہ وہ اس فریق کی راہ خدا تعالیٰ سے طلب کرتے رہیں جو منعم علیہم کا فریق ہے اور منعم علیہم کے کامل طور پر مصداق باعتبار کثرت کمیّت اور صفائی کیفیت اور نعماء حضرت احدیت از رُوئے نص صریح قرآنی اور احادیث متواترہ حضرت مرسلِ یزدانی دو گروہ ہیں ایک گروہ صحابہ اور دوسرا گروہ جماعت مسیح موعود کیونکہ یہ دونوں گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے تربیت یافتہ ہیں کسی اپنے اجتہاد کے محتاج نہیں وجہ یہ کہ پہلے گروہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے جو خدا سے براہ راست ہدایت پاکر وہی ہدایت نبوت کی پاک توجہ کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل میں ڈالتے تھے اور ان کے لیے مربی بے واسطہ تھے۔ اور دوسرے گروہ میں مسیح موعود ہے جو خدا سے الہام پاتا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے فیض اٹھاتا ہے لہٰذا اس کی جماعت بھی اجتہاد خشک کی محتاج نہیں ہے۔

(تحفہ گولڑویہ ص۸۰)

منعم علیہم لوگوں میں جو کمالات ہیں اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے

اشارہ فرمایا ہے ان کو حاصل کرنا ہر انسان کا اصل مقصد ہے اور ہماری جماعت کو خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کے قائم کرنے سے یہی چاہا ہے کہ وہ ایسی جماعت تیار کرے جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طیار کی تھی تاکہ اس آخری زمانہ میں یہ جماعت قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے۔ (الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

انسان کا اعلیٰ درجہ وہی نفس مطمئنہ ہے جس پر میں نے گفتگو شروع کی ہے اس حالت میں اور تمام حالتوں سے ایسے لوازم ہو جاتے ہیں کہ عام تعلق الٰہی سے بڑھ کر خاص تعلق ہو جاتا ہے جو زمینی اور سطحی نہیں ہوتا۔ بلکہ علوی اور سماوی تعلق ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اطمینان جس کو فلاح اور استقامت بھی کہتے ہیں۔ اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اسی راہ کی دعا تعلیم کی گئی ہے اور یہ استقامت کی راہ اُن لوگوں کی راہ ہے جو منعم علیہم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افضال و اکرام کے مورد ہیں۔ منعم علیہم کی راہ کو خاص طور پر بیان کرنے سے یہ مطلب تھا کہ استقامت کی راہیں مختلف ہیں۔ مگر وہ استقامت جو کامیابی اور فلاح کی راہوں کا نام ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی راہیں ہیں۔ اس میں ایک اور اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں دعا انسان کی زبان، قلب اور فعل سے ہوتی ہے۔ اور جب انسان خدا سے نیک ہونے کی دعا کرے تو اُسے شرم آتی ہے۔ مگر یہی ایک دعا ہے جو ان مشکلات کو دُور کر دیتی ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵)

یہ ضروری امر ہے کہ جو قویٰ کو اُن کے فطرتی کاموں پر لگاؤ تو اور بھی ملے گا۔ ہمارا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جہاں تک عملی طاقتوں سے کام لیا جاوے۔ اللہ تعالیٰ اس پر برکت نازل کرتا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ اول عقائد اخلاق۔ اعمال کو درست کرو۔ پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا مانگو تو اُس کا اثر کامل طور پر ظاہر ہو گا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۶)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں تمام مسلمانوں کو لازم ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا لحاظ رکھیں۔ کیونکہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پر مقدم رکھا ہے۔ پس پہلے عملی طور پر شکریہ کرنا چاہیئے اور یہی مطلب اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں رکھا ہے۔ یعنی دعا سے پہلے اسباب ظاہری کی رعایت اور نگہداشت ضروری طور پر کی جاوے۔ اور پھر دعاء کی طرف رجوع ہو۔ اولاً عقائد۔ اخلاق اور عادات کی اصلاح ہو۔ پھر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ...... اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا تعلیم کرنے میں اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ انسان تین پہلو ضرور مدنظر رکھے۔ اوّل اخلاقی حالت۔ دوم حالت عقائد۔ سوم اعمال کی حالت۔ مجموعی طور پر یوں کہو کہ انسان خداداد قوتوں کے ذریعے سے اپنے حال کی اصلاح کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ یہ مطلب نہیں کہ اصلاح کی

صورت میں دعا نہ کرے۔ نہیں۔ اُس وقت بھی مانگتا رہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۸)

نجات یافتہ کون ہے؟ وہ جو یقین رکھتا ہے جو خدا سچ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اور تمام مخلوق میں درمیانی شفیع ہے اور آسمان کے نیچے نہ اس کے ہم مرتبہ کوئی اور رسول ہے اور نہ قرآن کے ہم مرتبہ کوئی اور کتاب ہے۔ اور کسی کے لیے خدا نے نہ چاہا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے مگر یہ برگزیدہ نبی ہمیشہ کے لیے زندہ ہے اور اس کے ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے خدا نے یہ بنیاد ڈالی ہے کہ اس کے افاضہ تشریعی اور روحانی کو قیامت تک جاری رکھا اور آخر کار اُس کی روحانی فیض رسانی سے اس مسیح موعود کو دُنیا میں بھیجا جس کا آنا اسلامی عمارت کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کیونکہ ضرور تھا کہ یہ دُنیا ختم نہ ہو جب تک کہ محمدی سلسلہ کے لیے ایک مسیح روحانی رنگ کا نہ دیا جاتا جیسا کہ موسوی سلسلہ کے لیے دیا گیا تھا اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ (کشتی نوح صفحہ ۱۳)

اصل حقیقت اور اصل سرچشمہ نجات کا محبت ذاتی ہے جو وصال الٰہی تک پہنچاتی ہے وجہ یہ کہ کوئی محب اپنے محبوب سے جدا نہیں رہ سکتا اور چونکہ خدا خود نور ہے اس لیے اُس کی محبت سے نور نجات پیدا ہو جاتا ہے اور وہ محبت جو انسان کی فطرت میں ہے خدا تعالیٰ کی محبت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کی محبت ذاتی انسان کی محبت ذاتی میں ایک خارق عادت جوش بخشتی ہے اور ان دونوں محبتوں کے ملنے سے ایک فنا کی صورت پیدا ہو کر بقاء باللہ کا نور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بات کہ دونوں محبتوں کا باہم ملنا ضروری طور پر اس نتیجہ کو پیدا کرتا ہے کہ ایسے انسان کا انجام فنافی اللہ ہو اور خاکستر کی طرح یہ وجود ہو کر (جو حجاب ہے) ہر بر عشق الٰہی میں رُوح غرق ہو جائے۔ اس کی مثال وہ حالت ہے کہ جب انسان پر آسمان سے صاعقہ پڑتی ہے تو اُس آگ کی کشش سے انسان کے بدن کی اندرونی آگ یک دفعہ باہر آجاتی ہے تو اس کا نتیجہ جسمانی فنا ہوتا ہے پس دراصل یہ روحانی موت بھی اسی طرح دو قسم کی آگ کو چاہتی ہے ایک آسمانی آگ اور ایک اندرونی آگ اور دونوں کے ملنے سے وہ فنا پیدا ہو جاتی ہے جس کے بغیر سلوک تمام نہیں ہو سکتا یہی فنا وہ چیز ہے جس پر سالکوں کا سلوک ختم ہو جاتا ہے اور جو انسانی مجاہدات کی آخری حد ہے۔ اسی فنا کے بعد فضل اور موہبت کے طور پر مرتبہ بقا کا انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو یہ مرتبہ ملا انعام کے طور پر ملا یعنی محض فضل سے نہ کسی عمل کا اجر اور یہ عشق الٰہی کا آخری نتیجہ ہے جس سے ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے اور موت سے نجات ہوتی ہے (چشمہ مسیحی صفحہ ۴۱-۴۲)

نجات کے متعلق جو عقیدہ قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نجات نہ تو صوم سے ہے نہ صلوٰۃ سے نہ زکوٰۃ اور صدقات سے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے جس کو دعا حاصل کرتی ہے اسی لیے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعاء سب سے اوّل تعلیم فرمائی ہے۔ کیونکہ جب یہ دعاء قبول ہو جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتی ہے جس سے اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے کیونکہ جب انسان کی دعاء جو سچے دل اور خلوص نیت سے ہو قبول ہوتی ہے تو پھر نیکی اور اُس کے شرائط ساتھ خود ہی مرتب ہو جاتے ہیں۔

(الحکم ۱۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

قرآن شریف سے جو عقیدہ نجات کے بارے میں استنباط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نجات نہ تو صوم سے ہے نہ صلوٰۃ سے نہ زکوٰۃ اور نہ صدقات سے بلکہ محض دعا اور خدا کے فضل سے ہے اسی لیے خدا تعالیٰ نے دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ تعلیم فرمائی ہے کہ جب وہ قبول ہو کر خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرتی ہے اعمال صالحہ اس کے ساتھ شرائط ہیں مگر لوازم میں سے نہیں یعنی جب انسان کی دعا قبول ہوتی ہے تو اُس کے ساتھ تمام شرائط خود ہی مرتب ہوتی ہیں ورنہ اگر اعمال پر نجات کا مدار رکھا جائے تو یہ باریک شرک ہے اور اس سے ثابت ہوگا کہ انسان خود بخود نجات پا سکتا ہے کیونکہ اعمال تو انسان کے اختیاری امور ہیں اور انسان خود بخود اسے بجا لاتے ہیں ...... دعا جب تمام شرائط کے ساتھ ہوتی ہے تو وہ فضل کو جذب کرتی ہے اور فضل کے بعد شرائط خود بخود پورے ہوتے جاتے ہیں اسلامی نجات یہی ہے۔

(البدر ۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۲۷)

دنیا کے لیے جو دعا کی جاتی ہے وہ جہنم ہے۔ دعا صرف خدا کو راضی کرنے اور گناہوں سے بچنے کی ہونی چاہیئے باقی جتنی دعائیں ہیں وہ خود اس کے اندر آ جاتی ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ بڑی دعا ہے صراط مستقیم گویا خدا کو شناخت کرتا ہے اور اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کل گناہوں سے بچتا ہے اور صالحین میں داخل ہوتا ہے اگر ایک آدمی باخدا ہو تو سات پشت تک خدا تعالیٰ اس کی اولاد کی خبر گیری کرتا ہے.... دعا ایسی کرنی چاہیئے کہ نفس امّارہ گداز ہو کر نفس مطمئنہ کی طرف آ جاوے اگر وہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (جیسے کہ معنے مذکور ہوئے) طلب کرتا رہے گا تو دوسری جو اُسے ضرورتیں ہیں جن کے لیے وہ دعا چاہتا ہے وہ خدا خود پوری کر دے گا۔

(البدر ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اصل گناہ شرک ہے اور جو کوئی شرک سے یعنی مال اور رزق اور علم اور عقل اور اعمال اور نفس اور بُت اور شیطان اور دوسرے معبودوں سے بیزار ہو کر صرف خدا ہی کو اپنا خدا جانے اور اُس کے فضل کا منتظر رہے تو وہ بیشک رستگار

ہو کر جنت میں جائے گا۔ لیکن وہ آدمی کہ ان شرکوں میں سے کسی شرک میں گرفتار ہے تو زندان سقر میں محبوس ہوگا اور مکروہ لباس میں رہے گا یہاں تک کہ اس پر فضل ہو اب یہ مقام بڑا نازک اور نہایت دقیق اور لغزش کی جگہ ہے اور تھوڑے ہیں جو رستگار ہوتے ہیں اب سنیئے کہ جو جو مقامات واسطہ دفع اس شرک وارد ہیں اول سورہ فاتحہ میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور پرستش اور تقرب میں مدد بھی تجھ ہی سے مانگتے ہیں اس اعتقاد سے وہ سب شرک جاتے رہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ تو آپ ہم کو سیدھا راستہ بتلا صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اُن کا راستہ جن پر تیرا فضل ہوا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور بچا ہم کو اُن کے راستہ سے جن پر تیرا غضب ہے اور اُن سے جو راہ راست پر قائم نہیں رہے۔

(الحکم ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ الجزو نمبر ۱ یعنی اے باری تعالیٰ ہم پر وہ صراط مستقیم ظاہر کر جو تو نے اُن تمام اہل کمال لوگوں پر ظاہر کیا جن پر تیرا فضل اور کرم تھا چونکہ اہل کمال لوگوں کا صراط مستقیم یہی ہے کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت حقائق کو معلوم کرتے ہیں نہ اندھوں کی طرح پس اس دُعا کا ماحصل تو یہی ہوا کہ خداوندا وہ تمام علوم حقہ اور معارف صحیحہ اور اسرار عمیقہ اور حقائق دقیقہ جو دُنیا کے تمام اہل کمال لوگوں کو متفرق طور پر وقتاً فوقتاً تو عنایت کرتا رہا ہے اب وہ سب ہم میں جمع کر۔ سو دیکھئے کہ اس دُعا میں بھی علم اور حکمت ہی خدا سے چاہی ہے اور وہ علم مانگا ہے جو تمام دنیا میں متفرق تھا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۲۰-۴۲۲)

قانون قدرت میں قبولیت دعا کی نظیریں موجود ہیں اور ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ زندہ نمونے بھیجتا ہے اسی لیے اُس نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی دعا کی تعلیم فرمائی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا منشا اور قانون ہے اور کوئی نہیں جو اس کو بدل سکے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا سے پایا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال کو اکمل اور اتم کر۔ ان الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر تو اشارۃ النص کے طور پر اس سے دعا کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے کہ صراط مستقیم کی ہدایت مانگنے کی تعلیم ہے لیکن اس کے سر پر اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ بتا رہا ہے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں یعنی صراط مستقیم کے منازل کے لیے قویٰ سلیم سے کام لے کر استعانت الٰہی کو مانگنا چاہیئے پس ظاہری اسباب کی رعایت ضروری ہے جو اس کو چھوڑتا ہے وہ کافر نعمت ہے دیکھو! یہ زبان جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی اور عروق و اعصاب سے اس کو بنایا ہے اگر ایسی نہ ہوتی تو ہم بول نہ سکتے ایسی زبان دعا کے لیے عطا کی جو قلب کے خیالات اور ارادوں تک کو ظاہر کر سکے اگر ہم دعا کا

کام زبان سے کبھی نہ لیں تو ہماری شور بختی ہے۔ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں کہ اگر وہ زبان کو لگ جاویں تو وہ یک دفعہ ہی کام چھوڑ بیٹھتی ہے یہ رحیمیت ہے ایسا ہی قلب میں خشوع وخضوع کی حالت رکھی اور سوچنے اور تفکر کی قوتیں ودیعت کی ہیں پس یاد رکھو اگر ہم ان قوتوں اور طاقتوں کو معطل چھوڑ کر دعا کرتے ہیں تو یہ دُعا کچھ بھی مفید اور کارگر نہ ہوگی کیونکہ جب پہلے عطیہ سے کچھ کام نہیں لیا تو دوسرے سے کیا نفع اٹھائیں گے اس لیے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے پہلے اِیَّاکَ نَعْبُدُ بتا رہا ہے کہ ہم نے تیرے پہلے عطیوں اور قوتوں کو بیکار اور برباد نہیں کیا۔ یاد رکھو رحمانیت کا خاصہ یہی ہے کہ وہ رحیمیت سے فیض اُٹھانے کے قابل بنا دے اسی لیے خدا تعالیٰ نے جو اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] فرمایا یہ نری لفاظی نہیں ہے بلکہ انسانی شرف اسی کا متقاضی ہے مانگنا انسانی خاصہ ہے اور استجابت اللہ تعالیٰ کا جو نہیں مانتا وہ ظالم ہے...... اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا میں یہ مقصود ہے کہ ہمارے اعمال کو اکمل اور اتم کر اور پھر یہ کہہ کر کہ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اور بھی صراحت کردی کہ ہم اُس صراط کی ہدایت چاہتے ہیں جو منعم علیہ گروہ کی راہ ہے۔ اور مغضوب گروہ کی راہ سے بچا جن پر بد اعمالیوں کی وجہ سے عذاب الٰہی آگیا اور الضالین کہہ کر یہ دعا تعلیم کی کہ اس سے بھی محفوظ رکھ کہ تیری حمایت کے بدوں بھٹکتے پھریں۔ (الحکم ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱-۲)

یہ دعا اس واسطے سکھائی۔ کہ تا تم لوگ صرف اس بات پر ہی نہ بیٹھ رہو۔ کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ بلکہ اس طرح سے اعمال بجالاؤ کہ ان انعاموں کو حاصل کرسکو جو خدا کے مقرب بندوں پر ہوا کرتے ہیں بعض لوگ سجدوں میں بھی جاتے ہیں نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسرے ارکان اسلام بھی بجالاتے ہیں۔ مگر خدا کی نصرت اور مدد ان کے شامل حال نہیں ہوتی۔ اور ان کے اخلاق اور عادات میں کوئی نمایاں تبدیلی دکھائی نہیں دیتی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبادتیں بھی رسمی عبادتیں ہیں حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ احکام الٰہی کا بجالانا تو ایک بیج کی طرح ہوتا ہے جس کا اثر روح اور وجود دونوں پر پڑتا ہے ایک شخص جو کھیت کی آبپاشی کرتا اور بڑی محنت سے اس میں بیج بوتا ہے۔ اگر ایک دو ماہ تک اس میں انگوری نہ نکلے تو ماننا پڑتا ہے کہ بیج خراب ہے یہی حال عبادات کا ہے اگر ایک شخص خدا کو وحدہٗ لاشریک سمجھتا ہے نمازیں پڑھتا ہے روزے رکھتا ہے اور بظاہر نظر احکام الٰہی کو حتی الوسع بجالاتا ہے لیکن خدا کی طرف سے کوئی خاص مدد اس کے شامل حال نہیں ہوتی تو ماننا پڑتا ہے کہ جو بیج وہ بو رہا ہے وہی خراب ہے۔

(الحکم ۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

---

[1] المؤمن - ع - ۶ ۔

ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ فِیْ اٰیَةِ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اِشَارَةً عَظِیْمَةً اِلٰی تَزْکِیَةِ النُّفُوْسِ مِنْ دَقَآئِقِ الشِّرْكِ وَاسْتِیْصَالِ اَسْبَابِهَا وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ رَغَّبَ اللّٰهُ فِی الْاٰیَةِ فِیْ تَحْصِیْلِ کَمَالَاتِ الْاَنْبِیَآءِ وَاسْتِفْتَاحِ اَبْوَابِهَا فَاِنَّ اَکْثَرَ الشِّرْكِ قَدْ جَآءَ فِی الدُّنْیَا مِنْ بَابِ اِطْرَآءِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْاَوْلِیَآءِ وَاِنَّ الَّذِیْنَ حَسِبُوْا نَبِیَّهُمْ وَحِیْدًا فَرِیْدًا وَّ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ کَذَاتِ حَضْرَةِ الْکِبْرِیَآءِ فَکَانَ مَاٰلُ اَمْرِهِمْ اَنَّهُمْ اتَّخَذُوْهُ اِلٰهًا بَعْدَ مُدَّةٍ وَّهٰکَذَا فَسَدَتْ قُلُوْبُ النَّصَارٰی مِنَ الْاِطْرَآءِ وَالْاِعْتِدَآءِ فَاللّٰهُ یُشِیْرُ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ اِلٰی هٰذِهِ الْمَفْسَدَةِ وَالْغَوَایَةِ وَیُوْمِیُٔ اِلٰی اَنَّ الْمُنْعَمِیْنَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ وَالنَّبِیِّیْنَ وَالْمُحَدَّثِیْنَ اِنَّمَا یُبْعَثُوْنَ لِیَصْطَبِغَ النَّاسُ بِصِبْغِ تِلْكَ الْکِرَامِ لَا اَنْ یَّعْبُدُوْهُمْ وَیَتَّخِذُوْهُمْ اٰلِهَةً کَالْاَصْنَامِ فَالْغَرَضُ مِنْ اِرْسَالِ تِلْكَ النُّفُوْسِ الْمُهَذَّبَةِ ذَوِی الصِّفَاتِ الْمُطَهَّرَةِ اَنْ یَّکُوْنَ کُلُّ مُتَّبِعٍ قَرِیْعَ تِلْكَ الصِّفَاتِ لَا قَارِعَ الْجَبْهَةِ عَلٰی هٰذِهِ الصَّفَاةِ فَاَوْمَی اللّٰهُ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ لِاُولِی الْفَهْمِ وَالدِّرَایَةِ

ترجمہ: پھر جان لو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی آیت میں نفوس کو شرک کی باریک راہوں سے پاک کرنے اور ان راہوں کے اسباب کو مٹانے کی طرف عظیم اشارہ (پایا جاتا) ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے (لوگوں کو) اس آیت میں نبیوں کے کمالات کے حاصل کرنے اور ان (کمالات) کے دروازوں کو کھولے جانے کی اِستدعا کی ترغیب دی ہے کیونکہ زیادہ تر شرک نبیوں اور ولیوں کے متعلق غُلوّ کرنے کی وجہ سے دُنیا میں آیا ہے اور جن لوگوں نے اپنے نبی کو ایسا یکتا اور منفرد اور ایسا وحدہٗ لاشریک گمان کیا جیسے ذات رب العزت ہے اُن کا آل کار یہ ہُوا کہ اُنہوں نے کچھ مدّت کے بعد اُسی نبی کو معبود بنا لیا۔ اسی طرح (حضرت عیسیٰؑ کی تعریف میں) مبالغہ آرائی کرنے اور (حد سے) بڑھنے کی وجہ سے عیسائیوں کے دل بگڑ گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی فساد اور گمراہی کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور اس طرف بھی اشارہ فرماتا ہے کہ (اللہ تعالیٰ سے) انعام پانے والے لوگ یعنی رسول، نبی اور محدّث اس لیے مبعوث کیے جاتے ہیں کہ لوگ ان بزرگ ہستیوں کے رنگ میں رنگین ہوں، نہ اس لیے کہ وہ اُن کی عبادت کرنے لگیں اور اُنہیں بتوں کی طرح معبود بنا لیں۔ پس ان بااخلاق پاکیزہ صفات والی ہستیوں کو دنیا میں بھیجنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ (ان کا) ہر متّبع ان صفات سے متّصف ہو نہ یہ کہ اُنہیں کو پتھر کا بُت بنا کر اُس پر ماتھا رگڑنے والا ہو۔ پس

إِلٰى أَنَّ كَمَالَاتِ النَّبِيِّيْنَ لَيْسَتْ كَكَمَالَاتِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ - وَأَنَّ اللّٰهَ أَحَدٌ صَمَدٌ وَّحِيْدٌ لَّا شَرِيْكَ لَهٗ فِيْ ذَاتِهٖ وَلَا فِيْ صِفَاتِهٖ وَأَمَّا الْأَنْبِيَآءُ فَلَيْسُوْا كَذَالِكَ بَلْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ وَارِثِيْنَ مِنَ الْمُتَّبِعِيْنَ الصَّادِقِيْنَ فَأُمَّتُهُمْ وُرَثَآؤُهُمْ يَجِدُوْنَ مَا وَجَدَ أَنْبِيَآءُهُمْ إِنْ كَانُوْا لَهُمْ مُّتَّبِعِيْنَ وَإِلٰى هٰذَا أَشَارَ فِيْ قَوْلِهٖ عَزَّ وَجَلَّ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[1] فَانْظُرْ كَيْفَ جَعَلَ الْأُمَّةَ أَحِبَّآءَ اللّٰهِ بِشَرْطِ اتِّبَاعِهِمْ وَاقْتِدَآءِهِمْ بِسَيِّدِ الْمَحْبُوْبِيْنَ وَتَدُلُّ أٰيَةُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ أَنَّ تُرَاثَ السَّابِقِيْنَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ حَقٌّ وَّاجِبٌ غَيْرُ مَجْذُوْذٍ وَّ مَفْرُوْضٌ لِّلَاحِقِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ الصَّالِحِيْنَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ - وَهُمْ يَرِثُوْنَ الْأَنْبِيَآءَ وَيَجِدُوْنَ مَا وَجَدُوْا مِنْ إِنْعَامَاتِ اللّٰهِ - وَهٰذَا هُوَ الْحَقُّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ -

---

اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں سمجھ بُوجھ اور عقل رکھنے والوں کو اشارہ فرمایا ہے کہ نبیوں کے کمالات پروردگارِ عالم کے کمالات کی طرح نہیں ہوتے - اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا، بے نیاز اور یگانہ ہے ۔ اُس کی ذات اور صفات میں اُس کا کوئی شریک نہیں ۔ لیکن نبی ایسے نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ اُن کے سچے مُتّبعین میں سے اُن کے وارث بناتا ہے پس اُن کی اُمّت اُن کی وارث ہوتی ہے - وہ سب کچھ پاتے ہیں جو اُن کے نبیوں کو ملا ہو بشرطیکہ وہ اُن کے پُورے پُورے مُتّبع ہوں - اور اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے آیت قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[2] میں اشارہ فرمایا ہے - پس دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے افرادِ اُمّت کو اپنے محبوب قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ محبُوبوں کے سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں اور آپ کے نمونہ پر چلیں -

پھر آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ پہلے مُرسلوں اور صدیقوں کی وراثت ایک لازمی اور نہ ختم ہونے والا حق ہے اور بعد میں آنے والے نیکوکار مومنوں کے لیے قیامت تک اِس ورثہ کا ملنا ضروری ہے پس وہ نبیوں کے وارث بنتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وہ سب انعامات پاتے ہیں جو نبیوں نے پائے اور یہی حق بات ہے ۔ پس تُو شک کرنے والوں میں (شامل) نہ ہو -

---

[1] سورہ اٰلِ عِمْرَان ع ۴ ۔ [2] ترجمہ : تو کہہ کہ (اے لوگو!) اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو (اس صورت میں) وہ (بھی) تم سے محبت کریگا ۔

وَ اَمَّا سِرُّ ذَالِكَ التَّوَارُثِ وَلِمِّيَّةِ الْمُوَرِّثِ وَالْوَارِثِ فَتَنْكَشِفُ مِنْ تِلْكَ الْاٰيَةِ الَّتِيْ تُعَلِّمُ التَّوْحِيْدَ وَتُعَظِّمُ الرَّبَّ الْوَحِيْدَ - فَاِنَّ اللّٰهَ الْمُعِيْنَ وَاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اِذَا عَلَّمَ دَقَائِقَ التَّوْحِيْدِ وَبَالَغَ فِي التَّلْقِيْنِ وَقَالَ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ فَاَرَادَ عِنْدَ هٰذَا التَّعْلِيْمِ وَالتَّفْهِيْمِ اَنْ يَّقْطَعَ عُرُوْقَ الشِّرْكِ كُلَّهَا فَضْلًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَرَحْمَةً مِّنْهُ عَلٰى اُمَّةِ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ لِيُنَجِّيَ هٰذِهِ الْاُمَّةَ مِنْ اٰفَاتٍ وَّرَدَتْ عَلَى الْمُتَقَدِّمِيْنَ فَعَلَّمَنَا دُعَآءً مَّبَرَّةً وَّعَطَآءً وَّ جَعَلَنَا مِنْهُ مِنَ الْمُسْتَخْلَصِيْنَ - فَنَحْنُ نَدْعُوْ بِتَعْلِيْمِهٖ وَنَطْلُبُ مِنْهُ بِتَفْهِيْمِهٖ فَرِحِيْنَ بِرِفْدِهٖ مُفْصِحِيْنَ بِحَمْدِهٖ قَائِلِيْنَ "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" وَنَحْنُ نَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا فِيْ هٰذَا الدُّعَآءِ كُلَّ مَا اُعْطِيَ لِلْاَنْبِيَآءِ مِنَ النَّعْمَآءِ وَنَسْئَلُهٗ اَنْ نَّثْبُتَ كَالْاَنْبِيَآءِ عَلَى الصِّرَاطِ وَنَتَجَافٰى عَنِ الْاِشْتِطَاطِ وَنَدْخُلَ مَعَهُمْ فِيْ مَرْبَعِ حَظِيْرَةِ الْقُدْسِ مُتَطَهِّرِيْنَ مِنْ كُلِّ اَنْوَاعِ الرِّجْسِ وَمُبَادِرِيْنَ اِلٰى ذِي رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فَلَا

اس توارث کا راز اور مُورث اور وارث بننے کا اصل سبب اِس آیت سے منکشف ہوتا ہے جو توحید سکھاتی اور اس واحد و لاشریک پروردگار کی عظمت بیان کرتی ہے کیونکہ پوری مدد کرنے والے اور سب سے زیادہ رحم کرنے والے خدا نے جب توحید کی باریک راہیں سکھائیں اور اُن کی خوب تلقین کی اور فرمایا اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو اس تعلیم و تفہیم سے اُس نے یہ ارادہ فرمایا کہ اپنے خاص فضل سے اور خاتم النّبیین کی اُمت پر اپنی خاص رحمت فرماتے ہوئے شرک کی تمام رگیں کاٹ دے تا اِس اُمت کو اُن آفات سے نجات دے جو پہلوں پر وارد ہوئی تھیں۔ پس اُس نے بطور اپنے کرم اور احسان کے ہمیں ایک دعا سکھائی اور اس کے ذریعہ ہمیں (اپنے) برگزیدہ بندوں میں شامل کر لیا۔ پس ہم اُس کے سکھانے کے مطابق دعا مانگتے ہیں اور اس کے سمجھانے کے مطابق اُس سے طلب کرتے ہیں۔ اس حالت میں کہ ہم اُس کے انعام پر بہت خوش ہیں اور اُس کی حمد بیان کرتے ہوئے اِن الفاظ میں دعاء کرتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اور ہم اس دعاء میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے وہ تمام نعمتیں مانگتے ہیں جو نبیوں کو دی گئی تھیں اور اُس سے ہم یہ بھی مانگتے ہیں کہ ہم نبیوں کی طرح صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہیں اور اس راہ سے دُور نہ ہوں۔ اور ہر قسم کی ناپاکی اور پلیدی سے پاک ہو کر اور پروردگارِ عالم کی بارگاہ کی طرف جلدی کرتے ہوئے ان (نبیوں) کے ساتھ ہی حظیرۃ القدس کی منزل میں داخل ہو جائیں

يَخْفٰى اَنَّ اللّٰهَ جَعَلَنَا فِى هٰذَا الدُّعَآءِ كَاَظْلَالٍ لِّلْاَنْبِيَآءِ وَاَوْرَثَنَا وَاَعْطَانَا الْمَعْلُوْمَ وَالْمَكْتُوْمَ وَالْمَعْكُوْمَ وَالْمَخْتُوْمَ وَمِنْ كُلِّ الْاٰلَآءِ وَالنَّعْمَآءِ فَاحْتَمَلْنَا مِنْهَا وِقْرَنَا وَرَجَعْنَا بِمَا يَسُدُّ فَقْرَنَا وَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاُحْلِلْنَا مَحَلَّ الْفَآئِزِيْنَ۔ وَهٰذَا هُوَ سِرُّ اِرْسَالِ الْاَنْبِيَآءِ وَبَعْثِ الْمُرْسَلِيْنَ وَالْاَصْفِيَآءِ وَ لِنَصْطَبِغَ بِصِبْغِ الْكِرَامِ وَنَنْتَظِمَ فِى سِلْكِ الْاِلْتِيَامِ وَنَرِثَ الْاَوَّلِيْنَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ الْمُنْعَمِيْنَ۔

وَمَعَ ذٰلِكَ قَدْجَرَتْ سُنَّةُ اللّٰهِ اَنَّهٗ اِذَا اَعْطٰى عَبْدًا كَمَالًا وَّطَفِقَ الْجُهَّالُ يَعْبُدُوْنَهٗ ضَلَالًا وَّيُشْرِكُوْنَهٗ بِالرَّبِّ الْكَرِيْمِ عِزَّةً وَّجَلَالًا بَلْ يَحْسَبُوْنَهٗ رَبًّا فَعَّالًا فَيَخْلُقُ اللّٰهُ مِثْلَهٗ وَيُسَمِّيْهِ بِتَسْمِيَتِهٖ وَيَضَعُ كَمَالَاتِهٖ فِى فِطْرَتِهٖ وَ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ لِغَيْرَتِهٖ لِيُبْطِلَ مَا خَطَرَ فِى قُلُوْبِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ وَ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ مِّنَ الْمَسْئُوْلِيْنَ۔ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ كَالدَّرِّ السَّآئِغِ لِلْاِغْتِذَآءِ اَوْ كَالدُّرَّةِ الْبَيْضَآءِ فِى اللَّمَعَانِ وَالصَّفَآءِ وَيَسُوْقُ اِلَيْهِ شِرْبًا مِّنَ

پس یہ بات مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دُعاء میں ہمیں نبیوں کے اظلال قرار دیا ہے اور ہمیں تمام ظاہر اور مخفی اور بندھی ہوئی اور مُہر کی ہوئی غرض ہر قسم کی برکتیں اور نعمتیں عطا کی ہیں جن میں سے ہم نے اپنے مقدور بھر اٹھا لی ہیں۔ اور اُتنی لے آئے ہیں جو ہماری احتیاج کو دُور کر سکیں اور وادیاں (اپنی) اپنی گنجائش کے مطابق بہ نکلیں (یعنی جتنے انعام کسی کے ظرف میں سما سکتے تھے وہ اُسے مل گئے) پس ہم کامیاب و کامران لوگوں کے مقام اور مرتبہ پر اُتارے گئے۔ نبیوں کے بھیجنے اور رسولوں اور برگزیدہ لوگوں کی بعثت کا یہی راز ہے کہ ہم اُن بزرگ لوگوں کے رنگ میں رنگین ہو جائیں اور اُن کے ساتھ اتحاد کی لڑی میں پروئے جائیں اور پہلے انعام یافتہ لوگوں اور مقربان دربار گاہ اُلوہیت) کے وارث بن جائیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت رہی ہے کہ جب وہ اپنے کسی بندہ کو کوئی کمال عطا کرتا ہے اور جاہل لوگ اپنی گمراہی کی وجہ سے اس کی عبادت کرنے لگ جاتے ہیں اور اُسے عزّت و جلال میں رب کریم کا شریک قرار دیتے ہیں بلکہ اُسے ربّ فعّال خیال کرنے لگ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا کوئی مثیل پیدا کر دیتا ہے اور اُس کا وہی نام رکھ دیتا ہے اور اُس کے کمالات بھی اُس (مثیل) کی فطرت میں رکھ دیتا ہے اور وہ اپنی غیرت کی بنا پر ایسا کرتا ہے تا مشرکوں کے دلوں میں جو خیالات پیدا ہوئے انھیں غلط ثابت کر دے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو وہ کرتا ہے اُس کے متعلق وہ جواب دِہ نہیں ہوتا حالانکہ دوسرے لوگ جواب دِہ ہوتے ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے غذا کے لیے خوشگوار دودھ کی مانند بنا دیتا ہے اور

التَّسْنِيْمِ وَيُضَمِّخُهُ بِالطِّيْبِ الْعَمِيْمِ حَتّٰى يُسْفِرَ عَنْ مَرْأًى وَسِيْمٍ وَّاَرَجٍ نَّسِيْمٍ لِّلنَّاظِرِيْنَ۔ فَالْحَاصِلُ اَنَّهٗ تَعَالٰى اَشَارَ فِيْ هٰذَا الدُّعَآءِ لِطُلَّابِ الرَّشَادِ اِلٰى رَحْمَتِهِ الْعَآمَّةِ وَالْوِدَادِ فَكَاَنَّهٗ قَالَ اِنِّيْ رَحِيْمٌ وَّسِعَتْ رَحْمَتِيْ كُلَّ شَيْءٍ اَجْعَلُ بَعْضَ الْعِبَادِ وَارِثًا لِّبَعْضٍ مِّنَ التَّفَضُّلِ وَالْعَطَآءِ لِاَسُدَّ بَابَ الشِّرْكِ الَّذِيْ يَشِيْعُ مِنْ تَخْصِيْصِ الْكَمَالَاتِ بِبَعْضِ اَفْرَادٍ مِّنَ الْاَصْفِيَآءِ فَهٰذَا هُوَ سِرُّ هٰذَا الدُّعَآءِ كَاَنَّهٗ يُبَشِّرُ النَّاسَ بِفَيْضٍ عَامٍّ وَّعَطَآءٍ شَامِلٍ لِّلْاَنَامِ وَّيَقُوْلُ اِنِّيْ فَيَّاضٌ وَّرَبُّ الْعَالَمِيْنَ وَلَسْتُ كَبَخِيْلٍ وَّضَنِيْنٍ۔ فَاذْكُرُوْا بَيْتَ فَيْضِيْ وَمَا ثَمَّ فَاِنَّ فَيْضِيْ قَدْ عَمَّ وَتَمَّ وَاِنَّ صِرَاطِيْ صِرَاطٌ قَدْ سُوِّيَ وَمُدَّ لِكُلِّ مَنْ نَّهَضَ وَاعْتَدَّ وَاسْتَعَدَّ وَطَلَبَ كَالْمُجَاهِدِيْنَ وَهٰذِهٖ نُكْتَةٌ عَظِيْمَةٌ فِيْ اٰيَةِ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ وَهِيَ اِزَالَةُ الشِّرْكِ وَسَدُّ اَبْوَابِهٖ فَالسَّلَامُ عَلٰى قَوْمٍ اسْتَخْلَصُوْا مِنْ هٰذَا الشِّرْكِ وَعَلٰى مَنْ لَّدَيْهِمْ وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ مِّنَ الطَّالِبِيْنَ الصَّادِقِيْنَ ۞ (کرامات الصادقین صفحہ ۸۹ تا ۹۱)

جسے چاہے چمک اور صفائی میں روشن موتی کی طرح بنا دیتا ہے اور اُس تک تسنیم کا پانی پہنچا دیتا ہے۔ اُسے عطرِ عمیم کی خوشبو سے ممسوح کر دیتا ہے یہاں تک کہ دیکھنے والوں کے لیے اُس کے خوبصورت چہرہ اور خوشبو سے پردہ اُٹھا دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس دُعا میں طالبانِ ہدایت کے لیے اپنی عام رحمت اور محبت کی طرف اشارہ فرمایا ہے گویا کہ اس نے یُوں کہا ہے کہ مَیں رحیم ہوں اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے میں بعض بندوں کا بعض کو ازراہِ فضل وعطا وارث بناتا ہوں تاکہ مَیں اُس شرک کا دروازہ بند کردوں جو بعض برگزیدوں کے ساتھ بعض کمالات کے مخصوص کیے جانے کی وجہ سے پھیل سکتا ہے پس یہ ہے رازِ اس دُعا کا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک عام فیض اور ہمہ گیر بخشش کی بشارت دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ مَیں فیّاض ہُوں اور پروردگارِ عالم ہوں اور مَیں بخیل اور کنجوس نہیں ہوں پس تم میرے فیض کے گھر کو اور جو کچھ وہاں ہے یاد کرو کیونکہ میرا فیض عام بھی ہے اور مفید بھی۔ اور میرا رستہ وہ راستہ ہے جو ہموار اور کشادہ کیا گیا ہے ہر اُس شخص کے لیے جو اُٹھے، توجہ کرے اور تیار ہو جائے اور مجاہدوں کی طرح تلاش کرنے لگے۔ آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں یہی عظیم نکتہ ہے یعنی شرک کا ازالہ اور اُس کے دروازوں کو بند کرنا پس سلامتی ہو اُن لوگوں پر جو اِس شرک سے خلاصی پا گئے اور اُن پر بھی جو اُن کے ساتھی ہیں اور اُن پر بھی جو طالبوں اور صادقوں میں سے ان کے متبع بن گئے ہیں۔

سورہ فاتحہ میں ..... مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ دعا میں مشغول رہیں۔ بلکہ دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سکھلائی گئی ہے اور فرض کیا گیا ہے کہ پنج وقت یہ دُعا کریں۔ پھر کس قدر غلطی ہے کہ کوئی شخص دُعا کی روحانیت سے انکار کرے۔ قرآن شریف نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ دعا اپنے اندر ایک روحانیت رکھتی ہے اور دعا سے ایک فیض نازل ہوتا ہے جو طرح طرح کے پیرایوں میں کامیابی کا ثمرہ بخشتا ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۳۰)

یہ دُعا نوعِ انسان کی عام ہمدردی کے لیے ہے کیونکہ دعا کرنے میں تمام نوعِ انسان کو شامل کر لیا ہے اور سب کے لیے دُعا مانگی ہے کہ خدا دنیا کے دکھوں سے انہیں بچاوے اور آخرت کے ٹوٹے سے محفوظ رکھے اور سب کو سیدھی راہ پر لاوے۔ (ایام الصلح صفحہ ۳۰ حاشیہ)

انجیل میں ایک اور نقص یہ ہے کہ اُس نے یہ تعلیم کسی جگہ نہیں دی کہ عبادت کرتے وقت اعلیٰ طریق عبادت یہی ہے کہ اغراض نفسانیہ کو درمیان سے اٹھا دیا جاوے بلکہ اگر کچھ سکھلایا تو صرف روٹی مانگنے کے لیے دعا سکھلائی قرآن شریف نے تو ہمیں یہ دعا سکھلائی کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی ہمیں اُس راہ پر قائم کر جو نبیوں اور صدیقوں کی اور عاشقان الٰہی کی راہ ہے۔ مگر انجیل یہ سکھلاتی ہے کہ ہماری روزینہ کی روٹی آج ہمیں بخش۔ ہم نے تمام انجیل پڑھ کر دیکھی اُس میں اس اعلیٰ تعلیم کا نام ونشان نہیں ہے۔

(نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۴۳)

یہ بھی یاد رہے کہ سورۃ فاتحہ کے عظیم الشان مقاصد میں سے یہ دعا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ اور جس طرح انجیل کی دعا میں روٹی مانگی گئی ہے اس دعا میں خدا تعالیٰ سے وہ تمام نعمتیں مانگی گئی ہیں جو پہلے رسولوں اور نبیوں کو دی گئی تھیں یہ مقابلہ بھی قابل نظارہ ہے اور جس طرح حضرت مسیح کی دعا قبول ہو کر عیسائیوں کو روٹی کا سامان بہت کچھ مل گیا ہے اسی طرح یہ قرآنی دعا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے قبول ہو کر اخیار و ابرار مسلمان بالخصوص ان کے کامل فرد انبیاء بنی اسرائیل کے وارث ٹھہرائے گئے اور دراصل مسیح موعود کا اس امت میں سے پیدا ہونا یہ بھی اسی دعا کی قبولیت کا نتیجہ ہے کیونکہ گو مخفی طور پر بہت سے اخیار و ابرار نے انبیاء بنی اسرائیل کی مماثلت کا حصہ لیا ہے مگر اس امت کا مسیح موعود کھلے کھلے طور پر خدا کے حکم اور اذن سے اسرائیلی مسیح کے مقابل کھڑا کیا گیا ہے تا موسوی اور محمدی سلسلہ کی مماثلت سمجھ آجائے۔

(کشتی نوح صفحہ ۴۹)

سورۃ فاتحہ میں اس قدر حقائق و دقائق و معارف جمع ہیں کہ اگر ان سب کو لکھا جاوے تو وہ باتیں ایک دفتر

میں بھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ اسی ایک حکیمانہ دعا کو دیکھئے کہ جو اس سورہ میں سکھلائی گئی ہے یعنی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ
یہ دعا ایک ایسا مفہوم کلّی اپنے اندر رکھتی ہے جو تمام دین اور دنیا کے مقاصد کی یہی ایک کنجی ہے ہم کسی چیز کی حقیقت
پر اطلاع نہیں پا سکتے اور نہ اُس کے فوائد سے منتفع ہو سکتے ہیں جب تک کہ ہمیں اس کے پانے کے لیے ایک
مستقیم راہ نہ ملے دنیا کے جس قدر مشکل اور پیچیدہ امور ہیں۔ خواہ وہ سلطنت اور وزارت کی ذمہ داریوں کے
متعلق ہوں اور خواہ سپہ گری اور جنگ وجدال سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ طبعی اور ہیئت کے دقیق مسائل
کے متعلق ہوں اور خواہ صناعت طِبّ کے طریق تشخیص اور علاج کے متعلق اور خواہ تجارت اور زراعت کے
متعلق ان تمام امور میں کامیابی ہونا مشکل اور غیر ممکن ہے جب تک کہ ان کے بارہ میں ایک مستقیم راہ نہ ملے کہ کس
طور سے اس کام کو شروع کرنا چاہیئے اور ہر ایک عقلمند انسان مشکلات کے وقت میں یہی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ
اس مشکل سربستہ کے بارے میں ایک لمبے وقت تک رات کو اور دن کو سوچتا رہے تا ہو کہ اس مشکل کشائی کے لیے
کوئی راہ نکل آوے اور ہر ایک صنعت اور ہر ایک ایجاد اور ہر ایک پیچیدہ اور الجھے ہوئے کام کو چلانا اس بات کو
چاہتا ہے کہ اُس کام کے لیے راہ نکل آوے پس دنیا اور دین کی اغراض کے لیے اصل دعا راہ نکالنے کی دعا ہے
جب سیدھی راہ کسی امر کے متعلق ہاتھ میں آجائے تو یقیناً وہ امر بھی خدا کے فضل سے حاصل ہو جاتا ہے خدا کی قدرت
اور حکمت نے ہر ایک مدعا کے حصول کے لیے ایک راہ رکھی ہے مثلاً کسی بیمار کا ٹھیک ٹھیک علاج نہیں ہو سکتا
جب تک اُس مرض کی حقیقت سمجھنے اور نسخہ کے تجویز کے لیے ایک ایسی راہ نہ نکل آوے کہ دل فتویٰ دیدے کہ
اس راہ میں کامیابی ہو گی بلکہ کوئی انتظام دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا جب تک اس انتظام کے لیے ایک راہ پیدا نہ ہو پس
راہ کا طلب کرنا طالب مقصد کا فرض ہوا اور جیسا کہ دنیا کی کامیابی کا صحیح سلسلہ ہاتھ میں لینے کے لیے پہلے ایک راہ کی
ضرورت ہے جس پر قدم رکھا جائے ایسا ہی خدا کا دوست اور مورد محبت اور فضل بننے کے لیے قدیم سے ایک
راہ کی ضرورت پائی گئی ہے اِسی لیے دوسری سورۃ میں جو سورۃ البقر ہے جو اس سورۃ کے بعد ہے سورۃ کے
شروع میں ہی فرمایا گیا ہے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی انعام پانے کی یہ راہ ہے جو ہم بیان کرتے ہیں [1]

(کشتی نوح صفحہ ۵۴-۵۵)

یہ دعا یعنی دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ایک جامع دعا ہے کہ جو انسان کو اس بات کی طرف متوجہ
کرتی ہے کہ مشکلات دینی اور دنیوی کے وقت میں اول جس چیز کی تلاش انسان کا فرض ہے وہ یہی ہے کہ اس امر کے
حصول کے لیے وہ صراط مستقیم تلاش کرے یعنی کوئی ایسی صاف اور سیدھی راہ ڈھونڈے جس سے بآسانی اس

[1] سورۃ فاتحہ میں راہ راست کے لیے دعا کی گئی اور دوسری سورت میں گویا وہ دعا قبول ہو کر راہ راست بتلائی گئی۔
منہ

مطلب تک پہنچ سکے۔ اور دل یقین سے بھر جائے شکوک سے نجات ہو لیکن انجیل کی ہدایت کے موافق روٹی مانگنے والا خدا جوئی کی راہ اختیار نہ کرے گا اُس کا مقصد تو روٹی ہے جب روٹی مل گئی تو پھر اس کو خدا سے کیا غرض یہی وجہ ہے کہ عیسائی صراط مستقیم سے گر گئے اور ایک نہایت قابل شرم عقیدہ جو انسان کو خدا بنانا ہے ان کے گلے پڑ گیا۔

(کشتی نوح صفحہ ۵۵-۵۶)

اسلام وہ مذہب ہے جس کے سچے پیروؤں کو خدا تعالیٰ نے تمام گذشتہ راست بازوں کا وارث ٹھہرایا ہے اور ان کی متفرق نعمتیں اس امت مرحومہ کو عطا کر دی ہیں۔ اور اُس نے اس دعا کو قبول کر لیا ہے جو قرآن شریف میں آپ سکھلائی تھی اور وہ یہ ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۔ ہمیں وہ راہ دکھلا۔ جو اُن راست بازوں کی راہ ہے۔ جن پر تو نے ہر ایک انعام اکرام کیا ہے۔ یعنی جنہوں نے تجھ سے ہر ایک قسم کی برکتیں پائی ہیں اور تیرے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف ہوئے ہیں اور تجھ سے دعاؤں کی قبولیتیں حاصل کی ہیں۔ اور تیری نصرت اور مدد اور راہ نمائی ان کے شامل حال ہوئی ہے اور ان لوگوں کی راہوں سے ہمیں بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو تیری راہ کو چھوڑ کر اور راہوں کی طرف چلے گئے ہیں۔ یہ وہ دعا ہے جو نماز میں پانچ وقت پڑھی جاتی ہے اور یہ بتلا رہی ہے کہ اندھا ہونے کی حالت میں دنیا کی زندگی بھی ایک جہنم ہے اور پھر مرنا بھی ایک جہنم ہے اور در حقیقت خدا کا سچا تابع اور واقعی نجات پانے والا وہی ہو سکتا ہے جو خدا کو پہچان لے اور اُس کی ہستی پر کامل ایمان لے آوے اور وہی ہے جو گناہ کو چھوڑ سکتا ہے اور خدا کی محبت میں محو ہو سکتا ہے۔

(لیکچر لاہور صفحہ ۱۵-۱۶)

اللہ تعالیٰ نے جو یہ دعا[1] سکھائی ہے تو اس طور پر نہیں کہ دعا تو سکھا دی لیکن سامان کچھ نہیں۔ بلکہ جہاں دعا سکھائی ہے وہاں سب کچھ موجود ہے چنانچہ اگلی سورت میں اس قبولیت کا اشارہ ہے جہاں فرمایا ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ[2]۔ یہ ایسی دعوت ہے کہ دعوت کا سامان پہلے سے طیار رہے۔

(الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

قرآن شریف کو جہاں سے شروع کیا ہے ان ترقیوں کا وعدہ کر لیا ہے جو بالطبع روح تقاضا کرتی ہے چنانچہ سورۃ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تعلیم کی۔ اور فرمایا کہ تم یہ دعا کرو کہ اے اللہ ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت فرما وہ صراط مستقیم جو ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرے انعام و اکرام ہوئے۔ اس دعا کے ساتھ ہی سورۃ البقر کی پہلی ہی آیت میں یہ بشارت دیدی ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ گویا روحیں دعا کرتی ہیں اور ساتھ ہی قبولیت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اور وہ وعدہ دعا کی قبولیت کا قرآن مجید کے نزول کی صورت

---

[1] اہدنا الصراط المستقیم۔ [2] البقرۃ ع ۱۔

میں پورا ہوتا ہے۔ایک طرف دعا ہے اور دوسری طرف اس کا نتیجہ موجود ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے جو اس نے فرمایا۔ (الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

هٰذَا الدُّعَآءُ رَدٌّ عَلٰى قَوْلِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ الْقَلَمَ قَدْ جَفَّ بِمَا هُوَ كَآئِنٌ فَلَا فَائِدَةَ فِي الدُّعَآءِ فَاللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يُبَشِّرُ عِبَادَهٗ بِقُبُوْلِ الدُّعَآءِ فَكَاَنَّهٗ يَقُوْلُ يَا عِبَادِ "اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ"۔ وَاِنَّ فِي الدُّعَآءِ تَاثِيْرَاتٍ وَّ تَبْدِيْلَاتٍ وَّالدُّعَآءُ الْمَقْبُوْلُ يُدْخِلُ الدَّاعِيَ فِي الْمُنْعَمِيْنَ وَفِي الْاٰيَةِ اِشَارَةٌ اِلٰى عَلَامَاتٍ تُعْرَفُ بِهَا قُبُوْلِيَّةُ الدُّعَآءِ عَلٰى طَرِيْقِ الْاِصْطِفَآءِ وَاِيْمَآءٌ اِلٰى اٰثَارِ الْمُقْبِلِيْنَ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ اِذَا اَحَبَّ الرَّحْمٰنَ وَقَوَّى الْاِيْمَانَ فَذَالِكَ الْاِنْسَانُ وَاِنْ كَانَ عَلٰى حُسْنِ اعْتِقَادٍ فِيْ اَمْرِ اسْتِجَابَةِ دَعَوَاتِهٖ وَلٰكِنَّ الْاِعْتِقَادَ لَيْسَ كَعَيْنِ الْيَقِيْنِ وَلَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ وَلَا يَسْتَوِيْ حَالُ اُولِي الْاَبْصَارِ وَالْعَمِيْنَ ؕ

بَلْ مَنْ يَّدَّرَّبُ بِاسْتِجَابَةِ الدَّعَوَاتِ حَقَّ التَّدَرُّبِ وَكَانَ مَعَهٗ اَثَرٌ مِّنَ الْمُشَاهَدَاتِ فَلَا يَبْقٰى لَهٗ شَكٌّ وَّلَا رَيْبٌ فِيْ قُبُوْلِيَّةِ الْاَدْعِيَةِ وَالَّذِيْنَ يَشُكُّوْنَ

ترجمہ۔یہ دعا اُن لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونے والا ہے اُس پر قلم خشک ہو چکا ہے پس اب دعا کا کوئی فائدہ نہیں۔سو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں کو قبولیتِ دُعا کی بشارت دیتا ہے۔گویا وہ کہتا ہے کہ اے میرے بندو! تم مجھ سے دعا کرو۔مَیں تمہاری دعا قبول کروں گا۔اور دعا میں یقیناً تاثیریں اور (قضاء و قدر کو) بدلنے کی طاقتیں ہیں اور مقبول دُعا ، دعا کرنے والے کو انعام یافتہ گروہ میں داخل کر دیتی ہے۔

اِس آیت میں اُن علامتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے اِصطفاء کے طریق پر قبولیتِ دُعا کی شناخت ہوتی ہے اور اس میں مقرّبین کے آثار کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ جب انسان خدائے رحمان سے محبت کرتا ہے اور اپنے ایمان کو پختہ کر لیتا ہے تو وہی حقیقی انسان ہوتا ہے اور اگرچہ اُسے اپنی دُعاؤں کی قبولیت کے بارہ میں پہلے بھی حُسنِ اعتقاد ہو لیکن صرف اعتقاد عَینُ الیقین کی طرح نہیں ہو سکتا کیونکہ سُنی سُنائی بات مشاہدہ کی طرح نہیں ہوتی اور آنکھیں رکھنے والوں اور اندھوں کی حالت یکساں نہیں ہوتی ، بلکہ جس شخص کو دُعاؤں کی قبولیت کا پورا تجربہ ہو اور اس کے ساتھ ہی مشاہدات بھی ہو چکے ہوں ایسے شخص کو دُعاؤں کی قبولیت میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ سکتا

فِيهَا فَسَبَبُهٗ حِرْمَانُهُمْ مِّنْ ذَالِكَ الْحَظِّ ثُمَّ قِلَّةُ الْتِفَاتِهِمْ اِلٰى رَبِّهِمْ وَ ابْتِلَاءُ هُمْ بِسِلْسِلَةِ اَسْبَابٍ تُوْجَدُ فِيْ وَاقِعَاتِ الْفِطْرَةِ وَظُهُوْرَاتِ الْقُدْرَةِ فَمَا تَرَقَّتْ اَعْيُنُهُمْ فَوْقَ الْاَسْبَابِ الْمَادِّيَّةِ الْمَوْجُوْدَةِ اَمَامَ الْاَعْيُنِ فَاسْتَبْعَدُوْا مَا لَمْ تُحِطْ بِهَآ اٰرَآءُ هُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۞ (كرامات الصادقين صفحہ ۸۰)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں آج کل کے مولویوں کا رد ہے جو یہ مانتے ہیں کہ سب روحانی فیوض اور برکات ختم ہوگئے ہیں اور کسی کی محنت اور مجاہدہ کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا اور اُن برکات اور ثمرات سے حصہ نہیں ملتا جو پہلے منعم علیہ گروہ کو ملتا ہے۔ یہ لوگ قرآن کریم کے فیوض کو اب گویا بے اثر مانتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرات قدسی کے قائل نہیں۔ کیونکہ اگر اب ایک بھی آدمی اس قسم کا نہیں ہو سکتا جو منعم علیہ گروہ کے رنگ میں رنگین ہو سکے تو پھر اس دعاء کے مانگنے سے فائدہ کیا ہوا؟ مگر نہیں یہ ان لوگوں کی غلطی اور سخت غلطی ہے جو ایسا یقین کر بیٹھے ہیں خدا تعالیٰ کے فیوض اور برکات کا دروازہ اب بھی اُسی طرح کھُلا ہے لیکن وہ سارے فیوض اور برکات محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے ملتے ہیں اور اگر کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے بغیر یہ دعویٰ کرے کہ وہ روحانی برکات اور سماوی انوار سے حصہ پاتا ہے تو ایسا شخص جھوٹا اور کذاب ہے۔

(الحکم ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

وَفِيْ اٰيَةِ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ اِشَارَةٌ وَّحَثٌّ عَلٰى دُعَاءِ صِحَّةِ الْمَعْرِفَةِ كَاَنَّهٗ يُعَلِّمُنَا وَيَقُوْلُ ادْعُوا اللّٰهَ اَنْ يُّرِيَكُمْ صِفَاتِهٖ كَمَا هِيَ وَيَجْعَلَكُمْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ۔ لِاَنَّ الْاُمَمَ الْاُوْلٰى مَا ضَلُّوْا اِلَّا بَعْدَ كَوْنِهِمْ عُمْيًا فِيْ مَعْرِفَةِ صِفَاتِ

اور جو لوگ اس بارہ میں شک کرتے ہیں اس کا سبب اُن کی قبولیتِ دعا کے حصہ سے محرومی، اپنے پروردگار کی طرف اُن کی توجہ کی کمی اور اس سلسلۂ اسباب میں اُن کا اُلجھ جانا ہے جو واقعاتِ فطرت اور مظاہرِ قدرت میں پائے جاتے ہیں۔ پس اُن کی نگاہیں ان موجودہ مادّی اسباب سے جو آنکھوں کے سامنے ہوں اُوپر نہیں اُٹھتیں۔ لہٰذا وہ اُن تمام اُمور کو مستبعد خیال کرتے ہیں جن پر اُن کی عقلیں حاوی نہ ہو سکیں اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ہوتے۔

ترجمہ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی آیت میں صحیح معرفت (کے حصول) کی دعا کرنے کی طرف اشارہ اور ترغیب ہے گویا خدا ہمیں یہ سکھاتا ہے اور کہتا ہے (اے بندو!) تم مجھ سے دُعاء کرو کہ میں تمہیں اپنی حقیقی صفات دکھلاؤں اور تمہیں شاکر بندوں میں شامل کر لوں کیونکہ پہلی اُمتیں خدا تعالیٰ کی صفات، اُس کے انعامات اور اُس کی

اللّٰہِ تَعَالٰی وَاِنْعَامَاتِہٖ وَمَرْضَاتِہٖ وَکَانُوْا یُفْنُوْنَ الْاَیَّامَ فِیْمَا یَزِیْدُ الْاٰثَامَ فَحَلَّ غَضَبُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ فَضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ وَکَانُوْا مِنَ الْہَالِکِیْنَ وَ اِلَیْہِ اَشَارَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ قَوْلِہٖ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ ۞

(کرامات الصادقین صفحہ ۸۱)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا دین اور دنیا کی ساری حاجتوں پر حاوی ہے۔ کیونکہ کسی امر میں جب تک صراطِ مستقیم نہ ملے کچھ نہیں بنتا۔ طبیب کو زراعت کرنے والے کو غرض ہر انسان کو ہر کام میں صراط مستقیم کی ضرورت ہے۔

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

بہترین دعا فاتحہ ہے کیونکہ وہ جامع دعا ہے۔ جب زمیندار کو زمینداری کا ڈھب آجاوے گا تو وہ زمینداری کے صراطِ مستقیم پر پہنچ جاویگا اور کامیاب ہو جاویگا۔ اسی طرح تم خدا کے ملنے کی صراطِ مستقیم تلاش کرو اور دعا کرو کہ یا الٰہی میں ایک تیرا گنہگار بندہ ہوں اور افتادہ ہوں۔ میری راہنمائی کر۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سب حاجتیں بغیر شرم کے خدا سے مانگو کہ اصل معطی وہی ہے بہت نیک وہی ہے جو بہت دعا کرتا ہے کیونکہ اگر کسی بخیل کے دروازہ پر سوالی ہر روز جا کر سوال کریگا تو آخر ایک دن اُس کو بھی شرم آجاوے گی۔

(الحکم ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

تم ان مردوں کی طرف خیال مت کرو جو خود بھی مردہ اور اسلام کو بھی مردہ بناتے ہیں یہ تو درحقیقت ایسا مذہب ہے کہ جس میں انسان ترقی کرتا ہوا فرشتوں سے مصافحہ کرتا ہے اور اگر یہ بات نہ تھی تو صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ کیوں سکھایا۔ اس میں صرف جسمانی اموال کی طلب نہیں کی گئی بلکہ روحانی انعام کی درخواست ہے پس اگر تم نے اندھا ہی رہنا ہے تو پھر تم مانگتے کیا ہو۔ یہ دعا فاتحہ ایسی جامع اور عجیب دعا ہے کہ پہلے کبھی کسی نبی نے سکھلائی ہی نہیں پس اگر یہ نرے الفاظ ہی الفاظ ہیں اور اس کو خدا نے منظور نہیں کرنا تو ایسے الفاظ خدا نے ہمیں کیوں سکھلائے۔ اگر ہمیں وہ مقام ملنا ہی نہیں تو ہم پانچ وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ خدا کی ذات میں بخل

خوشنودی کی معرفت سے اندھا ہونے پر ہی گمراہ ہوئی ہیں کیونکہ وہ لوگ اپنی زندگی کے ایّام ایسے کاموں میں گزارتے تھے جو اُن کے گناہوں کو بڑھاتے تھے۔ پس اُن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور اُن پر ذلّت ڈال دی گئی اور وہ ہلاک ہونے والوں میں شامل ہوگئے۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ میں اشارہ کیا ہے۔

نہیں۔ اور نہ انبیاء اس لیے آتے ہیں کہ اُن کی پوجا کی جاوے۔ بلکہ اس لیے کہ لوگوں کو تعلیم دیں کہ ہماری راہ اختیار کرنے والے ہمارے ظل کے نیچے آجاویں گے۔ (الحکم ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۷)

دعا تب ہی جامع ہوسکتی ہے کہ وہ تمام منافع اور مفاد کو اپنے اندر رکھتی ہو اور تمام نقصانوں اور مضرتوں سے بچاتی ہو۔ پس اس دعا میں تمام بہترین منافع جو ہو سکتے ہیں اور ممکن ہیں وہ اس دعا میں مطلوب ہیں اور بڑی سے بڑی نقصان رساں چیز جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اُس سے بچنے کی دعا ہے۔

(الحکم ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

دعا بہترین دعا وہ ہوتی ہے جو جامع ہو تمام خیروں کی۔ اور مانع ہو تمام مضرات کی اسی لیے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا میں آدم سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک کے کل منعم علیہم لوگوں کے انعامات کے حصول کی دعا ہے۔ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں ہر قسم کی مضرتوں سے بچنے کی دعا ہے۔

(الحکم ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اور وہ دو گروہ جو ان لوگوں کے مقابل پر بیان فرمائے گئے ہیں وہ مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جن سے محفوظ رہنے کے لیے خدا تعالیٰ سے اسی سورۃ فاتحہ میں دعا مانگی گئی ہے اور یہ دعا جس وقت اکٹھی پڑھی جاتی ہے یعنی اس طرح پر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہمیں منعم علیہم میں داخل کر اور مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْنَ سے بچا تو اس وقت صاف سمجھ آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علم میں مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ میں سے ایک وہ فریق ہے جو مغضوب علیہم اور ضالین کا ہم عصر ہے۔ اور جبکہ مغضوب علیہم سے مراد اس سورۃ میں بالیقین وہ لوگ ہیں جو مسیح موعود سے انکار کرنے والے اور اس کی تکفیر اور تکذیب اور توہین کرنے والے ہیں تو بلا شبہ ان کے مقابل پر منعم علیہم سے وہی لوگ اس جگہ مراد رکھے گئے ہیں جو صدق دل سے مسیح موعود پر ایمان لانے والے اور اس کی دل سے تعظیم کرنے والے اور اس کے انصار ہیں اور دنیا کے سامنے اس کی گواہی دیتے ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۲)

آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ یہ تمام آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیامت تک اختلاف رہے گا منعم علیہم بھی رہیں گے مغضوب علیہم بھی رہیں گے۔ ہاں ملل باطلہ دلیل کے رو سے ہلاک ہو جائیں گی۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۱ حاشیہ در حاشیہ)

قرآن شریف نے جیسا کہ جسمانی تمدن کے لیے یہ تاکید فرمائی ہے کہ ایک بادشاہ کے زیر حکم ہو کر چلیں یہی تاکید روحانی تمدن کے لیے بھی ہے اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ یہ دعا سکھلاتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پس سوچنا چاہیئے کہ یوں توکوئی مومن بلکہ کوئی انسان بلکہ کوئی حیوان بھی خدا تعالیٰ کی نعمت سے خالی نہیں مگر نہیں کہہ سکتے کہ ان کی پیروی کے لیے خدا تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا ہے لہٰذا اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ جن لوگوں پر اکمل اور اتم طور پر نعمت روحانی کی بارش ہوئی ہے ان کی راہوں کی ہمیں توفیق بخش کہ تا ہم ان کی پیروی کریں۔ سو اس آیت میں یہی اشارہ ہے کہ تم امام الزمان کے ساتھ ہو جاؤ۔ یاد رہے کہ امام الزمان کے لفظ میں نبی رسول محدث مجدد سب داخل ہیں مگر جو لوگ ارشاد اور ہدایت خلق اللہ کے لیے مامور نہیں ہوتے اور نہ وہ کمالات ان کو دئے گئے وہ گو ولی ہوں یا ابدال ہوں امام الزمان نہیں کہلا سکتے۔

(ضرورت الامام صـ۲۳-۲۴)

بعض کہتے ہیں کہ انبیاء اس دعا کو کیوں مانگتے ہیں؟ ان کو معلوم نہیں وہ ترقیات کے لیے مانگتے تھے چونکہ اللہ تعالیٰ غیر محدود ہے اس کے فیضان و فضل بھی غیر منقطع ہیں اس لیے وہ ان غیر محدود فضلوں کے حاصل کرنے کے لیے اس دعا کو مانگتے تھے۔ (الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صـ۱۲)

قرآن کریم اور حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مرشد کے ساتھ مرید کا تعلق ایسا ہونا چاہیئے جیسا عورت کا تعلق مرد سے ہو مرشد کے کسی حکم کا انکار نہ کرے اور اس کی دلیل نہ پوچھے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فرمایا ہے کہ منعم علیہم کی راہ کے مقید رہیں۔ انسان چونکہ طبعاً آزادی کو چاہتا ہے پس حکم کر دیا کہ اس راہ کو اختیار کرے۔

(الحکم ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صـ۲-۳)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پایا جاتا ہے کہ جب انسانی کوششیں تھک کر رہ جاتی ہیں تو آخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (الحکم ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صـ۷)

سورہ فاتحہ سے ایک عزت کا خطاب مجھے عنایت ہوا۔ وہ کیا ہے اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔

(الحکم ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء صـ۱۲)

انسان کی بڑی سے بڑی خواہش دنیا میں یہی ہے کہ اس کو سکھ اور آرام ملے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ہی راہ مقرر کی ہے جو تقویٰ کی راہ کہلاتی ہے اور دوسرے لفظوں میں اس کو قرآن کریم کی راہ کہتے ہیں اور یا اس کا نام صراط مستقیم رکھتے ہیں۔ (الحکم ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صـ۳)

نماز کا مغز اور روح بھی دعا ہی ہے جو سورہ فاتحہ میں ہمیں تعلیم دی گئی ہے۔ جب ہم اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہتے ہیں تو اس دعا کے ذریعہ سے اس نور کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں جو خدا تعالیٰ سے اترتا اور

دلوں کو یقین اور محبت سے منور کرتا ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۲)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں منعم علیہ گروہ میں سے شہیدوں کا گروہ بھی ہے اور اس سے یہی مراد ہے کہ استقامت عطا ہو۔ جو جان تک دیدینے میں بھی قدم کو ہلنے نہ دے۔

(الحکم ۱۰ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ میں تکمیل علمی کی طرف اشارہ ہے اور تکمیل عملی کا بیان صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں فرمایا کہ جو نتائج اکمل اور اتم ہیں۔ وہ حاصل ہو جائیں جیسے ایک پودا جو لگایا گیا ہے جب تک پورا نشوونما حاصل نہ کرے اُس کو پھول پھل نہیں لگ سکتے اسی طرح اگر کسی ہدایت کے اعلیٰ اور اکمل نتائج موجود نہیں ہیں وہ ہدایت مُردہ ہدایت ہے جس کے اندر کوئی نشوونما کی قوت اور طاقت نہیں ہے ..... اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہہ کر ایک قید لگادی ہے یعنی یہ راہ کوئی بے ثمر اور حیران اور سرگردان کرنے والی راہ نہیں ہے بلکہ اس پر چل کر انسان بامراد اور کامیاب ہوتا ہے۔

(الحکم ۲۴ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ کے راستبازوں اور منعم علیہ کی راہ ہی وہ اصل مقصود ہے جو انسان کے لیے خدا تعالیٰ نے رکھا ہے۔

(الحکم ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

جو شخص بیعت میں داخل ہوتا ہے اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مقاصد کو مدنظر رکھے جو بیعت سے ہیں یہ امور کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جاوے اصل منشا اور مدعا سے دور ہیں..... خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص بڑا ہی بدبخت ہے اور اُس کی کچھ بھی قدر اللہ تعالیٰ کے حضور نہیں جس نے گو سارے انبیا علیہم السلام کی زیارت کی ہو مگر وہ سچا اخلاص وفاداری اور خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ،خشیت اللہ اور تقویٰ اُس کے دل میں نہ ہو۔ پس یاد رکھو کہ نری زیارتوں سے کچھ نہیں ہوتا خدا تعالیٰ نے جو پہلی دعا سکھلائی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے اگر خدا تعالیٰ کا اصل مقصود زیارت ہوتا تو وہ اِهْدِنَا کی جگہ اَرِنَا صُوَرَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا تعلیم فرماتا۔ جو نہیں کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں دیکھ لو کہ آپ نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ مجھے ابراہیم علیہ السلام کی زیارت ہو جاوے۔ گو آپ کو معراج میں سب کی زیارت بھی ہو گئی۔ پس یہ امر مقصود بالذات ہرگز نہیں ہونا چاہیئے اصل مقصد سچی اتباع ہے۔

(الحکم ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷-۸)

اپنا مدعا اور مقصود ہمیشہ یہ ہونا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق تزکیہ نفس حاصل ہو اور اس کی

مرضی کے موافق تقویٰ حاصل ہو اور کچھ ایسے اعمال حسنہ میسر آجاویں کہ وہ راضی ہو جائے۔ پس جب وقت وہ راضی ہوگا تب اُس وقت ایسے شخص کو اپنے مکالمات سے مشرف کرنا اگر اس کی حکمت اور مصلحت تقاضا کریگی۔ تو وہ خود عطا کر دیگا اصل مقصود اس کو ہرگز نہیں ٹھیرانا چاہیئے کہ یہی ہلاکت کی جڑ ہے بلکہ اصل مقصود یہی ہونا چاہیئے کہ قرآن شریف کی تعلیم کے موافق احکام الٰہی پر پابندی نصیب ہو اور تزکیہ نفس حاصل ہو اور خدا تعالیٰ کی محبت اور عظمت دل میں بیٹھ جائے اور گناہ سے نفرت ہو خدا تعالیٰ نے بھی یہی دعا سکھائی ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ پس اس جگہ خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ تم یہ دعا کرو کہ ہمیں الہام ہو۔ بلکہ یہ فرمایا ہے کہ تم یہ دعا کرو کہ راہ راست ہمیں نصیب ہو۔ ان لوگوں کے راہ جو آخر کار خدا تعالیٰ کے انعام سے مشرف ہو گئے۔ بندہ کو اس سے کیا مطلب ہے کہ وہ الہام کا خواہش مند ہو اور نہ بندہ کی اس میں کچھ فضیلت ہے۔ بلکہ یہ تو خدا تعالیٰ کا فعل ہے نہ بندہ کا عمل صالح تا اس پر اجر کی توقع ہو۔ (الحکم ۲۴ نومبر ۱۹۰۷ء صٖ)

نماز کا (جو مومن کی معراج ہے) مقصود یہی ہے کہ اس میں دعا کی جاوے اور اسی لیے ام الادعیہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ دعا مانگی جاتی ہے۔ (الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صا)

ہونا چاہیئے اور شئے ہے اور ہے اور شئے ہے۔ اس ہے کا علم سوائے دعا کے نہیں حاصل ہوتا عقل سے کام لینے والے ہے کے علم کو نہیں پا سکتے اسی لیے ہے خدا را بخدا تواں شناخت۔ لَاتُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ کے یہی معنی ہیں کہ وہ صرف عقلوں کے ذریعہ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا بلکہ خود بخود جو ذریعے (اس نے) بتلائے ہیں ان سے ہی اپنے وجود کو شناخت کرواتا ہے اور اس امر کے لیے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ جیسی اور کوئی دعا نہیں۔ (البدر ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صٖ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[1]۔ جو ہماری راہ میں مجاہدہ کریگا ہم اس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے اور ادھر یہ دعا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ سو انسان کو چاہیئے کہ اس کو مدنظر رکھ کر نماز میں بالحاح دعا کرے اور تمنا رکھے کہ وہ بھی اُن لوگوں میں سے ہو جاوے جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اُٹھایا جاوے:

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صـ۳۹)

خدائے تعالیٰ کا آواز دینا یہی ہے کہ درمیانی حجاب اُٹھ گیا اور بُعد نہیں رہا۔ یہ متقی کا انتہائی درجہ ہوتا ہے جب وہ اطمینان اور راحت پاتا ہے دوسرے مقام پر قرآن شریف نے اس اطمینان کا نام فلاح اور استقامت بھی رکھا ہے اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اُسی استقامت یا اطمینان یا فلاح کی طرف لطیف اشارہ ہے اور

---

[1] العنکبوت - ۷۰

خود مستقیم کا لفظ تبلا رہا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۷)

ہر قسم کی دعائیں طفیلی ہیں۔ اصل دعائیں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے کرنی چاہئیں۔ باقی دعائیں خود بخود قبول ہوجائیں گی۔ کیونکہ گناہ کے دور ہونے سے برکات آتی ہیں۔ یوں دعا قبول نہیں ہوتی جو نری دنیا ہی کے واسطے ہو اس لیے پہلے خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے دعائیں کرے۔ اور وہ سب سے بڑھکر دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہے جب یہ دعا کرتا رہے گا تو وہ مُنْعَمْ عَلَیْہِمْ کی جماعت میں داخل ہوگا جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے دریا میں غرق کر دیا ہے۔ ان لوگوں کے زمرہ میں جو منقطعین ہیں داخل ہو کر یہ وہ انعامات الٰہی حاصل کرے گا جیسی عادت اللہ ان سے جاری ہے۔ یہ کبھی کسی نے نہیں سنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک راستباز متقی کو رزق کی مار دے بلکہ وہ تو سات پشت تک بھی رحم کرتا ہے۔ قرآن شریف میں خضر اور موسیٰ کا واقعہ درج ہے کہ انھوں نے ایک خزانہ نکالا اس کی بابت کہا گیا کہ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔ اس آیت میں ان کے والدین کا ذکر تو ہے لیکن یہ ذکر نہیں کہ وہ لڑکے خود کیسے تھے۔ باپ کے طفیل سے اس خزانہ کو محفوظ رکھا تھا اور اس لیے ان پر رحم کیا گیا لڑکوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ ستاری سے کام لیا۔

توریت اور ساری آسمانی کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ متقی کو ضائع نہیں کرتا اس لیے پہلے ایسی دعائیں کرنی چاہئیں جن سے نفس امارہ نفس مطمئنہ ہو جاوے اور اللہ تعالیٰ راضی ہوجاوے پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعائیں مانگو کیونکہ اس کے قبول ہونے پر جو یہ خود مانگتا ہے خدا تعالیٰ خود دے دیتا ہے۔

(الحکم ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

اگر اسی قدر مقصود ہوتا جو بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ موٹی موٹی بدیوں سے پرہیز کرنا ہی کمال ہے تو اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی دعا تعلیم نہ ہوتی جس کا انتہائی اور آخری مرتبہ اور مقام خدا تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا اتنا ہی تو کمال نہ تھا کہ وہ چوری چکاری نہ کیا کرتے تھے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت۔ صدق وفا میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ پس اس دعا کی تعلیم سے یہ سکھایا کہ نیکی اور انعام ایک الگ شئ ہے جب تک انسان اسے حاصل نہیں کرتا اس وقت تک وہ نیک اور صالح نہیں کہلا سکتا۔ اور منعم علیہ کے زمرہ میں نہیں آتا۔ اس سے آگے فرمایا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اس مطلب کو قرآن شریف نے دوسرے مقام پر یوں فرمایا ہے کہ مومن کے نفس کی تکمیل دو شربتوں کے پینے سے ہوتی ہے۔ ایک شربت کا نام کافوری ہے اور دوسرے کا نام زنجبیلی ہے۔ کافوری شربت تو یہ ہے کہ اس کے پینے سے نفس بالکل ٹھنڈا ہوجاوے اور بدیوں کے لیے کسی قسم کی حرارت اس میں محسوس نہ ہو۔ جس طرح پر کافور میں یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ زہریلے مواد کو دبا دیتا ہے

اسی لیے اسے کافور کہتے ہیں اسی طرح پر یہ کافوری شربت گناہ اور بدی کی زہر کو دبا دیتا ہے۔ اور وہ مواد ردیہ جو اُٹھ کر انسان کی روح کو ہلاک کرتے ہیں ان کو اُٹھنے نہیں دیتا بلکہ بے اثر کر دیتا ہے دوسرا شربت شربت زنجبیلی ہے جس کے ذریعہ سے انسان میں نیکیوں کے لیے ایک قوت اور طاقت آتی ہے اور پھر حرارت پیدا ہوتی رہے (پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو اصل مقصد اور غرض ہے یہ گویا زنجبیلی شربت اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کافوری شربت ہے۔

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب تک کسی کے پاس حقیقی نیکیوں کا ذخیرہ نہیں ہے تب تک وہ مومن نہیں ہے اسی لیے خدا تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا تعلیم فرمائی ہے کہ انسان چوری زنا وغیرہ جیسے موٹے موٹے بُرے کاموں کو ترک کرنا ہی نیکی نہ جان لے بلکہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فرما کر بتلا دیا کہ نیکی اور انعام ایک الگ شئے ہے جب تک اسے حاصل نہ کریگا تب تک نیک اور صالح نہیں کہلائے گا۔ دیکھو خدا تعالیٰ نے یہ دعا نہیں سکھلائی کہ تو مجھے فاسقوں اور فاجروں میں داخل نہ کر اور اس پر بس نہیں کیا۔ بلکہ یہ سکھلایا کہ انعام والوں میں داخل کر۔ اس کے آگے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ان آیات سے یہ مطلب ہے کہ مومن کے نفس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جبکہ وہ دو شربت پیتا ہے ایک شربت کا نام تو کافوری ہے کہ جس کے پینے سے اس کا نفس بدیوں سے سرد ہو جاتا ہے جیسے کافور میں ایک خاصہ ہے کہ وہ زہریلی مواد کو جذب کرتا ہے ایسے ہی اس کے اندر جو زہر گناہ اور بدی کی ہوتی ہے وہ اس شربت کافوری سے جذب ہو جاتی ہے اور دوسرا شربت زنجبیلی شربت ہے جس سے انسان کو نیکی کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن شریف میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی دعا تعلیم فرمائی ہے جس میں دونوں شربت اللہ تعالیٰ سے طلب کیے گئے ہیں۔

(البدر ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

انسانی زندگی کا مقصد اور غرض صراط مستقیم پر چلنا اور اس کی طلب ہے۔ جس کو اس سورۃ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یا الٰہم کو سیدھی راہ دکھا ان لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا۔ یہ وہ دعا ہے جو ہر وقت ہر نماز اور ہر رکعت میں مانگی جاتی ہے۔ اس قدر اس کا تکرار ہی اس کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہماری جماعت یاد رکھے کہ یہ معمولی سی بات نہیں ہے۔ اور صرف زبان سے طوطے کی طرح ان الفاظ کا رٹ دینا اصل مقصود نہیں ہے بلکہ یہ انسان کو انسان کامل بنانے کا ایک

کارگر اور خطا نہ کرنے والا نسخہ ہے جسے ہر وقت نصب العین رکھنا چاہیئے اور تعویذ کی طرح مدنظر رہے اس آیت میں چار قسم کے کمالات کے حاصل کرنے کی التجا ہے۔ اگر یہ ان چار قسم کے کمالات کو حاصل کریگا تو گویا دعا مانگنے اور خلق انسانی کے حق کو ادا کریگا اور ان استعدادوں اور قویٰ کے بھی کام میں لانے کا حق ادا ہو جائے گا جو اس کو دی گئی ہیں ...... میں یہ بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو اپنے تراشے ہوئے وظائف اور اوراد کے ذریعہ سے ان کمالات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو طریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں کیا وہ محض فضول ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر منعم علیہ کی راہ کا سچا تجربہ کار اور کون ہو سکتا ہے جن پر نبوت کے بھی سارے کمالات ختم ہو گئے۔ آپ نے جو راہ اختیار کیا ہے وہ بہت ہی صحیح اور اقرب ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر اور ایجاد کرنا خواہ وہ بظاہر کتنا ہی خوش کرنے والا معلوم ہوتا ہو میری رائے میں ہلاکت ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے ......

غرض منعم علیہم لوگوں میں جو کمالات ہیں اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے ان کو حاصل کرنا ہر انسان کا اصل مقصد ہے اور ہماری جماعت کو خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کے قائم کرنے سے یہی چاہا ہے کہ وہ ایسی جماعت تیار کرے جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کی تھی تاکہ اس آخری زمانہ میں یہ جماعت قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور عظمت پر بطور گواہ ٹھہرے۔ (الحکم ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵-۶)

جیسا ہمارے علماء کا عقیدہ ہے کہ اب الہام کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہوتا تو ایک عارف طالب تو زندہ ہی مرجاتا۔ خدا بخیل نہیں ہے۔ اس نے خود صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا سکھائی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ان نعمتوں کا دروازہ کھلا ہے۔ (البدر ۳ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

یقیناً جانو کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی شخص اس تک پہنچ سکتا ہے جب تک صراط مستقیم پر نہ چلے۔ وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی ذات صفات کو شناخت کرے۔ اور ان راہوں اور ہدایتوں پر عمل درآمد کرے۔ جو اس کی مرضی اور منشاء کے موافق ہیں۔ جب یہ ضروری بات ہے تو انسان کو چاہیئے کہ دین کو دنیا پر مقدم کرے۔ (البدر ۳۱ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

ہر ایک چیز پر خدا کو اختیار کر لینا اور اس کے لیے سچی محبت اور سچے جوش سے دنیا کی تمام تلخیوں کو اختیار کرنا بلکہ اپنے ہاتھ سے تلخیاں پیدا کر لینا یہ وہ مرتبہ ہے کہ بجز صدیقوں کے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا یہی وہ عبادت ہے جس کے ادا کرنے کے لیے انسان مامور ہے اور جو شخص یہ عبادت بجا لاتا ہے تب تو اس کے اس فعل پر

خدا کی طرف سے بھی ایک فعل مترتب ہوتا ہے جس کا نام انعام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے یعنی یہ دعا سکھلاتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے ہمارے خدا ہمیں اپنی سیدھی راہ دکھلا اُن لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا ہے اور اپنی خاص عنایات سے مخصوص فرمایا ہے۔ حضرت احدیت میں یہ قاعدہ ہے کہ جب خدمت مقبول ہو جاتی ہے تو اُس پر ضرور کوئی انعام مترتب ہوتا ہے چنانچہ خوارق اور نشان جن کی دوسرے لوگ نظیر پیش نہیں کر سکتے یہ بھی خدا تعالیٰ کے انعام ہیں جو خاص بندوں پر ہوتے ہیں۔

(حقیقۃ الوحی صـ۵۲-۵۳)

یاد رکھو ایک پہلو پر جانے والے لوگ مشرک ہوتے ہیں۔ آخر خدا کی طرف قدم اٹھانے اور حقیقی طور پر اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ والی دعا مانگنے کے یہی معنے تو ہیں کہ خدایا وہ راہ دکھا جس سے تو راضی ہو اور جس پر چل کر نبی کامیاب اور بامراد ہوئے آخر جب نبیوں والی راہ پر چلنے کے لیے دعا کی جاویگی تو پھر ابتلاؤں اور آزمائشوں کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے اور ثابت قدمی کے واسطے خدا سے مدد طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ صحت و عافیت بھی رہے مال و دولت میں بھی ترقی ہو اور ہر طرح کے عیش و عشرت کے سامان اور مالی اور جانی آرام بھی ہوں کوئی ابتلا بھی نہ آوے اور پھر یہ کہ خدا بھی راضی ہو جاوے وہ ابلہ ہے وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں پر خدا راضی ہوا ہے ان کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے کہ وہ طرح طرح کے امتحانوں میں ڈالے گئے اور مختلف مصائب اور شدائد سے ان کا سامنا ہوا۔

(الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صـ۱۱)

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یعنی اے خدا کہ تو رب العالمین رحمٰن رحیم اور مالک یوم الدین ہے ہمیں وہ راہ دکھا جو ان لوگوں کی راہ ہے۔ جن پر تیرا بے انتہا فضل ہوا اور تیرے بڑے بڑے انعام اکرام ہوئے۔ مومن کو چاہیئے کہ ان چار صفات والے خدا کا صرف زبانی اقرار ہی نہ کرے بلکہ اپنی ایسی حالت بناوے جس سے معلوم ہو کہ وہ صرف خدا کو ہی رب جانتا ہے۔ زید عمر کو نہیں جانتا۔ اور اس بات پر یقین رکھے کہ درحقیقت خدا ہی ایسا ہے۔ جو عملوں کی جزا سزا دیتا ہے اور پوشیدہ سے پوشیدہ اور نہاں در نہاں گناہوں کو جانتا ہے۔ یاد رکھو کہ صرف زبانی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا جب تک عملی حالت درست نہ ہو۔ جو شخص حقیقی طور پر خدا کو ہی اپنا رب اور مالک یوم الدین سمجھتا ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ وہ چوری بدکاری قمار بازی یا دیگر افعال شنیعہ کا مرتکب ہو سکے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سب چیزیں ہلاک کر دینے والی ہیں۔ اور ان پر عمل درآمد کرنا خدا تعالیٰ کے حکم کی صریح نافرمانی ہے۔ غرض انسان جب تک عملی طور پر ثابت

نہ کردیوے کہ وہ حقیقت میں خدا پر سچا اور پکا ایمان رکھتا ہے۔ تب تک وہ فیوض اور برکات حاصل نہیں ہو سکتے۔ جو مقربوں کو ملا کرتے ہیں۔

{ الحکم ۲ جنوری ۱۹۰۸ء صہ ٦
" ٦ جنوری ۱۹۰۸ء صہ ۲ }

قرآن شریف پڑھ کر دیکھ لو اس میں کہیں بھی ایسا نہیں ملیگا کہ خدا اس شخص پر بھی راضی ہوتا ہے جو اس کی رضامندی کی راہوں سے غافل اور لاپرواہی کرنے والا ہو۔ خدا تعالیٰ نے اپنی رضامندی کی جو راہیں مقرر کردی ہیں انہی کے اختیار کرنے سے وہ راضی ہوتا ہے۔ صاف طور سے اس نے یہ دعا سکھا دی ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ دیکھو انسان انسان سے خوش ہو کر اُس کو انعامات عطا کرتا ہے۔ تو کیا خدا اپنی رضامندی کی راہوں پر چلنے والوں اور اُس کی تلاش کرنے والوں سے محبت نہیں کریگا۔ مگر استعداد بھی ہو اُس کے فیوض کے لینے کی۔

(الحکم ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صہ ۲)

غرض دعا ہی ایک اعلیٰ ہتھیار ہے جو مشکل سے نجات کی راہ ہے جہاں کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا وہاں دعا کے ذریعہ کامیابی ممکن اور یقینی ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے تمام شرائط اور لوازم مہیا اور میسر ہوں۔ عمدہ دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ہے۔ جس میں نہ کسی خاص مذہب کا نام ہے۔ اور نہ کوئی خاص پہلو اختیار کیا گیا ہے۔

(الحکم ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صہ ۲)

دعا کے بارہ میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفاتحہ میں دعا سکھلائی ہے۔ یعنی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ اس میں تین لحاظ رکھنے چاہئیں۔

(۱) ایک یہ کہ تمام بنی نوع کو اس میں شریک رکھے۔ (۲) تمام مسلمانوں کو (۳) تیسرے اُن حاضرین کو جو جماعت نماز میں داخل ہیں۔ پس اس طرح کی نیت سے کل نوع انسان اس میں داخل ہوں گے۔ اور یہی منشاء خدا تعالیٰ کا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اسی سورت میں اُس نے اپنا نام رب العالمین رکھا ہے۔ جو عام ہمدردی کی ترغیب دیتا ہے جس میں حیوانات بھی داخل ہیں۔ پھر اپنا نام رحمان رکھا ہے۔ اور یہ نام نوع انسان کی ہمدردی کی ترغیب دیتا ہے۔ کیونکہ یہ رحمت انسانوں سے خاص ہے۔ اور پھر اپنا نام رحیم رکھا ہے۔ اور یہ نام مومنوں کی ہمدردی کی ترغیب دیتا ہے۔ کیونکہ رحیم کا لفظ مومنوں سے خاص ہے۔ اور پھر اپنا نام مالک یوم الدین رکھا ہے۔ اور یہ نام جماعت موجودہ کی ہمدردی کی ترغیب دیتا ہے۔ کیونکہ یوم الدین وہ دن ہے جس میں خدا تعالیٰ کے سامنے جماعتیں حاضر ہوں گی۔ سو اسی تفصیل کے لحاظ سے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی دعا ہے۔ پس اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دعاء میں تمام نوع انسانی کی ہمدردی داخل ہے۔ اور اسلام کا

اصول یہی ہے کہ سب کا خیر خواہ ہو۔ (الحکم ۲۹ اکتوبر ۱۸۹۸ء صفحہ ۴)

عادت اللہ اسی پر جاری ہے کہ جس کام کے لیے مصمم عزم کیا جاوے اُس کے انجام کے لیے طاقت مل جاتی ہے سو مصمم عزم اور عہد واثق سے اعمال کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اور نماز میں اس دعا کو پڑھتے ہیں کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ الخ بہت خضوع اور خشوع سے زور لگانا چاہیئے اور بار بار پڑھنا چاہیئے۔ انسان بغیر عبادت کچھ چیز نہیں بلکہ جمیع جانوروں سے بدتر ہے اور شر البریہ ہے۔

(الحکم ۳۰ جون ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

آٹھویں اور نویں اور دسویں صداقت جو سورت فاتحہ میں درج ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ہم کو اُن سالکین کا راستہ بتلا جنہوں نے ایسی راہیں اختیار کیں کہ جن سے اُن پر تیرا انعام وارد ہوا اور اُن لوگوں کی راہوں سے بچا جنہوں نے لاپروائی سے سیدھی راہ پر قدم مارنے کے لیے کوشش نہ کی اور اس باعث سے تیری تائید سے محروم رہ کر گمراہ رہے۔ یہ تین صداقتیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ بنی آدم اپنے اقوال اور افعال اور اعمال اور نیات کے رو سے تین قسم کے ہوتے ہیں بعض سچے دل سے خدا کے طالب ہوتے ہیں اور صدق اور عاجزی سے خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں پس خدا بھی اُن کا طالب ہو جاتا ہے اور رحمت اور انعام کے ساتھ اُن پر رجوع کرتا ہے اِس حالت کا نام انعامِ الٰہی ہے اِسی کی طرف آیتِ ممدوحہ میں اشارہ فرمایا اور کہا صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی وہ لوگ ایسا صفا اور سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں جس سے فیضانِ رحمتِ الٰہی کے مستحق ٹھہر جاتے ہیں اور بباعث اِس کے کہ اُن میں اور خدا میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا اور بالکل رحمتِ الٰہی کے محاذی آپڑتے ہیں اِس جہت سے انوار فیضانِ الٰہی کے اُن پر وارد ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں کہ جو دیدہ دانستہ مخالفت کا طریق اختیار کر لیتے ہیں اور دشمنوں کی طرح خدا سے مونہہ پھیر لیتے ہیں سو خدا بھی اُن سے منہ پھیر لیتا ہے اور رحمت کے ساتھ اُن پر رجوع نہیں کرتا اِس کا باعث یہی ہوتا ہے کہ وہ عداوت اور بیزاری اور غضب اور غیظ اور ناراضامندی جو خدا کی نسبت اُن کے دلوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہے وہی اُن میں اور خدا میں حجاب ہو جاتی ہے اِس حالت کا نام غضبِ الٰہی ہے اِسی کی طرف خدائے تعالیٰ نے اشارہ فرما کر کہا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں کہ جو خدا سے لاپرواہ رہتے ہیں اور سعی اور کوشش سے اُس کو طلب نہیں کرتے خدا بھی اُن کے ساتھ لاپرواہی کرتا ہے اور اُن کو اپنا راستہ نہیں دکھلاتا کیونکہ وہ لوگ راستہ طلب کرنے میں آپ سستی کرتے ہیں اور اپنے تئیں اس فیض کے لائق نہیں بناتے کہ جو خدا کے قانونِ قدیم میں محنت اور کوشش کرنے والوں

کے لیے مقرر ہے اِس حالت کا نام اضلالِ الٰہی ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ خدا نے اُن کو گمراہ کیا یعنی جبکہ اُنہوں نے ہدایت پانے کے طریقوں کو بجد وجہد طلب نہ کیا تو خدا نے بہ پابندی اپنے قانون قدیم کے اُن کو ہدایت بھی نہ دی اور اپنی تائید سے محروم رکھا اسی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا وَلَا الضَّآلِّيْنَ غرض ماحصل اور خلاصہ ان تینوں صداقتوں کا یہ ہے کہ جیسے انسان کی خدا کے ساتھ تین حالتیں ہیں ایسا ہی خدا بھی ہر یک حالت کے موافق اُن کے ساتھ جُدا جُدا معاملہ کرتا ہے جو لوگ اُس پر راضی ہوتے ہیں اور دلی محبت اور صدق سے اُس کے خواہاں ہو جاتے ہیں خدا بھی اُن پر راضی ہو جاتا ہے اور اپنی رضامندی کے انوار اُن پر نازل کرتا ہے اور جو لوگ اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور عمداً مخالفت اختیار کرتے ہیں خدا بھی مخالف کی طرح اُن سے معاملہ کرتا ہے اور جو لوگ اُس کی طلب میں سُستی اور لاپروائی کرتے ہیں خدا بھی اُن سے لاپروائی کرتا ہے اور اُن کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے غرض جس طرح آئینہ میں انسان کو وہی شکل نظر آتی ہے کہ جو حقیقت میں شکل رکھتا ہے اسی طرح حضرت احدیت کہ جو ہر یک کدورت سے مُصفّٰی اور پاک ہے محبت والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے غضب والوں پر غضب ناک ہے لاپرواہوں کے ساتھ لاپرواہی رُکنے والوں سے رُک جاتا ہے اور جُھکنے والوں کی طرف جُھکتا ہے چاہنے والوں کو چاہتا ہے اور نفرت کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے اور جس طرح آئینہ کے سامنے جو انداز اپنا بناؤ گے وہی انداز آئینہ میں بھی نظر آئے گا ایسا ہی خداوند تعالیٰ کے روبرو جس انداز سے کوئی چلتا ہے وہی انداز خدا کی طرف سے اُس کے لیے موجود ہے اور جن لباسوں کو بندہ اپنے لیے آپ اختیار کر لیتا ہے وہی تخم بویا ہوا اُس کا اُس کو دیا جاتا ہے جب انسان ہر یک طرح کے حجابوں اور کدورتوں اور آلائشوں سے اپنے دل کو پاک کر لیتا ہے اور صحن سینہ اُس کے کا مواد ردّیہ ما سوائے اللہ سے بالکل خالی ہو جاتا ہے تو اس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کوئی اپنے مکان کا دروازہ جو آفتاب کی طرف ہے کھول دیتا ہے اور سورج کی کرنیں اُس کے گھر کے اندر چلی آتی ہیں لیکن جب بندہ ناراستی اور دروغ اور طرح طرح کی آلائشوں کو آپ اختیار کر لیتا ہے اور خدا کو حقیر چیز کی طرح خیال کر کے چھوڑ دیتا ہے تو اُس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کوئی روشنی کو ناپسند کر کے اور اُس سے بغض رکھ کر اپنے گھر کے تمام دروازے بند کر دے تا ایسا نہ ہو کہ کسی طرف سے آفتاب کی شعاعیں اس کے گھر کے اندر آ جائیں۔ اور جب انسان بباعثِ جذبات نفسانی یا ننگ و ناموس یا تقلید قوم وغیرہ طرح طرح کی غلطیوں اور آلائشوں میں گرفتار ہو اور سُستی اور تکاسل اور لاپروائی سے اُن آلائشوں سے پاک ہونے کے لیے کچھ سعی اور کوشش نہ کرے تو اُس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کوئی اپنے گھر کے دروازوں کو بند پاوے اور تمام گھر میں اندھیرا بھرا ہوا دیکھے اور پھر اُٹھ کر دروازوں کو نہ کھولے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے اور دل میں یہ

کہے کہ اب اِس وقت کون اُٹھے اور کون اتنی تکلیف اُٹھاوے یہ تینوں مثالیں اُن تینوں حالتوں کی ہیں جو انسان کے اپنے ہی فعل یا اپنی ہی سُستی سے پیدا ہو جاتی ہیں جن میں سے پہلی حالت کا نام حسب تصریح گزشتہ کے انعامِ الٰہی اور دوسری حالت کا نام غضبِ الٰہی اور تیسری حالت کا نام اضلالِ الٰہی ہے ان تینوں صداقتوں سے بھی ہمارے مخالفین بے خبر ہیں کیونکہ برہمو سماج والوں کو اُس صداقت سے بالکل اطلاع نہیں ہے جس کے رو سے خدائے تعالیٰ سرکش اور غضب ناک بندوں کے ساتھ غضب ناک کا معاملہ کرتا ہے چنانچہ برہمو صاحبوں میں سے ایک صاحب نے اِس بارہ میں انہیں دنوں میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس میں صاحب موصوف خدا کی کتابوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُن میں غضب کی صفت خدائے تعالیٰ کی طرف کیوں کر منسوب کی گئی ہے کیا خدا ہماری کمزوریوں پر چڑتا ہے اظاہر ہے کہ اگر صاحب راقم کو اِس صداقت کی کچھ بھی خبر ہوتی تو کیوں وہ ناحق اپنی اوقات ضائع کر کے ایک ایسا رسالہ چھپواتے جس سے اُن کی کم فہمی ہر یک پر کُھل گئی ہے اور اُن کو باوجود دعویٰ عقل کے یہ بات سمجھ نہ آئی کہ خدا کا غضب بندہ کی حالت کا ایک عکس ہے جب انسان کسی مخالفانہ شر سے محجوب ہو جائے اور خدا سے دوسری طرف مُنہ پھیر لے تو کیا وہ اس لائق رہ سکتا ہے کہ جو سچّے محبّوں اور صادقوں پر فیضانِ رحمت ہوتا ہے اُس پر بھی وہی فیضان ہو جائے ہرگز نہیں بلکہ خدا کا قانونِ قدیم جو ابتدا سے چلا آیا ہے جس کو ہمیشہ راست باز اور صادق آدمی تجربہ کرتے رہے ہیں اور اب بھی صحیح تجارب سے اُس کی سچائیوں کو مشاہدہ کرتے ہیں وہ یہی قانون ہے کہ جو شخص ظلماتی حجابوں سے نکل کر سیدھا خدائے تعالیٰ کی طرف اپنے روح کا مُنہ پھیر کر اُس کے آستانہ پر گر پڑتا ہے اسی پر فیضانِ رحمت خاصّہ ایزدی کا ہوتا ہے اور جو شخص اِس طریق کے برخلاف کوئی دوسرا طریق اختیار کر لیتا ہے تو بالضرور جو امرِ رحمت کے برخلاف ہے یعنی غضبِ الٰہی اُس پر وارد ہو جاتا ہے اور غضب کی اصل حقیقت یہی ہے کہ جب ایک شخص اُس طریق مستقیم کو چھوڑ دیتا ہے کہ جو قانونِ الٰہی میں افاضۂ رحمتِ الٰہی کا طریق ہے تو فیضانِ رحمت سے محروم رہ جاتا ہے اِسی محرومی کی حالت کا نام غضبِ الٰہی ہے اور چونکہ انسان کی زندگی اور آرام اور راحت خدا کے فیض سے ہی ہے اِس جہت سے جو لوگ فیضانِ رحمت کے طریق کو چھوڑ دیتے ہیں وہ خدا کی طرف سے اِسی جہان میں یا دوسرے جہان میں طرح طرح کے عذابوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ جس کے شاملِ حال رحمتِ الٰہی نہیں ہے ضرور ہے کہ انواع اقسام کے عذابِ روحانی و بدنی اُس کی طرف مونہہ کریں اور چونکہ خدا کے قانون میں یہی انتظام مقرّر ہے کہ رحمتِ خاصہ اُنہیں کے شاملِ حال ہوتی ہے کہ جو رحمت کے طریق کو یعنی دُعا اور توحید کو اختیار کرتے ہیں اِس باعث سے جو لوگ اِس طریق کو چھوڑ دیتے ہیں وہ طرح طرح کی آفات میں گرفتار ہو جاتے ہیں اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ[1] - فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ[2] - یعنی اِن کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پروا کیا

[1] الفرقان - ع - ۶ [2] آل عمران - ع - ۱۰

رکھتا ہے اگر تم دُعا نہ کرو اور اُس کے فیضان کے خواہان نہ ہو خدا کو تو کسی کی زندگی اور وجود کی حاجت نہیں وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔ اور آریہ سماج والے اور عیسائی بھی ان تینوں صداقتوں میں سے پہلی اور تیسری صداقت سے بے خبر ہیں کوئی اُن میں سے یہ اعتراض کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ سب لوگوں کو کیوں ہدایت نہیں دیتا اور کوئی یہ اعتراض کر رہا ہے کہ خدا میں صفتِ اضلال کیونکر پائی جاتی ہے جو لوگ خدائے تعالیٰ کی ہدایت کی نسبت معترض ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ ہدایت الٰہی اُنہیں کے شاملِ حال ہوتی ہے کہ جو ہدایت پانے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور اُن راہوں پر چلتے ہیں جن راہوں پر چلنا فیضانِ رحمت کے لیے ضروری ہے اور جو لوگ اضلال الٰہی کی نسبت معترض ہیں اُن کو یہ خیال نہیں آتا کہ خدائے تعالیٰ اپنے قواعد مقررہ کے ساتھ ہر یک انسان سے مناسب حال معاملہ کرتا ہے اور جو شخص سُستی اور کاہل سے اُس کے لیے کوشش کرنا چھوڑ دیتا ہے ایسے لوگوں کے بارہ میں قدیم سے اُس کا یہی قاعدہ مقرر ہے کہ وہ اپنی تائید سے اُن کو محروم رکھتا ہے اور اُنہیں کو اپنی راہیں دکھلاتا ہے۔ جو اُن راہوں کے لیے بدل و جان سعی کرتے ہیں بھلا یہ کیونکر ہو سکے کہ جو شخص نہایت لاپروائی سے سُستی کر رہا ہے وہ ایسا ہی خدا کے فیض سے مستفیض ہو جائے جیسے وہ شخص کہ جو تمام عقل اور تمام زور اور تمام اخلاص سے اُس کو ڈھونڈتا ہے اِسی کی طرف ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[1]۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم اُن کو بالضرور اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں اب دیکھنا چاہیئے کہ یہ دس صداقتیں جو سورۂ فاتحہ میں درج ہیں کس قدر عالی اور بے نظیر صداقتیں ہیں جن کے دریافت کرنے سے ہمارے تمام مخالفین قاصر رہے اور پھر دیکھنا چاہیئے کہ کس ایجاز اور لطافت سے اَقلّ قلیل عبارت میں اُن کو خدائے تعالیٰ نے بھر دیا ہے اور پھر اس طرف خیال کرنا چاہیئے کہ علاوہ اِن سچائیوں کے اور اِس کمال ایجاز کے دوسرے کیا کیا لطائف ہیں جو اِس سورۂ مبارکہ میں بھرے ہوئے ہیں اگر ہم اِس جگہ اُن سب لطائف کو بیان کریں تو یہ مضمون ایک دفتر بن جائے گا۔

{ براہین احمدیہ حصّہ چہارم
حاشیہ نمبر ۱۱ صفحہ ۴۵۶-۴۷۶ }

سورۃ فاتحہ میں ایک مخفی پیشگوئی موجود ہے اور وہ یہ کہ جس طرح یہودی لوگ حضرت عیسیٰ کو کافر اور دجال کہہ کر مغضوب عَلَیْہِم بن گئے بعض مسلمان بھی ایسے ہی بنیں گے۔ اسی لیے نیک لوگوں کو یہ دعا سکھلائی گئی کہ وہ منعم علیہم میں سے حصہ لیں اور مغضوب علیہم نہ بنیں سورۃ فاتحہ کا اعلیٰ مقصود مسیح موعود اور اس کی جماعت اور اسلامی یہودی اور اُن کی جماعت اور ضالین یعنی عیسائیوں کے زمانہ ترقی کی خبر ہے سو کس قدر خوشی کی بات ہے کہ وہ باتیں آج پوری ہوئیں۔ (نزول المسیح صفحہ ۳۶-۳۷)

---

[1] العنکبوت: ۷۰

سورۃ فاتحہ میں خدا نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ اس جگہ احادیث صحیحہ کے رو سے بکمال تواتر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد بدکار اور فاسق یہودی ہیں جنھوں نے حضرت مسیح کو کافر قرار دیا اور قتل کے درپئے رہے اور اُس کی سخت توہین و تحقیر کی اور جن پر حضرت عیسیٰ نے لعنت بھیجی جیسا کہ قرآن شریف میں مذکور ہے۔ اور الضالین سے مراد عیسائیوں کا وہ گمراہ فرقہ ہے جنھوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا سمجھ لیا اور تثلیث کے قائل ہوئے اور خون مسیح پر نجات کا حصر رکھا اور ان کو زندہ خدا کے عرش پر بٹھا دیا۔ اب اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا ایسا فضل کر کہ ہم نہ تو وہ یہودی بن جائیں جنھوں نے مسیح کو کافر قرار دیا تھا اور ان کے قتل کے درپئے ہوئے تھے اور نہ ہم مسیح کو خدا قرار دیں اور تثلیث کے قائل ہوں۔ چونکہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں اسی اُمت میں سے مسیح موعود آئیگا۔ اور بعض یہودی صفت مسلمانوں میں سے اس کو کافر قرار دیں گے اور قتل کے درپئے ہوں گے اور اس کی سخت توہین و تحقیر کریں گے اور نیز جانتا تھا کہ اس زمانہ میں تثلیث کا مذہب ترقی پر ہوگا اور بہت سے بدقسمت انسان عیسائی ہو جائیں گے اس لیے اس نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی اور اس دعا میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا جو لفظ ہے وہ بلند آواز سے کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ جو اسلامی مسیح کی مخالفت کریں گے وہ بھی خدا تعالیٰ کی نظر میں مغضوب علیہم ہوں گے جیسا کہ اسرائیلی مسیح کے مخالف مغضوب علیہم تھے۔

(نزول المسیح صفحہ ۴۱-۴۲)

ہم نے تو اس زمانہ میں یہود دیکھ لیے اور ہم ایمان لائے کہ آیت غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اسی بات کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ اس قوم میں بھی مغضوب علیہم یہودی ضرور پیدا ہوں گے سو ہو گئے اور پیشگوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری ہو گئی مگر کیا یہ امت کچھ ایسی ہی بدقسمت ہے کہ ان کی تقدیر میں یہود بننا ہی لکھا تھا اس فعل کو ہم خدائے کریم کی طرف کبھی منسوب نہیں کر سکتے کہ یہود مردود بننے کے لیے تو یہ امت اور مسیح بنی اسرائیل سے آوے ایسی کارروائی سے تو اس امت کی ناک کٹتی ہے اور اس خطاب کے لائق نہیں رہتی کہ اس کو امت مرحومہ کہا جاوے پس اس امت کا یہود بننا جیسا کہ آیت غیر المغضوب علیہم سے سمجھا جاتا ہے اس بات کو چاہتا ہے کہ جو یہود مغضوب علیہم کے مقابل مسیح آیا تھا اس کا مثیل بھی اس امت میں سے آوے اسی کی طرف تو اس آیت کا اشارہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔

(اعجاز احمدی صفحہ ۱۲-۱۳)

خدا فرماتا ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ یعنی اے مسلمانوں تم خدا سے دعا مانگتے رہو۔

کہ یا الٰہی ہمیں ان لوگوں میں سے نہ بنانا جن پر اس دنیا میں ہی تیرا غضب نازل ہوا ہے۔ اور نہ ہی ان لوگوں کا راستہ دکھانا جو کہ راہِ راست سے گمراہ ہو گئے ہیں۔

اور یہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ بطور قصہ یا کتھا کے بیان نہیں کیا۔ بلکہ وہ جانتا تھا کہ جس طرح پہلی قوموں نے بدکاریاں کیں اور نبیوں کی تکذیب اور تفسیق میں حد سے بڑھ گئیں۔ اسی طرح مسلمانوں پر بھی ایک وقت آئے گا جب کہ وہ فسق و فجور میں حد سے بڑھ جاویں گے اور جن کاموں سے اُن قوموں پر خدا کا غضب بھڑکا تھا۔ ویسے ہی کام مسلمان بھی کریں گے اور خدا کا غضب ان پر نازل ہو گا۔

تفسیروں اور احادیث والوں نے مغضوب سے یہود مراد لیے ہیں۔ کیونکہ یہود نے خدا تعالیٰ کے انبیا کے ساتھ بہت ہنسی ٹھٹھا کیا تھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خاص طور پر دکھ دیا تھا۔ اور نہایت درجہ کی شوخیاں اور بے باکیاں انہوں نے دکھائی تھیں۔ جن کا آخری نتیجہ یہ ہوا تھا۔ کہ اسی دنیا میں ہی خدا کا غضب ان پر نازل ہوا تھا۔ مگر اس جگہ خدا کے غضب سے کوئی یہ نہ سمجھ لے۔ کہ (معاذ اللہ) خدا چڑ جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان بسبب اپنے گناہوں کے نہایت درجہ کے پاک اور قدوس خدا سے دور ہو جاتا ہے یا مثال کے طور پر یوں سمجھ لو کہ ایک شخص کسی ایسے حجرہ میں بیٹھا ہوا ہو۔ جس کے چار دروازے ہوں۔ اگر وہ ان دروازوں کو کھولیگا تو دھوپ اور آفتاب کی روشنی اندر آتی رہے گی اور اگر وہ سب دروازے بند کر دے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ روشنی کا آنا بند ہو جائے گا غرض یہ بات سچی ہے۔ کہ جب انسان کوئی فعل کرتا ہے تو سنت اللہ اسی طرح سے ہے۔ کہ اس فعل پر ایک فعل خدا کی طرف سے سرزد ہوتا ہے جیسے اس شخص نے اپنی بدقسمتی سے جب چاروں دروازے بند کر دئے تھے۔ تو اس پر خدا کا فعل یہ تھا۔ کہ اس مکان میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا۔ غرض اس اندھیرا کرنے کا نام خدا کا غضب ہے۔ یہ مت سمجھو کہ خدا کا غضب بھی اسی طرح کا ہوتا ہے کہ جس طرح سے انسان کا غضب ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا خدا ہے۔ اور انسان انسان ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ جس طرح سے ایک انسان کام کرتا ہے خدا بھی اسی طرح سے ہی کرتا ہے۔ مثلاً خدا سنتا ہے تو کیا اس کو سننے کے لیے انسان کی طرح ہوا کی ضرورت ہے! اور کیا اس کا سننا بھی انسان کی طرح سے ہے کہ جس طرف ہوا کا رُخ زیادہ ہوا۔ اس طرف کی آواز کو زیادہ سن لیا۔ یا مثلاً دیکھتا ہے کہ جب تک سورج چاند چراغ وغیرہ کی روشنی نہ ہو انسان دیکھ نہیں سکتا۔ تو کیا خدا بھی روشنیوں کا محتاج ہے۔ غرض انسان کا دیکھنا اَور رنگ کا ہے اور خدا کا اَور رنگ کا ہے۔ اس کی حقیقت خدا کے سپرد کرنی چاہیئے۔ آریہ وغیرہ جو اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کو غضب ناک کہا گیا ہے۔ یہ ان کی صریح غلطی ہے۔ ان کو چاہیئے تھا۔ کہ قرآن مجید کی دوسری جگہوں پر نظر کرتے۔ وہاں تو صاف طور پر لکھا ہے عَذَابِیۤ

اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ[1] خدا کی رحمت تو کل چیزوں کے شامل حال ہے۔ مگر ان کو دقت ہے تو یہ ہے کہ خدا کی رحمت کے تو وہ قائل ہی نہیں۔ ان کے مذہبی اصول کے بموجب اگر کوئی شخص بصد مشکل مکتی حاصل کر بھی لے۔ تو آخر پھر وہاں سے بھی نکلنا ہی پڑیگا۔ غرض خوب یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے کلام پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ جیسے خدا ہر ایک عیب سے پاک ہے ویسے ہی اس کا کلام بھی ہر ایک قسم کی غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ اور یہ جو فرمایا ہے۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ۔ تو اس سے یہ مراد ہے کہ یہود ایک قوم تھی جو توریت کو مانتی تھی۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بہت تکذیب کی تھی اور بڑی شوخی کے ساتھ ان سے پیش آئے تھے۔ یہاں تک کہ کئی بار ان کے قتل کا ارادہ بھی انہوں نے کیا تھا۔ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی فن کو کمال تک پہنچا دیتا ہے تو پھر وہ بڑا نامی گرامی اور مشہور ہوجاتا ہے اور جب کبھی اس فن کا ذکر شروع ہوتا ہے تو پھر اسی کا نام ہی لیا جاتا ہے۔ مثلاً دنیا میں ہزاروں پہلوان ہوئے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں مگر رستم کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر کسی کو پہلوانی کا خطاب بھی دیا جاتا ہے تو اسے بھی رستم ہند وغیرہ کرکے پکارا جاتا ہے یہی حال یہود کا ہے کوئی نبی نہیں گذرا جس سے انہوں نے شوخی نہیں کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو انہوں نے یہاں تک مخالفت کی کہ صلیب پر چڑھانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور ان کے مقابلہ پر ہر ایک شرارت سے کام لیا۔ ہاں اگر یہ سوال پیدا ہو کہ یہود نے تو انبیاء کے مقابل پر شوخیاں اور شرارتیں کی تھیں مگر اب تو سلسلہ نبوت ختم ہوچکا ہے۔ اس لیے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ والی دعا کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا۔ کہ آخری زمانہ میں مسیح نازل ہوگا۔ اور مسلمان لوگ اس کی تکذیب کرکے یہود خصلت ہوجاویں گے اور طرح طرح کی بدکاریوں اور قسم قسم کی شوخیوں اور شرارتوں میں ترقی کرجاویں گے اس لیے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ والی دعا سکھائی ہے کہ اے مسلمانوں پنجگانہ نمازوں کی ہر ایک رکعت میں دعا مانگتے رہو کہ یاالٰہی ہمیں ان کی راہ سے بچائے رکھیو۔ جن پر تیرا غضب اسی دنیا میں نازل ہوا تھا۔ اور جن کو تیرے مسیح کی مخالفت کرنے کے سبب سے طرح طرح کی آفات ارضی وسماوی کا ذائقہ چکھنا پڑا تھا سو جاننا چاہیئے کہ یہی وہ زمانہ ہے جس کی طرف آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ اشارہ کرتی ہے۔ اور وہی خدا کا سچا مسیح ہے جو اس وقت تمہارے درمیان بول رہا ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ پچیس ۲۵ برس سے صبر کرتا رہا ہے۔ ان لوگوں نے کوئی دقیقہ میری مخالفت کا اٹھا نہیں رکھا ہر طرح سے شوخیاں کی گئیں طرح طرح کے الزام ہم پر لگائے گئے اور ان شوخیوں اور شرارتوں میں پوری سرگرمی سے کام لیا گیا۔ ہر پہلو سے میرے فنا اور معدوم کرنے کے لیے زور لگائے گئے اور ہمارے لیے طرح طرح کے کفر نامے تیار کیے گئے اور نصاریٰ اور یہود سے بھی بدتر ہمیں سمجھا گیا۔ حالانکہ ہم کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔

[1] الاعراف ع ۱۹ ۔

پر دل وجان سے یقین رکھتے تھے قرآن شریف کو خدا تعالیٰ کی سچی اور کامل کتاب سمجھتے تھے اور سچے دل سے اسے
خاتم الکتب جانتے تھے اور آنحضرت صلعم کو سچے دل سے خاتم النبیین سمجھتے تھے۔ وہی نمازیں تھیں وہی قبلہ
تھا۔ اسی طرح سے ماہ رمضان کے روزے رکھتے تھے۔ حج اور زکوٰۃ میں بھی کوئی فرق نہ تھا۔ پھر معلوم نہیں
کہ وہ کون سے وجوہات تھے جن کے سبب سے ہمیں یہود اور نصاریٰ سے بھی بدتر ٹھہرایا گیا۔ اور دن رات ہمیں
گالیاں دینا موجب ثواب سمجھا گیا۔ آخر شرافت بھی تو کوئی چیز ہے اس طرح کا طریق تو وہی لوگ اختیار کرتے
ہیں جن کے ایمان مسلوب اور دل سیاہ ہو جاتے ہیں۔ غرض چونکہ خدا جانتا تھا۔ کہ ایک وقت آئے گا۔ جب کہ
مسلمان یہود سیرت ہو جائیں گے۔ اس لیے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ والی دعا سکھا دی۔ اور پھر فرمایا ولا الضالین
یعنی نہ ہی ان لوگوں کی راہ پر چلانا جنہوں نے تیری سچی اور سیدھی راہ سے منہ موڑ لیا۔ اور یہ عیسائیوں کی طرف اشارہ
ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انجیل کے ذریعہ سے یہ تعلیم ملی تھی۔ کہ خدا کو ایک اور واحد لاشریک مانو۔ مگر انہوں
نے اس تعلیم کو چھوڑ دیا۔ اور ایک عورت کے بیٹے کو خدا بنا لیا۔ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ تو بڑا سخت
لفظ ہے اور ضالین نرم لفظ ہے۔ یہ نرم لفظ نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہودیوں کا تھوڑا گناہ تھا۔ وہ توریت کے
پابند تھے اور اس کے حکموں پر چلتے تھے۔ گو وہ شوخیوں اور شرارتوں میں بہت بڑھ گئے تھے۔ مگر وہ کسی کو خدا یا
خدا کا بیٹا بنانے کے سخت دشمن تھے اور سورہ فاتحہ میں ان کا نام جو پہلے آیا ہے۔ تو وہ اس واسطے نہیں کہ ان
کے گناہ زیادہ تھے بلکہ اس واسطے کہ اسی دنیا میں ہی ان کو سزا دی گئی تھی اور اس کی مثال اس طرح پر ہے کہ ایک
تحصیلدار انہیں کو جرمانہ کرتا ہے جن کا قصور اس کے اختیار سے باہر نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی بھاری سے بھاری
گناہ پر وہ اپنی طرف سے ۵۰ ۶۰ روپیہ جرمانہ کر سکتا ہے لیکن اگر قصوروار زیادہ کا حقدار ہو تو پھر تحصیلدار
یہ کہہ کر کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے اور کہ تمہاری سزا کا یہاں موقع نہیں کسی اعلیٰ افسر کے سپرد کرتا ہے اسی طرح
یہودیوں کی شرارتیں اور شوخیاں اسی حد تک ہیں کہ ان کی سزا اسی دنیا میں دی جا سکتی تھی۔ لیکن ضالین کی سزا یہ
دنیا برداشت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ایسا نفرتی عقیدہ ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا
ہے۔ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْہُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ
وَلَدًا[1] یعنی یہ ایک ایسا بُرا کام ہے جس سے قریب ہے کہ زمین آسمان پھٹ جائیں اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو
جائیں غرض یہودیوں کی چونکہ سزا تھوڑی تھی اس لیے ان کو اسی جہان میں دی گئی اور عیسائیوں کی سزا اس قدر
سخت ہے کہ یہ جہان اس کی برداشت نہیں کر سکتا اس لیے ان کی سزا کے واسطے دوسرا جہان مقرر ہے۔ اور پھر

---

[1] مریم۔ع۔۶ ۞

یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ یہ عیسائی صرف ضال ہی نہیں ہیں۔ بلکہ مضل بھی ہیں۔ ان کا دن رات یہی پیشہ ہے۔ کہ اوروں کو گمراہ کرتے پھریں۔ پچاس پچاس ہزار ساٹھ ساٹھ ہزار بلکہ لاکھوں پرچے ہر روز شائع کرتے ہیں اور اس باطل عقیدہ کی اشاعت کے لیے ہر طرح کے بہانے عمل میں لاتے ہیں۔

(الحکم ۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳-۴)

وَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْفَاتِحَةَ اُمُّ الْكِتَابِ وَاَنَّهَا تَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَفِيْهَا ذِكْرُ اَخْيَارِ اُمَّةٍ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَذِكْرُ شَرِّهِمُ الَّذِيْنَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا وَذِكْرُ الَّذِيْنَ اخْتُتِمَتْ عَلَيْهِمْ هٰذِهِ السُّوْرَةُ اَعْنِي الضَّآلِّيْنَ ۔ وَقَدْ اَقْرَرْتُمْ بِاَنَّهُمُ النَّصَارٰى وَاَخَّرَ اللّٰهُ ذِكْرَهُمْ فِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ لِيُعْلَمَ اَنَّ فِتْنَتَهُمْ اٰخِرُ الْفِتَنِ فَلَمْ يَبْقَ لِدَجَّالِكُمْ مَوْضِعُ قَدَمٍ يَّا اُولِي النُّهٰى ۔ وَاِنَّ هٰذِهِ الْفِرَقَ ثَلٰثٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَكَذَالِكَ مِنْكُمْ ثَلٰثٌ شَابَهَ بَعْضُكُمْ بَعْضَهُمْ وَضَاهٰى۔

(خطبۃ الھامیۃ صفحہ ۶۹-۷۰)

وَقَدْ سَمَّى اللّٰهُ تِلْكَ الْيَهُوْدَ الْمَغْضُوْبَ عَلَيْهِمْ وَحَذَّرَكُمْ فِيْ اُمِّ الْكِتَابِ اَنْ تَكُوْنُوْا كَمِثْلِهِمْ وَذَكَّرَكُمْ اَنَّهُمْ اُهْلِكُوْا بِالطَّاعُوْنِ فَمَا لَكُمْ تَنْسَوْنَ وَصَايَا اللّٰهِ وَلَا تَتَّقُوْنَ رَبَّكُمْ وَلَا تَحْذَرُوْنَ ۔ وَلَا تُفَكِّرُوْنَ فِيْ قَوْلِ اللّٰهِ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

(ترجمہ) تم جانتے ہو کہ سورہ فاتحہ ام القرآن ہے جو کچھ حق ہے وہی فرماتی ہے اور اس میں اُن نیکوں کا ذکر ہے کہ مسلمانوں سے پہلے گذرے ہیں اور اُن بدوں کا بھی ذکر ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ہوئے ہیں اور خدا نے ان پر اسی دنیا میں غضب کیا اور ان کا بھی ذکر ہے کہ جن پر اس سورۃ کو ختم کیا گیا ہے یعنی فرقہ ضالین اور تم اقرار کرتے ہو کہ وہ فرقہ ضالین نصاریٰ ہی ہیں اور خدا نے سب سے بعد اس سورۃ کے آخر میں ان کا ذکر کیا ہے تاکہ جان لو کہ نصاریٰ کا فتنہ تمام فتنوں کے پیچھے ہے پس تمہارے دجال کے لیے قدم رکھنے کی جگہ نہیں رہی اور یہ تین فرقے ہیں اہل کتاب کے اور اسی طرح تم میں بھی تین فرقے ہیں کہ بعض بعض کے مشابہ ہو گئے۔

خدا نے ان یہودیوں کا نام مغضوب علیہم رکھا اور سورہ فاتحہ میں تم کو اس بات سے ڈرایا کہ تم اُن جیسے ہو جاؤ اور تم کو یاد دلایا کہ وہ طاعون سے ہلاک کیے گئے۔ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم خدا کے حکموں کو بھول گئے اور اُس سے نہیں ڈرتے

وَلَمْ يَقُلْ غَيْرِ الْيَهُوْدِ فَاِنَّهٗ اَوْمٰى فِىْ هٰذِهٖ اِلٰى عَذَابٍ اَصَابَهُمْ وَاِلٰى عَذَابٍ يُّصِيْبُكُمْ اِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ وَاِنَّهٗ نَبَأٌ عَظِيْمٌ وَّقَدْ ظَهَرَتْ اٰثَارُهٗ وَاِنَّ فِىْ هٰذَا لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يُّفَكِّرُوْنَ ۞ (خُطْبَۃ اِلہَامِیَّۃ صفحہ ۸۹، ۹۰)

وَاِنَّ الْفَاتِحَةَ كَفَتْ لِسَعِيْدٍ يَّطْلُبُ الْحَقَّ وَلَا يَمُرُّ عَلَيْنَا كَالَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ ذَكَرَ فِيْهِ فِرَقًا ثَلٰثًا خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَهُمُ الْمُنْعَمُ عَلَيْهِمْ وَالْمَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلُّوْنَ ـ ثُمَّ جَعَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةَ فِرْقَةً رَّابِعَةً وَّاَوْمَأَ الْفَاتِحَةُ اِلٰى اَنَّهُمْ وَرِثُوْا تِلْكَ الثَّلٰثَةَ اِمَّا مِنَ الْمُنْعَمِ عَلَيْهِمْ اَوْ مِنَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اَوْ مِنَ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ وَيَتَنَصَّرُوْنَ وَاَمَرَ اَنْ يَّسْئَلَ الْمُسْلِمُوْنَ رَبَّهُمْ اَنْ يَّجْعَلَهُمْ مِّنَ الْفِرْقَةِ الْاُوْلٰى وَلَا يَجْعَلَهُمْ مِّنَ الَّذِيْنَ غَضِبَ عَلَيْهِمْ وَلَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ الَّذِيْنَ يَعْبُدُوْنَ عِيْسٰى وَبِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ـ وَكَانَ فِىْ هٰذَا اَنْبَآءٌ ثَلٰثَةٌ لِّقَوْمٍ يَّتَفَرَّسُوْنَ ـ فَلَمَّا جَآءَ وَقْتُ هٰذِهِ الْاَنْبَآءِ بَدَءَ اللّٰهُ مِنَ الضَّآلِّيْنَ كَمَآ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ فَخَرَجَ النَّصَارٰى مِنْ دَيْرِهِمْ بِقُوَّةٍ لَّا يَدَانِ لَهَا وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ وَزُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا

خدا تعالیٰ کی کلام میں غور نہیں کرتے کہ غیر المغضوب فرمایا غیر الیہود نہیں فرمایا کیونکہ اس میں اشارہ اس عذاب کی طرف ہے جو ان کو پہنچا اور جو تمہیں پہنچے گا اگر تم باز نہ آئے پس کیا ممکن ہے کہ تم بچے رہو اور یہ بڑی اطلاع ہے اور اس کے نشان ظاہر ہو گئے اور اس میں ان کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں۔

اور فاتحہ کی سورۃ اس سعادت مند کے لیے جو حق تلاش کرتا اور ہمارے سامنے سے متکبر کی طرح نہیں گذرتا کافی ہے کیونکہ خدا نے اس سورۃ میں تین فرقوں کا ذکر کیا ہے جو اگلے زمانہ میں گذرے اور وہ یہ ہیں منعم علیہم اور مغضوب علیہم اور ضالین۔ پھر اس امت کو چوتھا فرقہ قرار دیا اور فاتحہ میں اشارہ کیا کہ وہ ان تین فرقوں میں سے یا تو منعم علیہم کے وارث ہونگے یا مغضوب علیہم کے وارث ہونگے یا ضالین کے وارث ہوں گے اور حکم دیا ہے کہ مسلمان اپنے رب سے چاہیں کہ ان کو پہلے فرقہ میں سے بنا دے اور مغضوب علیہم اور ضالین میں سے نہ بنا دے جو (ضالین) عیسیٰ کو پوجتے ہیں اور اپنے پروردگار کے برابر بناتے ہیں اور اس میں اُن کے لیے جو فراست سے کام لیتے ہیں تین پیشگوئیاں ہیں۔ پس جب ان پیشگوئیوں کا وقت پہنچ گیا خدا نے ضالین سے شروع کیا جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔ پس نصاریٰ ایسی قوت کے ساتھ اپنے گرجاؤں سے نکلے ہیں کہ کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا اور وہ ہر ایک اونچائی پر سے دوڑتے ہیں اور زمین ہلنے لگی اور اپنے سب بوجھ

وَاَخرَجَتْ اَثقَالَهَا وَتَنَصَّرَ فَوْجٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ كَمَا اَنْتُمْ تُشَاهِدُوْنَ ثُمَّ جَآءَ وَقْتُ النَّبَاءِ الثَّانِيْ اَعْنِيْ وَقْتَ خُرُوْجِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ كَمَا كَانَ الْوَعْدُ الرَّبَّانِيُّ فَصَارَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰى سِيْرَةِ الْيَهُوْدِ الَّذِيْنَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَصَارَتْ اَهْوَآءُهُمْ كَاَهْوَآءِهِمْ وَاٰرَآءُهُمْ كَاٰرَآءِهِمْ وَرِيَآءُهُمْ كَرِيَآءِهِمْ وَشَحْنَآءُهُمْ كَشَحْنَآءِهِمْ وَاِبَآءُهُمْ كَاِبَآءِهِمْ يَكْذِبُوْنَ وَيَفْسُقُوْنَ۔ وَيَظْلِمُوْنَ وَيَسْتَكْبِرُوْنَ وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يَّسْفِكُوا الدِّمَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّمُلِئَتْ نُفُوْسُهُمْ شُحًّا وَّبُخْلًا وَّحَسَدًا وَّضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ فَهُمْ لَا يُكْرَمُوْنَ فِي السَّمَآءِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمِنْ كُلِّ بَابٍ يُّطْرَدُوْنَ وَكَذَالِكَ مُلِئَتِ الْاَرْضُ ظُلْمًا وَّجَوْرًا وَّقَلَّ الصَّالِحُوْنَ فَنَظَرَ اللّٰهُ اِلَى الْاَرْضِ فَوَجَدَ اَهْلَهَا فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ۔ ظُلْمَةِ الْجَهْلِ وَظُلْمَةِ الْفِسْقِ وَظُلْمَةِ الدَّاعِيْنَ اِلَى التَّثْلِيْثِ وَالْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ فَتَذَكَّرَ فَضْلًا وَّرُحْمًا وَّعْدَهُ الثَّالِثَ الَّذِيْ يَدْعُوْنَ لَهُ الدَّاعُوْنَ فَاَنْعَمَ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِاِرْسَالِ مَثِيْلِ عِيْسٰى وَهَلْ يُنْكِرُ بَعْدَهٗ اِلَّا الْعَمُوْنَ ۔ (خطبۃ الہامیۃ صفحہ ۹۹ تا ۱۰۳)

اُگل دئے اور مسلمانوں میں سے بہت سے نصرانی ہو گئے۔ پھر دوسری خبر کا وقت پہنچا یعنی مغضوب علیہم کے نکلنے کا وقت جیسا کہ خدا نے وعدہ فرمایا تھا پس مسلمانوں کے ایک گروہ نے یہودیوں کی راہ اور نمونہ اختیار کر لیا جو خدا کے غضب کے نیچے تھے اور ان کی خواہشیں اور ریا اور کینہ اور دشمنی اور سرکشی بالکل اُن جیسی ہو گئی۔ جھوٹ بولتے ہیں اور زنہ کاری کرتے ہیں اور ظلم اور تکبر کرتے ہیں۔ اور ناحق خون کرنے کو دوست رکھتے ہیں اور ان کے نفس حرص اور طمع اور بخل اور حسد سے بھر گئے ہیں اور وہ ذلیل ہو گئے ہیں نہ آسمان میں ان کی عزت ہے اور نہ زمین میں اور ہر ایک طرف سے دھتکارے جاتے ہیں اور اسی طرح زمین ظلم اور جور سے بھر گئی اور نیک لوگ کم ہو گئے۔ ایسے وقت میں خدا نے زمین کو دیکھا اور زمین والوں کو تین طرح کی تاریکی میں پایا۔ ایک جہالت کا اندھیرا دوسرے فسق کا اندھیرا تیسرے ان لوگوں کا اندھیرا جو تثلیث اور شیطان کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے فضل اور رحم کر کے تیسرے وعدہ کو یاد کیا جس کے لیے دعا کرنے والے دعا کرتے تھے۔ پس مثیل عیسیٰ کو بھیجنے سے اس امت پر انعام کیا اور اس پر اندھوں کے سوا اور کوئی انکار نہیں کرتا۔

فَفَکِّرُوْا فِیْ اُمِّ الْکِتٰبِ حَقَّ الْفِکْرِ لِمَ حَذَّرَکُمُ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنُوْا الْمَغْضُوْبَ عَلَیْہِمْ مَا لَکُمْ لَا تُفَکِّرُوْنَ۔ فَاعْلَمُوْا اَنَّ السِّرَّ فِیْہِ اَنَّ اللّٰہَ کَانَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ سَوْفَ یُبْعَثُ فِیْکُمُ الْمَسِیْحُ الثَّانِیْ کَاَنَّہٗ ھُوَ وَکَانَ یَعْلَمُ اَنَّ حِزْبًا مِّنْکُمْ یُکَفِّرُوْنَہٗ وَیُکَذِّبُوْنَہٗ وَیُحَقِّرُوْنَہٗ وَیَشْتُمُوْنَہٗ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّقْتُلُوْہُ وَیَلْعَنُوْنَہٗ فَعَلَّمَکُمْ ھٰذَا الدُّعَآءَ رُحْمًا عَلَیْکُمْ وَاِشَارَۃً اِلٰی نَبَاٍ قَدَّرَہٗ فَقَدْ جَآءَکُمْ مَّسِیْحُکُمْ فَاِنْ لَّمْ تَنْتَھُوْا فَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ وَ ثَبَتَ مِنْ ھٰذَا الْمَقَامِ اَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ عِنْدَ اللّٰہِ الْعَلَّامِ ھُمُ الْیَھُوْدُ الَّذِیْنَ فَرَّطُوْا فِیْ اَمْرِ عِیْسٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ وَکَفَّرُوْہُ وَاٰذَوْہُ وَلُعِنُوْا عَلٰی لِسَانِہٖ فِی الْقُرْاٰنِ وَکَذَالِکَ مَنْ شَابَھَھُمْ مِّنْکُمْ بِتَکْفِیْرِ مَسِیْحِ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَتَکْذِیْبِہٖ وَاِیْذَآءِہٖ بِاللِّسَانِ وَالتَّمَنِّیْ لِقَتْلِہٖ وَلَوْ بِالْبُھْتَانِ کَمَا اَنْتُمْ تَفْعَلُوْنَ وَ الْمُرَادُ مِنْ قَوْلِہٖ الضَّآلِّیْنَ النَّصَارٰی الَّذِیْنَ اَفْرَطُوْا فِیْ اَمْرِ عِیْسٰی وَاَطْرَءُوْہُ وَقَالُوْا اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ وَ ھُوَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ یَعْنِی الثَّالِثَ الَّذِیْ یُوْجَدُ فِیْہِ الثَّلٰثَۃُ کَمَا ھُمْ یَعْتَقِدُوْنَ۔ وَالْمُرَادُ مِنْ قَوْلِہٖ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ ھُمُ النَّبِیُّوْنَ وَالْاَخْیَارُ الْاٰخَرُوْنَ مِنْ بَنِیْ

چاہیئے کہ ام الکتاب میں خوب غور کرو کہ کیوں تم کو خدا نے اس سے ڈرایا کہ تم مغضوب علیہم ہو جاؤ۔ جان لو کہ اس میں یہ راز تھا کہ خدا جانتا تھا کہ مسیح ثانی تم میں پیدا ہوگا اور گویا وہ وہی ہوگا اور خدا جانتا تھا کہ ایک گروہ تم میں سے اس کو کافر اور جھوٹا کہے گا اسے گالیاں دیں گے اور حقیر جانیں گے اور اس کے قتل کا ارادہ کریں گے اور اس پر لعنت کریں گے۔ پس اس نے رحم کر کے اور اس خبر کی طرف جو مقدر تھی اشارہ کے لیے یہ دعا تم کو سکھائی پس تمہارا مسیح تمہارے پاس آ گیا اب اگر تم ظلم سے باز نہ آئے تو ضرور پکڑے جاؤ گے اور اس مقام سے ثابت ہوا کہ خدا کے نزدیک مغضوب علیہم سے وہ یہودی مراد ہیں جنھوں نے عیسیٰ کے معاملہ میں ناانصافی کی اور اس کو کافر کہا اور اس کو ستایا اور قرآن میں اس کی زبان پر لعنت کیے گئے۔ اور اسی طرح تم میں سے وہ جو مسیح آخر الزمان کی تکفیر اور زبان سے اس کی تکذیب اور ایذا اور اس کے قتل کی آرزو کی وجہ سے اُن یہودیوں سے مشابہ ہو گئے۔ اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں حد سے گذر گئے اور کہا کہ مسیح ہی خدا ہے اور وہ تین میں سے ایک ہے ایسا کہ دونوں اس کے وجود میں موجود ہیں اور انعمت علیہم سے وہ انبیا اور بنی اسرائیل کے آخری

إِسْرَآئِيْلَ الَّذِيْنَ صَدَّقُوا الْمَسِيْحَ وَمَا فَرَّطُوْا فِيْ أَمْرِهٖ وَمَا أَفْرَطُوْا بِأَقَاوِيْلَ
وَكَذَالِكَ الْمُرَادُ عِيْسَى الْمَسِيْحُ الَّذِيْ خُتِمَتْ عَلَيْهِ تِلْكَ السِّلْسِلَةُ وَانْتَقَلَتِ
النُّبُوَّةُ وَسُدَّ بِهٖ مَجْرَى الْفَيْضِ كَأَنَّهُ الْعَرِمَةُ وَكَأَنَّهٗ لِهٰذَا الْاِنْتِقَالِ الْعَلَمُ
وَالْعَلَامَةُ أَوِ الْحَشْرُ وَالْقِيَامَةُ كَمَا أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ وَكَذَالِكَ الْمُرَادُ مِنْ
أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ فِيْ هٰذِهِ الْآيَةِ هُوَ سِلْسِلَةُ أَبْدَالِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ الَّذِيْنَ صَدَّقُوْا
مَسِيْحَ آخِرِ الزَّمَانِ وَآمَنُوْا بِهٖ وَقَبِلُوْهُ بِصِدْقِ الطَّوِيَّةِ وَالْجَنَانِ أَعْنِي الْمَسِيْحَ
الَّذِيْ خُتِمَتْ عَلَيْهِ هٰذِهِ السِّلْسِلَةُ وَهُوَ الْمَقْصُوْدُ الْأَعْظَمُ مِنْ قَوْلِهٖ أَنْعَمْتَ
عَلَيْهِمْ كَمَا تَقْتَضِي الْمُقَابَلَةُ۔ وَلَا يُنْكِرُهُ الْمُتَدَبِّرُوْنَ۔ فَإِنَّهٗ إِذَا عُلِمَ بِالْقَطْعِ وَ
الْيَقِيْنِ وَالتَّصْرِيْحِ وَالتَّعْيِيْنِ أَنَّ الْمَغْضُوْبَ عَلَيْهِمْ هُمُ الْيَهُوْدُ الَّذِيْنَ كَفَّرُوا
الْمَسِيْحَ وَحَسِبُوْهُ مِنَ الْمَلْعُوْنِيْنَ كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ قَرِيْنَةُ قَوْلِهِ الضَّآلِّيْنَ فَلَا
يَسْتَقِيْمُ التَّرْتِيْبُ وَلَا يَحْسُنُ نِظَامُ كَلَامِ الرَّحْمٰنِ إِلَّا بِأَنْ يُّعْنٰى مِنْ أَنْعَمْتَ
عَلَيْهِمْ مَسِيْحُ آخِرِ الزَّمَانِ فَإِنَّ رِعَايَةَ الْمُقَابَلَةِ مِنْ سُنَنِ الْقُرْآنِ وَمِنْ أَهَمِّ
أُمُوْرِ الْبَلَاغَةِ وَحُسْنِ الْبَيَانِ وَلَا يُنْكِرُهٗ إِلَّا الْجَاهِلُوْنَ فَظَهَرَ مِنْ هٰذَا الْمَقَامِ

برگزیدے مراد ہیں جنھوں نے مسیح کی تصدیق کی اور اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور باتوں سے اس مسیح
کے حق میں زیادتی نہیں کی اور اسی طرح مراد لفظ انعمت علیہم سے عیسیٰ مسیح ہے جس پر وہ سلسلہ ختم ہوا اور اس کے
وجود سے فیض کا چشمہ بند ہوگیا گویا کہ اس کا وجود اس انتقال کے لیے ایک نشانی یا حشر اور قیامت تھا اور اسی طرح
انعمت علیہم سے مراد اس امت کے ابدالوں کا سلسلہ مراد ہے جنہوں نے مسیح آخرالزمان کی تصدیق کی اور صدق دل
سے اس کو قبول کیا یعنی اس مسیح کو جس پر یہ سلسلہ ختم ہوا اور انعمت علیہم سے وہی مقصود اعظم ہے کیونکہ مقابلہ اسی کا مقتضی
ہے اور تدبر کرنے والے اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور پھر جب اس بات کا قطعی۔ یقینی۔ صراحت اور تعیین کے
ساتھ علم ہوگیا کہ مغضوب علیہم وہی یہودی ہیں جنہوں نے مسیح کو کافر کہا اور اس کو ملعون جانا جیسا کہ الضالین کا
لفظ اس پر دلالت کرتا ہے اس لیے ترتیب ٹھیک نہیں بیٹھتی اور قرآن کے کلام کا نظام درست نہیں ہوتا
سوائے اس کے کہ انعمت علیہم سے آخر زمانہ کا مسیح مراد لیا جائے کیونکہ قرآن شریف کی عادت ہے کہ مقابلہ
کی رعایت رکھتا ہے اور مقابلہ کی رعایت رکھنا اعلیٰ درجہ کی بلاغت اور حسن بیان میں داخل ہے اور جاہل کے سوا
کوئی اس معنے سے انکار نہیں کرتا اس مقام سے اچھی طرح سے معلوم ہوا کہ جو کوئی نماز میں یا نماز سے باہر اس دعا کو

بِالظُّهُوْرِ الْبَیِّنِ التَّامِّ اَنَّہٗ مَنْ قَرَءَ ھٰذَا الدُّعَآءَ فِیْ صَلَاتِہٖ اَوْ خَارِجَ الصَّلَاۃِ فَقَدْ سَاَلَ رَبَّہٗ اَنْ یُّدْخِلَہٗ فِیْ جَمَاعَۃِ الْمَسِیْحِ الَّذِیْ یُکَفِّرُہٗ قَوْمُہٗ وَیُکَذِّبُوْنَہٗ وَیُفَسِّقُوْنَہٗ وَیَحْسَبُوْنَہٗ شَرَّ الْمَخْلُوْقَاتِ وَیُسَمُّوْنَہٗ دَجَّالًا وَّمُلْحِدًا ضَالًّا کَمَا سَمّٰی عِیْسٰی اَلْیَھُوْدُ الْمَلْعُوْنُ۔ (خطبۃ الہامیۃ صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۶)

فَالَّذِیْنَ سَمَّاھُمُ اللّٰہُ الْمَغْضُوْبَ عَلَیْھِمْ فِی الْفَاتِحَۃِ ھُمُ الْیَھُوْدُ الَّذِیْنَ کَذَّبُوا الْمَسِیْحَ وَاَرَادُوْا اَنْ یُّصَلِّبُوْہُ وَیَعْلَمُہُ الْعَالِمُوْنَ۔ وَاِنَّ لَفْظَ الضَّآلِّیْنَ الَّذِیْ وَقَعَ بَعْدَ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ قَرِیْنَۃٌ قَطْعِیَّۃٌ عَلٰی ھٰذَا الْمَعْنٰی وَلَا یَرْتَابُ فِیْہِ اِلَّا الْجَاھِلُوْنَ فَاِنَّ الضَّآلِّیْنَ قَوْمٌ اَفْرَطُوْا فِیْ اَمْرِ عِیْسٰی فَثَبَتَ مِنْ ھٰذَا اَنَّ الْمَغْضُوْبَ عَلَیْھِمْ قَوْمٌ فَرَّطُوْا فِیْ اَمْرِہٖ وَھٰذَانِ اِسْمَانِ مُتَقَابِلَانِ اَیُّھَا النَّاظِرُوْنَ۔ ثُمَّ خَوَّفَکُمُ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنُوْا کَمِثْلِھِمْ فَیَحِلَّ الْغَضَبُ عَلَیْکُمْ کَمَا حَلَّ عَلٰی اَعْدَآءِ الْمَسِیْحِ وَمَسَّھُمْ لَعْنَتُہُ الْمَذْکُوْرَۃُ فِی الْقُرْاٰنِ۔ خطبۃ الہامیۃ صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۱)

وَتَفْصِیْلُ الْمَقَامِ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَخْبَرَ عَنْ بَعْضِ الْیَھُوْدِ فِی السُّوْرَۃِ الْفَاتِحَۃِ اَنَّھُمْ کَانُوْا مَحَلَّ غَضَبِ اللّٰہِ فِیْ زَمَنِ عِیْسَی ابْنِ الصِّدِّیْقَۃِ فَاِنَّھُمْ کَفَّرُوْہُ وَاٰذَوْہُ وَاَثَارُوْا لَہٗ

پڑھتا ہے وہ اپنے پروردگار سے سوال کرتا ہے کہ اس کو اُس مسیح کی جماعت میں داخل فرماوے جس کو اس کی قوم کافر کہے گی اور اس کی تکذیب کرے گی اور اس کو سب مخلوقات سے بدتر سمجھے گی اور اس کا نام دجال اور ملحد اور گمراہ رکھے گی جیسا کہ یہود ملعون نے عیسٰی کا نام رکھا تھا۔

پس وہ لوگ جن کو خدا نے فاتحہ میں مغضوب علیہم کہا ہے وہی یہودی ہیں جنہوں نے مسیح کی تکذیب کی اور چاہا کہ اسے سولی دیں۔ اور ضالین کا لفظ جو مغضوب علیہم کے بعد واقع ہوا ان معنوں پر یقینی قرینہ ہے اس پر جاہل کے سوا کوئی شک نہیں لاتا۔ کیونکہ ضالین وہ لوگ ہیں جنہوں نے عیسٰی کے بارہ میں افراط کیا۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی نسبت تفریط کی اور یہ دو نام ایک دوسرے کے مقابل پر واقع ہوئے ہیں۔ پھر خدا نے تم کو اس بات سے ڈرایا کہ تم ان کی طرح ہو جاؤ اور انجام کار وہی غضب تم پر اترے جیسا کہ مسیح کے دشمنوں پر نازل ہوا اور وہ لعنت ان کے شامل حال ہوئی جس کا قرآن میں ذکر ہے۔

اس مقام کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ خدا تعالیٰ سورہ فاتحہ میں اُن بعض یہودیوں کی نسبت اطلاع دیتا ہے جن پر عیسٰی بن صدیقہ کے زمانہ میں خدا کا غضب ان پر نازل ہوا کیونکہ انہوں نے اس کو کافر کہا اور ستایا اور ہر طرح کا فتنہ اٹھایا۔

كُلِّ نَوْعِ الْفِتْنَةِ ثُمَّ اَشَارَ اِلٰى اَنَّ طَآئِفَةً مِّنْكُمْ كَمِثْلِهِمْ يَكْفُرُوْنَ مَسِيْحَهُمْ وَيُكَمِّلُوْنَ جَمِيْعَ اَنْحَآءِ الْمُشَابَهَةِ وَيَفْعَلُوْنَ بِهٖ مَاكَانُوْا يَفْعَلُوْنَ - وَاَنْتُمْ تَقْرَءُوْنَ اٰيَةَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ثُمَّ لَا تَلْتَفِتُوْنَ - اَعَلَّمَكُمُ اللّٰهُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ عَبَثًا كَوَضْعِ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ اَوْ كَتَبَهَا لِتَذْكِيْرِ جَرِيْمَةٍ تَرْتَكِبُوْنَهَا مَالَكُمْ لَا تُمْعِنُوْنَ وَمَاغَضِبَ اللّٰهُ عَلٰى تِلْكَ الْيَهُوْدِ اِلَّا لِمَاكَفَّرُوْا رَسُوْلَهٗ عِيْسٰى وَكَذَّبُوْهُ وَشَتَمُوْهُ وَكَادُوْا اَنْ يَّقْتُلُوْهُ مِنَ الْحَسَدِ وَالْهَوٰى - وَقَدْ كُتِبَ عَلَيْكُمْ قَدَرُ اللّٰهِ اَنَّكُمْ تَفْعَلُوْنَ بِمَسِيْحِكُمْ كَمَا فَعَلَ الْيَهُوْدُ بِمَسِيْحِهِمْ -

(خُطْبَۃ اِلْہَامِیَّۃ صفحہ ۱۳۶ تا ۱۴۰)

اِنَّ لَفْظَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ قَدْ حَذٰى لَفْظَ الضَّآلِّيْنَ اَعْنِيْ وَقَعَ ذَالِكَ بِحِذَآءِ هٰذَا كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُبْصِرِيْنَ فَثَبَتَ بِالْقَطْعِ وَالْيَقِيْنِ اَنَّ مَغْضُوْبَ عَلَيْهِمْ هُمُ الَّذِيْنَ فَرَّطُوْا فِيْ اَمْرِ عِيْسٰى بِالتَّكْفِيْرِ وَالْاِيْذَاءِ وَالتَّوْهِيْنِ كَمَا اَنَّ الضَّآلِّيْنَ هُمُ الَّذِيْنَ اَفْرَطُوْا فِيْ اَمْرِهٖ بِاتِّخَاذِهٖ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ۞ (خُطْبَۃ اِلْہَامِیَّۃ صفحہ ۱۲۲ حاشیہ)

پھر خدا تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ یہود کی طرح اپنے مسیح کی تکفیر کریگا اور ہر طرح کی مشابہت ان سے پیدا کرلیں گے اور ان کے ہاتھوں سے وہ سب کام ہوں گے جو یہود نے کیے اور تم مغضوب علیہم کی آیت پڑھتے ہو پھر اس کی طرف توجہ نہیں کرتے کیا خدا نے یونہی یہ سورۃ تم کو سکھلائی جیسا کہ کوئی کسی چیز کو بے ٹھکانے رکھ دے یا اس سورۃ کو اس لیے اتارا کہ تم کو وہ گناہ یاد دلائے جو تمہارے ہاتھ سے ہوگا کیوں غور سے نہیں دیکھتے اور خدا اُن یہودیوں پر عیسیٰ کو کافر کہنے کے سبب اور اس کی تکذیب اور اُس کو گالیاں دینے کے سبب غضب ناک ہوا اور اس لیے بھی کہ وہ ہوا و حسد کے مارے چاہتے تھے کہ اس کو قتل کر دیں خدا تعالیٰ کی تقدیر تمہارے حق میں اسی طرح جاری ہوئی ہے کہ تم اپنے مسیح سے وہی کرو جو یہود نے اپنے مسیح سے کیا۔

لفظ مغضوب علیہم ضالین کے لفظ کے مقابل میں ہے یعنی وہ لفظ اس لفظ کے مقابل پڑا ہے جیسا کہ دیکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں پس قطع اور یقین سے ثابت ہوگیا کہ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں تفریط کی اور کافر قرار دیا اور دُکھ دیا اور اہانت کی اور ضالین سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں افراط کیا اور ان کو خدا قرار دیدیا۔

ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ فِیْ ھٰذِہِ السُّوْرَۃِ الْمُبَارَکَۃِ یُبَیِّنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ مَاکَانَ اٰخِرُ شَاْنِ اَھْلِ الْکِتَابِ وَیَقُوْلُ اِنَّ الْیَھُوْدَ عَصَوْا رَبَّھُمْ بَعْدَ مَا نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ الْاِنْعَامَاتُ وَتَوَاتَرَتِ التَّفَضُّلَاتُ فَصَارُوْا قَوْمًا مَّغْضُوْبًا عَلَیْہِ وَالنَّصَارٰی نَسُوْا صِفَاتَ رَبِّھِمْ وَاَنْزَلُوْہُ مَنْزِلَ الْعَبْدِ الضَّعِیْفِ الْعَاجِزِ فَصَارُوْا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ؁

وَفِی السُّوْرَۃِ اِشَارَۃٌ اِلٰی اَنَّ اَمْرَ الْمُسْلِمِیْنَ سَیَئُوْلُ اِلٰی اَمْرِ اَھْلِ الْکِتَابِ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ فَیُشَابِھُوْنَھُمْ فِیْ اَفْعَالِھِمْ وَاَعْمَالِھِمْ فَیُدْرِکُھُمُ اللّٰہُ تَعَالٰی بِفَضْلٍ مِّنْ لَّدُنْہُ وَاِنْعَامٍ مِّنْ عِنْدِہٖ وَیَحْفَظُھُمْ مِّنَ الْاِنْحِرَافَاتِ السَّبُعِیَّۃِ وَالْبَھِیْمِیَّۃِ وَالْوَھْمِیَّۃِ وَیُدْخِلُھُمْ فِیْ عِبَادِہِ الصَّالِحِیْنَ ؁

(کراماتُ الصَّادِقِین صفحہ ۸۳)

اسی طرح احادیث صحیحہ میں بھی ذکر تھا۔ کہ آخری زمانہ میں اکثر حصّہ مسلمانوں کا یہودیوں سے مشابہت پیدا کرلیگا۔ اور سورۃ فاتحہ میں بھی اسی کی طرف اشارہ تھا۔ کیونکہ اس میں یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ کہ اے خدا ہمیں ایسے یہودی بننے سے محفوظ رکھ جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وقت میں تھے۔ اور ان کے مخالف تھے جن پر خدا تعالیٰ کا غضب اسی دنیا میں نازل ہوا تھا۔ اور یہ عادت اللہ ہے۔ کہ جب خدا تعالیٰ کسی قوم کو کوئی حکم دیتا ہے۔ یا ان کو کوئی دعا سکھلاتا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ بعض لوگ ان میں سے اس گناہ کے مرتکب ہوں گے جس سے ان کو منع

(ترجمہ از مرتب) پھر جان لو کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک سورۃ میں مومنوں پر یہ واضح کرتا ہے کہ اہل کتاب کا کیا انجام ہوا اور فرماتا ہے کہ یہودیوں نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات نازل ہونے اور اُس کے فضلوں کے پے در پے اُترنے کے بعد اپنے پروردگار کی نافرمانی کی پس وہ ایک مَغْضُوْبِ عَلَیْھِم قوم بن گئے۔ اور نصارٰی نے اپنے ربّ کی صفات کو بھلا دیا اور اُسے ایک کمزور اور عاجز بندہ قرار دیدیا پس وہ ایک گمراہ قوم بن گئے۔

اور اِس سُورۃ میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا معاملہ بھی آخری زمانہ میں اہل کتاب کا سا ہوجائے گا پس وہ اپنے افعال اور اعمال میں ان (اہل کتاب) کے مشابہ ہوجائیں گے پھر (دوبارہ) اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنے خاص فضل اور اپنے اِنعام سے نوازے گا اور اُنہیں بہیمیّت، درندگی اور توہّمات والی خرابیوں اور لغزشوں سے محفوظ رکھے گا اور اُنہیں اپنے صالح بندوں میں داخل کرلیگا۔

کیا گیا ہے پس چونکہ آیۃ غیر المغضوب علیہم سے مراد وہ یہودی ہیں جو ملت موسوی کے آخری زمانہ میں یعنی حضرت مسیح کے وقت میں بباعث نہ قبول کرنے حضرت مسیح کے مورد غضب الٰہی ہوئے تھے۔ اس لیے اس آیت میں سُنت مذکورہ کے لحاظ سے یہ پیشگوئی ہے۔ کہ اُمت محمدیہ کے آخری زمانہ میں بھی اسی اُمّت میں سے مسیح موعود ظاہر ہوگا اور بعض مسلمان اس کی مخالفت کرکے ان یہودیوں سے مشابہت پیدا کریں گے جو حضرت مسیح کے وقت میں تھے۔

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۱۵-۱۶)

خدا نے بعض مسلمانوں کو یہود قرار دیدیا ہے اور صاف اشارہ کردیا ہے کہ جن بدیوں کے یہود مرتکب ہوئے تھے یعنی علماء ان کے۔ اس امت کے علماء بھی انہیں بدیوں کے مرتکب ہوں گے اور اسی مفہوم کی طرف آیت غیر المغضوب علیہم میں بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں باتفاق کل مفسرین مغضوب علیہم سے مراد وہ یہود ہیں جن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کی وجہ سے غضب نازل ہوا تھا۔ اور احادیث صحیحہ میں مغضوب علیہم سے مراد وہ یہود ہیں جو مورد غضب الٰہی دنیا میں ہی ہوئے تھے اور قرآن شریف یہ بھی گواہی دیتا ہے کہ یہود کو مغضوب علیہم ٹھہرانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر لعنت جاری ہوئی تھی۔ پس یقینی اور قطعی طور پر مغضوب علیہم سے مراد وہ یہود ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر ہلاک کرنا چاہا تھا۔ اب خدا تعالیٰ کا یہ دعا سکھلانا کہ خدایا ایسا کر کہ ہم وہی یہودی نہ بن جائیں جنہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا صاف تبلا رہا ہے کہ امت محمدیہ میں بھی ایک عیسیٰؑ پیدا ہونے والا ہے ورنہ اس دعا کی کیا ضرورت تھی اور نیز جبکہ آیات مذکورہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بعض علماء مسلمان بالکل علماء یہود سے مشابہ ہو جائیں گے اور یہود بن جائیں گے۔ پھر یہ کہنا کہ ان یہودیوں کی اصلاح کے لیے اسرائیلی عیسیٰؑ آسمان سے نازل ہوگا بالکل غیر معقول بات ہے کیونکہ اول تو باہر سے ایک نبی کے آنے سے مہر ختم نبوت ٹوٹتی ہے اور قرآن شریف صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھہراتا ہے۔ ماسوا اس کے قرآن شریف کے رو سے یہ امت خیر الامم کہلاتی ہے پس اس کی اس سے زیادہ بے عزتی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہودی بننے کے لیے تو یہ امت ہو مگر عیسیٰ باہر سے آوے۔ اگر یہ سچ ہے کہ کسی زمانہ میں اکثر علماء اس امت کے یہودی بن جائیں گے یعنی یہود خصلت ہوجائیں گے تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ان یہود کے درست کرنے کے لیے عیسیٰ باہر سے نہیں آئے گا بلکہ جیسا کہ بعض افراد کا نام یہود رکھا گیا ہے ایسا ہی اس کے مقابل پر ایک فرد کا نام عیسیٰ بھی رکھا جائے گا۔ اس بات کا انکار نہیں ہوسکتا کہ قرآن اور حدیث دونوں نے بعض افراد اس امت کا نام یہود رکھا ہے جیسا کہ آیت غیر المغضوب علیہم سے بھی ظاہر ہے کیونکہ اگر بعض افراد اس امت کے یہودی بننے والے نہ ہوتے تو دعا مذکورہ بالا ہرگز نہ سکھلائی جاتی۔ جب سے دنیا میں خدا کی کتابیں آئی ہیں خدا تعالیٰ کا ان میں یہی محاورہ ہے کہ

جب کسی قوم کو ایک بات سے منع کرتا ہے کہ مثلاً تم زنا نہ کرو یا چوری نہ کرو یا یہودی نہ بنو تو اس منع کے اندر پیشگوئی مخفی ہوتی ہے کہ بعض ان میں سے ارتکاب ان جرائم کا کریں گے۔ دنیا میں کوئی شخص ایسی نظیر پیش نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت یا ایک قوم کو خدا تعالیٰ نے کسی ناکردنی کام سے منع کیا ہو اور پھر وہ سب کے سب اس کام سے باز رہے ہوں بلکہ ضرور بعض اس کام کے مرتکب ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے توریت میں یہودیوں کو یہ حکم دیا کہ تم نے توریت کی تحریف نہ کرنا سو اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض یہود نے توریت کی تحریف کی مگر قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کہیں یہ حکم نہیں دیا کہ تم نے قرآن کی تحریف نہ کرنا بلکہ یہ فرمایا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[1] یعنی ہم نے ہی قرآن شریف کو اتارا اور ہم ہی اس کی محافظت کریں گے۔ اسی وجہ سے قرآن شریف تحریف سے محفوظ رہا۔ غرض یہ قطعی اور یقینی اور مسلم سنت الٰہی ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی کتاب میں کسی قوم یا جماعت کو ایک بُرے کام سے منع کرتا ہے یا نیک کام کے لیے حکم فرماتا ہے تو اس کے علم قدیم میں یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس کے حکم کی مخالفت بھی کریں گے پس خدا تعالیٰ کا سورہ فاتحہ میں یہ فرمانا کہ تم دعا کیا کرو کہ تم وہ یہودی نہ بن جاؤ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینا چاہا تھا جس سے دنیا میں ہی ان پر غضب الٰہی کی مار پڑی اس سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ مقدر تھا کہ بعض افراد اس امت کے جو علماء امت کہلائیں گے اپنی شرارتوں اور تکذیب مسیح وقت کی وجہ سے یہودیوں کا جامہ پہن لیں گے ورنہ ایک لغو دعا کے سکھلانے کی کچھ ضرورت نہ تھی یہ تو ظاہر ہے کہ علماء اس امت کے اس طرح کے یہودی نہیں بن سکتے کہ وہ اسرائیل کے خاندان میں سے بن جائیں اور پھر عیسیٰؑ بن مریم کو جو مدت سے اس دنیا سے گذر چکا ہے سولی دینا چاہیں کیونکہ اب اس زمانہ میں نہ وہ یہودی اس زمین پر موجود ہیں نہ وہ عیسیٰ موجود ہے پس ظاہر ہے کہ اس آیت میں ایک آئندہ واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتلانا منظور ہے کہ اس امت میں عیسیٰ مسیح کے رنگ میں آخری زمانہ میں ایک شخص مبعوث ہوگا اور اس کے وقت کے بعض علماء اسلام ان یہودی علما کی طرح اس کو دُکھ دیں گے جو عیسیٰ علیہ السلام کو دکھ دیتے تھے اور ان کی شان میں بدگوئی کریں گے بلکہ احادیث صحیحہ سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہودی بننے کے یہ معنی ہیں کہ یہودیوں کی بداخلاق اور بدعادات علماء اسلام میں پیدا ہو جائیں گی اور گو بظاہر مسلمان کہلائیں گے مگر ان کے دل مسخ ہو کر ان یہودیوں کے رنگ سے رنگین ہو جائیں گے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دُکھ دیکر مورد غضب الٰہی ہوئے تھے پس جب کہ یہودی یہی لوگ بنیں گے جو مسلمان کہلاتے ہیں تو کیا یہ اس امت مرحومہ کی بے عزتی نہیں کہ یہودی بننے کے لیے تو یہ مقرر کیے جائیں مگر مسیح جو ان یہودیوں کو درست کریگا وہ باہر سے آوے یہ تو قرآن شریف کے منشاء کے سراسر برخلاف ہے۔ قرآن شریف نے سلسلہ محمدیہ کو ہر ایک نیکی اور بدی میں سلسلہ موسویہ کے مقابل رکھا ہے نہ صرف بدی میں ماسوا اس کے آیت غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا

[1] الحجر: ۱۰

صریح یہ منشاء ہے کہ وہ لوگ یہودی اس لیے کہلائیں گے کہ خدا کے مامور کو جو ان کی اصلاح کے لیے آئے گا بنظرِ تحقیر و انکار دیکھیں گے اور اس کی تکذیب کریں گے اور اس کو قتل کرنا چاہیں گے اور اپنے قوی غضبیہ کو اس کی مخالفت میں بھڑکائیں گے اس لیے وہ آسمان پر مغضوب علیہم کہلائیں گے۔ ان یہودیوں کی مانند جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکذب تھے جس تکذیب کا آخر کار نتیجہ یہ ہوا تھا کہ سخت طاعون یہود میں پڑی تھی اور بعد اس کے طیطوس رومی کے ہاتھ سے وہ نیست و نابود کیے گئے تھے پس آیت غیر المغضوب علیہم سے ظاہر ہے کہ دنیا میں ہی کوئی غضب اُن پر نازل ہوگا کیونکہ آخرت کے غضب میں تو ہر ایک کافر شریک ہے اور آخرت کے لحاظ سے تمام کافر مغضوب علیہم ہیں پھر کیا وجہ کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں خاص کرکے ان یہودیوں کا نام مغضوب علیہم رکھا جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو سولی دینا چاہا تھا۔ بلکہ اپنی دانست میں سولی دے چکے تھے۔ پس یاد رہے کہ ان یہودیوں کو مغضوب علیہم کی خصوصیت اس لیے دی گئی کہ دنیا میں ہی ان پر غضب الٰہی نازل ہوا تھا اور اسی بناء پر سورہ فاتحہ میں اس امت کو یہ دعا سکھلائی گئی کہ خدایا ایسا کر کہ وہی یہودی ہم نہ بن جائیں یہ ایک پیشگوئی تھی جس کا یہ مطلب تھا کہ جب اس امت کا مسیح مبعوث ہوگا تو اس کے مقابل پر وہ یہود بھی پیدا ہو جائیں گے۔ جن پر اسی دنیا میں خدا کا غضب نازل ہوگا پس اس دعا کا یہ مطلب تھا کہ یہ مقدّر ہے کہ تم میں سے بھی ایک مسیح پیدا ہوگا اور اس کے مقابل پر یہود پیدا ہوں گے جن پر دنیا میں ہی غضب نازل ہوگا۔ سو تم دُعا کرتے رہو کہ تم ایسے یہود نہ بن جاؤ۔

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یوں تو ہر ایک کافر قیامت میں مورد غضب الٰہی ہے لیکن اس جگہ غضب سے مراد دنیا کا غضب ہے جو مجرموں کے سزا دینے کے لیے دنیا میں ہی نازل ہوتا ہے اور وہ یہودی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دکھ دیا تھا اور بموجب نصّ قرآن کریم ان کی زبان پر لعنتی کہلائے تھے وہ وہی لوگ تھے جن پر دنیا میں ہی عذاب کی مار پڑی تھی یعنی اول سخت طاعون سے وہ ہلاک کیے گئے تھے اور پھر جو باقی رہ گئے تھے وہ طیطوس رومی کے ہاتھ سے سخت عذاب کے ساتھ ملک سے منتشر کیے گئے تھے پس غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ میں یہی عظیم الشان پیشگوئی مخفی ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں میں سے یہودی کہلائیں گے وہ بھی ایک مسیح کی تکذیب کریں گے جو اس پہلے مسیح کے رنگ پر آئیگا یعنی نہ وہ جہاد کریگا اور نہ تلوار اٹھائے گا بلکہ پاک تعلیم اور آسمانی نشانوں کے ساتھ دین کو پھیلائے گا اور اس آخری مسیح کی تکذیب کے بعد بھی دنیا میں طاعون پھیلے گی اور وہ سب باتیں پوری ہوں گی جو ابتدا سے سب نبی کہتے چلے آئے ہیں اور یہ وسوسہ کہ آخری زمانہ میں وہی مسیح ابن مریم دوبارہ دنیا میں آجائے گا۔ یہ تو قرآن شریف کے منشاء کے سراسر برخلاف ہے جو شخص

قرآن شریف کو ایک تقویٰ اور ایمان اور انصاف او ر تدبّر کی نظر سے دیکھے گا۔ اس پر روز روشن کی طرح کھل جائے گا۔ کہ خداوند قادر کریم نے اس امت محمدیہ کو موسوی امت کے بالکل بالمقابل پیدا کیا ہے۔ ان کی اچھی باتوں کے بالمقابل پر اچھی باتیں دی ہیں اور ان کی بُری باتوں کے مقابل پر بُری باتیں اس امت میں بعض ایسے ہیں جو انبیاء بنی اسرائیل سے مشابہت رکھتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو مغضوب علیہم یہود سے مشابہت رکھتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گھر ہے جس میں عمدہ عمدہ آراستہ کمرے موجود ہیں جو عالیشان اور مہذب لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہیں اور جس کے بعض حصے میں پائخانے بھی ہیں اور بدر روبھی اور گھر کے مالک نے چاہا کہ اس محل کے مقابل پر ایک اور محل بنا دے کہ تا جو جو سامان اس پہلے محل میں تھا اس میں بھی موجود ہو۔ سو یہ دوسرا محل اسلام کا محل ہے اور پہلا محل موسوی سلسلہ کا محل تھا۔ یہ دوسرا محل پہلے محل کا کسی بات میں محتاج نہیں۔ قرآن شریف توریت کا محتاج نہیں اور یہ امت کسی اسرائیلی نبی کی محتاج نہیں۔ ہر ایک کامل جو اس امت کے لیے آتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے پرورش یافتہ ہے اور اس کی وحی محمدی وحی کی ظل ہے۔ یہی ایک نکتہ ہے جو سمجھنے کے لائق ہے۔ افسوس ہمارے مخالف حضرت عیسیٰؑ کو دوبارہ لاتے ہیں نہیں سمجھتے کہ مطلب تو یہ ہے کہ اسلام کو فخر مشابہت حاصل ہو نہ یہ ذلت کہ کوئی اسرائیلی نبی آوے تا امت اصلاح پاوے۔

[تذکرۃ الشہادتین۔ ایڈیشن اول مندرجہ ریویو آف ریلیجنز
بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۱۶ تا ۴۱۹]

باوجود ان تمام شہادتوں اور معجزات اور زبردست نشانوں کے مولوی لوگ میری تکذیب کرتے ہیں اور ضرور تھا کہ ایسا ہی کرتے تا پیشگوئی آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کی پوری ہو جاتی۔

[تذکرۃ الشہادتین۔ ایڈیشن اول مندرجہ ریویو آف ریلیجنز
بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء صـ ۴۳۵]

مَیں ایک فضل کی طرح اہل حق کے لیے آیا پر مجھ سے ٹھٹھا کیا گیا اور مجھے کافر اور دجال ٹھہرایا گیا اور بے ایمانوں میں سے مجھے سمجھا گیا۔ اور ضرور تھا کہ ایسا ہی ہوتا تا وہ پیشگوئی پوری ہوتی جو آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کے اندر مخفی ہے کیونکہ خدا نے منعم علیہم کا وعدہ کر کے اس آیت میں بتا دیا ہے کہ اس امت میں وہ یہودی بھی ہوں گے جو یہود کے علماء سے مشابہ ہوں گے۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو سولی دینا چاہا اور جنہوں نے عیسیٰؑ کو کافر اور دجال اور ملحد قرار دیا تھا اب سوچو کہ یہ کس بات کی طرف اشارہ تھا اسی بات کی طرف اشارہ تھا کہ مسیح موعود اس امت میں سے آنے والا ہے اس لیے اس کے زمانہ میں یہود کے رنگ کے لوگ بھی پیدا کیے جائیں گے جو اپنے زعم

ہیں علماء کہلائیں گے سو آج تمہارے ملک میں وہ پیشگوئی پوری ہوگئی۔

{تذکرۃ الشہادتین ایڈیشن اول مندرجہ ریویو آف ریلیجنز بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۵۵}

تقدیر الٰہی میں قرار پا چکا تھا کہ ایسے یہودی اس اُمت میں بھی پیدا ہوں گے پس اس لیے میرا نام عیسیٰ رکھا گیا جیسا کہ حضرت یحییٰ کا نام الیاس رکھا گیا تھا چنانچہ آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے پس عیسیٰ کی آمد کی پیشگوئی اس اُمت کے لیے ایسی ہی تھی جیسا کہ یہودیوں کے لیے حضرت یحییٰ کی آمد کی پیشگوئی۔ غرض یہ نمونہ قائم کرنے کے لیے میرا نام عیسیٰ رکھا گیا۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ اس عیسیٰ کے مکذّب جو اس اُمّت میں ہونے والے تھے اُن کا نام یہود رکھا گیا۔ چنانچہ آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ میں انہیں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ یہودی جو اس اُمّت کے عیسیٰ کے منکر ہیں جو اُن یہودیوں کے مشابہ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ کو قبول نہیں کیا تھا پس اس طور سے کامل درجہ پر مشابہت ثابت ہوگئی کہ جس طرح وہ یہودی جو الیاس نبی کی دوبارہ آمد کے منتظر تھے حضرت عیسیٰ پر محض اس عذر سے کہ الیاس دوبارہ دنیا میں نہیں آیا ایمان نہ لائے۔ اسی طرح یہ لوگ اِس اُمّت کے عیسیٰ پر محض اس عذر سے ایمان نہ لائے کہ وہ اسرائیلی عیسیٰ۔ دوبارہ دنیا میں نہیں آیا پس اُن یہودیوں میں جو حضرت عیسیٰ پر ایمان نہیں لائے تھے اس وجہ سے کہ الیاس دوبارہ دنیا میں نہیں آیا اور اِن یہودیوں میں جو حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد کے منتظر ہیں مشابہت ثابت ہوگئی اور یہی خدا تعالیٰ کا مقصد تھا۔ اور جیسا کہ اسرائیلی یہودیوں اور اِن یہودیوں میں مشابہت ثابت ہوگئی اسی طرح اسرائیلی عیسیٰ اور اِس عیسیٰ میں جو مَیں ہوں مشابہت بدرجۂ کمال پہنچ گئی کیونکہ وہ عیسیٰ اسی وجہ سے یہودیوں کی نظر سے ردّ کیا گیا کہ ایک نبی دوبارہ دنیا میں نہیں آیا اسی طرح یہ عیسیٰ جو مَیں ہوں اِن یہودیوں کی نگاہ میں ردّ کیا گیا ہے کہ ایک نبی دوبارہ دنیا میں نہیں آیا۔ اور صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو احادیث نبویّہ اِس اُمّت کے یہودی ٹھہراتی ہیں جن کی طرف آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ بھی اشارہ کرتی ہے وہ اصل یہودی نہیں ہیں بلکہ اسی اُمّت کے لوگ ہیں جن کا نام یہودی رکھا گیا ہے اِسی طرح وہ عیسیٰ بھی اصل عیسیٰ نہیں ہے جو بنی اسرائیل میں سے ایک نبی تھا بلکہ وہ بھی اِسی اُمت میں سے ہے۔ اور یہ خدا تعالیٰ کی اُس رحمت اور فضل سے بعید ہے جو اِس اُمّت کے شامل حال رکھتا ہے کہ وہ اِس اُمّت کو یہودی کا خطاب تو دے بلکہ اُن یہودیوں کا خطاب دے جنھوں نے الیاس نبی کے دوبارہ آنے کی حجّت پیش کر کے حضرت عیسیٰ کو کافر اور کذاب ٹھہرایا تھا لیکن اِس اُمّت کے کسی فرد کو عیسیٰ کا خطاب نہ دے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ یہ اُمّت

خدا تعالیٰ کے نزدیک کچھ ایسی بدبخت اور بدقسمت ہے کہ اس کی نظر میں شریر اور نافرمان یہودیوں کا خطاب تو پا سکتی ہے مگر اس اُمّت میں ایک فرد بھی ایسا نہیں کہ عیسیٰ کا خطاب پاوے پس یہی حکمت تھی کہ ایک طرف تو خدا تعالیٰ نے اس اُمّت کے بعض افراد کا نام یہودی رکھ دیا اور دوسری طرف ایک فرد کا نام عیسیٰ بھی رکھ دیا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صـ۲۴۲-۲۴۳)

یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو آیا ہے کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ وہ اسی معرکہ کی طرف اشارہ ہے یعنی یہود نے خدا کے پاک اور مقدس نبی کو عمداً محض شرارت سے لعنتی ٹھہرا کر خدا تعالیٰ کا غضب اپنے پر نازل کیا اور مغضوب علیہم ٹھہرے حالانکہ ان کو پتہ بھی لگ گیا تھا کہ حضرت مسیح قبر میں نہیں رہے اور وہ پیشگوئی اُن کی پوری ہوئی کہ یونس کی طرح میرا حال ہوگا یعنی زندہ ہی قبر میں جاؤں گا اور زندہ ہی نکلوں گا اور نصاریٰ گو حضرت مسیح سے محبت کرتے تھے مگر محض اپنی جہالت سے انہوں نے بھی لعنت کا داغ حضرت مسیح کے دل کی نسبت قبول کر لیا اور یہ نہ سمجھا کہ لعنت کا مفہوم دل کی ناپاکی سے تعلق رکھتا ہے اور نبی کا دل کسی حالت میں ناپاک اور خدا کا دشمن اور اس سے بیزار نہیں ہو سکتا پس اس سورت میں بطور اشارت مسلمانوں کو یہ سکھلایا گیا ہے کہ یہود کی طرح آنیوالے مسیح موعود کی تکذیب میں جلدی نہ کریں اور حیلہ بازی کے فتوے طیار نہ کریں اور اس کا نام لعنتی نہ رکھیں۔ ورنہ وہی لعنت الٹ کر ان پر پڑے گی ایسا ہی عیسائیوں کی طرح نادان دوست نہ بنیں اور ناجائز صفات اپنے پیشوا کی طرف منسوب نہ کریں پس بلاشبہ اس سورۃ میں مخفی طور پر میرا ذکر ہے اور ایک لطیف پیرایہ میں میری نسبت یہ ایک پیشگوئی ہے اور دعا کے رنگ میں مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ ایسا زمانہ تم پر بھی آئیگا اور تم بھی حیلہ جوئی سے مسیح موعود کو لعنتی ٹھہراؤ گے کیونکہ یہ بھی حدیث ہے کہ اگر یہودی سوسمار کے سوراخ میں داخل ہوئے ہیں تو مسلمان بھی داخل ہوں گے یہ عجیب خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ قرآن شریف کی پہلی سورۃ میں ہی جس کو پنج وقت مسلمان پڑھتے ہیں میرے آنے کی نسبت پیشگوئی کر دی فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذَالِكَ۔

(تحفہ گولڑویہ صـ۱۵ حاشیہ)

چونکہ یہ امت مرحومہ ہے اور خدا نہیں چاہتا کہ ہلاک ہوں اس لیے اس نے یہ دعا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کی سکھلا دی اور اس کو قرآن میں نازل کیا اور قرآن اسی سے شروع ہوا اور یہ دعا مسلمانوں کی نمازوں میں داخل کر دی تا وہ کسی وقت سوچیں اور سمجھیں کہ کیوں ان کو یہود کی اس سیرت سے ڈرایا گیا جس سیرت کو یہود نے نہایت برے طور سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کیا تھا۔ یہ بات صاف طور پر سمجھ آتی ہے کہ اس دعا میں جو سورہ فاتحہ میں مسلمانوں کو سکھائی گئی ہے فرقہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے مسلمانوں کا بظاہر کچھ

بھی تعلق نہ تھا کیونکہ جبکہ قرآن شریف اور احادیث اور اتفاق علماء اسلام سے ثابت ہو گیا کہ مغضوب علیہم سے یہود مراد ہیں اور یہود بھی وہ جنہوں نے حضرت مسیح کو بہت ستایا اور دُکھ دیا تھا اور ان کا نام کافر اور لعنتی رکھا تھا اور اُن کے قتل کرنے میں کچھ فرق نہیں کیا تھا اور توہین کو اُن کی مستورات تک پہنچا دیا تھا تو پھر مسلمانوں کو اس دعا سے کیا تعلق تھا اور کیوں یہ دعا ان کو سکھلائی گئی - اب معلوم ہوا کہ یہ تعلق تھا کہ اس جگہ بھی پہلے مسیح کی مانند ایک مسیح آنیوالا تھا اور مقدر تھا کہ اُس کی بھی ویسی ہی توہین اور تکفیر ہو لہذا یہ دعا سکھلائی گئی جس کے یہ معنے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس گناہ سے محفوظ رکھ کہ ہم تیرے مسیح موعود کو دکھ دیں اور اس پر کفر کا فتویٰ لکھیں اور اس کو سزا دلانے کے لیے عدالتوں کی طرف کھینچیں اور اس کی پاک دامن اہل بیت کی توہین کریں اور اُس پر طرح طرح کے بہتان لگائیں اور اس کے قتل کے لیے فتوے دیں غرض صاف ظاہر ہے کہ یہ دعا اسی لیے سکھلائی گئی کہ تا قوم کو اُس یادداشت کے پرچہ کی طرح جس کو ہر وقت اپنی جیب میں رکھتے ہیں یا اپنی نشست گاہ کی دیوار پر لگاتے ہیں اس طرف توجہ دی جائے کہ تم میں بھی ایک مسیح موعود آنے والا ہے اور تم میں بھی وہ مادہ موجود ہے جو یہودیوں میں تھا - غرض اس آیت پر ایک محققانہ نظر کے ساتھ غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک پیشگوئی ہے جو دعا کے رنگ میں فرمائی گئی چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ حسب وعدہ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ[1] آخری خلیفہ اس امت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رنگ میں آئیگا اور ضرور ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح قوم کے ہاتھ سے دکھ اٹھائے اور اس پر کفر کا فتویٰ لکھا جاوے اور اس کے قتل کے ارادے کیے جائیں اس لیے ترحم کے طور پر تمام مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی کہ تم خدا سے پناہ چاہو کہ تم اُن یہودیوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسوی سلسلہ کے مسیح موعود کو کافر ٹھہرایا گیا تھا اور اس کی توہین کرتے تھے اور اُن کو گالیاں دیتے تھے اور اس دعا میں صاف اشارہ ہے کہ تم پر بھی یہ وقت آنے والا ہے اور تم میں سے بھی بہتوں میں یہ مادہ موجود ہے - پس خبردار رہو اور دعا میں مشغول رہو تا ٹھوکر نہ کھاؤ اور اس آیت کا دوسرا فقرہ جو الضالین ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ہمیں اے ہمارے پروردگار اس بات سے بھی بچا کہ ہم عیسائی بن جائیں یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب کہ مسیح موعود ظاہر ہوگا عیسائیوں کا بہت زور ہوگا اور عیسائیت کی ضلالت ایک سیلاب کی طرح زمین پر پھیلے گی اور اس قدر طوفان ضلالت جوش ماریگا کہ بجز دعا کے اَور کوئی چارہ نہ ہوگا اور تثلیث کے واعظ اس قدر مکر کا جال پھیلائیں گے کہ قریب ہوگا کہ راستبازوں کو بھی گمراہ کریں لہذا اس دعا کو بھی پہلی دعا کے ساتھ شامل کر دیا گیا اور اسی ضلالت کے زمانہ کی طرف اشارہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ جب تم دجال کو دیکھو تو سورہ کہف کی پہلی آیتیں پڑھو۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۶-۶۷)

[1] النور ع ۷

یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ سورۂ فاتحہ میں صرف دو فتنوں سے بچنے کے لیے دعا سکھلائی گئی ہے۔(۱) اول یہ فتنہ کہ اسلام کے مسیح موعود کو کافر قرار دینا۔ اس کی توہین کرنا۔ اس کی ذاتیات میں نقص نکالنے کی کوشش کرنا۔ اس کے قتل کا فتویٰ دینا۔ جیسا کہ آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ میں انہی باتوں کی طرف اشارہ ہے۔(۲) دوسرے نصاریٰ کے فتنے سے بچنے کے لیے دعا سکھلائی گئی۔ اور سورۃ کو اسی کے ذکر پر ختم کر کے اشارہ کیا گیا ہے کہ فتنہ نصاریٰ ایک سیل عظیم کی طرح ہوگا اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ غرض اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ اس عاجز کی نسبت قرآن شریف نے اپنی پہلی سورۃ میں ہی گواہی دیدی ورنہ ثابت کرنا چاہیئے کہ کن مغضوب علیہم سے اس سورۃ میں ڈرایا گیا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ حدیث اور قرآن شریف میں آخری زمانہ کے بعض علماء کو یہود سے نسبت دی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ مغضوب علیہم سے مراد وہ یہود ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو سلسلہ موسویہ کے آخری خلیفہ اور مسیح موعود تھے کافر ٹھہرایا تھا اور اُن کی سخت توہین کی تھی اور اُن کے پرائیویٹ امور میں افترائی طور پر نقص ظاہر کیے تھے۔ پس جبکہ یہی لفظ مغضوب علیہم کا ان یہودیوں کے مثیلوں پر بولا گیا جن کا نام بوجہ تکفیر و توہین حضرت مسیح مغضوب علیہم رکھا گیا تھا پس اس جگہ مغضوب علیہم کے پورے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر جب سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ آنیوالے مسیح موعود کی نسبت صاف اور صریح پیشگوئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے پہلے مسیح کی طرح ایذا اٹھائے گا اور یہ دعا کہ یا الٰہی ہمیں مغضوب علیہم ہونے سے بچا اس کے قطعی یقینی یہی معنے ہیں کہ ہمیں اس سے بچا کہ ہم تیرے مسیح موعود کو جو پہلے مسیح کا مثیل ہے ایذا نہ دیں اس کو کافر نہ ٹھہرائیں۔ ان معنوں کے لیے یہ قرینہ کافی ہے کہ مغضوب علیہم صرف اُن یہودیوں کا نام ہے جنہوں نے حضرت مسیح کو ایذا دی تھی۔ اور حدیثوں میں آخری زمانہ کے علماء کا نام یہود رکھا گیا ہے یعنی وہ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکفیر و توہین کی تھی۔ اور اس دعا میں ہے کہ یا الٰہی ہمیں وہ فرقہ مت بنا جن کا نام مغضوب علیہم ہے۔ پس دعا کے رنگ میں یہ ایک پیشگوئی ہے جو دو خبر پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ اس امت میں بھی ایک مسیح موعود پیدا ہوگا۔ اور دوسری یہ پیشگوئی ہے کہ بعض لوگ اس امت میں سے اُس کی بھی تکفیر اور توہین کریں گے اور وہ لوگ مورد غضب الٰہی ہوں گے اور اس وقت کا نشان یہ ہے کہ فتنہ نصاریٰ بھی ان دنوں میں حد سے بڑھا ہوا ہوگا جن کا نام ضالین ہے اور ضالین پر بھی یعنی عیسائیوں پر بھی اگرچہ خدا تعالیٰ کا غضب ہے کہ وہ خدا کے حکم کے شنوا نہیں ہوئے مگر اس غضب کے آثار قیامت کو ظاہر ہوں گے اور اس جگہ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں جن پر بوجہ تکفیر و توہین و ایذا و ارادہ قتل مسیح موعود کے دنیا میں ہی غضب الٰہی نازل ہوگا یہ میرے جانی دشمنوں کے لیے قرآن کی پیشگوئی ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۳-۷۴)

المغضوب علیہم سے وہ علماء یہودی مراد ہیں جنہوں نے شدت عداوت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی نسبت یہ بھی روا نہ رکھا کہ اُن کو مومن قرار دیا جائے بلکہ کافر کہا اور واجب القتل قرار دیا اور مغضوب علیہ وہ شدید الغضب انسان ہوتا ہے جس کے غضب کے غلو پر دوسرے کو غضب آوے اور یہ دونوں لفظ باہم مقابل واقع ہیں یعنی ضالین وہ ہیں جنہوں نے افراط محبت سے حضرت عیسیٰ کو خدا بنایا اور المغضوب علیہم وہ یہودی ہیں جنہوں نے خدا کے مسیح کو افراط عداوت سے کافر قرار دیا اس لیے مسلمانوں کو سورۃ فاتحہ میں ڈرایا گیا اور اشارہ کیا گیا کہ تمہیں یہ دونوں امتحان پیش آئیں گے مسیح موعود آئے گا اور پہلے مسیح کی طرح اُس کی بھی تکفیر کی جائیگی اور ضالین یعنی عیسائیوں کا غلبہ بھی کمال کو پہنچ جائے گا جو حضرت عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں تم ان دونوں فتنوں سے اپنے تئیں بچاؤ اور بچنے کے لیے نمازوں میں دعائیں کرتے رہو۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۱ حاشیہ در حاشیہ)

ضالین سے مراد صرف گمراہ نہیں بلکہ وہ عیسائی مراد ہیں جو افراط محبت کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی شان میں غلو کرتے ہیں کیونکہ ضلالت کے یہ بھی معنے ہیں کہ افراط محبّت سے ایک شخص کو ایسا اختیار کیا جائے کہ دوسرے کا عزّت کے ساتھ نام سننے کی بھی برداشت نہ رہے جیسا کہ اس آیت میں بھی یہی معنے مراد ہیں کہ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ[1] (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۴ حاشیہ در حاشیہ)

ضالین پر اس سورۃ کو ختم کیا ہے یعنی ساتویں آیت پر جو ضالین کے لفظ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ضالین پر قیامت آئے گی۔ یہ سورۃ درحقیقت بڑے دقائق اور حقائق کی جامع ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں اور اس سورۃ کی یہ دعا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ یہ صاف اشارہ کر رہی ہے کہ اس امت کے لیے ایک آنے والے گروہ مغضوب علیہم کے ظہور سے اور دوسرے گروہ ضالین کے غلبہ کے زمانہ میں ایک سخت ابتلا درپیش ہے جس سے بچنے کے لیے پانچ وقت دعا کرنی چاہیئے اور یہ دعا سورہ فاتحہ کی اس طور پر سکھائی گئی کہ پہلے الحمد للہ سے مالک یوم الدین تک خدا کے محامد اور صفات جمالیہ اور جلالیہ ظاہر فرمائے گئے تا دل بول اٹھے کہ وہی معبود ہے چنانچہ انسانی فطرت نے ان پاک صفات کا دلدادہ ہو کر اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا اقرار کیا اور پھر اپنی کمزوری کو دیکھا تو اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہنا پڑا اور پھر خدا سے مدد پاکر یہ دعا کی جو جمیع اقسام شر سے بچنے کے لیے اور جمیع اقسام خیر کو جمع کرنے کے لیے کافی و وافی ہے یعنی یہ دعا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ آمین۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۲ حاشیہ)

[1] یوسف۔ع۔۱۱

قرآن شریف کے رو سے کئی انسانوں کا بروزی طور پر آنا مقدّر تھا۔ (۱) اول مثیل موسیٰ کا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جیسا کہ آیت اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا شَاہِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا[۱] سے ثابت ہے۔ (۲) دوم خلفاء موسیٰ کے مثیلوں کا جن میں مثیل مسیح بھی داخل ہے جیسا کہ آیت کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ[۲] سے ثابت ہے۔ (۳) عام صحابہ کے مثیلوں کا جیسا کہ آیت وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡہُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ[۳] سے ثابت ہے۔ (۴) چہارم ان یہودیوں کے مثیلوں کا جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کفر کا فتویٰ لکھا اور اُن کو قتل کرنے کے لیے فتوے دئے اور اُن کو ایذا اور قتل کے لیے سعی کی جیسا کہ آیت غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ میں جو دعا سکھائی گئی ہے اس سے صاف مترشح ہو رہا ہے (۵) پنجم یہودیوں کے بادشاہوں کے اُن مثیلوں کا جو اسلام میں پیدا ہوئے جیسا کہ ان دو بالمقابل آیتوں سے جن کے الفاظ باہم ملتے ہیں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں۔

یہودیوں کے بادشاہوں کی نسبت	اسلام کے بادشاہوں کی نسبت
قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّہۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ[۴]	ثُمَّ جَعَلۡنٰکُمۡ خَلٰٓئِفَ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لِنَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ[۵]

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۴)

اگر یہ لوگ بھی کفر اور قتل کا فتویٰ نہ دیتے تو غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کی دعا جو سورہ فاتحہ میں سکھائی گئی ہے جو پیشگوئی کے رنگ میں تھی کیوں کر پوری ہوتی کیونکہ سورہ فاتحہ میں جو غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کا فقرہ ہے اس سے مراد جیسا کہ فتح الباری اور درمنثور وغیرہ میں لکھا ہے یہودی ہیں اور یہودیوں کا بڑا واقعہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قریب تر زمانہ میں وقوع میں آیا وہ یہی واقعہ تھا جو انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کافر ٹھہرایا اور اس کو ملعون اور واجب القتل قرار دیا اور اس کی نسبت سخت درجہ پر غضب اور غصہ میں بھر گئے اس لیے وہ اپنے ہی غضب کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی نظر میں مغضوب علیہم ٹھہرائے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ سے چھ سو برس بعد میں پیدا ہوئے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ کی امت کو جو غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کی دعا سورہ فاتحہ میں سکھلائی گئی اور تاکید کی گئی کہ پانچ وقت کی نماز اور تہجد اور اشراق اور دونوں عیدوں میں یہی دعا پڑھا کریں اس میں کیا بھید تھا جس حالت میں ان یہودیوں کا زمانہ اسلام کے زمانہ سے پہلے مدت سے منقطع ہو چکا تھا تو یہ دعا مسلمانوں کو کیوں سکھلائی گئی اور کیوں اس دعا میں یہ تعلیم دی گئی کہ مسلمان لوگ ہمیشہ خدا تعالیٰ سے پنج وقت پناہ مانگتے رہیں جو یہودیوں کا وہ فرقہ نہ بن جائیں جو مغضوب علیہم

[۱] المزمل ع ۱ ۔ [۲] النور ع ۷ ۔ [۳] الجمعۃ ع ۱ ۔ [۴] الاعراف ع ۱۵ ۔ [۵] یونس ع ۲

ہیں پس اس دعا سے صاف طور پر سمجھ آتا ہے کہ اس امت میں بھی ایک مسیح موعود پیدا ہونے والا ہے اور ایک فرقہ مسلمانوں کے علماء کا اس کی تکفیر کریگا اور اس کے قتل کی نسبت فتوٰی دیگا۔ لہذا سورہ فاتحہ میں غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کی دعا کو تعلیم کر کے سب مسلمانوں کو ڈرایا گیا کہ وہ خدا تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں کہ ان یہودیوں کی مثل نہ بن جائیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم پر کفر کا فتوی لکھا تھا اور اُن پر قتل کا فتوٰی دیا تھا اور نیز ان کے پرائیویٹ امور میں دخل دیکر ان کی ماں پر افترا کیا تھا اور خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں میں یہ سنت اور عادت مستمرہ ہے کہ جب وہ ایک گروہ کو کسی کام سے منع کرتا ہے یا اس کام سے بچنے کے لیے دعا سکھلاتا ہے تو اس کا اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض ان میں سے ضرور اس جرم کا ارتکاب کریں گے لہذا اس اصول کے رو سے جو خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں میں پایا جاتا ہے صاف سمجھ آتا ہے جو غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کی دعا سکھلانے سے یہ مطلب تھا کہ ایک فرقہ مسلمانوں میں سے پورے طور پر یہودیوں کی پیروی کریگا اور خدا کے مسیح کی تکفیر کر کے اور اس کی نسبت قتل کا فتوای لکھ کر اللہ تعالیٰ کو غضب میں لائے گا اور یہودیوں کی طرح مغضوب علیہم کا خطاب پائے گا۔ یہ ایسی صاف پیشگوئی ہے کہ جب تک انسان عمداً بے ایمانی پر کمربستہ نہ ہو اس سے انکار نہیں کر سکتا اور صرف قرآن نے ہی ایسے لوگوں کو یہودی نہیں بنایا بلکہ حدیث بھی یہی خطاب ان کو دے رہی ہے اور صاف بتلا رہی ہے کہ یہودیوں کی طرح اس امت کے علما بھی مسیح موعود پر کفر کا فتوی لگائیں گے اور مسیح موعود کے سخت دشمن اس زمانہ کے مولوی ہوں گے کیونکہ اس سے ان کی عالمانہ عزتیں جاتی رہیں گی اور لوگوں کے رجوع میں فرق آجائے گا اور یہ حدیثیں اسلام میں بہت مشہور ہیں یہاں تک کہ فتوحات مکیؔ میں بھی اس کا ذکر ہے کہ مسیح موعود جب نازل ہوگا تو اس کی یہی عزت کی جائے گی کہ اس کو دائرہ اسلام سے خارج کیا جائے گا اور ایک مولوی صاحب اٹھیں گے اور کہیں گے اِنَّ ھٰذَا الرَّجُلَ غَیَّرَ دِیۡنَنَا یعنی یہ شخص کیسا مسیح موعود ہے اس شخص نے تو ہمارے دین کو بگاڑ دیا یعنی یہ ہماری حدیثوں کے اعتقاد کو نہیں مانتا اور ہمارے پُرانے عقیدوں کی مخالفت کرتا ہے۔ اور بعض حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ اس امت کے بعض علماء یہودیوں کی سخت پیروی کریں گے یہاں تک کہ اگر کسی یہودی مولوی نے اپنی ماں سے زنا کیا ہے تو وہ بھی اپنی ماں سے زنا کریں گے اور اگر کوئی یہودی فقیہ سوسمار کے سوراخ کے اندر گھسا ہے تو وہ بھی گھُسیں گے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ انجیل اور قرآن شریف میں جہاں یہودیوں کا کچھ خراب حال بیان کیا ہے وہاں دنیاداروں اور عوام کا تذکرہ نہیں بلکہ اُن کے مولوی اور فقیہ اور سردار کاہن مراد ہیں جن کے ہاتھ میں کفر کے فتوے ہوتے ہیں اور جن کے وعظوں پر عوام افروختہ ہو جاتے ہیں اسی واسطے قرآن شریف میں ایسے یہودیوں کی اس گدھے

سے مثال دی ہے جو کتابوں سے لدا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ عوام کو کتابوں سے کچھ سروکار نہیں کتابیں تو مولوی لوگ رکھا کرتے ہیں لہٰذا یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جہاں انجیل اور قرآن اور حدیث میں یہودیوں کا ذکر ہے وہاں ان کے مولوی اور علماء مراد ہیں اور اسی طرح غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کے لفظ سے عام مسلمان مراد نہیں ہیں بلکہ ان کے مولوی مراد ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۵-۱۳۶)

قرآن شریف کی پہلی ہی سورت میں جو اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے کہ مغضوب علیہم اور ضالین لوگوں میں سے نہ بننا۔ یعنی اے مسلمانوں تم یہود اور نصاریٰ کے خصائل کو اختیار نہ کرنا۔ اس میں سے بھی ایک پیشگوئی نکلتی ہے کہ بعض مسلمان ایسا کریں گے۔ یعنی ایک زمانہ آویگا کہ اُن میں سے بعض یہود اور نصاریٰ کے خصائل اختیار کریں گے۔ کیونکہ حکم ہمیشہ ایسے امر کے متعلق دیا جاتا ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والے بعض لوگ ہوتے ہیں۔

(الحکم ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۰۱ صفحہ ۱)

قرآن شریف کو سورۃ فاتحہ سے شروع کر کے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر ختم کیا ہے۔ لیکن جب ہم مسلمانوں کے معتقدات پر نظر کرتے ہیں تو دجال کا فتنہ ان کے ہاں عظیم الشان فتنہ ہے اور یہ ہم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دجال کا ذکر ہی بھول گیا ہو۔ نہیں بات اصل یہ ہے کہ دجال کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں نے دھوکا کھایا ہے۔ سورۃ فاتحہ میں جو دو فتنوں سے بچنے کی دعا سکھائی ہے۔ اوّل غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ۔ غیر المغضوب سے مراد باتفاق جمیع اہل اسلام یہود ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت امت پر آنے والا ہے جب کہ وہ یہود سے تشابہ پیدا کرے گی اور وہ زمانہ مسیح موعود ہی کا ہے جب کہ اس کے انکار اور کفر پر اسی طرح زور دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت مسیح ابن مریم کے کفر پر یہودیوں نے دیا تھا۔ غرض اس دعا میں یہ سکھایا گیا کہ یہود کی طرح مسیح موعود کی توہین اور تکفیر سے ہم کو بچا اور دوسرا عظیم الشان فتنہ جس کا ذکر سورۃ فاتحہ میں کیا ہے اور جس پر سورۃ فاتحہ کو ختم کر دیا ہے وہ نصاریٰ کا فتنہ ہے۔ جو وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں بیان فرمایا ہے۔

اب جب قرآن شریف کے انجام پر نظر کی جاتی ہے تو وہ بھی ان دونوں فتنوں کے متعلق کھلی کھلی شہادت دیتا ہے مثلاً غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ کے مقابل میں سورۃ تبّت یدا ہے مجھے بھی فتویٰ کفر سے پہلے یہ الہام ہوا تھا۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْ كَفَّرَ اَوْقِدْ لِيْ يَا هَامَانُ لَعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ عَلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ مَا كَانَ لَهٗٓ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهَآ اِلَّا خَآئِفًا وَّمَآ اَصَابَكَ فَمِنَ اللّٰهِ یعنی وہ زمانہ یاد کر جب کہ مکفر تجھ پر تکفیر کا فتویٰ لگائے گا۔ اور اپنے کسی حامی کو جس کا لوگوں پر اثر پڑ سکتا ہو کہے گا کہ میرے لیے اس فتنہ کی آگ بھڑکا تا میں دیکھ لوں کہ یہ شخص جو موسیٰ کی طرح کلیم اللہ ہونے کا مدعی ہے خدا اس کا معاون ہے یا نہیں اور میں تو اُسے

جھوٹا خیال کرتا ہوں۔ ابی لہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور آپ بھی ہلاک ہو گیا اس کو نہیں چاہیئے تھا کہ اس میں دخل دیتا مگر ڈر ڈر کر اور جو رنج تجھے پہنچے گا۔ وہ خدا کی طرف سے ہے۔

غرض سورت تبت میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کے فتنہ کی طرف اشارہ ہے اور ولا الضالین کے مقابل قرآن شریف کے آخر میں سورہ اخلاص ہے اور اس کے بعد کی دونوں سورتیں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ان دونو کی تفسیر ہیں ان دونوں سورتوں میں اس تیرہ و تار زمانہ سے پناہ مانگی گئی ہے جب کہ مسیح موعود پر کفر کا فتوای لگا کر مغضوب علیہم کا فتنہ پیدا ہو گا اور عیسائیت کی ضلالت اور ظلمت دنیا پر محیط ہونے لگے گی۔ پس جیسے سورہ فاتحہ میں جو ابتدائے قرآن ہے ان دونو بلاؤں سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے اسی طرح قرآن شریف کے آخر میں بھی ان فتنوں سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم کی تاکہ یہ بات ثابت ہو جاوے کہ اوّل بآخر نسبتے دارد......

الضّالین کے مقابل آخر کی تین سورتیں ہیں۔ اصل تو قُلْ ھُوَ اللّٰہُ ہے اور باقی دونو سورتیں اس کی شرح ہیں......

آخر سورۃ میں شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا تعلیم فرمائی ہے جیسے سورۃ فاتحہ کو الضالین پر ختم کیا تھا ویسے ہی آخری سورت میں خناس کے ذکر پر ختم کیا تا کہ خناس اور الضالین کا تعلق معلوم ہو...... کس طرح پر ایک دائرہ کی طرح خدا نے اس سلسلہ کو رکھا ہوا ہے ولا الضالین پر سورۃ فاتحہ کو جو قرآن کا آغاز ہے ختم کیا اور پھر قرآن شریف کے آخر میں وہ سورتیں رکھیں جن کا تعلق سورۃ فاتحہ کے انجام سے ہے۔

(الحکم ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اگر کوئی ہم سے سیکھے تو سارا قرآن ہمارے ذکر سے بھرا ہوا ہے ابتدا ہی میں ہے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اب ان سے کوئی پوچھے کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْب کونسا فرقہ تھا تمام فرقے اسلام کے اس بات پر متفق ہیں کہ وہ یہودی تھے اور ادھر حدیث شریف میں ہے کہ میری امت یہودی ہو جاوے گی تو پھر بتلاؤ کہ اگر مسیح نہ ہو گا تو وہ یہودی کیسے بنیں گے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۸)

سورہ فاتحہ میں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کہہ کر مسیح موعود کی پیشگوئی فرمائی۔ اور پھر اس سورہ میں مغضوب اور ضالین دو گروہوں کا ذکر کر کے یہ بھی بتا دیا کہ جب مسیح موعود آئے گا تو اس وقت ایک قوم مخالفت کرنے والی ہو گی جو مغضوب قوم یہودیوں کے نقش قدم پر چلے گی اور ضالین میں یہ اشارہ کیا کہ قتل دجال اور کسر صلیب کے لیے آئے گا۔ کیونکہ مغضوب سے یہود اور ضالین سے نصاریٰ بالاتفاق مراد ہیں۔

(الحکم ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

سورۃ فاتحہ کا ذکر تھا آپ نے فرمایا کہ

اس میں تین گروہوں کا ذکر ہے اول منعم علیہم۔ دوم مغضوب سوم ضالین۔ مغضوب سے مراد بالاتفاق یہود ہیں اور ضالین سے نصاریٰ اب تو سیدھی بات ہے کہ کوئی دانشمند باپ بھی اپنی اولاد کو وہ تعلیم نہیں دیتا جو اس کے لیے کام آنے والی نہ ہو پھر خدا تعالیٰ کی نسبت یہ کیونکر روا رکھ سکتے ہیں کہ اس نے ایسی دعا تعلیم کی جو پیش آنے والے امور نہ تھے؟ نہیں بلکہ یہ امور سب واقعہ ہونے والے تھے مغضوب سے مراد یہود ہیں اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امت کے بعض لوگ یہودی صفت ہو جائیں گے یہاں تک کہ ان سے تشبہ اختیار کریں گے کہ اگر یہودی نے ماں سے زنا کیا ہو تو وہ بھی کریں گے۔ اب وہ یہودی جو خدا تعالیٰ کے عذاب کے نیچے آئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اُن پر لعنت پڑی تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ مسیح موعود کے زمانہ میں یہ سب واقعات پیش آئیں گے۔ وہ وقت اب آ گیا ہے۔ میری مخالفت میں یہ لوگ ان سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں رہے۔

(الحکم ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

وہ یہودی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت میں موجود تھے خدا نے دعا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سکھلا کر اشارہ فرما دیا کہ وہ بروزی طور پر اس امّت میں بھی آنے والے ہیں تا بروزی طور پر وہ بھی اس مسیح موعود کو ایذا دیں جو اس اُمّت میں بروزی طور پر آنے والا ہے بلکہ یہ فرمانا کہ تم نمازوں میں سورۃ فاتحہ کو ضروری طور پر پڑھو یہ سکھلاتا ہے کہ مسیح موعود کا ضروری طور پر آنا مقدر ہے ایسا ہی قرآن شریف میں اس اُمّت کے اشرار کو یہود سے نسبت دی گئی اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ ایسے شخص کو جو مریمی صفت سے محض خدا کے نفخ سے عیسوی صفت حاصل کرنے والا تھا اُس کا نام سورۃ تحریم میں ابن مریم رکھ دیا ہے کیونکہ فرمایا ہے کہ جب کہ مثالی مریم نے بھی تقویٰ اختیار کیا تو ہم نے اپنی طرف سے روح پھونک دی اس میں اشارہ تھا کہ مسیح ابن مریم میں کلمۃ اللہ ہونے کی کوئی خصوصیّت نہیں بلکہ آخری مسیح بھی کلمۃ اللہ ہے اور روح اللہ بھی بلکہ ان دونوں صفات میں وہ پہلے سے زیادہ کامل ہے جیسا کہ سورۃ تحریم اور سورۃ فاتحہ اور سورۃ النور اور آیت کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ[1] سے سمجھا جاتا ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۵۹)

غرض یہ سلسلہ موسوی سلسلہ سے کسی صورت میں کم نہ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک تو مماثلت اور مطابقت میں فرمایا کہ بدی کا حصّہ بھی تم کو ویسے ہی ملے گا جیسے یہود کو ملا۔ اور اس سلسلہ کی نسبت بار بار ذکر ہوا۔ کہ اخیر تک اس کی عظمت قائم رکھے گا سورۃ فاتحہ میں بھی اس کا ذکر ہے جب کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فرمایا۔ مغضوب سے مراد یہودی ہیں۔

[1] آل عمران۔ع۔۱۲

اب قابل غور یہ امر ہے کہ یہودی کیسے مغضوب ہوئے۔ انہوں نے پیغمبروں کو نہ مانا اور حضرت عیسیٰ کا انکار کیا تو ضرور تھا کہ اس امت میں بھی کوئی زمانہ ایسا ہوتا اور ایک مسیح آتا جس سے یہ لوگ انکار کرتے۔ اور وہ مماثلت پوری ہوتی۔ ورنہ کوئی ہم کو بتائے کہ اگر اسلام پر ایسا زمانہ کوئی آنیوالا ہی نہ تھا۔ اور نہ کوئی مسیح آنا تھا پھر اس دعائے فاتحہ کی تعلیم کا کیا فائدہ تھا۔ الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

کتاب اللہ کو کھول کر دیکھ لو وہ فیصلہ کرتی ہے۔ پہلی ہی سورۃ کو پڑھو جو سورہ فاتحہ ہے جس کے بغیر نماز بھی نہیں ہو سکتی دیکھو اس میں کیا تعلیم دی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

اب صاف ظاہر ہے کہ اس دعا میں مغضوب اور ضالین کی راہ سے بچنے کی دُعا ہے۔ مغضوب سے بالاتفاق یہودی مراد ہیں اور ضالین سے عیسائی۔ اگر اس اُمت میں یہ فتنہ اور فساد پیدا نہ ہونے والا تھا تو پھر اس دُعا کی تعلیم کی کیا غرض تھی؟ سب سے بڑا فتنہ تو اَلدَّجَّال کا تھا مگر یہ نہیں کہا وَلَا الدَّجَّال کیا خدا تعالیٰ کو اس فتنہ کی خبر نہ تھی؟ اصل یہ ہے کہ یہ دعا بڑی پیشگوئی اپنے اندر رکھتی ہے ایک وقت اُمت پر ایسا آنے والا تھا کہ یہودیت کا رنگ اس میں آجاویگا اور یہودی وہ قوم تھی جس نے حضرت مسیح کا انکار کیا تھا۔ پس یہاں جو فرمایا کہ یہودیوں سے بچنے کی دعا کرو۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ تم بھی یہودی نہ بن جانا یعنی مسیح موعود کا انکار نہ کر بیٹھنا۔

اور ضالین یعنی نصاریٰ کی راہ سے بچنے کی دعا جو تعلیم کی تو اس سے معلوم ہوا کہ اُس وقت صلیبی فتنہ خطرناک ہوگا۔ اور یہی سب فتنوں کی جڑ اور ماں ہوگا دجّال کا فتنہ اس سے الگ نہ ہوگا۔ ورنہ اگر الگ ہوتا تو ضرور تھا کہ اُس کا بھی نام لیا جاتا۔ (الحکم ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

صرف قرآن کا ترجمہ اصل میں مفید نہیں جب تک اس کے ساتھ تفسیر نہ ہو مثلاً غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ کی نسبت کسی کو کیا سمجھ آسکتا ہے کہ اس سے مراد یہود نصاریٰ ہیں جب تک کھول کر نہ بتلایا جاوے اور پھر یہ دعا مسلمانوں کو کیوں سکھلائی گئی۔ اس کا یہی منشا تھا کہ جیسے یہودیوں نے حضرت مسیح کا انکار کر کے خدا کا غضب کمایا۔ ایسے ہی آخری زمانہ میں اس امت نے بھی مسیح موعود کا انکار کر کے خدا کا غضب کمانا تھا اسی لیے اول ہی ان کو بطور پیشگوئی کے اطلاع دی گئی کہ سعید روحیں اس وقت غضب سے بچ سکیں۔

(البدر ۲۹ اکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۲)

اللہ تعالیٰ نے ہم کو سورۂ فاتحہ میں یہ دُعا سکھائی۔ کہ اے خدا نہ تو ہمیں مغضوب علیہم میں سے بنائیو اور نہ

ضالین میں سے۔ اب سوچنے کا مقام ہے کہ ان ہر دو کا مرجع حضرت عیسٰی ہی ہیں مغضوب علیہ وہ قوم ہے جس نے حضرت (عیسٰی) کے ساتھ عداوت کرنے اور اُن کو ہر طرح سے دُکھ دینے میں غلوّ کیا اور ضالین وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن کے ساتھ محبّت کرنے میں غلو کیا اور خدائی صفات اُن کو دیدیئے۔ صرف ان دونوں کی حالت سے بچنے کے واسطے ہم کو دعا سکھلائی گئی ہے اگر دجّال ان کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔ تو یہ دعا اِس طرح سے ہوتی کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الدَّجَّال۔ یہ ایک پیشگوئی ہے جو کہ اِس زمانہ کے ہر دو قسم کے شر سے آگاہ کرنے کے واسطے مسلمانوں کو پہلے سے خبردار کرتی ہے۔ یہ عیسائیوں کے مشن ہی ہیں جو کہ اِس زمانہ میں ناخنوں تک زور لگا رہے ہیں کہ اسلام کو سطحِ دُنیا سے نابود کردیں اسلام کے واسطے یہ سخت مضر ہو رہے ہیں۔

(بدر ۱۳ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴ و الحکم ۱۷ ستمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

لَاشَکَّ اَنَّ سَیِّدَنَا سَیِّدَ الْاَنَامِ وَصَدْرَ الْاِسْلَامِ کَانَ مَثِیْلَ مُوْسٰی فَاقْتَضَتْ رِعَایَۃُ الْمُقَابَلَۃِ اَنْ یُّبْعَثَ فِیْ اٰخِرِ زَمَنِ الْاُمَّۃِ مَثِیْلُ عِیْسٰی وَ اِلَیْہِ اَشَارَ رَبُّنَا فِی الصُّحُفِ الْمُطَھَّرَۃِ۔ فَاِنْ شِئْتُمْ فَفَکِّرُوْا فِیْ سُوْرَۃِ النُّوْرِ وَ التَّحْرِیْمِ وَالْفَاتِحَۃِ۔ ھٰذَا مَا کَتَبَ رَبُّنَا الَّذِیْ لَا یَبْلُغُ عِلْمَہٗ الْعَالِمُوْنَ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ تُؤْمِنُوْنَ ۔ (مواہب الرحمان صفحہ ۶۰)

اس اُمت کے لیے سلسلہ موسوی کی مماثلت کے لحاظ سے ضروری تھا کہ ایک مسیح آئے اور علاوہ بریں چونکہ اس امت کے لیے یہ کہا گیا تھا کہ آخری زمانہ میں وہ یہود کے ہمرنگ ہو جائے گی چنانچہ بالاتفاق غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ میں مغضوب سے مراد یہود لی گئی ہے۔ پھر یہ یہودی تو اسی وقت ہوتے جب اُن کے سامنے بھی ایک عیسٰی پیش ہوتا اور اسی طرح پر یہ بھی انکار کر دیتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آنے والا عیسٰی آگیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ (الحکم ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

(ترجمہ) اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے آقا سرورِ کائنات اور بانیٔ اِسلام حضرت موسٰیؑ کے مثیل تھے۔ اسی تقابل کی مناسبت نے اِس بات کا تقاضا کیا کہ اس اُمت کے آخری زمانہ میں حضرت عیسٰیؑ کا ایک مثیل مبعوث ہو۔ اسی کی طرف خدا تعالیٰ نے پاک صحیفوں میں اشارہ فرمایا ہے۔ اگر تم چاہو تو سُورۂ نُور، سُورۂ تحریم اور سُورۂ فاتحہ میں غور کرو۔ یہ ہمارے ربّ کا نوشتہ ہے جس کو عالم لوگ از خود نہیں جان سکتے۔ پھر تم اِس کے بعد کس بات پر ایمان لاؤ گے۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں فرمایا ہے کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ - اِس میں ہم نے غور کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے شخص میں دو قسم کی صفات کی ضرورت ہے۔ اوّل تو عیسوی صفات اور دوسرے محمدی صفات کی کیونکہ مغضوب علیہم سے مراد یہود اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ جب یہود نے شرارت کی تھی تو حضرت عیسیٰؑ ان کے واسطے آئے تھے جب نصاریٰ کی شرارت زیادہ بڑھ گئی تو آنحضرتؐ تشریف آور ہوئے تھے اور یہاں خدا تعالیٰ نے دونوں کا فتنہ جمع کیا اندرونی یہود اور بیرونی نصاریٰ جن کے لیے آنے والا بھی آنحضرت کا کامل بروز اور حضرت عیسیٰ کا پورا نقشہ ہونا چاہیئے تھا۔

(الحکم ۱۷ مئی ۱۹۰۳ء صـ۲)

قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس امت پر دو زمانے بہت خوفناک آئیں گے ایک وہ زمانہ جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آیا اور دوسرا وہ زمانہ جو دجالی فتنہ کا زمانہ ہے جو مسیح کے عہد میں آنیوالا تھا جس سے پناہ مانگنے کے لیے اس آیت میں اشارہ ہے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور اسی زمانہ کے لیے یہ پیشگوئی سورہ نور میں موجود ہے وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا[۱] - اس آیت کے معنے پہلی آیت کے ساتھ ملا کر یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دین پر آخری زمانہ میں ایک زلزلہ آئے گا اور خوف پیدا ہو جائیگا کہ یہ دین ساری زمین پر سے گم نہ ہو جائے۔ تب خدا تعالیٰ دوبارہ اس دین کو روئے زمین پر متمکن کر دے گا اور خوف کے بعد امن بخش دیگا۔

(لیکچر لاہور صـ۴۱)

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے مراد مولوی ہیں کیونکہ ایسی باتوں میں اول نشانہ مولوی ہی ہوا کرتے ہیں دنیاداروں کو تو دین سے تعلق ہی کم ہوتا ہے۔

(البدر ۵ مئی ۱۹۰۳ء صـ۱۳۱)

یہود ایک قوم کا نام ہے۔ جو حضرت موسیٰ کی امت کہلائی ان بدقسمتوں نے شوخیاں کی تھیں۔ سب نبیوں کو دکھ دیا۔ یہ قاعدے کی بات ہے کہ جو کسی بدی میں کمال تک پہنچتا ہے اور نامی ہو جاتا ہے تو پھر اس بدی میں اسی کا نام لیا جاتا ہے۔ ڈاکو تو کئی ہوئے مگر بعض ڈاکو خصوصیت سے مشہور ہیں۔ دیکھو ہزاروں پہلوان گذرے ہیں مگر رستم کا نام ہی مشہور ہے یہ یہود چونکہ اول درجے کے شرارت کرنے والے تھے اور نبیوں کے سامنے شوخیاں کرتے اس لیے ان کا نام مغضوب علیہم ہو گیا یوں تو مغضوب علیہم اور بھی ہیں۔

(بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صـ۷)

وَفِیْ اٰیَۃِ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اِشَارَۃٌ وَّحَثٌّ عَلٰی دُعَآءِ صِحَّۃِ

(ترجمہ از مرتب) آیت اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں اشارہ ہے اور اس امر پر ترغیب دلائی گئی ہے کہ صحیح

[۱] النور - ع ۷ -

الْمَعْرِفَةِ كَاَنَّهٗ يُعَلِّمُنَا وَيَقُوْلُ ادْعُوا اللّٰهَ اَنْ يُّرِيَكُمْ صِفَاتَهٗ كَمَا هِيَ وَيَجْعَلَكُمْ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ لِاَنَّ الْاُمَمَ الْاُوْلٰى مَاضَلُّوْا اِلَّا بَعْدَ كَوْنِهِمْ عُمْيًا فِيْ مَعْرِفَةِ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاِنْعَامَاتِهٖ وَمَرْضَاتِهٖ وَكَانُوْا يُفْنُوْنَ الْاَيَّامَ فِيْمَا يَزِيْدُ الْاٰثَامَ فَحَلَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ فَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَكَانُوْا مِنَ الْهَالِكِيْنَ۔ وَاِلَيْهِ اَشَارَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ قَوْلِهٖ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَسِيَاقُ كَلَامِهٖ يُعْلِمُ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ لَا يَتَوَجَّهُ اِلَّا اِلٰى قَوْمٍ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِ الْغَضَبِ فَالْمُرَادُ مِنَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ فِي الْاٰيَةِ قَوْمٌ عَصَوْا فِيْ نَعْمَآءٍ وَّاٰلَآءٍ رَزَقَهُمُ اللّٰهُ خَاصَّةً وَّاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ وَنَسُوا الْمُنْعِمَ وَحَقَّهٗ وَكَانُوْا مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔ وَاَمَّا الضَّآلُّوْنَ فَهُمْ قَوْمٌ اَرَادُوْا اَنْ يَّسْلُكُوْا مَسْلَكَ الصَّوَابِ وَلٰكِنْ لَّمْ يَكُنْ مَّعَهُمْ مِّنَ الْعُلُوْمِ الصَّادِقَةِ وَالْمَعَارِفِ الْمُنِيْرَةِ الْحَقَّةِ وَالْاَدْعِيَةِ الْعَاصِمَةِ الْمُوَفِّقَةِ بَلْ غَلَبَتْ عَلَيْهِمْ خَيَالَاتٌ وَّهْمِيَّةٌ فَرَكَنُوْا اِلَيْهَا وَجَهِلُوْا طَرِيْقَهُمْ وَاَخْطَأُوْا

معرفت کے لیے دُعاء کی جاوے گویا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تعلیم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے دُعاء کرو کہ وہ اپنی صفات کی ماہیت تمہیں دکھائے اور تمہیں شکر گزار بندوں میں سے بناوے کیونکہ پہلی قومیں اللہ تعالیٰ کی صفات، اُس کے انعامات اور اس کی خوشنودی کی معرفت سے اندھا ہونے کے بعد ہی گمراہ ہوئی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے دن ایسے اعمال میں ضائع کر دئے جن اعمال نے اُنہیں گناہوں میں اور بھی آگے بڑھا دیا پس اُن پر خدا کا غضب نازل ہُوا اور اُن پر خواری مُسلّط کر دی گئی اور وہ ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اُنہی لوگوں کا رُخ کرتا ہے جن پر اس غضب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انعام کیے ہوں پس اس آیت میں مَغْضُوْب عَلَیْہِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان نعمتوں اور برکتوں کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اُنہیں پر نازل فرمائی تھیں اس (کے احکام) کی نافرمانی کی۔ اپنی خواہشات کی پیروی کی اور انعام کرنے والے خدا اور اس کے حق کو بھول گئے اور منکروں میں شامل ہو گئے۔

اِسی طرح ضَآلِّیْن سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے صحیح رستہ چلنے کا ارادہ تو کیا لیکن صحیح علوم، روشن اور حقیقی معارف اور محفوظ رکھنے والی اور توفیق بخشنے والی دعائیں اُن کے شاملِ حال نہ ہوئیں۔ بلکہ اُن پر توہمات غالب آ گئے اور وہ ان کی طرف جُھک گئے۔ (اپنے صحیح) راستوں سے بھٹک گئے اور سچے مشرب کو بھول گئے۔ پس وہ

مَشْرَبِهِمْ مِنَ الْحَقِّ فَضَلُّوْا وَمَا سَرَحُوْا أَفْكَارَهُمْ فِي مَرَاعِي الْحَقِّ الْمُبِيْنِ - وَ الْعَجَبُ مِنْ أَفْكَارِهِمْ وَعُقُوْلِهِمْ وَأَنْظَارِهِمْ أَنَّهُمْ جَوَّزُوْا عَلَى اللّٰهِ وَعَلٰى خَلْقِهٖ مَا يَأْبٰى مِنْهُ الْفِطْرَةُ الصَّحِيْحَةُ وَالْإِشْرَاقَاتُ الْقَلْبِيَّةُ وَلَمْ يَعْلَمُوْا أَنَّ الشَّرَائِعَ تَخْدِمُ الطَّبَائِعَ وَالطَّبِيْبُ مُعِيْنٌ لِّلطَّبِيْعَةِ لَا مُنَازِعٌ لَّهَا فَيَا حَسْرَةً عَلَيْهِمْ مَّا أَلْهَاهُمْ عَنْ صِرَاطِ الصَّادِقِيْنَ - وَفِيْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ يُعَلِّمُ اللّٰهُ تَعَالٰى عِبَادَهُ الْمُسْلِمِيْنَ فَكَأَنَّهٗ يَقُوْلُ يَا عِبَادِ إِنَّكُمْ رَأَيْتُمُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى فَاجْتَنِبُوْا شِبْهَ أَعْمَالِهِمْ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ الدُّعَاءِ وَالْإِسْتِعَانَةِ وَلَا تَنْسَوْا نَعْمَاءَ اللّٰهِ كَالْيَهُوْدِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبُهٗ وَلَا تَتْرُكُوا الْعُلُوْمَ الصَّادِقَةَ وَالدُّعَاءَ وَلَا تَهِنُوْا مِنْ طَلَبِ الْهِدَايَةِ كَالنَّصَارٰى فَتَكُوْنُوْا مِنَ الضَّالِّيْنَ ۞

(کرامات الصّادقین صفحہ ۸۱، ۸۲)

وَجُمْلَةُ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ إِشَارَةٌ إِلٰى رِعَايَةِ حُسْنِ الْأَدَابِ وَ التَّأَدُّبِ مَعَ رَبِّ الْأَرْبَابِ فَإِنَّ لِلدُّعَاءِ أَدَابًا وَّلَا يَعْرِفُهَا إِلَّا مَنْ كَانَ تَوَّابًا وَّ مَنْ لَّا يُبَالِي الْأَدَابَ فَيَغْضَبُ اللّٰهُ عَلَيْهِ إِذَا أَصَرَّ عَلَى الْغَفْلَةِ وَمَا تَابَ فَلَا

گمراہ ہوگئے اور انہوں نے اپنے افکار کو واضح اور کُھلی سچائی کی چراگاہوں میں نہیں چھوڑا۔ اور ان کے افکار، ان کی عقلوں اور نظروں پر تعجب ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوق پر وہ کچھ جائز قرار دیدیا جس کو فطرتِ صحیحہ اور قلبی انوار ہرگز قبول نہیں کرتے۔ وہ نہیں جانتے کہ شریعتیں (دراصل) طبائع کی (بطورِ علاج) خدمت کرتی ہیں۔ اور طبیب طبیعت کا معاون ہوتا ہے نہ اس کا مخالف۔ پس افسوس ہے کہ یہ لوگ صادقوں کی راہ سے کتنے غافل ہیں۔

اِس سُورت میں اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں کو تعلیم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! تم نے یہود و نصاریٰ کو دیکھ لیا ہے۔ پس تم ان جیسے اعمال کرنے سے اجتناب کرو اور دُعاء اور اِستعانت کے طریق کو مضبوطی سے پکڑو اور یہود کی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نہ بھُولو۔ ورنہ تم پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا۔ نیز تم سچّے علوم اور دُعاء کو ترک نہ کرو اور ہدایت کی تلاش میں عیسائیوں کی طرح سُستی نہ کرو ورنہ تم بھی گمراہوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کے جملہ میں حُسنِ ادب کی رعایت رکھنے اور خُدائے پروردگار کے ساتھ ادب کا طریق اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ دُعاء کرنے کے بھی کچھ آداب ہیں اور اُنہیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو (اللہ تعالیٰ کی طرف) جُھکنے والا ہو۔ جو شخص ان آداب کی پروا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اُس سے ناراض ہو جاتا ہے

يَرٰى مِنْ دُعَآئِهٖ اِلَّا الْعُقُوْبَةَ وَالْعَذَابَ فَلِاَجْلِ ذٰلِكَ قَلَّ الْفَآئِزُوْنَ فِى الدُّعَآءِ وَكَثُرَ الْهَالِكُوْنَ لِحُجُبِ الْعُجْبِ وَالْغَفْلَةِ وَالرِّيَآءِ وَاِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَدْعُوْنَ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ وَاِلٰى غَيْرِ اللّٰهِ مُتَوَجِّهُوْنَ ۔ بَلْ اِلٰى زَيْدٍ وَّ بَكْرٍ يَّنْظُرُوْنَ فَاللّٰهُ لَا يَقْبَلُ دُعَآءَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ وَيَتْرُكُهُمْ فِىْ بَيْدَآءِهِمْ تَآئِهِيْنَ ۔ وَاِنَّ حَبْوَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُنْكَسِرِيْنَ ۔ وَلَيْسَ الدَّاعِى الَّذِىْ يَنْظُرُ اِلٰى اَطْرَافٍ وَّ اَنْحَآءٍ وَّيُخْتَلَبُ بِكُلِّ بَرْقٍ وَّضِيَآءٍ وَّيُرِيْدُ اَنْ يُّتْرَعَ كُمَّهٗ وَلَوْ بِوَسَآئِلِ الْاَصْنَامِ وَيَعْلُوْ كُلَّ رَبْوَةٍ رَّاغِبًا فِىْ حَبْوَةٍ وَّيَبْغِىْ مَعْشُوْقَ الْمَرَامِ وَلَوْ بِتَوَسُّلِ اللِّئَامِ وَالْفَاسِقِيْنَ ۔ بَلِ الدَّاعِى الصَّادِقُ هُوَ الَّذِىْ يَتَبَتَّلُ اِلَى اللّٰهِ تَبْتِيْلًا وَّ لَا يَسْئَلُ غَيْرَهٗ فَتِيْلًا وَّ يَجِىْٓءُ اللّٰهَ كَالْمُنْقَطِعِيْنَ الْمُسْتَسْلِمِيْنَ وَيَكُوْنُ اِلَى اللّٰهِ سَيْرُهٗ وَلَا يَعْبَأُ بِمَنْ هُوَ غَيْرُهٗ وَلَوْ كَانَ مِنَ الْمُلُوْكِ وَ السَّلَاطِيْنِ ۔ وَالَّذِىْ يَكُبُّ عَلٰى غَيْرِهٖ وَلَا يَقْصِدُ الْحَقَّ فِىْ سَيْرِهٖ فَهُوَ لَيْسَ

جب وہ (اپنی) غفلت پر اصرار کرتا ہے اور توبہ نہیں کرتا تو اُسے اپنی دُعاء سے (اپنی بد اعمالیوں کی) سزا اور عذاب کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے دُعاء میں کامیابی حاصل کرنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور تکبر، غفلت اور ریاء کے پردوں کی وجہ سے ہلاک ہونے والے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ جب دُعاء کرتے ہیں تو ساتھ ہی شرک کے مُرتکب ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں بلکہ زید و بکر کی طرف نگاہِ اُمید رکھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ایسے مُشرکوں کی دُعاؤں کو قبول نہیں کیا کرتا اور اُنہیں اپنے بیابانوں میں حیران و پریشان چھوڑے رکھتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے اِنعامات منکسر المزاج لوگوں کے بہت قریب ہیں۔ (لیکن) وہ شخص تو دُعاء کرنے والا نہیں (کہلا سکتا) ہے جو (خدا کے سوا) اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا ہے۔ ہر چمک اور روشنی سے دھوکا کھا جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اپنی آستین بھرلے خواہ بُتوں کے وسیلہ سے ہی ہو۔ اور بھیک حاصل کرنے کے شوق میں اُونچی (دُشوار گزار) جگہ پر پہنچتا ہے۔ وہ اپنے خیالی معشوق کو ڈھونڈتا ہے خواہ کمینوں اور بدکرداروں کے توسُّل سے ہی ہو۔ لیکن صحیح دُعاء کرنے والا وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف پوری طرح منقطع ہو جاتا ہے اور اُس کے غیر سے کچھ نہیں مانگتا اور تبتّل اختیار کرنے والوں اور فرماں برداروں کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف آتا ہے۔ اُس کی دوڑ خدا کی طرف ہی ہوتی ہے اور وہ اُس کے غیر کی پرٗوا نہیں کرتا۔ خواہ وہ کوئی بادشاہ ہو یا سلطان۔ اور جو شخص خُدا تعالیٰ کے سوا کسی اور (کی دہلیز) پر جھکتا ہے اور راہِ سُلوک

مِنَ الدَّاعِيْنَ الْمُوَحِّدِيْنَ بَلْ كَزَامِلَةِ الشَّيَاطِيْنِ فَلَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰى طَلَاوَةِ كَلِمَاتِهٖ وَيَنْظُرُ اِلٰى خُبْثَةِ نِيَّاتِهٖ وَاِنَّمَا هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ مَعَ حَلَاوَةِ لِسَانِهٖ وَ حُسْنِ بَيَانِهٖ كَمِثْلِ رَوْثٍ مُّفَضَّضٍ اَوْ كَنِيْفٍ مُّبَيَّضٍ قَدْ اٰمَنَتْ شَفَتَاهُ وَقَلْبُهٗ مِنَ الْكَافِرِيْنَ۔ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَهُمُ الْمُرَادُوْنَ مِنْ قَوْلِهٖ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اِنَّهُمْ دُعُوْا اِلٰى سُبُلِ الْحَقِّ فَتَرَكُوْهَا بَعْدَ رُؤْيَتِهَا وَتَخَيَّرُوا الْمَفَاسِدَ بَعْدَ التَّنَبُّهِ عَلٰى خُبْثَتِهَا وَانْطَلَقُوْا ذَاتَ الشِّمَالِ وَمَا انْطَلَقُوْا ذَاتَ الْيَمِيْنِ۔ وَاِنَّهُمْ رَكَنُوْا اِلَى الْمَيْنِ وَمَا بَقِيَ اِلَّا قِيْدُ رُمْحَيْنِ وَعَدِمُوا الْحَقَّ بَعْدَ مَا كَانُوْا عَارِفِيْنَ۔ وَاَمَّا الضَّآلُّوْنَ الَّذِيْنَ اُشِيْرَ اِلَيْهِمْ فِيْ قَوْلِهٖ عَزَّ وَجَلَّ اَلضَّآلِّيْنَ فَهُمُ الَّذِيْنَ وَجَدُوْا طَرِيْقًا طَامِسًا فِيْ لَيْلٍ دَامِسٍ فَزَاغُوْا عَنِ الْمَحَجَّةِ قَبْلَ ظُهُوْرِ الْحُجَّةِ وَقَامُوْا عَلَى الْبَاطِلِ غَافِلِيْنَ۔ وَمَا كَانَ مِصْبَاحٌ يُّؤْمِنُهُمُ الْعِثَارَ اَوْ يُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰثَارَ فَسَقَطُوْا فِيْ هُوَّةِ الضَّلَالِ غَيْرَ

میں اللہ تعالیٰ کو مقصود نہیں بناتا وہ خدا کو واحد مان کر دُعا کرنے والوں سے نہیں بلکہ شیطان کے ساتھیوں کی طرح ہے پس اللہ تعالیٰ اُس کے الفاظ کی رَونق کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اُس کی نیّتوں کی خباثتوں کو دیکھتا ہے اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی زبان کی مٹھاس اور طرز بیان کی خوبصورتی کے باوجود ایسے گوبر کی طرح ہے جس پر چاندی کا ملمع کیا گیا ہو یا ایسے بیتُ الخلاء کی طرح ہے جس پر سفیدی کی گئی ہو۔ اُس کے ہونٹ تو مومن ہیں مگر وہ دل سے کافر ہے۔ پس یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام مغضوب علیہم سے وہی لوگ مراد ہیں۔ ان لوگوں کو حق کے راستوں کی طرف بلایا گیا لیکن اُنہوں نے ان راستوں کو دیکھ لینے کے باوجود انہیں چھوڑ دیا اور بداعمالیوں کے مفاسد کو اُن کی خباثت کو جاننے کے باوجود اختیار کر لیا۔ وہ بائیں طرف چل پڑے اور اُنہوں نے دائیں طرف رُخ نہ کیا۔ وہ جھوٹ کی طرف ایسے مائل ہو گئے حتیٰ کہ دو نیزہ بھر فرق بھی باقی نہ رہا۔ اُنہوں نے حق کو جاننے کے باوجود اسے معدوم قرار دیدیا۔ لیکن وہ گمراہ لوگ جن کی طرف اللہ کے کلام اَلضَّآلِّیْنَ میں اشارہ ہے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اندھیری رات میں مٹے ہوئے راستہ کو پا تو لیا تھا لیکن وہ اس راستہ کے خلاف کسی پختہ دلیل کے ظہور سے قبل ہی اس راستہ سے بھٹک گئے اور غافل (ہوکر) باطل پر قائم ہو گئے۔ اُنہیں ایسا کوئی چراغ (ہدایت) نہ ملا جو انہیں لغزش سے محفوظ رکھتا اور انہیں راہِ حق کے آثار دکھاتا۔ پس وہ نادانستہ گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے۔

مُتَعَبِّدِيْنَ - وَلَوْ كَانُوْا مِنَ الدَّاعِيْنَ بِدُعَاءِ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ لَحَفِظَهُمْ رَبُّهُمْ وَلَاَرَاهُمُ الدِّيْنَ الْقَوِيْمَ وَلَنَجَّاهُمْ مِّنْ سُبُلِ الضَّلَالَةِ وَ لَهَدَاهُمْ اِلٰى طُرُقِ الْحَقِّ وَالْحِكْمَةِ وَالْعَدَالَةِ لِيَجِدُوا الصِّرَاطَ غَيْرَ مَلُوْمِيْنَ - وَلٰكِنَّهُمْ بَادَرُوْا اِلَى الْاَهْوَآءِ وَمَا دَعَوْا رَبَّهُمْ لِلْاِهْتِدَآءِ وَمَا كَانُوْا خَآئِفِيْنَ بَلْ لَوَّوْا رُؤُسَهُمْ مُّسْتَكْبِرِيْنَ - وَسَرَتْ حُمَيَّا الْعُجْبِ فِيْهِمْ فَرَفَضُوا الْحَقَّ لِهَفَوَاتٍ خَرَجَتْ مِنْ فِيْهِمْ وَلَفَظَتْهُمْ تَعَصُّبَاتُهُمْ اِلٰى بَوَادِی الْهَالِكِيْنَ ۞ (کرامات الصادقین صفحہ ۹۳، ۹۴)

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں جو خدا تعالیٰ کے مقابل پر قوت غضبی کو استعمال کر کے قویٰ سبعیہ کی پیروی کرتے ہیں اور ضالین سے وہ مراد ہیں جو قویٰ بہیمیہ کی پیروی کرتے ہیں اور میانہ طریق وہ ہے جس کو لفظ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے یاد فرمایا ہے غرض اس مبارک امت کے لیے قرآن شریف میں وسط کی ہدایت ہے توریت میں خدا تعالیٰ نے انتقامی امور پر زور دیا تھا اور انجیل میں عفو اور درگزر پر زور دیا تھا اور اس امت کو موقعہ شناسی اور وسط کی تعلیم ملی۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۲۶)

مغضوب قوتِ سبعی کے نیچے ہے۔ یہود اس قوت کے ماتحت اور مغلوب رہے اور عیسائی قوتِ واہمہ کے نیچے۔ شرک اسی قوتِ واہمہ سے پیدا ہوتا ہے قوتِ سبعی والا تو افراط سے کام لیتا ہے کہ جہاں ڈرنے کا حق ہے وہاں بھی نہیں ڈرتا۔ اور قوتِ واہمہ کا مغلوب رسّی کو سانپ سمجھ کر اس سے بھی ڈر جاتا ہے پس عیسائی

اگر وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعاء کرنے والے ہوتے تو اُن کا پروردگار انہیں ضرور محفوظ رکھتا اور اُنہیں سچا دین دکھاتا۔ اور اُنہیں ضلالت کے رستوں سے نجات دیتا اور اُن کی حق و حکمت اور عدل کے راستوں کی طرف راہنمائی کرتا۔ تا وہ (صحیح) راستہ پالیتے اس طرح اُن پر کوئی ملامت نہ ہوتی۔ لیکن اُنہوں نے نفسانی خواہشات کی طرف جلد قدم بڑھایا اور ہدایت کے لیے اپنے پروردگار سے دعا نہ کی اور نہ ہی خدا تعالیٰ سے خائف ہوئے بلکہ انہوں نے تکبّر کرتے ہوئے اپنے سر پھیر لیے اور خود بینی کا جوش اُن میں سرایت کر گیا۔ پس اُنہوں نے ان فضول باتوں کی وجہ سے جو اُن کے مُنہ سے نکلیں حق کو چھوڑ دیا اور ان کے تعصّبات نے ان کو ہلاک ہونیوالے لوگوں کے جنگلوں میں پھینک دیا۔

تو اس قدر گر گئے کہ انہوں نے ایک مُردہ انسان کو خدا بنا لیا اور یہودی اتنے بڑھے کہ انہوں نے سرے ہی سے انکار کر دیا۔
اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں تین قوموں کا ذکر کیا ہے اور تین ہی قسم کے لوگ رکھے بھی ہیں۔ اول وہ جو اعتدال سے کام لینے والے ہیں یہ منعم علیہ گروہ ہوتا ہے ان کی راہ صراط مستقیم ہے دوم افراط والی قوم اس کا نام مغضوب ہے سوم تفریط سے کام لینے والے یہ ضالین ہیں۔ مغضوب کا لفظ بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی پر غضب نہیں کرتا بلکہ خود انسان اپنے افعال بد سے اس غضب کو کھینچ لیتا ہے۔

(الحکم ۱۰ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۲)

قرآن شریف میں وَلَا الضَّآلِّيْنَ تو کہا اگر دجال کوئی الگ چیز تھی تو چاہیئے تھا وَلَا الدَّجَّال بھی کہا ہوتا۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے متعلق تمام مفسر متفق ہیں کہ ان سے یہودی اور عیسائی مراد ہیں جب پانچ وقت نمازوں میں ان فتنوں سے بچنے کے لیے دعا تعلیم کی گئی ہے کہ الضالین سے نہ کرنا اور نہ مغضوب قوم میں سے بنانا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا اور اہم فتنہ یہی تھا جو ام الفتن کہنا چاہیئے۔

(الحکم ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

مغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں اور ضالّین سے مراد نصاریٰ ہیں یہود نے اتنی ظاہر پرستی کی کہ باطنی احکام کا کچھ لحاظ نہ کیا اور نصاریٰ نے اتنی باطن پرستی کی کہ ظاہری احکام کا کچھ لحاظ نہ رکھا اور احکام الٰہی کو جو چراغ اور حقیقت نما تھے فضول سمجھ کر ترک کر دیا اور ہر ایک کے باطنی معنیٰ کر لیے اور سمجھ لیا کہ مسیح میں وہ سب پورے ہو گئے اس طرح گمراہ ہو گئے اور افراط تفریط میں پڑ گئے اور کلام مجید ان دونوں کو نقطہ اعتدال پر قائم کرتا ہے۔

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

کلام اللہ میں مغضوب علیہم نام یہودیوں کا ہے جنہوں نے صرف ظاہر پرستی شروع کر کے باطن کا انکار کیا اور لا الضالین نام نصاریٰ کا ہے جنہوں نے ظاہر کا انکار کیا اور گمراہ ہو گئے کیونکہ ظاہر نمونہ اور چراغ ہے واسطے باطن کے جو کوئی نمونہ چھوڑ دے وہ گمراہ ہو جاتا ہے سو سورہ فاتحہ میں یہی ظاہر ظاہر افراط اور تفریط ان دونو فرقوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو آیا ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

سورہ فاتحہ میں بار بار غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ مفسرین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہودی مولوی اور ضالین سے مراد نصاریٰ مولوی ہیں ان دونوں کا اکٹھا ذکر کرنے سے صریح اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص بروزی رنگ میں آنے والا ہے غیر المغضوب وہ لوگ تھے

جو مسیح سے سرکش ہوئے اور ضالین وہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سرکش ہوئے پس اس لیے اس آنے والے میں دونوں رنگ ہوئے امت محمدیہ کو جو یہ دعا تعلیم کی تو معلوم ہوا کہ ان کے لیے یہ واقعہ پیش آنے والا ہے اور اس لیے یہ مقام جمع کردئے کہ وہ دونوں رنگ اپنے اندر رکھے گا۔

(البدر ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء صـ۱۳۱)

جیسے شیشہ میں انسان کی شکل نظر آتی ہے حالانکہ وہ شکل بذات خود الگ قائم ہوتی ہے اس کا نام بروز ہے۔ اس کا سِرّ سورہ فاتحہ میں ہی ہے جیسے کہ لکھا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ تمام مفسروں نے مغضوب سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ لیے ہیں۔ (البدر ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صـ۲۵۸)

سورہ فاتحہ میں پہلے حسن و احسان ہی کو دکھایا ہے اور اگر ان سے انسان اس کی طرف رجوع نہیں کرتا تو پھر تیسری صورت غضب کی بھی ہے اس لیے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہہ کر ڈرایا ہے لیکن مبارک وہی شخص ہے جو اس کے حسن اور احسان سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور اُس کے احکام کی پیروی کرتا ہے اس سے خدا قریب ہو جاتا ہے اور دعاؤں کو سُنتا ہے۔

(الحکم ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صـ۳)

غیر المغضوب سے مفسرین یہود مراد لیتے ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ جو بد اعمال کریگا پکڑا جائے گا۔ اور خدا کے غضب میں آئے گا۔ اس میں یہود کی تخصیص نہیں۔

(بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صـ۷)

ابرار اخیار کے بڑے گروہ جن کے ساتھ بد مذاہب کی آمیزش نہیں وہ دو ہی ہیں ایک پہلوں کی جماعت یعنی صحابہ کی جماعت جو زیر تربیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے دوسری پچھلوں کی جماعت جو بوجہ تربیت روحانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جیسا کہ آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ سے سمجھا جاتا ہے صحابہ کے رنگ میں ہیں۔ یہی دو جماعتیں اسلام میں حقیقی طور پر منعم علیہم ہیں اور خدا تعالیٰ کا انعام ان پر یہ ہے کہ ان کو انواع اقسام کی غلطیوں اور بدعات سے نجات دی ہے اور ہر ایک قسم کے شرک سے ان کو پاک کیا ہے اور خالص اور روشن توحید ان کو عطا فرمائی جس میں نہ دجال کو خدا بنایا جاتا ہے اور نہ ابن مریم کو خدائی صفات کا شریک ٹھہرایا جاتا ہے اور اپنے نشانوں سے اس جماعت کے ایمان کو قوی کیا ہے اور اپنے ہاتھ سے ان کو ایک پاک گروہ بنایا ہے ان میں سے جو لوگ خدا کا الہام پانے والے اور خدا کے خاص جذبہ سے اس کی طرف کھنچے ہوئے ہیں نبیوں کے رنگ میں ہیں

اور جو لوگ اُن میں سے بذریعہ اپنے اعمال کے صدق اور اخلاص دکھلانے والے اور ذاتی محبت سے بغیر کسی غرض کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں وہ صدیقوں کے رنگ میں ہیں اور جو لوگ اُن میں سے آخری نعمتوں کی امید پر دکھ اٹھانے والے اور جزا کے دن کا بچشم دل مشاہدہ کرکے جان کو ہتھیلی پر رکھنے والے ہیں وہ شہیدوں کے رنگ میں ہیں۔ اور جو لوگ ان میں سے ہر ایک فساد سے باز رہنے والے ہیں وہ صلحاء کے رنگ میں ہیں اور یہی سچے مسلمان کا مقصود بالذات ہے کہ ان مقامات کو طلب کرے اور جب تک حاصل نہ ہوں تب تک طلب اور تلاش میں سُست نہ ہو اور وہ دو گروہ جو ان لوگوں کے مقابل پر بیان فرمائے گئے ہیں وہ مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جن سے محفوظ رہنے کے لیے خدا تعالیٰ سے اسی سورۃ فاتحہ میں دعا مانگی گئی ہے اور یہ دعا جس وقت اکٹھی پڑھی جاتی ہے یعنی اس طرح پر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہمیں منعم علیہم میں داخل کر اور مغضوب علیہم اور ضالین سے بچا تو اس وقت صاف سمجھ میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علم میں منعم علیہم میں سے ایک وہ فریق ہے جو مغضوب علیہم اور ضالین کا ہم عصر ہے۔ اور جب کہ مغضوب علیہم سے مراد اسی سورۃ میں بالیقین وہ لوگ ہیں جو مسیح موعود سے انکار کرنے والے اور اس کی تکفیر اور تکذیب اور توہین کرنے والے ہیں تو بلاشبہ ان کے مقابل پر منعم علیہم سے وہی لوگ اس جگہ مراد رکھے گئے ہیں جو صدق دل سے مسیح موعود پر ایمان لانے والے اور اس کی دل سے تعظیم کرنے والے اور اس کے انصار ہیں اور دنیا کے سامنے اس کی گواہی دیتے ہیں رہے ضالین۔ پس جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت* اور تمام اکابر اسلام کی شہادت سے ضالین سے مراد عیسائی ہیں اور ضالین سے پناہ مانگنے کی دعا بھی ایک پیشگوئی کے رنگ میں ہے کیونکہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عیسائیوں کا کچھ بھی زور نہ تھا بلکہ فارسیوں کی سلطنت بڑی قوت اور شوکت میں تھی۔ اور مذاہب میں سے تعداد کے لحاظ سے بدھ مذہب دنیا

---

* بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورہ فاتحہ میں اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے مراد یہود اور الضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔ دیکھو کتاب درمنثور صفحہ ۹۔ اور عبدالرزاق اور احمد نے اپنی مسند میں اور عبد ابن حمید اور ابن جریر اور بغوی نے معجم الصحابہ میں اور ابن منذر اور ابوالشیخ نے عبداللہ بن شقیق سے روایت کی ہے قَالَ اَخْبَرَنِیْ مَنْ سَمِعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ بِوَادِی الْقُرٰی عَلٰی فَرَسٍ لَّہٗ وَسَاَلَہٗ رَجُلٌ مِّنْ بَنِی الْعَیْنِ فَقَالَ مَنِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ قَالَ اَلْیَھُوْدُ۔ قَالَ فَمَنِ الضَّآلُّوْنَ قَالَ اَلنَّصَارٰی۔ یعنی کہا کہ مجھے اس شخص نے خبر دی ہے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا جب کہ آپ وادی قریٰ میں گھوڑے پر سوار تھے کہ بنی عین میں سے ایک شخص نے آنحضرت سے سوال کیا کہ سورہ فاتحہ میں مغضوب علیہم سے کون مراد ہے فرمایا کہ یہود پھر سوال کیا کہ ضالین سے کون مراد ہے فرمایا کہ نصاریٰ۔ درمنثور صفحہ ۱۷۔ منہ

میں تمام مذاہب سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور مجوسیوں کا مذہب بھی بہت زور و جوش میں تھا اور ہندو بھی علاوہ قومی اتفاق کے بڑی شوکت اور سلطنت اور جمعیت رکھتے تھے اور چینی بھی اپنی تمام طاقتوں میں بھرے ہوئے تھے۔ تو پھر اس جگہ طبعاً یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ تمام قدیم مذاہب جن کی بہت پُرانی اور زبردست سلطنتیں تھیں اور جن کی حالتیں قومی اتفاق اور دولت اور طاقت اور قدامت اور دوسرے اسباب کی رو سے بہت ترقی پر تھیں ان کے شر سے بچنے کے لیے کیوں دعا نہیں سکھلائی اور عیسائی قوم جو اس وقت نسبتی طور پر ایک کمزور قوم تھی کیوں اُن کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے دعا سکھلائی گئی۔ اس سوال کا یہی جواب ہے جو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ مقدر تھا کہ یہ قوم روز بروز ترقی کرتی جائے گی۔ یہاں تک کہ تمام دنیا میں پھیل جائے گی اور اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لیے ہر ایک تدبیر سے زور لگائیں گے اور کیا علمی سلسلہ کے رنگ میں اور کیا مالی ترغیبوں سے اور کیا اخلاق اور شیرینی کلام دکھلانے سے اور کیا دولت اور شوکت کی چمک سے اور کیا نفسانی شہوات اور اباحت اور بے قیدی کے ذرائع سے اور کیا نکتہ چینیوں اور اعتراضات کے ذریعہ سے اور کیا بیماروں اور ناداروں اور درماندوں اور یتیموں کا متکفل بننے سے ناخنوں تک یہ کوشش کریں گے کہ کسی بد قسمت نادان یا لالچی یا شہوت پرست یا جاہ طلب یا بیکس اور یا کسی بچہ بے پدر و مادر کو اپنے قبضہ میں لا کر اپنے مذہب میں داخل کریں سو اسلام کے لیے یہ ایک ایسا فتنہ تھا کہ کبھی اسلام کی آنکھ نے اس کی نظیر نہیں دیکھی اور اسلام کے لیے یہ ایک عظیم الشان ابتلا تھا جس سے لاکھوں انسانوں کے ہلاک ہو جانے کی امید تھی اس لیے خدا نے سورہ فاتحہ میں جس سے قرآن کا افتتاح ہوتا ہے اس مہلک فتنہ سے بچنے کے لیے دعا سکھلائی اور یاد رہے کہ قرآن شریف میں یہ ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے جس کی نظیر اور کوئی پیشگوئی نہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۲-۸۳)

اَلْفَاتِحَةُ تَفْتَحُ عَلَيْكُمْ بَابَ الْهُدٰى فَإِنَّ اللّٰهَ بَدَءَ فِيْهَا مِنَ الْمَبْدَءِ وَجَعَلَ اٰخِرَ الْاَزْمِنَةِ زَمَنَ الضَّآلِّيْنَ وَاِنَّهُمْ هُمُ النَّصَارٰى۔ كَمَا جَآءَ مِنْ نَّبِيِّنَا الْمُجْتَبٰى۔ فَاَيْنَ فِيْهَا ذِكْرُ دَجَّالِكُمْ فَاَرُوْنَاهُ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔

(خطبۃ الہامیۃ صفحہ ۶۷، ۶۸)

(ترجمہ) سورہ فاتحہ تمہارے لیے ہدایت کی راہ کھولتی ہے چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس میں مبدء عالم سے ابتدا کیا ہے اور دنیا کے اس سلسلہ کو ضالین کے زمانہ پر ختم کیا ہے اور وہ نصاریٰ کا گروہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ میں آیا ہے اب بتاؤ تمہارے دجال کا ذکر سورۃ فاتحہ میں کہاں ہے اگر ہو تو قرآن میں ہمیں دکھلاؤ۔

وَهٰذَا الْمَقَامُ لَيْسَ كَمَقَامٍ تَمُرُّ عَلَيْهِ كَغَافِلِيْنَ بَلْ هُوَ الْمَنْبَعُ لِلْحَقِيْقَةِ الْمَخْفِيَّةِ الَّتِيْ سُمِّيَتِ النَّصَارٰى لَهَا الضَّآلِّيْنَ ۔ وَلَقَدْ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا الْاِسْمِ فِيْ سُوْرَةِ الْفَاتِحَةِ لِيُشِيْرَ اِلٰى هٰذِهِ الضَّلَالَةِ وَلِيُشِيْرَ اِلٰى اَنَّ عَقِيْدَةَ حَيَاةِ الْمَسِيْحِ اُمُّ ضَلَالَاتِهِمْ كَمِثْلِ اُمِّ الْكِتَابِ مِنَ الصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ فَاِنَّهُمْ لَوْ لَمْ يَرْفَعُوْهُ اِلَى السَّمَآءِ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ لَمَا جَعَلُوْهُ مِنَ الْاٰلِهَةِ ۔ وَمَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّرْجِعُوْا اِلَى التَّوْحِيْدِ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّرْجِعُوْا مِنْ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةِ ۔ فَكَشَفَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْعُقْدَةَ رُحْمًا عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاَثْبَتَ بِثُبُوْتٍ بَيِّنٍ وَّاَوْضَحَ اَنَّ عِيْسٰى مَا صُلِبَ وَمَا رُفِعَ اِلَى السَّمَآءِ وَمَا كَانَ رَفْعُهٗ اَمْرًا جَدِيْدًا مَّخْصُوْصًا بِهٖ بَلْ كَانَ رَفْعُ الرُّوْحِ فَقَطْ كَمِثْلِ رَفْعِ اِخْوَانِهٖ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ ؕ (اَلْهُدٰی صفحہ ۱۱۰)

(قرآن) سورہ فاتحہ میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ عیسائیت کے فتنہ سے خدا کی پناہ مانگیں جیسا کہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے معنے تمام مفسرین نے یہی کیے ہیں۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صـ۶۲ـ)

سورہ فاتحہ میں خدا تعالیٰ نے عیسائیوں کا نام الضَّآلِّیْن رکھا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگرچہ دنیا کے صدہا

(ترجمہ) یہ مقام ایسا نہیں کہ تو اس پر سے غافلوں کی طرح گزر جائے بلکہ یہ اس مخفی حقیقت کا منبع ہے جس کی بناء پر نصارٰی[1] کا نام اَلضَّآلِّیْنَ رکھا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں (عیسائیوں کو) اس (ضَآلِّین کے) نام سے اس لیے موسوم کیا ہے تا وہ اُس گمراہی کی طرف اشارہ کرے (جس میں یہ قوم مبتلا ہے) نیز اس لیے بھی کہ تا وہ اس طرف اشارہ کرے کہ حیاتِ مسیح کا عقیدہ اُن کی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں سے (یہ سورۃ فاتحہ) اس کتاب کی اصل ہے۔ اگر وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پر نہ چڑھاتے تو وہ اُسے معبود بھی نہ ٹھہرا سکتے اور ان کے لیے ممکن نہیں کہ اس عقیدہ سے رجوع کیے بغیر توحید کی طرف لوٹ سکیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر رحم کرتے ہوئے اِس عقدہ کو کھول دیا اور واضح ثبوت کے ساتھ ثابت فرمایا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو صلیب پر قتل نہیں کیا گیا تھا اور نہ اُنہیں آسمان کی طرف اُٹھایا گیا تھا اور آپ کا رفع کوئی انوکھی بات نہیں تھی جو آپ کے ساتھ ہی مخصوص ہو بلکہ وہ تو آپ کے بھائیوں یعنی دوسرے نبیوں کی طرح صرف رُوح کا رفع تھا۔

---

[1] اَیِ النَّصَارٰی۔

فرقوں میں ضلالت موجود ہے مگر عیسائیوں کی ضلالت کمال تک پہنچ جائے گی گویا دنیا میں فرقہ ضالّہ وہی ہے۔
(تتمہ حقیقۃ الوحی صـ۶۵)

اِعْلَمْ اَسْعَدَكَ اللّٰهُ اَنَّ اللّٰهَ قَسَّمَ الْيَهُوْدَ وَ النَّصَارٰى فِىْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ عَلٰى ثَلٰثَةِ اَقْسَامٍ۔ فَرَغَّبَنَا فِىْ قِسْمٍ مِّنْهُمْ وَبَشَّرَ بِهٖ بِفَضْلٍ وَّ اِكْرَامٍ۔ وَّ عَلَّمَنَا دُعَآءً لِنَكُوْنَ كَمِثْلِ تِلْكَ الْكِرَامِ۔ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ وَالرُّسُلِ الْعِظَامِ۔ وَبَقِىَ الْقِسْمَانِ الْاٰخَرَانِ۔ وَهُمَا الْمَغْضُوْبُ عَلَيْهِمْ مِّنَ الْيَهُوْدِ وَالضَّآلُّوْنَ مِنْ اَهْلِ الصُّلْبَانِ۔ فَاَمَرَنَا اَنْ نَّعُوْذَ بِهٖ مِنْ اَنْ نَّلْحَقَ بِهِمْ مِنَ الشَّقَاوَةِ وَالطُّغْيَانِ۔ فَظَهَرَ مِنْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ اَنَّ اَمْرَنَا قَدْ تُرِكَ بَيْنَ خَوْفٍ وَّرَجَآءٍ وَّنَعْمَةٍ وَّبَلَآءٍ۔ اِمَّا مُشَابَهَةٌ بِالْاَنْبِيَآءِ وَاِمَّا شُرْبٌ مِّنْ كَاْسِ الْاَشْقِيَآءِ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ عَظُمَ وَعِيْدُهٗ۔ وَجَلَّتْ مَوَاعِيْدُهٗ۔ وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ عَلٰى هُدَى الْاَنْبِيَآءِ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ الْوَدُوْدِ فَقَدْ خِيْفَ عَلَيْهِ اَنْ يَّكُوْنَ كَالنَّصَارٰى اَوِ الْيَهُوْدِ۔ فَاشْتَدَّتِ الْحَاجَةُ اِلٰى نَمُوْذَجِ النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ۔ لِيَدْفَعَ نُوْرُهُمْ ظُلُمَاتِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَشُبُهَاتِ الضَّآلِّيْنَ۔ وَلِذٰلِكَ وَجَبَ ظُهُوْرُ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ فِىْ هٰذَا الزَّمَانِ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ لِاَنَّ الضَّآلِّيْنَ

(ترجمہ از مرتب) جان لو، اللہ تعالیٰ آپ کو سعادت بخشے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ میں یہود اور نصاریٰ کو تین اقسام پر منقسم کیا ہے اور ہمیں ان میں سے ایک قسم میں شمولیت کی رغبت دلائی ہے اور اپنے فضل اور کرم سے اس (کے حصول) کی بشارت بھی دی ہے۔ نیز ہمیں ایک دُعاء سکھائی ہے تا ہم بھی اُن بزرگ نبیوں اور بڑے بڑے رسوں کی طرح بن جائیں اور باقی جو دوسری دو اقسام رہ گئیں وہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ یعنی یہودی اور اَلضَّآلِّيْنَ یعنی اہل صلیب ہیں پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم اِس بات سے اُس کی پناہ مانگیں کہ ہم بدبختی اور سرکشی میں کہیں اُن کے ساتھ شامل نہ ہو جائیں پس اس سورۃ سے ظاہر ہوا کہ ہمارا معاملہ خوف اور اُمید اور آسودگی اور آزمائش کے درمیان چھوڑ دیا گیا ہے یعنی یا تو نبیوں کی مانند بن جائیں اور یا بدبختوں کے پیالہ سے پئیں۔ پس تم خدا سے ڈرو جس کی وعید بہت بڑی ہے اور جس کے وعدے عظیم الشان ہیں۔ پس جو شخص خدائے وَدُود کے فضل سے نبیوں کی ہدایت پر قائم نہ ہوگا اُس کے متعلق ڈر ہے کہ وہ نصاریٰ یا یہود کی مانند ہو جائے۔ لہٰذا نبیوں اور رسولوں کے نمونہ کی شدید حاجت ہے تا اُن کا نُور مغضوب علیہم کی تاریکیوں اور ضالّین کے شبہات کو دُور کرے۔ اِسی لیے اِس زمانہ میں اُمت میں سے مسیح موعود کا ظہور واجب ہو گیا

قَدْ كَثُرُوْا فَاقْتَضَتِ الْمَسِيْحَ ضُرُوْرَةُ الْمُقَابَلَةِ۔ وَاِنَّكُمْ تَرَوْنَ اَفْوَاجًا مِّنَ الْقِسِّيْسِيْنَ الَّذِيْنَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ فَاَيْنَ الْمَسِيْحُ الَّذِىْ يَذُبُّهُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اَمَا ظَهَرَ اَثَرُ الدُّعَآءِ۔ اَوْ تُرِكْتُمْ فِى اللَّيْلَةِ اللَّيْلَآءِ۔ اَمْ عُلِّمْتُمْ دُعَآءَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ لِيَزِيْدَ الْحَسْرَةُ وَتَكُوْنُوْا كَالْمَحْرُوْمِيْنَ۔ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ مَا قَسَمَ الْفِرَقَ عَلٰى ثَلٰثَةِ اَقْسَامٍ فِىْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ اِلَّا بَعْدَ اَنْ اَعَدَّ كُلَّ نَمُوْذَجٍ مِّنْهُمْ فِىْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاِنَّكُمْ تَرَوْنَ كَثْرَةَ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَكَثْرَةَ الضَّآلِّيْنَ۔ فَاَيْنَ الَّذِىْ جَآءَ عَلٰى نَمُوْذَجِ النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ مِنَ السَّابِقِيْنَ۔ مَا لَكُمْ لَا تُفَكِّرُوْنَ فِىْ هٰذَا وَتَمُرُّوْنَ غَافِلِيْنَ۔ ثُمَّ اعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ السُّوْرَةَ قَدْ اَخْبَرَتْ عَنِ الْمَبْدَءِ وَالْمَعَادِ وَاَشَارَتْ اِلٰى قَوْمٍ هُمْ اٰخِرُ الْاَقْوَامِ وَمُنْتَهَى الْفَسَادِ۔ فَاِنَّهَا اخْتُتِمَتْ عَلَى الضَّآلِّيْنَ۔ وَفِيْهِ اِشَارَةٌ لِّلْمُتَدَبِّرِيْنَ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ ذَكَرَهَا تَيْنِ الْفِرْقَتَيْنِ فِىْ اٰخِرِ السُّوْرَةِ وَمَا ذَكَرَ الدَّجَّالَ الْمَعْهُوْدَ تَصْرِيْحًا وَّلَا بِالْاِشَارَةِ۔ مَعَ اَنَّ الْمَقَامَ كَانَ يَقْتَضِىْ ذِكْرَ الدَّجَّالِ۔ فَاِنَّ

ہے کیونکہ ضالّین کی بڑی کثرت ہوگئی ہے لہٰذا تقابل کے لزوم نے مسیح موعود کے ظہور کا تقاضا کیا۔ تم خود فوج در فوج پادریوں کو دیکھ رہے ہو جو اَلضَّالِّیْن (کا گروہ) ہیں۔ پھر اگر تمہیں کچھ سمجھ ہے تو (سوچو کہ) وہ مسیح موعود کہاں ہے جو اُن کا مقابلہ کرے؟ کیا تمہاری دعاء کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا؟ یا (بالفاظِ دیگر) تمہیں اندھیری رات میں چھوڑ دیا گیا ہے؟ کیا تمہیں صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی دُعاء اِسی لیے سکھائی گئی تھی کہ تمہاری حسرت میں اضافہ ہو اور تم بے نصیب رہ جاؤ۔ حق بات یہ ہے اور حق بات ہی میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس سورۃ میں تین گروہوں میں تقسیم اُس وقت بیان فرمائی جبکہ اُس نے ان میں سے ہر ایک کا نمونہ اس اُمّت میں مقدّر کر دیا تھا۔ اب تم مغضوب علیہم کی کثرت اور ضالّین کی کثرت تو دیکھ رہے ہو پھر وہ (بزرگ) کہاں ہے جو سابقہ نبیوں اور رسولوں کے نمونہ پر آیا ہو۔ تمہیں کیا (ہو گیا) ہے کہ تم اِس بات پر غور نہیں کرتے اور غافل گزر جاتے ہو۔ مزید برآں جان لو کہ اس سورۃ نے مبدء اور معاد (ہر دو) کی خبر دی ہے اور اُس قوم کی طرف اشارہ کیا ہے جو قوموں میں سے آخری قوم ہے اور بداعمالی کے لحاظ سے بھی انتہائی (مقام) پر ہے کیونکہ یہ سورۃ لفظ اَلضَّالِّیْن پر ختم ہوئی اور اس میں تدبّر کرنیوالوں کے لیے اشارہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں گروہوں کا سورۃ کے آخر میں ذکر کیا ہے لیکن دجّال معہود کا نہ تصریحاً ذکر کیا ہے نہ اشارۃً۔ حالانکہ یہ مقام دجّال کے ذکر کا مقتضی تھا کیونکہ سورۃ فاتحہ نے

السُّوْرَةَ اَشَارَتْ فِیْ قَوْلِهَا الضَّآلِّیْنَ اِلٰی اٰخِرِ الْفِتَنِ وَاَکْبَرِ الْاَھْوَالِ۔ فَلَوْ کَانَتْ فِتْنَۃُ الدَّجَّالِ فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ اَکْبَرَ مِنْ ھٰذِہِ الْفِتْنَۃِ لَخَتَمَ السُّوْرَۃَ عَلَیْھَا لَا عَلٰی ھٰذِہِ الْفِرْقَۃِ۔ فَفَکِّرُوْا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَنَسِیَ اَصْلَ الْاَمْرِ رَبُّنَا ذُو الْجَلَالِ۔ وَذَکَرَ الضَّآلِّیْنَ فِیْ مَقَامٍ کَانَ وَاجِبًا فِیْہِ ذِکْرُ الدَّجَّالِ۔ وَاِنْ کَانَ الْاَمْرُ کَمَا ھُوَ زَعْمُ الْجُھَّالِ۔ لَقَالَ اللّٰہُ فِیْ ھٰذَا الْمَقَامِ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الدَّجَّالِ۔ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ اَرَادَ فِیْ ھٰذِہِ السُّوْرَۃِ اَنْ یَّحُثَّ الْاُمَّۃَ عَلٰی طُرُقِ النَّبِیّٖنَ وَیُحَذِّرَھُمْ مِّنْ طُرُقِ الْکَفَرَۃِ الْفَجَرَۃِ۔ فَذَکَرَ قَوْمًا اَکْمَلَ لَھُمْ عَطَآءَہٗ۔ وَاَتَمَّ نَعْمَآءَہٗ۔ وَوَعَدَ اَنَّہٗ بَاعِثٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ مَنْ ھُوَ یُشَابِہُ النَّبِیّٖنَ۔ وَیُضَاھِی الْمُرْسَلِیْنَ۔ ثُمَّ ذَکَرَ قَوْمًا اٰخَرَ تُرِکُوْا فِی الظُّلُمَاتِ وَجَعَلَ فِتْنَتَھُمْ اٰخِرَ الْفِتَنِ وَاَعْظَمَ الْاٰفَاتِ۔ وَاَمَرَ اَنْ یَّعُوْذَ النَّاسُ کُلُّھُمْ بِہٖ مِنْ ھٰذِہِ الْفِتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ وَیَتَضَرَّعُوْا لِدَفْعِھَا فِی الصَّلَوَاتِ فِیْ اَوْقَاتِھَا الْخَمْسَۃِ۔ وَمَا اَشَارَ فِیْ ھٰذَا اِلَی الدَّجَّالِ وَفِتْنَتِہٖ

اَلضَّآلِّیْن کے لفظ سے آخری زمانہ کے فتنہ اور انتہائی خطرہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں دجّال کا فتنہ اَلضَّآلِّیْن کے فتنہ سے بڑا تھا تو وہ اِس سورۃ کو دجّال کے فتنہ کے ذکر پر ختم کرتا نہ کہ اس فرقہ ضالّہ پر۔ پس تم اپنے دلوں میں غور کرو کیا ہمارا ذی شان پروردگار اصل بات کو بھول گیا اور اس نے ایسی جگہ اَلضَّآلِّیْن کا ذکر دیا جہاں دجّالِ معہود کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ اگر معاملہ ناواقفوں کے خیال کے مطابق ایسا ہی ہوتا تو خدا تعالیٰ اس جگہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الدَّجَّال فرماتا حالانکہ تم جانتے ہو کہ اِس سُورۃ سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ اُمّتِ مُسلمہ کو انبیاء کے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے اور اُن کو بدکردار کافروں کے راستوں سے ڈرائے تبھی تو اُس نے پہلے ایک ایسی قوم کا ذکر کیا جس پر اس نے اپنی بخششوں کو مکمّل کیا تھا اور اپنی نعمتوں کو انتہاء تک پہنچایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ اِس اُمّت میں سے ایک شخص کو پیدا کرے گا جو نبیوں کے مُشابہ اور رسولوں کی مانند ہوگا۔ پھر اس نے ایک اور گروہ کا ذِکر کیا جو تاریکیوں میں چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اُن کے فتنہ کو آخری فتنہ اور سب سے بڑی آفت قرار دیا اور اُس نے حکم فرمایا کہ قیامت کے دن تک تمام لوگ ان فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگا کریں اور اُن کے دُور ہونے کے لیے پانچوں وقت نمازوں میں آہ وزاری کیا کریں۔ لیکن اُس نے

الْعَظِيْمَةِ۔ فَاَيُّ دَلِيْلٍ اَكْبَرُ مِنْ هٰذَا عَلٰى اِبْطَالِ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةِ ثُمَّ مِنْ مُّؤَيِّدَاتِ هٰذَا الْبُرْهَانِ اَنَّ اللّٰهَ ذَكَرَ النَّصَارٰى فِيْ اٰخِرِ الْقُرْاٰنِ كَمَا ذَكَرَ فِيْ اَوَّلِ الْفُرْقَانِ۔ فَفَكِّرْ فِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَفِي الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ۔ وَمَا هُمْ اِلَّا النَّصَارٰى فَعُذْ مِنْ عُلَمَآءِهِمْ بِرَبِّ النَّاسِ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ كَمَا خَتَمَ الْفَاتِحَةَ عَلَى الضَّآلِّيْنَ كَذَالِكَ خَتَمَ الْقُرْاٰنَ عَلَى النَّصْرَانِيِّيْنَ وَاِنَّ الضَّآلِّيْنَ هُمُ النَّصْرَانِيُّوْنَ كَمَا رُوِيَ عَنْ نَّبِيِّنَا فِي الدُّرِّ الْمَنْثُوْرِ وَفِيْ فَتْحِ الْبَارِيْ فَلَا تُعْرِضْ عَنِ الْقَوْلِ الثَّابِتِ الْمَشْهُوْرِ۔ وَمُسَلَّمِ الْجُمْهُوْرِ ۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۸۲ تا ۱۹۱)

بتا دیں تو سہی کہ اس قوم کی جس کا فتنہ دجال سے بھی زیادہ ہے خبر کہاں دی گئی ہے۔ قرآن شریف نے تو اسی واسطے دجال کا نام نہیں لیا بلکہ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا جس سے مراد یہی قوم نصاریٰ ہے وَلَا الدَّجَّالِ کیوں نہ کہا۔ اصل امر یہی ہے کہ یہی وہ قوم ہے جس سے تمام انبیا اپنی اپنی اُمت کو ڈراتے آئے ہیں۔

(الحکم ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

وہ دجال جس کا حدیثوں میں ذکر ہے وہ شیطان ہی ہے جو آخر زمانہ میں قتل کیا جائے گا۔ جیسا کہ دانیال نے بھی یہی لکھا ہے اور بعض حدیثیں بھی یہی کہتی ہیں۔ اور چونکہ مظہر اتمّ شیطان کا نصرانیت ہے۔ اس لیے سورہ فاتحہ میں دجّال کا تو کہیں ذکر نہیں مگر نصاریٰ کے شرّ سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا حکم ہے اگر دجال کوئی الگ مفسد ہوتا تو قرآن شریف میں بجائے اِس کے کہ خدا تعالیٰ یہ فرماتا ولا الضّآلین یہ فرمانا چاہیئے تھا کہ ولا الدّجّال

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۹)

اِس سورۃ میں دجّال اور اُس کے فتنۂ عظیمہ کی طرف تو کوئی اشارہ نہ فرمایا۔ پس اِس عقیدہ کے باطل ہونے پر اِس سے بڑی دلیل اور کونسی ہو سکتی ہے۔ نیز اِس دلیل کے تائیدی اُموریں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے آخر میں بھی ویسے ہی نصاریٰ کا ذکر کیا ہے جیسے اس نے شروع میں ان کا ذکر فرمایا۔ پس لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ اور اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ میں غور کرو۔ یہ لوگ نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ پس ان کے پادریوں سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگو۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے سُورت فاتحہ کو اَلضَّآلِّيْنَ (کے ذکر) پر ختم کیا ہے اسی طرح اُس نے قرآنِ کریم کو نصاریٰ (کے ذکر) پر ختم کیا ہے اور اَلضَّآلِّيْنَ نصاریٰ ہی ہیں جیسا کہ دُرِّ منثور اور فتح الباری میں نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے۔ پس تم ایسی پختہ بات سے جو زبان زدِ خلائق ہے اور جو جمہور (مسلمانوں) کے نزدیک مسلّم ہے مُنہ نہ موڑو۔

اس شیطان[ا] کا نام دوسرے لفظوں میں عیسائیت کا بھوت ہے یہ بھوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عیسائی گرجا میں قید تھا اور صرف جسّاسہ کے ذریعہ سے اسلامی اخبار معلوم کرتا تھا پھر قرون ثلاثہ کے بعد بموجب خبر انبیاء علیہم السلام کے اس بھوت نے رہائی پائی اور ہر روز اُس کی طاقت بڑھتی گئی یہاں تک کہ تیرھویں صدی ہجری میں بڑے زور سے اُس نے خروج کیا اسی بھوت کا نام دجّال ہے جس نے سمجھنا ہو سمجھ لے اور اسی بھوت سے خدا تعالیٰ نے سورہ فاتحہ کے اخیر میں ولا الضآلین کی دعا میں ڈرایا ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۴۲ حاشیہ)

وہ دجّال کہاں ہے ؟ جس سے تم ڈراتے ہو مگر اَلضَّآلِّیْنَ والا دجّال دن بدن دنیا میں ترقی کر رہا ہے اور قریب ہے کہ آسمان و زمین اس کے فتنہ سے پھٹ جائیں۔

(حقیقۃ الوحی ص۴۶)

خدا تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ وہ دجال جس سے ڈرایا گیا ہے وہ آخری زمانہ کے گمراہ پادری ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ کا طریق چھوڑ دیا ہے کیونکہ اُس نے سورہ ممدوحہ میں یہی دعا سکھلائی ہے کہ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ ایسے یہودی نہ بن جائیں جن پر حضرت عیسیٰ کی نافرمانی اور عداوت سے غضب نازل ہوا تھا اور نہ ایسے عیسائی بن جائیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو چھوڑ کر اس کو خدا بنا دیا تھا اور ایک ایسا جھوٹ اختیار کیا جو تمام جھوٹوں سے بڑھ کر ہے اور اس کی تائید میں حد سے زیادہ فریب اور مکر استعمال میں لائے اس لیے آسمان پر اُن کا نام دجال رکھا گیا اگر کوئی اور دجال ہوتا تو اس آیت میں اس سے پناہ مانگنی ضروری تھی یعنی سورہ فاتحہ میں بجائے وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے ولا الدجال ہونا چاہیئے تھا اور یہی معنے واقعات نے ظاہر کیے ہیں کیونکہ جس آخری فتنہ سے ڈرایا گیا تھا زمانہ نے اسی فتنہ کو پیش کیا ہے جو تثلیث پر غلوّ کرنے کا فتنہ ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۳۱ حاشیہ)

ان لوگوں نے مسیح کو نصف خدائی کا دعویدار بنا دیا ہے ایسا ہی انہوں نے دجّال کی نسبت مان رکھا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کریگا اور یہ کریگا اور وہ کریگا افسوس قرآن تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تلوار سے تمام اُن باطل معبودوں کو قتل کرتا ہے جن میں خدائی صفات مانی جائیں پھر یہ دجّال کہاں سے نکل آیا ہے سورۃ فاتحہ میں یہودی اور عیسائی بننے سے بچنے کی دعا تو سکھلائی کیا دجّال کا ذکر خدا کو یاد نہ رہا جو اتنا بڑا فتنہ تھا؟

(الحکم ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء ص۵)

یہ جو میں نے ضالین کہا ہے تو اس سے مراد عیسائی اور پادری ہیں۔ انگریز اس سے مراد نہیں کیونکہ انگریز تو اکثر ایسے

[ا] دجال۔

ہوتے ہیں جنہوں نے ساری عمر میں ایک دفعہ بھی انجیل پڑھی ہوئی نہیں ہوتی۔ ان پادریوں پر اسلام ایک بڑا بھاری صدمہ ہے کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کو وہ مغلوب نہیں کر سکتے ......

یہ جو میں نے ضالین کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد بھی پادری لوگ ہیں جو نہ صرف خود گمراہ ہیں بلکہ اوروں کو گمراہ کرنے میں بھی پوری ہمت اور کوشش سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ جو حدیثوں میں دجال کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد ضالین ہی ہیں اور اگر دجال کے معنے ضالین کے نہ لیے جاویں تو ماننا پڑیگا۔ کہ خدا تعالیٰ نے ضالین کا ذکر تو قرآن شریف میں کر دیا۔ بلکہ ان کے فتنہ عظیم سے بچنے کے لیے دعا بھی سکھا دی مگر دجال کا ذکر تک بھی نہ کیا۔ حالانکہ وہ ایک ایسا عظیم فتنہ تھا جس سے لکھوکھا لوگ گمراہ ہو جاتے تھے۔ غرض سچی بات یہی ہے کہ دجال اور ضالین ایک ہی گروہ کا نام ہے۔ جو لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں اور اس آخری زمانہ میں اپنے پورے زور پر ہیں اور ہر ایک طرح کے مکر اور فریب سے خلقت کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے پھرتے ہیں۔ اور چونکہ دجال کے معنے بھی گمراہ کرنے والے کے ہیں۔ اسی واسطے احادیث میں یہ لفظ ضالین کی بجائے بولا گیا ہے اور احادیث میں ضالین کی بجائے دجال کا لفظ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ لوگ اپنی طرف سے ایک دجال بنا لیں گے اور عجیب عجیب قسم کے خیالات اس کی طرف منسوب کریں گے کہ اس کے ایک ہاتھ میں بہشت ہوگا اور ایک ہاتھ میں دوزخ اور وہ خدائی کا بھی دعویٰ کریگا اور نبوت کا بھی۔ اور اس کے ماتھے پر کافر لکھا ہوا ہوگا اور اس کا ایک گدھا ہوگا۔ جس کے کانوں میں اس قدر فاصلہ ہوگا۔ اور اس میں یہ یہ باتیں ہوں گی۔ اس لیے خدا فرماتا ہے کہ وہ دجالی گروہ ضالین کا ہی ہے جو طرح طرح کے پیرایوں میں لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ اور بڑے بڑے وعدے دے دیکر خدا تعالیٰ کی کتابوں میں تحریف تبدیل کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو خدا تعالیٰ کے حکموں سے بالکل روگردان کر رہے ہیں یہاں تک کہ سور جیسی گندی چیز کو بھی حلال خیال کر رہے ہیں حالانکہ توریت میں سور خاص طور پر حرام کیا گیا ہے اور خود مسیح نے بھی کہا ہے۔ کہ سوروں کے آگے موتی مت ڈالو۔ اور ایسا ہی کفارہ جیسا گندہ مسئلہ ایجاد کر کے انہوں نے گناہوں کے لیے ایک وسیع میدان تیار کر دیا ہے۔ خواہ انسان کیسے ہی کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو مگر یسوع کو خدا یا خدا کا بیٹا سمجھنے سے وہ سب عیب جاتے رہیں گے۔ اور انسان نجات پا جائے گا اب تبلاؤ کیا یہ صاف سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ وہی گمراہ کرنے والا گروہ ہے جس کو احادیث میں دجال اور قرآن کریم میں ضالین کر کے پکارا گیا ہے۔ (الحکم ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

قرآن نے اپنے اول میں بھی مغضوب علیہم اور ضالین کا ذکر فرمایا ہے اور اپنے آخر میں بھی جیسا کہ آیت لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ بصراحت اس پر دلالت کر رہی ہے اور یہ تمام اہتمام تاکید کے لیے کیا گیا اور نیز اس لیے

کہ تا مسیح موعود اور غلبہ نصرانیت کی پیشگوئی نظری نہ رہے اور آفتاب کی طرح چمک اٹھے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۸۷)

اگر یہ اعتراض ہے کہ اب تو انبیاء کا سلسلہ بند ہو گیا اب کیوں ہمیں مغضوب علیہم بنایا جاتا ہے۔ جب اس امت کے لیے خاتمہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس قوم میں بھی کئی یہودیوں کا رنگ دکھلائیں گے۔ وہ یہودی عیسیٰ کو سولی دینا چاہتے تھے اسی طرح حدیث صحیح میں ہے کہ آخر یہ بھی یہودی ہوں گے اور خدا کی طرف سے جو آئے گا اس کی تکذیب کریں گے اور اس کے قتل کے منصوبے کرنا داخل ثواب سمجھیں گے۔ خدا کی باتیں بے معنی نہیں۔ یہ عذاب کے دن ہیں یا نہیں؟ پچیس برس سے صبر کیا ان لوگوں نے تو اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ میں نے ان کے کفرناموں میں دیکھا کہ لکھتے ہیں اس کا کفر یہود و نصاریٰ کے کفر سے بڑھ کر ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ کلمہ پڑھتے ہیں۔ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا نام تعظیم سے لیتے ہیں جان تک فدا کرنے کو حاضر ہیں۔ کیا وہ ان سے بدتر ہیں۔ جو ہر وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ بجز اس کے جو مسلوب الایمان ہو جائے ایسا الزام نہیں دے سکتا اگر ان میں ایمان نہیں تو کیا شرافت بھی جاتی رہی۔ اور اللہ تعالیٰ تو خوب جانتا تھا کہ ایسا فرقہ ہونے والا ہے۔ جو مسیح کی تکفیر اپنا ایمان سمجھے گا۔ اسی لیے اس دعا میں اس راہ سے بچنے کے لیے دعا سکھلائی۔

(بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ ان کی راہ سے بچا جو گمراہ ہوئے یعنی سچی راہ کو چھوڑ دیا۔ اس راہ کو جس کی تعلیم انجیل میں ملی تھی کہ خدا کو واحد جانو۔ یہ تعلیم بالکل چھوڑ دی۔ دیکھو ان کو تبلایا گیا تھا کہ وہ خدا معبود ہے۔ جو حضرت عیسیٰ کا بھی خدا ہے مگر اب یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں اور یہ کہ وہی جزا سزا کے مالک ہیں۔

(بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

یہ نہ سمجھو کہ مغضوب علیہم ذرا سخت ہے۔ اور ضالین نرم۔ یہ بات نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ یہودی لوگوں کا ان ضالین سے تھوڑا گناہ تھا وہ تورات کے پابند تھے۔ ہم نے ایک یہودی سے اس کے مذہب کی نسبت پوچھا تو اس نے کہا۔ ہمارا خدا کی نسبت وہی عقیدہ ہے جو قرآن میں ہے۔ ہم نے اب تک کسی انسان کو خدا نہیں بنایا۔ اس اعتبار سے تو یہ ضالین سے اچھے ہیں مگر شوخی شرارت میں ضالین سے بڑھ کر ہیں۔ پس اس لیے کہ انہیں دنیا میں سزا ملی ان کا ذکر پہلے آیا۔ ایک تحصیلدار کے پاس مقدمہ ہو اور اس نے اسے کچھ تھوڑا جرمانہ یا قید کرنا ہو تو سزا دے گا۔ اور اگر اس کی سزا اس کے اختیارات سے باہر ہو تو کسی دوسری عدالت کے سپرد کرتا ہے۔ یہودیوں کے اعمال ایسے تھے۔ کہ ان کی سزا اس دنیا میں بھی ہو سکتی تھی۔ مگر ضالین کا گناہ ان سے زیادہ ہے کہ مخلوق کو خدا بنا لیا پس یہ آگے چل کر

سزا پائیں گے یہ ایسے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا[1] یعنی قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے زمین شق ہو اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاویں۔ یہودیوں کے بارے میں یہ نہ فرمایا معمولی گناہ تھا یہیں سزا دیدی اور ضالین کی سزا سخت ہے اور سزا میں تفاوت ضرور ہؤا کرتا ہے۔ ایک چور معمولی ہو تو اس کی سزا اور ہے اور ایک عادی مجرم چوروں کا استاد ہو تو اس کی اور۔ پادریوں نے اپنے بدعقیدے کو یہاں تک پھیلایا ہے کہ بعض اوقات ایک ایک پرچہ پچاس پچاس ہزار نکلتا ہے ایک ایسے مذہب کی تائید کے لیے جس کی بنا حق کے نہایت خلاف اور ہر طرح سے مضر ہے۔

(بدر ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

سورہ فاتحہ جس کو ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں اس سورہ میں تین گذشتہ فرقے پیش کیے ہیں ایک وہ جو انعمت علیہم کے مصداق ہیں۔ دوسرے مغضوب تیسرے ضالین۔

مغضوب سے یہ مخصوصاً مراد نہیں کہ قیامت میں ہی غضب ہوگا کیونکہ جو کتاب اللہ کو چھوڑتا اور احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا ہے ان سب پر غضب ہوگا مغضوب سے مراد بالاتفاق یہود ہیں اور الضالین سے نصاریٰ اب اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ منعم علیہ فرقہ میں داخل ہونے اور باقی دو سے بچنے کے لیے دُعا ہے۔ اور یہ سنت اللہ ٹھیری ہوئی ہے جب سے نبوت کی بنیا ڈالی گئی ہے خدا تعالیٰ نے یہ قانون مقرر کر رکھا ہے کہ جب وہ کسی قوم کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے تو بعض اس کی تعمیل کرنے والے اور بعض خلاف ورزی کرنے والے ضرور ہوتے ہیں پس بعض منعم علیہ بعض مغضوب اور بعض ضالین ضرور ہوں گے۔

اب زمانہ بآواز بلند کہتا ہے کہ اس سورہ شریف کے موافق ترتیب آخر سے شروع ہوگئی ہے آخری فرقہ نصاریٰ کا رکھا ہے اب دیکھو کہ اس میں کس قدر لوگ داخل ہوگئے ہیں ایک بشپ نے اپنی تقریر میں ذکر کیا ہے کہ...... مسلمان مرتد ہو چکے ہیں اور یہ قوم جس زور شور کے ساتھ نکلی ہے اور جو جو طریق اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے اختیار کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی عظیم الشان فتنہ نہیں ہے اب دیکھو کہ تین باتوں میں سے ایک تو ظاہر ہوگئی پھر دوسری قوم مغضوب ہے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وقت بھی آگیا اور وہ بھی پورا ہو رہا ہے یہودیوں پر غضب الٰہی اس دنیا میں بھی بھڑکا اور طاعون نے اُن کو تباہ کیا۔ اب اپنی بدکاریوں اور فسق و فجور کی وجہ سے طاعون بکثرت پھیل رہی ہے۔ کتمان حق سے وہ لوگ جو عالم کہلاتے ہیں نہیں ڈرتے۔ اب ان دونوں کے پورا ہونے سے تیسرے کا پتہ صاف ملتا ہے انسان کا قاعدہ ہے کہ جب چار میں سے تین معلوم ہوں تو چوتھی شے معلوم کر لیتا ہے اور اُس پر اُس کو اُمید ہو جاتی ہے نصاریٰ میں لاکھوں داخل ہوگئے

[1] مریم ع ۶-۹

مغضوب میں داخل ہوتے جاتے ہیں منعم علیہ کا نمونہ بھی اب خدا دکھانا چاہتا ہے جب کہ سورہ فاتحہ میں دعا تھی اور سورہ نور میں وعدہ کیا گیا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورہ نور میں دعا قبول ہو گئی ہے۔ غرض اب تیسرا حصہ منعم علیہ کا ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس کو روشن طور پر ظاہر کر دیگا۔ اور یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے جو ہو کر رہے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ انسان کو ثواب میں داخل کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ استحقاق جنت کا ثابت کریں۔ جیسا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوا۔ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر تھا کہ وہ صحابہ کے بدون ہی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی فتوحات عطا فرماتا۔ مگر نہیں خدا نے صحابہ کو شامل کر لیا تاکہ وہ مقبول ٹھیریں اس سنت کے موافق یہ بات ہماری جماعت کو پیش آگئی ہے کہ بار بار تکلیف دی جاتی ہے اور چندے مانگے جاتے ہیں۔

(الحکم ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۶و۷)

سورہ فاتحہ میں تین دعائیں سکھلائی گئی ہیں (۱) ایک یہ دعا کہ خدا تعالیٰ اُس جماعت میں داخل رکھے جو صحابہ کی جماعت ہے اور پھر اس کے بعد اس جماعت میں داخل رکھے جو مسیح موعود کی جماعت ہے جن کی نسبت قرآن شریف فرماتا ہے وَ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ[1] غرض اسلام میں یہی دو جماعتیں منعم علیہم کی جماعتیں ہیں اور انہی کی طرف اشارہ ہے آیت صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں کیونکہ تمام قرآن پڑھ کر دیکھو جماعتیں دو ہی ہیں۔ ایک صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت۔ دوسری وآخرین منہم کی جماعت جو صحابہ کے رنگ میں ہے اور وہ مسیح موعود کی جماعت ہے۔ پس جب تم نماز میں یا خارج نماز کے یہ دعا پڑھو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ تو دل میں یہی ملحوظ رکھو کہ میں صحابہ اور مسیح موعود کی جماعت کی راہ طلب کرتا ہوں۔ یہ تو سورۃ فاتحہ کی پہلی دعا ہے۔ (۲) دوسری دعا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسیح موعود کو دکھ دیں گے اور اس دعا کے مقابل پر قرآن شریف کے اخیر میں سورہ تبت یدا ابی لھب ہے۔ (۳) تیسری دعا ولا الضالین ہے۔ اور اس کے مقابل پر قرآن شریف کے اخیر میں سورہ اخلاص ہے یعنی قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ اور اس کے بعد دو اور سورتیں جو ہیں یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس یہ دونوں سورتیں سورہ تبت اور سورہ اخلاص کے لیے بطور شرح کے ہیں اور ان دونوں سورتوں میں اس تاریک زمانہ سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے جب کہ لوگ خدا کے مسیح کو دکھ دیں گے اور جب کہ عیسائیت کی ضلالت تمام دنیا میں پھیلے گی پس سورہ فاتحہ میں اُن تینوں دعاؤں کی تعلیم بطور براعت الاستہلال ہے یعنی وہ اہم مقصد جو قرآن میں مفصل بیان کیا گیا ہے سورہ فاتحہ میں بطور اجمال اس کا افتتاح کیا ہے اور پھر سورۃ تبت اور سورہ اخلاص اور سورہ فلق اور سورہ الناس میں ختم قرآن کے وقت میں انہی دونوں

[1] الجمعۃ۔ ع ۱۔

بلاؤں سے خداتعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے پس افتتاح کتاب اللہ بھی انہی دونوں دعاؤں سے ہوا۔ اور پھر اختتام کتاب اللہ بھی انہی دونوں دعاؤں پر کیا گیا۔

اور یاد رہے کہ ان دونوں فتنوں کا قرآن شریف میں مفصل بیان ہے اور سورہ فاتحہ اور آخری سورتوں میں اجمالاً ذکر ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں دعا ولاالضّالین میں صرف دو لفظ میں سمجھا یا گیا ہے کہ عیسائیت کے فتنہ سے بچنے کے لیے دعا مانگتے رہو جس سے سمجھا جاتا ہے کہ کوئی فتنہ عظیم الشان درپیش ہے جس کے لیے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ نماز کے پنج وقت میں یہ دعا شامل کردی گئی اور یہاں تک تاکید کی گئی کہ اس کے بغیر نماز ہو نہیں سکتی جیسا کہ حدیث لَاصَلٰوۃَ اِلَّا بِالْفَاتِحَۃِ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہزارہا مذہب پھیلے ہوئے ہیں جیسا کہ پارسی یعنی مجوسی اور براہمہ یعنی ہندو مذہب اور بدھ مذہب جو ایک بڑے حصہ دنیا پر قبضہ رکھتا ہے اور چینی مذہب جس میں کروڑہا لوگ داخل ہیں اور ایسا ہی تمام بت پرست جو تعداد میں سب مذہبوں سے زیادہ ہیں اور یہ تمام مذہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بڑے زور و جوش سے پھیلے ہوئے تھے اور عیسائی مذہب ان کے نزدیک ایسا تھا جیسا کہ ایک پہاڑ کے مقابل پر ایک تنکا پھر کیا وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں یہ دعا نہیں سکھلائی کہ مثلاً خدا چینی مذہب کی ضلالتوں سے پناہ میں رکھے یا مجوسیوں کی ضلالتوں سے پناہ میں رکھے یا بدھ مذہب کی ضلالتوں سے پناہ میں رکھے یا آریہ مذہب کی ضلالتوں سے پناہ میں رکھے یا دوسرے بت پرستوں کی ضلالتوں سے پناہ میں رکھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ تم دعا کرتے رہو کہ عیسائی مذہب کی ضلالتوں سے محفوظ رہو اس میں کیا بھید ہے اور عیسائی مذہب میں کونسا عظیم الشان فتنہ آئندہ کسی زمانہ میں پیدا ہونے والا تھا جس سے بچنے کے لیے زمین کے تمام مسلمانوں کو تاکید کی گئی۔ پس سمجھو اور یاد رکھو کہ یہ دعا خدا کے اس علم کے مطابق ہے کہ جو اس کو آخری زمانہ کی نسبت تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ تمام مذہب بت پرستوں اور چینیوں اور پارسیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے تنزّل پر ہیں اور ان کے لیے کوئی ایسا جوش نہیں دکھلایا جائے گا جو اسلام کو خطرہ میں ڈالے مگر عیسائیت کے لیے وہ زمانہ آتا جاتا ہے کہ اس کی حمایت میں بڑے بڑے جوش دکھلائے جائیں گے اور کروڑہا روپیہ سے اور ہر ایک تدبیر اور ہر ایک مکر اور حیلہ سے اس کی ترقی کے لیے قدم اٹھایا جائے گا اور یہ تمنا کی جائے گی کہ تمام دنیا مسیح پرست ہو جائے تب وہ دن اسلام کے لیے سخت دن ہونگے اور بڑی ابتلا کے دن ہوں گے۔ سو اب یہ وہی فتنہ کا زمانہ ہے جس میں تم آج ہو۔ تیرہ سو برس کی پیشگوئی جو سورۃ فاتحہ میں تھی آج تم میں اور تمہارے ملک میں پوری ہوئی اور اس فتنہ کی جڑ مشرق ہی نکلا اور جیسا کہ اس فتنہ کا ذکر قرآن کے ابتدا میں فرمایا گیا ایسا ہی قرآن شریف کے انتہا میں بھی ذکر فرمایا تا یہ امر مؤکّد ہو کر

دلوں میں بیٹھ جائے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۶-۷۷)

سورۃ فاتحہ نری تعلیم ہی نہیں بلکہ اس میں ایک بڑی پیشگوئی بھی ہے اور وہ یہ کہ خدا نے اپنی چاروں صفات ربوبیّت۔ رحمانیّت۔ رحیمیّت۔ مالکیّت یوم الدین یعنی اقتدار جزا سزا کا ذکر کر کے اور اپنی عام قدرت کا اظہار فرما کر پھر اس کے بعد کی آیتوں میں یہ دُعا سکھلائی ہے کہ خدایا ایسا کر کہ گذشتہ راستباز نبیوں رسولوں کے ہم وارث ٹھہرائے جائیں ان کی راہ ہم پر کھولی جائے اُن کی نعمتیں ہم کو دی جائیں خدایا ہمیں اس سے بچا کہ ہم اس قوم میں سے ہو جائیں جن پر دُنیا میں ہی تیرا عذاب نازل ہوا۔ یعنی یہود جو حضرت عیسیٰ مسیح کے وقت میں تھی جو طاعون سے ہلاک کی گئی۔ خدایا ہمیں اس سے بچا کہ ہم اُس قوم میں سے ہو جائیں جن کے شامل حال تیری رہنمائی نہ ہوئی اور وہ گمراہ ہو گئی یعنی نصاریٰ اس دعا میں یہ پیشگوئی مخفی ہے کہ بعض مسلمانوں میں سے ایسے ہوں گے کہ وہ اپنے صدق صفا کی وجہ سے پہلے نبیوں کے وارث ہو جائیں گے اور نبوت اور رسالت کی نعمتیں پائیں گے اور بعض ایسے ہونگے کہ وہ یہودی صفت ہو جائیں گے جن پر دنیا میں ہی عذاب نازل ہوگا اور بعض ایسے ہوں گے کہ وہ عیسائیت کا جامہ پہن لیں گے۔ کیونکہ خدا کی کلام میں یہ سنت مستمرہ ہے کہ جب ایک قوم کو ایک کام سے منع کیا جاتا ہے تو ضرور بعض ان میں سے ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے علم میں اُس کام کے مرتکب ہونے والے ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نیکی اور سعادت کا حصہ لیتے ہیں ابتداء دنیا سے اخیر تک جس قدر خدا نے کتابیں بھیجیں اُن تمام کتابوں میں خدا تعالیٰ کی یہ قدیم سنت ہے کہ جب وہ ایک قوم کو ایک کام سے منع کرتا ہے یا ایک کام کی رغبت دیتا ہے تو اس کے علم میں یہ مقدر ہوتا ہے کہ بعض اُس کام کو کریں گے اور بعض نہیں۔ پس یہ سورۃ پیشگوئی کر رہی ہے کہ کوئی فرد اس اُمت میں سے کامل طور پر نبیوں کے رنگ میں ظاہر ہوگا تا وہ پیشگوئی جو آیت صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے مستنبط ہوتی ہے وہ اکمل اور اتم طور پر پوری ہو جائے۔ اور کوئی گروہ ان میں سے ان یہودیوں کے رنگ میں ظاہر ہوگا جن پر حضرت عیسیٰ نے لعنت کی تھی اور وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے تھے تا وہ پیشگوئی جو آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ سے مستنبط ہوتی ہے ظہور پذیر ہو۔ اور کوئی گروہ ان میں سے عیسائیوں کے رنگ میں ہو جائے گا عیسائی بن جائے گا جو خدا کی رہنمائی سے بوجہ اپنی شراب خواری اور اباحت اور فسق و فجور کے بے نصیب ہو گئے تا وہ پیشگوئی جو آیت ولا الضالین سے مترشح ہو رہی ہے ظاہر ہو جائے اور چونکہ یہ بات مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہے کہ آخری زمانہ میں ہزار ہا مسلمان کہلانے والے یہودی صفت ہو جائیں گے اور قرآن شریف کے کئی ایک مقامات میں بھی یہ پیشگوئی موجود ہے اور صد ہا مسلمانوں کا عیسائی ہو جانا یا عیسائیوں کی سی بے قید اور آزاد زندگی اختیار کرنا خود مشہود اور محسوس ہو رہا ہے بلکہ بہت سے لوگ مسلمان کہلانے والے ایسے ہیں کہ وہ

عیسائیوں کی طرزِ معاشرت پسند کرتے ہیں اور مسلمان کہلا کر نماز روزہ اور حلال اور حرام کے احکام کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ دونوں فرقے یہودی صفت اور عیسائی صفت اِس ملک میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں تو یہ دو پیشگوئیاں سورۃ فاتحہ کی تو تم پوری ہوتی دیکھ چکے ہو اور بچشم خود مشاہدہ کر چکے ہو کہ کس قدر مسلمان یہودی صفت اور کس قدر عیسائیوں کے لباس میں ہیں۔ تو اب تیسری پیشگوئی خود ماننے کے لائق ہے کہ جیسا کہ مسلمانوں نے یہودی عیسائی بننے سے یہود و نصاریٰ کی بدی کا حصہ لیا ایسا ہی اُن کا حق تھا کہ بعض افراد ان کے اُن مقدس لوگوں کے مرتبہ اور مقام سے بھی حصہ لیں جو بنی اسرائیل میں گذر چکے ہیں یہ خدائے تعالیٰ پر بدظنی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی بدی کا تو حصہ دار ٹھہرا دیا ہے یہاں تک کہ اُن کا نام یہود بھی رکھدیا مگر اُن کے رسولوں اور نبیوں کے مراتب میں سے اس امت کو کوئی حصہ نہ دیا پھر یہ امت خیرالامم کس وجہ سے ہوئی بلکہ شرّالامم ہوئی کہ ہر ایک نمونہ شر کا ان کو ملا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا۔ کیا ضرور نہیں کہ اس امت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں نظر آوے جو بنی اسرائیل کے تمام نبیوں کا وارث اور اُن کا ظل ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ اس امت میں اس زمانہ میں ہزار ہا یہودی صفت لوگ تو پیدا کرے اور ہزار ہا عیسائی مذہب داخل کرے مگر ایک شخص بھی ایسا ظاہر نہ کرے جو انبیاء گذشتہ کا وارث اور ان کی نعمت پانے والا ہو تا پیشگوئی جو آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مستنبط ہوتی ہے وہ بھی ایسی ہی پوری ہو جائے جیسا کہ یہودی اور عیسائی ہونے کی پیشگوئی پوری ہو گئی اور جس حالت میں اس امت کو ہزار ہا بُرے نام دئے گئے ہیں اور قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہود ہو جانا بھی اُن کے نصیب میں ہے تو اس صورت میں خدا کے فضل کا خود یہ مقتضا ہونا چاہیئے تھا کہ جیسے گذشتہ نصاریٰ سے انہوں نے بُری چیزیں لیں اسی طرح وہ نیک چیز کے بھی وارث ہوں اسی لیے خدا نے سورۃ فاتحہ میں آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ میں بشارت دی کہ اِس اُمت کے بعض افراد انبیاء گذشتہ کی نعمت بھی پائیں گے نہ یہ کہ نرے یہود ہی بنیں یا عیسائی بنیں اور ان قوموں کی بدی تو لے لیں مگر نیکی نہ لے سکیں۔

(کشتی نوح صفحہ ۴۲-۴۴)

وَمَا قَصَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا الْفِرَقَ الثَّلٰثَ فِي الْفَاتِحَةِ اِلَّا لِيُشِيْرَ اِلٰى اَنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ وَرِثَتْهُمْ فِيْ كُلِّ قِسْمٍ مِّنَ الْاَقْسَامِ الْمَذْكُوْرَةِ فَقَدْ ظَهَرَتْ هٰذِهِ

(ترجمہ اصل کتاب سے) خدا نے فاتحہ میں تین فرقوں کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ امت مذکورہ قسموں میں سے ہر ایک قسم کی وارث ہو گی پس بلا شبہ یہ وراثت ہمارے زمانہ میں جو آخری زمانہ ہے ایسی ظہور تام

الْوَرَاثَۃُ فِیْ مُسْلِمِیْ زَمَانِنَا الَّذِیْ ھُوَ اٰخِرُ الزَّمَانِ بِظُھُوْرِھَا تَامٍّ تَعْرِفُھَا کُلُّ
نَفْسٍ مِّنْ غَیْرِ الْحَاجَۃِ اِلَی الْاِمْعَانِ- کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الَّذِیْنَ یَنْظُرُوْنَ اِلٰی
مُسْلِمِیْ زَمَنِنَا ھٰذَا وَاِلٰی مَا یَعْمَلُوْنَ- وَلِکُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْ ھٰذِہِ الْوُرَثَاءِ الثَّلٰثِ
دَرَجَاتٌ ثَلٰثٌ اَمَّا الَّذِیْنَ وَرِثُوا الْمُنْعَمَ عَلَیْھِمْ فَمِنْھُمْ رِجَالٌ مَّا وَجَدُوْا
حَظَّھُمْ مِّنَ الْاِنْعَامِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنَ الْعَقَائِدِ اَوِ الْاَحْکَامِ وَھُمْ عَلَیْہِ یَقْنَعُوْنَ-
وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدُوْنَ وَاِنَّھُمْ وَقَفُوْا عَلٰی مَرْتَبَۃِ الْاِقْتِصَادِ وَمَا یَکْمُلُوْنَ- وَ
مِنْھُمْ فَرْدٌ اجْتَبَاہُ رَبُّہٗ وَکَمَّلَہٗ وَجَعَلَہٗ سَابِقًا فِی الْخَیْرَاتِ وَھُوَ یَجْتَبِیْ
اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَخُصُّ بِالدَّرَجَاتِ فَذٰلِکَ الْمَخْصُوْصُ ھُوَ الْمَسِیْحُ الْمَوْعُوْدُ
الَّذِیْ ظَھَرَ فِی الْقَوْمِ وَھُمْ لَا یَعْرِفُوْنَ- وَاَمَّا الَّذِیْنَ وَرِثُوا الْمَغْضُوْبَ عَلَیْھِمْ مِّنَ
الْیَھُوْدِ فَمِنْھُمْ رِجَالٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ شَابَھُوْھُمْ فِیْ تَرْکِ الْفَرَآئِضِ وَالْحُدُوْدِ
لَا یَصُوْمُوْنَ وَلَا یُصَلُّوْنَ- وَلَا یَذْکُرُوْنَ الْمَوْتَ وَلَا یُبَالُوْنَ- وَمِنْھُمْ قَوْمٌ
تَّخَذُوا الدُّنْیَا مَعْبُوْدَھُمْ وَلَھَا فِیْ لَیْلِھِمْ وَنَھَارِھِمْ یَعْمَلُوْنَ- وَمِنْھُمْ
سَابِقُوْنَ فِی الرَّذَآئِلِ وَاُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ اَھْلَ الْحَقِّ سُخْرِیًّا وَّعَلَیْھِمْ

سے مسلمانوں میں ظاہر ہو گئی ہے کہ ہر یک نفس بغیر حاجت فکر کے اِس کو پہچان رہا ہے چنانچہ یہ بات ان لوگوں پر مخفی نہیں
جو ہمارے زمانہ کے مسلمانوں اور ان کے کاموں کی طرف نظر کرتے ہیں اور ان تین قسم کے وارثوں میں سے ہر یک فرقہ
وارثہ کے تین درجہ ہیں۔ لیکن وہ جو منعم علیہم کے وارث ہوئے اُن میں سے بعضوں نے انعام سے حصہ نہ پایا مگر
تھوڑا سا حصہ عقائد اور احکام میں سے ان کو ملا اور اسی پر انہوں نے قناعت کی اور بعض ان میں سے درمیانی چال
والے ہیں اور وہ اسی اپنی چال پر کھڑے ہو گئے اور تکمیل اور کمال کے درجہ تک نہیں پہنچے اور اُن میں سے ایک فرد ہے
کہ خدا نے اس کو چنا اور امام بنایا اور نیکیوں میں کامل کیا اور وہ چن لیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور درجوں سے
مخصوص کرتا ہے پس وہی مخصوص وہی مسیح موعود ہے جو اس قوم میں ظاہر ہوا اور وہ نہیں پہچانتے اور لیکن جو مغضوب علیہم
کے وارث ہوئے ان میں سے وہ مسلمان ہیں جو خدا کے احکام اور فرائض کے ترک کرنے میں یہود سے مشابہ ہو گئے
نہ نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں اور موت کو یاد نہیں کرتے اور بے خوف ہیں اور ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں
نے دنیا کو اپنا معبود بنایا اور رات دن اسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ایسے لوگ ہیں کہ کمینی اور رذیل
خصلتوں میں سب سے بڑھ گئے۔ یہی لوگ ہیں جو اہل حق پر ٹھٹھے مارتے ہیں اور ان سے دشمنی کرتے ہیں اور گالیاں دیتے

يَضْحَكُوْنَ - وَيُعَادُوْنَهُمْ وَيُكَفِّرُوْنَهُم وَيَشْتِمُوْنَهُمْ وَيَعْمَلُوْنَ رِيَاءً وَّ بَطَرًا وَّلَا يُخْلِصُوْنَ - وَيَصُوْلُوْنَ عَلٰى مَسِيْحِ اللّٰهِ وَحِزْبِهٖ وَيَجُرُّوْنَهُمْ اِلَى الْحُكَّامِ وَفِيْ كُلِّ طَرِيْقٍ يَّقْعُدُوْنَ - وَيَقُوْلُوْنَ اقْتُلُوْهُمْ فَاِنَّهُمْ كَافِرُوْنَ - وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى كَلَامِ اللّٰهِ وَاجْعَلُوْهُ حَكَمًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ تَرٰى اَعْيُنَهُمْ تَحْمَرُّ مِنَ الْغَيْظِ وَيَمُرُّوْنَ شَاتِمِيْنَ وَهُمْ مُّشْتَعِلُوْنَ - وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيِ اللّٰهِ رَءَوْهَا بِاَعْيُنِهِمْ ثُمَّ يَمُرُّوْنَ مُسْتَكْبِرِيْنَ كَاَنَّهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ - وَنَبَذُوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا وَّقَالُوْا لَا تَسْمَعُوْا دَلَائِلَهٗ وَالْغَوْا فِيْهَا لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ - وَاَمَّا الَّذِيْنَ وَرِثُوا الضَّآلِّيْنَ فَمِنْهُمْ قَوْمٌ اَحَبُّوْا شِعَارَ النَّصَارٰى وَسِيَرَتَهُمْ وَاِلَيْهَا يَمِيْلُوْنَ - وَتَجِدُهُمْ يَرْغَبُوْنَ فِيْ حُلَلِهِمْ وَ قُمُصَانِهِمْ وَقَلَانِسِهِمْ وَنِعَالِهِمْ وَطَرْزِ مَعِيْشَتِهِمْ وَجَمِيْعِ خِصَالِهِمْ وَعَلٰى مَنْ خَالَفَهَا يَضْحَكُوْنَ وَيَتَزَوَّجُوْنَ نِسَآءً مِّنْ قَوْمِهِمْ وَعَلَيْهِنَّ يَعْشَقُوْنَ وَمِنْهُمْ قَوْمٌ مَّالُوْا اِلَى الْفَلْسَفَةِ الَّتِيْ اَشَاعُوْهَا وَفِيْ اَمْرِ الدِّيْنِ يَتَسَاهَلُوْنَ - وَكَمْ مِّنْ كَلِمٍ تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ يُحَقِّرُوْنَ دِيْنَ اللّٰهِ وَ

ہیں اور ریا اور دکھلاوے کے کام کرتے ہیں اور اخلاص نہیں رکھتے اور خدا کے مسیح پر اور اس کے گروہ پر حملہ کرتے ہیں اور ان کو حاکموں کی طرف کھینچتے ہیں اور ہر ایک رستے کے سرے پر ان کے ستانے کے لیے بیٹھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان کو مار ڈالو کیونکہ یہ کافر ہیں۔ اور جس وقت ان کو کہیں کہ خدا کی کلام کی طرف آؤ اور اس کو ہمارے اور اپنے درمیان حکم بناؤ تو ان کی آنکھیں غصہ سے لال ہو جاتی ہیں اور گالیاں دیتے گذر جاتے ہیں۔ بہتوں نے خدا کے نشانوں کو آنکھوں سے دیکھا پھر متکبرانہ گذر جاتے ہیں۔ گویا اندھے ہیں۔ خدا کی کتاب کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا ہے اور کہتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو نہ سنو اور ان کے پڑھنے کے وقت شور ڈال دو تا غالب ہو جاؤ لیکن جو ضالین کے وارث ہوئے ان میں سے بعض نصاریٰ کی خُو خصلت اور شعار کو دوست رکھتے ہیں اور اس طرف جھک گئے۔ لباس کوٹ پتلون بوٹ اور طرز زندگی اور ساری عادتوں میں نصاریٰ کی نقل اتارتے ہیں اور ان عادتوں کے مخالفوں پر ہنستے ہیں اور نصاریٰ کی عورتوں کو اپنے نکاح میں لاتے ہیں اور اُن سے عشق بازیاں کرتے ہیں اور ان میں سے (کچھ لوگ) نصاریٰ کے فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے جس کی ان شہروں میں انہوں نے اشاعت کی ہے اور دین کے کاموں میں غفلت کرتے ہیں۔ بہت سی نامناسب باتیں بولتے

لَا یُبَالُوْنَ - وَمِنْهُمْ قَوْمٌ اَكْمَلُوْا اَمْرَ الضَّلَالَةِ وَارْتَدُّوْا مِنَ الْاِسْلَامِ وَعَادُوْهُ مِنَ الْجَهَالَةِ وَ كَتَبُوْا كُتُبًا فِیْ رَدِّهٖ وَ شَتَمُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَصَالُوْا عَلٰی عِرْضِهٖ وَ تِلْكَ اَفْوَاجٌ فِیْ هٰذَا الْمُلْكِ بَعْدَ مَا كَانُوْا یُسْلِمُوْنَ - فَتَمَّ مَا اُشِیْرَ اِلَیْهِ فِی الْفَاتِحَةِ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ - (خطبة الهامية صفحہ ۱۰۷ تا ۱۰۸)

سعید فرقہ جو کہ عذاب سے نجات پانے والا ہے وہ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ہے - اور جو عذاب میں مبتلا ہونے والا ہے وہ مَغْضُوْب عَلَیْهِمْ ہے - مَغْضُوْب عَلَیْهِم اور ضالین میں وہی فرق ہے جو ایک مرض محرقہ اور مدقوق میں ہوتا ہے کہ ایک جلدی ہلاک ہوتا ہے اور ایک آہستہ آہستہ ہلاکت تک پہنچتا ہے - مگر انجام کار دونوں ہلاک ہوتے ہیں - کوئی آگے کوئی پیچھے - (البدر ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

بہترین دعا وہ ہوتی ہے جو جامع ہو تمام خیروں کی اور مانع ہو تمام مضرات کی اس لیے اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی دعا میں آدم سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل منعم علیہم لوگوں کے انعامات کی حصول کی دعاء ہے - اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں ہر قسم کی مضرتوں سے بچنے کی دعا ہے - چونکہ مغضوب سے مراد یہود اور ضالّین سے مراد نصاریٰ بالاتفاق ہے تو اس دعا کی تعلیم کا منشاء صاف ہے کہ یہودیوں نے جیسے بے جا عداوت کی تھی - مسیح موعود کے زمانہ میں مولوی لوگ بھی ویسا ہی کریں گے اور حدیثیں اس کی تائید کرتی ہیں - یہاں تک کہ وہ یہودیوں کے قدم بقدم چلیں گے -

(الحکم ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ سے مانگنے کے واسطے ادب کا ہونا ضروری ہے اور عقلمند جب کوئی شے بادشاہ سے طلب کرتے ہیں تو ہمیشہ آداب کو مدنظر رکھتے ہیں اسی لیے سورہ فاتحہ میں خدا تعالیٰ نے سکھایا ہے کہ کس طرح مانگا جاوے اور اس میں دکھایا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی سب تعریف خدا کو ہی ہے جو رب ہے سارے جہان کا الرحمن یعنی بلا مانگے اور سوال کیے کے دینے والا اور الرحیم یعنی انسان کی سچی محنت پر ثمرات حسنہ مرتب کرنے والا ہے مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ - جزا سزا اُسی کے ہاتھ میں ہے چاہے رکھے چاہے مارے

ہیں اور خدا کے دین کی حقارت کرتے ہیں اور خوف نہیں کرتے اور بعض ان میں سے پکے گمراہ ہو گئے اور جہالت سے اسلام کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں اور اسلام کے ردّ میں کتابیں لکھیں اور خدا کے رسول کو برا کہا اور اس کی عزت پر حملہ کیا اور اس قسم کے لوگ اس ملک میں کثرت سے ہیں اور وہ اس سے پہلے مسلمان تھے پس جس بات کا سورہ فاتحہ میں اشارہ تھا وہ ظاہر ہو گئی اِنَّا لِلّٰہ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن -

اور جزا و سزا آخرۃ کی بھی ہے اور اس دنیا کی بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب اس قدر تعریف انسان کرتا ہے تو اُسے خیال آتا ہے کہ کتنا بڑا خدا ہے جو کہ رب ہے رحمان ہے رحیم ہے اب تک اُسے غائب مانتا چلا آرہا ہے اور پھر اُسے حاضر ناظر جان کر پکارتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یعنی ایسی راہ جو کہ بالکل سیدھی ہے اس میں کسی قسم کی کجی نہیں ہے۔ ایک راہ اندھوں کی ہوتی ہے کہ محنتیں کر کر کے تھک جاتے ہیں اور نتیجہ کچھ نہیں نکلتا اور ایک وہ راہ کہ محنت کرنے سے اُس پر نتیجہ مرتب ہوتا ہے پھر آگے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا اور وہ وہی صِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے جس پر چلنے سے انعام مرتب ہوتے ہیں پھر غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ نہ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرا غضب ہوا اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور نہ ان کی جو دور جا پڑے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے کل دنیا اور دین کے کاموں کی راہ مراد ہے مثلاً ایک طبیب جب کسی کا علاج کرتا ہے تو جب تک اُسے ایک صراط مستقیم ہاتھ نہ آوے علاج نہیں کر سکتا اسی طرح تمام وکیلوں اور ہر پیشہ اور علم کی ایک صراط مستقیم ہے کہ جب وہ ہاتھ آجاتی ہے تو پھر کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ انبیاء کو اس دعا کی کیوں ضرورت تھی وہ تو پیشتر ہی سے صراط مستقیم پر ہوتے ہیں۔ تلمیذ الرحمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ

وہ یہ دعا ترقی مراتب اور درجات کے لیے طلب کرتے ہیں بلکہ یہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تو آخرۃ میں مومن بھی مانگیں گے کیونکہ جیسے اللہ تعالیٰ کی کوئی حد نہیں ہے اسی طرح اس کے پاس درجات اور مراتب کی ترقی کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ (بدر ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۷-۲۸)

سورۃ فاتحہ کی بعض مختصر تفاسیر

اِعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى افْتَتَحَ كِتَابَهٗ بِالْحَمْدِ لَا بِالشُّكْرِ وَلَا بِالثَّنَاءِ۔ لِاَنَّ الْحَمْدَ اَتَمُّ وَاَكْمَلُ مِنْهُمَا وَاَحَاطَهُمَا بِالْاِسْتِيْفَاءِ۔ ثُمَّ ذَالِكَ رَدٌّ عَلٰى عَبَدَةِ الْمَخْلُوْقِيْنَ وَالْاَوْثَانِ۔ فَاِنَّهُمْ يَحْمَدُوْنَ طَوَاغِيْتَهُمْ وَيَنْسِبُوْنَ اِلَيْهَا صِفَاتِ الرَّحْمٰنِ۔ وَفِى الْحَمْدِ اِشَارَةٌ اُخْرٰى۔ وَهِىَ اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ

(ترجمہ از مرتب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو شکر اور ثناء سے نہیں بلکہ حمد سے شروع کیا ہے کیونکہ حمد کا لفظ ان دونوں سے زیادہ مکمل اور جامع ہے اور ان دونوں پر پورے طور پر محیط ہے۔ پھر لفظ الحمد مخلوق کے پرستاروں اور بتوں کے پوجاریوں کی تردید ہے۔ کیونکہ وہ اپنے باطل معبودوں کی حمد کرتے ہیں۔ اور خدائے رحمان کی صفات ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ الحمد میں ایک اور اشارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ اے

وَتَعَالٰى يَقُوْلُ اَيُّهَا الْعِبَادُ اعْرِفُوْنِيْ بِصِفَاتِيْ وَاٰمِنُوْا بِيْ بِكَمَالَاتِيْ وَانْظُرُوْا اِلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرَضِيْنَ هَلْ تَجِدُوْنَ كَمِثْلِيْ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَاَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ وَمَالِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ وَمَعَ ذَالِكَ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ اِلٰهَكُمْ اِلٰهٌ جَمَعَ جَمِيْعَ اَنْوَاعِ الْحَمْدِ فِيْ ذَاتِهٖ وَتَفَرَّدَ فِيْ سَآئِرِ مَحَاسِنِهٖ وَصِفَاتِهٖ۔ وَاِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّهٗ تَعَالٰى مُنَزَّهٌ شَانُهٗ عَنْ كُلِّ نَقْصٍ وَّحُوْلِ حَالَةٍ وَّلُحُوْقِ وَصْمَةٍ كَالْمَخْلُوْقِيْنَ۔ بَلْ هُوَ الْكَامِلُ الْمَحْمُوْدُ وَلَا تُحِيْطُهُ الْحُدُوْدُ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْاَزَلِ اِلٰى اَبَدِ الْاٰبِدِيْنَ۔ وَلِذَالِكَ سَمَّى اللّٰهُ نَبِيَّهٗ اَحْمَدَ وَكَذَالِكَ سَمّٰى بِهِ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ لِيُشِيْرَ اِلٰى مَا تَعَمَّدَ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَمْدَ عَلٰى رَاْسِ الْفَاتِحَةِ ثُمَّ اَشَارَ اِلَى الْحَمْدِ فِيْ اٰخِرِ هٰذِهِ السُّوْرَةِ فَاِنَّ اٰخِرَهَا لَفْظُ الضَّآلِّيْنَ وَهُمُ النَّصَارَى الَّذِيْنَ اَعْرَضُوْا عَنْ حَمْدِ اللّٰهِ وَاَعْطَوْا حَقَّهٗ لِاَحَدٍ مِّنَ الْمَخْلُوْقِيْنَ۔ فَاِنَّ حَقِيْقَةَ الضَّلَالَةِ هِيَ تَرْكُ الْمَحْمُوْدِ الَّذِيْ يَسْتَحِقُّ الْحَمْدَ وَالثَّنَآءَ كَمَا فَعَلَ النَّصَارٰى وَنَحَتُوْا مِنْ عِنْدِهِمْ مَحْمُوْدًا اٰخَرَ

میرے بندو مجھے میری صفات کے ذریعہ پہچانو۔ اور میرے کمالات کی بناء پر مجھ پر ایمان لاؤ۔ اور آسمانوں اور زمینوں پر غور کرو۔ کیا تم میرے جیسا کسی اور کو رب العالمین اور ارحم الراحمین اور مالک یوم الدین پاتے ہو۔ مزید براں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تمہارا معبود ایسا معبود ہے جس کی ذات ہر قسم کی حمد کی جامع ہے۔ اور اپنی تمام خوبیوں اور صفتوں میں منفرد اور یگانہ ہے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہر نقص ہر تغیر اور ہر عیب کے لاحق ہونے سے پاک ہے جو مخلوق میں پایا جاتا ہے بلکہ وہ اپنی ذات میں قابل تعریف ہے۔ اور وہ حد بندی سے بالا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بعثت اور پچھلی بعثت میں بلکہ ازل سے ابدالاباد تک سب تعریف اسی کے لیے ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کا نام احمد رکھا اور اسی طرح مسیح موعود کا بھی یہی نام رکھا۔ تا اس نے جو قصد کیا تھا اس کی طرف اشارہ فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ کے ابتداء میں الحمد لکھا ہے پھر اس سورت کے آخر میں بھی الحمد کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اس کے آخر میں الضالّین کا لفظ ہے اور وہ نصاریٰ ہیں جنھوں نے خدا تعالیٰ کی حمد کرنے سے منہ موڑ لیا۔ اور اس کا حق مخلوق کے ایک فرد کو دے دیا۔ کیونکہ گمراہی کی حقیقت یہ ہے کہ اس قابل تعریف ہستی کو جو حمد و ثنا کی مستحق ہے چھوڑ دیا جائے۔ جیسا کہ نصاریٰ نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے پاس سے ایک اور قابل تعریف معبود بنا لیا۔ اور انہوں نے اس کی تعریف

وَبَالَغُوْا فِي الْإِطْرَآءِ وَاتَّبَعُوا الْأَهْوَآءَ ۔ وَبَعُدُوْا مِنْ عَيْنِ الْحَيَاةِ وَهَلَكُوْا كَمَا يَهْلِكُ الضَّآلُّ فِي الْمَوْمَاةِ ۔ وَإِنَّ الْيَهُوْدَ هَلَكُوْا فِيْ أَوَّلِ أَمْرِهِمْ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ الْقَهَّارِ ۔ وَالنَّصَارٰى سَلَكُوْا قَلِيْلًا ثُمَّ ضَلُّوْا وَ فَقَدُوا الْمَآءَ فَمَاتُوْا فِيْ فَلَاةٍ مِّنَ الْاِضْطِرَارِ ۔ فَحَاصِلُ هٰذَا الْبَيَانِ أَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ أَحْمَدَيْنِ فِيْ صَدْرِ الْإِسْلَامِ وَ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ ۔ وَأَشَارَ إِلَيْهِمَا بِتَكْرَارِ لَفْظِ الْحَمْدِ فِيْ أَوَّلِ الْفَاتِحَةِ وَفِيْ اٰخِرِهَا لِأَهْلِ الْعِرْفَانِ ۔ وَفَعَلَ كَذَالِكَ لِيَرُدَّ عَلَى النَّصْرَانِيِّيْنَ ۔ وَأَنْزَلَ أَحْمَدَيْنِ مِنَ السَّمَآءِ لِيَكُوْنَا كَالْجِدَارَيْنِ لِحِمَايَةِ الْأَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ؞

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۹۱ تا ۱۹۴)

ہم اس حیّ وقیّوم کو محض اپنی تدبیروں سے ہرگز پا نہیں سکتے بلکہ اس راہ میں صراط مستقیم صرف یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی زندگی معہ اپنی تمام قوتوں کے خدائے تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے پھر خدا کے وصال کے لیے دعا میں لگے رہیں تا خدا کو خدا ہی کے ذریعہ سے پاویں۔ اور سب سے زیادہ پیاری دعا جو عین محل اور موقعہ سوال کا ہمیں سکھاتی ہے اور فطرت کے روحانی جوش کا نقشہ ہمارے سامنے رکھتی ہے وہ دعا ہے جو خدائے کریم نے اپنی پاک کتاب قرآن شریف میں یعنی سورۂ فاتحہ میں ہمیں سکھائی ہے اور وہ یہ ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تمام پاک تعریفیں جو ہو سکتی ہیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وہی خدا جو ہمارے اعمال سے پہلے ہمارے لیے رحمت کا سامان

میں بڑا مبالغہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور زندگی کے چشمہ سے دور نکل گئے۔ اور اس طرح ہلاک ہوگئے جس طرح ایک راہ گم کردہ شخص بیابان میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور یہود تو اپنی ابتدا میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ اور خدائے قہار کے غضب کے مورد بن گئے تھے۔ نصاریٰ چند قدم چلے پھر گمراہ ہو گئے اور روحانی پانی کھو دیا۔ اور آخر کار لاچار ہو کر بیابانوں میں ہی مر گئے پس خلاصہ بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو احمد پیدا کیے (ایک) اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اور (ایک) آخری زمانہ میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل عرفان کے لیے سورۃ فاتحہ کے شروع میں اور اس کے آخر میں الحمد کا لفظاً ومعناً تکرار کر کے ان دونو (احمدوں) کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور خدا نے ایسا عیسائیوں کی تردید کے لیے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو احمد آسمان سے اتارے تا وہ دونوں پہلوں اور پچھلوں کی حمایت کے لیے دو دیواروں کی طرح ہو جائیں۔

میسر کرنے والا ہے اور ہمارے اعمال کے بعد رحمت کے ساتھ جزا دینے والا ہے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ وہ خدا جو جزا کے دن کا وہی ایک مالک ہے کسی اور کو وہ دن نہیں سونپا گیا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اے وہ جو ان تعریفوں کا جامع ہے ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور ہم ہر ایک کام میں توفیق تجھ ہی سے چاہتے ہیں اس جگہ ہم کے لفظ سے پرستش کا اقرار کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے تمام قوٰی تیری پرستش میں لگے ہوئے ہیں اور تیرے آستانہ پر جھکے ہوئے ہیں کیونکہ انسان باعتبار اپنے اندرونی قوٰی کے ایک جماعت اور ایک امت ہے اور اس طرح پر تمام قوٰی کا خدا کو سجدہ کرنا یہی وہ حالت ہے جس کو اسلام کہتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہمیں سیدھی راہ دکھلا اور اس پر ثابت قدم کر کے ان لوگوں کی راہ دکھلا جن پر تیرا انعام و اکرام ہے اور تیرے مورد فضل و کرم ہو گئے ہیں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور ہمیں ان لوگوں کی راہوں سے بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو تجھ تک نہیں پہنچ سکے اور راہ کو بھول گئے اٰمِيْن اے خدا ایسا ہی کر۔

یہ آیات سمجھا رہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کے انعامات جو دوسرے لفظوں میں فیوض کہلاتے ہیں انہیں پر نازل ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کی خدا کی راہ میں قربانی دیکر اور اپنا تمام وجود اس کی راہ میں وقف کر کے اور اس کی رضا میں محو ہو کر پھر اس وجہ سے دعا میں لگے رہتے ہیں کہ تا جو کچھ انسان کو روحانی نعمتوں اور خدا کے قرب اور وصال اور اس کے مکالمات اور مخاطبات میں سے مل سکتا ہے وہ سب اُن کو ملے اور اس دعا کے ساتھ اپنے تمام قوٰی سے عبادت بجا لاتے ہیں اور گناہ سے پرہیز کرتے اور آستانہ الٰہی پر پڑے رہتے ہیں اور جہاں تک ان کے لیے ممکن ہے اپنے تئیں بدی سے بچاتے ہیں اور غضب الٰہی کی راہوں سے دور رہتے ہیں سو چونکہ وہ ایک اعلیٰ ہمت اور صدق کے ساتھ خدا کو ڈھونڈتے ہیں اس لیے اس کو پا لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی پاک معرفت کے پیالوں سے سیراب کیے جاتے ہیں اس آیت میں جو استقامت کا ذکر فرمایا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچا اور کامل فیض جو روحانی عالم تک پہنچاتا ہے کامل استقامت سے وابستہ ہے اور کامل استقامت سے مراد ایک ایسی حالت صدق و وفا ہے جس کو کوئی امتحان ضرر نہ پہنچا سکے یعنی ایسا پیوند ہو جس کو نہ تلوار کاٹ سکے نہ آگ جلا سکے اور نہ کوئی دوسری آفت نقصان پہنچا سکے عزیزوں کی موتیں اُس سے علیحدہ نہ کر سکیں پیاروں کی جدائی اُس میں خلل انداز نہ ہو سکے بے آبرُوئی کا خوف کچھ رعب نہ ڈال سکے ہولناک دکھوں سے مارا جانا ایک ذرہ دل کو نہ ڈرا سکے سو یہ دروازہ نہایت تنگ ہے اور یہ راہ نہایت دشوار گذار ہے کس قدر مشکل ہے آہ صد آہ۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۲۹ و ۱۳۰)

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کو مستحکم اور مضبوط کرنے کی تین صورتیں ہیں اور خدا تعالیٰ نے وہ تینوں ہی سورۃ فاتحہ میں بیان کر دی ہیں۔ اول۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حسن کو دکھایا ہے جبکہ جمیع محامد کے ساتھ اپنے آپ کو متصف کیا ہے یہ قاعدہ کی بات ہے کہ خوبی بجائے خود دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے خوبی میں ایک مقناطیسی جذب ہے جو دلوں کو کھینچتی ہے۔ جیسے موتی کی آب۔ گھوڑے کی خوبصورتی۔ لباس کی چمک دمک غرض یہ حسن پھولوں۔ پتوں۔ پتھروں۔ حیوانات۔ نباتات۔ جمادات کسی چیز میں ہو۔ اس کا خاصہ ہے کہ بے اختیار دل کو کھینچتا ہے پس خدا تعالیٰ نے پہلا مرحلہ اپنی خدائی منوانے کا حسن کا رکھا ہے جب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرمایا کہ جمیع اقسام حمد و ستائش اسی کے لیے سزاوار ہیں۔ پھر دوسرا درجہ احسان کا ہوتا ہے انسان جیسے حسن پر مائل ہوتا ہے ویسے ہی احسان پر بھی مائل ہوتا ہے اس لیے پھر اللہ تعالیٰ نے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ۔ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ صفات کو بیان کر کے اپنے احسان کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن اگر انسان کا مادہ ایسا ہی خراب ہو اور وہ حسن اور احسان سے بھی سمجھ نہ سکے تو پھر تیسرا ذریعہ سورۃ فاتحہ میں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ کہہ کر متنبہ کیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ تو حسن سے فائدہ اٹھاتے اور جو ان سے کم درجہ پر ہوں وہ احسان سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں لیکن جو ایسے ہی پلید طبع ہوں ان کو اپنے جلال اور غضب سے متوجہ کیا ہے یہودیوں کو مغضوب کہا ہے۔ اور ان پر طاعون ہی پڑی تھی۔ خدا تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں یہودیوں کی راہ اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ یا یوں کہو کہ طاعون کے عذاب شدید سے ڈرایا ہے۔ شیطان بے باک انسان پر ایسا سوار ہے کہ وہ سن لیتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک جذبات اور شہوات پر ایک موت وارد ہو کر انہیں بالکل سرد نہ کر دے خدا تعالیٰ پر ایمان لانا مشکل ہے۔

(الحکم ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵-۶)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ الیٰ آخر السورہ۔ یہ ساری باتیں چاہتی ہیں کہ کوئی ربّ ہے اور کوئی چیز مخلوق بھی ہے پس ہم کو اپنی خدائی کا ثبوت دیں۔ خدا نے انسان کو مخلوق پیدا کیا ہے اور دنیا میں بھی مخلوق بنایا ہے۔ پھر ہم چاند سورج وغیرہ کو کس طرح خدا مان لیں۔

(الحکم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

بت پرستی اور عناصر پرستی کا مذہب اس ملک (ہندوستان) میں اس قدر قدیم ہے کہ محققانہ طور پر اس کا کوئی ابتدا ٹھہرانا مشکل ہے بجز اس کے کہ اس مذہب کو وید کے ساتھ ساتھ تسلیم کیا جائے مگر پھر بھی...... مجھے بعض قرآنی آیتوں پر نظر ڈال کر خیال آتا ہے کہ شاید اصل تعلیم وید کی عناصر پرستی سے پاک ہو اور عناصر کی مہما اور استت سے کچھ اور مطلب ہو۔ مگر...... یہ میرا خیال اس وقت یقین کے مرتبہ تک پہنچے گا جب کہ وید کی پچاس یا ساٹھ

یا ستر شرتیوں سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ ان تمام عناصر اور اجرام فلکی کی پوجا سے جن کی ہما اور اُستت رگ وید میں موجود ہے صاف اور صریح لفظوں کے ساتھ منع کرتا ہے۔

وید کی شرتیوں کی وہ تاویل جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں قرآن شریف کی چند آیتوں پر غور کرنے سے میرے دل میں گذرتی ہے پہلی آیت یہ کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف کی سورۃ فاتحہ میں فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی ہر ایک حمد اور ثنا اس خدا کے لیے مسلم ہے جس کی تربیت ہر ایک عالم میں یعنی ہر ایک رنگ میں ہر ایک پیرایہ میں اور ہر ایک فائدہ بخش صنعت الٰہی کے ذریعہ سے مشہود اور محسوس ہو رہی ہے یعنی جن جن متفرق وسیلوں پر اس دنیا کے لوگوں کی بقا اور عافیت اور تکمیل موقوف ہے دراصل ان کے پردہ میں ایک ہی پوشیدہ طاقت کام کر رہی ہے جس کا نام اللہ ہے چنانچہ اس دنیا کے کاروبار کی تکمیل کے لیے ایک قسم کی تربیت سورج کر رہا ہے جو ایک حد تک انسان کے بدن کو گرمی پہنچا کر دوران خون کا سلسلہ جاری رکھتا ہے جس سے انسان مرنے سے بچتا ہے اور اس کی آنکھوں کے نور کی مدد کرتا ہے پس حقیقی سورج جو حقیقی گرمی پہنچانے والا اور حقیقی روشنی عطا کرنے والا ہے وہ خدا ہے کیونکہ اسی کی طاقت کے سہارے سے یہ سورج بھی کام کر رہا ہے اور اُس حقیقی سورج کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ دوران خون کے سلسلہ کو جاری رکھتا ہے جس پر جسمانی زندگی موقوف ہے اس طرح پر کہ اس فعل کا آلہ انسان کے دل کو ٹھہراتا ہے اور آسمانی روشنی سے آنکھوں کے نور کی مدد کرتا ہے بلکہ وہ روحانی زندگی کو نوع انسان کے تمام اعضاء تک پہنچانے کے لیے منجملہ انسانوں کے ایک انسان کو اختیار کر لیتا ہے اور انسانی سلسلہ کے مجموعہ کے لیے جو ایک جسم کا حکم رکھتا ہے اس کو بطور دل کے قرار دیدیتا ہے اور اس کو روحانی زندگی کا خون نوع انسان کے تمام اعضاء تک پہنچانے کے لیے ایک آلہ مقرر کر دیتا ہے پس وہ طبعاً اس خدمت میں لگا رہتا ہے کہ ایک طرف سے لیتا اور پھر تمام مناسب اطراف میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور جیسا کہ غیر حقیقی اور جسمانی سورج آنکھوں کو کامل روشنی پہنچاتا اور تمام نیک بد چیزیں ان پر کھول دیتا ہے۔ ایسا ہی یہ حقیقی سورج دل کی آنکھ کو معرفت کے بلند مینار تک پہنچا کر دن چڑھا دیتا ہے اور جیسا کہ وہ جسمانی سورج حقیقی سورج کے سہارے سے پھلوں کو پکاتا ہے اور ان میں شیرینی اور حلاوت ڈالتا ہے اور عفونتوں کو دور کرتا اور بہار کے موسم میں تمام درختوں کو ایک سبز چادر پہناتا اور خوشگوار پھلوں کی دولت سے اُن کے دامن کو پُر کرتا اور پھر خریف میں اس کے برخلاف اثر ظاہر کرتا ہے اور تمام درختوں کے پتے گرادیتا اور بدشکل بنا دیتا اور پھلوں سے محروم کرتا اور بالکل انہیں ننگے کر دیتا ہے بجز اُن ہمیشہ بہار درختوں کے جن پر وہ ایسا اثر نہیں ڈالتا یہی کام اُس حقیقی آفتاب کے ہیں جو سرچشمہ تمام روشنیوں اور فیضوں کا ہے وہ اپنی مختلف تجلیات سے مختلف طور کے اثر دکھاتا ہے ایک قسم کی تجلی سے وہ بہار پیدا

کر دیتا ہے اور پھر دوسری قسم کی تجلی سے وہ خزاں لاتا ہے اور ایک تجلی سے وہ عارفوں کے لیے معرفت کی حلاوتیں پیدا کرتا ہے اور پھر ایک تجلی سے کفر اور فسق کا عفونت ناک مادہ دنیا سے دور اور دفع کر دیتا ہے۔ پس اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ تمام کام جو یہ جسمانی آفتاب کر رہا ہے وہ سب کام اُسی حقیقی آفتاب کے ظل ہیں اور یہ نہیں کہ وہ صرف روحانی کام کرتا ہے بلکہ جس قدر اس جسمانی سورج کے کام ہیں وہ اس کے اپنے کام نہیں ہیں بلکہ درحقیقت اسی معبود حقیقی کی پوشیدہ طاقت اس کے اندر وہ تمام کام کر رہی ہے جیسا کہ اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن شریف میں ایک ملکہ کا قصہ لکھا ہے جو آفتاب پرست تھی اور اس کا نام بلقیس تھا اور وہ اپنے ملک کی بادشاہ تھی اور ایسا ہوا کہ اُس وقت کے نبی نے اُس کو دھمکی دے بھیجی کہ تجھے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیئے ورنہ ہمارا لشکر تیرے پر چڑھائی کریگا اور پھر تیری خیر نہیں ہوگی پس وہ ڈر گئی اور اُس نبی کے پاس حاضر ہونے کے لیے اپنے شہر سے روانہ ہوئی اور قبل اس کے کہ وہ حاضر ہو اس کو متنبہ کرنے کے لیے ایک ایسا محل طیار کیا گیا جس پر نہایت مصفا شیشہ کا فرش تھا اور اس فرش کے نیچے نہر کی طرح ایک وسیع خندق طیار کی گئی تھی جس میں پانی بہتا تھا اور پانی میں مچھلیاں چلتی تھیں جب وہ ملکہ اس جگہ پہنچی تو اُس کو حکم دیا گیا کہ محل کے اندر آجا تب اُس نے نزدیک جا کر دیکھا کہ پانی زور سے بہ رہا ہے اور اس میں مچھلیاں ہیں اس نظارہ سے اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اُٹھا لیا کہ ایسا نہ ہو کہ پانی میں تر ہو جائے۔ تب اُس نبی نے اُس ملکہ کو جس کا نام بلقیس تھا آواز دی کہ اے بلقیس تو کس غلطی میں گرفتار ہو گئی یہ تو پانی نہیں ہے جس سے ڈر کر تو نے پاجامہ اوپر اُٹھا لیا یہ تو شیشہ کا فرش ہے اور پانی اس کے نیچے ہے۔ اس مقام میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ[1]۔ یعنی اس نبی نے کہا کہ اے بلقیس تو کیوں دھوکا کھاتی ہے یہ تو شیش محل کے شیشے ہیں جو اوپر کی سطح پر بطور فرش کے لگائے گئے ہیں اور پانی جو زور سے بہ رہا ہے وہ تو ان شیشوں کے نیچے ہے نہ کہ یہ خود پانی ہیں تب وہ سمجھ گئی کہ میری مذہبی غلطی پر مجھے ہوشیار کیا گیا ہے اور میں نے فی الحقیقت جہالت کی راہ اختیار کر رکھی تھی جو سورج کی پوجا کرتی تھی۔

تب وہ خدائے واحد لاشریک پر ایمان لائی اور اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے یقین کر لیا کہ وہ طاقت عظمیٰ جس کی پرستش کرنی چاہیئے وہ تو اور ہے اور میں دھوکہ میں رہی اور سطحی چیز کو معبود ٹھہرایا۔ اور اُس نبی کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ دنیا ایک شیش محل ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور عناصر وغیرہ جو کچھ کام کر رہے ہیں یہ دراصل ان کے کام نہیں یہ تو بطور شیشوں کے ہیں بلکہ ان کے نیچے ایک طاقت مخفی ہے جو خدا ہے یہ سب اس کے کام ہیں اس نظارہ کو دیکھ کر بلقیس نے سچے دل سے سورج کی پوجا سے توبہ کی اور سمجھ لیا کہ وہ طاقت ہی اَور ہے کہ سورج وغیرہ سے کام کراتی ہے اور یہ تو صرف شیشے ہیں۔

---

[1] النمل۔ع ۳۔

یہ تو ہم نے سورج کا حال بیان کیا ایسا ہی چاند کا حال ہے جن صفات کو چاند کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل خدا تعالیٰ کے صفات ہیں وہ راتیں جو خوفناک تاریکی پیدا کرتی ہیں چاند اُن کو روشن کرنے والا ہے جب وہ چمکتا ہے تو فی الفور اندھیری رات کی تاریکی اُٹھ جاتی ہے کبھی وہ پہلے وقت سے ہی چمکنا شروع کرتا ہے اور کبھی کچھ تاریکی کے بعد نکلتا ہے یہ عجیب نظارہ ہوتا ہے کہ ایک طرف چاند چڑھا اور ایک طرف تاریکی کا نام و نشان نہ رہا اسی طرح خدا بھی نہایت گندہ اور تاریک آدمیوں پر جو اس کی طرف جھکتے ہیں چمکتا ہے تو ان کو ایسی طرح روشن کر دیتا ہے جیسا کہ چاند رات کو روشن کرتا ہے۔ اور کوئی انسان اپنی عمر کے پہلے زمانہ میں ہی اس چاند کی روشنی سے حصہ لیتا ہے اور کوئی نصف عمر میں اور کوئی آخری حصہ میں اور بعض بدبخت سلخ کی راتوں کی طرح ہوتے ہیں یعنی تمام عمر ان پر اندھیرا ہی چھائے رہتا ہے اُس حقیقی چاند سے حصہ لینا ان کے نصیب نہیں ہوتا۔ غرض کہ یہ سلسلہ چاند کی روشنی کا اس حقیقی چاند کی روشنی سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ ایسا ہی چاند پھلوں کو موٹا کرتا اور اُن میں طراوت ڈالتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو عبادت کرکے اپنے درخت وجود میں پھل تیار کرتے ہیں چاند کی طرح خدا کی رحمت ان کے شامل حال ہو جاتی ہے اور اس پھل کو موٹا اور تازہ بتازہ کر دیتی ہے اور یہی معنے رحیم کے لفظ میں مخفی ہیں جو سورۃ فاتحہ میں خدا کی دوسری صفت بیان کی گئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جسمانی طور پر چار قسم کی ربوبیت ایسی ہو رہی ہے جس سے نظام عالم وابستہ ہے ایک آسمانی ربوبیت یعنی اکاش سے ہے جو جسمانی تربیت کا سرچشمہ ہے جس سے پانی برستا ہے اگر وہ پانی کچھ مدت نہ برسے تو جیسا کہ علم طبعی میں ثابت کیا گیا ہے کوؤں کے پانی بھی خشک ہو جائیں یہ آسمانی ربوبیت یعنی اکاش کا پانی بھی دنیا کو زندہ کرتا ہے اور نابود کو بود کی حالت میں لاتا ہے اس طور پر آسمان ایک پہلا رب النوع ہے جس سے پانی برستا ہے جس کو وید میں اِندر کے نام سے یاد کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ[1] اس جگہ آسمان سے مراد وہ کرہ زمہریر ہے جس سے پانی برستا ہے اور اس آیت میں اس کرہ زمہریر کی قسم کھائی گئی ہے جو مینہ برساتا ہے اور رجع کے معنے مینہ ہے اور خلاصہ معنی آیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں وحی کا ثبوت دینے کے لیے آسمان کو گواہ لاتا ہوں جس سے پانی برستا ہے یعنی تمہاری روحانی حالت بھی ایک پانی کی محتاج ہے اور وہ آسمان سے ہی آتا ہے جیسا کہ تمہارا جسمانی پانی آسمان سے آتا ہے اگر وہ پانی نہ ہو تو تمہاری عقلوں کے پانی بھی خشک ہو جائیں۔ عقل بھی اُسی آسمانی پانی یعنی وحی الٰہی سے تازگی اور روشنی پاتی ہے۔ غرض جس خدمت میں آسمان لگا ہوا ہے یعنی پانی برسانے کی خدمت یہ کام آسمان کا خدا تعالیٰ کی پہلی صفت کا ایک ظلّ ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے کہ ابتدا ہر ایک چیز کا پانی سے ہے انسان بھی پانی سے ہی پیدا ہوتا ہے اور وید کی رو سے پانی کا دیوتا اکاش ہے جس کو وید کی اصطلاح میں اندر کہتے ہیں مگر یہ سمجھنا غلطی ہے کہ یہ اندر کچھ چیز ہے بلکہ وہی پوشیدہ اور نہاں در نہاں طاقت عظمیٰ جس کا

---

[1] سورۃ الطارق۔

نام خدا ہے اس میں کام کر رہی ہے اسی کو بیان کرنے کے لیے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یعنی سورۃ فاتحہ میں یوں فرمایا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی مت خیال کرو کہ بجز خدا کے کوئی اور بھی ربّ ہے جو اپنی ربوبیت سے دنیا کی پرورش کر رہا ہے بلکہ وہی ایک خدا ہے جو تمہارا ربّ ہے اُسی کی طاقت ہر ایک جگہ کام کرتی ہے اس جگہ اس ترتیب کے لحاظ سے جو اس سورت میں ہے اندر دیوتا کا ردّ ملحوظ ہے کیونکہ پہلی تربیت اسی سے شروع ہوتی ہے اِسی کو دوسرے لفظوں میں آسمان یا اکاش کہتے ہیں۔ اِسی وجہ سے دُنیا کے لوگ تمام قضاء و قدر کو آسمان کی طرف منسوب کیا کرتے ہیں۔ اور بت پرستوں کے نزدیک بڑا ربّ النوع وہی ہے جو اندر کہلاتا ہے پس اس جگہ اسی کا ردّ منظور ہے اور یہ جتلانا مقصود ہے کہ حقیقی اِندر وہی اکیلا خدا ہے اُسی کی طاقت ہے جو پانی برساتی ہے آسمان کو رب العالمین کہنا حماقت ہے بلکہ رب العالمین وہی ہے جس کا نام اللہ ہے۔

غرض خدا تعالیٰ کی یہ پہلی ربوبیّت ہے جس کو نادانوں نے اکاش یعنی اندر کی طرف منسوب کیا ہے بات یہی ہے کہ اندھوں کو اکاش سے پانی برستا نظر آتا ہے مگر برسانے والی ذات ایک اور طاقت ہے اور اِس طور پر برسانا یہ جلوہ دکھلاتا ہے کہ یہ بھی اس کی ایک صفت ہے پس آسمان کی یہ ظاہری ربوبیت اس کی حقیقی ربوبیت کا ایک ظل ہے اور جو سامان رعد اور صاعقہ وغیرہ کا بادل میں ہوتا ہے دراصل یہ سب اس کی صفات کے رنگوں میں سے ایک رنگ ہے۔ پھر دوسری ربوبیت خدا تعالیٰ کی جو زمین پر کام کر رہی ہے رحمانیت ہے۔ اس لفظ رحمان سے بت پرستوں کے مقابل پر سورج دیوتا کا ردّ ملحوظ ہے کیونکہ بموجب بت پرستوں کے خیال کے جیسا کہ اکاش یعنی آسمان پانی کے ذریعہ سے چیزوں کو پیدا کرتا ہے ایسا ہی سورج بہار کے ایام میں تمام درختوں کو لباس پہناتا ہے گویا یہ اس کی وہ رحمت ہے جو کسی عمل پر مترتب نہیں۔ پس سورج جسمانی طور پر رحمانیت کا مظہر ہے کیونکہ وہ موسم بہار میں ننگے درختوں کو پتوں کی چادر پہناتا ہے اور اس وقت تک درختوں نے اپنے طور پر کوئی عمل نہیں کیا ہوتا یعنی کچھ بنایا نہیں ہوتا تا بنائے ہوئے پر کچھ زیادہ کیا جائے بلکہ وہ خزاں کی غارت گری کے باعث سے محض ننگے اور برہنہ کھڑے ہوتے ہیں پھر سورج کے پرتوہ عاطفت سے ہر ایک درخت اپنے تئیں آراستہ کرنا شروع کر دیتا ہے آخر سورج کی مدد سے درختوں کا عمل اس حد تک پہنچتا ہے کہ وہ پھل بنا لیتے ہیں پس جبکہ وہ پھل بنا کر اپنے عمل کو پورا کر چکتے ہیں تب چاند اُن پر اپنی رحیمیت کا سایہ ڈالتا ہے۔ اور رحیم اس کو کہتے ہیں کہ عمل کرنے والے کو اُس کے تکمیل عمل کے لیے مدد دے تا اُس کا عمل ناتمام نہ رہ جاوے پس چاند درختوں کے پھلوں کو یہ مدد دیتا ہے کہ اُن کو موٹے کر دیتا ہے اور اُن میں اپنی تاثیر سے رطوبت ڈالتا ہے چنانچہ علم طبعی میں یہ مُسلّم مسئلہ ہے کہ چاند کی روشنی میں باغبان لوگ اناروں کے پھٹنے کی آواز سنا کرتے ہیں غرض استعارہ کے طور پر قمر جو نیرّ دوم ہے رحیم کے نام سے موسوم ہوا کیونکہ بڑا فصل

اس کا یہی ہے جو موجود شدہ پھلوں کی مدد کرتا ہے اور موٹا اور تازہ کر دیتا ہے پھر جب وہ پھل طیار ہو جاتے اور اپنے کمال کو پہنچ جاتے ہیں تو زمین اُن کو اپنی مالکانہ حیثیت سے اپنی طرف گراتی ہے تا وہ اپنی جزا سزا کو پہنچیں پس اگر وہ عُمدہ اور نفیس پھل ہیں تو زمین پر ان کی بڑی عزت ہوتی ہے اور وہ قابل قدر جگہوں میں رکھے جاتے ہیں اور اگر وہ ردّی ہیں تو خراب جگہوں میں پھینک دئے جاتے ہیں اور یہ سزا جزا گویا زمین کے ہاتھ میں ہوتی ہے کہ جو خدا نے اس کی فطرت کو دے رکھی ہے کہ اچھے پھل کا قدر کرتی ہے اور بُرے پھل کو ذلیل جگہ رکھتی ہے۔

غرض وید میں بطور استعارہ کے یہ چار نام ہیں جو چار بڑے بڑے دیوتاؤں کو عطا ہوئے ہیں اول اکاش یعنی آسمان جس کو اندر دیوتا بولتے ہیں وہ پانی کا داتا ہے اور قرآن شریف میں ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ[1] یعنی ہر ایک چیز پانی سے ہی زندہ ہے اِس لیے یہ مجازی دیوتا یعنی اندر جس کو اکاش کہنا چاہیئے سب مجازی دیوتاؤں سے بڑا ہے جس کی بغلوں میں سورج اور چاند پرورش پاتے ہیں یہ بہ نسبت اَوروں کے ربوبیت عامہ کا دیوتا ہے بعد اس کے سورج دیوتا ہے جو رحمانیت کا مظہر ہے اس کی ربوبیت چاند سے زیادہ اور اکاش یعنی اندر دیوتا سے کم ہے وہ کام جو اس کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بغیر موجودگی عمل کے درختوں پر اپنی عنایت اور کرپا ظاہر کرتا ہے کیونکہ درخت ننگ دھڑنگ کھڑے ہوتے ہیں اور خزاں کے مارے ہوئے ایسے ہوتے ہیں کہ گویا مُردے ہیں جو زمین میں گاڑے گئے ہیں اور تہیدست فقیروں کی طرح ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں پس سورج دیوتا بہار کے موسم میں موج میں آکر ان کو لباس بخشتا ہے اور ان کا دامن پھلوں اور پھولوں سے بھر دیتا ہے اور چند روز میں اُن کے سر پر پھولوں کے سہرے باندھتا ہے اور سبز پتوں کی ریشمی قبا ان کو پہناتا ہے اور پھلوں کی دولت سے اُن کو مالا مال کر دیتا ہے اور اس طرح پر ایک شاندار نوشہ اُن کو بنا دیتا ہے پس اس کی رحمانیت میں کیا شک رہا جو بغیر کسی سابق عمل کے ننگے درویشوں پر اس قدر کرپا اور مہربانی کرتا ہے۔ اس قسم کے استعارات وید میں بہت موجود ہیں کہ اول شاعرانہ طور پر معلوم ہوتے ہیں اور پھر ذرہ غور کریں تو کوئی علمی چمک بھی ان میں دکھائی دیتی ہے۔

پھر سورج کے بعد وید کی رو سے چاند دیوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے عملوں کو دیکھ کر اپنی مدد سے اُن کے اعمال انجام تک پہنچاتا ہے یعنی بہار کے موسم میں درخت پھل تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن اگر چاند نہ ہوتا تو یہ عمل ان کا ناقص رہ جاتا اور پھلوں میں تازگی اور فربہی اور طراوت ہرگز نہ آتی۔ پس چاند ان کے عمل کا متمم ہے اس لیے اس لائق ہوا کہ مجازی طور پر اس کو رحیم کہا جائے سو وید اُس کو رحیم قرار دیتا ہے سو استعارہ کے طور پر کچھ حرج نہیں۔

---

[1] الانبیاء ع ۳

پھر چاند کے بعد دھرتی دیوتا ہے جس نے مسافروں کو جگہ دینے کے لیے اپنی پشت کو بہت وسیع کر رکھا ہے ہر ایک پھل درخت پر مسافر کی طرح ہوتا ہے آخر کار مستقل سکونت اُس کی زمین پر ہوتی ہے اور زمین اپنے مالکانہ اختیارات سے جہاں چاہے اُس کو اپنی پشت پر جگہ دیتی ہے اور جیسا کہ خدا نے قرآن شریف میں فرمایا وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[1] کہ ہم نے انسانوں کو زمین پر اور دریاؤں پر خود اٹھایا ایسا ہی زمین بھی ہر ایک چیز کو اُٹھاتی ہے اور ہر ایک خاکی چیز کی سکونت مستقل زمین میں ہے وہ جس کو چاہے عزت کے مقام پر بٹھا دے اور جس کو چاہے ذلت کے مقام میں پھینک دے۔ پس اس طرح پر زمین کا نام مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہوا یعنی استعارہ کے طور پر صحیفہ فطرت کے آئینہ میں یہ چاروں الٰہی صفات نظر آتی ہیں۔ غرض اسی طرح خدا نے چاہا کہ اپنی صفات کو مجازی مظاہر میں بھی ظاہر کرے تا طالب حق مثالوں کو پا کر اُس کے دقیق در دقیق صفات پر اطمینان پکڑ لے۔

اب اس تمام تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ چار مجازی دیوتے جو وید میں مذکور ہیں چار مجازی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں چنانچہ اکاش مجازی طور پر ربوبیت کبریٰ کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے اور سورج رحمانیت کی صفت سے موصوف ہے اور چاند رحیمیت کی صفت سے حصہ دیا گیا ہے اور زمین مالک یوم الدین کی صفت سے بہرہ یاب ہے اور یہ چاروں صفات مشہود و محسوس ہیں انہیں امور کی وجہ سے موٹی عقل والوں نے درحقیقت ان کو دیوتے قرار دیا ہے اور ان کو رَبّ النوع اور قابل پرستش سمجھا ہے پس ان لوگوں کے ردّ کے لیے خدا تعالیٰ اپنی پاک کتاب قرآن شریف میں یعنی سورۃ فاتحہ میں فرماتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔ اٰمِيْنَ ۔

ترجمہ۔ حمد اور اُستت اور مہما اس بڑے رب کے لیے خاص ہے جس کا نام اللہ ہے جو رب العالمین ہے۔ اور رحمان العالمین ہے اور رحیم العالمین ہے۔ اور مالک جمیع عالم یوم الدین ہے یعنی یہ مرتبہ پرستش کا خدا کے لیے مخصوص ہے کہ اس کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت اور جزا سزا کے لیے مالکیت ایک عالم اور ایک رنگ میں محدود نہیں بلکہ یہ صفات اس کی بے انتہا رنگوں میں ظاہر ہوتی ہیں کوئی ان کا انتہا نہیں پا سکتا اور آسمان اور سورج وغیرہ کی ربوبیتیں یعنی پرورشیں ایک خاص رنگ اور ایک خاص قسم میں محدود ہیں اور اس اپنے تنگ دائرہ سے آگے نہیں نکلتیں اس لیے ایسی چیزیں پرستش کے لائق نہیں۔ علاوہ اس کے اُن کے یہ افعال بالارادہ نہیں بلکہ ان سب کے نیچے الٰہی طاقت کام کر رہی ہے۔ پھر فرمایا کہ اے وہ سب کے رَبّ کہ جو بے انتہا رنگوں میں اپنے یہ صفات

---

[1] بنی اسرائیل۔ ع۔ ۷ ۞

ظاہر کرتا ہے پرستش کے لائق تو ہی ہے اور سورج چاند وغیرہ پرستش کے لائق نہیں ہیں اسی طرح دوسرے مقام میں فرمایا لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ[1] یعنی نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے یہ تمام چیزیں سورج چاند۔ آسمان۔ آگ۔ پانی وغیرہ پیدا کی ہیں۔ چاند اور سورج کا ذکر کرکے پھر بعد اس کے جمع کا صیغہ بیان کرنا اس غرض سے ہے کہ یہ کل چیزیں جن کی غیر قومیں پرستش کرتی ہیں تم ہرگز اُن کی پرستش مت کرو۔ پھر اس سورۃ میں یعنی سورۃ فاتحہ میں اس بات کا جواب ہے کہ جب اکاش اور سورج اور چاند اور آگ اور پانی وغیرہ کی پرستش سے منع کیا گیا تو پھر کونسا فائدہ اللہ کی پرستش میں ہے کہ جو ان چیزوں کی پرستش میں نہیں تو دعا کے پیرایہ میں اس کا جواب دیا گیا کہ وہ خدا ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اپنے تئیں آپ اپنے بندوں پر ظاہر کرتا ہے انسان صرف اپنی عقل سے اُس کو شناخت نہیں کرتا بلکہ وہ قادر مطلق اپنی خاص تجلّی سے اور اپنی زبردست قدرتوں اور نشانوں سے اپنے تئیں شناخت کرواتا ہے وہی ہے کہ جب غضب اور قہر اس کا دنیا پر بھڑکتا ہے تو اپنے پرستار بندوں کو اُس غضب سے بچا لیتا ہے وہی ہے جو انسان کی عقل کو روشن کرکے اور اُس کو اپنے پاس سے معرفت عطا کرکے گمراہی سے نجات دیتا ہے اور گمراہ ہونے نہیں دیتا۔ یہ سورہ فاتحہ کا خلاصہ مطلب ہے جس کو پانچ وقت مسلمان نمازوں میں پڑھتے ہیں بلکہ دراصل اسی دعا کا نام نماز ہے اور جب تک انسان اِس دُعا کو درد دل کے ساتھ خدا کی حضور میں کھڑے ہوکر نہ پڑھے اور اس سے وہ عقدہ کشائی نہ چاہے جس عقدہ کشائی کے لیے یہ دعا سکھلائی گئی ہے تب تک اُس نے نماز نہیں پڑھی۔ اور اس نماز میں تین چیزیں سکھلائی گئی ہیں۔

(۱) اول خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات توحید تا انسان چاند۔ سورج اور دوسرے جھوٹے دیوتاؤں سے مُنہ پھیر کر صرف اسی سچے دیوتا کا ہو جائے اور اس کی روح سے یہ آواز نکلے کہ

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ

یعنی مَیں تیرا ہی پرستار ہوں اور تجھ سے ہی مدد چاہتا ہوں اور دوسری یہ سکھلایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں اپنے بھائیوں کو شریک کرے اور اس طرح پر بنی نوع کا حق ادا کردے اس لیے دعا میں اِهْدِنَا کا لفظ آیا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ اے ہمارے خدا ہم سب لوگوں کو اپنی سیدھی راہ دکھلا۔ یہ معنے نہیں کہ مجھ کو اپنی سیدھی راہ دکھا۔ پس اس طور کی دعا سے جو جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے بنی نوع کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور تیسری اس دعا میں یہ سکھلانا مقصود ہے کہ ہماری حالت کو صرف خشک ایمان تک محدود نہ رکھ بلکہ وہ ہمیں روحانی نعمتیں عطا کر جو تو نے پہلے راستبازوں کو دی ہیں اور پھر کہا کہ یہ دعا بھی کرو کہ ہمیں ان لوگوں کی راہوں سے بچا جن کو روحانی آنکھیں عطا نہیں ہوئیں آخر انہوں نے ایسے کام کیے جن سے اسی دنیا میں غضب اُن پر نازل ہوا۔ اور یا اس دُنیا میں غضب سے تو بچے مگر گمراہی کی

[1] حٰمٓ السجدۃ: ۳۸

موت سے مرے اور آخرت کے غضب میں گرفتار ہوئے خلاصہ دعا کا یہ ہے کہ جس کو خدا روحانی نعمتیں عطا نہ کرے اور دیکھنے والی آنکھیں نہ بخشے اور دل کو یقین اور معرفت سے نہ بھرے آخر وہ تباہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کی شوخیوں اور شرارتوں کی وجہ سے اِسی دنیا میں اس پر غضب پڑتا ہے کیونکہ وہ پاکوں کے حق میں بدزبانی کرتا ہے اور کتوں کی طرح زبان نکالتا ہے پس ہلاک کیا جاتا ہے جیسا کہ یہود اپنی شرارتوں اور شوخیوں کی وجہ سے ہلاک کیے گئے اور بار ہا طاعون کا عذاب اُن پر نازل ہوا جس نے ان کی بیخ کنی کر دی اور یا اگر وہ دنیا میں شوخی اور شرارت نہ کرے اور بدزبانی اور شرارت کے منصوبے میں شریک نہ ہو تو اُس کے عذاب کی جگہ عالم ثانی ہے جب اس دُنیا سے وہ گذر جائیگا۔

(نسیم دعوت صـ۴۳-۵۴)

(سورہ فاتحہ کا ترجمہ) تمام تعریفیں اور تمام مدح اور تمام استت اور حمد خدا کے لیے مُسلّم اور مخصوص ہے جو تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور پرورش کرنے والا ہے کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ جو اُس کی پیدا کردہ نہیں اور اس کی پرورش کردہ نہیں۔ وہ رحمٰن ہے یعنی وہ بغیر عوض اعمال کے اپنے تمام بندوں کو خواہ کافر ہیں خواہ مومن اپنی نعمتیں دیتا ہے اور اُن کی آسایش اور آرام کے لیے بیشمار نعمتیں اُن کو عطا کر رکھی ہیں اور وہ رحیم ہے یعنی پہلے تو وہ اپنی رحمانیت سے جس میں انسان کی کوشش کا دخل نہیں ایسے قُویٰ اور طاقتیں اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے جن سے نیک اعمال بجا لاسکیں اور تکمیل اعمال کے لیے ہر ایک قسم کے اسباب مہیّا کر دیتا ہے اور پھر جب اُس کی رحمانیت سے انسان اس لائق ہو جاتا ہے کہ اعمال نیک بجالاسکے تو ان اعمال کی جزا کے لیے خدا تعالیٰ کا نام رحیم ہے اور جب انسان خدا تعالیٰ کی رحیمیت سے فیضیاب ہو کر اس لائق ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے ابدی انعام واکرام پاوے تو اس ابدی انعام واکرام کے دینے کے لیے خدا تعالیٰ کا نام مالک یوم الدین ہے۔ پھر بعد اس کے فرمایا ہے کہ وہ خدا جو ان صفات کا جامع ہے ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور پرستش وغیرہ نیک امور میں تیری ہی مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھی راہ دکھا۔ اُن لوگوں کی راہ جن پر تیرا انعام اکرام ہے اور اُن لوگوں کی راہ سے بچا جو تیرے غضب کے نیچے ہیں (یعنی ایسی شوخی اور شرارت کے کام کرتے ہیں جو اسی دنیا میں مورد غضب ہو جاتے ہیں) اور ہمیں اُن لوگوں کی راہ سے بچا جو تیری راہ کو بھول گئے ہیں اور وہ راہیں اختیار کرتے ہیں جو تیری مرضی کے موافق نہیں آمین۔

اب دیکھو کہ قرآن شریف کی یہ سُورت جس کا نام سورۃ فاتحہ ہے کیسی توحید سے پُر ہے جو کسی جگہ انسان کی طرف سے یہ دعویٰ نہیں کہ میں خود بخود ہوں اور خدا کا پیدا کردہ نہیں اور نہ یہ دعویٰ ہے کہ میرے اعمال اپنی قوت اور طاقت سے ہیں اور وید کی طرح اُس میں یہ دُعا نہیں کہ "اے پرمیشر ہمیں بہت سی گوئیں دے اور بہت سے گھوڑے دے اور بہت سا لوٹ کا مال دے" بلکہ یہ دُعا ہے کہ ہمیں وہ راہ دکھا جس راہ سے انسان تجھے پا لیتا ہے اور تیرا روحانی انعام واکرام اُسے نصیب ہوتا ہے اور تیرے غضب سے بچتا ہے اور گمراہی کی راہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ (چشمہ معرفت صـ۱۹۷-۱۹۸)

وَفِي السُّوْرَةِ إِشَارَةٌ إِلٰى بَرَكَاتِ الدُّعَاءِ وَإِلٰى أَنَّهُ كُلُّ خَيْرٍ يَّنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَإِلٰى أَنَّهُ مَنْ عَرَفَ الْحَقَّ وَثَبَّتَ نَفْسَهُ عَلَى الْهُدٰى وَتَهَذَّبَ وَصَلُحَ فَلَا يُضَيِّعُهُ اللّٰهُ وَيُدْخِلُهُ فِيْ عِبَادِهِ الْمُنْعَمِيْنَ وَالَّذِيْ عَصٰى رَبَّهُ فَيَكُوْنُ مِنَ الْهَالِكِيْنَ ؛

وَفِي السُّوْرَةِ إِشَارَةٌ إِلٰى أَنَّ السَّعِيْدَ هُوَ الَّذِيْ كَانَ فِيْهِ جَيْشُ الدُّعَاءِ لَا يَعْبَأُ وَلَا يَلْغَبُ وَلَا يَعْبِسُ وَلَا يَيْئَسُ وَيَثِقُ بِفَضْلِ رَبِّهِ إِلٰى أَنْ تُدْرِكَهُ عِنَايَةُ اللّٰهِ فَيَكُوْنَ مِنَ الْفَآئِزِيْنَ ؛

وَفِي السُّوْرَةِ إِشَارَةٌ إِلٰى أَنَّ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى مُؤَثِّرَةٌ بِقَدْرِ إِيْمَانِ الْعَبْدِ بِهَا وَإِذَا تَوَجَّهَ الْعَارِفُ إِلٰى صِفَةٍ مِّنْ صِفَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَأَبْصَرَهُ بِبَصَرِ رُوْحِهٖ وَاٰمَنَ ثُمَّ اٰمَنَ ثُمَّ اٰمَنَ حَتّٰى فَنٰى فِيْ إِيْمَانِهٖ فَتَدْخُلُ رُوْحَانِيَّةُ هٰذِهِ الصِّفَةِ فِيْ قَلْبِهٖ وَتَأْخُذُهُ مِنْهُ فَيَرَى السَّالِكُ بِأَنَّهُ فَارِغًا مِّنْ غَيْرِ الرَّحْمَانِ

(ترجمہ از مرتب) اس سورۃ میں دعا کی برکتوں کی طرف اشارہ ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر بھلائی آسمان سے نازل ہوتی ہے اور پھر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس شخص نے حق کو پہچان لیا اور اپنے آپ کو ہدایت پر قائم کر لیا اور مہذب اور صالح بن گیا تو اُسے اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کیا کرتا بلکہ اُسے اپنے انعام یافتہ بندوں میں داخل کر لیتا ہے اور جو شخص اپنے رب کی نافرمانی کرتا ہے وہ ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

پھر اس سورۃ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نیک بخت وہ ہے جس کے اندر دعا کے لیے ایک غیر معمولی جوش ہوتا ہے اور وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا نہ تھکتا ہے نہ تیوری چڑھاتا ہے اور نہ وہ مایوس ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے رب کے فضل پر بھروسہ رکھتا ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی عنایت اس کے شامل حال ہو جاتی ہے اور وہ کامیاب ہونے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

پھر اس سورت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ اسی کے مطابق اثر دکھاتی ہیں جتنا بندہ کو ان پر ایمان ہو اور جب کوئی عارف خدا تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف توجہ کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کو اپنی روحانی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے اور اس پر ایمان لے آتا ہے پھر ایمان لے آتا ہے۔ پھر ایمان لے آتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان میں فنا ہو جاتا ہے تو اس صفت کی روحانی تاثیر اس کے دل میں داخل ہو جاتی ہے اور اس پر قبضہ کر لیتی ہے تب

وَ قَلْبَهٗ مُطْمَئِنًّا بِالْاِيْمَانِ وَعَيْشَهٗ حُلْوًا بِذِكْرِ الْمَنَّانِ وَ يَكُوْنُ مِنَ الْمُسْتَبْشِرِيْنَ۔ فَتَتَجَلّٰى تِلْكَ الصِّفَةُ لَهٗ وَتَسْتَوِىْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَكُوْنَ قَلْبُ هٰذَا الْعَبْدِ عَرْشَ هٰذِهِ الصِّفَةِ وَ يَنْصَبِغُ الْقَلْبُ بِصِبْغِهَا بَعْدَ ذَهَابِ الصِّبْغِ النَّفْسَانِيَّةِ وَ بَعْدَ كَوْنِهٖ مِنَ الْفَانِيْنَ۔

فَاِنْ قُلْتَ مِنْ اَيْنَ عَلِمْتَ اَنَّ هٰذِهِ الْاِشَارَةَ تُوْجَدُ فِى الْفَاتِحَةِ فَاعْلَمْ اَنَّ لَفْظَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ يَدُلُّ عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى مَا قَالَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَكَاَنَّهٗ اَنْطَقَ فِطْرَتَنَا وَ اَرَانَا مَا كَانَ مَخْفِيًّا فِىْ فِطْرَتِنَا وَ هٰذِهٖ اِشَارَةٌ اِلٰى اَنَّ الْاِنْسَانَ قَدْ خُلِقَ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَاُدْخِلَ فِىْ فِطْرَتِهٖ اَنْ يَّحْمَدَ اللّٰهَ وَيَسْتَيْقِنَ اَنَّهٗ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ وَرَحْمٰنٌ وَّ رَحِيْمٌ وَّ مَالِكُ يَوْمِ الدِّيْنِ وَ اَنَّهٗ يُعِيْنُ الْمُسْتَعِيْنَ وَ يَهْدِى الدَّاعِيْنَ۔ فَثَبَتَ مِنْ هٰهُنَا اَنَّ الْعَبْدَ مَجْبُوْلٌ عَلٰى مَعْرِفَةِ رَبِّهٖ وَعِبَادَتِهٖ وَقَدْ اُشْرِبَ فِىْ قَلْبِهٖ مَحَبَّتُهٗ فَتَظْهَرُ

سالک مشاہدہ کرتا ہے کہ اس کا سینہ غیر اللہ کی محبّت سے خالی ہے اس کا دل ایمان سے مطمئن ہے اور اس کی زندگی محسن خدا کی یاد کی وجہ سے نہایت خوشگوار بن گئی ہے۔ پس وہ ہر لحاظ سے خوش و خرم ہو جاتا ہے پھر اس پر اس صفت کی مزید تجلی ہوتی ہے اور وہ اس پر چھا جاتی ہے یہاں تک کہ ایسے بندہ کا دل اس صفت کا عرش بن جاتا ہے اور نفسانیت کا رنگ بالکل دھل جانے اور بندہ کے فانی فی اللہ ہونے کے بعد اس کا دل اس صفت کے رنگ میں خوب رنگین ہو جاتا ہے۔

اگر تم کہو کہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ سورۃ فاتحہ میں یہ اشارہ موجود ہے؟ تو تم جان لو کہ اس اشارہ پر الحمد للہ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (یہاں) یہ نہیں کہا کہ تم کہو الحمد للہ بلکہ صرف الحمد للہ کہا گویا اس نے ہماری فطرت سے (یہ فقرہ) کہلوایا ہے اور جو چیز ہماری فطرت میں پوشیدہ ہے وہ اس نے دکھا دی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان فطرت اسلام پر پیدا کیا گیا ہے اور اس کی فطرت میں یہ بات داخل کر دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور یقین رکھے کہ وہ رب العالمین ہے۔ رحمان ہے۔ رحیم ہے اور مالک یوم الدین ہے اور یہ کہ وہ مدد مانگنے والے کی مدد کرتا ہے اور دعا کرنے والوں کو ہدایت دیتا ہے۔ پس اس جگہ سے ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت انسان کی فطرت میں ودلیعت کی گئی ہے اور اس کے دل میں اس کی محبت بھر دی گئی ہے پس یہ حالت پڑ دل

هٰذِهِ الْحَالَةُ بَعْدَ رَفْعِ الْحُجُبِ وَيَجْرِيْ ذِكْرُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَى اللِّسَانِ مِنْ غَيْرِ اِخْتِيَارٍ وَّ تَكَلُّفٍ وَّتَنْبُتُ شَجَرَةُ الْمَعَارِفِ وَتُثْمِرُ وَتُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ وَ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اِشَارَةٌ اُخْرٰى وَهُوَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ الْاٰخِرِيْنَ مُشَاكِلِيْنَ بِالْاَوَّلِيْنَ فَاِذَا اتَّصَلَتْ اَرْوَاحُهُمْ بِاَرْوَاحِهِمْ بِكَمَالِ الْاِقْتِدَآءِ وَمُنَاسَبَةِ الطَّبَائِعِ فَيَنْزِلُ الْفَيْضُ مِنْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى قُلُوْبِهِمْ ثُمَّ اِذَا تَمَّ اقْتِضَآءُ الْمُسْتَفِيْضِ اِلَى الْمُفِيْضِ وَبَلَغَ الْاَمْرُ اِلٰى غَايَةِ الْوُصْلَةِ فَيَصِيْرُ وُجُوْدُهُمَا كَشَيْءٍ وَّاحِدٍ وَّيَغِيْبُ اَحَدُهُمَا فِي الْاٰخَرِ وَهٰذِهِ الْحَالَةُ هِيَ الْمُعَبَّرُ عَنْهَا بِالْاِتِّحَادِ وَفِيْ هٰذِهِ الْمَرْتَبَةِ يُسَمَّى السَّالِكُ فِي السَّمَآءِ بِتَسْمِيَةِ الْاَنْبِيَآءِ لِمُشَابَهَتِهٖ اِيَّاهُمْ فِيْ جَوْهَرِهِمْ وَطَبْعِهِمْ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْعَارِفِيْنَ ٭ (كرامات الصادقين صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴)

وَالْاٰنَ نَرٰى اَنْ نُّوَازِنَ هٰذَا الدُّعَآءَ بِالدُّعَاءِ الَّذِيْ عَلَّمَهُ الْمَسِيْحُ فِي الْاِنْجِيْلِ لِيَتَبَيَّنَ لِكُلِّ مُنْصِفٍ اَيُّهُمَا اَشْفٰى لِلْعَلِيْلِ وَاَدْرَءُ لِلْغَلِيْلِ وَاَرْفَعُ شَاْنًا

کے اُٹھ جانے کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے اور تب خدا تعالیٰ کا ذکر زبان پر بلا اختیار اور بلا تکلف جاری ہو جاتا ہے معارف کا درخت پیدا ہو جاتا ہے اور پھل دینے لگتا ہے اور ہمیشہ تازہ بتازہ اپنا پھل دیتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں ایک اور اشارہ ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے بعد میں آنے والوں کو پہلے آنے والوں کے مشابہ پیدا کیا ہے پس جب کامل پیروی اور طبائع کی مناسبت کی وجہ سے ان کی روحیں اُن کی روحوں سے اتصال پاتی ہیں تو وہ خاص فیضان اُن کے دلوں سے ان کے دلوں پر نازل ہو جاتا ہے۔ پھر جب فیض چاہنے والے کی رسائی فیض رساں تک کامل ہو جاتی ہے اور باہمی تعلق کا معاملہ اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے تو ان دونو کا وجود ایک ہی وجود کی مانند بن جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے میں غائب ہو جاتے ہیں یہی وہ حالت ہے جسے اتحاد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس مرتبہ میں سالک کو آسمان میں نبیوں کا نام دیا جاتا ہے اس وجہ سے کہ طبیعت اور جوہر میں ان سے مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ عارفوں پر (یہ امر) مخفی نہیں۔

اور اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کی دعا کا اُس دعا سے موازنہ کریں جو حضرت مسیح علیہ السلام نے انجیل میں سکھائی ہے تا ہر منصف پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان دونوں میں سے کونسی (دعا کسی) بیمار کو زیادہ شفاء

وَاَتَمَّ بُرْهَانًا وَّاَنْفَعُ لِلطَّالِبِيْنَ۔ فَاعْلَمْ اَنَّ فِیْ اِنْجِیْلِ لُوْقَا قَدْ كُتِبَ فِی الْاَصْحَاحِ الْحَادِیْ عَشَرَ اَنَّ الْمَسِیْحَ عَلَّمَ الدُّعَآءَ هٰكَذَا۔ فَقَالَ لَهُمْ یَعْنِیْ لِلْحَوَارِیِّیْنَ۔ مَتٰی صَلَّیْتُمْ فَقُوْلُوْا یَا اَبَانَا الَّذِیْ فِی السَّمٰوٰتِ لِیَتَقَدَّسِ اسْمُكَ لِیَأْتِ مَلَكُوْتُكَ لِتَكُنْ مَشِیْئَتُكَ كَمَا فِی السَّمٰوٰتِ كَذَالِكَ عَلَی الْاَرْضِیْنَ۔ خُبْزَنَا كَفَافَنَا اَعْطِنَا كُلَّ یَوْمٍ وَّاغْفِرْ لَنَا خَطَایَانَا لِاَنَّنَا نَحْنُ اَیْضًا نَغْفِرُ لِكُلِّ مَنْ یُّذْنِبُ اِلَیْنَا (یَعْنِیْ نَغْفِرُ لِلْمُذْنِبِیْنَ) وَلَا تُدْخِلْنَا فِیْ تَجْرِبَةٍ لٰكِنْ نَجِّنَا مِنَ الشِّرِّیْرِ۔ هٰذَا دُعَآءٌ عُلِّمَ لِلْمَسِیْحِیِّیْنَ۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ دُعَآءٌ یُّفَرِّطُ فِی الصِّفَاتِ الرَّبَّانِیَّةِ وَكَذَالِكَ مَا یُحِیْطُ عَلٰی مَقَاصِدِ الْفِطْرَةِ الْاِنْسَانِیَّةِ بَلْ یَزِیْدُ سَوْرَةَ الْحَسْرَةِ الرُّوْحَانِیَّةِ وَیُحَرِّكُ الْقُوٰی لِطَلَبِ الْاَهْوَآءِ الْفَانِیَةِ وَالشَّهَوَاتِ الْمُتَفَانِیَةِ مَعَ الذُّهُوْلِ عَنْ سَعَادَاتِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ وَمِنْ جُمْلَتِهٖ جُمَلِهٖ فِقْرَةٌ اَعْنِیْ لِیَتَقَدَّسِ اسْمُكَ فَانْظُرْ فِیْهَا بِعَقْلِكَ

دینے والی یا کسی پیاسے کی پیاس کو زیادہ بجھانے والی ہے یا شان میں زیادہ بلند۔ دلیل کے لحاظ سے زیادہ مکمل اور طالبانِ حق کے لیے زیادہ نفع رساں ہے۔ اب جان لو کہ انجیل لوقا باب ۱۱ میں لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے حواریوں کو اس طرح کی دعا سکھائی اور انہیں کہا:

"جب تم دعا کرو تو کہو اے ہمارے باپ جو آسمانوں پر ہے تیرے نام کی تقدیس ہو
تیری بادشاہت آوے۔ تیری مراد جیسی آسمانوں پر ہے زمینوں پر بھی بر آوے۔ ہماری
روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے اور ہمارے گناہوں کو بخش کیونکہ ہم بھی اپنے تمام قصور واروں
کا قصور بخشتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ ہم کو شریر سے بچا۔"

یہ دعا ہے جو مسیحیوں کو سکھائی گئی۔

معلوم ہو کہ یہ دعا ربانی صفات کو گھٹا کر پیش کرتی ہے۔ نیز یہ دعا فطرتِ انسانی کے تمام مقاصد پر بھی حاوی نہیں بلکہ روحانی حسرت کی شدت کو اور بھی بڑھاتی ہے اور آخرت کی سعادتوں سے غافل کر کے نفسانی قویٰ کو فانی خواہشوں اور مادی آرزوؤں کے حصول پر اُبھارتی ہے۔ اس دعا کے تمام جملوں میں ایک فقرہ یہ ہے یعنی

"تیرا نام پاک مانا جائے"

لہ مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء [illegible]

وَ فَہۡمِكَ هَلْ تَجِدُهٗ حَرِيًّا بِشَانِ الْاَكْمَلِ الَّذِيْ لَيْسَتْ لَهٗ حَالَةٌ مُّنْتَظَرَةٌ مِّنْ حَالَاتِ الْكَمَالِ وَلَا مَرْتَبَةٌ مُّتَرَقَّبَةٌ مِّنْ مَّرَاتِبِ التَّقَدُّسِ وَالْجَلَالِ۔ فَاِنَّ الْمَحَامِدَ وَالتَّقَدُّسَاتِ كُلَّهَا ثَابِتَةٌ لِّحَضْرَةِ الْعِزَّةِ وَلَا يُنْتَظَرُ شَيْءٌ مِّنْهَا فِي الْاَزْمِنَةِ الْاٰتِيَةِ وَهٰذَا هُوَ تَعْلِيْمُ الْقُرْاٰنِ وَ تَلْقِيْنُ كَلَامِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ كَمَا مَرَّ كَلَامُنَا فِيْ هٰذَا الْبَيَانِ۔ وَمَنْ اَقْبَلَ عَلَى الْفُرْقَانِ الْمَجِيْدِ وَ فَهِمَهٗ وَ تَدَبَّرَ وَ نَظَرَهٗ بِالنَّظَرِ السَّدِيْدِ فَيَنْكَشِفُ عَلَيْهِ اَنَّ الْفُرْقَانَ قَدْ اَكْمَلَ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ الْبَيَانَ وَصَرَّحَ بِاَنَّ لِلّٰهِ كَمَالًا تَامًّا۔ وَكُلُّ كَمَالٍ ثَابِتٌ لَّهٗ بِالْفِعْلِ وَلَيْسَ فِيْهِ كَلَامٌ وَتَجْوِيْزُ الْحَالَةِ الْمُنْتَظَرَةِ لَهٗ جَهْلٌ وَّظُلْمٌ وَّاجْتِرَامٌ وَّاَمَّا الْاِنْجِيْلُ فَيَجْعَلُ الْبَارِيَ عَزَّ اسْمُهٗ مُحْتَاجًا اِلَى الْحَالَةِ الْمُنْتَظَرَةِ وَضَاجِرًا لِّكَمَالَاتٍ مَّفْقُوْدَةٍ غَيْرِ الْمَوْجُوْدَةِ وَلَا يَقْبَلُ وُجُوْدَ كَمَالِ شَجَرَتِهٖ بَلْ يُظْهِرُ الْاَمَانِيَّ لِاِيْنَاعِ ثَمَرَتِهٖ وَلَيْسَ قَائِلُ اسْتِنَارَةِ بَدْرِهٖ بَلْ يَنْتَظِرُ زَمَانَ عُلُوِّ قَدْرِهٖ كَاَنَّ رَبَّ الْاِنْجِيْلِ وَاجِمٌ مِّنْ فَقْدِ الْمُرَادَاتِ وَعَاجِزٌ عَنْ اِمْضَاءِ الْاِرَادَاتِ وَ

اب اپنی عقل اور فہم سے کام لے کر اس پر غور کیجئے کہ آیا آپ اس دعاء کو اس کامل ترین ذات کی شان کے شایان پاتے ہیں جس کے کمالات کے لیے کوئی حالتِ منتظرہ باقی نہیں اور نہ اس کے تقدس اور جلال کے مراتب میں سے کوئی مرتبہ قابلِ انتظار ہے۔ یقیناً تمام تعریفیں اور پاکیزگیاں اس بارگاہِ عزّت کے لیے ثابت ہیں ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کا کسی آیندہ زمانہ میں (ملنے کا) انتظار ہو۔ یہ قرآن کریم کی وہ تعلیم ہے اور خدائے رحمان کے کلام کی تلقین ہے جس کے متعلق ہم قبل ازیں وضاحت کر چکے ہیں۔

اور جس شخص نے بھی قرآنِ مجید کی طرف توجہ کی۔ اُسے سمجھا۔ اس میں تدبّر سے کام لیا اور اس پر صحیح طور سے غور کیا اُس پر یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ قرآن کریم نے اس معاملہ کو مکمل طور پر بیان کیا ہے اور اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ ہر انتہائی کمال اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور اُس کے لیے ہر کمال بالفعل ثابت ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں اور اس کے لیے کسی حالتِ منتظرہ کا تجویز کرنا جہالت، ظلم اور گناہ ہے۔ لیکن انجیل خدائے باری تعالیٰ کو حالتِ منتظرہ کا محتاج اور بعض گم شدہ اور غیر موجود کمالات کے لیے بے چین قرار دیتی ہے۔ اور انجیل خدائی درخت کے کامل ہونے کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ اُس کے پھل کے پکنے کی صرف آرزو ظاہر کرتی ہے۔ خدا کے بدرِ منوّر ہونے کی قائل نہیں بلکہ وہ اس کی قدر و منزلت کے بڑھنے کے زمانہ کی منتظر ہے گویا انجیل کا خدا مرادوں کے بَر نہ آنے کے رنج کی وجہ سے خاموش ہے اور اپنے ارادوں

كَمْ مِّنْ لَيْلَةٍ بَاتَهَا يَنْتَظِرُ كَمَالَاتٍ وَّيَتَرَقَّبُ تَغَيُّرَ حَالَاتٍ حَتّٰى يَئِسَ مِنْ اَيَّامِ رَشَادِهٖ وَاَقْبَلَ عَلٰى عِبَادِهٖ لِيَتَمَنَّوْا لَهٗ حُصُوْلَ مُرَادِهٖ وَلِيَعْقِدُوا الْهِمَمَ لِزَوَالِ كَمَدِهٖ وَعِلَاجِ رَمَدِهٖ سُبْحَانَ رَبِّنَا اِنْ هٰذَا اِلَّا بُهْتَانٌ مُّبِيْنٌ ۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ مَا لِلْبِلْبَالِ وَرَبِّ ذِي الْجَلَالِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ ثُمَّ دُعَاءُ الْمَسِيْحِ دُعَآءٌ لَّا اَثَرَ فِيْهِ مِنْ غَيْرِ التَّنْزِيْهِ كَاَنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ مُنَزَّهٌ عَنِ الْكِذْبِ وَالتَّمْوِيْهِ وَلٰكِنْ لَّا تُوْجَدُ فِيْهِ كَمَالَاتٌ اُخْرٰى وَلَا مِنَ الصِّفَاتِ الثُّبُوْتِيَّةِ اَثَرٌ اَدْنٰى فَاِنَّ التَّنْزِيْهَ وَالتَّقْدِيْسَ مِنَ الصِّفَاتِ السَّلْبِيَّةِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى ذَوِي الْمَعْرِفَةِ وَالْبَصِيْرَةِ وَاَمَّا الصِّفَاتُ السَّلْبِيَّةُ فَهِيَ لَا تَقُوْمُ مَقَامَ الْاِثْبَاتِ كَمَا ثَبَتَ عِنْدَ الثِّقَاتِ وَاَمَّا مَا عَلَّمَنَا الْقُرْاٰنُ مِنَ الدُّعَآءِ فَهُوَ يَشْتَمِلُ عَلٰى جَمِيْعِ صِفَاتٍ كَامِلَةٍ تُوْجَدُ فِيْ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ اَلَا تَرٰى اِلٰى قَوْلِهٖ عَزَّ وَجَلَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ

کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ اُس نے کتنی ہی راتیں اپنے کمالات (کے عروج کو پہنچنے) کا انتظار کرتے ہوئے اور حالات کے پلٹا کھانے کی اُمید میں گزار دیں یہاں تک کہ وہ کامیابی کے ایّام سے مایوس ہو گیا اور اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوا تا وہ اُس کی مراد بر آنے کی دعائیں کریں اور تا وہ اُس کے غم کے مٹنے اور اُس کے آشوبِ چشم کے علاج کے لیے اپنی کمرِ ہمت باندھ لیں۔ پاک ہے ہمارا ربّ۔ یہ (کمزوری) اس پر کھلا کھلا بُہتان ہے۔ اس کا تو یہ عالم ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے کہ وہ ہو جائے اور صرف کہہ دیتا ہے کہ وہ ہو جائے تو وہ ہو جاتی ہے۔ بھلا ربّ ذوالجلال اور ربّ العالمین سے پریشانی کا کیا تعلق؟

پھر حضرت مسیحؑ کی دُعاء ایک ایسی دُعاء ہے جس میں خدا کو عیب سے پاک قرار دینے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں۔ گویا یہ دعاء یہ کہتی ہے کہ خُدا تعالیٰ جھُوٹ اور بناوٹ سے تو پاک ہے لیکن نہ اس میں کوئی اور کمالات پائے جاتے ہیں اور نہ اس میں مثبت صفات کا کوئی معمولی سا بھی نشان (پایا جاتا) ہے کیونکہ عیوب سے پاک ہونا منفی صفات میں سے ہے جیسا کہ صاحبِ معرفت اور بصیرت لوگوں پر مخفی نہیں اور منفی صفات مُثبت صفات کا مرتبہ نہیں رکھتیں۔ یہ حقیقت پختہ کار لوگوں کے نزدیک ثابت شدہ ہے۔

لیکن قرآنِ کریم نے جو دعاء ہمیں سکھائی ہے وہ ان تمام صفاتِ کاملہ پر مشتمل ہے جو ذاتِ الٰہی میں پائی جاتی ہیں۔ کیا تم خُدائے عزّوجلّ کے کلام اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کو نہیں

الرحیم مالک یوم الدین کیف احاط صفات اللہ جموعها وتأبط اصولها وفروعها۔ واشار فی الحمد للہ ان اللہ ذات لا تحصی صفاته ولا تعدّ کمالاته۔ واشار فی رب العالمین ان ربوبیته یعم السموات والارضین والجسمانیین والروحانیین۔ واشار فی الرحمن الرحیم ان الرحمة بجمیع انواعها من اللہ القیوم القدیم والخلاق الکریم۔ واشار فی قوله مالک یوم الدین ان مالک المجازاة هو اللہ لا غیره من المخلوقین۔ وان ابحر المجازاة جاریة وهی تمر مر السحاب کل حین۔ وکل ما یری عبده من فضل اللہ واحساناته بعد اعمال صالحة وصدقه وصدقاته فانما هو مستبعة مجازاته۔ ففی هذه المحامد اشارات رفیعة عالیة ودلالات لطیفة متعالیة علی کل کمال لحضرة اللہ جامع کل جمال وجلال۔ ثم من المعلوم ان اللام فی الحمد للہ للاستغراق فهو یشیر الی ان المحامد کلها للہ بالاستحقاق۔ واما دعاء الانجیل اعنی لیتقدس

دیکھئے کہ کس طرح وہ تمام صفاتِ الٰہیہ پر حاوی ہے اور کس طرح اُس نے ان اصول اور فروع کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میں یہ اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس کی نہ صفات شمار کی جا سکتی ہیں اور نہ اس کے کمالات گنے جا سکتے ہیں۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْن میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی بارش آسمانوں اور زمینوں پر بلکہ تمام جسمانی اور روحانی چیزوں پر عام ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی رحمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی (ملتی) ہے جو قیوم و قدیم اور خلاق و کریم ہے۔ اُس نے اپنے الفاظ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْن میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ جزا و سزا کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے سوا مخلوقات میں سے اور کوئی مالک نہیں۔ اُس کی جزا کے سمندر جاری ہیں اور وہ ہر وقت بادلوں کی طرح (فیض پہنچانے کے لیے) گزر رہے ہیں اور بندہ اعمالِ صالحہ، صدق اور اپنی قربانیوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے احسانات میں سے جو کچھ بھی پاتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی جزا (دینے والی صفت) کا احسان ہوتا ہے۔ (غرض) ان صفاتِ حسنہ میں اس امر پر اعلیٰ درجہ کے اشارے اور لطیف اور بلند پایہ دلائل ہیں کہ ہر کمال اللہ تعالیٰ کے لیے سزاوار ہے جو ہر جلال و جمال کا جامع ہے۔ پھر یہ تو ظاہر ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میں جو الف لام ہے وہ استغراق کے لیے ہے اور اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سب صفاتِ حسنہ بطور حق کے اللہ تعالیٰ کے لیے ہی (واجب) ہیں۔ لیکن انجیل کی یہ دعا کہ "تیرا نام پاک ہو" کسی کمال کی

اسْمُكَ فَلَا يُشِيْرُ إِلٰى كَمَالٍ بَلْ يُخْبِرُ عَنْ خَطَرَاتِ زَوَالٍ وَّ يُظْهِرُ الْأَمَانِيَّ لِتَقْدِيْسِ الرَّحْمَانِ كَأَنَّ التَّقَدُّسَ لَيْسَ لَهٗ بِحَاصِلٍ إِلٰى هٰذَا الْآنِ فَمَا هٰذَا الدُّعَاءُ إِلَّا مِنْ نَّوْعِ الْهَذَيَانِ فَإِنَّكَ تَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ قُدُّوْسٌ مِّنَ الْأَزَلِ إِلَى الْأَبَدِ كَمَا هُوَ يَلِيْقُ بِالْأَحَدِ الصَّمَدِ فَهُوَ مُنَزَّهٌ وَّمُقَدَّسٌ عَنْ كُلِّ التَّدَنُّسَاتِ فِيْ جَمِيْعِ الْأَوْقَاتِ إِلٰى أَبَدِ الْآبِدِيْنَ وَلَيْسَ مَحْرُوْمًا وَّمِنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ......

ثُمَّ الْإِنْجِيْلُ يَذْكُرُ اللّٰهَ تَعَالٰى بِاسْمِ الْأَبِ وَالْقُرْآنُ يَذْكُرُهٗ بِاسْمِ الرَّبِّ وَبَيْنَهُمَا بَوْنٌ بَعِيْدٌ وَّيَعْلَمُهٗ مَنْ هُوَ زَكِيٌّ وَّسَعِيْدٌ وَّإِنْ لَّمْ يَعْلَمْهُ مَنْ كَانَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ. فَإِنَّ لَفْظَ الْأَبِ قَدْ كَثُرَ اسْتِعْمَالُهٗ فِي الْمَخْلُوْقِيْنَ فَنَقْلُهٗ إِلَى الرَّبِّ تَعَالٰى فِعْلٌ فِيْهِ رَائِحَةٌ مِّنَ الْإِشْرَاكِ وَهُوَ أَقْرَبُ لِلْإِهْلَاكِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُتَدَبِّرِيْنَ ٭ (كرامات الصادقين صفحه ۹۵ تا ۹۸)

وَاعْلَمُوْا أَيُّهَا النَّاظِرُوْنَ وَالْعُلَمَاءُ الْمُتَبَصِّرُوْنَ أَنَّ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَّمَ تَمْهِيْدًا قَبْلَ الدُّعَاءِ وَالْقُرْآنُ عَلَّمَ تَمْهِيْدًا قَبْلَ الدُّعَاءِ وَ

طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ زوال کا خدشہ پیدا کرتی اور اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کے لیے محض خواہشات کا اظہار کرتی ہے گویا اسے ابھی تک تقدّس حاصل نہیں پس یہ دعا ایک قسم کا بے معنی کلام ہے اور کچھ نہیں کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کہ اس کی شانِ احدیت و بے نیازی کے شایاں ہے وہ ازل سے ابد تک ہمیشہ قدّوس ہے اور وہ تمام عیوب سے ہمیشہ ہمیش کے لیے ابدالآباد تک منزّہ اور مقدّس ہے۔ وہ نہ کسی خوبی سے محروم ہے اور نہ آئندہ کسی بھلائی کے ملنے کا منتظر ہے...... پھر انجیل خدا تعالیٰ کا ذکر اَب کے نام سے کرتی اور قرآن اس کا ذکر ربّ کے نام سے کرتا ہے اور ان دونوں (الفاظ) میں بہت بڑا فرق ہے جسے ہر ذہین اور سعادت مند سمجھتا ہے اگرچہ نادان نہ سمجھیں کیونکہ اَب (باپ) کا لفظ اکثر مخلوقات کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ کے لیے استعمال کرنا ایک ایسا فعل ہے جس میں شرک کی بو پائی جاتی ہے جو انسان کو ہلاک کرنے کے زیادہ قریب ہے جیسا کہ تدبّر کرنے والوں پر مخفی نہیں۔

اے دیکھنے والو اور اے اہلِ بصیرت علماء! جان لو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا سے پہلے ایک تمہید سکھائی ہے اور قرآن کریم نے (بھی) دعا سے قبل ایک تمہید سکھائی ہے اور عقل مندوں کے نزدیک ان دونو

اَلْفَرْقُ بَيْنَهُمَا ظَاهِرٌ عَلٰى اَهْلِ الدُّعَآءِ فَاِنَّ تَمْهِيْدَ الْقُرْاٰنِ يُحَرِّكُ الرُّوْحَ اِلٰى عِبَادَةِ الرَّحْمَانِ وَيُحَرِّكُ الْعِبَادَ اِلٰى اَنْ يَنْتَجِعُوْا حَضْرَتَهٗ بِاِمْحَاضِ النِّيَّةِ وَ اِخْلَاصِ الْجَنَانِ وَيُظْهِرُ عَلَيْهِمْ اَنَّهٗ عَيْنُ كُلِّ رَحْمَةٍ وَّ يَنْبُوْعُ جَمِيْعِ اَنْوَاعِ الْحَنَانِ وَمَخْصُوْصٌ بِاسْمِ الرَّبِّ وَالرَّحْمَانِ وَالرَّحِيْمِ وَ الدَّيَّانِ فَالَّذِيْنَ يَطَّلِعُوْنَ عَلٰى هٰذِهِ الصِّفَاتِ فَلَا يُزَايِلُوْنَ اَهْلَهَا وَلَوْ سَقَطُوْا فِيْ فَلَوَاتِ الْمَمَاتِ بَلْ يَسْعَوْنَ اِلَيْهِ وَيُوَطِّنُوْنَ لَدَيْهِ بِصِدْقِ الْقَلْبِ وَصِحَّةِ النِّيَّاتِ وَيَتَرَاكَضُوْنَ اِلَيْهِ خَيْلَهُمْ وَيَسْعَوْنَ كَالْمَشُوْقِ وَيَضْطَرِمُ فِيْهِمْ هَوَى الْمَعْشُوْقِ فَلَا يُنَاقِشُ اَهْوَآءً اُخْرٰى عِنْدَ غَلَبَةِ هَوٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ فَثَبَتَ اَنَّ فِيْ تَمْهِيْدِ هٰذَا الدُّعَآءِ تَحْرِيْكًا عَظِيْمًا لِّلْعَابِدِيْنَ ۔...

ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ نَنْظُرُ اِلٰى دُعَآءٍ عَلَّمَهٗ عِيْسٰى وَاِلٰى دُعَآءٍ عَلَّمَهٗ رَبُّنَا الْاَعْلٰى لِيَتَبَيَّنَ مَاهُوَ الْفَرْقُ بَيْنَهُمَا لِذِى النُّهٰى وَلِيَنْتَفِعَ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنَ الصَّالِحِيْنَ ۔

تمہیدوں میں فرق ظاہر ہے کیونکہ قرآن کریم کی تمہید رُوح کو خدائے رحمان کی عبادت کی تحریک کرتی ہے اور بندوں کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ خلوصِ نیّت اور صفائی قلب سے بارگاہِ ایزدی کی تلاش میں لگ جائیں۔ نیز (یہ تمہید) اُنہیں بتاتی ہے کہ خُدا تعالیٰ تمام رحمتوں کا سرچشمہ اور تمام نوازشوں کا منبع ہے اور ربّ۔ رحمان۔ رحیم اور دیّان (جزا سزا کا مالک) کے ناموں سے مخصوص ہے۔ جن لوگوں کو ان صفات کا علم ہوجاتا ہے وہ ان کے مالک (اللہ تعالیٰ) سے جُدا نہیں ہوتے خواہ وہ مَوت کے بیابانوں میں جاگریں بلکہ وہ اُس کی طرف دَوڑتے ہیں اور صِدقِ قلب اور صحّتِ نیّت سے اُسی کے پاس ڈیرے جما لیتے ہیں۔ اس کی طرف اپنے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اُس کی طرف والہانہ بڑھتے ہیں۔ اُن کے اندر (اپنے) معشوق کی محبّت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کے غلبہ کی وجہ سے دوسری خواہشات سے کوئی کش مکش نہیں رکھتا۔ پس ثابت ہوا کہ اِس دُعاء کی تمہید میں عبادت کرنے والوں کے لیے ایک زبردست تحریک ہے......

پھر اِس کے بعد ہم اُس دعاء پر غور کرتے ہیں جو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے سکھائی اور اِس دُعاء پر بھی جو ہمارے خدائے بزرگ و برتر نے سکھائی تا عقلمند پر واضح ہوجائے کہ ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے اور تا جو کوئی بھی نیک لوگوں میں شامل ہے اِس فرق سے فائدہ اُٹھائے۔

فَاعْلَمْ اَنَّ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ عَلَّمَ دُعَآءً یَتَنَزَّرٰی عَلَیْهِ اِنْصَافُنَا اَعْنِیْ خُبْزَنَا کَفَافُنَا۔ وَاَمَّا الْقُرْاٰنُ فَعَافَ ذِکْرَ الْخُبْزِ وَالْمَآءِ فِی الدُّعَآءِ وَ عَلَّمَنَا طَرِیْقَ الرُّشْدِ وَالْاِهْتِدَآءِ وَحَثَّ عَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ وَنَطْلُبَ مِنْهُ الدِّیْنَ الْقَوِیْمَ وَنَعُوْذَ بِهٖ مِنْ طُرُقِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ الضَّآلِّیْنَ وَاَشَارَ اِلٰی اَنَّ رَاحَةَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَابِعَةٌ لِّطَلَبِ الصِّرَاطِ وَاِخْلَاصِ الطَّاعَةِ فَانْظُرْ اِلٰی دُعَآءِ الْاِنْجِیْلِ وَدُعَآءِ الْقُرْاٰنِ مِنَ الرَّبِّ الْجَلِیْلِ وَ کُنْ مِّنَ الْمُنْصِفِیْنَ۔ وَاَمَّا مَا جَآءَ فِیْ دُعَآءِ عِیْسٰی تَرْغِیْبٌ فِی الْاِسْتِغْفَارِ فَهُوَ تَاکِیْدٌ لِّدُعَآءِ طَلَبِ الْخُبْزِ کَاَهْلِ الْاِضْطِرَارِ لَعَلَّ اللّٰهَ یَرْحَمُ وَ یُعْطِیْ خُبْزًا کَثِیْرًا عِنْدَ هٰذَا الْاِقْرَارِ فَالْاِسْتِغْفَارُ تَضَرُّعٌ لِّطَلَبِ الرُّغْفَانِ وَاَصْلُ الْاَمْرِ هُوَ طَلَبُ الْخُبْزِ مِنَ اللّٰهِ الْمَنَّانِ وَیَثْبُتُ مِنْ هٰذَا الدُّعَآءِ اَنَّ اَکْثَرَ اُمَمِ عِیْسٰی کَانُوْا عُشَّاقَ الذَّهَبِ وَاللُّجَیْنِ وَمَاجِرِیِ الْحَقِّ لِلْحَجَرَیْنِ وَبَائِعِی الدِّیْنِ بِبَخْسٍ مِّنَ الدَّرَاهِمِ وَمُخْتَبِئِیْ خُلَاصَةِ النَّقْدَیْنِ وَتَارِکِیْ ذَیْلِ الرَّبِّ الرَّاحِمِ

پس جان لو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو دعا سکھلائی ہے یعنی یہ کہ "ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دیا کر" ہمارا اِنصاف اسے ناقص قرار دیتا ہے۔ اِس کے برخلاف قرآن کریم نے (اپنی) دُعاء میں روٹی اور پانی کا ذکر کرنا ناپسند کیا ہے اور ہمیں رُشد و ہدایت کا طریق سکھایا ہے اور اس بات کی طرف ترغیب دی ہے کہ ہم اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہیں اور اللہ تعالیٰ سے دینِ قویم طلب کریں اور مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ اور ضَآلِّیْن کی راہوں سے اُس کی پناہ مانگیں۔ اِس دُعاء میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ دُنیا اور آخرت کی راحت صحیح راہ کی تلاش اور مُخلصانہ فرمانبرداری پر مُنحصر ہے۔ پس انجیل کی دعاء پر بھی نگاہ ڈالو اور قرآن کی دُعاء پر بھی جو اللہ جلّ شانُہٗ کی طرف سے ہے اور انصاف کرو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا میں استغفار کے متعلق جو ترغیب آئی ہے وہ بھی (دراصل) بے قراروں کی طرح صرف روٹی مانگنے کی دُعاء کرنے کی تاکید ہی ہے تا اللہ تعالیٰ رحم کرے اور اس اقرار (گناہ) کے بدلہ میں بہت سی روٹیاں دیدے پس (ان کا) استغفار بھی صرف روٹیاں مانگنے کی خاطر آہ و زاری ہے۔ اصل مقصد خدائے بخشندہ سے روٹی مانگنا ہی ہے۔ (انجیل کی) اس دُعاء سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اکثر پیروکار ہمیشہ سے سونے چاندی کے ہی عاشق ہیں اور وہ سونے چاندی کی خاطر خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ چند سکّوں کی خاطر دین کو بیچ ڈالتے ہیں اور چاندی سونے کے سکّوں کو ہی اپنے کپڑوں میں چھپائے پھرتے ہیں اور رحم کرنے والے

وَالْعَاشِقِيْنَ عَاصِيْنَ۔ وَحُبِّبَ اِلَيْهِمْ اَنْ يَّتَّخِذُوا الطَّمَعَ شِرْعَةً وَّحُبَّ الدُّنْيَا نُجْعَةً فَاسْتَشْرِفِ الْاَنَاجِيْلَ لِيَظْهَرَ عَلَيْكَ صِدْقُ مَا قِيْلَ وَاتَّقِ الرَّبَّ الْجَلِيْلَ وَدَعِ الْاَقَاوِيْلَ۔

(کرامات الصادقین صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۲)

سورۃ فاتحہ کے لطائف

پھر اس طرف خیال کرنا چاہیئے کہ علاوہ اِن سچائیوں کے اور اِن مکمل ایمانات کے دوسرے کیا کیا لطائف ہیں جو اِس سورۃ مبارکہ میں بھرے ہوئے ہیں اگر ہم اِس جگہ اُن سب لطائف کو بیان کریں تو یہ مضمون ایک دفتر بن جائیگا صرف چند لطیفے بطور نمونہ بیان کیے جاتے ہیں۔

اوّل یہ لطیفہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اِس سورۃ فاتحہ میں دعا کرنے کا ایسا طریقہ حسنہ بتلایا ہے جس سے بہتر طریقہ پیدا ہونا ممکن نہیں اور جس میں وہ تمام امور جمع ہیں جو دعائیں دلی جوش پیدا کرنے کے لیے نہایت ضروری ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ قبولیت دعا کے لیے ضرور ہے کہ اُس میں ایک جوش ہو کیونکہ جن دعاؤں میں جوش نہ ہو وہ صرف لفظی بڑبڑ ہے حقیقی دعائیں نہیں مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ دعاؤں میں جوش پیدا ہونا ہر یک وقت انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ انسان کے لیے اشد ضرورت ہے کہ دعا کرنے کے وقت جو امور دلی جوش کے محرک ہیں وہ اُس کے خیال میں حاضر ہوں اور یہ بات ہر یک عاقل پر روشن ہے کہ دلی جوش پیدا کرنے والی صرف دو ہی چیزیں ہیں ایک خدا کو کامل اور قادر اور جامع صفات کاملہ خیال کر کے اُس کی رحمتوں اور کرموں کو ابتدا سے انتہا تک اپنے وجود اور بقا کے لیے ضروری دیکھنا اور تمام فیوض کا مبدء اُسی کو خیال کرنا۔ دوسرے اپنے تئیں اور اپنے تمام ہم جنسوں کو عاجز اور مفلس اور خدا کی مدد کا محتاج یقین کرنا یہی دو امر ہیں جن سے دعاؤں میں جوش پیدا ہوتا ہے اور جو جوش دلانے کے لیے کامل ذریعے ہیں وجہ یہ کہ انسان کی دعائیں تب ہی جوش پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے تئیں سراسر ضعیف اور ناتوان اور مدد الٰہی کا محتاج دیکھتا ہے اور خدا کی نسبت نہایت قوی اعتقاد سے یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ بغایت درجہ کامل القدرت اور رب العالمین اور رحمان اور رحیم اور مالک الامر مجازات ہے اور جو کچھ انسان کی حاجتیں ہیں سب

رب کے دامن کے تدارک ہیں اس حال میں کہ مقید و تاہ حال ہیں سو انہیں اسی بات کا شوق دلایا گیا ہے کہ وہ طمع کو اپنا طریق قرار دے لیں اور دنیا کی محبت کو اپنا مقصود بنا لیں پس انا جیل کا مطالعہ کرو تا آپ پر ہمارے قول کی صداقت ظاہر ہو جائے اور اللہ جل شانہ سے ڈرو اور دوسری باتوں کو چھوڑ دو۔

کا پورا کرنا اُسی کے ہاتھ میں ہے سو سورۃ فاتحہ کے ابتدا میں جو اللہ تعالیٰ کی نسبت بیان فرمایا گیا ہے کہ وہی ایک ذات ہے کہ جو تمام محامد کاملہ سے متصف اور تمام خوبیوں کی جامع ہے اور وہی ایک ذات ہے جو تمام عالموں کی رب اور تمام رحمتوں کا چشمہ اور سب کو اُن کے عملوں کا بدلہ دینے والی ہے پس ان صفات کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نے بخوبی ظاہر فرما دیا کہ سب قدرت اُسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر یک فیض اُسی کی طرف سے ہے اور اپنی اس قدر عظمت بیان کی کہ دنیا اور آخرت کے کاموں کا قاضی الحاجات اور ہر یک چیز کا علت العلل اور ہر یک فیض کا مبدء اپنی ذات کو ٹھہرایا جس میں یہ بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ اُس کی ذات کے بغیر اور اُس کی رحمت کے بدوں کسی زندہ کی زندگی اور آرام اور راحت ممکن نہیں اور پھر بندہ کو تذلل کی تعلیم دی اور فرمایا اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اے مبدء تمام فیوض ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں یعنی ہم عاجز ہیں آپ سے کچھ بھی نہیں کر سکتے جب تک تیری توفیق اور تائید شامل حال نہ ہو پس خدا تعالیٰ نے دُعا میں جوش دلانے کے لیے دو محرک بیان فرمائے ایک اپنی عظمت اور رحمت شاملہ دوسرے بندوں کا عاجز اور ذلیل ہونا اب جاننا چاہیے کہ یہی دو محرک ہیں جن کا دُعا کے وقت خیال میں لانا دُعا کرنے والوں کے لیے نہایت ضروری ہے جو لوگ دُعا کی کیفیت سے کسی قدر چاشنی حاصل رکھتے ہیں انہیں خوب معلوم ہے کہ بغیر پیش ہونے ان دونوں محرکوں کے دُعا ہو ہی نہیں سکتی اور بجز اُن کے آتش شوقِ الٰہی دُعا میں اپنے شعلوں کو بلند نہیں کرتی یہ بات نہایت ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کی عظمت اور رحمت اور قدرتِ کاملہ کو یاد نہیں رکھتا وہ کسی طرح سے خدا کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور جو شخص اپنی عاجزی اور درماندگی اور مسکینی کا اقراری نہیں اُس کی روح اُس مولیٰ کریم کی طرف ہرگز جھک نہیں سکتی غرض یہ ایسی صداقت ہے جس کے سمجھنے کے لیے کوئی عمیق فلسفہ درکار نہیں بلکہ جب خدا کی عظمت اور اپنی ذلت اور عاجزی متحقق طور پر دل میں منتقش ہو تو وہ حالت خاصہ خود انسان کو سمجھا دیتی ہے کہ خالص دُعا کرنے کا یہی ذریعہ ہے سچے پرستار خوب سمجھتے ہیں کہ حقیقت میں انہیں دو چیزوں کا تصوّر دُعا کے لیے ضروری ہے یعنی اوّل اس بات کا تصوّر کہ خدائے تعالیٰ ہر یک قسم کی ربوبیت اور پرورش اور رحمت اور بدلہ دینے پر قادر ہے اور اُس کی یہ صفاتِ کاملہ ہمیشہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ دوسرے اس بات کا تصوّر کہ انسان بغیر توفیق اور تائیدِ الٰہی کے کسی چیز کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور بلاشبہ یہ دونوں تصوّر ایسے ہیں کہ جب دُعا کرنے کے وقت دل میں جم جاتے ہیں۔ تو یکایک انسان کی حالت کو ایسا تبدیل کر دیتے ہیں کہ ایک متکبر اُن سے متاثر ہو کر روتا ہوا زمین پر گر پڑتا ہے اور ایک گردن کش سخت دل کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں یہی کَل ہے جس سے ایک غافل مُردہ میں جان پڑ جاتی ہے انہیں دو باتوں کے تصوّر سے ہر یک دل دُعا کرنے کی طرف کھینچا جاتا ہے غرض یہی روحانی

وسیلہ ہے جس سے انسان کی روح رو بخدا ہوتی ہے اور اپنی کمزوری اور امدادِ ربانی پر نظر پڑتی ہے اسی کے ذریعہ سے انسان ایک ایسے عالمِ بیخودی میں پہنچ جاتا ہے جہاں اپنی مکدّر ہستی کا نشان باقی نہیں رہتا اور صرف ایک ذاتِ عظمیٰ کا جلال چمکتا ہوا نظر آتا ہے اور وہی ذاتِ رحمتِ کُل اور ہر یک ہستی کا ستون اور ہر یک درد کا چارہ اور ہر یک فیض کا مبدء دکھائی دیتی ہے آخر اس سے ایک صورت فنا فی اللہ کی ظہور پذیر ہو جاتی ہے جس کے ظہور سے نہ انسان مخلوق کی طرف مائل رہتا ہے نہ اپنے نفس کی طرف نہ اپنے ارادہ کی طرف اور بالکل خدا کی محبت میں کھویا جاتا ہے اور اُس ہستی حقیقی کی شہود سے اپنی اور دوسری مخلوق چیزوں کی ہستی کالعدم معلوم ہوتی ہے اس حالت کا نام خدا نے صراطِ مستقیم رکھا ہے جس کی طلب کے لیے بندہ کو تعلیم فرمایا اور کہا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ یعنی وہ راستہ فنا اور توحید اور محبتِ الٰہی کا جو آیاتِ مذکورۂ بالا سے مفہوم ہو رہا ہے وہ ہمیں عطا فرما اور اپنے غیر سے بکلّی منقطع کر خلاصہ یہ کہ خداتعالیٰ نے دعا میں جوش پیدا کرنے کے لیے وہ اسباب حقہ انسان کو عطا فرمائے کہ جو اس قدر دلی جوش پیدا کرتے ہیں کہ دُعا کرنیوالے کو خودی کے عالم سے بیخودی اور نیستی کے عالم میں پہنچا دیتے ہیں اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات ہرگز نہیں کہ سورۃ فاتحہ دعا کے کئی طریقوں میں سے ہدایت مانگنے کا ایک طریقہ ہے بلکہ جیسا کہ دلائل مذکورۂ بالا سے ثابت ہو چکا ہے در حقیقت صرف یہی ایک طریقہ ہے جس پر جوشِ دل سے دُعا کا صادر ہونا موقوف ہے اور جس پر طبیعت انسانی بمقتضا اپنے فطرتی تقاضا کے چلنا چاہتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جیسے خدا نے دوسرے اُمور میں قواعد مقررہ ٹھہرا رکھے ہیں ایسا ہی دُعا کے لیے بھی ایک قاعدہ خاص ہے اور وہ قاعدہ وہی محرّک ہیں جو سورۃ فاتحہ میں لکھے گئے ہیں اور ممکن نہیں کہ جب تک وہ دونوں محرّک کسی کے خیال میں نہ ہوں تب تک اُس کی دُعا میں جوش پیدا ہو سکے سو طبعی راستہ دعا مانگنے کا وہی ہے جو سورۃ فاتحہ میں ذکر ہو چکا ہے پس سورہ ممدوحہ کے لطائف میں سے یہ ایک نہایت عُمدہ لطیفہ ہے کہ دُعا کو معہ محرکات اس کے کے بیان کیا ہے فتدبر۔

پھر ایک دوسرا لطیفہ اس سورۃ میں یہ ہے کہ ہدایت کے قبول کرنے کے لیے پورے پورے اسباب ترغیب بیان فرمائے ہیں کیونکہ ترغیبِ کامل جو معقول طور پر دی جائے ایک زبردست کشش ہے اور حصر عقلی کے رو سے ترغیب کامل اُس ترغیب کا نام ہے جس میں تین جُزیں موجود ہوں ایک یہ کہ جس شے کی طرف ترغیب دینا منظور ہو اُس کی ذاتی خوبی بیان کی جائے سو اس جز کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ یعنی ہم کو وہ راستہ بتلا جو اپنی ذات میں صفتِ استقامت اور راستی سے موصوف ہے جس میں ذرا کجی نہیں سو اس آیت میں ذاتی خوبی اُس راستہ کی بیان فرما کر اُس کے حصول کے لیے ترغیب دی۔ دوسری جز ترغیب کی یہ ہے کہ جس شے کی طرف ترغیب دینا منظور ہو اُس شے کے فوائد بیان کیے جائیں سو اِس جُز کو اس آیت میں بیان فرمایا

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ یعنی اُس راستہ پر ہم کو چلا جس پر چلنے سے پہلے سالکوں پر انعام اور کرم ہو چکا ہے سو اِس آیت میں راستہ چلنے والوں کا کامیاب ہونا ذکر فرما کر اُس راستہ کا شوق دلایا تیسری جز ترغیب کی یہ ہے کہ جس شے کی طرف ترغیب دینا منظور ہو اُس شے کے چھوڑنے والوں کی خرابی اور بدحالی بیان کی جائے سو اِس جز کو اس آیت میں بیان فرمایا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ یعنی اُن لوگوں کی راہوں سے بچا جنھوں نے صراط مستقیم کو چھوڑا اور دوسری راہیں اختیار کیں اور غضب الٰہی میں پڑے اور گمراہ ہوئے سو اِس آیت میں اُس سیدھا راستہ چھوڑنے پر جو ضرر مترتب ہوتا ہے اُس سے آگاہ کیا غرض سورۃ فاتحہ میں ترغیب کی تینوں جزوں کو لطیف طور پر بیان کیا ذاتی خوبی بھی بیان کی فوائد بھی بیان کیے اور پھر اُس راہ کے چھوڑنے والوں کی ناکامی اور بدحالی بھی بیان فرمائی تا ذاتی خوبی کو سُن کر طبائع سلیمہ اُس کی طرف میل کریں اور فوائد پر اطلاع پا کر جو لوگ فوائد کے خواہاں ہیں اُن کے دلوں میں شوق پیدا ہو اور ترک کرنے کی خرابیاں معلوم کر کے اُس وبال سے ڈریں جو کہ ترک کرنے پر عائد حال ہوگا پس یہ بھی ایک کامل لطیفہ ہے جس کا التزام اِس صورت میں کیا گیا۔

پھر تیسرا لطیفہ اِس سورۃ میں یہ ہے کہ باوجود التزام فصاحت و بلاغت یہ کمال دکھلایا ہے کہ محامدِ الٰہیہ کے ذکر کرنے کے بعد جو فقرات دُعا وغیرہ کے بارہ میں لکھے ہیں اُن کو ایسے عُمدہ طور پر بطور لف و نشر مرتب کے بیان کیا ہے۔ جس کا صفائی سے بیان کرنا باوجود رعایت تمام مدارج فصاحت و بلاغت کے بہت مشکل ہوتا ہے اور جو لوگ سخن میں صاحبِ مذاق ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کے لف و نشر کیسا نازک اور دقیق کام ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اول محامدِ الٰہیہ میں فیوضِ اربعہ کا ذکر فرمایا کہ وہ ربّ العالمین ہے۔ رحمان ہے رحیم ہے۔ مالک یوم الدین ہے اور پھر بعد اس کے فقرات نعبد اور استعانت اور دُعا اور طلبِ جزا کو انہیں کے ذیل میں اِس لطافت سے لکھا ہے کہ جس فقرہ کو کسی قسم فیض سے نہایت مناسبت تھی اُسی کے نیچے وہ فقرہ درج کیا چنانچہ ربّ العالمین کے مقابلہ پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ لکھا کیونکہ ربوبیت سے استحقاق عبادت شروع ہو جاتا ہے پس اُسی کے نیچے اور اُسی کے محاذات میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا لکھنا نہایت موزوں اور مناسب ہے اور رحمان کے مقابلہ پر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ لکھا کیونکہ بندہ کے لیے اعانتِ الٰہی جو توفیقِ عبادت اور ہر یک اُس کے مطلوب میں ہوتی ہے جس پر اُس کی دُنیا اور آخرت کی صلاحیت موقوف ہے یہ اُس کے کسی عمل کا پاداش نہیں بلکہ محض صفت رحمانیت کا اثر ہے پس استعانت کو صفتِ رحمانیت سے بشدت مناسبت ہے اور رحیم کے مقابلہ پر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ لکھا کیونکہ دُعا ایک مجاہدہ اور کوشش ہے اور کوششوں پر جو ثمرہ مُترتّب ہوتا ہے وہ صفت رحیمیت کا اثر ہے۔ اور مالک یوم الدین کے مقابلہ پر صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ

وَلَا الضَّآلِّیْنَ لکھا کیونکہ امر مجازات مالک یوم الدین کے متعلق ہے سو ایسا فقرہ جس میں طلب انعام اور عذاب سے بچنے کی درخواست ہے اُسی کے نیچے رکھنا موزوں ہے۔

چوتھا لطیفہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ مجمل طور پر تمام مقاصد قرآن شریف پر مشتمل ہے گویا یہ سورۃ مقاصد قرآنیہ کا ایک ایجاز لطیف ہے اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ[1] یعنی ہم نے تجھے اے رسول سات آیتیں سورۃ فاتحہ کی عطا کی ہیں جو مجمل طور پر تمام مقاصد قرآنیہ پر مشتمل ہیں اور اُن کے مقابلہ پر قرآن عظیم بھی عطا فرمایا ہے جو مفصل طور پر مقاصد دینیہ کو ظاہر کرتا ہے اور اسی جہت سے اس سورۃ کا نام ام الکتاب اور سورۃ الجامع ہے۔ اُم الکتاب اس جہت سے کہ جمیع مقاصد قرآنیہ اُس سے مستخرج ہوتے ہیں اور سورۃ الجامع اس جہت سے کہ علوم قرآنیہ کے جمیع انواع پر بصورت اجمال مشتمل ہے اسی جہت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ جس نے سورۃ فاتحہ کو پڑھا گویا اُس نے سارے قرآن کو پڑھ لیا غرض قرآن شریف اور حدیث نبوی سے ثابت ہے کہ سورت فاتحہ ممدوحہ ایک آئینہ قرآن نما ہے۔ اس کی تصریح یہ ہے کہ قرآن شریف کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمام محامد کاملہ باری تعالیٰ کو بیان کرتا ہے اور اُس کی ذات کے لیے جو کمال تام حاصل ہے اُس کو بوضاحت بیان فرماتا ہے سو یہ مقصد اَلْحَمْدُ لِلّٰہ میں بطور اجمال آ گیا کیونکہ اُس کے یہ معنے ہیں کہ تمام محامد کاملہ اللہ کے لیے ثابت ہیں جو مستجمع جمیع کمالات اور مستحق جمیع عبادات ہے دوسرا مقصد قرآن شریف کا یہ ہے کہ وہ خدا کا صانع کامل ہونا اور خالق العالمین ہونا ظاہر کرتا ہے اور عالم کے ابتدا کا حال بیان فرماتا ہے اور جو دائرہ عالم میں داخل ہو چکا اُس کو مخلوق ٹھہراتا ہے اور اُن اُمور کے جو لوگ مخالف ہیں اُن کا کذب ثابت کرتا ہے سو یہ مقصد رب العالمین میں بطور اجمال آ گیا۔ تیسرا مقصد قرآن شریف کا خدا کا فیضان بلا استحقاق ثابت کرنا اور اُس کی رحمت عامہ کا بیان کرنا ہے سو یہ مقصد لفظ رحمان میں بطور اجمال آ گیا۔ چوتھا مقصد قرآن شریف کا خدا کا وہ فیضان ثابت کرنا ہے جو محنت اور کوشش پر مترتب ہوتا ہے سو یہ مقصد لفظ رحیم میں آ گیا۔ پانچواں مقصد قرآن شریف کا عالم معاد کی حقیقت بیان کرنا ہے سو یہ مقصد مالک یوم الدین میں آ گیا۔ چھٹا مقصد قرآن شریف کا اخلاص اور عبودیت اور تزکیہ نفس عن غیر اللہ اور علاج امراض روحانی اور اصلاح اخلاق ردیہ اور توحید فی العبادت کا بیان کرنا ہے سو یہ مقصد اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں بطور اجمال آ گیا۔ ساتواں مقصد قرآن شریف کا ہر یک کام میں فاعل حقیقی خدا کو ٹھہرانا اور تمام توفیق اور لطف اور نصرت اور ثبات علی الطاعت اور عصمت عن العصیان اور حصول جمیع اسباب خیر اور صلاحیت دنیا و دین اُسی کی طرف سے قرار دینا اور اُن تمام اُمور میں اُسی سے مدد چاہنے کے لیے تاکید کرنا سو یہ مقصد اِیَّاکَ

[1] الحجر ع ۶۔

نَسْتَعِیْنُ میں بطور اجمال آگیا۔ آٹھواں مقصد قرآن شریف کا صراط مستقیم کے دقائق کو بیان کرنا ہے اور پھر اُس کی طلب کے لیے تاکید کرنا کہ دعا اور تضرع سے اُس کو طلب کریں سو یہ مقصد اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں بطور اجمال کے آگیا۔ نواں مقصد قرآن شریف کا اُن لوگوں کا طریق و خلق بیان کرنا ہے جن پر خدا کا انعام و فضل ہوا تا طالبین حق کے دل جمعیت پکڑیں سو یہ مقصد صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ میں آگیا۔ دسواں مقصد قرآن شریف کا اُن لوگوں کا خلق و طریق بیان کرنا ہے جن پر خدا کا غضب ہوا۔ یا جو راستہ بھول کر انواع اقسام کی بدعتوں میں پڑ گئے تا حق کے طالب اُن کی راہوں سے ڈریں سو یہ مقصد غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں بطور اجمال آگیا ہے یہ مقاصد عشرہ ہیں جو قرآن شریف میں مندرج ہیں۔ جو تمام صداقتوں کا اصل الاصول ہیں سو یہ تمام مقاصد سورۂ فاتحہ میں بطور اجمال آگئے۔

پانچواں لطیفہ سورۂ فاتحہ میں یہ ہے کہ وہ اُس اتم اور اکمل تعلیم پر مشتمل ہے کہ جو طالب حق کے لیے ضروری ہے اور جو ترقیات قربت اور معرفت کے لیے کامل دستور العمل ہے کیونکہ ترقیات قربت کا شروع اُس نقطہ سیر سے ہے کہ جب سالک اپنے نفس پر ایک موت قبول کر کے اور سخت آزار کشی کو روا رکھ کر اُن تمام نفسانی خواہشوں سے خالصاً للہ دست کش ہو جائے کہ جو اُس میں اور اُس کے مولیٰ کریم میں جدائی ڈالتے ہیں اور اُس کے موتہ کو خدا کی طرف سے پھیر کر اپنی نفسانی لذات اور جذبات اور عادات اور خیالات اور ارادات اور نیز مخلوق کی طرف پھیرتے ہیں اور اُن کے خوفوں اور اُمیدوں میں گرفتار کرتے ہیں اور ترقیات کا اوسط درجہ وہ ہے کہ جو جو ابتدائی درجہ میں نفس کشی کے لیے تکالیف اُٹھانی پڑتی ہیں اور حالات معتادہ کو چھوڑ کر طرح طرح کے دکھ سہنے پڑتے ہیں وہ سب آلام صورت انعام میں ظاہر ہو جائیں اور بجائے مشقت کے لذت اور بجائے رنج کے راحت اور بجائے تنگی کے انشراح اور بشاشت محسوس ہو۔ اور ترقیات کا اعلیٰ درجہ وہ ہے کہ سالک اِس قدر خدا اور اُس کے ارادوں اور خواہشوں سے اتحاد اور محبت اور یک جہتی پیدا کر لے کہ اُس کا تمام اپنا عین و اثر جاتا رہے اور ذات اور صفات الٰہیہ بلا شائبہ ظلمت اور بلا توہم حالیت و محلیت اُس کے وجود آئینہ صفت میں منعکس ہو جائیں اور فنا اتم کے آئینہ کے ذریعہ سے جس نے سالک میں اور اُس کی نفسانی خواہشوں میں غایت درجہ کا بُعد ڈال دیا ہے انعکاس ربانی ذات اور صفات کا نہایت صفائی سے دکھائی دے۔ اِس تقریر میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس میں وجودیوں یا ویدانتیوں کے باطل خیال کی تائید ہو کیونکہ انہوں نے خالق اور مخلوق میں جو ابدی امتیاز ہے شناخت نہیں کیا اور اپنے کشوف مشتبہ کے دھوکہ سے کہ جو سلوک ناتمام کی حالت میں اکثر پیش آجاتے ہیں یا جو سودا انگیز ریاضتوں کا ایک نتیجہ ہوتا ہے سخت مغالطات کے پیچ میں پڑ گئے یا کسی نے سُکر اور بے خودی کی حالت میں جو ایک قسم کا جنون ہے اُس فرق کو نظر سے ساقط کر دیا

کہ جو خدا کی روح اور انسان کی روح میں باعتبار طاقتوں اور قوتوں اور کمالات اور تقدسات کے ہے ورنہ ظاہر ہے کہ قادرِ مطلق کہ جس کے علم قدیم سے ایک ذرہ مخفی نہیں اور جس کی طرف کوئی نقصان اور خسران عائد نہیں ہوسکتا اور جو ہر یک قسم کے جہل اور آلودگی اور ناتوانی اور غم اور حزن اور درد اور رنج اور گرفتاری سے پاک ہے وہ کیوں کر اُس چیز کا عین ہوسکتا ہے کہ جو اُن سب بلاؤں میں مُبتلا ہے۔ کیا انسان جس کی روحانی ترقیات کے لیے اِس قدر حالات منتظرہ ہیں جن کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا وہ اُس ذات صاحب کمال تام سے مشابہ یا اُس کا عین ہوسکتا ہے جس کے لیے کوئی حالتِ منتظرہ باقی نہیں؟ کیا جس کی ہستی فانی اور جس کی روح میں صریح مخلوقیت کے نقصان پائے جاتے ہیں وہ باوجود اپنی تمام آلائشوں اور کمزوریوں اور ناپاکیوں اور عیبوں اور نقصانوں کے اُس ذات جلیل الصفات سے برابر ہوسکتا ہے جو اپنی خوبیوں اور پاک صفتوں میں ازلی ابدی طور پر اتم اور اکمل ہے سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ[1]۔ بلکہ اِس تیسرے قسم کی ترقی سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ سالک خدا کی محبت میں ایسا فانی اور مستہلک ہوجاتا ہے اور اِس قدر ذاتِ بیچون و بیچگون اپنی تمام صفات کاملہ کے ساتھ اُس سے قریب ہوجاتی ہے کہ الوہیت کے تجلیات اُس کے نفسانی جذبات پر ایسے غالب آجاتے ہیں اور ایسے اُس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جو اس کو اپنے نفسانی جذبات سے بلکہ ہر یک سے جو نفسانی جذبات کا تابع ہو مغائرت کلّی اور عداوت ذاتی پیدا ہوجاتی ہے اور اِس میں اور قسم دوم کی ترقی میں فرق یہ ہے کہ گو قسم دوم میں بھی اپنے ربّ کی مرضی سے موافقت تامّہ پیدا ہوجاتی ہے اور اُس کا ایلام بصورتِ انعام نظر آتا ہے مگر ہنوز اس میں ایسا تعلق باللہ نہیں ہوتا کہ جو ماسوی اللہ کے ساتھ عداوتِ ذاتی پیدا ہوجانے کا موجب ہو اور جس سے محبّتِ الٰہی صرف دِل کا مقصد ہی نہ رہے بلکہ دل کی سرشت بھی ہوجائے۔ غرض قسم دوم کی ترقی میں خدا سے موافقت تامہ کرنا اور اُس کے غیر سے عداوت رکھنا سالک کا مقصد ہوتا ہے اور اُس مقصد کے حصول سے وہ لذّت پاتا ہے لیکن قسم سوم کی ترقی میں خدا سے موافقتِ تامہ اور اُس کے غیر سے عداوت خود سالک کی سرشت ہوجاتی ہے جس سرشت کو وہ کسی حالت میں چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ انفکاک الشئ عن نفسہٖ محال ہے برخلاف قسمِ دوم کے کہ اُس میں انفکاک جائز ہے اور جب تک ولائیت کسی ولی کی قسمِ سوم تک نہیں پہنچتی عارضی ہے اور خطرات سے امن میں نہیں وجہ یہ کہ جب تک انسان کی سرشت میں خدا کی محبّت اور اُس کے غیر کی عداوت داخل نہیں تب تک کچھ رگ و ریشہ ظلم کا اُس میں باقی ہے کیونکہ اُس نے حق ربوبیّت کو جیسا کہ چاہیئے تھا ادا نہیں کیا اور لقاءِ تام حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہے لیکن جب اِس کی سرشت میں محبّتِ الٰہی اور موافقتِ باللہ بخوبی داخل ہوگئی یہاں تک کہ خدا اُس کے کان ہوگیا جن سے وہ سُنتا ہے اور اُس کی آنکھیں ہوگیا جن سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کا ہاتھ ہوگیا جس سے وہ پکڑتا ہے اور اُس کا پاؤں ہوگیا جس سے وہ چلتا ہے تو پھر کوئی ظلم اُس میں باقی نہ رہا اور ہر یک خطرہ سے امن

---

[1] الانعام۔ ع۔ ۱۲۔

میں آگیا۔ اسی درجہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ[1]

اب سمجھنا چاہیئے کہ یہ ترقیات ثلاثہ کہ جو تمام علوم و معارف کا اصل الاصول بلکہ تمام دین کا لب لباب ہے۔ سورۃ فاتحہ میں بتمامتر خوبی و رعایت ایجاز و خوش اسلوبی بیان کیے گئے ہیں چنانچہ پہلی ترقی کہ جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لیے اول قدم ہے اس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ کیونکہ ہریک قسم کی کجی اور بے راہی سے باز آکر اور بالکل رو بخدا ہو کر راہ راست کو اختیار کرنا یہ وہی سخت گھاٹی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں فنا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ امور مالوفہ اور معتادہ کو یک لخت چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشوں کو جو ایک عمر سے عادت ہو چکی ہے یک دفعہ ترک کرنا اور ہریک ننگ اور ناموس اور عجب اور ریا سے منہ پھیر کر اور تمام ماسوا اللہ کو کالعدم سمجھ کر سیدھا خدا کی طرف رُخ کر لینا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو موت کے برابر ہے اور یہ موت روحانی پیدائش کا مدار ہے اور جیسے دانہ جب تک خاک میں نہیں ملتا اور اپنی صورت کو نہیں چھوڑتا تب تک نیا دانہ وجود میں آنا غیر ممکن ہے اسی طرح روحانی پیدائش کا جسم اس فنا سے طیار ہوتا ہے جوں جوں بندہ کا نفس شکست پکڑتا جاتا ہے اور اُس کا فعل اور ارادت اور رو بخلق ہونا فنا ہوتا جاتا ہے توں توں پیدائش روحانی کے اعضا بنتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب فناء اتم حاصل ہو جاتی ہے تو وجود ثانی کی خلعت عطا کی جاتی ہے اور ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[2] کا وقت آجاتا ہے اور چونکہ یہ فناء اتم بغیر نصرت و توفیق و توجہ خاص قادر مطلق کے ممکن نہیں اس لیے یہ دعا تعلیم کی لِیے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ جس کے یہ معنے ہیں کہ اے خدا ہم کو راہ راست پر قائم کر اور ہریک طور کی کجی اور بے راہی سے نجات بخش۔ اور یہ کامل استقامت اور راست روی جس کو طلب کرنے کا حکم ہے نہایت سخت کام ہے اور اول دفعہ میں اس کا حملہ سالک پر ایک شیر ببر کی طرح ہے جس کے سامنے موت نظر آتی ہے پس اگر سالک ٹھہر گیا اور اُس موت کو قبول کر لیا تو پھر بعد اس کے کوئی اسے سخت موت نہیں اور خدا اس سے زیادہ تر کریم ہے کہ پھر اُس کو یہ جلتا ہوا دوزخ دکھا دے۔ غرض یہ کامل استقامت وہ فنا ہے کہ جس سے کارخانہ وجود بندہ کو بکلی شکست پہنچتی ہے اور ہوا اور شہوت اور ارادت اور ہریک خود روی کے فعل سے بیکبارگی دستکش ہونا پڑتا ہے اور یہ مرتبہ سیر و سلوک کے مراتب میں سے وہ مرتبہ ہے جس میں انسانی کوششوں کا بہت کچھ دخل ہے اور بشری مجاہدات کی بخوبی پیش رفت ہے اور اسی حد تک اولیاء اللہ کی کوششیں اور سالکین کی محنتیں ختم ہو جاتیں ہیں اور پھر بعد اس کے خاص مواہب سماوی ہیں جن میں بشری کوششوں کو کچھ دخل نہیں

---

[1] الانعام۔ ع ۹ ، [2] المومنون۔ ع ۱۔

بلکہ خود خدائے تعالیٰ کی طرف سے عجائبات سماوی کی سیر کرانے کے لیے غیبی سواری اور آسمانی بُراق عطا ہوتا ہے۔
اور دوسری ترقی کہ جو قُربت کے میدانوں میں چلنے کے لیے دوسرا قدم ہے اِس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔یعنی ہم کو اُن لوگوں کا راہ دکھلا جن پر تیرا انعام اکرام ہے اِس جگہ واضح رہے کہ جو لوگ منعم علیہم ہیں اور خدا سے ظاہری و باطنی نعمتیں پاتے ہیں شدائد سے خالی نہیں ہیں بلکہ اِس دارالابتلا میں ایسی ایسی شدّتیں اور صعوبتیں اُن کو پہنچتی ہیں کہ اگر وہ کسی دوسرے کو پہنچتیں تو مدد ایمانی اُس کی منقطع ہو جاتی۔ لیکن اِس جہت سے اُن کا نام منعم علیہم رکھا گیا ہے کہ وہ بباعث غلبۂ محبت آلام کو برنگ انعام دیکھتے ہیں اور ہر یک رنج یا راحت جو دوست حقیقی کی طرف سے اُن کو پہنچتی ہے بوجہ مستی عشق اُس سے لذت اُٹھاتے ہیں پس یہ ترقی فی القرب کی دوسری قسم ہے جس میں اپنے محبوب کے جمیع افعال سے لذت آتی ہے اور جو کچھ اُس کی طرف سے پہنچے انعام ہی انعام نظر آتا ہے اور اصل موجب اِس حالت کا ایک محبتِ کامل اور تعلق صادق ہوتا ہے جو اپنے محبوب سے ہو جاتا ہے اور یہ ایک موہبت خاص ہوتی ہے جس میں حیلہ اور تدبیر کو کچھ دخل نہیں بلکہ خدا ہی کی طرف سے آتی ہے اور جب آتی ہے تو پھر سالک ایک دوسرا رنگ پکڑ لیتا ہے اور تمام بوجھ اُس کے سر سے اُتارے جاتے ہیں اور ہر یک ایلام انعام ہی معلوم ہوتا ہے اور شکوہ اور شکایت کا نشان نہیں ہوتا پس یہ حالت ایسی ہوتی ہے کہ گویا انسان بعد موت کے زندہ کیا گیا ہے کیونکہ اُن تلخیوں سے بکلّی نکل آتا ہے جو پہلے درجہ میں تھیں جن سے ہر یک وقت موت کا سامنا معلوم ہوتا تھا مگر اب چاروں طرف سے انعام ہی انعام پاتا ہے اور اسی جہت سے اُس کی حالت کے مناسب حال یہی تھا کہ اُس کا نام منعم علیہ رکھا جاتا اور دوسرے لفظوں میں اِس حالت کا نام بقا ہے کیونکہ سالک اِس حالت میں اپنے تئیں ایسا پاتا ہے کہ گویا وہ مرا ہوا تھا اور اب زندہ ہو گیا اور اپنے نفس میں بڑی خوش حالی اور انشراح صدر دیکھتا ہے اور بشریت کے انقباض سب دور ہو جاتے ہیں اور الوہیت کے مربیانہ انوار نعمت کی طرح برستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اسی مرتبہ میں سالک پر ہر یک نعمت کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور عنایاتِ الٰہیہ کامل طور پر متوجہ ہوتی ہیں اور اِس مرتبہ کا نام سیر فی اللہ ہے کیونکہ اِس مرتبہ میں ربوبیت کے عجائبات سالک پر کھولے جاتے ہیں اور جو ربّانی نعمتیں دوسروں سے مخفی ہیں اُن کا اُس کو سیر کرایا جاتا ہے۔ کشوفِ صادقہ سے متمتع ہوتا ہے اور مخاطبات حضرتِ احدیت سے سرفرازی پاتا ہے اور عالمِ ثانی کے باریک بھیدوں سے مطلع کیا جاتا ہے اور علوم اور معارف سے وافر حصہ دیا جاتا ہے غرض ظاہری اور باطنی نعمتوں سے بہت کچھ اُس کو عطا کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اُس درجۂ یقین کامل تک پہنچتا ہے کہ گویا مدبر حقیقی کو بچشم خود دیکھتا ہے سو اِس طور کی اطلاع کامل جو اسرارِ سماوی ہیں

اُس کو بخشے جاتے ہیں اِس کا نام سیر فی اللہ ہے لیکن یہ وہ مرتبہ ہے جس میں محبّتِ الٰہی انسان کو دی تو جاتی ہے لیکن بطریقِ طبیعت اُس میں قائم نہیں کی جاتی یعنی اُس کی سرشت میں داخل نہیں ہوتی بلکہ اُس میں محفوظ ہوتی ہے۔

اور تیسری ترقی جو قربت کے میدانوں میں چلنے کے لیے انتہائی قدم ہے اِس آیت میں تعلیم کی گئی ہے جو فرمایا ہے۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں انسان کو خدا کی محبت اور اُس کے غیر کی عداوت سرشت میں داخل ہو جاتی ہے اور بطریقِ طبیعت اُس میں قیام پکڑتی ہے اور صاحب اِس مرتبہ کا اخلاقِ الٰہیہ سے ایسا ہی بالطبع پیار کرتا ہے کہ جیسے وہ اخلاق حضرتِ احدیّت میں محبوب ہیں اور محبّتِ ذاتی حضرت خداوندِ کریم کی اِس قدر اُس کے دل میں آمیزش کر جاتی ہے کہ اُس کے دل سے محبّتِ الٰہی کا منفک ہونا مستحیل اور ممتنع ہوتا ہے اور اگر اُس کے دل کو اور اُس کی جان کو بڑے بڑے امتحانوں اور ابتلاؤں کے سخت صدمات کے پیچ میں دے کر کوفتہ کیا جائے اور نچوڑا جائے تو بجز محبّتِ الٰہیہ کے اَور کچھ اُس کے دل اور جان سے نہیں نکلتا اُسی کے درد سے لذّت پاتا ہے اور اُسی کو واقعی اور حقیقی طور پر اپنا دلارام سمجھتا ہے یہ وہ مقام ہے جس میں تمام ترقیاتِ قُرب ختم ہو جاتی ہیں اور انسان اپنے اُس انتہائی کمال کو پہنچ جاتا ہے کہ جو فطرتِ بشری کے لیے مقدّر ہے۔

یہ لطائف خمسہ ہیں کہ جو بطور نمونہ مشتے از خروارے ہم نے لکھے ہیں مگر عجائباتِ معنوی اِس صورت میں اور نیز دوسرے حقائق و معارف اِس قدر ہیں کہ اگر اُن کا عشر عشیر بھی لکھا جائے تو اُس کے لکھنے کے لیے ایک بڑی کتاب چاہیئے۔ اور جو اس سورہ مبارکہ میں خواص روحانی ہیں وہ بھی ایسے اعلیٰ و حیرت انگیز ہیں جن کو طالبِ حق دیکھ کر اِس بات کے اقرار کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ بلاشبہ وہ قادرِ مطلق کا کلام ہے۔

(براہین احمدیہ حاشیہ نمبر ۱۱۔ صفحہ ۵۲۴-۵۲۶)

تمّت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تفسیر سُورۃ البقرۃ

بَیَانْ فرمُودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

خلاصہ مضمون: اِس سورۃ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بہت تفصیل ہے اور امر ونہی کھول کر بیان کیا گیا ہے اور صبر اور ایثار کی بہت تاکید ہے۔

مکتوبات جلد پنجم، نمبر پنجم صفحہ ۱۵۰
(مکتوب ۴۲ بنام حضرت منشی عبداللہ صاحب سنوری رضی اللہ عنہ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ

اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ

آیاتِ مندرجہ بالا میں پہلے اِس آیت پر یعنی الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ پر غور کرنا چاہیئے کہ کس لطافت اور خوبی اور رعایتِ ایجاد سے خدائے تعالیٰ نے وسوسۂ مذکور[1] کا جواب دیا ہے اوّل قرآن شریف کے نزول کی علّتِ فاعلی بیان کی اور اُس کی عظمت اور بزرگی کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا الٓمّٓ میں خدا ہوں جو سب سے زیادہ جانتا ہوں یعنی نازل کنندہ اِس کتاب کا مَیں ہوں جو علیم و حکیم ہوں جس کے علم کے برابر کسی کا علم نہیں پھر بعد اس کے علّتِ مادی قرآن کے بیان میں فرمائی اور اُس کی عظمت کی طرف اشارہ فرمایا اور کہا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ وہ کتاب ہے یعنی ایسی عظیم الشان اور عالی مرتبت کتاب ہے جس کی علّتِ مادی علمِ الٰہی ہے یعنی جس کی نسبت ثابت ہے کہ اس کا منبع اور چشمہ ذاتِ قدیم حضرت حکیمِ مطلق ہے اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے وہ کا لفظ اختیار کرنے سے جو بُعد اور دُوری کے لیے آتا ہے اِس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ کتاب اُس ذاتِ عالی صفات کے علم سے ظہور پذیر ہے جو اپنی ذات میں بے مثل و مانند ہے جس کے علومِ کاملہ و اسرارِ دقیقہ نظرِ انسانی کی حدِّ جولان سے بہت بعید اور دُور ہیں پھر بعد اس کے علّتِ صُوری کا قابلِ تعریف ہونا ظاہر فرمایا اور کہا لَا رَیْبَ فِیْهِ یعنی قرآن اپنی ذات میں ایسی صورتِ مدلّل و معقول پر واقعہ ہے کہ کسی نوع کے شک کرنے کی اُس میں گنجائش نہیں یعنی وہ دوسری کتابوں کی طرح بطور کتھا اور کہانی کے نہیں بلکہ ادلّۂ یقینیہ و براہینِ قطعیہ پر مشتمل ہے اور اپنے مطالب پر حُججِ بیّنہ اور دلائلِ شافیہ بیان کرتا ہے اور فی نفسہٖ ایک معجزہ ہے جو شکوک اور شُبہات کے دُور کرنے میں سیفِ قاطع کا حکم رکھتا ہے اور خداشناسی کے بارہ میں صرف ہونا چاہیئے کے ظنّی مرتبہ میں نہیں چھوڑتا بلکہ ہے کے یقینی اور قطعی مرتبہ تک پُہنچاتا ہے۔ یہ تو عللِ ثلاثہ کی عظمت کا بیان فرمایا اور پھر باوجود عظیم الشّان ہونے اِن ہر سہ علّتوں کے جن کو تاثیر اور اصلاح میں دخلِ عظیم ہے۔ علّتِ رابعہ یعنی علّتِ غائی نزولِ قرآن شریف کو جو رہنمائی اور ہدایت ہے صرف متّقین میں مُنحصر کر دیا اور فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی یہ کتاب صرف اُن جواہرِ قابلہ کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے جو بوجہ پاک باطنی و عقلِ سلیم و فہمِ مستقیم و شوقِ طلبِ حق و نیّتِ صحیح انجام کار درجۂ ایمان و خداشناسی و تقویٰ کامل پر پُہنچ جائیں گے یعنی جن کو خدا اپنے علمِ قدیم سے جانتا ہے کہ اُن کی فطرت اِس ہدایت کے مناسب حال واقعہ ہے اور وہ معارفِ حقّانی میں ترقّی کر سکتے ہیں وہ بالآخر اِس کتاب سے ہدایت پا جائیں گے اور بہرحال یہ کتاب اُن کو پُہنچ رہے گی اور قبل اس کے جو وہ مریں خدا اُن کو راہِ راست پر آنے کی توفیق دے دیگا۔ اب دیکھو اس جگہ خدائے تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کے علم میں ہدایت پانے کے لائق ہیں اور اپنی اصل فطرت میں صفتِ

---

[1] وسوسۂ مذکور سے مراد برہمو سماج والوں کا یہ وسوسہ ہے کہ اگر کامل معرفت قرآن پر ہی موقوف ہے تو پھر خدا نے اس کو تمام ملکوں میں اور تمام معمورات قدیم و جدید میں کیوں شائع نہ کیا اور کیوں کروڑہا مخلوقات کو اپنی معرفت کاملہ اور اعتقادِ صحیح سے محروم رکھا۔ (مرتب)

تقویٰ سے متصف ہیں وہ ضرور ہدایت پا جائیں گے اور پھر اُن آیات میں جو اس آیت کے بعد میں لکھی گئی ہیں اسی کی زیادہ تر تفصیل کر دی اور فرمایا کہ جس قدر لوگ (خدا کے علم میں) ایمان لانے والے ہیں وہ اگرچہ ہنوز مسلمانوں میں شامل نہیں ہوئے پر آہستہ آہستہ سب شامل ہو جائیں گے اور وہی لوگ باہر رہ جائیں گے جن کو خدا خوب جانتا ہے کہ طریقۂ حقّہ اسلام قبول نہیں کریں گے اور گو اُن کو نصیحت کی جائے یا نہ کی جائے ایمان نہیں لائیں گے یا مراتب کاملہ تقویٰ و معرفت تک نہیں پہنچیں گے غرض ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے کھول کر بتلا دیا کہ ہدایتِ قرآنی سے صرف متّقی منتفع ہو سکتے ہیں جن کی اصل فطرت میں غلبہ کسی ظلمتِ نفسانی کا نہیں اور یہ ہدایت ان تک ضرور پہنچ رہے گی لیکن جو لوگ متّقی نہیں ہیں نہ وہ ہدایتِ قرآنی سے کچھ نفع اُٹھاتے ہیں اور نہ یہ ضرور ہے کہ خواہ نخواہ اُن تک ہدایت پہنچ جائے۔" (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۸۴ تا صفحہ ۱۸۶ حاشیہ نمبر ۱۱)

"جب تک کسی کتاب کے علل اربعہ کامل نہ ہوں وہ کتاب کامل نہیں کہلا سکتی اس لیے خدا تعالیٰ نے ان آیات میں قرآن شریف کے علل اربعہ کا ذکر فرما دیا ہے اور وہ چار ہیں (۱) علت فاعلی (۲) علت مادّی (۳) علت صوری (۴) علت غائی۔ اور ہر چہار کامل درجہ پر ہیں پس الٓمّٓ علت فاعلی کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے معنی ہیں اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ یعنی کہ میں جو خدا ئے عالم الغیب ہوں میں نے اس کتاب کو اُتارا ہے پس چونکہ خدا اس کتاب کی علت فاعلی ہے اس لیے اس کتاب کا فاعل ہر ایک فاعل سے زبردست اور کامل ہے۔ اور علت مادّی کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ فقرہ کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس نے خدا کے علم سے خلعت وجود پہنا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کا علم تمام علوم سے کامل تر ہے اور علت صوری کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ فقرہ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ یعنی یہ کتاب ہر ایک غلطی اور شک و شبہ سے پاک ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ جو کتاب خدا تعالیٰ کے علم سے نکلی ہے وہ اپنی صحت اور ہر ایک عیب سے مبرّا ہونے میں بے مثل و بے مانند ہے اور لاریب ہونے میں اکمل اور اتم ہے اور علت غائی کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ فقرہ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی یہ کتاب ہدایت کامل متقین کے لیے ہے اور جہاں تک انسانی سرشت کے لیے زیادہ سے زیادہ ہدایت ہو سکے وہ اس کتاب کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔" (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۳-۱۳۴ حاشیہ)

"اللہ جل شانہ نے قرآن کریم کے نزول کی علت غائی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ قرار دی ہے اور قرآن کریم سے رشد اور ہدایت اور فیض حاصل کرنے والے بالتخصیص متقیوں کو ہی ٹھہرایا ہے۔ جیساکہ وہ فرماتا ہے الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔" (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۹-۱۴۰)

جس شخص کو ایک ذرہ سی بصیرت بھی حاصل ہے وہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب سلسلہ تحقیق اور تدقیق کا اُس حد تک پہنچ جائے کہ حقیقت واقعی بکلّی منکشف ہو جائے اور چاروں طرف سے دلائل واضحہ اور شواہد قاطعہ آفتاب کی طرح چمکتے ہوئے نکل آویں تو امر تنقیح اور تفتیش کا وہیں ختم ہو جاتا ہے اور طالب حق کو اُسی جگہ مضبوطی سے قدم مارنا پڑتا ہے اور انسان کو بجز ماننے اُس کے کچھ بن نہیں پڑتا اور خود ظاہر ہے کہ جب مکمّل ثبوت ہاتھ میں آگیا اور ہر ایک گوشۂ امر مبحوث عنہ کا

صبح صادق کی طرح کھل گیا اور حق الامر کا چہرہ بکمال صفائی نمودار ہوگیا تو پھر کیوں دانشمند اور صحیح الحواس انسان اُس
میں شک کرے اور کیا وجہ کہ سلیم العقل انسان کا دل پھر بھی اُس پر تسلّی نہ پکڑے ہاں جب تک امکان غلطی باقی ہے اور بصفائی
تمام انکشاف نہیں ہوا تب تک غور اور فکر کا گھوڑا آگے سے آگے دوڑ سکتا ہے اور نظر ثانی در نظر ثانی ہو سکتی ہے نہ یہ کہ
ثابت شدہ صداقت میں بھی وہمیوں کی طرح شک کر کے بیہودہ وساوس میں پڑتے جائیں اِس کا نام خیالات کی ترقی نہیں
یہ تو مادۂ سودا کی ترقی ہے جس شخص پر ایک امر کے جواز یا عدم جواز کی نسبت حال واقعی اظہر من الشمس ہوگیا تو پھر کیا وہ
مدہوش یا دیوانہ ہے کہ باوصف اس انکشاف تام کے پھر بھی اپنے دل میں یہ سوال کرے کہ شاید جس امر کو میں ناجائز سمجھتا ہوں
وہ جائز ہی ہو یا جس کو میں جائز قرار دیتا ہوں وہ حقیقت میں ناجائز ہو البتّہ ایسے سوالات اُس وقت پیش آسکتے تھے
اور ایسے وساوس اُس حالت میں دلوں میں اُٹھ سکتے تھے کہ جب سارا مدار قیاسات عقلیہ پر ہوتا اور عقل انسانی برہمو سماج
والوں کی عقل کی طرح اپنے دوسرے رفیق کے اتّفاق اور اشتمال سے محروم اور بے نصیب ہوتی لیکن الہام حقیقی
کے تابعین کی عقل ایسی غریب اور بے کس نہیں بلکہ اُس کا ممد و معاون خدا کا کلام کامل ہے جو سلسلہ تحقیقات کو اپنے
مرکزِ اصلی تک پہنچاتا ہے اور وہ مرتبہ یقین اور معرفت کا بخشتا ہے کہ جس کے آگے قدم رکھنے کی گنجایش ہی نہیں کیونکہ
ایک طرف تو دلائلِ عقلیہ کو باستیفا بیان کرتا ہے اور دوسری طرف خود وہ بے مثل و مانند ہونے کی وجہ سے خدا اور
اُس کی ہدایتوں پر یقین لانے کے لیے حجت قاطعہ ہے سو اس دوہرے ثبوت سے جس قدر طالب حق کو مرتبہ حق الیقین
حاصل ہوتا ہے اُس مرتبہ کا قدر وہی شخص جانتا ہے کہ جو سچّے دل سے خدا کو ڈھونڈتا ہے اور وہی اُس کو جانتا ہے کہ
جو روح کی سچائی سے خدا کا طالب ہے لیکن برہمو سماج والے جن کا یہ اُصول ہے کہ ایسی کوئی کتاب یا ایسا کوئی انسان
نہیں جس میں غلطی کا امکان نہ ہو کیونکہ اِس مرتبہ یقین تک پہنچ سکتے ہیں جب تک اِس شیطانی اُصول سے توبہ کر کے یقینی
راہ کے طالب نہ ہوں کیونکہ جس حالت میں اب تک برہمو سماج والوں کو خود باقرار اُن کے ایسی کوئی کتاب نہیں ملی اور
نہ اُنہوں نے آپ بنائی کہ جو ایسے مسائل کا مجموعہ ہو کہ جو غلطی سے خالی ہوں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اب تک ایمان
اُن کا ورطہ شبہات میں ڈوبتا پھرتا ہے اور یہ اُصول اُن کا صاف دلالت کرتا ہے کہ اُن کو خداشناسی کے مسائل میں سے
کسی مسئلہ پر یقین حاصل نہیں اور اُن کے نزدیک یہ بات محالات میں سے ہے کہ کوئی کتاب علم دین میں صحیح مسائل کا مجموعہ
ہو بلکہ اُنہوں نے تو علانیہ یہ رائے ظاہر کر دی ہے کہ گو کوئی کتاب ایسی ہو کہ جو سراسر خدا کی ہستی کی قائل اور اس کو واحد
لاشریک اور قادر اور خالق اور عالم الغیب اور حکیم اور رحمان اور رحیم اور دوسری صفات کاملہ سے یاد کرتی ہو اور
حدوث اور فنا اور تغیر اور تبدّل اور شرکت غیر وغیرہ امور ناقصہ سے پاک اور برتر سمجھتی ہو مگر تب بھی وہ کتاب اُن کے
نزدیک غلطی کے امکان سے خالی نہیں اور اس لائق نہیں کہ جو اُس پر یقین کیا جائے اور اسی وجہ سے یہ لوگ قرآن شریف
سے بھی انکار کر رہے ہیں اب دیکھو کہ اُن کے دین و ایمان کا اُنہیں کے اقرار سے یہ خلاصہ نکلا کہ اُن کے نزدیک خدا کی

هستی اور اُس کی وحدانیت اور قادریت بھی امکان غلطی سے خالی نہیں!! غرض جبکہ اُنہوں نے آپ ہی اقرار کر دیا کہ اُن کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی صحت اُن کے نزدیک یقینی ہو تو اِس سے صاف کھُل گیا کہ اُن کے مذہب کی بنیاد سراسر ظنیات پر ہے اور ایمان اُن کا مراتب یقینیہ سے بکلّی دور و مہجور ہے پس یہ وہی بات ہے جس کو ہم بارہا اسی حاشیہ میں لکھ چکے ہیں کہ مجرّد عقلی تقریروں سے علم الٰہیات میں کامل تسلّی اور تشفّی ممکن نہیں اِس صورت میں ہمارا اور برہمو لوگوں کا اِس بات پر تو اتّفاق ہو چکا کہ مجرّد عقل کی رہبری سے کوئی انسان یقین کامل تک نہیں پہنچ سکتا اور ما بہ النزاع فقط یہی امر تھا کہ کیا خدا نے برہمو لوگوں کی رائے کے موافق انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ باوجود جوش طلب یقین کامل اور حق محض کے جو اُس کی فطرت میں ڈالا گیا ہے پھر بھی اپنی اُس فطرتی مراد سے ناکام اور بے نصیب رہے اور صرف ایسے خیالوں تک اُس کا علم محدود رہے کہ جو امکان غلطی سے خالی نہیں یا خدا نے اُس کی معرفت کامل اور پوری پوری کامیابی کے لیے کوئی سبیل بھی مقرر کر رکھا ہے اور کوئی ایسی کتاب بھی عطا فرمائی ہے کہ جو اُس اُصول متذکرہ بالا سے باہر ہو کر جس میں امکان غلطی کا قاعدہ کلّیہ کر رکھا ہے۔ سو الحمد للہ والمنۃ ایسی کتاب کا خدا کی طرف سے نازل ہونا براہین قطعیہ سے ہم پر ثابت ہو گیا ہے اور ہم بذریعہ کتاب ممدوح کے اُس ہلاکت کے ورطہ سے باہر نکل آئے ہیں جس میں برہمو لوگ مُردہ کی طرح پڑے ہوئے ہیں اور وہ کتاب وہی عالی شان اور مقدّس کتاب ہے جس کا نام فرقان ہے جو حق اور باطل میں فرق بیّن دکھلاتی ہے اور ہر ایک قسم کی غلطیوں سے مبرّا ہے جس کی پہلی صفت یہی ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ اُسی نے ہم پر ظاہر کیا ہے کہ خدا حق کے طالبوں کو مراتب یقینیہ سے محروم رکھ کر ہلاک کرنا نہیں چاہتا بلکہ اُس رحیم و کریم نے ایسا اپنے ضعیف اور ناقص بندوں پر احسان کیا ہے کہ جس کام کو عقل ناقص انسان کی نہیں کر سکتی تھی اُس نے وہ کام آپ کر دکھایا ہے اور جس درخت بلند تک بشر کا کوتہ ہاتھ نہیں پہنچتا تھا اُس کے پھلوں کو اُس نے اپنے ہاتھ سے نیچے گرایا ہے اور حق کے طالبوں کو اور سچائی کے بھوکے اور پیاسوں کو یقین کامل اور قطعی کا سامان عطا کر دیا ہے اور جو دینی صداقتوں کے ہزارہا دقائق ذرّات کی طرح روحانی آسمان کی دور دراز فضاؤں میں منتشر تھے اور جو زندگی کا پانی شبنم کی طرح متفرق طور پر انسانی سرشت کے ظلمات میں اور اُس کی عمیق در عمیق استعدادات میں مخفی اور محتجب تھا جس کو بمنصہ ظہور لانا اور ناپیدا کنار فضاؤں سے ایک جگہ اکٹھا کرنا انسانی عقل کی طاقتوں سے باہر تھا اور بشر کی ضعیف قوّتوں کے پاس کوئی ایسا باریک اور غیب نما آلہ نہ تھا کہ جس کے ذریعہ سے انسان اُن ادق اور پوشیدہ ذرّات حقیقت کو کہ جن کو باستیفا دیکھنے کے لیے بصارت وفا نہیں کرتی تھی اور جمع کرنے کے لیے عمر فرصت نہیں دیتی تھی آسانی سے دریافت اور حاصل کر لیتا اُن سب لطائف حکمت و دقائق معرفت کو اُس کامل کتاب نے بلا تفاوت و بلا نقصان و بلا سہو و بلا نسیان خدائی کی قدرت اور قوّت سے اور ربانیّت کی طاقت اور حکومت سے ہمارے سامنے لا رکھا ہے تا ہم اُس پانی کو پی کر بچ جائیں اور موت کے گڑھے میں نہ پڑیں اور پھر کمال یہ کہ اس جامعیّت سے اکٹھا

کیا ہے کہ کوئی دقیقہ دقائق صداقت سے اور کوئی لطیفہ لطائف حکمت سے باہر نہیں رہا اور نہ کوئی ایسا امر داخل ہوا کہ جو کسی صداقت کے مبائن اور منافی ہو چنانچہ ہم نے منکرین کو ملزم اور رسوا کرنے کے لیے جا بجا بصراحت لکھ دیا ہے اور بآواز بلند سنا دیا ہے کہ اگر کوئی برہمو قرآنِ شریف کے کسی بیان کو خلافِ صداقت سمجھتا ہے یا کسی صداقت سے خالی خیال کرتا ہے تو اپنا اعتراض پیش کرے ہم خدا کے فضل اور کرم سے اُس کے وہم کو ایسا دور کر دیں گے کہ جس بات کو وہ اپنے خیال باطل میں ایک عیب سمجھتا تھا اُس کا ہنر ہونا اس پر آشکارا ہو جائے گا۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۲۷۹ تا ۲۸۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

یاد رکھنا چاہیئے کہ بیعت اس غرض سے ہے کہ تا وہ تقویٰ کہ جو اول حالت میں تکلف اور تصنع سے اختیار کی جاتی ہے دوسرا رنگ پکڑے اور برکت توجہ صادقین و جذبہ کاملین طبیعت میں داخل ہو جائے اور اُس کا جُز بن جائے اور وہ مشکوٰتی نور دل میں پیدا ہو جاوے کہ جو عبودیت اور ربوبیت کے باہم تعلق شدید سے پیدا ہوتا ہے جس کو متصوفین دوسرے لفظوں میں روح قدس بھی کہتے ہیں جس کے پیدا ہونے کے بعد خدائے تعالیٰ کی نافرمانی ایسی بالطبع بُری معلوم ہوتی ہے جیسی وہ خود خدائے تعالیٰ کی نظر میں بُری و مکروہ ہے اور نہ صرف خلق اللہ سے انقطاع میسر آتا ہے بلکہ بجز خالق و مالک حقیقی ہر یک موجود کو کالعدم سمجھ کر فنا نظری کا درجہ حاصل ہوتا ہے سو اس نور کے پیدا ہونے کے لیے ابتدائی اتقا جس کو طالب صادق اپنے ساتھ لاتا ہے شرط ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی علت غائی بیان کرنے میں فرمایا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ یہ نہیں فرمایا کہ هُدًى لِّلْفَاسِقِينَ یا هُدًى لِّلْكَافِرِينَ ابتدائی تقویٰ جس کے حصول سے متقی کا لفظ انسان پر صادق آسکتا ہے وہ ایک فطرتی حصہ ہے کہ جو سعیدوں کی خلقت میں رکھا گیا ہے اور ربوبیت اولیٰ اس کی مُربّی اور وجود بخش ہے جس سے متقی کا پہلا تولد ہے مگر وہ اندرونی نور جو روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ عبودیت خالصہ تامہ اور ربوبیت کاملہ مستجمعہ کے پورے جوڑ و اتصال سے بطرز ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[1] کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیت ثانیہ ہے جس سے متقی تولد ثانی پاتا ہے اور ملکوتی مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے بعد ربوبیت ثالثہ کا درجہ ہے جو خلق جدید سے موسوم ہے جس سے متقی لاہوتی مقام پر پہنچتا ہے اور تولد ثالث پاتا ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۴۵ تا ۸۴۶ حاشیہ)

قرآن شریف نے تو اپنے نزول کی علّت غائی ہی یہ قرار دی ہے کہ تقویٰ کی راہوں کو سکھائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی یہ کتاب اس غرض سے اُتری ہے کہ تا جو لوگ گناہ سے پرہیز کرتے ہیں ان کو باریک سے باریک گناہوں پر بھی اطلاع دی جائے تا وہ ان بُرے کاموں سے بھی پرہیز کریں جو ہر ایک آنکھ کو نظر نہیں آتے بلکہ فقط معرفت کی خوردبین سے نظر آسکتے ہیں اور موٹی نگاہیں اُن کے دیکھنے

---

[1] المؤمنون - ع - ۱ +

سے خطا کر جاتی ہیں مثلاً آپ کے یسوع صاحب کا قول متی نے یہ لکھا ہے کہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی شہوت سے کسی عورت پر نگاہ کرے تو وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا لیکن قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ نہ تو شہوت سے اور نہ بغیر شہوت کے بیگانہ عورت کے مُنہ پر ہرگز نظر نہ ڈال اور ان کی باتیں مت سُن اور اُن کی آواز مت سُن اور اُن کے حُسن کے قصے مت سُن کہ ان امور سے پرہیز کرنا تجھے ٹھوکر کھانے سے بچائے گا۔ (نور القرآن ۲ صفحہ ۲۵، ۲۶)

یہ کتاب جو شکوک و شبہات سے پاک ہے متقیوں کے لیے ہدایت نامہ ہے اور متقی وہ لوگ ہیں جو خدا پر (جس کی ذات مخفی در مخفی ہے) ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے خدا کی راہ میں کچھ دیتے اور اُس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تیرے پر نازل ہوئی اور نیز اُن کتابوں پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں وہی لوگ خدا کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی ہیں جو نجات پائیں گے۔

...... خدا تعالیٰ نے ان آیات میں فیصلہ کر دیا ہے اور نجات پانا صرف اسی بات میں حصر کر دیا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لاویں اور اُس کی بندگی کریں۔ خدا تعالیٰ کے کلام میں تناقض اور اختلاف نہیں ہو سکتا پس جب کہ اللہ جلّ شانہٗ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے نجات کو وابستہ کر دیا ہے تو پھر بے ایمانی ہے کہ ان آیات قطعیۃ الدلالت سے انحراف کر کے متشابہات کی طرف دوڑیں۔ متشابہات کی طرف وہی لوگ دوڑتے ہیں جن کے دل نفاق کی مرض سے بیمار ہوتے ہیں۔

اور ان آیات میں جو معرفت کا نکتہ مخفی ہے وہ یہ ہے کہ آیات ممدوحہ بالا میں خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی یہ وہ کتاب ہے جو خدا تعالیٰ کے علم سے ظہور پذیر ہوئی ہے اور چونکہ اُس کا علم جہل اور نسیان سے پاک ہے اس لیے یہ کتاب ہر ایک شک و شبہ سے خالی ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ کا علم انسانوں کی تکمیل کے لیے اپنے اندر ایک کامل طاقت رکھتا ہے اس لیے یہ کتاب متقین کے لیے ایک کامل ہدایت ہے اور ان کو اُس مقام تک پہنچاتی ہے جو انسانی فطرت کی ترقیات کے لیے آخری مقام ہے اور خدا ان آیات میں فرماتا ہے کہ متقی وہ ہیں کہ جو پوشیدہ خدا پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور قرآن شریف اور پہلی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں وہی ہدایت کے سر پر ہیں اور وہی نجات پائیں گے ان آیات سے یہ تو معلوم ہوا کہ نجات بغیر نبی کریم پر ایمان لانے اور اُس کی ہدایات نماز وغیرہ کے بجالانے کے نہیں مل سکتی۔ اور جھوٹے ہیں وہ لوگ جو نبی کریم کا دامن چھوڑ کر محض خشک توحید سے نجات ڈھونڈتے ہیں مگر یہ عقدہ قابل حل رہا کہ جبکہ وہ لوگ ایسے راست باز ہیں کہ پوشیدہ خدا پر ایمان لاتے اور نماز بھی ادا کرتے اور روزہ بھی رکھتے ہیں اور اپنے مالوں میں سے خدا کے راہ میں کچھ دیتے ہیں اور قرآن شریف اور پہلی کتابوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں تو پھر یہ فرمانا کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی ان کو یہ کتاب ہدایت دیگی اس کے کیا معنی ہیں وہ تو ان سب باتوں کو بجالا کر پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں اور حاصل شدہ کو حاصل کرانا یہ تو ایک امر

عبث معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ باوجود ایمان اور عمل صالح کے کامل استقامت اور کامل ترقی کے محتاج ہیں جس کی رہنمائی صرف خدا ہی کرتا ہے انسانی کوشش کا اس میں دخل نہیں۔ استقامت سے مراد یہ ہے کہ ایسا ایمان دل میں رچ جائے کہ کسی ابتلاء کے وقت ٹھوکر نہ کھاویں اور ایسے طرز اور ایسے طور پر اعمال صالحہ صادر ہوں کہ ان میں لذت پیدا ہو اور مشقت اور تلخی محسوس نہ ہو اور ان کے بغیر جی ہی نہ سکیں گویا وہ اعمال روح کی غذا ہو جائیں اور اُس کی روٹی بن جائیں اور اُس کا آب شیریں بن جائیں کہ بغیر اُس کے زندہ نہ رہ سکیں غرض استقامت کے بارے میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن کو انسان محض اپنی سعی سے پیدا نہیں کر سکتا بلکہ جیسا کہ روح کا خدا کی طرف سے فیضان ہوتا ہے وہ فوق العادت استقامت بھی خدا کی طرف سے پیدا ہو جائے۔

اور ترقی سے مُراد یہ ہے کہ وہ عبادت اور ایمان جو انسانی کوششوں کی انتہا ہے اس کے علاوہ وہ حالات پیدا ہو جائیں جو محض خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کے بارے میں انسانی سعی اور عقل صرف اس حد تک رہبری کرتی ہے کہ اُس پوشیدہ خدا پر جس کا چہرہ نہیں دیکھا گیا ایمان لایا جائے اسی وجہ سے شریعت جو انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتی اس بات کے لیے مجبور نہیں کرتی کہ انسان اپنی طاقت سے ایمان بالغیب سے بڑھ کر ایمان حاصل کرے ہاں راست بازوں کو اسی آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ میں وعدہ دیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان بالغیب پر ثابت قدم ہو جائیں اور جو کچھ وہ اپنی سعی سے کر سکتے ہیں کرلیں تب خدا ایمان کی حالت سے عرفان کی حالت تک اُن کو پہنچا دے گا۔ اور ان کے ایمان میں ایک اور رنگ پیدا کر دیگا قرآن شریف کی سچائی کی یہ ایک نشانی ہے کہ وہ جو اس کی طرف آتے ہیں اُن کو اُس مرتبہ ایمان اور عمل پر رکھنا نہیں چاہتا کہ جو وہ اپنی کوشش سے اختیار کرتے ہیں کیونکہ اگر ایسا ہو تو کیونکر معلوم ہو کہ خدا موجود ہے بلکہ وہ انسانی کوششوں پر اپنی طرف سے ایک ثمرہ مرتب کرتا ہے جس میں خدائی چمک اور خدائی تصرف ہوتا ہے مثلاً جیسا کہ میں نے بیان کیا انسان خدا پر ایمان لانے کے بارہ میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ وہ اس پوشیدہ خدا پر ایمان لاوے جس کے وجود پر ذرہ ذرہ اس عالم کا گواہ ہے مگر انسان کی یہ تو طاقت ہی نہیں ہے کہ محض اپنے ہی قدموں اور اپنی ہی کوشش اور اپنے ہی زور بازو سے خدا کے انوار اُلوہیت پر اطلاع پاوے اور ایمانی حالت سے عرفانی حالت تک پہنچ جاوے اور مشاہدہ اور رویت کی کیفیت اپنے اندر پیدا کرلے۔

اِسی طرح انسانی سعی اور کوشش نماز کے ادا کرنے میں اس سے زیادہ کیا کر سکتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے پاک اور صاف ہو کر اور نفی خطرات کر کے نماز ادا کریں اور کوشش کریں کہ نماز ایک گری ہوئی حالت میں نہ رہے اور اس کے جس قدر ارکان حمد و ثنا حضرت عزت اور توبہ و استغفار اور دعا اور درود ہیں وہ دلی جوش سے صادر ہوں لیکن یہ تو انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ ایک فوق العادت محبت ذاتی اور خشوع ذاتی اور محویت سے بھرا ہوا ذوق و شوق اور ہر ایک کدورت

سے خالی حضور اس کی نماز میں پیدا ہو جائے گویا وہ خدا کو دیکھ لے اور ظاہر ہے کہ جب تک نماز میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو وہ نقصان سے خالی نہیں اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ متقی وہ ہیں جو نماز کو کھڑی کرتے ہیں اور کھڑی وہی چیز کی جاتی ہے جو گرنے کے لیے مستعد ہے پس آیت یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہ معنی ہیں کہ جہاں تک اُن سے ہو سکتا ہے نماز کو قائم کرنے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور تکلف اور مجاہدات سے کام لیتے ہیں مگر انسانی کوششیں بغیر خدا تعالیٰ کے فضل کے بیکار ہیں اِس لیے اُس کریم و رحیم نے فرمایا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یعنی جہاں تک ممکن ہو وہ تقویٰ کی راہ سے نماز کی اقامت میں کوشش کریں پھر اگر وہ میرے کلام پر ایمان لاتے ہیں تو میں اُن کو فقط اُنہی کی کوشش اور سعی پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ مَیں آپ اُن کی دستگیری کروں گا۔ تب اُن کی نماز ایک اور رنگ پکڑ جائے گی اور ایک اور کیفیت ان میں پیدا ہو جائے گی۔ جو ان کے خیال و گمان میں بھی نہیں تھی۔ یہ فضل محض اس لیے ہو گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے کلام قرآن شریف پر ایمان لائے اور جہاں تک ان سے ہو سکا اس کے احکام کے مطابق عمل میں مشغول رہے غرض نماز کے متعلق جس زاید ہدایت کا وعدہ ہے وہ یہی ہے کہ اس قدر طبعی جوش اور ذاتی محبّت اور خشوع اور کامل حضور میسّر آ جائے کہ انسان کی آنکھ اپنے محبوب حقیقی کے دیکھنے کے لیے کُھل جائے اور ایک خارق عادت کیفیت مشاہدہ جمال باری کی میسّر آ جائے جو لذات روحانیہ سے سراسر معمور ہو اور دنیوی رذایل اور انواع و اقسام کے معاصی قولی اور فعلی اور بصری اور سماعی سے دل کو متنفر کر دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ[1]

ایسا ہی مالی عبادت جس قدر انسان اپنی کوشش سے کر سکتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اپنے اموال مرغوبہ میں سے کچھ خدا کے لیے دیوے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں فرمایا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ اور جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[2] لیکن ظاہر ہے کہ اگر مالی عبادت میں انسان صرف اسی قدر بجا لاوے کہ اپنے اموال محبوبہ مرغوبہ میں سے کچھ خدا تعالیٰ کی راہ میں دیوے تو یہ کچھ کمال نہیں ہے کمال تو یہ ہے کہ ماسوٰی سے بکلی دست بردار ہو جائے اور جو کچھ اس کا ہے وہ اس کا نہیں بلکہ خدا کا ہو جائے یہاں تک کہ جان بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں فدا کرنے کے لیے طیار ہو کیونکہ وہ بھی مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ میں داخل ہے خدا تعالیٰ کا منشاء اس کے قول مِمَّا رَزَقْنَا سے صرف درہم و دینار نہیں ہے بلکہ یہ بڑا وسیع لفظ ہے جس میں ہر ایک وہ نعمت داخل ہے جو انسان کو دی گئی ہے۔

غرض اِس جگہ بھی ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ فرمانے سے خدا تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ جو کچھ انسان کو ہر ایک قسم کی نعمت مثلاً اس کی جان اور صحت اور علم اور طاقت اور مال وغیرہ میں سے دیا گیا ہے اس کی نسبت انسان اپنی کوشش سے صرف مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ تک اپنا اخلاص ظاہر کر سکتا ہے اور اس سے بڑھ کر بشری قوتیں

---

[1] ھود۔ ع۔ ۱۰ ۞ [2] اٰل عمران۔ ع۔ ۱۰ ۞

طاقت نہیں رکھتیں لیکن خدا تعالیٰ کا قرآن شریف پر ایمان لانے والے کے لیے اگر وہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کی حد تک اپنا صدق ظاہر کریگا بموجب آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے یہ وعدہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس قسم کی عبادات میں بھی کمال تک اس کو پہنچا دیگا اور کمال یہ ہے کہ اس کو یہ قوّت ایثار بخشی جائے گی کہ وہ شرح صدر سے یہ سمجھ لیگا کہ جو کچھ اُس کا ہے خدا کا ہے اور کبھی کسی کو محسوس نہیں کرائے گا کہ یہ چیزیں اس کی تھیں جس کے ذریعہ سے اُس نے نوع انسان کی خدمت کی مثلاً احسان کے ذریعہ سے کبھی انسان کسی کو محسوس کراتا ہے کہ اس نے اپنا مال دوسرے کو دیا مگر یہ ناقص حالت ہے کیونکہ وہ تبھی محسوس کریگا کہ جب اُس چیز کو اپنی چیز سمجھے گا پس جب بموجب آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے خدا تعالیٰ قرآن شریف پر ایمان لانے والے کو اس مقام سے ترقی بخشے گا تو وہ یہاں تک اپنی تمام چیزوں کو خدا کی چیزیں سمجھ لیگا کہ محسوس کرانے کی مرض بھی اس کے دل میں سے جاتی رہے گی اور نوع انسان کے لیے ایک مادری ہمدردی اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر۔ اور کوئی چیز اُس کی اپنی نہیں رہے گی۔ بلکہ سب خدا کی ہو جائے گی اور یہ تب ہوگا کہ جب وہ سچے دل سے قرآن شریف اور نبی کریمؐ پر ایمان لائے گا۔ بغیر اس کے نہیں۔ پس کس قدر گمراہ وہ لوگ ہیں جو بغیر متابعت قرآن شریف اور رسول کریمؐ کے صرف خشک توحید کو موجب نجات ٹھیراتے ہیں بلکہ مشاہدہ ثابت کر رہا ہے کہ ایسے لوگ نہ خدا پر سچا ایمان رکھتے ہیں نہ دُنیا کے لالچوں اور خواہشوں سے پاک ہو سکتے ہیں چہ جائیکہ وہ کسی کمال تک ترقی کریں اور یہ بات بھی بالکل غلط اور کورانہ خیال ہے کہ انسان خود بخود نعمت توحید حاصل کر سکتا ہے بلکہ توحید خدا کی کلام کے ذریعہ سے ملتی ہے اور اپنی طرف سے جو کچھ سمجھتا ہے وہ شرک سے خالی نہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کے بارے میں انسانی کوشش صرف اس حد تک ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کر کے اس کی کتاب پر ایمان لاوے اور صبر سے اُس کی پیروی کرے اس سے زیادہ انسان میں طاقت نہیں لیکن خدا تعالیٰ نے آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ میں یہ وعدہ فرمایا ہے کہ اگر اس کی کتاب اور رسول پر کوئی ایمان لائے گا تو وہ مزید ہدایت کا مستحق ہوگا اور خدا اُس کی آنکھ کھولے گا اور اپنے مکالمات و مخاطبات سے مشرف کریگا اور بڑے بڑے نشان اُس کو دکھائے گا یہاں تک کہ وہ اِسی دُنیا میں اس کو دیکھ لے گا کہ اُس کا خدا موجود ہے اور پوری تسلّی پائے گا۔ خدا کا کلام کہتا ہے کہ اگر تو میرے پر کامل ایمان لاوے تو میں تیرے پر بھی نازل ہوں گا۔ اسی بنا پر حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس اخلاص اور محبت اور شوق سے خدا کے کلام کو پڑھا کہ وہ الہامی رنگ میں میری زبان پر بھی جاری ہو گیا (حقیقۃ الوحی صـ۱۳۲ - ۱۳۸)

ترجمہ۔ میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔ یہ کتاب جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے متقیوں کے لیے ہدایت نامہ ہے (متقی کون ہوتے ہیں؟) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو کھڑی کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں عطا کیا گیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور متقی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل کی گئی ہے اور اس وحی پر بھی جو تجھ سے پہلے نازل ہوئی اور آخرۃ پر بھی یقین رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

تفسیر۔ الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ میں اللہ جو بہت جاننے والا ہوں یہ کتاب جو شک وشبہ اور ہر عیب ونقص سے پاک ہے متقیوں کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی ہے۔

قرآن کریم کی علل اربعہ | ہر شے کی چار علّتیں ہوتی ہیں یہاں بھی ان علل اربعہ کو بیان کیا ہے اور وہ عللِ اربعہ یہ ہوتی ہیں علّت فاعلی۔ علّت صوری۔ علّت مادی۔ علّت غائی۔ اس مقام پر قرآن شریف کی چار علّتوں کا ذکر کیا۔

علّتِ فاعلی تو اس کتاب کی الٓمّٓ ہے اور الٓمّٓ کے معنے میرے نزدیک اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ یعنی میں اللہ وہ ہوں جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں اور علّت مادی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ہے۔ یعنی یہ کتاب اس خدا کی طرف سے آئی ہے جو سب سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اور علّتِ صوری لَا رَيْبَ فِيْهِ ہے یعنی اس کتاب کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ ہی نہیں جو بات ہے مستحکم اور جو دعوٰی ہے وہ مدلل اور روشن اور علّتِ غائی اس کتاب کی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے یعنی اس کتاب کے نزول کی غرض وغایت یہ ہے کہ متقیوں کو ہدایت کرتی ہے۔ یہ چاروں علّتیں بیان کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے عام صفات بتائے ہیں کہ وہ متقی کون ہوتے ہیں جو ہدایت پاتے ہیں اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ یعنی وہ متقی ہوتے ہیں جو خدا پر جو ہنوز پردہ غیب میں ہوتا ہے ایمان لاتے ہیں اور نماز کو کھڑا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو تجھ پر نازل کی ہے اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل ہوا۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ صفات متقی کے بیان فرمائے اب یہاں بالطبع ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کتاب کی غرض غایت تو یہ بتائی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور پھر متقیوں کے صفات بھی وہ بیان کیے جو سب کے سب ایک با خدا انسان میں ہوتے ہیں یعنی خدا پر ایمان لاتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو۔ صدقہ دیتا ہو کتاب اللہ کو مانتا ہو۔ قیامت پر یقین رکھتا ہو پھر جو شخص پہلے ہی سے ان صفات سے متصف (ہے) اور وہ متقی کہلاتا ہے اور ان امور کا پابند ہے تو پھر وہ ہدایت کیا ہوئی؟ جو اس کتاب کے ذریعہ اُس نے حاصل کی اس میں وہ امر زائد کیا ہے جس کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور امر ہے جو اس ہدایت میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ امور جو بطور صفات متقین بیان فرمائے ہیں یہ تو اِس ہدایت کے لیے جو اس کتاب کا اصل مقصد اور غرض ہے بطور شرائط ہیں ورنہ وہ ہدایت اور چیز ہے اور وہ ایک اعلیٰ امر ہے جو خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے اور جس کو میں بیان کرتا ہوں پس یاد رکھو کہ متقی کی صفات میں سے پہلی صفت یہ بیان کی يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ یعنی غیب پر ایمان لاتے ہیں یہ مومن کی ایک ابتدائی حالت کا اظہار ہے کہ جن چیزوں کو اس نے نہیں دیکھا ان کو مان لیا ہے۔ غیب اللہ تعالیٰ کا نام ہے اور اس غیب میں بہشت۔ دوزخ حشر اجساد اور وہ تمام امور جو ابھی تک پردہ غیب میں ہیں شامل ہیں۔ اب

ابتدائی حالت میں تو مومن ان پر ایمان لاتا ہے۔لیکن ہدایت یہ ہے کہ اس حالت پر اُسے ایک انعام عطا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا علم غیب سے انتقال کر کے شہود کی طرف آجاتا ہے اور اس پر پھر ایسا زمانہ آجاتا ہے کہ جن باتوں پر وہ پہلے غائب کے طور پر ایمان لاتا تھا وہ ان کا عارف ہو جاتا ہے اور وہ امور جو ابھی تک مخفی تھے اس کے سامنے آجاتے ہیں اور حالت شہود میں انہیں دیکھتا ہے پھر وہ خدا کو غیب نہیں مانتا بلکہ اسے دیکھتا ہے اور اس کی تجلّی سامنے رہتی ہے غرض اس غیب کے بعد شہود کا درجہ اسے عطا کیا جاتا ہے جیسے ایمان کے بعد عرفان کا مرتبہ ملتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کو اسی عالم میں دیکھ لیتا ہے اور اگر اس کو یہ مرتبہ عطا نہ ہوتا تو پھر یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے مصداق کو کوئی ہدایت اور انعام عطا نہ ہوتا۔ اس کے لیے قرآن شریف گویا موجب ہدایت نہ ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اور اس کے لیے ہدایت یہی ہے کہ اس کے ایمان کو حالت غیب سے منتقل کر کے حالت شہود میں لے آتا ہے اور اس پر دلیل یہ ہے۔ مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی[1] یعنی جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ دوسرے عالم میں بھی اندھا اٹھایا جاوے گا۔ اس نابینائی سے یہی مراد ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی تجلّی اور ان امور کو جو حالت غیب میں ہیں اسی عالم میں مشاہدہ نہ کرے اور یہ نابینائی کا کچھ حصّہ غیب والے میں پایا جاتا ہے لیکن هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے موافق جو شخص ہدایت پا لیتا ہے اس کی وہ نابینائی دور ہو جاتی ہے اور وہ اس حالت سے ترقی کر جاتا ہے اور وہ ترقی اس کلام کے ذریعہ سے یہ ہے کہ ایمان بالغیب کے درجہ سے شہود کے درجہ پر پہنچ جاوے گا اور اس کے لیے یہی ہدایت ہے۔

متقی کی دوسری صفت | متقی کی دوسری صفت یہ ہے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یعنی وہ نماز کو کھڑی کرتے ہیں۔متقی سے جیسے ہو سکتا ہے نماز کھڑی کرتا ہے۔ یعنی کبھی اس کی نماز گر پڑتی ہے پھر اُسے کھڑا کرتا ہے۔ یعنی متقی خدا سے ڈرا کرتا ہے اور وہ نماز کو قائم کرتا ہے اس حالت میں مختلف قسم کے وساوس اور خطرات بھی ہوتے ہیں جو پیدا ہو کر اس کے حضور میں حارج ہوتے ہیں اور نماز کو گرا دیتے ہیں لیکن یہ نفس کی اس کشاکش میں بھی نماز کو کھڑا کرتا ہے۔ کبھی نماز گرتی ہے مگر یہ پھر اسے کھڑا کرتا ہے۔اور یہی حالت اس کی رہتی ہے کہ وہ تکلّف اور کوشش سے بار بار اپنی نماز کو کھڑا کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس کلام کے ذریعہ ہدایت عطا کرتا ہے اس کی ہدایت کیا ہوتی ہے[2]؟

اس وقت بجائے یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کے ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ اس کشمکش اور وساوس کی زندگی سے نکل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ انہیں وہ مقام عطا کرتا ہے جس کی نسبت فرمایا ہے کہ بعض آدمی ایسے کامل ہو جاتے ہیں کہ نماز ان کے لیے بمنزلہ غذا ہو جاتی ہے اور نماز میں ان کو وہ لذّت اور ذوق عطا کیا جاتا ہے جیسے سخت پیاس کے وقت ٹھنڈا پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ نہایت رغبت سے اسے پیتا ہے اور خوب سیر ہو کر حظ حاصل کرتا ہے یا سخت بھوک کی حالت ہو اور اسے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا خوش ذائقہ کھانا مل جاوے جس کو

---

[1] بنی اسرائیل ۔ ع ۸ ۔ [2] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ صفحہ ۳ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء ۔

کھا کر وہ بہت ہی خوش ہوتا ہے۔ یہی حالت پھر نماز میں ہو جاتی ہے۔ وہ نماز اس کے لیے ایک قسم کا نشہ ہو جاتی ہے جس کے بغیر وہ سخت کرب و اضطراب محسوس کرتا ہے۔ لیکن نماز کے ادا کرنے سے اس کے دل میں ایک خاص سرور اور ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے جس کو ہر شخص نہیں پا سکتا اور نہ الفاظ میں یہ لذّت بیان ہو سکتی ہے اور انسان ترقی کر کے ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اسے ذاتی محبت ہو جاتی ہے۔ اور اس کو نماز کے کھڑے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اس لیے کہ وہ نماز اس کی کھڑی ہی ہوتی ہے اور ہر وقت کھڑی ہی رہتی ہے اس میں ایک طبعی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور ایسے انسان کی مرضی خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہوتی ہے۔ انسان پر ایسی حالت آتی ہے کہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے محبّتِ ذاتی کا رنگ رکھتی ہے اس میں کوئی تکلف اور بناوٹ نہیں ہوتی۔ جس طرح پر حیوانات اور دوسرے انسان اپنے ماکولات و مشروبات اور دوسری شہوات میں لذت اٹھاتے ہیں۔ اس سے بہت بڑھ چڑھ کر وہ مومن متقی نماز میں لذّت پاتا ہے۔ اس لیے نماز کو خوب سنوار سنوار کر پڑھنا چاہیئے۔ نماز ساری ترقیوں کی جڑ اور زینہ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ نماز مومن کا معراج ہے اس دین میں ہزاروں لاکھوں اولیاء اللہ۔ راستباز۔ ابدال۔ قطب۔ گزرے ہیں۔ انہوں نے یہ مدارج اور مراتب کیونکر حاصل کیے؟ اسی نماز کے ذریعہ سے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے اور فی الحقیقت جب انسان اس مقام اور درجہ پر پہنچتا ہے تو اس کے لیے اکمل اتم لذّت نماز ہی ہوتی ہے۔ اور یہی معنے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ہیں پس کشاکش نفس سے انسان نجات پا کر اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

غرض یاد رکھو کہ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وہ ابتدائی درجہ اور مرحلہ ہے جہاں نماز بے ذوقی اور کشاکش سے ادا کرتا ہے لیکن اس کتاب کی ہدایت ایسے آدمی کے لیے یہ ہے کہ اس مرحلہ سے نجات پا کر اس مقام پر جا پہنچتا ہے جہاں نماز اس کے لیے قرۃ العین ہو جاوے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس مقام پر متقی سے مراد وہ شخص ہے جو نفس لوّامہ کی حالت میں ہے۔

نفس کے تین درجہ نفس کے تین درجہ ہیں۔ نفس امّارہ۔ لوّامہ۔ مطمئنہ۔ نفس امارہ وہ ہے جو فسق و فجور میں مبتلا ہے اور نافرمانی کا غلام ہے۔ ایسی حالت میں انسان نیکی کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر ایک سرکشی اور بغاوت پائی جاتی ہے لیکن جب اس سے کچھ ترقی کرتا اور نکلتا ہے تو وہ وہ حالت ہے جو نفس لوّامہ کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اگر بدی کرتا ہے تو اس سے شرمندہ بھی ہوتا ہے اور اپنے نفس کو ملامت بھی کرتا ہے اور اس طرح پر نیکی کی طرف بھی توجہ کرتا ہے۔ لیکن اس حالت میں وہ کامل طور پر اپنے نفس پر غالب نہیں آتا بلکہ اس کے اور نفس کے درمیان ایک جنگ جاری رہتی ہے جس میں کبھی وہ غالب آ جاتا ہے اور کبھی نفس اسے مغلوب کر لیتا ہے یہ سلسلہ لڑائی کا بدستور جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کی دستگیری کرتا ہے اور آخر اسے کامیاب اور بامراد کرتا ہے اور وہ اپنے نفس پر فتح پا لیتا ہے پھر تیسری حالت میں پہنچ جاتا ہے جس کا نام نفس مطمئنہ ہے۔ اس وقت اس کے نفس کے تمام گند دور ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے فساد مٹ جاتے ہیں۔ نفس مطمئنہ کی آخری حالت ایسی حالت ہوتی ہے جیسے دو سلطنتوں کے درمیان ایک جنگ ہو کر ایک فتح پا لے۔ اور وہ تمام مفسدہ دور کر کے امن قائم کرے

اور پہلا سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً [1]

یعنی جب بادشاہ کسی گاؤں میں داخل ہوتے ہیں تو پہلا تانا بانا سب تباہ کر دیتے ہیں بڑے بڑے نمبردار رئیس نواب ہی پہلے پکڑے جاتے ہیں اور بڑے بڑے نامور ذلیل کیے جاتے ہیں اور اس طرح پر ایک تغیر عظیم واقع ہوتا ہے یہی ملوک کا خاصہ ہے اور ایسا ہی ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے اسی طرح پر جب روحانی سلطنت بدلتی ہے تو پہلی سلطنت پر تباہی آتی ہے۔ شیطان کے غلاموں کو قابو کیا جاتا ہے۔ وہ جذبات اور شہوات جو انسان کی روحانی سلطنت میں مفسدہ پردازی کرتے ہیں ان کو کچل دیا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے اور روحانی طور پر ایک نیا سکہ بیٹھ جاتا ہے اور بالکل امن و امان کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حالت اور درجہ ہے جو نفس مطمئنہ کہلاتا ہے اس لیے کہ اس وقت کسی قسم کی کش مکش اور کوئی فساد پایا نہیں جاتا بلکہ نفس ایک کامل سکون اور اطمینان کی حالت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جنگ کا خاتمہ ہو کر نئی سلطنت قائم ہو جاتی ہے اور کوئی فساد اور مفسدہ باقی نہیں رہتا۔ بلکہ دل پر خدا کی فتح کامل ہوتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ خود اس کے عرش دل پر نزول فرماتا ہے۔ اسی کامل درجہ کی حالت بیان فرمایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ [2] یعنی بیشک اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے اور پھر اس سے ترقی کرو تو احسان کا حکم دیتا ہے اور پھر اس سے بھی ترقی کرو تو إِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ کا حکم ہے۔

حالتِ عدل | عدل کی حالت یہ ہے جو متقی کی حالت نفس امارہ کی صورت میں ہوتی ہے اس حالت کی اصلاح کے لیے عدل کا حکم ہے۔ اس میں نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً کسی کا قرضہ ادا کرنا ہے لیکن نفس اس میں یہی خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کو دبا لوں۔ اور اتفاق سے اس کی میعاد بھی گذر جاوے اس صورت میں نفس اور بھی دلیر اور بے باک ہوگا کہ اب تو قانونی طور پر بھی کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا مگر یہ ٹھیک نہیں۔ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا دَین واجب ادا کیا جاوے اور کسی حیلے اور عذر سے اس کو دبایا نہ جاوے۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ ان امور کی پروا نہیں کرتے اور ہماری جماعت میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بہت کم توجہ کرتے ہیں اپنے قرضوں کے ادا کرنے میں۔ یہ عدل کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے لوگوں کی نماز نہ پڑھتے تھے۔ پس تم میں سے ہر ایک اس بات کو خوب یاد رکھے کہ قرضوں کے ادا کرنے میں سستی نہیں کرنی چاہیئے اور کسی قسم کی خیانت اور بے ایمانی سے دور بھاگنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ امر الٰہی کے خلاف ہے جو اس نے اس آیت میں دیا ہے۔

حالتِ احسان | اس کے بعد احسان کا درجہ ہے جو شخص عدل کی رعایت کرتا ہے اور اس کی حدبندی کو نہیں توڑتا اللہ تعالیٰ اسے توفیق اور قوت دے دیتا ہے اور وہ نیکی میں اور ترقی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ عدل ہی نہیں کرتا بلکہ تھوڑی سی نیکی کے بدلے بہت بڑی نیکی کرتا ہے لیکن احسان کی حالت میں بھی ایک کمزوری ابھی باقی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس

---

[1] النمل۔ ع۔ ۳ ٭ [2] النحل۔ ع۔ ۱۳ ٭

نیکی کو حبط بھی دیتا ہے مثلاً ایک شخص دس برس تک کسی کو روٹی کھلاتا ہے۔ اور وہ کبھی ایک بات اس کی نہیں مانتا تو اسے کہہ دیتا ہے کہ دس برس کا ہمارے ٹکڑوں کا غلام ہے۔ اور اس طرح پر اس نیکی کو بے اثر کر دیتا ہے۔ دراصل احسان والے کے اندر بھی ایک قسم کی مخفی ریا ہوتی ہے لیکن تیسرا مرتبہ ہر قسم کی آلائش اور آلودگی سے پاک ہے اور وہ اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی کا درجہ ہے۔

ایتاء ذی القربیٰ کی حالت | ایتاء ذی القربیٰ کا درجہ طبعی حالت کا درجہ ہے یعنی جس مقام پر انسان سے نیکیوں کا صدور ایسے طور پر ہو جیسے طبعی تقاضا ہوتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسی ماں اپنے بچے کو دودھ دیتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے کبھی اس کو خیال بھی نہیں آتا کہ بڑا ہو کر کمائی کریگا اور اس کی خدمت کریگا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بادشاہ اسے یہ حکم دے کہ تو اگر اپنے بچے کو دودھ نہ دیگی اور اس سے وہ مر جاوے تو بھی تجھ سے مواخذہ نہ ہوگا۔ اس حکم پر بھی اس کو دودھ دینا وہ نہیں چھوڑ سکتی بلکہ ایسے بادشاہ کو دو چار گالیاں ہی سنادیگی۔ اس لیے کہ وہ پرورش اس کا ایک طبعی تقاضا ہے وہ کسی امید یا خوف پر مبنی نہیں۔ اسی طرح پر جب انسان نیکی میں ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ نیکیاں اس سے ایسے طور پر صادر ہوتی ہیں گویا ایک طبعی تقاضا ہے۔ تو یہی وہ حالت ہے جو مطمئنہ کہلاتی ہے۔ غرض یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کے یہ معنے ہیں کہ جب تک نفس مطمئنہ نہ ہو ایک کشاکش میں لگا رہتا ہے کبھی نفس غالب آجاتا ہے اور کبھی آپ غالب آجاتا ہے صبح کو اٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ٹھنڈا پانی ہے اس کو نہانے کی حاجت ہے پس اگر نفس کی بات مان لیتا ہے تو نماز کو کھو لیتا ہے اور اگر ہمت سے کام لیتا ہے تو اس پر فتح پا لیتا ہے شکر کی بات ہے کہ ایک مرتبہ خود مجھے ایسی حالت پیش آئی۔ سردی کا موسم تھا۔ مجھے غسل کی حاجت ہوگئی۔ پانی گرم کرنے کے لیے کوئی سامان اس جگہ نہ تھا۔ ایک پادری کی لکھی ہوئی کتاب میزان الحق میرے پاس تھی۔ اُس وقت وہ کام آئی میں نے اُس کو جلا کر پانی گرم کرلیا۔ اور خدا کا شکر کیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ بعض وقت شیطان بھی کام آجاتا ہے۔

پھر میں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ کے یہی معنے ہیں اور اس پر ترقی یہی ہے کہ ایسی حالت سے نجات پا کر مطمئنہ کی حالت میں پہنچ جاوے۔

خوب یاد رکھو کہ نرا غیب پر ایمان لانے کا انجام خطرناک ہوتا رہا ہے افلاطون جب مرنے لگا تو کہنے لگا کہ میرے لیے بُت پر ایک مرغا ہی ذبح کرو۔ جالینوس نے کہا میری قبر میں خچر کے پیشاب گاہ کے برابر ایک سوراخ رکھ دینا تاکہ ہوا آتی رہے۔ اب غور کرو کہ کیا ایسے لوگ ہادی ہو سکتے ہیں جو ایسی مذبذب اور مضطرب حالت میں ہوتے ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ جب تک اندر روشنی پیدا نہ ہو کیا فائدہ۔ لیکن یہ روشنی خدا تعالیٰ کے فضل ہی سے ملتی ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ سب طبائع یکساں نہیں ہوتی ہیں اور خدا تعالیٰ نے سب کو نبی پیدا نہیں کیا۔

اثر صحبت | لیکن صحبت میں بڑا شرف ہے اس کی تاثیر کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچا ہی دیتی ہے۔ کسی کے پاس اگر خوشبو ہو تو پاس والے کو بھی پہنچ ہی جاتی ہے۔ اسی طرح پر صادقوں کی صحبت ایک روح صدق کی نفخ کر دیتی ہے میں سچ کہتا ہوں کہ گہری

صحبت نبی اور صاحب نبی کو ایک کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن شریف میں کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ[1] فرمایا ہے۔ اور اسلام کی خوبیوں میں سے یہ ایک بے نظیر خوبی ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے صادق موجود رہتے ہیں لیکن آریہ سماجی یا عیسائی اس طریق سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں جبکہ ان کے ہاں یہ مسلم امر ہے کہ اب کوئی شخص خدا رسیدہ ایسا ہو نہیں سکتا جس پر خدا تعالیٰ کی تازہ بتازہ وحی نازل ہو اور وہ اس سے توفیق پا کر ان لوگوں کو صاف کرے جو گناہ آلود زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں افسوس سے ظاہر کرتا ہوں کہ آریہ سماج کے اندر ایک نیش ہے وہ بے جا طور سے مسلمانوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور اعتراض کرنا ہی اپنے مذہب کی خوبی اور کمال پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب ان سے پوچھا جاوے کہ اسلام کے مقابلہ میں روحانیت پیش کرو۔ تو کچھ نہیں۔ نکتہ چینی کرنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ شخص بڑا بدنصیب اور نادان ہے جو بغیر اس کے کہ کسی منزل پر پہنچا ہو دوسروں پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ ایک بچہ جو اقلیدس کے اصولوں سے ناواقف ہے اور ان نتائج سے بے خبر ہے جو اس کی اشکال سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان ٹیڑھی لکیروں کو دیکھ کر کب خوش ہو سکتا ہے وہ تو اعتراض کریگا لیکن عقلمندوں کے نزدیک اس اعتراض کی کیا وقعت اور حقیقت ہو سکتی ہے۔ ایسا ہی حال ان آریوں کا ہے۔ وہ اعتراض کرتے ہیں مگر خود حق اور حقیقت سے بے خبر اور محروم ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں سے آگاہ نہیں اور اس کی طاقتوں کا انہیں علم نہیں ہے۔ اور نہ انہیں وہ حواس ملے ہیں جو وہ اسی عالم میں بہشتی نظاروں کو دیکھ سکیں اور اللہ تعالیٰ کی طاقتوں اور قدرتوں کے نمونے مشاہدہ کریں ایسے مذہب کی بنیاد بالکل ریت پر ہے وہ آج بھی نہیں اور کل بھی نہیں۔ یہ خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی نابینا مذہب کی تائید نہیں کرتا۔ اور کوئی نصرت اسے نہیں دی جاتی۔ اسلام کی سچائی کی یہی بڑی زبردست دلیل ہے کہ ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ اس کی نصرت فرماتا ہے۔ اور اس زمانہ میں بھی خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تا میں اس کی تازہ بتازہ نصرتوں کا ثبوت دوں۔ چنانچہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جس نے خدا تعالیٰ کے نشانات نہ دیکھے ہوں؟...... اس کے بالمقابل ہمیں کوئی بتائے کہ وید کیا لایا؟ وہ تو بالکل ادھورا ہے دوسرے لوگوں کو تو خواب بھی آجاتی ہے مگر وید والوں کے نزدیک خواب بھی بے حقیقت چیز ہے اور وہ بھی نہیں آسکتی۔ جبکہ وہ دروازہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کے لیے یقینی دروازہ ہے بند ہے تو اور وسائل خدا رسی کے کیا ہو سکتے ہیں؟ میں سچ کہتا ہوں کہ جہاں تک میں نے اس فرقہ کے حالات دیکھے ہیں۔ ان میں شوخیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا؟ یا بعض ایسے لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ مذہب کی اصل غرض کیا ہے؟

غرض اسلام ایک ایسا پاک مذہب ہے جو ساری نیکیوں کا حقیقی سرچشمہ اور منبع ہے اس لیے کہ نیکیوں کی جڑھ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور وہ بدون اس کے پیدا نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں کے عجائبات اور نشانات تازہ بتازہ دیکھتا رہے۔ اور یہ بجز اسلام کے کسی دوسرے کو حاصل نہیں اگر ہے تو کوئی پیش کرے! علاوہ بریں اسلام کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ بعض فطرتی نیکیاں جو انسان کرتا ہے یہ ان پر ازدیاد کرتا اور انہیں کامل کرتا ہے اس لیے ہی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرمایا هُدًى لِّلظّٰلِمِيْنَ یا لِلْكٰفِرِيْنَ نہیں کہا۔ عرصہ کی بات ہے ایک برہمو اگنی ہوتری نے

[1] التوبہ۔ ع۔ ۱۵

کہا تھا کہ لا الہ الا اللہ تو ہم بھی کہتے ہیں تم محمد رسول اللہ کیوں کہتے ہو؟ ہم نے کہا تھا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان دہریہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب وہ کھلا دہریہ ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا ایمان ہوتا تو کیوں دہریہ بنتا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ قرآن شریف ایسی کامل اور جامع کتاب ہے کہ کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کیا وید میں کوئی ایسی شرتی ہے جو هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کا مقابلہ کرے؟ اگر زبانی اقرار کوئی چیز ہے یعنی اس کے ثمرات اور نتائج کی حاجت نہیں تو پھر تو ساری دنیا کسی نہ کسی رنگ میں خدا تعالیٰ کا اقرار کرتی ہے۔ اور بھگتی عبادت۔ صدقہ خیرات کو بھی اچھا سمجھتی ہے اور کسی نہ کسی صورت میں ان باتوں پر عمل بھی کرتی ہے پھر ویدوں نے آکر دنیا کو کیا بخشا؟ یا تو یہ ثابت کرو کہ جو قومیں وید کو نہیں مانتی ہیں ان میں نیکیاں بالکل مفقود ہیں اور یا کوئی امتیازی نشان بتاؤ؟

قرآن شریف کو جہاں سے شروع کیا ہے ان ترقیوں کا وعدہ کر لیا ہے جو بالطبع روح تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تعلیم کی۔ اور فرمایا کہ تم یہ دعا کرو کہ اے اللہ ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت فرما وہ صراط مستقیم جو ان لوگوں کی راہ ہے جن پر تیرے انعام واکرام ہوئے۔ اس دعا کے ساتھ ہی سورۃ البقر کی پہلی ہی آیت میں یہ بشارت دیدی ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ گویا روحیں دعا کرتی ہیں اور ساتھ ہی قبولیت اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اور وہ وعدہ دعا کی قبولیت کا قرآن مجید کے نزول کی صورت میں پورا ہوتا ہے۔ ایک طرف دعا ہے اور دوسری طرف اس کا نتیجہ موجود ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے جو اس نے فرمایا مگر افسوس دنیا اس سے بے خبر اور غافل ہے اور اس سے دور رہ کر ہلاک ہو رہی ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے جو ابتدائے قرآن مجید میں متقیوں کے صفات بیان فرمائے ہیں ان کو معمولی صفات میں رکھا ہے۔ لیکن جب انسان قرآن مجید پر ایمان لا کر اُسے اپنی ہدایت کے لیے دستور العمل بناتا ہے تو وہ ہدایت کے ان اعلیٰ مدارج اور مراتب کو پا لیتا ہے جو هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ میں مقصود رکھے ہیں قرآن شریف کی اس علت غائی کے تصوّر سے ایسی لذّت اور سرور آتا ہے کہ الفاظ میں ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ کے خاص فضل اور قرآن مجید کے کمال کا پتہ لگتا ہے۔ پھر متقی کی ایک اور علامت بیان فرمائی وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ یعنی جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی حالت ہوتی ہے اور اس میں سب کے سب شریک ہیں کیونکہ عام طور پر یہ فطرت انسانی کا ایک تقاضا ہے کہ اگر کوئی سائل اس کے پاس آجاوے تو کچھ نہ کچھ اسے ضرور دیدیتا ہے گھر میں دس روٹیاں موجود ہوں اور کسی سائل نے آکر صدا کی تو ایک روٹی اس کو بھی دیدیگا یہ امر زیر ہدایت نہیں ہے بلکہ فطرت کا ایک طبعی خاصہ ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہاں مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ عام ہے اس سے کوئی خاص شے روپیہ پیسہ یا روٹی کپڑا مراد نہیں ہے بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں۔

انفاق کی دو صورتیں غرض یہ انفاق عام انفاق ہے اور اس کے لیے مسلمان یا غیر مسلمان کی بھی شرط نہیں۔ اور اس لیے یہ انفاق دو قسم کا ہوتا ہے ایک فطرتی دوسرا زیر اثر نبوت. فطرتی تو وہی ہے جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ تم میں سے

کون ہے اگر کوئی قیدی یا بھوکا آدمی جو کئی روز سے بھوکا ہو یا ننگا ہو آکر سوال کرے اور تم اسے کچھ نہ کچھ دے نہ دو۔ کیونکہ یہ امر فطرت میں داخل ہے اور یہ بھی میں نے بتا دیا ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ روپیہ پیسہ سے مخصوص نہیں خواہ جسمانی ہو یا علمی سب اس میں داخل ہے جو علم سے دیتا ہے وہ بھی اس کے ماتحت ہے۔ مال سے دیتا ہے وہ بھی داخل ہے طبیب ہے وہ بھی داخل ہے مگر موجب منشاء ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں قرآن شریف اسے لے جانا چاہتا ہے اور وہ مقام ہے کہ انسان اپنی زندگی ہی خدا تعالیٰ کے لیے وقف کر دے اور یہ للّٰہی وقف کہلاتا ہے۔

اس حالت اور مقام پر جب ایک شخص پہنچتا ہے تو اس میں مِمَّا رہتا ہی نہیں کیونکہ جب تک وہ مِمَّا کی حد کے اندر ہے اس وقت تک وہ ناقص ہے اور اس علت غائی تک نہیں پہنچا جو قرآن مجید کی ہے لیکن کامل اسی وقت ہوتا ہے جب یہ حد نہ رہے اور اس کا وجود اس کا ہر فعل ہر حرکت و سکون محض اللہ تعالیٰ کے حکم اور اذن کے ماتحت بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے وقف ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو۔ کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کا کمال یہی ہے جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کے منشاء کے موافق ہے[1]

اس کے بعد ایک اور صفت متقیوں کی بیان کی یعنی وہ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ کے موافق ایمان لاتے ہیں اور ایسا ہی جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اگر اتنا ہی ایمان ہے تو پھر ہدایت کیا ہے؟ وہ ہدایت یہ ہے کہ ایسا انسان خود اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر وحی اور الہام کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اور وہ وحی الٰہی اس پر بھی اترتی ہے جس سے اس کا ایمان ترقی کر کے کامل یقین اور معرفت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ اس ترقی کو پالیتا ہے جو ہدایت کا اصل مقصود تھا۔ اس پر وہ انعام و اکرام ہونے لگتے ہیں۔ جو مکالمہ الٰہیہ سے ملتے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے وحی اور الہام کے دروازہ کو بند نہیں کیا جو لوگ اس اُمت کو الہام و وحی کے انعامات سے بے بہرہ ٹھیراتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں اور قرآن شریف کے اصل مقصد کو انہوں نے سمجھا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک یہ امت وحشیوں کی طرح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرات اور برکات کا معاذ اللہ خاتمہ ہو چکا اور وہ خدا جو ہمیشہ سے متکلم خدا رہا ہے۔ اب اس زمانہ میں آکر خاموش ہو گیا۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر مکالمہ مخاطبہ نہیں تو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا مطلب ہی کیا ہوا۔ بغیر مکالمہ مخاطبہ کے تو اس کی ہستی پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی؟ اور پھر قرآن شریف میں یہ کیوں کہا وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[2] اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا[3] یعنی جن لوگوں نے اپنے قول اور فعل سے بتا دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر انہوں نے استقامت دکھائی ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ فرشتوں کا نزول ہو اور مخاطبہ نہ ہو۔ نہیں بلکہ وہ انہیں بشارتیں دیتے ہیں۔ یہی تو

---

[1] الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۵ ٭ [2] العنکبوت۔ ع ۷ ٭ [3] حٰم السجدۃ۔ ع ۴ ٭

اسلام کی خوبی اور کمال ہے جو دوسرے مذاہب کو حاصل نہیں ہے۔

استقامت بہت مشکل چیز ہے یعنی خواہ ان پر زلزلے آئیں فتنے آئیں وہ ہر قسم کی مصیبت اور دکھ میں ڈالے جاویں مگر ان کی استقامت میں فرق نہیں آتا۔ ان کا اخلاص اور وفاداری پہلے سے زیادہ ہوتی ہے ایسے لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان پر خدا کے فرشتے اتریں اور انہیں بشارت دیں کہ تم کوئی غم نہ کرو۔ یہ یقیناً یاد رکھو کہ وحی اور الہام کے سلسلہ کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اکثر جگہ وعدے کیے ہیں اور یہ اسلام ہی سے مخصوص ہے۔ ورنہ عیسائیوں کے ہاں بھی مہر لگ چکی ہے وہ اب کوئی شخص ایسا نہیں بتا سکتے جو اللہ تعالیٰ کے مخاطبہ مکالمہ سے مشرف ہو۔ اور ویدوں پر تو پہلے ہی سے مہر لگی ہوئی ہے ان کا تو مذہب ہی یہی ہے کہ ویدوں کے الہام کے بعد پھر ہمیشہ کے لیے یہ سلسلہ بند ہو گیا گویا خدا پہلے کبھی بولا تھا مگر اب وہ گونگا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت کلام نہیں کرتا اور کوئی اس کے فیض سے بہرہ ور نہیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ پہلے بولتا تھا اور یا اب وہ سنتا اور دیکھتا بھی ہے؟ مجھے افسوس ہوتا ہے جب میں مسلمانوں کے منہ سے اس قسم کے الفاظ نکلتے سنتا ہوں کہ اب مخاطبہ مکالمہ کی نعمت کسی کو نہیں مل سکتی۔ یہ کیوں عیسائیوں یا آریوں کی طرح مہر لگاتے ہیں۔ اگر اسلام میں یہ کمال اور خوبی نہ ہو تو پھر دوسرے مذاہب پر اسے کیا فخر اور امتیاز حاصل ہوگا۔

نری توحید سے تو نہیں ہو سکتا کیونکہ برہمو بھی تو ایک ہی خدا کو مانتا ہے وہ بھی صدقہ دیتا ہے خدا کو اپنے طور پر یاد بھی کرتا ہے اور یہی اخلاقی صفات اس میں پائے جاتے ہیں تو پھر ایک مسلمان اور اس برہمو میں کیا فرق ہوا؟ یہ امور تو نقل سے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا کیا جواب ہے؟ کچھ بھی نہیں بجز اس کے کہ اسلام کا روشن چہرہ ان امتیازی نشانوں کے ذریعہ دکھایا جاوے جو خدا تعالیٰ کے مکالمہ کے ذریعہ ملتے ہیں۔ یقیناً سمجھو کہ اصل جو فضل آسمان سے آتا ہے اس کی کوئی چوری اور نقل نہیں کر سکتا اگر اسلام میں مکالمہ مخاطبہ اور تفضلات نہ ہوتے۔ تو اسلام کچھ بھی چیز نہ ہوتا! اس کا یہی تو فخر ہے کہ وہ ایک سچے مسلمان کو ان انعامات و اکرام کا وارث بنا دیتا ہے اور وہ فی الحقیقت خدا نما مذہب ہے۔ اسی دنیا میں باللہ تعالیٰ کو دکھا دیتا ہے اور یہی غرض ہے اسلام کی کیونکہ اسی ایک ذریعہ سے انسان کی گناہ آلود زندگی پر موت وارد ہو کر اسے پاک صاف بنا دیتی ہے اور حقیقی نجات کا دروازہ اس پر کھلتا ہے۔ کیونکہ جب تک خدا تعالیٰ پر کامل یقین نہ ہو گناہ سے کبھی نجات مل سکتی ہی نہیں۔ جیسے یہ ایک ظاہر امر ہے کہ جب انسان کو یقین ہو کہ فلاں جگہ سانپ ہے تو وہ ہرگز ہرگز اس جگہ داخل نہ ہوگا یا زہر کے کھانے سے مر جانے کا یقین زہر کے کھانے سے بچاتا ہے۔ پھر اگر خدا تعالیٰ پر پورا پورا یقین ہو کہ وہ سمیع اور بصیر ہے اور ہمارے افعال کی جزا دیتا ہے اور گناہ سے اسے سخت نفرت ہے تو اس یقین کو رکھ کر انسان کیسے جرأت کر سکتا ہے سچی بات یہ ہے کہ اسلام کی روح اور اصل حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مکالمہ اور مخاطبہ کا شرف وہ انسان کو عطا کرتا ہے خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ آسمان سے انعام و اکرام ملتے ہیں۔ جب انسان اس مرتبہ اور مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی نسبت کہا جاتا ہے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یعنی یہی وہ لوگ ہیں

جو کامل ترقی پاکر اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے نجات پائی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ ۲ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

تقویٰ علوم دینیہ کی کلید ہے | قرآن شریف نے شروع میں ہی فرمایا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ پس قرآن شریف کے سمجھنے اور اس کے موافق ہدایت پانے کے لیے تقویٰ ضروری اصل ہے ایسا ہی دوسری جگہ فرمایا لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ۔[1] دوسرے علوم میں یہ شرط نہیں۔ ریاضی۔ ہندسہ و ہیئت وغیرہ میں اس امر کی شرط نہیں کہ سیکھنے والا ضرور متقی اور پرہیزگار ہو بلکہ خواہ کیسا ہی فاسق و فاجر ہو وہ بھی سیکھ سکتا ہے مگر علم دین میں خشک منطقی اور فلسفی ترقی نہیں کر سکتا اور اس پر وہ حقائق اور معارف نہیں کھل سکتے جس کا دل خراب ہے اور تقویٰ سے حصہ نہیں رکھتا اور پھر کہتا ہے کہ علوم دین اور حقائق اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں وہ جھوٹ بولتا ہے ہرگز ہرگز اسے دین کے حقائق اور معارف سے حصہ نہیں ملتا بلکہ دین کے لطائف اور نکات کے لیے متقی ہونا شرط ہے جیسا کہ یہ فارسی شعر ہے ؎

عروس حضرت قرآن نقاب آنگاہ بردارد　　　کہ دار الملک معنے را کند خالی زہر غوغا

جب تک یہ بات پیدا نہ ہو اور دار الملک معنے خالی نہ ہو وہ غوغا کیا ہے؟ یہی فسق و فجور دنیا پسندی ہے۔ ہاں یہ جدا امر ہے کہ چور کی طرح کچھ کہلائے تو کہدے لیکن جو روح القدس سے بولتے ہیں وہ بجز تقویٰ کے نہیں بولتے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ تقویٰ تمام دینی علوم کی کنجی ہے انسان تقویٰ کے سوا ان کو نہیں سیکھ سکتا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یہ کتاب تقوی کرنے والوں کو ہدایت کرتی ہے اور وہ کون ہیں اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ یعنی ابھی وہ خدا نظر نہیں آتا۔ اور پھر نماز کو کھڑی کرتے ہیں یعنی نماز میں ابھی پورا سرور اور ذوق پیدا نہیں ہوتا تاہم بے لطفی اور بے ذوقی اور وساوس میں ہی نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ تجھ پر یا تجھ سے پہلے نازل کیا گیا ہے اُس پر ایمان لاتے ہیں۔

یہ متقی کے ابتدائی مدارج اور صفات ہیں۔ جیسا کہ مَیں نے ایک مرتبہ بیان کیا تھا بظاہر یہاں اعتراض ہوتا ہے کہ جب وہ خدا پر ایمان لاتے ہیں نماز پڑھتے ہیں خرچ کرتے ہیں اور ایسا ہی خدا کی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں پھر اس کے سوا نئی ہدایت کیا ہو گی؟ یہ تو گویا تحصیل حاصل ہوئی۔ یُنْفِقُوْنَ میں دونوں باتیں داخل ہیں دوسروں کو روٹی یا کپڑا یا مال دیتا ہے۔ اور یا قومی خرچ کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ عبارتیں اور یہ الفاظ اسی حد تک جو بیان کی گئی ہیں انسان کے کمال سلوک اور معرفت تامہ پر دلالت نہیں کرتے۔

اگر ہدایت کا انتہائی نقطہ نگاہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ہی تک ہو تو پھر معرفت کیا ہوئی؟ اس لیے جو شخص قرآن مجید کی ہدایت پر کاربند ہو گا وہ معرفت کے اعلیٰ مقام تک پہنچے گا اور وہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے نکل کر مشاہدہ کی حالت تک ترقی کرے گا۔ گویا خدا تعالیٰ کے وجود پر عین الیقین کا مقام ملیگا۔

[1] الواقعۃ۔ ع ۳۔

اس طرح پر نماز کے متعلق ابتدائی حالت تو یہی ہو گی جو یہاں بیان کی کہ وہ نماز کو کھڑی کرتے ہیں یعنی نماز گویا گری پڑتی ہے۔ گرنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں ذوق اور لذت نہیں بے ذوقی اور وساوس کا سلسلہ ہے اس لیے اس میں وہ کشش اور جذب نہیں کہ انسان جیسے بھوک پیاس سے بیقرار ہو کر کھانے اور پانی کے لیے دوڑتا ہے اسی طرح پر نماز کے لیے دیوانہ وار دوڑے۔ لیکن جب وہ ہدایت پاتا ہے تو پھر یہ صورت نہیں رہے گی اس میں ایک ذوق پیدا ہو جائے گا وساوس کا سلسلہ ختم ہو کر اطمینان اور سکینت کا رنگ شروع ہو گا۔

کہتے ہیں کسی شخص کی کوئی چیز گم ہو گئی تو اُس نے کہا کہ ذرا ٹھیر جاؤ نماز میں یاد آجاویگی یہ نماز کاملوں کی نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ اس میں تو شیطان اُنہیں وسوسہ ڈالتا ہے لیکن جب کامل کا درجہ ملیگا تو ہر وقت نماز ہی میں رہے گا اور ہزاروں لاکھ روپیہ کی تجارت اور مفاد بھی اس میں کوئی ہرج اور روک نہیں ڈال سکتا۔ اسی طرح پر باقی جو کیفیتیں ہیں وہ نرے قال کے رنگ میں نہ ہوں گی ان میں حالی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور غیب سے شہود پر پہنچ جاویگا۔ یہ مراتب نرے سُنانے ہی کو نہیں ہیں کہ بطور قصہ تم کو سُنا دیا اور تم بھی تھوڑی دیر کے لیے سُن کر خوش ہو گئے نہیں یہ ایک خزانہ ہے اس کو مت چھوڑو۔ اس کو نکال تو یہ تمہارے اپنے ہی گھر میں ہے اور تھوڑی سی محنت اور سعی سے اس کو پا سکتے ہو (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

سمجھنا چاہیئے کہ صفائی ذہن بھی تو آخر تقویٰ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ فرماتا ہے الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (۲/۱) یعنی یہ کتاب انہیں کو ہدایت نصیب کرتی ہے۔ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ اور جن میں تقویٰ نہیں وہ تو اندھے ہیں۔ اگر کوئی پاک نظر سے اور خدا کا خوف کر کے اس کو دیکھتا ہے۔ تب تو اس کو سب کچھ اس میں سے نظر آجاتا ہے اور اگر ضد اور تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھی ہوئی ہے تو وہ اس میں سے کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

پھر دیکھو کہ تقویٰ کو ایسی اعلیٰ درجہ کی ضروری شے قرار دیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی علت غائی اسی کو ٹھہرایا ہے چنانچہ دوسری سورۃ کو جب شروع کیا ہے تو یوں ہی فرمایا ہے الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن کریم کی یہ ترتیب بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس میں علل اربعہ کا ذکر فرمایا ہے علت فاعلی، مادی، صوری، غائی ہر ایک چیز کے ساتھ یہ چار ہی علل ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نہایت اکمل طور پر ان کو دکھاتا ہے الٓمّٓ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بہت جاننے والا ہے اس کلام کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے یعنی خدا اس کا فاعل ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یہ مادہ بتایا یہ کہو کہ یہ علت مادی ہے علت صوری لَا رَيْبَ فِيْهِ ہر ایک چیز میں شک شبہ اور ظنون فاسدہ پیدا ہو سکتے ہیں مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہے کہ اس میں کوئی ریب نہیں ہے لاریب اسی کے لیے ہے یعنی سب قسم کے ریب اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی شان یہ بتائی کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ تو طبعاً ہر ایک سلیم الفطرت اور سعادت مند انسان کی روح اُچھلے گی اور خواہش کریگی کہ اس کی ہدایتوں پر عمل کرے۔ ہم افسوس سے کہتے ہیں کہ

قرآن شریف کی اجلیٰ اور اصفیٰ شان کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا ورنہ قرآن شریف کی خوبیاں اور اس کے کمالات اس کا حُسن اپنے اندر ایک ایسا کشش اور جذب رکھتا ہے کہ بے اختیار ہو ہو کر دل اس کی طرف چلے آئیں مثلاً اگر ایک خوش نما باغ کی تعریف کی جاوے اس کے خوشبودار درختوں اور دل کو تر و تازہ کرنے والی بوٹیوں اور روشوں اور مصفا پانی کی بہتی ہوئی ندیوں اور نہروں کا تذکرہ کیا جاوے تو ہر ایک شخص دل سے چاہے گا کہ اس کی سیر کرے اور اس سے حظ اٹھاوے اور اگر یہ بھی بتایا جاوے کہ اس میں بعض چشمے ایسے جاری ہیں جو امراض مزمنہ اور مہلکہ کو شفا دیتے ہیں تو اور بھی زیادہ جوش اور طلب کے ساتھ لوگ وہاں جائیں گے۔ اسی طرح پر قرآن شریف کی خوبیوں اور کمالات کو اگر نہایت ہی خوبصورت اور موثر الفاظ میں بیان کیا جاوے تو روح پورے جوش کے ساتھ اس طرف دوڑتی ہے اور حقیقت میں روح کی تسلی اور سیری کا سامان اور وہ بات جس سے روح کی حقیقی احتیاج پوری ہوتی ہے قرآن کریم ہی میں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ اور دوسری جگہ کہا لَا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ[1] مطہرون سے مراد وہی متقین ہیں جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ قرآنی علوم کے انکشاف کے لیے تقویٰ شرط ہے علوم ظاہری اور علوم قرآنی کے حصول کے درمیان ایک عظیم الشان فرق ہے۔ دنیوی اور رسمی علوم کے حاصل کرنے کے واسطے تقویٰ شرط نہیں ہے۔ صرف و نحو طبعی۔ فلسفہ۔ ہیئت و طبابت پڑھنے والے کے واسطے یہ ضروری امر نہیں ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو اوامر الٰہی اور نواہی کو ہر وقت مد نظر رکھتا ہو۔ اپنے ہر فعل و قول کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکومت کے نیچے رکھے۔ بلکہ بسا اوقات کیا عموماً دیکھا گیا ہے کہ دنیوی علوم کے ماہر اور طلبگار دہریہ منش ہو کر ہر قسم کے فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں آج دنیا کے سامنے ایک زبردست تجربہ موجود ہے۔ یورپ اور امریکہ باوجودیکہ وہ لوگ ارضی علوم میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں اور آئے دن نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں لیکن اُن کی روحانی اور اخلاقی حالت بہت کچھ قابل شرم ہے۔ لنڈن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے حالات جو کچھ شائع ہوتے رہیں ہم تو ان کا ذکر بھی نہیں کر سکتے۔ مگر علوم آسمانی اور اسرار قرآنی کی واقفیت کے لیے تقویٰ پہلی شرط ہے اس میں توبۃ النصوح کی ضرورت ہے جب تک انسان پوری فروتنی اور انکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ اٹھالے۔ اور اس کے جلال اور جبروت سے لرزاں ہو کر نیازمندی کے ساتھ رجوع نہ کرے۔ قرآنی علوم کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ اور روح کے اُن خواص اور قویٰ کی پرورش کا سامان اس کو قرآن شریف سے نہیں مل سکتا جس کو پاکر روح میں ایک لذت اور تسلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اس کے علوم خدا کے ہاتھ میں ہیں پس اس کے لیے تقویٰ بطور نردبان کے ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ بے ایمان۔ شریر۔ خبیث النفس ارضی خواہشوں کے اسیران سے بہرہ ور ہوں۔ اس واسطے اگر ایک مسلمان مسلمان کہلا کر خواہ وہ صرف و نحو۔ معانی و بدیع وغیرہ علوم کا کتنا ہی بڑا فاضل کیوں نہ ہو۔ دنیا کی نظر میں شیخ الکل فی الکل بنا بیٹھا ہو لیکن اگر تزکیہ نفس نہیں کرتا۔ قرآن شریف کے

---

[1] الواقعۃ۔ع۔۳۔

علوم سے اس کو حصّہ نہیں دیا جاتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کی توجہ ارضی علوم کی طرف بہت جھکی ہوئی ہے۔ اور مغربی روشنی نے عالم کو اپنی نئی ایجادوں اور صنعتوں سے حیران کر رکھا ہے مسلمانوں نے بھی اگر اپنی فلاح اور بہتری کی کوئی راہ سوچی تو بدقسمتی سے یہ سوچی ہے کہ وہ مغرب کے رہنے والوں کو اپنا امام بنائیں اور یورپ کی تقلید پر فخر کریں۔ یہ تو نئی روشنی کے مسلمانوں کا حال ہے جو لوگ پُرانے فیشن کے مسلمان کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو حامی دین متین سمجھتے ہیں ان کی ساری عمر کی تحصیل کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ صرف و نحو کے جھگڑوں اور اُلجھیڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ضالین کے تلفظ پر مرمٹے ہیں۔ قرآن شریف کی طرف بالکل توجہ ہی نہیں اور ہو کیونکر جبکہ وہ تزکیہ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

ہاں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو تزکیہ نفس کے دعوے کرتا ہے وہ صوفیوں اور سجادہ نشینوں کا گروہ ہے مگر ان لوگوں نے قرآن شریف کو تو چھوڑ دیا ہے اور اپنے ہی طریق اختراع کر لیے ہیں کوئی چلہ کشیاں کرتا ہے کوئی اِلا اللہ کے نعرے مارتا ہے کوئی نفی اثبات۔ توجہ۔ حبسِ دم وغیرہ میں مبتلا ہیں غرض ایسے طریقے نکالے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہوتے اور نہ قرآن شریف کا یہ منشا ہے۔ اور نہ کبھی سلسلہ نبوت نے ایسے طریقوں کو پسند کیا۔ غرض یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب تک انسان ایک پاک تبدیلی نہیں کرتا ہے اور نفس کا تزکیہ نہیں کرتا قرآن شریف کے معارف اور خوبیوں پر اطلاع نہیں ملتی۔ قرآن شریف میں وہ نکات اور حقائق ہیں جو رُوح کی پیاس کو بُجھا دیتے ہیں کاش دنیا کو معلوم ہوتا کہ روح کی لذت کس چیز میں ہے اور پھر وہ معلوم کرتی کہ وہ قرآن شریف اور صرف قرآن شریف میں موجود ہے۔

دیکھو جس جس قدر انسان تبدیلی کرتا جاتا ہے اسی قدر وہ ابدال کے زمرہ میں داخل ہوتا جاتا ہے حقائق قرآنی نہیں کھلتے جب تک ابدال کے زمرہ میں داخل نہ ہو۔ لوگوں نے ابدال کے معنے سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ اور اپنے طور پر کچھ کا کچھ سمجھ لیا ہے اصل یہ ہے کہ ابدال وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اندر پاک تبدیلی کرتے ہیں۔ اور اس تبدیلی کی وجہ سے ان کے قلب گناہ کی تاریکی اور زنگ سے صاف ہو جاتے ہیں شیطان کی حکومت کا استیصال ہو کر اللہ تعالیٰ کا عرش ان کے دل پر ہوتا ہے۔ پھر وہ روح القدس سے قوت پاتے اور خدا تعالیٰ سے فیض پاتے ہیں۔ تم لوگوں کو میں بشارت دیتا ہوں کہ تم میں سے جو اپنے اندر تبدیلی کریگا وہ ابدال ہے انسان اگر خدا کی طرف قدم اٹھائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا فضل دوڑ کر اس کی دستگیری کرتا ہے۔ یہ سچی بات ہے اور مَیں تمہیں بتاتا ہوں کہ چالاکی سے علوم القرآن نہیں آتے۔ دماغی قوت اور ذہنی ترقی قرآنی علوم کو جذب کرنیکا اکیلا باعث نہیں ہو سکتا۔ اصل ذریعہ تقویٰ ہی ہے متقی کا معلّم خدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیوں پر اُمیّت غالب ہوتی ہے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے اُمّی بھیجا کہ باوجودیکہ آپ نے نہ کسی مکتب میں تعلیم پائی اور نہ کسی کو استاد بنایا۔ پھر آپ نے وہ معارف اور حقائق بیان کیے جو دنیوی علوم کے ماہروں کو دنگ اور حیران کر دیا قرآن شریف جیسی پاک۔ کامل کتاب آپ کے لبوں پر جاری ہوئی جس کی فصاحت و بلاغت نے سارے عرب کو خاموش کرا دیا۔ وہ کیا بات تھی جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم علوم میں سب سے بڑھ گئے۔ وہ تقویٰ ہی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مطہر زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت

ہوسکتا ہے کہ قرآن شریف جیسی کتاب وہ لائے جس کے علوم نے دنیا کو حیران کر دیا ہے۔

آپ کا اُمّی ہونا ایک نمونہ اور دلیل ہے اس امر کی کہ قرآنی علوم یا آسمانی علوم کے لیے تقویٰ مطلوب ہے نہ دنیوی چالاکیاں۔ غرض قرآن شریف کی اصل غرض اور غایت دنیا کو تقویٰ کی تعلیم دینا ہے جس کے ذریعہ وہ ہدایت کے منشاء کو حاصل کر سکے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱ تا ۳)

یہ بات بدیہی ہے کہ جب تک انسان اپنے اخلاق ردّیہ کو نہیں چھوڑتا اس وقت تک اُن اخلاق کے مقابل پر جو اخلاق فاضلہ ہیں جو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں اُن کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ دو ضدیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ سورۂ بقر کی ابتدا میں اُس نے فرمایا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی قرآن شریف اُن لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو متقی ہیں یعنی وہ لوگ جو تکبر نہیں کرتے اور خشوع اور انکسار سے خدا تعالیٰ کی کلام میں غور کرتے ہیں وُہی ہیں جو آخر کو ہدایت پاتے ہیں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۷)

بباعث ضعف بشریت انسان کی فطرت میں ایک بخل بھی ہے کہ اگر ایک پہاڑ سونے کا بھی اُس کے پاس ہو تب بھی ایک حصہ بخل کا اس کے اندر رہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ اپنا تمام مال اپنے ہاتھ سے چھوڑ دے لیکن جب بموجب آیت هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے ایک وہبی قوت اس کے شامل حال ہو جاتی ہے تو پھر ایسا انشراح صدر ہو جاتا ہے کہ تمام بخل سارا شُحّ نفس دور ہو جاتا ہے تب خدا کی رضا جوئی ہر ایک مال سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ زمین پر فانی خزانے جمع کرے بلکہ آسمان پر اپنا مال جمع کرتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۷ حاشیہ)

اسلام نے بہت ہی آسان راہ رکھی ہے اور وہ کشادہ راہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ اب اللہ تعالیٰ نے جو یہ دعا سکھائی ہے تو اس طور پر نہیں کہ دعا تو سکھا دی لیکن سامان کچھ نہیں۔ بلکہ جہاں دعا سکھائی ہے وہاں سب کچھ موجود ہے چنانچہ اگلی سورت میں اس قبولیت کا اشارہ ہے جہاں فرمایا۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ یہ ایسی دعوت ہے کہ دعوت کا سامان پہلے سے طیّار ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

بے نقط لکھنا کوئی اعلیٰ درجہ کی بات نہیں۔ یہ ایک قسم کا تکلف ہے اور تکلفات میں پڑنا لغو امر ہے۔ مومنوں کی شان یہ ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ[1]۔ یعنی مومن وہ ہوتے ہیں جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں اگر بے نقط ہی کو معجزہ سمجھتے ہو تو قرآن شریف میں بھی ایک بے نقط معجزہ ہے اور وہ یہ ہے لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ اس میں ریب کا کوئی لفظ نہیں۔ یہی اس کا معجزہ ہے لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ[2]۔ اس سے بڑھکر اور کیا خوبی ہوتی۔ مَیں نے کئی بار اشتہار دیا ہے کہ کوئی ایسی سچائی پیش کرو جو ہم قرآن شریف سے نہ نکال سکیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

---

[1] سورہ مومنون۔ ع۔ ۱۔ ۱ [2] حٰم السجدہ۔ ع۔ ۵ +

دین کی راہ میں دو قسم کی تکلیفیں ہیں ایک تکالیف شرعیہ۔ جیسا کہ نماز ہے اور روزہ ہے اور حج ہے اور زکوٰۃ ہے۔ نماز کے واسطے انسان اپنے کاروبار کو ترک کرتا ہے اور ان کا ہرج بھی کر کے مسجد میں جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں پچھلی رات اُٹھتا ہے۔ ماہ رمضان میں دن بھر کی بھوک اور پیاس برداشت کرتا ہے۔ حج میں سفر کی صعوبتیں اُٹھاتا ہے زکوٰۃ میں اپنی محنت کی کمائی دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے یہ سب تکالیف شرعیہ ہیں اور انسان کے واسطے موجب ثواب ہیں اس کا قدم خدا کی طرف بڑھاتی ہیں۔ لیکن ان سب میں انسان کو ایک وسعت دی گئی ہے اور وہ اپنے آرام کی راہ تلاش کر لیتا ہے جاڑے کے موسم میں وضو کے واسطے پانی گرم کر لیتا ہے بہ سبب علالت کھڑا ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے۔ رمضان میں سحری میں اُٹھ کر خوب کھانا کھا لیتا ہے بلکہ بعض لوگ ماہ صیام میں معمول سے بھی زیادہ خرچ کھانے پینے پر کر لیتے ہیں۔ غرض ان تکالیف شرعیہ میں کچھ نہ کچھ آرام کی صورت ساتھ ساتھ انسان نکالتا رہتا ہے۔ اس واسطے اس سے پورے طور پر صفائی نہیں ہوتی۔ اور منازل سلوک جلدی سے طے نہیں ہو سکتے۔ لیکن سماوی تکالیف جو آسمان سے اُترتی ہیں ان میں انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ اور بہرحال برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس واسطے ان کے ذریعہ سے انسان کو خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

ہر دو قسم کی تکلیف شرعی اور سماوی کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں (کیا ہے) : تکالیف شرعی کے متعلق پہلے سیپارہ میں فرمایا ہے الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی مومن وہ ہے۔ جو خدا تعالیٰ پر غیب سے ایمان لاتے ہیں اپنی نماز کو کھڑا کرتے ہیں۔ یعنی صدہا وساوس آکر دل کو اور طرف پھیر دیتے ہیں۔ مگر وہ بار بار خدا کی طرف توجہ کر کے اپنی نماز کو (جو) بہ سبب وساوس کے گرتی رہتی ہے۔ بار بار کھڑا کرتے رہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے دئیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ تکالیف شرعیہ ہیں۔ مگر ان پر پورے طور سے بھروسہ حصول ثواب کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بہت سی باتوں میں انسان غفلت کرتا ہے۔ اکثر نماز کی حقیقت اور مغز سے بے خبر ہو کر صرف پوست کو ادا کرتا ہے۔ اس واسطے انسانی مدارج کی ترقی کے واسطے سماوی تکالیف بھی رکھی گئی ہیں۔ ان کا ذکر بھی خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ؕ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ[1]

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۵ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

سورۃ بقرہ کے شروع میں ہی جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہا گیا تو گویا خدا تعالیٰ نے دینے کی طیاری کی یعنی یہ کتاب متقی کو کمال تک پہنچانے کا وعدہ کرتی ہے۔ سو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب اُن کے لیے نافع ہے۔ جو پرہیز کرنے

[1] البقرۃ: ۱۵۶ تا ۱۵۸

اور نصیحت سننے کو طیار ہو۔ اس درجہ کا متقی وہ ہے جو مخلّی بالطبع ہو کر حق کی بات سننے کو طیار ہو جیسے جب کوئی مسلمان ہوتا ہے تو وہ متقی بنتا ہے۔ جب کسی غیر مذہب کے اچھے دن آئے تو اُس میں اتّقا پیدا ہُوا۔ عُجب۔ غرور۔ پندار دور ہُوا۔ یہ تمام روکیں تھیں جو دور ہو گئیں۔ ان کے دور ہونے سے تاریک گھر کی کھڑکی کھُل گئی۔ اور شعاعیں اندر داخل ہو گئیں یہ جو فرمایا کہ یہ کتاب متقین کی ہدایت ہے۔ یعنی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ تو اتقا جو افتعال کے باب پر ہے اور یہ باب تکلف کے لیے آیا کرتا ہے یعنی اس میں اشارہ ہے کہ جس قدر یہاں ہم تقویٰ چاہتے ہیں۔ وہ تکلف سے خالی نہیں جس کی حفاظت کے لیے اس کتاب میں ہدایات ہیں۔ گویا متقی کو نیکی کرنے میں تکلیف سے کام لینا پڑتا ہے۔ جب یہ درجہ گزر جاتا ہے تو سالک عبد صالح ہو جاتا ہے گویا تکلیف کا رنگ دور ہُوا۔ اور صالح نے طبعاً و فطرتاً نیکی شروع کی وہ ایک قسم کے دارالامان میں ہے جس کو کوئی خطرہ نہیں۔ اب کل جنگ اپنے نفسانی جذبات کے برخلاف ختم ہو چکی اور وہ امن میں آگیا۔ اور ہر ایک قسم کے خطرات سے پاک ہو گیا۔ اس امر کی طرف ہمارے ہادی کامل نے اشارہ کیا ہے فرمایا کہ ہر ایک کے ساتھ شیطان ہوتا ہے لیکن میرا شیطان مسلم ہو گیا ہے۔ سو متقی کو ہمیشہ شیطان کے مقابل جنگ ہے لیکن جب وہ صالح ہو جاتا ہے تو کل جنگیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک ریا ہی ہے جس سے اُسے آٹھوں پہر جنگ ہے۔ متقی ایک ایسے میدان میں ہے۔ جہاں ہر وقت لڑائی ہے۔ اللہ کے فضل کا ہاتھ اُس کے ساتھ ہو۔ تو اُسے فتح ہو۔ جیسے ریا جس کی چال ایک چیونٹی کی طرح ہے۔ بعض وقت انسان بے سمجھے لیکن موقعہ پر ریا کو دل میں پیدا ہونے کا موقعہ دیدیتا ہے۔ مثلاً ایک کا چاقو گم ہو جاوے۔ اور وہ دوسرے سے دریافت کرے۔ تو اس موقعہ پر ایک متقی کا جنگ شیطان سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو اُسے سکھاتا ہے۔ کہ مالک چاقو کا اس طرح دریافت کرنا ایک قسم کی بے عزتی ہے جس سے اُس کے افروختہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ آپس میں لڑائی بھی ہو جائے۔ اس موقعہ پر ایک متقی کو اپنے نفس کی بدخواہش سے جنگ ہے۔ اگر اس شخص میں محض لِلّٰہ دیانت موجود ہو۔ تو غصہ کرنے کی اس میں ضرورت ہی کیا ہے۔ کیونکہ دیانت جس قدر مخفی رکھی جاوے اسی قدر بہتر ہو۔ مثلاً ایک جواہری کو راستہ میں چند چور مل جاویں اور چور آپس میں اُس کے متعلق مشورہ کریں۔ بعض اُسے دولت مند بتلاویں اور بعض کہیں کہ وہ کنگال ہے۔ اب مقابلتاً یہ جواہری اُنہیں کو پسند کریگا۔ جو اُسے کنگال ظاہر کریں گے۔ اسی طرح یہ دنیا کیا ہے۔ ایک قسم کی دارالابتلا ہے۔ وہی اچھا ہے جو ہر ایک امر خفیہ رکھے اور ریا سے بچے۔ وہ لوگ جن کے اعمال لِلّٰہی ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر اپنے اعمال کو ظاہر ہونے نہیں دیتے۔ یہی لوگ متقی ہیں۔ مَیں نے تذکرۃ الاولیاء میں دیکھا ہے کہ ایک مجمع میں ایک بزرگ نے سوال کیا۔ کہ اُس کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کوئی اُس کی مدد کرے۔ ایک نے صالح سمجھ کر اُس کو ایک ہزار روپیہ دیا۔ اُنہوں نے روپیہ لیکر اُس کی سخاوت اور فیاضی کی تعریف کی۔ اس بات پر وہ رنجیدہ ہُوا۔ کہ جب یہاں ہی تعریف ہو گئی تو شاید ثواب آخرت سے محرومیت ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آیا۔ اور کہا کہ وہ روپیہ اُس کی والدہ کا تھا۔ جو دینا نہیں چاہتی۔ چنانچہ وہ روپیہ واپس دیا گیا۔ جس پر ہر ایک نے لعنت کی اور کہا کہ جھوٹا ہے اصل میں یہ روپیہ

دینا نہیں چاہتا۔ جب شام کے وقت وہ بزرگ گھر گیا۔ تو وہ شخص ہزار روپیہ اُس کے پاس لایا۔ اور کہا کہ آپ نے سرعام میری تعریف کر کے مجھے محروم ثواب آخرت کیا۔ اس لیے مَیں نے یہ بہانہ کیا۔ اب یہ روپیہ آپ کا ہے۔ لیکن آپ کسی کے آگے نام نہ لیں۔ بزرگ رو پڑا اور کہا کہ اب تو قیامت تک مورد لعن طعن ہُوا۔ کیونکہ کل کا واقعہ سب کو معلوم ہے۔ اور یہ کسی کو معلوم نہیں کہ تو نے مجھے روپیہ واپس دیدیا ہے۔

ایک متقی تو اپنے نفس امارہ کے برخلاف جنگ کر کے اپنے خیال کو چھپاتا ہے۔ اور خفیہ رکھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اُس خفیہ خیال کو ہمیشہ ظاہر کر دیتا ہے۔ جیسا ایک بدمعاش کسی بدچلنی کا مرتکب ہو کر خفیہ رہنا چاہتا ہے۔ اُسی طرح ایک متقی چُھپ کر نماز پڑھتا ہے اور ڈرتا ہے۔ کہ کوئی اُس کو نہ دیکھ لے۔ سچا متقی ایک قسم کا ستر چاہتا ہے تقوی کے مراتب بہت ہیں لیکن بہرحال تقوی کے لیے تکلف ہے۔ اور متقی حالت جنگ میں ہے۔ اور صالح اُس جنگ سے باہر ہے جیسے کہ میں نے مثال کے طور پر اوپر ریا کا ذکر کیا۔ جس سے متقی کو آٹھوں پہر جنگ ہے۔ بسا اوقات ریا اور حلم کا جنگ ہو جاتا ہے۔ کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔ گالی سُن کر اُس کا نفس جوش مارتا ہے۔ تقوی تو اُس کو سکھلاتا ہے۔ کہ وہ غصہ ہونے سے باز رہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا[1]۔ س ۱۹۔ ایسا ہی بے صبری کے ساتھ اُسے اکثر جنگ کرنا پڑتا ہے۔ بے صبری سے مراد یہ ہے کہ اُس کو راہ تقوی میں اس قدر دقتوں کا مقابلہ ہے۔ کہ مشکل سے وہ منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ اس لیے بے صبر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک کنوئاں پچاس ہاتھ تک کھودنا ہے۔ اگر دو چار ہاتھ کے بعد کھودنا چھوڑ دیا جائے۔ تو محض یہ ایک بدظنی ہے۔ اب تقوی کی شرط یہ ہے۔ کہ جو اللہ تعالیٰ نے احکام دیئے اُس کو اخیر تک پہنچائے اور بے صبر نہ ہو جاوے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۹-۴۱)

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کی علت غائی بیان کرنے میں فرمایا ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یہ نہیں فرمایا کہ هُدًى لِّلْفٰسِقِيْنَ یا هُدًى لِّلْكَافِرِيْنَ ابتدائی تقوی جس کے حصول سے متقی کا لفظ انسان پر صادق آسکتا ہے وہ ایک فطرتی حصہ ہے کہ جو سعیدوں کی خلقت میں رکھا گیا ہے۔ اور ربوبیت اولیٰ اس کی مربی اور وجود بخش ہے جس سے متقی کا پہلا تولد ہے۔ مگر وہ اندرونی نور جو روح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ عبودیت خالصہ تامہ اور ربوبیت کاملہ مستجمعہ کے پورے جوڑ و اتصال سے بطرز ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[2] کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیت ثانیہ ہے۔ جس سے متقی تولد ثانی پاتا ہے اور ملکوتی مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے بعد ربوبیت ثالثہ کا درجہ ہے۔ جو خلق جدید سے موسوم ہے جس سے متقی لاہوتی مقام پر پہنچتا ہے اور تولد ثانی پاتا ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) بقیہ جلد اوّل ملحقہ جلد دوم صفحہ ۱۵ حاشیہ)

---

[1] الفرقان۔ ع۔ ۶ + [2] المومنون۔ ع۔ ۱ +

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھیج کر بجائے خود ایک روحانی معجزہ دکھایا تاکہ انسان اُن معارف اور حقائق اور روحانی خوارق کو معلوم کرے جن کا اُسے پتہ نہ تھا۔ مگر افسوس کہ قرآن کی اس علت غائی کو چھوڑ کر جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے اُس کو صرف چند قصص کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اور نہایت بے پروائی اور خود غرضی سے مشرکین عرب کی طرح اساطیر الاولین کہہ کر ٹالا جاتا ہے۔ وہ زمانہ تھا آنحضرت صلعم کی بعثت کا اور قرآن کے نزول کا۔ جب وہ دنیا سے گم شدہ طاقتوں کو یاد دلانے کے لیے آیا تھا۔ اب وہ زمانہ آگیا جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے پیشینگوئی کی تھی کہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن اُن کے حلق سے قرآن نہ اُترے گا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۴)

یاد رکھو کہ کتاب مجید کے بھیجنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ دنیا پر عظیم الشان رحمت کا نمونہ دکھاوے۔ جیسے فرمایا مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[1] اور ایسا ہی قرآن مجید کے بھیجنے کی غرض بتائی کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ یہ ایسی عظیم الشان اغراض ہیں کہ ان کی نظیر نہیں پائی جا سکتی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

اصول تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان عبودیت کو چھوڑ کر الوہیت کے ساتھ ایسا مل جاوے جیسا کہ لکڑی کے تختے دیوار کے ساتھ مل کر ایک ہو جاتے ہیں اس کے اور خدا کے درمیان کوئی شے حائل نہ رہے۔ امور تین قسم کے ہوتے ہیں ایک یقینی بدیہی یعنی ظاہر دیکھنے میں ایک بات بری یا بھلی ہے دوم یقینی نظری یعنی ویسا یقین تو نہیں مگر پھر بھی نظری طور پر دیکھنے میں وہ امر اچھا یا بُرا ہو سوم وہ امور جو مشتبہ ہوں یعنی اُن میں شبہ ہو کہ شاید یہ بُرے ہوں پس متقی وہ ہے کہ اس احتمال اور شبہ سے بھی بچے اور تینوں مراتب کو طے کرے ..... تقویٰ کے مضمون پر ہم کچھ شعر لکھ رہے تھے اُس میں ایک مصرع الہامی درج ہوا وہ شعر یہ ہے

ہر اِک نیکی کی جڑ یہ اتقا ہے اگر یہ جڑ رہی سب کچھ رہا ہے

اس میں دوسرا مصرعہ الہامی ہے جہاں تقویٰ نہیں وہاں حسنہ حسنہ نہیں اور کوئی نیکی نیکی نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف کی تعریف میں فرماتا ہے کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ قرآن بھی اُن لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کریں۔ ابتدا میں قرآن کے دیکھنے والوں کا تقویٰ یہ ہے کہ جہالت اور حسد اور بخل سے قرآن شریف کو (نہ) دیکھیں بلکہ نورِ قلب کا تقویٰ ساتھ لیکر صدق نیت سے قرآن شریف کو پڑھیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۲ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

ہمارے فقراء نے بہت سی بدعتیں اپنے اندر داخل کر لی ہیں۔ بعض نے ہندوؤں کے منتر بھی یاد کیے ہوئے ہیں۔ اور ان کو بھی مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے بھائی صاحب کو ورزش کا شوق تھا۔ ان کے پاس ایک پہلوان آیا

[1] الانبیاء ع ۷۔

تھا۔ جاتے ہوئے اس نے ہمارے بھائی صاحب کو الگ لے جا کر کہا کہ مَیں ایک عجیب تحفہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو بہت ہی قیمتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے ایک منتر پڑھ کر ان کو سنایا اور کہا کہ یہ منتر ایسا پُر تاثیر ہے۔ کہ اگر ایک دفعہ صبح کے وقت اس کو پڑھ لیا جاوے تو پھر سارا دن نہ نماز کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ وضو کی ضرورت۔ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے کلام کی ہتک کرتے ہیں۔ وہ کلام پاک جس میں ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ کا وعدہ دیا گیا ہے خود اس کو چھوڑ کر دوسری طرف بھٹکتے پھرتے ہیں۔ انسان کے ایمان میں ترقی تب ہی ہو سکتی ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ کے فرمودہ پر چلے اور خدا پر اپنے توکل کو قائم کرے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

قرآن شریف تقویٰ ہی کی تعلیم دیتا ہے اور یہی اس کی علت غائی ہے اگر انسان تقویٰ اختیار نہ کرے تو اُس کی نمازیں بھی بے فائدہ اور دوزخ کی کلید ہو سکتی ہیں چنانچہ اس کی طرف اشارہ کر کے سعدی کہتا ہے

کلیدِ درِ دوزخ است آن نماز — کہ در چشم مردم گذاری دراز

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

ساری جڑ تقویٰ اور طہارت ہے اسی سے ایمان شروع ہوتا ہے اور اسی سے اس کی آبپاشی ہوتی ہے اور نفسانی جذبات دبتے ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

تقویٰ سے سب شے ہے قرآن نے ابتدا اسی سے کی ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے بھی مراد تقویٰ ہے کہ انسان اگرچہ عمل کرتا ہے مگر خوف سے جرأت نہیں کرتا کہ اسے اپنی طرف منسوب کرے اور اُسے خدا کی استعانت سے خیال کرتا ہے اور پھر اُسی سے آیندہ کے لیے استعانت طلب کرتا ہے پھر دوسری سورت بھی ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ سے شروع ہوتی ہے نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ سب اسی وقت قبول ہوتا ہے جب انسان متقی ہو اُس وقت خدا تمام داعی گناہ کے اُٹھا دیتا ہے بیوی کی ضرورت ہو تو بیوی دیتا ہے دوا کی ضرورت ہو تو دوا دیتا ہے جس شی کی حاجت ہو وہ دیتا ہے اور ایسے مقام سے روزی دیتا ہے کہ اُسے خبر نہیں ہوتی۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۷۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

جہاں قرآن شریف میں تقویٰ کا ذکر کیا ہے وہاں بتایا ہے کہ ہر ایک علم (اس سے اخروی علم مراد ہے زمینی اور دنیوی علم مراد نہیں) کی جڑ تقویٰ ہی ہے اور تمام نیکیوں کی جڑ یہی تقویٰ ہے متقی کا خدا تعالیٰ خود متکفل ہوتا ہے اور اس کے لیے عجیب در عجیب نشان ظاہر کرتا ہے۔ قرآن شریف نے شروع میں ہی فرمایا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ پس قرآن شریف کے سمجھنے اور اس کے موافق ہدایت پانے کے لیے تقویٰ ضروری اصل ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۶-۷)

تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ ہر چیز کی جڑ ہے۔ تقویٰ کے معنی ہیں ہر ایک باریک در باریک رگ گناہ سے بچنا۔ تقویٰ اس کو

کہتے ہیں کہ جس امر میں بدی کا شبہ بھی ہو اُس سے بھی کنارہ کرے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

تقویٰ کا اثر اسی دنیا میں متقی پر شروع ہو جاتا ہے یہ صرف اُدھار نہیں۔ نقد ہے بلکہ جس طرح زہر کا اثر اور تریاق کا اثر فوراً بدن پر ہوتا ہے اسی طرح تقویٰ کا اثر بھی ہوتا ہے (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ صفحہ ۱ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء)

میری رائے میں ائمہ اربعہ ایک برکت کا نشان تھے اور ان میں روحانیت تھی۔ کیونکہ روحانیت تقویٰ سے شروع ہوتی ہے اور وہ لوگ درحقیقت متقی تھے اور خدا سے ڈرتے تھے اور ان کے دل کلاب الدنیا سے مناسبت نہ رکھتے تھے۔

یاد رکھو یہ تقویٰ بڑی چیز ہے خوارق کا صدور بھی تقویٰ ہی سے ہوتا ہے اور اگر خوارق نہ بھی ہوں پھر بھی تقویٰ سے عظمت ملتی ہے تقویٰ ایک ایسی دولت ہے کہ اس کے حاصل ہونے سے انسان خدا تعالیٰ کی محبت میں فنا ہو کر نقش وجود مٹا سکتا ہے کمال تقویٰ کا یہی ہے کہ اس کا اپنا وجود ہی نہ رہے۔ اور صیقل زدم آں قدر کہ آئینہ نہ ماند کا مصداق ہو جائے اصل میں یہی توحید اور یہی وحدت وجود تھی جس میں لوگوں نے غلطیاں کھا کر کچھ کا کچھ بنا لیا ہے۔ یہ کیا دین اور تقویٰ ہے کہ ایک ضعیف انسان اور بے چارہ بندہ ہو کر خدائی کا دعویٰ کرے.... اصل یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ اور تزکیہ نفس کا مدار ہے تقویٰ اور خدا کا خوف جو بدقسمتی سے ان لوگوں میں نہیں ہوتا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲-۳)

حقیقت میں تقویٰ ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے انسان کا اکرام ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۵)

اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور اس کو راضی کرنے کے لیے جو شخص ہر ایک بدی سے بچتا ہے اس کو متقی کہتے ہیں.... اللہ تعالیٰ تو متقی کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا[1] یعنی جو اللہ تعالیٰ کے لیے تقویٰ اختیار کرتا ہے تو ہر مشکل سے اللہ تعالیٰ اس کو رہائی دیدیتا ہے لوگوں نے تقویٰ کے چھوڑنے کے لیے طرح طرح کے بہانے بنا رکھے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جھوٹ بولے بغیر ہمارے کاروبار نہیں چل سکتے اور دوسرے لوگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ اگر سچ کہا جائے تو وہ لوگ ہم پر اعتبار نہیں کرتے پھر بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ سُود لینے کے بغیر ہمارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ کیونکر متقی کہلا سکتے ہیں خدا تعالیٰ تو وعدہ کرتا ہے کہ میں متقی کو ہر ایک مشکل سے نکالوں گا اور ایسے طور سے رزق دوں گا جو گمان اور وہم میں بھی نہ آسکے اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے جو لوگ ہماری کتاب پر عمل کریں گے ان کو ہر طرف سے اوپر سے اور نیچے رسے) رزق دونگا۔ پھر فرمایا ہے کہ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ[2] جس کا مطلب یہی ہے کہ رزق تمہارا تمہاری اپنی محنتوں اور کوششوں اور منصوبوں سے وابستہ نہیں وہ اس سے بالاتر ہے یہ لوگ ان وعدوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ جو شخص تقویٰ اختیار نہیں کرتا وہ معاصی میں غرق رہتا ہے اور بہت ساری رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَنْ عَادَا لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ۔ الحدیث۔ جو شخص میرے ولی کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اب دیکھ لو کہ متقی کی شان کس قدر بلند ہے اور اس کا

---

[1] الطلاق - ع - ۱ + [2] الذاریات - ع - ۱+

پایہ کس قدر عالی ہے جس کا قرب خدا کی جناب میں ایسا ہے کہ اس کا ستایا جانا خدا کا ستایا جانا ہو۔ تو خدا اُس کا کس قدر معاون و مددگار ہوگا۔ لوگ بہت سی مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ لیکن متقی بچائے جاتے ہیں۔ بلکہ اُن کے پاس جو آجاتا ہے وہ بھی بچایا جاتا ہے مصائب کی کوئی حد نہیں۔ انسان کا اپنا اندر اس قدر مصائب سے بھرا ہُوا ہے کہ اس کا کوئی اندازہ نہیں امراض کو ہی دیکھ لیا جاوے کہ ہزارہا مصائب کے پیدا کرنے کو کافی ہیں لیکن جو تقویٰ کے قلعہ میں ہوتا ہے وہ ان سے محفوظ ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ ایک ایسے جنگل میں ہے جو درندہ جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۵-۳۶)

اللہ تعالیٰ نے متقیوں کے لیے چاہا ہے کہ ہر دو لذتیں اُٹھائیں۔ بعض وقت دنیوی لذات آرام اور طیبات کے رنگ میں بعض وقت عسرت اور مصائب میں۔ تاکہ اُن کے دونو اخلاق کامل نمونہ دکھا سکیں۔ بعض اخلاق طاقت میں اور بعض مصائب میں کھُلتے ہیں۔ ہمارے نبی کریمؐ کو یہ دونو باتیں میسر آئیں۔ سو جس قدر ہم آپ کے اخلاق پیش کر سکیں گے۔ کوئی اور قوم اپنے کسی نبی کے اخلاق پیش نہ کر سکے گی۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۷)

اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ[1]۔ ۳۲ ۔ کہ ہم اس دنیا میں بھی اور آئندہ بھی متقی کے ولی ہیں۔ سو یہ آیت بھی تکذیب میں اُن نادانوں کی ہے جنہوں نے اس زندگی میں نزول ملائکہ سے انکار کیا۔ اگر نزع میں نزول ملائکہ تھا تو حیات الدنیا میں خدا تعالیٰ کیسے ولی ہُوا۔

سو یہ ایک نعمت ہے کہ ولیوں کو خدا کے فرشتے نظر آتے ہیں۔ آئندہ کی زندگی محض ایمانی ہے لیکن ایک متقی کو آئندہ کی زندگی یہیں دکھلائی جاتی ہے۔ اُنہیں اسی زندگی میں خدا ملتا ہے نظر آتا ہے اُن سے باتیں کرتا ہے۔ سو اگر ایسی صورت کسی کو نصیب نہیں تو اُس کا مرنا اور یہاں سے چلے جانا نہایت خراب ہے ایک ولی کا قول ہے کہ جس کو ایک خواب سچا عمر میں نصیب نہیں ہوا اس کا خاتمہ خطرناک ہے جیسے کہ قرآن مومن کے یہ نشان ٹھہراتا ہے۔ سو جس میں یہ نشان نہیں اُس میں تقویٰ نہیں۔ سو ہم سب کی یہ دعا چاہیئے کہ یہ شرط ہم میں پوری ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام۔ خواب۔ مکاشفات کا فیضان ہو کیونکہ یہ مومن کا خاصہ ہے سو یہ ہونا چاہیئے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۷-۳۸)

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ ایمان لانے پر ثواب اسی وجہ سے ملتا ہے کہ ایمان لانے والا چند قرائن صدق کے لحاظ سے ایسی باتوں کو قبول کر لیتا ہے کہ وہ ہنوز مخفی ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہ نے مومنوں کی تعریف قرآن کریم میں فرمائی ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ یعنی ایسی بات کو مان لیتے ہیں کہ وہ ہنوز در پردہ غیب ہے جیسا کہ صحابہ کرام نے ہمارے سیّد و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مان لیا اور کسی نے نشان نہ مانگا اور کوئی ثبوت طلب نہ کیا اور گو بعد اس کے اپنے وقت پر بارش کی طرح نشان برسے اور معجزات ظاہر ہوئے لیکن صحابہ کرام ایمان لانے میں معجزات کے محتاج نہیں ہوئے اور اگر وہ معجزات کے دیکھنے پر ایمان موقوف

[1] حٰمٓ السجدۃ۔ ع ۔ ۴ ۔

رکھتے تو ایک ذرہ بزرگی اُن کی ثابت نہ ہوتی اور عوام میں سے شمار کیے جاتے اور خدائے تعالیٰ کے مقبول اور پیارے بندوں میں داخل نہ ہو سکتے کیونکہ جن جن لوگوں نے نشان مانگا خدائے تعالیٰ نے اُن پر عتاب ظاہر کیا اور درحقیقت ان کا انجام اچھا نہ ہوا اور اکثر وہ بے ایمانی کی حالت میں ہی مرے۔ غرض خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نشان مانگنا کسی قوم کے لیے مبارک نہیں ہوا اور جس نے نشان مانگا وہی تباہ ہوا انجیل میں بھی حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ اس وقت کے حرامکار مجھ سے نشان مانگتے ہیں ان کو کوئی نشان دیا نہیں جائے گا۔ مَیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ بالطبع ہر یک شخص کے دل میں اس جگہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ بغیر کسی نشان کے حق اور باطل میں انسان کیونکر فرق کر سکتا ہے اور اگر بغیر نشان دیکھنے کے کسی کو منجانب اللہ قبول کیا جائے تو ممکن ہے کہ اس قبول کرنے میں دھوکا ہو۔ اس کا جواب وہی ہے جو مَیں لکھ چکا ہوں کہ خدائے تعالیٰ نے ایمان کا ثواب اکثر اسی امر سے مشروط کر رکھا ہے کہ نشان دیکھنے سے پہلے ایمان ہو اور حق اور باطل میں فرق کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ چند قرائن جو وجہ تصدیق ہو سکیں اپنے ہاتھ میں ہوں اور تصدیق کا پلّہ تکذیب کے پلّہ سے بھاری ہو۔ مثلاً حضرت صدیق اکبر ابوبکر رضی اللہ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو انہوں نے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا اور جب پوچھا گیا کہ کیوں ایمان لائے تو بیان کیا کہ میرے پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امین ہونا ثابت ہے اور مَیں یقین رکھتا ہوں کہ انہوں نے کبھی کسی انسان کی نسبت بھی جھوٹ کو استعمال نہیں کیا چہ جائیکہ خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھیں۔ ایسا ہی اپنے اپنے مذاق پر ہر یک صحابی ایک ایک اخلاقی یا تعلیمی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی دیکھ کر اور اپنی نظر دقیق سے اُس کو وجہ صداقت ٹھہرا کر ایمان لائے تھے اور اُن میں سے کسی نے بھی نشان نہیں مانگا تھا اور کاذب اور صادق میں فرق کرنے کے لیے اُن کی نگاہوں میں یہ کافی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تقویٰ کے اعلیٰ مراتب پر ہیں اپنے منصب کے اظہار میں بڑی شجاعت اور استقامت رکھتے ہیں اور جس تعلیم کو لائے ہیں وہ دوسری سب تعلیموں سے صاف تر اور پاک تر اور سراسر نور ہے اور تمام اخلاق حمیدہ میں بے نظیر ہیں اور للّٰہی جوش اُن میں اعلیٰ درجہ کے پائے جاتے ہیں اور صداقت اُن کے چہرہ پر برس رہی ہے پس انہیں باتوں کو دیکھ کر اُنہوں نے قبول کر لیا کہ وہ درحقیقت خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اس جگہ یہ نہ سمجھا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے معجزات ظاہر نہیں ہوئے بلکہ تمام انبیا سے زیادہ ظاہر ہوئے لیکن عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ اوائل میں کھلے کھلے معجزات اور نشان مخفی رہتے ہیں تا صادقوں کا صدق اور کاذبوں کا کذب پرکھا جائے یہ زمانہ ابتلا کا ہوتا ہے اور اس میں کوئی کھلا کھلا نشان ظاہر نہیں ہوتا پھر جب ایک گروہ صافی دلوں کا اپنی نظر دقیق سے ایمان لے آتا ہے اور عوام کالانعام باقی رہ جاتے ہیں تو اُن پر حجت پوری کرنے کے لیے یا اُن پر عذاب نازل کرنے کے لیے نشان ظاہر ہوتے ہیں مگر ان نشانوں سے وہی لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں جو پہلے ایمان لا چکے تھے اور بعد میں ایمان لانے والے بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ ہر روزہ تکذیب سے اُن کے دل سخت ہو جاتے ہیں اور اپنی

مشہور کردہ رائوں کو وہ بدل نہیں سکتے آخر اسی کفر اور انکار میں واصل جہنم ہوتے ہیں۔

مجھے دلی خواہش ہے اور میں دُعا کرتا ہوں کہ آپ کو یہ بات سمجھ آ جاوے کہ درحقیقت ایمان کے مفہوم کے لیئے یہ بات ضروری ہے کہ پوشیدہ چیزوں کو مان لیا جائے اور جب ایک چیز کی حقیقت ہر طرح سے کھل جائے یا ایک وافر حصہ اُس کا کھل جائے تو پھر اُس کا مان لینا ایمان میں داخل نہیں مثلاً اب جو دن کا وقت ہے اگر میں یہ کہوں کہ میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ اب دن ہے رات نہیں ہے تو میرے اِس ماننے میں کیا خوبی ہوگی اور اس ماننے میں مجھے دوسروں پر کیا زیادت ہے سعید آدمی کی پہلی نشانی یہی ہے کہ اِس بابرکت بات کو سمجھ لے کہ ایمان کس چیز کو کہا جاتا ہے کیونکہ جس قدر ابتدائے دنیا سے لوگ انبیا کی مخالفت کرتے آئے ہیں اُن کی عقلوں پر یہی پردہ پڑا ہوا تھا کہ وہ ایمان کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ جب تک دوسرے امور مشہودہ محسوسہ کی طرح انبیا کی نبوت اور اُن کی تعلیم کھُل نہ جائے تب تک قبول کرنا مناسب نہیں اور وہ بیوقوف یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ کھُلی ہوئی چیز کو ماننا ایمان میں کیوں کر داخل ہوگا وہ تو ہندسہ اور حساب کی طرح ایک علم ہوا نہ کہ ایمان پس یہی حجاب تھا کہ جس کی وجہ سے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اوائل میں ایمان لانے سے محروم رہے اور پھر جب اپنی تکذیب میں پختہ ہو گئے اور مخالفانہ رائوں پر اصرار کر چکے اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے کھُلے کھُلے نشان ظاہر ہوئے تب اُنہوں نے کہا کہ اب قبول کرنے سے مرنا بہتر ہے غرض نظر دقیق سے صادق کے صدق کو شناخت کرنا سعیدوں کا کام ہے اور نشان طلب کرنا نہایت منحوس طریق اور اشقیا کا شیوہ ہے جس کی وجہ سے کروڑہا منکر ہیزم جہنم ہو چکے ہیں خدائے تعالیٰ اپنی سنت کو نہیں بدلتا وہ جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے اُن ہی کے ایمان کو ایمان سمجھتا ہے جو زیادہ ضد نہیں کرتے اور قراین مرجحہ کو دیکھ کر اور علامات صدق پا کر صادق کو قبول کر لیتے ہیں اور صادق کا کلام صادق کی راست بازی صادق کی استقامت اور خود صادق کا مُونہہ ان کے نزدیک اس کے صدق پر گواہ ہوتا ہے مبارک وہ جن کو مردم شناسی کی عقل دی جاتی ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۳۳۶-۳۳۹)

متقی کی حالت میں چونکہ رویت باری تعالیٰ اور مکالمات و مکاشفات کے مراتب حاصل نہیں ہوتے۔ اس لیے اس کو اول ایمان بالغیب ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ تکلف کے طور پر ایمانی درجہ ہوتا ہے کیونکہ قرائن قویہ کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لاتا ہے جو بین الشک والیقین ہوتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض آدمی تقویٰ کے اس درجہ پر بھی نہیں ہوتے یہ دہریہ منش لوگ ہیں وہ آثار اور آیات قدرت کو تو دیکھتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل نہیں ہوتے اور نہیں مانتے۔ مگر متقی اللہ تعالیٰ کو مان لیتا ہے۔ اور اس پر ایمان لاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ یہ مت سمجھو کہ یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ یا اس کا مرتبہ کم ہے۔ اور جو فہم سے بڑھ کر قدم مارتے ہیں۔ وہ بڑے مجاہد ہیں اور اُن کے لیے بڑے بڑے مراتب اللہ

مدارج پر ہیں نہیں۔ بلکہ یہ ایمان بالغیب متقی کے پہلے درجہ کی حالت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی وقعت رکھتی ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ جانتے ہو سب سے بڑھ کر ایمان کس کا ہے۔ صحابہ نے عرض کی کہ حضور آپ کا ہی ہے آپ نے فرمایا کہ میرا کس طرح ہو سکتا ہے میں تو ہر روز جبریل کو دیکھتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نشانات کو ہر وقت دیکھتا ہوں۔ پھر صحابہ نے عرض کی کہ کیا ہمارا ایمان؟ پھر آپ نے فرمایا کہ تمہارا ایمان کس طرح تم بھی تو نشانات دیکھتے ہو۔ آخر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ صدہا سال کے میرے بعد آئیں گے۔ ان کا ایمان عجیب ہے کیونکہ وہ کوئی بھی ایسا نشان نہیں دیکھتے جیسے تم دیکھتے ہو مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں۔ غرض خدا تعالیٰ متقی کو اگر وہ اسی ابتدائی درجہ میں مر جاوے تو اسی زمرہ میں داخل کر لیتا ہے۔ اور اسی دفتر میں اس کا نام لکھ دیتا ہے باوجودیکہ وہ مکالمات اور مخاطبات الٰہیہ کو نہیں جانتا۔ اور اس لذت اور نعمت سے ابھی اس نے کچھ بھی نہیں پایا لیکن پھر بھی وہ ایسی قوت دکھاتا ہے کہ نہ صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان ہی رکھتا ہے بلکہ اس ایمان کو اپنے عمل سے بھی ثابت کرتا ہے یعنی یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ۔

تقویٰ کی اس حالت میں نمازوں میں بھی وسوسے ہوتے ہیں اور قسم قسم کے وہم اور شکوک پیدا ہو کر خیالات کو پراگندہ کرتے ہیں۔ باوجود اس کے بھی وہ نماز نہیں چھوڑتے اور نہیں تھکتے اور ہارتے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کہ چند روز نماز پڑھی اور ظنون فاسدہ اور خیالات پراگندہ دل میں گذرنے لگے۔ نماز چھوڑ دی اور ہار کر بیٹھ رہے مگر متقی اپنی ہمت نہیں ہارتا وہ نماز کو کھڑی کرتا نماز گری پڑتی ہے۔ وہ بار بار اسے کھڑی کرتا ہے۔ تقویٰ کی حالت میں دو زمانے متقی پر آتے ہیں۔ ایک ابتلا کا زمانہ دوسرا اصطفا کا زمانہ ابتلا کا زمانہ اس لیے آتا ہے کہ تا تمہیں اپنی قدر و منزلت اور قابلیت کا پتہ مل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر راستبازوں کی طرح ایمان لاتا ہے۔ اس لیے کبھی اس کو وہم اور شکوک آ کر پریشان دل کرتے ہیں کبھی کبھی خدا تعالیٰ ہی کی ذات پر اعتراض اور وہم پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ صادق مومن کو اس مقام پر ڈرنا اور گھبرانا نہ چاہیئے بلکہ آگے ہی قدم رکھے کسی نے کہا ہے ؎

عشق اول سرکش و خونی بود تا گریزد ھر کہ بیرونی بود

شیطان پلید کا کام ہے کہ وہ راضی نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے منکر نہ کرالے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے روگردان نہ کر لے۔ وہ وساوس پر وساوس ڈالتا رہتا ہے لاکھوں کروڑوں انسان انہیں وسوسوں میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب کرلیں پھر دیکھا جائے گا۔ باوجود اس کے کہ انسان کو اس بات کا علم نہیں کہ ایک سانس کے بعد دوسرا سانس آئیگا بھی یا نہیں لیکن شیطان ایسا دلیر کرتا ہے کہ وہ بڑی بڑی جھوٹی امیدیں دیتا اور سبز باغ دکھاتا ہے۔ شیطان کا یہ پہلا سبق ہوتا ہے۔ مگر متقی بہادر ہوتا ہے

اس کو ایک جرأت دی جاتی ہے کہ وہ ہر وسوسہ کا مقابلہ کرتا ہے اس لیے یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ فرمایا یعنی اس درجہ میں وہ ہارتے اور تھکتے نہیں اور ابتدا میں اُنس اور ذوق اور شوق کا نہ ہونا اُن کو بیدل نہیں کرتا وہ اسی بے ذوقی اور بے لطفی میں بھی نماز پڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سب وساوس اور اوہام دور ہو جاتے ہیں۔ شیطان کو شکست ملتی اور مومن کامیاب ہو جاتا ہے غرض متقی کا یہ زمانہ سستی کا زمانہ نہیں ہوتا بلکہ میدان میں کھڑے رہنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ وساوس کا پوری مردانگی سے مقابلہ کرے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ - ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲،۱)

تقویٰ..... کسی قدر تکلف کو چاہتا ہے۔ اسی لیے تو فرمایا۔ کہ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ۔ اس میں ایک تکلف ہے۔ مشاہدہ کے مقابل ایمان بالغیب لانا ایک قسم کے تکلف کو چاہتا ہے۔ سو متقی کے لیے ایک حد تک تکلف ہے۔ کیونکہ جب وہ صالح کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ تو پھر غیب اُس کے لیے غیب نہیں رہتا۔ کیونکہ صالح کے اندر سے ایک نہر نکلتی ہے جو اُس میں سے نکل کر خدا تک پہنچتی ہے۔ وہ خدا اور اس کی محبت کو اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے کہ مَنۡ کَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی[1]۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک انسان پوری روشنی اسی جہان میں نہ حاصل کرلے وہ کبھی خدا کا منہ نہ دیکھے گا سو متقی کا کام یہی ہے۔ کہ وہ ہمیشہ ایسے سرمے طیار کرتا رہے جس سے اُس کا روحانی نزول الماء دور ہو جاوے۔ اب اس سے ظاہر ہے۔ کہ متقی شروع میں اندھا ہوتا ہے۔ مختلف کوششوں اور تزکیوں سے وہ نور حاصل کرتا ہے۔ سو جب سوجاکھا ہو گیا۔ اور صالح بن گیا۔ پھر ایمان بالغیب نہ رہا۔ اور تکلف بھی ختم ہو گیا۔ جیسے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برأی العین اسی عالم میں بہشت و دوزخ وغیرہ سب کچھ مشاہدہ کرایا گیا۔ جو متقی کو ایک ایمان بالغیب کے رنگ میں ماننا پڑتا ہے۔ وہ تمام آپ کے مشاہدہ میں آ گیا۔ سو اس آیت میں اشارہ ہے کہ متقی اگرچہ اندھا ہے۔ اور تکلف کی تکلیف میں ہے۔ لیکن صالح ایک دارالامان میں آ گیا ہے۔ اور اُس کا نفس نفس مطمئنہ ہو گیا ہے۔ متقی اپنے اندر ایمان بالغیب کی کیفیت رکھتا ہے۔ وہ اندھا دھند طریق سے چلتا ہے اُس کو کچھ خبر نہیں۔ ہر ایک بات پر اُس کا ایمان بالغیب ہے۔ یہی اُس کا صدق ہے۔ اور اس صدق کے مقابل خدا کا وعدہ ہے کہ وہ فلاح پائے گا اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۔

اس کے بعد متقی کی شان میں آیا ہے۔ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ یعنی وہ نماز کو کھڑی کرتا ہے۔ یہاں لفظ کھڑی کرنے کا آیا ہے۔ یہ بھی اُس تکلف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو متقی کا خاصہ ہے۔ یعنی جب وہ نماز شروع کرتا ہے۔ تو طرح طرح کے وساوس کا اُسے مقابلہ ہے۔ جن کے باعث اس کی نماز گویا بار بار گرتی پڑتی ہے۔ جس کو اُس نے کھڑا کرنا ہے۔ جب اُس نے اَللّٰهُ اَکۡبَرُ کہا تو ایک ہجوم وساوس ہے۔ جو اُس کے حضور قلب میں تفرق ڈال رہا ہے۔ وہ ان سے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ پریشان ہوتا ہے۔ ہر چند حضور و ذوق کے لیے لڑتا مرتا ہے۔ لیکن نماز جو گری پڑتی ہے۔ بڑی جانکنی

---

[1] بنی اسرائیل - ع - ۸

سے اُسے کھڑا کرنے کے فکر میں ہے۔ بار بار اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر نماز کے قائم کرنے کے لیے دعا مانگتا ہے۔ اور ایسے اَلصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ کی ہدایت چاہتا ہے جس سے اُس کی نماز کھڑی ہو جاوے۔ ان وساوس کے مقابل میں متقی ایک بچہ کی طرح ہے جو خدا کے آگے گڑگڑاتا ہے۔ روتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ میں اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ[1] ہو رہا ہوں سو یہی وہ جنگ ہے جو متقی کو نماز میں نفس کے ساتھ کرنا ہے۔ اور اسی پر ثواب مترتب ہو گا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نماز میں وساوس کو فی الفور دور کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کی منشاء کچھ اور ہے کیا خدا نہیں جانتا حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا قول ہے کہ ثواب اس وقت تک ہے جب تک مجاہدات ہیں۔ اور جب مجاہدات ختم ہوئے۔ تو ثواب ساقط ہو جاتا ہے۔ گویا صوم و صلوٰۃ اُس وقت تک اعمال ہیں جب تک ایک جدوجہد سے وساوس کا مقابلہ ہے۔ لیکن جب اُن میں ایک اعلیٰ درجہ پیدا ہو گیا اور صاحبِ صوم و صلوٰۃ تقویٰ کے تکلف سے بچ کر صلاحیت سے رنگین ہو گیا۔ تو اب صوم و صلوٰۃ اعمال نہیں رہے۔ اس موقع پر اُنہوں نے سوال کیا ہے۔ کہ کیا اب نماز معاف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ثواب تو اُس وقت تک تھا جس وقت تک تکلف کرنا پڑتا تھا۔ سو بات یہ ہے۔ کہ نماز اب عمل نہیں بلکہ ایک انعام ہے۔ یہ نماز اُس کی ایک غذا ہے۔ اُس کے لیے قُرَّۃُ الْعَیْنِ ہے۔ یہ گویا نقد بہشت ہے۔

مقابل میں وہ لوگ جو مجاہدات میں ہیں۔ وہ کشتی کر رہے ہیں اور یہ نجات پا چکا ہے۔ سو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا سلوک جب ختم ہوا۔ تو اُس کے مصائب بھی ختم ہو گئے۔ مثلاً ایک مخنث اگر کہے کہ وہ کبھی کسی عورت کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ تو وہ کونسی نعمت یا ثواب کا مستحق ہے اُس میں تو صفت بدنظری ہے ہی نہیں۔ لیکن ایک مرد صاحب رجولیت اگر ایسا کرے تو ثواب پاوے گا۔ اسی طرح انسان کو ہزاروں مقامات طے کرنے پڑتے ہیں۔ بعض بعض امور میں اس کی مشاقی اُس کو قادر کر دیتی ہے نفس کے ساتھ اُس کی مصالحت ہو گئی۔ اب وہ ایک بہشت میں ہے۔ لیکن وہ پہلا سا ثواب نہیں رہے گا۔ وہ ایک تجارت کر چکا ہے۔ جس کا اب وہ نفع اُٹھا رہا ہے۔ لیکن پہلا رنگ نہ رہے گا۔ انسان میں ایک فعل تکلف سے کرتے کرتے اُس میں طبیعت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جو طبعی طور سے لذت پاتا ہے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اس کام سے ہٹایا جاوے۔ وہ طبعاً یہاں سے ہٹ نہیں سکتا۔ سو اتقا اور تقویٰ کی حد تک پورا انکشاف نہیں ہوتا وہ ایک قسم کا دعویٰ ہے اس کے بعد متقی کی شان میں وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ آیا ہے۔ یہاں متقی کے لیے مِمَّا کا لفظ استعمال کیا۔ کیونکہ اس وقت وہ ایک اعمٰی کی حالت میں ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ خدا نے اُس کو دیا اُس میں سے کچھ خدا کے نام کا دیا۔ حق یہ ہے کہ اگر وہ آنکھ رکھتا۔ تو دیکھ لیتا کہ اس کا کچھ بھی نہیں۔ سب خدا کا ہی ہے۔ یہ ایک حجاب تھا۔ جو اتقا میں لازمی ہے۔ اس حالت اتقا کے تقاضے نے متقی سے خدا کے دیئے میں سے کچھ دلوایا۔ رسول اکرمؐ نے حضرت عائشہؓ سے ایام وفات میں دریافت فرمایا کہ گھر میں

---

[1] الاعراف - ع - ۲۲ - ۵

کچھ ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک دینار تھا۔ فرمایا کہ یہ سیرت یگانگت سے بعید ہے۔ کہ ایک چیز بھی اپنے پاس رکھی جاوے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اتقا کے درجہ سے گذر کر صلاحیت تک پہنچ چکے تھے۔ اس لیے مِمَّا اُن کی شان میں نہ آیا۔ کیونکہ وہ اندھا ہے جس نے کچھ اپنے پاس رکھا اور کچھ خدا کو دیا لیکن یہ لازمۂ متقی تھا۔ کیونکہ خدا کے راہ (میں) دینے میں بھی اُسے نفس کے ساتھ جنگ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ دیا اور کچھ رکھا۔ وہاں رسول اکرم نے سب خدا کو دیا۔ اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔

جیسے دھرم مہوتسو کے مضمون میں انسان کی تین حالتیں ذکر کی گئی ہیں۔ جو انسان پر ابتدا سے انتہا تک وارد ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی قرآن نے جو انسان کو تمام مراحل ترقی کے طے کرانے آیا۔ اتقا سے شروع کیا۔ یہ ایک تکلف کا راستہ ہے۔ یہ ایک خطرناک میدان ہے۔ اُس کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اور مقابل بھی تلوار ہے۔ اگر بچ گیا۔ تو نجات پا گیا۔ وَاِلَّا اَسْفَلُ السّٰفِلِیْن میں پڑ گیا۔ چنانچہ یہاں متقی کی صفات میں یہ نہیں فرمایا۔ کہ جو کچھ ہم دیتے ہیں۔ اُسے سب کا سب خرچ کر دیتا ہے۔ متقی میں ابھی اس قدر ایمانی طاقت نہیں جو نبی کی شان ہوتی ہے۔ کہ وہ ہمارے ہادی کامل کی طرح کل کا کل دیا ہوا خدا کا خدا کو دیدے۔ اسی لیے پہلے مختصر سا ٹیکس لگایا گیا تاکہ چاشنی چکھ کر زیادہ کے لیے طیار ہو جاوے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ رزق سے مراد صرف مال نہیں۔ بلکہ جو کچھ اُن کو عطا ہوا۔ علم۔ حکمت۔ طبابت۔ یہ (سب) کچھ رزق میں ہی شامل ہے۔ اُس کو اسی میں سے خدا کی راہ میں بھی خرچ کرنا ہے۔ انسان نے اس راہ میں بتدریج اور زینہ بہ زینہ ترقی کرنا ہے۔ اگر انجیل کی طرح یہ تعلیم ہوتی۔ کہ گال پر ایک طمانچہ کھا کر دوسرے طمانچہ کے لیے گال آگے رکھ دی جاوے۔ یا سب کچھ دے دیا جاوے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح تعلیم کے ناممکن التعمیل ہونے کے باعث ثواب سے محروم رہتے۔ لیکن قرآن تو حسب فطرت انسانی آہستہ آہستہ ترقی کراتا ہے انجیل کی مثال تو اُس لڑکے کی ہے۔ جو مکتب میں داخل ہوتے ہی بڑی مشکل مکتب کی کتاب پڑھنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اُس کی حکمت کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے تھا۔ کہ تدریج کے ساتھ تعلیم کی تکمیل ہو۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۶-۴۷)

قرآن شریف کی اصل غرض اور غایت دنیا کو تقویٰ کی تعلیم دینا ہے جس کے ذریعہ وہ ہدایت کے منشاء کو حاصل کر سکے۔ اب اس آیت میں تقویٰ کے تین مراتب کو بیان کیا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں مگر طوطے کی طرح سے یونہی بغیر سوچے سمجھے چلے جاتے ہیں جیسے ایک پنڈت اپنی پوتھی کو اندھا دھند پڑھتا جاتا ہے نہ خود کچھ سمجھتا ہے اور نہ سننے والوں کو پتہ لگتا ہے اسی طرح پر قرآن شریف کی تلاوت کا طریق صرف یہ رہ گیا ہے کہ دو چار سپارے پڑھ لیے اور کچھ معلوم نہیں کہ کیا پڑھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ سُر لگا کر پڑھ لیا۔ اور ق اور ع کو پورے طور پر ادا کر دیا۔ قرآن شریف کو عمدہ طور پر اور

خوش الحانی سے پڑھنا یہ بھی ایک اچھی بات ہے مگر قرآن شریف کی تلاوت کی اصل غرض تو یہ ہے کہ اس کے حقائق اور معارف پر اطلاع ملے اور انسان ایک تبدیلی اپنے اندر کرے ۔ یہ یاد رکھو کہ قرآن شریف میں ایک عجیب و غریب اور سچا فلسفہ ہے ۔ اس میں ایک نظام ہے جس کی قدر نہیں کی جاتی جب تک نظام اور ترتیب قرآنی کو مدِّنظر نہ رکھا جاوے اور اس پر پورا غور نہ کیا جاوے قرآن شریف کی تلاوت کے اغراض پورے نہ ہوں گے۔[1]

غرض بات یہ تھی کہ قرآن شریف میں ترتیب کو مدنظر رکھنا ضروری ہے اور یہ آئتیں جو میں نے پڑھی تھیں ان میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۔ یاد رکھو اتقا تین قسم کا ہوتا ہے پہلی قسم اتقا کی علمی رنگ رکھتی ہے یہ حالت ایمان کی صورت میں ہوتی ہے ۔ دوسری قسم عملی رنگ رکھتی ہے جیسا کہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں فرمایا ہے ۔ انسان کی وہ نمازیں جو شبہات اور وساوس میں مبتلا ہیں کھڑی نہیں ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے یَقْرَؤُنَ نہیں فرمایا بلکہ یُقِیْمُوْنَ فرمایا یعنی جو حق ہے اس کے ادا کرنے کا ۔ سنو! ہر ایک چیز کی ایک علت غائی ہوتی ہے اگر اس سے رہ جاوے تو وہ بیفایدہ ہو جاتی ہے مثلاً ایک بیل جو قلبہ رانی کے واسطے خریدا گیا ہے اپنے منصب پر اس وقت قائم سمجھا جاویگا کہ وہ کر کے دکھا دے نہ صرف یہ کہ اس کی غرض وغایت کھانے پینے ہی تک محدود رہے ۔ وہ اپنی علت غائی سے دور ہے اور اس قابل ہے کہ اس کو ذبح کیا جاوے ۔ اسی طرح یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ سے لوازم الصلوٰۃ معراج ہے اور یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق شروع ہوتا ہے مکاشفات اور رویا صالحہ آتے ہیں لوگوں سے انقطاع ہوتا جاتا ہے اور خدا کی طرف ایک تعلق پیدا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ تبتل تام ہو کر خدا میں جا ملتا ہے ۔

صَلی جلنے کو کہتے ہیں جیسے کباب کو بھونا جاتا ہے اسی طرح نماز میں سوزش لازمی ہے جب تک دل بریان نہ ہو نماز میں لذت اور سرور پیدا نہیں ہوتا اور اصل تو یہ ہے کہ نماز ہی اپنے سچے معنوں میں اُس وقت ہوتی ہے نماز میں یہ شرط ہے کہ وہ بجمیع شرائط ادا ہو جب تک وہ ادا نہ ہو وہ نماز نہیں ہے اور نہ وہ کیفیت جو صلوٰۃ میں میل نما کی ہے حاصل ہوتی ہے۔

یاد رکھو صلوٰۃ میں حال اور قال دونوں کا جمع ہونا ضروری ہے ۔ بعض وقت اعلام تصویری ہوتا ہے ایسی تصویر دکھائی جاتی ہے جس سے دیکھنے والے کو پتہ ملتا ہے کہ اس کا منشاء یہ ہے ۔ ایسا ہی صلوٰۃ میں منشاء الٰہی کی تصویر ہے ۔ نماز میں جیسے زبان سے کچھ پڑھا جاتا ہے ویسے ہی اعضا اور جوارح کی حرکات سے کچھ دکھایا بھی جاتا ہے جب انسان کھڑا ہوتا ہے اور تحمید و تسبیح کرتا ہے اُس کا نام قیام رکھا ہے اب ہر ایک شخص جانتا ہے کہ حمد و ثنا کے مناسب حال قیام ہی ہے ۔ بادشاہوں کے سامنے جب قصائد سنائے جاتے ہیں تو آخر کھڑے ہو کر ہی پیش کرتے ہیں ۔ ادھر تو ظاہری طور پر قیام رکھا ہی ہے اور زبان سے حمد و ثنا بھی رکھی ہے ۔ مطلب اس کا یہی ہے کہ روحانی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو ۔

---

[1] الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳

حمد ایک بات پر قائم ہو کر کی جاتی ہے جو شخص مصدق ہو کر کسی کی تعریف کرتا ہے تو وہ ایک رائے پر قائم ہو جاتا ہے اس الحمد للہ کہنے والے کے واسطے یہ ضروری ہوا کہ وہ سچے طور پر الحمد للہ اسی وقت کہہ سکتا ہے کہ پورے طور پر اس کو یقین ہو جائے کہ جمیع اقسام محامد کے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ جب یہ بات دل میں انشراح کے ساتھ پیدا ہو گئی تو یہ روحانی قیام ہے کیونکہ دل اس پر قائم ہو جاتا ہے۔ اور وہ سمجھا جاتا ہے کہ کھڑا ہے۔ حال کے موافق کھڑا ہو گیا تاکہ روحانی قیام نصیب ہو۔

پھر رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہتا ہے قاعدہ کی بات ہے کہ جب کسی کی عظمت مان لیتے ہیں تو اس کے حضور جھکتے ہیں عظمت کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے رکوع کرے پس سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم زبان سے کہا اور حال سے جھکنا دکھایا۔

یہ اس قول کے ساتھ حال دکھایا پھر تیسرا قول ہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ اَعْلٰی افعل التفضیل ہے یہ بالذات سجدہ کو چاہتا ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ حالی تصویر سجدہ میں گرے گا۔ اور اس اقرار کے مناسب حال ہیئت فی الفور اختیار کر لی۔

اس قال کے ساتھ تین حال جسمانی ہیں ایک تصویر اس کے آگے پیش کی ہے ہر ایک قسم کا قیام بھی کرتا ہے زبان جو جسم کا ٹکڑا ہے اس نے بھی کہا اور وہ شامل ہو گئی۔

تیسری چیز اور ہے وہ اگر شامل نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی وہ کیا ہے؟ وہ قلب ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ قلب کا قیام ہو اور اللہ تعالیٰ اس پر نظر کر کے دیکھے کہ درحقیقت وہ حمد بھی کرتا ہے اور کھڑا بھی ہے۔ اور روح بھی کھڑا ہوا حمد کرتا ہے جسم ہی نہیں بلکہ روح بھی کھڑا ہے اور جب سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم کہتا ہے تو دیکھے کا اتنا ہی نہیں کہ صرف عظمت کا اقرار ہی کیا ہے نہیں بلکہ ساتھ ہی جھکا بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی روح بھی جھک گیا ہے پھر تیسری نظر میں خدا کے حضور سجدہ میں گرا ہے اس کی علو شان کو ملاحظہ میں لا کر اس کے ساتھ ہی دیکھے کہ روح بھی الوہیت کے آستانہ پر گرا ہوا ہے۔ غرض یہ حالت جب تک پیدا نہ ہو لے اس وقت تک مطمئن نہ ہو کیونکہ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کے یہی معنی ہیں اگر یہ سوال ہو کہ یہ حالت پیدا کیونکر ہو؟ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ نماز پر مداومت کی جاوے اور وساوس اور شبہات سے پریشان نہ ہو ابتدائی حالت میں شکوک و شبہات سے ایک جنگ ضرور ہوتی ہے اس کا علاج یہی ہے کہ نہ تھکنے والے استقلال اور صبر کے ساتھ لگا رہے اور خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگتا رہے آخر وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

یہ تقویٰ عملی کا ایک جزو ہے اور دوسری جزو اس (تقویٰ) کی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ہے جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ عام لوگ رزق سے مراد اشیاء خوردنی لیتے ہیں یہ غلط ہے جو کچھ قویٰ کو دیا جاوے وہ بھی رزق ہے علوم و فنون وغیرہ معارف حقائق عطا ہوتے ہیں یا جسمانی طور پر معاش مال میں فراخی ہو۔

رزق میں حکومت بھی شامل ہے اور اخلاق فاضلہ بھی رزق ہی میں داخل ہیں یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یعنی روٹی میں سے روٹی دیتے ہیں۔ علم میں سے علم اور اخلاق میں سے اخلاق۔ علم کا دینا تو ظاہر ہی ہے یہ یاد رکھو کہ وہی بخیل نہیں ہے جو اپنے مال میں سے کسی مستحق کو کچھ (نہیں) دیتا بلکہ وہ بھی بخیل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہو اور وہ دوسروں کو سکھانے میں مضائقہ کرے۔ محض اس خیال سے اپنے علوم و فنون سے کسی کو واقف نہ کرنا کہ اگر وہ سیکھ جاویگا تو ہماری بیقدری ہو جائے گی یا آمدنی میں فرق آجائے گا شرک ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اس علم یا فن کو ہی اپنا رازق اور خدا سمجھتا ہے۔ اسی طرح پر جو اپنے اخلاق سے کام نہیں لیتا وہ بھی بخیل ہے اخلاق کا دینا یہی ہوتا ہے کہ جو اخلاق فاضلہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے دے رکھے ہیں اس کی مخلوق سے ان اخلاق سے پیش آوے۔ وہ لوگ اس کے نمونہ کو دیکھ کر خود بھی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اخلاق سے اس قدر ہی مراد نہیں ہے کہ زبان کی نرمی اور الفاظ کی نرمی سے کام لے۔ نہیں بلکہ شجاعت۔ مروت، عفت جس قدر قوتیں انسان کو دی گئی ہیں در اصل سب اخلاقی قوتیں ہیں ان کا بر محل استعمال کرنا ہی ان کو اخلاقی حالت میں لے آتا ہے ایک موقع مناسب پر غضب کا استعمال بھی اخلاقی رنگ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ نہیں کہ انجیل کی تعلیم کی طرح (جو ایک ہی پہلو اپنے اندر رکھتی ہے کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دو۔ یہ اخلاق نہیں ہے اور نہ یہ تعلیم حکمت کے اصول پر مبنی ہو سکتی (رہے)۔
اگر ایسا ہو تو تمام فوجوں کا موقوف کر دینا اور ہر قسم کے آلات حرب کو توڑ دینا لازم آئے گا اور مسیحی دنیا کو بطور ایک خادم کے رہنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر کوئی کرتہ مانگے تو چغہ بھی دینا پڑیگا ایک کوس بیگار لے جانا چاہے تو دو کوس جانے کا حکم ہے۔ پھر عیسائی لوگوں کو کس قدر مشکلات پیش آئیں اگر اس تعلیم پر عمل کریں۔ نہ ان کے پاس ضروریات زندگی بسر کرنے کو کچھ رہے اور نہ کوئی آرام کی صورت کیونکہ جو کچھ ان کے پاس ہو کوئی مانگ لے تو پھر ان کے پاس خاک رہ جاوے۔ اگر محنت مزدوری سے کمانا چاہیں تو کوئی بیگار میں لگا دے غرض اس تعلیم پر زور تو بہت دیا گیا ہے اور پادریوں کو دیکھا ہے کہ وہ بازاروں میں اس تعلیم کی بڑے شد و مد سے تعریف کر کے وعظ کرتے ہیں لیکن جب عمل پوچھو تو کچھ نہیں ہے گویا بگفتن ہی سب کچھ ہے کرنے کے واسطے کچھ نہیں۔ اس لیے اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔ اخلاق یہ ہے کہ تمام قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے دئے ہیں۔ بر محل استعمال کیا جاوے۔ مثلاً عقل دی گئی ہے اور کوئی دوسرا شخص جس کو کسی امر میں واقفیت نہیں اس کے مشورہ کا محتاج ہے اور یہ اس کی نسبت پوری واقفیت رکھتا ہے تو اخلاق کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی عقل سلیم سے اس کو پوری مدد دے اور اس کو سچا مشورہ دے۔ لوگ ان باتوں کو معمولی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا کیا بگڑتا ہے اس کو خراب ہونے دو۔ یہ شیطانی فعل ہے۔ انسانیت سے بعید ہے کہ وہ کسی دوسرے کو بگڑتا دیکھے اور اس کی مدد کے لیے طیار نہ ہو۔ نہیں بلکہ چاہیئے کہ نہایت توجہ اور دلدہی سے اس کی بات سنے اور اپنی عقل و سمجھ سے اس کو ضروری مدد دے۔

لیکن اگر کوئی یہاں یہ اعتراض کرے کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ کیوں فرمایا مِمّا کے لفظ سے بخل کی بو آتی ہے۔ چاہیئے تھا کہ ؎

ہر چہ داری خرچ کن در راہِ او

اصل بات یہ ہے کہ اس سے بخل ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن شریف خدائے حکیم کا کلام ہے۔ حکمت کے معنے ہیں شئے را برمحل داشتن پس مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ محل اور موقع کو دیکھ کر خرچ کرو۔ جہاں تھوڑا خرچ کرنے کی ضرورت ہے وہاں تھوڑا خرچ کرو اور جہاں بہت خرچ کرنے کی ضرورت ہے وہاں بہت خرچ کرو۔

اب مثلاً عفو ہی ایک اخلاقی قوت ہے اس کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا عفو کے لائق ہے یا نہیں مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں بعض تو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جاتی ہے جو غصہ تو لاتی ہے لیکن وہ معافی کے قابل ہوتے ہیں اور (بعض) ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اُن کی کسی شرارت پر چشم پوشی کی جاوے اور اُس کو معاف کر دیا جاوے تو وہ زیادہ دلیر ہو کر مزید نقصان کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً ایک خدمتگار ہے جو بڑا نیک اور فرمان بردار ہے وہ چاء لایا اتفاق سے اس کو ٹھوکر لگی۔ اور چاء کی پیالی گر کر ٹوٹ گئی اور چاء بھی مالک پر گر گئی اگر اس کو مارنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور تیز و تند ہو کر اس پر جا پڑے تو یہ سفاہت ہو گی۔ یہ عفو کا مقام ہے کیونکہ اس نے عمداً شرارت نہیں کی ہے۔ اور عفو اس کو زیادہ شرمندہ کرتا اور آئندہ کے لیے محتاط بناتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا شریر ہے کہ وہ ہر روز توڑتا ہے اور یوں نقصان پہنچاتا ہے اس پر رحم یہی ہو گا کہ اس کو سزا دی جاوے۔ پس یہی حکمت ہے مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ میں۔ ہر ایک مومن اپنے نفس کا مجتہد ہوتا ہے وہ محل اور موقع کی شناخت کرے اور جس قدر مناسب ہو خرچ کرے میں ابھی بتا چکا ہوں کہ قرآن شریف کی تعلیم حکیمانہ نظام اپنے اندر رکھتی ہے اس کے بالمقابل انجیل کی تعلیم کو دیکھو کہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دے وغیرہ وغیرہ کیسی قابلِ اعتراض ہے کہ اس کی پردہ پوشی نہیں ہو سکتی اور اس کی تمدنی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑا نرم خو اور تقدس مآب پادری بھی اس تعلیم پر عمل نہیں کر سکتا اگر کوئی انجیل کی اس تعلیم کا عملی ثبوت لینے کے لیے کسی پادری صاحب کے مُنہ پر طمانچہ مارے تو وہ بجائے اس کے کہ دوسری گال پھیرے پولیس کے پاس دوڑا جاوے گا اور اس کو حکام کے سپرد کرا دیگا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انجیل معطل پڑی ہے اور قرآن شریف پر عمل ہو رہا ہے۔ ایک مفلس اور نادار بڑھیا بھی جس کے پاس ایک جَو کی روٹی کا ٹکڑا ہے اس ٹکڑے میں سے ایک حصّہ دے کر مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ میں داخل ہو سکتی ہے لیکن انجیل کے طمانچہ کھا کر گال پھیرنے کی تعلیم میں مقدس سے مقدس پادری بھی شامل نہیں ہو سکتا۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

انجیل تو اس پہلو میں یہاں تک گری ہوئی ثابت ہوتی ہے کہ اور تو اور خود حضرت مسیح بھی اس پر پورا عمل نہ دکھا سکے اور وہ تعلیم جو خود پیش کی تھی عملی پہلو میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کہنے ہی کے لیے ہے۔ ورنہ چاہیئے تھا کہ اس سے پیشتر کہ

وہ گرفتار ہوتے خود اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دیتے۔ اور دعائیں مانگنے اور اضطراب ظاہر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کر کے بھی دکھاتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ وہ کفارہ ہی کے لیے آئے ہیں کیونکہ اگر ان کی زندگی کا یہی کام تھا کہ وہ خود کشی کے طریق سے دنیا کو نجات دیں اور بقول عیسائیوں کے خدا بجز اس صورت کے نجات دے ہی نہیں سکتا تھا۔ تو ان کو چاہیئے تھا کہ جس کام کے لیے وہ بھیجے گئے تھے وہ تو یہی تھا پھر وعظ اور تبلیغ کی ضرورت ہی کیا تھی کیوں نہ آتے ہی یہ کہہ دیا کہ مجھے پکڑو اور پھانسی دیدو تاکہ دنیا کی رستگاری ہو۔[1]

غرض قرآن شریف کی تعلیم ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور ذرہ ذرہ اس کے آگے ہے اور اس نے ایسی تعلیم دی ہے جو انسانی قویٰ کی تکمیل کرتی ہے اور عفو اور انتقام کو محل اور موقع پر رکھنے کے واسطے اس سے بڑھ کر تعلیم نظر نہیں آئے گی۔ اگر کوئی اس تعلیم کے خلاف اور کچھ پیش کرتا ہے تو وہ گویا قانون الٰہی کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے بعض طبائع طبعاً عفو چاہتی ہیں اور بعض مار کھانے کے قابل ہوتی ہیں۔ سب عدالتیں قرآن شریف کی تعلیم کے موافق کھلی رہ سکتی ہیں اگر انجیل کے مطابق کریں تو آج ہی سب کچھ بند کرنا پڑے اور پھر دیکھو کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے انسان انجیلی تعلیم پر عمل نہیں کر سکتا۔ پس یہ دو نمونے علمی اور عملی تقویٰ کے ہوتے ہیں لیکن اس کے سوا تیسری قسم تقویٰ کی ہے وَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔

انسان قوت شہادت کا محتاج ہے ایسی راہ اختیار نہ کرے کہ پاک شہادتوں سے دور ہو۔ وہ راہ خطرناک راہ ہے جس میں راست بازوں کی شہادتیں موجود نہیں ہیں تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ جس میں زبردست شہادتیں ہر زمانہ میں زندہ موجود ہوں مثلاً تم نے راہ پوچھا کسی نے کچھ کہا کہ یہ راہ فلاں طرف جاتا ہے مگر دس کہتے ہیں کہ نہیں یہ تو فلاں طرف جاتا ہے تو اب تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اُن بھلے مانس آدمیوں کی بات مان لو یا درکھو کہ شہادت پاک بازوں کی ہی مقبول اور موزوں ہوتی ہے۔ بدمعاشوں کی شہادت کبھی مقبول نہیں ہو سکتی یہ تیسری قسم تقویٰ کی ہے جو يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ میں بیان ہوئی ہے اس کو چھوڑ کر بھی لوگ بہت خراب ہوتے ہیں ہمارے ساتھ جو لوگوں نے مخالفت کی ہے تو اسی وجہ سے کہ اُنہوں نے تقویٰ کی اس قسم کو چھوڑ دیا ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

متقی کی تعریف اور ایمان کی فلاسفی تقویٰ اس بات کا نام ہے کہ جب وہ دیکھے کہ میں گناہ میں پڑتا ہوں تو دعا اور تدبیر سے کام لیوے۔ ورنہ نادان ہوگا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ[2]۔ کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ ہر ایک مشکل اور تنگی سے نجات کی راہ اس کے لیے پیدا کر دیتا ہے۔ متقی درحقیقت وہ ہے کہ جہاں تک اس کی قدرت اور طاقت ہے وہ تدبیر اور تجویز سے کام لیتا ہے جیسا کہ قرآن شریف کے شروع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ

---

[1] الحکم جلد ۵ ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۲-۳ ‏[2] الطلاق: ۳-۴

بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ ایمان بالغیب کے یہ معنے ہیں کہ وہ خدا سے اڑ نہیں باندھتے بلکہ جو بات پردہ غیب میں ہو اس کو قرائن مرجحہ کے لحاظ سے قبول کرتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں کہ صدق کے وجوہ کذب کے وجوہ پر غالب ہیں یہ بڑی غلطی ہے کہ انسان یہ خیال رکھے کہ آفتاب کی طرح ہر ایک ایمانی امر اس پر منکشف ہو جاوے۔ اگر ایسا ہو تو پھر بتلاؤ کہ اس کے ثواب حاصل کرنے کا کونسا موقع ملا۔ کیا ہم اگر آفتاب کو دیکھ کر کہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے تو ہم کو ثواب ملتا ہے ہرگز نہیں۔ کیوں صرف اس لیے کہ اس میں غیب کا پہلو کوئی بھی نہیں لیکن جب ملائکہ خدا اور قیامت وغیرہ پر ایمان لاتے ہیں تو ثواب ملتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ ان پر ایمان لانے میں ایک پہلو غیب کا پڑا ہوا ہے۔ ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ اخفا بھی ہو اور طالب حق چند قرائن صدق کے لحاظ سے ان باتوں کو مان لے۔

اور مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ جو کچھ ہم نے ان کو عقل. فکر. فہم فراست اور رزق اور مال وغیرہ عطا کیا ہے اس میں سے خدا کی راہ میں اس کے لیے صرف کرتے ہیں۔ یعنی فعل کے ساتھ بھی کوشش کرتے ہیں پس جو شخص دعا اور کوشش سے مانگتا ہے وہ متقی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ یاد رکھو کہ جو شخص پوری فہم اور عقل اور زور سے تلاش نہیں کرتا وہ خدا کے نزدیک ڈھونڈنے والا نہیں قرار پاتا اور اس طرح سے امتحان کرنے والا ہمیشہ محروم رہتا ہے لیکن اگر وہ کوششوں کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور پھر اُسے کوئی لغزش ہوتی ہے تو خدا اُسے بچاتا ہے اور جو آسانی تن کے ساتھ دروازہ پر آتا ہے اور امتحان لیتا ہے تو خدا کو اس کی پروا نہیں ہے۔ ابوجہل وغیرہ کو آنحضرت صلعم کی صحبت تو نصیب ہوئی اور وہ کئی دفعہ آپ کے پاس آیا بھی لیکن چونکہ آزمائش کے لیے آتا رہا اس لیے گر گیا اور اسے ایمان نصیب نہ ہوا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۸ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸۴)

اس جگہ ہدایت سے مراد ایک اور اعلیٰ امر ہے۔ جو انسان کی کمال ترقیات پر دلالت کرتا ہے اور ان اعمال کو صبر اور استقلال کے ساتھ بجا لانے سے حاصل ہوتا ہے۔ پہلا ایمان غیب پر ہے لیکن اگر ایمان صرف غیب تک محدود رہے۔ تو اس میں کیا فائدہ وہ تو ایک سنی سنائی بات ہے۔ اس کے بعد معرفت اور مشاہدہ کا درجہ حاصل کرنا چاہیئے۔ جو کہ اس ایمان کے بعد رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام کے عطا ہوتا ہے اور انسان کی حالت غیب سے منتقل ہو کر علم شہود کی طرف آجاتی ہے۔ جن باتوں پر وہ پہلے غیب کے طور پر ایمان لاتا تھا۔ اب ان کا عارف بن جاتا ہے اور اس کو رفتہ رفتہ وہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے پس غیب پر ایمان لانے والے کو آگے ترقی دی جاتی ہے اور وہ مشاہدہ کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔

(البدر جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

ایک مرتبہ میں نے خیال کیا کہ صلوٰۃ میں اور دُعا میں کیا فرق ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے اَلصَّلٰوۃُ ھِیَ الدُّعَاءُ

اَلصَّلٰوۃُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ یعنی نماز ہی دعا ہے۔ نماز عبادت کا مغز ہے۔

جب انسان کی دعا محض دنیوی امور کے لیے ہو تو اس کا نام صلوٰۃ نہیں۔ لیکن جب انسان خدا کو ملنا چاہتا ہے اور اُس کی رضا کو مدنظر رکھتا ہے۔ اور ادب، انکسار، تواضع اور نہایت محویت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو کر اُس کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ تب وہ صلوٰۃ میں ہوتا ہے۔

اصل حقیقت دُعا کی وہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا اور انسان کے درمیان رابطہ تعلق بڑھے۔ یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور انسان کو نامعقول باتوں سے ہٹاتی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ انسان رضائے الٰہی کو حاصل کرے۔ اس کے بعد روا ہے کہ انسان اپنی دنیوی ضروریات کے واسطے بھی دُعا کرے۔ یہ اس واسطے روا رکھا گیا ہے کہ دنیوی مشکلات بعض دفعہ دینی معاملات میں حارج ہو جاتے ہیں۔ خاص کر خامی اور کچ پنے کے زمانہ میں یہ اُمور ٹھوکر کا موجب بن جاتے ہیں۔ صلوٰۃ کا لفظ پُرسوز معنے پر دلالت کرتا ہے جیسے آگ سے سوزش پیدا ہوتی ہے۔ ویسی ہی گدازش دعا میں پیدا ہونی چاہیئے۔ جب ایسی حالت کو پہنچ جائے جیسے موت کی حالت ہوتی ہے۔ تب اُس کا نام صلوٰۃ ہوتا ہے۔[1]

دوسرا امر نماز ہے جس کی پابندی کے لیے بار بار قرآن شریف میں کہا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ اسی قرآن مجید میں اُن مصلّیوں پر لعنت کی ہے جو نماز کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور اپنے بھائیوں سے بخل کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ نماز اللہ تعالیٰ کے حضور ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی بدیوں اور بدکاریوں سے محفوظ کر دے۔ انسان درد اور فرقت میں پڑا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا قرب اسے حاصل ہو جس سے وہ اطمینان اور سکینت اسے ملے جو نجات کا نتیجہ ہے مگر یہ بات اپنی کسی چالاکی یا خوبی سے نہیں مل سکتی جب تک خدا نہ بلاوے یہ جا نہیں سکتا جب تک وہ پاک نہ کرے یہ پاک نہیں ہو سکتا۔ بہتیرے لوگ اس پر گواہ ہیں کہ بارہا یہ جوش طبیعتوں میں پیدا ہوتا ہے کہ فلاں گناہ دور ہو جاوے جس میں وہ مبتلا ہیں لیکن ہزار کوشش کریں دور نہیں ہوتا باوجودیکہ نفس لوّامہ ملامت کرتا ہے لیکن پھر بھی لغزش ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سے پاک کرنا خدا تعالیٰ ہی کا کام ہے اپنی طاقت سے کوئی نہیں ہو سکتا ہاں یہ سچ ہے کہ اس کے لیے سعی کرنا ضروری امر ہے غرض وہ اندر جو گناہوں سے بھرا ہوا ہے اور جو خدا تعالیٰ کی معرفت اور قرب سے دور جا پڑا ہے اس کو پاک کرنے اور دور سے قریب کرنے کے لیے نماز ہے اسی ذریعہ سے ان بدیوں کو دور کیا جاتا ہے اور اُس کی بجائے پاک جذبات بھر دیئے جاتے ہیں یہی سر ہے جو کہا گیا ہے کہ نماز بدیوں کو دور کرتی ہے یا نماز فحشاء اور منکر سے روکتی ہے پھر نماز کیا ہے؟ یہ ایک دعا ہے جس میں پورا درد اور سوزش ہو اسی لیے اس کا نام صلوٰۃ ہے کیونکہ سوزش اور فرقت اور درد سے طلب

[1] بدر جلد ۱ نمبر ۸ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲

کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بد ارادوں اور بُرے جذبات کو اندر سے دور کرے اور پاک محبت اس کی جگہ اپنے فیضِ عام کے ماتحت پیدا کر دے۔

صلوٰۃ کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نِرے الفاظ اور دعا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ضروری ہے کہ ایک سوزش رقّت اور درد ساتھ ہو۔ خدا تعالیٰ کسی دعا کو نہیں سُنتا جب تک دعا کرنے والا موت تک نہ پہنچ جاوے۔ دعا مانگنا ایک مشکل امر ہے اور لوگ اس کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں بہت سے لوگ مجھے خط لکھتے ہیں کہ ہم نے فلاں وقت فلاں امر کے لیے دعا کی تھی مگر اُس کا اثر نہ ہوا۔ اور اس طرح پر وہ خدا تعالیٰ سے بدظنی کرتے ہیں اور مایوس ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ جب تک دعا کے لوازم ساتھ نہ ہوں وہ دعا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

دعا کے لوازم میں سے یہ ہے کہ دل پگھل جاوے اور روح پانی کی طرح حضرت احدیت کے آستانہ پر گرے۔ اور ایک کرب اور اضطراب اس میں پیدا ہو۔ اور ساتھ ہی انسان بے صبر اور جلد باز نہ ہو بلکہ صبر اور استقامت کے ساتھ دعا میں لگا رہے پھر توقع کی جاتی ہے کہ وہ دعا قبول ہو گی۔

نماز بڑی اعلیٰ درجہ کی دعا ہے مگر افسوس لوگ اس کی قدر نہیں جانتے اور اس کی حقیقت صرف اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ رسمی طور پر قیام رکوع سجود کر لیا اور چند فقرے طوطے کی طرح رٹ لیے۔ خواہ اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ ایک اور افسوسناک امر پیدا ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے ہی مسلمان نماز کی حقیقت سے ناواقف تھے اور اس پر توجہ نہیں کرتے تھے اس پر بہت سے فرقے ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے نماز کی پابندیوں کو اُڑا کر اس کی جگہ چند وظیفے اور ورد قرار دیئے گئے۔ کوئی نوشاہی ہے کوئی چشتی ہے کوئی کچھ ہے کوئی کچھ۔ یہ لوگ اندرونی طور پر اسلام اور احکام الٰہی پر حملہ کرتے ہیں۔ اور شریعت کی پابندیوں کو توڑ کر ایک نئی شریعت قائم کرتے ہیں یقیناً یاد رکھو کہ ہمیں اور ہر ایک طالبِ حق کو نماز ایسی نعمت کے ہوتے ہوئے کسی اور بدعت کی ضرورت نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی تکلیف یا ابتلا کو دیکھتے تو فوراً نماز میں کھڑے ہو جاتے تھے اور ہمارا اپنا اور ان راستبازوں کا جو پہلے ہو گزرے ہیں ان سب کا تجربہ ہے کہ نماز سے بڑھ کر خدا کی طرف لے جانے والی کوئی چیز نہیں جب انسان قیام کرتا ہے تو وہ ایک ادب کا طریق اختیار کرتا ہے ایک غلام جب اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ دست بستہ کھڑا ہوتا ہے پھر رکوع بھی ادب ہے جو قیام سے بڑھکر ہے اور سجدہ ادب کا انتہائی مقام ہے جب انسان اپنے آپ کو فنا کی حالت میں ڈال دیتا ہے اس وقت سجدہ میں گر پڑتا ہے افسوس ان نادانوں اور دنیا پرستوں پر جو نماز کی ترمیم کرنا چاہتے ہیں اور رکوع سجود پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ تو کمال درجہ کی خوبی کی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب تک انسان اُس عالم سے حصہ نہ رکھتا ہو جہاں سے نماز آئی ہے تب تک انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں مگر جس شخص کا یقین خدا پر نہیں وہ نماز پر کس طرح یقین کر سکتا ہے نماز جامع حسنات ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۲-۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

ا؎ الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸

انسان کی زاہدانہ زندگی کا بڑا بھاری معیار نماز ہے وہ شخص جو خدا کے حضور نماز میں گریاں رہتا ہے امن میں رہتا ہے جیسے ایک بچہ اپنی ماں کی گود میں چیخ چیخ کر روتا ہے اور اپنی ماں کی محبت اور شفقت کو محسوس کرتا ہے اسی طرح پر نماز میں تضرع اور ابتہال کے ساتھ خدا کے حضور گڑگڑانے والا اپنے آپ کو ربوبیت کی عطوفت کی گود میں ڈال دیتا ہے یاد رکھو اس نے ایمان کا حظ نہیں اٹھایا جس نے نماز میں لذت نہیں پائی۔ نماز صرف ٹکروں کا نام نہیں ہے بعض لوگ نماز کو تو دو چار چونچیں لگا کر جیسے مرغی ٹھونگیں مارتی ہے ختم کرتے ہیں اور پھر لمبی چوڑی دعا شروع کرتے ہیں حالانکہ وہ وقت جو اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرنے کے لیے ملا تھا اس کو صرف ایک رسم اور عادت کے طور پر جلد جلد ختم کرنے میں گذار دیتے ہیں اور حضور الٰہی سے نکل کر دعا مانگتے ہیں۔ نماز میں دعا مانگو۔ نماز کو دعا کا ایک وسیلہ اور ذریعہ سمجھو۔ (الحکم جلد ۴ ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۱)

یہ جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں بھی ایک طرح کا اضطراب ہے۔ کبھی کھڑا ہونا پڑتا ہے کبھی رکوع کرنا پڑتا ہے اور کبھی سجدہ کرنا پڑتا اور پھر طرح طرح کی احتیاطیں کرنی پڑتی ہیں مطلب یہی ہوتا ہے کہ انسان خدا کے لیے دکھ اور مصیبت کو برداشت کرنا سیکھے ورنہ ایک جگہ بیٹھ کر بھی تو خدا کی یاد ہو سکتی تھی۔ پر خدا نے ایسا منظور نہیں کیا۔ صلوٰۃ کا لفظ ہی سوزش پر دلالت کرتا ہے۔ جب تک انسان کے دل میں ایک قسم کا قلق اور اضطراب پیدا نہ ہو۔ اور خدا کے لیے اپنے آرام کو نہ چھوڑے تب تک کچھ بھی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ فطرتاً اس قسم کے ہوتے ہیں جو ان باتوں میں پورے نہیں اتر سکتے اور پیدائشی طور پر ہی ان میں ایسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں جو وہ ان امور میں استقلال نہیں دکھا سکتے مگر تاہم بھی توبہ اور استغفار بہت کرنی چاہیئے کہ کہیں ان میں ہی شامل نہ ہو جاویں جو دین سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔ اور اپنا مقصود بالذات دنیا کو ہی سمجھتے ہیں..... یہ نماز جو تم لوگ پڑھتے ہو صحابہ بھی یہی نماز پڑھا کرتے تھے اور اسی نماز سے انہوں نے بڑے بڑے روحانی فائدے اور بڑے بڑے مدارج حاصل کیے تھے۔ فرق صرف حضور اور خلوص کا ہی ہے۔ اگر تم میں بھی وہی اخلاص صدق وفا اور استقلال ہو تو اسی نماز سے اب بھی وہی مدارج حاصل کر سکتے ہو جو تم سے پہلوں نے حاصل کیے تھے چاہیئے کہ خدا کی راہ میں دُکھ اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ یاد رکھو جب اخلاص اور صدق سے کوشش نہیں کرو گے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ یہاں سے توبیعت کر جاتے ہیں مگر گھر میں جا کر جب تھوڑی سی بھی تکلیف آئی۔ اور کسی نے دھمکایا تو جھٹ مرتد ہو گئے۔ ایسے لوگ ایمان فروش ہوتے ہیں صحابہ کو دیکھو کہ انہوں نے تو دین کی خاطر اپنے سر کٹوا دیئے تھے اور جان و مال سب خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے کسی دشمن کی دشمنی کی انہیں پرواہ تک بھی نہ تھی وہ تو خدا کی راہ میں سب طرح کی تکالیف اُٹھانے اور ہر طرح کے دکھ برداشت کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور انہوں نے اپنے دلوں میں فیصلہ کیا ہوا تھا مگر یہ ہیں جو ذرا بھی نمبردار یا کسی اور شخص نے دھمکایا تو دین ہی چھوڑ دیا ایسے لوگوں کی عبادتیں بھی محض پوست ہی ہوتی ہیں ایسوں

کی نمازیں بھی خدا تک نہیں پہنچتیں بلکہ اسی وقت ان کے منہ پر ماری جاتی ہیں اور ان کے لیے لعنت کا موجب ہوتی ہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ [۵] وہ لوگ جو نمازوں کی حقیقت سے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کی نمازیں نری ٹکریں ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ ایک سجدہ اگر خدا کو کرتے ہیں تو دوسرا دنیا کو کرتے ہیں جب تک انسان خدا کے لیے تکالیف اور مصائب کو برداشت نہیں کرتا تب تک مقبول حضرت احدیت نہیں ہوتا دیکھو دنیا میں بھی اس کا نمونہ پایا جاتا ہے اگر ایک غلام اپنے آقا کا ہر ایک تکلیف اور مصیبت میں اور ہر ایک خطرناک میدان میں ساتھ دیتا رہے۔ تو وہ غلام غلام نہیں رہتا بلکہ دوست بن جاتا ہے۔ یہی خدا کا حال ہے اگر انسان اس کا دامن نہ چھوڑے اور اسی کے آستانہ پر گرا رہے اور استقلال کے ساتھ وفاداری کرتا رہے تو پھر خدا بھی ایسے کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اس کے ساتھ دوست والا معاملہ کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۴)

علمی تجارب کے ذریعہ سے ہر ایک عارف کو ماننا پڑا ہے کہ دعا کا قبولیت کے ساتھ ایک رشتہ ہے۔ ہم اس راز کو معقولی طور پر دوسروں کے دلوں میں بٹھا سکیں یا نہ بٹھا سکیں مگر کروڑہا راستبازوں کے تجارب نے اور خود ہمارے تجربہ نے اس مخفی حقیقت کو ہمیں دکھلا دیا ہے کہ ہمارا دعا کرنا ایک قوت مقناطیسی رکھتا ہے اور فضل اور رحمت الٰہی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ نماز کا مغز اور روح بھی دعا ہی ہے۔ جو سورہ فاتحہ میں ہمیں تعلیم دی گئی ہے جب ہم اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کہتے ہیں تو اس دعا کے ذریعہ سے اُس نور کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں جو خدا تعالیٰ سے اُترتا اور دلوں کو یقین اور محبت سے منور کرتا ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۲)

تمہیں چاہیئے کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعا مانگو اور اس کے فضل کو طلب کرو۔ ہر ایک نماز میں دعا کے واسطے کئی موقع ہیں۔ رکوع۔ قیام۔ قعدہ سجدہ وغیرہ آٹھ پہروں میں پانچ مرتبہ نماز پڑھنی پڑتی ہے۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور اس پر ترقی کر کے اشراق اور تہجد کی نمازیں ہیں یہ سب دعا ہی کے لیے موقع ہیں۔ اصل غرض اور مغز نماز کا دعا ہی ہے اور دعا خدا تعالیٰ کے قانون قدرت کے موافق ہے۔ عام طور پر دیکھو کہ جب بچہ روتا دھوتا ہے اور اضطراب ظاہر کرتا ہے تو ماں کس قدر بے قرار ہو کر اس کو دودھ دیتی ہے الوہیت اور عبودیت میں اسی قسم کا ایک تعلق ہے جس کو ہر شخص سمجھ نہیں سکتا جب انسان خدا تعالیٰ کے دروازہ پر گرتا ہے اور نہایت عاجزی اور خشوع وخضوع کے ساتھ گرتا ہے اور اپنے حالات کو پیش کرتا ہے اور اس سے اپنی حاجات کو مانگتا ہے تو الوہیت کا کرم جوش میں آتا ہے اور اس پر رحم کیا جاتا ہے خدا تعالیٰ کے فضل وکرم کا دودھ بھی ایک گریہ کو چاہتا ہے اس لیے اس کے حضور رونے والی آنکھ پیش کرنی چاہیئے۔ یہ خیال غلط اور باطل ہے جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے حضور رونے دھونے سے کچھ نہیں ملتا۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے صفات قدرت وتصرف پر ایمان نہیں لاتے ہیں۔ اگر وہ حقیقی ایمان پیدا کرتے تو یہ کبھی نہ کہتے۔ جب کبھی کوئی خدا تعالیٰ کے حضور آیا ہے اور اس نے سچی توبہ کے ساتھ

---

[۵] سورۃ الماعون +

رجوع کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا فضل کیا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے جو کسی نے کہا ہے ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد　　　اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

خدا تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ تم اس کے حضور پاک دل لے کر آجاؤ۔ صرف اتنی شرط ہے کہ اس کے مناسب حال اپنے آپ کو بناؤ اور وہ سچی تبدیلی پیدا کرو خدا تعالیٰ میں عجیب در عجیب قدرتیں ہیں اور اس میں لاانتہا فضل و برکات ہیں مگر ان کے دیکھنے اور پانے کے لیے محبت کی آنکھ پیدا کرو۔ اگر سچی محبت ہو تو خدا تعالیٰ بہت دعائیں سنتا ہے اور تائیدیں کرتا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ محبت اور اخلاص خدا تعالیٰ سے ہو۔ محبت ایک ایسی شے ہے کہ انسان کی سفلی زندگی کو جلا کر ایک نیا اور مصفا انسان بنا دیتی ہے پھر وہ دیکھتا ہے جو پہلے نہیں دیکھتا تھا وہ وہ سنتا ہے جو پہلے نہیں سنتا تھا۔　(الحکم جلد ۹ ع۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

ظنون فاسدہ والا انسان ناقص الخلقت ہوتا ہے چونکہ اس کے پاس صرف رسمی امور ہوتے ہیں اس لیے نہ اس کا دین درست ہوتا ہے نہ دنیا ایسے لوگ نمازیں پڑھتے ہیں مگر نماز کے مطالب سے ناآشنا ہوتے ہیں اور ہرگز نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں نماز میں تو ٹھونگیں مارتے ہیں لیکن نماز کے بعد دعا میں گھنٹہ گھنٹہ گزار دیتے ہیں تعجب کی بات ہے کہ نماز جو اصل دعا کے لیے ہے اور جس کا مغز ہی دعا ہے اس میں وہ کوئی دعا نہیں کرتے۔ نماز کے ارکان بجائے خود دعا کے لیے محرک ہوتے ہیں۔ حرکت میں برکت ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھے بیٹھے کوئی مضمون نہیں سوجھتا جب ذرا اٹھ کر پھرنے لگے ہیں تو مضمون سوجھ گیا ہے۔ اس طرح پر سب اعمال کا حال ہے اگر ان کی اصلیت کا لحاظ اور مغز کا خیال نہ ہو تو وہ ایک رسم اور عادت رہ جاتی ہے اس طرح روزہ میں خدا کے واسطے نفس کو پاک رکھنا ضروری ہے لیکن اگر حقیقت نہ ہو تو پھر یہ رسم ہی رہ جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ ع۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

جب خدا کو پہچان لو گے تو پھر نماز ہی نماز میں رہو گے۔ دیکھو یہ بات انسان کی فطرت میں ہے کہ خواہ کوئی ادنیٰ سی بات ہو جب اس کو پسند آجاتی ہے تو پھر دل خواہ نخواہ اس کی طرف کھینچا جاتا ہے اسی طرح پر جب انسان اللہ تعالیٰ کو شناخت کر لیتا ہے اور اُس کے حسن و احسان کو پسند کرتا ہے تو دل بے اختیار ہو کر اسی کی طرف دوڑتا ہے اور بے ذوقی سے ایک ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اصل نماز وہی ہے جس میں خدا کو دیکھتا ہے۔ اس زندگی کا مزہ اسی دن آسکتا ہے جبکہ سب ذوق اور شوق سے بڑھ کر جو خوشی کے سامانوں میں مل سکتا ہے تمام لذت اور ذوق دعا ہی میں محسوس ہو۔ یاد رکھو کوئی آدمی کسی موت و حیات کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا خواہ رات کو موت آجاوے یا دن کو۔ جو لوگ دنیا سے ایسا دل لگاتے ہیں کہ گویا کبھی مرنا ہی نہیں وہ اس دنیا سے نامراد جاتے ہیں وہاں ان کے لیے خزانہ نہیں ہے۔ جس سے وہ لذت اور خوشی حاصل کر سکیں......

نماز کیا چیز ہے؟ نماز اصل میں رب العزت سے دعا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ عافیت اور خوشی کا سامان مل سکتا ہے جب خدا تعالیٰ اس پر اپنا فضل کریگا اس وقت اسے حقیقی سرور اور راحت ملے گی اُس وقت سے اس کو نمازوں میں لذت اور ذوق آنے لگے گا جس طرح لذیذ غذاؤں کے کھانے سے مزا آتا ہے اسی طرح پھر گریہ و بکا کی لذت آئے گی اور یہ حالت جو نماز کی ہے پیدا ہو جائے گی اس سے پہلے جیسے کڑوی دوا کو کھاتا ہے تاکہ صحت حاصل ہو اسی طرح اس بے ذوقی نماز کو پڑھنا اور دعائیں مانگنا ضروری ہیں اس بے ذوقی کی حالت میں یہ فرض کر کے کہ اس سے لذت اور ذوق پیدا (ہو) یہ دعا کرے کہ اے اللہ تو مجھے دیکھتا ہے کہ میں کیسا اندھا اور نابینا ہوں اور میں اس وقت بالکل مردہ حالت میں ہوں میں جانتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے آواز آئے گی تو میں تیری طرف آجاؤں گا اس وقت مجھے کوئی روک نہ سکے گا لیکن میرا دل اندھا اور ناشناسا ہے تو ایسا شعلہ نور اس پر نازل کر کہ تیرا اُنس اور شوق اس میں پیدا ہو جائے تو ایسا فضل کر کہ میں نابینا نہ اُٹھوں اور اندھوں میں نہ جاملوں۔ جب اس قسم کی دعا مانگے گا اور اس پر دوام کرے گا تو وہ دیکھے گا کہ ایک وقت اس پر آئے گا کہ اسی بے ذوقی کی نماز میں ایک چیز آسمان سے اس پر گرے گی جو رقت پیدا کر دیگی۔ (الحکم جلد ۷ ع۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳؁ء صـ۱۱)

نماز اُس وقت حقیقی نماز کہلاتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے سچا اور پاک تعلق ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اطاعت میں اس حد تک فنا ہو اور یہاں تک دین کو دنیا پر مقدم کر لے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان تک دیدینے اور مرنے کے لیے طیار ہو جائے جب یہ حالت انسان میں پیدا ہو جائے اس وقت کہا جائے گا کہ اس کی نماز نماز ہے مگر جب تک یہ حقیقت انسان کے اندر پیدا نہیں ہوتی اور سچا اخلاص اور وفاداری کا نمونہ نہیں دکھاتا اُس وقت تک اس کی نمازیں اور دوسرے اعمال بے اثر ہیں۔ (الحکم جلد ۸ ع۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴؁ء صـ۳)

جب تک انسان کامل طور پر توحید پر کاربند نہیں ہوتا۔ اس میں اسلام کی محبت اور عظمت قائم نہیں ہوتی..... نماز کی لذت اور سرور اسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ مدار اسی بات پر ہے کہ جب تک بُرے ارادے ناپاک اور گندے منصوبے بھسم نہ ہوں انانیت اور شیخی دور ہو کر نیستی اور فروتنی نہ آئے خدا کا سچا بندہ نہیں کہلا سکتا اور عبودیت کاملہ کے سکھانے کے لیے بہترین معلم اور افضل ترین ذریعہ نماز ہی ہے۔

میں پھر تمہیں بتلاتا ہوں کہ اگر خدا تعالیٰ سے سچا تعلق۔ حقیقی ارتباط قائم کرنا چاہتے ہو تو نماز پر کاربند ہو جاؤ اور ایسے کاربند بنو کہ تمہارا جسم نہ تمہاری زبان بلکہ تمہاری روح تمہاری روح کے ارادے اور جذبے سب کے سب ہمہ تن نماز ہو جائیں۔ (الحکم جلد ۳ ع۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹؁ء صـ۵)

فَاِنَّ الصَّلٰوۃَ مَرْکَبٌ یُوْصِلُ الْعَبْدَ اِلٰی رَبِّ الْعِبَادِ۔ فَیَصِلُ بِھَا اِلٰی مَقَامٍ لَا یَصِلُ اِلَیْهِ عَلٰی صَهَوَاتِ

(ترجمہ از مرتب) نماز ایک ایسی سواری ہے جو بندہ کو پروردگار عالم تک پہنچاتی ہے اس کے ذریعہ انسان ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں گھوڑوں کی پیٹھوں پر

اَلْجِيَادِ۔ وَصَيْدُهَا لَا يُصَادُ بِالسِّهَامِ۔ وَسِرُّهَا لَا يَظْهَرُ بِالْاَقْلَامِ۔ وَمَنِ الْتَزَمَ هٰذِهِ الطَّرِيْقَةَ۔ فَقَدْ بَلَغَ الْحَقَّ وَالْحَقِيْقَةَ۔ وَاَلْفَى الْحِبَّ الَّذِيْ هُوَ فِيْ حُجُبِ الْغَيْبِ۔ وَنَجَا مِنَ الشَّكِّ وَالرَّيْبِ۔ فَتَرٰى اَيَّامَهٗ غُرَرًا۔ وَّكَلَامَهٗ دُرَرًا۔ وَّوَجْهَهٗ بَدْرًا۔ وَّمَقَامَهٗ صَدْرًا۔ وَّمَنْ ذَلَّ لِلّٰهِ فِيْ صَلٰوتِهٖ اَذَلَّ اللّٰهُ لَهُ الْمُلُوْكَ وَيَجْعَلُ مَالِكًا هٰذَا الْمَمْلُوْكَ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۶۲ و ۱۶۳)

نماز ایسی شے ہے کہ جس سے ایک ذوق۔ اُنس اور سرور بڑھتا ہے۔ مگر جس طرز پر نماز ادا کی جاتی ہے اس سے حضور قلب نہیں ہوتا اور بے ذوقی اور بے لطفی پیدا ہوتی ہے میں نے اپنی جماعت کو یہی نصیحت کی ہے کہ وہ بے ذوقی اور بے حضوری پیدا کرنے والی نماز نہ پڑھیں بلکہ حضور قلب کی کوشش کریں جس سے ان کو سرور اور ذوق حاصل ہو عام طور پر یہ حالت ہو رہی ہے کہ نماز کو ایسے طور سے پڑھتے ہیں کہ جس میں حضور قلب کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ جلدی جلدی اس کو ختم کیا جاتا ہے اور خارج نماز میں بہت کچھ دعا کے لیے کرتے ہیں اور دیر تک دعا مانگتے رہتے ہیں حالانکہ نماز کا (جو مومن کی معراج ہے) مقصود یہی ہے کہ اس میں دعا کی جاوے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

میں نے بارہا سمجھایا ہے کہ نماز کا تعہد کرو جس سے حضور اور ذوق پیدا ہو۔ فریضہ تو جماعت کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں باقی نوافل اور سُنن کو جیسا چاہو طول دو۔ اور چاہیئے کہ اس میں گریہ و بکا ہو تاکہ وہ حالت پیدا ہو جاوے جو نماز کا اصل مطلب ہے نماز ایسی شے ہے کہ سیّئات کو دور کر دیتی ہے جیسے فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ[۱] نماز کل بدیوں کو دور کر دیتی ہے۔ حسنات سے مراد نماز ہے مگر آج کل یہ حالت ہو رہی ہے کہ عام طور پر نمازی کو مکار سمجھا جاتا ہے کیونکہ عام لوگ بھی جانتے ہیں کہ یہ لوگ جو نماز پڑھتے ہیں یہ اسی قسم کی ہے جس پر خدا نے واویلا کیا ہے کیونکہ اس کا کوئی نیک اثر اور نیک نتیجہ مترتب نہیں ہوتا نرے الفاظ کی بحث میں پسند نہیں کرتا آخر مر کر خدا تعالیٰ کے حضور جانا ہے...... میرا تو یہ مذہب ہے کہ اگر دس دن بھی نماز کو سنوار کر پڑھیں تو تنویر قلب ہو جاتی ہے مگر یہاں تو پچاس پچاس برس تک نماز پڑھنے والے دیکھے گئے ہیں کہ بدستور رو بدنیا اور سفلی زندگی میں نگونسار ہیں اور انہیں نہیں معلوم کہ وہ نمازوں میں کیا پڑھتے ہیں اور استغفار کیا چیز ہے؟...... ایک افغان نماز تو پڑھتا ہے لیکن وہ اثر نماز سے بالکل بے خبر ہے۔

بیٹھ کر نہ پہنچ سکتا اور نماز کا شکار (ثمرات) تیروں سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا راز قلموں سے ظاہر نہیں ہو سکتا ہے اور جس شخص نے اس طریق کو لازم پکڑا اس نے حق اور حقیقت کو پا لیا اور اس محبوب تک پہنچ گیا جو غیب کے پردوں میں ہے اور شک و شبہ سے نجات حاصل کر لی پس تو دیکھے گا کہ اس کے دن روشن ہیں اور اس کی باتیں موتیوں کی مانند ہیں اور اس کا چہرہ چودھویں کا چاند ہے۔ اس کا مقام صدر نشینی ہے۔ جو شخص نماز میں اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی سے جھکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے بادشاہوں کو جھکا دیتا ہے اور اس مملوک بندہ کو مالک بنا دیتا ہے۔

---

[۱] ہود۔ ع ۱۰-۹

یاد رکھو رسم اور چیز ہے اور صلوٰۃ اور چیز۔ صلوٰۃ ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے قرب کا کوئی قریب ذریعہ نہیں یہ قرب کی کنجی ہے اس سے کشوف ہوتے ہیں اسی سے الہامات اور مکالمات ہوتے ہیں یہ دعاؤں کے قبول ہونے کا ایک ذریعہ ہے لیکن اگر کوئی اس کو اچھی طرح سے سمجھ کر ادا نہیں کرتا تو وہ رسم اور عادت کا پابند ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱-۱۲)

نماز ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم اسلام لائی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ہمیں نماز معاف فرما دی جاوے کیونکہ ہم کاروباری آدمی ہیں مویشی وغیرہ کے سبب سے کپڑوں کا کوئی اعتماد نہیں ہوتا اور نہ ہمیں فرصت ہوتی ہے تو آپؐ نے اُس کے جواب میں فرمایا کہ دیکھو کہ جب نماز نہیں تو ہے ہی کیا وہ دین ہی نہیں جس میں نماز نہیں۔ نماز کیا ہے۔ یہی کہ اپنے عجز و نیاز اور کمزوریوں کو خدا کے سامنے پیش کرنا۔ اور اُسی سے اپنی حاجت روائی چاہنا۔ کبھی اُس کی عظمت اور اُس کے احکام کی بجا آوری کے واسطے دست بستہ کھڑا ہونا اور کبھی کمال مذلت اور فروتنی سے اُس کے آگے سجدہ میں گر جانا اُس سے اپنی حاجات کا مانگنا یہی نماز ہے۔ ایک سائل کی طرح کبھی اُس مسئول کی تعریف کرنا کہ تو ایسا ہے تو ایسا ہے۔ اُس کی عظمت اور جلال کا اظہار کر کے اُس کی رحمت کو جنبش دلانا اور پھر اس سے مانگنا۔ پس جس دین میں یہ نہیں وہ دین ہی کیا ہے۔

انسان ہر وقت محتاج ہے کہ اُس سے اُس کی رضا کی راہیں مانگتا رہے اور اُس کے فضل کا اُسی سے خواستگار ہو کیونکہ اُسی کی دی ہوئی توفیق سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اے خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم تیرے ہو جائیں اور تیری رضا پر کاربند ہو کر تجھے راضی کر لیں۔ خدا کی محبت اُسی کا خوف اُسی کی یاد دل میں لگائے رہنے کا نام نماز ہے اور یہی دین ہے۔ پھر جو شخص نماز ہی سے فراغت حاصل کرنی چاہتا ہے اس نے حیوانوں سے بڑھ کر کیا کیا۔ وہی کھانا پینا اور حیوانوں کی طرح سو رہنا یہ تو دین ہرگز نہیں یہ سیرت کفار ہے بلکہ جو دم غافل وہ دم کافر والی بات بالکل راست اور صحیح ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ اُذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ[1] یعنی اے میرے بندو تم مجھے یاد کیا کرو اور میری یاد میں مصروف رہا کرو میں بھی تم کو نہ بھولوں گا تمہارا خیال رکھوں گا اور میرا شکر کیا کرو میرے انعامات کی قدر کیا کرو اور کفر نہ کیا کرو۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کے ترک اور اُس سے غفلت کا نام کفر ہے پس جو دم غافل وہ دم کافر والی بات صاف ہے۔

یہ پانچ وقت تو خدا تعالیٰ نے بطور نمونہ کے مقرر فرمائے ہیں۔ ورنہ خدا کی یاد میں تو ہر وقت دل کو لگا رہنا چاہیئے اور کبھی کسی وقت بھی غافل نہ ہونا چاہیئے اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت اُسی کی یاد میں غرق ہونا بھی ایک ایسی صفت ہے کہ انسان اس سے انسان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ پر کسی طرح کی امید اور بھروسہ کرنے کا حق رکھ سکتا ہے۔ اصل میں قاعدہ ہے کہ اگر انسان نے کسی خاص منزل پر پہونچنا ہے اُس کے واسطے چلنے کی ضرورت ہوتی

[1] البقرۃ: ۱۵۳

ہے جتنی لمبی وہ منزل ہوگی اُتنا ہی زیادہ تیزی کوشش اور محنت اور دیر تک اُسے چلنا ہوگا۔ سو خدا تک پہونچنا بھی تو ایک منزل ہے اور اُس کا بُعد اور دوری بھی لمبی۔ پس جو شخص خدا سے ملنا چاہتا ہے اور اُس کے دربار میں پہونچنے کی خواہش رکھتا ہے اس کے واسطے نماز ایک گاڑی ہے جس پر سوار ہو کر وہ جلد تر پہونچ سکتا ہے اور جس نے نماز ترک کر دی وہ کیا پہونچے گا۔

اصل میں مسلمانوں نے جب سے نماز کو ترک کیا یا اُسے دل کی تسکین آرام اور محبت سے اُس کی حقیقت سے غافل ہو کر پڑھنا ترک کیا ہے تب ہی سے اسلام کی حالت بھی معرض زوال میں آئی ہے۔ وہ زمانہ جس میں نماز سنوار کر پڑھی جاتی تھی غور سے دیکھ لو کہ اسلام کے واسطے کیسا تھا ایک دفعہ تو اسلام نے تمام دنیا کو زیر پا کر دیا تھا۔ جب سے اسے ترک کیا وہ خود متروک ہو گئے ہیں۔ درد دل سے پڑھی ہوئی نماز ہی ہے کہ تمام مشکلات سے انسان کو نکال لیتی ہے ہمارا بار ہا کا تجربہ ہے کہ اکثر کسی مشکل کے وقت دعا کی جاتی ہے ابھی نماز میں ہی ہوتے ہیں کہ خدا نے اس امر کو حل اور آسان کر دیا ہوا ہوتا ہے۔

نماز میں کیا ہوتا ہے یہی کہ عرض کرتا ہے التجا کے ہاتھ بڑھاتا ہے اور دوسرا اُس کی عرض کو اچھی طرح سنتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ جو سنتا تھا وہ بولتا ہے اور گذارش کرنے والے کو جواب دیتا ہے۔ نمازی کا یہی حال ہے خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور خدا کو اپنے مصائب اور حوائج سناتا ہے پھر آخر سچی اور حقیقی نماز کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک وقت جلد آجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اُس کے جواب کے واسطے بولتا اور اُس کو جواب دیکر تسلی دیتا ہے۔ بھلا یہ بجز حقیقی نماز کے ممکن ہے ہرگز نہیں۔ (الحکم جلد ۷ صفحہ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

نماز ایسے نہ ادا کرو۔ جیسے مرغی دانے کے لیے ٹھونگ مارتی ہے بلکہ سوز و گداز سے ادا کرو اور دعائیں بہت کیا کرو نماز مشکلات کی کنجی ہے۔ ماثورہ دعاؤں اور کلمات کے سوا اپنی مادری زبان میں بھی بہت دعا کیا کرو تاکہ اس سے سوز و گداز کی تحریک ہو اور جب تک سوز و گداز نہ ہو اُسے ترک مت کرو کیونکہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اور سب کچھ ملتا ہے چاہیئے کہ نماز کی جس قدر جسمانی صورتیں ہیں ان سب کے ساتھ دل بھی ویسے ہی تابع ہو۔ اگر جسمانی طور پر کھڑے ہو تو دل بھی خدا کی اطاعت کے لیے ویسے ہی کھڑا ہو۔ اگر جھکو تو دل بھی ویسے ہی جھکے اگر سجدہ کرو تو دل بھی ویسے ہی سجدہ کرے۔ دل کا سجدہ یہ ہے کہ کسی حال میں خدا کو نہ چھوڑے۔ جب یہ حالت ہوگی تو گناہ دور ہونے شروع ہو جاویں گے معرفت بھی ایک شے ہے جو کہ گناہ سے انسان کو روکتی ہے۔ جیسے جو شخص سم الفار۔ سانپ اور شیر کو ہلاک کرنے والا جانتا ہے تو وہ ان کے نزدیک نہیں جاتا ایسے ہی جب تم کو معرفت ہوگی تو تم گناہ کے نزدیک نہ پھٹکو گے اس کے لیے ضروری ہے کہ یقین بڑھاؤ اور وہ دعا سے بڑھے گا اور نماز خود دعا ہے نماز کو جس قدر سنوار کر ادا کرو گے اسی قدر گناہوں سے رہائی پاتے جاؤ گے۔۔۔۔۔ نماز کی ظاہری صورت پر اکتفا کرنا نادانی ہے اکثر لوگ رسمی نماز ادا کرتے ہیں اور بہت جلدی کرتے ہیں جیسے ایک ناواجب ٹیکس لگا ہوا ہے جلدی گلے سے اتر جاوے بعض لوگ نماز تو جلدی پڑھ

لیتے ہیں لیکن اس کے بعد دعا اس قدر لمبی مانگتے ہیں کہ نماز کے وقت سے دو گنا تگنا وقت لے لیتے ہیں حالانکہ نماز تو خود دعا ہے جس کو یہ نصیب نہیں ہے کہ نماز میں دعا کرے اس کی نماز ہی نہیں۔ چاہیئے کہ اپنی نماز کو دعا سے مثل کھانے اور سرد پانی کے لذیذ اور مزیدار کر لو ایسا نہ ہو کہ اس پر ویل ہو۔

نماز خدا کا حق ہے اُسے خوب ادا کرو اور خدا کے دشمن سے مداہنہ کی زندگی نہ برتو۔ وفا اور صدق کا خیال رکھو اگر سارا گھر غارت ہوتا ہو تو ہونے دو مگر نماز کو ترک مت کرو وہ کافر اور منافق ہیں جو کہ نماز کو منحوس کہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ نماز کے شروع کرنے سے ہمارا فلاں فلاں نقصان ہوا ہے نماز ہرگز خدا کے غضب کا ذریعہ نہیں ہے جو اسے منحوس کہتے ہیں ان کے اندر خود زہر ہے جیسے بیمار کو شیرینی کڑوی لگتی ہے ویسے ہی ان کو نماز کا مزا نہیں آتا۔ یہ دین کو درست کرتی ہے۔ اخلاق کو درست کرتی ہے دنیا کو درست کرتی ہے نماز کا مزا دنیا کے ہر ایک مزے پر غالب ہے لذات جسمانی کے لیے ہزاروں خرچ ہوتے ہیں اور پھر ان کا نتیجہ بیماریاں ہوتی ہیں اور یہ مفت کا بہشت ہے جو اُسے ملتا ہے قرآن شریف میں دو جنتوں کا ذکر ہے ایک ان میں سے دنیا کی جنت ہے اور وہ نماز کی لذت ہے۔

نماز خواہ نخواہ کا ٹیکس نہیں ہے بلکہ عبودیت کو ربوبیت سے ایک ابدی تعلق اور کشش ہے اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے خدا تعالیٰ نے نماز بنائی ہے اور اس میں ایک لذت رکھ دی ہے جس سے یہ تعلق قائم رہتا ہے جیسے لڑکے اور لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے اگر ان کے ملاپ میں ایک لذت نہ ہو تو فساد ہوتا ہے ایسے ہی اگر نماز میں لذت نہ ہو تو وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے دروازہ بند کر کے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ رشتہ قائم رہے اور لذت پیدا ہو جو تعلق عبودیت کا ربوبیت سے ہے وہ بہت گہرا اور انوار سے پُر ہے جس کی تفصیل نہیں ہو سکتی جب وہ نہیں ہے تب تک انسان بہائم ہے۔ اگر دو چار دفعہ بھی لذت محسوس ہو جائے تو اس چاشنی کا حصہ مل گیا لیکن جسے دو چار دفعہ بھی نہ ملا وہ اندھا ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[1] آئندہ کے سب وعدے اسی سے وابستہ ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶، ۷)

انسان کی خدا ترسی کا اندازہ کرنے کے لیے اُس کے التزام نماز کو دیکھنا کافی ہے کہ کس قدر ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو شخص پورے پورے اہتمام سے نماز ادا کرتا ہے اور خوف اور بیماری اور فتنہ کی حالتیں اس کو نماز سے روک نہیں سکتیں وہ بے شک خدائے تعالیٰ پر ایک سچا ایمان رکھتا ہے مگر یہ ایمان غریبوں کو دیا گیا دولتمند اس نعمت کو پانے والے بہت ہی تھوڑے ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۱۴)

خوف اور محبت دو ایسی چیزیں ہیں کہ بظاہر ان کا جمع ہونا بھی محال نظر آتا ہے کہ ایک شخص جس سے خوف کرے اُس سے محبت کیونکر کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا خوف اور محبت ایک الگ رنگ رکھتی ہے جس قدر انسان خدا کے خوف میں ترقی کرے گا اسی قدر محبت زیادہ ہوتی جاوے گی اور جس قدر محبت الٰہی میں وہ ترقی کرے گا اسی قدر

[1] بنی اسرائیل۔ ع ۸۔

خدا تعالیٰ کا خوف غالب ہو کر بدیوں اور برائیوں سے نفرت دلا کر پاکیزگی کی طرف لے جائے گا۔

پس اسلام نے ان دونوں حقوق کو پورا کرنے کے لیے ایک صورت نماز کی رکھی جس میں خدا کے خوف کا پہلو رکھا ہے اور محبت کی حالت کے اظہار کے لیے حج رکھا ہے۔ خوف کے جس قدر ارکان ہیں وہ نماز کے ارکان سے بخوبی واضح ہیں کہ کس قدر تذلل اور اقرار عبودیت اس میں موجود ہے اور حج میں محبت کے سارے ارکان پائے جاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ ع۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

نماز انسان کا تعویذ ہے پانچ وقت دعا کا موقع ملتا ہے کوئی دعا تو سنی جائے گی۔ اس لیے نماز کو بہت سنوار کر پڑھنا چاہیئے۔ اور مجھے یہی بہت عزیز ہے۔ (الحکم جلد ۵ ع۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

نماز میں جو جماعت کا زیادہ ثواب رکھا ہے اس میں یہی غرض ہے کہ وحدت پیدا ہوتی ہے اور پھر اس وحدت کو عملی رنگ میں لانے کی یہاں تک ہدایت اور تاکید ہے کہ باہم پاؤں بھی مساوی ہوں اور صف سیدھی ہو اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ گویا ایک ہی انسان کا حکم رکھیں اور ایک کے انوار دوسرے میں سرایت کر سکیں وہ تمیز جس سے خودی اور خود غرضی پیدا ہوتی ہے نہ رہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ دوسرے کے انوار کو جذب کرتا ہے۔ پھر اسی وحدت کے لیے حکم ہے کہ روزانہ نمازیں محلہ کی مسجد میں اور ہفتہ کے بعد شہر کی مسجد میں اور پھر سال کے بعد عیدگاہ میں جمع ہوں۔ اور کل زمین کے مسلمان سال میں ایک مرتبہ بیت اللہ میں اکٹھے ہوں۔ ان تمام احکام کی غرض وہی وحدت ہے۔ (لیکچر لدھیانہ بحوالہ الحکم جلد ۱۰ ع۳۷ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ تمام انسانوں کو ایک نفس واحد کی طرح بنادے۔ اس کا نام وحدت جمہوری ہے جس سے بہت سے انسان بحالت مجموعی ایک انسان کے حکم میں سمجھا جاتا ہے۔ مذہب سے بھی یہی منشاء ہوتا ہے کہ تسبیح کے دانوں کی طرح وحدۃ جمہوری کے ایک دھاگہ میں سب پروئے جائیں یہ نمازیں باجماعت جو کہ ادا کی جاتی ہیں۔ وہ بھی اسی وحدت کے لیے ہیں۔ تاکہ کل نمازیوں کا ایک وجود شمار کیا جاوے۔ اور آپس میں مل کر کھڑے ہونے کا حکم اس لیے ہے۔ کہ جس کے پاس زیادہ نور ہے۔ وہ دوسرے کمزور میں سرایت کر کے اُسے قوت دیوے حتیٰ کہ حج بھی اسی لئے ہے۔ اس وحدت جمہوری کو پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی ابتدا اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔ کہ اوّل یہ حکم دیا کہ ہر ایک محلہ والے پانچ وقت نمازوں کو باجماعت محلہ کی مسجد میں ادا کریں۔ تاکہ اخلاق کا تبادلہ آپس میں ہو اور انوار مل ملا کر کمزوری کو دور کر دیں۔ اور آپس میں تعارف ہو کر انس پیدا ہو جاوے۔ تعارف بہت عمدہ شے ہے۔ کیونکہ اس سے اُنس بڑھتا ہے جو کہ وحدت کی بنیاد ہے حتیٰ کہ تعارف والا دشمن ایک ناآشنا دوست سے بہت اچھا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب غیر ملک میں ملاقات ہو۔ تو تعارف کی وجہ سے دلوں میں انس پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ کینہ والی زمین سے الگ ہونے کے باعث بغض جو کہ عارضی شے ہوتا ہے۔ وہ تو دور ہو جاتا ہے اور صرف تعارف باقی رہ جاتا ہے۔ پھر دوسرا حکم یہ ہے کہ جمعہ کے دن

جامع مسجد میں جمع ہوں۔ کیونکہ ایک شہر کے لوگوں کا ہر روز جمع ہونا تو مشکل ہے۔ اس لیے یہ تجویز کی کہ شہر کے سب لوگ ہفتہ میں ایک دفعہ مل کر تعارف اور وحدت پیدا کریں۔ آخر کبھی نہ کبھی تو سب ایک ہو جاویں گے۔ پھر سال کے بعد عیدین میں یہ تجویز کی۔ کہ دیہات اور شہر کے لوگ مل کر نماز ادا کریں تاکہ تعارف اور اُنس بڑھ کر وحدت جمہوری پیدا ہو پھر اسی طرح تمام دنیا کے اجتماع کے لیے ایک دن عمر بھر میں مقرر کر دیا۔ کہ مکہ کے میدان میں سب جمع ہوں۔ غرضیکہ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ آپس میں الفت اور اُنس ترقی پکڑے۔ (البدر جلد ۳ عـ۳۴ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صـ۵)

اس میں شک نہیں کہ نماز میں برکات ہیں مگر وہ برکات ہر ایک کو نہیں مل سکتے۔ نماز بھی وہی پڑھتا ہے جس کو خدا تعالیٰ نماز پڑھاوے۔ ورنہ وہ نماز نہیں نرا پوست ہے جو پڑھنے والے کے ہاتھ میں ہے اس کو مغز سے کچھ واسطہ اور تعلق ہی نہیں۔ اسی طرح کلمہ بھی وہی پڑھتا ہے جس کو خدا تعالیٰ کلمہ پڑھواوے جب تک نماز اور کلمہ پڑھنے میں آسمانی چشمہ سے گھونٹ نہ ملے تو کیا فائدہ؟ وہ نماز جس میں حلاوت اور ذوق ہو اور خالق سے سچا تعلق قائم ہو کر پوری نیازمندی اور خشوع کا نمونہ ہو۔ اُس کے ساتھ ہی ایک تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جس کو پڑھنے والا فوراً محسوس کر لیتا ہے کہ اب وہ وہ نہیں رہا جو چند سال پہلے تھا۔ (الحکم جلد ۸ عـ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـ۶)

نماز جو کہ پانچ وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس میں بھی یہی اشارہ ہے۔ کہ اگر وہ نفسانی جذبات اور خیالات سے اُسے محفوظ نہ رکھے گا۔ تب تک وہ سچی نماز ہرگز نہ ہوگی نماز کے معنے ٹکریں مار لینے اور رسم اور عادت کے طور پر ادا کرنے کے ہرگز نہیں۔ نماز وہ شے ہے۔ جسے دل بھی محسوس کرے۔ کہ روح پگھل کر خوفناک حالت میں آستانہ الوہیّت پر گر پڑے۔ جہاں تک طاقت ہے وہاں تک رقت کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور تضرع سے دعا مانگے۔ کہ شوخی اور گناہ جو اندر نفس میں ہیں۔ وہ دور ہوں۔ اسی قسم کی نماز بابرکت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ اس پر استقامت اختیار کریگا۔ تو دیکھے گا۔ کہ رات کو یا دن کو ایک نور اس کے قلب پر گرا ہے اور نفس امّارہ کی شوخی کم ہوگئی ہے۔ جیسے اژدہا میں ایک سم قاتل ہے۔ اسی طرح نفس امارہ میں بھی سم قاتل ہوتا ہے۔ اور جس نے اُسے پیدا کیا اسی کے پاس اس کا علاج ہے۔

(البدر جلد ۳ عـ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صـ۳)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز روزہ کی وجہ سے برکات حاصل نہیں ہوتے وہ غلط کہتے ہیں۔ نماز روزہ کے برکات اور ثمرات ملتے ہیں۔ اور اسی دنیا میں ملتے ہیں۔ لیکن نماز روزہ اور دوسری عبادات کو اس مقام اور جگہ تک پہنچانا چاہیئے جہاں وہ برکات دیتے ہیں۔ صحابہ کا سا رنگ پیدا کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اور سچی اتباع کرو پھر معلوم ہوگا کہ کیا کیا برکات ملتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ عـ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۶ء صـ۳)

خوب یاد رکھو اور پھر یاد رکھو! کہ غیر اللہ کی طرف جھکنا خدا سے کاٹنا ہے۔ نماز اور توحید کچھ ہی ہو (کیونکہ توحید کے عملی اقرار کا نام ہی نماز ہے) اسی وقت بے برکت اور بے سود ہوتی ہے جب اس میں نیستی اور تذلل کی روح اور حنیف

دل نہ ہو! سنو! وہ دعا جس کے لیے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] فرمایا ہے اس کے لیے یہی سچی روح مطلوب ہے۔ اگر اس تضرع اور خشوع میں حقیقت کی روح نہیں تو وہ ٹیں ٹیں سے کم نہیں ہے۔

{ ٹریکٹ ۱ بعنوان حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت وجود پر ایک خط مرتبہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی رضؓ صفحہ ۱۱ }

نماز اور استغفار دل کی غفلت کے عمدہ علاج ہیں نماز میں دعا کرنی چاہیئے کہ (اے اللہ) مجھ میں اور میرے گناہ میں دوری ڈال۔ صدق سے انسان دعا کرتا رہے تو یہ یقینی بات ہے کہ کسی وقت منظور ہو جاوے جلدی کرنی اچھی نہیں ہوتی زمیندار ایک کھیت بوتا ہے تو اسی وقت نہیں کاٹ لیتا۔ بے صبری کرنے والا بے نصیب ہوتا ہے نیک انسان کی یہ علامت ہے کہ وہ بے صبری نہیں کرتے۔ بے صبری کرنے والے بڑے بڑے بدنصیب دیکھے گئے ہیں اگر ایک انسان کنواں کھودے اور ۲۰ ہاتھ کھودے اور ایک ہاتھ رہ جائے تو اس وقت بے صبری سے چھوڑ دے تو اپنی ساری محنت کو برباد کرتا ہے اور اگر صبر سے ایک ہاتھ اور بھی کھود لے تو گوہر مقصود پا لیوے۔ یہ خدا کی عادت ہے کہ ذوق اور شوق اور معرفت کی نعمت ہمیشہ دکھ کے بعد دیا کرتا ہے اگر ہر ایک نعمت آسانی سے مل جاوے تو اس کی قدر نہیں ہوا کرتی سعدی نے کیا عمدہ کہا ہے ؎

گر نباشد بدوست راہ بردن   شرط عشق است در طلب مردن

(البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۰)

نماز سے پیشتر ایمان شرط ہے ایک ہندو اگر نماز پڑھے گا تو اُسے کیا فائدہ ہوگا جس کا ایمان قوی ہوگا وہ دیکھے گا کہ نماز میں کیسے لذت ہے۔ اور اس سے اول معرفت ہے جو خدا کے فضل سے آتی ہے اور کچھ اس کی طینت سے آتی ہے جو محمود فطرت والے ہیں مناسب حال اس کے فضل کے ہوتے ہیں اور اس کے اہل ہوتے ہیں انہیں پر فضل ہی کرتا ہے ہاں یہ بھی لازم ہے کہ جیسے دنیا کی راہ میں کوشش کرتا ہے ویسے ہی خدا کی راہ میں بھی کرے..... نماز پڑھو۔ تدبر سے پڑھو اور ادعیہ ماثورہ کے بعد اپنی زبان میں دعا مانگنی مطلق حرام نہیں ہے جب گدازش ہو تو سمجھو کہ مجھے موقعہ دیا گیا ہے اس وقت کثرت سے مانگو اس قدر مانگو کہ اس نکتہ تک پہنچو کہ جس سے رقت پیدا ہو جاوے یہ بات اختیاری نہیں ہوتی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی ترشحات پیدا ہوتے ہیں۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۱)

دعا وہ اکسیر ہے۔ جو ایک مُشت خاک کو کیمیا کر دیتی ہے۔ اور وہ ایک پانی جو اندرونی غلاظتوں کو دھو دیتا ہے۔ اُس دعا کے ساتھ روح پگھلتی ہے اور پانی کی طرح بہ کر آستانہ حضرت احدیت پر گرتی ہے۔ وہ خدا کے حضور میں کھڑی بھی ہوتی ہے۔ اور رکوع بھی کرتی ہے اور سجدہ بھی کرتی ہے۔ اور اسی کی ظل وہ نماز ہے۔ جو اسلام نے سکھائی ہے۔ اور روح کا کھڑا ہونا یہ ہے۔ کہ وہ خدا کے لیے ہر ایک مصیبت کی برداشت اور حکم ماننے کے بارے میں مستعدی ظاہر کرتی ہے۔

[1] المؤمن۔ ع۔ ۶۱

اور اُس کا رکوع یعنی جھکنا یہ ہے۔ کہ وہ تمام محبتوں اور تعلقوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف جُھک آتی ہے۔ اور خدا کے لیے ہو جاتی ہے اور اُس کا سجدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے آستانہ پر گر کر اپنے تئیں بکلی کھو دیتی ہے۔ اور اپنے نقش وجود کو مٹا دیتی ہے۔ یہی نماز ہے جو خدا کو ملاتی ہے۔ اور شریعت اسلامی نے اُس کی تصویر معمولی نماز میں کھینچ کر دکھلائی ہے۔ تا وہ جسمانی نماز روحانی نماز کی طرف محرک ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کے وجود کی ایسی بناوٹ پیدا کی ہے۔ کہ روح کا اثر جسم پر اور جسم کا اثر روح پر ضرور ہوتا ہے۔ جب تمہاری روح غمگین ہو تو آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اور جب رُوح میں خوشی پیدا ہو۔ تو چہرہ پر بشاشت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان بسا اوقات ہنسنے لگتا ہے۔ ایسا ہی جب جسم کو کوئی تکلیف اور درد پُہنچے تو اُس درد میں روح بھی شریک ہوتی ہے۔ اور جب جسم کھُلی ٹھنڈی ہوا سے خوش ہو۔ تو روح بھی اُس سے کچھ حصہ لیتی ہے۔ پس جسمانی عبادات کی غرض یہ ہے۔ کہ روح اور جسم کے باہمی تعلقات کی وجہ سے روح میں حضرت احدیت کی طرف حرکت پیدا ہو۔ اور وہ روحانی قیام اور رکوع اور سجود میں مشغول ہو جائے۔ کیونکہ انسان ترقیات کے لیے مجاہدات کا محتاج ہے۔ اور یہ بھی ایک قسم مجاہدہ کی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ جب دو چیزیں باہم پیوست ہوں۔ تو جب ہم ان میں سے ایک چیز کو اٹھائیں گے۔ تو اُس اٹھانے سے دوسری چیز کو بھی جو اُس سے ملحق ہے۔ کچھ حرکت پیدا ہوگی۔ لیکن صرف جسمانی قیام اور رکوع اور سجود میں کچھُ فائدہ نہیں ہے۔ جب تک کہ اُس کے ساتھ یہ کوشش شامل نہ ہو۔ کہ روح بھی اپنے طور سے قیام اور رکوع اور سجود سے کچھ حصہ لے۔ اور یہ حصہ لینا معرفت پر موقوف ہے۔ اور معرفت فضل پر موقوف۔

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۸-۲۹)

اللہ تعالے سے تعلق کے لیے ایک محویّت کی ضرورت ہے۔ ہم بار بار اپنی جماعت کو اس پر قائم ہونے کے لیے کہتے ہیں کیونکہ جب تک دنیا کی طرف سے انقطاع اور اس کی محبت دلوں سے ٹھنڈی ہو کر اللہ تعالیٰ کے لیے فطرتوں میں طبعی جوش اور محویّت پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک ثبات میسّر نہیں آسکتا۔ بعض صوفیوں نے لکھا ہے۔ کہ صحابہ جب نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ تو انہیں ایسی محویّت ہوتی تھی۔ کہ جب فارغ ہوتے۔ تو ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکتے تھے۔ جب انسان کسی اور جگہ سے آتا ہے۔ تو شریعت نے حکم دیا ہے۔ کہ وہ آکر السّلام علیکم کہے۔ نماز سے فارغ ہوتے السّلام علیکم ورحمۃ اللہ کے کہنے کی حقیقت یہی ہے۔ کہ جب ایک شخص نے نماز کا عقد باندھا اور اللہ اکبر کہا۔ تو وہ گویا اس عالم سے نکل گیا۔ اور ایک نئے جہان میں جا داخل ہوا۔ گویا ایک مقام محویت میں جا پہنچا۔ پھر جب وہاں سے واپس آیا۔ تو السّلام علیکم ورحمۃ اللہ کہہ کر آن ملا۔ لیکن صرف ظاہری صورت کافی نہیں ہو سکتی۔ جب تک دل میں اس کا اثر نہ ہو۔ چھلکوں سے کیا ہاتھ آسکتا ہے۔ محض صورت کا ہونا کافی نہیں۔ حال ہونا چاہیئے۔ علّت غائی حال ہی ہے مطلق قال اور صورت جس کے ساتھ حال نہیں ہوتا وہ تو الٹی ہلاکت کی راہیں ہیں۔ انسان جب حال پیدا کر لیتا ہے۔ اور اپنے حقیقی خالق و مالک سے ایسی سچی محبت اور اخلاص پیدا کر لیتا ہے۔ کہ یہ بے اختیار اس کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے۔

اور ایک حقیقی محویت کا عالم اُس پر طاری ہو جاتا ہے۔ تو اس وقت اس کیفیت سے انسان گویا سلطان بن جاتا ہے۔ اور ذرہ ذرہ اس کا خادم بن جاتا ہے۔ (البدر جلد ۳ ۳۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

حقیقت میں جو شخص نماز کو چھوڑتا ہے وہ ایمان کو چھوڑتا ہے اس سے خدا کے ساتھ تعلقات میں فرق آجاتا ہے۔ اس طرف سے فرق آیا تو معاً اس طرف سے بھی فرق آجاتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

نماز سے بڑھ کر اور کوئی وظیفہ نہیں ہے کیونکہ اس میں حمد الٰہی ہے۔ استغفار ہے اور درود شریف۔ تمام وظائف اور اوراد کا مجموعہ یہی نماز ہے اور اس سے ہر ایک قسم کے غم و ہم دُور ہوتے ہیں اور مُشکلات حل ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ذرا بھی غم پہنچتا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اسی لیے فرمایا اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ[1] اطمینان سکینت قلب کے لیے نماز سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں۔ (الحکم جلد ۷ ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

نماز اپنی زبان میں نہیں پڑھنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے جس زبان میں قرآن شریف رکھا ہے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیئے ہاں اپنی حاجتوں کو اپنی زبان میں خدا تعالیٰ کے سامنے بعد مسنون طریق اور اذکار کے بیان کر سکتے ہیں مگر اصل زبان کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ عیسائیوں نے اصل زبان کو چھوڑ کر کیا پھل پایا۔ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ (الحکم جلد ۶ ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

پانچواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لیے خدا تعالیٰ نے مجاہدہ ٹھیرایا ہے یعنی اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی طاقتوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی جان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی عقل کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اس کو ڈھونڈھا جائے جیسا کہ وہ فرماتا ہے جَاھِدُوْا بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ[2] وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا[3] یعنی اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنے نفسوں کو مع ان کی تمام طاقتوں کے خدا کی راہ میں خرچ کرو اور جو کچھ ہم نے عقل اور علم اور فہم اور ہنر وغیرہ تم کو دیا ہے وہ سب کچھ خدا کی راہ میں لگاؤ۔ جو لوگ ہمارے راہ میں ہر ایک طور سے کوشش بجا لاتے ہیں ہم ان کو اپنی راہیں دکھا دیا کرتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۸۶)

مجھے یہ الہام بارہا ہو چکا ہے اُجِیْبُ کُلَّ دُعَآئِکَ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ ہر ایک ایسی دعاء جو نفس الامر میں نافع اور مفید ہے قبول کی جائے گی۔ میں جب اس خیال کو اپنے دل میں پاتا ہوں تو میری روح لذت اور سرور سے بھر جاتی ہے۔ جب مجھے یہ اول ہی اول الہام ہوا۔ قریباً پچیس یا تیس برس کا عرصہ ہوتا ہے تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ میری دعائیں جو میرے یا میرے احباب کے متعلق ہونگی ضرور قبول کریگا پھر میں نے خیال کیا کہ اس معاملہ میں بخل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ایک انعام آلٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے متقین کی صفت میں فرمایا ہے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ پس میں نے اپنے دوستوں کیلئے یہ اصول کر رکھا ہے کہ خواہ وہ یاد دلائیں یا نہ یاد دلائیں۔ کوئی امر خطیر پیش کریں یا نہ کریں۔ اُنکی دینی اور دنیوی بھلائی کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۲)

متقی کا لفظ باب افتعال سے آتا ہے اور یہ باب تصنع کے لیے آتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ متقی کو بڑا مجاہدہ اور کوشش کرنی پڑتی ہے اور اس حالت میں وہ نفس لوامہ کے نیچے ہوتا ہے اور جب حیوانی زندگی بسر کرتا ہے اُس وقت امارہ کے نیچے ہوتا ہے اور

---

[1] الرعد ع ۴ [2] التوبہ ع ۶ [3] العنکبوت ع ۷

مجاہدہ کی حالت سے نکل کر جب غالب آجاتا ہے تو مطمئنہ کی حالت میں ہوتا ہے متقی نفس امارہ کی حالت سے نکل کر آتا ہے اور لوامہ کے نیچے ہوتا ہے اسی لیے متقی کی شان میں آیا ہے کہ وہ نماز کو کھڑی کرتے ہیں گویا اس میں بھی ایک قسم کی لڑائی ہی کی حالت ہوتی ہے وساوس اور اوہام آ آکر حیران کرتے ہیں مگر وہ گھبراتا نہیں اور یہ وساوس اُس کو درماندہ نہیں کرسکتے وہ بار بار خدا تعالیٰ کی استعانت چاہتا ہے اور خدا کے حضور چلاتا اور روتا ہے یہاں تک کہ غالب آجاتا ہے ایسا ہی مال کے خرچ کرنے میں بھی شیطان اس کو روکتا ہے اور اسراف اور انفاق فی سبیل اللہ کو یکساں دکھاتا ہے حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اسراف کرنے والا اپنے مال کو ضائع کرتا ہے مگر فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا اُس کو پھر پاتا ہے اور خرچ سے زیادہ پاتا ہے اس لیے ہی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

دولت مند اور متمول لوگ دین کی خدمت اچھی طرح کرسکتے ہیں اسی لیے خدا تعالیٰ نے مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ متقیوں کی صفت کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ یہاں مال کی کوئی خصوصیت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دیا ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے مقصود اس سے یہ ہے کہ انسان اپنے بنی نوع کا ہمدرد اور معاون بنے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت کا انحصار دو ہی باتوں پر ہے۔ تعظیم لامر اللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ پس مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں شفقت علیٰ خلق اللہ کی تعلیم ہے دینی خدمات کے لیے متمول لوگوں کو بڑے بڑے موقع مل جاتے ہیں ایک دفعہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روپیہ کی ضرورت بتلائی۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر کا کل اثاث البیت لے کر حاضر ہو گئے آپ نے پوچھا۔ ابوبکر! گھر میں کیا چھوڑ آئے تو جواب میں کہا اللہ اور رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نصف لے آئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا عمر! گھر میں کیا چھوڑ آئے تو جواب دیا کہ نصف۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر و عمر کے فعلوں میں جو فرق ہے وہی ان کے مراتب میں فرق ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳، ۴)

متقیوں کی صفات میں سے ہے کہ وہ بالغیب ایمان لاتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ یعنی علم۔ مال اور دوسرے قوائے ظاہری اور باطنی جو کچھ دیا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے خدا نے بڑے بڑے وعدہ انعام کے کیے ہیں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴۔ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

پھر متقی کے لیے ایک اور منزل آتی ہے وہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ہے یعنی جو کچھ ان کو ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرنے اور دیتے ہی رہتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ایمان کبھی کسی حال سے کبھی کسی حال سے قوی ہو جاتا ہے اس کے لیے یہ لکھا ہے کہ اول خود دعا کرے اور پھر جن پر حسن ظن ہو ان سے دعا کرائے۔ یہ بھی نہ ہو تو خیرات کرے جب خیرات دیتا ہے تو قبض دور ہو جاتی ہے۔ سوالی اگر آجاوے تو اس کو پہلے ہی جھڑک نہ دے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قبض پیدا ہو جاتی ہے اور پھر کچھ بھی دینے کی توفیق نہیں ملتی۔ اور اگر اس کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے گا تو کچھ دینے کے لیے بھی سینہ کھل جائے گا۔ صدقات ایسی چیزیں ہیں کہ اُن سے دنیاوی منازل طے ہو جاتی ہیں اخلاق

فاضلہ پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر بڑی بڑی نیکیوں کی توفیق دی جاتی ہے غرض مختلف مدارج اور اسباب ہیں اور یہ اس لیے ہیں کہ متقی اپنے اصلی مرتبہ پر پہنچ جاتے یہ دوسرا درجہ اصلاح کا ہے۔ اس وقت متقی کا نام صالح رکھا جاتا ہے اس وقت شیطان کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صالح کا درجہ طفیلی درجہ ہے جو تقوی سے آتا ہے پہلا درجہ بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اس وقت شبہات سے ایک خطرناک جنگ ہوتی ہے اور شیطان پوری طاقت سے حملہ کرتا ہے مگر اس درجہ میں فساد دور ہو جاتے ہیں شیطان کو بہت سی شکستیں مل چکی ہوتی ہیں اس کی طاقت بہت ہی کمزور ہو جاتی ہے اس کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ فساد دور ہو کر اخلاق فاضلہ اور خدا کی محبت اندر آجاتی ہے۔ یہ اطمینان کا درجہ ہے اور یہ وہی درجہ ہے جس کو یَآ اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ[1] کہا گیا ہے۔ میں اس کے وہ معنی کرتا ہوں جو مجھ پر کھولے گئے ہیں۔ جب انسان اس درجہ پر پہنچتا ہے۔ ایک قدرتی جذب الی اللہ اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ گولی کی طرح لڑھکتا ہوا چلا جاتا ہے اب دور رہنا ناممکن ہے یہ معیت کو چاہتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

میں یقیناً جانتا ہوں۔ کہ خسارہ کی حالت میں وہ لوگ ہیں۔ جو ریاکاری کے موقعوں میں تو صدہا روپیہ خرچ کریں۔ اور خدا کی راہ میں پیش و پس سوچیں۔ شرم کی بات ہے۔ کہ کوئی شخص اس جماعت میں داخل ہو کر پھر اپنی خسّت اور بخل کو نہ چھوڑے یہ خدا تعالیٰ کی سنّت ہے کہ ہر ایک اہل اللہ کے گروہ کو اپنی ابتدائی حالت میں چندوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کئی مرتبہ صحابہؓ پر چندے لگائے جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سب سے بڑھ کر رہے۔..... جو ہمیں مدد دیتے ہیں۔ آخر وہ خدا کی مدد دیکھیں گے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہشتم صفحہ ۶۶)

آیت ۵۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝

یعنی متقی وہ ہوتے ہیں جو پہلے نازل شدہ کتب پر اور تجھ پر جو کتاب نازل ہوئی اس پر (ایمان لاتے) اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ امر بھی تکلف سے خالی نہیں۔ ابھی تک ایمان ایک محجوبیت کے رنگ میں ہے۔ متقی کی آنکھیں معرفت اور بصیرت کی نہیں۔ اُس نے تقوی سے شیطان کا مقابلہ کر کے ابھی ایک بات کو مان لیا ہے یہی حال اس وقت ہماری جماعت کا ہے۔ اُنہوں نے بھی تقوی سے مانا تو ہے اور ابھی وہ نہیں جانتے۔ کہ یہ جماعت کہاں تک نشو ونما الٰہی ہاتھوں سے پانے والی ہے۔ سو یہ ایک ایمان ہے جو بالآخر فائدہ رساں ہوگا۔

یقین کا لفظ عام طور پر جب استعمال ہو۔ تو اس سے مراد اس کا ادنیٰ درجہ ہوتا ہے یعنی علم کے تین مدارج میں سے ادنیٰ درجہ کا علم یعنی علم الیقین اس درجہ پر اتقا والا ہوتا ہے۔ مگر بعد اس کے عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ بھی تقوی کے مراحل طے کرنے کے بعد حاصل کر لیتا ہے۔

تقوی کوئی چھوٹی چیز نہیں۔ اس کے ذریعہ اُن تمام شیطانوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے جو انسان کی ہر ایک اندرونی طاقت و قوت پر غلبہ پائی ہوئی ہیں۔ یہ تمام قوتیں نفس امّارہ کی حالت میں انسان کے اندر شیطان ہیں۔ اگر اصلاح

---

[1] سورۃ الفجر: ۲۸

نہ پائیں گے تو انسان کو غلام کر لیں گے۔ علم و عقل ہی بُرے طور پر استعمال ہو کر شیطان ہو جاتے ہیں متقی کا کام ان کی اور ایسا ہی اور کل قوٰی کی تعدیل کرنا ہے۔ ایسا ہی جو لوگ انتقام، غضب یا نکاح کو ہر حال میں بُرا جانتے ہیں۔ وہ بھی صحیفہ قدرت کے مخالف ہیں اور قوٰی انسانی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ سچا مذہب وہی ہے۔ جو انسانی قوٰی کا مربی ہو نہ کہ اُن کا استیصال کرے۔ رجولیت یا غضب جو خدا تعالیٰ کی طرف سے فطرت انسانی میں رکھے گئے ہیں۔ اُن کو چھوڑنا خدا کا مقابلہ کرنا ہے۔ جیسے تارک الدنیا ہونا۔ یا راہب بن جانا۔ یہ تمام حق العباد کو تلف کرنے والے ہیں۔ اگر یہ امر ایسا ہی ہوتا۔ تو گویا اُس خدا پر اعتراض ہے۔ جس نے یہ قوٰی ہم میں پیدا کیے۔ سو ایسی تعلیمیں جو انجیل میں ہیں اور جن سے قوٰی کا استیصال لازم آتا ہے۔ ضلالت تک پہنچاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اس کی تعدیل کا حکم دیتا ہے۔ ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۷-۴۸)

تمام نیکیوں اور راست بازیوں کا بڑا بھاری ذریعہ منجملہ دیگر اسباب اور وسائل کے آخرت پر ایمان بھی ہے اور جب انسان آخرت اور اُس کی باتوں کو قصہ اور داستان سمجھے تو سمجھ لو کہ وہ رد ہو گیا اور دونوں جہان سے گیا گذرا ہوا۔ اس لیے کہ آخرت کا ڈر بھی تو انسان کو خائف اور ترساں بنا کر اُس کو معرفت کے سچے چشمہ کی طرف کشاں کشاں لے آتا ہے اور سچی معرفت بغیر حقیقی خشیت اور خدا ترسی کے حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ پس یاد رکھو کہ آخرت کے متعلق وساوس کا پیدا ہونا ایمان کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے اور خاتمہ بالخیر میں فتور آ جاتا ہے جس قدر ابرار۔ اخیار اور راست باز انسان دنیا میں ہو گذرے ہیں جو رات کو اُٹھ کر قیام اور سجدہ ہی میں صبح کر دیتے تھے کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ وہ جسمانی قوتیں بہت رکھتے تھے اور بڑے بڑے قوی ہیکل جوان اور تنومند پہلوان تھے؟ نہیں!! یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ جسمانی قوت اور توانائی سے وہ کام ہرگز نہیں ہو سکتے جو روحانی قوت اور طاقت کر سکتی ہے۔ بہت سے انسان آپ لوگوں نے دیکھے ہوں گے جو تین چار بار دن میں کھاتے ہیں اور خوب لذیذ اور مقوی اغذیہ پلاؤ وغیرہ کھاتے ہیں مگر اُس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ صبح تک خراٹے مارتے رہتے ہیں اور نیند اُن پر غلبہ رکھتی ہے اور یہاں تک نیند اور سستی کے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ اُن کو عشاء کی نماز بھی دوبھر اور مشکل عظیم معلوم دیتی ہے چہ جائیکہ وہ تہجد گذار ہوں۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۴)

ہم کو اُس (خدا) نے قرآن اور حدیث کے ذریعہ خبر دی ہے کہ ایک زمانہ اور بھی آنے والا ہے جبکہ خدا کے ساتھ کوئی نہ ہوگا۔ وہ زمانہ بڑا خوفناک زمانہ ہے۔ چونکہ اُس پر ایمان لانا ہر مومن اور مسلمان کا کام ہے۔ جو اُس پر ایمان نہیں لاتا وہ مسلمان نہیں۔ کافر ہے۔ اور بے ایمان ہے جس طرح سے بہشت۔ دوزخ۔ انبیاء علیہم السلام اور کتابوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ ویسا ہی اُس ساعت پر ایمان لانا لازم ہے۔ جب نفخ صور ہو کر سب نیست و نابود ہو جاویں گے یہ سنت اللہ اور عادت اللہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے سمجھانے کے لیے تین طریق اختیار فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ

انسان کو عقل دی ہے۔ کہ اگر وہ اُس سے ذرا بھی کام لے۔ اور غور کرے۔ تو یہ امر نہایت صفائی سے ذہن میں آسکتا ہے۔ کہ انسان کی مختصر سی زندگی دو عدموں کے درمیان واقع ہے۔ اور کبھی کبھی بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ قیاس سے مجہولات کا پتہ لگ سکتا ہے۔ انسان معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم غور کریں۔ کہ ہمارے باپ دادے کہاں ہیں۔ اس پر غور کریں اور سوچیں تو ماننا پڑے گا۔ کہ سب کو اسی راستہ پر چلنا ہوگا۔ نادان ہے وہ انسان جس کے سامنے ہزار ہا نمونے ہوں اور وہ اُن سے سبق نہ لے عقل نہ سیکھے۔ عموماً دیکھا گیا ہے اور یہ ایک مانی ہوئی بات ہے۔ کہ ہر گاؤں اور شہر میں زندوں سے قبریں زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض مخفی اور بعض ظاہر ہوتی ہیں۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے۔ کہ جب شہر میں کوئی کنواں کھودتے ہیں۔ تو اُس میں سے ہڈیاں نکلتی ہیں۔ عموماً قبریں ہی قبریں ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ ایک دوسری بات ہے۔ کہ وہ نمودار نہ ہوں۔ اس سے نابود شدہ طبقہ انسان کا پتہ لگتا ہے۔

دوسری ایک یہ دلیل عقلی اُس زمانہ کے وجود پر موجود ہے۔ کہ جس طرح کھیت میں سبزہ نکلتا ہے۔ خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے۔ کہ وہ رفتہ رفتہ زرد ہو کر خشک ہونے لگتا ہے۔ اور پھر ایک حالت اُس پر آتی ہے کہ وہ گرنے لگتا ہے۔ کہ اس وقت جب نقصان ہونے لگتا ہے۔ تو بونے والا کسان اُس کو خود ہی کاٹ ڈالتا ہے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ اسی طرح پڑا پڑا اُڑ کر ضائع جاوے۔

دنیا خدا تعالیٰ کا کھیت ہے جس طرح زمیندار مصلحت اور انجام بینی سے کبھی کچا ہی کاٹ لیتا ہے۔ کبھی ذرا پختہ ہوتا ہے تو کاٹتا ہے۔ اسی طرح سے ہم بھی پرورش پا کر خداوندی مشیت اور ارادے کے موافق ٹھیک اپنے اپنے وقت پر کاٹے جاتے ہیں زمیندار کے فعل سے سبق اور عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ کہ انسان کی زندگی کا بھی ٹھیک یہی طرز ہے جیسے بعض دانے اگنے بھی نہیں پاتے۔ بلکہ زمین کے اندر ہی اندر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض بچے شکمِ مادر ہی ضائع ہو جاتے ہیں اور بعض پیدا ہونے کے چند روز بعد مرتے ہیں۔ غرض ٹھیک اُسی قانون اور عمل کے موافق انسان بچہ۔ جوان اور بوڑھا ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی مرضی کی درانتی اُسے وقتاً فوقتاً مصلحت سے کاٹتی جاتی ہے کبھی بچے مرتے ہیں جن کو کہتے ہیں کہ اٹھرا سے مرتے ہیں صحیح البدن توانا تندرست جوان بھی مرتے ہیں۔ عمر رسیدہ ہو کر ہیر ناتواں بھی آخر اُٹھ جاتے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ قطع و برید کا دنیا میں ایسا جاری ہے جو ہر آن انسان کو سبق دیتا ہے۔ کہ دُنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں۔ پس یہ بھی ایک دلیل اُس زمانہ کی آمد پر ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور دلیل خدا تعالیٰ نے اس زمانہ کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے پیش کی ہے۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے قہری معجزات ہیں جن سے ایک ایک وقت دُنیا کے تختے اُلٹ گئے۔ اور خلقت کا نام و نشان تک قریباً مٹ گیا ہے۔ انسان خدا تعالیٰ کے قہر کے ہاتھ میں ہے جب چاہے وہ نابود کر دے۔ پھر اس کو اور دلیل کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ کہ بعض امراض اس ہیبت اور شدت سے پھیلتی ہیں کہ جنہوں نے اُن کا دورہ دیکھا ہوگا۔ وہ کہہ سکتے

ہیں۔کہ قیامت ہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ (رسالہ الانذار صفحہ ۵۴-۵۶ ایڈیشن اول)

طالب نجات وہ ہے جو خاتم النبیین پیغمبر آخر الزمان پر جو کچھ اوتارا گیا ہے۔ اوس پر ایمان لاوے اور اس پیغمبر سے پہلے جو کتابیں اور صحیفے سابقہ انبیاء اور رسولوں پر نازل ہوئے اُن کو بھی مانے۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اور طالب نجات وہ ہے جو پچھلی آنے والی گھڑی یعنی قیامت پر یقین رکھے اور جزا و سزا مانتا ہو۔

(الحکم جلد ۸ ۳۴-۳۵ صفحہ ۹ مورخہ ۱۰/۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء)

فرمایا کہ

"آج میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن شریف کی وحی اور اس سے پہلی وحی پر ایمان لانے کا ذکر تو قرآن شریف میں موجود ہے۔ ہماری وحی پر ایمان لانے کا ذکر کیوں نہیں۔ اسی امر پر توجہ کر رہا تھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور القاء کے یکایک میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ آیۂ کریمہ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ میں تینوں وحیوں کا ذکر ہے۔ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ سے قرآن شریف کی وحی اور مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے انبیأ سابقین کی وحی اور اٰخرۃ سے مراد مسیح موعود کی وحی ہے۔ آخرۃ کے معنے ہیں پیچھے آنے والی۔ وہ پیچھے آنے والی چیز کیا ہے۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں پیچھے آنیوالی چیز سے مراد وہ وحی ہے جو قرآن کریم کے بعد نازل ہوگی۔ کیونکہ اس سے پہلے وحیوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ دوسری وہ جو آنحضرت صلعم سے قبل نازل ہوئی اور تیسری وہ جو آپ کے بعد آنے والی تھی۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱۴ نمبر ۳-۴ بابت ماہ مارچ و اپریل ۱۹۱۵ء صفحہ ۱۶۴ حاشیہ)

آیت ۶- اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

متقی کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر آخر میں بطور نتیجہ یہ کہا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جو تقوی پر قدم مارتے ہیں۔ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ نماز ڈگمگاتی ہے۔ پھر اُسے کھڑا کرتے ہیں۔ خدا کے دیئے سے دیتے ہیں باوجود خطرات نفس بلا سوچے گذشتہ اور موجودہ کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرکار وہ یقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے سر پر ہیں۔ وہ ایک ایسی سڑک پر ہیں۔ جو برابر آگے کو جا رہی ہے۔ اور جس سے آدمی فلاح تک پہنچتا ہے۔ پس یہی لوگ فلاح یاب ہیں۔ جو منزل مقصود تک پہنچ جاویں گے۔ اور راہ کے خطرات سے نجات پا چکے ہیں۔ اس لیے شروع میں ہی اللہ تعالیٰ نے ہم کو تقویٰ کی تعلیم کر کے ایک ایسی کتاب ہم کو عنایت کی جس میں تقویٰ کے وصایا بھی دیئے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۹)

یعنی جن لوگوں میں مذکورہ بالا اوصاف موجود ہوں وہ لوگ اپنے پروردگار کی سیدھی راہ پر ہیں اور وہی لوگ نجات یابندہ اور فرقہ ناجیہ کے لوگ ہیں یہی طریق نجات ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے یہ راستہ کیا صاف اور سیدھا ہے طالب نجات کو لازم ہے کہ وہ اپنی عقل کو الہام و وحی الٰہی کے ماتحت چلائے ورنہ بھٹک جائیگا۔ (الحکم جلد ۸ ۳۴و۳۵ مورخہ ۱۰/۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

آیت ۷۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝

اِس جگہ خدائے تعالیٰ نے صاف فرمادیا۔ کہ جو لوگ خدائے تعالیٰ کے علم میں ہدایت پانے کے لائق ہیں اور اپنی اصل فطرت میں صفت تقویٰ سے متصف ہیں۔ وہ ضرور ہدایت پاجائیں گے۔ اور پھر ان آیات میں جو اس آیت کے بعد میں لکھی گئی ہیں۔ اسی کی زیادہ تر تفصیل کردی۔ اور فرمایا۔ کہ جس قدر لوگ (خدا کے علم میں) ایمان لانے والے ہیں۔ وہ اگرچہ ہنوز مسلمانوں میں شامل نہیں ہوئے۔ پر آہستہ آہستہ سب شامل ہوجائیں گے۔ اور وہی لوگ باہر رہ جائیں گے جنکو خدا خوب جانتا ہے کہ طریقۂ حقۂ اسلام قبول نہیں کریں گے۔ اور گو ان کو نصیحت کی جائے یا نہ کی جائے ایمان نہیں لائیں گے یا مراتب کاملہ تقویٰ و معرفت تک نہیں پہنچیں گے۔

غرض ان آیات میں خدائےتعالیٰ نے کھول کر تبلا دیا کہ ہدایتِ قرآنی سے صرف متقی منتفع ہو سکتے ہیں جن کی اصل فطرت میں غلبہ کسی ظلمتِ نفسانی کا نہیں اور یہ ہدایت ان تک ضرور پہنچ رہے گی لیکن جو لوگ متقی نہیں ہیں نہ وہ ہدایتِ قرآنی سے کچھ نفع اٹھاتے ہیں۔ اور نہ یہ ضرور ہے کہ خواہ نخواہ ان تک ہدایت پہنچ جائے۔ خلاصہ جواب یہ کہ دنیا میں دو طور کے آدمی پائے جاتے ہیں بعض متقی اور طالب حق جو ہدایت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اور بعض مفسد الطبع جن کو نصیحت کرنا نہ کرنا برابر ہوتا ہے۔ (براہین احمدیہ جلد سوم ص۱۸۶ حاشیہ ۱۱)

آیت ۸۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۝

خدا تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ ظلم کرتا ہے عادت اللہ یہ ہے کہ جب ایک فعل یا عمل انسان سے صادر ہوتا ہے تو جو کچھ اس میں اثر مخفی یا کوئی خاصیّت چھپی ہوئی ہوتی ہے خدا تعالیٰ ضرور اُس کو ظاہر کر دیتا ہے مثلاً جس وقت ہم کسی کوٹھڑی کے چاروں طرف سے دروازے بند کردیں گے تو یہ ہمارا ایک فعل ہے جو ہم نے کیا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس پر اثر یہ مترتب ہوگا کہ ہماری کوٹھڑی میں اندھیرا ہو جائے گا اور اندھیرا کرنا خدا کا فعل ہے جو قدیم سے اُس کے قانون قدرت میں مندرج ہے۔ ایسا ہی جب ہم ایک وزن کافی تک زہر کھالیں گے تو کچھ شک نہیں کہ یہ ہمارا فعل ہوگا پھر بعد اس کے ہمیں مار دینا یہ خدا کا فعل ہے جو قدیم سے اُس کے قانون قدرت میں مندرج ہے۔ غرض ہمارے فعل کے ساتھ ایک فعل خدا کا ضرور ہوتا ہے جو ہمارے فعل کے بعد ظہور میں آتا اور اُس کا نتیجہ لازمی ہوتا ہے۔ سو یہ انتظام جیسا کہ ظاہر سے متعلق ہے ایسا ہی باطن سے بھی متعلق ہے۔ ہر ایک ہمارا نیک یا بد کام ضرور اپنے ساتھ ایک اثر رکھتا ہے جو ہمارے فعل کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ اور قرآن شریف

میں جو خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ آیا ہے اس میں خدا کے مُہر لگانے کے یہی معنی ہیں کہ جب انسان بدی کرتا ہے تو بدی کا نتیجہ اثر کے طور پر اُس کے دل پر اور مونہہ پر خدا تعالیٰ ظاہر کر دیتا ہے اور یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَہُمْ[1] یعنی جبکہ وہ حق سے پھر گئے تو خدا تعالیٰ نے اُن کے دل کو حق کی مناسبت سے دور ڈال دیا اور آخر کو معاندانہ جوش کے اثروں سے ایک عجیب کایا پلٹ اُن میں ظہور میں آئی اور ایسے بگڑے کہ گویا وہ وہ نہ رہے اور رفتہ رفتہ نفسانی مخالفت کے زہر نے اُن کے انوار فطرت کو دبا لیا۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۷)

آریہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن شریف میں لکھا ہے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ کہ خدا نے دلوں پر مہر کر دی ہے تو اس میں انسان کا کیا قصور ہے یہ ان لوگوں کی کوتہ اندیشی ہے کہ ایک کلام کے ماقبل اور مابعد پر نظر نہیں ڈالتے ورنہ قرآن شریف نے صاف طور پر بتلایا ہے کہ یہ مہر جو خدا کی طرف سے لگتی ہے یہ دراصل انسانی افعال کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب ایک فعل انسان کی طرف سے صادر ہوتا ہے تو سنت اللہ یہی ہے کہ ایک فعل خدا کی طرف سے بھی صادر ہو۔ جیسے ایک شخص جب اپنے مکان کے دروازے بند کر دے تو یہ اس کا فعل ہے اور اس پر خدا کا فعل یہ صادر ہوگا کہ اس مکان میں اندھیرا کر دے۔ کیونکہ روشنی اندر آنے کے جو ذریعہ تھے وہ اُس نے خود اپنے لیے بند کر دیئے اسی طرح اس مہر کے اسباب کا ذکر خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں دوسری جگہ کیا ہے جہاں لکھا ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ[2] کہ جب انہوں نے کجی اختیار کی تو خدا نے ان کو کج کر دیا اسی کا نام مہر ہے لیکن ہمارا خدا ایسا نہیں کہ پھر اس مہر کو دور نہ کر سکے چنانچہ اُس نے اگر مہر لگنے کے اسباب بیان کیے ہیں تو ساتھ ہی وہ اسباب بھی بتلا دیئے ہیں جن سے مُہر اٹھ جاتی ہے۔ جیسے کہ یہ فرمایا ہے اِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا۔[3]

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۶۷)

آیت ۹۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ۝

کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض اتنی ہی بات پر راضی ہو جاوے کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے۔ اور وہ آزمائے نہ جاویں۔ ایسے لوگ جو اتنی بات پر اپنی کامیابی سمجھتے ہیں وہ یاد رکھیں انہیں کے لیے.... آیا ہے وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۷ ۲۴ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

انسان کو صرف پنجگانہ نماز اور روزوں وغیرہ وغیرہ احکام کی ظاہری بجا آوری پر ہی ناز نہیں کرنا چاہیئے۔ نماز

---

[1] الصف۔ ع۔ ۱ [2] الصف۔ ع۔ ۱ [3] بنی اسرائیل۔ ع۔ ۳

پڑھنی تھی پڑھ لی۔ روزے رکھنے تھے رکھ لیے۔ زکوٰۃ دینی تھی دیدی وغیرہ وغیرہ مگر نوافل ہمیشہ نیک اعمال کی متمم ومکمل ہوتی ہے اور یہی ترقیات کا موجب ہوتا ہے۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ خیرات وصدقہ وغیرہ جو خدا نے اس پر فرض ٹھہرایا ہے بجالاوے اور ہر ایک کارِ خیر کے کرنے میں اس کو ذاتی محبت ہو اور کسی تصنّع ونمایش وریاء کو اس میں دخل نہ ہو یہ حالت مومن کی اُس کے سچے اخلاص اور تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور ایک سچّا اور مضبوط رشتہ اُس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیدا کر دیتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اُس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور اُس کے کان ہو جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے اور اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ کام کرتا ہے الغرض ہر ایک فعل اس کا اور ہر ایک حرکت وسکون اُس کا اللہ ہی کا ہوتا ہے۔ اس وقت جو اس سے دشمنی کرتا ہے وہ خدا سے دشمنی کرتا ہے اور پھر فرماتا ہے کہ میں کسی بات میں اس قدر تردد نہیں کرتا جس قدر کہ اُس کی موت میں۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ مومن اور غیر مومن میں ہمیشہ فرق رکھ دیا جاتا ہے۔ غلام کو چاہیئے کہ ہر وقت رضاء الٰہی کو ماننے اور ہر ایک رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں دریغ نہ کرے کون ہے جو عبودیت سے انکار کر کے خدا کو اپنا محکوم بنانا چاہتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

۱۱۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۵ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ

جب تک ایک مرض کے مواد مخفی ہیں تب تک اُس مرض کا کچھ علاج نہیں ہو سکتا لیکن مواد کے ظہور اور بروز کے وقت ہر یک طور کی تدبیر ہو سکتی ہے انبیا نے جو سخت الفاظ استعمال کیے حقیقت میں ان کا مطلب تحریک ہی تھا تا خلق اللہ میں ایک جوش پیدا ہو جائے اور خوابِ غفلت سے اس ٹھوکر کے ساتھ بیدار ہو جائیں اور دین کی طرف خوض اور فکر کی نگاہیں دوڑانا شروع کر دیں اور اس راہ میں حرکت کریں گو وہ مخالفانہ حرکت ہی سہی اور اپنے دلوں کا اہلِ حق کے دلوں کے ساتھ ایک تعلق پیدا کر لیں گو وہ عدوانہ تعلق ہی کیوں نہ ہو اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ یقیناً سمجھنا چاہیئے کہ دینِ اسلام کو سچے دل سے ایک دن وہی لوگ قبول کریں گے جو بباعث سخت اور پُر زور جگانے والی تحریکوں کے کتب دینیہ کی ورق گردانی میں لگ گئے ہیں اور جوش کے ساتھ اس راہ کی طرف قدم اُٹھا رہے ہیں گو وہ قدم مخالفانہ ہی سہی۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۰-۳۱)

ایک نہایت لطیف نکتہ جو سورۃ القدر کے معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اس سورۃ میں صاف اور صریح لفظوں میں فرما دیا ہے کہ جس وقت کوئی آسمانی مصلح زمین پر آتا ہے تو اس کے ساتھ فرشتے آسمان سے اُتر کر مستعد لوگوں کو حق کی طرف کھینچتے ہیں پس ان آیات کے مفہوم سے یہ جدید فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اگر سخت ضلالت اور غفلت کے زمانہ میں یک دفعہ ایک خارقِ عادت کے طور پر انسانوں کے قُویٰ میں خود بخود مذہب کی تفتیش کی طرف حرکت پیدا ہونی شروع ہو جائے تو وہ اس بات کی علامت ہو گی کہ کوئی آسمانی مصلح پیدا ہو گیا ہے کیونکہ بغیر روح القدس

کے نزول کے وہ حرکت پیدا ہونا ممکن نہیں اور وہ حرکت حسب استعداد طبائع دو قسم کی ہوتی ہے حرکت تامہ اور حرکت ناقصہ۔ حرکت تامہ وہ حرکت ہے جو روح میں صفائی اور سادگی بخش کر اور عقل اور فہم کو کافی طور پر تیز کر کے رُوبحق کر دیتی ہے اور حرکت ناقصہ وہ ہے جو روح القدس کی تحریک سے عقل اور فہم تو کسی قدر تیز ہو جاتا ہے مگر بباعث عدم سلامت استعداد کے وہ روبحق نہیں ہو سکتا بلکہ مصداق اس آیت کا ہو جاتا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا یعنی عقل اور فہم کے جنبش میں آنے سے پچھلی حالت اُس شخص کی پہلی حالت سے بدتر ہو جاتی ہے جیسا کہ تمام نبیوں کے وقت میں یہی ہوتا رہا کہ جب ان کے نزول کے ساتھ ملائک کا نزول ہوا تو ملائکہ کی اندرونی تحریک سے ہر یک طبیعت عام طور پر جنبش میں آ گئی تب جو لوگ راستی کے فرزند تھے وہ اُن راستبازوں کی طرف کھینچے چلے آئے اور جو شرارت اور شیطان کی ذرّیت تھے وہ اس تحریک سے خواب غفلت سے جاگ تو اُٹھے اور دینیات کی طرف متوجہ بھی ہو گئے لیکن بباعث نقصان استعداد حق کی طرف رُخ نہ کر سکے سو فعل ملائک کا جو ربانی مصلح کے ساتھ اُترتے ہیں ہر یک انسان پر ہوتا ہے لیکن اس فعل کا نیکوں پر نیک اثر اور بدوں پر بد اثر ہوتا ہے۔

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید (و) در شورہ بوم خس

اور جیسا کہ ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں یہ آیت کریمہ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا اسی مختلف طور کے اثر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۵)

اُن کے دلوں میں مرض تھی خدا تعالیٰ نے اس مرض کو زیادہ کیا یعنی امتحان میں ڈال کر اس کی حقیقت ظاہر کر دی۔

(جنگ مقدس (بیان حضرت مسیح موعود مورخہ یکم جون ۱۸۹۳ء) صفحہ ۱۲۶ بار سوم)

جیسا کہ خدائے کریم بے نیاز ہے اُس نے اپنے برگزیدوں میں بھی بے نیازی کی صفت رکھ دی ہے سو وہ خدا کی طرح سخت بے نیاز ہوتے ہیں اور جب تک کوئی پوری خاکساری اور اخلاص کے ساتھ ان کے رحم کے لیے ایک تحریک پیدا نہ کرے وہ قوت اُن کی جوش نہیں مارتی اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ تمام دُنیا سے زیادہ تر رحم کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں مگر اس کی تحریک اُن کے اختیار میں نہیں ہوتی گو وہ بارہا چاہتے بھی ہیں کہ وہ قوت ظہور میں آوے مگر بجز ارادہ الٰہیہ کے ظاہر نہیں ہوتی بالخصوص وہ منکروں اور منافقوں اور سُست اعتقاد لوگوں کی کچھ بھی پرواہ نہیں رکھتے اور ایک مرے ہوئے کیڑے کی طرح اُن کو سمجھتے ہیں۔ اور وہ بے نیازی ان کی ایک ایسی شان رکھتی ہے جیسا کہ ایک معشوق نہایت خوبصورت برقع میں اپنا چہرہ چھپائے رکھے۔ اور اسی بے نیازی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب کوئی شریر انسان ان پر بدظنی کرے تو بسا اوقات بے نیازی کے جوش سے اُس بدظنی کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں کیونکہ تخلق باخلاق اللّٰہ رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کوئی معجزہ اُن سے ظاہر ہو تو اُن کے دلوں میں ایک جوش پیدا کر دیتا ہے اور ایک امر کے حصول کے لیے

سخت کرب اور قلق ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تب وہ بے نیازی کا برقعہ اپنے منہ پر سے اُتار لیتے ہیں اور وہ حُسن اُن کا جو بجز خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں دیکھتا وہ آسمان کے فرشتوں پر اور ذرہ ذرّہ پر نمودار ہو جاتا ہے اور اُن کا منہ پر سے برقعہ اُٹھانا یہ ہے کہ وہ اپنے کامل صدق اور صفا کے ساتھ اور اس روحانی حُسن کے ساتھ جس کی وجہ سے وہ خدا کے محبوب ہو گئے ہیں اس خدا کی طرف ایک ایسا خارق عادت رجوع کرتے ہیں اور ایک ایسے اقبال علی اللہ کی اُن میں حالت پیدا ہو جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی فوق العادت رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ساتھ ہی ذرہ ذرّہ اس عالم کا کھنچا چلا آتا ہے اور ان کی عاشقانہ حرارت کی گرمی آسمان پر جمع ہوتی اور بادلوں کی طرح فرشتوں کو بھی اپنا چہرہ دکھاتی ہے۔ اور ان کی دردیں جو رعد کی خاصیت اپنے اندر رکھتی ہیں ایک سخت شور ملاء اعلیٰ میں ڈال دیتی ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ بادل پیدا ہو جاتے ہیں جن سے رحمت الٰہی کا وہ مینہ برستا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۶۲-۶۳)

انبیاء علیہم السلام کی خاصیت ہوتی ہے کہ مومن اور کافر ان کے طفیل سے اپنے کفر اور ایمان میں کمال کرتے ہیں۔ لکھا ہے کہ ابوجہل کا کفر پورا نہ ہوتا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے۔

پہلے اس کا کفر مخفی تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر اس کا اظہار ہو گیا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا صدق بھی مخفی تھا جو اس وقت ظاہر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روحانی دعوت کی ایک نے اس دعوت کو قبول کیا اور دوسرے نے انکار کر دیا۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا انبیاء و رسل آکر اس خباثت اور شقاوت کو جو ان کے اندر ہوتی ہے ظاہر کر دیتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

جب کوئی ابتلا اور آزمایش آتی ہے تو وہ انسان کو ننگا کر کے دکھا دیتی ہے۔ اُس وقت وہ مرض جو دل میں ہوتی ہے اپنا پورا اثر کر کے انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا یہ مرض ابتلا ہی کے وقت بڑھتی اور اپنا پورا زور دکھاتی ہے خدا تعالیٰ کی یہ بھی عادت ہے کہ وہ دلوں کی مخفی قوتوں کو ظاہر کر دیتا ہے جو شخص اپنے دل میں ایک نور رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا صدق اور اخلاص ظاہر کر دیتا ہے اور جو دل میں خبث اور شرارت رکھتا ہے اُس کو بھی کھول کر دکھا دیتا ہے اور کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

نرا بدیوں سے بچنا کوئی کمال نہیں ہماری جماعت کو چاہیئے کہ اسی پر بس نہ کرے نہیں بلکہ انہیں دونو کمال حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جس کے لیے مجاہدہ اور دعا سے کام لیں یعنی بدیوں سے بچیں اور نیکیاں کریں۔ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ وہ خدا کو سادہ نہ سمجھ لے کہ وہ مکر و فریب میں آ جائے گا۔ جو شخص سفلہ طبع ہو کر خدا تعالیٰ کو دھوکہ دینا

چاہتا ہے اور نیکی اور راست بازی کی چادر کے نیچے فریب کرتا ہے وہ یاد رکھے کہ خدا تعالیٰ اسے اور بھی رسوا کریگا۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ایسے ہی لوگوں کے لیے فرمایا ہے نفاق اور ریا کاری کی زندگی لعنتی زندگی ہے یہ چھپ نہیں سکتی۔ آخر ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اور پھر سخت ذلیل کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ کسی چیز کو چھپاتا نہیں نہ نیکی کو نہ بدی کو۔ سچے نکوکار اپنی نیکیوں کو چھپاتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ انہیں ظاہر کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب حکم ہوا کہ تو پیغمبر ہو کر فرعون کے پاس جا تو اُنہوں نے عذر ہی کیا اس میں سر یہ تھا کہ جو لوگ خدا کے لیے پورا اخلاص رکھتے ہیں وہ نمود اور ریا سے بالکل پاک ہوتے ہیں سچے اخلاص کی یہی نشانی ہے کہ کبھی خیال نہ آوے کہ دنیا ہمیں کیا کہتی ہے۔ جو شخص اپنے دل میں اس امر کا ذرا بھی شائبہ رکھتا ہے وہ بھی شرک کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

(البقرۃ: ۱۲، ۱۳) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝

اور جب اُن کو کہا جائے کہ تم زمین میں فساد مت کرو اور کفر اور شرک اور بدعقیدگی کو مت پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ہی راستہ ٹھیک ہے اور ہم مفسد نہیں ہیں بلکہ مصلح اور ریفارمر ہیں خبردار رہو یہی لوگ مفسد ہیں جو زمین پر فساد کر رہے ہیں۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۰۶ و ۵۰۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

(البقرۃ: ۱۴) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ۝

اور جب اُن کو کہا جائے کہ ایمان لاؤ جیسے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ہی ایمان لاویں جیسے بیوقوف ایمان لائے ہیں خبردار ہو وہی بیوقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۰۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

(البقرۃ: ۱۵) وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝

یعنی جب وہ مسلمانوں کے پاس جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور جب وہ دوسروں کے پاس جاتے ہیں تو

کہہ دیتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو قرآن شریف میں منافق کہا گیا ہے اس لیے جب تک کوئی شخص پورے طور پر قرآن مجید پر عمل نہیں کرتا تب تک وہ پورا پورا اسلام میں بھی داخل نہیں ہوتا۔
(الحکم جلد ۱۲ ع۱ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

۱۹۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

یعنی اندھے اور گونگے اور بہرے خدا سے دور رہیں گے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۴۸ حاشیہ)

قانون الٰہی یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا خوف اور خشیت اُٹھ جاتی ہے اور دلوں میں رقت اور روح میں گداز نہیں رہتی اُس وقت منذر نشان پیدا ہوتے ہیں یہ مقام توڑنے کا تھا۔ مگر افسوس ان لوگوں نے اندھے اور بہرے ہو کر ان نشانات آلٰہیہ کو (جو تضرع اور ابتہال پیدا کر سکتے تھے ایمان میں ایک نئی زندگی بخش سکتے تھے) چھوڑ دیا اور صُمٌّ بُكْمٌ ہو کر گذر گئے ایسے لوگوں کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں ایسے لوگوں پر خدا کا فتویٰ لگ چکا ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ (الحکم جلد ۴ ع ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

جوں جوں متقی خدا تعالیٰ کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ ایک نور ہدایت اُسے ملتا ہے۔ جو اُس کی معلومات اور عقل میں ایک خاص قسم کی روشنی پیدا کرتا ہے اور جوں جوں دور ہوتا جاتا ہے ایک تباہ کرنے والی تاریکی اُس کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کا مصداق ہو کر ذلت اور تباہی کا مورد بن جاتا ہے۔ مگر اُس کے بالمقابل نور اور روشنی سے بہرہ ور انسان اعلیٰ درجہ کی راحت اور عزت پاتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۴)

نابینائی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آنکھوں کی نابینائی ہے اور دوسری دل کی۔ آنکھوں کی نابینائی کا اثر ایمان پر کچھ نہیں ہوتا۔ مگر دل کی نابینائی کا اثر ایمان پر پڑتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری اور بہت ضروری ہے کہ ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ سے پورے تذلل اور انکسار کے ساتھ ہر وقت دعا مانگتا رہے کہ وہ اُسے سچی معرفت اور حقیقی بصیرت اور بینائی عطا کرے اور شیطان کے وساوس سے محفوظ رکھے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۳)

۲۰۔ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝

یہ اس بڑے مینہ کی مانند ہے جس میں طرح طرح کی تاریکیاں ہوں اور رعد اور برق بھی ہو..... تاریکیوں سے مراد آزمایش اور ابتلاء کی تاریکیاں۔ (سبز اشتہار صفحہ ۱۶)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۠

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا منافقوں کا کام ہے مگر یہ لوگ قَامُوْا میں داخل ہیں احتیاط سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تاریکی جب خدا کی طرف منسوب ہو تو دشمن کی آنکھ میں ابتلا کا موقع اس سے مراد ہوتا ہے اور اس لیے اس کو غاسق اللہ کہتے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۶ مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۳)

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ یعنی خدا وہ قادر ہے جس کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔

(ست بچن صفحہ ۸۳)

یعنی خدا بڑا قادر ہے یہ پرستاروں کے لیے تسلی ہے کیونکہ اگر خدا عاجز ہو اور قادر نہ ہو تو ایسے خدا سے کیا امید رکھیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۲۵)

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اُسے جو کچھ قیامت کو کرنا ہے وہ اسی دنیا میں کر کے دکھا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ہے مگر پھر ایمان ایمان نہ رہتا۔ اور نہ اس کے ثمرات میسر ہوتے جو لوگ ایمان کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور اس کو نہیں سمجھ سکتے وہ ایسے اعتراض کرتے ہیں۔ ایمان کی حقیقت کچھ نہ کچھ مخفی رہنا ضروری ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

بعض لوگوں کا اعتقاد ہے۔ کہ چونکہ خدا تعالیٰ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ہے۔ اس واسطے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ جھوٹ بولے۔ ایسا اعتقاد بے ادبی میں داخل ہے۔ ہر ایک امر جو خدا تعالیٰ کے وعدہ اس کی ذات جلال اور صفات کے برخلاف ہے وہ اس کی طرف منسوب کرنا بڑا گناہ ہے۔ جو امر اس کی صفات کے برخلاف ہے ان کی طرف اس کی توجہ ہی نہیں۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

غور کرو کہ جس قادر خدا نے انسان کو ایسے ایسے انقلابات میں سے گذار کر انسان بنا دیا اور اب ایسا انسان ہے۔ کہ گویا عقل حیران ہے کہ کیا سے کیا بن گیا۔ ناک منہ اور دوسرے اعضا پر غور کرو۔ کہ خدا تعالیٰ نے

اسے کیا بنایا ہے پھر اندرونی حواس خمسہ دیئے۔ اور دوسرے قویٰ اور طاقتیں اس کو عطا کیں۔ پس جس خدائے قادر نے اس زمانہ سے جو یہ نطفہ تھا عجیب تصرفات سے انسان بنا دیا۔ کیا اس کے لیے مشکل ہے کہ اس کو پاک حالت میں لے جاوے اور جذبات سے الگ کر دے جو شخص ان باتوں پر غور کرے گا وہ بے اختیار ہو کر کہہ اُٹھے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۙ﴿﴾ الَّذِیۡ جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿﴾

اے لوگو تم اُس خدائے واحد لاشریک کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو پیدا کیا چاہئیے کہ تم اُس قادرِ توانا سے ڈرو جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا اور آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا اور آسمان سے پانی اُتار کر طرح طرح کے رزق تمہارے لیے پھلوں میں سے پیدا کیے سو تم دیدہ و دانستہ اُنہیں چیزوں کو خدا کا شریک مت ٹھہراؤ جو تمہارے فائدہ کے لیے بنائی گئی ہیں۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۴۲۸ و صفحہ ۴۳۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

یعنی اے لوگو! تم اُس خدا کی پرستش کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے یعنی اسی کو اپنے کاموں کا کارساز سمجھو اور اُس پر توکل رکھو۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۲۶-۳۲۷)

جب انتہا درجہ تک کسی کا وجود ضروری سمجھا جاتا ہے تو وہ معبود ہو جاتا ہے اور یہ صرف خدا تعالیٰ ہی کا وجود ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ کسی انسان یا اور مخلوق کے لیے ایسا نہیں کہہ سکتے

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

یعنی اے لوگو اس خدا کی پرستش کرو جس نے تم کو پیدا کیا...... عبادت کے لائق وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا یعنی زندہ رہنے والا وہی ہے اُسی سے دل لگاؤ۔ پس ایمانداری تو یہی ہے کہ خدا سے خاص تعلق رکھا جائے اور دوسری سب چیزوں کو اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا جائے اور جو شخص اولاد کو یا والدین کو یا کسی اور چیز کو ایسا عزیز رکھے کہ ہر وقت انہیں کا فکر رہے تو وہ بھی ایک بُت پرستی ہے بت پرستی کے یہی تو معنے نہیں کہ ہندوؤں کی طرح بت لیکر بیٹھ جائے۔

اور اس کے آگے سجدہ کرے حد سے زیادہ پیار و محبت بھی عبادت ہی ہوتی ہے (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۸۔ مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۝ (البقرة: ۲۴، ۲۵)

اور اگر تم اِس کلام کے بارے میں کہ جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے کسی نوع کے شک میں ہو یعنی اگر تمہارے نزدیک اُس نے وہ کلام آپ بنا لیا ہے یا جنّات سے سیکھا ہے یا جادو کی قسم ہے یا شعر ہے یا کسی اَور قسم کا شک ہے تو تم بھی اگر سچے ہو تو بقدر ایک سورت اُس کی مثل بنا کر دکھلاؤ اور اپنے دوسرے مددگاروں یا معبودوں سے مدد لے لو اور اگر نہ بنا سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز بنا نہیں سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے طیّار کی گئی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور اگر تم کو قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو تم بھی کوئی ایک سورت اُس کی مانند بنا کر دکھلاؤ اور اگر نہ بناؤ اور یاد رکھو کہ ہرگز نہیں بنا سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے طیار کی گئی ہے۔ پھر میں مکرر کہتا ہوں کہ قبل اس کے جو تم لوگ اِس فکر میں پڑو کہ قرآن شریف کے مثل و مانند کوئی دوسرا کلام تلاش کیا جائے اوّل تم کو اس بات کا دیکھ لینا نہایت ضروری ہے کہ اُس دوسری کلام نے وہ دعویٰ بھی کیا ہے یا نہیں جس دعویٰ کو آیات مذکورہ بالا میں ابھی تم سُن چکے ہو کیونکہ اگر کسی متکلّم نے ایسا دعویٰ ہی نہیں کیا کہ میرا کلام بے مثل و مانند ہے جس کے مقابلہ اور معارضہ سے فی الحقیقت تمام جن و انس عاجز و ساکت ہیں تو ایسے مُتکلّم کے کلام کو خواہ نخواہ بے مثل و مانند سمجھ لینا حقیقت میں اُسی مشہور مثل کا مصداق ہے کہ مدعی سُست و گواہ چُست۔ ماسوا اس کے کسی کلام کو قرآن شریف کی نظیر اور شبیہ ٹھہرانے میں اس بات کا ثبوت بھی پیدا کر لینا چاہیئے کہ جن کمالات ظاہری و باطنی پر قرآن شریف مشتمل ہے اُنہیں کمالات پر وہ کلام بھی اشتمال رکھتا ہے جس کو بطور نظیر پیش کیا گیا ہے کیونکہ اگر نظیر پیش کردہ کو کمالاتِ قرآنیہ سے کچھ بھی حصّہ حاصل نہیں تو پھر ایسی نظیر پیش کرنا بجز اپنی جہالت اور حماقت دکھلانے کے کس غرض پر مبنی ہوگا۔ یہ بات خوب یاد رکھو کہ جیسے اُن تمام چیزوں کی نظیر اور شبیہ بنانا کہ جو صادر من اللہ

ہیں غیر ممکن اور ممتنع ہے ایسا ہی قرآنِ شریف کی نظیر بنانا بھی حدِ امکان سے خارج ہے یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے عرب
کے نامی شاعروں کو کہ جن کی عربی مادری زبان تھی اور جو طبعی طور پر اور نیز کسبی طور پر مذاق کلام سے خوب واقف تھے ماننا
پڑا کہ قرآن شریف انسانی طاقتوں سے بلند تر ہے اور کچھ عرب پر موقوف نہیں بلکہ خود تم میں سے کئی اندھے تھے کہ جو
اُس کامل روشنی سے بینا ہو گئے اور کئی بہرے تھے کہ اُس سے سُننے لگ گئے اور اب بھی وہ روشنی چاروں طرف سے
تاریکی کو اُٹھاتی جاتی ہے اور قرآنِ شریف کے انوارِ حقہ دلوں کو مُنور کرتے جاتے ہیں واقعی یہ حال ہو رہا ہے کہ جس
قدر لوگوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اُسی قدر قرآن شریف کی عظمت کے قائل ہوتے جاتے ہیں چنانچہ بڑے بڑے متعصب
انگریزوں میں سے جو کہ حکیم اور فلاسفر کہلاتے تھے خود بول اُٹھے کہ قرآن شریف اپنی فصاحت اور بلاغت میں بے نظیر ہے
یہاں تک کہ گاڈفری ہیگنس صاحب جیسے سرگرم عیسائی کو اپنی کتاب کے دفعہ ۱۲۲ میں لکھنا پڑا کہ حقیقت میں جیسی عالی
عبارتیں قرآن میں پائی جاتی ہیں اُس سے زیادہ غالباً دنیا بھر میں نہیں مل سکتیں اور ایسا ہی پوٹ صاحب کو بمجبوری اپنی
کتاب میں یہی گواہی دینی پڑی۔

آریا سماج والے جو خدا کے الہام اور کلام کو وید پر ختم کیے بیٹھے ہیں وہ بھی عیسائیوں کی طرح قرآن شریف کی بے نظیری
سے انکار کر کے اپنے وید کی نسبت فصاحت بلاغت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہم اس امر کو بار بار غافل لوگوں پر ظاہر
کرنا فرض سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف کی بے نظیری سے صرف وہ شخص انکار کر سکتا ہے جس کو یہ طاقت ہو کہ جو کچھ قرآن شریف
کی وجوہ بے نظیری اس کتاب میں بطور نمونہ درج کی گئی ہیں کسی دوسری کتاب سے نکال کر دکھلا سکے سو اگر آریا سماج والوں
کو اپنے وید پر یہ امید ہے کہ وہ قرآن شریف کا مقابلہ کر سکے گا تو انہیں بھی اختیار ہے کہ وید کا زور دکھلاویں مگر صرف دعویٰ
ہی دعویٰ کرنا اور راو باشانہ باتیں مونہہ پر لانا نیک طینت آدمیوں کا کام نہیں انسان کی ساری شرافت اور عقل اسی میں ہے
کہ اگر اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل ہو تو پیش کرے ورنہ ایسا دعویٰ کرنے سے ہی زبان بند رکھے جس کا ماحصل بجز فضول گوئی و
ژاژ خائی اور کچھ بھی نہیں۔ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن شریف کی بلاغت ایک پاک اور مُقدس بلاغت ہے جس کا مقصدِ اعلیٰ یہ
ہے کہ حکمت اور راستی کی روشنی کو فصیح کلام میں بیان کر کے تمام حقائق اور دقائق علمِ دین ایک موجز اور مدلل عبارت میں بھر
دیئے جائیں اور جہاں تفصیل کی اشد ضرورت ہو وہاں تفصیل ہو اور جہاں اجمال کافی ہو وہاں اجمال ہو اور کوئی صداقتِ دینی
ایسی نہ ہو جس کا مفصلاً یا مجملاً ذکر نہ کیا جائے اور باوصف اس کے ضرورتِ حقہ کے تقاضا سے ذکر ہو نہ غیر ضروری طور
پر اور پھر کلام بھی ایسا فصیح اور سلیس اور متین ہو کہ جس سے بہتر بنانا ہرگز کسی کے لیے ممکن نہ ہو اور پھر وہ کلام روحانی
برکات بھی اپنے ہمراہ رکھتا ہو یہی قرآن شریف کا دعویٰ ہے جس کو اُس نے آپ ثابت کر دیا ہے اور جابجا فرما بھی دیا ہے
کہ کسی مخلوق کے لیے ممکن نہیں کہ اس کی نظیر بنا سکے۔ اب جو شخص منصفانہ طور پر بحث کرنا چاہتا ہے اس پر یہ امر پوشیدہ نہیں
کہ قرآن شریف کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ایسی کتاب کا پیش کرنا ضروری ہے جس میں وہی خوبیاں پائی جائیں

جو اُس میں پائی جاتی ہیں۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۹۶ تا ۳۹۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جس قدر میں نے اب تک لطائف و معارف و خواص سورۃ فاتحہ لکھے ہیں وہ بدیہی طور پر بے مثل و مانند ہیں مثلاً جو شخص ذرا منصف بن کر اول اُن صداقتوں کے اعلیٰ مرتبہ پر غور کرے جو کہ سورۃ فاتحہ میں جمع ہیں اور پھر اُن لطائف اور نکات پر نظر ڈالے جن پر سورہ ممدوحہ مشتمل ہے اور پھر حُسن بیان اور ایجازِ کلام کو مشاہدہ کرے کہ کیسے معانی کثیرہ کو الفاظ قلیلہ میں بھرا ہوا ہے اور پھر عبارت کو دیکھے کہ کیسی آب و تاب رکھتی ہے اور کس قدر روانگی اور صفائی اور ملائمت اس میں پائی جاتی ہے کہ گویا ایک نہایت مصفّٰی اور شفاف پانی ہے کہ بہتا ہوا چلا جاتا ہے اور پھر اُس کی روحانی تاثیروں کو دل میں سوچے کہ جو بطور خارقِ عادت دلوں کو ظلمات بشریت سے صاف کر کے مورد انوارِ حضرت الوہیت بناتی ہیں جن کو ہم اس کتاب کے ہر موقعہ پر ثابت کرتے چلے جاتے ہیں تو اُس پر قرآن شریف کی شان بلند جس سے انسانی طاقتیں مقابلہ نہیں کرسکتیں ایسی وضاحت سے کھل سکتی ہے جس پر زیادت متصوّر نہیں اور اگر باوجود مشاہدہ ان کمالات کے پھر بھی کسی کورِ باطن پر عدیم المثالی اُس کلام مقدس کی مشتبہ رہے تو اُس کا علاج قرآن شریف نے آپ ہی ایسا کیا ہے جس سے کامل طور پر منکرین پر اپنی حجت کو پورا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ یعنی اگر تمہیں اِس کلام کے منجانب اللہ ہونے میں کچھ شک ہے تو تم اس کی کسی سورہ کی مانند کوئی کلام بنا کر دکھاؤ اور اگر تم نہ بنا سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز بنا نہ سکو گے سو اُس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے طیار ہے جس کا ایندھن کافر آدمی اور اُن کے بت ہیں جو نارِ جہنم کو اپنے گناہوں اور شرارتوں سے افروختہ کر رہے ہیں یہ قول فیصل ہے کہ جو خدائے تعالیٰ نے منکرینِ اعجازِ قرآنی کے ملزم کرنے کے لیے آپ فرما دیا ہے اب اگر کوئی ملزم اور لاجواب رہ کر پھر بھی قرآن شریف کی بلاغت بے مثل سے منکر رہے اور بیہودہ گوئی اور ژاژخائی سے باز نہ آوے تو ایسے بے حیا منقلب الفطرت کا اِس دُنیا میں علاج نہیں ہوسکتا اِس کے لیے وہی علاج ہے جس کا خدا نے اپنے قول فیصل میں وعدہ فرمایا ہے۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۴۴ تا ۵۴۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

یعنی اے منکرین اگر تم اُس کلام کے بارہ میں جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے کچھ شک میں ہو یعنی اگر تم اُس کو خدا کا کلام نہیں سمجھتے اور ایسا کلام بنانا انسانی طاقت کے اندر خیال کرتے ہو تو تم بھی ایک سورت جو انہیں ظاہری باطنی کمالات پر مشتمل ہو بنا کر پیش کرو اور اگر تم نہ بنا سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز نہیں بنا سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (پتھر (بت) اور آدمی ہیں یعنی بت اور مشرک اور نافرمان لوگ ہی اُس آگ کے بھڑکنے کا موجب ہو رہے ہیں اگر دُنیا میں بت پرستی و شرک و بے ایمانی و نافرمانی نہ ہوتی تو وہ آگ بھی افروختہ نہ ہوتی تو گویا اُس کا ایندھن یہی چیزیں ہیں جو علتِ موجبہ اس کے افروختہ ہونے کی ہیں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۴ و ۱۵ حاشیہ)

اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْقُرْاٰنَ مَا ادَّعٰى اِعْجَازَ الْبَلَاغَةِ اِلَّا فِي الرِّبَاغَةِ فَاِنَّ الْعَرَبَ فِيْ زَمَانِهٖ
كَانُوْا فُصَحَآءَ الْعَصْرِ وَبُلَغَآءَ الدَّهْرِ وَكَانَ مَدَارُ تَفَاخُرِهِمْ عَلٰى غُرَرِ الْبَيَانِ وَدُرَرِهٖ وَثِمَارِ
الْكَلَامِ وَزَهْرِهٖ وَكَانُوْا يَتَنَاضَلُوْنَ بِالْقَصَآئِدِ الْمُبْتَكَرَةِ وَالْخُطَبِ الْمُحَبَّرَةِ وَلٰكِنْ مَا كَانَ
لَهُمْ اَنْ يَتَكَلَّمُوْا فِي اللَّطَآئِفِ الْحِكْمِيَّةِ وَمَا مَسَّتْ بَيَانَهُمْ رَآئِحَةُ الْمَعَارِفِ الْاِلٰهِيَّةِ بَلْ
كَانَ مَسْرَحُ اَفْكَارِهِمْ اِلَى الْاَبْيَاتِ الْعِشْقِيَّةِ وَالْاَهَاجِيْكِ الْمُلْهِيَةِ وَمَا كَانُوْا عَلٰى تَرْصِيْعِ
مَضَامِيْنِ الْحِكَمِ قَادِرِيْنَ وَكَانُوْا قَدْ مَرَنُوْا مِنْ سِنِيْنَ عَلٰى اَنْوَاعِ النَّظْمِ وَالنَّثْرِ وَلَطَآئِفِ
الْبَيَانِ وَسُلِّمُوْا وَقُبِلُوْا فِي الْاَقْرَانِ وَكَانُوْا اَهْلَ اللِّسَانِ وَسَوَابِقَ الْمَيَادِيْنِ۔ فَخَاطَبَهُمُ اللّٰهُ
وَقَالَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا
وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ وَقَالَ
قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا[1]۔ فَعَجَزَ الْكُفَّارُ عَنِ الْمُقَابَلَةِ وَوَلَّوُا الدُّبُرَ كَالْمَغْلُوْبِيْنَ۔ وَلَمَّا عَجَزُوْا عَنِ
النِّضَالِ فِي الْبَيَانِ مَالُوْا اِلَى السَّيْفِ وَالسِّنَانِ مُتَنَدِّمِيْنَ مُغْتَاظِيْنَ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ اَسْلَمُوْا

کیا تجھے معلوم نہیں کہ قرآن نے اعجاز بلاغت کا دعویٰ کشتی گاہ کے میدان میں کیا ہے کیونکہ عرب اس کے زمانہ میں فصحاء عصر اور بلغاء دہر تھے اور ان کے باہم فخر کرنے کا مدار فصیح اور باآب و تاب تقریروں پر تھا اور نیز کلام کے پھلوں اور پھولوں پر ناز کرتے تھے اور اُن کی لڑائیاں نوایجاد قصیدوں اور پاکیزہ خطبوں کے ساتھ ہوتی تھیں مگر اُن کو لطائف حکمیہ میں بات کرنے کا سلیقہ نہ تھا اور ان کے بیان کو معارف الٰہیہ کی بو بھی نہیں پہنچی تھی بلکہ ان کے فکروں کا چراگاہ صرف عشقیہ شعروں اور ہنسانے والے اور غافل کرنے والے بیتوں تک تھا اور مضامین حکمیہ کی مرصع نگاری پر وہ قادر نہ تھے حالانکہ وہ ایک زمانہ سے نظم اور نثر اور لطائف بیان کے مشتاق تھے اور اپنے ہم جنسوں میں مسلم اور مقبول تھے اور اہل زبان اور میدانوں میں سبقت کرنے والے تھے۔ پس خدا تعالیٰ نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اُتارا ہے تو تم بھی کوئی سورت اس کی مانند بنا کر لاؤ اور اگر بنا نہ سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز بنا نہیں سکو گے سو اُس آگ سے ڈرو جس کے ہیزم افروختنی آدمی اور پتھر ہیں اور وہ آگ کافروں کے لیے طیار کی گئی ہے۔ اور فرمایا کہ اگر تمام جن و انس اس بات کے لیے اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کے کوئی مثل بنا لاویں تو ہرگز نہیں لاسکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ پس کفار مقابلہ سے عاجز آگئے اور مغلوب ہو کر پیٹھیں پھیر لیں اور جب خوش تقریری کی لڑائیوں سے عاجز آگئے تو شرمندہ اور غضبناک ہو کر تلوار اور نیزہ کی طرف جھک گئے اور بہت سے ان میں سے اعجاز بلاغت

---

[1] بنی اسرائیل۔ ع۔ ۱۰

نَظَراً عَلٰی ھٰذِہِ الْمُعْجِزَۃِ کَلَبِیْدِ بْنِ رَبِیْعَۃَ الْعَامِرِیِّ صَاحِبِ الْمُعَلَّقَۃِ الرَّابِعَۃِ فَاِنَّہٗ اَدْرَکَ الْاِسْلَامَ وَتَشَرَّفَ بِہٖ وَاَرَی الْاِخْلَاصَ التَّآمَّ وَمَاتَ سَنَۃَ اِحْدٰی وَاَرْبَعِیْنَ۔ وَکَذٰلِکَ کَثِیْرٌ مِّنْھُمْ اَقَرُّوْا بِاَنَّ الْقُرْاٰنَ مَمْلُوٌّ مِّنَ الْعِبَارَاتِ الْمُھَذَّبَۃِ وَالْاِسْتِعَارَاتِ الْمُسْتَعْذَبَۃِ وَالْاَفَانِیْنِ الْمُسْتَمْلَحَۃِ وَالْمَضَامِیْنِ الْحِکْمِیَّۃِ الْمُوَشَّحَۃِ بَلْ مَنْ اَمْعَنَ مِنْھُمُ النَّظَرَ فَسَعٰی اِلَی الْاِسْلَامِ وَحَضَرَ وَدَخَلَ فِی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ فَلَوْ کَانَ الْقُرْاٰنُ مُتَنَزِّلًا مِّنْ اَعْلٰی مَدَارِجِ الْکَمَالِ فِیْ فَصَاحَتِ الْمَقَالِ وَبَلَاغَۃِ الْاَقْوَالِ لَکَانَ الْاَمْرُ اَسْھَلَ عَلَی الْمُخَالِفِیْنَ۔ وَلَقَالُوْا اَیُّھَا الرَّجُلُ اِنَّ الْکَلَامَ الَّذِیْ عَرَضْتَ عَلَیْنَا وَالْحَدِیْثَ الَّذِیْ اَتَیْتَہٗ لَدَیْنَا لَیْسَ بِفَصِیْحٍ بَلْ لَیْسَ بِصَحِیْحٍ وَّلَا نَجِدُ فِیْہِ غَیْرَ الْمَعَانِی الْمَطْرُوْقَۃِ الْمَوَارِدِ وَالْکَلَامِ الرَّقِیْقِ الْبَارِدِ وَمَا جِئْتَ بِاَطْیَبَ وَاَحْلٰی وَفِیْہِ اَلْفَاظٌ کَذَا وَکَذَا وَاِنَّکَ اَسْقَطْتَ فِیْ کَلَامِکَ وَبَاعَدْتَ عَنْ مَّرَامِکَ وَلَسْتَ مِنَ الْمُجِیْدِیْنَ۔ فَلَا حَاجَۃَ اِلٰی اَنْ نَّاْتِیَ بِمِثْلِہٖ مِنَ الْاَقْوَالِ اَوْ نَتَوَازَنَ فِی الْمَقَالِ وَنَتَحَاذٰی حَذْوَ النِّعَالِ فَاِلَیْکَ عَنَّا وَتَجَافَ وَاتْرُکِ الْاَوْصَافَ فَاِنَّ کَلَامَکَ سَقَطٌ عِنْدَ الْاُدَبَآءِ الْمَشْھُوْرِیْنَ۔ وَالْفُصَحَآءِ الْمَاھِرِیْنَ وَلٰکِنَّھُمْ مَا سَارُوْا ذٰلِکَ الْمَسْرٰی وَمَا قَدَحُوْا فِیْ ھٰذَا الدَّعْوٰی بَلْ قَبِلُوْا اَعْلٰی

قرآن کو تسلیم کر کے ایمان لائے جیسا کہ لبید بن ربیعۃ العامری جو معلقہ رابعہ کا مصنف ہے اس نے اسلام کا زمانہ پایا اور مشرف باسلام ہوا اور پورا اخلاص دکھایا اور سن اکتالیس میں فوت ہوا اور اسی طرح بہتوں نے اُن میں سے قرآن شریف کی بلاغت فصاحت کو قبول کر لیا اور اقرار کر لیا کہ درحقیقت قرآن عبارات پاکیزہ سے پُر اور شیریں استعارات سے مالامال اور ملیح تقریروں اور آراستہ اور حکمیہ مضمونوں سے بھرا ہوا ہے بلکہ جس نے اس میں نظر غور کی سو وہ اسلام کی طرف دوڑا اور ایمان والوں میں داخل ہوا پس اگر قرآن فصاحت اور بلاغت کے اعلیٰ مدارج سے متنزل ہوتا تو مخالفوں پر یہ بات بہت آسان ہو جاتی اور وہ کہہ سکتے تھے کہ اے مرد جو کلام تو نے پیش کی ہے اور جو بات تو لایا ہے وہ فصیح نہیں ہے بلکہ صحیح بھی نہیں ہے اور اس میں معانی مطروقۃ الموارد پائے جاتے ہیں اور اس میں الفاظ رقیق موجود ہیں اور تو نے اپنی کلام میں غلطی کی ہے اور مطلب سے دور جا پڑا ہے اور کوئی نکتہ تیری کلام میں نہیں بلکہ اُس میں تو ایسے ایسے لفظ ہیں پس کچھ حاجت نہیں کہ ہم اس کی کوئی نظیر بنا دیں یا اُس سے نعل بنعل مقابلہ کریں ہم سے الگ ہو اور اپنی کلام کی تعریفیں چھوڑ دے کیونکہ تیرا کلام مشہور ادیبوں کے نزدیک ردّی ہے۔ مگر کفارِ عرب اس راہ نہیں چلے اور اس دعویٰ میں انہوں نے کچھ جرح قدح نہیں کیا بلکہ انہوں نے تو قرآن کے اعلیٰ مراتب بلاغت کو قبول کر لیا۔

مَرَاتِبِ بَلَاغَتِهٖ وَعَجِبُوْا لِعُلُوِّ شَاْنِ فَصَاحَتِهٖ وَقَالُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ وَاَكْثَرُهُمْ اٰمَنُوْا بِاِعْجَازِهٖ وَاَقَرُّوْا بِتَنَاوُشٍ بَازِهٖ وَعَجِزُوْا عَنْ دَرْكِ هِنْدَازِهٖ وَقَالُوْا كَلَامٌ فَاقَ كَلِمَاتِ الْبَشَرِ وَكُلُّهٗ لُبٌّ وَّلَيْسَ مَعَهٗ شَيْءٌ مِّنَ الْقِشْرِ وَعَلَيْهِ طَلَاوَةٌ وَّفِيْهِ حَلَاوَةٌ وَّهُوَ غَدَقٌ لَّا يَنْفَدُ مِنْ شُرْبِ الشَّارِبِيْنَ۔ وَمَا نَبَسُوْا بِكَلِمَةٍ فِيْ قَدْحِ شَاْنِهٖ وَمَا فَاهُوْا بِكَلَامٍ فِيْ جَرْحِ بَيَانِهٖ وَنَسُّوْا جِمَالَ الْفِكْرِ فِيْ مَيْدَانِهٖ ثُمَّ رَجَعُوْا مَرْعُوْبِيْنَ نَادِمِيْنَ۔ وَاَكْثَرُهُمْ كَانُوْا يَبْكُوْنَ عِنْدَ سَمَاعِهٖ وَيَسْجُدُوْنَ بَاكِيْنَ۔

هٰذَا مَا نَجِدُ فِي الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ وَاَحَادِيْثِ النَّبِيِّ الرَّؤُوْفِ الرَّحِيْمِ اِيْمَانًا وَّدِيَانَةً وَّصِدْقًا وَّ اَمَانَةً وَّمَا نَجِدُ كَلِمَةً خِلَافَ ذٰلِكَ مِنْ اَسْلَافِ النَّصَارٰى اَوِ الْمُشْرِكِيْنَ وَكَانُوْا خَيْرًا مِّنْكُمْ فِيْ تَنْقِيْدِ الْكَلِمَاتِ يَا مَعْشَرَ الْجَاهِلِيْنَ۔ وَاَمَّا مَا ظَنَنْتَ اَنَّ فِي الْقُرْاٰنِ بَعْضَ اَلْفَاظٍ غَيْرَ لِسَانِ قُرَيْشٍ فَقَدْ قُلْتَ هٰذَا اللَّفْظَ مِنْ جَهْلٍ وَّطَيْشٍ وَّ مَا كُنْتَ مِنَ الْمُتَبَصِّرِيْنَ۔ اِعْلَمْ اَيُّهَا الْغَبِيُّ وَالْجَهُوْلُ الدَّنِيُّ اَنَّ مَدَارَ الْفَصَاحَةِ عَلٰى اَلْفَاظٍ مَّقْبُوْلَةٍ سَوَآءٌ كَانَتْ مِنْ لِّسَانِ الْقَوْمِ اَوْ مِنْ كَلِمٍ مَّنْقُوْلَةٍ مُّسْتَعْمَلَةٍ فِيْ بُلَغَآءِ الْقَوْمِ غَيْرِ مَجْهُوْلَةٍ وَّسَوَآءٌ

اور اس کی عظیم الشان فصاحت سے تعجب میں رہ گئے اور کہا کہ یہ تو صریح جادو ہے اور اکثر ان کے اس قرآنی معجزہ پر ایمان لائے اور اقرار کر لیا کہ اس کے بازکی سخت پکڑیں ہیں اور اس کی حقیقت کی دریافت سے عاجز رہ گئے اور کہا کہ یہ ایک کلام ہے کہ کلمات بشر پر غالب آگیا اور وہ سارے کا سارا مغز ہے اور اس کے ساتھ چھلکا نہیں اور اس پر ایک آب و تاب ہے اور اُس میں ایک حلاوت ہے اور وہ ایک بے اندازہ اور بکثرت مصفا پانی ہے جو پینے والوں کے پینے سے ختم نہیں ہوتا اور قرآن کے قدح شان میں وہ کوئی کلمہ مُنہ پر نہ لائے اور اس کی جرح میں اُنہوں نے کوئی بات مُنہ سے نہ نکالی اور اُس کے میدان میں انہوں نے فکر کے اونٹ دوڑائے تو سہی مگر خوفناک اور شرمندہ ہوکر رجوع کیا اور اکثر اُن کے قرآن کو سُن کر روتے اور سجدہ کرتے تھے۔

یہ وہ بیان ہے جو ہم قرآن کریم میں پاتے اور نبی رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں پڑھتے ہیں اور ہم نے اس کو ایمانًا اور دیانتًا اور امانتًا لکھا ہے اور ہم اس کے برخلاف کوئی ایسا قول بھی نہیں پاتے جو اس وقت کے نصاریٰ اور مشرکوں کے منہ سے قرآن کی شان کے برخلاف نکلا ہو اور اے نادانو وہ نصاریٰ قرآن کی پرکھ میں تم سے بہتر تھے اور یہ جو تم نے خیال کیا کہ قرآن میں بعض الفاظ ایسے ہیں کہ وہ زبان قریش کے مخالف ہیں سو یہ بات تیری سراسر جہل اور نفسانی جوش سے ہے اور بصیرت کی راہ سے نہیں۔ اے غبی اور سفلہ نادان تجھے معلوم ہو کہ فصاحت کا مدار الفاظ مقبولہ پر ہوا کرتا ہے خواہ وہ کلمات قوم کی اصل زبان میں سے ہوں یا ایسے کلمات منقولہ ہوں جو بلغاء قوم کے استعمال میں آگئے ہوں اور

كَانَتْ مِنْ لُغَتِ قَوْمٍ وَّاحِدٍ وَّمِنْ مُحَاوَرَاتِهِمْ عَلَى الدَّوَامِ اَوْ خَالَطَهَا اَلْفَاظٌ اِسْتَحْلَاهَا بُلَغَاءُ الْقَوْمِ وَاسْتَعْمَلُوْهَا فِي النَّظْمِ وَالنَّثْرِ مِنْ غَيْرِ مَخَافَةِ اللَّوْمِ مُخْتَارِيْنَ غَيْرَ مُضْطَرِّيْنَ۔ فَلَمَّا كَانَ مَدَارُ الْبَلَاغَةِ عَلٰى هٰذِهِ الْقَاعِدَةِ فَهٰذَا هُوَ مِعْيَارُ الْكَلِمَاتِ الصَّاعِدَةِ فِيْ سَمَآءِ الْبَلَاغَةِ الرَّاعِدَةِ فَلَا حَرَجَ اَنْ تَكُوْنَ لَفْظٌ مِّنْ غَيْرِ اللِّسَانِ مَقْبُوْلًا فِيْ اَهْلِ الْبَيَانِ بَلْ رُبَّمَا يَزِيْدُ الْبَلَاغَةُ مِنْ هٰذَا النَّهْجِ فِيْ بَعْضِ الْاَوْقَاتِ بَلْ يَسْتَمْلِحُوْنَهُ فِيْ بَعْضِ الْمَقَامَاتِ وَيَتَلَذَّذُوْنَ بِهٖ اَهْلُ الْاَفَانِيْنِ۔ وَلٰكِنَّكَ رَجُلٌ غُمْرٌ جَهُوْلٌ وَّمَعَ ذٰلِكَ مُعَانِدٌ وَّعَجُوْلٌ فَلِاَجْلِ ذٰلِكَ مَا تَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ حِقْدِكَ وَجَهْلِكَ وَمَا تَضَعُ قَدَمًا اِلَّا فِيْ دَحْلِكَ وَلَا تَدْرِيْ مَا لِسَانُ الْعَرَبِ وَمَا الْفَصَاحَةُ۔

(نور الحق حصہ اوّل صفحہ ۱۱۰ تا صفحہ ۱۱۲)

قرآن کریم اپنے اعجاز کے ثبوت میں اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کہتا ہے۔ یہ معجزات روحانی ہیں۔ جس طرح وحدانیت کے دلائل دیئے ہیں۔ اسی طرح پر حکمت۔ فصاحت۔ بلاغت بھی انسان اُس کی مثل بنانے پر قادر نہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ[۵]۔

غرض روحانی معجزات میں کوئی یہ خیال نہ کرے کہ یہ مسلمانوں کا زعم اور خیال ہے۔ آج کل کے نیچری نہیں بلکہ

خواہ وہ ایک ہی قوم کی لغت میں سے ہوں اور اُن کے دائمی محاورات میں سے ہوں یا ایسے الفاظ اُن میں مل گئے ہوں جو قوم کے بلغاء کو شیریں معلوم ہوئے اور انہوں نے اُن کے استعمال اپنی نظم اور نثر میں جائز رکھے ہوں) اور کسی ملامت سے نہ ڈرے ہوں اور نہ کسی اضطرار سے وہ الفاظ استعمال کیے ہوں پس جبکہ بلاغت کا مدار اسی قاعدہ پر ہوا پس یہی قاعدہ اُن عبارات بلیغہ کے لیے معیار ہے جو فصاحت کے آسمان پر چڑھے ہوئے اور بلندی میں گرج رہے ہیں پس اس بات میں کچھ بھی حرج نہیں کہ ایک غیر زبان کا لفظ ہو مگر بلغاء نے اس کو قبول کر لیا ہو بلکہ اس طریق سے تو بسا اوقات بلاغت بڑھ جاتی ہے اور کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے بلکہ بعض مقامات میں اس طرز کو فصیح اور بلیغ لوگ ملیح اور نمکین سمجھتے ہیں اور تفنن عبارات کے عشاق اُس سے لذت اُٹھاتے ہیں مگر تو تو اے معترض ایک غبی اور جاہل ہے اور باوجود اس کے تو جلد باز اور دشمن حق ہے اس لیے تو بغیر کینہ اور جہل کے اور کچھ نہیں جانتا اور بغیر گڑھے کے اور کسی جگہ قدم نہیں رکھتا اور تو نہیں جانتا کہ زبان عرب کیا شے ہے اور فصاحت کسے کہتے ہیں۔

(نور الحق صفحہ ۱۱۰ تا صفحہ ۱۱۲)

[۵] بنی اسرائیل۔ ع۔ ۱۰

خلاف نیچر یہ نہیں مانتے کہ قرآن کا معجزہ ہے۔ سید احمد نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اور وہ اُس کی فصاحت و بلاغت کو معجزہ نہیں مانتا۔ جب ہم یاد کرتے ہیں تو ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ سید احمد نے معجزات سے انکار کیا ہے۔ سید صاحب کسی طور سے معجزہ نہیں مان سکتا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ایک معمولی درجہ کا آدمی یا اعلیٰ درجہ کا آدمی بھی نظیر بنا سکتا ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ اتنا نہیں جانتے کہ قرآن لانے والا وہ شان رکھتا ہے کہ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ [1]۔ ایسی کتاب جس میں ساری کتابیں اور ساری صداقتیں موجود ہیں۔ کتاب سے مراد اور عام مفہوم وہ عمدہ باتیں ہیں جو بالطبع انسان قابل تقلید سمجھتا ہے۔ قرآن شریف ایسی حکمتوں اور معارف کا جامع ہے۔ اور رطب ویابس کا ذخیرہ اُس کے اندر نہیں۔ ہر ایک چیز کی تفسیر وہ خود کرتا ہے۔ اور ہر ایک قسم کی ضرورتوں کا سامان اُس کے اندر موجود ہے۔ وہ ہر پہلو سے نشان اور آیت ہے۔ اگر کوئی انکار کرے تو ہم ہر پہلو سے اُس کا اعجاز ثابت کرنے اور دکھلانے کو تیار ہیں۔ آج کل توحید اور ہستی الٰہی پر بہت زور آور حملے ہو رہے ہیں۔ عیسائیوں نے بھی بہت کچھ زور مارا اور لکھا۔ لیکن جو کچھ کہا اور لکھا وہ اسلام کے خدا کی بابت ہی لکھا۔ نہ کہ ایک مُردہ مصلوب اور عاجز خدا کی بابت۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر قلم اُٹھائے گا اُس کو آخر کار اُسی خدا کی طرف آنا پڑیگا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ صحیفۂ فطرت کے ایک ایک پتہ میں اُس کا پتا ملتا ہے۔ اور بالطبع انسان اُسی خدا کا نقش اپنے اندر رکھتا ہے۔ غرض ایسے آدمیوں کا قدم جب اُٹھے گا وہ اسلام ہی کے میدان کی طرف اُٹھے گا۔ یہ بھی تو ایک عظیم الشان اعجاز ہے۔ اگر کوئی قرآن کریم کے اس معجزہ کا انکار کرے تو ایک ہی پہلو میں ہم لوگوں کو آزما لیتے ہیں۔ یعنی اگر قرآن کو خدا کا کلام نہیں مانتا تو اس روشنی اور سائنس کے زمانہ میں ایسا مدعی خدا ئے تعالیٰ کی ہستی پر دلائل لکھے۔ ہم وہ تمام دلائل قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھا دیں گے اور اگر توحید الٰہی کی نسبت دلائل قلمبند کرے تو وہ سب دلائل بھی قرآن کریم ہی سے نکال کر دکھا دیں گے۔ اور وہ ویسے دلائل کا دعویٰ کر کے لکھیں کہ یہ دلائل قرآن میں نہیں یا اُن صداقتوں اور پاک تعلیموں پر لکھے جن کی نسبت اُن کا خیال ہو کہ وہ قرآن کریم میں نہیں تو ہم اُس کو واضح طور پر دکھلا دیں گے کہ قرآن کا دعویٰ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ کیسا سچا اور صاف ہے۔ اور یا اصل اور فطرتی مذہب کی بابت دلائل لکھنا چاہے تو ہم ہر پہلو سے قرآن کریم کا اعجاز ثابت کر کے دکھائیں گے۔ اور بتلا دینگے کہ تمام صداقتیں اور پاک تعلیمیں اُسی میں موجود ہیں۔

الغرض قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے کہ ہر ایک قسم کے معارف اور اسرار اُس میں موجود ہیں۔ لیکن اُن کے حاصل کرنے کے لیے میں پھر کہتا ہوں کہ اُسی قوت قدسیہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ [2]۔

---

[1] سورۃ البیّنۃ۔ [2] الواقعۃ۔ ع۔۳

ایسا ہی فصاحت بلاغت میں مثلاً سورۃ فاتحہ کی ترکیب چھوڑ کر اور ترکیب استعمال کرو تو وہ مطالب عالیہ اور مقاصد اُسنیٰ جو اس ترکیب میں موجود ہیں ممکن نہیں کسی دوسری ترکیب میں بیان ہو سکیں۔ کوئی سورۃ لے لو خواہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ ہی کیوں نہ ہو جس قدر نرمی۔ ملاطفت کی رعایت کو ملحوظ رکھ کر اُس میں معارف اور حقائق ہیں کوئی دوسرا بیان نہ کر سکے گا۔ یہ بھی اعجاز قرآن ہی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب بعض نادان مقامات حریری یا سبع معلقہ کو بے نظیر و بے مثل کہتے ہیں اور اس طرح پر قرآن کریم کی بے مانندیت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اول تو حریری کے مصنف نے کہیں اُس کے بینظیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر وہ خود قرآن کی اعجازی فصاحت کا قائل تھا۔ ان باتوں کو چھوڑ کر وہ راستی اور صداقت کو ذہن میں نہیں رکھتے۔ بلکہ اُن کو چھوڑ کر الفاظ کی طرف جاتے رہے ہیں۔ وہ کتابیں حق اور حکمت سے خالی ہیں۔ اعجاز کی خوبی اور وجہ تو یہی ہے کہ ہر رعایت کو زیر نظر رکھے۔ فصاحت بلاغت کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ صداقت اور حکمت کو بھی نہ چھوڑے۔ یہ معجزہ قرآن شریف ہی کا ہے جو آفتاب کی طرح روشن ہے جو ہر پہلو سے اپنے اندر اعجازی طاقت رکھتا ہے۔ انجیل کی طرح نرے زبانی ہی جمع خرچ نہیں۔ کہ "ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسری بھی پھیر دو۔" یہ لحاظ اور خیال نہیں کہ یہ تعلیم حکیمانہ فعل سے کہاں تک تعلق رکھتی ہے۔ اور انسان کی فطرت کا لحاظ اس میں کہاں تک ہے؟ اس کے مقابل میں قرآن کی تعلیم پڑھیں گے تو پتہ لگ جائے گا کہ انسان کے خیالات ایسے ہر پہلو پر قادر نہیں ہو سکتے۔ اور ایسی مکمل اور بے نقص تعلیم زمینی دماغ اور ذہن کا نتیجہ نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہزار آدمی ہمارے سامنے مسکین ہوں اور ہم ایک دو کو کچھ دیدیں اور باقی کا خیال تک بھی نہ کریں۔ اسی طرح انجیل ایک ہی پہلو پر پڑی ہے باقی پہلوؤں کا اُسے خیال تک بھی نہیں رہا۔ ہم یہ انجیل پر الزام نہیں دیتے۔ یہ یہودیوں کی شامت اعمال کا نتیجہ ہے جیسی اُن کی استعدادیں تھیں اُن کے ہی موافق انجیل آئی "جیسی روح ویسے فرشتے" اس میں کسی کا کیا قصور؟ اس کے علاوہ انجیل ایک قانون ہے مختص المقام والزمان اور مختص القوم۔ جیسا کہ انگریزی بھی قوانین مختص المقام اور مختص الوقت نافذ کر دیتے ہیں بعد از وقت اُن کا اثر نہیں رہتا۔ اسی طرح انجیل بھی ایک مختص قانون ہے عام نہیں۔ مگر قرآن کریم کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ قیامت تک ایک ہی لاتبدیل قانون ہے اور ہر قوم اور ہر وقت کے لیے ہے چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ[1] یعنی ہم اپنے خزانوں میں سے بقدر معلوم نازل کرتے ہیں۔ انجیل کی ضرورت اسی قدر تھی۔ اس لیے انجیل کا خلاصہ ایک صفحہ میں آ سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی ضرورتیں تھیں سارے زمانہ کی اصلاح۔ قرآن کا مقصد تھا وحشیانہ حالت سے انسان بنانا۔ انسانی آداب سے مہذب انسان بنانا تا شرعی حدود اور احکام کے ساتھ مرحلہ طے ہو۔ اور پھر باخدا انسان بنانا۔ یہ لفظ مختصر ہیں۔ مگر اس کے ہزارہا شعبہ ہیں۔ چونکہ یہودیوں۔ طبعیوں۔ آتش پرستوں اور مختلف اقوام میں بدروشی کی روح کام کر رہی تھی اس لیے

---

[1] الحجر۔ ع ۲۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باعلام الٰہی سب کو مخاطب کرکے کہا۔ یَاۤاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔[1]
اس لیے ضروری تھا کہ قرآن شریف اُن تمام تعلیمات کا جامع ہوتا جو وقتاً فوقتاً جاری رہ چکی تھیں۔ اور اُن تمام صداقتوں کو اپنے اندر رکھتا جو آسمان سے مختلف اوقات میں مختلف نبیوں کے ذریعے زمین کے باشندوں کو پہنچائی گئی تھیں۔ قرآن کریم کے مدنظر تمام نوع انسان تھا نہ کوئی خاص قوم اور ملک اور زمانہ اور انجیل کا مدنظر ایک خاص قوم تھی۔ اس لیے مسیح علیہ السلام نے بار بار کہا کہ "میں اسرائیل کی گم گشتہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں" بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کیا لایا؟ وہی تو ہے جو توریت میں ہے۔ اسی کوتاہ نظری نے بعض عیسائیوں کو عدم ضرورت قرآن جیسے رسائل لکھنے پر دلیر کردیا۔ کاش وہ سچی دانائی اور حقیقی فراست سے حصہ رکھتے تا وہ بھٹک نہ جاتے۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ توریت میں لکھا ہے کہ تو زنا نہ کر۔ ایسا ہی قرآن میں لکھا ہے کہ زنا نہ کر۔ قرآن توحید سکھلاتا ہے اور توریت بھی خدائے واحد کی پرستش سکھلاتی ہے۔ لیکن فرق کیا ہوا؟ بظاہر یہ سوال بڑا پیچدار ہے۔ اگر کسی ناواقف آدمی کے سامنے پیش کیا جاوے تو وہ گھبرا جاوے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے باریک اور پیچدار سوالات کا حل بھی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی تو قرآنی معارف ہیں جو اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور توریت میں تطابق ضرور ہے اس سے ہم کو انکار نہیں۔ لیکن توریت نے صرف متن کو لیا ہے جس کے ساتھ دلائل۔ براہین اور شرح نہیں ہے لیکن قرآن کریم نے معقولی رنگ کو لیا ہے۔ اس لیے کہ توریت کے وقت انسانوں کی استعدادیں وحشیانہ رنگ میں تھیں۔ اس لیے قرآن نے وہ طریق اختیار کیا جو عبادت کے منافع کو ظاہر کرتا ہے۔ اور جو بتلاتا ہے کہ اخلاق کے مفاد یہ ہیں۔ اور نہ صرف مفاد اور منافع کو بیان ہی کرتا ہے بلکہ معقول طور پر دلائل و براہین کے ساتھ اُن کو پیش کرتا ہے۔ تاکہ عقل سلیم سے کام لینے والوں کو کوئی جگہ انکار کی نہ رہے۔ جیسا میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ قرآن کے وقت استعدادیں معقولیت کا رنگ پکڑ گئی تھیں اور توریت کے وقت وحشیانہ حالت تھی۔ آدم سے لیکر زمانہ ترقی کرتا گیا تھا اور قرآن کے وقت دائرہ کی طرح پورا ہوگیا۔ حدیث میں ہے زمانہ مستدیر ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔[2]

...... یہی تو قرآنی اعجاز ہے کہ وہ اپنے پیرو کو کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہونے دیتا۔ دلائل اور براہین بھی خود ہی بیان کرکے اُسے مستغنی کردیتا ہے۔ قرآن شریف نے دلائل کے ساتھ احکام کو لکھا ہے اور ہر حکم کے جداگانہ دلائل دیئے ہیں۔ غرض یہ دو بڑے فرق ہیں جو توریت اور قرآن میں ہیں۔ اوّل الذکر میں طریق استدلال نہیں۔ دعوی کی دلیل خود تلاش کرنی پڑتی ہے۔ آخر الذکر اپنے دعوے کو ہر قسم کی دلیل سے مدلل کرتا ہے۔ اور پھر پیش کرتا ہے اور خدا کے احکام کو زبردستی نہیں منواتا۔ بلکہ انسان کے مونہہ سے سر تسلیم خم کرنے کی صدا نکلواتا ہے۔ نہ کسی جبر و اکراہ سے بلکہ اپنے

[1] اعراف۔ ع۔ ۲۰۔ [2] الاحزاب۔ ع۔ ۵۔

لطیف طریق استدلال سے۔ اور فطری سیادت سے۔ توریت کا مخاطب خاص گروہ ہے۔ اور قرآن کے مخاطب کل لوگ جو قیامت تک پیدا ہوں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۴ تا ۸۸)

عبداللہ ابن ابی سرح کی کلام سے خدا تعالیٰ کی کلام کا توارد ہوا یعنی عبداللہ کے منہ سے بھی یہ فقرہ نکلا تھا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ[1] اور خدا تعالیٰ کی وحی میں بھی یہی آیا۔ اور اگر کہو کہ پھر خدا تعالیٰ کی کلام اور انسان کی کلام میں مابہ الامتیاز کیا ہوا تو اول تو ہم اس کا یہی جواب دیتے ہیں کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آپ قرآن شریف میں فرمایا ہے مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلام جو غیر کا کلام کہلاتا ہے قرآنی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو کیونکہ اعجاز کے لیے اسی قدر معتبر سمجھا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یہ نہیں فرمایا کہ فَأْتُوْا بِاٰيَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یا فَأْتُوْا بِكَلِمَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ اور درحقیقت یہ سچ ہے کہ خدا کے کلمات علیحدہ علیحدہ تو وہی کلمات ہیں جو کفار کی زبان پر بھی جاری تھے۔ پھر رنگینی عبارت اور نظم کلام اور دیگر لوازم کے لحاظ سے وہی کلمات بحیثیت مجموعی ایک معجزہ کے رنگ میں ہو گئے اور جو معجزہ خدا تعالیٰ کے افعال میں پایا جاتا ہے اس کی بھی یہی نشان ہے یعنی وہ بھی اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے جیسا کہ کلام اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے منہ سے جو چھوٹے چھوٹے فقرے نکلتے ہیں وہ اپنے مطالب عالیہ کے لحاظ سے جو ان کے اندر ہوتے ہیں انسانی فقرات سے امتیاز کلی رکھتے ہیں یہ امر دیگر ہے کہ انسان اُن کے پوشیدہ حقائق معارف تک نہ پہنچے مگر ضرور ان کے اندر انوار مخفیہ ہوتے ہیں جو ان کلمات کی روح ہوتے ہیں جیسا کہ یہی کلمہ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ اپنی گذشتہ آیات کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایک امتیازی رنگ اپنے اندر رکھتا ہے یعنی اس قسم کی روحانی فلاسفی اس کے اندر بھری ہوئی ہے کہ وہ بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کی نظیر انسانی کلام میں نہیں ملتی۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۹، ۳۰)

قرآن شریف کی فصاحت بلاغت ایسی اعلیٰ درجہ کی اور مسلّم ہے کہ انصاف پسند دشمنوں کو بھی اسے ماننا پڑا ہے۔ قرآن شریف نے فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ کا دعویٰ کیا لیکن آج تک کسی سے ممکن نہیں ہوا کہ اس کی مثل لا سکے۔ عرب جو بڑے فصیح و بلیغ بولنے والے تھے اور خاص موقعوں پر بڑے بڑے مجمع کرتے اور ان میں اپنے قصائد سناتے تھے وہ بھی اس کے مقابلے میں عاجز ہو گئے۔

اور پھر قرآن شریف کی فصاحت بلاغت ایسی نہیں ہے کہ اس میں صرف الفاظ کا تتبع کیا جاوے اور معانی اور مطالب کی پرواہ نہ کی جاوے بلکہ جیسا اعلیٰ درجہ کے الفاظ ایک عجیب ترتیب کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح پر حقائق اور معارف کو ان میں بیان کیا گیا ہے اور یہ رعایت انسان کا کام نہیں کہ وہ حقائق اور معارف کو بیان کرے اور فصاحت و بلاغت کے مراتب کو بھی ملحوظ رکھے۔

---

[1] المؤمنون۔ ع ۱

ایک جگہ فرمایا ہے یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ [1] - یعنی ان پر ایسے صحائف پڑھتا ہے کہ جن میں حقائق و معارف ہیں۔ انشاء والے جانتے ہیں کہ انشا پردازی میں پاکیزہ تعلیم۔ اور اخلاق فاضلہ کو ملحوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے اور پھر ایسی موثر اور جاذب تعلیم دینا جو صفات رذیلہ کو دور کر کے بھی دکھا دے اور ان کی جگہ اعلیٰ درجہ کی خوبیاں پیدا کر دے۔ عربوں کی جو حالت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں وہ سارے عیبوں اور برائیوں کا مجموعہ بنے ہوئے تھے اور صدیوں سے ان کی یہ حالت بگڑی ہوئی تھی مگر کس قدر آپ کے فیوضات اور برکات میں قوت تھی کہ تیئیس ۲۳ برس کے اندر کل ملک کی کایا پلٹ دی یہ تعلیم ہی کا اثر تھا۔

ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ بھی اگر قرآن شریف کی لے کر دیکھی جاوے تو معلوم ہوگا کہ اس میں فصاحت بلاغت کے مراتب کے علاوہ تعلیم کی ذاتی خوبیوں اور کمالات کو اس میں بھر دیا ہے۔ سورہ اخلاص ہی کو دیکھو کہ توحید کے کل مراتب کو بیان فرمایا ہے اور ہر قسم کے شرکوں کا رد کر دیا ہے۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ کو دیکھو کہ کس قدر اعجاز ہے۔ چھوٹی سی سورہ جس کی سات آیتیں ہیں لیکن دراصل سارے قرآن شریف کا فن اور خلاصہ اور فہرست ہے۔ اور پھر اس میں خدا تعالیٰ کی ہستی۔ اس کے صفات۔ دعا کی ضرورت اس کی قبولیت کے اسباب اور ذرائع مفید اور سود مند دعاؤں کا طریق نقصان رساں راہوں سے بچنے کی ہدایت سکھائی ہے وہاں دنیا کے کل مذاہب باطلہ کا رد اس میں موجود ہے۔

اکثر کتابوں اور اہل مذہب کو دیکھو گے کہ وہ دوسرے مذاہب کی برائیاں اور نقص بیان کرتے ہیں اور دوسری تعلیموں پر نکتہ چینی کرتے ہیں مگر ان نکتہ چینیوں کو پیش کرتے ہوئے یہ کوئی اہل مذہب نہیں کرتا کہ اس کے بالمقابل کوئی عمدہ تعلیم بھی پیش کرے اور دکھائے کہ اگر میں فلاں بری بات سے بچانا چاہتا ہوں تو اس کی بجائے یہ اچھی تعلیم دیتا ہوں۔ یہ کسی مذہب میں نہیں یہ فخر قرآن شریف ہی کو ہے کہ جہاں وہ دوسرے مذاہب باطلہ کا رد کرتا ہے۔ اور ان کی غلط تعلیموں کو کھولتا ہے۔ وہاں اصلی اور حقیقی تعلیم بھی پیش کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱-۲)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں فصاحت بلاغت کا زور تھا اس لیے آپ کو قرآن کریم بھی ایک معجزہ اسی رنگ کا ملا۔ یہ رنگ اسی لیے اختیار کیا کہ شعرا جادو بیان سمجھے جاتے تھے اور ان کی زبان میں اتنا اثر تھا کہ وہ جو چاہتے تھے چند شعر پڑھ کر کرا لیتے تھے۔ جیسے آجکل جوش دلانے کے لیے انگریزوں نے باجا رکھا ہوا ہے ان کے پاس زبان تھی جو دلیری اور حوصلہ پیدا کر دیتی تھی ہر حربہ میں وہ شعر سے کام لیتے تھے اور فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ [2] کے مصداق تھے۔ اس لیے اس وقت ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ اپنا کلام بھیجتا۔ پس خدا تعالیٰ نے اپنا کلام نازل فرمایا اور اسی کلام کے رنگ میں اپنا معجزہ پیش کر دیا جبکہ ان کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ الآیۃ۔ تم جو اپنی زبان دانی کا دم مارتے اور لاف زنی کرتے ہو اگر کوئی قوت اور حوصلہ ہے تو اس

---

[1] سورۃ البیّنۃ [2] الشعراء - ع - ۱۱

کلام کے معجزہ کے مقابل کچھ پیش کر کے دکھاؤ لیکن باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر کچھ نہ بنایا خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب تحدی کر دی گئی ہے کہ تم ہرگز ہرگز بنا نہ سکو گے) تو ملزم ہو کر ذلیل ہو جائیں گے پھر بھی وہ کچھ پیش نہ کر سکے اگر وہ کچھ بناتے اور پیش کرتے تو صحیح تاریخ ضرور شہادت دیتی مگر کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ کسی نے کچھ بنایا ہو۔ پس خدا تعالیٰ نے اس وقت اسی رنگ کا معجزہ دکھایا تھا۔ (الحکم جلد ۶ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ اس میں من مثلہ کے یہ معنے بھی اکثر مفسرین نے کیے ہیں کہ اگر مقابلہ میں کوئی لکھ کر لا دیں تو اس میں پیشگوئیاں بھی اسی طرح ہوں جیسے قرآن شریف میں ہیں۔ (البدر جلد ۱ ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

فرمایا۔ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ یعنی جہنم کی آگ کا ایندھن جس سے وہ آگ ہمیشہ افروختہ رہتی ہے دو چیزیں ہیں ایک وہ انسان جو حقیقی خدا کو چھوڑ کر اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں یا ان کی مرضی سے ان کی پرستش کی جاتی ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ[1] یعنی تم اور تمہارے معبود باطل جو انسان ہو کر خدا کہلاتے رہے جہنم میں ڈالے جائیں گے (۲) دوسرا ایندھن جہنم کا بت ہیں مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا وجود نہ ہوتا تو جہنم بھی نہ ہوتا۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۷)

۲۶۔ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

یعنی جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل بجا لاتے ہیں وہ ان باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

پس واضح رہے کہ اس جگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں بتلایا گیا ہے کہ جو رشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے وہی رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے پس جیسا کہ کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا ایسا ہی کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زندہ ایمان نہیں کہلا سکتا اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں تو وہ ایمان ہیچ ہے اور اگر اعمال ہوں

[1] الانبیاء ع ۷۔

اور ایمان نہ ہو تو وہ اعمال ریاکاری ہیں اسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا کے ایمان اور عمل کا ایک ظل ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں جو باہر سے آکر انسان کو ملے گی بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر سے ہی نکلتی ہے اور ہر ایک کی بہشت اسی کا ایمان اور اسی کے اعمال صالحہ ہیں جن کی اسی دنیا میں لذت شروع ہو جاتی ہے اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں۔ اور نہریں بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسوس ہوں گے خدا کی پاک تعلیم ہمیں یہی بتلاتی ہے کہ سچا اور پاک اور مستحکم اور کامل ایمان جو خدا اور اس کی صفات اور اس کے ارادوں کے متعلق ہو وہ بہشت خوش نما اور بارور درخت ہے اور اعمال صالحہ اس بہشت کی نہریں ہیں۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۵-۱۳۶)

موت کے بعد جو کچھ انسان کی حالت ہوتی ہے درحقیقت وہ کوئی نئی حالت نہیں ہوتی بلکہ وہی دنیا کی زندگی کی حالتیں زیادہ صفائی سے کھل جاتی ہیں جو کچھ انسان کے عقائد اور اعمال کی کیفیت صالحہ یا غیر صالحہ ہوتی ہے وہ اس جہان میں مخفی طور پر اس کے اندر ہوتی ہے اور اس کا تریاق یا زہر ایک چھپی ہوئی تاثیر انسانی وجود پر ڈالتا ہے مگر آنے والے جہان میں ایسا نہیں رہے گا بلکہ وہ تمام کیفیات کھلا کھلا اپنا چہرہ دکھلائیں گی اس کا نمونہ عالم خواب میں پایا جاتا ہے کہ انسان کے بدن پر جس قسم کے مواد غالب ہوتے ہیں عالم خواب میں اسی قسم کی جسمانی حالتیں نظر آتی ہیں جب کوئی تیز تپ چڑھنے کو ہوتا ہے تو خواب میں اکثر آگ اور آگ کے شعلے نظر آتے ہیں اور بلغمی تپوں اور ریزش اور زکام کے غلبہ میں انسان اپنے تئیں پانی میں دیکھتا ہے غرض جس طرح کی بیماریوں کے لیے بدن نے طیاری کی ہو وہ کیفیتیں تمثّل کے طور پر خواب میں نظر آجاتی ہیں پس خواب کے سلسلہ پر غور کرنے سے ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ عالم ثانی میں بھی یہی سنت اللہ ہے کیونکہ جس طرح خواب ہم میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر کے روحانیات کو جسمانی طور پر تبدل[1] کر کے دکھلاتا ہے اُس عالم میں بھی یہی ہوگا اور اُس دن ہمارے اعمال اور اعمال کے نتائج جسمانی طور ظاہر ہوں گے اور جو کچھ ہم اس عالم سے مخفی طور پر ساتھ لے جائیں گے وہ سب اُس دن ہمارے چہرہ پر نمودار نظر آئیگا اور جیسا کہ انسان جو کچھ خواب میں طرح طرح کے تمثلات دیکھتا ہے اور کبھی گمان نہیں کرتا کہ یہ تمثلات ہیں بلکہ انہیں واقعی چیزیں یقین کرتا ہے ایسا ہی اُس عالم میں ہوگا بلکہ خدا تمثلات کے ذریعہ سے اپنی نئی قدرت دکھائے گا چونکہ وہ قدرت کامل ہے پس اگر ہم تمثلات کا نام بھی نہ لیں اور یہ کہیں کہ خدا کی قدرت سے وہ ایک نئی پیدائش ہے تو یہ تقریر بہت درست اور واقعی اور صحیح ہے خدا فرماتا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ[2] یعنی کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں جو اُس کے لیے مخفی ہیں سو خدا نے ان تمام نعمتوں کو مخفی قرار دیا جن کا دنیا کی نعمتوں میں نمونہ نہیں یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں ہیں اور ہم دودھ اور انار اور انگور

---

[1] سہو کاتب ہے۔ غالباً متبدل یا تبدیل ہونا چاہیئے۔ [2] السجدۃ - ع - ۲۔

وغیرہ کو ہم جانتے ہیں اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں سو اس سے معلوم ہوا کہ وہ چیزیں اور ہیں اور ان کو ان چیزوں سے صرف نام کا اشتراک ہے پس جس نے بہشت کو دنیا کی چیزوں کا مجموعہ سمجھا اُس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔ اس آیت کی شرح میں جو ابھی میں نے ذکر کی ہے ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وہ چیزیں ہیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ دلوں میں کبھی گذریں۔ حالانکہ ہم دنیا کی نعمتوں کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور کانوں سے بھی سنتے ہیں اور دل میں بھی وہ نعمتیں گذرتی ہیں پس جبکہ خدا اور رسول اس کا ان چیزوں کو ایک نرالی چیزیں بتلاتا ہے تو ہم قرآن سے دور جا پڑتے ہیں اگر یہ گمان کریں کہ بہشت میں بھی دنیا کا ہی دودھ ہوگا کہ گائیوں اور بھینسوں سے دوہا جاتا ہے گویا دودھ دینے والے جانوروں کے وہاں ریوڑ کے ریوڑ موجود ہوں گے اور درختوں پر شہد کی مکھیوں نے بہت سے چھتے لگائے ہوئے ہونگے اور فرشتے تلاش کرکے وہ شہد نکالیں گے اور نہروں میں ڈالیں گے کیا ایسے خیالات اس تعلیم سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں جس میں یہ آیتیں موجود ہیں کہ دنیا نے ان چیزوں کو کبھی نہیں دیکھا اور وہ چیزیں روح کو روشن کرتی ہیں اور خدا کی معرفت بڑھاتی ہیں اور روحانی غذائیں ہیں۔ گو ان غذاؤں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے مگر ساتھ ساتھ بتا یا گیا ہے کہ ان کا سرچشمہ روح اور راستی ہے۔ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ قرآن شریف کی مندرجہ ذیل آیت سے یہ پایا جاتا ہے کہ جو جو نعمتیں بہشت میں دی جائیں گی ان نعمتوں کو دیکھ کر بہشتی لوگ اُن کو شناخت کرلیں گے کہ یہی نعمتیں ہمیں پہلے بھی ملی تھیں جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا یعنی جو لوگ ایمان لانے والے اور اچھے کام کرنے والے ہیں جن میں ذرہ فساد نہیں ان کو خوشخبری دے کہ وہ اس بہشت کے وارث ہیں جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں جب وہ عالم آخرت میں اُن درختوں کے اُن پھلوں میں سے جو دنیا کی زندگی میں ہی اُن کو مل چکے تھے پائیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہ پھل ہیں جو ہمیں پہلے ہی دئے گئے تھے کیونکہ وہ ان پھلوں کو ان پہلے پھلوں سے متشابہ پائیں گے۔ اب یہ گمان کہ پہلے پھلوں سے مراد دنیا کی جسمانی نعمتیں ہیں بالکل غلطی ہے اور آیت کے بدیہی معنے اور اس کے منطوق کے بالکل برخلاف ہے بلکہ اللہ جل شانہ اس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک بہشت بنایا ہے جس کے درخت ایمان اور جس کی نہریں اعمال صالحہ ہیں اسی بہشت کا وہ آئندہ بھی پھل کھائیں گے اور وہ پھل زیادہ نمایاں اور شیریں ہوگا اور چونکہ وہ روحانی طور پر اسی پھل کو دنیا میں کھا چکے ہوں گے اس لیے دوسری دنیا میں اس پھل کو پہچان لیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل معلوم ہوتے ہیں کہ جو پہلے ہمارے کھانے میں آچکے ہیں اور اس پھل کو اس پہلی خوراک سے مشابہ پائیں گے سو یہ آیت صریح بتا رہی ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کی محبت اور پیار کی غذا کھاتے تھے اب جسمانی تشکل پر وہی غذا ان کو ملے گی اور چونکہ وہ پریت اور محبت کا مزہ چکھ چکے تھے اور اُس کیفیت سے آگاہ تھے اس لیے ان کی روح کو وہ زمانہ

یاد آجائے گا کہ جب وہ گوشوں اور خلوتوں میں اور رات کے اندھیروں میں محبت کے ساتھ اپنے محبوب حقیقی کو یاد کرتے اور اس یاد سے لذت اٹھاتے تھے۔ غرض اس جگہ جسمانی غذاؤں کا کچھ ذکر نہیں اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جبکہ روحانی طور پر عارفوں کو یہ غذا دنیا میں مل چکی تھی تو پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی نعمتیں ہیں کہ نہ دنیا میں کسی نے دیکھیں نہ سنیں اور نہ کسی کے دل میں گذریں اور اس صورت میں ان دونوں آیتوں میں تناقض پایا جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تناقض اس صورت میں ہوتا کہ جب اس آیت میں دنیا کی نعمتیں مراد ہوتیں لیکن اس جگہ دنیا کی نعمتیں مراد نہیں ہیں جو کچھ عارف کو معرفت کے رنگ میں ملتا ہے وہ درحقیقت دوسرے جہان کی نعمت ہوتی ہے جس کا نمونہ شوق دلانے کے لیے پہلے ہی دیا جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ باخدا آدمی دنیا میں سے نہیں ہوتا اسی لیے تو دنیا اُس سے بغض رکھتی ہے۔ بلکہ وہ آسمان سے ہوتا ہے اس لیے آسمانی نعمت اُس کو ملتی ہے۔ دنیا کا آدمی دنیا کی نعمتیں پاتا ہے اور آسمان کا آسمانی نعمتیں حاصل کرتا ہے۔ سو یہ بالکل سچ ہے کہ وہ نعمتیں دنیا کے کانوں اور دنیا کے دلوں اور دنیا کی آنکھوں سے چھپائی گئیں لیکن جس کی دنیوی زندگی پر موت آجائے اور وہ پیالہ روحانی طور پر اُس کو پلایا جائے جو آگے جسمانی طور پر پیا جائیگا اُس کو یہ پیا اس وقت یاد آجائے گا جبکہ وہی پیالہ جسمانی طور پر اُس کو دیا جائے گا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس نعمت سے دنیا کی آنکھ اور کان وغیرہ کو بے خبر سمجھے گا۔ چونکہ وہ دنیا میں تھا اگرچہ دنیا میں سے نہیں تھا اس لیے وہ بھی گواہی دے گا کہ دنیا کی نعمتوں سے وہ نعمت نہیں نہ دنیا میں اس کی آنکھ نے ایسی نعمت دیکھی نہ کان نے سنی اور نہ دل میں گذری۔ لیکن دوسری زندگی میں اس کے نمونے دیکھے جو دنیا میں سے نہیں تھے بلکہ وہ آنے والے جہان کی ایک خبر تھی اور اسی سے اُس کا رشتہ اور تعلق تھا۔ دنیا سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۶۲ تا صفحہ ۱۶۷)

عبادت اصل میں اس کو کہتے ہیں کہ انسان ہر قسم کی قساوت۔ کجی کو دور کر کے دل کی زمین کو ایسا صاف بنا دے جیسے زمیندار زمین کو صاف کرتا ہے عرب کہتے ہیں مَوْرٌ مُّعَبَّدٌ جیسے سرمہ کو باریک کر کے آنکھوں میں ڈالنے کے قابل بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح جب دل کی زمین میں کوئی کنکر پتھر ناہمواری نہ رہے اور ایسی صاف ہو کہ گویا روح ہی روح ہو اس کا نام عبادۃ ہے۔ چنانچہ اگر یہ درستی اور صفائی آئینہ کی کی جاوے تو اس میں شکل نظر آجاتی ہے اور اگر زمین کی کی جاوے تو اس میں انواع واقسام کے پھل پیدا ہو جاتے ہیں پس انسان جو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اگر دل صاف کرے اور اُس میں کسی قسم کی کجی اور ناہمواری۔ کنکر۔ پتھر نہ رہنے دے تو اس میں خدا نظر آئے گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے درخت اس میں پیدا ہو کر نشوونما پائیں گے اور وہ اثمار شیریں وطیب ان میں لگیں گے جو اُكُلُهَا دَآئِمٌ[1] کے مصداق ہوں گے یاد رکھو کہ یہ وہی مقام ہے جہاں صوفیوں کے سلوک کا خاتمہ ہے۔ جب سالک یہاں پہنچتا ہے تو خدا ہی خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اس کا دل عرش الٰہی بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر نزول فرماتا ہے۔ سلوک کی تمام منزلیں یہاں آکر ختم ہو جاتی ہیں کہ انسان کی حالت تعبد درست ہو جس میں روحانی باغ لگ جاتے ہیں اور آئینہ کی طرح خدا نظر آتا ہے

[1] الرعد: ۳۶

اسی مقام پر پہنچ کر انسان دنیا میں جنت کا نمونہ پاتا ہے اور یہاں ہی هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا کہنے کا حظ اور لطف اٹھاتا ہے۔ غرض حالت تعبد کی درستی کا نام عبادۃ ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

قرآن شریف نے جہاں بہشت کا تذکرہ فرمایا ہے وہاں پہلے ایمان کا تذکرہ کیا ہے اور پھر اعمال صالحہ کا۔ اور ایمان اور اعمال صالحہ کی جزا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کہا ہے یعنی ایمان کی جزا جنت اور اس جنت کو ہمیشہ سرسبز رکھنے کے لیے چونکہ نہروں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ نہریں اعمال صالحہ کا نتیجہ ہیں اور اصل حقیقت یہی ہے کہ وہی اعمال صالحہ اس دوسرے جہاں میں انہار جاریہ کے رنگ میں متمثل ہو جائیں گے۔

دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جس جس قدر انسان اعمال صالحہ میں ترقی کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتا اور سرکشی اور حدود اللہ سے اعتدا کرنے کو چھوڑتا ہے اسی قدر ایمان اُس کا بڑھتا ہے اور ہر جدید عمل صالح پر اُس کے ایمان میں ایک رسوخ اور دل میں ایک قوت آتی جاتی ہے۔ خدا کی معرفت میں اسے ایک لذت آنے لگتی ہے اور پھر یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ مومن کے دل میں ایک ایسی کیفیت محبت الٰہی اور عشق خداوندی کی اللہ تعالیٰ ہی کی موہبت اور فیض سے پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا سارا وجود اس محبت اور سرور سے جو اس کا نتیجہ ہوتا ہے لبالب پیالہ کی طرح بھر جاتا ہے اور انوار الٰہی اس کے دل پر کلی احاطہ کر لیتے ہیں اور ہر قسم کی ظلمت اور تنگی اور قبض دور کر دیتے ہیں۔

اس حالت میں تمام مصائب اور مشکلات بھی جو خدا تعالیٰ کی راہ میں ان کے لیے آتے ہیں وہ انہیں ایک لحظہ کے لیے پراگندہ دل اور منقبض خاطر نہیں کر سکتے بلکہ وہ بجائے خود محسوس اللذت ہوتے ہیں یہ ایمان کا آخری درجہ ہوتا ہے۔

ایمان کے انواع اوّلیہ بھی سات ہیں اور ایک اور آخری درجہ ہے جو موہبت الٰہی سے عطا کیا جاتا ہے اس لیے بہشت کے بھی سات ہی دروازے ہیں اور آٹھواں دروازہ فضل کے ساتھ کھلتا ہے غرض یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بہشت اور دوزخ جو اُس جہان میں موجود ہوں گی وہ کوئی نئی بہشت و دوزخ نہ ہو گی بلکہ انسان کے ایمان اور اعمال ہی کا وہ ایک ظل ہیں اور یہی اُس کی سچی فلاسفی ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو باہر سے آکر انسان کو ملیگی بلکہ انسان کے اندر ہی سے وہ نکلتی ہے مومن کے لیے ہر حال میں اسی دنیا میں بہشت موجود ہوتا ہے اسی عالم کا بہشت موجود دوسرے عالم میں اس کے لیے بہشت موعود کا حکم رکھتا ہے پس یہ کیسی سچی اور صاف بات ہے کہ ہر ایک کا بہشت اُس کا ایمان اور اعمال صالحہ ہیں جن کی اس دنیا میں لذت شروع ہو جاتی ہے اور یہی ایمان اور اعمال دوسرے رنگ میں باغ اور نہریں دکھائی دیتی ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اور اپنے تجربہ سے کہتا ہوں کہ اسی دنیا میں باغ اور نہریں نظر آتی ہیں اور دوسرے عالم میں بھی باغ اور نہریں کھلے طور پر محسوس ہوں گی۔

اسی طرح پر جہنم بھی انسان کی بے ایمانی اور بداعمالی کا نتیجہ ہے جیسے جنت میں انگور انار وغیرہ پاک درختوں کی مثال

دی ہے ویسے ہی جہنم میں زقوم کے درخت کا وجود بتایا ہے اور جیسے بہشت میں نہریں اور سلسبیل اور زنجبیلی اور کافوری نہریں ہوں گی اسی طرح جہنم میں گرم پانی اور پیپ کی نہریں بتائی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایمان منکسر المزاجی اور اپنی رائے کو چھوڑ دینے سے پیدا ہوا ہے اسی طرح بے ایمانی تکبر اور انانیت سے پیدا ہوتی ہے اس لیے اس کے نتیجہ میں زقوم کا درخت دوزخ میں ہوا اور وہ بداعمالیاں اور شوخیاں جو اس تکبر و خود بینی سے پیدا ہوتی ہیں وہ وہی کھولتا ہوا پانی یا پیپ ہوگی جو دوزخیوں کو ملے گی۔

اب یہ کیسی صاف بات ہے کہ جیسے بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اسی طرح پر دوزخ کی زندگی بھی یہاں ہی سے انسان لے جاتا ہے جیسا کہ دوزخ کے باب میں فرمایا ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ[1] یعنی دوزخ وہ آگ ہے جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے اور وہ گناہ سے پیدا ہوتی اور پہلے دل پر غالب ہوتی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آگ کی جڑ وہ ہموم غموم اور حسرتیں ہیں جو انسان کو آگھیرتی ہیں کیونکہ تمام روحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں جیسے تمام روحانی سروروں کا منبع بھی دل ہے اور دل ہی سے شروع ہونے بھی چاہئیں کیونکہ دل ہی ایمان یا بے ایمانی کا منبع ہے ایمان یا بے ایمانی کا شگوفہ بھی پہلے دل ہی سے نکلتا ہے۔ اور پھر تمام بدن اور اعضا پر اس کا عمل ہوتا ہے اور سارے جسم پر محیط ہو جاتا ہے پس یاد رکھو کہ بہشت اور دوزخ اسی دنیا سے انسان ساتھ لے جاتا ہے اور یہ بات بھولنی نہ چاہیئے کہ بہشت اور دوزخ اس جسمانی دنیا کی طرح نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا مبدء اور منبع روحانی امور ہیں ہاں یہ سچی بات ہے کہ عالم معاد میں وہ جسمانی شکل پر ضرور متشکل ہوکر نظر آئیں گے۔

یہ ایک بڑا ضروری مضمون ہے جس پر ساری قوموں نے دھوکہ کھایا ہے اور اس کی حقیقت کے نہ سمجھنے کی وجہ سے کوئی خدا ہی کا منکر ہو بیٹھا ہے اور کوئی تناسخ کا قائل ہوگیا کسی نے کچھ تجویز کیا اور کسی نے کچھ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱، ۲)

جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اُن کو خوشخبری دیدو کہ وہ اُن باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے ندیاں بہ رہی ہیں۔ اس آیت میں ایمان کو اللہ تعالیٰ نے باغ سے مثال دی ہے اور اعمال صالحہ کو نہروں سے جو رشتہ اور تعلق نہر جاریہ اور درخت میں ہے وہی رشتہ اور تعلق اعمال صالحہ کو ایمان سے ہے پس جیسے کوئی باغ ممکن ہی نہیں کہ پانی کے بدوں سرسبز اور ثمردار ہوسکے اسی طرح پر کوئی ایمان جس کے ساتھ اعمال صالحہ نہ ہوں مفید اور کارگر نہیں ہو سکتا پس بہشت کیا ہے وہ ایمان اور اعمال ہی کے مجسم نظارے ہیں۔ وہ بھی دوزخ کی طرح کوئی خارجی چیز نہیں ہے بلکہ انسان کا بہشت

---

[1] سورۃ الھمزۃ: ۷

بھی اُس کے اندر ہی سے نکلتا ہے ۔ یاد رکھو کہ اُس جگہ پر جو راحتیں ملتی ہیں وہ وہی پاک نفس ہوتا ہے جو دنیا میں بنایا جاتا ہے۔ پاک ایمان پودہ سے مماثلت رکھتا ہے اور اچھے اچھے اعمال اخلاق فاضلہ یہ اس پودہ کی آبپاشی کے لیے بطور نہروں کے ہیں جو اس کی سرسبزی اور شادابی کو بحال رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں تو یہ ایسے ہیں جیسے خواب میں دیکھے جاتے ہیں مگر اُس عالم میں محسوس اور مشاہد ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ لکھا ہے کہ جب بہشتی ان انعامات سے بہرہ ور ہوں گے تو یہ کہیں گے هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دنیا میں جو دودھ۔ یا شہد۔ یا انگور انار وغیرہ چیزیں ہم کھاتے پیتے ہیں وہی وہاں ملیں گی نہیں وہ چیزیں اپنی نوعیت اور حالت کے لحاظ سے بالکل اور کی اور ہوں گی ہاں صرف نام کا اشتراک پایا جاتا ہے اور اگرچہ ان تمام نعمتوں کا نقشہ جسمانی طور پر دکھایا گیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ وہ چیزیں روح کو روشن کرتی ہیں اور خدا کی معرفت پیدا کرنے والی ہیں ان کا سرچشمہ روح اور راستی ہے ۔ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ سے یہ مراد لینا کہ وہ دنیا کی جسمانی نعمتیں ہیں بالکل غلط ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا منشا اس آیت میں یہ ہے کہ جن مومنوں نے اعمال صالحہ کیے اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک بہشت بنایا جس کا پھل وہ اس دوسری زندگی میں بھی کھائیں گے اور وہ پھل چونکہ روحانی طور پر دنیا میں بھی کھا چکے ہوں گے اس لیے اُس عالم میں اُس کو پہچان لیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ وہی روحانی ترقیاں ہوتی ہیں جو دنیا میں کی ہوتی ہیں اس لیے وہ عابد و عارف اُن کو پہچان لیں گے ۔ میں پھر صاف کر کے کہنا چاہتا ہوں کہ جہنم اور بہشت میں ایک فلسفہ ہے جس کا ربط باہم اسی طرح پر قائم ہوتا ہے جو میں نے ابھی بتایا ہے ۔ مگر اس بات کو کبھی بھی بھولنا نہیں چاہیئے کہ دنیا کی سزائیں تنبیہ اور عبرت کے لیے انتظامی رنگ کی حیثیت سے ہیں۔ سیاست اور رحمت دونوں باہم ایک رشتہ رکھتی ہیں۔ اور اسی رشتہ کے اظلال یہ سزائیں اور جزائیں ہیں انسانی افعال اور اعمال اسی طرح پر محفوظ اور بند ہوتے جاتے ہیں جیسے فونوگراف میں آواز بند کی جاتی ہے جب تک انسان عارف نہ ہو اس سلسلہ پر غور کر کے کوئی لذت اور فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

(الحکم جلد ۶ ۲؎ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۲؁ء صفحہ ۶)

دوزخیوں کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ اُن کو زقوم کھانے کو ملے گا اور بہشتیوں کو اُس کے بالمقابل دودھ اور شہد کی نہریں اور قسم قسم کے پھل بیان کیے گئے ہیں اس کا سِرّ کیا ہے ؟

اصل بات یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بالمقابل بیان ہوئی ہیں بہشت کی نعمتوں کا ذکر ایک جگہ کر کے یہ بھی فرمایا ہے كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا تو اس میں رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ سے یہ مراد نہیں کہ دنیا کے آم خربوزے اور دوسرے پھل اور دُنیا کا دودھ اور شہد ان کو یاد آجائے گا نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ مومن جو اخلاص اور محبت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور اس ذوق شوق سے جو لذّت

ان کو محسوس ہوتی ہے تو بہشت کی نعمتوں اور لذتوں کے حاصل ہونے پر وہ لذت اُن کو یاد آجائے گی کہ اس قسم کی لذت بخش نعمتیں ہمارے رب سے پہلے بھی ملتی رہی ہیں۔ چونکہ بہشتی زندگی اسی عالم سے شروع ہوتی ہے۔ اِس لیے ان نعمتوں کا ملنا بھی یہیں سے شروع ہو جاتا ہے ورنہ بہشت کی نعمتوں کے بارہ میں تو آیا ہے کہ نہ اُن کو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا تو ان دنیوی پھلوں سے اُن کا کیا رشتہ ہُوا؟ ایمان اور اعمال کی مثال قرآن شریف میں درختوں سے دی گئی ہے ایمان کو درخت بتایا ہے اور اعمال اس کی آبپاشی کے لیے بطور نہروں کے ہیں۔ جب تک اعمال سے ایمان کے پودہ کی آبپاشی نہ ہو اُس وقت تک وہ شیریں پھل حاصل نہیں ہوتے بہشتی زندگی والا انسان خدا کی یاد سے ہر وقت لذت پاتا ہے اور جو بدبخت دوزخی زندگی والا ہے تو وہ ہر وقت اس دنیا میں زقوم ہی کھا رہا ہے اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے مَعِيْشَةً ضَنْكًا[1] بھی اسی کا نام ہے جو قیامت کے دن زقوم کی صورت پر متمثل ہو جائے گی۔ غرض دونو صورتوں میں باہم رشتے قائم ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

کوئی بات سوائے خدا کے فضل کے حاصل نہیں ہو سکتی اور جسے اس دنیا میں فضل ہوگا اُسے ہی آخرت میں بھی ہوگا جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى[2] اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ان حواس کے حصول کی کوشش اسی جہان میں کرنی چاہیئے کہ جس سے انسان کو بہشتی زندگی حاصل ہوتی ہے اور وہ حواس بلا تقویٰ کے نہیں مل سکتے۔ ان آنکھوں سے انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا لیکن تقویٰ کی آنکھوں سے انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ اگر وہ تقویٰ اختیار کرے گا تو وہ محسوس کریگا کہ خدا مجھے نظر آرہا ہے اور ایک دن آوے گا کہ خود کہہ اُٹھے گا کہ میں نے خدا کو دیکھ لیا۔ اسی بہشتی زندگی کی تفصیل جو کہ متقی کو اسی دنیا میں حاصل ہوتی ہے قرآن شریف میں ایک اور جگہ بھی پائی جاتی ہے جیسے لکھا ہے كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ جب وہ عالم آخرت میں ان درختوں کے ان پھلوں سے جو دنیا کی زندگی میں ہی ان کو مل چکے تھے پائیں گے تو کہہ دیویں گے کہ یہ تو وہ پھل ہیں جو کہ ہمیں اول ہی دئے گئے تھے۔ کیونکہ وہ ان پھلوں کو ان پہلے پھلوں سے مشابہ پاویں گے۔ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دنیا میں جو نعمتیں مثل دودھ۔ شہد گھی۔ اور انار اور انگور وغیرہ اُنہوں نے کھائی ہیں۔ وہی اُن کو وہاں جنت میں ملیں گے اور وہاں ان چیزوں کے مہیا کرنے کے لیے بہت سے باغات۔ درخت۔ مالی اور بیل وغیرہ اور گائیں بھینسوں کے ریوڑ ہوں گے اور درختوں پر شہد کی مکھیوں کے چھتے ہوں گے جن سے شہد آتار کر اہل جنت کو دیا جاوے گا یہ سب غلط خیال ہیں اگر جنت کی یہی نعمت ہے جو ان کو دنیا میں ملتی رہی اور آخرت میں بھی ملے گی تو مومنوں اور کافروں میں کیا فرق رہا۔ ان سب چیزوں کے حاصل کرنے میں تو کافر اور مشرک بھی شریک ہیں پھر اس میں بہشت کی خصوصیت کیا ہے۔ لیکن قرآن شریف اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ بہشت کی نعمتیں ایسی چیزیں

[1] طٰہٰ ع ۷ ۔ [2] بنی اسرائیل ع ۸۔

ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ دلوں میں گزریں اور ہم دنیا کی نعمتوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ سب آنکھوں نے دیکھی کانوں نے سنی اور دل میں گذری ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان جنتی نعمتوں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے مگر وہ اصل میں اور امور ہیں ورنہ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ کے کیا معنے ہوں گے اس کے وہی معنے ہیں جو کہ مَنۡ كَانَ فِيۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى[1] کے ہیں دوسرے مقام پر قرآن شریف فرماتا ہے وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ[2] جو شخص خدا تعالیٰ سے خائف ہے اور اس کی عظمت اور جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کے لیے دو بہشت ہیں ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔ جو شخص سچے اور خالص دل سے نقش ہستی کو اس کی راہ میں مٹا کر اُس کے متلاشی ہوتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں تو اس میں ان کو ایک قسم کی لذت شروع ہو جاتی ہے اور ان کو وہ روحانی غذائیں ملتی ہیں جو روح کو روشن کرتی اور خدا کی معرفت کو بڑھاتی ہیں ایک جگہ پر شیخ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب انسان عارف ہو جاتا ہے تو اس کی نماز کا ثواب مارا جاتا ہے اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کی نماز اب بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی بلکہ یہ معنے ہیں کہ چونکہ اب اسے لذت شروع ہو گئی ہے تو جو اجر اس کا عنداللہ تھا وہ اب اُسے دنیا میں ملنا شروع ہو گیا ہے۔ جیسے ایک شخص اگر دودھ میں برف اور خوشبو وغیرہ ڈال کر پیتا ہے تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ اُسے ثواب ملے گا۔ کیونکہ لذت تو اس نے اس کی یہیں حاصل کر لی۔ خدا تعالیٰ کی رضامندی اور کسی عمل کی قبولیت اور شے ہے اور ثواب اور شئے ہے ہر ایک لفظ اپنے اپنے مقام کے لیے چسپاں ہوتا ہے اسی لحاظ سے شیخ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ عارف کی نماز کا ثواب مارا جاتا ہے۔ جو اہلِ حال ہوتا ہے وہ اپنی جگہ پورے بہشت میں ہوتا ہے اور جب انسان کو خدا سے پورا تعلق ہو جاتا ہے تو اغلال اور اثقال جس قدر بوجھ اس کی گردن میں ہوتے ہیں وہ سب اُٹھائے جاتے ہیں وہ لذت جو خدا کی طرف سے اُس کی عبادت میں حاصل ہوتی ہے وہ اور ہے اور جو اکل و شرب اور جماع وغیرہ میں حاصل ہوتی ہے وہ اور ہے لکھا ہے کہ اگر ایک عارف دروازہ بند کر کے مولا سے راز و نیاز کر رہا ہو تو اسے اپنی عبادت اور اس راز و نیاز کے اظہار کی بڑی غیرت ہوتی ہے۔ اور وہ ہرگز اُس کا افشاء پسند نہیں کرتا۔ اگر اس وقت کوئی دروازہ کھول کر اندر چلا جاوے تو وہ ایسا ہی نادم اور پشیمان ہوتا ہے جیسے زانی زنا کرتا پکڑا جاتا ہے جب اس لذت کی حد کو انسان پہنچ جاتا ہے تو اس کا حال اور ہوتا ہے اور اسی حالت کو وہ یاد کر کے جنت میں کہے گا کہ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ۔ بہشتی زندگی کی بنیاد یہی دنیا ہے۔ بعد مرنے کے جب انسان بہشت میں داخل ہو گا تو یہی کیفیت اور لذت اُسے یاد آ دیگی تو اسی بات کا طالب ہر ایک کو ہونا چاہیئے۔

(البدر جلد ۲ ع ۴۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۴-۳۳۵)

قرآن شریف میں وعدہ کیا ہے۔ کہ مرنے کے بعد جو صالح ہو گا بہشت میں جائے گا۔ بظاہر یہ وعدہ قصہ معلوم

[1] بنی اسرائیل ع ۸ ۔ [2] الرحمٰن ع ۳ ۔

ہوتا ہے بات یہ ہے کہ قصہ نہیں گو قصہ کا رنگ اختیار کیا گیا اصل میں عرب کے لوگ (الٰہیات و روحانیات میں) بچوں کی طرح تھے۔ خدا نے استعارہ کا رنگ قریب الفہم کرنے کے لیے اختیار کیا خدا تعالیٰ نے دوسرے موقعہ پر فرمایا۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ[1] یعنی سب کچھ اس جنت کی مثال ہے دوسری جگہ رسول اکرم کی زبان پر فرمایا مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ۔ اس جگہ کے دودھ اور شہد کی نہریں نہ ہوں گی پھر فرمایا۔ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اے رسول بشارت دیدے ان ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں کو ان کے لیے باغ ہیں چلتی ہیں اُن کے نیچے نہریں۔ پھر فرمایا۔ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ[2]۔ کلمہ طیبہ درخت کی مثال ہے اب اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کھول دیا کہ وہ ایمان جو ہے وہ بطور تخم اور شجر کے ہے اور اعمال جو ہیں وہ آبپاشی کی بجائے ہیں۔ (بدر جلد ۷ ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۴-۵)

اس آیت میں ایمان کو اعمال صالح کے مقابل پر رکھا ہے جنّت اور انہار یعنی ایمان کا نتیجہ تو جنت ہے اور اعمال صالح کا نتیجہ انہار ہیں پس جس طرح باغ بغیر نہر اور پانی کے جلدی برباد ہوجانے والی چیز ہے اور دیرپا نہیں اسی طرح ایمان بے عمل صالح بھی کسی کام کا نہیں پھر ایک دوسری جگہ پر ایمان کو اشجار (درختوں) سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ ایمان جس کی طرف مسلمانوں کو بلایا جاتا ہے وہ اشجار ہیں اور اعمال صالحہ اُن اشجار کی آبپاشی کرتے ہیں۔ غرض اس معاملہ میں جتنا جتنا تدبر کیا جاوے اسی قدر معارف سمجھ میں آویں گے جس طرح سے ایک کسان کاشت کار کے واسطے ضروری ہے کہ وہ تخم ریزی کرے اسی طرح روحانی منازل کے کاشتکار کے واسطے ایمان جو کہ روحانیات کی تخم ریزی ہے ضروری اور لازمی ہے اور پھر جس طرح کاشت کار کھیت یا باغ وغیرہ کی آبپاشی کرتا ہے اُسی طرح سے روحانی باغ ایمان کی آبپاشی کے واسطے اعمال صالحات کی ضرورت ہے یاد رکھو کہ ایمان بغیر اعمال صالح کے ایسا ہی بے کار ہے جیسا کہ ایک عمدہ باغ بغیر نہر یا کسی دوسرے ذریعہ آبپاشی کے نکما ہے۔

درخت خواہ کیسے ہی عمدہ قسم کے ہوں۔ اور اعلیٰ قسم کے پھل لانے والے ہوں۔ مگر جب مالک آبپاشی کی طرف سے لاپرواہی کرے گا۔ تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ سب جانتے ہیں یہی حال روحانی زندگی میں شجر ایمان کا ہے ایمان ایک درخت ہے جس کے واسطے انسان کے اعمال صالح روحانی رنگ میں اس کی آبپاشی کے واسطے نہریں بن کر آبپاشی کا کام کرتے ہیں۔

پھر جس طرح ہر ایک کاشتکار کو تخم ریزی اور آبپاشی کے علاوہ بھی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے روحانی فیوض برکات کے ثمرات حسنہ کے حصول کے واسطے بھی مجاہدات لازمی اور ضروری رکھے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالحہ بھی رکھا ہے عمل صالحہ اسے کہتے ہیں جس میں ایک ذرہ بھر فساد

[1] الرعد ع ۵ ؛ [2] ابراھیم ع ۴

نہ ہو یاد رکھو کہ انسان کے عمل پر ہمیشہ چور پڑا کرتے ہیں وہ کیا ہیں ریاکاری (کہ جب انسان دکھاوے کے لیے ایک عمل کرتا ہے) عجب۔ (کہ وہ عمل کرکے اپنے نفس میں خوش ہوتا ہے) اور قسم قسم کی بدکاریاں اور گناہ جو اُس سے صادر ہوتے ہیں اُن سے اعمال باطل ہوجاتے ہیں۔ عمل صالحہ وہ ہے جس میں ظلم۔ عجب۔ ریا۔ تکبر۔ حقوق انسان کے تلف کرنے کا خیال تک نہ ہو۔ جیسے آخرت میں عمل صالحہ سے بچتا ہے ویسے ہی دنیا میں بھی بچتا ہے اگر ایک آدمی بھی گھر بھر میں عمل صالحہ والا ہو تو سب گھر بچا رہتا ہے سمجھ لو کہ جب تک کہ تم میں عمل صالحہ نہ ہو صرف ماننا فائدہ نہیں کرتا۔ (البدر جلد ۱ ۹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۶)

خوب یاد رکھو کہ جب تک سچے دل سے اور روحانیت کے ساتھ یہ اعمال نہ ہوں کچھ فائدہ نہ ہوگا اور یہ اعمال کام نہ آئیں گے۔ اعمال صالحہ اُسی وقت اعمال صالحہ کہلاتے ہیں جب ان میں کسی قسم کا فساد نہ ہو صلاح کی ضدّ فساد ہے صالحہ وہ ہے جو فساد سے مبرّہ منزّہ ہو جن کی نمازوں میں فساد ہے اور نفسانی اغراض چھپے ہوئے ہیں۔ اُن کی نمازیں اللہ تعالیٰ کے واسطے ہرگز نہیں ہیں اور وہ زمین سے ایک بالشت بھی اوپر نہیں جاتی ہیں کیونکہ ان میں اخلاص کی روح نہیں اور روحانیت سے خالی ہیں۔
(الحکم جلد ۸ ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

عمل صالحہ ہماری اپنی تجویز اور قرار داد سے نہیں ہو سکتا۔ اصل میں اعمال صالحہ وہ ہیں جس میں کسی نوع کا کوئی فساد نہ ہو کیونکہ صالح فساد کی ضد ہے۔ جیسے غذا طیب اُس وقت ہوتی ہے کہ وہ نہ کچی ہو نہ سڑی ہوئی ہو اور نہ کسی ادنیٰ درجہ کی جنس کی ہو بلکہ ایسی ہو جو فوراً جزو بدن ہو جانے والی ہو۔ اسی طرح پر ضروری ہے کہ عمل صالح میں بھی کسی قسم کا فساد نہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ہو اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہو۔ اور پھر نہ اس میں کسی قسم کا کسل ہو نہ عجب ہو نہ ریا ہو نہ وہ اپنی تجویز سے ہو۔ جب ایسا عمل ہو تو وہ عمل صالح کہلاتا ہے اور یہ کبریت احمر ہے۔
(الحکم جلد ۸ ۱۴-۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل و ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

ایسا ہی قرآن شریف کے دوسرے مقامات میں بھی بہشتیوں کے ہمیشہ بہشت میں رہنے کا جابجا ذکر ہے اور سارا قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ[1] وغیرہ۔ وغیرہ۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۵۳-۲۵۴)

فلاح آخرت بجز اعمال صالحہ کے نہیں اور اعمال صالحہ وہ ہوں جو خلاف نفس اور مشقت سے ادا کیے جائیں اور عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ دل سے جس کام کے لیے مصمم عزم کیا جاوے۔ اس کے انجام کے لیے طاقت مل جاتی ہے۔ سو مصمم عزم اور عہد واثق سے اعمال کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔
(مکتوبات جلد ۵ ۵ صفحہ ۶ مکتوب ۱۹ بنام حضرت منشی ظفر احمد صاحبؓ)

یہ جو لکھا ہے کہ بہشت میں دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہاں گائیوں کا ایک گلہ ہوگا اور بہت سارے گوالے ہوں گے۔ جو دودھ دوہ دوہ کر ایک نہر میں ڈالتے رہیں گے۔ یا بہت سے چھتے شہد

[1] آیت زیر تفسیر ۲۵۔ البقرہ۔ ع ۳۔ ۹۰ وغیرہ۔

کی مکھیوں کے ہوں گے اور پھر ان کا شہد جمع کر کے نہروں میں گرایا جاویگا۔ یہ مطلب نہیں اللہ تعالیٰ نے جو مجھ پر ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات نہ ہو گی اگر یہی خربوزہ اور تربوز یا انار ہوں گے تو پھر بات ہی کیا ہوئی کافر بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے یہاں اس دنیا میں کھا لیے تم نے آگے جا کر کھائے۔ اس کی حقیقت جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن شریف میں فرمایا ہے وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل بجا لاتے ہیں وہ ان باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اس آیت میں بہشت کی حقیقت اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے گویا جو رشتہ نہروں کو باغ کے ساتھ ہے وہی تعلق اور رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہوتا ہے اور جس طرح پر کوئی باغ یا درخت بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح پر کوئی ایمان بغیر اعمال صالحہ کے زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو ایمان ہیچ ہے اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو تو وہ اعمال ریا کاری ہیں۔ پس قرآن شریف نے جو بہشت پیش کیا ہے اس کی حقیقت اور فلاسفی یہی ہے کہ وہ اس دنیا کے ایمان اور اعمال کا ایک ظل ہے اور ہر شخص کی بہشت اس کے اپنے اعمال اور ایمان سے شروع ہوتی ہے اور اس دنیا میں ہی اس کی لذت محسوس ہونے لگتی ہے اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ اور نہریں نظر آتی ہیں لیکن عالم آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسوس ہوں گے۔ اور ان کا ایک خارجی وجود نظر آجائے گا۔ قرآن شریف سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان کی آبپاشی اعمال صالحہ سے ہوتی ہے بغیر اس کے وہ خشک ہو جاتا ہے پس یہاں دو باتیں بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ بہشت باغ ہے دوسرا ان درختوں کی نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے قرآن شریف کو پڑھو اور اول سے آخر تک اس پر غور کرو تب اس کا مزہ آئیگا کہ حقیقت کیا ہے؟ ہم مجاز اور استعارہ ہرگز پیش نہیں کرتے بلکہ یہ حقیقت الامر ہے وہ خدا تعالیٰ جس نے عدم سے انسان کو بنایا ہے اور جو خلق جدید پر قادر ہے وہ یقیناً انسان کے ایمان کو اشجار سے متمثل کر دیگا اور اعمال کو انہار سے متمثل کریگا۔ اور واقعی طور پر دکھا دے گا یعنی ان کا وجود فی الخارج بھی نظر آئے گا۔ اس کی مختصر سی مثال یوں بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جیسے انسان خواب میں عمدہ اور شیریں پھل کھاتا ہے اور ٹھنڈے اور خوشگوار پانی پیتا ہے اور فی الواقع وہ پھل اور آب صرد ہوتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں کوئی دوسرا امر نہیں ہوتا۔ پھلوں کو کھا کر سیری ہوتی اور پانی پی کر فی الواقعہ پیاس دور ہوتی ہے لیکن جب اٹھتا ہے تو نہ ان پھلوں کا کوئی وجود ہوتا ہے۔ اور نہ اس پانی کا۔ اسی طرح پر جیسے اس حالت میں اللہ تعالیٰ ان اشیاء کا ایک وجود پیدا کر دیتا ہے عالم آخرت میں ایمان اور اعمال صالحہ کو اُس صورت میں متمثل کر دیا جائے گا۔ اسی لیے فرمایا ہے هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ اس کے اگر یہ معنے کریں کہ وہ جنتی جب ان پھلوں اور میووں کو کھائیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہ پھل اور خربوزے یا تربوز یا انار ہیں جو ہم نے دنیا میں کھائے تھے تو یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح پر تو وہ لذت بخش چیز نہیں ہو سکتے

اور نعماءِ جنت کی حقارت ہے اگر کوئی شخص مثلاً کشمیر میں جاوے اور وہاں کی ناشپاتیاں کھا کر کہے کہ یہ تو وہی ناشپاتیاں ہیں جو پنجاب میں کھائی تھیں تو یہ صریح ان ناشپاتیوں کی حقارت ہے پس اگر بہشت کی نعماء کی بھی یہی مثال ہے تو یہ خوشی نہیں بلکہ ان سے بیزاری ہے اس لیے اس کا یہ مفہوم اور مطلب نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بہشتی لوگ جو اس دنیا میں بڑے عابد اور زاہد تھے جب وہ اپنے ایمان اور اعمال صالحہ کے متمثلات سے لطف اُٹھائیں گے تو ان کو وہ ایمانی لذت آجائے گی اور ان مجاہدات اور اعمال صالحہ کا مزا آجائیگا جو اس عالم میں انہوں نے کیے تھے اس لیے وہ کہیں گے هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ۔

غرض جس قدر قرآن شریف کو کوئی شخص تدبر اور غور سے پڑھے گا اسی قدر وہ اس حقیقت کو سمجھ لے گا کہ ان لذات کا تمثیلی رنگ میں فائدہ اُٹھائے گا محبت الٰہی کی لذات میں۔ لذّت کا لفظ جو مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے وہ جسمانی لذت کے مفہوم سے ہزاروں درجہ زیادہ مفہوم روحانی لذت میں رکھتا ہے۔ اگر اس محبت کی لذت میں غیر معمولی سیری اور سیرابی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے محب جسمانی لذات کو ترک کیوں کریں۔ یہاں تک کہ بعض اس قسم کے بھی ہو گذرے ہیں جنہوں نے سلطنت تک کو چھوڑ دیا چنانچہ ابراہیم ادھم نے سلطنت چھوڑ دی۔ اور انبیاء علیہم السلام نے ہزاروں لاکھوں مصائب کو برداشت کیا اگر وہ لذت اور ذوق اس محبت الٰہی کی تہ میں نہ تھا جو انہیں کشاں کشاں لئے جاتا تھا تو پھر وہ کیا بات تھی کہ اس قدر مصائب کو انہوں نے خوشی کے ساتھ اٹھالیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اس درجہ میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں اس لیے آپ کی زندگی کا نمونہ بھی سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں اور عزتیں پیش کیں۔ مال و دولت۔ سلطنت۔ عورتیں۔ اور کہا کہ آپ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کریں اور یہ توحید کا مذہب پیش نہ کریں اس خیال کو جانے دیں وہ دنیادار تھے ان کی نظر دنیا کی فانی اور بے حقیقت لذتوں سے پرے نہ جاسکتی تھی انہوں نے سمجھا کہ یہ تبلیغ انہیں اغراض کے لیے ہوگی مگر آپ نے ان کی ان ساری پیش کردہ باتوں کو رد کر دیا اور کہا کہ اگر میرے دائیں بائیں آفتاب اور ماہتاب بھی لاکر رکھدو تب بھی میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر اس کے بالمقابل انہوں نے آپ کو وہ تکالیف پہنچائیں جن کا نمونہ کسی دوسرے شخص کی تکالیف میں نظر نہیں آتا۔ لیکن آپ نے ان تکالیف کو بڑی لذّت اور سرور سے منظور کیا مگر اس راہ کو نہ چھوڑا اب اگر کوئی لذت اور ذوق نہ تھا تو پھر کیا وجہ تھی جو ان مصائب مشکلات کو برداشت کیا۔ وہ وہی لذت تھی جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں ملتی ہے اور جس کی مثال اور نمونہ کوئی پیش نہیں کیا جاسکتا ...... بہشت کی لذّات میں ایک اور بھی خوبی ہے جو دنیا کی لذتوں میں اور جسمانی لذتوں میں نہیں ہے مثلاً انسان روٹی کھاتا ہے تو دوسری لذّتیں اسے یاد نہیں رہتی ہیں۔ مگر بہشت کی لذات نہ صرف جسم ہی کے لیے ہوں گی۔ بلکہ روح کے لیے بھی لذت بخش ہوں گی دونوں لذتیں اس میں اکٹھی ہوں گی۔ اور پھر اس میں کوئی کثافت نہ ہو گی۔ اور سب سے بڑھ کر جو لذت ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ مگر دیدار الٰہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہاں ہی سے طیاری ہو اور

اس کے دیکھنے کے لیے یہاں ہی سے انسان آنکھیں لے جاوے جو شخص یہاں طیاری کر کے نہ جاویگا۔ وہ وہاں محروم رہے گا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹-۱۰)

۲۷۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ

فرماتا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ یعنی بہتوں کو اس کلام سے گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو یہ ہدایت دیتا ہے مگر گمراہ ان کو کرتا ہے جو گمراہ ہونے کے کام کرتے ہیں اور فاسقانہ چالیں چلتے ہیں یعنی انسان اپنے ہی افعال کا نتیجہ خدا تعالیٰ سے پا لیتا ہے جیسے کہ ایک شخص آفتاب کے سامنے کی کھڑکی جب کھول دیتا ہے تو یہ ایک قدرتی اور فطرتی امر ہے کہ آفتاب کی روشنی اور اس کی کرنیں اُس کے مُنہ پر پڑتی ہیں لیکن جب وہ اس کھڑکی کو بند کر دیتا ہے تو اپنے ہی فعل سے اپنے لیے اندھیرا پیدا کر لیتا ہے چونکہ خدا تعالیٰ علت العلل ہے بوجہ اپنے علت العلل ہونے کے ان دونوں فعلوں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے لیکن اپنے پاک کلام میں اس نے بارہا تصریح سے فرما دیا ہے کہ جو ضلالت کے اثر کسی کے دل میں پڑتے ہیں وہ اسی کی بد اعمالی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

(جنگ مقدس صفحہ ۱۲۵ (بار سوم) بیان یکم جون ۱۸۹۳ء)

خدائے تعالیٰ کی پیشگوئیوں میں بعض امور کا اخفا اور بعض کا اظہار ہوتا ہے اور ایسا ہونا شاذ و نادر ہے کہ من کل الوجوہ اظہار ہی ہو کیونکہ پیشگوئیوں میں حضرت باری تعالیٰ کے ارادہ میں ایک قسم کی خلق اللہ کی آزمایش بھی منظور ہوتی ہے اور اکثر پیشگوئیاں اس آیت کی مصداق ہوتی ہیں کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ اسی وجہ سے ہمیشہ ظاہر پرست لوگ امتحان میں پڑ کر پیشگوئی کے ظہور کے وقت دھوکہ کھا جاتے ہیں اور زیادہ تر انکار کرنے والے اور حقیقت مقصودہ سے بے نصیب رہنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جو یہ چاہتے ہیں کہ حرف حرف پیشگوئی کا ظاہری طور پر جیسا کہ سمجھا گیا ہو پورا ہو جائے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۶۱-۶۴)

(۲۹) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝

یعنی تم اس خدا سے کیوں انکار کرتے ہو جس نے تمہیں موت کے بعد زندگی بخشی پھر تمہیں موت دیگا اور پھر زندہ کریگا اور پھر اس کی درگاہ میں حاضر کیے جاؤ گے۔ (ست بچن صفحہ ۹۳)

انسان پر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہ نطفہ ہوتا ہے اور اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا پھر مدارج ستہ سے گذر کر اس پر ایک موت آتی ہے اور پھر اُسے ایک احیا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ ہر حیات سے پہلے ایک موت ضرور آتی ہے اس آیت میں صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ ایک زمانہ اُن پر ایسا گذرا ہے کہ وہ بالکل مردہ تھے یعنی ہر قسم کی ضلالت اور ظلمت میں مبتلا تھے۔ پھر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ زندگی عطا ہوئی اور پھر ان کی تکمیل اور ایک موت ان پر وارد ہوئی جو فنا فی اللہ کی موت تھی اس کے بعد ان کو بقا باللہ کا درجہ ملا۔ اور ہمیشہ کے لیے زندگی پائی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

(۳۰) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۝

وہ وہی خدا ہے جس نے جو کچھ زمین پر ہے تمہارے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ (توضیح مرام صفحہ ۴۲)

خدا تعالیٰ نے جو کچھ زمین میں ہے سب پیدا کرکے اور آسمان کو بھی سات طبقے بنا کر غرض اس عالم کی پیدائش سے بکلی فراغت پاکر پھر چاہا کہ آدم کو پیدا کرے پس اس نے اس کو روز ششم یعنی جمعہ کے آخر حصہ میں پیدا کیا کیونکہ جو چیزیں از روئے نص قرآنی چھٹے دن پیدا ہوئی تھیں آدم ان سب کے بعد میں پیدا کیا گیا۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ سورہ حٰم السجدہ جزو چوبیس میں اس بات کی تصریح ہے کہ خدا نے جمعرات اور جمعہ کے دن سات آسمان بنائے اور ہر ایک آسمان کے ساکن کو جو اس آسمان میں رہتا تھا اس آسمان کے متعلق جو امر تھا وہ اس کو سمجھا دیا اور ورلے آسمان کو ستاروں کی قندیلوں سے سجایا اور نیز ان ستاروں کو اس لیے پیدا کیا کہ بہت سے امور حفاظت دنیا کے ان پر موقوف تھے یہ اندازے اس خدا کے باندھے ہوئے ہیں جو زبردست اور دانا ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۸ حاشیہ)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

ملایک | قادر مطلق نے دنیا کے حوادث کو صرف اسی ظاہری سلسلہ تک محصور اور محدود نہیں کیا بلکہ ایک باطنی سلسلہ ساتھ ساتھ جاری ہے۔ اگر آفتاب ہے یا ماہتاب یا زمین یا وہ بخارات جن سے پانی برستا ہے یا وہ آندھیاں جو زور سے آتی ہیں یا وہ اولے جو زمین پر گرتے ہیں یا وہ شہب ثاقبہ جو ٹوٹتے ہیں اگرچہ یہ تمام چیزیں اپنے کاموں اور تمام تغیرات اور تحولات اور حدوثات میں ظاہری اسباب بھی رکھتی ہیں جن کے بیان میں ہیئت اور طبعی کے دفتر بھرے پڑے ہیں لیکن با ایں ہمہ عارف لوگ جانتے ہیں کہ ان اسباب کے نیچے اور اسباب بھی ہیں جو مدبر بالارادہ ہیں جن کا دوسرے لفظوں میں نام ملایک ہے وہ جس چیز سے تعلق رکھتے ہیں اُس کے تمام کاروبار کو انجام تک پہنچاتے ہیں اور اپنے کاموں میں اکثر اُن روحانی اغراض کو مدنظر رکھتے ہیں جو مولیٰ کریم نے اُن کو سپرد کی ہیں اور اُن کے کام بیہودہ نہیں بلکہ ہر ایک کام میں بڑے بڑے مقاصد اُن کو مدنظر رہتے ہیں.....

حکیم مطلق نے اِس عالم کے احسن طور پر کاروبار چلانے کے لیے دو نظام رکھے ہوئے ہیں اور باطنی نظام فرشتوں کے متعلق ہے اور کوئی جز ظاہری نظام کی ایسی نہیں جس کے ساتھ درپردہ باطنی نظام نہ ہو...... اس عالم کی حرکات اور حوادث خود بخود نہیں اور نہ بغیر مرضی مالک اور نہ عبث اور بے ہودہ ہیں بلکہ درپردہ تمام اجرام علوی اور اجسام سفلی کے لیے منجانب اللہ مدبّر مقرر ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں ملایک کہتے ہیں اور جب تک کوئی انسان پابند اعتقاد وجود ہستی باری ہے اور دہریہ نہیں اُس کو ضرور یہ بات ماننی پڑے گی کہ یہ تمام کاروبار عبث نہیں بلکہ ہر یک حدوث اور ظہور پر خدا تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت بالارادہ کا ہاتھ ہے اور وہ ارادہ تمام انتظام کے موافق بتوسط اسباب ظہور پذیر ہوتا ہے چونکہ خدا تعالیٰ نے اجرام اور اجسام کو علم اور شعور نہیں دیا اس لیے اُن باتوں کے پورا کرنے کے لیے جن میں علم اور شعور درکار ہے ایسے اسباب یعنی ایسی چیزوں کی توسّط کی حاجت ہوئی جن کو علم اور شعور دیا گیا ہے اور وہ ملایک ہیں۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۲۴-۱۲۸ حاشیہ)

فرشتوں کا وجود ماننے کے لیے نہایت سہل اور قریب راہ یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی توجہ اس طرف مبذول کریں کہ یہ بات طے شدہ اور فیصل شدہ ہے کہ ہمارے اجسام کی ظاہری تربیت اور تکمیل کے لیے اور نیز اس کام کے لیے کہ تا ہمارے ظاہری حواس کے افعال مطلوبہ کما ینبغی صادر ہو سکیں خدا تعالیٰ نے یہ قانون قدرت رکھا ہے کہ عناصر اور

شمس و قمر اور تمام ستاروں کو اس خدمت میں لگا دیا ہے کہ وہ ہمارے اجسام اور قویٰ کو مدد پہنچا کر اُن سے بوجہ احسن ان کے تمام کام صادر کرا دیں اور ہم ان صداقتوں کے ماننے سے کسی طرف بھاگ نہیں سکتے کہ مثلاً ہماری آنکھ اپنی ذاتی روشنی سے کسی کام کو بھی انجام نہیں دے سکتی جب تک آفتاب کی روشنی اُس کے ساتھ شامل نہ ہو اور ہمارے کان محض اپنی قوت شنوائی سے کچھ بھی سُن نہیں سکتے جب تک کہ ہوا متکیف بصوت اُن کی ممد و معاون نہ ہو۔ پس کیا اس سے یہ ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ کے قانون نے ہمارے قوے کی تکمیل اسباب خارجیہ میں رکھی ہے اور ہماری فطرت ایسی نہیں ہے کہ اسباب خارجیہ کی مدد سے مستغنی ہو اگر غور سے دیکھو تو نہ صرف ایک دو بات میں بلکہ ہم اپنے تمام حواس تمام قوای تمام طاقتوں کی تکمیل کے لیے خارجی امدادات کے محتاج ہیں پھر جبکہ یہ قانون اور انتظام خدائے واحد لاشریک کا جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے ہمارے خارجی قویٰ اور حواس اور اغراض جسمانی کی نسبت نہایت شدت اور استحکام اور کمال التزام سے پایا جاتا ہے تو پھر کیا یہ بات ضروری اور لازمی نہیں کہ ہماری روحانی تکمیل اور روحانی اغراض کے لیے بھی یہی انتظام ہوتا دونوں انتظام ایک ہی طرز پر واقع ہو کر صانع واحد پر دلالت کریں اور خود ظاہر ہے کہ جس حکیم مطلق نے ظاہری انتظام کی یہ بنا ڈالی ہے اور اسی کو پسند کیا ہے کہ اجرام سماوی اور عناصر وغیرہ اسباب خارجیہ کے اثر سے ہمارے ظاہر اجسام اور قویٰ اور حواس کی تکمیل ہو اس حکیم قادر نے ہماری روحانیت کے لیے بھی یہی انتظام پسند کیا ہوگا کیونکہ وہ واحد لاشریک ہے اور اس کی حکمتوں اور کاموں میں وحدت اور تناسب ہے اور دلائل انّیہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ سو وہ اشیاء خارجیہ جو ہماری روحانیت پر اثر ڈال کر شمس اور قمر اور عناصر کی طرح جو اغراض جسمانی کے لیے ممد ہیں ہماری اغراض روحانی کو پورا کرتی ہیں انہیں کا نام ہم ملائک رکھتے ہیں پس اس تقریر سے وجود ملائک کا بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے۔ اور گو ہم پر ان کی کنہ کھل نہ سکے اور کھلنا کچھ ضرور بھی نہیں۔ لیکن اجمالی طور پر قانون قدرت کے توافق اور اتحاد پر نظر کر کے اُن کا وجود ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ کیونکہ جس حالت میں ہم نے بطیب خاطر ظاہری قانون کو مان لیا ہے۔ تو پھر کیا وجہ کہ ہم اُسی طرز اور طریق پر باطنی قانون کو تسلیم نہ کریں۔ بے شک ہمیں باطنی قانون بھی اسی طرح قبول کرنا پڑے گا کہ جس طرح ہم نے ظاہری قانون کو مان لیا۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۳۳-۱۳۵ حاشیہ)

قرآن کریم کی تعلیم کی رُو سے فرشتے نجوم اور شمس اور قمر اور آسمان کے لیے جان کی طرح ہیں اور قیام اور بقاء ان تمام چیزوں کا فرشتوں کے تعلق پر موقوف ہے۔ اور اُن کے اُرجاء کی طرف کھسک جانے سے تمام اجرام ستاروں اور شمس و قمر اور آسمان کو موت کی صورت پیش آتی ہے تو پھر اس صورت میں وہ جان کی طرح ہوئے یا کچھ اور ہوئے۔ میں ان مولویوں کی حالت پر سخت افسوس کرتا ہوں کہ جو ان تمام کھلے کھلے مقامات قرآنی کو دیکھ کر پھر بھی اس بات کے قبول کرنے سے متامل ہیں کہ ملائکہ کو اجرام سماوی بلکہ بعض فرشتوں کو جو عنصری ہیں عناصر اور اجرام سماوی سے ایسا شدید تعلق ہے کہ جیسا کہ ارواح کو قوالب کے ساتھ ہوتا ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۴۳-۱۴۴ حاشیہ)

معقولی طور پر اس بات کا ثبوت کہ نظام ظاہری میں جو کچھ امر خیر ہو رہا ہے اُن تمام امور کا ظہور و صدور دراصل ملایک کے افعال خفیہ سے ہے اِن امور پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے کہ ہر یک چیز سے اللہ جل شانہ وہ کام لیتا ہے جس کام کے کرنے کی اُس چیز کو قوتیں عطا کی گئی ہیں پس اب یہ خیال کرنا کہ ہر یک تغیر اجرام سماوی اور کائنات الجو کا صرف اسباب طبیعیہ خارجیہ سے ظہور میں آتا ہے اور کسی روحانی سبب کی ضرورت نہیں بالکل غیر معقول ہے کیونکہ اگر ایسا ہی ہوتا کہ یہ تغیرات اجرام سماوی اور حوادث کائنات الجو جو بڑے بڑے مصالح پر مشتمل اور بنی آدم کی بقا اور صحت اور ضرورات معاشرت کی اس شرط سے ممد و معاون ہیں کہ اِن میں افراط اور تفریط نہ پایا جائے اگر یہ خود بخود ہوتے اور ایسی ذی شعور چیزوں کا درمیان قدم نہ ہوتا جو ارادہ اور فہم اور مصلحت اور اعتدال کی رعایت کرسکتے ہیں اور ہمارا تمام کاروبار زندگی اور بقا اور ضرورات معاشرت کا صاف ایسی چیزوں پر چھوڑا جاتا جو نہ شعور رکھتے ہیں نہ ادراک اور نہ مصلحت وقت کو پہچان سکتے ہیں اور نہ اپنے کاموں کو افراط اور تفریط سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور نہ نیک انسان اور بد انسان میں فرق کرکے ہر یک کے ساتھ اُس کے مناسب حال معاملہ کرسکتے ہیں تو دُنیا میں اندھیر پڑ جاتا اور صانع حکیم و قدیر و عادل رحیم و کریم کا کچھ پتہ نہ لگتا بلکہ یہ سلسلہ ذی روحوں کی حیات کا جو زمین پر بستے ہیں ایک دم بھی چل نہ سکتا اور دنیا مع اپنے تمام لوازم کے اپنے خاتمہ کے صدمہ کو دیکھ لیتی پس اس سے صاف تر اور صریح تر اور روشن تر اور کیا دلیل ہوگی کہ اِس آسمانی اور کائنات الجو کے سلسلہ میں وہ گڑبڑ اور اندھیر نظر نہیں آتا جو اُس صورت میں ہوتا جبکہ تمام مدار اِس نظام کا بیجان اور بے شعور چیزوں پر ہوتا سو ہمیں اِس دلیل کی روشنی ملایک کے وجود اور اُن کی ضرورت کے ماننے کے لیے ایسی بصیرت بخشتی ہے کہ گویا ہم بچشم خود ملایک کے وجود کو دیکھ رہے ہیں۔

اور اگر کوئی اِس جگہ یہ شبہ پیش کرے کہ کیوں یہ بات روا نہیں کہ ملایک درمیان نہ ہوں اور ہر یک چیز خدا تعالیٰ کے حکم اور اذن اور تدبیر محکم سے وہی خدمت بجا لاوے جو اللہ جل شانہ کا منشا ہے تو ایسا شبہ درحقیقت غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوگا کیونکہ ہم ابھی پہلے اس سے لکھ چکے ہیں کہ یہ بات ایک ثابت شدہ صداقت ہے کہ اجرام علوی اور عناصر اور کائنات الجو جو ہماری بقا اور حیات اور معاشرت کے خادم ٹھہرائے گئے ہیں علم اور شعور اور ارادہ نہیں رکھتے پس صِرف اُنہیں کے تغیرات اور حوادث سے وہ کام اور وہ اغراض اور وہ مقاصد ہمارے لیے حاصل ہو جانا جو صرف عاقلانہ وزن اور تعدیل اور تدبیر اور مصلحت اندیشی سے صادر ہوسکتے ہیں بداہت ممتنع ہے خدا تعالیٰ جس چیز سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اول اُسی کام کے متعلق جس قدر مصالح ہیں اُن تمام مصالح کے مناسب حال اُس چیز میں قوتیں رکھ دیتا ہے۔ مثلاً ایک فعل خدا تعالیٰ کا بارش ہے جس کے انواع اقسام کے اغراض کے لیے ہمیں ضرورت ہے اور خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کے موافق کبھی اُس بارش کو عین وقتوں پر نازل کرتا ہے اور افراط تفریط کے نقصانوں سے ہمارے کھیتوں اور ہماری صحتوں کو بچا لیتا ہے اور کبھی دنیا پر کوئی تنبیہ نازل کرنا منظور ہوتا ہے تو بارش کو

جس ملک سے چاہے روک لیتا ہے یا اس میں افراط تفریط رکھ دیتا ہے کبھی ایک ملک یا ایک شہر یا ایک گاؤں یا ایک قطعہ زمین کو بعض آدمیوں کو سزا دینے کے لیے اُس بارش کے نفع سے بکلی محروم کر دیتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے فقط اُسی قدر بادل کو آسمان کی فضا میں پھیلاتا ہے یہاں تک کہ ایک کھیت میں بارش برستی ہے اور ایک دوسرا کھیت جو اُسی کے ساتھ ملحق ہے اس بارش کے ایک قطرہ سے بھی بہرہ یاب نہیں ہوتا اور خشک اور دھوپ میں سڑا ہوا رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی کبھی ایک ہوا کا بگڑنا ایک شہر یا ایک اقلیم یا ایک محلہ کو سخت وبا میں ڈالتا ہے اور دوسری طرف کو بکلی بچا لیتا ہے۔ اسی طرح ہم ہزارہا دقیق در دقیق ربانی مصالح دیکھتے ہیں جن کو ہم بے شعور عناصر اور اجرام کی طرف ہرگز منسوب نہیں کر سکتے اور یقیناً ہم جانتے ہیں کہ ایسے مصالح سے بھرے ہوئے کام صرف بے جان اور بے شعور اور بے تدبیر اجرام اور عناصر اور دوسری کائنات الجو سے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ بیشک خدا تعالیٰ اس بات پر تو قادر تھا کہ ان چیزوں سے یہ سب کام لے لیتا لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو اول ان چیزوں کو فہم اور ادراک اور شعور اور وضع الشی فی محلہ کی عقل بخشتا اور جبکہ یہ ثابت نہیں تو پھر ضرورتاً یہ ثابت ہے کہ ان کے ساتھ در پردہ اور چیزیں ہیں جن کو موضع الشی فی محلہ کی عقل دی گئی ہے اور وہی ملایک ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص جو خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان لاتا ہے اور اُس کو رحیم اور کریم اور مدبّر اور عادل سمجھتا ہے وہ ہرگز ایسا خیال نہیں کریگا کہ اُس حکیم و کریم نے اپنی ربوبیت کے نظام کا تمام کارخانہ ایسی چیزوں کے ہاتھ میں دیدیا ہے جن کو نیک و بد کی شناخت عطا نہیں ہوئی اور تدابیر اور تعدیل اور مصلحت شناسی کی قوتیں بخشی نہیں گئیں ہاں ایک طبعی اور دہری جو خدا تعالیٰ کے وجود سے ہی منکر ہے ضرور ایسا خیال کریگا مگر وہ ساتھ ہی غفلت کی وجہ سے یہ بھی کہے گا کہ جو کچھ اجرام سماوی یا عناصر اور کائنات الجو سے ظہور میں آرہا ہے وہ بر وفق حکمت اور مصلحت نہیں ہے اور نہ خدا موجود ہے تا اس کو حکمت اور مصلحت سے کام کرنے والا مان لیا جائے بلکہ اتفاقاً اجرام علوی اور سفلی کے حوادث اور تغیرات سے کبھی خیر اور کبھی شر انسانوں کے لیے پیش آجاتی ہے سو اس کے قائل کرنے کے لیے الگ طریق ہے جو بہت صاف اور جلد اُس کا منہ بند کرنے والا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے زبردست کام اور پیشگوئیاں جو ربانی طاقت اپنے اندر رکھتی ہیں جو ملہموں اور واصلان الٰہی کو دی جاتی ہیں اللہ جل شانہ کے وجود اور اس کی صفات کاملہ جمیلہ جلیلہ پر دلالت قویہ قطعیہ یقینیہ رکھتی ہیں لیکن افسوس کہ دُنیا میں صدق دل سے خدا تعالیٰ کو طلب کرنے والے اور اس کی معرفت کی راہوں کے بھوکے اور پیاسے بہت کم ہیں اور اکثر ایسے لوگوں سے دُنیا بھری پڑی ہے جو پکارنے والے کی آواز نہیں سنتے اور بلانے والے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور جگانے والے کے شور سے آنکھ نہیں کھولتے۔ ہم نے اس امر کی تصدیق کرانے کے لیے خدا تعالیٰ سے فضل اور توفیق اور اذن پا کر ہر ایک مخالف کو بُلایا مگر کوئی شخص دل کے صدق اور سچی طلب سے ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا اور اگر کوئی متوجہ ہوتا یا اب بھی ہو تو وہ زندہ خدا جس کی قدرتیں ہمیشہ عقلمندوں کو حیران کرتی رہی ہیں وہ قادر قیوم جو قدیم سے اس جہان کے حکیموں کو شرمندہ اور ذلیل

کر رہا ہے بلاشبہ آسمانی چمک سے اُس پر حجت قائم کریگا دنیا میں بڑی خرابی جو افعال شنیعہ کا موجب ہو رہی ہے اور آخرت کی طرف سر اُٹھانے نہیں دیتی در اصل یہی ہے کہ اکثر لوگوں کو جیسا کہ چاہیئے خدا تعالیٰ پر ایمان نہیں۔ بعض تو اس زمانہ میں کھلی کھلی ہستی باری تعالیٰ سے ہی منکر ہیں اور بعض اگرچہ زبان سے قائل ہیں مگر اُن کے اعمال اور خیال اور ہاتھ اور پیر گواہی دے رہے ہیں کہ وہ اللہ جلّ شانہ پر ایمان نہیں رکھتے اور دن رات دنیا کی فکروں میں ایسے لگے ہوئے ہیں کہ مرنا بھی یاد نہیں۔ اس کا بھی یہی سبب ہے کہ اکثر دلوں پر ظلمت چھا گئی ہے اور نور معرفت کا ایک ذرا دلوں میں باقی نہیں رہا۔

اب واضح ہو کہ ہم ملایک کی ضرورت وجود کا ثبوت بکلی دے چکے جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جو اپنے تنزہ اور تقدس میں ہریک برتر سے برتر ہے اپنی تدلیات اور تجلیات میں مظاہر مناسبہ سے کام لیتا ہے اور چونکہ جسم اور جسمانی چیزیں اپنے ذاتی خواص اور اپنی ہستی کی کامل تقییدات سے مقید ہو کر اور بمقابل ہستی اور وجود باری اپنا نام ہست اور موجود رکھا کر اور اپنے ارادوں یا اپنے طبعی افعال سے اختصاص پا کر اور ایک وجود جامع ہویّت نفس اور مانع ہویّت غیر بن کر ذات علت العلل اور فیاض مطلق سے دور جا پڑے ہیں اور اُن کے وجود کے گرداگرد اپنی ہستی اور انانیّت کا اور مخلوقیت کا ایک بہت ہی موٹا حجاب ہے اس لیے وہ اس لائق نہیں رہیں کہ ذات احدیت کے وہ فیضان براہ راست اُن پر نازل ہو سکیں جو صرف اس صورت میں نازل ہو سکتے ہیں کہ جب حجب مذکورہ بالا درمیان نہ ہوں اور ایک ایسی ہستی ہو جو بکلی نیستی کے مشابہ ہو کیونکہ ان تمام چیزوں کی ہستی نیستی کے مشابہ نہیں ہر ایک چیز اس قسم کی مخلوقات میں سے بزبان حال اپنی ہستی کا بڑے زور و شور سے اقرار کر رہی ہے۔ آفتاب کہہ رہا ہے کہ میں وہ ہوں جس پر تمام گرمی و سردی و روشنی کا مدار ہے جو ۳۶۵ صورتوں میں تین سو پینسٹھ قسم کی تاثیریں دُنیا میں ڈالتا ہے اور اپنی شعاعوں کے مقابلہ سے گرمی اور اپنے انحراف شعاعوں سے سردی پیدا کرتا ہے اور اجسام اور اجسام کے مواد اور اجسام کی شکلوں اور حواس پر اپنی حکومت رکھتا ہے۔ زمین کہہ رہی ہے کہ میں وہ ہوں کہ جس پر ہزار ہا ملک آباد ہیں۔ اور جو طرح طرح کی نباتات پیدا کرتی اور طرح طرح کے جواہر اپنے اندر طیار کرتی اور آسمانی تاثیرات کو عورت کی طرح قبول کرتی ہے۔ آگ بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ میں ایک جلانے والی چیز ہوں۔ اور بالخاصیت قوتِ احراق میرے اندر ہے اور اندھیرے میں قائمقام آفتاب ہوں اسی طرح زمین کی ہر ایک چیز بزبانِ حال اپنی ثنا کر رہی ہے مثلاً سنا کہتی ہے کہ میں دوسرے درجہ کے آخری حصہ میں گرم اور اول درجہ میں خشک ہوں اور بلغم اور سودا اور صفرا اور اخلاط سوختہ کا مسہل ہوں اور دماغ کی منقی ہوں اور صرع اور شقیقہ اور جنون اور صداع کہنہ و درد پہلو و ضیق النفس و قولنج و عرق النساء و نقرس و تشنج عضل و داء الثعلب و داء الحیہ اور حکہ اور جرب اور بثور کہنہ اور اوجاع مفاصل بلغمی و صفراوی مخلوط باہم اور تمام امراض سوداوی کو نافع ہوں اور ریوند بول رہی ہے کہ میں مرکّب القویٰ ہوں

اور دوسرے درجہ کی پہلے مرتبہ میں گرم اور خشک ہوں اور بالعرض مبرّد بھی بوجہ شدّت تحلیل ہوں اور رطوبات فضلیہ اپنے اندر رکھتی ہوں مجفّف ہوں قابض ہوں جالی ہوں اور منضج اور مقطع مواد لزجہ ہوں اور سموم باردہ کا تریاق ہوں خاصکر عقرب کے لیے اور اخلاط غلیظہ اور رقیقہ کا مسہل ہوں اور حیض اور بول کی مدر ہوں اور جگر کو قوت دیتی ہوں اور اُس کے اور نیز طحال اور امعاء کے سدے کھولتی ہوں اور ریحوں کو تحلیل کرتی ہوں اور پرانی کھانسی کو مفید ہوں اور ضیق النفس اور سل اور قرحہ ریہ وامعاء اور استسقا کی تمام قسموں اور یرقان سدی اور اسہال سدی اور ماساریقا اور ذوسنطاریا اور تحلیل نفخ اور ریاح اور اورام باردہ احشا وتخمہ ومغص وبواسیر ونواسیر وتپ ربع کو مفید ہوں اور جُدوار کہتی ہے کہ میں تیسرے درجہ کے اوّل مرتبہ میں گرم اور خشک ہوں اور حرارتِ غریزی سے بہت ہی مناسبت رکھتی ہوں اور مفرح اور مُقوّیِ قُوٰی اور اعضاءِ رئیسہ دل اور دماغ اور کبد ہوں اور احشاء کی تقویت کرتی ہوں اور تمام گرم اور سرد زہروں کا تریاق ہوں اور اسی وجہ سے زرنباد اور مشک اور زنجبیل کا قلیل حصہ اپنے ساتھ ملاکر تیزاب گوگرد اور آب قاقلہ سفید اور آب پودینہ اور آب بادیان کے ساتھ ہیضہ وبائی کو باذن اللّٰہ بہت مفید ہوں اور مسکن اوجاع اور مقوی باصرہ ہوں اور تفتیت حصاۃ اور قلع قولنج وعسر البول ورفع تپ ربع میں نفع رکھتی ہوں۔ اور بقدر نیم مثقال گزیدہ مار اور عقرب کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہوں یہاں تک کہ عقرب جرارہ کی بھی زہر دور کرتی ہوں اور بید مشک اور عرق نیلوفر کے ساتھ دل کے ضعف کو بہت جلد نفع پہنچاتی ہوں اور کم ہوتی ہوئی نبض کو تھام لیتی ہوں اور گلاب کے ساتھ وجع مفاصل کو مفید ہوں اور سنگ گردہ اور مثانہ کو نافع ہوں اگر بول بند ہوجائے تو شیرہ تخم خیارین کے ساتھ جلد اُس کو کھول دیتی ہوں اور قولنج ریحی کو مفید ہوں اور اگر بچہ پیدا ہونے میں مشکل پیش آجائے تو آب عنب الثعلب یا حلبہ یا شیرہ خارخسک کے ساتھ صرف دو دانگ پلانے سے وضع حمل کرادیتی ہوں اور ام الصبیان اور اکثر امراض دماغی و اعصابی کو مفید ہوں اور اورام مغابن یعنے پس گوش اور زیر بغل اور بن ران اور خناق اور خنازیر اور تمام اورام گلو کو نفع پہنچاتی ہوں اور طاعون کے لیے مفید ہوں اور سرکہ کے ساتھ پلکوں کے ورم کو نفع دیتی ہوں اور دانتوں پر ملنے سے اُن کے اس درد کو دور کردیتی ہوں جو بوجہ مادہ باردہ ہو اور بواسیر پر ملنے سے اس کی درد کو ساکن کردیتی ہوں اور آنکھ میں چکانے سے رمد بارد کو دور کردیتی ہوں اور احلیل میں چکانے سے نافع حبس البول ہوں اور مشک وغیرہ ادویہ مناسبہ کے ساتھ باہ کے لیے سخت مؤثر ہوں اور صرع اور سکتہ اور فالج اور لقوہ اور استرخاء اور رعشہ اور خدر اور اس قسم کی تمام امراض کو نافع ہوں اور اعصاب اور دماغ کے لیے ایک اکسیر ہوں اور اگر میں نہ ملوں تو اکثر باتوں میں زرنباد میرا قائمقام ہے۔

غرض یہ تمام چیزیں بزبان حال اپنی اپنی تعریف کر رہی ہیں اور محجوب بانفسہا ہیں یعنی اپنے خواص کے پردہ میں محجوب ہیں اس لیے مبدء فیض سے دور پڑ گئی ہیں اور بغیر ایسی چیزوں کی توسط کے جو ان حجابوں سے منزہ ہوں مبدء فیض کا کوئی ارادہ اُن سے تعلق نہیں پکڑ سکتا کیونکہ حجاب اُس فیض سے مانع ہے اس لیے خداتعالیٰ کی حکمت

نے تقاضا کیا کہ اس کی ارادات کا مظہر اول بننے کے لیے ایک ایسی مخلوق ہو جو محجوب بنفسہ نہ ہو بلکہ اس کی ایک ایسی نرالی خلقت ہو جو برخلاف اور چیزوں کے اپنی فطرت سے ہی ایسی واقع ہو کہ نفس حاجب سے خالی اور خداتعالیٰ کے لیے اس کی جوارح کی طرح ہو اور خداتعالیٰ کے جمیع ارادات کے موافق جو مخلوق اور مخلوق کے کل عوارض سے تعلق رکھتے ہیں اُس کی تعداد ہو اور وہ نرالی پیدائش کی چیزیں مرایا صافیہ کی طرح اپنی فطرت رکھ کر ہر وقت خداتعالیٰ کے سامنے کھڑی ہوں اور اپنے وجود میں ذو جہتین ہوں ایک جہت تجرد اور تنزہ کی جو اپنے وجود میں وہ نہایت الطف اور منزہ عن الحجب ہوں جس کی وجہ سے وہ دوسری مخلوق سے نرالی اور خداتعالیٰ کے وجود سے ظلی طور پر مشابہت تامہ رکھتی ہوں اور محجوب بانفسہا نہ ہوں۔ دوسری جہت مخلوقیت کی جس کی وجہ سے وہ دوسری مخلوقات سے مناسبت رکھیں اور اپنی تاثیرات کے ساتھ اُن سے نزدیک ہو سکیں سو خداتعالیٰ کے اِس ارادہ سے اس عجیب مخلوق کا وجود ہو گیا جس کو ملایک کہتے ہیں۔ یہ ملایک ایسے فنا فی طاعت اللہ ہیں کہ اپنا ارادہ اور فیشن اور توجہ اور اپنے ذاتی قویٰ یعنی یہ کہ اپنے نفس سے کسی پر مہربان ہونا یا اُس سے ناراض ہو جانا اور اپنے نفس سے ایک بات کو چاہنا یا اس سے کراہت کرنا کچھ بھی نہیں رکھتے بلکہ بکلی جوارح الحق کی طرح ہیں خداتعالیٰ کے تمام ارادے اول انہیں کے مرایا صافیہ میں منعکس ہوتے ہیں اور پھر ان کے توسط سے کل مخلوقات میں پھیلتے ہیں چونکہ خداتعالیٰ بوجہ اپنے تقدس تام کے نہایت تجرّد اور تنزہ میں ہے اس لیے وہ چیزیں جو انانیت اور ہستی محجوبہ کی کثافت سے خالی نہیں اور محجوب بانفسہا ہیں اُس مبدء فیض سے کچھ مناسبت نہیں رکھتیں اور اسی وجہ سے ایسی چیزوں کی ضرورت پڑی جو من وجہ خداتعالیٰ سے مناسبت رکھتی ہوں اور من وجہ اس کی مخلوق سے تا اُس طرف سے فیضان حاصل کریں اور اس طرف پہنچا دیں یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی اپنے وجود اور قیام اور حرکت اور سکون اور اپنے تغیرات ظاہری اور باطنی اور اپنے ہر یک خاصہ کے اظہار اور اپنے ہر ایک عرض کے اخذ یا ترک میں مستقل بالذات نہیں بلکہ اُس ایک ہی حیّ قیوم کے سہارے سے یہ تمام کام مخلوق کے چلتے ہیں اور بظاہر اگرچہ یہی نظر آتا ہے کہ ہم اپنے کاموں میں کسی غیبی مدد کے محتاج نہیں جب چاہیں حرکت کر سکتے ہیں اور جب چاہیں ٹھہر سکتے ہیں اور جب چاہیں بول سکتے ہیں اور جب چاہیں چپ کر سکتے ہیں لیکن ایک عارفانہ نظر کے ساتھ ضرور کھل جائے گا کہ ہم اپنی ان تمام حرکات و سکنات اور سب کاموں میں غیبی مدد کے ضرور محتاج ہیں اور خداتعالیٰ کی قیّومیت ہمارے نطفہ میں ہمارے علقہ میں ہمارے مضغہ میں ہمارے جنین میں اور ہماری ہر یک حرکت میں اور سکون میں اور قول میں اور فعل میں غرض ہماری تمام مخلوقیت کے لوازم میں کام کرتی ہے مگر وہ قیومیت بوجہ ہمارے محجوب بالنفس ہونے کے براہ راست ہم پر نازل نہیں ہوتی کیونکہ ہم میں اور اُس ذات الطف اللطائف اور اعلیٰ اور اغنی اور نور الانوار میں کوئی مناسبت درمیان نہیں کیونکہ ہر ایک چیز ہم میں سے خواہ وہ جاندار ہے یا بیجان محجوب بنفسہ اور ساحت قدسیہ تنزّہ سے بہت دور ہے اِس لیے خداتعالیٰ میں اور ہم میں ملایک کا وجود اسی طرح ضروری ہوا جیسا کہ نفس ناطقہ اور بدن انسان میں قوائے رُوحانیہ اور حسّیہ کا توسط ضروری ٹھہرا

کیونکہ نفس ناطقہ نہایت تجرّد اور لطافت میں تھا اور بدن انسان محجوب بنفسہ اور کثافت اور ظلمت میں پڑا تھا اس لیے خدا تعالیٰ نے اِن دونوں کے درمیان میں قُویٰ روحانیہ اور حسّیہ کو ذوجہتین پیدا کیا تا وہ قُویٰ نفس ناطقہ سے فیضان قبول کرکے تمام جسم کو اس سے متادب اور مہذّب کریں۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۴۶-۱۷۳ حاشیہ)

ملایک کی نسبت جو اجرام علوی اور اجسام سفلی کی طرف ہے وہ درحقیقت ایسی ہی ہے جیسے قُویٰ روحانیہ اور حسیہ کی نسبت بدن انسان کی طرف ہے کیونکہ جیسا کہ نفس ناطقہ انسان کا بدن انسان کی تدبیر بتوسّط قویٰ رُوحانیہ اور حسّیہ کے کرتا ہے ایسا ہی قیوم العالم جو تمام عالم کے بقا اور قیام کے لیے نفس مدبّرہ کی طرح اور بحکم آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] اُن کی حیات کا نور ہے تدبیر عالم کبیر کی بواسطہ ملایک کے فرماتا ہے اور ہمیں اس بات کے ماننے سے چارہ نہیں کہ جو کچھ عالم صغیر میں ذات واحد لاشریک کا نظام ثابت ہوا ہے اُسی کے مشابہ عالم کبیر کا بھی نظام ہے کیونکہ یہ دونو عالم ایک ہی ذات سے صادر ہیں اور اُس ذات واحد لاشریک کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے کہ دونوں نظام ایک ہی شکل اور طرز پر واقع ہوں تا دونوں مل کر ایک ہی خالق اور صانع پر دلالت کریں کیونکہ توحید فی النظام توحید باری عزّ اسمہٗ کے مسئلہ کو مویّد ہے وجہ یہ کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کئی خالق ہوتے تو اِس نظام میں اختلاف کثیر پایا جاتا۔ غرض یہ بات نہایت سیدھی اور صاف ہے کہ ملایک اللہ عالم کبیر کے لئے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے قُویٰ روحانیہ وحسّیہ نشاء انسانیہ کے لیے جو عالم صغیر ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۲۶-۱۷۷ حاشیہ)

صرف ہمارے قُویٰ ہماری انسانیت کی کل چلانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ ضرور ہمیں خارجی مُمِدّوں اور معاونوں کی حاجت ہے مگر قانون قدرت ہمیں بتلا رہا ہے کہ وہ خارجی ممد و معاون اگرچہ بلحاظ علت العلل ہونے کے خدا تعالیٰ ہی ہے مگر اُس کا یہ انتظام ہرگز نہیں ہے کہ وُہ بلا توسط ہمارے قُویٰ اور اجسام پر اثر ڈالتا ہے بلکہ جہاں تک ہم نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قدر ہم اپنے فکر اور ذہن اور سوچ سے کام لیتے ہیں صریح اور صاف اور بدیہی طور پر ہمیں نظر آتا ہے کہ ہریک فیضان کے لیے ہم میں اور ہمارے خداوند کریم میں علل متوسّط ہیں جن کے توسط سے ہریک قُوت اپنی حاجت کے موافق فیضان پاتی ہے پس اسی دلیل سے ملایک اور جنات کا وجود بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم نے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ خیر اور شر کے اکتساب میں صرف ہمارے ہی قُویٰ کافی نہیں بلکہ خارجی ممدات اور معاونات کی ضرورت ہے جو خارق عادت اثر رکھتے ہوں مگر وہ ممد اور معاون خدا تعالیٰ براہ راست اور بلا توسّط نہیں بلکہ بتوسط بعض اسباب ہے سو قانون قدرت کے ملاحظہ نے قطعی اور یقینی طور پر ہم پر کھول دیا کہ وہ ممدّات اور معاونات خارج میں موجود ہیں گو اُن کی کنہ اور کیفیت ہم کو معلوم ہو یا نہ ہو مگر یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ نہ براہ راست خدا تعالیٰ ہے اور نہ ہماری ہی قوتیں اور ہمارے ہی ملکے ہیں بلکہ وہ اِن دونوں قسموں سے الگ ایسی مخلوق چیزیں ہیں جو ایک مستقل وجود اپنا رکھتی ہیں اور جب ہم

---

[1] النور: ۳۶

اِن میں سے کسی کا نام داعی الی الخیر رکھیں گے تو اسی کو ہم روح القدس یا جبرائیل کہیں گے اور جب ہم اُن میں سے کسی کا نام داعی الی الشر رکھیں گے تو اُسی کو ہم شیطان اور ابلیس کے نام سے بھی موسوم کریں گے۔ یہ تو ضرور نہیں کہ ہم روح القدس یا شیطان ہر یک تاریک دل کو دکھلا دیں اگرچہ عارف اُن کو دیکھ بھی لیتے ہیں اور کشفی مشاہدات سے وہ دونوں نظر بھی آجاتی ہیں مگر محجوب کے لیے جو ابھی نہ شیطان کو دیکھ سکتا ہے نہ روح القدس کو یہ ثبوت کافی ہے کیونکہ متاثر کے وجود سے مؤثر کا وجود ثابت ہوتا ہے اور اگر یہ قاعدہ صحیح نہیں ہے تو پھر خدا تعالیٰ کے وجود کا بھی کیونکر پتہ لگ سکتا ہے کیا کوئی دکھلا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کہاں ہے صرف متاثرات کی طرف دیکھ کر جو اس کی قدرت کے نمونے ہیں اس مؤثر حقیقی کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ ہاں عارف اپنے انتہائی مقام پر روحانی آنکھوں سے اُس کو دیکھتے ہیں اور اُس کی باتوں کو بھی سُنتے ہیں مگر محجوب کے لیے بجز اس کے اور استدلال کا طریق کیا ہے کہ متاثرات کو دیکھ کر اُس مؤثر حقیقی کے وجود پر ایمان لاوے سو اسی طریق سے روح القدس اور شیاطین کا وجود ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف ثابت ہوتا ہے بلکہ نہایت صفائی سے نظر آجاتا ہے افسوس اُن لوگوں کی حالت پر جو فلسفہ باطلہ کی ظلمت سے متاثر ہو کر ملایک اور شیاطین کے وجود سے انکار کر بیٹھتے ہیں اور بینات اور نصوص صریحہ قرآن کریم سے انکار کر دیا اور نادانی سے بھرے ہوئے الحاد کے گڑھے میں گر پڑے۔ اور اس جگہ واضح رہے کہ یہ مسئلہ اُن مسائل میں سے ہے جن کے اثبات کے لیے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی استنباط حقائق میں اس عاجز کو متفرد کیا ہے۔ فالحمدُ للہ علیٰ ذالک۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۸۵-۸۹)

واضح ہو کہ یہ خیال کہ فرشتے کیوں نظر نہیں آتے بالکل عبث ہے فرشتے خدا تعالیٰ کے وجود کی طرح نہایت لطیف وجود رکھتے ہیں پس کس طرح ان آنکھوں سے نظر آویں کیا خدا تعالیٰ جس کا وجود ان فلسفیوں کے نزدیک بھی مسلّم ہے ان فانی آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ ماسوا اس کے یہ بات بھی درست نہیں کہ کسی طرح نظر ہی نہیں آ سکتے کیونکہ عارف لوگ اپنے مکاشفات کے ذریعہ سے جو اکثر بیداری میں ہوتے ہیں فرشتوں کو روحانی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور اُن سے باتیں کرتے ہیں اور کئی علوم اُن سے اخذ کرتے ہیں اور مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور جو مفتری کذاب کو بغیر ذلیل اور معذب کرنے کے نہیں چھوڑتا کہ میں اس بیان میں صادق ہوں کہ بارہا عالم کشف میں میں نے ملایک کو دیکھا ہے اور اُن سے بعض علوم اخذ کیے ہیں اور اُن سے گذشتہ یا آنیوالی خبریں معلوم کی ہیں جو مطابق واقعہ تھیں پھر میں کیونکر کہوں کہ فرشتے کسی کو نظر نہیں آ سکتے بلاشبہ نظر آ سکتے ہیں مگر اور آنکھوں سے اور جیسے یہ لوگ ان باتوں پر ہنستے ہیں عارف اِن کی حالتوں پر روتے ہیں۔ اگر صحبت میں رہیں تو کشفی طریقوں سے مطمئن ہو سکتے ہیں لیکن مشکل تو یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی کھوپری میں ایک قسم کا تکبر ہوتا ہے وہ تکبر انہیں اس قدر بھی اجازت نہیں دیتا کہ انکسار اور تذلل اختیار کر کے طالب حق بن کر حاضر ہو جائیں۔

اور یہ خیالات کہ ہمیں فرشتوں کے کاموں کا کیوں کچھ احساس نہیں ہوتا۔ دراصل پہلے اعتراض کی ایک فرع

ہیں محجوب ہونے کی حالت میں جیسے فرشتے نظر نہیں آتے اور جیسے خدا تعالیٰ کا بھی کچھ پتہ نہیں لگتا صرف اپنے خیالات پر سارا مدار ہوتا ہے ایسا ہی فرشتوں کے کاموں کا بھی جو روحانی ہیں کچھ احساس نہیں ہوتا اس جگہ یہ مثل ٹھیک آتی ہے کہ ایک اندھے نے آفتاب کے وجود سے انکار کر دیا تھا کہ ٹٹولنے سے اِس کا کچھ پتہ نہیں ملتا تب آفتاب نے اُس کو مخاطب کر کے کہا کہ اے اندھے میں ٹٹولنے سے معلوم نہیں ہو سکتا کیونکہ تیرے ہاتھوں سے بہت دور ہوں تو یہ دعا کر کہ خدا تعالیٰ تجھ کو آنکھیں بخشے تب تو آنکھوں کے ذریعہ سے مجھے دیکھ لیگا اور یہ خیال کہ اگر مدبّرات اور مقسمات امر فرشتے ہیں تو پھر ہماری تدبیریں کیوں پیش جاتی ہیں اور کیوں اکثر امور ہمارے معالجات اور تدبیرات سے ہماری مرضی کے موافق ہو جاتے ہیں تو اِس کا یہ جواب ہے کہ وہ ہمارے معالجات اور تدبیرات بھی فرشتوں کے دخل اور القاء اور الہام سے خالی نہیں ہیں جس کام کو فرشتے باذنہٖ تعالیٰ کرتے ہیں وہ کام اُس شخص یا اُس چیز سے لیتے ہیں جس میں فرشتوں کی تحریکات کے اثر کو قبول کرنے کا فطرتی مادہ ہے مثلاً فرشتے جو ایک کھیت یا ایک گاؤں یا ایک ملک میں باذنہٖ تعالیٰ پانی برسانا چاہتے ہیں تو وہ آپ تو پانی نہیں بن سکتے اور نہ آگ سے پانی کا کام لے سکتے ہیں بلکہ بادل کو اپنی تحریکات جاذبہ سے محل مقصود پر پہنچا دیتے ہیں اور مدبّرات امر ان کو جس کمّ اور کیف اور حد اور اندازہ تک ارادہ کیا گیا ہے برسا دیتے ہیں بادل میں وہ تمام قوّتیں موجود ہوتی ہیں جو ایک بیجان اور بے ارادہ اور بے شعور چیز میں باعتبار اُس کی جمادی حالت اور عنصری خاصیت کے ہو سکتی ہیں اور فرشتوں کی منصبی خدمت دراصل تقسیم اور تدبیر ہوتی ہے اسی لیے وہ مقسمات اور مدبّرات کہلاتے ہیں اور القاء اور الہام بھی جو فرشتے کرتے ہیں وہ بھی برعایت فطرت ہی ہوتا ہے مثلاً وہ الہام جو خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر وہ نازل کرتے ہیں دوسروں پر نہیں کر سکتے بلکہ اُس طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور اسی قاعدہ کے موافق ہر یک شخص اپنے اندازہ استعداد پر فرشتوں کے القا سے فیض یاب ہوتا ہے اور جس فن یا علم کی طرف کسی کا رُوئے خیال ہے اُسی میں فرشتہ سے مدد پاتا ہے مثلاً جب اللہ جلّ شانہٗ کا ارادہ ہوتا ہے کہ کسی دوا سے کسی کو دست آویں تو طبیب کے دل میں فرشتہ ڈال دیتا ہے کہ فلاں مُسہل کی دوا اُس کو کھلا دو تب وہ تربد یا خیار شیر یا شیر خشت یا سقمونیا یا سنا یا کشٹر آئل یا کوئی اور چیز جیسے دل میں ڈالا گیا ہو اُس بیمار کو بتلا دیتا ہے اور پھر فرشتوں کی تائید سے اُس دوا کو طبیعت قبول کر لیتی ہے قے نہیں آتی تب فرشتے اُس دوا پر اپنا اثر ڈال کر بدن میں اُس کی تاثیرات پہنچاتے ہیں اور مادہ موذیہ کا اخراج باذنہٖ تعالیٰ شروع ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے نہایت حکمت اور قدرت کاملہ سے سلسلہ ظاہری علوم و فنون کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا اور اپنی خدائی کے تصرفات اور دائمی قبضہ کو بھی معطل نہیں رکھا اور اگر خدا تعالیٰ کا اس قدر دقیق در دقیق تصرف اپنی مخلوق کے عوارض اور اُس کی بقا اور فنا پر نہ ہوتا تو وہ ہرگز خدا نہ ٹھہر سکتا اور نہ توحید درست ہو سکتی ہاں یہ بات درست ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس عالم میں نہیں چاہا کہ یہ تمام اسرار عام نظروں میں بدیہی ٹھہر جاویں کیونکہ اگر یہ بدیہی ہوتے تو پھر اُن پر ایمان لانے کا کچھ بھی ثواب نہ ہوتا مثلاً اگر لوگ خدا تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ

لینے اور اُس کے فرشتوں کا مشاہدہ کر لیتے تو پھر یہ معلومات بھی اُن تمام معلومات کی مدّ میں داخل ہو جاتے جو انسان بذریعہ حواس یا تجارب حاصل کرتا ہے اِس صورت میں اُن امور کا ماننا موجب نجات نہ ٹھہر سکتا جیسا کہ اور دوسرے صدہا امور معلومہ کا ماننا موجب نجات نہیں ہے مثلاً ہم اِس بات کو مانتے ہیں کہ درحقیقت سورج اور چاند موجود ہیں اور زمین پر صدہا قسم کے جانور صدہا قسم کی بُوٹیاں صدہا قسم کی کانیں اور دریا اور پہاڑ موجود ہیں مگر کیا اِس ماننے سے ہمیں کوئی ثواب حاصل ہوگا یا ہم اِن چیزوں کا وجود قبول کرنے سے خدا تعالیٰ کے مُقرّب ہو جائیں گے ہرگز نہیں پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے فرشتوں کو مانتا ہے بہشت اور دوزخ کے وجود پر ایمان لاتا ہے اور قیامت میں میزانِ عمل کو قبول کرتا ہے قیامت کی پُل صراط پر صدق دل سے یقین رکھتا ہے اور اِس حقیقت کو مانتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو دنیا میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے رسول بھی ہیں جو دُنیا میں آئے ہیں اور اس کی طرف سے حشر اجسام بھی ہے جو ایک دن ہوگا اور خدا بھی موجود ہے جو درحقیقت واحد لاشریک ہے تو وہ شخص عنداللہ قابل نجات ٹھہر جاتا ہے۔ پیارو! یقیناً سمجھو کہ اس کی یہی وجہ ہے کہ یہ شخص خدا تعالیٰ پر جو ہنوز درپردہ غیب ہے ایمان لاتا ہے اور اُس کی کتاب کے اخبارِ غیبیہ کو صحیح سمجھتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک راستباز اور نیک خیال اور نیک ظن اور فرمانبردار ٹھہرتا ہے تب اِس صدق کی برکت سے بخشا جاتا ہے ورنہ مجرّد معلومات کو نجات سے تعلق ہی کیا ہے کیا اگر کوئی روز قیامت میں کُل حجابوں کے رفع کے بعد یہ کہے کہ یہ بہشت اور دوزخ جو سامنے نظر آ رہا ہے اور یہ ملایک جو صف باندھے کھڑے ہیں اور یہ میزان جس سے عمل تُل رہے ہیں اور یہ رب العالمین جو عدالت کر رہا ہے اِن سب باتوں پر اب میں ایمان لایا تو کیا ایسے ایمان سے وہ رہا ہو جائے گا ہرگز نہیں پس اگر رہا نہیں ہوگا تو اس کا سبب کیا ہے کیا اِس کا یہ سبب نہیں کہ اُس وقت اُس نے اُن تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جو پہلے اِس سے پردہ غیب میں تھیں اس لیے وہ موقعہ ثواب کا ہاتھ سے جاتا رہا جو صرف اُسی شخص کو مل سکتا ہے جو اُن بدیہی ثبوتوں سے بے خبر ہو اور محض قرائن دقیقہ سے استنباط کر کے بات کی اصلیت تک پہنچ گیا ہو سو افسوس کہ وہ لوگ جو فلسفہ پر مرے جاتے ہیں اُن کی عقلوں پر یہی پردہ پڑا ہوا ہے کہ وہ اِس بات کو نہیں سوچتے کہ اگر علم ذات باری اور علم وجود ملایک اور علم حشر اجسام اور علم جنت وجہنم اور علم نبوّت اور رسالت ایسے مانجھے جاتے اور صاف کیے جاتے اور بدیہی طور پر دکھلائے جاتے کہ جیسے علوم ہندسہ وحساب اور بعض حصے علوم طبعی اور طبابت اور ہیئت صاف کیے گئے ہیں تو پھر ایسے علوم بدیہیہ ضروریہ کو نجات انسانی سے تعلق ہی کیا تھا جبکہ نجات کی یہ حقیقت ہے کہ وہ اللہ جل شانہٗ کا محبّت اور پیار سے بھرا ہوا ایک فضل ہے جو راستبازوں اور صادقوں اور سچے ایمانداروں اور کامل وفاداروں اور اخبارِ ظنّیہ کے ماننے والوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر علوم بدیہیہ ضروریہ کا ماننا کس راست بازی اور صدق اور صفا کو ثابت کر سکتا ہے ہم صریح دیکھتے ہیں کہ جیسے ہم اس بات کے قائل ہیں کہ چار کا نصف دو ہیں ایسا ہی ایک اول درجہ کا بدمعاش بھی اس بات کا قائل ہوتا ہے ہم دنیا

ہیں ہزار ہا بلکہ کروڑ ہا چیزوں کو یقینی اور قطعی طور پر مانتے ہیں اور اُن کے وجود میں ذرّہ شک نہیں کرتے تو کیا اُن کے ماننے سے کوئی ثواب ہمیں مل سکتا ہے ہرگز نہیں یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے نشانوں کو بھی ایسے بدیہی طور سے اپنے نبیوں کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جیسے ہمیشہ سے دُنیا کے جاہل لوگ تقاضا کر رہے ہیں بلکہ جن کی استعدادوں پر پردہ تھا اُن پر ابتلا کا پردہ بھی ڈال دیا گیا جیسا کہ یہ ذکر قرآن کریم میں موجود ہے کہ مکّہ کے جاہل یہ درخواست کرتے تھے کہ ہم اِس شرط پر ایمان لاسکتے ہیں کہ عرب کے تمام مردے زندہ کیے جائیں یا یہ کہ ہمارے روبرو ایک زینہ لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہمارے روبرو ہی آسمان سے اُترو اور کتاب الٰہی ساتھ لاؤ جس کو ہم ہاتھ میں لیکر پڑھ لیں اور وہ نادان نہیں سمجھتے تھے کہ اگر انکشاف حقیقت اِس قدر ہو جائے تو پھر اِس عالم اور قیامت میں فرق کیا رہا اور ایسے بدیہی نشانوں کے بعد اُس قبول پر ایمان کا لفظ کیونکر اطلاق کریں گے کون شخص ہے جو حقائق بدیہیہ بیّنہ کو قبول نہیں کرتا غرض فلسفہ والوں کے خیالات کی بنیاد ہی غلط ہے وہ چاہتے ہیں کہ کُل ایمانیات کو علوم مشہودہ محسوسہ میں داخل کر دیں اور ملائک اور جنّت اور جہنّم اور خدا تعالیٰ کا وجود ایسا ثابت ہو جائے جیسا کہ آج کل کی تحقیقاتوں سے اکثر معمورہ ارض اور بہت سی نباتات اور کانوں کا پتہ لگ گیا ہے مگر جس چیز کو خدا تعالیٰ نے اوّل روز سے انسان کی نجات کا ایک طریق نکالنے کے لیے ایمانیات میں داخل کر دیا ہے وہ کیونکر برخلاف ارادہ الٰہی اِس درجہ کی ہدایت تک پُہنچ جائے ہاں جب انسان ایمان کے درجہ سے عرفان کے مرتبہ پر ترقی کرتا ہے تو بلاشُبہ یہ تمام امور بداہت کے رنگ میں نظر آتے ہیں بلکہ ہندسی ثبوتوں سے بڑھ کر اُن کا ثبوت ہوتا ہے کیونکہ ہندسی ثبوت اکثر دوائر موہومہ پر مبنی ہیں مگر دینی امور عرفانی مرتبہ میں وہم اور شک سے منزّہ ہوتے ہیں اور دُنیا میں جس قدر ایک چیز زیادہ سے زیادہ بدیہی طور پر ثابت ہو سکتی ہے اُسی طور پر اُن تمام عقائد کا ثبوت مل جاتا ہے بلکہ ایسا اعلیٰ ثبوت کہ کوئی نمونہ اُس کا دُنیا میں پایا نہیں جاتا مگر کم بخت انسان ان راہوں کی طرف ذرّہ رغبت نہیں کرتا اور اُن راہوں سے حق الیقین تک پہنچنا چاہتا ہے جو خدا تعالیٰ کے قدیم قانون قُدرت نے وہ راہیں ان امور کے دریافت کے لیے مقرر نہیں کیں اِس کی ایسی ہی مثال ہے کہ جیسے کوئی کسی شیرینی کو آنکھ پر رکھ کر اُس کا میٹھا یا کڑوا ہونا امتحان کرے یا آنکھوں کو بند کرکے کانوں سے دیکھنے کا کام لینا چاہے مگر یاد رہے کہ یہ بات بھی نہیں کہ ایمانی مرتبہ میں خدا تعالیٰ نے اِن تمام امور کے تسلیم کرانے میں اپنے بندوں کو صرف تکلیف مالایطاق دینا چاہا ہے بلکہ اُن کی تسلیم کے لیے بُراہین لطیفہ دئے ہیں جن پر ایک سلیم العقل نظر غور ڈال کر ایک حصہ وافر یقین کا حاصل کر سکتا ہے مثلاً گو ایمانی مرتبہ میں خدا تعالیٰ پر ایمان لانا ایک ایمان بالغیب ہے مگر قرآن کریم کو دیکھو کہ اُس صانع کا وجود ثابت کرنے کے لیے کس قدر استدلالات اور بُراہین شافیہ سے بھرا ہوا ہے۔ ایسا ہی اگرچہ یہ تو نہیں کہ ہم ملایک کو کسی مُنکر کے ہاتھ میں پکڑا دیں یا کام کرتے دکھلا دیں لیکن طالب حق کے لیے اِس قدر کافی ہے کہ دقیق در دقیق تدبیرات نظام کو دیکھ کر ضرورت ملایکہ اُس کی نظر میں ضرور ثابت ہو جائیں گی اور اگر ایسا طالب دہریہ ہے تو پہلے ہم وجود باری کا اُس کو ثبوت دیں گے اور پھر اِس بات کا ثبوت

کہ خدا بجز اِس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ اُس کے حکم و ارادہ کے بغیر ایک پتہ بھی ہل سکے اور پھر یہ ثبوت دینگے کہ جن مصالح دقیقہ کے ساتھ خدا تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنا فیضان بذریعہ شمس و قمر و نجوم و ابر و باد وغیرہ کر رہا ہے اُن مصالح کی شناخت اور وضع شئی فی محلہ کے قویٰ ہرگز اُن چیزوں کو نہیں دیئے گئے جیسا کہ ابھی ہم ثابت کر چکے اور یہ بھی ثابت کر چکے کہ خدا تعالیٰ بغیر وسائط کے کوئی کام نہیں کرتا اور جن کو وسائط ٹھہراتا ہے پہلے اُن کو اُن کاموں کی مناسب حال قوتیں اور طاقتیں عطا کرتا ہے مثلاً شعور کے کام صاحب شعور سے لیتا ہے اور ارادہ کا کام صاحب ارادہ سے انسان کا کام انسان سے اور حیوان کا کام حیوان سے اور نظر دقیق کا کام نظر دقیق سے پس ان ثبوتوں کے بعد بلا شبہ ملایک کے وجود کی ضرورت ثابت ہوتی ہے اور ایمانی امور کے لیے صرف اس قدر ثبوت کی حاجت ہے تا تکلیف مالا یطاق نہ ہو اور نیز ایمان لانے کا ثواب بھی ضائع نہ ہو کیونکہ اگر ملائک کے وجود کا ایسا ثبوت دیا جاتا کہ گویا ان کو پکڑ کر دکھلا دیا جاتا تو پھر ایمان ایمان نہ رہتا اور نجات کی حکمت عملی فوت ہو جاتی۔ فافہم و تدبر و لا تکن من المستعجلین۔

(آئینہ کمالات اسلام ص۱۸۱-۲۱۴ حاشیہ)

جیسے ہمارے اجسام اور ہماری تمام ظاہری قوتوں پر آفتاب اور ماہتاب اور دیگر سیاروں کا اثر ہے ایسا ہی ہمارے دل اور دماغ اور ہماری تمام روحانی قوتوں پر یہ سب ملایک ہماری مختلف استعدادوں کے موافق اپنا اپنا اثر ڈال رہے ہیں جو چیز کسی عُمدہ جوہر بننے کی اپنے اندر قابلیت رکھتی ہے وہ اگرچہ خاک کا ایک ٹکڑا ہے یا پانی کا وہ قطرہ جو صدف میں داخل ہوتا ہے یا پانی کا وہ قطرہ جو رحم میں پڑتا ہے وہ اُن ملایک اللہ کی روحانی تربیت سے لعل اور الماس اور یاقوت اور نیلم وغیرہ یا نہایت درجہ کا آبدار اور وزنی موتی یا اعلیٰ درجہ کے دل اور دماغ کا انسان بن جاتا ہے...... قرآن شریف نے جس طرز سے ملایک کا حال بیان کیا ہے وہ نہایت سیدھی اور قریب قیاس راہ ہے اور بجز اس کے ماننے کے انسان کو کچھ بن نہیں پڑتا قرآن شریف پر بدیدہ تعمق غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بلکہ جمیع کائنات الارض کی تربیت ظاہری و باطنی کے لیے بعض وسائط کا ہونا ضروری ہے اور بعض بعض اشارات قرآنیہ سے نہایت صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ نفوس طیبہ جو ملایک سے موسوم ہیں اُن کے تعلقات طبقات سماویہ سے الگ الگ ہیں بعض اپنی تاثیرات خاصہ سے ہوا کے چلانے والے اور بعض مینہ کے برسانے والے اور بعض بعض اور تاثیرات کو زمین پر اُتارنے والے ہیں پس اس میں کچھ شک نہیں کہ بوجہ مناسبت نوری وہ نفوس طیبہ اُن روشن اور نورانی ستاروں سے تعلق رکھتے ہوں گے کہ جو آسمانوں میں پائے جاتے ہیں مگر اس تعلق کو ایسا نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جیسے زمین کا ہر یک جاندار اپنے اندر جان رکھتا ہے بلکہ اُن نفوس طیبہ کو بوجہ مناسبت اپنی نورانیت اور روشنی کے جو روحانی طور پر اُنہیں حاصل ہے روشن ستاروں کے ساتھ ایک مجہول الکنہ تعلق ہے اور ایسا شدید تعلق ہے کہ اگر اُن نفوس طیبہ کا اُن ستاروں سے الگ ہونا فرض کر لیا جائے تو پھر اُن کے تمام قویٰ میں فرق پڑ جائے گا

اُنہیں نفوس کے پوشیدہ ہاتھ کے زور سے تمام ستارے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں اور جیسے خدائے تعالیٰ تمام عالم کے لیے بطور جان کے ہے ایسا ہی (مگر اس جگہ تشبیہ کامل مراد نہیں) وہ نفوس نورانیہ کواکب اور سیارات کے لیے جان کا ہی حکم رکھتے ہیں اور اُن کے جدا ہو جانے سے اُن کی حالت وجود یہ میں بکلی فساد راہ پا جانا لازمی وضروری امر ہے اور آج تک کسی نے اِس امر میں اختلاف نہیں کیا کہ جس قدر آسمانوں میں سیارات اور کواکب پائے جاتے ہیں وہ کائنات الارض کی تکمیل وتربیت کے لیے ہمیشہ کام میں مشغول ہیں غرض یہ نہایت جچی ہوئی اور ثبوت کے چرخ پر چڑھی ہوئی صداقت ہے کہ تمام نباتات اور جمادات اور حیوانات پر آسمانی کواکب کا دن رات اثر پڑ رہا ہے اور جاہل سے جاہل ایک دہقان بھی اِس قدر تو ضرور یقین رکھتا ہوگا کہ چاند کی روشنی پھلوں کے موٹا کرنے کے لیے اور سورج کی دھوپ اُن کو پکانے اور شیریں کرنے کے لیے اور بعض ہوائیں بکثرت پھل آنے کے لیے بلاشبہ موثر ہیں اب جبکہ ظاہری سلسلہ کائنات کا ان چیزوں کی تاثیرات مختلفہ سے تربیت پا رہا ہے تو اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ باطنی سلسلہ پر بھی باذنہ تعالیٰ وہ نفوس نورانیہ اثر کر رہی ہیں جن کا اجرام نورانیہ سے ایسا شدید تعلق ہے کہ جیسے جان کو جسم سے ہوتا ہے۔

اب اِس کے بعد یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اگرچہ بظاہر یہ بات نہایت دور از ادب معلوم ہوتی ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اُس کے مقدس نبیوں میں افاضہ انوار وحی کے لیے کوئی اور واسطہ تجویز کیا جائے لیکن ذرا غور کرنے سے بخوبی سمجھ آجائیگا کہ اِس میں کوئی سوء ادب کی بات نہیں بلکہ سراسر خدائے تعالیٰ کے اُس عام قانونِ قدرت کے مطابق ہے جو دُنیا کی ہر یک چیز کے متعلق کُھلے کُھلے طور پر مشہود ومحسوس ہو رہا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام بھی اپنے ظاہری جسم اور ظاہری قویٰ کے لحاظ سے اِنہیں وسائط کے محتاج ہیں اور نبی کی آنکھ بھی گو کیسی ہی نورانی اور بابرکت آنکھ ہے مگر پھر بھی عوام کی آنکھوں کی طرح آفتاب یا اُس کے کسی دوسرے قائم مقام کے بغیر کچھ دیکھ نہیں سکتے اور بغیر توسط ہوا کے کچھ سُن نہیں سکتے لہذا یہ بات بھی ضروری طور پر ماننی پڑتی ہے کہ نبی کی روحانیت پر بھی ان سیارات کے نفوس نورانیہ کا ضرور اثر پڑتا ہوگا۔ بلکہ سب سے زیادہ اثر پڑتا ہوگا کیونکہ جس قدر استعداد صافی اور کامل ہوتی ہے اُسی قدر اثر بھی صافی اور کامل طور پر پڑتا ہے قُرآن شریف سے ثابت ہے کہ یہ سیارات اور کواکب اپنے اپنے قالبوں کے متعلق ایک ایک روح رکھتے ہیں جن کو نفوس کواکب سے بھی نامزد کر سکتے ہیں اور جیسے کواکب اور سیاروں میں باعتبار اُن کے قالبوں کے طرح طرح کے خواص پائے جاتے ہیں جو زمین کی ہر یک چیز پر حسب استعداد اثر ڈال رہے ہیں ایسا ہی اُن کے نفوس نورانیہ میں بھی انواع اقسام کے خواص ہیں جو باذن حکیم مطلق کائنات الارض کے باطن پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اور یہی نفوس نورانیہ کامل بندوں پر بشکل جسمانی متشکل ہو کر ظاہر ہو جاتے ہیں اور بشری صورت سے متمثل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ تقریر از قبیل خطابیات نہیں بلکہ یہ وہ صداقت ہے جو طالب حق اور حکمت کو ضرور ماننی پڑیگی کیونکہ جب ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ضرور کائنات الارض کی تربیت اجرام سماویہ کی طرف سے ہو رہی ہے اور

جہاں تک ہم بطور استقراء اجسام ارضیہ پر نظر ڈالتے ہیں اس تربیت کے آثار ہر یک جسم پر خواہ وہ نباتات میں سے ہے خواہ جمادات میں سے خواہ حیوانات میں سے ہے بدیہی طور پر ہمیں دکھائی دیتے ہیں پس اس صریح تجربہ کے ذریعہ سے ہم اس بات کے ماننے کے لیے بھی مجبور ہیں کہ روحانی کمالات اور دل اور دماغ کی روشنی کا سلسلہ بھی جہاں تک ترقی کرتا ہے بلاشبہ ان نفوس نورانیہ کا اُس میں بھی دخل ہے اسی دخل کی رو سے شریعت غرّا نے استعارہ کے طور پر اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوں میں ملایک کا واسطہ ہونا ایک ضروری امر ظاہر فرمایا ہے جس پر ایمان لانا ضروریات دین میں سے گردانا گیا ہے جن لوگوں نے اپنی نہایت مکروہ نادانی سے اِس الٰہی فلسفہ کو نہیں سمجھا جیسے آریہ مذہب والے یا برہمو مذہب والے اُنہوں نے جلدی سے بباعث اپنے بے وجہ بخل اور بغض کے جو اُن کے دلوں میں بھرا ہوا ہے تعلیم فرقانی پر یہ اعتراض جڑ دیا کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولوں میں ملایک کا واسطہ ضروری ٹھہراتا ہے اور اِس بات کو نہ سمجھا اور نہ خیال کیا کہ خدائے تعالیٰ کا عام قانون تربیت جو زمین پر پایا جاتا ہے اِسی قاعدہ پر مبنی ہے ہندؤں کے رشی جن پر بقول ہندؤں کے چاروں وید نازل ہوئے کیا وہ اپنے جسمانی قویٰ کے ٹھیک ٹھیک طور پر قائم رہنے میں تاثیرات اجرام سماویہ کے محتاج نہیں تھے کیا وہ بغیر آفتاب کی روشنی کے صرف آنکھوں کی روشنی سے دیکھنے کا کام لے سکتے تھے یا بغیر ہوا کے ذریعہ کے کسی آواز کو سُن سکتے تھے تو اس کا جواب بدیہی طور پر یہی ہوگا کہ ہرگز نہیں بلکہ وہ بھی اجرام سماویہ کی تربیت اور تکمیل کے بہت محتاج تھے ہندؤں کے ویدوں نے اِن ملایک کے بارے میں کہاں انکار کیا ہے۔ بلکہ اُنہوں نے تو اِن وسائط کے ماننے اور قابل قدر جا... بہت ہی غلو کیا ہے یہاں تک کہ خدائے تعالیٰ کے درجہ سے اُن کا درجہ برابر ٹھہرا دیا ہے ایک رگ وید پر ہی نظر ڈال کر دیکھو کہ کس قدر اُس میں اجرام سماویہ اور عناصر کی پرستش موجود ہے اور کیسی اُن کی استت اور مہما اور مدح اور ثنا میں ورقوں کے ورق سیاہ کر دیئے ہیں اور کس عاجزی اور گڑگڑانے سے اُن سے دعائیں مانگی گئی ہیں جو قبول بھی نہیں ہوئیں مگر شریعت فرقانی نے تو ایسا نہیں کیا بلکہ اُن نفوس نورانیہ کو جو اجرام سماویہ سے یا عناصر یا دخانات سے ایسا تعلق رکھتے ہیں جیسے جان کا جسم سے تعلق ہوتا ہے صرف ملایک یا جنّات کے نام سے موسوم کیا ہے اور اُن نورانی فرشتوں ... جو نورانی ستاروں اور سیاروں پر اپنا مقام رکھتے ہیں اپنی ذات پاک میں اور اپنے رسولوں میں ایسے طور کا واسطہ نہیں ٹھہرایا جس کے رُو سے اُن فرشتوں کو با اقتدار یا با اختیار مان لیا جاوے بلکہ اُن کو اپنی نسبت ایسا ظاہر فرمایا ہے کہ جیسے ایک بے جان چیز ایک زندہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس سے وُہ زندہ جس طور سے کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے اسی بنا پر بعض مقامات قرآن شریف میں اجسام کے ہر یک ذرّہ پر بھی ملایک کا نام اطلاق کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ سب ذرات اپنے رب کریم کی آواز سُنتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو اُن کو حکم دیا گیا ہو مثلاً جو کچھ تغیرات بدن انسان میں مرض کی طرف یا صحت کی طرف ہوتے ہیں اُن تمام مواد کا ذرّہ ذرّہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق آگے پیچھے قدم رکھتا ہے۔

اب ذرا آنکھ کھول کر دیکھ لینا چاہیئے کہ اِس قسم کے وسائط کے ماننے میں جو قرآن شریف میں قرار دیئے گئے ہیں کونسا

شرک لازم آتا ہے اور خدا تعالیٰ کی شان قدرت میں کونسا فرق آجاتا ہے بلکہ یہ تو اسرار معرفت و دقائق حکمت کی وہ باتیں ہیں جو قانون قدرت کے صفحہ صفحہ میں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں اور بغیر اس انتظام کے ماننے کے خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ ثابت ہی نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کی خدائی چل سکتی ہے بھلا جب تک ذرّہ ذرّہ اُس کا فرشتہ بن کر اُس کی اطاعت میں نہ لگا ہو تب تک یہ سارا کارخانہ اُس کی مرضی کے موافق کیونکر چل سکتا ہے؟ کوئی ہمیں سمجھائے تو سہی اور نیز اگر ملایک سماویہ کے نظام روحانی سے خدا تعالیٰ کی قادرانہ شان پر کچھ دھبہ لگ سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں ملایک کے نظام جسمانی کے ماننے سے کہ جو نظام روحانی کا بعینہٖ ہم رنگ و ہم شکل ہے خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آریہ وغیرہ ہمارے مخالفوں نے فرط نابینائی سے ایسے ایسے بیجا اعتراضات کر دئیے ہیں جن کی اصل بنا بہت سے مشرکانہ حواشی کے ساتھ اُن کے گھر میں بھی موجود ہے اور ناحق بوجہ اپنی بے بصیرتی کے ایک عمدہ صداقت کو بطالت کی شکل میں سمجھ لیا ہے .....

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت کے رو سے خواص ملایک کا درجہ خواص البشر سے کچھ زیادہ نہیں بلکہ خواص الناس خواص الملایک سے افضل ہیں اور نظام جسمانی یا نظام روحانی میں ان کا وسائط قرار پانا اُن کی افضلیت پر دلالت نہیں کرتا بلکہ قرآن شریف کی ہدایت کی رو سے وہ خدام کی طرح اس کام میں لگائے گئے ہیں (توضیح مرام صـ۳۳-۴۵)

ملایک اللہ (جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں) ایک ہی درجہ کی عظمت اور بزرگی نہیں رکھتے نہ ایک ہی قسم کا کام انہیں سپرد ہے بلکہ ہر یک فرشتہ علیحدہ علیحدہ کاموں کے انجام دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے دُنیا میں جس قدر تغیرات و انقلابات دیکھتے ہو یا جو کچھ مکمن قوۃ سے حیزّ فعل میں آتا ہے یا جس قدر ارواح و اجسام اپنے کمالات مطلوبہ تک پہنچتے ہیں ان سب پر تاثیرات سماویہ کام کر رہی ہیں اور کبھی ایک ہی فرشتہ مختلف طور کی استعدادوں پر مختلف طور کے اثر ڈالتا ہے۔ (توضیح مرام صـ۶۷-۶۸) (نیز دیکھیں آیت ۹۸)

صرف اتنا ہی نہیں کہ ملایک بعض وقت نظر آتے ہیں بلکہ بسا اوقات ملایک کلام میں اپنا واسطہ ہونا ظاہر کر دیتے ہیں۔ (برکات الدعا صـ۲۱ حاشیہ)

یہ سنت اللہ ہے کہ جب ایک مامور آتا ہے تو آسمان سے اُس کے ساتھ فرشتے یا یوں کہو کہ نور اُترتا ہے اور وہ نور مستعد دلوں پر پڑتا اور اُن کو روشن کرتا اور ان کو قوت دیتا ہے۔ اور ہر ایک شخص قوت پا کر روحانی امور کو سمجھنے لگتا ہے چونکہ اس نزول نور کا اصل سبب وہ مامور ہی ہوتا ہے اس لیے اس زمانہ کے تمام دینی معارف اُسی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔

(ایام الصلح صـ۵۴ حاشیہ)

ملایک اس معنی سے ملایک کہلاتے ہیں کہ وہ ملاک اجرام سماویہ اور ملاک اجسام الارض ہیں یعنی اُن کے قیام اور بقا کے لیے روح کی طرح ہیں اور نیز اس معنی سے بھی ملایک کہلاتے ہیں کہ وہ رسولوں کا کام دیتے ہیں۔ (توضیح مرام صـ۳۳ حاشیہ)

وَالْمُسْلِمُ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ وَلَهٗ نَحَرَ نَاقَةَ نَفْسِهٖ وَتَلَّهَا لِلْجَبِيْنِ ○ وَمَانَسِيَ الْحَيْنَ فِيْ حِيْنٍ ○ فَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ النُّسُكَ وَالضَّحَايَا فِي الْاِسْلَامِ ○ هِيَ تَذْكِرَةٌ لِّهٰذَا الْمَرَامِ ○ وَحَثٌّ عَلٰى تَحْصِيْلِ هٰذَا الْمَقَامِ ○ وَاِرْهَاصٌ لِحَقِيْقَةٍ تَحْصُلُ بَعْدَ السُّلُوْكِ التَّامِّ ○ فَوَجَبَ عَلٰى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ كَانَ يَبْتَغِيْ رِضَاءَ اللّٰهِ الْوَدُوْدِ ○ اَنْ يَّفْهَمَ هٰذِهِ الْحَقِيْقَةَ وَيَجْعَلَهَا عَيْنَ الْمَقْصُوْدِ ○ وَيُدْخِلَهَا فِيْ نَفْسِهٖ حَتّٰى تَسْرِيَ فِيْ كُلِّ ذَرَّةِ الْوُجُوْدِ ○ وَلَا يَهْدَءَ وَلَا يَسْكُنُ قَبْلَ اَدَاءِ هٰذِهِ الضَّحِيَّةِ لِلرَّبِّ الْمَعْبُوْدِ ○ وَلَا يَقْنَعُ بِنَمُوْذَجٍ وَقِشْرٍ كَالْجُهَلَاءِ وَالْعُمْيَانِ ○ بَلْ يُؤَدِّيْ حَقِيْقَةَ اَضْحَاتِهٖ ○ وَيَقْضِيْ بِجَمِيْعِ حَصَاتِهٖ ○ وَرُوْحِ تُقَاتِهٖ رُوْحَ الْقُرْبَانِ ○ هٰذَا هُوَ مُنْتَهٰى سُلُوْكِ السَّالِكِيْنَ ○ وَغَايَةُ مَقْصَدِ الْعَارِفِيْنَ ○ وَعَلَيْهِ يَخْتَتِمُ جَمِيْعُ مَدَارِجِ الْاَتْقِيَاءِ ○ وَبِهٖ يَكْمُلُ سَائِرُ مَرَاحِلِ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالْاَصْفِيَاءِ ○ وَاِلَيْهِ يَنْتَهِيْ سَيْرُ الْاَوْلِيَاءِ ○ وَاِذَا بَلَغْتَ اِلٰى هٰذَا فَقَدْ بَلَّغْتَ جُهْدَكَ اِلَى الْاِنْتِهَاءِ ○

ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس نے اپنا مُنہ ذبح ہونے کے لیے خدا تعالیٰ کے آگے رکھ دیا ہو اور اپنے نفس کی اونٹنی کو اس کے لیے قربان کر دیا ہو اور ذبح کے لیے پیشانی کے بل اس کو گرا دیا ہو اور موت سے ایک دم غافل نہ ہو۔ پس حاصل کلام یہ ہے کہ ذبیحہ اور قربانیاں جو اسلام میں مروج ہیں وہ سب اسی مقصود کے لیے بطور یاد دہانی ہیں اور اس مقام کے حاصل کرنے کے لیے ایک ترغیب ہے اور اُس حقیقت کے لیے جو سلوک تام کے بعد حاصل ہوتی ہے ایک ارہاص ہے۔ پس ہر ایک مرد مومن اور عورت مومنہ پر جو خدائے ودود کی رضا کی طالب ہے واجب ہے کہ اس حقیقت کو سمجھے اور اس کو اپنے مقصود کا عین قرار دے اور اس حقیقت کو اپنے نفس کے اندر داخل کرے یہاں تک کہ وہ حقیقت ہر ذرّہ وجود میں داخل ہو جائے اور راحت اور آرام اختیار نہ کرے جب تک کہ اس قربانی کو اپنے ربّ معبود کے لیے ادا نہ کرلے۔ اور جاہلوں اور نادانوں کی طرح صرف نمونہ اور پوست بے مغز پر قناعت نہ کر بیٹھے۔ بلکہ چاہیئے کہ اپنی قربانی کی حقیقت کو بجا لاوے اور اپنی ساری عقل کے ساتھ اور اپنی پرہیزگاری کی رُوح سے قربانی کی روح کو ادا کرے۔ یہ وہ درجہ ہے جس پر سالکوں کا سلوک انتہا پذیر ہوتا ہے اور عارفوں کا مقصد اپنی غایت کو پہنچتا ہے اور اس پر تمام درجے پرہیز گاروں کے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور سب منزلیں راست بازوں اور برگزیدوں کی پوری ہو جاتی ہیں۔ اور یہاں تک پہنچ کر سیر اولیاء کا اپنے انتہائی نقطہ تک جا پہنچتا ہے۔ اور جب تو اس مقام تک پہنچ گیا تو تو نے اپنی کوشش کو انتہا تک پہنچا دیا اور فنا کے مرتبہ تک پہنچ گیا پس اس وقت تیرے

وَفُزْتَ بِمَرْتَبَةِ الْفَنَاءِ ○ فَحِيْنَئِذٍ تَصِلُ شَجَرَةُ سُلُوْكِكَ اِلٰى اَتَمِّ النَّمَاءِ ○ وَتَصِلُ عُنُقُ رُوْحِكَ اِلٰى لُعَاعِ رَوْضَةِ الْقُدْسِ وَالْكِبْرِيَاءِ ○ كَالنَّاقَةِ الْعَنْقَاءِ ○ اِذَا اَوْصَلَتْ عُنُقَهَا اِلَى الشَّجَرَةِ الْخَضْرَاءِ ○ وَبَعْدَ ذَالِكَ جَذَبَاتٌ وَنَفَحَاتٌ وَتَجَلِّيَاتٌ مِنَ الْحَضْرَةِ الْاَحَدِيَّةِ لِيَقْطَعَ بَعْضَ بَقَايَا عُرُوْقِ الْبَشَرِيَّةِ ○ وَبَعْدَ ذَالِكَ اِحْيَاءٌ وَاِبْقَاءٌ وَاِدْنَاءٌ لِلنَّفْسِ الْمُطْمَئِنَّةِ الرَّاضِيَةِ الْمَرْضِيَّةِ الْفَانِيَةِ ○ لِيَسْتَعِدَّ الْعَبْدُ لِقَبُوْلِ الْفَيْضِ بَعْدَ الْحَيَاتِ الثَّانِيَةِ ○ وَبَعْدَ ذَالِكَ يُكْسَى الْاِنْسَانُ الْكَامِلُ حُلَّةَ الْخِلَافَةِ مِنَ الْحَضْرَةِ ○ وَيُصَبَّغُ بِصِبْغِ صِفَاتِ الْاُلُوْهِيَّةِ ○ عَلٰى وَجْهِ الظِّلِّيَّةِ ○ تَحْقِيْقًا لِمَقَامِ الْخِلَافَةِ ○ وَبَعْدَ ذَالِكَ يَنْزِلُ اِلَى الْخَلْقِ لِيَجْذِبَهُمْ اِلَى الرُّوْحَانِيَّةِ ○ وَيُخْرِجَهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ الْاَرْضِيَّةِ ○ اِلَى الْاَنْوَارِ السَّمَاوِيَّةِ ○ وَيُجْعَلُ وَارِثًا لِكُلِّ مَنْ مَّضٰى مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَاَهْلِ الْعِلْمِ وَالدِّرَايَةِ ○ وَشُمُوْسِ الْقُرْبِ وَالْوَلَايَةِ ○ وَيُعْطٰى لَهٗ عِلْمُ الْاَوَّلِيْنَ ○ وَمَعَارِفُ السَّابِقِيْنَ ○ مِنْ اُولِى الْاَبْصَارِ وَحُكَمَاءِ الْمِلَّةِ ○ تَحْقِيْقًا لِمَقَامِ الْوِرَاثَةِ ○

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۰۰)

سلوک کا درخت اپنے کامل نشو ونما تک پہنچ جائے گا اور تیری روح کی گردن تقدس اور بزرگی کے مرغزار کے نرم سبزہ تک پہنچ جائے گی۔ اُس اونٹنی کی مانند جس کی گردن لمبی ہو اور اس نے اپنی گردن کو ایک سبز درخت تک پہنچا دیا ہو اور اس کے بعد حضرت احدیّت کے جذبات ہیں اور خوشبوئیں ہیں اور تجلّیات ہیں تا وہ بعض اُن رگوں کو کاٹ دے کہ جو بشریت میں سے باقی رہ گئی ہوں اور بعد اس کے زندہ کرنا ہے اور باقی رکھنا اور قریب کرنا اُس نفس کا جو خدا کے ساتھ آرام پکڑ چکا ہے جو خدا سے راضی اور خدا اس سے راضی اور فنا شدہ ہے تا کہ یہ بندہ حیات ثانی کے بعد قبول فیض کے لیے مستعد ہو جائے اور اس کے بعد انسان کامل کو حضرت احدیّت کی طرف سے خلافت کا پیرایہ پہنایا جاتا ہے۔ اور رنگ دیا جاتا ہے الوہیت کی صفتوں کے ساتھ۔ اور یہ رنگ ظلّی طور پر ہوتا ہے تا مقام خلافت متحقق ہو جائے اور پھر اس کے بعد خلقت کی طرف اترتا ہے تا ان کو روحانیت کی طرف کھینچے۔ اور زمین کی تاریکیوں سے باہر لا کر آسمانی نوروں کی طرف لے جائے۔ اور یہ انسان اُن سب کا وارث کیا جاتا ہے جو نبیوں اور صدیقوں اور اہل علم اور درایت میں سے اور قرب اور ولایت کے سورجوں میں سے اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور دیا جاتا ہے اس کو علم اوّلین کا اور معارف گذشتہ اہل بصیرت اور حکمائے ملت کے تا اس کے لیے مقام وراثت کا متحقق ہو جائے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۰۰)

میری نسبت خدا نے میرے ہی ذریعہ سے براہین احمدیہ میں خبر دی کہ میں آدم کے رنگ پر ایک خلیفہ پیدا کرتا ہوں تب اس خبر کو سُن کر بعض مخالفوں نے میرے حالات کو کچھ اپنے عقائد کے برخلاف پا کر اپنے دلوں میں کہا کہ یا الٰہی کیا تو ایسے انسان کو اپنا خلیفہ بنائے گا کہ جو ایک مفسد آدمی ہے جو ناحق قوم میں پھوٹ ڈالتا ہے اور علماء کے مسلّمات سے باہر جاتا ہے۔ تب خدا نے جواب دیا کہ جو مجھے معلوم ہے وہ تمہیں معلوم نہیں۔ یہ خدا کا کلام ہے کہ جو مجھ پر نازل ہوا۔ اور درحقیقت میرے اور میرے خدا کے درمیان ایسے باریک راز ہیں جن کو دنیا نہیں جانتی اور مجھے خدا سے ایک نہانی تعلق ہے جو قابل بیان نہیں اور اس زمانہ کے لوگ اُس سے بے خبر ہیں پس یہی معنی ہیں اس وحی الٰہی کے کہ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (براھین احمدیہ حصہ پنجم صـــ۶۳ـــ)

روحانی طور پر انسان کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی کمال نہیں کہ وہ اس قدر صفائی حاصل کرے کہ خدا تعالیٰ کی تصویر اُس میں کھینچی جائے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً یعنی میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ تصویر ایک چیز کی اصل صورت کی خلیفہ ہوتی ہے یعنی جانشین۔ اور یہی وجہ ہے کہ جس جس موقع پر اصل صورت میں اعضا واقع ہوتے ہیں اور خطّ و خال ہوتے ہیں اُسی اُسی موقع پر تصویر میں بھی ہوتے ہیں اور حدیث شریف اور نیز توریت میں بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا پس صورت سے مراد یہی روحانی تشابہ ہے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب مثلاً ایک نہایت صاف آئینہ پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے تو صرف اسی قدر نہیں ہوتا کہ آفتاب اس کے اندر دکھائی دیتا ہے بلکہ وہ شیشہ آفتاب کی صفات بھی ظاہر کرتا ہے اور وہ یہ کہ اُس کی روشنی انعکاسی طور پر دوسرے پر بھی پڑ جاتی ہے۔ پس یہی حال روحانی آفتاب کی تصویر کا ہوتا ہے کہ جب ایک قلب صافی اُس سے ایک انعکاسی شکل قبول کر لیتا ہے تو آفتاب کی طرح اُس میں سے بھی شعاعیں نکل کر دوسری چیزوں کو منوّر کرتی ہیں گویا تمام آفتاب اپنی پوری شوکت کے ساتھ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صـــ۲۵ـــ)

اِنَّ نَبِیَّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اٰدَمَ خَاتِمَۃِ الدُّنْیَا وَمُنْتَھَی الْاَیَّامِ۔ وَخُلِقَ کَاٰدَمَ بَعْدَ مَا خُلِقَ عَلَی الْاَرْضِ کُلُّ نَوْعٍ مِّنَ الدَّوَآبِّ وَکُلُّ صِنْفٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَالْاَنْعَامِ۔ وَلَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ ھٰذِہِ الْخَلِیْقَۃَ مِنْ اَنْوَاعِ النَّعَمِ وَالسِّبَاعِ وَالدُّوْدِ عَلَی

(ترجمہ اصل کتاب سے) بے شک ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے خاتمہ کے آدم اور زمانہ کے دنوں کے منتہی تھے اور آنحضرت آدم کی طرح پیدا کیے گئے اس کے بعد زمین پر ہر طرح کے کیڑے مکوڑے اور چارپائے اور درندے پیدا ہو گئے۔ اور جس وقت خدا نے اِس مخلوق کو یعنی حیوانوں اور درندوں اور چیونٹیوں کو زمین پر پیدا

اَلْاَرَضِیْنَ اَعْنِیْ کُلَّ حِزْبٍ مِّنَ الْفَاجِرِیْنَ وَالْکَافِرِیْنَ - وَالَّذِیْنَ اٰثَرُوا الدُّنْیَا عَلَی الدِّیْنِ وَخَلَقَ فِی السَّمَآءِ نُجُوْمَهَا وَاَقْمَارَهَا وَشُمُوْسَهَا اَعْنِی النُّفُوْسَ الْمُسْتَعِدَّةَ مِنَ الطَّاهِرِیْنَ الْمُنَوَّرِیْنَ - خَلَقَ بَعْدَ هٰذَا اٰدَمَ الَّذِیْ اِسْمُهٗ مُحَمَّدٌ وَّاَحْمَدُ ؐ وَهُوَ سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَاَتْقٰی وَاَسْعَدُ وَاِمَامُ الْخَلِیْقَةِ - وَاِلَیْهِ اَشَارَ اللّٰهُ فِیْ قَوْلِهٖ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ وَبِعِزَّةِ اللّٰهِ وَجَلَالِهٖ اَنَّ لَفْظَ اِذْ یَدُلُّ بِدَلَالَةٍ قَطْعِیَّةٍ عَلٰی هٰذَا الْمَقْصُوْدِ وَیَدُلُّ عَلَیْهِ سِیَاقُ الْاٰیَةِ وَسِبَاقُهَا اِنْ کُنْتَ لَسْتَ کَالْیَهُوْدِ - فَلَا شَکَّ اَنَّهٗ اٰدَمُ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَالْاُمَّةُ کَالذُّرِّیَّةِ لِهٰذَا النَّبِیِّ الْمَحْمُوْدِ - وَاِلَیْهِ اَشَارَ فِیْ قَوْلِهٖ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ[1] - فَاَمْعِنْ فِیْهِ وَتَفَکَّرْ - وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِیْنَ - وَاِنَّ زَمَانَ رُوْحَانِیَّةِ نَبِیِّنَا عَلَیْهِ السَّلَامُ قَدْ بَدَءَ مِنَ الْاَلْفِ الْخَامِسِ وَکَمَلَ اِلٰی اٰخِرِ الْاَلْفِ السَّادِسِ وَاِلَیْهِ اَشَارَ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ[2] - وَتَفْصِیْلُ الْمَقَامِ اَنَّ نَبِیَّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَآءَ عَلٰی قَدَمِ اٰدَمَ وَاِنَّ رُوْحَانِیَّةَ اٰدَمَ قَدْ طَلَعَتْ فِی الْیَوْمِ الْخَامِسِ لِمَا خُلِقَ اِلٰی هٰذَا الْیَوْمِ کُلَّمَا کَانَ مِنْ اَجْزَآءِ هُوِیَّتِهٖ وَحَقِیْقَةِ مَاهِیَّتِهٖ فَاِنَّ الْاَرْضَ بِجَمِیْعِ مَخْلُوْقَاتِهَا

کیا یعنی فاجروں اور کافروں اور دنیا پرستوں کے ہر ایک گروہ کو پیدا کیا اور آسمان میں ستارے اور چاندوں اور سورجوں یعنی پاکوں کے نفوس مستعدہ کو ظہور میں لایا تو بعد اس کے اُس آدم کو وجود کا خلعت پہنایا جس کا نام محمد اور احمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ آدم کی اولاد کا سردار اور خلقت کا امام اور سب سے زیادہ تقی اور سعید ہے اور اس کی طرف خدا تعالیٰ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ الاٰیۃ اور خدا کی عزت اور جلال کی قسم کہ اِذْ کا لفظ قطعی دلالت کے ساتھ اس مقصود پر دلالت کرتا ہے اور اگر تو یہود کی طرح نہیں تو آیت کا سیاق سباق تجھ پر اس راز کو کھول دیگا پس شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر زمانہ کے آدم ہیں اور امت اس نبی محمود کی ذریت کی بجا ہے اور اس کی طرف خدا تعالیٰ کے اِس قول کا اشارہ ہے اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ پس ان معنوں میں غور اور فکر کر اور غافلوں میں سے مت ہو اور ہمارے نبی کی روحانیت کا زمانہ پانچویں ہزار سے شروع اور چھٹے ہزار کے آخر تک کامل ہوا اور اس کی طرف خدا تعالیٰ کا قول اشارہ کرتا ہے کہ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ اور اس مقام کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آدم کے قدم پر آئے اور آدم کی روحانیت نے پانچویں دن میں طلوع فرمایا کیونکہ اِس دن تک سب کچھ جو اس کی ہویت کے اجزا سے اور اس کی ماہیت کی حقیقت سے تھا پیدا ہو گیا

---

[1] الکوثر: ۲ ☆ [2] التوبہ: ۳۳، الفتح: ۲۹ اور الصف: ۱۰

وَالسَّمَآءَ بِجَمِيْعِ مَصْنُوْعَاتِهَا كَانَتْ حَقِيْقَةَ هُوِيَّةِ اٰدَمَ كَاَنَّ مَادَّتَهٗ قَدِ انْتَقَلَتْ
مِنَ الْحَقِيْقَةِ الْجَمَادِيَّةِ اِلَى الْحَقِيْقَةِ النَّبَاتِيَّةِ ثُمَّ مِنَ الْحَقِيْقَةِ النَّبَاتِيَّةِ اِلَى الْهُوِيَّةِ
الْحَيَوَانِيَّةِ ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ انْتَقَلَتْ مِنْ حَيْثُ الرُّوْحَانِيَّةِ مِنَ الْكَمَالَاتِ الْكَوْكَبِيَّةِ
اِلَى الْكَمَالَاتِ الْقَمَرِيَّةِ وَمِنَ الْاَنْوَارِ الْقَمَرِيَّةِ اِلَى الْاَشِعَّةِ الشَّمْسِيَّةِ وَكَانَتْ هٰذِهِ
الْاِنْتِقَالَاتُ كُلُّهَا مَظَاهِرَ تَرَقِّيَاتِ الْعَالَمِ اِلٰى مَعَارِجِ الْحَقِيْقَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ. كَاَنَّ الْاِنْسَانَ
كَانَ فِيْ وَقْتٍ جَمَادًا وَّفِيْ وَقْتٍ اٰخَرَ نَبَاتًا وَّبَعْدَ ذَالِكَ حَيَوَانًا وَّبَعْدَ ذَالِكَ كَوْكَبًا وَّ
قَمَرًا وَّشَمْسًا حَتّٰى جُمِعَ فِي الْيَوْمِ الْخَامِسِ كُلَّمَا اقْتَضَتْ فِطْرَتُهٗ مِنَ الْقُوَى الْاَرْضِيَّةِ
وَالسَّمَاوِيَّةِ بِفَضْلِ اللّٰهِ اَحْسَنِ الْخَالِقِيْنَ. فَكَانَ الْخَلْقُ كُلُّهٗ فَرْدًا كَامِلًا لِاٰدَمَ اَوْمِرْاٰةً
لِّوُجُوْدِهِ الَّذِيْ اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَاَكْرَمَ. ثُمَّ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يُّرِيَ هٰذِهِ الْخَفَايَا عَلٰى
وَجْهِ الْكَمَالِ. فِيْ شَخْصٍ وَّاحِدٍ هُوَ مَظْهَرُ جَمِيْعِ هٰذِهِ الْخِصَالِ. فَتَجَلَّتْ رُوْحَانِيَّةُ اٰدَمَ
بِالتَّجَلِّي الْجَامِعِ الْكَامِلِ فِي السَّاعَةِ الْاٰخِرَةِ مِنَ الْجُمُعَةِ. اَعْنِي الْيَوْمَ الَّذِيْ هُوَ السَّادِسُ
مِنَ السِّتَّةِ. فَكَذَالِكَ طَلَعَتْ رُوْحَانِيَّةُ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْاَلْفِ الْخَامِسِ
بِاِجْمَالِ صِفَاتِهَا وَمَا كَانَ ذَالِكَ الزَّمَانُ مُنْتَهٰى تَرَقِّيَاتِهَا بَلْ كَانَتْ قَدَمًا اُوْلٰى

کیونکہ زمین اپنی تمام مخلوق کے ساتھ اور آسمان اپنی تمام مصنوعات کے ساتھ آدم کی ہویت کی حقیقت تھے گویا آدم کا مادہ تھا گویا آدم کا مادہ جمادی حقیقت سے نباتی حقیقت کی طرف اور نباتی حقیقت سے حیوانیت کی ہویت کی طرف منتقل ہوا پھر روحانیت کے طور پر کوکبی کمالات سے قمری کمالات کی طرف اور قمری انوار سے شمسی شعاعوں کی طرف انتقال فرمایا اور یہ سب انتقالات مظاہر ترقیات عالم کے حقیقت انسانیہ کے معارج کی طرف تھے) اور اس راز کو دوسرے لفظوں میں اس طرح پر سمجھنا چاہیئے کہ انسان ایک وقت جماد تھا اور دوسرے وقت نبات اور اس کے بعد حیوان اور اس کے بعد ستارہ اور چاند اور سورج تھا۔ یہاں تک کہ پانچویں دن وہ سب کچھ جو اس کی فطرت زمینی اور آسمانی قویٰ سے تقاضا کرتی تھی احسن الخالقین خدا کے فضل سے جمع ہو گیا۔ پس تمام پیدایش آدم کے لیے ایک فرد کامل تھا یا اس کے وجود کا آئینہ تھا جسے خدا نے معزز اور مکرم بنایا۔ پھر ارادہ فرمایا کہ پوشیدگیوں کو پورے طور پر ایک ہی شخص میں ظاہر کرے جو ان خصلتوں کا مظہر ہو۔ پس آدم کی روحانیت نے جامع کامل تجلی کے ساتھ جمعہ کے دن آخری ساعت میں تجلی فرمائی یعنی اس دن جو چھٹا ہے اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت نے پانچویں ہزار میں اجمالی صفات کے ساتھ ظہور فرمایا اور وہ زمانہ اس روحانیت کی ترقیات کا انتہا نہ تھا بلکہ اس کے کمالات کے معراج کے لیے پہلا قدم تھا

لِمَعَارِجِ كَمَالَاتِهَا ثُمَّ كَمُلَتْ وَتَجَلَّتْ تِلْكَ الرُّوْحَانِيَّةُ فِيْ اٰخِرِ الْاَلْفِ السَّادِسِ اَعْنِيْ فِيْ هٰذَا الْحِيْنِ۔ كَمَا خُلِقَ اٰدَمُ فِيْ اٰخِرِ الْيَوْمِ السَّادِسِ بِاِذْنِ اللّٰهِ اَحْسَنِ الْخَالِقِيْنَ۔ وَاتَّخَذَتْ رُوْحَانِيَّةُ نَبِيِّنَا خَيْرِ الرُّسُلِ مَظْهَرًا مِّنْ اُمَّتِهٖ لِتَبْلُغَ كَمَالَ ظُهُوْرِهَا وَغَلَبَةَ نُوْرِهَا كَمَا كَانَ وَعْدُ اللّٰهِ فِي الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ۔ فَاَنَا ذَالِكَ الْمَظْهَرُ الْمَوْعُوْدُ۔ وَالنُّوْرُ الْمَعْهُوْدُ۔ فَاٰمِنْ وَّلَا تَكُنْ مِّنَ الْكَافِرِيْنَ۔

(خطبہ الہامیہ صـ۱۷۱-۱۷۸)

فرشتوں کا جناب الٰہی میں عرض کرنا کہ کیا تو ایک مفسد کو خلیفہ بنانے لگا ہے اس کے کیا معنے ہیں پس واضح ہو کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے چھٹے دن آسمانوں کے سات طبقے بنائے اور ہر ایک آسمان کے قضاءِ قدر کا انتظام فرمایا اور چھٹا دن جو ستارہ سعد اکبر کا دن ہے یعنی مشتری کا دن قریب الاختتام ہوگیا اور فرشتے جن کو حسب منطوق آیت وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا[1] سعد و نحس کا علم دیا گیا تھا اور ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ سعد اکبر مشتری ہے اور انہوں نے دیکھا کہ بظاہر اس دن کا حصہ آدم کو نہیں ملا کیونکہ دن میں سے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے سو یہ خیال گذرا کہ اب پیدائش آدم کی زحل کے وقت میں ہوگی اس کی سرشت میں زحلی تاثیریں جو قہر اور عذاب وغیرہ ہے رکھی جائیں گی اس لیے اس کا وجود بڑے فتنوں کا موجب ہوگا سو بنا اعتراض کی ایک ظنی امر تھا نہ یقینی اس لیے ظنی پیرایہ میں انہوں نے انکار کیا اور عرض کیا کہ کیا تو ایسے شخص کو پیدا کرتا ہے جو مفسد اور خوں ریز ہوگا اور خیال کیا کہ ہم زاہد اور عابد اور تقدیس کرنے والے اور ہر ایک بدی سے پاک ہیں اور نیز ہماری پیدائش مشتری کے وقت میں ہے جو سعد اکبر ہے تب ان کو جواب ملا کہ اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی تمہیں خبر نہیں کہ میں آدم کو کس وقت بناؤں گا میں مشتری کے وقت کے اُس حصے میں اُس کو بناؤں گا جو اس دن کے تمام حصوں میں سے زیادہ مبارک ہے اور اگرچہ جمعہ کا دن سعد اکبر ہے لیکن اُس کے عصر کے وقت کی گھڑی ہر ایک اسکی گھڑی سے سعادت اور برکت میں سبقت لے گئی ہے۔ سو آدم جمعہ کی اخیر گھڑی میں بنایا گیا یعنی عصر کے وقت پیدا کیا گیا اسی وجہ سے احادیث میں ترغیب دی گئی ہے کہ جمعہ کی عصر اور مغرب کے درمیان بہت دعا کرو کہ اس میں ایک گھڑی ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے

پھر اُس روحانیت نے چھٹے ہزار کے آخر میں یعنی اس وقت پوری طرح سے تجلی فرمائی جیسا کہ آدم چھٹے دن کے آخر میں احسن الخالقین خدا کے اذن سے پیدا ہوا اور خیر الرسل کی روحانیت نے اپنے ظہور کے کمال کے لیے اور اپنے نور کے غلبہ کے لیے ایک مظہر اختیار کیا جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کتاب مبین میں وعدہ فرمایا تھا پس میں وہی مظہر ہوں پس ایمان لا اور کافروں سے مت ہو۔ (خطبہ الہامیہ صـ۱۷۱-۱۷۸)

---

[1] حٰمٓ السجدۃ: ۱۳۔

یہ وہی گھڑی ہے جس کی فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی اس گھڑی میں جو پیدا ہو وہ آسمان پر آدم کہلاتا ہے اور ایک بڑے سلسلہ کی اس سے بنیاد پڑتی ہے سو آدم اسی گھڑی میں پیدا کیا گیا اس لیے آدم ثانی یعنی اس عاجز کو یہی گھڑی عطا کی گئی اسی کی طرف براہین احمدیہ کے اس الہام میں اشارہ ہے کہ یَنْقَطِعُ اٰبَآءُکَ وَیُبْدَءُ مِنْکَ دیکھو براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۰۔ اور یہ اتفاقات عجیبہ میں سے ہے کہ یہ عاجز نہ صرف ہزار ششم کے آخری حصہ میں پیدا ہوا جو مشتری سے وہی تعلق رکھتا ہے جو آدم کا روز ششم یعنی اس کا آخری حصہ تعلق رکھتا تھا بلکہ یہ عاجز بروز جمعہ چاند کی چودھویں تاریخ میں پیدا ہوا ہے۔ اس جگہ ایک اور بات بیان کرنے کے لائق ہے کہ اگر یہ سوال ہو کہ جمعہ کی آخری گھڑی جو عصر کے وقت کی ہے جس میں آدم پیدا کیا گیا کیوں ایسی مبارک ہے اور کیوں آدم کی پیدائش کے لیے وہ خاص کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تاثیر کواکب کا نظام ایسا رکھا ہے کہ ایک ستارہ اپنے عمل کے آخری حصہ میں دوسرے ستارے کا کچھ اثر لے لیتا ہے جو اُس حصے سے ملحق ہو اور اس کے بعد میں آنے والا ہو۔ اب چونکہ عصر کے وقت سے جب آدم پیدا کیا گیا رات قریب تھی لہٰذا وہ وقت زحل کی تاثیر سے بھی کچھ حصہ رکھتا تھا اور مشتری سے بھی فیضیاب تھا جو جمالی رنگ کی تاثیرات اپنے اندر رکھتا ہے سو خدا نے آدم کو جمعہ کے دن عصر کے وقت بنایا کیونکہ اس کو منظور تھا کہ آدم کو جلال اور جمال کا جامع بنا دے جیسا کہ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ خَلَقْتُ بِیَدَیَّ[1] یعنی آدم کو مَیں نے اپنے دونوں ہاتھ سے پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے ہاتھ انسان کی طرح نہیں ہیں پس دونوں ہاتھ سے مراد جمالی اور جلالی تجلّی ہے۔ پس اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو جلالی اور جمالی تجلی کا جامع پیدا کیا گیا اور چونکہ اللہ تعالیٰ علمی سلسلہ کو ضائع کرنا نہیں چاہتا اس لیے اس نے آدم کی پیدائش کے وقت اُن ستاروں کی تاثیرات سے بھی کام لیا ہے جن کو اس نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ اور یہ ستارے فقط زینت کے لیے نہیں ہیں جیسا عوام خیال کرتے ہیں بلکہ ان میں تاثیرات ہیں جیسا کہ آیت وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا[2] سے یعنی حفظاً کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے یعنے نظام دنیا کی محافظت میں ان ستاروں کو دخل ہے اُسی قسم کا دخل جیسا کہ انسانی صحت میں دوا اور غذا کو ہوتا ہے جس کو الوہیت کے اقتدار میں کچھ دخل نہیں بلکہ جبروت ایزدی کے آگے یہ تمام چیزیں بطور مردہ ہیں یہ چیزیں بجز اذنِ الٰہی کچھ نہیں کر سکتیں ان کی تاثیرات خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ پس واقعی اور صحیح امر یہی ہے کہ ستاروں میں تاثیرات ہیں جن کا زمین پر اثر ہوتا ہے لہٰذا اُس انسان سے زیادہ تر کوئی دنیا میں جاہل نہیں کہ جو بنفشہ اور نیلوفر اور تربد اور سقمونیا اور خیار شنبر کی تاثیرات کا تو قائل ہے مگر اُن ستاروں کی تاثیرات کا منکر ہے جو قدرت کے ہاتھ کے اول درجہ پر تجلی گاہ اور مظہر العجائب ہیں جن کی نسبت خود خدا تعالیٰ نے حفظاً کا لفظ استعمال کیا ہے یہ لوگ جو سراپا جہالت میں غرق ہیں اس علمی سلسلہ کو شرک میں داخل کرتے ہیں۔ نہیں جانتے جو دنیا میں خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہی ہے جو

[1] ص: ۷۶ ۔ [2] حٰم السجدۃ: ۱۳

کوئی چیز اس نے لغو اور بے فائدہ اور بے تاثیر پیدا نہیں کی جبکہ وہ فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے
تو اب تبلاؤ کہ سماء الدنیا کو لاکھوں ستاروں سے پر کر دینا انسان کو اس سے کیا فائدہ ہے۔ اور خدا کا یہ کہنا کہ
سب چیزیں انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں ضرور ہمیں اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ان چیزوں کے اندر خاص وہ تاثیرات
ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی تمدّن پر اپنا اثر ڈالتی ہیں جیسا کہ متقدمین حکما نے لکھا ہے کہ زمین ابتدا میں بہت ناہموار
تھی خدا نے ستاروں کی تاثیرات کے ساتھ اس کو درست کیا ہے اور یہ ستارے جیسا کہ یہ جاہل لوگ سمجھتے ہیں آسمان
دنیا پر ہی نہیں ہیں بلکہ بعض بعض سے بڑے بڑے بعد پر واقع ہیں اسی آسمان میں مشتری نظر آتا ہے جو چھٹے آسمان پر ہے
ایسا ہی زُحل بھی دکھائی دیتا ہے جو ہفتم آسمان پر ہے اور اسی وجہ سے اُس کا نام زُحل ہے جو اس کا بُعد تمام ستاروں سے
زیادہ ہے کیونکہ لغت میں زُحل بہت دور ہونے والے کو بھی کہتے ہیں اور آسمان سے مراد وہ طبقات لطیفہ ہیں جو بعض
بعض سے اپنے خواص کے ساتھ متمیز ہیں۔ یہ کہنا بھی جہالت ہے کہ آسمان کچھ چیز نہیں کیونکہ جہاں تک عالم بالا کی طرف
سیر کی جائے محض خلا کا حصہ کسی جگہ نظر نہیں آئے گا۔ پس کامل استقراء جو مجہولات کی اصلیت دریافت کرنے کے
لیے اول درجہ پر ہے صریح اور صاف طور پر سمجھاتا ہے کہ محض خلا کسی جگہ نہیں ہے۔ اور جیسا کہ پہلا آدم جمالی اور جلالی
رنگ میں مشتری اور زحل کی دونوں تاثیریں لے کر پیدا ہوا اسی طرح وہ آدم جو ہزار ششم کے آخر میں پیدا ہوا وہ بھی یہ
دونوں تاثیریں اپنے اندر رکھتا ہے اس کے پہلے قدم پر مُردوں کا زندہ ہونا ہے اور دوسرے قدم پر زندوں کا مرنا
ہے یعنی قیامت ہیں۔ خدا نے اس کے وقت میں رحمت کی نشانیاں بھی رکھی ہیں اور قہر کی بھی تا دونوں رنگ جمالی اور جلالی
ثابت ہو جائیں آخری زمانہ کی نسبت خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ آفتاب اور ماہتاب ایک ہی وقت میں تاریک ہو جائینگے
زمین پر جا بجا خسف واقع ہوگا۔ پہاڑ اڑائے جائیں گے۔ یہ سب قہری اور جلالی نشانیاں ہیں۔ عیسائیت کے غلبہ کے
زمانہ کی نسبت بھی اسی قسم کے اشارات قرآن شریف میں پائے جاتے ہیں کیونکہ لکھا ہے کہ قریب ہے کہ اس دین کے
غلبہ کے وقت آسمان پھٹ جائیں اور زمین میں بذریعہ خسف وغیرہ ہلاکتیں واقع ہوں غرض وجود آدم ثانی بھی جامع
جلال وجمال ہے اور اسی وجہ سے آخر ہزار ششم میں پیدا کیا گیا اور ہزار ششم کے حساب سے دنیا کے دنوں کا یہ جمعہ
ہے اور جمعہ میں سے یہ عصر کا وقت ہے جس میں یہ آدم پیدا ہوا۔ اور سورہ فاتحہ میں اس مقام کے متعلق ایک لطیف
اشارہ ہے اور وہ یہ کہ چونکہ سورہ فاتحہ ایک ایسی سورۃ ہے جس میں مبدء اور معاد کا ذکر ہے یعنی خدا کی ربوبیت سے
لیکر یوم الدین تک سلسلہ صفات الٰہیہ کو پہنچایا ہے اس مناسبت کے لحاظ سے حکیم ازلی نے اس سورۃ کو سات آیتوں
پر تقسیم کیا ہے تا دنیا کی عمر میں سات ہزار کی طرف اشارہ ہو۔ اور چھٹی آیت اس سورۃ کی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ
ہے گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھٹے ہزار کی تاریکی آسمانی ہدایت کو چاہے گی اور انسانی سلیم فطرتیں خدا
کی جناب سے ایک ہادی کو طلب کریں گی یعنی مسیح موعود کو۔ اور ضالین پر اس سورۃ کو ختم کیا ہے یعنی ساتویں

آیت پر جو ضالین کے لفظ پر ختم ہوتی ہے ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ضالین پر قیامت آئے گی ۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۹-۱۱۲ حاشیہ)

آدم عصر کے وقت چھٹے دن پیدا ہوا تھا ۔ اس وقت مشتری کا دورہ ختم ہو کر زحل کا شروع ہونے والا تھا چونکہ زحل کی تاثیرات خوں ریزی اور سفاکی ہیں ۔ اس لیے ملائکہ نے اس خیال سے کہ یہ زحل کی تاثیرات کے اندر پیدا ہوگا ۔ یہ کہا اَتَجۡعَلُ فِیۡھَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡھَا ۔ اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس طرح انسان ارضی تاثیرات اور بوٹیوں کے خواص سے واقف ہوتا ہے اس طرح پر آسمانی مخلوق آسمانی تاثیرات سے باخبر ہوتی ہے ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً سے استنباط ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلے سے اس وقت کوئی قوم موجود ہو اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے وَالۡجَآنَّ خَلَقۡنٰہُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ[1] ایک قوم جان بھی آدم سے پہلے موجود تھی بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے ۔ اور یہی حق ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کو ہمیشہ سے خالق نہ مانیں تو اس کی ذات پر (نعوذ باللہ) حرف آتا ہے اور ماننا پڑے گا کہ آدم سے پیشتر خدا تعالیٰ معطل تھا لیکن چونکہ قرآن شریف خدا تعالیٰ کی صفات کو قدیمی بیان کرتا ہے اسی لیے اس حدیث کا مضمون راست ہے قرآن میں جو کوئی ترکیب ہے وہ ان صفات کے استمرار پر دلالت کرتی ہیں لیکن اگر آدم سے ابتدائے خلق ہوتی اور اس سے پیشتر نہ ہوتی تو پھر یہ نحوی ترکیب قرآن میں نہ ہوتی ۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۷)

ممکن ہے ۔ کہ ایک قوم موجود ہو ۔ اور اس کے ہوتے وہ اور قوم کو پیدا کر دیوے ۔ یا ایک قوم کو ہلاک کر کے اور پیدا کر دے ۔ موسیٰ کے قصہ میں بھی ایک جگہ ایسا واقعہ بیان ہوا ہے ۔ آدم کے وقت بھی خدا سابقہ قوموں کو ہلاک کر چکا تھا پھر جب آدم کو پیدا کیا تو اور قوم بھی پیدا کر دی خلیفہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ایک قوم ضرور پہلے سے موجود ہو ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک اور قوم کو پیدا کر کے پہلی قوم کا خلیفہ اُسے قرار دیا جاوے اور آدم اس کے مورث اعلیٰ ہوں کیونکہ خدا کی ذات ازلی ابدی ہے اس پر تغیر نہیں آتا مگر انسان ازلی ابدی نہیں ہے اس پر تغیر آتا ہے میرے الہام میں بھی مجھے آدم کہا گیا ہے ۔

جب روحانیت پر موت آجاتی ہے یعنی اصل انسانیت فوت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بطور آدم کے ایک اور کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح سے ہمیشہ سے آدم پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ اگر قدیم سے یہ سلسلہ ایسا نہ ہو تو پھر ماننا پڑیگا کہ ۵ یا ۶ ہزار برس سے خدا ہے قدیم سے نہیں ہے یا یہ کہ اول وہ معطل تھا ۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۷)

---

[1] الحجر : ۲۸ ÷

اسلام اور قرآن شریف کا یہ مذہب نہیں کہ دنیا چھ ہزار سال سے ہے یہ تو عیسائی لوگوں کا عقیدہ ہے مگر قرآن شریف میں تو خدا تعالیٰ نے آدمؑ کے متعلق فرمایا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً - اب ظاہر ہے کہ خلیفہ اس کو کہتے ہیں کہ جو کسی کے پیچھے آوے - اور اس کا جانشین ہو جس سے ثابت ہوتا ہے - کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق تھی آدم اس کا قائم مقام اور جانشین ہُوا۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۱۴ مورخہ ۶ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی اس مسئلہ میں ہم توریت کی پیروی کرتے ہیں کہ چھ سات ہزار سال سے ہی جب سے یہ آدم پیدا ہوا تھا اس دنیا کا آغاز ہوا ہے اور اس سے پہلے کچھ بھی نہ تھا اور خدا گویا معطل تھا - اور نہ ہی ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ تمام نسل انسانی جو اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہے یہ اسی آخری آدم کی نسل ہے - ہم تو اس آدم سے پہلے بھی نسل انسانی کے قائل ہیں - جیسا کہ قرآن شریف کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے - خدا نے یہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً - خلیفہ کہتے ہیں جانشین کو - اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق موجود تھی - پس امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے لوگوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس آخری آدم کی اولاد میں سے ہیں یا کسی دوسرے آدم کی اولاد میں سے ہیں - آپ کے سوال کے مناسب حال ایک قول حضرت محی الدین ابن عربی صاحب کا ہے وہ لکھتے ہیں کہ میں حج کرنے کے واسطے گیا تو وہاں مجھے ایک شخص ملا جس کو میں نے خیال کیا کہ وہ آدم ہے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تو ہی آدم ہے؟ اس پر اُس نے جواب دیا کہ تم کون سے آدم کے متعلق سوال کرتے ہو؟ آدم تو ہزاروں گزر چکے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا: فرشتوں نے کشفی رنگ میں دیکھا - آدم کی اولاد نے جو فساد ڈالنا تھا۔

(الحکم جلد ۴۷ نمبر ۱۹ تا ۲۲ مورخہ ۲۱/۲۸ مئی و ۷/۱۴ جون ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۵)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا اَیْ عَلَّمَهٗ حَقَائِقَ الْاَشْيَآءِ كُلِّهَا وَجَعَلَهٗ عَالَمًا مُّجْمَلًا مَّثِيْلَ الْعَالَمِيْنَ۔ [1]

(ترجمہ از مرتب) [1] وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا یعنی آدم کو اشیاء کے تمام حقائق کا علم عطا فرمایا اور اُسے ایک مجمل عالم بنایا جو عالمین کا مثیل تھا۔ (سر الخلافہ صفحہ ۴۸)

قَالَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ فَهٰذَا التَّعْلِيْمُ يَدُلُّ عَلٰى اَشْيَآءٍ مِّنْهَا اَنَّهٗ كَانَ مُعَلِّمَ الْكَلِمَاتِ بِتَوَسُّطِ الْمُسَمَّيَاتِ۔ وَنَعْنِيْ بِالْمُسَمَّيَاتِ كُلَّمَا يُمْكِنُ بَيَانُهٗ بِالْاِشَارَاتِ فِعْلاً كَانَ اَوْ مِنْ اَسْمَآءِ الْمَخْلُوْقَاتِ۔ وَمِنْهَا اَنَّهٗ كَانَ مُعَلِّمَ حَقَآئِقِ الْاَشْيَآءِ وَخَوَآصِّهَا الْمَكْتُوْمَةِ الْمَخْزُوْنَةِ فِيْ حَيِّزِ الْاِخْتِفَآءِ۔ بِلُغَةٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ وَاِنْ قُلْتَ اِنَّ النَّحْوِيِّيْنَ خَصَّصُوْا لَفْظَ الْاِسْمِ بِالْاَسْمَآءِ الْمَخْصُوْصَةِ الَّتِيْ لَهَا مَعَانِيْ وَلَا تَقْتَرِنُ بِاَحَدٍ مِّنَ الْاَزْمِنَةِ الثَّلَاثَةِ فَجَوَابُهٗ اَنَّ ذٰلِكَ اصْطِلَاحٌ لِّهٰذِهِ الْفِرْقَةِ۔ وَلَا اِعْتِبَارَ بِهٖ عِنْدَ نَظْرِ الْحَقِيْقَةِ۔ فَانْظُرْ كَالْمُبْصِرِيْنَ۔ وَاِنْ قِيْلَ اِنَّ الْمَشْهُوْرَ بَيْنَ الْعَآمَّةِ مِنْ اَهْلِ الْمِلَّةِ۔ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّمَ اٰدَمَ جَمِيْعَ اللُّغَاتِ الْمُخْتَلِفَةِ۔ فَكَانَ يَنْطِقُ بِكُلِّ لُغَةٍ مِّنَ الْعَرَبِيَّةِ وَالْفَارِسِيَّةِ وَغَيْرِهَا مِنَ الْاَلْسِنَةِ۔ فَجَوَابُهٗ اَنَّ هٰذَا خَطَاءٌ نَشَاَ مِنَ الْغَفْلَةِ۔ لَا يَلْتَفِتُ اِلَيْهِ اَحَدٌ مِّنْ اَهْلِ الْخُبْرَةِ بِمَا خَالَفَ اَمْرًا ثَبَتَ بِالْبَدَاهَةِ۔ وَمَا هُوَ اِلَّا زَعْمُ الْغَافِلِيْنَ۔ بَلِ الْعَرَبِيَّةُ هِيَ اللِّسَانُ مِنْ مُّسْتَاْنَفِ الْاَيَّامِ وَمُسْتَطْرَفِهَا۔ وَلَيْسَ غَيْرُهَا اِلَّا كَمَرْجَانٍ مِّنْ دُرَرِ صَدَفِهَا وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْقُرْاٰنَ وَالتَّوْرَاتَ۔ قَدْ اَثْبَتَا مَا قُلْنَا وَاَكْمَلَا الْاِثْبَاتَ اَلَا تَعْلَمُ مَا جَآءَ فِي الْاَصْحَاحِ الْحَادِيْ الْعَشَرَ

(ترجمہ از اصل کتاب) کہا ہے ۔کہ خدا نے آدم کو نام سکھائے ۔پس یہ سکھلانا کئی باتوں پر دلالت کرتا ہے اُن میں سے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ نے کلمات کو مسمیات کے ذریعہ سے سکھلایا اور مسمیات سے مراد ہمارے ایسے امور ہیں جن کا بیان کرنا اشارات کے ذریعہ سے ممکن ہے خواہ وہ فعل ہوں یا اسماء مخلوقات میں سے ہوں اور پھر دوسرا امر یہ ہے کہ حقائق اشیاء اور ان کے جو چھپے ہوئے خواص ہیں وہ زبان عربی میں سکھلائے گئے اور اگر تو یہ بات کہے کہ نحویوں نے لفظ اسم کو اسماء مخصوصہ سے خاص کیا ہے یعنی وہ اسماء جن کے واسطے معانی ہیں اور تین زمانوں میں سے کسی سے اقتران نہیں رکھتے ہیں پس جواب اس کا یہ ہے کہ یہ اس فرقہ کی اصطلاح ہے اور جب ہم حقیقی طور پر نظر کریں تو یہ اصطلاح ساقط الاعتبار ہوگی پس دیکھنے والوں کی طرح سوچ ۔اور اگر کوئی کہے کہ عوام مسلمانوں میں تو یہ مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو تمام بولیاں سکھادی تھیں اور وہ ہر یک بولی عربی فارسی وغیرہ بولتا تھا پس اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خطا ہے اور اس کی طرف کوئی عقلمند توجہ نہیں کرے گا کیونکہ یہ بدیہی الثبوت امر کے مخالف ہے اور بے خبروں کا گمان باطل ہے بلکہ پہلی زبان اور پہلے زمانہ کی بولی صرف عربی ہے اور اس کا غیر اس کا مال موروثی ہے یا کوئی چھوٹا سا موتی اس کے موتیوں میں سے ہے اور تو جانتا ہے کہ قرآن اور تورات نے جو کچھ ہم نے کہا وہ ثابت کردیا ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ توریت کتاب پیدائش گیارھویں باب میں لکھا ہے

مِنَ التَّكْوِيْنِ۔ فَاِنَّهٗ شَهِدَ اَنَّ اللِّسَانَ كَانَتْ وَاحِدَةً فِي الْاَرَضِيْنَ۔ ثُمَّ اخْتَلَفُوْا بِبَابِلَ مُعْرِقِيْنَ۔ وَاَمَّا الْقُرْاٰنُ فَقَدْ سَبَقَ فِيْهِ الْبَيَانُ۔ فَفَكِّرْ كَالْمُحَقِّقِيْنَ ثُمَّ هٰهُنَا طَرِيْقٌ اٰخَرُ لِطُلَّابِ الْحَقِّ وَالْمَعْرِفَةِ وَهُوَ اَنَّا اِذَا نَظَرْنَا فِيْ سُنَنِ اللّٰهِ ذِي الْجَلَالِ وَالْحِكْمَةِ۔ فَوَجَدْنَا نِظَامَ خَلْقِهٖ عَلٰى طَرِيْقِ الْوَحْدَةِ۔ وَذٰلِكَ اَمْرٌ اخْتَارَهُ اللّٰهُ لِهِدَايَةِ الْبَرِيَّةِ۔ لِيَكُوْنَ عَلٰى اَحَدِيَّتِهٖ اَحَدٌ مِّنَ الْاَدِلَّةِ۔ وَ لِيَدُلَّ عَلٰى اَنَّهُ الْخَالِقُ الْوَاحِدُ لَاشَرِيْكَ لَهٗ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرَضِيْنَ۔ فَالَّذِيْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ كَيْفَ تُعْزٰى اِلَيْهِ كَثْرَةٌ غَيْرُ مُرَتَّبَةٍ۔ وَ لُغَاتٌ مُتَفَرِّقَةٌ غَيْرُ مُنْتَظِمَةٍ۔ اَلَاتَعْلَمُ اَنَّهٗ رَاعَى الْوَحْدَةَ فِيْ كُلِّ كَثْرَةٍ۔ وَاَشَارَ اِلَيْهِ فِيْ صُحُفٍ مُّطَهَّرَةٍ۔ وَّكِتَابِ اِمَامِ الْعَارِفِيْنَ۔ وَاَبَانَ فِيْ صُحُفِهِ الْغَرَّآءِ۔ اَنَّهٗ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ مِّنَ الْمَآءِ۔ فَانْظُرْ اِلٰى سُنَّةِ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَآءِ۔ كَيْفَ رَدَّ الْكَثْرَةَ اِلٰى وَحْدَةِ الْاَشْيَآءِ وَجَعَلَ الْمَآءَ اُمَّ الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ فَفَكِّرْ كَالْعُقَلَآءِ فَاِنَّهٗ عُنْوَانُ الْاِهْتِدَآءِ وَلَاتَسْتَعْجِلْ كَالْجَاهِلِيْنَ وَاِنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ دَلِيْلٌ وَّاضِحٌ عَلٰى سُنَّةِ خَالِقِ الرَّقِيْعِ

کہ ابتدا میں تمام زمین کی بولی ایک تھی پھر جب وہ عراق عرب میں داخل ہوئی تو بابل شہر میں بولیوں میں اختلاف پڑا اور قرآن کا بیان تو تو سُن چکا۔ پس تحقیق کرنے والوں کی طرح سوچ۔ پھر اس جگہ ایک اور طریق ثبوت حق اور معرفت کے طالبوں کے لیے ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ہم اللہ ذوالجلال کی سنتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم اس کی پیدائش کا نظام وحدت کے طور پر پاتے ہیں اور یہ وہ امر ہے جس کو خدا تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے اختیار کیا ہے تا کہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہو اور اس دلیل پر دلالت کرے کہ وہ اکیلا پیدا کرنے والا واحد لاشریک ہے کوئی اس کا شریک زمین و آسمان میں نہیں پس جس نے انسان کو نفس واحد سے پیدا کیا کیونکر اس کی طرف ایک ایسی کثرت منسوب کی جائے جو غیر مرتب ہے اور کیونکر ایسی زبانیں اس کی طرف سے سمجھی جائیں جو غیر منتظم ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اس نے ہر یک کثرت میں وحدت کی رعایت رکھی ہے اور اپنی پاک کلام میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو عارفوں کی امام ہے اور اُس نے اپنی کتاب روشن میں بیان فرمایا ہے کہ اُس نے ہر یک چیز کو پانی سے ہی پیدا کیا ہے پس خدا تعالیٰ کی سنت کی طرف دیکھ کیونکر اُس نے کثرت کو وحدت کی طرف رد کیا ہے اور پانی کو زمین اور آسمان کی ماں ٹھہرایا ہے پس عقلمندوں کی طرح سوچ کہ یہ ہدایت پانے کی علامت ہے اور جاہل مت بن اور یہ آیت خدا تعالیٰ کی سنت پر دلیل واضح ہے اور اس میں

وَالْغُبَرَآءِ - وَفِيهَا تَبْصِرَةٌ لِأَهْلِ الْأَنْظَارِ وَالْآرَآءِ - وَاللّٰهُ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ يَا مَعْشَرَ الطُّلَبَآءِ - هُوَالَّذِي نَوَّرَ مِنْ نُورٍ وَّاحِدٍ نُجُومَ السَّمَآءِ وَخَلَقَ نُفُوسًا مُّتَشَابِهَةً عَلَى الْغُبَرَآءِ - وَجَعَلَ الْإِنْسَانَ عَالَمًا جَامِعَ جَمِيعِ حَقَآئِقِ الْأَشْيَآءِ - فَلَوْ لَمْ يَكُنْ نِظَامُ الْخَلْقِ مَبْنِيًّا عَلَى الْوَحْدَةِ - لَمَا وَجَدْتَ فِي خَلْقِ اللّٰهِ وُجُوْدَ هٰذِهِ الْمُشَابَهَةِ - وَلَكَانَ خَلْقُ اللّٰهِ كَالْمُتَفَرِّقِيْنَ - بَلْ لَوْ لَمْ يَكُنِ النِّظَامُ الْوَحْدَانِيُّ لَبَطَلَتِ الْحِكَمُ وَضَاعَ السِّرُّ الرُّوْحَانِيُّ - وَسُدَّ الصِّرَاطُ الرَّبَّانِيُّ وَعَسِرَ أَمْرُ السَّالِكِيْنَ - فَمَالَكَ لَا تَفْهَمُ وَحْدَةً دَالَّةً عَلَى الْوَحِيْدِ - وَهِيَ فِي الْإِسْلَامِ مَدَارُ التَّوْحِيْدِ - وَأَصْلٌ كَبِيْرٌ لِلتَّعْظِيْمِ وَالتَّمْجِيْدِ - وَسِرَاجٌ مُّنِيْرٌ لِمَعْرِفَةِ الْوَحْدَانِيَّةِ الْإِلٰهِيَّةِ - وَالْأَحَدِيَّةِ الرَّبَّانِيَّةِ وَإِنَّهَا مِنْ عُلُوْمٍ اخْتُصَّتْ بِالْمُسْلِمِيْنَ -

(منن الرحمان صفحہ ۶۰)

ابتدا میں جب خدا نے انسان کو پیدا کیا اُس وقت بذریعہ الہام بولیوں کی تعلیم کرنا ایسا امر تھا کہ جس میں دونوں طور کی شرائط موجود تھیں۔ اول ذاتی قابلیت پہلے انسان میں جیسا کہ چاہیئے الہام پانے کے لیے موجود تھی۔ دوسری ضرورتِ حقّہ بھی الہام کی مقتضی تھی کیونکہ اُس وقت بجز خدائے تعالیٰ کے اور کوئی حضرتِ آدم کے لیے رفیق شفیق نہ تھا کہ جو اُن کو بولنا سکھاتا پھر اپنی تعلیم سے شائستگی اور تہذیب کے مرتبہ تک پہنچاتا بلکہ حضرتِ آدم کے لیے صرف ایک خدائے تعالیٰ تھا جس نے تمام ضروری حوائج آدم کو پورا کیا اور اُس کو آپ حُسنِ تربیت اور حسنِ تادیب سے مرتبۂ حقیقی انسانیت کے پہنچایا ہاں بعد اُس کے جب اولاد حضرتِ آدم کی دُنیا میں پھیل گئی اور جو علوم خدائے تعالیٰ

اہلِ نظر کے لیے بصیرت کی راہ ہے اور خدا تعالیٰ وتر ہے وتر کو دوست رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے ایک نور سے تمام ستاروں کو بنایا اور زمین پر تمام نفوس متشابہ پیدا کیے اور انسان کو ایک عالم جمیع حقائق اشیاء کا جامع بنایا پس اگر مخلوقات کا نظام وحدت پر مبنی نہ ہوتا تو خدا تعالیٰ کی پیدائش میں یہ مشابہت نہ پائی جاتی اور مخلوق متفرق چیزوں کی طرح ہوتی۔ بلکہ اگر نظام وحدانی نہ ہوتا تو حکمت باطل ہو جاتی اور سر روحانی ضائع ہو جاتا اور ربانی راہ بند ہو جاتی اور سالکوں کا امر مشکل ہو جاتا پس تجھے کیا ہو گیا کہ تو اس وحدت کو نہیں سمجھتا جو اُس یگانہ پر دلالت کرتی ہے اور وہی اسلام میں توحید کا مدار ہے اور اس کی تعظیم اور تمجید کے لیے اصل کبیر ہے اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی یکتائی کے پہچاننے کے لیے ایک چراغ روشن ہے اور ان علوم میں سے ہے جو اہلِ اسلام سے خاص ہے۔

(منن الرحمان صفحہ ۶۰)

نے آدم کو سکھلائے تھے وہ اُس کی اولاد میں بخوبی رواج پکڑ گئے تب بعض انسان بعض انسانوں کے اُستاد اور معلّم بن بیٹھے اور ہر ایک بچّہ کے لیے اُس کے والدین بولی سکھانے کے لیے رفیق شفیق نکل آئے مگر آدم کے لیے بجُز ایک خدا کے اور کوئی نہ تھا جو اُس کو بولی سکھاتا اور ادب انسانیّت سے ادب آموز کرتا اُس کے لیے بجائے اُستاد اور معلّم اور ماں اور باپ کے اکیلا خدا ہی تھا جس نے اُس کو پیدا کر کے آپ سب کچھ اُس کو سکھایا۔ غرض آدم کے لیے یہ ضرورت حقّاً و جوباً پیش آگئی تھی کہ خدا اس کی تربیت آپ فرماتا اور اس کے مایحتاج کا آپ بندوبست کرتا۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۶۱-۳۶۷)

ممکن ہے جس مقام پر آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی ہو وہاں کے لوگ کسی عذاب الٰہی سے ایسے تباہ ہو گئے ہوں کہ آدمی نہ بچا ہو دنیا میں یہ سلسلہ جاری ہے کہ کوئی مقام بالکل تباہ ہو جاتا ہے کوئی غیر آباد۔ آباد ہو جاتا ہے۔ کوئی برباد شُد پھر از سرِ نو آباد ہوتا ہے...... پس ایسی صورت میں ان مشکلات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایمان لانا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ رب۔ رحمان۔ رحیم۔ مالک یوم الدین ہے اور ہمیشہ سے ہی ہے جاندار ایک تو تکوّن سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک تکوین سے ممکن ہے آدم کی پیدائش کے وقت اور مخلوقات ہو اور اس کی جنس سے نہ ہو یا اگر ہو بھی تو اس میں کیا ہرج ہے کہ قدرت نمائی کے لیے خدا تعالیٰ نے حوا کو بھی ان کی پسلی سے پیدا کر دیا۔ (بدر جلد ۲ نمبر ۲۴ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸۷)

یہ الہام جو میری نسبت ہوا یعنی یَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ اَرَدْتُّ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ آدَمَ جس کے یہ معنی ہیں کہ اے آدم تو اپنے جوڑے کے ساتھ جنت میں رہ۔ میں نے چاہا کہ میں اپنا مظہر دکھلاؤں اس لیے میں نے اس آدم کو پیدا کیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدم صفی اللہ کے وجود کا سلسلہ دوریّہ اس عاجز کے وجود پر آکر ختم ہو گیا۔ یہ بات اہل حقیقت اور معرفت کے نزدیک مسلّم ہے کہ مراتب وجود دوریہ ہیں یعنی نوع انسان میں بعض بعض کی خو اور طبیعت پر آتے رہتے ہیں جیسا کہ پہلی کتابوں سے ثابت ہے کہ ایلیا یحییٰ نبی کی خو اور طبیعت پر آگیا اور جیسا کہ ہمارے نبی علیہ السلام حضرت ابراہیم کی خو اور طبیعت پر آئے اسی سر کے لحاظ سے یہ ملت محمدی ابراہیمی ملت کہلائی سو ضرور تھا کہ مرتبۂ آدمیّت کی حرکت دوری زمانہ کے انتہاء پر ختم ہوتی۔ سو یہ زمانہ جو آخر الزمان ہے۔ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے ایک شخص کو حضرت آدم علیہ السلام کے قدم پر پیدا کیا جو یہی راقم ہے اور اس کا نام بھی آدم رکھا...... اور پہلے آدم کی طرح خدا نے اس آدم کو بھی زمین کے حقیقی انسانوں سے خالی ہونے کے وقت میں اپنے دونوں ہاتھوں جلالی اور جمالی سے پیدا کر کے اس میں اپنی روح پھونکی کیونکہ دنیا میں کوئی روحانی انسان موجود نہ تھا جس سے یہ آدم روحانی تولّد پاتا اس لیے خدا نے خود روحانی باپ بن کر اس آدم کو پیدا کیا اور ظاہری پیدائش کے رو سے اُسی طرح نر اور مادہ پیدا کیا جس طرح کہ پہلا آدم پیدا کیا تھا یعنی اس نے مجھے بھی جو آخری آدم ہوں جوڑا پیدا کیا جیسا کہ الہام یَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ میں اس طرف ایک لطیف اشارہ ہے اور بعض گذشتہ اکابر نے خدا تعالیٰ سے الہام پا کر یہ پیشگوئی بھی کی تھی کہ وہ انتہائی آدم جو مہدی کامل اور خاتم ولایت عامہ ہے اپنی جسمانی خلقت کی رو سے جوڑا پیدا ہو گا یعنی آدم صفی اللہ

کی طرح مذکر اور مونث کی صورت پر پیدا ہوگا اور خاتم الاولاد ہوگا کیونکہ آدم نوع انسان میں سے پہلا مولود تھا۔ سو ضرور ہوا کہ وہ شخص جس پر بکمال و تمام دورہ حقیقت آدمیہ ختم ہو وہ خاتم الاولاد ہو یعنی اس کی موت کے بعد کوئی کامل انسان کسی عورت کے پیٹ سے نہ نکلے۔ اب یاد رہے کہ اس بندۂ حضرت احدیت کی پیدائش جسمانی اس پیشگوئی کے مطابق بھی ہوئی یعنی میں توام پیدا ہوا تھا اور میرے ساتھ ایک لڑکی تھی جس کا نام جنّت تھا اور یہ الہام کہ یَآ اٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ جو آج سے بیس برس پہلے براہین احمدیہ کے صفحہ ۴۹۶ میں درج ہے اس میں جو جنت کا لفظ ہے اس میں یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ لڑکی کہ جو میرے ساتھ پیدا ہوئی اس کا نام جنت تھا اور یہ لڑکی صرف سات ماہ تک زندہ رہ کر فوت ہوگئی تھی۔ غرض چونکہ خدا تعالیٰ نے اپنے کلام اور الہام میں مجھے آدم صفی اللہ سے مشابہت دی تو یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اس قانون قدرت کے مطابق جو مراتب وجود دوریہ میں حکیم مطلق کی طرف سے چلا آتا ہے مجھے آدم کی خو اور طبیعت اور واقعات کے مناسب حال پیدا کیا گیا ہے چنانچہ وہ واقعات جو حضرت آدم پر گذرے منجملہ ان کے یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش زوج کے طور پر تھی یعنی ایک مرد اور ایک عورت ساتھ تھی اور اسی طرح پر میری پیدائش ہوئی یعنی جیسا کہ میں ابھی لکھ چکا ہوں میرے ساتھ ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام جنّت تھا اور پہلے وہ لڑکی پیٹ میں سے نکلی تھی... اہل کشف نے مہدی خاتم الولایت کی علامتوں میں سے لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ وہ آخری مہدی جس کی وفات کے بعد اور کوئی مہدی پیدا نہیں ہوگا خدا سے براہ راست ہدایت پائے گا جس طرح آدم نے خدا سے ہدایت پائی اور وہ ان علوم اور اسرار کا حامل ہوگا جن کا آدم خدا سے حامل ہوا اور ظاہری مناسبت آدم سے اس کی یہ ہوگی کہ وہ بھی زوج کی صورت میں پیدا ہوگا یعنی مذکر اور مونث دونوں پیدا ہوں گے جس طرح آدم کی پیدائش تھی کہ ان کے ساتھ ایک مونث بھی پیدا ہوئی تھی یعنی حضرت حوّا علیہا السلام۔ اور خدا نے جیسا کہ ابتدا میں جوڑا پیدا کیا مجھے بھی اسی لیے جوڑا پیدا کیا کہ تا اوّلیت کو آخریت کے ساتھ مناسبت تام پیدا ہو جائے یعنی چونکہ ہر ایک وجود سلسلہ بروزات میں دَور کرتا رہتا ہے اور آخری بروز اُس کا بہ نسبت درمیانی بروزات کے اتم اور اکمل ہوتا ہے اس لیے حکمت الٰہیہ نے تقاضا کیا کہ وہ شخص کو جو آدم صفی اللہ کا آخری بروز ہے وہ اس کے واقعات سے اشد مناسبت پیدا کرے۔ سو آدم کا ذاتی واقعہ یہ ہے کہ خدا نے آدم کے ساتھ حوّا کو بھی پیدا کیا سو یہی واقعہ بروز اتم کے مقام میں آخری آدم کو پیش آیا کہ اس کے ساتھ بھی ایک لڑکی پیدا کی گئی اور اُسی آخری آدم کا نام عیسیٰ بھی رکھا گیا تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ حضرت عیسیٰ کو بھی آدم صفی اللہ کے ساتھ ایک مشابہت تھی لیکن آخری آدم جو بروزی طور پر عیسیٰ بھی ہے آدم صفی اللہ سے اشد مشابہت رکھتا ہے کیونکہ آدم صفی اللہ کے لیے جس قدر بروزات کا دَور ممکن تھا وہ تمام مراتب بروزی وجود کے طے کر کے آخری آدم پیدا ہوا ہے اور اس میں اتم اور اکمل بروزی حالت

دکھائی گئی ہے جیسا کہ براہین احمدیہ کے صفحہ ۵۰۰ میں میری نسبت ایک یہ خدا تعالیٰ کا کلام اور الہام ہے کہ خَلَقَ آدَمَ فَاَکْرَمَہٗ یعنی خدا نے آخری آدم کو پیدا کر کے پہلے آدموں پر ایک وجہ کی اس کو فضیلت بخشی۔ اس الہام اور کلام الٰہی کے یہی معنے ہیں کہ گو آدم صفی اللہ کے لیے کئی بروزات تھے جن میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے لیکن یہ آخری بروز اکمل اور اتم ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۵۴-۱۵۷)

اِنَّ اللّٰہَ وِتْرٌ یُّحِبُّ الْوِتْرَ فَاقْتَضَتْ وَحْدَتُہٗ اَنْ یَّکُوْنَ الْاِنْسَانُ الَّذِیْ ھُوَ خَاتَمُ الْخُلَفَآءِ مُشَابِھًا بِاٰدَمَ الَّذِیْ ھُوَ اَوَّلُ مَنْ اُعْطِیَ خِلَافَۃً عُظْمٰی۔ وَاَوَّلُ مَنْ نُفِخَ فِیْہِ الرُّوْحُ مِنْ رَّبِّ الْوَرٰی۔ لِیَکُوْنَ زَمَانُ نَوْعِ الْبَشَرِ کَدَائِرَۃٍ یَّتَّصِلُ نُقْطَتُہُ الْاٰخِرَۃُ بِنُقْطِھَا الْاُوْلٰی۔ وَلِیَدُلَّ عَلَی التَّوْحِیْدِ الَّذِیْ دُعِیَ اِلَیْہِ الْاِنْسَانُ۔ وَالتَّوْحِیْدُ اَحَبُّ الْاَشْیَآءِ اِلٰی رَبِّنَا الْاَعْلٰی۔ فَاخْتَارَ وَضْعًا دَوْرِیًّا فِیْ خَلْقِ الْاِنْسَانِ۔ فَلِذٰلِکَ خَتَمَ عَلٰی اٰدَمَ کَمَا کَانَ بَدْءٌ مِنْ اٰدَمَ فِیْ اَوَّلِ الْاَوَانِ وَاِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُتَفَکِّرِیْنَ۔ وَاِنَّ اٰدَمَ اٰخِرِ الزَّمَانِ حَقِیْقَۃً ھُوَ نَبِیُّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ وَالنِّسْبَۃُ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ کَنِسْبَۃِ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۶۹-۱۷۰)

۳۴۔ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ۝

تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں۔ سوا اس کے جو تو نے ہم کو سکھایا۔ تحقیق تو علم اور حکمت والا ہے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

(ترجمہ اصل کتاب سے) خدا اکیلا ہے اور ایک ہونے کو دوست رکھتا ہے اس لیے اس کی یکتائی نے چاہا کہ وہ انسان جو خلیفوں کا خاتم ہو اُس آدم کے مشابہ ہو جو سب خلیفوں کا پہلا تھا اور مخلوقات میں اول شخص تھا جس میں خدا نے (کی طرف سے) روح پھونکی گئی تھی اور یہ اس لیے کیا تاکہ نوع بشر کا زمانہ اس دائرہ کی طرح ہو جائے جس کا آخری نقطہ اس کے پہلے نقطے سے مل جاتا ہے اور نیز اس لیے کہ اس توحید پر دلالت کرے جس کی طرف انسان کو بلایا گیا ہے اور توحید ہمارے پروردگار کو سب چیزوں سے زیادہ پیاری ہے اس لیے انسان کی پیدائش میں وضع دوری کو اختیار فرمایا اور اسی سبب سے آدم پر ختم کیا جیسا کہ شروع میں آدم سے ابتدا کیا اور فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بڑا بھاری نشان ہے اور آخر زمانہ کا آدم درحقیقت ہمارے نبی کریم ہیں صلی اللہ علیہ وسلم اور میری نسبت اس کی جناب کے ساتھ استاد اور شاگرد کی نسبت ہے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۶۹-۱۷۰)

کیا عمدہ اور صاف اور پاک اور خدائے تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کے موافق یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ اُس سے ہونا ثابت ہے وُہ قبول کیا جائے اور جو کچھ آیندہ ثابت ہو اُس کے قبول کرنے کے لیے آمادہ رہیں اور بجز اُمور منافی صفاتِ کمالیہ حضرت باری عزّ اسمہ سب کاموں پر اُس کو قادر سمجھا جائے اور امکانی طور پر سب ممکناتِ قدرت پر ایمان لایا جائے یہی طریق اہلِ حق ہے جس سے خدائے تعالیٰ کی عظمت و کبریائی قبول کی جاتی ہے اور ایمانی صورت بھی محفوظ رہتی ہے جس پر ثواب پانے کا تمام مدار ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۵۵-۵۶)

طریق عبودیت یہی ہے کہ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا کہنے والوں کے ساتھ ہو۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۱)

خدا کا نام علیم ہے اور پھر قرآن میں آیا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ[1] اسی لیے ملائکہ نے کہا۔ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

۳۵ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ۗ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

انسان کی پیدائش میں دو قسم کے حُسن ہیں ایک حُسنِ معاملہ اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی تمام امانتوں اور عہد کے ادا کرنے میں یہ رعایت رکھے کہ کوئی امر حتّی الوسع ان کے متعلق فوت نہ ہو...... دوسرا حُسن انسان کی پیدائش میں حُسن بُشرہ ہے اور یہ دونوں حُسن اگرچہ روحانی اور جسمانی پیدائش درجۂ پنجم میں نمودار ہو جاتے ہیں لیکن آب و تاب اُن کی فیضان روح کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ جسمانی وجود کی روح جسمانی قالب طیار ہونے کے بعد جسم میں داخل ہوتی ہے ایسا ہی روحانی وجود کی روح روحانی قالب طیار ہونے کے بعد انسان کے روحانی وجود میں داخل ہوتی ہے یعنی اس وقت جبکہ انسان شریعت کا تمام جُوا اپنی گردن پر لے لیتا ہے اور مشقت اور مجاہدہ کے ساتھ تمام حدود الٰہیہ کے قبول کرنے کے لیے طیار ہوتا ہے اور ورزشِ شریعت اور بجا آوری احکام کتاب اللہ سے اس لائق ہو جاتا ہے کہ خدا کی روحانیت اس کی طرف توجہ فرماوے اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنی محبت ذاتیہ سے اپنے تئیں خدا تعالیٰ کی محبت ذاتیہ کا مستحق ٹھہرا لیتا ہے جو برف کی طرح سفید اور شہد کی طرح شیریں ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وجود روحانی خشوع کی حالت سے شروع ہوتا ہے اور روحانی نشو و نما کے چھٹے مرتبہ پر یعنی اس مرتبہ پر کہ جبکہ روحانی قالب کے کامل ہونے کے بعد محبت ذاتیہ الٰہیہ کا شعلہ انسان کے دل پر ایک روح کی طرح پڑتا ہے اور دائمی حضور کی حالت اُس کو بخش دیتا ہے کمال کو پہنچتا ہے اور تبھی روحانی حُسن اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے لیکن یہ

[1] الرحمٰن: ۲، ۳۔

جو رُوحانی حُسن ہے جس کو حسن معاملہ کے ساتھ موسوم کرسکتے ہیں یہ وہ حُسن ہے جو اپنی قوی کششوں کے ساتھ حُسن بُشرہ سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ حُسن بشرہ صرف ایک یا دو شخص کے فانی عشق کا موجب ہوگا جو جلد زوال پذیر ہو جائے گا اور اس کی کشش نہایت کمزور ہوگی لیکن وہ روحانی حُسن جس کو حُسن معاملہ سے موسوم کیا گیا ہے وہ اپنی کششوں میں ایسا سخت اور زبردست ہے کہ ایک دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور زمین و آسمان کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے اور قبولیت دعا کی بھی در حقیقت فلاسفی یہی ہے کہ جب ایسا روحانی حُسن والا انسان جس میں محبت آلہیّہ کی روح داخل ہو جاتی ہے جب کسی غیر ممکن اور نہایت مشکل امر کے لیے دعا کرتا ہے اور اس دعا پر پُورا پُورا زور دیتا ہے تو چونکہ وہ اپنی ذات میں حُسن روحانی رکھتا ہے اس لیے خدا تعالیٰ کے امر اور اذن سے اس عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کی طرف کھینچا جاتا ہے پس ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی کامیابی کے لیے کافی ہوں تجربہ اور خدا تعالیٰ کی پاک کتاب سے ثابت ہے کہ دُنیا کے ہر ایک ذرہ کو طبعاً ایسے شخص کے ساتھ ایک عشق ہوتا ہے اور اس کی دُعائیں اُن تمام ذرات کو ایسا اپنی طرف کھینچتی ہیں جیسا کہ آہن رُبا لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے پس غیر معمولی باتیں جن کا ذکر کسی علم طبعی اور فلسفہ میں نہیں اس کشش کی باعث ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کشش طبعی ہوتی ہے جب سے کہ صانع مطلق نے عالم اجسام کو ذرّات سے ترکیب دی ہے ہر ایک ذرّے میں وہ کشش رکھی ہے اور ہر ایک ذرّہ روحانی حُسن کا عاشق صادق ہے اور ایسا ہی ہر ایک سعید روح بھی۔ کیونکہ وہ حُسن تجلّی گاہ حق ہے۔ وہی حسن تھا جس کے لیے فرمایا گیا۔ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِیْسَ۔ اور اب بھی بہتیرے ابلیس ہیں جو اس حُسن کو شناخت نہیں کرتے مگر وہ حُسن بڑے بڑے کام دکھلا رہا ہے۔

نوح میں وہی حُسن تھا جس کی پاس خاطر حضرت عزّت جلّ شانہٗ کو منظور ہوئی اور تمام منکروں کو پانی کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد مُوسیٰ بھی وُہی حُسن روحانی لیکر آیا جس نے چند روز تکلیفیں اُٹھا کر آخر فرعون کا بیڑا غرق کیا۔ پھر سب کے بعد سیّد الانبیاء و خیر الورٰی مولانا و سیّدنا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم الشان رُوحانی حُسن لے کر آئے جس کی تعریف میں یہی آیت کریمہ کافی ہے دَنَا فَتَدَلّٰی۔ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[1] یعنی وہ نبی جناب الٰہی کے بہت نزدیک چلا گیا اور پھر مخلوق کی طرف جُھکا اور اس طرح پر دونوں حقوں کو جو حق اللہ اور حق العباد ہے ادا کر دیا اور دونوں قسم کا حُسن روحانی ظاہر کیا اور دونوں قوسوں میں وتر کی طرح ہو گیا یعنی دونوں قوسوں میں جو ایک درمیانی خط کی طرح ہو اور اس طرح اُس کا وجود واقع ہوا ہے جیسے یہ (قوس خالق | قوس مخلوق — درمیانی خط آنحضرت) اس حُسن کو ناپاک طبع اور اندھے لوگوں نے نہ دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ[2] یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تو انہیں دکھائی نہیں دیتا آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۱-۶۲)

---

[1] النجم: ۹، ۱۰ ❖ [2] الاعراف: ۱۹۹۔

آدم سے مراد کامل انسان ہے جب انسان کامل آدم بن جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم سجدہ (اطاعت) کا دیتا ہے اور اس کے ہر ایک کام کو خدا تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ سے سرانجام کرتا ہے لیکن آدم کامل بننے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا خدا سے سچا اور پکا تعلق ہو جب انسان ہر ایک حرکت اور سکون حکم الٰہی کے نیچے ہو کر کرتا ہے تو انسان خدا کا ہو جاتا ہے تب خدا انسان کا والی وارث ہو جاتا ہے اور پھر اس پر کوئی مخالفت سے دست اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ آدمی جو احکام الٰہی کی پروا نہیں کرتا خدا بھی اُس کی پروا نہیں کرتا ..... آدم علیہ السلام کامل انسان تھے تو فرشتوں کو سجدہ (اطاعۃ) کا حکم ہوا۔ اسی طرح اگر ہم میں ہر ایک آدم بنے تو وہ بھی فرشتوں سے سجدہ کا مستحق ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

اہل عرب اس قسم کے استثنا کرتے ہیں صرف و نحو میں بھی اگر دیکھا جاوے تو ایسے استثناء بکثرت ہوا کرتے ہیں اور ایسی نظیریں موجود ہیں جیسے کہا جاوے کہ میرے پاس ساری قوم آئی مگر گدھا۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ساری کی ساری قوم جنس حمار میں سے تھی غلط ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ کے بھی یہ معنے ہوئے کہ وہ فقط ابلیس ہی قوم جن میں سے تھا ملائکہ میں سے نہیں تھا ملائک ایک الگ پاک جنس ہے اور شیطان الگ۔ ملائکہ اور ابلیس کا راز ایسا مخفی در مخفی ہے کہ بجز آمنا و صدقنا کے انسان کو چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اقتدار و توفیق نہیں دی مگر وسوسہ اندازی میں وہ محرک ہے جیسے ملائکہ پاک تحریکات کے محرک ہیں ویسے ہی شیطان ناپاک جذبات کا محرک ہے۔ ملایکہ کی منشاء ہے کہ انسان پاکیزہ ہو مطہر ہو اور اُس کے اخلاق عمدہ ہوں اور اس کے بالمقابل شیطان چاہتا ہے کہ انسان گندہ اور ناپاک ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ قانون الٰہی ملائکہ و ابلیس کی تحریکات کا دوش بدوش چلتا ہے لیکن آخر کار ارادہ الٰہی غالب آ جاتا ہے۔ گویا پس پردہ ایک جنگ ہے جو خود بخود جاری رہ کر آخر قادر و مقتدر حق کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور باطل کی شکست۔

چار چیزیں ہیں جن کی کنہ و راز کو معلوم کرنا انسان کی طاقت سے بالاتر ہے اول۔ اللہ جل شانہ۔ دویم۔ روح۔ سویم۔ ملائکہ۔ چہارم۔ ابلیس۔ جو شخص ان چاروں میں سے خدا تعالیٰ کے وجود کا قایل ہے اور اس کے صفات الوہیت پر ایمان رکھتا ہے۔ ضرور ہے کہ وہ ہر سہ اشیاء روح و ملائکہ و ابلیس پر ایمان لائے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

۳۶۔ وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

حوا پسلی ہی سے بنائی گئی ہیں ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان لاتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی کہے کہ پھر ہماری پسلی نہ ہوتی تو میں کہتا ہوں کہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ میں اگر خدا تعالیٰ کو قادر اور عظیم الشان

نہ دیکھتا تو یہ دعاؤں کی قبولیت کے نمونے جو دیکھتا ہوں نظر نہ آتے۔ ... پس یہ کہنا کہ آدم علیہ السلام کی پسلی نکال لی تھی اور حوا اس پسلی سے بنی تو پھر پسلی کہاں سے آگئی سخت بیوقوفی اور اللہ تعالیٰ کے حضور سوء ادبی ہے۔

(الحکم جلد ۴ ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

انبیاء علیہم السلام کے گلہ کرنے سے بھی انسان کافر ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ ان تعلقات سے محض ناآشنا ہوتا ہے جو انبیاء و رسل اور اللہ تعالیٰ میں ہوتے ہیں اس لیے کسی ایسے امر کو جو ہماری سمجھ اور دانش سے بالاتر اور بالاتر ہے اپنی عقل کے پیمانہ سے ناپنا صریح حماقت ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا گلہ کرنے لگے کہ انہوں نے درخت ممنوع کا پھل کھایا۔ یا عَبَسَ وَتَوَلّٰی[1] کو لے بیٹھے۔ ایسی حرکت آداب الرسل کے خلاف ہے اور کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔

(الحکم جلد ۸ ۱۴-۱۵ مورخہ ۳۰ اپریل و یکم مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

یا اٰدم اسکن انت وزوجك الجنة اے آدم ..... تو اور جو شخص تیرا تابع اور رفیق ہے جنت میں یعنی نجات حقیقی کے وسائل میں داخل ہو جاؤ۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۴۹۶-۴۹۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

شجرہ کی نسبت سوال ہوا کہ وہ کونسا درخت تھا جس کی ممانعت کی گئی تھی۔ فرمایا کہ مفسروں نے کئی باتیں لکھی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ انگور ہوگا۔ شراب اسی سے پیدا ہوتی ہے اور شراب کی نسبت لکھا ہے رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت کا انگور ایسا ہی ہو کہ بغیر سڑانے گلانے کے اس کے تازہ شیرہ میں نشہ ہوتا ہو جیسے تاڑی کہ ذرا سی دیر کے بعد اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(البدر جلد ۲ ۱۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۲)

سوال ہوا کہ آدم کی جنت کہاں تھی؟ اس کے متعلق فرمایا۔ ہمارا مذہب یہی ہے کہ زمین میں ہی تھی خدا فرماتا ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ[2] آدم کی بود و باش آسمان پر یہ بات بالکل غلط ہے۔

(البدر جلد ۲ ۱۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۲)

۳۷ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

کامل یقین والوں کو شیطان چھو بھی نہیں سکتا ..... میرا تو یقین ہے کہ حضرت آدم کی استعداد میں کسی قدر تساہل تھا تب ہی تو شیطان کو وسوسہ کا قابو مل گیا۔ واللہ اگر اس جگہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سا جوہر قابل کھڑا کیا جاتا تو شیطان کا کچھ بھی پیش نہ جاتا۔

(بدر جلد ۱۲ ۲ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۱۲ء صفحہ ۲)

یہ غلط ہے کہ شیطان خود حوّا کے پاس گیا ہو بلکہ جیسا کہ اب چھپ کر آتا ہے ویسا ہی تب بھی چھپ کر گیا تھا

---

[1] سورہ عبس: ۲ [2] طٰہٰ: ۵۶

کسی آدمی کے اندر وہ اپنا خیال بھر دیتا ہے اور وہ اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ کسی ایسے ہی مخالف دین کے دل میں شیطان نے یہ بات ڈال دی تھی۔ اور وہ بہشت جس میں حضرت آدمؑ رہتے تھے وہ بھی زمین پر ہی تھا۔ کسی بدنے اُن کے دل میں وسوسہ ڈال دیا۔ (الحکم جلد ۵ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰)

شیطان کے معنے ہیں ہلاک ہونے والا یہ لفظ شَیْط سے نکلا ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۷)

جو وجود شر انگیز ہے۔ یعنی وجود شیطان جس کا مقام ذوالعقول کے قسم میں انتہائی نقطہ انخفاض میں واقع ہے اُس کا اثر ہر یک دل کو جو اُس سے کچھ نسبت رکھتا ہے شر کی طرف کھینچتا ہے جس قدر کوئی اُس سے مناسبت پیدا کرتا ہے اُسی قدر بے ایمانی اور خباثت کے خیال اُس کو سوجھتے ہیں یہاں تک کہ جس کو مناسبت تام ہو جاتی ہے وُہ اُسی کے رنگ اور روپ میں آکر پورا پورا شیطان ہو جاتا ہے اور ظلی طور پر اُن سب کمالات خباثت کو حاصل کر لیتا ہے جو اصلی شیطان کو حاصل ہیں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۰۲-۲۰۳ حاشیہ)

بعض فرقے جو شیطان کے وجود سے منکر ہیں وہ تعجب کریں گے کہ شیطان کیا چیز ہے پس ان کو یاد رہے کہ انسان کے دل کے ساتھ دو کششیں ہر وقت نوبت بہ نوبت لگی رہتی ہیں ایک کشش خیر کی اور ایک کشش شر کی۔ پس جو خیر کی کشش ہے شریعت اسلام اُس کو فرشتہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور جو شر کی کشش ہے اُس کو شریعت اسلام شیطان کی طرف منسوب کرتی ہے اور مدعا صرف اس قدر ہے کہ انسانی سرشت میں دو کششیں موجود ہیں کبھی انسان نیکی کی طرف جھکتا ہے اور کبھی بدی کی طرف۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۳۳)

شیطان کو ہمیشہ رات سے غرض ہے دن سے کچھ غرض نہیں کیونکہ وہ پُرانا چور ہے جو تاریکی میں قدم رکھتا ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۴۲)

تاریکی تاریکی کو پیدا کرتی ہے اندرونی روشنی اور روشنی کو لاتی ہے اسی واسطے تاریکی کو شیطان سے تشبیہ دی ہے اور روشنی روح القدس سے مشابہہ ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

توریت سے ثابت ہوتا ہے کہ سانپ آدم کے گناہ سے پہلے ہی لعنتی جانور تھا جس نے خدا کی مخالفت کی سو سوال یہ ہے کہ یہ آدم سے پہلے کیونکر لعنتی ہو گیا۔

توریت کا بیان ہے کہ سانپ نے حوّا سے باتیں کیں لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے قانون قدرت میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ سانپ انسان سے باتیں کرے سو کچھ شک نہیں کہ سانپ سے مراد شیطان ہے گو نحاش کا لفظ عبرانی میں صرف سانپ پر اطلاق پاتا ہے مگر کچھ شک نہیں کہ جو ام الالسنہ (عربی) میں لفظ آیا ہے وہ خنّاس ہے اور خنّاس کو غیر مرتب طور پر مقلوب کر کے اور خا کا نقطہ اڑا کر اور اس پر تین نقطے ڈال کر نحَّاش بنایا گیا ہے لیکن اب سوال یہ ہے کہ خدا کے قانون قدرت کے رو سے شیطان بھی انسان کے ساتھ باتیں نہیں کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان نے حوا

سے خواب میں سانپ کی صورت پر باتیں کیں یا کشف میں جو بیداری سے مشابہ ہوتا ہے باتیں کیں اور تعبیر کی رو سے سانپ شیطان کا نام ہے اور سانپ سے باتیں کرنا یہ ہے کہ کوئی ظالم بادشاہ ظہور کرے جیسا کہ لکھا ہے اِن رَّاٰی اَنَّہٗ یُکَلِّمُ الْحَیَّۃَ ظَہَرَ عَدُوٌّ مِّنَ الْفَرَاعِنَۃِ پس یہ بات قریب قیاس ہے کہ آدم کے خروج کا یہ باعث ہوا ہو کہ کوئی جابر بادشاہ اُس ملک میں آگیا ہو اور اُس نے آدم کو اس ملک سے نکال دیا ہو کیونکہ یہ عادت اللہ میں داخل نہیں ہے کہ یونہی خدا کے فرشتے دھکے دے کر نکالیں۔ سانپ کا حوا سے باتیں کرنا صاف دلالت کرتا ہے کہ یہ ایک استعارہ ہے کیونکہ خدا کا قانون قدرت اس بات کی شہادت نہیں دیتا کہ حیوانات انسان سے باتیں کریں اور سلیمان سے طیور کا باتیں کرنا بھی بطریق کشف کے تھا نہ کہ ظاہری طور پر اسی لیے وہ معجزہ تھا اور اگر وہ فعل مجرد انسانی قویٰ کے ذریعہ سے ہوتا تو آج کل کروڑ ہا آدمی حیوانات سے گفتگو کر سکتے۔ (الحکم جلد ۸ عہ۱۸ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء صہ۵)

وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ یعنی تم اپنے جسم خاکی کے ساتھ زمین پر ہی رہو گے یہاں تک کہ اپنے تمتّع کے دن پورے کر کے مرجاؤ گے یہ آیت جسم خاکی کو آسمان پر جانے سے روکتی ہے کیونکہ لَکُمْ جو اس جگہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے اس بات پر بصراحت دلالت کر رہا ہے کہ جسم خاکی آسمان پر جا نہیں سکتا بلکہ زمین سے ہی نکلا اور زمین میں ہی رہے گا اور زمین میں ہی داخل ہوگا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صہ۶۰۹)

(ترجمہ) تمہارے قرار کی جگہ زمین ہی رہے گی۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صہ۱۳۳ حاشیہ)

تمہاری قرار گاہ زمین ہی ہوگی اور موت کے دنوں تک تم زمین پر ہی اپنے آرام کی چیزیں حاصل کرو گے۔ یہ آیت بھی آیت ممدوحہ بالا (فِیْہَا تَحْیَوْنَ الخ) کے ہم معنی ہے پس کس طرح ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ زمین پر جو انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے صرف تینتیس ۳۳ برس تک زندگی بسر کریں مگر آسمان پر جو انسانوں کے رہنے کی جگہ نہیں دو ہزار برس تک یا اس سے بھی زیادہ کسی نامعلوم مدّت تک سکونت اختیار کر رکھیں اس سے تو شبہ پڑے گا کہ وہ انسان نہیں ہیں خاصکر اس صورت میں کہ ایسے فوق الانسانیت خواص دکھلانے میں کوئی دوسرا انسان اُن کا شریک نہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صہ۲۱۸-۲۱۹)

وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ یعنی تمہارا قرارگاہ زمین ہی رہے گی۔ (تحفہ گولڑویہ صہ۳)

تمہارا زمین پر ہی قرار ہوگا اور تم زمین پر ہی اپنی موت تک زندگی بسر کرو گے۔ یہ بھی خدا کا وعدہ ہے۔ (چشمہ معرفت صہ۲۱۹)

آدم جس بہشت میں سے نکالا گیا تھا وہ زمین پر ہی تھا بلکہ توریت میں ان کے حدود بھی بیان کیے گئے ہیں۔ نصوص قرآنیہ سے یہی ثابت ہے کہ انسان کے رہنے اور مرنے کے واسطے یہی زمین ہے۔ جو شخص اس کے برخلاف کچھ مذہب رکھتا ہے وہ خدا تعالےٰ کے کلام کی بے ادبی کرتا ہے۔

(بدر جلد ۶ عہ۸ ۲۱ فروری ۱۹۰۷ء صہ۵)

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝

دعا جب قبول ہونے والی ہوتی ہے تو اللہ اس کے لیے دل میں ایک سچا جوش اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ خود ہی ایک دعا سکھاتا ہے اور الہامی طور پر اس کا پیرایہ بتا دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے راست باز بندوں کو قبول ہونے والی دعائیں خود الہاماً سکھا دیتا ہے۔ بعض وقت ایسی دعا میں ایسا حصّہ بھی ہوتا ہے جس کو دعا کرنے والا ناپسند کرتا ہے مگر وہ قبول ہو جاتی ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًاۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝

یعنی جو لوگ میرے کلام کی پیروی کریں نہ اُن پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں سو یہ موتیں اور ذلتیں جو دنیا پرستوں پر آتی ہیں ان موتوں کے خوف سے وہ لوگ رہائی پا جاتے ہیں جو کہ خود رضائے الٰہی میں فانی ہو کر روحانی طور پر موت قبول کر لیتے ہیں۔ (ست بچن صفحہ ۹)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝

یعنی جو لوگ ہماری کتاب پہنچنے کے بعد کفر اختیار کریں اور تکذیب کریں وہ جہنم میں گرائے جائیں گے۔
(جنگ مقدس ۳۱ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۵۰)

جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی وہ جہنمی ہیں اور اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔
شہادت القرآن (بار دوم صفحہ ۴۳)

ہمارا ایمان یہی ہے کہ دوزخ میں ایک عرصہ تک آدمی رہے گا پھر نکل آئے گا گویا جن کی اصلاح نبوت سے نہیں ہو سکی اُن کی اصلاح دوزخ کریگا۔ حدیث میں آیا ہے۔ يَاْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ یعنی دوزخ پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اُس میں کوئی متنفس نہیں ہوگا اور نسیم صبا اُس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○

بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کا دیا ہوا لقب ہے اسرائیل کے معنے ہیں جو خدا سے بے وفائی نہیں کرتے اس کی اطاعت اور محبت کے رشتہ میں منسلک قوم حقیقی اور اصلی طور پر اسلام کے یہی معنے ہیں بہت سی پیشگوئیوں میں جو اسرائیل کا نام رکھا ہے ۔ یہ قلت فہم کی وجہ سے لوگوں کو سمجھ نہیں آتی ہیں اسرائیل سے مراد اسلام ہی ہے اور وہ پیشگوئیاں اسلام کے حق میں ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲؁ء صفحہ ۳)

کسی قوم موجودہ کو مخاطب کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطاب قوم موجودہ تک ہی محدود رہے بلکہ قرآن کریم کا تو یہ بھی محاورہ پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک قوم کو مخاطب کرتا ہے مگر اصل مخاطب کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو گذر گئے یا آیندہ آنیوالے ہیں مثلاً اللہ جل شانہ سورۃ البقرہ میں یہود موجودہ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ۔ یعنی اے بنی اسرائیل اُس نعمت کو یاد کرو جو ہم نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو تا میں بھی تمہارے عہد کو پورا کروں اور مجھ سے پس ڈرو۔ اب ظاہر ہے کہ یہود موجودہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کا مصداق تھے اُن پر تو کوئی انعام بھی نہیں ہوا تھا اور نہ اُن سے یہ عہد ہوا تھا کہ تم نے خاتم الانبیاء پر ایمان لانا۔

(شہادۃ القرآن بار دوم صفحہ ۲۹)

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ○

خدا کے پاک کلام قرآن کو ناپاک باتوں سے ملا کر پڑھنا بے ادبی ہے وہ تو صرف روٹیوں کی غرض سے ملاں لوگ پڑھتے ہیں اس ملک کے لوگ ختم وغیرہ دیتے ہیں تو ملاں لوگ لمبی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں کہ شوربا اور روٹی زیادہ ملے وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا یہ کفر ہے جو طریق آج کل پنجاب میں نماز کا ہے میرے نزدیک ہمیشہ سے اُس پر بھی اعتراض ہے۔ ملاں لوگ صرف مقررہ آدمیوں پر نظر کرکے جماعت کراتے ہیں ایسا امام شرعاً ناجائز ہے صحابہ میں کہیں نظیر نہیں ہے کہ اس طرح اجرت پر امامت کرائی ہو پھر اگر کسی کو مسجد سے نکالا جاوے تو

چیف کورٹ تک مقدمہ چلتا ہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک ملا نے نماز جنازہ کی ۶ یا ۷ تکبیریں کہیں لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ کام روزمرہ کے محاورہ سے یاد رہتا ہے کبھی سال میں ایک آدمی مرتا ہے تو کیسے یاد رہے۔ جب مجھے یہ بات بھول جاتی ہے کہ کوئی مرا بھی کرتا ہے تو اس وقت کوئی میت ہوتی ہے اسی طرح ایک ملا یہاں آکر رہا ہمارے میرزا صاحب نے اُسے محلے تقسیم کر دئے ایک دن وہ روتا ہوا آیا کہ مجھے جو محلہ دیا ہے اس کے آدمیوں کے قد چھوٹے ہیں اس لیے اُن کے مرنے پر جو کپڑا ملیگا اس سے چادر بھی نہ بنے گی اس وقت ان لوگوں کی حالت بہت ردی ہے صوفی لکھتے ہیں کہ مردہ کا مال کھانے سے دل سخت ہو جاتا ہے۔

(البدر جلد ۲ عنا مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۳)

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۝

ہر ایک جو زکوٰۃ کے لایق ہے وہ زکوٰۃ دے۔ (کشتی نوح صفحہ ۱۴)

عزیزو! یہ دین کے لیے اور دین کی اغراض کے لیے خدمت کا وقت ہے اس وقت کو غنیمت سمجھو کہ پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا چاہیئے کہ زکوٰۃ دینے والا اسی جگہ اپنی زکوٰۃ بھیجے اور ہر ایک شخص فضولیوں سے اپنے تئیں بچاوے اور اس راہ میں وہ روپیہ لگا وے اور بہرحال صدق دکھاوے تا فضل اور رُوح القدس کا انعام پاوے کیونکہ یہ انعام ان لوگوں کے لیے تیار ہے جو اس سلسلہ میں داخل ہوئے ہیں۔ (کشتی نوح صفحہ ۷۰)

جو زیور استعمال میں آتا ہے اور مثلاً کوئی بیاہ شادی پر مانگ کر لے جاتا ہے تو دیدیا جا وے وہ زکوٰۃ سے مستثنے ہے۔ (الحکم جلد ۶ عـــ۱۶ ۳۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

زیور کے رہن کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا۔

زیور ہو کچھ ہو جب کہ انتفاع جائز ہے تو خواہ نخواہ تکلفات کیوں بناتے جاویں۔ اگر کوئی شخص زیور کو استعمال کرنے سے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی اس کے ذمہ ہے زیور کی زکوٰۃ بھی فرض ہے چنانچہ کل ہی ہمارے گھر میں زیور کی زکوٰۃ ڈیڑھ سو روپیہ دیا ہے پس اگر زیور استعمال کرتا ہے تو اس کی زکوٰۃ دے اگر بکری رہن رکھی ہے اور اس کا دودھ پیتا ہے تو اس کو گھاس بھی دے۔

(الحکم جلد ۷ عـــ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

اس سوال کے جواب میں کہ جو روپیہ بطور قرض کسی کو دیا گیا ہے اس پر زکوٰۃ ہے؟

فرمایا۔ "نہیں"۔ (بدر جلد ۶ عـــ۸ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ تجارت کا مال جو ہے جس میں بہت سا حصہ خریداروں کی طرف ہوتا ہے

اور اگر اہی میں پڑا ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں۔ فرمایا

جو مال معلّق ہے اس پر زکوٰۃ نہیں جب تک کہ اپنے قبضہ میں نہ آجائے لیکن تاجر کو چاہیئے کہ حیلہ بہانے سے زکوٰۃ کو نہ ٹال دے۔ آخر اپنی حیثیت کے مطابق اپنے اخراجات بھی تو اسی مال میں سے برداشت کرتا ہے۔ تقویٰ کے ساتھ اپنے مال موجودہ اور معلّق پر نگاہ ڈالے اور مناسب زکوٰۃ دیکر خدا تعالیٰ کو خوش کرتا رہے۔ بعض لوگ خدا تعالےٰ کے ساتھ بھی حیلے بہانے کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ (بدر جلد ۶ ۲۸ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

بہت سے لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ مگر وہ اتنا بھی نہیں سوچتے اور سمجھتے کہ یہ کس کی زکوٰۃ ہے اگر کتے کو ذبح کر دیا جاوے یا سؤر کو ذبح کر ڈالو تو وہ صرف ذبح کرنے سے حلال نہیں ہو جائے گا۔ زکوٰۃ تزکیہ سے نکلی ہے مال کو پاک کرو۔ اور پھر اس میں سے زکوٰۃ دو۔ جو اس میں سے دیتا ہے۔ اس کا صدق قائم ہے لیکن جو حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا وہ اس کے اصل مفہوم سے دور پڑا ہوا ہے اس قسم کی غلطیوں سے دست بردار ہونا چاہیئے اور ان ارکان کی حقیقت کو بخوبی سمجھ لینا چاہیئے تب یہ ارکان نجات دیتے ہیں ورنہ نہیں اور انسان کہیں کا کہیں چلا جاتا ہے یقیناً سمجھو کہ فخر کرنے کی کوئی چیز نہیں ہے اور خدا تعالیٰ کا کوئی انفسی یا آفاقی شریک نہ ٹھیراؤ اور اعمال صالحہ بجا لاؤ۔ مال سے محبت نہ کرو۔ (الحکم جلد ۱۱ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

اگر میری جماعت میں ایسے احباب ہوں جو ان پر بوجہ املاک و اموال و زیورات وغیرہ کے زکوٰۃ فرض ہو تو اُن کو سمجھنا چاہیئے کہ اس وقت دین اسلام جیسا غریب اور یتیم اور بے کس کوئی بھی نہیں اور زکوٰۃ نہ دینے میں جس قدر تہدید شرع وارد ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اور عنقریب ہے جو منکر زکوٰۃ کافر ہو جائے۔ پس فرض عین ہے۔ جو اسی راہ میں اعانت اسلام میں زکوٰۃ دی جاوے۔ زکوٰۃ میں کتابیں خریدی جائیں اور مفت تقسیم کی جائیں۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۲ صفحہ ۱۰۶)

زیورات کی نسبت جو آپ نے دریافت کیا ہے۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ مگر اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ جو زیور مستعمل ہو اس کی زکوٰۃ نہیں ہے۔ مگر بہتر ہے کہ دوسرے کو عاریتاً کبھی دیدیا کریں مثلاً دو تین روز کے لیے کسی عورت کو اگر عاریتاً پہننے کے لیے دیدیا جائے تو پھر بالاتفاق ساقط ہو جاتی ہے۔

(مکتوبات جلد ۵ صفحہ ۵۵ (مکتوب ۱۳/۵۔ بنام مفتی حبیب الرحمٰنؓ صاحب)

۴۵ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

نیک آدمیوں کی یہی نشانی ہے کہ وہ ایسی نصیحت کسی دوسرے کو ہرگز نہیں دیتے جس کے آپ پابند نہ ہوں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ کیا تم لوگوں کو نیک باتوں کے لیے نصیحت کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو یعنی آپ اُن نیک باتوں پر عمل نہیں کرتے۔ (ست بچن صفحہ ۸۱)

حقیقت میں اس امر کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ انسان کا قول اور فعل باہم ایک مطابقت رکھتے ہوں اگر ان میں مطابقت نہیں تو کچھ بھی نہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ یعنی تم لوگوں کو تو نیکی کا امر کرتے ہو۔ مگر اپنے آپ کو اس امر نیکی کا مخاطب نہیں بناتے بلکہ بھول جاتے ہو۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جس کے اخلاق اچھے نہیں ہیں مجھے اس کے ایمان کا خطرہ ہے۔ کیونکہ اس میں تکبر کی ایک جڑ ہے اگر خدا راضی نہ ہو تو گویا یہ برباد ہو گیا پس جب اس کی اپنی اخلاقی حالت کا یہ حال ہے تو اسے دوسرے کو کہنے کا کیا حق ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ اس کا یہی مطلب ہے کہ اپنے نفس کو فراموش کر کے دوسرے کے عیوب کو نہ دیکھتا رہے بلکہ چاہیئے کہ اپنے عیوب کو دیکھے چونکہ خود تو وہ پابند ان امور کا نہیں ہوتا اس لیے آخر کار لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ کا مصداق ہو جاتا ہے اخلاص اور محبت سے کسی کو نصیحت کرنی بہت مشکل ہے۔ لیکن بعض وقت نصیحت کرنے میں بھی ایک پوشیدہ بغض اور کبر ملا ہوا ہوتا ہے اگر خالص محبت سے وہ نصیحت کرتے ہوتے تو خدا ان کو اس آیت کے نیچے نہ لاتا بڑا سعید وہ ہے جو اول اپنے عیوب کو دیکھے۔ ان کا پتہ اس وقت لگتا ہے جب ہمیشہ امتحان لیتا رہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

۴۶۔ وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ وَاِنَّهَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ۙ

صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ اُس سے مدد چاہو کیونکہ نیکیوں سے بدیاں دور ہو جاتی ہیں۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۰۵۔ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

نماز اور صبر کے ساتھ خدا سے مدد چاہو نماز کیا چیز ہے وُہ دُعا ہے جو تسبیح تحمید تقدیس اور استغفار اور درود کے ساتھ تضرّع سے مانگی جاتی ہے سو جب تم نماز پڑھو تو بے خبر لوگوں کی طرح اپنی دُعاؤں میں صرف عربی الفاظ کے پابند نہ رہو کیونکہ ان کی نماز اور ان کا استغفار سب رسمیں ہیں جن کے ساتھ کوئی حقیقت نہیں۔

(کشتی نوح صفحہ ۶۳)

انسان کو جو حکم اللہ تعالیٰ نے شریعت کے رنگ میں دئے ہیں جیسے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ نماز کو قائم رکھو یا فرمایا وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ان پر جب وہ ایک عرصہ تک قائم رہتا ہے تو یہ احکام بھی شرعی

---

۸۱ الصف: ۳

رنگ سے نکل کر کوئی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور پھر وہ ان احکام کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

۵۰ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِىْ ذٰلِكُمْ بَلَٓاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ○

یعنی وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی وہ تم کو طرح طرح کے دکھ دیتے تھے تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا۔

(شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۰)

اے بنی اسرائیل ہماری اُس نعمت کو یاد کرو کہ ہم نے آلِ فرعون سے تمہیں چھڑایا تھا جب وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو رکھ لیتے تھے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۴۱)

۵۱ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

اور وہ زمانہ یاد کرو جب دریا نے تمہیں راہ دیا تھا اور فرعون اُس کے لشکر کے سمیت غرق کیا گیا تھا۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم صفحہ ۶۴۱)

اور وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے تمہارے پہنچنے کے ساتھ ہی دریا کو پھاڑ دیا۔ پھر ہم نے تم کو نجات دیدی اور فرعون کے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۰)

۵۴ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

فرقان...... حق و باطل میں فرق کرنے والی (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

۵۶ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

اور وہ زمانہ یاد کرو جب تم نے موسیٰ کو کہا تھا کہ ہم بغیر دیکھے خدا پر ہرگز ایمان نہیں لائینگے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۴۱)

وہ وقت یاد کرو جب تم نے موسیٰ کو کہا کہ ہم تیرے کہے پر تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بچشم خود نہ دیکھ لیں تب تم پر صاعقہ پڑی۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳)

تم وہ وقت یاد کرو جبکہ تم نے نہ کسی اور نے یہ کہا کہ ہم تیرے کہنے پر تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم آپ ظاہر ظاہر خدا کو نہ دیکھ لیں اور پھر تم کو بجلی نے پکڑا اور تم دیکھتے تھے۔ اور اس آیت میں ایک اور لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اس آیت کے مضمون میں موجودہ یہودیوں کو گذشتہ لوگوں کے قائم مقام نہیں ٹھہرایا بلکہ اُن کو فی الحقیقت گذشتہ لوگ ہی ٹھہرا دیا تو اِس صورت میں قرآن کریم نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک کے یہودیوں کے وہی نام رکھ دیئے جو اُن گذشتہ بنی اسرائیل کے نام تھے کیونکہ جب یہ لوگ حقیقتاً وہی لوگ قرار دیئے گئے تو یہ لازمی ہوا کہ نام بھی وہی ہوں وجہ یہ کہ نام حقائق کے لیے مثل عوارض غیر منفک کے ہیں اور عوارض لازمیہ اپنے حقائق سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب خوب متوجہ ہو کر سوچو کہ جبکہ خدا تعالیٰ نے صریح اور صاف لفظوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے ہی ایسے ایسے برے کام حضرت موسیٰ کے عہد میں کیے تھے تو پھر ایسی صریح اور کھلی کھلی نص کی تاویل کرنا اور احادیث کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو قرآن کریم کی رو سے وفات یافتہ ہے پھر زمین پر اُتارنا کیسی بے اعتدالی اور ناانصافی ہے۔ عزیزو! اگر خدا تعالیٰ کی یہی عادت اور سنت ہے کہ گذشتہ لوگوں کو پھر دنیا میں لے آتا ہے تو نص قرآنی جو بتکرار در تکرار گذشتہ لوگوں کو مخاطب کر کے اُن کے زندہ ہونے کی شہادت دے رہی ہے اُس سے درگذر کرنا ہرگز جائز نہیں اور اگر وہاں یہ دھڑکہ دل کو پکڑتا ہے کہ ایسے معنے گو خدا تعالیٰ کی قدرت سے تو بعید نہیں لیکن معقول کے برخلاف ہیں۔ اس لیئے تاویل کی طرف رُخ کیا جاتا ہے اور وہ معنے کیے جاتے ہیں جو عند العقل کچھ بعید نہیں ہیں تو پھر ایسا ہی حضرت عیسیٰ کے آنے کی پیشگوئی کے معنے کرنے چاہئیے کیونکہ اگر گذشتہ یہودیوں کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں زندہ ہو جانا یا اگر بطریق تناسخ کے اُن کی رُوحیں پھر آجانا طریق معقول کے برخلاف ہے تو حضرت مسیح کی نسبت کیونکر دوبارہ دنیا میں آنا تجویز کیا جاتا ہے جن کی وفات پر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۱؎ بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے کیا یہودیوں کی روحوں کا دوبارہ دُنیا میں آنا خدا تعالیٰ کی قدرت سے بعید اور نیز طریق معقول کے برخلاف لیکن حضرت عیسیٰ کا بجسدہ العنصری پھر زمین پر آجانا بہت معقول ہے۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۲،۳۳)

ان کی یہ خاص مراد کشفاً والہاماً وعقلاً وفرقاناً مجھے پوری ہوتی نظر نہیں آتی کہ وہ لوگ سچ مچ کسی دن حضرت مسیح ابن مریم کو آسمان سے اُترتے دیکھ لیں گے سو نہیں اس بات پر ضد کرنا کہ ہم تب ہی ایمان لائیں گے کہ جب مسیح کو اپنی آنکھوں سے آسمان سے اُترتا ہوا مشاہدہ کرینگے ایک خطرناک ضد ہے اور یہ قول اُن لوگوں کے قول سے ملتا جلتا ہے جن کا خود ذکر اللہ جلّ شانہ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ وہ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کہتے رہے اور ایمان لانے سے بے نصیب رہے۔
(ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲)

۱؎ المائدہ : ۱۱۸

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ؁[1]

پھر تم کو زندہ کیا گیا تاکہ تم شکر کرو۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ؁[2]

اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے تمہیں بدلی کا سایہ دیا اور تمہارے لیے منّ و سلویٰ اتارا۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۲۱)

اور ہم نے بادلوں کو تم پر سائبان کیا اور ہم نے تم پر منّ و سلویٰ اُتارا۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ تو اُن یہودیوں سے جو قرآن میں مخاطب کیے گئے دو ہزار برس پہلے فوت ہو چکے تھے اور ان کا حضرت موسیٰ کے زمانہ میں نام و نشان بھی نہ تھا پھر وہ حضرت موسیٰ سے ایسا سوال کیونکر کر سکتے تھے کہاں اُن پر بجلی گری کہاں اُنہوں نے منّ و سلویٰ کھایا۔ کیا وہ پہلے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں اور اور قالبوں میں موجود تھے اور پھر آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی بطور تناسخ آ موجود ہوئے اور اگر یہ نہیں تو بجز اس تاویل کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مخاطبت کے وقت ضروری نہیں کہ وہی لوگ حقیقی طور پر واقعات منسوبہ کے مصداق ہوں جو مخاطب ہوں کلام الٰہی اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ ایک قاعدہ ٹھہر گیا ہے کہ بسا اوقات کوئی واقعہ ایک شخص یا ایک قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور در اصل وہ واقعہ کسی دوسری قوم یا دوسرے شخص سے تعلق رکھتا ہے اور اسی باب میں سے عیسیٰ بن مریم کے آنے کی خبر ہے کیونکہ بعض احادیث میں آخری زمانہ میں آنے کا ایک واقعہ حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کیا گیا حالانکہ وہ فوت ہو چکے تھے پس یہ واقعہ بھی حضرت مسیح کی طرف ایسا ہی منسوب ہے جیسا کہ واقعہ فرعون کے ہاتھ سے نجات پانے کا اور منّ سلویٰ کھانے کا اور صاعقہ گرنے کا اور دریا سے پار ہونے کا اور قصہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ کا اُن یہودیوں کی طرف منسوب کیا گیا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے حالانکہ وہ واقعات اُن کی پہلی قوم کے تھے۔ جو اُن سے صدہا برس پہلے مر چکے تھے۔ پس اگر کسی کو آیات کے معنے کرنے میں معقولی شق کی طرف خیال نہ ہو اور ظاہر الفاظ پر اڑ جانا واجب سمجھے تو کم سے کم ان آیات سے یہ ثابت ہوگا کہ مسئلہ تناسخ حق ہے ورنہ کیونکر ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ ایک فاعل کے فعل کو کسی ایسے شخص کی طرف

[1] البقرۃ: ۵۷
[2] البقرۃ: ۵۸

منسوب کرے جس کو اس فعل کے ارتکاب سے کچھ بھی تعلق نہیں حالانکہ وہ آپ ہی فرماتا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی[1] پھر اگر موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کی نافرمانی کی تھی اور اُن پر بجلی گری تھی یا اُنہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور اُن پر عذاب نازل ہوا تھا تو اس دوسری قوم کو اِن واقعات سے کیا تعلق تھا جو دو ہزار برس بعد پیدا ہوئے یوں تو حضرت آدم سے تا ایں دم متقدمین متاخرین کے لیے بطور آبا و اجداد ہیں لیکن کسی کا گنہ کسی پر عاید نہیں ہو سکتا پھر خدا تعالیٰ کا قرآن کریم میں یہ فرمانا کہ تم نے موسیٰ کی نافرمانی کی اور تم نے کہا کہ ہم خدا کو نہیں مانیں گے جب تک اُس کو دیکھ نہ لیں اور اس گنہ کے سبب سے تم پر بجلی گری کیونکر ان تمام الفاظ کے بنظر ظاہر کوئی اور معنے ہو سکتے ہیں بجز اِس کے کہ کہا جائے کہ درحقیقت وہ تمام یہودی جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے حضرت موسیٰ کے وقت میں بھی موجود تھے اور انہیں پر منّ وسلویٰ نازل ہوا تھا اور انہیں پر بجلی پڑی تھی اور اِنہیں کی خاطر فرعون کو ہلاک کیا گیا تھا اور پھر وہی یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بطور تناسخ پیدا ہو گئے اور اِس طرح پر خطاب صحیح ٹھہر گیا مگر سوال یہ ہے کہ کیوں ایسے سیدھے سیدھے معنے نہیں کیے جاتے کیا یہ خدا تعالیٰ کی قدرت سے دور ہیں اور کیوں ایسے معنے قبول کیے جاتے ہیں جو تاویلات بعیدہ کے حکم میں ہیں کیا خدا تعالےٰ قادر نہیں کہ جس طرح بقول ہمارے مخالفوں کے وہ حضرت عیسٰیؑ کو بعینہٖ بجسدہ العنصری کسی وقت صدہا برسوں کے بعد پھر زمین پر لے آئیگا اسی طرح اُس نے حضرت موسیٰ کے زمانہ کے یہودیوں کو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زندہ کر دیا ہو یا اُن کی روحوں کو بطور تناسخ پھر دنیا میں لے آیا ہو جس حالت میں صرف بے بنیاد اقوال کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ کی روح کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا گیا ہے تو کیوں اور کیا وجہ کہ اُن تمام یہودیوں کی روحوں کا دوبارہ بطور تناسخ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آجانا قبول نہ کیا جائے جن کے موجود ہو جانے پر نصوص صریحہ بینہ قرآن کریم شاہد ہیں۔

(شہادت القرآن - صفحہ ۳۰-۳۱)

یہود میں جب طاعون مصر اور کنعان کی راہ میں پھوٹی تو وہ لوگ اُس وقت جنگل میں تھے اور شہر کی عفونتوں سے بالکل الگ تھے۔ ترنجبین اور بٹیر اُن کی غذا تھی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ اب کوئی بلا ہم پر نہیں آئیگی۔ مگر جب انہوں نے نافرمانی شروع کی اور فسق اور فجور میں مبتلا ہوئے تو وہی ترنجبین اور بٹیر طاعون کا موجب ہو گئے۔ یہ کیسا باریک بھید خدا کی حکمتوں کا ہے کہ چونکہ اللہ جل شانہ جانتا تھا کہ یہ قوم عنقریب سرکشی اختیار کریگی اس لیے اُن کے لیے دن رات کی غذا ترنجبین اور بٹیر مقرر کیا گیا۔ یہ دونوں چیزیں طب کے قواعد کے رو سے بالخاصیت طاعون پیدا کرتی ہیں اسی وجہ سے طبیب لوگ امراض جلدیہ میں جہاں بثور اور پھوڑوں کی بیماریاں ہوں ترنجبین دینے سے پرہیز کیا کرتے ہیں۔ بدبخت یہود ایک طرف تو ارتکاب جرائم کا کرتے رہے اور دوسری طرف دن رات بٹیر اور ترنجبین کھا کر طاعون کا مادہ اپنے اندر جمع کر لیا جب اُن کے مواخذہ کا وقت آیا تو ایک طرف تو جرائم انتہا کو پہنچ چکے تھے جو سزا کو چاہتے تھے۔ اور دوسری طرف طاعونی مادّہ بٹیر اور ترنجبین کے استعمال سے اس قدر اُن کے اندر جمع ہو گیا تھا کہ اب وہ تقاضا کرتا تھا کہ ان میں طاعون پھوٹے۔ سو اُس ایک ہی رات میں جب یہودیوں کے لیے آسمان سے

[1] الانعام : ۱۶۵

سزا کا حکم نازل ہوا ساتھ اُس کے مادہ طاعون کو بھی جو طبّار بیٹھا تھا یہ حکم آیا کہ ہاں اب نکل اور اِس شریر قوم کو ہلاک کر تب وہ اُس جنگل میں کتوں کی طرح مرے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۰۲-۱۰۳)

هٰذَا مَا جَآءَ فِي الْقُرْاٰنِ وَتَقْرَؤُنَهٗ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ الْفُرْقَانِ مَعَ اَنَّ ظَاهِرَ صُوْرَةِ هٰذَا الْبَيَانِ يُخَالِفُ اَصْلَ الْوَاقِعَةِ وَهٰذَا اَمْرٌ لَّا يَخْتَلِفُ فِيْهِ اثْنَانِ فَاِنَّ اللّٰهَ مَا فَرَّقَ بِيَهُوْدَ زَمَانِ نَبِيِّنَا بَحْرًا مِّنَ الْبِحَارِ وَمَا اَغْرَقَ اٰلَ فِرْعَوْنَ اَمَامَ اَعْيُنِ تِلْكَ الْاَشْرَارِ وَمَا كَانُوْا مَوْجُوْدِيْنَ عِنْدَ تِلْكَ الْاَخْطَارِ۔ وَمَا اتَّخَذُوا الْعِجْلَ وَمَا كَانُوْا فِيْ ذٰلِكَ الْوَقْتِ حَاضِرِيْنَ۔ وَمَا قَالُوْا يَا مُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً بَلْ مَا كَانَ لَهُمْ فِيْ زَمَانِ مُوْسٰى اَثَرًا وَّتَذْكِرَةً وَّكَانُوْا مَعْدُوْمِيْنَ۔ فَكَيْفَ اَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَكَيْفَ بُعِثُوْا مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ وَفَارَقُوا الْحِمَامَ وَكَيْفَ ظَلَّلَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَكَيْفَ اَكَلُوا الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى وَنَجَّاهُمُ اللّٰهُ مِنَ الْبَلْوٰى وَمَا كَانُوْا مَوْجُوْدِيْنَ۔ بَلْ وُلِدُوْا بَعْدَ قُرُوْنٍ مُّتَطَاوِلَةٍ وَّاَزْمِنَةٍ بَعِيْدَةٍ مُّبْعَدَةٍ وَّلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاللّٰهُ لَا يَاْخُذُ رَجُلًا مَّكَانَ رَجُلٍ وَّهُوَ اَعْدَلُ الْعَادِلِيْنَ۔ فَالسِّرُّ فِيْهِ اَنَّ اللّٰهَ اَقَامَهُمْ مَّقَامَ اٰبَآءِهِمْ لِمُنَاسَبَةٍ كَانَتْ فِيْ اٰرَآءِهِمْ وَسَمَّاهُمْ بِتَسْمِيَةِ اَسْلَافِهِمْ وَجَعَلَهُمْ وُرَثَآءَ اَوْصَافِهِمْ وَكَذٰلِكَ اسْتَمَرَّتْ سُنَّةُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ (سر الخلافہ صفحہ ۴۹)

(ترجمہ) یہ آیات (۵۱ تا ۵۸) ہیں جو قرآن کریم میں آئی ہیں اور تم انہیں کتاب اللہ میں پڑھتے ہو۔ ان آیات میں ظاہراً جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اصل واقعات کے خلاف ہے اور یہ ایسا امر ہے جس میں کوئی دو آدمی بھی اختلاف نہیں کرتے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود کے لیے کسی سمندر کو نہیں چیرا۔ نہ اللہ نے آل فرعون کو ان شریروں کے سامنے غرق کیا اور نہ وہ ان خطرات کے وقت موجود تھے نہ انہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا اور نہ انہوں نے یہ کہا کہ اے موسیٰ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر میں نہ دیکھ لیں۔ بلکہ ان کا کوئی نشان یا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نہ تھا بلکہ خود ہی وہ معدوم تھے۔ پھر کس طرح ان کو صاعقہ نے آپکڑا۔ کس طرح وہ موت کے بعد زندہ کیے گئے اور موت سے علیحدہ ہوگئے اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کے ذریعہ سایہ کیا اور کس طرح انہوں نے من وسلویٰ کھایا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مصیبت سے نجات دی حالانکہ وہ اس وقت موجود بھی نہ تھے بلکہ وہ صدیوں اور لمبا عرصہ بعد پیدا ہوئے اور کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھایا کرتی اور نہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو دوسرے شخص کی بجائے پکڑتا ہے کیونکہ وہ تو سب عدل کرنے والوں سے زیادہ عدل کرنیوالا ہے اس میں یہ راز کی بات بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے آباء و اجداد کا بوجہ ان کے خیالات سے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۟

یعنی ہم نے ظالموں پر طاعون کا عذاب بھیجا کیونکہ وہ فاسق تھے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے کہیں نہیں فرمایا کہ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ یعنی اس لیے ہم نے اُن پر طاعون نازل کی کہ وہ مومن تھے پس مومن کسی صورت میں طاعون کا مستحق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ کافر اور فاسق کے لیے مخصوص ہے اسی وجہ سے جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے خدا کا کوئی نبی طاعون سے فوت نہیں ہوا ہاں ایسے مومن جو گناہ سے خالی نہیں ہوتے کبھی وہ بھی اس بیماری میں مبتلا ہو کر مرجاتے ہیں اور ان کی یہ موت اُن کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے اور اُن کے لیے یہ ایک قسم کی شہادت ہے لیکن کسی نے کبھی نہیں سُنا ہو گا کہ موسیٰ ہو کر پھر اس کو طاعون ہو گئی ہو اور ایسا شخص بڑا خبیث اور پلید اور بد ذات ہو گا جس کا یہ اعتقاد ہو کہ کوئی نبی یا خلیفۃ اللہ طاعون سے مرا ہے پس اگر یہ ایسی شہادت ہوتی جو قابل تعریف ہے اور جس پر کوئی اعتراض نہیں تو پہلے حقدار اُس کے انبیاءؑ اور رسول ہوتے لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ کبھی کوئی نبی یا رسول اور اوّل درجہ کا کوئی برگزیدہ جو خدا تعالیٰ سے مکالمہ مخاطبہ کا شرف رکھتا تھا اس خبیث مرض میں مبتلا ہو کر مرگیا ہو۔ بلکہ اوّل حقدار اس مرض کے ابتدا سے وہی لوگ رہے ہیں جو طرح طرح کے معاصی اور فجور میں مبتلا تھے یا کافر اور بے ایمان تھے اور عقل ہرگز تجویز نہیں کر سکتی کہ وہ مرض جو قدیم سے خدا نے کُفّار کے سزا دینے کے لیے تجویز کر رکھی ہے اس میں خدا کے نبی اور رسول اور مُلہم بھی شریک ہو جائیں توریت اور انجیل اور قرآن تینوں متفق اللسان بیان فرما رہے ہیں کہ ہمیشہ طاعون کفّار کو سزا دینے کے لیے نازل ہوتی رہی ہے اور خدا نے قدیم سے لاکھوں کفار اور فاسق اور فاجر اسی طاعون کے ذریعہ نیست و نابود کیے جیسا کہ خدا کی کتابوں اور تاریخ سے ظاہر ہے اور خدا اس سے بزرگ اور اعلیٰ ہے کہ اپنے مقدس لوگوں کو اس عذاب میں کفار کے ساتھ شریک کرے اور جو بلا کفار کے عذاب کے لیے قدیم سے مقرر ہے اور جس کے ذریعہ سے ہمیشہ نبیوں کے عہد میں ہزاروں فاسق فاجر مرتے رہے ہیں وہی بلا اپنے برگزیدہ نبیوں پر مسلط کر دے۔ پس جس طرح خدا کا وہ عذاب جو قوم لوط پر آیا تھا کسی نبی کی موت اس کے ذریعہ سے ہرگز نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر ایک عذاب جو قوموں کی ہلاکت کے لیے وارد ہو چکا ہے کوئی نبی اس عذاب سے نہیں مرا ایسا ہی

(بقیہ صفحہ سابقہ) مناسبت رکھنے کے قائم مقام بنایا۔ انہیں ان کے بزرگوں کا نام دیا اور انہیں ان کے اوصاف کا وارث بنایا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی سنت قدیم سے چلی آرہی ہے۔

طاعون جو کفار کے لیے ایک مخصوص عذاب ہے کسی برگزیدہ پر وارد نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کوئی اس کے برخلاف دعوی کرے اور یہ کہے کہ کوئی نبی گذشتہ نبیوں میں سے طاعون سے بھی ہلاک ہوا تھا تو یہ اس کا اختیار ہے کسی بیباک یا گستاخ کی ہم زبان تو بند نہیں کر سکتے۔ مگر کتاب اللہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ طاعون رجز ہے ہمیشہ کافروں پر نازل ہوتی ہے۔ ہاں جیسا کہ جہنم خاص کافروں کے لیے مخصوص ہے تاہم بعض گنہ گار مومن جو جہنم میں ڈالے جائیں گے وہ محض تمحیص اور تطہیر اور پاک کرنے کے لیے دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ مگر خدا کے وعدہ کے موافق جو اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ[۱] ہے برگزیدہ لوگ اس دوزخ سے دور رکھے جائیں گے۔ اسی طرح طاعون بھی ایک جہنم ہے کافر اس میں عذاب دینے کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔ اور ایسے مومن جن کو معصوم نہیں کہہ سکتے اور معاصی سے پاک نہیں ہیں اُن کے لیے یہ طاعون پاک کرنے کا ذریعہ ہے جس کو خدا نے جہنم کے نام سے پکارا ہے۔ سو طاعون ادنیٰ مومنوں کے لیے تجویز ہو سکتی ہے جو پاک ہونے کے محتاج ہیں۔ مگر وہ لوگ جو خدا کی قرب اور محبت میں بلند مقامات پر ہیں وہ ہرگز اس جہنم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۶-۱۰۸)

لوگوں کو طاعون کی خبر نہیں وہ اس کو نزلہ زکام کی طرح ایک عام مرض سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام رجز رکھا ہے۔ رجز عذاب کو بھی کہتے ہیں۔ لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اونٹ کی بن ران میں یہ مرض ہوتا ہے اور اس میں ایک کیڑا پڑ جاتا ہے۔ جسے نغف کہتے ہیں۔ اس سے ایک لطیف نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ اُونٹ کی وضع میں ایک قسم کی سرکشی پائی جاتی ہے تو اس سے یہ پایا گیا۔ کہ جب انسانوں میں وہ سرکشی کے دن پائے جاویں تو یہ عذاب الیم اُن پر نازل ہوتا ہے۔ اور رجز کے معنے لغت میں دوام کے بھی آئے ہیں۔ اور یہ مرض بھی دیرپا ہوتا ہے۔ اور گھر سے سب کو رخصت کرکے نکلتا ہے۔ اس میں یہ بھی دکھایا ہے۔ کہ یہ بلا گھروں کی صفائی کرنے والی ہے۔ بچوں کو یتیم بناتی۔ اور بیشمار بے کس عورتوں کو بیوہ کر دیتی ہے۔

اور رُجز کے معنے میں غور کرنے سے اس کا باعث بھی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ یہ مرض پلیدی اور ناپاکی سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اچھی صفائی نہیں ہوتی۔ مکان کی دیواریں بدنما اور قبروں کا نمونہ ہیں۔ نہ روشنی ہے۔ نہ ہوا آسکتی ہے۔ وہاں عفونت کا زہریلا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم میں جو آیا ہے۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[۲] (س ۲۹) ہر ایک قسم کی پلیدی سے پرہیز کرو۔ ہجر دور چلے جانے کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا۔ کہ رُوحانی پاکیزگی چاہنے والوں کے لیے ظاہری پاکیزگی اور صفائی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک قوت کا اثر دوسری پر اور ایک پہلو کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے۔ دو حالتیں ہیں۔ جو باطنی حالت تقویٰ اور طہارت پر قائم ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ظاہری پاکیزگی بھی چاہتے ہیں۔ (رسالہ الانذار صفحہ ۶۔ بار اول)

---

[۱] الانبیآء: ۱۰۲ ٭ [۲] المدثر: ۶ ٭

طاعون کا تذکرہ شروع ہوتے ہی فرمایا کہ قرآن شریف میں اس کو رِجۡزٌ مِّنَ السَّمَآءِ کہا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پر انسانی ہاتھ نہیں پڑ سکتا اور نہ زمینی تدابیر اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں ورنہ یہ عذاب آسمانی نہ رہے۔ طاعون جو اس کا نام رکھا ہے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جیسے فاروق جب طعن اور تکذیب حد سے گذر جاتی ہیں تو پھر اس کی پاداش میں طاعون آتی ہے اور پھر صفائی کر کے ہی قہر الٰہی بس کرتا ہے۔

عرض کیا گیا کہ دَآبَّۃُ الۡاَرۡضِ اور رِجۡزٌ مِّنَ السَّمَآءِ میں کیا تعلق ہے؟ فرمایا امر تو آسمانی ہی ہوتے ہیں یعنی اس طاعون کا امر آسمان سے آتا ہے اور وہ انسانی ہاتھوں سے بالا تر رہتا ہے اور اس کا معالجہ بھی آسمان ہی سے آتا ہے۔ دابۃ الارض طاعون کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس کے کیڑے تو زمینی ہی ہوتے ہیں۔

عرض کیا گیا کہ طاعون سے مرنا شہادت بتاتے ہیں تو پھر عذاب کیونکر ہوا؟ (فرمایا) جو لوگ طاعون سے مرنا شہادت بتاتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ طاعونی موت تو عذاب الٰہی ہی ہے لیکن یہ جو کسی حدیث میں آیا ہے کہ اگر مومن ہو کر طاعون سے مر جاوے تو شہادت ہے تو یہ اللہ تعالیٰ نے گویا مومن کی پردہ پوشی کی ہے کثرت سے اگر مرنے لگیں تو شہادت نہ رہے گی پھر عذاب ہو جائے گا۔ شہادت کا حکم شاذ کے اندر ہے۔ کثرت ہمیشہ کافروں پر ہوتی ہے۔

اگر یہ ایسی ہی شہادت اور برکت والی چیز تھی تو اس کا نام رِجۡزٌ مِّنَ السَّمَآءِ نہ رکھا جاتا اور پھر کثرت سے مومن مرتے اور انبیا مبتلا ہوتے مگر کیا کوئی کسی نبی کا نام لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں پس یاد رکھو کہ اگر کوئی شاذ مومن اس سے مر جاوے تو اللہ تعالیٰ اپنی ستاری سے اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور اس کے لیے کہا گیا کہ وہ شہادت کی موت مرتا ہے۔ ماسوا اس کے میں نے بارہا کہا ہے کہ اگر کوئی حدیث قرآن شریف کے متعارض ہو۔ اور اس کی تاویل قرآن کے موافق نہ ہو تو اسے چھوڑ دینا چاہیئے حکم ہمیشہ کثرت پر ہوتا ہے شاذ تو معدوم کا حکم رکھتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

یہ (طاعون) زمینی چیز نہیں ہے کہ زمین اس کا علاج کرے یہ آسمان سے آتی ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا یہ رِجۡزٌ مِّنَ السَّمَآءِ ہے۔ سابقہ انبیا کے وقت بھی یہ بطور عذاب کے ایک نشان ہوتا رہا ہے بس اس کا علاج یہی ہے کہ اپنے ایمان کو اس کی انتہائی غایت تک پہنچا دو اس کے آنے سے پیشتر اس خدا سے صلح کرو استغفار کرو توبہ کرو۔ دعاؤں میں لگو اس (طاعون) کی کوئی دوائی نہیں ہے مرض ہو تو دوا ہو یہ تو ایک عذاب الٰہی اور قہر ایزدی ہے بجز تقویٰ کے اس کا کیا علاج ہے یاد رکھو کہ اگر گھر بھر میں ایک بھی متقی ہو گا تو خدا اس کے سارے گھر کو بچا دے گا بلکہ اگر اس کا تقویٰ کامل ہے تو وہ اپنے محلے کا بھی شفیع ہو سکتا ہے اگرچہ متقی مر بھی جاوے تو وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے مگر ایسے وقت میں جبکہ یہ موت ایک قہر الٰہی کا نمونہ ہے اور بطور نشان کے دنیا پر آتی ہے میرا دل ہرگز شہادت نہیں دیتا کہ کوئی متقی اس ذلت کی موت سے مرے متقی ضرور بچایا جاوے گا۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵-۶ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۸)

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

اور فساد کی نیّت سے زمین پر مت پھرا کرو یعنی اس نیّت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں یا کسی کی جیب کتریں یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۰۵)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

جو واقعات آنکھوں کے سامنے ہیں وہ صاف شہادت دے رہے ہیں کہ درحقیقت اِس اُمت اور اِس امت کے علماء نے اس زمانہ کے یہودیوں کے قدموں پر قدم مارا ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت میں موجود تھے اور نہ صِرف اسی بات میں وہ اُس وقت کے یہودیوں کے مشابہ ہوگئے ہیں کہ دیانت اور تقوی اور روحانیت اور حقیقت شناسی ان میں باقی نہیں رہی بلکہ دنیوی ادبار بھی ویسا ہی شامل حال ہوگیا ہے کہ جیسا اس زمانہ میں تھا اور جیسا کہ اس وقت یہودیہ ریاستوں کو رومی ملوک نے تباہ کردیا تھا اور ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کا مصداق ہوگئے تھے اور یہودی اپنے تئیں ضعیف اور بیکس دیکھ کر ایک ایسے مسیح کے منتظر تھے جو بادشاہ

ہوکر آوے اور رومیوں پر تلوار چلاوے کیونکہ توریت کے آخر میں یہی وعدہ دیا گیا تھا۔ ویسا ہی یہ قوم مسلمان بھی اکثر اور اغلب طور پر ادبار کی حالت میں گری ہوئی نظر آتی ہے اگر کوئی ریاست ہے تو اس کو اندرونی نفاقوں اور وزراء اور عملہ کی خیانتوں اور بادشاہوں کے کسل اور سستیوں اور جہالتوں اور بے خبریوں اور عیش پسندیوں اور آرام طلبیوں نے ایسا کمزور کر دیا ہے کہ اب اُن کا کوئی آخری دم ہی نظر آتا ہے اور یہ لوگ بھی یہودیوں کی طرح منتظر تھے کہ مسیح موعود بادشاہوں کی طرح بڑے جلال کے ساتھ اُن کی حمایت کے لیے نازل ہوگا۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۵۸-۵۹)

یہودی بھی تو پیغمبر زادے ہیں۔ کیا صدہا پیغمبر اُن میں نہیں آئے تھے مگر اس پیغمبر زادگی نے ان کو کیا فایدہ پہنچایا۔ اگر ان کے اعمال اچھے ہوتے تو وہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے مصداق کیوں ہوتے۔ خدا تعالیٰ تو ایک پاک تبدیلی کو چاہتا ہے بعض اوقات انسان کو تکبر نسب بھی نیکیوں سے محروم کر دیتا ہے اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں اسی سے نجات پالوں گا جو بالکل خیال خام ہے۔ کبیر کہتا ہے کہ اچھا ہوا ہم نے چماروں کے گھر جنم لیا۔

کبیرا اچھا ہوا ہم نیچے بھلے سب کو کریں سلام

خدا تعالیٰ وفاداری اور صدق کو پیار کرتا ہے اور اعمال صالحہ کو چاہتا ہے لاف و گزاف اسے راضی نہیں کر سکتے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵-۲۶ مورخہ ۳۱ جولائی و ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۳)

یہودی بیچارے خود ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کے مصداق اُن کی وہ حالت تھی کہ صورت ہیں حالش میپرس دنیا پرستی کے سوا کچھ جانتے ہی نہیں..... یہودیوں نے کھانے پینے کے سوا اور کوئی مقصود ہی نہیں رکھا۔ خدا کی قدرت ہے جب ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کی حالت آئی تو وہ افعال بھی آ گئے جو ذلت کے جالب اور ذلت کے نتائج تھے اگر وہ تائب ہو جاتے تو پھر ضُرِبَتْ کیونکر صادق آتا...... یہودیوں کی زندگی اگر نا پاکیوں کا مجموعہ نہ تھی تو پھر ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کی مار اُن پر کیوں کر پڑتی۔ اس پر خوب غور کرو اس کے اندر یہ مخفی اسرار ہیں اور پتہ ملتا ہے کہ یہودی قوم کے اطوار بگڑ جاویں گے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۴ ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کیا کم تھے؟ کیا بنی اسرائیل نے کھلے کھلے نشان نہ دیکھے تھے مگر بتاؤ کہ ان میں وہ تقویٰ وہ خدا ترسی اور نیکی جو حضرت موسیٰ چاہتے تھے کامل طور پر پیدا ہوئی آخر ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کے مصداق وہ قوم ہو گئی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

اس نبی کو جس کی اُمت کا خاتمہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ پر ہوا ہے اس کو زندہ کہا جاتا ہے حضرت عیسیٰ کی قوم یہودی تھی اور اُس کی نسبت خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اب قیامت تک ان کو عزت نہ ملے گی۔ اب اگر حضرت عیسیٰ پھر آ گئے تو پھر گویا اُن کی کھوئی ہوئی عزت بحال ہو گئی اور قرآن شریف کا یہ حکم باطل ہو گیا جس پہلو اور حیثیت سے دیکھو جو کچھ وہ مانتے ہیں اس پہلو سے قرآن کریم کا ابطال اور آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی توہین لازم آتی ہے۔ پھر تعجب ہے کہ یہ لوگ مسلمان کہلا کر ایسے اعتقادات رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہود کے لیے فتویٰ دیتا ہے کہ ان میں نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور وہ ذلیل ہوگئے پھر ان میں زندہ نبی کیسے آسکتا ہے؟

(الحکم جلد ۷ ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

بنی اسرائیل جن میں کثرت سے نبی اور رسول آئے۔ اور خدا تعالیٰ کے عظیم الشان فضلوں کے وہ وارث اور حقدار ٹھہرائے گئے تھے۔ لیکن جب اس کی روحانی حالت بگڑی اور اس نے راہ مستقیم کو چھوڑ دیا سرکشی اور فسق و فجور کو اختیار کیا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ کی مصداق ہوئی خدا تعالیٰ کا غضب ان پر ٹوٹ پڑا اور ان کا نام سور اور بندر رکھا گیا۔ یہاں تک وہ گر گئے کہ انسانیت سے بھی ان کو خارج کیا گیا۔ یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے۔ بنی اسرائیل کی حالت ہر وقت ایک مفید سبق ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

اگر یہودی ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کے مصداق ہو چکے ہیں اور نبوت اس خاندان سے منتقل ہو چکی ہے تو پھر یہ ناممکن ہے کہ مسیح دوبارہ اسی خاندان سے آوے؟ اگر یہ تسلیم کیا جاوے گا تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ادنیٰ نبی مانا جاوے اور اس امت کو بھی ادنیٰ امت حالانکہ یہ قرآن شریف کے منشاء کے صریح خلاف ہے۔ (الحکم جلد ۹ ۳۸ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ۔ ادنیٰ کو اعلیٰ کے عوض میں ترک کرتے ہو۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۵۲-۵۳)

يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ توریت میں لکھا ہے کہ جھوٹا نبی قتل کیا جاوے گا اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر قرآن کی نص صریح سے پایا جاوے یا حدیث کے تواتر سے ثابت ہو کہ نبی قتل ہوتے رہے ہیں تو پھر ہم کو اس سے انکار نہیں کرنا پڑے گا۔ بہر حال یہ کچھ ایسی بات نہیں کہ نبی کی شان میں خلل انداز ہو کیونکہ قتل بھی شہادت ہوتی ہے۔ مگر ہاں ناکام قتل ہو جانا انبیاء کی علامات میں سے نہیں۔

یہ مصالح پر موقوف ہے کہ ایک شخص کے قتل سے فتنہ برپا ہوتا ہے تو مصلحت الٰہی نہیں چاہتی کہ اس کو قتل کرا کر فتنہ برپا کیا جاوے۔ جس کے قتل سے ایسا اندیشہ نہ ہو اس میں ہرج نہیں۔

(الحکم جلد ۷ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

۶۳۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝

یعنی جو لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور جو لوگ یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرست ہیں جو شخص اُن میں سے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور اعمال صالحہ بجالائے گا خدا اُس کو ضائع نہیں کریگا اور ایسے لوگوں کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے اور اُن کو کچھ خوف نہیں ہوگا اور نہ غم۔

یہ آیت ہے جس سے بباعث نادانی اور کج فہمی یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ یہ لوگ اپنے نفس امّارہ کے پیرو ہو کر محکمات اور بیّنات قرآنی کی مخالفت کرتے ہیں اور اسلام سے خارج ہونے کے لیے متشابہات کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اُن کو یاد رہے کہ اس آیت سے وہ کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور آخرت پر ایمان لانا اس بات کو مستلزم پڑا ہوا ہے کہ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اللّٰہ کے نام کی قرآن شریف میں یہ تعریف کی ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جو رب العالمین اور رحمٰن اور رحیم ہے جس نے زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا اور آدم کو پیدا کیا اور رسول بھیجے اور کتابیں بھیجیں اور سب کے آخر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا جو خاتم الانبیاء اور خیر الرّسل ہے۔ اور یوم آخر قرآن شریف کی رو سے یہ ہے جس میں مُردے جی اُٹھیں گے اور پھر ایک فریق بہشت میں داخل کیا جائے گا جو جسمانی اور روحانی نعمت کی جگہ ہے۔ اور ایک فریق دوزخ میں داخل کیا جاوے گا جو روحانی اور جسمانی عذاب کی جگہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ اس یوم آخر پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں۔

پس جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود لفظ اللہ اور یوم آخر کے تصریح ایسے معنی کر دئے جو اسلام سے مخصوص ہیں تو جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور یوم آخر پر ایمان لائے گا اُس کے لیے یہ لازمی امر ہوگا کہ قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاوے اور کسی کا اختیار نہیں ہے کہ ان معنوں کو بدل ڈالے۔ اور ہم اِس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی ایسے معنے ایجاد کریں کہ جو قرآن شریف کے بیان کردہ معنوں سے مغائر اور مخالف ہوں ہم نے اوّل سے آخر تک قرآن شریف کو غور سے دیکھا ہے اور توجہ سے دیکھا۔ اور بار بار دیکھا اور اُس کے معانی میں خوب تدبّر کیا ہے ہمیں بدیہی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف میں جس قدر صفات اور افعال الٰہیّہ کا ذکر ہے ان سب صفات کا موصوف اسم اللہ ٹھہرایا گیا ہے مثلاً کہا گیا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ایسا ہی اِس قسم کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں یہ بیان ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے قرآن اُتارا۔ اللہ وہ ہے جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا پس جبکہ قرآنی اصطلاح میں اللہ کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کو بھیجا ہے لہذا یہ ضروری ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان لاوے تبھی اُس کا ایمان معتبر اور صحیح سمجھا جائے گا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاوے۔ خدا تعالیٰ نے اِس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ مَنْ اٰمَنَ بِالرَّحْمٰنِ یا مَنْ اٰمَنَ بِالرَّحِیْمِ یا مَنْ اٰمَنَ بِالْکَرِیْمِ بلکہ یہ فرمایا کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ اور اللہ سے مُراد وہ ذات ہے جو مستجمع جمیع صفات کاملہ ہے اور ایک عظیم الشان صفت اُس کی یہ ہے کہ اُس نے قرآن شریف کو اُتارا۔ اِس صورت میں ہم صرف ایسے شخص کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان لایا جبکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا ہو اور قرآن شریف پر بھی ایمان لایا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے کیا معنی ہوئے تو یاد رہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو لوگ محض خدا تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں اُن کا ایمان معتبر نہیں ہے جب تک خدا کے رسول پر ایمان نہ لاویں یا جب تک اُس ایمان کو کامل نہ کریں۔ اِس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف میں اختلاف نہیں ہے پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ صد ہا آیتوں میں تو خدا تعالیٰ یہ فرماوے کہ صرف توحید کافی نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے نبی پر ایمان لانا نجات کے لیے ضروری ہے بجز اس صورت کے کہ کوئی اس نبی سے بے خبر رہا ہو اور پھر کسی ایک آیت میں برخلاف اس کے یہ بتلا وے کہ صرف توحید سے ہی نجات ہو سکتی ہے قرآن شریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی کچھ ضرورت نہیں اور طرفہ یہ کہ اس آیت میں توحید کا ذکر بھی نہیں اگر توحید مراد ہوتی تو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ مَنْ اٰمَنَ بِالتَّوْحِیْدِ۔ مگر آیت کا تو یہ لفظ ہے کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ پس اٰمَنَ بِاللّٰہِ کا فقرہ ہم پر یہ واجب کرتا ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ قرآن شریف میں اللّٰہ کا لفظ کن معنوں پر آتا ہے۔ ہماری دیانت کا یہ تقاضا ہونا چاہیئے کہ جب ہمیں خود قرآن سے ہی یہ معلوم ہوا کہ اللہ کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے قرآن بھیجا اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تو ہم اُسی معنی کو قبول کریں جو قرآن شریف نے بیان کیے اور خود روی اختیار نہ کریں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۱-۱۴۳)

واضح ہو کہ قرآن شریف میں ان آیات کے ذکر کرنے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ بغیر اس کے جو رسول پر ایمان لایا جائے نجات ہو سکتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بغیر اس کے کہ خدائے واحد لاشریک اور یوم آخرت پر ایمان لایا جاوے نجات نہیں ہو سکتی اور اللہ پر پورا ایمان تبھی ہو سکتا ہے کہ اُس کے رسولوں پر ایمان لاوے وجہ یہ کہ وہ اس کی صفات کے مظہر ہیں اور کسی چیز کا وجود بغیر وجود اُس کی صفات کے بپایۂ ثبوت نہیں پہنچتا۔ لہذا بغیر علم صفات باری تعالیٰ کے معرفت باری تعالیٰ ناقص رہ جاتی ہے کیونکہ مثلاً یہ صفات اللہ تعالیٰ کی کہ وہ بولتا ہے سنتا ہے پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے رحمت یا عذاب کرنے پر قدرت رکھتا ہے بغیر اس کے کہ رسول کے ذریعہ سے ان کا پتہ لگے کیونکر اُن پر یقین آسکتا ہے اور اگر یہ صفات مشاہدہ کے رنگ میں ثابت نہ ہوں تو خدا تعالیٰ کا وجود ہی ثابت نہیں ہوتا تو اس صورت میں اس پر ایمان لانے کے کیا معنے ہوں گے اور جو شخص خدا پر ایمان لاوے ضرور ہے کہ اُس کے صفات پر بھی ایمان لاوے اور یہ ایمان اُس کو نبیوں پر ایمان لانے کے لیے مجبور کرے گا۔ کیونکہ مثلاً خدا کا کلام کرنا اور بولنا بغیر ثبوت خدا کی کلام کے کیونکر سمجھ آسکتا ہے اور اس کلام کو پیش کرنے والے مع اُس کے ثبوت کے صرف نبی ہیں۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۹-۱۷۰)

اللہ پر ایمان لانے کے یہ معنے ہیں کہ اُسے اُن تمام صفات سے موصوف مانا جاوے جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے مثلاً ربّ رحمٰن۔ رحیم۔ تمام محامد والا۔ رسولوں کا بھیجنے والا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے والا اب آپ ہی بتلا دیں کہ قرآن شریف میں لفظ اللہ کے یہ معنے ہیں کہ نہیں پھر جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا۔ قرآن کو نہیں مانتا تو اس نے کیا اُس اللہ کو مانا جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ جیسے گلاب کے پھول سے خوشبو دور کر دی جاوے تو پھر وہ گلاب کا پھول پھول نہیں رہتا اور اُسے پھینک دیتے ہیں پس اسی طرح اللہ کو ماننے والا وہی ہوگا جو اُسے اُن صفات کے ساتھ مانے جو قرآن نے بیان کیے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶۵)

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

اگر کوئی ہم و غم واقع بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے الہام سے اس کے لیے خارجی اسباب ان کے دور کرنے کے پیدا کر دیتا ہے یا خارق عادت صبر ان کو عطا کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

۶۴۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

احادیث صحیحہ صاف اور صریح لفظوں میں بتلا رہی ہیں کہ یاجوج ماجوج کا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ جب قوم یاجوج ماجوج اپنی قوت اور طاقت کے ساتھ تمام قوموں پر غالب آجائے گی اور ان کے ساتھ کسی کو تاب مقابلہ نہیں رہے گی تب مسیح موعود کو حکم ہوگا کہ اپنی جماعت کو کوہ طور کی پناہ میں لے آوے یعنی آسمانی نشانوں کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرے اور خدا کی زبردست اور ہیبت ناک عجائبات سے مدد لے ان نشانوں کی مانند جو بنی اسرائیل کی سرکش قوم کے ڈرانے کے لیے کوہ طور میں دکھلائے گئے تھے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ یعنی کوہ طور میں نشان کے طریق پر بڑے بڑے زلزلے آئے۔ اور خدا نے طور کے پہاڑ کو یہود کے سروں پر اس طرح پر لرزاں کر کے دکھلایا کہ گویا اب وہ ان کے سروں پر پڑتا ہے تب وہ اس ہیبت ناک نشان کو دیکھ کر بہت ڈر گئے۔ اسی طرح مسیح موعود کے زمانہ میں بھی ہوگا۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۸۰-۸۱)

لوگ کہا کرتے تھے۔ کہ خدا نے کس طرح پہاڑ کو بنی اسرائیل کے اوپر کر دیا تھا۔ یہ قصہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اب کانگڑہ۔ دھرم سالہ مقامات کے لوگوں نے خوب سمجھ لیا ہوگا کہ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ۔ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ ذرا سے زلزلے میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا پہاڑ اُوپر آگرا۔ پھر خدا چاہے۔ اس کو پیچھے ہٹا دے۔ یا اوپر گرا دے۔ یہ تحریر نیا زمانہ کے جہلا کا جواب ہے۔ جو خدا نے زلزلہ کے ذریعہ سے دیا ہے۔ اُمید ہے۔ کہ اس قدر نظارے دیکھ کر بعض خوش قسمت

لوگ سمجھ جائیں گے۔ کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت میں ہے۔ اور وہ جو چاہتا ہے۔ کر دیتا ہے۔
(بدر جلد ۱ ۳ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ

اسلام میں صرف وہ قسم تناسخ یعنی اواگون کی باطل اور غلط ٹھہرائی گئی ہے جس میں گذشتہ ارواح کو پھر دنیا کی طرف لوٹایا جاوے لیکن بجز اس کے اور بعض صورتیں تناسخ یعنی اواگون کی ایسی ہیں کہ اسلام نے اُن کو روا رکھا ہے چنانچہ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی تعلیم سے ثابت ہے کہ ایک شخص جو اس دنیا میں زندہ موجود ہے جب تک وہ تزکیہ نفس کر کے اپنا سلوک تمام نہ کرے اور پاک ریاضتوں سے گندے جذبات اپنے دل میں سے نکال نہ دیوے تب تک وہ کسی نہ کسی حیوان یا کیڑے یا مکوڑے سے مشابہ ہوتا ہے اور اہل باطن کشفی نظر سے معلوم کر جاتے ہیں کہ وہ اپنے کسی مقام نفس پرستی میں مثلاً بیل سے مشابہ ہوتا ہے یا گدھے سے یا کُتّے سے یا کسی اور جانور سے اور اسی طرح نفس پرست انسان اسی زندگی میں ایک جون بدل کر دوسری جون میں آتا رہتا ہے ایک جون کی زندگی سے مرتا ہے اور دوسری جون کی زندگی میں جنم لیتا ہے اسی طرح اس زندگی میں ہزار ہا موتیں اُس پر آتی ہیں اور ہزار ہا جونیں اختیار کرتا ہے اور اخیر پر اگر سعادت مند ہے تو حقیقی طور پر انسان کی جون اُس کو ملتی ہے اسی بنا پر خدا تعالیٰ نے نافرمان یہودیوں کے قصہ میں فرمایا کہ وہ بندر بن گئے اور سور بن گئے سو یہ بات تو نہیں تھی کہ وہ حقیقت میں تناسخ کے طور پر بندر ہو گئے تھے بلکہ اصل حقیقت یہی تھی کہ بندروں اور سوروں کی طرح نفسانی جذبات اُن میں پیدا ہو گئے تھے غرض یہ قسم تناسخ کی اسی دنیا کی زندگی کے غیر منقطع سلسلہ میں شروع ہوتی ہے اور اسی میں ختم ہو جاتی ہے اور اس میں مرنا اور جینا اور آنا اور جانا ایک حکمی امر ہوا کرتا ہے نہ واقعی اور حقیقی۔ اور دوسری قسم تناسخ کی وہ ہے جو قیامت کے دن دوزخیوں کو پیش آئیگی اور وہ یہ ہے کہ ہر یک دوزخی جس گندے جذبہ میں گرفتار ہو گا اُسی کے مناسب حال کسی حیوان کی صورت بنا کر اُس کو دوزخ میں ڈالا جائیگا مثلاً جو لوگ شکم پرستی کی وجہ سے خدا سے دور پڑ گئے وہ کتوں کی شکل میں کر کے دوزخ میں گرائے جائیں گے اور جو لوگ شہوت جماع کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے حکم سے روگردان ہو گئے وہ سوروں کی شکل میں دوزخ میں گرائے جائیں گے اور جن لوگوں نے نافرمانی کر کے بہت سے حیوانوں کے ساتھ مشابہت پیدا کر لی تھی وہ بہت سی جونوں میں پڑیں گے اس طرح پر کہ ایک جون کو ایسی حالت میں ختم کر کے جو موت سے مشابہ ہے دوسری جون کا چولہ پہن لیں گے اسی طرح ایک جون کے بعد دوسری جون میں آئیں گے اور نہ ایک موت بلکہ ہزاروں

موتیں اُن پر آئیں گی۔ اور وہ موتیں وہی ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ثبور کثیر کے لفظ سے قرآن شریف میں بیان کیا ہے مگر مومنوں پر بجز ایک موت کے جو موتۃ اولیٰ ہے اور کوئی موت نہیں آئیگی۔ تیسری قسم تناسخ کی جو قرآن میں بیان ہے یہ ہے جو انسانی نطفہ ہزار ہا تغیرات کے بعد پھر نطفہ کی شکل بنتا ہے مثلاً اول گندم کا دانہ ہوتا ہے اور ہزاروں برس اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ زمیندار اُس کو زمین میں بوتا ہے اور وہ سبزہ کی شکل پر ہو کر زمین سے نکلتا ہے آخر دانہ بن جاتا ہے پھر کسی وقت زمیندار اُس کو بوتا ہے اور پھر سبزہ بنتا ہے اسی طرح صدہا سال ایسا ہی ہوتا رہتا ہے اور ہزارہا قالب میں وہ دانہ آتا ہے یہاں تک کہ اس کے انسان بننے کا وقت آجاتا ہے تب اُس دانہ کو کوئی انسان کھا لیتا ہے اور اُس سے انسانی نطفہ بن جاتا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۸۲-۸۴)

کتے سے مراد ایک طماع آدمی جو کہ تھوڑی سی بات پر راضی اور تھوڑی سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں اور بندر سے مراد ایک مسخ شدہ آدمی ہے۔

مفسرین سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ مسخ شدہ یہود پر پشم بھی پیدا ہو گئی تھی اور ان کی دم بھی نکل آئی تھی بلکہ ان کے عادات مثل بندروں کے ہو گئے تھے اس وقت بھی امت مثل یہود کے ہو گئی ہے اس سے مراد یہی ہے کہ ان کی خصلت ان میں آگئی ہے کہ ماموروں کا انکار کرتے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۴)

یہودیوں پر بھی ایک زمانہ ایسا آیا تھا کہ اُن میں نری زبان درازی ہی رہ گئی تھی اور انہوں نے صرف زبان کی باتوں پر ہی کفایت کر لی تھی۔ زبان سے تو وہ بہت کچھ کہتے تھے مگر دل میں طرح طرح کے گندے خیالات اور زہریلے مواد بھرے ہوئے تھے یہی وجہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر طرح طرح کے عذاب نازل کیے اور ان کو مختلف مُصیبتوں میں ڈالا اور ذلیل کیا یہاں تک کہ انہیں سؤر اور بندر بنایا۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

۷۳ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ۚ

ایک اور وہم پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض مُردے زندہ ہو گئے جیسے وہ مُردہ جس کا خون بنی اسرائیل نے چھپا لیا تھا جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اِس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قصوں میں قرآن شریف کی کسی عبارت سے نہیں نکلتا کہ فی الحقیقت کوئی مردہ زندہ ہو گیا تھا اور واقعی طور پر کسی قالب میں جان پڑ گئی تھی بلکہ اِس آیت پر نظر غور کرنے سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے ایک خون کر کے چھپا دیا تھا اور بعض بعض پر خون کی تہمت لگاتے تھے سو خدا تعالیٰ نے اصل مجرم کے پکڑنے کے لیے یہ تدبیر سمجھائی تھی کہ تم ایک گائے کو ذبح کر کے اُس کی بوٹیاں اس لاش پر مارو اور تمام اشخاص جن پر شبہ ہے ان بوٹیوں کو نوبت بہ نوبت اُس لاش پر ماریں تب اصل خونی کے ہاتھ سے

جب لاش پر بوٹی لگے گی تو لاش سے ایسی حرکات صادر ہونگی جس سے خونی پکڑا جائے۔

اب اس قصہ سے واقعی طور پر لاش کا زندہ ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا بعض کا خیال ہے کہ یہ صرف ایک دھمکی تھی کہ تا چور بیدل ہوکر اپنے تئیں ظاہر کرے لیکن ایسی تاویل سے عالم الغیب کا عجز ظاہر ہوتا ہے اور ایسی تاویلیں وہی لوگ کرتے ہیں کہ جن کو عالم ملکوت کے اسرار سے حصہ نہیں اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ طریق علم عمل الترب یعنی مسمریزم کا ایک شعبہ تھا جس کے بعض خواص میں سے یہ بھی ہے کہ جمادات یا مردہ حیوانات میں ایک حرکت مشابہہ بحرکت حیوانات پیدا ہوکر اُس سے بعض مشتبہ اور مجہول امور کا پتہ لگ سکتا ہے ہمیں چاہیئے کہ کسی سچائی کو ضائع نہ کریں اور ہریک وہ حقیقت یا خاصیت جو عین صداقت ہے اس کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے سمجھیں علم عمل التّرب ایک عظیم الشان علم ہے جو طبعی کا ایک روحانی حصہ ہے جس میں بڑے بڑے خواص اور عجائبات پائے جاتے ہیں اور اس کی اصلیت یہ ہے کہ انسان جس طرح باعتبار اپنے مجموعی وجود کے تمام چیزوں پر خلیفۃ اللہ ہے اور سب چیزیں اُس کے تابع کردی گئی ہیں۔ اسی طرح انسان جس قدر اپنے اندر انسانی قویٰ رکھتا ہے تمام چیزیں اُن قوی کی اس طرح پر تابع ہیں کہ شرائط مناسبہ کے ساتھ اُن کا اثر قبول کرلیتی ہیں انسان قوت فاعلہ کے ساتھ دُنیا میں بھیجا گیا ہے اور دوسری چیزیں قوت منفعلہ رکھتی ہیں ادنیٰ اثر انسان کی قوت فاعلہ کا یہ ہے کہ ہریک جاندار اُس سے ایسا ہل سکتا ہے کہ اُس کے خادموں میں اپنے تئیں شمار کرلیتا ہے اور اُس کا مسخّر ہوجاتا ہے فطرت نے جن انسانوں کو قوت فاعلہ کا بہت سا حصہ دیا ہے اُن سے عمل الترب کے عجیب عجیب خواص ظاہر ہوتے ہیں درحقیقت انسان ایک ایسا جانور ہے کہ اُس کے ظاہری اور باطنی قوی ترقی دینے سے ترقی پذیر ہوسکتے ہیں اور ان کی قوت فاعلی کا اثر بڑھ جاتا ہے مثلاً جن لوگوں کو ہمارے ملک میں ڈائن کہتے ہیں ان کی صرف اس قدر حقیقت ہے کہ اُن کی زہریلی نظر سے ضعیف الخلقت لوگ بچے وغیرہ کسی قدر متاثر ہوجاتے ہیں بعض لوگ اپنی زہریلی نظر سے درندوں کو مغلوب اور متاثر کرکے آسانی سے اُن کا شکار کرلیتے ہیں۔ بعض اپنے تصورات ترہی مشق کی وجہ سے دوسرے کے دل میں ڈال دیتے ہیں بعض اپنی کیفیت ذوقی کا اثر اُسی عمل کے زور سے دوسرے کے دل تک پہنچا سکتے ہیں بعض بے جان چیزوں پر اثر ڈال کر اُن میں حرکت پیدا کردیتے ہیں چنانچہ زمانہ حال میں بھی ان باتوں میں مشق رکھنے والے بہت نظر آتے ہیں بعض کٹے ہوئے سر بکری وغیرہ کے عمل الترب کے زور سے ایسی حرکت میں لاتے ہیں کہ وہ ناچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بعض عمل الترب کے زور سے چوروں کا پتہ لگا لیتے ہیں قرآن شریف یا لوٹے کو حرکت دیکر جو چور کا پتہ نکالتے ہیں حقیقت میں یہ عمل الترب کی ایک شاخ ہے اگرچہ اُس کی شرائط ضروریہ کے نہ پائے جانے کی وجہ سے غلطی واقع ہو چنانچہ اسی وجہ سے بکثرت غلطی واقع ہوتی بھی ہے لیکن یہ غلطی اس عمل کی عزت اور عظمت کو گھٹا نہیں سکتی کیونکہ بہت سے تجارب صحیحہ سے اِس کی اصلیت ثابت ہوچکی ہے بے شک انسانی حیات اور شعور کا اثر دوسری چیزوں پر بھی پڑ سکتا ہے اور انسان کی قوت کشفی کا پرتوہ جمادات

یا کسی مردہ حیوان پر پڑ کر اُس کو بعض مجہولات کے استکشاف کا آلہ بنا سکتا ہے چنانچہ قضیہ مذکورہ بالا جس کا آیت مذکورہ بالا میں ذکر ہے اسی قسم میں سے ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۸-۵۲)

نیکی کو نیک لوگ اگر ہزار پردوں کے اندر بھی کریں تو خدا نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ اُسے ظاہر کر دیگا اور اسی طرح بدی کا حال ہے۔ بلکہ لکھا ہے کہ اگر کوئی عابد زاہد خدا کی عبادت میں مشغول ہو اور اُس صدق اور جوش کا جو اُس کے دل میں ہے انتہا کے نقطہ تک اظہار کر رہا ہو۔ اور اتفاقاً کنڈی لگانی بھول گیا ہو تو کوئی اجنبی باہر سے آکر اُس کا دروازہ کھول دے تو اُس کی حالت بالکل وہی ہوتی ہے جو ایک زانی کی عین زنا کے وقت پکڑا جانے سے۔ کیونکہ اصل غرض تو دونوں کی ایک ہی ہے یعنی اخفائے راز اگرچہ رنگ الگ الگ ہیں ایک نیکی کو اور دوسرا بدی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ غرض خدا کے بندوں کی حالت تو اس نقطہ تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے نیک بھی چاہتے ہیں کہ ہماری نیکی پوشیدہ رہے اور بد بھی اپنی بدی کو پوشیدہ رکھنے کی دعاء کرتا ہے مگر اس امر میں دونوں نیک و بد کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو قانون بنا رکھا ہے کہ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

۷۴۔ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

یہ حیات حقیقی کا ثبوت نہیں بلکہ ایک اعجوبہ قدرت کے ثابت ہونے سے دوسری قدرت کی طرف اشارہ ہے چنانچہ جابجا قرآن شریف میں یہی طریق ہے یہاں تک کہ نباتات کے اُگنے کو احیا موتٰی پر دلیل ٹھہرائی گئی ہے اور یہی آیت كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ان مقامات میں بھی لکھی گئی ہے۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جو قرآن کریم میں چار پرندوں کا ذکر لکھا ہے کہ اُن کو اجزاء متفرقہ یعنی جدا جدا کر کے چار پہاڑیوں پر چھوڑا گیا تھا اور پھر وہ بلانے سے آ گئے تھے یہ بھی عمل الترب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عمل الترب کے تجارب بتلا رہے ہیں کہ انسان میں جمیع کائنات الارض کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے ایک قوت مقناطیسی ہے اور ممکن ہے کہ انسان کی قوت مقناطیسی اس حد تک ترقی کرے کہ کسی پرند یا چرند کو صرف توجہ سے اپنی طرف کھینچ لے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۲-۵۳)

۸۳۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

بہشتیوں کے ہمیشہ بہشت میں رہنے کا جا بجا ذکر ہے اور سارا قرآن شریف اِس سے بھرا پڑا ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۵۳)

وہ تمام آیتیں جن کے بعد خالدون یا خالدین آتا ہے اسی امر کو ظاہر کر رہی ہیں کہ کوئی انسان راحت یا رنج عالم معاد کے چکھ کر پھر دنیا میں ہرگز نہیں آتا۔ {ازالہ اوہام حصہ دوم حاشیہ در حاشیہ متعلق صفحہ ۱۴۲ (ب)}

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ یعنی لوگوں کو وہ باتیں کہو جو واقعی طور پر نیک ہوں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

اور وہ زمانہ یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم نے خون نہ کرنا اور اپنے عزیزوں کو اُن کے گھروں سے نہ نکالنا اور تم نے اقرار کر لیا تھا کہ ہم اس عہد پر قائم رہیں گے لیکن تم پھر بھی ناحق کا خون کرتے اور اپنے عزیزوں کو ان کے گھروں سے نکالتے رہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۴۱)

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ

یعنی جو شخص تم میں سے ایسا کام کرے دنیا کی زندگی میں اُس کو رسوائی ہوگی اور قیامت کو اُس کے لیے سخت عذاب ہے۔ (شہادۃ القرآن بار دوم صفحہ ۳)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۝

تمہاری یہی عادت رہی کہ جب کوئی نبی تمہاری طرف بھیجا گیا تو بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کے درپئے قتل ہوئے یا قتل ہی کر دیا۔

اب فرمائیے کہ اگر یہ کلمات بطور استعارہ نہیں ہیں اور ان تمام آیات کو ظاہر پر حمل کرنا چاہیئے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جو لوگ درحقیقت ان آیات کے مخاطب ہیں جن کو آلِ فرعون سے نجات دی گئی تھی اور جن کو دریا نے راہ دیا تھا اور جن پر من وسلویٰ اُتارے گئے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک زندہ ہی تھے یا مرنے کے بعد پھر زندہ ہو کر آگئے تھے۔ کیا آپ لوگ جب مسجدوں میں بیٹھ کر قرآن کریم کا ترجمہ پڑھاتے ہیں تو ان آیات کے معنے یہ سمجھایا کرتے ہیں کہ ان آیات کے مخاطبین ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت تک بقیدِ حیات تھے یا قبروں سے زندہ ہو کر پھر دنیا میں آگئے تھے اگر کوئی طالب علم آپ سے سوال کرے کہ ان آیات کے ظاہر مفہوم سے تو یہی معنے نکلتے ہیں کہ مخاطب وہی لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ اور دوسرے نبیوں کے وقت موجود تھے۔ کیا اب یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زندہ تھے یا زندہ ہو کر پھر دنیا میں آگئے تھے تو کیا آپ کا یہی جواب نہیں کہ بھائی وہ تو سب فوت ہو گئے اور اب مجازی طور پر مخاطب ان کی نسل ہی ہے جو اُن کے کاموں پر راضی ہے گویا اُنہیں کا وجود ہے یا یوں کہو کہ گویا وہی ہیں۔ تو اب سمجھ لو کہ یہی مثال ابن مریم کے نزول کی ہے سنت اللہ

اسی طرح پر ہے کہ مراتب وجود دَوری ہیں۔ اور بعض کے ارواح بعض کی صورت مثالی لیکر اس عالم میں آتے ہیں اور روحانیت ان کی بکلی ایک دوسرے پر منطبق ہوتی ہے آیت تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ کو غور سے پڑھو۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۴۱-۶۴۳)

یعنی اے بنی اسرائیل کیا تمہاری یہ عادت ہوگئی کہ ہر ایک رسول جو تمہارے پاس آیا تو تم نے بعض کی اُن میں سے تکذیب کی اور بعض کو قتل کر ڈالا۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۳۴)

وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ مولویوں کے احادیث پیش کرنے پر فرمایا۔ ان (احادیث) پر ایسا وثوق تو نہیں ہوتا جیسے کلام الٰہی پر۔ کیونکہ خواہ کچھ ہی ہو پھر بھی وہ مسّ انسان سے تو خالی نہیں مگر خدا تعالیٰ جس کی تنقید کرتا جاوے وہ صحیح ہوتا جاوے گا اگر احادیث میں نزول مسیح کا ذکر تھا تو دیکھئے قرآن شریف میں وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ موجود ہے جو کہ اصل حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۱۰ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ۔

یعنی ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور بہت سے رُسل اس کے پیچھے آئے .... چونکہ مماثلت فی الانعامات ہونا ازبس ضروری ہے اور مماثلت تامہ بھی متحقق ہو سکتی تھی کہ جب مماثلت فی الانعامات متحقق ہو پس اسی لیے یہ ظہور میں آیا کہ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قریباً چودہ سو برس تک ایسے خدام شریعت عطا کیے گئے کہ وہ رسول اور مُلہم من اللہ تھے اور اختتام اس سلسلہ کا ایک ایسے رسول پر ہوا جس نے تلوار سے نہیں بلکہ فقط رحمت اور خُلق سے حق کی طرف دعوت کی اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہ خُدّام شریعت عطا کیے گئے جو بر طبق حدیث عُلَمَآءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ مُلہم اور مُحدّث تھے اور جس طرح موسیٰ کی شریعت کے آخری زمانہ میں حضرت مسیح علیہ السلام بھیجے گئے جنہوں نے نہ تلوار سے بلکہ صرف خُلق اور رحمت سے دعوت حق کی۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے اس شریعت کے لیے مسیح موعود کو بھیجا تا وہ بھی صرف خُلق اور رحمت اور انوار آسمانی سے راہ راست کی دعوت کرے اور جس طرح حضرت مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قریباً چودہ۱۴ سو برس بعد آئے تھے اس مسیح موعود نے بھی چودھویں۱۴ صدی کے سر پر ظہور کیا اور محمدی سلسلہ موسوی سلسلہ سے انطباق کلّی پا گیا اور اگر یہ کہا جائے کہ موسوی سلسلہ میں تو حمایت دین کے لیے نبی آتے رہے اور حضرت مسیح بھی نبی تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مرسل ہونے میں نبی اور محدث ایک ہی منصب رکھتے ہیں اور جیسا کہ خدا تعالیٰ نے نبیوں کا نام مرسل رکھا ایسا ہی محدثین کا نام بھی مرسل رکھا۔ اسی اشارہ کی غرض سے قرآن شریف میں وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ آیا ہے اور یہ نہیں آیا کہ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالْاَنْبِيَآءِ پس یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسل سے مراد مُرسل ہیں خواہ وہ رسول ہوں

[1] البقرہ: ۱۱۹

یا نبی ہوں یا محدث ہوں چونکہ ہمارے سید و رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرت صلعم کوئی نبی نہیں آسکتا اِس لیے اِس شریعت میں نبی کے قائم مقام محدّث رکھے گئے اور اسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ[1] چونکہ ثلہ کا لفظ دونوں فقروں میں برابر آیا ہے اِس لیے قطعی طور پر یہاں سے ثابت ہوا کہ اس اُمت کے محدث اپنی تعداد میں اور اپنے طولانی سلسلہ میں موسوی اُمت کے مرسلوں کے برابر ہیں اور درحقیقت اسی کی طرف اس دوسری آیت میں بھی اشارہ ہے اور وہ یہ ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ .... (الی) لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا[2] یعنی خدا نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ وعدہ کیا ہے کہ البتہ انہیں زمین میں اسی طرح خلیفہ کرے گا۔ جیسا کہ ان لوگوں کو کیا۔ جو ان سے پہلے گذر گئے۔ اور ان کے دین کو جو ان کے لیے پسند کیا ہے۔ ثابت کر دیگا۔ اور ان کے لیے خوف کے بعد امن کو بدل دیگا۔ میری عبادت کریں گے۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ (شہادۃ القرآن جلد دوم صفحہ ۲۶-۲۸)

اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ | جب محبتِ الٰہی بندہ کی محبت پر نازل ہوتی ہے تب دونوں محبتوں کے ملنے سے رُوح القدس کا ایک روشن اور کامل سایہ انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اور لقا کے مرتبہ پر اُس رُوح القدس کی روشنی نہایت ہی نمایاں ہوتی ہے اور اقتداری خوارق جن کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اسی وجہ سے ایسے لوگوں سے صادر ہوتے ہیں کہ یہ روح القدس کی روشنی ہر وقت اور ہر حال میں اُن کے شامل حال ہوتی ہے اور اُن کے اندر سکونت رکھتی ہے اور وہ اُس روشنی سے کبھی اور کسی حال میں جدا نہیں ہوتے اور نہ وہ روشنی اُن سے جدا ہوتی ہے۔ وہ روشنی ہر دم اُن کے تنفّس کے ساتھ نکلتی ہے اور اُن کی نظر کے ساتھ ہر یک چیز پر پڑتی ہے۔ اور اُن کی کلام کے ساتھ اپنی نورانیت لوگوں کو دکھلاتی ہے اُسی روشنی کا نام رُوح القدس ہے مگر یہ حقیقی رُوح القدس نہیں حقیقی روح القدس وہ ہے جو آسمان پر ہے یہ روح القدس اُس کا ظل ہے جو پاک سینوں اور دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ کے لیے آباد ہو جاتا ہے اور ایک طرفۃ العین کے لیے بھی اُن سے جدا نہیں ہوتا اور جو شخص تجویز کرتا ہے کہ یہ روح القدس کسی وقت اپنی تمام تاثیرات کے ساتھ اُن سے جدا ہو جاتا ہے وہ شخص سراسر باطل پر ہے اور اپنے پُر ظلمت خیال سے خدا تعالیٰ کے مقدس برگزیدوں کی توہین کرتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ حقیقی روح القدس تو اپنے مقام پر ہی رہتا ہے لیکن روح القدس کا سایہ جس کا نام مجازاً روح القدس ہی رکھا جاتا ہے اُن سینوں اور دلوں اور دماغوں اور تمام اعضا میں داخل ہوتا ہے جو مرتبہ بقا اور لقا کا پا کر اس لائق ٹھہر جاتے ہیں کہ اُن کی نہایت اصفیٰ اور اجلیٰ محبت پر خدا تعالیٰ کی کامل محبت اپنی برکات کے ساتھ نازل ہو اور جب وہ روح القدس نازل ہوتا ہے تو اُس انسان کے وجود سے ایسا

---

[1] الواقعہ : ۴۰، ۴۱ ۞ [2] النور : ۵۶ ۞

تعلق پکڑ جاتا ہے کہ جیسے جان کا تعلق جسم سے ہوتا ہے وہ قوت بینائی بن کر آنکھوں میں کام دیتا ہے اور قوت شنوائی کا جامہ پہن کر کانوں کو روحانی حس بخشتا ہے وہ زبان کی گویائی اور دل کے تقوٰی اور دماغ کی ہشیاری بن جاتا ہے اور ہاتھوں میں بھی سرایت کرتا ہے اور پیروں میں بھی اپنا اثر پہنچاتا ہے۔ غرض تمام ظلمت کو وجود میں سے اُٹھا دیتا ہے اور سر کے بالوں سے لیکر پیروں کے ناخنوں تک منور کردیتا ہے اور اگر ایک طرفۃ العین کے لیے بھی علیحدہ ہوجائے تو فی الفور اُس کی جگہ ظلمت آجاتی ہے مگر وہ کاملوں کو ایسا نعم القرین عطا کیا گیا ہے کہ ایک دم کے لیے بھی اُن سے علیحدہ نہیں ہوتا اور یہ گمان کرنا کہ اُن سے علیحدہ بھی ہوجاتا ہے یہ دوسرے لفظوں میں اس بات کا اقرار ہے کہ وہ بعد اس کے جو روشنی میں آگئے پھر تاریکی میں پڑ جاتے ہیں اور بعد اس کے جو معصوم یا محفوظ کیے گئے پھر نفس امّارہ اُن کی طرف عود کرتا ہے اور بعد اس کے جو رُوحانی حواس اُن پر کھولے گئے پھر وہ تمام حواس بیکار اور معطل کیے جاتے ہیں۔ سوائے وے لوگو جو اس صداقت سے منکر اور اس نکتہ معرفت سے انکاری ہو جلدی مت کرو اور اپنے ہی نورِ قلب سے گواہی طلب کرو کہ کیا یہ امر واقعی ہے کہ برگزیدوں کی روشنی کسی وقت بتمام وکمال اُن سے دور بھی ہوجاتی ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ وہ تمام نورانی نشان کامل مومنوں سے کمال ایمان کی حالت میں کبھی گم بھی ہوجاتے ہیں۔

اگر یہ کہو کہ ہم نے کب اور کس وقت کہا ہے کہ برگزیدوں کی روحانی روشنی کبھی سب کی سب دور بھی ہوجاتی ہے اور سراسر ظلمت اُن پر احاطہ کرلیتی ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ آپ لوگوں کے عقیدہ سے ایسا ہی نکلتا ہے کیونکہ آپ لوگ بالتزام واتباع آیات کلام الٰہی اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ ہریک نور اور سکینت اور اطمینان اور برکت اور استقامت اور ہریک روحانی نعمت برگزیدوں کو روح القدس سے ہی ملتی ہے اور جیسے اشرار اور کفار کے لیے دائمی طور پر شیطان کو بئس القرین قرار دیا گیا ہے تا ہر وقت وہ اُن پر ظلمت پھیلاتا رہے اور اُن کے قیام اور قعود اور حرکت اور سکون اور نیند اور بیداری میں ان کا پیچھا نہ چھوڑے ایسا ہی مقربین کے لیے دائمی طور پر روح القدس کو نعم القرین عطا کیا گیا ہے تا ہر وقت وہ اُن پر نور برساتا رہے اور ہر دم اُن کی تائید میں لگا رہے اور کسی دم اُن سے جدا نہ ہو۔

اب ظاہر ہے کہ جبکہ بمقابل بئس القرین کے جو ہمیشہ اشدّ شریروں کا ملازم اور رفیق ہے مقربوں کے لیے نعم القرین کا ہر وقت رفیق اور انیس ہونا نہایت ضروری ہے اور قرآن کریم اُس کی خبر دیتا ہے تو پھر اگر اُس نعم القرین کی علیحدگی مقربوں سے تجویز کی جائے جیسا کہ ہمارے اندرونی مخالف قومی بھائی گمان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح القدس جبرائیل کا نام ہے کبھی تو وہ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور مقربوں سے نہایت درجہ اتصال کرلیتا ہے یہاں تک کہ اُن کے دل میں دھنس جاتا ہے اور کبھی اُن کو اکیلا چھوڑ کر اُن سے جدائی اختیار کرلیتا ہے اور کروڑہا بلکہ بے شمار کوسوں کی دوری اختیار کرکے آسمان پر چڑھ جاتا ہے اور اُن مُقربوں سے بالکل قطع تعلقات کر کے اپنے قرارگاہ میں جا چھپتا ہے تب وہ اُس روشنی اور اُس برکت سے بکلّی محروم رہ جاتے ہیں جو اُس کے نزول کے وقت اُن کے دل اور دماغ اور بال بال میں پیدا ہوتی ہے

توکیا اس عقیدہ سے لازم نہیں آتا کہ رُوح القدس کے جدا ہونے سے پھر اُن برگزیدوں کو ظلمت گھیر لیتی ہے اور نعوذ باللہ نعم القرین کی جدائی کی وجہ سے بئس القرین کا اثر اُن میں شروع ہو جاتا ہے اب ذرہ خوف الٰہی کو اپنے دل میں جگہ دیکر سوچنا چاہیئے کہ کیا یہی ادب اور یہی ایمان اور عرفان ہے اور یہی محبّت رسُول اللہ صَلّی اللہ علیہ وسلم ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس نقص اور تنزل کی حالت کو روا رکھا جائے کہ گویا روح القدس آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے مدّتوں تک علیحدہ ہو جاتا تھا اور نعوذ باللہ اُن مدتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انوار قدسیہ سے جو روح القدس کا پرتوہ ہے محروم ہوتے تھے۔ غضب کی بات ہے کہ عیسائی لوگ تو حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت یقینی اور قطعی طور پر یہ اعتقاد رکھیں کہ روح القدس جب سے حضرت مسیح پر نازل ہوا کبھی اُن سے جدا نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ اور ہر دم روح القدس سے تائید یافتہ تھے یہاں تک کہ خواب میں بھی اُن سے رُوح القدس جدا نہیں ہوتا تھا اور اُن کا رُوح القدس کبھی آسمان پر اُن کو اکیلا اور مہجور چھوڑ کر نہیں گیا اور نہ روح القدس کی روشنی ایک دم کے لیے بھی کبھی اُن سے جدا ہوئی لیکن مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روح القدس آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا بھی ہو جاتا تھا اور اپنے دشمنوں کے سامنے بصراحت تمام یہ اقرار کریں کہ روح القدس کی دائمی رفاقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عیسیٰ کی طرح نصیب نہیں ہوئی۔

اب سوچو کہ اس سے زیادہ تر اور کیا بے ادبی اور گستاخی ہو گی کہ آنحضرت صلعم کی صریح توہین کی جاتی ہے اور عیسائیوں کو اعتراض کرنے کے لیے موقعہ دیا جاتا ہے۔ اِس بات کو کون نہیں جانتا کہ روح القدس کا نزول نورانیت کا باعث اور اُس کا جدا ہو جانا ظلمت اور تاریکی اور بدخیالی اور تفرقہ ایمان کا موجب ہوتا ہے خدا تعالیٰ اسلام کو ایسے مسلمانوں کے شرّ سے بچاوے جو کلمہ گو کہلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی حملہ کر رہے ہیں۔ عیسائی لوگ تو حواریوں کی نسبت بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ کبھی اُن سے روح القدس جدا ہوتا تھا بلکہ اُن کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ لوگ روح القدس کا فیض دوسروں کو بھی دیتے تھے۔ لیکن یہ لوگ مسلمان کہلا کر اور مولوی اور محدث اور شیخ الکل نام رکھا کر پھر جناب ختم المرسلین خیر الاوّلین والآخرین کی شان میں ایسی ایسی بدگمانی کرتے ہیں اور اِس قدر سخت بدزبانی کر کے پھر خاصے مسلمان کے مسلمان اور دوسرے لوگ اِن کی نظر میں کافر ہیں۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۷۲ تا ۷۶)

اس کی تفسیر میں تمام مفسّرین اس بات پر متفق ہیں کہ روح القدس ہر وقت قرین اور رفیق حضرت عیسٰی کا تھا اور ایک دم بھی اُن سے جدا نہیں ہوتا تھا دیکھو تفسیر حسینی تفسیر مظہری تفسیر عزیزی معالم ابن کثیر وغیرہ! اور مولوی صدیق حسن فتح البیان میں اِس آیت کی تفسیر میں یہ عبارت لکھتے ہیں وَکَانَ جِبْرَائِیْلُ یَسِیْرُ مَعَ عِیْسٰی حَیْثُ سَارَ فَلَمْ یُفَارِقْہُ حَتّٰی صَعِدَ بِہٖ اِلَی السَّمَاءِ۔ یعنی جبرائیل ہمیشہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ہی رہتا تھا ایک طرفۃ العین بھی ان سے جدا نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ اُن کے ساتھ ہی آسمان پر گیا اس جگہ دو باتیں نہایت قابل افسوس ناظرین کی توجہ لاتی ہیں

(۱) اول یہ کہ اِن مولویوں کا تو یہ اعتقاد تھا کہ جبرائیل وحی لیکر آسمان سے نبیوں پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا تھا اور تبلیغ وحی کر کے پھر بلا توقف آسمان پر چلا جاتا تھا۔ اب مخالف اِس عقیدہ کے حضرت عیسیٰ کی نسبت ایک نیا عقیدہ تراشا گیا اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ کی وحی کے لیے جبرائیل آسمان پر نہیں جاتا تھا بلکہ وحی خود بخود آسمان سے گر پڑتی تھی اور جبرائیل ایک طرفۃ العین کے لیے بھی حضرت عیسیٰ سے جدا نہیں ہوتا تھا اُسی دن آسمان کا مُنہ جبرائیل نے بھی دیکھا جب حضرت عیسیٰ آسمان پر تشریف لے گئے ورنہ پہلے اِس سے تینتیس برس تک برابر دن رات زمین پر رہے اور ایک دم کے لیے بھی حضرت عیسیٰ سے جدا نہیں ہوئے اور برابر تینتیس برس تک اپنا وہ آسمانی مکان جو ہزار کوس کے طول و عرض سے کچھ کم نہیں ویران سُنسان چھوڑ دیا حالانکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ایک دم کے لیے بھی آسمان بقدر بالشت بھی فرشتوں سے خالی نہیں رہتا۔ اور تینتیس برس تک جو حضرت عیسیٰ کو وحی پہنچاتے رہے اُس کی طرز بھی سب انبیاء سے نرالی نکلی کیونکہ بخاری نے اپنی صحیح میں اور ایسا ہی ابو داؤد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے اور ایسا ہی مسلم نے بھی اِس پر اتفاق کیا ہے کہ نزول جبرائیل کا وحی کے ساتھ انبیاء پر وقتاً فوقتاً آسمان سے ہوتا ہے (یعنی وہ تجلی جس کی ہم تصریح کر آئے ہیں) اور اس کی تائید میں ابن جریر اور ابن کثیر نے یہ حدیث بھی لکھی ہے عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَنْ یُّوْحِیَ بِاَمْرِہٖ تَکَلَّمَ بِالْوَحْیِ فَاِذَا تَکَلَّمَ اَخَذَتِ السَّمٰوٰتُ مِنْہُ رَجْفَۃً اَوْ قَالَ رَعْدَۃً شَدِیْدَۃً مِّنْ خَوْفِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَاِذَا سَمِعَ بِذَالِکَ اَھْلُ السَّمٰوٰتِ صَعِقُوْا وَخَرُّوْا لِلّٰہِ سُجَّدًا فَیَکُوْنُ اَوَّلَ مَنْ یَّرْفَعُ رَاْسَہٗ جِبْرَائِیْلُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ فَیُکَلِّمُہُ اللّٰہُ مِنْ وَّحْیِہٖ بِمَا اَرَادَ فَیَمْضِیْ بِہٖ جِبْرَائِیْلُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَی الْمَلَآئِکَۃِ کُلَّمَا مَرَّ بِسَمَآءٍ سَمَآءٍ یَسْئَلُہٗ مَلَائِکَتُھَا مَاذَا قَالَ رَبُّنَا یَا جِبْرَائِیْلُ فَیَقُوْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ الْحَقَّ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ فَیَقُوْلُوْنَ کُلُّھُمْ مِثْلَ مَا قَالَ جِبْرَائِیْلُ فَیَنْتَھِیْ جِبْرَائِیْلُ بِالْوَحْیِ اِلٰی حَیْثُ اَمَرَہُ اللّٰہُ تَعَالٰی مِنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ یعنی نواس بن سمعان سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس وقت خدا تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ کوئی امر وحی اپنی طرف سے نازل کرے تو بطور وحی متکلم ہوتا ہے یعنی ایسا کلام کرتا ہے جو ابھی اجمال پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک چادر پوشیدگی کی اُس پر ہوتی ہے تب اُس محجوب المفہوم کلام سے ایک لرزہ آسمانوں پر پڑ جاتا ہے جس سے وہ ہولناک کلام تمام آسمانوں میں پھر جاتا ہے اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اِس کے کیا معنے ہیں اور خوف الٰہی سے ہر یک فرشتہ کانپنے لگتا ہے کہ خدا جانے کیا ہونے والا ہے اور اُس ہولناک آواز کو سُن کر ہر یک فرشتہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سجدہ میں گر جاتے ہیں پھر سب سے پہلے جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام سجدہ سے سر اُٹھاتا ہے اور خدا تعالیٰ اس وحی کی تمام تفصیلات اُس کو سمجھا دیتا ہے اور اپنی مراد اور منشاء سے مطلع کر دیتا ہے تب جبرائیل اُس وحی کو لیکر تمام فرشتوں کے پاس جاتا ہے جو مختلف آسمانوں میں ہیں اور ہر یک فرشتہ اُس سے پوچھتا ہے کہ یہ آواز ہولناک کیسی تھی اور اِس سے کیا مراد تھی

تب جبرائیل اُن کو یہ جواب دیتا ہے کہ یہ ایک امر حق ہے اور خدا تعالیٰ بلند اور نہایت بزرگ ہے یعنی یہ وحی اُن حقائق میں سے ہے جن کا ظاہر کرنا اُس العلی الکبیر نے قرینِ مصلحت سمجھا ہے تب وہ سب اُس کے ہم کلام ہو جاتے ہیں۔ پھر جبرائیل اُس وحی کو اُس جگہ پہنچا دیتا ہے جس جگہ پہنچانے کے لیے اُس کو حکم تھا خواہ آسمان یا زمین۔

اب اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نزولِ وحی کے وقت جبرائیل آسمان پر ہی ہوتا ہے اور پھر جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اُس کی آواز میں قوت اور قدرت بخشی ہے اپنے محل میں اس وحی کو پہنچا دیتا ہے۔ اِس صورت میں یہ عقیدہ رکھنا کہ گویا جبرائیل اپنے اصلی وجود کے ساتھ آسمانوں سے ہجرت کر کے حضرت عیسیٰ کے پاس آ گیا تھا اور تینتیس برس برابر اُن کے پاس رہا اور وہ تمام خدمات جو آسمانوں پر اُس کے سپرد تھیں جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں وہ تینتیس برس تک معرض التوا میں رہیں۔ کیسا باطل عقیدہ ہے جس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وحی بغیر توسط جبرائیل کے خود بخود زمین پر نازل ہوتی تھی اور زمین پر ہی وہ وحی جبرائیل کو مل جاتی تھی۔

دوسری بات ناظرین کی توجہ کے لائق یہ ہے کہ اِن مولویوں نے بات بات میں حضرت عیسیٰ کو بڑھایا اور ہمارے سیّد و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی بغضب کی بات ہے کہ اِن کا عقیدہ حضرت مسیح کی نسبت تو یہ ہو کہ کبھی روح القدس ان سے جدا نہیں ہوتا تھا اور مسِّ شیطان سے وہ بری تھے اور یہ دونو باتیں انہیں کی خصوصیت تھی لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ان کا یہ اعتقاد ہو کہ نہ روح القدس ہمیشہ اور ہر وقت اُن کے پاس رہا اور نہ وہ نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد مسِّ شیطان سے بری تھے۔ باوجود ان باتوں کے یہ لوگ مسلمان کہلاویں ان کی نظر میں ہمارے سیّد و مولیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مُردہ مگر حضرت عیسیٰ اب تک زندہ۔ اور عیسیٰؑ کے لیے روح القدس دائمی رفیق مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ اس نعمت سے بے بہرہ اور حضرت عیسیٰ مسِّ شیطان سے محفوظ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ نہیں جن لوگوں کے یہ عقائد ہوں اُن کے ہاتھ سے جس قدر دین اسلام کو اِس زمانہ میں نقصان پہنچ رہا ہے کون اُس کا اندازہ کر سکتا ہے یہ لوگ چھپے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں چاہیے کہ ہر یک مسلمان اور سچا عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پرہیز کرے سلف صالح کو سراسر شرارت کی راہ سے اپنے اقوال مردودہ کے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اپنی نابینائی کی وجہ سے سلف صالح کے اقوال کو سمجھ نہیں سکتے اور نہ احادیث نبویہ کی اصل حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں صرف دھوکہ دینے کی راہ سے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا یہ حال ہے تو یہی عقیدہ سلف صالح کا ہے۔

اے نادانو! یہ سلف صالح کا ہرگز طریقہ نہیں۔ اگر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے کہ کبھی یا مدتوں تک آپ سے روح القدس جدا بھی ہو جاتا تھا تو وہ ہرگز ہر یک وقت اور ہر یک زمانہ کی احادیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ نہ کرتے ان کی نظر تو اس آیت پر تھی وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى[1]

---

[1] النجم: ۴،۵۔

اگر صحابہ تمہاری طرح مس شیطان کا اعتقاد رکھتے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سید المعصومین کیوں قرار دیتے خدا تعالیٰ سے ڈرو کیوں افترا پر کمر باندھی ہے (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۰۴-۱۱۲)

روح القدس کا تعلق تمام نبیوں اور پاک لوگوں سے ہوتا ہے پھر مسیح کی اس سے کیا خصوصیت ہے اس کا جواب یہی ہے کہ کوئی خصوصیت نہیں بلکہ اعظم اور اکبر حصہ روح القدس کی فطرت کا حضرت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے لیکن چونکہ یہود شریر الطبع نے حضرت مسیح پر یہ بہتان لگایا تھا کہ اُن کی ولادت روح القدس کی شراکت سے نہیں بلکہ شیطان کی شراکت سے ہے یعنی ناجائز طور پر اس لیے خدا نے اس بہتان کی ذب اور دفع کے لیے اس بات پر زور دیا کہ مسیح کی پیدایش روح القدس کی شراکت سے ہے اور وہ مَسّ شیطان سے پاک ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا لعنتیوں کا کام ہے کہ دوسرے نبی مَسّ شیطان سے پاک نہیں ہیں بلکہ یہ کلام محض یہودیوں کے خیال باطل کے دفع کے لیے ہے کہ مسیح کی ولادت مَسّ شیطان سے ہے یعنی حرام کے طور پر پھر چونکہ یہ بحث مسیح میں شروع ہوئی اس لیے روح القدس کی پیدائش میں ضرب المثل مسیح ہو گیا ورنہ اُس کو پاک پیدایش میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ذرہ ترجیح نہیں بلکہ دنیا میں معصوم کامل صرف محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوا ہے اور بعض حدیثوں کے یہ الفاظ کہ مَسّ شیطان سے پاک صرف ابن مریم اور اس کی ماں یعنی مریم ہے یہ لفظ بھی یہودیوں کے مقابل پر مسیح کی پاکیزگی ظاہر کرنے کے لیے ہے گویا یہ فرماتا ہے کہ دنیا میں صرف دو گروہ ہیں ایک وہ جو آسمان پر ابن مریم کہلاتے ہیں اگر مرد ہیں اور مریم کہلاتے ہیں اگر عورت ہیں دوسرے وہ گروہ ہے جو آسمان پر یہود مغضوب علیہم کہلاتے ہیں پہلا گروہ مَسّ شیطان سے پاک ہے اور دوسرا گروہ شیطان کے فرزند ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۳ حاشیہ در حاشیہ)

جب شیطان کا ظہور ہوا تو اس کا اثر مٹانے کے لیے روح القدس کا ظہور ضروری ہوا۔ جس طرح شیطان بدی کا باپ ہے روح القدس نیکی کا باپ ہے۔ انسان کی فطرت کو دو مختلف جذبہ لگے ہوئے ہیں۔ (۱) ایک جذبہ بدی کی طرف جس سے انسان کے دل میں بُرے خیالات اور بدکاری اور ظلم کے تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جذبہ شیطان کی طرف سے ہے اور کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کی فطرت کے لازم حال یہ جذبہ ہے۔ گو بعض قومیں شیطان کے وجود سے انکار بھی کریں لیکن اس جذبہ کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ (۲) دوسرا جذبہ نیکی کی طرف ہے جس سے انسان کے دل میں نیک خیالات اور نیکی کرنے کی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ جذبہ روح القدس کی طرف سے ہے اور اگرچہ قدیم سے اور جب سے کہ انسان پیدا ہوا ہے یہ دونوں قسم کے جذبے انسان میں موجود ہیں لیکن آخری زمانہ کے لیے مقدر تھا کہ پورے زور شور سے یہ دونوں قسم کے جذبے انسان میں ظاہر ہوں۔ اس لیے اس زمانہ میں بروزی طور پر یہودی بھی پیدا ہوئے اور بروزی طور پر مسیح ابن مریم بھی پیدا ہوا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۳-۱۳۴ حاشیہ)

روح القدس کے فرزند وہ تمام سعادت مند اور راست باز ہیں جن کی نسبت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ

سُلْطَانٌ [1] وارد ہے۔ اور قرآن کریم سے دو قسم کی مخلوق ثابت ہوتی ہے اول وہ جو روح القدس کے فرزند ہیں۔ اور بن باپ پیدا ہونا کوئی خصوصیت نہیں۔ دوم شیطان کے فرزند۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۸۹۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

لعنت کا لفظ جو عربی اور عبرانی میں مشترک ہے نہایت پلید معنے رکھتا ہے اور اس لفظ کے ایسے خبیث معنے ہیں کہ بجز شیطان کے اور کوئی اس کا مصداق نہیں ہو سکتا کیونکہ عربی اور عبرانی کی زبان میں ملعون اسکو کہتے ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے رد کیا جائے اسی وجہ سے لعین شیطان کا نام ہے کیونکہ وہ ہمیشہ کے لیے رحمت الٰہی سے رد کیا گیا ہے اور خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں میں توریت سے قرآن شریف تک کسی ایسے شخص کی نسبت ملعون ہونے کا لفظ نہیں بولا گیا جس نے انجام کار خدا کی رحمت اور فضل سے حصہ لیا ہو بلکہ ہمیشہ سے یہ ملعون اور لعنتی کا لفظ انہی ازلی بدبختوں پر اطلاق پاتا رہا ہے جو ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی رحمت اور نجات اور نظر محبت سے بے نصیب کیے گئے اور خدا کے لطف اور مہربانی اور فضل سے ابدی طور پر دور اور مہجور ہو گئے اور اُن کا رشتہ دائمی طور پر خدا تعالیٰ سے کاٹ دیا گیا اور اُس جہنم کا خلود ان کے لیے قرار پایا جو خدا تعالیٰ کے غضب کا جہنم ہے اور خدا تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہونے کی امید نہ رہے۔ اور نبیوں کے مونہہ سے بھی یہ لفظ کبھی ایسے اشخاص کی نسبت اطلاق نہیں پایا جو کسی وقت خدا کی ہدایت اور فضل اور رحم سے حصہ لینے والے تھے اس لیے یہودیوں کی مقدس کتاب اور اسلام کی مقدس کتاب کی رو سے یہ عقیدہ متفق علیہ مانا گیا ہے کہ جو شخص ایسا ہو کہ خدا کی کتابوں میں اس پر ملعون کا لفظ بولا گیا ہو وہ ہمیشہ کے لیے خدا تعالیٰ کی رحمت سے محروم اور بے نصیب ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں بھی اشارہ ہے۔ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا [2]۔ یعنی زناکار اور زناکاری کی اشاعت کرنے والے جو مدینہ میں ہیں یہ لعنتی ہیں یعنی ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت سے ردّ کیے گئے اس لیے یہ اس لائق ہیں کہ جہاں ان کو پاؤ قتل کر دو۔ پس اس آیت میں اس بات کی طرف یہ عجیب اشارہ ہے کہ لعنتی ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہوتا ہے اور اس کی پیدائش ہی ایسی ہوتی ہے جس پر جھوٹ اور بدکاری کا جوش غالب رہتا ہے اور اسی بنا پر قتل کرنے کا حکم ہوا کیونکہ جو قابل علاج نہیں اور مرض متعدی رکھتا ہے اس کا مرنا بہتر ہے اور یہی توریت میں لکھا ہے کہ لعنتی ہلاک ہو گا۔ علاوہ اس کے ملعون کے لفظ میں یہ کس قدر پلید معنے مندرج ہیں کہ عربی اور عبرانی زبان کی رو سے ملعون ہونے کی حالت میں ان لوازم کا پایا جانا ضروری ہے کہ شخص ملعون یعنی دلی خواہش سے خدا تعالیٰ سے بیزار ہو اور خدا تعالیٰ اس سے بیزار ہو اور وہ خدا تعالیٰ سے اپنے دلی جوش کے ساتھ دشمنی رکھے اور ایک ذرہ محبت اور تعظیم اللہ جل شانہ کی اس کے دل میں نہ ہو اور ایسا ہی خدا تعالیٰ کے دل میں بھی ایک ذرہ اس کی محبت نہ ہو

[1] بنی اسرائیل: ۶۶ [2] الاحزاب: ۶۲

یہاں تک کہ وہ شیطان کا وارث ہو نہ خدا کا۔ اور یہ بھی لعنتی ہونے کے لوازم میں سے ہے کہ شخص ملعون خدا تعالیٰ کی شناخت اور معرفت اور محبت سے بکلی بے نصیب ہو۔ (تریاق القلوب صفحہ ۴۹-۵۰)

لعنت ایک ایسا مفہوم ہے جو شخص ملعون کے دل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کسی شخص کو اُس وقت لعنتی کہا جاتا ہے جبکہ اُس کا دل خُدا سے بالکل برگشتہ اور اُس کا دشمن ہو جائے۔ اسی لیے لعین شیطان کا نام ہے۔ اور اس بات کو کون نہیں جانتا کہ لَعنت قُرب کے مقام سے ردّ کرنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ اُس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کا دل خُدا کی محبت اور اطاعت سے دور جا پڑے اور درحقیقت وہ خُدا کا دشمن ہو جائے۔ لفظ لَعنت کے یہی معنے ہیں جس پر تمام اہلِ لُغت نے اتفاق کیا ہے.... لَعنت شیطان سے مخصوص ہے اور لعین شیطان کا نام ہے اور لعنتی وہ ہوتا ہے جو شیطان سے نکلا اور شیطان سے ملا ہوا اور خود شیطان ہے۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۲)

کتاب لسان العرب میں لعن کے یہ معنے لکھے ہیں کہ اَللَّعْنُ اَلْاِبْعَادُ وَالطَّرْدُ مِنَ الْخَیْرِ یعنی لعنت کے یہ معنے ہیں کہ ہر ایک نیکی اور مال اور برکت اور بہتری سے کسی کو محروم کیا جائے پھر دوسرے معنے لعنت کے یہ لکھے ہیں کہ اَلْاِبْعَادُ مِنَ اللّٰہِ وَمِنَ الْخَلْقِ یعنی لعنت کے یہ معنی ہیں کہ جناب الٰہی سے مردود ہو جاوے اور قبولیت سے محروم رہے۔ اور مخلوق کی نظر سے بھی گر جاوے اور عزت اور وجاہت بھی جاتی رہے۔ غرض خدا کے نزدیک لعنت کا لفظ تمام نامرادیوں اور مردود اور مخذول ہونے کے معنوں پر محیط ہے اور ہر ایک نوع کی برکت سے محروم اور مخذول اور مردود رہنا اس کے لوازم میں سے ہے اور جس شخص پر خدا کی لعنت وارد ہو جائے اس کا ثمرہ ہلاکت اور تباہی ہے اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نجران کے عیسائی مجھ سے مباہلہ کرتے (جو لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ کے ساتھ کیا جاتا ہے) تو اِس قدر موت اور ہلاکت اُن پر آتی کہ اُن کے درختوں کے پرندے بھی مر جاتے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۱۶)

باتفاق تمام اہلِ زبان لعنت کا مفہوم دل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اُس حالت میں کسی کو ملعون کہا جائے گا جبکہ حقیقت میں اُس کا دل خدا سے برگشتہ ہو کر سیاہ ہو جائے اور خدا کی رحمت سے بے نصیب اور خدا کی محبت سے بے بہرہ اور خدا کی معرفت سے بکلی تہی دست اور خالی اور شیطان کی طرح اندھا اور بے بہرہ ہو کر گمراہی کے زہر سے بھرا ہُوا ہو اور خدا کی محبت اور معرفت کا نور ایک ذرہ اُس میں باقی نہ رہے اور تمام تعلق مہر و وفا کا ٹوٹ جائے اور اُس میں اور خدا میں باہم بغض اور نفرت اور کراہت اور عداوت پیدا ہو جائے۔ یہاں تک کہ خدا اُس کا دشمن اور وہ خدا کا دشمن ہو جائے اور خدا اُس سے بیزار اور وہ خدا سے بیزار ہو جائے۔ غرض ہر ایک صفت میں شیطان کا وارث ہو جائے۔ اور اسی وجہ سے لعین شیطان کا نام ہے۔ (مسیح ہندوستان میں صفحہ ۱۵-۱۶)

لغت کی کتابوں میں صاف لکھا ہوا ہے کہ لعین شیطان کا نام ہے اور ملعون وہ شخص ہوتا ہے جس کا خدا سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ خدا سے دور ہو۔ (الحکم جلد ۶ ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

لعنت کا تعلق دل سے ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ملعون خدا کا اور خدا ملعون کا دشمن ہو جاوے اور خدا سے اس کا کوئی تعلق نہ رہے اور وہ خدا سے برگشتہ ہو جاوے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۵ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

خدا کے نزدیک لعنت وہ نہیں ہوتی جو کہ عام لوگوں کے نزدیک ہوتی ہے بلکہ خدا کی لعنت سے مراد دنیا اور آخرت کی لعنت ہے (یعنی ہر) دو کی ذلت ہے (البدر جلد ۲ ۳۲ مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۰)

لسان العرب میں کہ جو لغت کی ایک پورانی کتاب اسلامی تالیفات میں سے ہے۔ اور ایسا ہی قطر المحیط اور محیط اور اقرب الموارد میں جو دو عیسائیوں کی تالیفات ہیں۔ جو حال میں بمقام بیروت چھپ کر شائع ہوئی ہیں۔ اور ایسا ہی کتب لغت کی تمام کتابوں میں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں لعنت کے معنی یہ لکھے ہیں۔

اَللَّعْنُ اَلْاِبْعَادُ وَالطَّرْدُ مِنَ الْخَيْرِ وَمِنَ اللّٰهِ وَمِنَ الْخَلْقِ وَمَنْ اَبْعَدَهُ اللّٰهُ لَمْ تَلْحَقْهُ رَحْمَتُهٗ وَخُلِّدَ فِي الْعَذَابِ وَاللَّعِيْنُ اَلشَّيْطَانُ وَالْمَمْسُوْخُ وَقَالَ الشَّمَّاخُ مَقَامُ الذِّئْبِ كَالرَّجُلِ اللَّعِيْنِ۔

یعنی لعنت کا مفہوم یہ ہے کہ لعنتی اُس کو کہتے ہیں جو ہر یک خیر و خوبی اور ہر قسم کی ذاتی صلاحیت اور خدا کی رحمت اور خُدا کی معرفت سے بکلی بے بہرہ اور بے نصیب ہو جائے۔ اور ہمیشہ کے عذاب میں پڑے یعنی اُس کا دِل بکلی سیاہ ہو جائے۔ اور بڑی نیکی سے لیکر چھوٹی نیکی تک کوئی خیر کی بات اُس کے نفس میں باقی نہ رہے۔ اور شیطان بن جائے اور اُس کا اندر مسخ ہو جائے۔ یعنی کتّوں اور سؤروں اور بندروں کی خاصیت اُس کے نفس میں پیدا ہو جائے۔ اور شماخ نے ایک شعر میں لعنتی انسان کا نام بھیڑیا رکھا ہے۔ اس مشابہت سے کہ لعنتی کا باطن مسخ ہو جاتا ہے۔ تَمَّ كَلَامُهُمْ۔ ایسا ہی عرف عام میں بھی جب یہ بولا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص پر خدا کی لعنت ہے۔ تو ہر یک ادنیٰ اعلیٰ یہی سمجھتا ہے۔ کہ وہ شخص خُدا کی نظر میں واقعی طور پر پلید باطن اور بے ایمان اور شیطان ہے۔ اور خدا اس سے بیزار اور وہ خدا سے روگردان ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۶ صفحہ ۳۳ و ۳۴)

یعنی کافر کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں۔ ایسے رقیق اور تپلے دل نہیں کہ حق کا انکشاف دیکھ کر اس کو قبول کریں۔ اللہ جل شانہٗ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہ کچھ خوبی کی بات نہیں بلکہ لعنت کا اثر ہے۔ جو دلوں پر ہے یعنی لعنت جب کسی پر نازل ہوتی ہے۔ اس کے نشانوں میں سے یہ بھی ایک نشان ہے۔ کہ دل سخت ہو جاتا ہے۔ اور گو کیسا ہی حق کھل جائے پھر انسان اس حق کو قبول نہیں کرتا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۲۷-۲۸)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا

مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكٰفِرِينَ ○

وکانوا یستفتحون من قبل | اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ سے نصرتِ دین کے لیے مدد مانگا کرتے تھے۔ اور ان کو الہام اور کشف ہوتا تھا اگرچہ وہ یہودی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی۔ خدا تعالیٰ کی نظر سے گر گئے تھے۔ لیکن جب عیسائی مذہب بوجہ مخلوق پرستی کے مرگیا۔ اور اس میں حقیقت اور نورانیت نہ رہی۔ تو اس وقت کے یہود اس گناہ سے بری ہو گئے۔ کہ وہ عیسائی کیوں نہیں ہوتے۔ تب ان میں دوبارہ نورانیت پیدا ہوئی۔ اور اکثر ان میں سے صاحبِ الہام اور صاحبِ کشف پیدا ہونے لگے۔ اور ان کے راہبوں میں اچھے اچھے حالات کے لوگ تھے اور وہ ہمیشہ اس بات کا الہام پاتے تھے۔ کہ نبی آخر زمان اور امام دوران جلد پیدا ہو گا۔ اور اسی وجہ سے بعض ربانی علماء خدا تعالیٰ سے الہام پا کر ملکِ عرب میں آرہے تھے۔ اور ان کے بچہ بچہ کو خبر تھی کہ عنقریب آسمان سے ایک نیا سلسلہ قائم کیا جائیگا۔ یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ [1] یعنی اس نبی کو وہ ایسی صفائی سے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بچوں کو۔ مگر جبکہ وہ نبی موعود۔ اس پر خدا کا سلام۔ ظاہر ہو گیا۔ تب خودبینی اور تعصب نے اکثر راہبوں کو ہلاک کر دیا۔ اور ان کے دل سیہ ہو گئے۔ مگر بعض سعادت مند مسلمان ہو گئے۔ اور اُن کا اسلام اچھا ہوا۔ (ضرورت الامام صفحہ ۶۶)

اہل کتاب منتظر تھے کہ پیغمبر کے آنے پر وہ اس کے ساتھ مل کر کفار سے جنگ کریں گے۔ لیکن جب پیغمبر آیا تو انکار پر آمادہ ہو گئے۔ (ریویو جلد ۳ ۶ صفحہ ۲۰۱)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ؕ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ؕ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○

أُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی اُنہوں نے گوسالہ سے ایسی محبت کی کہ گویا اُن کو گوسالہ شربت کی طرح پلا دیا گیا۔ درحقیقت جو شخص کسی سے کامل محبت کرتا ہے تو گویا اُسے پی لیتا ہے یا کھا لیتا ہے اور اُس کے اخلاق اور

[1] البقرۃ : ۱۴۷

اُس کے چال چلن کے ساتھ رنگین ہو جاتا ہے اور جس قدر زیادہ محبت ہوتی ہے اُسی قدر انسان بالطبع اپنے محبوب کی صفات کی طرف کھینچا جاتا ہے یہاں تک کہ اُسی کا روپ ہو جاتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے یہی بھید ہے کہ جو شخص خدا سے محبت کرتا ہے وہ ظلّی طور پر بقدر اپنی استعداد کے اُس نور کو حاصل کر لیتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات میں ہے اور شیطان سے محبت کرنے والے وہ تاریکی حاصل کر لیتے ہیں جو شیطان میں ہے۔

(نور القرآن نمبر۲ بار دوم صفحہ ۳۵)

۹۵ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝

اِس فرمانے سے مدّعا یہ تھا کہ درحقیقت یہودیوں کا یہ بیان کہ ہم نے درحقیقت مسیح کو پھانسی دیدیا جس سے یہ نتیجہ نکالنا منظور تھا کہ نعوذ باللہ مسیح ملعون ہے اور نبی صادق نہیں اور ایسا ہی عیسائیوں کا یہ بیان کہ درحقیقت مسیح پھانسی کی موت سے مرگیا جس سے یہ نتیجہ نکالنا منظور تھا کہ مسیح عیسائیوں کے گناہ کے لیے کفارہ ہوا۔ یہ دونوں خیال یہودیوں اور عیسائیوں کے غلط ہیں اور کسی کو ان دونوں گروہ میں سے اِن خیالات پر دلی یقین نہیں بلکہ دلی ایمان اِن کا صرف اِسی پر ہے کہ مسیح یقینی طور پر مصلوب نہیں ہوا۔ اِس تقریر سے خدائے تعالیٰ کا یہ مطلب تھا کہ تا یہودیوں اور عیسائیوں کی خاموشی سے منصفین قطعی طور پر سمجھ لیویں کہ اس بارے میں بجز شک کے اُن کے پاس کچھ نہیں اور یہودی اور عیسائی جو اس آیت کو سن کر چپ رہے اور انکار کے لیے میدان میں نہ آئے تو اُس کی یہ وجہ تھی کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر ہم مقابل پر آئے اور وہ دعویٰ کیا جو ہمارے دل میں نہیں تو ہم سخت رسوا کیے جائیں گے اور کوئی ایسا نشان خدائے تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہو جائے گا جس سے ہمارا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائیگا اس لیے اُنہوں نے دم نہ مارا اور چپ رہے اور اگرچہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہماری اس خاموشی سے ہمارا مان لینا ثابت ہو جائے گا جس سے ایک طرف تو ان کفارکے اس عقیدہ کی بیخکنی ہوگی اور ایک طرف یہ یہودی عقیدہ باطل ثابت ہو جائے گا کہ مسیح خدائے تعالیٰ کا سچا رسول اور راستباز نہیں اور ان میں سے نہیں جن کا خدائے تعالیٰ کی طرف عزت کے ساتھ رفع ہوتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی چمکتی ہوئی تلوار اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی پس جیسا کہ قرآن شریف میں اُنہیں کہا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو لیکن مارے خوف کے کسی نے یہ تمنا نہ کی اسی طرح اس جگہ بھی مارے خوف کے انکار نہ کر سکے یعنی یہ دعویٰ نہ کر سکے کہ ہم تو مسیح کے مصلوب ہونے پر یقین رکھتے ہیں ہمیں کیوں بے یقینوں میں داخل کیا جاتا ہے سو اُن کا نبی کے زمانہ میں خاموشی اختیار کرنا ہمیشہ کے حجت ہوگئی

اور اُن کے ساختہ پرداختہ کا اثر اُن کی آنے والی ذرّیتوں پر بھی پڑا کیونکہ سلف خلف کے لیے بطور دلیل کے ہوتے ہیں اور اُن کی شہادتیں آنے والی ذرّیت کو ماننی پڑتی ہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ اول ۳۴۳-۳۴۵)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ۝

جبریل جو ایک عظیم الشان فرشتہ ہے اور آسمان کے ایک نہایت روشن نیّر سے تعلق رکھتا ہے اُس کو کئی قسم کی خدمات سپرد ہیں اُنہیں خدمات کے موافق جو اُس کے نیّر سے لیے جاتے ہیں سو وہ فرشتہ اگرچہ ہر یک ایسے شخص پر نازل ہوتا ہے جو وحی الٰہی سے مشرّف کیا گیا ہو (نزول کی اصل کیفیت جو صرف اثر اندازی کے طور پر ہے نہ واقعی طور پر یاد رکھنی چاہیئے) لیکن اُس کے نزول کی تاثیرات کا دائرہ مختلف استعدادوں اور مختلف ظروف کے لحاظ سے چھوٹی یا بڑی بڑی شکلوں پر تقسیم ہو جاتا ہے نہایت بڑا دائرہ اُس کی روحانی تاثیرات کا وہ دائرہ ہے جو حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی سے متعلّق ہے اسی وجہ سے جو معارف وحقائق وکمالات حکمت وبلاغت قرآن شریف میں اکمل اور اتم طور پر پائے جاتے ہیں یہ عظیم الشان مرتبہ اور کسی کتاب کو حاصل نہیں اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے (جیسا کہ پہلے بھی ہم اِس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں) کہ ہر یک فرشتہ کی تاثیر انسان کے نفس پر دو قسم کی ہوتی ہے اول وہ تاثیر جو رحم میں ہونے کی حالت میں باذنہٖ تعالیٰ مختلف طور کے تخم پر مختلف طور کا اثر ڈالتی ہے پھر دوسری وہ تاثیر جو بعد طیاری وجود کے اُس وجود کی مخفی استعدادوں کو اپنے کمالات ممکنہ تک پہنچانے کے لیے کام کرتی ہے اُس دوسری تاثیر کو جب وہ نبی یا کامل ولی کے متعلّق ہو وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یوں ہوتا ہے کہ جب ایک مستعد نفس اپنے نور ایمان اور نور محبت کے کمال سے مبدء فیوض کے ساتھ دوستانہ تعلق پکڑ لیتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ کی زندگی بخش محبت اُس کی محبت پر پرتوہ انداز ہو جاتی ہے تو اس حد اور اس وقت تک جو کچھ انسان کو آگے قدم رکھنے کے لیے مقدور حاصل ہوتا ہے یہ دراصل اُس پنہانی تاثیر کا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کے فرشتہ نے انسان کے رحم میں ہونے کی حالت میں کی ہوتی ہے پھر بعد اس کے جب انسان اس پہلی تاثیر کی کشش سے یہ مرتبہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر وہی فرشتہ از سرِ نو اپنا اثر نور سے بھرا ہوا اس پر ڈالتا ہے مگر یہ نہیں کہ اپنی طرف سے بلکہ وہ درمیانی خادم ہونے کی وجہ سے اُس نالی کی طرح جو ایک طرف سے پانی کو کھینچتی اور دوسری طرف اُس پانی کو پہنچا دیتی ہے خدائے تعالیٰ کا نور فیض اپنے اندر کھینچ لیتا ہے پھر عین اُس وقت میں کہ جب انسان بوجہ اقترانِ محبّتین رُوح القدس کی نالی کے قریب اپنے تئیں رکھ دیتا ہے معاً اس نالی میں سے فیض وحی اُس کے اندر گر جاتا ہے یا یوں کہو کہ

اس وقت جبرائیل اپنا نورانی سایہ اس مستعد دل پر ڈال کر ایک عکسی تصویر اپنی اُس کے اندر لکھ دیتا ہے تب جیسے اُس فرشتہ کا جو آسمان پر مستقر ہے جبرائیل نام ہے اِس عکسی تصویر کا نام بھی جبرائیل ہی ہوتا ہے یا مثلاً اُس فرشتہ کا نام روح القدس ہے تو عکسی تصویر کا نام بھی روح القدس ہی رکھا جاتا ہے سو یہ نہیں کہ فرشتہ انسان کے اندر گھس آتا ہے بلکہ اُس کا عکس انسان کے آئینہ قلب میں نمودار ہو جاتا ہے مثلاً جب تم نہایت مصفی آئینہ اپنے مُنہ کے سامنے رکھ دو گے تو موافق دائرہ مقدار اُس آئینہ کے تمہاری شکل کا عکس بلا توقف اُس میں پڑے گا یہ نہیں کہ تمہارا مُنہ اور تمہارا سر گردن سے ٹوٹ کر اور الگ ہو کر آئینہ میں رکھ دیا جائیگا بلکہ اُس جگہ رہیگا جو رہنا چاہیئے صرف اُس کا عکس پڑیگا اور عکس بھی ہر یک جگہ ایک ہی مقدار پر نہیں پڑیگا بلکہ جیسی وسعت آئینہ قلب کی ہوگی اُسی مقدار کے موافق اثر پڑے گا مثلاً اگر تم اپنا چہرہ آرسی کے شیشہ میں دیکھنا چاہو کہ جو ایک چھوٹا سا شیشہ ایک قسم کی انگشتری میں لگا ہوا ہوتا ہے تو اگرچہ اُس میں بھی تمام چہرہ نظر آئے گا مگر ہر یک عضو اپنی اصلی مقدار سے نہایت چھوٹا ہو کر نظر آئے گا لیکن اگر تم اپنے چہرہ کو ایک بڑے آئینہ میں دیکھنا چاہو جو تمہاری شکل کے پورے انعکاس کے لیے کافی ہے تو تمہارے تمام نقوش اور اعضا چہرہ کے اپنے اصلی مقدار پر نظر آجائیں گے پس یہی مثال جبرائیل کی تاثیرات کی ہے ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبہ کے دلی پر بھی جبرائیل ہی تاثیر وحی کی ڈالتا ہے اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل پر بھی وہی جبرائیل تاثیر وحی کی ڈالتا رہا ہے لیکن ان دونوں وحیوں میں وہی فرق مذکورہ بالا آرسی کے شیشہ اور بڑے آئینہ کا ہے یعنی اگرچہ بظاہر صورت جبرائیل وہی ہے اور اُس کی تاثیرات بھی وہی مگر ہر یک جگہ مادہ قابلہ ایک ہی وسعت اور صفائی کی حالت پر نہیں اور یہ جو اس جگہ میں نے صفائی کا لفظ بھی لکھ دیا تو یہ اِس بات کے اظہار کے لیے ہے کہ جبرائیلی تاثیرات کا اختلاف صرف کمیت کے ہی متعلق نہیں بلکہ کیفیت کے بھی متعلق ہے یعنی صفائی قلب جو شرط انعکاس ہے۔ تمام افراد ملہمین کے ایک ہی مرتبہ پر کبھی نہیں ہوتے جیسے تم دیکھتے ہو کہ سارے آئینے ایک ہی درجہ کی صفائی ہرگز نہیں رکھتے بعض آئینے ایسے اعلیٰ درجہ کے آبدار اور مصفی ہوتے ہیں کہ پورے طور پر جیسا کہ چاہیئے دیکھنے والے کی شکل اُن میں ظاہر ہو جاتی ہے اور بعض ایسے کثیف اور مکدر اور پُرغبار اور دود آمیز جیسے ہوتے ہیں کہ صاف طور پر اُن میں شکل نظر نہیں آتی بلکہ بعض ایسے بگڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر مثلاً اُن میں دونوں لب نظر آویں تو ناک دکھائی نہیں دیتا اور اگر ناک نظر آگیا تو آنکھیں نظر نہیں آتیں سو یہی حالت دلوں کے آئینہ کی ہے جو نہایت درجہ کا مصفیٰ دل ہے اُس میں مصفا طور پر انعکاس ہوتا ہے اور جو کسی قدر مکدّر ہے اُس میں اُسی قدر مکدر دکھائی دیتا ہے اور اکمل اور اتم طور پر یہ صفائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل کو حاصل ہے ایسی صفائی کسی دوسرے دل کو ہرگز حاصل نہیں۔ (توضیح مرام صفحہ ۶۸-۷۲)

خدائے تعالیٰ کی وحی میں جو پاک دلوں پر نازل ہوتی ہے جبرائیل کا تعلق جو شریعت اسلام میں ایک ضروری مسئلہ سمجھا گیا اور قبول کیا گیا ہے ..... اِس کی تفصیل یہ ہے کہ حسب قانون قدرت مذکورہ بالا یہ امر ضروری ہے

کہ وحی کے القایا ملکہ وحی کے عطا کرنے کے لیے بھی کوئی مخلوق خدائے تعالیٰ کے الہامی اور روحانی ارادہ کو بمنصہ ظہور لانے کے لیے ایک عضو کی طرح بن کر خدمت بجالاوے جیساکہ جسمانی ارادوں کے پورا کرنے کے لیے بجالارہے ہیں سو وہ وہی عضو ہے جس کو دوسرے لفظوں میں جبریل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو بہ تبعیت حرکت اُس وجود اعظم کے سچ مچ ایک عضو کی طرح بلاتوقف حرکت میں آجاتا ہے یعنی جب خدائے تعالیٰ محبت کرنے والے دل کی طرف محبت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو حسب قاعدہ مذکورہ بالا جس کا ابھی بیان ہو چکا ہے جبریل کو بھی جو سانس کی ہوا یا آنکھ کے نور کی طرح خدائے تعالیٰ سے نسبت رکھتا ہے اُس طرف ساتھ ہی حرکت کرنی پڑتی ہے یا یوں کہو کہ خدائے تعالیٰ کی جنبش کے ساتھ ہی وہ بھی بلا اختیار و بلا ارادہ اسی طور سے جنبش میں آجاتا ہے کہ جیسا اصل کی جنبش سے سایہ کا ہلنا طبعی طور پر ضروری امر ہے پس جب جبریلی نور خدائے تعالیٰ کی کشش اور تحریک اور نفخہ نورانیہ سے جنبش میں آجاتا ہے تو معاً اُس کی ایک عکسی تصویر جس کو روح القدس کے ہی نام سے موسوم کرنا چاہیئے (محب) صادق کے دل میں منقش ہو جاتی ہے اور اُس کی محبت صادقہ کا ایک عرض لازم ٹھہر جاتی ہے تب یہ قوت خدائے تعالیٰ کے آواز سُننے کے لیے کان کا فایدہ بخشتی ہے اور اُس کے عجائبات کے دیکھنے کے لیے آنکھوں کی قائم مقام ہو جاتی ہے اور اُس کے الہامات زبان پر جاری ہونے کے لیے ایک ایسی محرک حرارت کا کام دیتی ہے جو زبان کے پہیہ کو زور کے ساتھ الہامی خط پر چلاتی ہے اور جب تک یہ قُوت پیدا نہ ہو اُس وقت تک انسان کا دل اندھے کی طرح ہوتا ہے اور زبان اس ریل کی گاڑی کی طرح ہوتی ہے جو چلنے والے انجن سے الگ پڑی ہو لیکن یاد رہے کہ یہ قوت جو روح القدس سے موسوم ہے ہر یک دل میں یکساں اور برابر پیدا نہیں ہوتی بلکہ جیسے انسان کی محبّت کامل یا ناقص طور پر ہوتی ہے اُسی اندازہ کے موافق یہ جبریلی نور اُس پر اثر ڈالتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ روح القدس کی قُوت جو دونوں محبتوں کے ملنے سے انسان کے دل میں جبریلی نور کے پرتوہ سے پیدا ہو جاتی ہے اِس کے وجود کے لیے یہ امر لازم نہیں کہ ہر وقت انسان خدائے تعالیٰ کا پاک کلام سُنتا ہی رہے یا کشفی طور پر کچھ دیکھتا ہی رہے بلکہ یہ تو انوار سماویہ کے پانے کے لیے اسباب قریبہ کی طرح ہے یا یوں کہو کہ یہ ایک روحانی روشنی روحانی آنکھوں کے دیکھنے کے لیے یا ایک روحانی ہوا روحانی کانوں تک آواز پہنچانے کے لیے منجانب اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی چیز سامنے موجود نہ ہو مجرد روشنی کچھ دکھا نہیں سکتی اور جب تک متکلّم کے مُنہ سے کلام نہ نکلے مجرد ہوا کانوں تک کوئی خبر نہیں پہنچا سکتی سو یہ روشنی یا یہ ہوا روحانی حواس کے لیے محض ایک آسمانی موّید عطا کیا جاتا ہے جیسے ظاہری آنکھوں کے لیے آفتاب کی روشنی اور ظاہری کانوں کے لیے ہوا کا ذریعہ مقرر کیا گیا ہے اور جب باری تعالیٰ کا ارادہ اِس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اپنا کلام اپنے کسی ملہم کے دل تک پہنچاوے تو اُس کی اِس متکلمانہ حرکت سے معاً جبریلی نور میں القا کے لیے ایک روشنی کی موج یا ہوا کی موج یا ملہم کی تحریک لسان کے لیے ایک حرارت

کی موج پیدا ہو جاتی ہے اور اُس تموج یا اُس حرارت سے بلا توقف وہ کلام ملہم کی آنکھوں کے سامنے لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے یا کانوں تک اُس کی آواز پہنچتی ہے یا زبان پر وہ الہامی الفاظ جاری ہوتے ہیں اور روحانی حواس اور روحانی روشنی جو قبل از الہام ایک قوت کی طرح ملتی ہے یہ دونوں قوتیں اِس لیے عطا کی جاتی ہیں کہ تا قبل از نزول الہام الہام کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے کیونکہ اگر الہام ایسی حالت میں نازل کیا جاتا کہ ملہم کا دل حواس روحانی سے محروم ہوتا یا روح القدس کی روشنی دل کی آنکھ کو پہنچی نہ ہوتی تو وہ الہام الٰہی کو کن آنکھوں کی پاک روشنی سے دیکھ سکتا سو اسی ضرورت کی وجہ سے یہ دونوں پہلے ہی سے ملہمین کو عطا کی گئیں اور اس تحقیق سے یہ بھی ناظرین سمجھ لیں گے کہ وحی کے متعلق جبریل کے تین کام ہیں۔

اوّل یہ کہ جب رحم میں ایسے شخص کے وجود کے لیے نطفہ پڑتا ہے جس کی فطرت کو اللہ جلشانہٗ اپنی رحمانیت کے تقاضا سے جس میں انسان کے عمل کو کچھ دخل نہیں ملہمانہ فطرت بنانا چاہتا ہے تو اُس پر اُسی نطفہ ہونے کی حالت میں جبریلی نور کا سایہ ڈال دیتا ہے تب ایسے شخص کی فطرت منجانب اللہ الہامی خاصیت پیدا کر لیتی ہے اور الہامی حواس اُس کو مل جاتے ہیں۔

پھر دوسرا کام جبریل کا یہ ہے کہ جب بندہ کی محبت خدائے تعالیٰ کی محبت کے زیر سایہ آپڑتی ہے تو خدائے تعالیٰ کی مربیانہ حرکت کی وجہ سے جبریلی نور میں بھی ایک حرکت پیدا ہو کر محب صادق کے دل پر وہ نور جا پڑتا ہے یعنی اُس نور کا عکس محب صادق کے دل پر پڑ کر ایک عکسی تصویر جبریل کی اُس میں پیدا ہو جاتی ہے جو ایک روشنی یا ہوا یا گرمی کا کام دیتی ہے اور بطور ملکہ الہامیہ کے ملہم کے اندر رہتی ہے ایک سرا اس کا جبریل کے نور میں غرق ہوتا ہے اور دوسرا ملہم کے دل کے اندر داخل ہو جاتا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں روح القدس یا اُس کی تصویر کہہ سکتے ہیں۔

تیسرا کام جبریل کا یہ ہے کہ جب خدائے تعالیٰ کی طرف سے کسی کلام کا ظہور ہو تو ہوا کی طرح موج میں آکر اس کلام کو دل کے کانوں تک پہنچا دیتا ہے یا روشنی کے پیرایہ میں افروختہ ہو کر اُس کو نظر کے سامنے کر دیتا ہے یا حرارت محرکہ کے پیرایہ میں تیزی پیدا کر کے زبان کو الہامی الفاظ کی طرف چلاتا ہے۔ (توضیح مرام صفحہ ۷۸-۸۳)

جبریلی نور کا چھیالیسواں حصہ تمام جہان میں پھیلا ہوا ہے جس سے کوئی فاسق اور فاجر اور پرلے درجہ کا بدکار بھی باہر نہیں بلکہ میں یہاں تک مانتا ہوں کہ تجربہ میں آچکا ہے کہ بعض اوقات ایک نہایت درجہ کی فاسقہ عورت جو کنجریوں کے گروہ میں سے ہے جس کی تمام جوانی بدکاری میں ہی گذری ہے کبھی سچی خواب دیکھ لیتی ہے اور زیادہ تر تعجب یہ ہے کہ ایسی عورت کبھی ایسی رات میں بھی کہ جب وہ بادہ بسر و آشنا ببر کا مصداق ہوتی ہے کوئی خواب دیکھ لیتی ہے اور وہ سچی نکلتی ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ جبریلی نور آفتاب کی طرح جو اُس کا ہیڈ کوارٹر ہے تمام معمورہ عالم پر حسب استعداد اُن کی اثر ڈال رہا ہے اور کوئی نفس بشر دُنیا میں ایسا نہیں کہ بالکل تاریک ہو کم سے کم ایک ذرہ سی محبت وطن اصلی اور محبوب اصلی کی ادنیٰ سے ادنیٰ سرشت میں بھی ہے اِس صورت میں نہایت ضروری تھا کہ تمام بنی آدم پر یہاں تک کہ اُن کے مجانین پر بھی کسی قدر جبریل کا اثر ہوتا اور فی الواقعہ ہے بھی۔ کیونکہ مجانین بھی جن کو عوام الناس مجذوب کہتے ہیں

اپنے بعض حالات میں بوجہ اپنے ایک طور کے انقطاع کے جبرائیلی نور کے نیچے جا پڑتے ہیں تو کچھ کچھ اُن کی باطنی آنکھوں پر اس نور کی روشنی پڑتی ہے جس سے وہ خدا تعالیٰ کے تصرفات خفیہ کو کچھ کچھ دیکھنے لگتی ہے مگر ایسی خوابوں یا ایسے مکاشفات سے نبوّت اور ولایت کو کچھ صدمہ نہیں پہنچتا اور اُن کی شان بلند میں کچھ بھی فرق نہیں آتا اور کوئی التباس حیران کرنے والا واقعہ نہیں ہوتا کیونکہ درمیان میں ایک ایسا فرق بیّن ہے کہ جو بدیہی طور پر ہر یک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خواص اور عام کی خوابیں اور مکاشفات اپنی کیفیت اور کمیّت اتصالی و انفصالی میں ہرگز برابر نہیں ہیں جو لوگ خدائے تعالیٰ کے خاص بندے ہیں وہ خارق عادت کے طور پر نعمت غیبی کا حصہ لیتے ہیں دُنیا اُن نعمتوں میں جو اُنہیں عطا کی جاتی ہیں صرف ایسے طور کی شریک ہے جیسے شاہ وقت کے خزانہ کے ساتھ ایک گدا دریوزہ گر ایک درم کے حاصل رکھنے کی وجہ سے شریک خیال کیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس ادنیٰ مشارکت کی وجہ سے نہ بادشاہ کی شان میں کچھ شکست آسکتی ہے اور نہ اس گدا کی کچھ شان بڑھ سکتی ہے اور اگر ذرا غور کر کے دیکھو تو یہ ذرہ مثال مشارکت ایک کرم شب تاب بھی جس کو پٹ بیجنا یا جگنو بھی کہتے ہیں آفتاب کے ساتھ رکھتا ہے تو کیا وہ اس مشارکت کی وجہ سے آفتاب کی عزت میں سے کوئی حصہ لے سکتا ہے۔

(توضیح مرام صفحہ ۸۴-۸۷)

یہ عاجز ملایک اور حضرت جبرائیل کے وجود کو اُسی طرح مانتا ہے جس طرح قرآن اور حدیث میں وارد ہے اور جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی رو سے ملایک کے اجرام سماوی سے خادمانہ تعلقات پائے جاتے ہیں یا جو جو کام خاص طور پر اُنہیں سپرد ہو رہا ہے اُس کی تشریح رسالہ توضیح مرام میں ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۴۲۱)

بالآخر ہم چند اقوال پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلف صالح کا ہرگز یہ عقیدہ نہ تھا کہ روح القدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص خاص وقتوں پر نازل ہوتا تھا اور دوسرے اوقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے نعوذ باللہ بکلی محروم ہوتے تھے ازاں جملہ وہ قول ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوت کے صفحہ ۲۷ میں لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ملایک وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دائمی رفیق اور قرین ہیں چنانچہ وہ جامع الاصول اور کتاب الوفا سے نقل کرتے ہیں کہ ابتدائے نبوت سے تین برس برابر حضرت اسرافیل ملازم صحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور پھر حضرت جبرائیل دائمی رفاقت کے لیے آئے اور بعد اس کے صاحب سفر السعادت سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات سال کے تھے جب حضرت اسرافیل کو اللہ جل شانہ کی طرف سے حکم ہوا کہ آنحضرت صلعم کے ملازم خدمت رہیں پس اسرافیل ہمیشہ اور ہر وقت آنحضرت صلعم کے پاس رہتا تھا اور آنحضرت صلعم کی عمر کا گیارہواں سال پورا ہونے تک یہی حال تھا مگر اسرافیل بجز کلمہ دو کلمہ کے اور کوئی بات وحی کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہیں ڈالتا تھا ایسا ہی میکائیل بھی آنحضرت کا قرین رہا۔ پھر بعد اس کے حضرت جبرائیل کو حکم ہوا اور وہ پورے انتیس سال قبل از وحی ہر وقت قرین اور مصاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ پھر بعد اس کے وحی نبوت شروع ہوئی۔

اس بیان سے ہر یک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جن بزرگوں نے مثلاً حضرت جبرائیل کی نسبت لکھا ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی اُنتیس سال تک ہمیشہ اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی رفیق تھا اُن کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا تھا کہ جبرائیل کسی وقت آسمان پر بھی چلا جاتا تھا کیونکہ کسی وقت چھوڑ کر چلا جانا دوام قرب اور معیت غیر منقطع کے منافی ہے لیکن جب ان بزرگوں کا دوسرا عقیدہ بھی دیکھا جائے کہ جبرائیل علیہ السلام کا قرارگاہ آسمان ہی ہے اور وہ ہر ایک وحی آسمان سے ہی لاتا ہے تو ان دونوں عقیدوں کے ملانے سے جو تناقض پیدا ہوتا ہے اُس سے رہائی پانے کے لیے بجز اس کے اور کوئی راہ نہیں مل سکتی کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ جبرائیل علیہ السلام کا آسمان سے اُترنا حقیقی طور پر نہیں بلکہ تمثلی ہے اور جب تمثلی طور پر اُترنا ہوا تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ جبرائیل علیہ السلام اپنے تمثلی وجود سے ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر دم اور ہر طرفۃ العین انبیاء علیہم السلام کے ساتھ رہے کیونکہ وہ اپنے اصلی وجود کے ساتھ تو آسمان پر ہی ہے اور اسی مذہب کی تصدیق اور تصویب شیخ عبدالحق محدّث دہلی نے اپنی کتاب مدارج النبوت کے صفحہ ۵۴ میں کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ نزول جبرائیل جو بعض اوقات دحیہ کلبی کی صورت میں یا کسی اور انسان کی صورت میں ہوتا تھا اس میں اہل نظر کو اشکال ہے اور یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اگر درحقیقت جبرائیل علیہ السلام ایک نیا جسم اپنے لیے مشابہ جسم دحیہ کلبی حاصل کرکے اُس میں اپنا رُوح داخل کر دیتے تھے تو پھر وہ اصلی جسم اُن کا جس کے تین سَو جناح ہیں کس حالت میں ہوتا تھا کیا وہ جسد بے روح پڑا رہتا تھا اور حضرت جبرائیل فوت ہو کر بطریق تناسخ دوسرے جسم میں آجاتے تھے۔

اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ اہل تحقیق کے نزدیک یہ تمثلی نزول ہے نہ حقیقی تا حقیقتاً ایک جسم کو چھوڑنا اور دوسرے جسم میں داخل ہونا لازم آوے پھر لکھتے ہیں بات یہ ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کے ذہن میں جو دحیہ کلبی کی صورت علمیہ تھی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام بوجہ قدرت کاملہ وارادت شاملہ اپنی کے اُس صورت پر اپنے وجود کا افاضہ مع جمیع صفات کاملہ اپنی کے کرکے تمثل کے طور پر اُس میں اپنے تئیں ظاہر کر دیتے تھے یعنی دحیہ کلبی کی صورت میں بطور تمثل اپنے تئیں دکھلا دیتے تھے اور اس صورت علمیہ کو اپنی صفات سے متلبّس کرکے نبی علیہ السلام پر تمثلاً ظاہر کر دیتے تھے یہ نہیں کہ جبرائیل آپ اپنے اصلی وجود کے ساتھ آسمان سے اُترتا تھا بلکہ جبرائیل علیہ السلام اپنے مقام پر آسمان میں ثابت وقائم رہتا تھا اور یہ جبرائیل اُس حقیقی جبرائیل کی ایک مثال تھی یعنی اس کا ایک ظل تھا اُس کا عین نہیں تھا کیونکہ عین جبرائیل تو وہ ہے جو اپنی صفات خاصہ کے ساتھ آسمان پر موجود ہے اور اُس کی حقیقت اور شان الگ ہے۔ پھر اس قدر تحریر کے بعد شیخ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ جس طرح جبرائیل علیہ السلام تمثلی صورت میں نہ حقیقی صورت میں نازل ہوتا رہا ہے یہی مثال روحانیات کی ہے جو بصورت جسمانیات متمثل ہوتی ہیں اور یہی مثال خُدا تعالیٰ کے تمثل کی بھی ہے جو اہل کشف کو صورت بشر پر نظر آتا ہے اور یہی مثال مکمّل اولیا کی ہے جو مواضع متفرقہ میں بصور متعددہ نظر آجاتے ہیں۔

خدا تعالیٰ شیخ بزرگ عبدالحق محدّث کو جزاء خیر دیوے کیونکہ اُنھوں نے بصدق دل قبول کر لیا کہ جبرائیل علیہ

السلام بذات خود نازل نہیں ہوتا بلکہ ایک تمثلی وجود انبیا علیہم السلام کو دکھائی دیتا ہے اور جبرائیل اپنے مقام آسمان میں ثابت اور برقرار ہوتا ہے۔ یہ وہی عقیدہ اس عاجز کا ہے جس پر حال کے کور باطن نام کے عُلما کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں افسوس کہ یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ اس بات پر تمام مفسّرین نے اور نیز صحابہ نے بھی اتفاق کیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام اپنے حقیقی وجود کے ساتھ صرف دو مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائی دیا ہے اور ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر وہ اپنے اصلی اور حقیقی وجود کے ساتھ آنحضرت صلعم کے پاس آتے تو خود یہ غیر ممکن تھا کیونکہ اُن کا حقیقی وجود تو مشرق مغرب میں پھیلا ہوا ہے اور اُن کے بازو آسمانوں کے کناروں تک پُہنچے ہوئے ہیں پھر وہ مکہ یا مدینہ میں کیونکر سما سکتے تھے۔ جب تم حقیقت اور اصل کی شرط سے جبرائیل کے نزول کا عقیدہ رکھوگے تو ضرور تم پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ وہ اصلی وجود کیونکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں سما گیا اور اگر کہو کہ وہ اصلی وجود نہیں تھا تو پھر ترک اصل کے بعد تمثل ہی ہوا یا کچھ اور ہوا اصل کا نزول تو اُس حالت میں ہو کہ جب آسمان میں اس وجود کا نام ونشان نہ رہے اور جب آسمان سے وہ وجود نیچے اُتر آیا تو پھر ثابت کرنا چاہیئے کہ کہاں اُس کے ٹھہرنے کی گنجایش ہوئی۔
غرض یہ خیال کہ جبرائیل اپنے اصلی وجود کے ساتھ زمین پر اُتر آتا تھا بدیہی البطلان ہے۔ خاص کر جب دوسری شق کی طرف نظر کریں اور اس فساد کو دیکھیں کہ ایسا عقیدہ رکھنے سے یہ لازم آتا ہے کہ انبیا علیہم السلام اکثر اوقات فیض وحی سے محروم اور معطل رہیں تو پھر نہایت بے شرمی ہوگی کہ اس عقیدہ کا خیال بھی دل میں لاویں۔ شیخ عبد الحق محدّث دہلوی مدارج النبوت کے صفحہ ۸۳ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کلمات وحدیث وحی خفی ہیں باستثنا چند مواضع یعنی قصہ اسارٰی بدر وقصہ ماریہ وعسل وتابیر نخل جو نادر اور حقیر ہیں۔ اور پھر اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ اوزاعی حسان بن عطیہ سے روایت کرتا ہے کہ نزول جبرائیل قرآن سے مخصوص نہیں بلکہ ہر یک سنت نزول جبرائیل سے ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی میں سے ہے۔ اور پھر صفحہ ۸۷ میں لکھتے ہیں کہ صحابہ آنحضرت صلعم کے ہر یک قول وفعل قلیل وکثیر وصغیر وکبیر کو وحی سمجھتے تھے اور اُس پر عمل کرنے میں کچھ توقف اور بحث نہیں کرتے تھے اور حرص رکھتے تھے کہ جو کچھ آنحضرت صلعم سرّ اور خلوت میں کرتے ہیں وہ بھی معلوم کریں۔ پس کچھ شک نہیں کہ جو شخص احوال صحابہ میں تامّل کرے کہ وہ کیونکر ہر یک امر اور قول اور فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجّت دین سمجھتے تھے اور کیونکر وہ آنحضرتؐ کے ہر یک زمانہ اور ہر یک وقت اور ہر یک دم کو وحی میں مستغرق جانتے تھے۔ تو اس اعتقاد کے رکھنے سے کہ کبھی جبرائیل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر آسمان پر چلا جاتا تھا خدا تعالیٰ سے شرم کریگا اور ڈریگا کہ ایسا وہم بھی اُس کے دل میں گزرے مگر افسوس کہ ہمارے یہ عُلماء جو محدّث بھی کہلاتے ہیں کچھ بھی ڈرتے نہیں اگر اُن کے ایسے عقیدوں کو ترک کرنا کفر ہے تو ایسا کفر اگر ملے تو زہے سعادت۔ ہم اُن کے ایسے ایمان سے سخت بیزار ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف اُن کے ایسے اقوال سے داد خواہ ہیں جن کی وجہ سے سخت اہانت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں میں ہو رہی ہے اِن لوگوں کے حق

ہیں کیا کہیں اور کیا لکھیں جنہوں نے کفار کو ہنسی اور ٹھٹھہ کا موقع دیا۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو حضرت عیسیٰ کی نسبت ایسا اور اس قدر گھٹا دیا کہ جس کے تصور سے بدن پر لرزہ پڑتا ہے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۱۱-۱۲۶)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں تین قسم کی حکومت رکھی ہے ایک دماغ۔ دوسرا دل تیسری زبان۔ دماغ عقول اور براہین سے کام لیتا ہے اور اس کا یہ کام ہے کہ ہر وقت وہ ایک تراش خراش میں لگا رہتا ہے۔ اور نئی نئی براہین اور حجج کو سوچتا رہتا ہے۔ اس کے سپرد یہی خدمت ہے کہ وہ مقدمات مرتب کرکے نتائج نکالتا رہتا ہے۔ قلب تمام وجود کا بادشاہ ہے یہ دلائل سے کام نہیں لیتا چونکہ اس کا تعلق ملک الملوک سے ہے اس لیے کبھی صریح الہام سے کبھی خفی الہام سے اطلاع پاتا ہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دماغ وزیر ہے وزیر مدبر ہوتے ہیں اس لیے دماغ تجاویز اسباب۔ دلائل۔ اور نتائج کے متعلق کام میں لگا رہتا ہے قلب کو ان سے کام نہیں ہے اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے قوت حاسہ رکھی ہے جیسے چیونٹی جہاں کوئی شیرینی رکھی ہوئی ہو معاً اس جگہ پہنچ جاتی ہے حالانکہ اس کے لیے کوئی دلیل اس امر کی نہیں ہوتی کہ وہاں شیرینی ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے اس میں ایک قوت حاسہ رکھی ہوئی ہوتی ہے جو اس کی رہبری کرتی ہے اسی طرح پر قلب کو چیونٹی کے ساتھ مشابہت ہے کیونکہ اس میں بھی وہ قوت حاسہ موجود ہے جو اس کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ دلائل و براہین اور ترتیب مقدمات اور استخراج نتائج کی ضرورت نہیں رکھتا۔ گو یہ امر دیگر ہے کہ دماغ اس کے لیے یہ اسباب اور امور بھی بہم پہنچا دیتا ہے۔

قلب کے معنے ایک ظاہری اور جسمانی ہیں اور ایک روحانی۔ ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ پھرنے والا چونکہ دوران خون اسی سے ہوتا ہے اس لیے اس کو قلب کہتے ہیں روحانی طور پر اس کے یہ معنی ہیں کہ جو ترقیات انسان کرنا چاہتا ہے وہ قلب ہی کے تصرف سے ہوتی ہیں جس طرح پر دوران خون جو انسانی زندگی کے لیے ایک اشد ضروری چیز ہے اسی قلب سے ہوتا ہے اسی طرح پر روحانی ترقیوں کا اسی کے تصرف پر انحصار ہے۔

بعض نادان آج کل کے فلسفی بیخبر ہیں وہ تمام عمدہ کاروبار کو دماغ سے ہی منسوب کرتے ہیں مگر وہ اتنا نہیں جانتے کہ دماغ تو صرف دلائل و براہین کا ملکہ ہے قوت متفکرہ اور حافظہ دماغ میں ہے لیکن قلب میں ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے وہ سردار ہے یعنی دماغ میں ایک قسم کا تکلف ہے اور قلب میں نہیں بلکہ وہ بلا تکلف ہے۔ اس لیے قلب رب العرش سے ایک مناسبت رکھتا ہے صرف قوت حاسہ کے ذریعہ دلائل و براہین کے بغیر پہچان جاتا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ اِسْتَفْتِ الْقَلْبَ یعنی قلب سے فتویٰ پوچھ لے یہ نہیں کہا کہ دماغ سے فتویٰ پوچھ لو۔

الوہیت کی تجلی اسی کے ساتھ لگی ہوئی ہے کوئی اس کو بعید نہ سمجھے یہ بات ادق اور مشکل تو ہے مگر تزکیہ نفس کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ کرامات قلب میں موجود ہیں۔ اگر قلب میں یہ طاقتیں نہ ہوتیں تو انسان کا وجود ہی بیکار سمجھا جاتا صوفی اور مجاہدہ کرنے والے لوگ جو تصوف اور مجاہدات کے مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ قلب سے

روشنی اور نور کے ستون شہودی طور پر نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ایک خط مستقیم میں آسمان کو جاتے ہیں یہ مسئلہ بدیہی اور یقینی ہے میں اس کو خاص مثال کے ذریعہ سے بیان نہیں کر سکتا۔ ہاں جن لوگوں کو مجاہدات کرنے پڑتے ہیں یا جنہوں نے سلوک کی منزلوں کو طے کرنا چاہا ہے انہوں نے اُس کو اپنے مشاہدہ اور تجربہ سے صحیح پایا ہے قلب اور عرش کے درمیان گویا باریک تار ہے قلب کو جو حکم کرتا ہے اس سے ہی لذت پاتا ہے خارجی دلائل اور براہین کا محتاج نہیں ہوتا ہے بلکہ ملہم ہو کر خدا سے اندر ہی اندر باتیں پاکر فتویٰ دیتا ہے۔ ہاں یہ بات سچ ہے کہ جب تک قلب قلب نہ بنے لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ[1] کا مصداق ہوتا ہے۔
یعنی انسان پر ایک وہ زمانہ آتا ہے۔ کہ جس میں نہ قلب نہ دماغ کی قوتیں اور طاقتیں ہوتی ہیں پھر ایک زمانہ دماغ کا آتا ہے ۔ دماغی قوتیں اور طاقتیں نشوونما پاتی ہیں اور ایک ایسا زمانہ آتا ہے۔ کہ قلب منور اور مشتعل اور روشن ہو جاتا ہے جب قلب کا زمانہ آتا ہے۔ اُس وقت انسان روحانی بلوغ حاصل کرتا ہے ۔ اور دماغ قلب کے تابع ہو جاتا ہے ۔ اور دماغی قوتوں کو قلب کی خاصیتوں اور طاقتوں پر فوق نہیں ہوتا۔ یہ بھی یاد رہے۔ کہ دماغی حالتوں کو مومنوں سے ہی خصوصیت نہیں ہے ہندو اور چوڑھے وغیرہ بھی سب کے سب ہر ایک دماغ سے کام لیتے ہیں جو لوگ دنیوی معاملات اور تجارت کے کاروبار میں مصروف ہیں وہ سب کے سب دماغ سے کام لیتے ہیں ان کی دماغی قوتیں پورے طور پر نشوونما پائی ہوئی ہیں اور ہر روز نئی نئی باتیں اپنے کاروبار کے متعلق ایجاد کرتے ہیں یورپ اور نئی دنیا کو دیکھو کہ یہ لوگ کس قدر دماغی قوتوں سے کام لیتے ہیں اور کس قدر آئے دن نئی ایجادیں کرتے ہیں۔ قلب کا کام جب ہوتا ہے جب انسان خدا کا بنتا ہے اُس وقت اندر کی ساری طاقتیں اور ریاستیں معدوم ہو کر قلب کی سلطنت ایک اقتدار اور قوت حاصل کرتی ہے تب انسان کامل انسان کہلاتا ہے یہ وہی وقت ہوتا ہے جب کہ وہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ[2] کا مصداق ہوتا ہے ۔ اور ملائکہ تک اسے سجدہ کرتے ہیں۔ اس وقت وہ ایک نیا انسان ہوتا ہے اس کی روح پوری لذت اور سرور سے سرشار ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳-۴)

۹۹۔ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝

یعنی جو شخص خدا اور اُس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو خدا ایسے کافروں کا خود دشمن ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص توحید خشک کا تو قائل ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکذب ہے وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے لہذا بموجب منشاء اس آیت کے خدا اُس کا دشمن ہے اور وہ خدا کے نزدیک کافر ہے تو پھر اس کی نجات کیونکر ہو سکتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۵-۱۲۶)

[1] الملک : ۱۱ [2] الحجر : ۳۰ و ص : ۷۳

ذرہ ذرہ عالم کا جس سے انواع واقسام کے تغیرات ہوتے رہتے ہیں یہ سب خدا کے فرشتے ہیں اور توحید پوری نہیں ہوتی جب تک ہم ذرہ ذرہ کو خدا کے فرشتے مان نہ لیں کیونکہ اگر ہم تمام مؤثرات کو جو دنیا میں پائی جاتی ہیں خدا کے فرشتے تسلیم نہ کریں تو پھر ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ تمام تغیرات انسانی جسم اور تمام عالم میں بغیر خدا تعالیٰ کے علم اور ارادہ اور مرضی کے خود بخود ہو رہے ہیں اور اس صورت میں خدا تعالیٰ کو محض معطل اور بے خبر ماننا پڑے گا۔ فرشتوں پر ایمان لانے کا یہ راز ہے کہ بغیر اس کے توحید قائم نہیں رہ سکتی اور ہر ایک چیز کو اور ہر ایک تاثیر کو خدا تعالیٰ کے ارادہ سے باہر ماننا پڑتا ہے اور فرشتہ کا مفہوم تو یہی ہے کہ فرشتے وہ چیزیں ہیں جو خدا کے حکم سے کام کر رہی ہیں پس جبکہ یہ قانون ضروری اور مسلّم ہے تو پھر جبرائیل اور میکائیل سے کیوں انکار کیا جائے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۸۳ حاشیہ)

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

بعض نابکار قومیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو بُت پرست کہتی ہیں اللہ تعالیٰ اس آیت میں اُن کی تردید کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف واقعات پر بحث کرتا ہے اور قرآن کُل دنیا کی صداقتوں کا مجموعہ ہے اور سب دین کی کتابوں کا فخر ہے جیسے فرمایا ہے فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ[1]۔ اور يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً[2]

پس قرآن کریم کے معنی کرتے وقت خارجی قصوں کو نہ لیں بلکہ واقعات کو مدنظر رکھنا چاہیئے...... اس قصہ میں

[1] البینہ: ۴ ؛ [2] البینہ: ۳

حضرت سلیمان علیہ السلام کی بریت منظور ہے اور ان کو اس ناپاک الزام سے بری کرنا مقصود ہے جو ان پر لگایا جاتا ہے کہ وہ بت پرست تھے خدا نے فرمایا مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ سلیمان نے کفر نہیں کیا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۰ صفحہ ۴ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۰ء)

..... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ کوئی کہے کہ کیا انبیا بھی کافر ہوا کرتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں لوگوں نے ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ بُت پرست ہو گئے تھے ایک عورت کے لیے۔ اُس اعتراض کا جواب دیا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

قرآن حق و باطل میں فرق کرنے کے لیے آیا ہے پھر اگر وہ معیار نہیں تو اور کیا ہے؟ بلاشبہ قرآن کریم تمام صداقتوں پر حاوی ہے اور تمام علوم میں جہاں تک صحت سے ان کو تعلق ہے قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں لیکن وہ عظمتیں اور وہ کمالات جو قرآن میں ہیں مطہّرین پر کھلتے ہیں۔ جن کو وحی الٰہی سے مشرف کیا جاتا ہے اور ہر ایک شخص تب مومن بنتا ہے کہ جب سچے دل سے اس بات کا اقرار کرے کہ درحقیقت قرآن کریم احادیث کے لیے جو راویوں کے دخل سے جمع کی گئی ہیں معیار ہے۔ گو اُس معیار کے تمام استعمال پر عوام کو بھی قدرت حاصل نہیں صرف اخص لوگوں کو حاصل ہے لیکن قدرت کا حاصل نہ ہونا اور چیز ہے اور ایک چیز کا ایک چیز کے لیے واقعی طور پر معیار ہونا یہ اور امر ہے میں پوچھتا ہوں کہ جو صفات اللہ جل شانہ، نے قرآن کریم کے لیے آپ بیان فرمائی ہیں کیا ان پر ایمان لانا فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس سبحانہ، نے قرآن کریم کا نام عام طور پر قول فصل اور فرقان اور میزان اور امام اور حکم اور نور نہیں رکھا؟ اور کیا اس کو جمیع اختلافات کے دور کرنے کا آلہ نہیں ٹھیرایا؟ اور کیا یہ نہیں فرمایا کہ اُس میں ہر ایک چیز کی تفصیل ہے؟ اور ہر یک امر کا بیان ہے اور کیا یہ نہیں لکھا کہ اُس کے فیصلہ کے مخالف کوئی حدیث ماننے کے لائق نہیں؟ اور اگر یہ سب باتیں سچ ہیں تو کیا مومن کے لیے ضروری نہیں جو اُن پر ایمان لاوے اور زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرے؟ اور واقعی طور پر اپنا یہ اعتقاد رکھے کہ حقیقت میں قرآن کریم معیار اور حکم اور امام ہے لیکن محجوب لوگ قرآن کریم کے دقیق اشارات اور اسرار کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور اس سے مسائل شرعیہ کا استنباط اور استخراج کرنے پر قادر نہیں اس لیے وہ احادیث صحیحہ نبویہ کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ قرآن کریم پر کچھ زوائد بیان کرتی ہیں یا بعض احکام میں اُس کی ناسخ ہیں

اور نہ زوائد بیان کرتی ہے بلکہ قرآن شریف کے بعض مجمل اشارات کی شارح ہیں قرآن کریم آپ فرماتا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا یعنی کوئی آیت ہم منسوخ یا منسی نہیں کرتے جس کے عوض دوسری آیت ویسی ہی یا اس سے بہتر نہیں لاتے۔ پس اس آیت میں قرآن کریم نے صاف فرمادیا ہے کہ نسخ آیت کا آیت سے ہی ہوتا ہے اسی وجہ سے وعدہ دیا ہے کہ نسخ کے بعد ضرور آیت منسوخہ کی جگہ آیت نازل ہوتی ہے ہاں علماء نے مسامحت کی راہ سے بعض احادیث کو بعض آیات کی ناسخ ٹھیرایا ہے جیسا کہ حنفی فقہ کے رو سے مشہور حدیث سے آیت منسوخ ہوسکتی ہے۔ مگر امام شافعی اسبات کا قائل ہے کہ متواتر حدیث سے بھی قرآن کا نسخ جائز نہیں۔ اور بعض محدثین خبرِ واحد سے بھی نسخ آیت کے قائل ہیں لیکن قائلین نسخ کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ حقیقی اور واقعی طور پر حدیث سے آیت منسوخ ہوجاتی ہے بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ واقعی امر تو یہی ہے کہ قرآن پر نہ زیادت جائز ہے اور نہ نسخ کسی حدیث سے لیکن ہماری نظر قاصر میں جو استخراج مسائل قرآن سے عاجز ہے یہ سب باتیں صورت پذیر معلوم ہوتی ہیں۔ اور حق یہی ہے کہ حقیقی نسخ اور حقیقی زیادت قرآن پر جائز نہیں کیونکہ اس سے اس کی تکذیب لازم آتی ہے۔ نور الانوار جو حنفیوں کے اصول فقہ کی کتاب ہے اس کے صفحہ ۱۹ میں لکھا ہے روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذ الی الیمن قال لہ بما تقضی یا معاذ فقال بکتاب اللہ قال فان لم تجد قال بسنۃ رسول اللہ قال فان لم تجد قال اجتہد برائی فقال الحمد للہ الذی وفق رسولہ بما یرضی بہ رسولہ۔ لا یقال انہ یناقض قول اللہ تعالیٰ ما فرّطنا فی الکتاب من شیءٍ فکل شیءٍ فی القراٰن فکیف یقال فان لم تجد فی کتاب اللہ لانا نقول ان عدم الوجدان لا یقتضی عدم کونہ فی القرآن ولھذا قال صلی اللہ علیہ وسلم فان لم تجد ولم یقل فان لم یکن فی الکتاب اس عبارت مذکورہ بالا میں اسبات کا اقرار ہے کہ ہر ایک امر دین قرآن میں درج ہے کوئی چیز اس سے باہر نہیں اور اگر تفاسیر کے اقوال جو اس بات کے مؤید ہیں بیان کیے جائیں تو اس کے لیے ایک دفتر چاہیئے لہذا اصل حق الامر یہی ہے کہ جو چیز قرآن سے باہر یا اس کے مخالف ہے وہ مردود ہے اور احادیث صحیحہ قرآن سے باہر نہیں۔ کیونکہ وحی غیر متلو کی مدد سے وہ تمام مسائل قرآن سے مستخرج اور مستنبط کیے گئے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ استخراج اور استنباط بجز رسول اللہ یا اُسی شخص کے جو ظلی طور پر ان کمالات تک پہنچ گیا ہو ہر یک کا کام نہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جن کو ظلی طور پر عنایات الٰہیہ نے وہ علم بخشا ہو جو اس کے رسول متبوع کو بخشا تھا وہ حقائق و معارف دقیقہ قرآن کریم پر مطلع کیا جاتا ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۹۰-۹۱)

میرا صدہا مرتبہ کا تجربہ ہے کہ خدا ایسا کریم و رحیم ہے کہ جب اپنی مصلحت سے ایک دعا کو منظور نہیں کرتا تو اس کے عوض میں کوئی اور دعا منظور کرلیتا ہے جو اس کے مثل ہوتی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا ط اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۲۷)

صبح کو ایک الہام ہوا تھا میرا ارادہ ہوا کہ لکھ لوں۔ پھر حافظہ پر بھروسا کر کے نہ لکھا۔ آخر وہ ایسا بھولا کہ ہرچند

یاد کیا مطلق یاد نہ آیا دراصل یہی بات ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَآ اَوْ مِثْلِہَا۔

(البدر جلد ۲ ۔ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵۰)

ہمارا خدا قادر مطلق خدا ہے۔ جو کامل اختیارات رکھتا ہے یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ[1]۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ جوتشی کی طرح نہیں وہ ایک حکم صبح دیتا اور رات کو اس کے بدلنے کے کامل اختیارات رکھتا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ والی آیت اس پر گواہ ہے۔ آخر صدقہ۔ خیرات بھی کوئی چیز ہے۔ تمام انبیاء کرام کا اجماعی مسئلہ ہے کہ صدقہ و استغفار سے ردّ بلا ہوتا ہے بلا کیا چیز ہے یعنی وہ تکلیف دہ امر جو خدا کے ارادے میں مُقدّر ہو چکا ہے۔ اب اس کی اطلاع جب کوئی نبی دے۔ تو وہ پیشگوئی بن جاتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے وہ تضرع کرنے والوں پر اپنی رحمت سے رجوع کرتا ہے اس لیے ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ وعید کی پیشگوئیاں ٹل نہیں بلکہ وہ ٹل جاتی ہیں۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

ہمیشہ دیکھا گیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور اس کا ارادہ ہو کر رہتا ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے یہ معنے تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شی پر بھی قادر ہے۔ اس طرح تو وہ اپنا بیٹا بنانے پر بھی قادر کہا جا سکتا ہے۔ پھر عیسائی مذہب کے اختیار کرنے میں کیا تامل ہے۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ بیشک قادر ہے مگر وہ اپنے تقدس اور ان صفات کے خلاف نہیں کرتا۔ جو قدیم سے الہامی کتب میں بیان کی جا رہی ہیں گویا ان کے خلاف اس کی توجہ ہوتی ہی نہیں۔ وہ ذات پاک اپنے مواعید کے خلاف بھی نہیں کرتا اور نہ اس طرف وہ متوجہ ہوتا ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

اور کہا انہوں نے کہ ہرگز بہشت میں داخل نہیں ہو گا یعنی نجات نہیں پائے گا مگر وہی شخص جو یہودی ہو گا یا نصرانی ہو گا یہ ان کی بے حقیقت آرزوئیں ہیں کہو لاؤ برہان اپنی اگر تم سچے ہو یعنی تم دکھلاؤ کہ تمہیں کیا نجات حاصل

[1] الرعد : ۴۰

ہوگئی ہے بلکہ نجات اُس کو ملتی ہے جس نے اپنا سارا وجود اللہ کی راہ میں سونپ دیا یعنی اپنی زندگی کو خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا اور اُس کی راہ میں لگا دیا۔ اور وہ بعد وقف کرنے اپنی زندگی کے نیک کاموں میں مشغول ہو گیا اور ہر ایک قسم کے اعمال حسنہ بجالانے لگا پس وہی شخص ہے جس کو اُس کا اجر اُس کے رب کے پاس سے ملیگا اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ ڈر ہے اور نہ وہ کبھی غمگین ہوں گے یعنی وہ پورے اور کامل طور پر نجات پا جائیں گے۔ اِس مقام میں اللہ جل شانہٗ نے عیسائیوں اور یہودیوں کی نسبت فرمایا کہ جو وہ اپنی اپنی نجات یابی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ صرف اُن کی آرزوئیں ہیں اور اُن آرزوؤں کی حقیقت جو زندگی کی روح ہے ان میں ہرگز پائی نہیں جاتی بلکہ اصلی اور حقیقی نجات وہ ہے جو اسی دنیا میں اُس کی حقیقت نجات یابندہ کو محسوس ہو جائے اور وہ اس طرح پر ہے کہ نجات یابندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق عطا ہو جائے کہ وہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دے۔ اس طرح پر کہ اس کا مرنا اور جینا اور اُس کے تمام اعمال خدا تعالیٰ کے لیے ہو جائیں اور اپنے نفس سے وہ بالکل کھویا جائے اور اُس کی مرضی خدا تعالیٰ کی مرضی ہو جائے اور پھر نہ صرف دل کے عزم تک یہ بات محدود رہے بلکہ اس کی تمام جوارح اور اُس کے تمام قویٰ اور اس کی عقل اور اُس کا فکر اور اُس کی تمام طاقتیں اسی راہ میں لگ جائیں تب اس کو کہا جائے گا کہ وہ محسن ہے یعنی خدمتگاری کا اور فرماں برداری کا حق بجالایا جہاں تک اس کی بشریت سے ہو سکتا تھا سو ایسا شخص نجات یاب ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں فرماتا ہے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (س سورہ انعام رکوع) کہہ نماز میری اور عبادتیں میری اور زندگی میری اور موت میری تمام اُس اللہ کے واسطے ہیں جو رب ہے عالموں کا جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی درجہ کے حاصل کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اول مسلمانوں کا ہوں۔

پھر بعد اس کے اللہ جل شانہٗ اس نجات کی علامات اپنی کتاب کریم میں لکھتا ہے کیونکہ گو جو کچھ فرمایا گیا وہ بھی ایک حقیقی ناجی کے لیے مابہ الامتیاز ہے لیکن چونکہ دنیا کی آنکھیں اس باطنی نجات اور وصول الی اللہ کو دیکھ نہیں سکتیں اور دنیا پر واصل اور غیر واصل کا امر مشتبہ ہو جاتا ہے اس لیے اُس کی نشانیاں بھی تبلا دیں کیونکہ یوں تو دنیا میں کوئی بھی فرقہ نہیں کہ اپنے تئیں غیر ناجی اور جہنمی قرار دیتا ہے کسی سے پوچھ کر دیکھ لیں بلکہ ہر ایک قوم کا آدمی جس کو پوچھو اپنی قوم کو اور اپنے مذہب کے لوگوں کو اول درجہ کا نجات یافتہ قرار دیگا۔ اس صورت میں فیصلہ کیونکر ہو تو اس فیصلہ کے لیے خدا تعالیٰ نے حقیقی اور کامل ایمانداروں اور حقیقی اور کامل نجات یافتہ لوگوں کے لیے علامتیں مقرر کر دی ہیں اور نشانیاں قرار دیدی ہیں تا دنیا شبہات میں مبتلا نہ رہے چنانچہ منجملہ ان نشانیوں کے بعض نشانیوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَھُمُ الْبُشْرٰی

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ[۱]۔ (س ۱۱ ر ۱۲۔ سورہ یونس)
یعنی خبردار ہو تحقیق وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کے دوست ہیں اُن پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے یعنی اللہ رسول کی تابع ہو گئے اور پھر پرہیزگاری اختیار کی اُن کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس دنیا کی زندگی اور نیز آخرت میں بشریٰ ہے یعنی خدا تعالیٰ خواب اور الہام کے ذریعہ سے اور نیز مکاشفات سے اُن کو بشارتیں دیتا رہے گا۔ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں تخلف نہیں اور یہ بڑی کامیابی ہے جو اُن کے لیے مقرر ہو گئی یعنی اسی کامیابی کے ذریعہ سے اُن میں اور غیروں میں فرق ہو جائے گا۔ اور جو سچے نجات یافتہ نہیں اُن کے مقابل میں دم نہیں مار سکیں گے پھر دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ[۲] (س ۲۴۔ رکوع ۱۸)

یعنی جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر استقامت اختیار کی اُن کی یہ نشانی ہے کہ اُن پر فرشتے اُترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم مت ڈرو اور کچھ غم نہ کرو اور خوشخبری سنو اُس بہشت کی جس کا تمہیں وعدہ دیا گیا تھا ہم تمہارے دوست اور متولی اس دنیا کی زندگی میں ہیں اور نیز آخرت میں اور تمہارے لیے اس بہشت میں وہ سب کچھ دیا گیا جو تم مانگو یہ مہمانی ہے غفور رحیم سے۔

اب دیکھئے اس آیت میں مکالمہ الٰہیہ اور قبولیت اور خدا تعالیٰ کا متولی اور متکفل ہونا اور اسی دنیا میں بہشتی زندگی کی بنا ڈالنا اور اُن کا حامی اور ناصر ہونا بطور نشان کے بیان فرمایا گیا۔ اور پھر اُس آیت میں..... کہ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ[۳] اُسی نشانی کی طرف اشارہ ہے کہ سچی نجات کا پانے والا ہمیشہ اچھے پھل لاتا ہے اور آسمانی برکات کے پھل اس کو ہمیشہ ملتے رہتے ہیں اور پھر ایک اور مقام میں فرماتا ہے وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ[۴] (س ۲ ر ۷)۔ اور جب میرے بندے میرے بارہ میں سوال کریں تو اُن کو کہہ دے کہ میں نزدیک ہوں یعنی جب وہ لوگ جو اللہ رسول پر ایمان لائے ہیں یہ پتہ پوچھنا چاہیں کہ خدا تعالیٰ ہم سے کیا عنایات رکھتا ہے جو ہم سے مخصوص ہوں اور غیروں میں نہ پائی جاویں۔ تو اُن کو کہہ دے کہ میں نزدیک ہوں یعنی تم میں اور تمہارے غیروں میں یہ فرق ہے کہ تم میرے مخصوص اور قریب ہو اور دوسرے مہجور اور دور ہیں جب کوئی دعا کرنے والوں میں سے جو تم میں سے دعا کرے دعا کرتے ہیں تو میں اس کا جواب دیتا ہوں یعنی میں اس کا ہم کلام ہو جاتا ہوں اور اس سے باتیں کرتا ہوں اور اُس کی دعا کو پایۂ قبولیت میں جگہ دیتا ہوں پس

[۱] یونس ۶۳ تا ۶۵ ۔ [۲] حٰمٓ السجدۃ : ۳۱ تا ۳۳ ۔ [۳] ابراہیم : ۲۶ ۔ [۴] البقرۃ : ۱۸۷ ۔

چاہیئے کہ قبول کریں حکم میرے کو اور ایمان لاویں تا کہ بھلائی پاویں ایسا ہی اور کئی مقامات میں اللہ جل شانہ نجات یافتہ لوگوں کے نشان بیان فرماتا ہے اگر وہ تمام لکھے جاویں تو طول ہو جائے گا جیسا کہ ان میں سے ایک یہ بھی آیت ہے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا [1] ۔ ۱۸۔ سورہ انفال) ۔ کہ اے ایمان والو اگر تم خدا تعالیٰ سے ڈرو تو خدا تم میں اور تمہارے غیروں میں ما بہ الامتیاز رکھ دیگا ۔ (جنگ مقدس بیان مورخہ ۶ ہائی ۱۸۹۳ء ص)

خدا تعالیٰ نے جیسے ابتدا سے انسان کی فطرت میں ایک ملکہ گناہ کرنے کا رکھا ایسا ہی گناہ کا علاج بھی اسی طرز سے اُس کی فطرت میں رکھا گیا ہے جیسے کہ وہ خود فرماتا ہے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗۤ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ [2] یعنی جو شخص اپنے تمام وجود کو خدا تعالیٰ کی راہ سونپ دیوے اور پھر اپنے تئیں نیک کاموں میں لگا دیوے تو اُس کو اُن کا اجر اللہ تعالیٰ سے ملیگا ۔ اور ایسے لوگ بیخوف اور بے غم ہیں ۔ اب دیکھیئے کہ یہ قاعدہ کہ توبہ کر کے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اپنی زندگی کو اُس کی راہ میں وقف کر دینا یہ گناہ کے بخشے جانے کے لیے ایک ایسا صراطِ مستقیم ہے کہ کسی خاص زمانہ تک محدود نہیں جب سے انسان اس مسافرخانہ میں آیا تب سے اس قانون کو اپنے ساتھ لایا ۔ جیسے اُس کی فطرت میں ایک شق یہ موجود ہے کہ گناہ کی طرف رغبت کرتا ہے ایسا ہی یہ دوسرا شق بھی موجود ہے کہ گناہ سے نادم ہو کر اپنے اللہ کی راہ میں مرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ زہر بھی اسی میں ہے ۔ اور تریاق بھی اسی میں ہے ۔ یہ نہیں کہ زہر اندر سے نکلے اور تریاق جنگلوں سے تلاش کرتے پھریں ۔ (جنگ مقدس بیان ۳۰ مئی ۱۸۹۳ء ص)

واضح ہو کہ لغت عرب میں اسلام اس کو کہتے ہیں کہ بطور پیشگی ایک چیز کا مول دیا جائے اور یا یہ کہ کسی کو اپنا کام سونپیں اور یا یہ کہ صلح کے طالب ہوں اور یا یہ کہ کسی امر یا خصومت کو چھوڑ دیں ۔

اور اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اس آیت کریمہ میں اُس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗۤ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کے لیے اور اُس کے ارادوں کی پیروی کے لیے اور اُس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیوے اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لیے قائم ہو جاوے اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اُس کی راہ میں لگا دیوے مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جاوے ۔

" اعتقادی " طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو درحقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اُس کی طاعت اور اُس کے عشق اور محبت اور اُس کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے بنائی گئی ہے ۔

---

[1] الانفال : ۳۰ ۔ [2] پ رکوع ۱۳ ۔

اُور عملی طَور پر اِس طرح سے کہ خالصاً للہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوّت سے متعلق اور ہر یک خدا داد توفیق سے وابستہ ہیں بجالاوے مگر ایسے ذوق وشوق و حضور سے کہ گویا وہ اپنی فرماں برداری کے آئینہ میں اپنے معبود حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔

پھر بقیہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جس کی اعتقادی و عملی صفائی ایسی محبت ذاتی پر مبنی ہو اور ایسے طبعی جوش سے اعمال حسنہ اُس سے صادر ہوں وُہی ہے جو عنداللہ مستحق اجر ہے اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ کچھ غم رکھتے ہیں یعنی ایسے لوگوں کے لیے نجات نقد موجود ہے کیونکہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لاکر اُس سے موافقت تامہ ہوگئی اور ارادہ اُس کا خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہمرنگ ہوگیا اور تمام لذت اُس کی فرماں برداری میں ٹھہر گئی اور جمیع اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ اور احتظاظ کی کشش سے صادر ہونے لگے تو یہی وہ کیفیت ہے جس کو فلاح اور نجات اور رستگاری سے موسوم کرنا چاہیئے اور عالم آخرت میں جو کچھ نجات کے متعلق مشہود و محسوس ہوگا وہ درحقیقت اِسی کیفیت راسخہ کے اظلال و آثار ہیں جو اُس جہان میں جسمانی طور پر ظاہر ہوجائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بہشتی زندگی اِسی جہان سے شروع ہوجاتی ہے اور جہنمی عذاب کی جڑھ بھی اِسی جہان کی گندی اور کورانہ زلیست ہے۔ اب آیات ممدوحہ بالا پر ایک نظر غور ڈالنے سے ہر یک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت تب کسی میں متحقق ہوسکتی ہے کہ جب اُس کا وجود معہ اپنے تمام باطنی و ظاہری قویٰ کے محض خدا تعالیٰ کے لیے اور اس کی راہ میں وقف ہوجاوے اور جو امانتیں اُس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں پھر اُسی معطی حقیقی کو واپس دی جائیں اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینہ میں بھی اپنے اسلام اور اُس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھلائی جاوے یعنی شخص مدعی اسلام یہ بات ثابت کردیوے کہ اُس کے ہاتھ اور پیر اور دل اور دماغ اور اُس کی عقل اور اُس کا فہم اور اُس کا غضب اور اُس کا رحم اور اُس کا حلم اور اُس کا علم اور اُس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اُس کی عزّت اور اُس کا مال اور اُس کا آرام اور سرور اور جو کچھ اُس کا سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر و باطن کے ہے یہاں تک کہ اُس کی نیات اور اُس کے دل کے خطرات اور اُس کے نفس کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہوگئے ہیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضا اُس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔ غرض یہ ثابت ہوجائے کہ صدق قدم اِس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ جو کچھ اُس کا ہے وہ اُس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہوگیا ہے اور تمام اعضا اور قویٰ الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وُہ جوارح الحق ہیں۔

اور ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف اور بدیہی طور پر ظاہر ہورہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی کا وقف کرنا جو حقیقت اسلام ہے دو قسم پر ہے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا معبود اور مقصود اور محبوب ٹھہرایا جاوے

اور اُس کی عبادت اور محبت اور خوف اور رجا میں کوئی دوسرا شریک باقی نہ رہے اور اُس کی تقدیس اور تسبیح اور عبادت اور تمام عبودیت کے آداب اور احکام اور اوامر اور حدود اور آسمانی قضا و قدر کے اُمور بدل و جان قبول کیے جائیں اور نہایت نیستی اور تذلّل سے ان سب حکموں اور حدّوں اور قانونوں اور تقدیروں کو بارادت تام سر پر اُٹھا لیا جاوے اور نیز وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اُس کی وسیع قدرتوں کے معرفت کا ذریعہ اور اُس کی ملکوت اور سلطنت کے علو مرتبہ کو معلوم کرنے کے لیے ایک واسطہ اور اُس کے آلاء اور نعماء کے پہچاننے کے لیے ایک قوی رہبر ہیں بخوبی معلوم کر لی جائیں۔

دوسری قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کی یہ ہے کہ اُس کے بندوں کی خدمت اور ہمدردی اور چارہ جوئی اور بار برداری اور سچی غم خواری میں اپنی زندگی وقف کر دی جاوے دوسروں کو آرام پہنچانے کے لیے دکھ اُٹھاویں اور دوسروں کی راحت کے لیے اپنے پر رنج گوارا کر لیں۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اسلام کی حقیقت نہایت ہی اعلیٰ ہے اور کوئی انسان کبھی اس شریف لقب اہل اسلام سے حقیقی طور پر ملقب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنا سارا وجود معہ اُس کے تمام قوتوں اور خواہشوں اور ارادوں کے حوالہ بخدا نہ کر دیوے اور اپنی انانیّت سے معہ اُس کے جمیع لوازم کے ہاتھ اُٹھا کر اُسی کی راہ میں نہ لگ جاوے۔ پس حقیقی طور پر اُسی وقت کسی کو مسلمان کہا جائے گا کہ جب اُس کی غافلانہ زندگی پر ایک سخت انقلاب وارد ہو کر اُس کے نفس امّارہ کا نقش ہستی معہ اُس کے تمام جذبات کے یک دفعہ مٹ جائے اور پھر اس موت کے بعد محسن للہ ہونے کے نئی زندگی اُس میں پیدا ہو جائے اور وہ ایسی پاک زندگی ہو جو اُس میں بجز طاعت خالق اور ہمدردی مخلوق کے اور کچھ بھی نہ ہو۔

خالق کی طاعت اس طرح سے کہ اُس کی عزت و جلال اور یگانگت ظاہر کرنے کے لیے بے عزتی اور ذلّت قبول کرنے کے لیے مستعد ہو اور اس کی وحدانیت کا نام زندہ کرنے کے لیے ہزاروں موتوں کے قبول کرنے کے لیے طیار ہو اور اُس کی فرماں برداری میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بخوشی خاطر کاٹ سکے اور اُس کے احکام کی عظمت کا پیار اور اس کی رضا جوئی کی پیاس گناہ سے ایسی نفرت دلا دے کہ گویا وہ کھا جانے والی ایک آگ ہے یا ہلاک کرنے والی ایک زہر ہے یا بھسم کر دینے والی ایک بجلی ہے جس سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بھاگنا چاہیے۔ غرض اُس کی مرضی ماننے کے لیے اپنے نفس کی سب مرضیات چھوڑ دے اور اُس کے پیوند کے لیے جانکاہ زخموں سے مجروح ہونا قبول کر لے اور اُس کے تعلق کا ثبوت دینے کے لیے سب نفسانی تعلقات توڑ دے۔

اور خلق اللہ کی خدمت اس طرح سے کہ جس قدر خلقت کی حاجات ہیں اور جس قدر مختلف وجوہ اور طرق کی راہ سے قسّام ازل نے بعض کو بعض کا محتاج کر رکھا ہے ان تمام امور میں محض للہ اپنی حقیقی اور بے غرضانہ اور

سچی ہمدردی سے جو اپنے وجود سے صادر ہوسکتی ہے ان کو نفع پہنچاوے اور ہر یک مدد کے محتاج کو اپنی خداداد قوت سے مدد دے اور ان کی دُنیا و آخرت دونوں کی اصلاح کے لیے زور لگاوے۔

مگر یہ للّٰہی وقف محض اُس صورت میں اسم بامسمّٰی ہوگی کہ جب تمام اعضا للّٰہی طاعت کے رنگ سے ایسے رنگ پذیر ہوجائیں کہ گویا وہ ایک الٰہی آلہ ہیں جن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً افعال الٰہیہ ظہور پذیر ہوتے ہیں یا ایک مصفّا آئینہ ہیں جس میں تمام مرضیات الٰہیہ بصفاء تام عکسی طور پر ظہور پکڑتی رہتی ہیں۔ اور جب اِس درجہ کاملہ پر للّٰہی طاعات و خدمات پہنچ جائیں تو اِس صبغۃ اللہ کی برکت سے اِس وصف کے انسان کے قویٰ اور جوارح کی نسبت وحدت شہودی کے طور پر یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ مثلاً یہ آنکھیں خدا تعالیٰ کی آنکھیں اور یہ زبان خدا تعالیٰ کی زبان اور یہ ہاتھ خدا تعالیٰ کے ہاتھ اور یہ کان خدا تعالیٰ کے کان اور یہ پاؤں خدا تعالیٰ کے پاؤں ہیں۔ کیونکہ وہ تمام اعضاء اور قوتیں للّٰہی راہوں میں خدا تعالیٰ کے ارادوں سے پُر ہوکر اور اُس کی خواہشوں کی تصویر بن کر اس لائق ہوجاتے ہیں کہ اُن کو اُسی کا روپ کہا جاوے وجہ یہ کہ جیسے ایک شخص کے اعضا پورے طور پر اُس کی مرضی اور ارادہ کے تابع ہوتے ہیں ایسا ہی کامل انسان اُس درجہ پر پہنچ کر خدا تعالیٰ کی مرضیات و ارادات سے موافقت تامہ پیدا کرلیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت اور مالکیت اور معبودیّت اور اس کی ہر یک مرضی اور خواہش کی بات ایسی ہی اُس کو پیاری معلوم ہوتی ہے کہ جیسی خود خدا تعالیٰ کو۔ سو یہ عظیم الشان للّٰہی طاعت و خدمت جو پیار اور محبت سے ملی ہوئی اور خلوص اور حنفیّت تامہ سے بھری ہوئی ہے یہی اسلام اور اسلام کی حقیقت اور اسلام کا لُب لباب ہے جو نفس اور خلق اور ہوا اور ارادہ سے موت حاصل کرنے کے بعد ملتا ہے۔

اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ آیت موصوفہ بالا یعنی بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ سعادت تامہ کے تینوں ضروری درجوں یعنی فنا اور بقا اور لقا کی طرف اشارت کرتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کرچکے ہیں۔ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کا فقرہ یہ تعلیم کر رہا ہے کہ تمام قوٰی اور اعضا اور جو کچھ اپنا ہے خدا تعالیٰ کو سونپ دینا چاہیئے اور اُس کی راہ میں وقف کر دینا چاہیئے اور یہ وہی کیفیت ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں فنا ہے وجہ یہ کہ جب انسان نے حسب مفہوم اِس آیت ممدوحہ کے اپنا تمام وجود معہ اُس کی تمام قوتوں کے خدا تعالیٰ کو سونپ دیا اور اُس کی راہ میں وقف کر دیا اور اپنی نفسانی جنبشوں اور سکونوں سے بکلی باز آگیا۔ تو بلاشبہ ایک قسم کی موت اُس پر طاری ہوگئی اور اسی موت کو اہل تصوّف فنا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

پھر بعد اس کے وَهُوَ مُحْسِنٌ کا فقرہ مرتبہ بقا کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ جب انسان بعد فنا اکمل و اتم و سلب جذبات نفسانی۔ الٰہی جذبہ اور تحریک سے پھر جنبش میں آیا اور بعد منقطع ہوجانے تمام نفسانی حرکات کے

پھر ربانی تحریکوں سے پُر ہو کر حرکت کرنے لگا تو یہ وہ حیاتِ ثانی ہے جس کا نام بقا رکھنا چاہیئے۔

پھر بعد اس کے یہ فقرات فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ جو اثبات وایجاب اجر و نفی و سلب خوف و حزن پر دلالت کرتی ہیں یہ حالت لقا کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس وقت انسان کے عرفان اور یقین اور توکّل اور محبت میں ایسا مرتبہ عالیہ پیدا ہو جائے کہ اُس کے خلوص اور ایمان اور وفا کا اجر اُس کی نظر میں وہمی اور خیالی اور ظنّی نہ رہے بلکہ ایسا یقینی اور قطعی اور مشہود اور مرئی اور محسوس ہو کہ گویا وہ اُس کو مل چکا ہے اور خدا تعالیٰ کے وجود پر ایسا یقین ہو جائے کہ گویا وہ اُس کو دیکھ رہا ہے اور ہر یک آیندہ کا خوف اُس کی نظر سے اُٹھ جاوے اور ہر یک گذشتہ اور موجودہ غم کا نام و نشان نہ رہے اور ہر یک روحانی تنعّم موجود الوقت نظر آوے تو یہی حالت جو ہر یک قبض اور کدورت سے پاک اور ہر یک دغدغہ اور شک سے محفوظ اور ہر یک دردِ انتظار سے منزہ ہے لقا کے نام سے موسوم ہے اور اس مرتبہ لقا پر محسن کا لفظ جو آیت میں موجود ہے نہایت صراحت سے دلالت کر رہا ہے کیونکہ احسان حسب تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسی حالت کاملہ کا نام ہے کہ جب انسان اپنی پرستش کی حالت میں خدا تعالیٰ سے ایسا تعلق پیدا کرے کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور یہ لقا کا مرتبہ تب سالک کے لیے کامل طور پر متحقّق ہوتا ہے کہ جب ربّانی رنگ بشریت کے رنگ و بو کو بتمام و کمال اپنے رنگ کے نیچے متواری اور پوشیدہ کر دیوے جس طرح آگ لوہے کے رنگ کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ نظر ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ وہی مقام ہے جس پر پہنچ کر بعض سالکین نے لغزشیں کھائی ہیں اور شہودی پیوند کو وجودی پیوند کے رنگ میں سمجھ لیا ہے۔ اِس مقام میں جو اولیاء اللہ پہنچے ہیں یا جن کو اس میں سے کوئی گھونٹ میسّر آ گیا ہے بعض اہل تصوّف نے اُن کا نام اطفال اللہ رکھ دیا ہے اِس مناسبت سے کہ وہ لوگ صفاتِ الٰہی کے کنارِ عاطفت میں بکلّی جا پڑے ہیں اور جیسے ایک شخص کا لڑکا اپنے حلیہ اور خط و خال میں کچھ اپنے باپ سے مناسبت رکھتا ہے ویسا ہی اُن کو بھی ظلّی طور پر بوجہ تخلّق باخلاق اللہ خدا تعالیٰ کی صفاتِ جمیلہ سے کچھ مناسبت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے نام اگرچہ کھلے کھلے طور پر بزبانِ شرع مستعمل نہیں ہیں مگر درحقیقت عارفوں نے قرآن کریم سے ہی اس کو استنباط کیا ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہ فرماتا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا[1] یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسے تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اگر مجازی طور پر ان الفاظ کا بولنا منہیاتِ شرع سے ہوتا تو خدا تعالیٰ ایسی طرز سے اپنی کلام کو منزہ رکھتا جس سے اِس اطلاق کا جواز مستنبط ہو سکتا ہے اور اس درجہ لقا میں بعض اوقات انسان سے ایسے امور صادر ہوتے ہیں کہ جو بشریت کی طاقتوں سے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور الٰہی طاقت کا رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں جیسے ہمارے سیّد و مولیٰ سیّد الرسل حضرت خاتم الانبیا صلّی اللہ علیہ وسلم

[1] البقرۃ: ۲۰۱

نے جنگ بدر میں ایک سنگریزوں کی مٹھی کفار پر چلائی اور وہ مٹھی کسی دُعا کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود اپنی روحانی طاقت سے چلائی مگر اُس مٹھی نے خدائی طاقت دکھلائی اور مخالف کی فوج پر ایسا خارق عادت اُس کا اثر پڑا کہ کوئی اُن میں سے ایسا نہ رہا کہ جس کی آنکھ پر اُس کا اثر نہ پہنچا ہو اور وہ سب اندھوں کی طرح ہو گئے اور ایسی سراسیمگی اور پریشانی اُن میں پیدا ہو گئی کہ مدہوشوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اسی معجزہ کی طرف اللہ جل شانہ اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ[1] یعنی جب تو نے اُس مٹھی کو پھینکا وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا تعالےٰ نے پھینکا یعنی درپردہ الٰہی طاقت کام کر گئی انسانی طاقت کا یہ کام نہ تھا۔

اور ایسا ہی دوسرا معجزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو شق القمر ہے اسی الٰہی طاقت سے ظہور میں آیا تھا کوئی دُعا اُس کے ساتھ شامل نہ تھی کیونکہ وہ صرف اُنگلی کے اشارہ سے جو الٰہی طاقت سے بھری ہوئی تھی وقوع میں آگیا تھا۔ اور اِس قسم کے اَور بھی بہت سے معجزات ہیں جو صرف ذاتی اقتدار کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے جن کے ساتھ کوئی دُعا نہ تھی۔ کئی دفعہ تھوڑے سے پانی کو جو صرف ایک پیالہ میں تھا اپنی انگلیوں کو اُس پانی کے اندر داخل کرنے سے اِس قدر زیادہ کر دیا کہ تمام لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں نے وہ پانی پیا اور پھر بھی وہ پانی ویسا ہی اپنی مقدار پر موجود تھا۔ اور کئی دفعہ دو۲ چار روٹیوں پر ہاتھ رکھنے سے ہزار ہا بھوکوں پیاسوں کا ان سے شکم سیر کر دیا اور بعض اوقات تھوڑے دودھ کو اپنے لبوں سے برکت دیکر ایک جماعت کا پیٹ اُس سے بھر دیا اور بعض اوقات شور آب کنوئیں میں اپنے مُنہ کا لعاب ڈال کر اُس کو نہایت شیریں کر دیا۔ اور بعض اوقات سخت مجروحوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان کو اچھا کر دیا۔ اور بعض اوقات آنکھوں کو جن کے ڈیلے لڑائی کے کسی صدمہ سے باہر جا پڑے تھے اپنے ہاتھ کی برکت سے پھر درست کر دیا۔ ایسا ہی اور بھی بہت سے کام اپنے ذاتی اقتدار سے کیے جن کے ساتھ ایک چھپی ہوئی طاقت الٰہی مخلوط تھی۔

حال کے برہمو اور فلسفی اور نیچری اگر ان معجزات سے انکار کریں تو وہ معذور ہیں کیونکہ وہ اُس مرتبہ کو شناخت نہیں کر سکتے جس میں ظلی طور پر الٰہی طاقت انسان کو ملتی ہے پس اگر وہ ایسی باتوں پر ہنسیں تو وہ اپنے ہنسنے میں بھی معذور ہیں کیونکہ اُنہوں نے بجز طفلانہ حالت کے اور کسی درجہ روحانی بلوغ کو طے نہیں کیا۔ اور نہ صرف اپنی حالت ناقص رکھتے ہیں بلکہ اس بات پر خوش ہیں کہ اسی حالت ناقصہ میں مریں بھی۔

مگر زیادہ تر افسوس اُن عیسائیوں پر ہے جو بعض خوارق اسی کے مشابہ مگر ان سے ادنیٰ حضرت مسیح میں سن سُنا کر اُن کی الوہیت کی دلیل ٹھہرا بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کا مُردوں کا زندہ کرنا اور مفلوجوں اور مجذوموں کا اچھا کرنا اپنے اقتدار سے تھا کسی دعا سے نہیں تھا۔ اور یہ دلیل اس بات پر ہے کہ وہ حقیقی طور پر

[1] الانفال: ۱۸

ابن اللہ بلکہ خدا تھا لیکن افسوس کہ ان بیچاروں کو خبر نہیں کہ اگر انہیں باتوں سے انسان خدا بن جاتا ہے تو اس خدائی کا زیادہ تر استحقاق ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کیونکہ اس قسم کے اقتداری خوارق جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھلائے ہیں حضرت مسیح علیہ السلام ہرگز دکھلا نہیں سکے اور ہمارے ہادی و مقتدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اقتداری خوارق نہ صرف آپ ہی دکھلائے بلکہ ان خوارق کا ایک لمبا سلسلہ روز قیامت تک اپنی امت میں چھوڑ دیا جو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں حسب ضرورت زمانہ ظہور میں آتا رہا ہے اور اس دنیا کے آخری دنوں تک اسی طرح ظاہر ہوتا رہے گا اور الٰہی طاقت کا پرتوہ جس قدر اس اُمّت کی مُقدّس رُوحوں پر پڑا ہے اس کی نظیر دوسری امتوں میں ملنی مشکل ہے پھر کس قدر بیوقوفی ہے کہ ان خارق عادت امور کی وجہ سے کسی کو خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا جاوے اگر ایسے ہی خوارق سے انسان خدا بن سکتا ہے تو پھر خداؤں کا کچھ انتہا بھی ہے؟

لیکن یہ بات اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس قسم کے اقتداری خوارق گو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتے ہیں مگر پھر بھی خدا تعالیٰ کے اُن خاص افعال سے جو بلا توسط ارادہ غیری ظہور میں آتے ہیں کسی طور سے برابری نہیں کر سکتے اور نہ برابر ہونا اُن کا مناسب ہے اسی وجہ سے جب کوئی نبی یا ولی اقتداری طور پر بغیر توسط کسی دعا کے کوئی ایسا امر خارق عادت دکھلاوے جو انسان کو کسی حیلہ اور تدبیر اور علاج سے اُس کی قوت نہیں دی گئی تو نبی کا وہ فعل خدا تعالیٰ کے اُن افعال سے کم رتبہ پر رہے گا جو خود خدا تعالیٰ علانیہ اور بالجہر اپنی قوت کاملہ سے ظہور میں لاتا ہے یعنی ایسا اقتداری معجزہ بہ نسبت دوسرے الٰہی کاموں کے جو بلا واسطہ اللہ جلشانہ سے ظہور میں آتے ہیں ضرور کچھ نقص اور کمزوری اپنے اندر موجود رکھتا ہوگا تا سرسری نگاہ والوں کی نظر میں تشابہ فی الخلق واقع نہ ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا باوجود اس کے کہ کئی دفعہ سانپ بنا لیکن آخر عصا کا عصا ہی رہا۔ اور حضرت مسیح کی چڑیاں باوجودیکہ معجزہ کے طور پر اُن کا پرواز قرآن کریم سے ثابت ہے مگر پھر بھی مٹی کی مٹی ہی تھے۔ اور کہیں خدا تعالیٰ نے یہ نہ فرمایا کہ وہ زندہ بھی ہوگئیں اور ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کے اقتداری خوارق میں چونکہ طاقت الٰہی سب سے زیادہ بھری ہوئی تھی کیونکہ وجود آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا تجلّیاتِ الٰہیہ کے لیے اتم و اعلیٰ و ارفع و اکمل نمونہ تھا اس لیے ہماری نظریں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے اقتداری خوارق کو کسی درجہ بشریت پر مقرر کرنے سے قاصر ہیں مگر تاہم ہمارا اس پر ایمان ہے کہ اس جگہ بھی اللہ جل شانہ اور اُس کے رسولِ کریم کے فعل میں مخفی طور پر کچھ فرق ضرور ہوگا۔

اب ان تحریرات سے ہماری غرض اس قدر ہے کہ لقا کا مرتبہ جب کسی انسان کو میسر آتا ہے تو اُس مرتبہ کی تموّج کے اوقات میں الٰہی کام ضرور اُس سے صادر ہوتے ہیں اور ایسے شخص کی گہری صحبت میں جو شخص ایک حصہ عمر کا بسر کرے تو ضرور کچھ نہ کچھ یہ اقتداری خوارق مشاہدہ کرے گا کیونکہ اس تموج کی حالت میں کچھ

الٰہی صفات کا رنگ ظلّی طور پر انسان میں آجاتا ہے یہاں تک کہ اس کا رحم خدا تعالیٰ کا رحم اور اس کا غضب خدا تعالیٰ کا غضب ہو جاتا ہے اور بسا اوقات وہ بغیر کسی دعا کے کہتا ہے کہ فلاں چیز پیدا ہو جائے تو وہ پیدا ہو جاتی ہے اور کسی پر غضب کی نظر سے دیکھتا ہے تو اُس پر کوئی وبال نازل ہو جاتا ہے اور کسی کو رحمت کی نظر سے دیکھتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک مورد رحم ہو جاتا ہے اور جیسا کہ خدا تعالیٰ کا کُن دائمی طور پر نتیجہ مقصودہ کو بلا تخلف پیدا کرتا ہے ایسا ہی اِس کا کُن بھی اُس تموّج اور مدّ کی حالت میں خطا نہیں جاتا۔ اور جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ان اقتداری خوارق کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ یہ شخص شدت اتصال کی وجہ سے خدائے عزّ وجل کے رنگ سے ظلّی طور پر رنگین ہو جاتا ہے اور تجلیات الٰہیہ اُس پر دائمی قبضہ کر لیتے ہیں اور محبوب حقیقی حجب حائلہ کو درمیان سے اُٹھا کر نہایت شدید قرب کی وجہ سے ہم آغوش ہو جاتا ہے اور جیسا کہ وہ خود مبارک ہے ایسا ہی اِس کے اقوال و افعال و حرکات اور سکنات اور خوراک اور پوشاک اور مکان اور زمان اور اس کے جمیع لوازم میں برکت رکھ دیتا ہے تب ہر یک چیز جو اس سے مسّ کرتی ہے بغیر اِس کے جو یہ دعا کرے برکت پاتی ہے اس کے مکان میں برکت ہوتی ہے اس کے دروازوں کے آستانے برکت سے بھرے ہوتے ہیں اس کے گھر کے دروازوں پر برکت برستی ہے جو ہر دم اِس کو مشاہدہ ہوتی ہے اور اُس کی خوشبو اس کو آتی ہے جب یہ سفر کرے تو خدا تعالیٰ مع اپنی تمام برکتوں کے اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب یہ گھر میں آوے تو ایک دریا نور کا ساتھ لاتا ہے غرض یہ عجیب انسان ہوتا ہے جس کی کُنہ بجز خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔

اِس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ فنا فی اللہ کے درجہ کے تحقق کے بعد یعنی اُس درجہ کے بعد جو اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ کے مفہوم کو لازم ہے جس کو صوفی فنا کے نام سے اور قرآن کریم استقامت کے اسم سے موسوم کرتا ہے درجہ بقا اور لقا کا بلا توقف پیچھے آنے والا ہے یعنی جبکہ انسان خلق اور ہوا اور ارادہ سے بکلی خالی ہو کر فنا کی حالت کو پہنچ گیا تو اس حالت کے راسخ ہونے کے ساتھ ہی بقا کا درجہ شروع ہو جاتا ہے مگر جب تک یہ حالت راسخ نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف بکلی جھک جانا ایک طبعی امر نہ ٹھہر جائے تب تک مرتبہ بقا کا پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ مرتبہ صرف اُسی وقت پیدا ہو گا کہ جب ہر یک اطاعت کا تصنع درمیان سے اُٹھ جائے اور ایک طبعی روئیدگی کی طرح فرماں برداری کی سرسبز اور لہراتی ہوئی شاخیں دل سے جوش مار کر نکلیں اور واقعی طور پر سب کچھ جو اپنا سمجھا جاتا ہے خدا تعالیٰ کا ہو جائے اور جیسے دوسرے لوگ ہوا پرستی میں لذّت اُٹھاتے ہیں اُس شخص کی تمام کامل لذّتیں پرستش اور یاد الٰہی میں ہوں۔ اور بجائے نفسانی ارادوں کے خدا تعالیٰ کی مرضیات جگہ پکڑ لیں۔

پھر جب یہ بقا کی حالت بخوبی استحکام پکڑ جائے اور سالک کے رگ و ریشہ میں داخل ہو جائے اور اُس کا جزو وجود بن جائے اور ایک نور آسمان سے اُترتا ہوا دکھائی دے جس کے نازل ہونے کے ساتھ ہی تمام پردے دور ہو جائیں اور نہایت

لطیف اور شیریں اور حلاوت سے ملی ہوئی ایک محبت دل میں پیدا ہو جو پہلے نہیں تھی اور ایک ایسی خنکی اور اطمینان اور سکینت اور سرور دل کو محسوس ہو کہ جیسے ایک نہایت پیارے دوست مدت کے بچھڑے ہوئے کی یک دفعہ ملنے اور بغلگیر ہونے سے محسوس ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کے روشن اور لذیذ اور مبارک اور سرور بخش اور فصیح اور معطر اور مبشرانہ کلمات اُٹھتے اور بیٹھتے اور سوتے اور جاگتے اِس طرح پر نازل ہونے شروع ہو جائیں کہ جیسے ایک ٹھنڈی اور دلکش اور پُر خوشبو ہوا ایک گلزار پر گذر کر آتی اور صبح کے وقت چلنی شروع ہوتی اور اپنے ساتھ ایک سُکر اور سُرور لاتی ہے۔ اور انسان خدا تعالیٰ کی طرف ایسا کھینچا جائے کہ بغیر اُس کی محبت اور عاشقانہ تصور کے جی نہ سکے اور نہ یہ کہ مال اور جان اور عزّت اور اولاد اور جو کچھ اس کا ہے قربان کرنے کے لیے طیار ہو بلکہ اپنے دل میں قربان کر ہی چکا ہو اور ایسی ایک زبردست کشش سے کھینچا گیا ہو جو نہیں جانتا کہ اُسے کیا ہو گیا اور نورانیت کا بشدت اپنے اندر انتشار پاوے جیسا کہ دن چڑھا ہوا ہوتا ہے اور صدق اور محبت اور وفا کی نہریں بڑے زور سے چلتی ہوئی اپنے اندر مشاہدہ کرے اور لحظہ بہ لحظہ ایسا احساس کرتا ہو کہ گویا خدا تعالیٰ اُس کے قلب پر اُترا ہوا ہے۔ جب یہ حالت اپنی تمام علامتوں کے ساتھ محسوس ہو تب خوشی کرو اور محبوب حقیقی کا شکر بجا لاؤ کہ یہی وہ انتہائی مقام ہے جس کا نام لقا رکھا گیا ہے۔

اِس آخری مقام میں انسان ایسا احساس کرتا ہے کہ گویا بہت سے پاک پانیوں سے اُس کو دھو کر اور نفسانیت کا بکلی رگ و ریشہ اُس سے الگ کر کے نئے سرے اُس کو پیدا کیا گیا اور پھر رب العالمین کا تخت اُس کے اندر بچھایا گیا اور خدائے پاک و قدوس کا چمکتا ہوا چہرہ اپنے تمام دلکش حسن و جمال کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اُس کے سامنے موجود ہو گیا ہے مگر ساتھ اس کے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دونوں آخری درجہ بقا اور لقا کے کسبی نہیں ہیں بلکہ وہبی ہیں اور کسب اور جد و جہد کی حد صرف فنا کے درجہ تک ہے اور اسی حد تک تمام راستباز سالکوں کا سیر و سلوک ختم ہوتا ہے اور دائرہ کمالات انسانیہ کا اپنے استدارت تامہ کو پہنچتا ہے اور جب اِس درجہ فنا کو پاک باطن لوگ جیسا کہ چاہیئے طے کر چکتے ہیں تو عادت الہیہ اسی طرح پر جاری ہے کہ یک دفعہ عنایت الٰہی کی نسیم چل کر بقا اور لقا کے درجہ تک اُنہیں پہنچا دیتی ہے۔

اب اِس تحقیق سے ظاہر ہے کہ اِس سفر کی تمام صعوبتیں اور مشقتیں فنا کی حد تک ہی ہیں اور پھر اِس سے آگے گذر کر انسان کی سعی اور کوشش اور مشقت اور محنت کو دخل نہیں بلکہ وہ محبت صافیہ جو فنا کی حالت میں خداوند کریم و جلیل سے پیدا ہوتی ہے الٰہی محبت کا خود بخود اُس پر ایک نمایاں شعلہ پڑتا ہے جس کو مرتبہ بقا اور لقا سے تعبیر کرتے ہیں اور جب محبّتِ الٰہی بندہ کی محبت پر نازل ہوتی ہے تب دونوں محبّتوں کے ملنے سے رُوح القدس کا ایک روشن اور کامل سایہ انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے اور لقا کے مرتبہ پر اُس رُوح القدس کی روشنی نہایت ہی نمایاں ہوتی ہے اور اقتداری خوارق جن کا ابھی ہم ذکر کر آئے ہیں اسی وجہ سے ایسے لوگوں سے صادر ہوتے ہیں کہ یہ روح القدس کی روشنی ہر وقت اور ہر حال میں اُن کے شامل حال ہوتی ہے اور اُن کے اندر سکونت رکھتی ہے اور وہ اُس روشنی سے کبھی اور

کسی حال میں جدا نہیں ہوتے اور نہ وہ روشنی اُن سے جدا ہوتی ہے۔ وہ روشنی ہر دم اُن کے تنفس کے ساتھ نکلتی ہے اور اُن کی نظر کے ساتھ ہر یک چیز پر پڑتی ہے۔ اور اُن کے کلام کے ساتھ اپنی نورانیت لوگوں کو دکھلاتی ہے اُسی روشنی کا نام رُوح القدس ہے مگر یہ حقیقی رُوح القدس نہیں حقیقی روح القدس وہ ہے جو آسمان پر ہے یہ روح القدس اُس کا ظل ہے جو پاک سینوں اور دلوں اور دماغوں میں ہمیشہ کے لیے آباد ہو جاتا ہے اور ایک طرفۃ العین کے لیے بھی اُن سے جُدا نہیں ہوتا اور جو شخص تجویز کرتا ہے کہ یہ روح القدس کسی وقت اپنی تمام تاثیرات کے ساتھ اُن سے جدا ہو جاتا ہے وہ شخص سراسر باطل پر ہے اور اپنے پُرظلمت خیال سے خدا تعالیٰ کے مقدس برگزیدوں کی توہین کرتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ حقیقی روح القدس تو اپنے مقام پر ہی رہتا ہے لیکن روح القدس کا سایہ جس کا نام مجازاً روح القدس ہی رکھا جاتا ہے اُن سینوں اور دلوں اور دماغوں اور تمام اعضا میں داخل ہوتا ہے جو مرتبہ بقا اور لقا کا پا کر اس لائق ٹھہر جاتے ہیں کہ ان کی نہایت اصفیٰ اور اجلیٰ محبت پر خدا تعالیٰ کی کامل محبت اپنی برکات کے ساتھ نازل ہو۔ اور جب وہ روح القدس نازل ہوتا ہے تو اُس انسان کے وجود سے ایسا تعلق پکڑ جاتا ہے کہ جیسے جان کا تعلق جسم سے ہوتا ہے وُہ قوت بینائی بن کر آنکھوں میں کام دیتا ہے اور قوت شنوائی کا جامہ پہن کر کانوں کو روحانی حس بخشتا ہے وہ زبان کی گویائی اور دل کے تقویٰ اور دماغ کی ہشیاری بن جاتا ہے اور ہاتھوں میں بھی سرایت کرتا ہے اور پیروں میں بھی اپنا اثر پہنچاتا ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۷۳-۵۷)

نجات یافتہ وُہ شخص ہے جو اپنے وجود کو خدا کے لیے اور خُدا کی راہ میں قربانی کی طرح رکھ دے اور نہ صرف نیّت سے بلکہ نیک کاموں سے اپنے صدق کو دکھلاوے جو شخص ایسا کرے اس کا بدلہ خُدا کے نزدیک مقرّر ہو چکا اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۸۸)

ہماری استقامت یہ ہے کہ جیسا کہ وُہ فرماتا ہے کہ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ یعنی یہ کہ قربانی کی طرح میرے آگے گردن رکھ دو ایسا ہی ہم اس وقت درجہ استقامت حاصل کریں گے کہ جب ہمارے وجود کے تمام پُرزے اور ہمارے نفس کی تمام قوّتیں اسی کے کام میں لگ جائیں اور ہماری موت اور ہماری زندگی اسی کے لیے ہو جائے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۱)

اِنسان کا اپنی ذات کو اپنے تمام قویٰ کے ساتھ خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دینا اور پھر اپنی معرفت کو احسان کی حد تک پہنچا دینا یعنی ایسا پردہ غفلت درمیان سے اُٹھانا کہ گویا خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یہی اسلام ہے پس ایک شخص کو مسلمان اُس وقت کہہ سکتے ہیں کہ جب یہ تمام قوتیں اُس کی خدا تعالیٰ کی راہ میں لگ جائیں اور اُس کے زیر حکم واجب طور پر اپنے اپنے محل پر مستعمل ہوں اور کوئی قوت بھی اپنی خود روی سے نہ چلے یہ تو ظاہر ہے کہ نئی زندگی کامل تبدیلی سے ملتی ہے اور کامل تبدیلی ہرگز ممکن نہیں جب تک انسان کی تمام قوتیں جو اُس کی انسانیت کا نچوڑ اور لب لباب ہیں اطاعت الٰہی

کے نیچے نہ آجائیں اور جب تمام قوتیں اطاعت الٰہی کے نیچے آگئیں اور اپنے نیچرل خواص کے ساتھ خط استقامت پر چلنے لگیں تو ایسے شخص کا نام مسلمان ہوگا۔ (ست بچن صفحہ ۱۴۷-۱۴۸)

وَجْهُهٗ کے اصل معنی لغت کی رو سے مُنہ کے ہیں چونکہ انسان مُنہ سے شناخت کیا جاتا ہے اور کروڑہا انسانوں میں مابہ الامتیاز مُنہ سے قائم ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں منہ سے مراد استعارہ کے طور پر انسان کی ذات اور اُس کی قوتیں ہیں جن کی رو سے وہ دوسرے جانوروں سے امتیاز رکھتا ہے گویا وہ قوتیں اس کی انسانیت کا مُنہ ہے۔

(ست بچن صفحہ ۱۴۷ حاشیہ)

جو شخص اپنے وجود کو خُدا کے آگے رکھ دے اور اپنی زندگی اُس کی راہوں میں وقف کرے اور نیکی کرنے میں سرگرم ہو سو وہ سرچشمہ قُرب الٰہی سے اپنا اجر پائیگا۔ اور ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم۔ یعنی جو شخص اپنے تمام قُویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دے اور خالص خُدا کے لیے اُس کا قول اور فعل اور حرکت اور سکون اور تمام زندگی ہوجائے اور حقیقی نیکی کے بجالانے میں سرگرم رہے سو اُس کو خُدا اپنے پاس سے اجر دیگا اور خوف اور حُزن سے نجات بخشے گا۔

یاد رہے کہ یہی اسلام کا لفظ کہ اس جگہ بیان ہوا ہے دوسرے لفظوں میں قرآن شریف میں اس کا نام استقامت رکھا ہے جیسا کہ وہ یہ دُعا سکھلاتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[1] یعنی ہمیں استقامت کی راہ پر قائم کر اُن لوگوں کی راہ جنہوں نے تجھ سے انعام پایا اور جن پر آسمانی دروازے کھلے۔ واضح رہے کہ ہر ایک چیز کی وضع استقامت اُس کی علت غائی پر نظر کر کے سمجھی جاتی ہے۔ اور انسان کے وجود کی علت غائی یہ ہے کہ نوع انسان خدا کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ پس انسانی وضع استقامت یہ ہے کہ جیسا کہ وہ اطاعت ابدی کے لیے پیدا کیا گیا ہے ایسا ہی درحقیقت خُدا کے لیے ہوجائے۔ اور جب وہ اپنے تمام قُویٰ سے خدا کے لیے ہوجائے گا تو بلاشبہ اُس پر انعام نازل ہوگا جس کو دوسرے لفظوں میں پاک زندگی کہہ سکتے ہیں۔

(سراجدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۱۸-۱۹)

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ یعنی اسلام کے دو ٹکڑے ہیں ایک یہ کہ خدا کی رضا میں ایسا محو ہوجانا کہ اپنی رضا چھوڑ کر اُس کی رضا جوئی کے لیے اُس کے آستانہ پر سر رکھ دینا اور دوسرے عام طور پر تمام بنی نوع انسان سے نیکی کرنا۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲)

مسلمان وہی ہے جو اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کا مصداق ہوگیا ہو۔ وجہ مونہہ کو کہتے ہیں۔ مگر اُس کا اطلاق ذات اور وجود پر بھی ہوتا ہے۔ پس جس نے ساری طاقتیں اللہ کے حضور رکھ دی ہوں وہی سچا مسلمان کہلانے کا مستحق ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۷۹-۸۰)

---

[1] الفاتحۃ: ۶، ۷۔

سچا اسلام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی ساری طاقتوں اور قوتوں کو مادام الحیات وقف کر دے تاکہ وہ حیات طیبہ کا وارث ہو۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ اس للّٰہی وقف کی طرف ایما کر کے فرماتا ہے مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اس جگہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کے معنے یہی ہیں کہ ایک نیستی اور تذلل کا لباس پہن کر آستانہ الوہیت پر گرے اور اپنی جان، مال، آبرو، غرض جو کچھ اس کے پاس ہے خدا ہی کے لیے وقف کرے۔ اور دنیا اور اس کی ساری چیزیں دین کی خادم بنا دے کوئی یہ نہ سمجھ لیوے کہ انسان دنیا سے کچھ غرض اور واسطہ ہی نہ رکھے میرا یہ مطلب نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ دنیا کے حصول سے منع کرتا ہے بلکہ اسلام نے رہبانیت کو منع فرمایا ہے یہ بزدلوں کا کام ہے۔ مومن کے تعلقات دنیا کے ساتھ جس قدر وسیع ہوں وہ اس کے مراتب عالیہ کا موجب ہوتے ہیں کیونکہ اس کے نصب العین دین ہوتا ہے اور دنیا (اور) اس کا مال و جاہ دین کا خادم ہوتا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ دنیا مقصود بالذات نہ ہو بلکہ حصول دنیا میں اصل غرض دین ہو اور ایسے طور پر دنیا کو حاصل کیا جاوے کہ وہ دین کی خادم ہو۔ جیسے انسان کسی جگہ سے دوسری جگہ جانے کے واسطے سفر کے لیے سواری یا اور زادِ راہ کو ساتھ لیتا ہے تو اس کی اصل غرض منزل مقصود پر پہنچنا ہوتا ہے نہ خود سواری اور راستہ کی ضروریات۔ اسی طرح پر انسان دنیا کو حاصل کرے مگر دین کا خادم سمجھ کر۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۲۹ مؤرخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

انسان کو ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی زندگی کو وقف کرے۔ مَیں نے بعض اخبارات میں پڑھا ہے کہ فلاں آریہ نے اپنی زندگی آریہ سماج کے لیے وقف کر دی ہے اور فلاں پادری نے اپنی عمر مشن کو دیدی ہے مجھے حیرت آتی ہے کہ کیوں مسلمان اسلام کی خدمت کے لیے اور خدا کی راہ میں اپنی زندگی کو وقف نہیں کر دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ پر نظر کر کے دیکھیں تو اُن کو معلوم ہو کہ کس طرح اسلام کی زندگی کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی جاتی تھیں۔ یاد رکھو یہ خسارہ کا سودا نہیں ہے بلکہ بے قیاس نفع کا سودا ہے کاش مسلمانوں کو معلوم ہوتا اور اس تجارت کے مفاد اور منافع پر ان کو اطلاع ملتی جو خدا کے لیے اُس کے دین کی خاطر اپنی زندگی وقف کرتا ہے کیا وہ اپنی زندگی کھوتا ہے؟ ہرگز نہیں فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اس للّٰہی وقف کا اجر اُن کا رب دینے والا ہے۔ یہ وقف ہر قسم کے ہموم و غموم سے نجات اور رہائی بخشنے والا ہے.....

میں خود جو اس راہ کا پورا تجربہ کار ہوں اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور فیض سے میں نے اس راحت اور لذت سے حظ اُٹھایا ہے یہی آرزو رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کے لیے اگر مر کے پھر زندہ ہوں اور پھر مروں اور زندہ ہوں تو ہر بار میرا شوق ایک لذت کے ساتھ بڑھتا ہی جاوے۔

پس میں چونکہ خود تجربہ کار ہوں اور تجربہ کر چکا ہوں اور اس وقف کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ جوش عطا

فرمایا ہے کہ اگر مجھے یہ بھی کہہ دیا جاوے کہ اس وقف میں کوئی ثواب اور فائدہ نہیں ہے بلکہ تکلیف اور دُکھ ہوگا تب بھی میں اسلام کی خدمت سے رُک نہیں سکتا۔ (الحکم جلد ۴ ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳-۴)

اسلام اللہ تعالیٰ کے تمام تصرفات کے نیچے آجانے کا نام ہے اور اس کا خلاصہ خدا کی سچی اور کامل اطاعت ہے۔ مسلمان وہ ہے جو اپنا سارا وجود خدا تعالیٰ کے حضور رکھ دیتا ہے بدون کسی امید پاداش کے مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔ (الحکم جلد ۶ ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اسلام کی فتح حقیقی اس میں ہے۔ کہ جیسے اسلام کے لفظ کا مفہوم ہے۔ اُسی طرح ہم اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کے حوالہ کردیں۔ اور اپنے نفس اور اس کے جذبات سے بکلّی خالی ہوجائیں۔ اور کوئی بُت ہوا اور ارادہ اور مخلوق پرستی کا ہماری راہ میں نہ رہے۔ اور بکلّی مرضیات الٰہیہ میں محو ہوجائیں۔ اور بعد اس فنا کے وہ بقا ہم کو حاصل ہوجائے۔ جو ہماری بصیرت کو ایک دوسرا رنگ بخشے۔ اور ہماری معرفت کو ایک نئی نورانیت عطا کرے۔ اور ہماری محبت میں ایک جدید جوش پیدا کرے۔ اور ہم ایک نئے آدمی ہوجائیں۔ اور ہمارا وہ قدیم خدا بھی ہمارے لیے ایک نیا خدا ہوجائے۔ یہی فتح حقیقی ہے جس کے کئی شعبوں میں سے ایک شعبہ مکالمات الٰہیہ بھی ہیں۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳ الحقہ جلد دوم)

مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے اور نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لیے قائم ہوجاوے۔ گویا اس کے قویٰ خدا تعالیٰ کے لیے مرجاتے ہیں گویا وہ اس کی راہ میں ذبح ہوجاتا ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اس اسلام کا نمونہ دکھلایا کہ ارادہ الٰہی کی بجا آوری میں اپنے نفس کو ذرا بھی دخل نہ دیا اور ایک ذرا سے اشارہ سے بیٹے کو ذبح کرنا شروع کردیا۔ (البدر جلد ۲ ۴۳ مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۴)

لا الہ الا اللہ ایک قول ہے اس کا عملی ثبوت بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فعل ہے نرا قول (ایمان کا دعویٰ) کسی کام کا نہیں اور نہ ہی وہ کچھ مفید ہوسکتا ہے۔ خشک ایمان ایک بے بال و پر مرغ کی مثال ہے جو ایک مضغہ گوشت ہے جو نہ چل پھر سکتا ہے نہ اُڑنے کی اس میں طاقت ہے۔ بلکہ اسلام اس کو کہتے ہیں کہ انسان باوجود ہیبتناک نظارے دیکھنے اور اس امر کا یقین ہونے کے کہ اس مقام پر کھڑا ہونا ہی گویا جان کو خطرہ میں ڈالنا ہے پھر بھی خدا کی راہ میں سر ڈال دے اور خدا کی راہ میں اپنے کسی نقصان کی پرواہ نہ کرے جنگ کے موقع پر سپاہی جانتا ہے کہ میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں اور اُسے بہ نسبت زندہ پھرنے کے مرنا یقینی نظر آتا ہے مگر با ایں ہمہ وہ اپنے افسر کی فرماں برداری اور وفاداری کرکے آگے ہی بڑھتا ہے۔ اور کسی خطرے کی پرواہ نہیں کرتا اس کا نام اسلام ہے۔ غرض ایک فقرہ (لا الہ الا اللہ) میں تو اللہ تعالیٰ نے توحید سکھائی ہے اور دوسرے (مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ) میں یہ سکھایا کہ اس توحید پر سچے اور زندہ ایمان کا ثبوت اپنے اس فعل سے دو اور خدا کی راہ میں اپنی گردن ڈال دو۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۲ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

یہ دونوں سلسلے کہ کبھی انسان تکالیف شرعیّہ کی پابندی کر کے اپنے ہاتھوں اور کبھی قضا و قدر کے آگے گردن جھکاتا ہے اس واسطے ہیں کہ انسان کی تکمیل ہو جاوے۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی اسلام کیا ہے؟ یہی کہ اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے حصول کے واسطے گردن ڈال دینا ابتلاؤں کا ہیبت ناک نظارہ لڑائی میں ننگی تلواروں کی چمک اور کھٹا کھٹ کی طرح آنکھوں کے سامنے موجود ہے جان جانے کا اندیشہ ہے۔ مگر کسی بات کی پرواہ نہ کر کے خدا کے واسطے یہ سب کچھ اپنے نفس پر وارد کر لینا یہ ہے اسلام کی تعلیم کی.... لب لباب۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

اور اُس سے اُور کون ظالم تر ہے کہ جو خدا کی مسجدوں کو اس بات سے روکے کہ اُن میں ذکر الٰہی کیا جائے اور مسجدوں کے خراب اور منہدم کرنے میں کوشش کرے۔ یہ عیسائیوں کی بدچلنی اور مفسدانہ حرکت کا حال بتلایا ہے جنہوں نے بیت المقدس کا کچھ پاس نہ کیا اور اُسے متکبّرانہ جوش میں آکر منہدم کیا اور بعد اس آیت کے فرمایا کہ جن عیسائیوں نے ایسی شوخی کی اُن کو دُنیا میں رسوائی درپیش ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جس طرف تم مُنہ کرو اُسی طرف خدا کا مُنہ پاؤ گے۔ (نسیم دعوت صفحہ ۸۴)

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ فرماتا ہے۔ کہ جدھر مُنہ پھیرو اُدھر ہی خُدا ہے۔

(شحنہ حق صفحہ ۵۴)

فرمایا۔

اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۶۶)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى - کہہ ہدایت وہی ہے جو خدا کی ہدایت ہے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم ص۵۱۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

مداہنہ کی انتہا یہی ہوا کرتی ہے کہ آخر اُسی قوم کا انسان کو بننا پڑتا ہے قرآن شریف میں اسی لیے ہے لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ دوسرے کو راضی کرنے کے لیے انسان کو اس کے مذہب کو بھی اچھا کہنا پڑتا ہے اسی لیے مداہنہ سے مومن کو پرہیز کرنا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى - اور ابراہیم کے مقام سے نماز کی جگہ پکڑو - اس جگہ مقام ابراہیم سے اخلاقِ مرضیّہ و معاملہ باللہ مُراد ہے یعنی محبّتِ الٰہیّہ اور تفویض اور رضا اور وفا یہی حقیقی مقام ابراہیم کا ہے جو اُمّتِ محمدیّہ کو بطور تبعیّت و وراثت عطا ہوتا ہے اور جو شخص قلب ابراہیم پر مخلوق ہے - اُس کی اتباع بھی اسی میں ہے۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم ص۵۱۰ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

تم اپنی نماز گاہ ابراہیم کے قدموں کی جگہ بناؤ یعنی کامل پیروی کرو تا نجات پاؤ۔ (اربعین نمبر ۳ صفحہ ۳۱)

یہ ابراہیم جو بھیجا گیا تم اپنی عبادتوں اور عقیدوں کو اس کی طرز پر بجا لاؤ اور ہر ایک امر میں اس کے

نمونہ پر اپنے تئیں بناؤ۔ (اربعین ۳ صفحہ ۱۳)

آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى - اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب امت محمدیہ میں بہت فرقے ہو جائیں گے تب آخر زمانہ میں ایک ابراہیم پیدا ہوگا اور ان سب فرقوں میں وہ فرقہ نجات پائے گا کہ اس ابراہیم کا پیرو ہوگا۔ (اربعین ۳ صفحہ ۳۲)

(۱۳۲) اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنی جماعت کو وصیت کروں اور یہ بات پہنچا دوں آئندہ ہر ایک کا اختیار ہے کہ وہ اسے سنے یا نہ سنے کہ اگر کوئی نجات چاہتا ہے اور حیات طیبہ اور ابدی زندگی کا طلب گار ہے تو وہ اللہ کے لیے اپنی زندگی وقف کرے اور ہر ایک اس کوشش اور فکر میں لگ جاوے کہ وہ اس درجہ اور مرتبہ کو حاصل کرے کہ کہہ سکے کہ میری زندگی میری موت میری قربانیاں میری نمازیں اللہ ہی کے لیے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی طرح اس کی روح بول اٹھے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ جب تک انسان خدا میں کھویا نہیں جاتا خدا میں ہو کر نہیں مرتا وہ نئی زندگی پا نہیں سکتا۔ پس تم جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہو تم دیکھتے ہو کہ خدا کے لیے زندگی کا وقف میں اپنی زندگی کی اصل اور غرض سمجھتا ہوں پھر تم اپنے اندر دیکھو کہ تم میں سے کتنے ہیں جو میرے اس فعل کو اپنے لیے پسند کرتے اور خدا کے لیے زندگی وقف کرنے کو عزیز رکھتے ہیں۔ (الحکم جلد ۴ صفحہ ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

(۱۳۳) وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ ۝

دیکھو دنیا چند روزہ ہے اور آگے پیچھے سب مرنے والے ہیں۔ قبریں منہ کھولے ہوئے آوازیں مار رہی ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی نوبت پر جا داخل ہوتا ہے عمر ایسی بے اعتبار اور زندگی ایسی ناپائدار ہے کہ چھ ماہ اور تین ماہ تک زندہ رہنے کی امید کیسی اتنی بھی امید اور یقین نہیں کہ ایک قدم کے بعد دوسرے قدم اٹھانے تک زندہ رہیں گے یا نہیں پھر جب یہ حال ہے کہ موت کی گھڑی کا علم نہیں اور یہ پکی بات ہے کہ وہ یقینی ہے ٹلنے والی نہیں تو دانشمند انسان کا فرض ہے کہ ہر وقت اس کے لیے طیار رہے اسی لیے قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہر وقت جب تک انسان خدا تعالیٰ سے اپنا معاملہ صاف نہ رکھے اور ان ہر دو حقوق کی پوری تکمیل نہ کرے بات نہیں بنتی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ حقوق (عباد) بھی دو قسم کے ہیں ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق عباد۔ اور حقوق

عباد بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جو دینی بھائی ہو گئے ہیں خواہ وہ بھائی ہے یا باپ ہے یا بیٹا مگر ان سب میں ایک دینی اخوت ہے اور ایک عام بنی نوع انسان سے سچی ہمدردی۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے بڑا حق یہی ہے کہ اُسی کی عبادت کی جاوے اور یہ عبادت کسی غرض ذاتی پر مبنی نہ ہو بلکہ اگر دوزخ اور بہشت نہ بھی ہوں تب بھی اس کی عبادت کی جاوے اور اُس ذاتی محبت میں جو مخلوق کو اپنے خالق سے ہونی چاہیئے کوئی فرق نہ آوے۔ اس لیے ان حقوق میں دوزخ اور بہشت کا سوال نہیں ہونا چاہیئے بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی میں میرا یہ مذہب ہے کہ جب تک دشمن کے لیے دعا نہ کی جاوے پورے طور پر سینہ صاف نہیں ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

یعنی اس وقت سے جتنے پیغمبر پہلے ہوئے ہیں یہ ایک گروہ تھا جو فوت ہو گیا ان کے اعمال ان کے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے اور ان کے کاموں سے تم نہیں پوچھے جاؤ گے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۰۱)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

یعنی اے مسلمانو! تم اس طرح پر ایمان لاؤ۔ اور یہ کہو۔ کہ ہم اس خدا پر ایمان لائے جس کا نام اللہ ہے۔ یعنی جیسا کہ قرآن شریف میں اس کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ وہ جامع تمام صفات کاملہ کا ہے اور تمام عیبوں سے پاک ہے۔ اور ہم خدا کے اس کلام پر ایمان لائے۔ جو ہم پر نازل ہوا یعنی قرآن شریف پر۔ اور ہم خدا کی اس

کلام پر بھی ایمان لائے۔ جو ابراہیم نبی پر نازل ہوا تھا۔ اور ہم خدا کے اس کلام پر ایمان لائے جو اسمٰعیل نبی پر نازل ہوا تھا۔ اور اُس کلام خدا پر ایمان لائے۔ جو اسحاق نبی پر نازل ہوا تھا۔ اور اُس کلام خدا پر ایمان لائے۔ جو یعقوب نبی پر نازل ہوا تھا اور اُس کلام خدا پر ایمان لائے جو یعقوب نبی کی اولاد پر نازل ہوا تھا۔ اور اُس کلام خدا پر ایمان لائے۔ جو موسیٰ نبی کو دیا گیا تھا۔ اور اُس کلام خدا پر ہم ایمان لائے۔ جو عیسیٰ نبی کو دیا گیا تھا۔ اور ہم اُن تمام کتابوں پر ایمان لائے۔ جو دُنیا کے کل نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھیں۔ یعنی اُس کی طرف سے جس نے کھلے کھُلے طور پر اُن کی ربوبیت کی۔ اور دُنیا پر ثابت کیا کہ وہ اُن کا ناصر اور حامی اور مُربّی ہے۔ خواہ وہ کسی قوم یا کسی ملک میں پیدا ہوئے تھے۔ ہم خدا کے نبیوں میں تفرقہ نہیں ڈالتے۔ جو بعض کو قبول کریں اور بعض کو ردّ کریں۔ بلکہ ہم سب کو قبول کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے دنیا میں آئے۔ اور ہم اس طرح پر جو خدا نے سکھایا ہے۔ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ اور خدا کے آگے اپنی گردن ڈالتے ہیں۔

پس اگر دوسرے لوگ بھی جو اسلام کے مخالف ہیں اسی طرح ایمان لاویں۔ اور کسی نبی کو جو خدا کی طرف سے آیا۔ ردّ نہ کریں۔ تو بلاشبہ وہ بھی ہدایت پا چکے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں اور بعض نبیوں کو مانیں۔ اور بعض کو ردّ کردیں۔ تو انہوں نے سچائی کی مخالفت کی اور خدا کی راہ میں پھوٹ ڈالنی چاہی۔ پس تو یقین رکھ۔ کہ وہ غالب نہیں ہو سکتے۔ اور اُن کو سزا دینے کے لیے خدا کافی ہے۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں۔ خدا سُن رہا ہے۔ اور اُن کی باتیں خدا کے علم سے باہر نہیں۔

(لیکچر مشمولہ چشمہ معرفت ص۵-۶)

اگر وہ ایسا ایمان لائیں جیسا کہ تم ایمان لائے تو وہ ہدایت پا چکے اور اگر ایسا ایمان نہ لاویں تو پھر وہ ایسی قوم ہے کہ جو مخالفت چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اور صلح کی خواہاں نہیں۔ (یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم و پیغام صلح ص۴)

فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اور اُن کی شرارتوں کے دفع کرنے کے لیے خدا تجھے کافی ہے اور وہ سمیع اور علیم ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

خدائے تعالیٰ ان سب کے تدارک کے لیے جو اس کام کو روک رہے ہیں۔ تمہارا مددگار ہوگا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول ص۱۱۶)

[۱۳۹] صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ○

یہ طریق اصطباغ خدا نے تمہیں سکھایا ہے۔ اور یہ خدا کا بپتسمہ ہے اور خدا کے بپتسمہ سے کون سا بپتسمہ بہتر ہو سکتا ہے اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم اُسی خدا کے پرستار ہیں اور اُسی کی پرستش کرتے ہیں۔ (لیکچر مشمولہ چشمہ معرفت ص۶)

یوحنا نبی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالیت و عظمت ظاہر کرنے کے لیے بطور پیشگوئی گواہی دی جو انجیل متی باب سوم میں اِس طرح پر درج ہے (۱۱) میں تو تمہیں توبہ کے لیے پانی سے بپتسما دیتا ہوں لیکن وُہ جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے قوی تر ہے کہ میں اُس کی جوتیاں اُٹھانے کے لائق نہیں وُہ تمہیں روح قُدس اور آگ سے بپتسما دیگا۔ اِس پیشگوئی پر محض نادانی کی راہ سے عیسائی لوگ خصومت کرتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حق میں ہے مگر یہ دعویٰ سراسر باطل و بے بُنیاد ہے اوّل تو حضرت مسیح حضرت یوحنا کے ہمعصر تھے نہ کہ بعد میں آنے والے یا بعد میں ابنیت کا منصب پانے والے۔ ماسوا اِس کے ہر یک شخص آزما سکتا ہے کہ دائمی طور پر سچے طالبوں کو روح قُدس اور آتش محبت سے بپتسما دینے والا آسمان کے نیچے صِرف ایک ہی ہے یعنی جناب سیّدنا و مولانا حضرت محمدّ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم جس کے جلال نام کا حضرت مسیح اپنی پیشگوئیوں میں آپ اقرار کرتے ہیں اور اِسی روح کے بپتسما کی طرف اللہ تعالیٰ نے قُرآن شریف میں اشارہ بھی فرمایا ہے جیساکہ وُہ فرماتا ہے۔ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ[1] یعنی خدائے تعالیٰ مومنوں کو رُوح قُدس سے تائید کرتا ہے اور پھر فرماتا ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ یعنی یہ خُدا کا بپتسما ہے اَور کون سا بپتسما اُس سے بڑھ کر خوبصورت ہے۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۳۶-۲۳۷ حاشیہ)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

اس مبارک امت کے لیے قرآن شریف میں وسط کی ہدایت ہے توریت میں خدا تعالیٰ نے انتقامی امور پر زور

[1] المجادلہ : ۲۳ ۔

دیا تھا اور انجیل میں عفو اور درگذر پر زور دیا تھا اور اس امت کو موقعہ شناسی اور وسط کی تعلیم ملی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا یعنی ہم نے تم کو وسط پر عمل کرنے والے بنایا اور وسط کی تعلیم تمہیں دی سو مبارک وہ جو وسط پر چلتے ہیں خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۲۶)

قرآن شریف کی تعلیم جس پہلو اور جس باب میں دیکھو اپنے اندر حکیمانہ پہلو رکھتی ہے۔ افراط یا تفریط اس میں نہیں ہے بلکہ وہ نقطۂ وسط پر قائم ہوئی ہے اور اسی لیے اس امت کا نام بھی اُمَّۃً وَّسَطًا رکھا گیا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

حفظ مراتب کا مقام قرآن شریف نے رکھا ہے کہ وہ عدل کی طرف لے جاتا ہے تمام احکام میں اس کی یہی صورت ہے مال کی طرف دیکھو نہ ممسک بناتا ہے نہ مسرف یہی وجہ ہے کہ اس امت کا نام ہی اُمَّۃً وَّسَطًا رکھ دیا گیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

خدا نے امت وسط کہا تھا۔ وسط سے مراد میانہ رو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۴)

خدا نے اسلام کو دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ بنایا ہے اس میں ایسی وسطی راہ اختیار کی گئی ہے جو افراط و تفریط سے بالکل خالی ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۱۴۵ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ۝

آپ (مولوی محمد بشیر بھوپالوی) نے جو نون ثقیلہ کا قاعدہ پیش کیا ہے وہ سراسر مخدوش اور باطل ہے حضرت ہر ایک جگہ اور ہر ایک مقام میں نون ثقیلہ کے ملانے سے مضارع استقبال نہیں بن سکتا قرآن کریم کے لیے قرآن کریم کی نظیریں کافی ہیں اگرچہ یہ سچ ہے کہ بعض جگہ قرآن کریم کے مضارعات پر جب نون ثقیلہ ملا ہے تو وہ استقبال کے معنوں پر مستعمل ہوئے ہیں لیکن بعض جگہ ایسی بھی ہیں کہ حال کے معنے قائم رہے ہیں یا حال اور استقبال بلکہ ماضی بھی اشتراکی طور پر ایک سلسلہ متصلہ ممتدہ کی طرح مراد لیے گئے ہیں یعنی ایسا سلسلہ جو حال یا ماضی سے شروع ہوا اور استقبال کی انتہا تک بلا انقطاع برابر چلا گیا۔ پہلی آیات کی نظیر یہ ہے کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے فَلَنُوَلِّیَنَّكَ

قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اب ظاہر ہے کہ اس جگہ حال ہی مراد ہے۔ کیونکہ مجرد نزول آیت کے بغیر توقف اور تراخی کے خانہ کعبہ کی طرف مونہہ پھیرنے کا حکم ہو گیا یہاں تک کہ نماز میں ہی مونہہ پھیر دیا گیا۔ اگر یہ حال نہیں تو پھر حال کس کو کہتے ہیں۔ استقبال تو اس صورت میں ہوتا کہ خبر اور ظہور خبر میں کچھ فاصلہ بھی ہوتا سو آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم تجھ کو اس قبلہ کی طرف پھیرتے ہیں جس پر تو راضی ہے سو تو مسجد حرام کی طرف مُنہ کر۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۲-۳۳)

۱۴۷۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

اگر آنحضرت اُمّی نہ ہوتے تو مخالفینِ اسلام بالخصوص یہودی اور عیسائی جن کو علاوہ اعتقادی مخالفت کے یہ بھی حسد اور بغض دامنگیر تھا کہ بنی اسرائیل میں سے رسول نہیں آیا بلکہ اُن کے بھائیوں میں سے جو بنی اسماعیل ہیں آیا وہ کیونکر ایک صریح امر خلافِ واقعہ پا کر خاموش رہتے بلاشبہ اُن پر یہ بات بکمال درجہ ثابت ہو چکی تھی کہ جو کچھ آنحضرت کے مونہہ سے نکلتا ہے وہ کسی اُمّی اور ناخواندہ کا کام نہیں اور نہ دس بیس آدمیوں کا کام ہے تب ہی تو وہ اپنی جہالت سے اَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ[۲] کہتے تھے اور جو اُن میں سے دانا اور واقعی اہل علم تھے وہ بخوبی معلوم کر چکے تھے کہ قرآن انسانی طاقتوں سے باہر ہے اور اُن پر یقین کا دروازہ ایسا کھل گیا تھا کہ اُن کے حق میں خدا نے فرمایا يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ یعنی اُس نبی کو ایسا شناخت کرتے ہیں کہ جیسا اپنے بیٹوں کو شناخت کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ دروازہ یقین اور معرفت کا کچھ اُن کے لیے ہی نہیں کھلا بلکہ اِس زمانہ میں بھی سب کے لیے کھلا ہے کیونکہ قرآن شریف کی حقّانیت معلوم کرنے کے لیے اب بھی وہی معجزاتِ قرآنیہ اور وہی تاثیراتِ فرقانیہ اور وہی تائیداتِ غیبی اور وہی آیات لاریبی موجود ہیں جو اُس زمانہ میں موجود تھی خدا نے اِس دین قویم کو قائم رکھنا تھا اِس لیے اِس کی سب برکات اور سب آیات قائم رکھی اور عیسائیوں اور یہودیوں اور ہندوؤں کے ادیانِ مُحرّفہ اور باطلہ ناقصہ کا استیصال منظور تھا اِس جہت سے اُن کے ہاتھ صرف قصّے ہی قصے رہ گئے اور برکتِ حقانیّت اور تائیدات سماویہ کا نام ونشان نہ رہا۔ اُن کی کتابیں ایسے نشان بتلا رہی ہیں جن کے ثبوت کا ایک ذرا نشان اُن کے ہاتھ میں نہیں صرف گذشتہ قصّوں کا حوالہ دیا جاتا ہے مگر قرآنِ شریف ایسے نشان پیش کرتا ہے جن کو ہر یک شخص دیکھ سکتا ہے (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۴۹۵ تا ۴۹۸)

حضرت موسٰی کی نسبت اللہ جلشانہ فرماتا ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ[۳] یعنی انہوں نے موسٰی کے نشانوں کا انکار کیا۔ لیکن ان کے دل یقین کر گئے۔ اور ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے

۱۔ البقرۃ: ۱۴۵ ۔ ۲۔ الفرقان: ۵ ۔ ۳۔ النمل: ۱۵

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ یعنی کافر لوگ جو اہل کتاب ہیں ایسے ایسے یقینی طور پر اُس کو شناخت کرتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔ (الحق دہلی ص۳۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت ہزاروں راہب ملہم اور اہل کشف تھے اور نبی آخرالزمان کے قرب ظہور کی بشارت سنایا کرتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے امام الزمان کو جو خاتم الانبیاء تھے قبول نہ کیا تو خدا کے غضب کے صاعقہ نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے تعلقات خدا تعالیٰ سے بکلی ٹوٹ گئے اور جو کچھ ان کے بارے میں قرآن شریف میں لکھا گیا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے حق میں قرآن شریف میں فرمایا گیا وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ[1] اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ سے نصرت دین کے لیے مدد مانگا کرتے تھے۔ اور اُن کو الہام اور کشف ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ یہودی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی تھی خدا تعالیٰ کی نظر سے گر گئے تھے لیکن جب عیسائی مذہب بوجہ مخلوق پرستی کے مر گیا اور اُس میں حقیت اور نورانیت نہ رہی تو اس وقت کے یہود اس گناہ سے بری ہو گئے کہ وہ عیسائی کیوں نہیں ہوتے تب ان میں دوبارہ نورانیت پیدا ہوئی اور اکثر ان میں سے صاحب الہام اور صاحب کشف پیدا ہونے لگے۔ اور ان کے راہبوں میں اچھے اچھے حالات کے لوگ تھے اور وہ ہمیشہ اسبات کا الہام پاتے تھے کہ نبی آخرزمان اور امام دوران جلد پیدا ہوگا اور اسی وجہ سے بعض ربانی علماء خدا تعالیٰ سے الہام پاکر ملک عرب میں آرہے تھے اور ان کے بچہ بچہ کو خبر تھی کہ عنقریب آسمان سے ایک نیا سلسلہ قائم کیا جائیگا یہی معنے اس آیت کے ہیں کہ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ یعنے اس نبی کو وہ ایسی صفائی سے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بچوں کو۔ مگر جبکہ وہ نبی موعود اس پر خدا کا سلام ظاہر ہو گیا تب نخوت دینی اور تعصب نے اکثر راہبوں کو ہلاک کر دیا اور ان کے دل سیاہ ہو گئے۔ مگر بعض سعادت مند مسلمان ہو گئے اور ان کا اسلام اچھا ہوا۔ (ضرورت الامام ص۴۰-۵)

حدیث نبوی يَعْرِفُهُمْ غَيْرِىْ کے معنے جو اس عاجز کے دل میں ڈالے گئے ہیں یہ ہیں۔ کہ غیر کے لفظ سے نفی ماسوا اللہ مراد نہیں۔ بلکہ نفی نا اہل و ناآشنا مراد ہے۔ مگر جو لوگ مومن حقیقی ہیں۔ وہ بباعث استعداد فنا اور زوال حجب کے کبریائی دامن کے اندر ہیں۔ اور غیر نہیں ہیں۔ خود خدا تعالیٰ نے بعض صالح اہل کتاب کے حق میں اپنی کتاب مجید میں یہ فرمایا ہے يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ یعنی وہ لوگ پیغمبر آخرالزمان کو جو امام الانبیاء اور سید الاولیاء ہے۔ اس طرح پر شناخت کرتے ہیں۔ جیسے وہ اپنے بیٹوں کو شناخت کر رہے ہیں۔ اور اسی طرح روحانی روشنی کی برکت سے اولیا اولیا کو شناخت کر لیتے ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اویس کے وجود کو یمن میں شناخت کر لیا۔ اور بارہا آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فرمایا کرتے تھے۔ کہ یمن کی طرف سے رحمان کی خوشبو آرہی ہے۔ اور آنحضرت صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو اپنے صحابہ کے مراتب معلوم تھے اور ہر یک کی نورانیت باطنی

[1] البقرة : ۹۰

کا اندازہ اس قلب منور پر مکشوف تھا۔ ہاں جو لوگ بیگانہ ہیں۔ وہ یگانہ حضرت احدیت کو شناخت نہیں کر سکتے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَھُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ[۱] یعنی وہ تیری طرف (اے پیغمبر صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ) نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ پر تو انہیں نظر نہیں آتا۔ اور وہ تیری صورت کو دیکھ نہیں سکتے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ انوار روحانی کا سخت چمکار ابیگانہ محض پر بھی جا پڑتا ہے۔ جیسے ایک عیسائی نے جبکہ مباہلہ کے لیے آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ معہ حسنین و حضرت علی و فاطمہ رَضِیَ اللہُ عَنۡھُمۡ عیسائیوں کے سامنے آئے۔ دیکھ کر اپنے بھائیوں کو کہا۔ کہ مباہلہ مت کرو۔ مجھ کو پروردگار کی قسم ہے۔ کہ میں ایسے منہ دیکھ رہا ہوں۔ کہ اگر اس پہاڑ کو کہیں گے۔ کہ یہاں سے اُٹھ جا تو فی الفور اُٹھ جائے گا۔ سو خدا جانے کہ اس وقت نور نبوت و ولایت کیسا جلال میں تھا۔ کہ اس کافر بد باطن سیہ دل کو بھی نظر آگیا۔ (مکتوبات احمدیہ جلد اول صفحہ ۵۱-۵۲)

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ○

اس آیت کا سیاق سباق یعنی اگلی پچھلی آیتوں کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ نبوت اور قرآن شریف کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف اس بات کا بیان ہے کہ اب بیت المقدس کی طرف نہیں۔ بلکہ بیت کعبہ کی طرف مُنہ پھیر کر نماز پڑھنی چاہیئے۔ سو اللہ جل شانہ اس آیت میں فرماتا ہے کہ یہ حق بات ہے یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہی نماز پڑھنا حق ہے جو ابتدا سے مقرر ہو چکا ہے اور پہلی کتابوں میں بطور پیشگوئی اس کا بیان بھی ہے سو تو (اے پڑھنے والے اس کتاب کے) اس بارے میں شک کرنے والوں سے مت ہو پھر اس آیت کے آگے بھی اسی مضمون کے متعلق آیتیں ہیں چنانچہ فرماتا ہے وَمِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡھَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ وَاِنَّہٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ[۲] یعنی ہر ایک طرف سے جو تو نکلے تو خانہ کعبہ کی ہی طرف نماز پڑھ یہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے غرض صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام آیات خانہ کعبہ کے بارے میں ہیں نہ کسی اور تذکرہ کے متعلق اور چونکہ یہ حکم جو خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کے لیے صادر ہوا ایک عام حکم ہے جس میں سب مسلمان داخل ہیں لہذا بوجہ عموم منشاء حکم بعض وسوسے والی طبیعتوں کا وسوسہ دور کرنے کے لیے ان آیات میں اُن کو تسلی دی گئی کہ اس بات سے متردد نہ ہوں کہ پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے پڑھتے اب اُس طرف سے ہٹ کر خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنا کیوں شروع کر دیا سو فرمایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ وُہی مقرر شدہ بات ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنے پہلے نبیوں کے ذریعہ سے پہلے ہی سے بتلا رکھا تھا اس میں شک مت کرو۔

دوسری آیت جو معترض نے تبائید دعویٰ خود تحریر کی ہے۔ وہ سورہ انعام کی ایک آیت ہے جو معہ اپنی آیات

---

[۱] - الاعراف : ۱۹۹ ✤ [۲] البقرہ : ۱۵۰ ✤

متعلقہ کے اس طرح پر ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ[۱]۔

یعنی کیا بجز خدا کے میں کوئی اور حکم طلب کروں اور وہ وہی ہے جس نے مفصّل کتاب تم پر اتاری اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی قرآن دیا ہے مراد یہ ہے کہ جن کو ہم نے علم قرآن سمجھایا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ منجانب اللہ ہے سوائے پڑھنے والے تو شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب ان آیات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب اس آیت کے جو فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ہے ایسے لوگ ہیں جو ہنوز یقین اور ایمان اور علم سے کم حصہ رکھتے ہیں بلکہ اوپر کی آیتوں سے یہ بھی کھلتا ہے کہ اس جگہ یہ حکم فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ شروع کی آیت میں جس سے یہ آیت تعلق رکھتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قول ہے یعنی یہ کہ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا۔ سو ان تمام آیات کا با محاورہ ترجمہ یہ ہے کہ میں بجز خدائے تعالیٰ کے کوئی اور حکم جو مجھ میں اور تم میں فیصلہ کرے مقرر نہیں کر سکتا وہ وہی ہے جس نے تم پر مفصل کتاب نازل کی سو جن کو اس کتاب کا علم دیا گیا ہے وہ اس کا منجانب اللہ ہونا خوب جانتے ہیں سو تو (اے بیخبر آدمی) شک کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اب تحقیق سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شک نہیں کرتے بلکہ شک کرنے والوں کو بحوالہ شواہد و دلائل منع فرماتے ہیں پس باوجود ایسے کھلے کھلے بیان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف شک فی الرسالت کو منسوب کرنا بیخبری و بے علمی یا محض تعصب نہیں تو کیا ہے۔

پھر اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر شک کرنے سے بعض ایسے نو مسلم یا متردد منع کیے گئے تھے جو ضعیف الایمان تھے تو اُن کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ تم شک مت کرو نہ یہ کہ تو شک مت کر کیونکہ ضعیف الایمان آدمی صرف ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ کئی ہوتے ہیں بجائے جمع کے واحد مخاطب کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وحدت سے وحدت جنسی مراد ہے جو جماعت کا حکم رکھتی ہے اگر تم اول سے آخر تک قرآن شریف کو پڑھو تو یہ عام محاورہ اس میں پاؤ گے کہ وہ اکثر مقامات میں جماعت کو فرد واحد کی صورت میں مخاطب کرتا ہے مثلاً نمونہ کے طور پر ان آیات کو دیکھو۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ○ وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَا وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا ○ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ○[۲]

[۱] الانعام: ۱۱۵ ۞ [۲] بنی اسرائیل: ۲۳-۲۵ ۞

یعنی خدائے تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدامت ٹھہرا اگر تو نے ایسا کیا تو مذموم اور مخذول ہو کر بیٹھے گا۔ اور تیرے خدا نے یہی چاہا ہے کہ تم اسی کی بندگی کرو اُس کے سوا کوئی اور دوسرا تمہارا معبود نہ ہو اور ماں باپ سے احسان کر اگر وہ دونو یا ایک اُن میں سے تیرے سامنے بڑی عمر تک پہنچ جائیں تو تو اُن کو اُف نہ کہہ اور نہ اُن کو جھڑک بلکہ اُن سے ایسی باتیں کہہ کہ جن میں اُن کی بزرگی اور عظمت پائی جائے اور تذلل اور رحمت سے ان کے سامنے اپنا بازو جھکا اور دعا کر کہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن کے زمانے میں میری پرورش کی۔

اب دیکھو کہ ان آیات میں بہ ہدایت ظاہر ہے کہ یہ واحد کا خطاب جماعت امت کی طرف ہے جن کو بعض دفعہ انہیں آیتوں میں تم کرکے بھی پکارا گیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات میں مخاطب نہیں کیونکہ ان آیتوں میں والدین کی تعظیم و تکریم اور اُن کی نسبت بر و احسان کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین تو صغیر سنی کے زمانے میں بلکہ جناب ممدوح کی شیر خوارگی کے وقت میں ہی فوت ہو چکے تھے سو اس جگہ سے اور نیز ایسے اور مقامات سے بوضاحت ثابت ہوتا ہے کہ جماعت کو واحد کے طور پر مخاطب کرکے پکارنا یہ قرآن شریف کا ایک عام محاورہ ہے کہ جو ابتدا سے آخر تک جابجا ثابت ہوتا چلا جاتا ہے یہی محاورہ توریت کے احکام میں بھی پایا جاتا ہے کہ واحد مخاطب کے لفظ سے حکم صادر کیا جاتا ہے اور مراد بنی اسرائیل کی جماعت ہوتی ہے جیسا کہ خروج باب ۳۳ و ۳۴ میں بظاہر حضرت موسیٰؑ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے۔

(۱۱) آج کے دن میں جو حکم تجھے کرتا ہوں تو اُسے یاد رکھیو۔ (۱۲) ہوشیار رہ تا نہ ہووے کہ اُس زمین کے باشندوں کے ساتھ جس میں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھے (۱۷) تو اپنے لیے ڈھالے ہوئے معبودوں کو مت بنائیو۔

اب ان آیات کا سیاق سباق دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ ان آیات میں حضرت موسیٰؑ مخاطب کیے گئے تھے مگر دراصل حضرت موسیٰؑ کو ان احکام کا نشانہ نہیں بنایا گیا حضرت موسیٰؑ نہ کنعان میں گئے اور نہ بت پرستی جیسا بُرا کام حضرت موسیٰؑ جیسے مرد خدا بت شکن سے ہو سکتا تھا جس سے ان کو منع کیا جاتا کیونکہ موسیٰؑ وہ مقرب اللہ ہے جس کی شان میں اسی باب میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو میری نظر میں منظور رہے اور مَیں تجھ کو بنام پہچانتا ہوں دیکھو خروج آیت (۱۷)۔

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہی طرز قرآن شریف کی ہے توریت اور قرآن شریف میں اکثر احکام اسی شکل سے واقعہ ہیں کہ گویا مخاطب اُن کے حضرت موسیٰؑ اور جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر دراصل وہ خطاب قوم اور اُمت کے لوگوں کی طرف ہوتا ہے لیکن جس کو ان کتابوں کی طرز تحریر معلوم نہیں وہ اپنی بیخبری سے یہی خیال کر لیتا ہے کہ گویا وہ خطاب و عتاب نبی منزل علیہ کو ہو رہا ہے مگر غور اور قرائن پر نظر ڈالنے سے اُس پر کھل جاتا ہے کہ یہ سراسر غلطی ہے۔

پھر یہ اعتراض اُن آیات پر نظر ڈالنے سے بھی بکلی مستاصل ہوتا ہے جن میں اللہ جلّ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین کامل کی تعریف کی ہے جیسا کہ وہ ایک (جگہ) فرماتا ہے قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ [1] (پارہ ۷) یعنی کہہ کہ مجھے اپنی رسالت پر کھلی کھلی دلیل اپنے رب کی طرف سے ملی ہے اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ [2] (پارہ ۱۳) یعنی کہہ کہ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بصیرت کاملہ کے ساتھ بلاتا ہوں اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا [3] (پارہ ۵) یعنی خدا نے تجھ پر کتاب اُتاری اور حکمت یعنی دلائل حقیت کتاب وحقیت رسالت تجھ پر ظاہر کیے اور تجھے وہ علوم سکھائے جنہیں تو خود بخود جان نہیں سکتا تھا اور تجھ پر اُس کا ایک عظیم فضل ہے پھر سورۂ نجم میں فرماتا ہے مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی [4]۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی [5]۔ یعنی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے دل نے جو اپنی صداقت کے آسمانی نشان دیکھے تو اس کی کچھ تکذیب نہ کی یعنی شک نہیں کیا اور آنکھ چپ وراست کی طرف نہیں پھیری اور نہ حد سے آگے بڑھی یعنی حق پر ٹھیر گئی اور اُس نے اپنے خدا کے وہ نشان دیکھے جو نہایت بزرگ تھے۔

اب اے ناظرین ذرا انصافاً دیکھو اے حق پسندو ذرا منصفانہ نگہ سے غور کرو کہ خدائے تعالیٰ کیسے صاف صاف طور پر بشارت دیتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بصیرت کاملہ کے ساتھ اپنی نبوت پر یقین تھا اور عظیم الشان نشان ان کو دکھلائے گئے تھے۔

اب خلاصہ جواب یہ ہے کہ تمام قرآن شریف میں ایک نقطہ یا ایک شعشہ اس بات پر دلالت کرنے والا نہیں پاؤ گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت یا قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کی نسبت کچھ شک تھا بلکہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ جس قدر یقین کامل وبصیرت کامل ومعرفت اکمل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات بابرکات کی نسبت دعویٰ کیا ہے اور پھر اُس کا ثبوت دیا ہے ایسا کامل ثبوت کسی دوسری موجودہ کتاب میں ہرگز نہیں پایا جاتا۔ فَھَلْ مَنْ یَّسْمَعُ فَیُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَیَکُوْنُ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ الْمُخْلِصِیْنَ۔ واضح رہے کہ انجیلوں میں حضرت مسیح کے بعض اقوال ایسے بیان کیے گئے ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنی عمر کے آخری دنوں میں اپنی نبوت اور اپنے مؤیّد من اللہ ہونے کی نسبت کچھ شبہات میں پڑ گئے تھے جیسا کہ یہ کلمہ کہ گویا آخری دم کا کلمہ تھا یعنی ایلی ایلی لما سبقتنی جس کے معنے یہ ہیں کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ عین دنیا سے رخصت ہونے کے وقت میں کہ جو اہل اللہ کے یقین اور ایمان کے انوار ظاہر ہونے کا وقت ہوتا ہے آنجناب کے مُنہ سے نکل گیا۔ پھر آپ کا یہ بھی طریق تھا کہ دشمنوں کے بدارادہ کا

---

[1] الانعام: ۵۸ ✧ [2] یوسف: ۱۰۹ ✧ [3] النساء: ۱۱۴ ✧ [4] النجم: ۱۲ ✧ [5] النجم: ۱۸ و ۱۹ ✧

احساس کرکے اُس جگہ سے بھاگ جایا کرتے تھے حالانکہ خدائے تعالیٰ سے محفوظ رہنے کا وعدہ پاچکے تھے ان دونوں امور سے شک اور تحیر ظاہر ہے پھر آپ کا تمام رات رو رو کر ایسے امر کے لیے دعا کرنا جس کا انجام بد آپ کو پہلے سے معلوم تھا بجز اس کے کیا معنے رکھتا ہے کہ ہر ایک بات میں آپ کو شک ہی شک تھا۔ یہ باتیں صرف عیسائیوں کے اس اعتراض اُٹھانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں ورنہ ان سوالات کا جواب ہم تو احسن طریق سے دے سکتے ہیں اور اپنے پیارے مسیح کے سر سے جو بشری ناتوانیوں اور ضعفوں سے مستثنیٰ نہیں تھے ان تمام الزامات کو صرف ایک نفی الوہیت و ابنیت سے ایک طرفۃ العین میں اٹھا سکتے ہیں مگر ہمارے عیسائی بھائیوں کو بہت دقت پیش آئے گی۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۲-۶)

عرصہ قریباً تین برس کا ہوا ہے کہ بعض تحریکات کی وجہ سے ... خدائے تعالیٰ نے پیشگوئی کے طور پر اس عاجز پر ظاہر فرمایا کہ مرزا احمد بیگ ولد مرزا گاماں بیگ ہوشیار پوری کی دختر کلاں انجام کار تمہارے نکاح میں آئے گی...... اس کے بعد اس عاجز کو ایک سخت بیماری آئی یہاں تک کہ قریب موت کے نوبت پہنچ گئی بلکہ موت کو سامنے دیکھ کر وصیت بھی کردی گئی اس وقت گویا یہ پیشگوئی آنکھوں کے سامنے آگئی اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اب آخری دم ہے اور کل جنازہ نکلنے والا ہے تب میں نے اس پیشگوئی کی نسبت خیال کیا کہ شاید اس کے اور معنے ہونگے جو میں سمجھ نہیں سکا تب اُسی حالت قریب الموت میں مجھے الہام ہوا اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ یعنے یہ بات تیرے رب کی طرف سے سچ ہے تو کیوں شک کرتا ہے سو اس وقت مجھ پر یہ بھید کھلا کہ کیوں خدائے تعالیٰ نے اپنے رسول کریم کو قرآن کریم میں کہا کہ تو شک مت کر سو میں نے سمجھ لیا کہ درحقیقت یہ آیت ایسے ہی نازک وقت سے خاص ہے جیسے یہ وقت تنگی اور نومیدی کا میرے پر ہے اور میرے دل میں یقین ہو گیا کہ جب نبیوں پر بھی ایسا ہی وقت آجاتا ہے جو میرے پر آیا تو خدائے تعالیٰ تازہ یقین دلانے کے لیے اُن کو کہتا ہے کہ تو کیوں شک کرتا ہے اور مصیبت نے تجھے کیوں نومید کر دیا تو نومید مت ہو۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۹۶، ۳۹۸، ۳۹۹)

(۱۴۹) وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

مجرد سبقت کا جوش اپنے اندر بُرا نہیں ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی خیر اور بھلائی کی ہر ایک قسم میں سبقت کرو اور زور مار کر سب سے آگے چلو سو جو شخص نیک وسائل سے خیر میں سبقت کرنا چاہتا ہے وہ درحقیقت حسد کے مفہوم کو پاک صورت میں اپنے اندر رکھتا ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد پنجم صفحہ ۵)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○

یعنی رسولؐ تم کو کتاب اور حکمت اور وہ تمام حقائق اور معارف سکھاتا ہے جن کا خود بخود معلوم کر لینا تمہارے لیے ممکن نہ تھا۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۴۱۷-۴۱۸)

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ○

یعنی تم مجھ کو یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ (ست بچن صفحہ ۸۵ بار دوم)

اور مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ اور میرا شکر کرو اور مجھ سے دعا مانگو۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۸)

اے میرے بندو تم مجھے یاد کیا کرو اور میری یاد میں مصروف رہا کرو میں بھی تم کو نہ بھولوں گا تمہارا خیال رکھونگا اور میرا شکر کیا کرو میرے انعامات کی قدر کیا کرو اور کفر نہ کیا کرو۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الٰہی کے ترک اور اُس سے غفلت کا نام کفر ہے پس جو دم غافل وہ دم کافر والی بات صاف ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

تم مجھ کو یاد رکھو میں تم کو یاد رکھوں گا یعنی آرام اور خوشحالی کے وقت تم مجھ کو یاد رکھو اور میرا قرب حاصل کرو تاکہ مصیبت میں تم کو یاد رکھوں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۲۵)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○

کوشش کرو کہ پاک ہو جاؤ کہ انسان پاک کو تب پاتا ہے کہ خود پاک ہو جاوے مگر تم اس نعمت کو کیونکر پا سکو اس کا جواب خود خدا نے دیا ہے جہاں قرآن میں فرماتا ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ[1] یعنی نماز اور صبر کے ساتھ خدا سے مدد چاہو نماز کیا چیز ہے وُہ دعا ہے جو تسبیح تحمید تقدیس اور استغفار اور درود کے ساتھ تضرّع سے مانگی جاتی ہے سو جب تم نماز پڑھو تو بے خبر لوگوں کی طرح اپنی دُعاؤں میں صرف عربی الفاظ کے پابند نہ رہو کیونکہ ان کی نماز اور ان کا استغفار سب رسمیں ہیں جن کے ساتھ کوئی حقیقت نہیں لیکن تم جب نماز پڑھو تو بجز قرآن کے جو خدا کا کلام ہے اور

---

[1] البقرة: ۴۶

بجز بعض ادعیہ ماثورہ کے کہ وہ رسول کا کلام ہے باقی اپنی تمام عام دعاؤں میں اپنی زبان میں ہی الفاظ متضرعانہ ادا کیا کرو تا ہو کہ تمہارے دلوں پر اُس عجز و نیاز کا کچھ اثر ہو۔ (کشتی نوح صفحہ ۶۳)

صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۸)

(۱۵۵) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوں ان کو مردے مت کہو۔ (شہادت القرآن۔ بار دوم صفحہ ۳۸)

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاویں اُن کو مردے مت کہو بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۸ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

(۱۵۶-۱۵۸) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

انسان کو خدا کی طرف سے تسلّی پانے کی بڑی بڑی حاجتیں پڑتی ہیں بسا اوقات وہ ایسی سخت مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اگر خدا کا کلام آیا نہ ہوتا اور اس کو اپنی اس بشارت سے مطلع نہ کرتا۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ تو وہ بے حوصلہ ہو کر شاید خدا کے وجود سے ہی انکار کرتا اور یا نا امیدی کی حالت میں خدا سے بکلّی رابطہ توڑ دیتا اور یا غموں کے صدمہ سے ہلاک ہو جاتا۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۲۹۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

خدا تعالیٰ کی انزال رحمت اور روحانی برکت کے بخشنے کے لیے بڑے عظیم الشان دو طریقے ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ کوئی مصیبت اور غم و اندوہ نازل کرکے صبر کرنے والوں پر بخشش اور رحمت کے دروازے کھولے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (الجزو ۲) یعنی ہمارا یہی قانون قدرت ہے کہ ہم مومنوں پر طرح طرح کی مصیبتیں ڈالا کرتے ہیں اور صبر کرنے والوں پر ہماری رحمت نازل ہوتی ہے اور کامیابی کی راہیں اُنہیں پر کھولی جاتی ہیں جو صبر کرتے ہیں۔

(۲) دوسرا طریق انزال رحمت کا ارسال مرسلین و نبیین و ائمہ و اولیا و خلفاء ہے تا اُن کی اقتدا و ہدایت سے لوگ راہ راست پر آجائیں اور اُن کے نمونہ پر اپنے تئیں بنا کر نجات پاجائیں سو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ اس عاجز کی اولاد کے ذریعہ سے یہ دونوں شق ظہور میں آجائیں۔ پس اوّل اُس نے قسم اوّل کے انزال رحمت کے لیے بشیر کو بھیجا تا بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ کا سامان مومنوں کے لیے طیار کرکے اپنی بشیریت کا مفہوم پورا کرے سو وہ ہزاروں مومنوں کے لیے جو اُس کی موت کے غم میں محض للہ شریک ہوئے بطور فرط کے ہوکر خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن کا شفیع ٹھہر گیا اور اندر ہی اندر بہت سی برکتیں اُن کو پہنچا گیا ..... دوسری قسم رحمت کی جو ابھی ہم نے بیان کی ہے اُس کی تکمیل کے لیے خدا تعالیٰ دوسرا بشیر بھیجے گا۔ (سبز اشتہار صفحہ ۱۶، ۱۷ حاشیہ)

یہ آیت وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ اصل مفہوم سے پھیری گئی کیونکہ عرف عام میں آزمایش کرنے والا اُس نتیجہ سے غافل اور بے خبر ہوتا ہے جو امتحان کے بعد پیدا ہوتا ہے مگر اس سے اِس جگہ یہ مطلب نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے امتحان میں ڈالنے سے یہ مطلب ہے کہ تا شخص زیر امتحان پر اُس کے اندرونی عیب یا اندرونی خوبیاں کھول دے۔ (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۵۵)

یعنی اے مومنو ہم تمہیں اس طرح پر آزماتے رہیں گے کہ کبھی کوئی خوفناک حالت تم پر طاری ہوگی اور کبھی فقر و فاقہ تمہارے شامل حال ہوگا اور کبھی تمہارا مالی نقصان ہوگا اور کبھی جانوں پر آفت آئیگی اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہوگے اور حسب المراد نتیجے کوششوں کے نہیں نکلیں گے اور کبھی تمہاری پیاری اولاد مرے گی۔ پس ان لوگوں کو خوشخبری ہو کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چیزیں اور اس کی امانتیں اور اس کے مملوک ہیں پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے اس کی طرف رجوع کرے یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پاگئے۔

غرض اس خلق کا نام صبر اور رضا برضائے الٰہی ہے اور ایک طور سے اس خلق کا نام عدل بھی ہے کیونکہ جب کہ خدا تعالیٰ انسان کی تمام زندگی میں اس کی مرضی کے موافق کام کرتا ہے اور ہزارہا باتیں اس کی مرضی کے موافق ظہور میں لاتا ہے اور انسان کی خواہش کے مطابق اس قدر نعمتیں اُس کو دے رکھی ہیں کہ انسان شمار نہیں کرسکتا تو پھر یہ شرط انصاف نہیں کہ اگر وہ کبھی اپنی مرضی بھی منوانا چاہے تو انسان منحرف ہو اور اس کی رضا کے ساتھ راضی نہ ہو اور

چون وچرا کرے یا بے دین اور بے راہ ہو جائے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

ہم تمھیں خوف اور فاقہ اور مال کے نقصان اور جان کے نقصان اور کوشش کے ضائع جانے اور اولاد کے فوت ہونے سے آزمائیں گے یعنی یہ تمام تکلیفیں قضاء و قدر کے طور پر یا دشمن کے ہاتھ سے تمہیں پہنچے گی سو اُن لوگوں کو خوشخبری ہو جو مصیبت کے وقت صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے ہیں اور خدا کی طرف رجوع کرینگے ان لوگوں پر خدا کا درود اور رحمت ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت کے کمال تک پہنچ گئے ہیں یعنی محض اس علم میں کچھ شرف اور بزرگی نہیں جو صرف دماغ اور دل میں بھرا ہوا ہو بلکہ حقیقت میں علم وہ ہے کہ دماغ سے اُتر کر تمام اعضا اس سے متادب اور رنگین ہو جائیں اور حافظہ کی یادداشتیں عملی رنگ میں دکھائی دیں۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۲۰۵)

خدا کی کتاب نے دعا کے بارہ میں یہ قانون پیش کیا ہے کہ وہ نہایت رحم سے نیک انسان کے ساتھ دوستوں کی طرح معاملہ کرتا ہے یعنی کبھی تو اپنی مرضی کو چھوڑ کر اس کی دعا سنتا ہے جیسا کہ خود فرمایا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] اور کبھی اپنی مرضی ہی منوانا چاہتا ہے جیسا کہ فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ ایسا اس لیے کیا کہ تا کبھی انسان کی دعا کے موافق اس سے معاملہ کر کے یقین اور معرفت میں اس کو ترقی دے اور کبھی اپنی مرضی کے موافق کر کے اپنی رضا کی اس کو خلعت بخشے اور اس کا مرتبہ بڑھاوے اور اس سے محبت کر کے ہدایت کی راہوں میں اس کو ترقی دیوے۔ (کشتی نوح صفحہ ۱۹ حاشیہ)

یاد رہے کہ مومن کے ساتھ خدا تعالیٰ دوستانہ معاملہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کبھی تو وہ مومن کے ارادہ کو پورا کرے اور کبھی مومن اس کے ارادہ پر راضی ہو جائے پس ایک جگہ تو مومن کو مخاطب کر کے فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] یعنی دعا کرو کہ میں تمہاری دُعا قبول کروں گا اس جگہ تو مومن کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے اور دوسری جگہ اپنی خواہش مومن سے منوانا چاہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْہُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ افسوس کہ نادان آدمی صرف ایک پہلو کو دیکھتا ہے اور دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۶ حاشیہ)

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ خیال کہ مقبولین کی ہر ایک دعا قبول ہو جاتی ہے یہ سراسر غلط ہے بلکہ حق بات یہ ہے کہ مقبولین کے ساتھ خدا تعالیٰ کا دوستانہ معاملہ ہے کبھی وُہ ان کی دُعائیں قبول کر لیتا ہے اور کبھی وہ اپنی مشیّت اُن سے منوانا چاہتا ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ دوستی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک

[1] المؤمن : ۶۱

دوست اپنے دوست کی بات کو مانتا ہے اور اُس کی مرضی کے موافق کام کرتا ہے اور پھر دوسرا وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اپنی بات اس سے منوانا چاہتا ہے اسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ ایک جگہ قرآن شریف میں مومنوں کی استجابت دعا کا وعدہ کرتا ہے اور فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] یعنی تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا اور دوسری جگہ اپنی نازل کردہ قضا و قدر پر خوش اور راضی رہنے کی تعلیم کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پس ان دونوں آیتوں کو ایک جگہ پڑھنے سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ دعاؤں کے بارے میں کیا سُنّت اللہ ہے اور ربّ اور عبد کا کیا باہمی تعلق ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۹)

قضا و قدر کا دعا کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے۔ دعا کے ساتھ معلّق تقدیر ٹل جاتی ہے۔ جب مشکلات پیدا ہوتے ہیں تو دعا ضرور اثر کرتی ہے جو لوگ دعا سے منکر ہیں ان کو ایک دھوکا لگا ہوا ہے قرآن شریف نے دعا کے دو پہلو بیان کیے ہیں ایک پہلو میں اللہ تعالیٰ اپنی منوانا چاہتا ہے اور دوسرے پہلو میں بندے کی مان لیتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ میں تو اپنا حق رکھ کر منوانا چاہتا ہے نون ثقیلہ کے ذریعہ سے جو اظہار تاکید کیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہے کہ قضائے مبرم کو ظاہر کریں گے تو اس کا علاج اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ہی ہے۔ اور دوسرا وقت خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کی امواج کے جوش کا ہے وہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں ظاہر کیا ہے۔ پس مومن کو ان دونوں مقامات کا پورا علم ہونا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۶ ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

مصیبتوں کو برا نہیں ماننا چاہیئے کیونکہ مصیبتوں کو برا سمجھنے والا مومن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ یہی تکالیف جب رسولوں پر آتی ہیں تو ان کو انعام کی خوشخبری دیتی ہیں اور جب یہی تکالیف بدوں پر آتی ہیں۔ ان کو تباہ کر دیتی ہیں غرض مصیبت کے وقت قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھنا چاہیئے کہ تکالیف کے وقت خدا تعالیٰ کی رضا طلب کرے۔

مومن کی زندگی کے دو حصے | جو نیک کام مومن کرتا ہے اس کے لیے اجر مقرر ہوتا ہے مگر صبر ایک ایسی چیز ہے جس کا ثواب بے حد و بے شمار ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے یہی لوگ صابر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو سمجھ لیا۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کی زندگی کے دو حصہ کرتا ہے جو صبر کے معنے سمجھ لیتے ہیں۔ اوّل جب وہ دعا کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اُسے

---

[1] المؤمن : ۶۱

قبول کرتا ہے جیسا کہ فرمایا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[۱] اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[۲]۔

دوم ۔ بعض دفعہ اللہ تعالیٰ مومن کی دعا کو بعض مصلحت کی وجہ سے قبول نہیں کرتا تو اُس وقت مومن خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے سر تسلیم خم کر دیتا ہے ۔ تنزل کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن سے دوست کا واسطہ رکھتا ہے جیسا کہ دو دوست ہوں ان میں سے ایک دوسرے کی بات تو کبھی مانتا ہے اور کبھی اس سے منواتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس تعلق کی مثال ہے جو وہ مومن سے رکھتا ہے کبھی وہ مومن کی دعا کو قبول کرتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اور کبھی وہ مومن سے اپنی باتیں منوانی چاہتا ہے چنانچہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ الخ پس اس بات کا سمجھنا ایمانداری ہے کہ ایک طرف زور نہ دے ۔

مومن کو مصیبت کے وقت میں غمگین نہیں ہونا چاہیئے وہ نبی سے بڑھ کر نہیں ہوتا ۔ اصل بات یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ایک محبت کا سرچشمہ جاری ہو جاتا ہے مومن کو کوئی مصیبت نہیں ہوتی جس سے اس کو ہزار ہا قسم لذت نہیں پہنچتی ۔ بلکہ مومن کو آرام کی زندگی میں ایسی لذت نہیں ہوتی جیسا کہ مصیبت کے زمانے میں ان کو لذت پہنچتی ہے ۔ خدا کے لوگوں کو یہ ایک مرض ہوتی ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کو خدا سے مار پڑتی رہے ۔

خدا تعالیٰ کے پیاروں کو گناہ سے مصائب نہیں پہنچتے ۔ دیکھو جب تک لڑکی اپنے والدین کے گھر میں ہوتی ہے والدین اُسے بہت پیار کرتے ہیں اور نکاح کے وقت اگرچہ والدین کو بہت تکلیف ہوتی ہے حتیٰ کہ والدہ ایک طرف روتی ہے اور والد ایک طرف روتا ہے تاہم وہ سب تکالیف برداشت کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے الگ کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے ۔ وہ جانتے (ہیں) کہ اس لڑکی میں ایک جوہر ہے جو کہ سسرال میں جا کر ظاہر ہو گا اس لیے مومن کے جوہر بھی مصائب سے کھلتے ہیں چنانچہ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دکھوں اور نصرت کے زمانہ پر آپ کے اخلاق کو کس طرح ظاہر کیا اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف نہ پہنچتے تو اب ہم ان کے اخلاق کے متعلق کیا بیان کرتے ۔ مومن کی تکالیف کو دوسرے بیشک تکالیف سمجھتے ہیں ۔ مگر مومن اس کو تکالیف نہیں خیال کرتا ۔ غرض یہ ضروری بات ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے مقرب کو دوسروں کی نسبت زیادہ دکھ پہنچائے مومن کو ہر روز مرنا پڑتا ہے اور یہ ضروری بات ہے کہ انسان اپنی سچی توبہ پر قائم رہے اور یہ سمجھے کہ توبہ سے ان کو ایک نئی زندگی ملتی ہے اور اگر توبہ کے ثمرات چاہتے ہو تو عمل کے ساتھ توبہ کی تکمیل کرو ۔ دیکھو جب مالی بوٹا لگاتا ہے پھر اس کو پانی دیتا ہے اور اس سے اس کی تکمیل کرتا ہے اسی طرح ایمان ایک بوٹا ہے اور اس کی آبپاشی عمل سے ہوتی ہے اس لیے ایمان کی تکمیل کے لیے عمل کی ازحد ضرورت ہے اگر ایمان کے ساتھ عمل نہیں ہونگے تو بوٹے خشک ہو جائیں گے اور وہ خائب و خاسر رہ جائیں گے ۔

(البدر جلد ۲ ع ۹ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۷)

---

[۱] المؤمن : ۶۱ ✦ [۲] البقرہ : ۱۸۷ ✦

تم مومن ہونے کی حالت میں ابتلا کو برا نہ جانو اور برا وہی جانے گا جو مومن کامل نہیں ہے قرآن شریف فرماتا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کبھی تم کو مال سے یا جان سے یا اولاد یا کھیتوں وغیرہ کے نقصان سے آزمایا کریں گے مگر جو ایسے وقتوں میں صبر کرتے اور شاکر رہتے ہیں تو اُن لوگوں کو بشارت دو کہ اُن کے واسطے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے کشادہ اور اُن پر خدا کی برکتیں ہوں گی جو ایسے وقتوں میں کہتے ہیں إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ یعنی ہم اور ہمارے متعلق کل اشیا یہ سب خدا ہی کی طرف سے ہیں اور پھر آخر کار ان کا لوٹنا خدا ہی کی طرف ہے کسی قسم کے نقصان کا غم ان کے دل کو نہیں کھاتا۔ اور وہ لوگ مقام رضا میں بود و باش رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ صابر ہوتے ہیں اور صابروں کے واسطے خدا نے بے حساب اجر رکھے ہوئے ہیں۔

مُهْتَدُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کے منشا کو پا لیا اور اُس کے مطابق عملدرآمد کرنے لگ گئے ایسے ہی لوگ تو ولی ہوتے ہیں۔ انہیں کو تو لوگ قطب کہتے ہیں۔ یہی تو غوث کہلاتے ہیں۔ پس کوشش کرو کہ تم بھی ان مدارج عالیہ کو حاصل کرنے کے قابل ہو سکو۔

خدا تعالیٰ نے تو انسان سے نہایت تنزل کے رنگ میں دوستانہ برتاؤ کیا ہے۔ دوستانہ تعلق کیا ہوتا ہے یہی کہ کبھی ایک دوست دوسرے دوست کی بات کو مان لیتا ہے اور کبھی دوسرے سے اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرتا ہے چنانچہ اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] اور إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ الآیۃ[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کی بات کو مان لیتا ہے اور اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے اور دوسری جگہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي[2] الآیہ سے اور وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔

بعض لوگ اللہ تعالیٰ پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہماری دعا کو قبول نہیں کرتا۔ یا اولیا لوگوں پر طعن کرتے ہیں کہ اُن کی فلاں دعا قبول نہیں ہوئی۔ اصل میں وہ نادان اس قانون الٰہی سے ناآشنا محض ہوتے ہیں جس انسان کو خدا سے ایسا معاملہ پڑا ہوگا وہ خوب اس قاعدہ سے آگاہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے مان لینے کے اور منوانے کے دو نمونے پیش کیے ہیں انہی کو مان لینا ایمان ہے تم ایسے نہ بنو کہ ایک ہی پہلو پر زور دو ایسا نہ ہو کہ تم خدا کی مخالفت کر کے اُس کے مقررہ قانون کو توڑنے کی کوشش کرنے والے بنو۔

مومن کے لیے مصائب ہمیشہ نہیں رہتے اور نہ لمبے ہوتے ہیں۔ بلکہ اُس کے واسطے رحمت۔ محبت اور لذت

---

[1] المؤمن : ۶۱ ٭ [2] البقرہ : ۱۸۷ ٭

کا چشمہ جاری کیا جاتا ہے۔ عاشق لوگ عشق کے غلبہ کے دقتوں اور اُس کے دردوں میں ہی لذت پاتے ہیں۔ یہ باتیں گو ایک خشک محض انسان کے لیے سمجھانی مشکل ہیں مگر جنہوں نے اس راہ میں قدم مارا ہے وہ اُن کو خوب جانتے ہیں۔ بلکہ اُن کو تو معمولی آرام اور آسایش میں وہ چین اور لذت نہیں ہوتی جو دُکھ کے اوقات میں ہوتی ہے۔ مثنوی رومی میں ایک حکایت ہے کہ ایک مرض ایسا ہے کہ اس میں جب تک ان کو مُکّے مارنے کوٹتے اور لتاڑتے رہتے ہیں تب تک وہ آرام میں رہتا ہے ورنہ تکلیف میں رہتا ہے سو یہی حال اہل اللہ کا ہے۔ کہ جب تک ان کو مصائب و شدائد کے مشکلات آتے رہیں اور اُن کو مار پڑتی رہے تب تک وہ خوش ہوتے اور لذت اٹھاتے ہیں۔ ورنہ بےچین اور بے آرام رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قادر تھا کہ اپنے بندوں کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچنے دیتا اور ہر طرح سے عیش و آرام میں اُن کی زندگی بسر کرواتا۔ اُن کی زندگی شاہانہ زندگی ہوتی۔ ہر وقت اُن کے لیے عیش و طرب کے سامان مہیا کیے جاتے مگر اُس نے ایسا نہیں کیا اس میں بڑے اسرار اور رازنہانی ہوتے ہیں دیکھو ایک والدین کو اپنی لڑکی کیسی پیاری ہوتی ہے بلکہ اکثر لڑکوں کی نسبت زیادہ پیاری ہوتی ہیں مگر ایک وقت آتا ہے کہ والدین اُن کو اپنے سے الگ کر دیتے ہیں وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اُس وقت کو دیکھنا بڑے جگر والوں کا کام ہوتا ہے دونوں طرف کی حالت ہی بڑی قابل رحم ہوتی ہے قریباً چودہ پندرہ سال ایک جگہ رہے ہوئے ہوتے ہیں آخر ان کی جدائی کا وقت نہایت ہی رقت کا وقت ہوتا ہے اُس جدائی کو بھی کوئی نادان بے رحمی کہہ دے تو بجا ہے مگر اُس لڑکی میں بعض ایسے قویٰ ہوتے ہیں جن کا اظہار اس علیحدگی اور سسرال میں جا کر شوہر سے معاشرت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے جو طرفین کے لیے موجب برکت اور رحمت ہوتا ہے۔

یہی حال اہل اللہ کا ہے۔ ان لوگوں میں بعض خلق ایسے پوشیدہ ہوتے ہیں کہ جب تک اُن پر تکالیف اور شدائد نہ آویں اُن کا اظہار ناممکن ہوتا ہے دیکھو اب ہم لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بیان کرنے میں بڑے فخر اور جرأت سے کام لیتے ہیں یہ بھی تو صرف اسی وجہ سے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دو دونوں زمانے آچکے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہم یہ فضیلت کس طرح بیان کرتے۔ دُکھ کے زمانہ کو بُری نظر سے نہ دیکھو یہ خدا سے لذت کو اور اُس کے قرب کو اپنی طرف کھینچتا ہے اُسی لذت کے حاصل کرنے کے واسطے جو خدا کے مقبولوں کو ملا کرتی ہے دنیوی اور سفلی کُل لذات کو طلاق دینی پڑا کرتی ہے۔ خدا کا مقرب بننے کے واسطے ضروری ہے کہ دُکھ سہنے جاویں۔ اور شکر کیا جاوے اور نئے دن ایک نئی موت اپنے اوپر لینی پڑتی ہے جب انسان دنیوی ہوا و ہوس اور نفس کی طرف سے یکلی موت اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے تب اسے وہ حیات ملتی ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی۔ پھر اس کے بعد مرنا کبھی نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن شریف غم کی حالت میں نازل ہوا ہے

تم بھی اسے غم ہی کی حالت میں پڑھا کرو۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ غم و الم میں گذرا ہے۔ توبہ کے درخت بو لو تا تم اس کے پھل کھاؤ۔ توبہ کا درخت بھی بالکل ایک باغ کے درخت کی مانند ہے جو جو حفاظتیں اور خدمات اُس باغ کے لیے جسمانی طور سے ہیں وہی اس توبہ کے درخت کے واسطے روحانی طور پر ہیں پس اگر توبہ کے درخت کا پھل کھانا چاہو تو اس کے متعلق قوانین اور شرائط کو پورا کرو ورنہ بے فائدہ ہوگا۔

(الحکم جلد ۷ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲-۱۳)

اس سے بڑھ کر انسان کے لیے فخر نہیں کہ وہ خدا کا ہو کر رہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں وہ ان سے مساوات بنا لیتا ہے کبھی ان کی مانتا ہے اور کبھی اپنی منواتا ہے ایک طرف فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] دوسری طرف فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک مقام دعا کا نہیں ہوتا۔ نَبْلُوَنَّكُمْ کے موقع پر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہنا پڑیگا یہ مقام صبر اور رضا کے ہوتے ہیں لوگ ایسے موقع پر دھوکا کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دعا کیوں قبول نہیں ہوتی۔ ان کا خیال ہے کہ خدا ہماری مٹھی میں ہے جو جب چاہیں گے منوالیں گے بھلا امام حسین علیہ السلام پر جو ابتلا آیا تو کیا انہوں نے دعا نہ مانگی ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر بچے فوت ہوئے تو کیا آپ نے دعا نہ کی ہوگی بات یہ ہے یہ مقام صبر اور رضا کے تھے۔

(البدر جلد ۲ ۴۱-۴۲ مورخہ ۲۹ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۱-۳۲۲)

لوگوں کا دستور ہے کہ حالت تنعم میں وہ خدا سے برگشتہ رہتے ہیں اور جب مصیبت اور تکلیف پڑتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگتے مانتے ہیں اور ذرا سے ابتلاء سے خدا سے قطع تعلق کر لیتے ہیں خدا کو اس شرط پر ماننے کے لیے طیار ہیں کہ وہ ان کی مرضی کے برخلاف کچھ نہ کرے۔ حالانکہ دوستی کا اصول یہ ہے کہ کبھی اپنی اس سے منوائے اور کبھی اس کی آپ مانے اور یہی طریق خدا نے بھی بتلایا ہے ایک جگہ تو فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] کہ تم مانگو تو میں دوں گا یعنی تمہاری بات مانوں گا اور دوسری جگہ اپنی منواتا ہے اور فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ الخ مگر یہاں آج کل لوگ خدا تعالیٰ کو مثل غلام کے اپنی مرضی کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ غوث۔ قطب۔ ابدال اور اولیاء وغیرہ جس قدر لوگ ہوئے ہیں اُن کو یہ سب مراتب اسی لیے ملے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھتے چلے آئے۔

(البدر جلد ۳ ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

جب انسان خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو اکثر خدا تعالیٰ اپنے بندے کی دُعا قبول کرتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ خدا تعالیٰ اپنی بات منواتا ہے۔ دو دوستوں کی آپس میں دوستی کے قائم رہنے کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ کبھی اس نے اُس کی بات مان لی اور کبھی اُس نے اِس کی بات مان لی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمیشہ ایک ہی دوسرے کی بات مانتا

[1] المؤمن : ۶۱

رہے اور وہ اپنی بات کبھی نہ منوائے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ہمیشہ اس کی دعا قبول ہوتی رہے اور اسی کی خواہش پوری ہوتی رہے۔ وہ بڑی غلطی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے قرآن شریف میں دو آیتیں نازل فرمائی ہیں۔ ایک میں فرمایا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] تم دعا مانگو میں تمہیں جواب دوں گا دوسری آیت میں فرمایا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ الخ یعنی ضرور ہے تم پر قسما قسم کے ابتلاء پڑیں اور امتحان آئیں اور آزمائشیں کی جاویں تاکہ تم انعام حاصل کرنے کے مستحق ٹھہرو۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ استقامت اختیار کرتے ہیں خدا ان کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ دعا کے بعد کامیابی اپنی خواہش کے مطابق ہو یا مصلحت الٰہی کوئی دوسری صورت پیدا کردے ہر حال میں دعا کا جواب ضرور خدا تعالیٰ کی طرف سے مل جاتا ہے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ دعا کے واسطے اس کی حد تک جو ضروری ہے تضرع کی جاوے اور پھر جواب نہ ملے۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۳۲ صفحہ ۳ مورخہ ۹ اگست ۱۹۰۶ء نیز دیکھیں الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۸ صفحہ ۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء)

دیکھو ایک جگہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] یعنی اگر تم مجھ سے مانگو تو قبول کروں گا اور دوسری جگہ فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ..... الآیہ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ[2] اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے بھی امتحان آیا کرتے ہیں۔ ..... اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں انسان اسی واسطے آتا ہے۔ کہ آزمایا جاوے۔ اگر وہ اپنی منشاء کے موافق خوشیاں مناتا رہے اور جس بات پر اس کا دل چاہے وہی ہوتا رہے تو پھر ہم اس کو خدا کا بندہ نہیں کہہ سکتے۔ اس واسطے ہماری جماعت کو اچھی طرح سے یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے دو طرح کی تقسیم کی ہوئی ہے۔ اس لیے اس تقسیم کے ماتحت چلنے کی کوشش کی جاوے۔ ایک حصہ تو اس کا یہ ہے کہ وہ تمہاری باتوں کو مانتا ہے اور دوسرا حصہ یہ ہے کہ وہ اپنی منواتا ہے۔ جو شخص ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ خدا ہمیشہ اسی کی مرضی کے مطابق کرتا رہے اندیشہ ہے کہ شاید وہ کسی وقت مرتد ہو جائے۔

کوئی یہ نہ کہے کہ میرے پر ہی تکلیف اور ابتلا کا زمانہ آیا ہے۔ بلکہ ابتدا سے سب نبیوں پر آتا رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا جب فوت ہوا تھا تو کیا انہیں غم نہیں ہوا تھا۔ ایک روایت میں لکھا ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گیارہ بیٹے فوت ہوئے تھے آخر بشریت ہوتی ہے۔ غم کا پیدا ہونا ضروری ہے مگر ہاں صبر کرنے والوں کو پھر بڑے بڑے اجر ملا کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ساری کتابوں کا منشا یہی ہے کہ انسان رضا بالقضاء سیکھے۔ جو شخص اپنے ہاتھ سے آپ تکلیف میں پڑتا ہے اور خدا کے لیے ریاضات اور مجاہدات کرتا ہے۔ وہ اپنے رگ پٹھے کی صحت کا خیال بھی رکھ لیتا ہے اور اکثر اپنی خواہش کے موافق ان اعمال کو بجا لاتا ہے۔ اور حتی الوسع اپنے آرام کو مدنظر رکھتا ہے۔ مگر جب خدا کی طرف سے کوئی امتحان پڑتا ہے اور کوئی ابتلا آتا ہے تو وہ رگ اور پٹھے کا لحاظ رکھ کر نہیں آتا۔ خدا کو اس کے آرام اور رگ پٹھے کا خیال مدنظر نہیں ہوتا۔ انسان جب کوئی مجاہدہ کرتا ہے تو وہ اپنا

---

[1] المومن : ۶۱

تصرف رکھتا ہے مگر جب خدا کی طرف سے کوئی امتحان آتا ہے تو اس میں انسان کے تصرف کا دخل نہیں ہوتا۔ انسان خدا کے امتحان میں بہت جلد ترقی کر لیتا ہے۔ اور وہ مدارج حاصل کر لیتا ہے جو اپنی محنت اور کوشش سے کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] میں اللہ تعالیٰ نے کوئی بشارت نہیں دی مگر وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ ......الآیۃ میں بڑی بڑی بشارتیں دی ہیں اور فرمایا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی بڑی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ غرض یہی طریق ہے جس سے انسان خدا کو راضی کر سکتا ہے نہیں تو اگر خدا کے ساتھ شریک بن جاوے اور اپنی مرضی کے مطابق اسے چلانا چاہے تو یہ ایک خطرناک راستہ ہوگا جس کا انجام ہلاکت ہے۔ ہماری جماعت کو منتظر رہنا چاہیئے کہ اگر کوئی ترقی کا ایسا موقع آجاوے تو اس کو خوشی سے قبول کیا جاوے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

یہ خدا تعالیٰ کا احسان اور اس کا کرم ہے کہ وہ اپنے بندہ کی بھی مان لیتا ہے ورنہ اس کی الوہیت اور ربوبیت کی شان کے یہ ہرگز خلاف نہیں کہ اپنی ہی منوائے۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ جو فرمایا تو اس مقام پر وہ اپنی منوانا چاہتا ہے۔ کبھی کسی قسم کا خوف آتا ہے اور کبھی بھوک آتی ہے اور کبھی مالوں میں کمی واقع ہوتی ہے تجارتوں میں خسارہ ہوتا ہے اور کبھی ثمرات میں کمی ہوتی ہے اولاد ضائع ہوتی ہے اور ثمرات برباد ہو جاتے ہیں اور نتائج نقصان دہ ہوتے ہیں ایسی صورتوں میں خدا تعالیٰ کی آزمائش ہوتی ہے اُس وقت خدا اپنی شان حکومت دکھانا چاہتا ہے اور اپنی منوانا چاہتا ہے اس وقت صادق اور مومن کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ نہایت اخلاص اور انشراح صدر کے ساتھ خدا کی رضا کو مقدم کر لیتا ہے اور اُس پر خوش ہو جاتا ہے کوئی شکوہ اور بدظنی نہیں کرتا۔ اس لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ پس صبر کرنے والوں کو بشارت دو۔ یہ نہیں فرمایا کہ دعا کرنے والوں کو بشارت دو بلکہ صبر کرنے والوں کو اس لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اگر بظاہر اپنی دعاؤں میں ناکامی دیکھے تو گھبرا نہ جاوے بلکہ صبر اور استقلال سے خدا تعالیٰ کی رضا کو مقدم کرے۔ اہل اللہ کو نظر آجاتا ہے کہ یہ کام ہونہار ہے پس جب وہ یہ دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں ورنہ قضاو قدر پر راضی رہتے ہیں اہل اللہ کے دو ہی کام ہوتے ہیں جب کسی بلا کے آثار دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ قضاء وقدر اسی طرح پر ہے تو صبر کرتے ہیں۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچوں کی وفات پر صبر کیا جن میں سے ایک بچہ ابراہیم بھی تھا۔

جبکہ خدا تعالیٰ نے یہ دو تقسیمیں رکھ دی ہیں اور یہ اُس کی سنت ٹھہر چکی ہے اور یہ بھی اُس نے فرمایا ہے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا[2] پھر کس قدر غلطی ہے جو انسان اس کے خلاف چاہے۔ میں نے بارہا بتایا ہے کہ انسان کے ساتھ خدا نے دوستانہ معاملہ رکھا ہے کبھی ایک دوست دوسرے کی مان لیتا ہے اور کبھی اپنی منواتا ہے

---

[1] المؤمن: ۶۱ ، [2] الاحزاب: ۶۳ اور الفتح: ۲۴

اور دعا بندہ اور خدا میں بھاجی کی طرح ہے ۔ اگر انسان یہ سمجھ لے کہ خدا تعالیٰ کمزور رعایا کی طرح ہر بات مان لے تو یہ نقص ہے ماں بھی بچہ کی ہر بات نہیں مان سکتی کبھی بچہ آگ کی انگاریاں مانگتا ہے تو وہ کب دیتی ہے یا مثلاً آنکھیں دکھتی ہوں تو اُسے زنک یا اور کوئی دوا ڈالنی ہی پڑتی ہے اسی طرح پر بندہ چونکہ تکمیل کا محتاج ہے اُسے ماروں کی ضرورت ہے تاکہ وہ صدق و وفا اور ثبات قدم میں کامل ثابت ہو۔

پھر دعا کرانے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صابر ہو جلد باز نہ ہو جو ذرا سی بات پر دجّال کہنے کو طیار رہے پس وہ کیا فائدہ اٹھائے گا ۔ اسے تو چاہیئے کہ صبر کے ساتھ انتظار کرے اور حسن ظن سے کام لے ۔

جب کہ خدا تعالیٰ نے لَنَبْلُوَنَّكُمْ فرمایا ہے تو صبر کرنے والوں کے لیے بشارت دی اور اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ بھی فرمایا ۔ میرے نزدیک اس کے یہی معنی ہیں کہ قبولیت دعا کی ایک راہ نکال دیتا ہے حکام کا بھی یہی حال ہے کہ جس پر ناراض ہوتے ہیں اگر وہ صبر کے ساتھ برداشت کرتا اور شکوہ اور بدظنی نہیں کرتا تو اُسے ترقی دیدیتے ہیں قرآن شریف سے صاف پایا جاتا ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ابتلا آویں ۔ جیسے فرمایا اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ[1] یعنی کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف آمَنَّا کہنے سے چھوڑے جائیں اور وہ فتنوں میں نہ پڑیں ۔ مصائب اور تکالیف پر اگر صبر کیا جاوے اور خدا تعالیٰ کی قضا کے ساتھ رضا ظاہر کی جاوے تو وہ مشکل کشائی کا مقدمہ ہوتی ہیں ۔ (الحکم جلد ۶ ۳۶ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳-۱۴)

یعنی ہم آزماتے رہیں گے کبھی ڈرا کر کبھی بھوک سے کبھی مالوں اور ثمرات وغیرہ کا نقصان کر کے ثمرات میں اولاد بھی داخل ہے اور یہ بھی کہ بڑی محنت سے کوئی فصل طیار کی اور یکایک اسے آگ لگی اور وہ تباہ ہو گئی یا اور امور کے لیے محنت مشقت کی نتیجہ میں ناکام رہ گیا غرض مختلف قسم کے ابتلا اور عوارض انسان پر آتے ہیں اور یہ خدا تعالیٰ کی آزمائش ہے ایسی صورت میں جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی اور اس کی تقدیر کے لیے سر تسلیم خم کرتے ہیں وہ بڑی شرح صدر سے کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کسی قسم کا شکوہ اور شکایت یہ لوگ نہیں کرتے ایسے لوگوں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن کے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت آتی ہے اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں کو مشکلات میں راہ دکھا دیتا ہے یاد رکھو اللہ تعالیٰ بڑا ہی کریم و رحیم اور بامروت ہے جب کوئی اس کی رضا کو مقدم کر لیتا ہے اور اس کی مرضی پر راضی ہو جاتا ہے تو وہ اس کو اس کا بدلہ دئے بغیر نہیں چھوڑتا ۔ غرض یہ تو وہ مقام اور مرحلہ ہے جہاں وہ اپنی بات منوانی چاہتا ہے دوسرا مقام اور مرحلہ وہ ہے جو اس نے اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[2] میں فرمایا ہے یہاں وہ اس کی بات ماننے کا وعدہ فرماتا ہے ۔ (الحکم جلد ۹ ۱۸ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۸)

---

[1] سورۃ العنکبوت : ۲، ۳ [2] المؤمن : ۶۱

چونکہ انسان کو بڑے بڑے ابتلا آتے رہتے ہیں جیسا خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ الآیہ (س ۲) ہم تمہیں آزماتے رہیں گے کبھی ڈر سے اور کبھی مالوں میں نقصان کرنے سے اور کبھی ثمرات کو تلف کرنے سے۔ اتلاف ثمرات سے مراد تفاسیر میں اولاد بھی لکھی ہے۔ اور اس میں کوششوں کا ضائع ہونا بھی شامل ہے۔ مثلاً حصول علم کی کوشش۔ تجارت میں کامیابی کی کوشش۔ زمینداری کی کوشش غرض ان کوششوں کا ضائع ہونا بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ ہر وقت انسان کو خیال ہوتا ہے۔ کہ کامیاب ہو جاؤں گا۔ آخر خدا تعالیٰ کے علم میں اُن کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ ناکام رہے۔ یا کھیتی نہیں لگتی۔ یا تجارت میں کامیاب نہیں ہوتے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار امتحان رکھے ہیں۔ ایک خوف۔ دوم کبھی نقصان مال اور تیسرے نقصان جان۔ چہارم تلف ثمرات۔ (رسالہ الانذار صـ۵۶)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ الآیہ

خوف سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈر ہی ڈر ہے انجام اچھا ہے اسی سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

پھر اَلْجُوْع فقر و فاقہ تنگ کرتا ہے بعض وقت ایک کرتہ پھٹ جاوے تو دوسرے کی توفیق نہیں ملتی جُوع کا لفظ رکھ کر عطش کا لفظ چھوڑ دیا ہے کیونکہ یہ جُوع میں داخل ہے۔

نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ چور لے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں چھوڑ جاتے کہ صبح کی روٹی کھا سکیں۔ سو چو کس قدر تکلیف اور آفت کا سامنا ہوتا ہے۔

پھر جانوں کا نقصان ہے پیچھے مرنے لگ جاتے ہیں (خدا محفوظ ہی رکھے آمین) یہاں تک کہ ایک بھی نہیں رہتا۔ جانوں کے نقصان میں یہ بات داخل ہے کہ خود تو زندہ رہے اور عزیز و متعلقین مرتے جاویں کس قدر صدمہ ایسے وقت پر ہوتا ہے۔.....

ثمرات میں اولاد بھی داخل ہے اور محنتوں کے بعد آخر کی کامیابیاں بھی مراد ہیں ان کے ضائع ہونے سے بھی سخت صدمہ ہوتا ہے۔ امتحان دینے والے اگر کبھی فیل ہو جاتے ہیں تو بارہا دیکھا گیا ہے کہ وہ خودکشیاں کر لیتے ہیں..... غرض اس قسم کے ابتلا جن پر آئیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو بشارت دیتا ہے وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الآیہ یعنی ایسے موقع پر جہد کے ساتھ برداشت کرنے والوں کو خوش خبری اور بشارت ہے۔ کہ جب ان کو کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ یاد رکھو کہ خدا کا خاص بندہ اور مقرب تب ہی ہوتا ہے کہ ہر مصیبت پر خدا ہی کو مقدم رکھے۔ غرض ایک وہ حصہ ہوتا ہے جس میں خدا اپنی منوانا چاہتا ہے۔ دعا کے معنی تو یہی ہیں کہ انسان خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یوں ہو پس کبھی مولیٰ کریم کی خواہش مقدم ہونی چاہیئے اور کبھی اللہ کریم اپنے بندہ کی خواہش کو پورا کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۴ عـ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صـ۳)

دنیوی بادشاہوں اور حاکموں نے جو اعلیٰ مراتب کے عطا کرنے کے واسطے امتحان مقرر کیے ہیں یہی سنت اللہ کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بعد امتحانوں کے درجات عطا کرتا ہے۔ جن مصائب اور تکالیف کے امتحانات میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاس ہوئے وہ دوسرے کا کام نہ تھا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

جن لوگوں کی پاک تبدیلی خدا تعالیٰ دعاؤں سے چاہتا ہے ان کی تبدیلی اس طرح پر ہوتی ہے کہ ان پر بلائیں اور خوف آتے ہیں جیسے فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ الآیہ۔

اگر انسان کے افعال سے گناہ دور ہو جاوے تو شیطان چاہتا ہے کہ آنکھ۔ کان۔ ناک۔ تک ہی رہے اور جب وہاں بھی اُسے قابو نہیں ملتا تو پھر وہ یہاں تک کوشش کرتا ہے کہ اور نہیں تو دل ہی میں گناہ رہے۔ گویا شیطان اپنی لڑائی کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ مگر جس دل میں خدا کا خوف ہے وہاں شیطان کی حکومت نہیں چل سکتی شیطان آخر اس سے مایوس ہو جاتا ہے اور الگ ہوتا ہے اور اپنی لڑائی میں ناکام و نامراد ہو کر اُسے اپنا بوریا بستر ا باندھنا پڑتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

ہماری فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ تکلیف کو بھی چاہتی ہے تاکہ تکمیل ہو جاوے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہی ہوتا ہے جو وہ انسان کو بعض اوقات ابتلاؤں میں ڈال دیتا ہے اس سے اس کی رضا بالقضا اور صبر کی قوتیں بڑھتی ہیں جس شخص کو خدا پر یقین نہیں ہوتا ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ ذرا سی تکلیف کے پہونچنے پر گھبرا جاتے ہیں اور وہ خودکشی میں آرام دیکھتا ہے۔ مگر انسان کی تکمیل اور تربیت چاہتی ہے کہ اس پر اس قسم کے ابتلا آدیں اور تاکہ اللہ تعالیٰ پر اس کا یقین بڑھے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ لیکن جن کو تفرقہ اور ابتلا نہیں آتا۔ ان کا حال دیکھو کہ کیسا ہوتا ہے وہ بالکل دنیا اور اُس کی خواہشوں میں منہمک ہو گئے ہیں ان کا سر اوپر کی طرف نہیں اُٹھتا۔ خدا تعالیٰ کا ان کو بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کو ضائع کر دیا اور بجائے اس کے ادنیٰ درجہ کی باتیں حاصل کیں کیونکہ ایمان اور عرفان کی ترقی ان کے لیے وہ راحت اور اطمینان کے سامان پیدا کرتی جو کسی مال و دولت اور دنیا کی لذت میں نہیں ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ ایک بچہ کی طرح آگ کے انگارہ پر خوش ہو جاتے ہیں اور اُس کی سوزش اور نقصان رسانی سے آگاہ نہیں۔ لیکن جن پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے اور جن کو ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال کرتا ہے اُن پر ابتلا آتا ہے۔

جو کہتے ہیں کہ ہم پر کوئی ابتلا نہیں آیا وہ بدقسمت ہیں وہ ناز و نعمت میں رہ کر بہائم کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کے زبان ہے مگر وہ حق بول نہیں سکتی خدا کی حمد و ثنا اُس پر جاری نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ صرف فسق و فجور کی باتیں کرنے کے لیے اور مزہ چکھنے کے واسطے ہے۔ ان کے آنکھیں ہیں مگر وہ قدرت کا نظارہ نہیں دیکھ سکتیں بلکہ وہ بدکاری کے لیے ہیں پھر ان کو خوشی اور راحت کہاں سے میسر آتی ہے یہ مت سمجھو کہ جس کو ہم و غم پہنچتا ہے وہ بدقسمت ہے۔ نہیں خدا اُس کو

پیار کرتا ہے۔ جیسے مرہم لگانے سے پہلے چیرنا اور جراحی کا عمل ضروری ہے اسی طرح خدا کی راہ میں ہم و غم آنا ضروری ہے۔
غرض یہ انسانی فطرت میں ایک امر واقعہ شدہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے اور اس میں کیا کیا بلائیں اور حوادث آتے ہیں ابتلاؤں میں ہی دعاؤں کے عجیب و غریب خواص اور اثر ظاہر ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارا خدا تو دعاؤں ہی سے پہچانا جاتا ہے دنیا میں جس قدر قومیں ہیں کسی قوم نے ایسا خدا نہیں مانا جو جواب دیتا ہو اور دعاؤں کو سنتا ہو کیا ایک ہندو ایک پتھر کے سامنے بیٹھ کر یا درخت کے آگے کھڑا ہو کر یا بیل کے روبرو ہاتھ جوڑ کر کہہ سکتا ہے کہ میرا خدا ایسا ہے کہ میں اس سے دعا کروں تو یہ مجھے جواب دیتا ہے؟ ہرگز نہیں کیا ایک عیسائی کہہ سکتا ہے کہ میں نے یسوع کو خدا مانا ہے وہ میری دعا کو سنتا اور اس کا جواب دیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بولنے والا خدا صرف ایک ہی ہے جو اسلام کا خدا ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے جس نے کہا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱-۲)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ الخ کبھی ہم تم کو نہایت فقر و فاقہ سے آزمائیں گے اور کبھی تمہارے بچے مر جاویں گے۔ تو جو لوگ مومن ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا ہی مال تھا۔ ہم بھی تو اُسی کے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہی لوگوں نے جو صبر کرتے ہیں میرے مطلب کو سمجھا ہے ان پر میری بڑی رحمتیں ہیں جن کا کوئی حد و حساب نہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۱)

کوئی مامور نہیں آتا جس پر ابتلا نہ آئے ہوں مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قید کیا گیا اور کیا کیا اذیت دی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ کیا گیا مگر بات یہ ہے کہ عاقبت بخیر ہوتی ہے اگر خدا کی سنت یہ ہوتی کہ مامورین کی زندگی ایک تنعم اور آرام کی ہو اور اس کی جماعت پلاؤ زردے وغیرہ کھاتی رہے تو پھر اور دنیا داروں میں اور ان میں کیا فرق ہوتا پلاؤ زردے کھا کر حمداً اللہ و شکراً للہ کہنا آسان ہے اور ہر ایک بے تکلف کہہ سکتا ہے لیکن بات یہ ہے جب مصیبت میں بھی وہ اسی دل سے کہے۔

مامورین اور ان کی جماعت کو زلزلے آتے ہیں۔ ہلاکت کا خوف ہوتا ہے طرح طرح کے خطرات پیش آتے ہیں کُذِبُوْا کے یہی معنے ہیں دوسرے ان واقعات سے یہ فائدہ ہے کہ کچوں اور پکوں کا امتحان ہو جاتا ہے کیونکہ جو کچے ہوتے ہیں اُن کا قدم صرف آسودگی تک ہی ہوتا ہے جب مصائب آئے تو وہ الگ ہو جاتے ہیں میرے ساتھ یہی سنت اللہ ہے کہ جب تک ابتلا نہ ہو تو کوئی نشان ظاہر نہیں ہوتا خدا کا اپنے بندوں سے بڑا پیار یہی ہے کہ اُن کو ابتلا میں ڈالے جیسے کہ وہ فرماتا ہے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ یعنی ہر ایک قسم کی مصیبت اور دُکھ میں ان کا رجوع خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے انعامات انہی کو ملتے ہیں جو استقامت اختیار کرتے ہیں خوشی کے ایام اگرچہ دیکھنے کو لذیذ ہوتے ہیں مگر انجام کچھ نہیں ہوتا

رنگ رلیوں میں رہنے سے آخر خدا کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے خدا کی محبت یہی ہے کہ ابتلا میں ڈالتا ہے اور اس سے اپنے بندے کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے مثلاً کسریٰ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کا حکم نہ دیتا تو یہ معجزہ کہ وہ اسی رات مارا گیا کیسے ظاہر ہوتا اور اگر مکہ والے لوگ آپ کو نہ نکالتے تو فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا[1] کی آواز کیسے سنائی دیتی۔ ہر ایک معجزہ ابتلا سے وابستہ ہے غفلت اور عیاشی کی زندگی کو خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے کامیابی پر کامیابی ہو تو تضرع اور ابتہال کا رشتہ تو بالکل رہتا ہی نہیں ہے حالانکہ خدا تعالیٰ اسی کو پسند کرتا ہے اس لیے ضرور ہے کہ دردناک حالتیں پیدا ہوں۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۰ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

دنیا میں دو قسم کے دکھ ہوتے ہیں بعض دکھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں تسلی دی جاتی ہے اور صبر کی توفیق ملتی ہے۔ فرشتے سکینت کے ساتھ اترتے ہیں اس قسم کے دکھ نبیوں اور راست بازوں کو بھی ملتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور ابتلا آتے ہیں جیسا کہ اس نے وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ الآیہ میں فرمایا ہے ان دکھوں کا انجام راحت ہوتا ہے اور درمیان میں بھی تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ خدا کی طرف سے صبر اور سکینت ان کو دی جاتی ہے۔ مگر دوسری قسم دکھ کی وہ ہے جس میں یہی نہیں کہ دکھ ہوتا ہے بلکہ اس میں صبر و ثبات کھویا جاتا ہے اس میں نہ انسان مرتا ہے نہ جیتا ہے اور سخت مصیبت اور بلا میں ہوتا ہے یہ شامت اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے مَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ[2] اور اس قسم کے دکھوں سے بچنے کا یہی طریق اور علاج ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

یاد رکھو ابتلا بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ابتلا شریعت کے اوامر و نواہی کا ہوتا ہے دوسرا ابتلا قضاء و قدر کا ہوتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَـوۡفِ الآیہ پس اصل مرد میدان اور کامل وہ ہوتا ہے جو ان دونوں قسم کی ابتلاؤں میں پورا اترے۔ بعض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اوامر و نواہی کی رعایت کرتے ہیں لیکن جب کوئی ابتلا مصیبت قضاء قدر کا پیش آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرتے ہیں۔۔ تقوی وہی ہے جو اعتقاد صحیح رکھتا ہو اعمال صالحہ کرنے والا ہو اور مصائب و شدائد میں پورا اترنے والا ہو اور یہی جوانمردی ہے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۱۸-۱۹ مورخہ ۸ و ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

یاد رکھو کہ خدا کے فضل کے حاصل کرنے کے دو راہ ہیں۔ ایک تو زہد نفس کشی اور مجاہدات کا ہے۔ اور دوسرا قضا و قدر کا۔ لیکن مجاہدات سے اس راہ کا طے کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس میں انسان کو اپنے ہاتھ سے اپنے بدن کو مجروح اور خستہ کرنا پڑتا ہے عام طبائع بہت کم اس پر قادر ہوتی ہیں۔ کہ وہ دیدہ و دانستہ تکلیف جھیلیں۔ لیکن قضاء و قدر کی طرف سے جو واقعات اور حادثات انسان پر آکر پڑتے ہیں۔ وہ ناگہانی ہوتے ہیں اور جب آپڑتے ہیں۔ تو پھر درویش بر جان درویش ان کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے جو کہ اس کے تزکیہ نفس کا باعث ہو جاتا ہے جیسے شہدا کو دیکھو۔ کہ

---

[1] الفتح: ۲ ۔ [2] الشوریٰ: ۳۱ ۔

جنگ کے بیچ میں لڑتے لڑتے جب مارے جاتے ہیں۔ تو خدا کے نزدیک کس قدر اجر کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ درجات قرب بھی اُن کو قضاء و قدر سے ہی ملتے ہیں۔ ورنہ اگر تنہائی میں ان کو اپنی گردنیں کاٹنی پڑیں۔ تو شاید بہت تھوڑے ایسے نکلیں جو شہید ہوں اسی لیے اللہ تعالیٰ غرباکو بشارت دیتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ اس کا یہی مطلب ہے۔ کہ قضاء و قدر کی طرف سے ان کو ہر ایک قسم کے نقصان پہنچتے ہیں۔ اور پھر وہ جو صبر کرتے ہیں، تو خدا تعالیٰ کی عنایتیں اور رحمتیں اُن کے شامل حال ہوتی ہیں۔ کیونکہ تلخ زندگی کا حصہ ان کو بہت ملتا ہے۔ لیکن امراء کو یہ کہاں نصیب۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳-۴)

بہت سے لوگ اس امر سے غافل ہیں کہ انسان پر جو بلائیں آتی ہیں وہ بلائیں بلاوجہ یونہی آجاتی ہیں۔ یا اُن کے نزول کو انسان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا خیال بالکل غلط ہے۔ یہ خوب یاد رکھو کہ ہر بلا جو اس زندگی میں آتی ہے یا جو مرنے کے بعد آئے گی جس کا ہمیں یقین ہے اس کی اصل جڑ گناہ ہی ہے۔ کیونکہ گناہ کی حالت میں انسان اپنے آپ کو ان انوار اور فیوض سے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں پرے ہٹا دیتا ہے اور اس اصل مرکز سے جو حقیقی راحت کا مرکز ہے ہٹ جاتا ہے اس لیئے تکلیف کا آنا اس حالت میں اس پر ضروری ہے۔

یہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انبیاء اور راست بازوں پر بھی بعض اوقات بلائیں آجاتی ہیں اور بھی مصائب اور شدائد میں ڈالے جاتے ہیں لیکن یہ گمان کرنا کہ وہ مصائب اور بلائیں کسی گناہ کی وجہ سے آتی ہیں خطرناک غلطی اور گناہ ہے۔ اُن بلاؤں میں جو خدا کے راست بازوں اور پیارے بندوں پر آتی ہیں۔ اور اُن بلاؤں میں جو خدا تعالیٰ کے نافرمانوں اور خطاکاروں پر آتی ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے کہ ان کے اسباب بھی مختلف ہیں۔

نبیوں اور راست بازوں پر جو بلائیں آتی ہیں ان میں ان کو ایک صبر جمیل دیا جاتا ہے جس سے وہ بلا اور مصیبت ان کے لیے مدرک الحلاوت ہو جاتی ہے وہ اس سے لذت اُٹھاتے ہیں اور روحانی ترقیوں کے لیے ایک ذریعہ ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کے درجات کی ترقی کے لیے ایسی بلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ جو ترقیات کے لیے زینہ کا کام دیتی ہیں۔ جو شخص ان بلاؤں میں نہیں پڑتا اور ان مصیبتوں کو نہیں اُٹھاتا۔ وہ کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔

دنیا کے عام نظام میں بھی تکالیف اور مشقتوں کا ایک سلسلہ ہے جس میں سے ہر ایسے شخص کو جو ترقی کا خواہاں ہے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان تکالیف اور شاقہ محنتوں میں باوجود تکالیف کے ایک لذت ہوتی ہے جو اسے کشاں کشاں آگے لیے جاتی ہے برخلاف اس کے وہ مصیبت اور تکالیف جو انسان کی اپنی بدکرداری کی وجہ سے اس پر آتی ہے وہ وہ مصیبت آتی ہے جس میں ایک درد اور سوزش ہوتی ہے جو اس کی زندگی اس کے لیے وبال جان کر دیتی ہے وہ موت کو ترجیح دیتا ہے مگر نہیں جانتا کہ یہ سلسلہ مر کر بھی ختم نہیں ہوگا۔

غرض بلاؤں کے نزول میں ہمیشہ سے قانون قدرت یہی ہے کہ جو بلائیں شامت اعمال کی وجہ سے آتی ہیں وہ الگ ہیں اور خدا کے راستبازوں اور پیغمبروں پر جو بلائیں آتی ہیں وہ اُن کی ترقی درجات کے لیے ہوتی ہیں۔

بعض جاہل جو اس راز کو نہیں سمجھتے وہ جب بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اس بلا سے فائدہ اُٹھائیں اور کم از کم آیندہ کے لیے مفید سبق حاصل کریں اور اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا کریں کہہ دیتے ہیں کہ اگر ہم پر مصیبت آئی تو کیا ہوا۔ نبیوں اور پیغمبروں پر بھی تو آجاتی ہیں حالانکہ ان بلاؤں کو انبیاء کے مشکلات اور مصائب سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ جہالت بھی کیسی بُری مرض ہے کہ انسان اس میں قیاس مع الفارق کر بیٹھتا ہے۔ یہ بڑا دھوکہ واقعہ ہوتا ہے جو انسان تمام انبیاء کی مشکلات کو عام لوگوں کی بلاؤں پر حمل کر لیتا ہے۔

پس خوب یاد رکھو کہ جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے انبیاء اور دوسرے اخیار و ابرار کی بلائیں محبت کی راہ سے ہیں خدا تعالیٰ اُن کو ترقی دینا چاہتا ہے اور یہ بلائیں وسائل ترقی میں سے ہیں۔ لیکن جب مفسدوں پر آتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو اس عذاب سے تباہ کرنا چاہتا ہے وہ بلائیں ان کے استیصال اور نیست و نابود کرنے کا ذریعہ ہو جاتی ہیں یہ ایسا فرق ہے کہ دلائل کا محتاج نہیں ہے کیونکہ جب اچھے آدمی جو خدا تعالیٰ کو مقدم کر لیتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ خدا تعالےٰ سے محبت کیوں کرتے ہیں بہشت اور دوزخ ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ اور نہ بہشت کی خواہش یا دوزخ کا ذکر ان کو خدا تعالیٰ کی اطاعت کا محرک ہوتا ہے بلکہ وہ طبعی جوش اور طبعی محبت سے خدا تعالیٰ سے محبت کرنے اور اس کی اطاعت میں محو ہوتے ہیں ان پر جب کوئی بلا آتی ہے تو وہ خود محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ از راہ محبت ہے وہ دیکھتے ہیں کہ ان بلاؤں کے ذریعہ ایک چشمہ کھولا جاتا ہے جس سے وہ سیراب ہوتے ہیں اور ان کا دل لذت سے بھر جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت ایک فوّارہ کی طرح جوش مارنے لگ جاتی ہے تب وہ چاہتے ہیں کہ یہ بلا زیادہ ہو تا کہ قربِ الٰہی زیادہ ہو اور رضا کے مدارج جلد طے ہوں۔

غرض الفاظ وفا نہیں کرتے جو اس لذّت کو بیان کر سکیں جو اخیار و ابرار کو ان بلاؤں کے ذریعہ آتی ہے۔ یہ لذت تمام سفلی لذتوں سے بڑھی ہوئی ہے اور فوق الفوق لذت ہوتی ہے۔ یہ مصیبت کیا ہے؟ ایک عظیم الشان دعوت ہے جس میں قسم قسم کے انعام و اکرام اور پھل اور میوے پیش کیے جاتے ہیں۔ خدا اس وقت قریب ہوتا ہے فرشتے اِن سے مصافحہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے مکالمہ کا شرف عطا کیا جاتا ہے اور وحی اور الہام سے اس کی تسلی اور سکینت دی جاتی ہے۔ لوگوں کی نظر میں یہ بلاؤں اور مصیبتوں کا وقت ہے مگر در اصل اِس وقت اللہ تعالیٰ کے فیضان اور فیوض کی بارش کا وقت ہوتا ہے۔ سفلی اور سطحی خیال کے لوگ اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ بلاؤں اور غموں ہی کا وقت ہے جو مزا آتا ہے اور راحت ملتی ہے۔ کیونکہ خدا جو انسان کا اصل مقصود ہے اس وقت اپنے بندے کے بہت ہی قریب ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قرآن جو دیا گیا ہے غم کی

حالت میں دیا گیا ہے پس تم بھی اس کو غم کی حالت میں پڑھو۔ غرض میں کہاں تک بیان کروں کہ ان بلاؤں میں کیا لذت اور مزا ہوتا ہے اور عاشق صادق کہاں تک ان سے محظوظ ہوتا ہے۔ مختصر طور پر یاد رکھو کہ ان بلاؤں کا پھل اور نتیجہ جو ابرار اور اخیار پر آتی ہیں جنت اور ترقی درجات ہے اور وہ بلائیں اور غم جو مفسدوں اور شریروں پر آتے ہیں ان کی وجہ شامتِ اعمال اور تاریک زندگی ہے اور اس کا نتیجہ جہنم اور عذاب الٰہی ہے۔ پس جو شخص آگ کے پاس جاتا ہے ضرور ہے کہ وہ اس کی سوزش سے حصہ لے اور اسے محسوس کرے اور اسے دکھ پہنچے لیکن جو ایک باغ میں جاتا ہے یقینی امر ہے کہ اس کے پھلوں اور پھولوں کی خوشبو سے اور اس خوبصورت نظارہ کے مشاہدہ سے لذت پاوے۔

اب واضح رہے کہ جس حال میں وہ بلائیں جو شامت اعمال کی وجہ سے آتی ہیں اور جن کا نتیجہ جہنمی زندگی اور عذاب الٰہی ہے اِن بلاؤں سے جو ترقی درجات کے طور پر اخیار و ابرار کو آتی ہیں الگ ہیں کیا کوئی ایسی صورت بھی رہے جو انسان اس عذاب سے نجات پاوے؟

اس عذاب اور دکھ سے رہائی کی بجز اس کے کوئی تجویز اور علاج نہیں ہے کہ انسان سچے دل سے توبہ کرے جب تک سچی توبہ نہیں کرتا یہ بلائیں جو عذاب الٰہی کے رنگ میں آتی ہیں اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کو نہیں بدلتا جو اس بارے میں اس نے مقرر فرما دیا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ[۵] یعنی جب تک کوئی قوم اپنی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی اللہ تعالیٰ بھی اس کی حالت نہیں بدلتا۔

خدا تعالیٰ ایک تبدیلی چاہتا ہے اور وہ پاکیزہ تبدیلی ہے جب تک وہ تبدیلی نہ ہو عذاب الٰہی سے رستگاری اور مخلصی نہیں ملتی.... پس جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کے لیے تبدیلی ہو یعنی وہ ان عذابوں اور دکھوں سے رہائی پائے جو شامت اعمال نے اس کے لیے طیار کیے ہیں اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔ جب وہ خود تبدیلی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ میں کیا ہے اس کے عذاب اور دکھ کو بدلا دیتا ہے اور دکھ کو سکھ سے تبدیل کر دیتا ہے.....

اِس امر کے دلائل بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنی اس مختصر زندگی میں بلاؤں سے محفوظ رہنے کا کس قدر محتاج ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اِن بلاؤں اور رد باؤں سے محفوظ رہے جو شامت اعمال کی وجہ سے آتی ہیں اور یہ ساری باتیں سچی توبہ سے حاصل ہوتی ہیں پس توبہ کے فوائد میں سے ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کا حافظ اور نگران ہو جاتا ہے۔ اور ساری بلاؤں کو خدا دور کر دیتا ہے۔ اور اُن منصوبوں سے جو دشمن اُس کے لیے طیار کرتے ہیں ان سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کا یہ فضل اور برکت کسی سے خاص نہیں بلکہ جس قدر بندے ہیں خدا تعالیٰ کے ہی ہیں اس لیے ہر ایک شخص جو اس کی طرف آتا ہے اور اس کے احکام اور اوامر کی پیروی کرتا ہے وہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسے پہلا شخص توبہ کر چکا ہے وہ ہر ایک سچی توبہ کرنے والے کو بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ {الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ صفحہ ۲-۳ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء}

[۵] - الرعد: ۱۲

ثمرات سے مراد اولاد ہے۔ اور یہ خدا کی طرف سے ابتلا ہوتے ہیں اور یہی انسان کا امتحان ہوتا ہے ہاں یہ باتیں اور کامل ایمان حاصل ہوتا ہے توبہ استغفار سے۔ اس کی کثرت کرو اور رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ[1] پڑھا کرو۔ اور اس کی کثرت کرو خدا تعالیٰ نعم البدل عطا کریگا۔ خدا کا دامن نہ چھوڑنے والا گنہگار ہو کر بھی بخشا جاتا ہے۔ ہاں تعلق توڑنا بُری بات ہے اور یہ زہر قاتل ہے پس توبہ استغفار کرو اور نمازوں میں دعائیں کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہو۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۴۴-۴۵ مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

ماتم کی حالت میں جزع فزع اور نوحہ یعنی سیاپا کرنا اور چیخیں مار کر رونا اور بےصبری کے کلمات زبان پر لانا یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ جن کے کرنے سے ایمان کے جانے کا اندیشہ ہے اور یہ سب رسمیں ہندوؤں سے لی گئی ہیں جاہل مسلمانوں نے اپنے دین کو بھلا دیا اور ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر لیں۔ کسی عزیز اور پیارے کی موت کی حالت میں مسلمانوں کے لیے قرآن شریف میں یہ حکم ہے کہ صرف اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہیں۔ یعنی ہم خدا کا مال اور ملک ہیں۔ اسے اختیار ہے جب چاہے اپنا مال لے لے۔ اور اگر رونا ہو۔ تو صرف آنکھوں سے آنسو بہانا جائز ہے اور جو اس سے زیادہ کرے۔ وہ شیطان سے ہے۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۲)

انسان کے واسطے ترقی کرنے کے دو ہی طریق ہیں اوّل تو انسان تشریعی احکام یعنی نماز روزہ زکوٰۃ۔ اور حج وغیرہ تکالیف شرعیہ کی پابندی سے جو کہ خدا کے حکم کے موجب خود بجالا کرتا ہے۔ مگر یہ امور چونکہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتے ہیں اس لیے کبھی ان میں سستی اور تساہل بھی کر بیٹھتا ہے۔ اور کبھی ان میں کوئی آسانی اور آرام کی صورت ہی پیدا کر لیتا ہے لہٰذا دوسرا وہ طریق ہے۔ جو براہ راست خدا کی طرف سے انسان پر وارد ہوتا ہے۔ اور یہی انسان کی اصلی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ تکالیف شرعیہ میں انسان کوئی نہ کوئی راہ بچاؤ یا آرام و آسائش کی نکال ہی لیتا ہے دیکھو کسی کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر اگر اسے کہا جاوے کہ اپنے بدن پر مارو۔ تو قاعدہ کی بات ہے۔ کہ آخر اپنے بدن کی محبت دل میں آہی جاتی ہے کون ہے جو اپنے آپ کو دُکھ میں ڈالنا چاہتا ہے؟ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے انسانی تکمیل کے واسطے ایک دوسری راہ رکھدی۔ اور فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ہم آزماتے رہیں گے۔ تم کو کبھی کسی قدر خوف بھیج کر کبھی فاقہ سے کبھی مال جان اور پھلوں پر نقصان وارد کرنے سے مگر ان مصائب شدائد اور فقر و فاقہ پر صبر کر کے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہنے والے کو بشارت دیدو کہ ان کے واسطے بڑے بڑے اجر خدا کی رحمتیں اور اس کے خاص انعامات مقرر ہیں۔ دیکھو ایک

---

[1] اعراف: ۲۴

کسان کس محنت اور جانفشانی سے قلبہ رانی کرکے زمین کو درست کرتا پھر تخم ریزی کرتا۔ آبپاشی کی مشکلات جھیلتا ہے۔ آخر جب طرح طرح کی مشکلات محنتوں اور حفاظتوں کے بعد کھیتی تیار ہوتی ہے۔ تو بعض اوقات خدا کی باریک در باریک حکمتوں سے ژالہ باری ہو جاتی یا کبھی خشک سالی ہی کی وجہ سے کھیتی تباہ و برباد ہو جاتی ہے غرض یہ ایک مثال ہے۔ ان مشکلات کی جن کا نام تکالیف قضا و قدر ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو جو پاک تعلیم دی گئی ہے وہ کیسی رضا بالقضا کا سچا نمونہ اور سبق ہے اور یہ بھی صرف مسلمانوں ہی کا حصہ ہے آریہ جو کہ روح اور ذات کو مع ان کے خواص کے خود بخود اور خدا کی طرح ازلی ابدی مانتے ہیں وہ کیونکر اِنَّا لِلّٰہِ کہہ سکتے ہیں اور یہ توفیق ان کو کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔

غرض تکالیف دو ہی قسم کی ہیں ایک حصہ تو وہ ہے جو احکام پر مشتمل ہے۔ جن میں نماز روزہ زکوٰۃ حج وغیرہ داخل ہیں۔ ان میں کسی قدر عذر اور حیلے وغیرہ کی بھی گنجایش ہے۔ اور جب تک پورا اخلاص اور کامل یقین نہ ہو انسان ان سے کسی نہ کسی قدر بچنے کی یا آرام کی صورت پیدا کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتا ہے۔ پس اس طرح کی کوئی کسر جو انسانی کمزوری کی وجہ سے رہ گئی ہو۔ اس کسر کے پورا کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے تکالیف قضا و قدر رکھ دی ہیں: تاکہ انسانی فطرت کی کمزوری کی وجہ سے جو کمی رہ گئی ہو۔ خدا کے فضل کے ہاتھ سے پوری ہو جاوے۔ تکالیف قضاء و قدر کا نام آریہ لوگ پہلی جون کا پھل رکھتے ہیں۔ مگر ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ اگر ایسا ہی ہے۔ تو پھر تمہارے جپ تپ کس مرض کی دوا ہیں۔ اگر آسمانی تکالیف تمہارے پہلے اعمال کا نتیجہ ہیں تو کیوں ایک اور عذاب جپ تپ کی مصیبت میں پڑ کر اپنے واسطے پیدا کرتے ہو؟

غرض یہ دونوں سلسلے کہ کبھی انسان تکالیف شرعیّہ کی پابندی کرکے اپنے ہاتھوں اور کبھی قضا و قدر کے آگے گردن جھکاتا ہے۔ اس واسطے ہیں کہ انسان کی تکمیل ہو جاوے۔ اسی کی طرف اشارہ کرکے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ[1] یعنی اسلام کیا ہے؟ یہی کہ اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے حصول کے واسطے گردن ڈال دینا۔ ابتلاؤں کا ہیبت ناک نظارہ لڑائی میں ننگی تلواروں کی چمک اور کھٹا کھٹ کی طرح آنکھوں کے سامنے موجود ہے جان جانے کا اندیشہ ہے مگر کسی بات کی پرواہ نہ کرکے خدا کے واسطے یہ سب کچھ اپنے نفس پر وارد کر لینا یہ ہے اسلام کی تعلیم کی لب لباب۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۰)

انسانی مدارج کی ترقی کے واسطے سماوی تکالیف بھی رکھی گئی ہیں۔ ان کا ذکر بھی خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں کیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔[2] یہ وہ مصائب ہیں جو خدا تعالیٰ اپنے ہاتھ سے ڈالتا ہے۔

---

[1] البقرہ: ۱۱۳

یہ ایک آزمائش ہے جس میں کبھی تو انسان پر ایک بھارے درجہ کا ڈر لاحق ہوتا ہے وہ ہر وقت اس خوف میں ہوتا ہے کہ شاید اب معاملہ بالکل بگڑ جائے گا۔ کبھی فقر و فاقہ شامل حال ہو جاتا ہے۔ ہر ایک امر میں انسان کا گذارا بہت تنگی سے ہونے لگتا ہے کبھی مال میں نقصان نمودار ہوتا ہے۔ تجارت اور دکانداری بگڑ جاتی ہے۔ یا چور لے جاتے ہیں۔ کبھی ثمرات میں نقصان ہوتا ہے۔ یعنی پھل خراب ہو جاتے ہیں کھیتی ضائع ہو جاتی ہے یا اولاد عزیز مر جاتی ہے۔ محاورہ عرب میں اولاد کو بھی ثمر کہتے ہیں اولاد کا فتنہ بھی بہت سخت ہوتا ہے اکثر لوگ مجھے گھبرا کر خط لکھتے رہتے ہیں کہ آپ دعا کریں کہ میری اولاد ہو۔ اولاد کا فتنہ ایسا سخت ہے کہ بعض نادان اولاد کے مرجانے کے سبب دہریہ ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہ اولاد انسان کو ایسی عزیز ہوتی ہے کہ وہ اس کے واسطے خدا کا ایک شریک بن جاتی ہے بعض لوگ اولاد کے سبب سے دہریہ، ملحد اور بے ایمان بن جاتے ہیں۔ بعضوں کے بیٹے عیسائی بن جاتے ہیں تو وہ بھی اولاد کی خاطر عیسائی ہو جاتے ہیں بعض بچے چھوٹی عمر میں مرجاتے ہیں۔ تو وہ ماں باپ کے واسطے سلب ایمان کا موجب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ظالم نہیں۔ جب کسی پر صدمہ سخت ہو۔ اور وہ صبر کرے۔ تو جتنا صدمہ ہو۔ اتنا ہی اس کا اجر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ رحیم غفور اور ستار ہے۔ وہ انسان کو اس واسطے تکلیف نہیں پہنچاتا کہ وہ تکلیف اٹھا کر دین سے الگ ہو جائے۔ بلکہ تکالیف اس واسطے آتی ہیں کہ انسان آگے قدم بڑھائے۔ صوفیا کا قول ہے کہ ابتلاء کے وقت فاسق آدمی قدم پیچھے ہٹاتا ہے لیکن صالح آدمی اور بھی قدم آگے بڑھاتا ہے۔

(بدر جلد ۷ عـ۲ـ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صـ۴-۵ و الحکم جلد ۱۲ عـ۵ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۰۸ء صـ۳)

جب میں آپ کی ان تکلیفوں کو دیکھتا ہوں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ان کریمانہ قدرتوں کو جن کو میں نے بذات خود آزمایا ہے۔ اور جو میرے پر وارد ہو چکے ہیں تو مجھے بالکل اضطراب نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خداوند کریم قادر مطلق ہے۔ اور بڑے بڑے مصائب شدائد سے مخلصی بخشتا ہے۔ اور جس کی معرفت زیادہ کرنا چاہتا ہے ضرور اس پر مصائب نازل کرتا ہے۔ تا اُسے معلوم ہو جائے۔ کیونکہ وہ نومیدی سے امید پیدا کر سکتا ہے۔ غرض فی الحقیقت وہ نہایت ہی قادر و کریم و رحیم ہے۔ (مکتوبات جلد پنجم نمبر (۲) صـ۲۱-۲۲۔ مکتوب ۱۴ بنام حضرت خلیفہ اولؓ)

گو کیسے عوارض شدیدہ ہوں خدا تعالیٰ کے فضل کی راہیں ہمیشہ کھلی ہیں اس کی رحمت کا امیدوار رہنا چاہیئے ہاں اس وقت اضطراب میں توبہ استغفار کی بہت ضرورت ہے۔ یہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص کسی بلا کے نزول کے وقت میں کسی ایسے عیب اور گناہ کو توبہ نصوح کے طور پر ترک کر دیتا ہے جس کا ایسی جلدی سے ترک کرنا ہرگز اس کے ارادہ میں نہ تھا۔ تو یہ عمل اس کے لیے ایک کفارہ عظیم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے سینہ کے کھلنے کے ساتھ ہی اس بلا کی تاریکی کھل جاتی ہے۔ اور روشنی امید کی پیدا ہو جاتی ہے۔

(مکتوبات جلد پنجم نمبر (۲) صـ۸۴ (مکتوب ۶۱ بنام حضرت خلیفہ اولؓ)

البقرة إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ○

یہ بات نہایت صاف اور ظاہر ہے کہ چونکہ انسان خدا کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے اُس کا تمام آرام اور ساری خوشحالی صرف اسی میں ہے کہ وہ سارا خدا کا ہی ہو جائے۔ اور حقیقی راحت کبھی ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک انسان اس حقیقی رشتہ کو جو اس کو خُدا سے ہے ممکن قوت سے حیّز فعل میں نہ لا وے۔ لیکن جب انسان خدا سے منہ پھیر لیوے تو اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے جیسا کہ کوئی شخص اُن کھڑکیوں کو بند کر دیوے جو آفتاب کی طرف تھیں اور کچھ شک نہیں کہ اُن کے بند کرنے کے ساتھ ہی ساری کوٹھڑی میں اندھیرا پھیل جائے گا۔ اور وہ روشنی جو محض آفتاب سے ملتی ہے یک لخت دور ہو کر ظلمت پیدا ہو جائے گی۔ اور وہی ظلمت ہے جو ضلالت اور جہنم سے تعبیر کی جاتی ہے کیونکہ دکھوں کی وہی جڑ ہے اور اُس ظلمت کا دور ہونا اور اس جہنم سے نجات پانا اگر قانون قدرت کے طریق پر تلاش کی جائے تو کسی کے مصلوب کرنے کی حاجت نہیں بلکہ وہی کھڑکیاں کھول دینی چاہئیں جو ظلمت کی باعث ہوئی تھیں۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ہم درحالیکہ نور پانے کی کھڑکیوں کے بند رکھنے پر اصرار کریں کسی روشنی کو پا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں سو گناہ کا معاف ہونا کوئی قصہ کہانی نہیں جس کا ظہور کسی آئندہ زندگی پر موقوف ہو۔ اور یہ بھی نہیں کہ یہ امور محض بے حقیقت اور مجازی گورنمنٹوں کی نافرمانیوں اور قصور بخشی کے رنگ میں ہیں بلکہ اُس وقت انسان کو مجرم یا گنہ گار کہا جاتا ہے کہ جب وہ خدا سے اعراض کر کے اُس روشنی کے مقابلہ سے پرے ہٹ جاتا اور اُس چمک سے اُدھر اُدھر ہو جاتا ہے جو خُدا سے اترتی اور دلوں پر نازل ہوتی ہے۔ اس حالت موجودہ کا نام خدا کی کلام میں جُناح ہے جس کو پارسیوں نے مبدّل کر کے گناہ بنا لیا ہے اور جنح جو اس کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں مَیل کرنا اور اصل مرکز سے ہٹ جانا۔ پس اس کا نام جُناح یعنی گناہ اس لیے ہوا کہ انسان اعراض کر کے اس مقام کو چھوڑ دیتا ہے جو الٰہی روشنی پڑنے کا مقام ہے اور اُس خاص مقام سے دوسری طرف میل کر کے اُن نوروں سے اپنے تئیں دور ڈالتا ہے جو اس سمت مقابل میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہی جرم کا لفظ جس کے معنے بھی گناہ ہیں جَرْم سے مشتق ہے اور جرم عربی زبان میں کاٹنے کو کہتے ہیں پس جُرْم کا نام اس لیے جُرْم ہوا کہ جرم کا مرتکب اپنے تمام تعلقات خدا تعالیٰ سے کاٹتا ہے اور باعتبار مفہوم کے جُرم کا لفظ جُناح کے لفظ سے سخت تر ہے کیونکہ جُناح صرف میل کا نام ہے

جس میں کسی طرح کا ظلم ہو مگر جرم کا لفظ کسی گناہ پر اس وقت صادق آئے گا کہ جب ایک شخص عمداً خدا کے قانون کو توڑ کر اور اُس کے تعلقات کی پرواہ نہ رکھ کر کسی نافرمانی امر کا دیدہ و دانستہ ارتکاب کرتا ہے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۵۴-۵۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ [1]

یعنی جو لوگ خدا تعالیٰ کی اُن کھلی کھلی تعلیمات اور ہدایتوں کو لوگوں پر پوشیدہ رکھتے ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اُن پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہے! اور نیز اُس کے بندوں کی بھی لعنت۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دوم صفحہ ۴۶)

قرآن شریف جس آواز بلند سے سخت زبانی کے طریق کو استعمال کر رہا ہے ایک غایت درجہ کا غبی اور سخت درجہ کا نادان بھی اُس سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً زمانہ حال کے مہذبین کے نزدیک کسی پر لعنت بھیجنا ایک سخت گالی ہے لیکن قرآن شریف کفار کو سُنا سُنا کر اُن پر لعنت بھیجتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (الجزو ۲ سورہ بقرہ) اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۔ الجزو ۲

(ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۲۵-۲۶ حاشیہ)

میں سچ سچ کہتا ہوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے میں نے ایک لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کیا جس کو دشنام دہی کہا جائے بڑے دھوکہ کی بات یہ ہے کہ اکثر لوگ دشنام دہی اور بیان واقعہ کو ایک ہی صورت میں سمجھ لیتے ہیں اور ان دونوں مختلف مفہوموں میں فرق کرنا نہیں جانتے بلکہ ایسی ہر یک بات کو جو دراصل ایک واقعی امر کا اظہار ہو اور اپنے محل پر چسپاں ہو محض اس کے کسی قدر مرارت کی وجہ سے جو حق گوئی کے لازم حال ہوا کرتی ہے دشنام ہی تصور کر لیتے ہیں۔ حالانکہ دشنام اور سب اور شتم فقط اُس مفہوم کا نام ہے جو خلاف واقعہ اور دروغ کے طور پر محض آزار رسانی کی غرض سے استعمال کیا جائے اور اگر ہر یک سخت اور آزار دہ تقریر کو محض بوجہ اس کے مرارت اور تلخی اور ایذا رسانی کے دشنام کے مفہوم میں داخل کر سکتے ہیں تو پھر اقرار کرنا پڑے گا کہ سارا قرآن شریف گالیوں سے پُر ہے کیونکہ جو کچھ بُتوں کی ذلّت اور بُت پرستوں کی حقارت اور اُن کے بارے میں لعنت ملامت کے سخت الفاظ قرآن شریف میں استعمال کیے گئے ہیں یہ ہرگز ایسے نہیں ہیں جن کے سُننے سے بت پرستوں کے دل خوش ہوئے ہوں۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۱۳-۱۴)

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۶۲-۱۶۳۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَبَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝

یعنی تحقیق آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے اختلاف اور ان کشتیوں کے چلنے میں جو دریا میں لوگوں کے نفع کے لیے چلتی ہیں اور جو کچھ خدا نے آسمان سے پانی اُتارا اور اُس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور زمین میں ہر ایک قسم کے جانور بکھیر دیئے اور ہواؤں کو پھیرا اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں مسخّر کیا یہ سب خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید اور اُس کے الہام اور اس کے مدبر بالارادہ ہونے پر نشانات ہیں۔

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ جلشانہ نے اپنے اس اصول ایمانی پر کیسا استدلال اپنے اس قانون قدرت سے کیا یعنی اپنے ان مصنوعات سے جو زمین و آسمان میں پائی جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے مطابق منشاء اس آیت کریمہ کے صاف صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بیشک اس عالم کا ایک صانع قدیم اور کامل اور وحدہ لاشریک اور مدبر بالارادہ اور اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے والا ہے۔ وجہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی یہ تمام مصنوعات اور یہ سلسلہ نظام عالم کا جو ہماری نظر کے سامنے موجود ہے یہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ یہ عالم خود بخود نہیں بلکہ اس کا ایک موجد اور صانع ہے جس کے لیے یہ ضروری صفات ہیں کہ وہ رحمان بھی ہو اور رحیم بھی ہو اور قادر مطلق بھی ہو اور واحد لاشریک بھی ہو اور ازلی ابدی بھی ہو اور مدبر بالارادہ بھی ہو اور مستجمع جمیع صفات کاملہ بھی ہو اور وحی کو نازل کرنے والا بھی ہو۔

(جنگ مقدس بیان ۲۵ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۵۰)

ہواؤں اور بادلوں کو پھیرنا یہ خدا تعالیٰ کا ہی کام ہے اور اس میں عقلمندوں کو خدا تعالیٰ کی ہستی اور اُس کے اختیار کامل کا پتہ لگتا ہے۔ اور یہ پھیرنا دو قسم پر ہے ایک ظاہری طور پر اور وہ یہ ہے کہ ہواؤں اور بادلوں کو ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف اور ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف پھیرا جائے دوسری قسم پھیرنے کی باطنی طور پر ہے۔ اور وہ یہ کہ ہواؤں اور بادلوں میں ایک کیفیت تریاقی یا سمّی پیدا کر دی جائے تا موجب

امن وآسایش خلق ہوں یا امراض وبائیہ کا موجب ٹھہریں۔ سوان دونوں قسموں کے پھیرنے میں انسان کا دخل نہیں اور بکلی انسانی طاقت سے باہر ہیں۔ اور بایں ہمہ ایک یہ مشکل بھی پیش ہے کہ ہماری صحت یا عدم صحت کا مدار صرف ان ہی دو چیزوں پر نہیں بلکہ ہزار در ہزار اسباب ارضی وسماوی اور بھی ہیں جو دقیق در دقیق اور انسان کی فکر اور نظر سے مخفی ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام اسباب اُس کی جدوجہد سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ انسان کو اُس خدا کی طرف رجوع کرنے کی حاجت ہے جس کے ہاتھ میں یہ تمام اسباب اور اسباب در اسباب ہیں۔

(ایام الصلح صـ۷-۸)

خدا نے ایک ایسا پانی اُتارا ہے جس سے مردہ زمین زندہ ہو رہی ہے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور انکے جوابات صـ)

طبعی تحقیقاتیں جہاں تک ہوتی چلی جائیں گی وہاں توحید ہی توحید نکلتی چلی جائے گی اللہ تعالیٰ اس آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیہ میں تبلاتا ہے کہ جس خدا کو قرآن پیش کرتا ہے اُس کے لیے زمین آسمان دلائل سے بھرے پڑے ہیں۔ مجھے ایک حکیم کا مقولہ بہت ہی پسند آتا ہے کہ اگر کل کتابیں دریا بُرد کر دی جاویں تو پھر بھی اسلام کا خدا باقی رہ جائے گا۔ اس لیے کہ وہ مثلث اور کہانی نہیں۔ اصل میں پختہ بات وہی ہے جس کی صداقت کسی خاص چیز پر منحصر نہ ہو کہ اگر وہ نہ ہو تو اُس کا پتہ ہی ندارد۔ قصہ کہانی کا نقش نہ دل میں ہوتا ہے نہ صحیفہ فطرت میں۔ جب تک ہی پنڈت پاندھے یا پادری نے یاد رکھا۔ ان کا کوئی وجود مسلم رہا۔ زاں بعد حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صـ۷۱-۷۲)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ○

جاننا چاہیئے کہ قُربِ الٰہی کی تین قسمیں تین قسم کی تشبیہ پر موقوف ہیں جن کی تفصیل سے مراتب ثلاثہ قرب کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اوّل قسم قُرب کی خادم اور مخدوم کی تشبیہ سے مناسبت رکھتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ۔ یعنی مومن جن کو دوسرے لفظوں میں بندہ فرماں بردار کہہ سکتے ہیں سب چیز سے زیادہ اپنے مولیٰ سے محبّت رکھتے ہیں تفصیل اِس کی یہ ہے کہ جیسے ایک نوکر با اخلاص و با صفا و باوفا بوجہ

مشاہدہ احسانات متواترہ وانعامات متکاثرہ وکمالات ذاتیہ اپنے آقا کی اِس قدر محبّت واخلاص ویکرنگی میں ترقّی کرجاتا ہے جو بوجہ ذاتی محبّت کے جو اُس کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے اپنے آقا سے ہم طبیعت وہم طریق ہو جاتا ہے اور اُس کی مرادات کا ایسا ہی طالب اور خواہاں ہوتا ہے جیسے آقا خود اپنی مرادات کا خواہاں ہے۔ اسی طرح بندہ وفادار کی حالت اپنے مولیٰ کریم کے ساتھ ہوتی ہے یعنی وُہ بھی اپنے خلوص اور صدق وصفا میں ترقّی کرتا کرتا اُس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے وجود سے بکلّی محو وفنا ہوکر اپنے مولیٰ کریم کے رنگ میں مل جاتا ہے۔

آنجا کہ محبّتے نمک میریزد — ہر پردہ کہ بود ازمیاں برخیزد
این نفس دنی کہ صد ہزارش دہن است — خاموش شود چو عشق شور انگیزد
چوں رنگ خودی رود کسی را از عشق — یارش زکرم برنگ خویش آمیزد

سو ایسا خادم جو ہمرنگ اور ہم طبیعت مخدوم ہو رہا ہے طبعی طور پر اُن سب باتوں سے متنفر ہو جاتا ہے جو اُس کے مخدوم کو بُری معلوم ہوتی ہیں۔ وہ نافرمانی کو اس جہت سے نہیں چھوڑتا کہ اُس پر سزا مترتب ہوگی اور تعمیل حکم اِس وجہ سے نہیں کرتا کہ اُس سے انعام ملیگا اور کوئی قول یا فعل اُس کا اپنے اخلاق کاملہ کے تقاضا سے صادر نہیں ہوتا بلکہ محض اپنے مخدوم حقیقی کی اطاعت کی وجہ سے جو اُس کی سرشت میں رچ گئی ہے صادر ہوتا ہے اور بے اختیار اُسی کی طرف اور اُس کی مرضیات کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے وہ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری گال کا پھیرنا خواہ نخواہ واجب نہیں جانتا اور نہ طمانچہ کی جگہ طمانچہ مارنا اُس کو لابدًا ضروری معلوم ہوتا ہے بلکہ وُہ اپنے یکرنگ دل سے فتویٰ پوچھتا ہے جو اُس وقت خاص میں اُس کے محبوب حقیقی کی مرضی کیا ہے اور اِس بات کے لیے کوئی معقول وجہ تلاش کرتا ہے کہ کس طریق کے اختیار کرنے میں زیادہ تر خیر ہے جو موجب خوشنودی حضرت باری جلّ شانہٗ ہے آیا عفو میں یا انتقام میں سو جو عمل موجودہ حالت کے لیے قرین بصواب ہو اُسی کو بروئے کار لاتا ہے اسی طرح اُس کی بخشش اور عطا بھی سخاوت جمیلہ کے تقاضا سے نہیں ہوتی بلکہ اطاعت کامل کی وجہ سے ہوتی ہے اور اُسی اطاعت کے جوش سے وقت موجودہ میں خوب سوچ لیتا ہے کہ کیا اِس وقت اِس طرز کی سخاوت یا ایسے شخص پر احسان ومروّت مقرون بمرضی مولیٰ ہوسکتی ہے اور اگر نامناسب دیکھتا ہے تو ایک حبّہ خرچ نہیں کرتا اور کسی ملامت کنندہ کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈرتا غرض احمقانہ تقلید سے وُہ کوئی کام بھی نہیں کرتا بلکہ سچی اور کامل محبّت کی وجہ سے اپنے آقا کا مزاجدان ہوجاتا ہے اور یکرنگی اور اتحاد کی روشنی جو اُس کے دل میں ہے وُہ ہر ایک تازہ وقت میں تازہ طور پر اُس کو سمجھا دیتی ہے جو اِس خاص وقت میں کیونکر اور کس طرز سے کوئی کام کرنا چاہیئے جو مخدوم حقیقی کے منشاء کے مطابق ہو اور چونکہ اُس کو اپنے منعم حقیقی سے ایک تعلق ذاتی پیدا ہوجاتا ہے اِس لیے اطاعت اور فرماں برداری اُس کے سر پر کوئی آزار رساں بوجھ نہیں ہوتا بلکہ وُہ فرماں برداری اُس کے ایک امر طبعی کے حکم میں ہوجاتی ہے

جو بالطبع مرغوب اور بلا تصنع و تکلف اُس سے صادر ہوتی رہتی ہے اور جیسے اللہ جلّ شانہٗ کو اپنی خوبی اور عظمت محبوب بالطبع ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا جلال ظاہر کرنا اس کے لیے محبوب بالطبع ہو جاتا ہے اور اپنے مخدوم حقیقی کی ہر ایک عادت و سیرت اس کی نظر میں ایسی پیاری ہو جاتی ہے کہ جیسی خود اُس کو پیاری ہے۔ سو یہ مقام اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کے سینے محبت غیر سے بالکل منزّہ و صاف ہو جاتے ہیں اور خدائے تعالیٰ کی رضامندی کو ڈھونڈنے کے لیے ہر ایک وقت جان قربان کرنے کو طیار رہتے ہیں۔

سینہ می باید تہی از غیر یار دل ہمی باید پر از یادِ نگار
جاں ہمی باید براہِ او فدا سر ہمی باید بہ پائے او نثار
ہیچ دانی چیست دینِ عاشقاں گویمت گر بشنوی عشّاق وار
از ہمہ عالم فروبستن نظر لوحِ دل شُستن زغیرِ دوستدار

قرب کی دوسری قسم ولد اور والد کی تشبیہ سے مناسبت رکھتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا[1]۔ یعنی اپنے اللہ جلّ شانہٗ کو ایسے دلی جوش محبت سے یاد کرو جیسا باپوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ مخدوم اُس وقت باپ سے مشابہ ہو جاتا ہے جب محبت میں غایت درجہ شدت واقعہ ہو جاتی ہے اور حُبّ جو ہریک کدورت اور غرض سے مُصفّا ہے دل کے تمام پردے چیر کر دل کی جڑھ میں اس طرح سے بیٹھ جاتی ہے کہ گویا اُس کی جُزء ہے تب جس قدر جوش محبت اور پیوند شدید اپنے محبوب سے ہے وُہ سب حقیقت میں مادرزاد معلوم ہوتا ہے اور ایسا طبیعت سے ہمرنگ اور اُس کی جُز ہو جاتا ہے کہ سعی اور کوشش کا ذریعہ ہرگز یاد نہیں رہتا اور جیسے بیٹے کو اپنے باپ کا وجود تصوّر کرنے سے ایک روحانی نسبت محسوس ہوتی ہے ایسا ہی اس کو بھی ہر وقت باطنی طور پر اُس نسبت کا احساس ہوتا رہتا ہے اور جیسے بیٹا اپنے باپ کا حُلیہ اور نقوش نمایاں طور پر اپنے چہرہ پر ظاہر رکھتا ہے اور اُس کی رفتار اور کردار اور خو اور بو بصفائی تام اُس میں پائی جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس یہی حال اس میں ہوتا ہے اور اس درجہ اور قربِ اوّل کے درجہ میں فرق یہ ہے کہ قربِ اوّل کا درجہ جو خادم اور مخدوم سے تشبیہ رکھتا ہے وہ بھی اگرچہ اپنے کمال کے رو سے اس درجہ ثانیہ سے نہایت مشابہ ہے لیکن یہ درجہ اپنی نہایت صفائی کی وجہ سے تعلق مادرزاد کے قائم مقام ہو گیا ہے اور جیسا باعتبار نفس انسانیت کے دو انسان مساوی ہوتے ہیں لیکن بلحاظ شدّت و ضُعف خواص انسانی کے ظہور آثار میں متفاوت واقع ہوتے ہیں ایسا ہی ان دونوں درجوں میں تفاوت درمیان ہے غرض اس درجہ میں محبت کمال لطافت تک پہنچ جاتی ہے اور مناسبت اور مشابہت بال بال میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ خیال کرنا چاہیئے کہ اگرچہ ایک شخص کمال عشق کی حالت میں اپنے معشوق سے ہمرنگ

---

[1] البقرہ: ۲۰۱

ہو جاتا ہے مگر جو شخص اپنے باپ سے جس سے وہ نکلا ہے مشابہت رکھتا ہے اُس کی مشابہت اور ہی آب و تاب رکھتی ہے۔

تیسرے قسم کا قُرب ایک ہی شخص کی صورت اور اُس کے عکس سے مشابہت رکھتا ہے یعنی جیسے ایک شخص آئینہ صاف وسیع میں اپنی شکل دیکھتا ہے تو تمام شکل اُس کی معہ اپنے تمام نقوش کے جو اُس میں موجود ہیں عکسی طور پر اُس آئینہ میں دکھائی دیتی ہے ایسا ہی اِس قسمِ ثالث قُرب میں تمام صفات الہٰیّہ صاحب قُرب کے وجود میں بہ تمامتر صفائی منعکس ہو جاتی ہے اور یہ انعکاس ہر یک قسم کی تشبّہ سے جو پہلے اِس سے بیان کیا گیا ہے اتم و اکمل ہے کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ جیسے ایک شخص آئینہ صاف میں اپنا مُونہہ دیکھ کر اُس شکل کو اپنی شکل کے مطابق پاتا ہے وُہ مطابقت اور مشابہت اُس کی شکل سے نہ کسی غیر کو کسی حیلہ یا تکلّف سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی فرزند میں ایسی ہو بہو مطابقت پائی جاتی ہے اور یہ مرتبہ کس کے لئے میسّر ہے اور کون اِس کامل درجہ قُرب سے موسوم ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ اُسی کو میسّر آتا ہے کہ جو الوہیّت و عبودیت کے دونوں قوسوں کے بیچ میں کامل طور پر ہو کر دونوں قوسوں سے ایسا شدید تعلق پکڑتا ہے کہ گویا اُن دونوں کا عین ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو بکلّی درمیان سے اُٹھا کر آئینہ صاف کا حُکم پیدا کر لیتا ہے اور وہ آئینہ ذوجہتین ہونے کی وجہ سے ایک جہت سے صورت الہٰیّہ بطور ظلّی حاصل کرتا ہے اور دوسری جہت سے وُہ تمام فیض حسب استعداد طبائع مختلفہ اپنے مقابلین کو پہنچاتا ہے اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[1] (سرمہ چشم آریہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴-۲۱۶)

جاننا چاہیئے کہ محبّت کوئی تصنع اور تکلف کا کام نہیں بلکہ انسانی قویٰ میں سے یہ بھی ایک قوت ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ دل کا ایک چیز کو پسند کر کے اُس کی طرف کھینچے جانا اور جیسا کہ ہر ایک چیز کے اصل خواص اُس کے کمال کے وقت بدیہی طور پر محسوس ہوتے ہیں یہی محبت کا حال ہے کہ اس کے جوہر بھی اُس وقت کُھلے کُھلے ظاہر ہوتے ہیں کہ جب اتم اور اکمل درجہ پر پہنچ جائے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ[2] یعنی انہوں نے گوسالہ سے ایسی محبت کی کہ گویا اُن کو گوسالہ شربت کی طرح پلا دیا گیا درحقیقت جو شخص کسی سے کامل محبّت کرتا ہے تو گویا اُسے پی لیتا ہے یا کھا لیتا ہے اور اُس کے اخلاق اور اُس کے چال چلن کے ساتھ رنگین ہو جاتا ہے اور جس قدر زیادہ محبت ہوتی ہے اسی قدر انسان بالطبع اپنے محبوب کی صفات کی طرف کھینچا جاتا ہے یہاں تک کہ اُسی کا روپ ہو جاتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے یہی بھید ہے کہ جو شخص خدا سے محبت کرتا ہے وہ ظلی طور پر بقدر اپنی استعداد کے اُس نور کو حاصل کر لیتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات میں ہے اور شیطان سے محبت کرنے والے وہ تاریکی حاصل کر لیتے ہیں جو شیطان میں ہے پس جب کہ محبت کی حقیقت یہ ہے تو پھر کیونکر ایک سچی کتاب جو منجانب اللہ ہے اجازت دے سکتی ہے کہ تم شیطان سے وہ محبت کرو جو خدا سے کرنی چاہیئے اور شیطان کے جانشینوں سے وہ پیار کرو جو رحمٰن کے جانشینوں سے کرنا چاہیئے۔ افسوس کہ پہلے تو انجیل کے باطل ہونے پر ہمارے پاس یہی ایک دلیل تھی کہ وہ ایک عاجز مشت خاک کو خدا بناتی ہے

---

[1] النجم: ۹-۱۰ ﴿ [2] البقرۃ: ۹۴ ﴾

اب یہ دوسری دلائل بھی پیدا ہوگئیں کہ اس کی دوسری تعلیمیں بھی گندی ہیں کیا یہ پاک تعلیم ہو سکتی ہے کہ شیطان سے ایسی ہی محبّت کرو جیسی خدا سے اور اگر یہ عذر کیا جائے کہ یسوع کے مُنہ سے سہواً یہ باتیں نکل گئیں کیونکہ وہ الٰہیات کے فلسفہ سے ناواقف تھا تو یہ عذر نکما اور فضول ہوگا کیونکہ اگر وہ ایسا ہی ناواقف تھا تو کیوں اُس نے قوم کے مصلح ہونے کا دعویٰ کیا کیا وہ بچہ تھا اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ محبت کی حقیقت بالالتزام اس بات کو چاہتی ہے کہ انسان سچے دل سے اپنے محبوب کے تمام شمائل اور اخلاق اور عبادات پسند کرے اور اُن میں فنا ہونے کے لیے بدل وجان ساعی ہوتا اپنے محبوب میں ہو کر وہ زندگی پاوے جو محبوب کو حاصل ہے سچی محبت کرنے والا اپنے محبوب میں فنا ہو جاتا ہے اپنے محبوب کے گریبان سے ظاہر ہوتا ہے اور ایسی تصویر اُس کی اپنے اندر کھینچتا ہے کہ گویا اُسے پی جاتا ہے اور کھا جاتا ہے کہ وہ اُس میں ہو کر اور اُس کے رنگ میں رنگین ہو کر اور اُس کے ساتھ ہو کر لوگوں پر ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اُس کی محبت میں کھویا گیا ہے۔

محبّت ایک عربی لفظ ہے اور اصل معنی اس کے پُر ہو جانا ہے چنانچہ عرب میں یہ مثل مشہور ہے کہ تَحَبَّبَ الْحِمَارُ یعنی جب عربوں کو یہ کہنا منظور ہوتا ہے کہ گدھے کا پیٹ پانی سے بھر گیا تو کہتے ہیں کہ تَحَبَّبَ الْحِمَارُ اور جب یہ کہنا منظور ہوتا ہے کہ اونٹ نے اتنا پانی پیا کہ وہ پانی سے پُر ہو گیا تو کہتے ہیں شَرِبَتِ الْاِبِلُ حَتّٰی تَحَبَّبَتْ اور حبّ جو دانہ کو کہتے ہیں وہ بھی اسی سے نکلا ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ وہ پہلے دانہ کی تمام کیفیت سے بھر گیا اور اُسی بنا پر احباب سونے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ جو دوسرے سے بھر جائے گا وہ اپنے وجود کو کھو دیگا گویا سو جائے گا اور اپنے وجود کی کچھ حس اُس کو باقی نہیں رہے گی پھر جبکہ محبت کی حقیقت یہ ہے تو ایسی انجیل جس کی یہ تعلیم ہے کہ شیطان سے بھی محبت کرو اور شیطانی گروہ سے بھی پیار کرو دوسرے لفظوں میں اُس کا ماحصل یہی نکلا کہ اُن کی بدکاری میں تم بھی شریک ہو جاؤ خوب تعلیم ہے ایسی تعلیم کیونکر خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو سکتی ہے بلکہ وہ تو انسان کو شیطان بنانا چاہتی ہے۔ خدا انجیل کی اس تعلیم سے ہر ایک کو بچاوے۔

اگر یہ سوال ہو کہ جس حالت میں شیطان اور شیطانی رنگ وروپ رکھنے والوں سے محبت کرنا حرام ہے تو کس قسم کا خلق اُن سے برتنا چاہیئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا پاک کلام قرآن شریف یہ ہدایت کرتا ہے کہ اُن پر کمال درجہ کی شفقت چاہیئے جیسا کہ ایک رحیم دل آدمی جذامیوں اور اندھوں اور لُولوں اور لنگڑوں وغیرہ دکھ والوں پر شفقت کرتا ہے اور شفقت اور محبّت میں یہ فرق ہے کہ محب اپنے محبوب کے تمام قول اور فعل کو بنظر استحسان دیکھتا ہے اور رغبت رکھتا ہے کہ ایسے حالات اُس میں بھی پیدا ہو جائیں مگر مشفق شخص مشفق علیہ کے حالات بنظر خوف وعبرت دیکھتا ہے اور اندیشہ کرتا ہے کہ شاید وہ شخص اس تباہ حالی میں ہلاک نہ ہو جائے اور حقیقی مشفق کی یہ علامت ہے کہ وہ شخص مشفق علیہ سے ہمیشہ نرمی سے پیش نہیں آتا بلکہ اُس کی نسبت محل اور

موقعہ کے مناسب حال کارروائی کرتا ہے اور کبھی نرمی اور کبھی درشتی سے پیش آتا ہے بعض وقت اُس کو شربت پلاتا ہے اور بعض اوقات ایک حاذق ڈاکٹر کی طرح اُس کا ہاتھ یا پیر کاٹتے ہیں اُس کی زندگی دیکھتا ہے اور بعض اوقات اُس کے کسی عضو کو چیرتا ہے اور بعض اوقات مرہم لگاتا ہے اگر تم ایک دن ایک بڑے شفاخانہ میں جہاں صدہا بیمار اور ہر یک قسم کے مریض آتے ہوں بیٹھ کر ایک حاذق تجربہ کار ڈاکٹر کی کارروائیوں کو مشاہدہ کرو تو اُمید ہے کہ مشفق کے معنے تمہاری سمجھ میں آجائیں گے سو تعلیم قرآنی ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ نیکوں اور ابرار اخیار سے محبت کرو اور فاسقوں اور کافروں پر شفقت کرو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَاعَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ[1] یعنی اے کافرو یہ نبی ایسا مشفق ہے جو تمہارے رنج کو دیکھ نہیں سکتا اور نہایت درجہ خواہشمند ہے کہ تم ان بلاؤں سے نجات پا جاؤ۔ پھر فرماتا ہے لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ[2] یعنی کیا تو اس غم سے ہلاک ہو جائے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ تو اُن کے غم میں ہلاک ہونے کے قریب ہے اور پھر ایک مقام میں فرماتا ہے تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَۃِ[3] یعنی مومن وہی ہیں جو ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی نصیحت کرتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ شدائد پر صبر کرو اور خدا کے بندوں پر شفقت کرو اس جگہ بھی مراد مرحمت سے شفقت ہے کیونکہ مرحمت کا لفظ زبان عرب میں شفقت کے معنوں پر مستعمل ہوتا ہے قرآنی تعلیم کا اصل مطلب یہ ہے کہ محبت جس کی حقیقت محبوب کے رنگ سے رنگین ہو جانا ہے بجز خدا تعالیٰ اور صلحا کے اور کسی سے جائز نہیں بلکہ سخت حرام ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ[4] اور پھر دوسرے مقام میں فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ[5] یعنی یہود اور نصاریٰ سے محبت مت کرو اور ہر ایک شخص جو صالح نہیں اس سے محبت مت کرو ان آیتوں کو پڑھ کر نادان عیسائی دھوکا کھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ عیسائی وغیرہ بے دین فرقوں سے محبت نہ کریں لیکن نہیں سوچتے کہ ہر یک لفظ اپنے محل پر استعمال ہوتا ہے جس چیز کا نام محبت ہے وہ فاسقوں اور کافروں سے اُسی صورت میں بجالانا متصور ہے کہ جب اُن کے کفر اور فسق سے کچھ حصہ لے لیوے نہایت سخت جاہل وہ شخص ہوگا جس نے یہ تعلیم دی کہ اپنے دین کے دشمنوں سے پیار کرو۔

ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ پیار اور محبت اسی کا نام ہے کہ اُس شخص کے قول اور فعل اور عادت اور خلق اور مذہب کو رضا کے رنگ میں دیکھیں اور اُس پر خوش ہوں اور اُس کا اثر اپنے دل پر ڈال لیں اور ایسا ہونا مومن سے کافر کی نسبت ہرگز ممکن نہیں ہاں مومن کافر پر شفقت کرے گا اور تمام دقائق ہمدردی بجالائے گا اور اُس کی جسمانی اور

---

[1] التوبہ : ۱۲۹ ⁘ [2] الشعراء : ۴ ⁘ [3] البلد : ۱۸ ⁘ [4] المائدۃ : ۵۲ ⁘ [5] اٰل عمران : ۱۱۹ ⁘

روحانی بیماریوں کا غمگسار ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ بغیر لحاظ مذہب ملت کے تم لوگوں سے ہمدردی کرو بھوکوں کو کھلاؤ غلاموں کو آزاد کرو قرضداروں کے قرض دو اور زیر باروں کے بار اُٹھاؤ اور بنی نوع سے سچی ہمدردی کا حق ادا کرو۔ اور فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی[1] یعنی خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ کہ احسان کرو جیسے بچہ سے اُس کی والدہ یا کوئی اور شخص محض قرابت کے جوش سے کسی کی ہمدردی کرتا ہے اور پھر فرماتا ہے لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ[2] یعنی نصاریٰ وغیرہ سے جو خدا نے محبت کرنے سے ممانعت فرمائی تو اس سے یہ نہ سمجھو کہ وہ نیکی اور احسان اور ہمدردی کرنے سے تمہیں منع کرتا ہے۔ نہیں بلکہ جن لوگوں نے تمہارے قتل کرنے کے لیے لڑائیاں نہیں کیں اور تمہیں تمہارے وطنوں سے نہیں نکالا۔ وہ اگرچہ عیسائی ہوں یا یہودی ہوں بے شک ان پر احسان کرو۔ اُن سے ہمدردی کرو۔ انصاف کرو۔ کہ خدا ایسے لوگوں سے پیار کرتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ[3] یعنی خدا نے جو تمہیں ہمدردی اور دوستی سے منع کیا ہے تو صرف اُن لوگوں کی نسبت جنھوں نے دینی لڑائیاں تم سے کیں اور تمہیں تمہارے وطنوں سے نکالا اور بس نہ کیا جب تک باہم مل کر تمہیں نکال نہ دیا سو اُن کی دوستی حرام ہے کیونکہ یہ دین کو مٹانا چاہتے ہیں اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تَوَلِّیْ[4] عربی زبان میں دوستی کو کہتے ہیں جس کا دوسرا نام مودت ہے اور اصل حقیقت دوستی اور مودت کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے سو مومن نصاریٰ اور یہود اور ہنود سے دوستی اور ہمدردی اور خیر خواہی کر سکتا ہے احسان کر سکتا ہے مگر اُن سے محبت نہیں کر سکتا یہ ایک باریک فرق ہے اس کو خوب یاد رکھو۔

پھر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مسلمان لوگ خدا کے ساتھ بھی بلا غرض محبت نہیں کرتے ان کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ خدا اپنی خوبیوں کی وجہ سے محبت کے لائق ہے۔

اما الجواب: پس واضح ہو کہ یہ اعتراض درحقیقت انجیل پر وارد ہوتا ہے نہ کہ قرآن پر کیونکہ انجیل میں یہ تعلیم ہرگز موجود نہیں کہ خدا سے محبت ذاتی رکھنی چاہیئے اور محبت ذاتی سے اُس کی عبادت کرنی چاہیئے مگر قرآن تو اس تعلیم سے بھرا پڑا ہے۔ قرآن نے صاف فرما دیا ہے فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا[5]۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ یعنی خدا کو ایسا یاد کرو جیسا کہ اپنے باپوں کو بلکہ اس سے بہت زیادہ اور مومنوں کی یہی

---

[1] النحل آیت ۹۱ ÷ [2] الممتحنہ آیت ۹ ÷ [3] الممتحنہ آیت ۱۰ ÷ [4] تولی کی تا اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تولی میں ایک تکلف ہے جو مغائرت پر دلالت کرتا ہے مگر محبت میں ایک ذرہ مغائرت باقی نہیں رہتی۔ منہ۔ [5] سورۃ البقرۃ: ۲۰۱ ÷

نشان ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر خدا سے محبت رکھتے ہیں یعنی ایسی محبت نہ وہ اپنے باپ سے کریں اور نہ اپنی ماں سے اور نہ اپنے دوسرے پیاروں سے اور نہ اپنی جان سے اور پھر فرمایا حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ[۱] یعنی خدا نے تمہارا محبوب ایمان کو بنادیا اور اُس کو تمہارے دلوں میں آراستہ کر دیا.....

اب سوچنا چاہیئے کہ اُن تمام آیات سے کس قدر صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف نے اعلیٰ طبقہ عبادت الٰہی کا اور اعمال صالحہ کا یہی رکھا ہے کہ محبت الٰہی اور رضا الٰہی کی طلب سچے دل سے ظہور میں آوے مگر اس جگہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عمدہ تعلیم جو نہایت صفائی سے بیان کی گئی ہے انجیل میں بھی موجود ہے ہم ہر ایک کو یقین دلاتے ہیں کہ اس صفائی اور تفصیل سے انجیل نے ہرگز بیان نہیں کیا...... اگر کہو کہ انجیل نے یہ سکھلا کر کہ خدا کو باپ کہو محبت ذاتی کی طرف اشارہ کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال سراسر غلط ہے کیونکہ انجیلوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے خدا کے بیٹے کا لفظ دو طور سے استعمال کیا ہے۔ ۱۔ اول تو یہ کہ مسیح کے وقت میں یہ قدیم رسم تھی کہ جو شخص رحم اور نیکی کے کام کرتا اور لوگوں سے مروت اور احسان سے پیش آتا تو وہ واشگاف کہتا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور اس لفظ سے اُس کی یہ نیت ہوتی تھی کہ جیسے خدا نیکوں اور بدوں دونوں پر رحم کرتا ہے اور اس کے آفتاب اور ماہتاب اور بارش سے تمام بھلے بُرے فائدہ اُٹھاتے ہیں ایسا ہی عام طور پر نیکی کرنا میری عادت ہے لیکن فرق اس قدر ہے کہ خدا تو ان کاموں میں بڑا ہے اور میں چھوٹا ہوں۔ سو انجیل نے بھی اس لحاظ سے خدا کو باپ ٹھیرایا کہ وہ بڑا ہے اور دوسروں کو بیٹا ٹھہرایا یہ نیت کر کے کہ وہ چھوٹے ہیں مگر اصل امر میں خدا سے مساوی کیا یعنی کمیت میں کمی بیشی کو مان لیا مگر کیفیت میں باپ بیٹا ایک رہے اور یہ ایک مخفی شرک تھا اس لیے کامل کتاب یعنی قرآن شریف نے اس طرح کی بول چال کو جائز نہیں رکھا یہودیوں میں جو ناقص حالت میں تھے جائز تھا اور اُنہیں کی تقلید سے یسوع نے اپنی باتوں میں بیان کر دیا چنانچہ انجیل کے اکثر مقامات میں اسی قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں کہ خدا کی طرح رحم کرو خدا کی طرح صلح کار بنو۔ خدا کی طرح دشمنوں سے بھی ایسی ہی بھلائی کرو جیسا کہ دوستوں سے تب تم خدا کے فرزند کہلاؤ گے کیونکہ اُس کے کام سے تمہارا کام مشابہ ہوگا صرف اتنا فرق رہا کہ وہ بڑا بمنزلہ باپ خدا اور تم چھوٹے بمنزلہ بیٹے کے ٹھیرے سو یہ تعلیم درحقیقت یہودیوں کی کتابوں سے لی گئی تھی اسی لیے یہودیوں کا اب تک یہ اعتراض ہے کہ یہ چوری اور سرقہ ہے بائیبل سے چُرا کر یہ باتیں انجیل میں لکھ دیں بہرحال یہ تعلیم ایک تو ناقص ہے اور دوسرے اس طرح کا بیٹا محبت ذاتی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ ۲۔ دوسری قسم کے بیٹے کا انجیل میں ایک بیہودہ بیان ہے جیسا کہ یوحنا باب ۱۰ آیت ۳۴ میں ہے یعنی اس درس میں بیٹا تو ایک طرف ہر ایک کو خواہ کیسا ہی بدمعاش ہو خدا بنا دیا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ نوشتوں کا باطل ہونا ممکن نہیں۔ غرض انجیل نے شخصی تقلید سے اپنی قوم کا ایک مشہور لفظ لے لیا

---

[۱] الحجرات: ۸

علاوہ اس کے یہ بات خود غلط ہے کہ خدا کو باپ قرار دیا جاوے۔ اور اس سے زیادہ تر نادان اور بے ادب کون ہوگا کہ باپ کا لفظ خدا تعالیٰ پر اطلاق کرے۔ (نور القرآن نمبر۲ صفحہ ۴۱-۴۶)

محبّت کا انتہا عبادت ہے اس لیے محبّت کا لفظ حقیقی طور پر خُدا سے خاص ہے اور نوع انسان کے لیے بجائے محبّت کے خدا کے کلام میں رحم اور احسان کا لفظ آیا ہے کیونکہ کمال محبت پرستش کو چاہتا ہے اور کمال رحم ہمدردی کو چاہتا ہے۔ اس فرق کو غیر قوموں نے نہیں سمجھا۔ اور خُدا کا حق غیروں کو دیا۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۴۱)

خدا کی محبت انسان کی محبت کی طرح نہیں جس میں یہ داخل ہے کہ جُدائی سے درد اور تکلیف ہو۔ بلکہ خدا کی محبت سے مراد یہ ہے کہ وہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ایسا پیش آتا ہے جیسا کہ مُحبّ پیش آتا ہے۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب حاشیہ صفحہ ۴۲)

محبّت کا لفظ جہاں کہیں باہم انسانوں کی نسبت آیا بھی ہو اس سے درحقیقت حقیقی محبت مراد نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی رو سے حقیقی محبت صرف خدا سے خاص ہے۔ اور دوسری محبتیں غیر حقیقی اور مجازی طور پر ہیں۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب حاشیہ صفحہ ۴۳)

پھر بعد اس کے لفظ اسلام کا مفہوم بھی محبّت پر ہی دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کے آگے اپنا سر رکھ دینا اور صدق دل سے قربان ہونے کے لیے طیّار ہو جانا جو اسلام کا مفہوم ہے یہ وہ عملی حالت ہے جو محبّت کے سرچشمہ سے نکلتی ہے۔ اسلام کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے صرف قولی طور پر محبّت کو محدود نہیں رکھا بلکہ عملی طور پر بھی محبت اور جانفشانی کا طریق سکھایا ہے۔ دنیا میں اور کونسا دین ہے جس کے بانی نے اُس کا نام اسلام رکھا ہے؟ اسلام نہایت پیارا لفظ ہے اور صدق اور اخلاص اور محبّت کے معنے کوٹ کوٹ کر اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ پس مُبارک وہ مذہب جس کا نام اسلام ہے۔ ایسا ہی خُدا کی محبّت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ یعنی ایماندار وہ ہیں جو سب سے زیادہ خُدا سے محبّت رکھتے ہیں۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۴۱)

خدا تو محبت اور اطاعت کی راہ بتاتا ہے چنانچہ خود قرآن شریف میں اُس نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ[۵] پھر کیا دنیا میں کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ بیٹا باپ کی محبت میں فنا ہو کر خود باپ بن جاوے باپ کی محبت میں فنا تو ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ باپ ہی ہو جاوے یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ فناءِ نظری ایک ایسی شے ہے جو محبّت سے ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن ایسی فنا جو درحقیقت بہانہ فنا کا ہو اور ایک جدید وجود کے پیدا کرنے کا باعث بنے کہ مَیں ہی ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

عبادت کے دو حصّے تھے۔ ایک وہ جو انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو ڈرنے کا حق ہے خدا تعالیٰ کا خوف

۵۔ البقرۃ: ۲۰۱

انسان کو پاکیزگی کے چشمہ کی طرف لے جاتا ہے اور اس کی روح گداز ہو کر الوہیت کی طرف بہتی ہے اور عبودیت کا حقیقی رنگ اسی میں پیدا ہو جاتا ہے۔

دوسرا حصہ عبادت کا یہ ہے کہ انسان خدا سے محبت کرے جو محبت کرنے کا حق ہے اسی لیے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اور دنیا کی ساری محبتوں کو غیر فانی اور آنی سمجھ کر حقیقی محبوب اللہ تعالیٰ ہی کو قرار دیا جاوے یہ دو حق ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی نسبت انسان سے مانگتا ہے ان دونوں قسم کے حقوق کے ادا کرنے کے لیے یوں تو ہر قسم کی عبادت اپنے اندر ایک رنگ رکھتی ہے مگر اسلام نے دو مخصوص صورتیں عبادت کی اُس کے لیے مقرر کی ہوئی ہیں۔ خوف اور محبّت دو ایسی چیزیں ہیں کہ بظاہر ان کا جمع ہونا بھی محال نظر آتا ہے کہ ایک شخص جس سے خوف کرے اس سے محبت کیونکر کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا خوف اور محبت ایک الگ رنگ رکھتی ہے جس قدر انسان خدا کے خوف میں ترقی کرے گا اسی قدر محبت زیادہ ہوتی جاویگی اور جس قدر محبت الٰہی میں وہ ترقی کرے گا اسی قدر خدا تعالیٰ کا خوف غالب ہو کر بدیوں اور برائیوں سے نفرت دلا کر پاکیزگی کی طرف لے جائے گا۔

پس اسلام نے ان دونوں حقوق کو پورا کرنے کے لیے ایک صورت نماز کی رکھی جس میں خدا کے خوف کا پہلو رکھا ہے اور محبت کی حالت کے اظہار کے لیے حج رکھا ہے۔ خوف کے جس قدر ارکان ہیں وہ نماز کے ارکان سے بخوبی واضح ہیں کہ کس قدر تذلل اور اقرار عبودیت اس میں موجود ہے اور حج میں محبت کے سارے ارکان پائے جاتے ہیں بعض وقت شدت محبت میں کپڑے کی بھی حاجت نہیں رہتی عشق بھی ایک جنون ہوتا ہے کپڑوں کو سنوار کر رکھنا یہ عشق میں نہیں رہتا۔ سیالکوٹ میں ایک عورت ایک درزی پر عاشق تھی اسے بہتیرا پکڑ کر رکھتے تھے وہ کپڑے پھاڑ کر چلی آتی تھی غرض یہ نمونہ جو انتہائے محبت کا لباس میں ہوتا ہے وہ حج میں موجود ہے۔ سر منڈایا جاتا ہے۔ دوڑتے ہیں محبت کا بوسہ رہ گیا وہ بھی ہے جو خدا کی ساری شریعتوں میں تصویری زبان میں چلا آیا ہے پھر قربانی میں بھی کمال عشق دکھایا ہے اسلام نے پورے طور پر ان حقوق کی تکمیل کی تعلیم دی ہے نادان ہے وہ شخص جو اپنی نابینائی سے اعتراض کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

مراتب قُرب و محبّت باعتبار اپنے روحانی درجات کے تین قسم پر منقسم ہیں سب سے ادنیٰ درجہ جو درحقیقت وہ بھی بڑا ہے یہ ہے کہ آتش محبت الٰہی لوح قلب انسان کو گرم تو کرے اور ممکن ہے کہ ایسا گرم کرے کہ بعض آگ کے کام اُس محرورسے ہوسکیں لیکن یہ کسر باقی رہ جائے کہ اُس متاثر میں آگ کی چمک پیدا نہ ہو اس درجہ کی محبّت پر جب خدا تعالیٰ کی محبّت کا شعلہ واقع ہو تو اس شعلہ سے جس قدر روح میں گرمی پیدا ہوتی ہے اُس کو سکینت و اطمینان اور کبھی فرشتہ و ملک کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

دوسرا درجہ محبت کا وہ ہے ..... جس میں دونوں محبتوں کے ملنے سے آتش محبت الٰہی لوح قلب انسان کو

اِس قدر گرم کرتی ہے کہ اُس میں آگ کی صورت پر ایک چمک پیدا ہو جاتی ہے لیکن اُس چمک میں کسی قسم کا اشتعال یا بھڑک نہیں ہوتی فقط ایک چمک ہوتی ہے جس کو روح القدس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تیسرا درجہ محبت کا وہ ہے جس میں ایک نہایت افروختہ شعلہ محبت الٰہی کا انسانی محبت کے مستعد فتیلہ پر پڑ کر اُس کو افروختہ کر دیتا ہے اور اُس کے تمام اجزا اور تمام رگ و ریشہ پر استیلا پکڑ کر اپنے وجود کا اتم اور اکمل مظہر اُس کو بنا دیتا ہے اور اِس حالت میں آتش محبت الٰہی لوح قلب انسان کو نہ صرف ایک چمک بخشتی ہے بلکہ معاً اُس چمک کے ساتھ تمام وجود بھڑک اُٹھتا ہے اور اُس کی لوئیں اور شعلے اِرد گرد کو روز روشن کی طرح روشن کر دیتے ہیں اور کسی قسم کی تاریکی باقی نہیں رہتی اور پورے طور پر اور تمام صفات کاملہ کے ساتھ وہ سارا وجود آگ ہی ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت جو ایک آتش افروختہ کی صورت پر دونوں محبتوں کے جوڑ سے پیدا ہو جاتی ہے اس کو روح امین کے نام سے بولتے ہیں کیونکہ یہ ہر یک تاریکی سے امن بخشتی ہے اور ہر یک غبار سے خالی ہے اور اس کا نام شدید القویٰ بھی ہے کیونکہ یہ اعلیٰ درجہ کی طاقت وحی ہے جس سے قوی تر وحی متصور نہیں اور اس کا نام ذوالافق الاعلیٰ بھی ہے کیونکہ یہ وحی الٰہی کے انتہائی درجہ کی تجلی ہے اور اس کو رَاٰی مَارَاٰی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے کیونکہ اِس کیفیت کا اندازہ تمام مخلوقات کے قیاس اور گمان اور وہم سے باہر ہے اور یہ کیفیت صرف دُنیا میں ایک ہی انسان کو ملی ہے جو انسان کامل ہے جس پر تمام سلسلہ انسانیہ کا ختم ہو گیا ہے۔ اور دائرہ استعدادات بشریہ کا کمال کو پہنچا ہے اور وہ درحقیقت پیدائش الٰہی کے خط ممتد کی اعلیٰ طرف کا آخری نقطہ ہے جو ارتفاع کے تمام مراتب کا انتہا ہے حکمت الٰہی کے ہاتھ نے ادنیٰ سی ادنیٰ خلقت سے اور اسفل سے اسفل مخلوق سے سلسلہ پیدائش کا شروع کر کے اُس اعلیٰ درجہ کے نقطہ تک پہنچا دیا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم جس کے معنے یہ ہیں کہ نہایت تعریف کیا گیا یعنی کمالات تامہ کا مظہر سو جیسا فطرت کے رو سے اُس نبی کا اعلیٰ اور ارفع مقام تھا ایسا ہی خارجی طور پر بھی اعلیٰ و ارفع مرتبہ وحی کا اُس کو عطا ہوا اور اعلیٰ و ارفع مقام محبت کا ملا۔ (توضیح مرام صفحہ ۲۴-۲۶)

جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی غیوری محبت ذاتیہ میں کسی مومن کی اس کے غیر سے شراکت نہیں چاہتی۔ ایمان جو ہمیں سب سے زیادہ پیارا ہے وہ اسی بات سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ ہم محبت میں دوسرے کو اُس سے شریک نہ کریں اللہ جلّ شانہٗ مؤمن کی یہ علامت فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ یعنی جو مومن ہیں وہ خدا سے بڑھ کر کسی سے دل نہیں لگاتے محبت ایک خاص حق اللہ جلّ شانہ کا ہے جو شخص اُس کا حق دوسرے کو دیگا وہ تباہ ہوگا۔ تمام برکتیں جو مردان خدا کو ملتی ہیں اور تمام قبولیتیں جو اُن کو حاصل ہوتی ہیں کیا وہ معمولی وظائف سے یا معمولی نماز روزہ سے ملتی ہیں ہرگز نہیں بلکہ وہ توحید فی المحبت سے ملتی ہیں جو اُسی کے ہو جاتے ہیں اُسی کے ہو رہتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے دوسروں کو اُس کی راہ میں قربان کرتے ہیں۔ مَیں خوب اُس درد کی حقیقت کو پہنچتا ہوں جو ایسے شخص کو

ہوتا ہے کہ یک دفعہ وہ ایسے شخص سے جدا کیا جاتا ہے جس کو وہ اپنے قالب کی گویا جان جانتا تھا لیکن مجھے غیرت اس بات میں ہے کہ ہمارے حقیقی پیارے کے مقابل پر کوئی اور نہ ہونا چاہیے۔ ہمیشہ سے میرا دل یہ فتویٰ دیتا ہے کہ غیر سے مستقل محبت کرنا جس سے الٰہی محبت باہر ہو خواہ وہ بیٹا ہو یا دوست کوئی ہو ایک قسم کا کفر اور کبیرہ گناہ ہے جس سے اگر نعمت اور رحمت الٰہی تدارک نہ کرے تو سلب ایمان کا خطرہ ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۹)

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝

یعنی دوزخی لوگ درخواست کریں گے جو ایک دفعہ ہم دنیا میں جائیں تا ہم اپنے باطل معبودوں سے ایسے ہی بیزار ہو جائیں جیسے وہ ہم سے بیزار ہیں لیکن وہ دوزخ سے نہیں نکلیں گے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم حاشیہ در حاشیہ متعلقہ صفحہ ۹۴۲ ب)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

ہر ایک انسان کے لیے دو جاذب موجود ہیں یعنی کھینچنے والے۔ ایک جاذب خیر ہے جو نیکی کی طرف اُس کو کھینچتا ہے دوسرا جاذب شر ہے جو بدی کی طرف کھینچتا ہے جیسا کہ یہ امر مشہود محسوس ہے کہ بسا اوقات انسان کے دل میں بدی کے خیالات پڑتے ہیں اور اُس وقت وہ ایسا بدی کی طرف مائل ہوتا ہے کہ گویا اُس کو کوئی بدی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور پھر بعض اوقات نیکی کے خیالات اس کے دل میں پڑتے ہیں اور اس وقت وہ ایسا نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے کہ گویا کوئی اس کو نیکی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور بسا اوقات ایک شخص بدی کر کے پھر نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور نہایت شرمندہ ہوتا ہے کہ میں نے بُرا کام کیوں کیا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی کو گالیاں دیتا اور مارتا ہے اور پھر نادم ہوتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ یہ کام میں نے بہت ہی بیجا کیا اور اس سے کوئی نیک سلوک کرتا ہے یا معافی چاہتا ہے سو یہ دونوں قسم کی قوتیں ہر ایک انسان میں پائی جاتی ہیں اور شریعت اسلام نے نیکی کی قوت کا نام لمّہ ملک رکھا ہے

اور بدی کی قوت کو لمۂ شیطان سے موسوم کیا ہے۔ فلسفی لوگ تو صرف اس حد تک ہی قائل ہیں کہ یہ دونوں قوتیں ہر ایک انسان میں ضرور موجود ہیں مگر خدا جو وراء الوراء اسرار ظاہر کرتا ہے اور عمیق اور پوشیدہ باتوں کی خبر دیتا ہے اس نے ان دونوں قوتوں کو مخلوق قرار دیا ہے جو نیکی کا القاء کرتا ہے اُس کا نام فرشتہ اور روح القدس رکھا ہے اور جو بدی کا القاء کرتا ہے اس کا نام شیطان اور ابلیس قرار دیا ہے مگر قدیم عقلمندوں اور فلاسفروں نے مان لیا ہے کہ القاء کا مسئلہ بیہودہ اور لغو نہیں ہے بیشک انسان کے دل میں دو قسم کے القاء ہوتے ہیں نیکی کا القا اور بدی کا القاء اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں القاء انسان کی پیدائش کا جزو نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ باہم متضاد ہیں اور نیز انسان اُن پر اختیار نہیں رکھتا اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں القاء باہر سے آتے ہیں اور انسان کی تکمیل اُن پر موقوف ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے وجود یعنی فرشتہ اور شیطان کو ہندوؤں کی کتابیں بھی مانتی ہیں اور گبر بھی اس کے قایل ہیں۔ بلکہ جس قدر خدا کی طرف سے دُنیا میں کتابیں آئی ہیں سب میں ان دونوں وجودوں کا اقرار ہے۔ پھر اعتراض کرنا محض جہالت اور تعصب ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۸۰-۲۸۱)

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

شریعت کی بنا نرمی پر ہے سختی پر نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے یہ مراد ہے کہ جو ان مندروں اور تھانوں پر ذبح کیا جاوے یا غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جاوے اس کا کھانا تو جائز نہیں ہے لیکن جو جانور بیع و شرا میں آجاتے ہیں اس کی حلت ہی سمجھی جاتی ہے۔ زیادہ تفتیش کی کیا ضرورت ہے دیکھو حلوائی وغیرہ بعض اوقات ایسی حرکات کرتے ہیں کہ اُن کا ذکر بھی کراہت اور نفرت پیدا کرتا ہے لیکن ان کی بنی ہوئی چیزیں آخر کھاتے ہی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شیرینیاں طیار کرتے ہیں اور میلی کچیلی دھوتی میں بھی ہاتھ مارتے جاتے ہیں اور جب کھانڈ طیار کرتے ہیں تو اُس کو پاؤں سے ملتے ہیں چوڑھے چمار گُڑ وغیرہ بناتے ہیں اور بعض اوقات جھوٹھے رس وغیرہ ڈال دیتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا کرتے ہیں ان سب کو استعمال کیا جاتا ہے اس طرح پر اگر تشدّد ہو تو سب حرام ہو جاویں اسلام نے مالا یطاق تکلیف نہیں رکھی ہے بلکہ شریعت کی بنا نرمی پر ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

جو شخص باغی نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا۔ تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ غفور رحیم ہے۔

(بدر جلد ۷، ۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

سچے نیکوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ خدا کی رضا جوئی کے لیے اپنے قریبیوں کو اپنے مال سے مدد کرتے ہیں اور نیز اس مال میں سے یتیموں کے تعہد اور ان کی پرورش اور تعلیم وغیرہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور مسکینوں کو فقر و فاقہ سے بچاتے ہیں اور مسافروں اور سوالیوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان مالوں کو غلاموں کے آزاد کرانے کے لیے اور قرض داروں کو سبکدوش کرنے کے لیے بھی دیتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۱۲)

وَاللّٰهُ اَدْخَلَ وُجُوْدَ الْمَلَآئِكَةِ فِي الْاِيْمَانِيَّاتِ كَمَا اَدْخَلَ فِيْهَا نَفْسَهٗ وَقَالَ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَقَالَ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ[1] فَبَيَّنَ لِلنَّاسِ اَنَّ حَقِيْقَةَ الْمَلَآئِكَةِ وَحَقِيْقَةَ صِفَاتِهِمْ مُتَعَالِيَةٌ عَنْ طَوْرِ الْعَقْلِ وَلَا يَعْلَمُهَا اَحَدٌ اِلَّا اللّٰهُ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ وَلَا لِمَلَآئِكَتِهٖ الْاَمْثَالَ وَاْتُوْهُ مُسْلِمِيْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۶۴)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے وجود کو ایمانیات میں شامل کیا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح اس نے اپنے آپ کو شامل کیا ہے۔ اور فرمایا ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ اور فرمایا ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ[1] پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو کھول کر بتا دیا کہ ملائکہ اور ان کی صفات کی حقیقت عقل سے بالا تر ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اس لیے تم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے متعلق اپنے پاس سے باتیں نہ بنایا کرو اور اسکے حضور میں فرمانبردار بنکر حاضر ہو۔

[1] المدثر: ۳۲ یعنی تیرے رب کے لشکروں کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔

وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ۔ یعنی بہادر وہ ہیں کہ جب لڑائی کا موقعہ آپڑے یا اُن پر کوئی مصیبت پڑے تو بھاگتے نہیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۱۳)

منجملہ انسان کے طبعی امور کے ایک صبر ہے جو اس کو ان مصیبتوں اور بیماریوں اور دکھوں پر کرنا پڑتا ہے جو اس پر ہمیشہ پڑتے رہتے ہیں اور انسان بہت سے سیاپے اور جزع فزع کے بعد صبر اختیار کرتا ہے لیکن جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی پاک کتاب کے رو سے وہ صبر اخلاق میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک حالت ہے جو تھک جانے کے بعد ضرورتاً ظاہر ہو جاتی ہے یعنی انسان کی طبعی حالتوں میں سے یہ بھی ایک حالت ہے کہ وہ مصیبت کے ظاہر ہونے کے وقت پہلے روتا چیختا سر پیٹتا ہے آخر بہت سا بخار نکال کر جوش تھم جاتا ہے اور انتہا تک پہنچ کر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے پس یہ دونوں حرکتیں طبعی حالتیں ہیں ان کو خلق سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ اس کے متعلق خلق یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے ہاتھ سے جاتی رہے اور اس چیز کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر کوئی شکایت منہ پر نہ لاوے اور یہ کہے کہ خدا کا تھا خدا نے لے لیا اور ہم اس کی رضا کے ساتھ راضی ہیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۱۵)

۱۸۰ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝

جیسے بات بات میں سزا دینا اور انتقام لینا مذموم و خلافِ اخلاق ہے اسی طرح یہ بھی خیر خواہی حقیقی کے برخلاف ہے کہ ہمیشہ یہی اُصول ٹھہرایا جاوے کہ جب کبھی کسی سے کوئی مجرمانہ حرکت صادر ہو تو جھٹ پٹ اُس کے جُرم کو معاف کیا جائے۔ جو شخص ہمیشہ مجرم کو سزا کے بغیر چھوڑ دیتا ہے وہ ایسا ہی نظامِ عالم کا دشمن ہے جیسے وہ شخص کہ ہمیشہ اور ہر حالت میں انتقام اور کینہ کشی پر مستعد رہتا ہے۔ نادان لوگ ہر محل میں عفو اور درگزر کرنا پسند کرتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ ہمیشہ درگزر کرنے سے نظامِ عالم میں ابتری پیدا ہوتی ہے اور یہ فعل خود مجرم کے حق میں بھی مُضر ہے کیونکہ اُس سے اُس کی بدی کی عادت پکتی جاتی ہے اور شرارت کا ملکہ راسخ ہوتا جاتا ہے ایک چور کو سزا کے بغیر چھوڑ دو پھر دیکھو کہ دوسری مرتبہ کیا رنگ دکھاتا ہے اسی جہت سے خدائے تعالیٰ نے اپنی اُس کتاب میں جو حکمت سے بھری ہوئی ہے فرمایا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا[۱] یعنی اے دانشمندو قاتل کے قتل کرنے اور موذی کی اُسی قدر ایذا دینے میں تمہاری زندگی ہے۔ جس نے ایک انسان کو ناحق بے موجب قتل کر دیا۔ اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۵۳-۳۵۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

خدا تعالیٰ نے یہ قانون رکھا ہوا ہے کہ وہ شریروں اور سرکشوں کو جو اس کے حدود اور اوامر کی پروا نہیں کرتے سزا دیتا ہے۔ تا کہ حد سے نہ بڑھ جائیں جنہوں نے حد سے بڑھنا چاہا خدا نے وہیں اُنہیں تنبیہ کی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سزا اور تنبیہ اس شخص کے لیے بھی جسے دی جاتی ہے اور دوسروں کے واسطے بھی جو عبرت کی نگاہ سے اُسے دیکھتے

---

[۱] المائدہ : ۳۳

ہیں بطور رحمت ہے۔ کیونکہ اگر سزا نہ دی جاتی۔ تو امن اُٹھ جاتا اور انجام کار نتیجہ بہت ہی بُرا ہوتا۔ قانون قدرت پر نظر کرو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسانی میں یہ بات رکھی ہوئی ہے اور اس فطرتی نقش ہی کی بنا پر قرآن نے یہ فرمایا ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ یعنی تمہارے تمدن۔ کے قیام کے لیے قصاص کا ہونا ضروری ہے۔ اگر افعال کے کچھ نتائج ہی نہیں ہوتے تو وہ افعال کیا ہوتے؟ اور ان سے کیا غرض مقصود ہوتی؟ غرض ضروری اور واقعی طور پر یہ سزائیں نہیں ہیں جو یہاں دی جاتی ہیں بلکہ یہ ایک ظل ہیں اصل سزاؤں کا اور ان کی غرض ہے عبرت۔ دوسرے عالم کے مقاصد اور ہیں اور وہ بالاتر اور بالاتر ہیں۔ وہاں تو مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ[1] کا انعکاسی نمونہ لوگ دیکھ لیں گے۔ اور انسان کو اپنے مخفی در مخفی گناہوں اور عزیمتوں کی سزا بھگتنی پڑے گی دنیا اور آخرت کی سزاؤں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دنیا کی سزائیں امن قائم کرنے اور عبرت کے لیے ہیں اور آخرت کی سزائیں افعال انسانی کے آخری اور انتہائی نتائج ہیں وہاں اسے سزا ضرور ملنی ٹھیری کیونکہ اس نے زہر کھائی ہوئی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ بدوں تریاق وہ اس زہر کے اثر سے محفوظ رہ سکے۔ عاقبت کی سزا اپنے اندر ایک فلسفیانہ حقیقت رکھتی ہے جس کو کوئی مذہب بجز اسلام کے کامل طور پر بیان نہیں کرسکا

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

(۱۸۱-۱۸۳) كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ؕ۝ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ؕ۝ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ۧ

(ترجمہ) تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جس وقت تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاوے تو اگر اس نے کچھ مال چھوڑا ہے تو چاہیئے کہ ماں باپ کے لیے اُس مال میں سے کچھ وصیت کرے ایسا ہی خویشوں کے لیے بھی معروف طور پر جو شرع اور عقل کے رو سے پسندیدہ ہے اور مستحسن سمجھا جاتا ہے وصیت کرنی چاہیئے یہ خدا نے پرہیزگاروں کے ذمہ ایک حق ٹھہرا دیا ہے جس کو بہرحال ادا کرنا چاہیئے یعنی خدا نے سب حقوق پر وصیت کو مقدم رکھا ہے اور سب سے پہلے مرنے والے کے لیے یہی حکم دیا ہے کہ وہ وصیت لکھے۔ اور پھر فرمایا کہ جو شخص سُننے کے بعد وصیت کو بدل

[1] الزلزال : ۹

ڈالے تو یہ گناہ اُن لوگوں پر ہے جو جرم تبدیل وصیت کے عمداً مرتکب ہوں تحقیق اللہ سنتا اور جانتا ہے یعنی ایسے منصوبے اُس پر مخفی نہیں رہ سکتے اور یہ نہیں کہ اُس کا علم ان باتوں کے جاننے سے قاصر ہے اور پھر فرمایا کہ جس شخص کو یہ خوف دامنگیر ہو کہ وصیت کرنے والے نے کچھ کجی اختیار کی ہے یعنی بغیر سوچنے سمجھنے کے کچھ غلطی کر بیٹھا ہے یا کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے یعنی عمداً کوئی ظلم کیا ہے اور اُس نے اس بات پر اطلاع پا کر جن کے لیے وصیت کی گئی ہے اس میں کچھ مناسب اصلاح کر دے تو اُس پر کوئی گناہ نہیں تحقیق اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲)

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں مگر جو تم میں سے بیمار یا سفر پر ہو وہ اتنے روزے پھر رکھے۔

(شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۸)

میری تو یہ حالت ہے کہ مرنے کے قریب ہو جاؤں تب روزہ چھوڑتا ہوں طبیعت روزہ چھوڑنے کو نہیں چاہتی یہ مبارک دن ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے نزول کے دن ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳ صفحہ ۵ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء)

کُتِبَ سے فرضی روزے مراد ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۴)

اس سوال کے جواب میں کہ جہاں چھ ماہ تک سورج نہیں چڑھتا روزہ کیونکر رکھیں۔ فرمایا۔

اگر ہم نے لوگوں کی طاقتوں پر اُن کی طاقتوں پر قیاس کرنا ہے تو انسانی قویٰ کی جڑھ جو حمل کا زمانہ ہے مطابق کر کے دکھلانا چاہیئے پس ہمارے حساب کی اگر پابندی لازم ہے تو ان بلاد میں صرف ڈیڑھ دن میں حمل ہونا چاہیئے اور اگر اُن کے حساب کی تو دو سو چھیاسٹھ برس تک بچہ پیٹ میں رہنا چاہیئے اور یہ ثبوت آپ کے ذمہ ہے حمل صرف ڈیڑھ دن تک رہتا ہے لیکن دو سو چھیاسٹھ برس کی حالت میں یہ تو ماننا کچھ بعید از قیاس نہیں کہ وہ چھ ماہ تک روزہ بھی رکھ سکتے ہیں کیونکہ اُن کے دن کا یہی مقدار ہے اور اسی کے مطابق ان کے قوای بھی ہیں۔ (جنگ مقدس بحث ۵ جون ۱۸۹۳ء)

تیسری بات جو اسلام کا رکن ہے وہ روزہ ہے روزہ کی حقیقت سے بھی لوگ ناواقف ہیں اصل یہ ہے کہ جس ملک میں انسان جاتا نہیں اور جس عالم سے واقف نہیں اس کے حالات کیا بیان کرے۔ روزہ اتنا ہی نہیں کہ اس میں انسان بھوکا پیاسا رہتا ہے بلکہ اس کی ایک حقیقت اور اس کا اثر ہے جو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے۔ انسانی فطرت میں ہے کہ جس قدر کم کھاتا ہے اُسی قدر تزکیہ نفس ہوتا ہے اور کشفی قوتیں بڑھتی ہیں۔ خدا تعالیٰ کا منشاء اس سے یہ ہے کہ ایک غذا کو

کم کرو اور دوسری کو بڑھاؤ۔ ہمیشہ روزہ دار کو یہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ اس سے اتنا ہی مطلب نہیں ہے کہ بھوکا رہے بلکہ اسے چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے ذکر میں مصروف رہے تاکہ تبتل اور انقطاع حاصل ہو۔ پس روزے سے یہی مطلب ہے کہ انسان ایک روٹی کو چھوڑ کر جو صرف جسم کی پرورش کرتی ہے دوسری روٹی کو حاصل کرے جو روح کے لیئے تسلی اور سیری کا باعث ہے۔ اور جو لوگ محض خدا کے لیے روزے رکھتے ہیں اور نرے رسم کے طور پر نہیں رکھتے اُنہیں چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح اور تہلیل میں لگے رہیں جس سے دوسری غذا انہیں مل جاوے۔ (الحکم جلد ۱۱ عـ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صـ۹)

روزہ اور نماز ہر دو عبادتیں ہیں۔ روزے کا زور جسم پر ہے اور نماز کا زور روح پر ہے۔ نماز سے ایک سوز و گداز پیدا ہوتی ہے۔ اس واسطے وہ افضل ہے۔ روزے سے کشوف پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیفیت بعض دفعہ جوگیوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن روحانی گدازش جو دعاؤں سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شامل نہیں۔

(بدر جلد ۱ عـ۱۰ مورخہ ۸ جون ۱۹۰۵ء صـ۲)

ایک شخص کا سوال حضرت صاحب کی خدمت میں پیش ہوا کہ روزہ دار کو آئینہ دیکھنا جائز ہے یا نہیں

فرمایا جائز ہے۔

اسی طرح ایک اور سوال پیش ہوا کہ حالت روزہ میں سر کو یا ڈاڑھی کو تیل لگانا جائز ہے یا نہیں

فرمایا جائز ہے۔

سوال پیش ہوا کہ روزہ دار کو خوشبو لگانا جائز ہے یا نہیں۔

فرمایا جائز ہے۔

سوال پیش ہوا کہ روزہ دار آنکھوں میں سُرمہ ڈالے یا نہ ڈالے۔

فرمایا۔ مکروہ ہے اور ایسی ضرورت ہی کیا ہے کہ دن کے وقت سرمہ لگائے۔ رات کو سرمہ لگا سکتا ہے۔

(بدر جلد ۶ عـ۶ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۷ء صـ۴)

فرمایا کہ بے خبری میں کھایا پیا تو اُس پر اُس روزہ کے بدلے میں دوسرا روزہ لازم نہیں آتا۔

(الحکم جلد ۱۱ عـ۷ صـ۱۴ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۷ء)

ایک شخص کا حضرت کی خدمت میں سوال پیش ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے دن روزہ رکھنا ضروری ہے کہ نہیں

فرمایا ضروری نہیں ہے

اسی طرح سوال پیش ہوا کہ "محرم کے پہلے دس دن کا روزہ رکھنا ضروری ہے کہ نہیں"؟

فرمایا۔ ضروری نہیں ہے" (بدر جلد ۶ عـ۱۱ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۰۷ء صـ۵)

ایک شخص کا سوال پیش ہوا کہ میں مکان کے اندر بیٹھا ہوا تھا اور میرا یقین تھا کہ ہنوز روزہ رکھنے کا وقت ہے اور میں نے

کچھ کھا کر روزہ کی نیت کی۔ مگر بعد میں ایک دوسرے شخص سے معلوم ہوا کہ اس وقت سفیدی ظاہر ہوگئی تھی اب میں کیا کروں۔ حضرت نے فرمایا کہ ایسی حالت میں اس کا روزہ ہوگیا۔ دوبارہ رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اپنی طرف سے اس نے احتیاط کی اور نیت میں فرق نہیں صرف غلطی لگ گئی اور چند منٹوں کا فرق پڑ گیا۔

(بدر جلد ۶ ۶ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

۱۸۵۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَؕ وَ عَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

مِنْکُمْ کا لفظ قرآن کریم میں قریباً بیاسی جگہ آیا ہے اور بجز دو یا تین جگہ کے جہاں کوئی خاص قرینہ قائم کیا گیا ہے باقی تمام مواضع میں مِنْکُمْ کے خطاب سے وہ تمام مسلمان مراد ہیں جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے..... فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔ یعنی جو تم میں سے مریض یا سفر پر ہو تو اتنے ہی روزے اور رکھ لے۔ اب سوچو کہ کیا یہ حکم صحابہ سے خاص تھا یا اس میں اور بھی مسلمان جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے شامل ہیں۔

(شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۵)

یعنی مریض اور مسافر روزہ نہ رکھے اس میں امر ہے یہ اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ جس کا اختیار ہو رکھ لے جس کا اختیار ہو نہ رکھے میرے خیال میں مسافر کو روزہ نہیں رکھنا چاہیئے اور چونکہ عام طور پر اکثر لوگ رکھ لیتے ہیں اس لیے اگر کوئی تعامل سمجھ کر رکھ لے تو کوئی ہرج نہیں مگر عِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ کا پھر بھی لحاظ رکھنا چاہیئے۔

سفر میں تکالیف اٹھا کر جو انسان روزہ رکھتا ہے تو گویا اپنے زورِ بازو سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا چاہتا ہے اُس کو اطاعتِ امر سے خوش نہیں کرنا چاہتا یہ غلطی ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت امر اور نہی میں سچا ایمان ہے۔

(الحکم جلد ۳ ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

میرا مذہب یہ ہے کہ انسان بہت دقتیں اپنے اوپر نہ ڈال لے۔ عرف میں جس کو سفر کہتے ہیں خواہ وہ دو تین کوس ہی ہو اُس میں قصر و سفر کے مسائل پر عمل کرے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ بعض دفعہ ہم دو دو تین تین میل اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں مگر کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم سفر میں ہیں لیکن جب انسان اپنی گٹھڑی اٹھا کر سفر کی نیت سے چل پڑتا ہے تو وہ مسافر ہوتا ہے۔ شریعت کی بنا دقت پر نہیں ہے جس کو تم عرف میں سفر سمجھو وہی

سفر ہے اور جیسا کہ خدا کے فرائض پر عمل کیا جاتا ہے ویسا ہی اُس کی رخصتوں پر عمل کرنا چاہیئے فرض بھی خدا کی طرف سے ہیں اور رخصت بھی خدا کی طرف سے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۳)

اصل بات یہ ہے کہ قرآن شریف کی رخصتوں پر عمل کرنا بھی تقویٰ ہے خدا تعالیٰ نے مسافر اور بیمار کو دوسرے وقت رکھنے کی اجازت اور رخصت دی ہے اس لیے اس حکم پر بھی تو عمل رکھنا چاہیئے میں نے پڑھا ہے کہ اکثر اکابر اس طرف گئے ہیں کہ اگر کوئی حالت سفر یا بیماری میں روزہ رکھتا ہے تو یہ معصیت ہے کیونکہ غرض تو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے نہ اپنی مرضی اور اللہ تعالیٰ کی رضا فرماں برداری میں ہے جو حکم وہ دے اُس کی اطاعت کی جاوے۔ اور اپنی طرف سے اس پر حاشیہ نہ چڑھایا جاوے۔ اس نے تو یہی حکم دیا ہے مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ اس میں کوئی قید اور نہیں لگائی کہ ایسا سفر ہو یا ایسی بیماری ہو میں سفر کی حالت میں روزہ نہیں رکھتا اور ایسا ہی بیماری کی حالت میں چنانچہ آج بھی میری طبیعت اچھی نہیں اور میں نے روزہ نہیں رکھا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۴)

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ اگر تم مریض ہو یا کسی سفر قلیل یا کثیر پر ہو تو اسی قدر روزے اور دنوں میں رکھ لو۔ سو اللہ تعالیٰ نے سفر کی کوئی حد مقرر نہیں کی اور نہ احادیث نبوی میں حد پائی جاتی ہے بلکہ محاورہ عام میں جس قدر مسافت کا نام سفر رکھتے ہیں وہی سفر ہے ایک منزل (سے) جو کم حرکت ہو اس کو سفر نہیں کہا جا سکتا۔ (مکتوبات جلد پنجم نمبر پنجم صفحہ ۸ (مکتوب نمبر ۳ بنام حضرت صاحبزادہ پیر سراج الحق صاحبؓ)

جو شخص مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں ماہ صیام میں روزہ رکھتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے صریح حکم کی نافرمانی کرتا ہے خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ مریض اور مسافر روزہ نہ رکھے۔ مرض سے صحت پانے اور سفر کے ختم ہونے کے بعد روزے رکھے۔ خدا کے اس حکم پر عمل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نجات فضل سے ہے نہ کہ اپنے اعمال کا زور دکھا کر کوئی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ کہ مرض تھوڑی ہو یا بہت اور سفر چھوٹا ہو یا لمبا ہو۔ بلکہ حکم عام ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ مریض اور مسافر اگر روزہ رکھیں گے۔ تو اُن پر حکم عدولی کا فتویٰ لازم آئے گا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

سوال پیش ہوا کہ بعض اوقات رمضان ایسے موسم میں آتا ہے کہ کاشت کاروں سے جبکہ کام کی کثرت مثل تخم ریزی و درودگی ہوتی ہے ایسے ہی مزدوروں سے جن کا گزارہ مزدوری پر ہے۔ روزہ نہیں رکھا جاتا۔ ان کی نسبت کیا ارشاد ہے فرمایا اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔ یہ لوگ اپنی حالتوں کو مخفی رکھتے ہیں ہر شخص تقویٰ و طہارت سے اپنی حالت سوچ لے اگر کوئی اپنی جگہ مزدوری پر رکھ سکتا ہے تو ایسا کرے ورنہ مریض کے حکم میں ہے پھر جب میسّر ہو رکھ لے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

(وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ) ایک دفعہ میرے دل میں آیا کہ یہ فدیہ کس لیے مقرر کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ توفیق کے واسطے ہے تاکہ روزہ کی توفیق اس سے حاصل ہو خدا ہی کی ذات ہے جو توفیق عطا کرتی ہے اور ہر شے خدا ہی سے طلب کرنی چاہیئے خدا تعالیٰ تو قادر مطلق ہے وہ اگر چاہے تو ایک مدقوق کو بھی روزہ کی طاقت عطا کر سکتا ہے تو فدیہ سے یہی مقصود ہے کہ وہ طاقت حاصل ہو جاوے اور یہ خدا کے فضل سے ہوتا ہے پس میرے نزدیک خوب ہے کہ (انسان) دعا کرے کہ الٰہی یہ تیرا ایک مبارک مہینہ ہے اور میں اس سے محروم رہا جاتا ہوں اور کیا معلوم کہ آئندہ سال زندہ رہوں یا نہ یا ان فوت شدہ روزوں کو ادا کر سکوں یا نہ اور اُس سے توفیق طلب کرے تو مجھے یقین ہے کہ ایسے دل کو خدا طاقت بخش دے گا۔

اگر خدا چاہتا تو دوسری امتوں کی طرح اس امت میں کوئی قید نہ رکھتا مگر اس نے قیدیں بھلائی کے واسطے رکھی ہیں میرے نزدیک اصل یہی ہے کہ جب انسان صدق اور کمال اخلاص سے باری تعالیٰ میں عرض کرتا ہے کہ اس مہینے میں تو مجھے محروم نہ رکھ تو خدا اُسے محروم نہیں رکھتا اور ایسی حالت میں اگر انسان ماہ رمضان میں بیمار ہو جاوے تو یہ بیماری اس کے حق میں رحمت ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک عمل کا مدار نیت پر ہے مومن کو چاہیئے کہ وہ اپنے وجود سے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی راہ میں دلاور ثابت کر دے جو شخص کہ روزے سے محروم رہتا ہے مگر اس کے دل میں یہ نیت درد دل سے تھی کہ کاش میں تندرست ہوتا اور روزہ رکھتا اور اس کا دل اس بات کے لیے گریاں ہے تو فرشتے اُس کے لیے روزے رکھیں گے بشرطیکہ وہ بہانہ جو نہ ہو تو خدا تعالیٰ ہرگز اُسے ثواب سے محروم نہ رکھے گا۔ یہ ایک باریک امر ہے کہ اگر کسی شخص پر (اپنے نفس کی کسل کی وجہ سے) روزہ گراں ہے اور وہ اپنے خیال میں گمان کرتا ہے کہ میں بیمار ہوں اور میری صحت ایسی ہے کہ اگر ایک وقت نہ کھاؤں تو فلاں فلاں عوارض لاحق حال ہوں گے اور یہ ہوگا اور وہ ہوگا تو ایسا آدمی جو خدا کی نعمت کو خود اپنے اوپر گراں گمان کرتا ہے کب اُس ثواب کا مستحق ہوگا۔ ہاں وہ شخص جس کا دل اس بات سے خوش ہے کہ رمضان آ گیا اور اس کا منتظر میں تھا کہ آوے اور روزہ رکھوں اور پھر وہ بوجہ بیماری کے نہیں رکھ سکا تو وہ آسمان پر روزے سے محروم نہیں ہے۔ اس دنیا میں بہت لوگ بہانہ جو ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جیسے اہل دنیا کو دھوکہ دے لیتے ہیں ویسے ہی خدا کو فریب دیتے ہیں۔ بہانہ جو اپنے وجود سے آپ مسئلہ تراش کرتے ہیں اور تکلفات شامل کر کے ان وسائل کو صحیح گردانتے ہیں لیکن خدا کے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے تکلفات کا باب بہت وسیع ہے اگر انسان چاہے تو اُس کے رو سے ساری عمر بیٹھ کر نماز پڑھتا رہے اور رمضان کے روزے بالکل ہی نہ رکھے مگر خدا اس کی نیت اور ارادہ کو جانتا ہے جو صدق اور اخلاص سے رکھتا ہے خدا جانتا ہے کہ اُس کے دل میں درد ہے اور خدا اُسے ثواب سے زیادہ بھی دیتا ہے کیونکہ درد دل ایک قابل قدر شے ہے۔ حیلہ جو انسان تاویلوں پر تکیہ کرتے ہیں لیکن خدا کے نزدیک یہ تکیہ کوئی شے نہیں۔ جب میں نے چھ ماہ روزے رکھے تھے تو ایک دفعہ ایک طائفہ انبیاء کا مجھے ملا (کشف میں) اور انہوں نے کہا تو نے کیوں اپنے نفس کو اس قدر

مشقت میں ڈالا ہوا ہے۔ اس سے باہر نکل۔ اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو خدا کے واسطے مشقت میں ڈالتا ہے تو وہ خود ماں باپ کی طرح رحم کر کے اُسے کہتا ہے کہ تو کیوں مشقت میں پڑا ہوا ہے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۲-۵۳)

(ایک شخص نے) سوال کیا کہ میں نے آج سے پہلے کبھی روزہ نہیں رکھا اس کا کیا فدیہ دوں۔

فرمایا خدا ہر شخص کو اس کی وسعت سے باہر دکھ نہیں دیتا۔ وسعت کے موافق گذشتہ کا فدیہ دیدو اور آئندہ عہد کرو۔ کہ سب روزے ضرور رکھوں گا۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۱-۹۸)

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کی نسبت فرمایا کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جو طاقت نہیں رکھتے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

اللہ تعالیٰ نے شریعت کی بنا آسانی پر رکھی ہے جو مسافر اور مریض صاحب مقدرت ہوں ان کو چاہیئے۔ کہ روزہ کی بجائے فدیہ دیدیں۔ فدیہ یہ ہے کہ ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

گذشتہ پرچہ اخبار نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۷ء کے صفحہ ۷ کالم اول میں یہ لکھا گیا تھا کہ .... "جو مریض اور مسافر صاحب مقدرت ہوں ان کو چاہیئے کہ روزہ کے بجائے فدیہ دیں۔"

اس جگہ مریض اور مسافر سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو کبھی امید نہیں۔ کہ پھر روزہ رکھنے کا موقع مل سکے۔ مثلاً ایک نہایت بوڑھا ضعیف انسان یا ایک کمزور حاملہ عورت جو دیکھتی ہے۔ کہ بعد وضع حمل بسبب بچے کو دودھ پلانے کے وہ پھر معذور ہو جائے گی۔ اور سال بھر اسی طرح گذر جائیگا۔ ایسے اشخاص کے واسطے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں۔ کیونکہ وہ روزہ رکھ ہی نہیں سکتے اور فدیہ دیں۔ باقی اور کسی کے واسطے جائز نہیں۔ کہ صرف فدیہ دیکر روزے کے رکھنے سے معذور سمجھا جا سکے۔ چونکہ اخبار بدر کی مذکورہ بالا عبارت صاف نہ تھی اس واسطے یہ مسئلہ دوبارہ حضرت اقدس کی خدمت میں پیش ہوا آپ نے فرمایا (ایڈیٹر)

" صرف فدیہ تو شیخ فانی یا اس جیسوں کے واسطے ہو سکتا ہے۔ جو روزہ کی طاقت کبھی بھی نہیں رکھتے۔ ورنہ عوام کے واسطے جو صحت پاکر روزہ رکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ صرف فدیہ کا خیال کرنا اباحت کا دروازہ کھول دینا ہے۔ جس دین میں مجاہدات نہ ہوں وہ دین ہمارے نزدیک کچھ نہیں۔ اس طرح سے خدا تعالیٰ کے بوجھوں کو سر پر سے ٹالنا سخت گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ میرے راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ان کو ہی ہدایت دی جاوے گی۔

فرمایا۔ خدا تعالیٰ نے دین اسلام میں پانچ مجاہدات مقرر فرمائے ہیں۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ صدقات۔ حج۔ اسلامی دشمن کا ذبّ اور دفع خواہ سیفی ہو۔ خواہ قلمی۔ یہ پانچ مجاہدے قرآن شریف سے ثابت ہیں مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان میں کوشش کریں اور ان کی پابندی کریں۔ یہ روزے تو سال میں ایک ماہ کے ہیں۔ بعض اہل اللہ تو نوافل کے طور پر اکثر روزے رکھتے رہتے ہیں اور ان میں مجاہدہ کرتے ہیں۔ ہاں دائمی روزے رکھنا منع ہیں یعنی ایسا نہیں چاہیئے کہ آدمی ہمیشہ روزے ہی رکھتا رہے بلکہ ایسا کرنا چاہیئے کہ نفلی روزہ کبھی رکھے اور کبھی چھوڑ دے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۴۳ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۳)

(فدیہ رمضان کے متعلق فرمایا:)
خواہ اپنے شہر میں کسی مسکین کو کھلائے یا یتیم اور مسکین فنڈ میں بھیجدے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۶ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

انسان کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ حسب استطاعت خدا کے فرائض بجالاوے۔ روزہ کے بارے میں خدا فرماتا ہے وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ یعنی اگر تم روزہ رکھ بھی لیا کرو تو تمہارے واسطے بڑی خیر ہے۔
(البدر جلد ۱ نمبر ۸ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۲)

۱۸۶ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

رمض سورج کی تپش کو کہتے ہیں رمضان میں چونکہ انسان اکل و شرب اور تمام جسمانی لذتوں پر صبر کرتا ہے دوسرے اللہ تعالیٰ کے احکام کے لیے ایک حرارت اور جوش پیدا کرتا ہے۔ روحانی اور جسمانی حرارت اور تپش مل کر رمضان ہوا اہل لغت جو کہتے ہیں کہ گرمی کے مہینہ میں آیا اس لیے رمضان کہلایا [illegible] رے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عرب کے لیے یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی روحانی رمض سے مراد روحانی ذوق و شوق [illegible] ور حرارت دینی ہوتی ہے رمض اُس حرارت کو بھی کہتے ہیں جس سے پتھر وغیرہ گرم ہو جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (پ ۲)، یہی ایک فقرہ ہے جس سے ماہ رمضان کی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ صوفیا نے لکھا ہے کہ یہ ماہ تنویر قلب کے لیے عمدہ مہینہ ہے کثرت سے اس میں مکاشفات ہوتے ہیں صلوٰۃ تزکیہ نفس کرتی ہے اور صوم (روزہ) تجلی قلب کرتا ہے۔ تزکیہ نفس سے مراد یہ ہے کہ نفس امارہ کی شہوات سے بُعد حاصل ہو جاوے اور تجلی قلب سے یہ مراد ہے کہ کشف کا دروازہ اس پر کھلے کہ خدا کو دیکھ لیوے۔ پس اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ میں یہی اشارہ ہے اس میں شک و شبہ کوئی نہیں ہے روزہ کا اجر عظیم ہے لیکن امراض اور

اغراض اس نعمت سے انسان کو محروم رکھتے ہیں مجھے یاد ہے کہ جوانی کے ایام میں میں نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ روزہ رکھنا سنت اہل بیت ہے میرے حق میں پیغمبر خدا نے فرمایا سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ سلمان یعنی اَلصُّلْحُ کہ اس شخص کے ہاتھ سے دو صلح ہوں گی ایک اندرونی دوسری بیرونی اور یہ اپنا کام رفق سے کریگا نہ کہ شمشیر سے اور میں مشرب حسین پر نہیں ہوں کہ جس نے جنگ کی بلکہ مشرب حسن پر ہوں کہ جس نے جنگ نہ کی میں نے سمجھا کہ روزہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ میں نے چھ ماہ تک روزے رکھے۔ اس اثنا میں میں نے دیکھا کہ انوار کے ستونوں کے ستون آسمان پر جا رہے ہیں یہ امر مشتبہ ہے کہ انوار کے ستون زمین سے آسمان پر جاتے تھے یا میرے قلب سے۔ لیکن یہ سب کچھ جوانی میں ہو سکتا تھا اور اگر اس وقت میں چاہتا تو چار سال تک روزہ رکھ سکتا تھا.... خدا تعالیٰ کے احکام دو قسموں میں تقسیم ہیں ایک عبادات مالی دوسرے عبادات بدنی عبادات مالی تو اسی کے لیے ہیں جس کے پاس مال ہو اور جس کے پاس نہیں وہ معذور ہیں اور عبادات بدنی کو بھی انسان عالم جوانی میں ہی ادا کر سکتا ہے ورنہ ۶۰ سال جب گذرے تو طرح طرح کے عوارضات لاحق ہوتے ہیں نزول الماء وغیرہ شروع ہو کر بینائی میں فرق آ جاتا ہے یہ ٹھیک کہا کہ پیری و صد عیب اور جو کچھ انسان جوانی میں کر لیتا ہے اُسی کی برکت بڑھاپے میں بھی ہوتی ہے اور جس نے جوانی میں کچھ نہیں کیا اُسے بڑھاپے میں بھی صدہا رنج برداشت کرنے پڑتے ہیں ؎ موئے سفید از اجل آرد پیام۔ انسان کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ حسب استطاعت خدا کے فرائض بجا لاوے روزہ کے بارے میں خدا فرماتا ہے وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی اگر تم روزہ رکھ بھی لیا کرو تو تمہارے واسطے بڑی خیر ہے۔ (البدر جلد ۱ ۸ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۲)

میں نے قُرآن کے لفظ میں غور کی تب مجھ پر کھلا کہ اس مبارک لفظ میں ایک زبردست پیشگوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہی قرآن یعنی پڑھنے کے لائق کتاب ہے اور ایک زمانہ میں تو اور بھی زیادہ یہی پڑھنے کے قابل کتاب ہو گی جبکہ اور کتابیں بھی پڑھنے میں اس کے ساتھ شریک کی جائیں گی۔ اُس وقت اسلام کی عزت بچانے کے لیے اور بطلان کا استیصال کرنے کے لیے یہی ایک کتاب پڑھنے کے قابل ہو گی اور دیگر کتابیں قطعاً چھوڑ دینے کے لائق ہونگی (اور فرمایا) فرقان کے بھی یہی معنے ہیں یعنی یہی ایک کتاب حق و باطل میں فرق کرنے والی ٹھہرے گی اور کوئی حدیث کی یا اور کوئی کتاب اس حیثیت اور پایہ کی نہ ہو گی..... اب سب کتابیں چھوڑ دو اور رات دن کتاب اللہ ہی کو پڑھو.... بڑا بے ایمان ہے وہ شخص جو قرآن کریم کی طرف التفات نہ کرے اور دوسری کتابوں پر ہی رات دن جھکا رہے.... ہماری جماعت کو چاہیئے کہ قرآن کریم کے شغل اور تدبر میں جان و دل سے مصروف ہو جائیں اور حدیثوں کے شغل کو ترک کر دیں.... بڑے تاسف کا مقام ہے کہ قران کریم کا وہ اعتنا اور تدارس نہیں کیا جاتا جو احادیث کا کیا جاتا ہے..... اس وقت قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لو تو تمہاری فتح ہے۔ اس نور کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہ سکے گی۔ میں کہتا ہوں درحقیقت یہی ایک ہتھیار ہے جو اب بھی کارگر ہے اور ہمیشہ کے لیے کارگر ہو گا اور پہلے بھی قرن اول میں یہی ایک حربہ تھا جو خود حضور سرور عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام

اور صحابہ کے ہاتھ میں تھا مبارکی اور صد ہزار مبارک کی ہے اُس قوم کو جو اس کے اختیار کرنے اور اسی یگانہ کتاب کو اپنا مایۂ ایمان قرار دینے میں ذرا بھی تردد اور تذبذب میں نہیں پڑی بڑے جوش اور خوشی سے آگے بڑھ کر اس فرقان اور نور کو لبیک کہا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (الجزو ۲) یعنی قرآن میں تین صفتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ جو علوم دین لوگوں کو معلوم نہیں رہے تھے اُن کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔ دوسرے جن علوم میں پہلے کچھ اجمال چلا آتا تھا اُن کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ تیسرے جن اُمور میں اختلاف اور تنازعہ پیدا ہو گیا تھا اُن میں قول فیصل بیان کر کے حق اور باطل میں فرق ظاہر کرتا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۰۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ

اور جب تجھ سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو میں نزدیک ہوں دُعا کرنے والے کی دُعا قبول کرتا ہوں۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۰۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جب میرے بندے میرے بارہ میں سوال کریں تُو ان کو کہہ دے کہ میں نزدیک ہوں یعنی جب وہ لوگ جو اللہ رسول پر ایمان لائے ہیں یہ پتہ پوچھنا چاہیں کہ خدا تعالیٰ ہم سے کیا عنایات رکھتا ہے جو ہم سے مخصوص ہوں اور غیروں میں نہ پائی جاویں۔ تو ان کو کہہ دے کہ میں نزدیک ہوں یعنی تم میں اور تمہارے غیروں میں یہ فرق ہے کہ تم میرے مخصوص اور قریب ہو اور دوسرے مہجور اور دور ہیں جب کوئی دعا کرنے والوں میں سے جو تم میں سے دعا کرے دعا کرتے ہیں تو میں اُس کا جواب دیتا ہوں یعنی میں اس کا ہم کلام ہو جاتا ہوں اور اس سے باتیں کرتا ہوں اور اُس کی دعا کو پایۂ قبولیت میں جگہ دیتا ہوں پس چاہیئے کہ قبول کریں حکم میرے کو اور ایمان لاویں تاکہ بھلائی پاویں۔

(جنگ مقدس صفحہ ۵۴ بحث ۲۶ مئی ۱۸۹۳ء)

ہر ایک پکارنے والے کی پکار کو سننے والا اور جواب دینے والا یعنی دعاؤں کا قبول کرنے والا۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۲۵)

یعنی اگر میرے بندے میری نسبت سوال کریں کہ وہ کہاں ہے تو ان کو کہہ کہ وہ تم سے بہت ہی قریب ہے میں دعا کرنیوالے کی دعا سنتا ہوں۔ پس چاہیئے کہ وہ دعاؤں سے میرا وصل ڈھونڈیں اور مجھ پر ایمان لاویں تاکہ کامیاب ہوں۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۹)

اور جب میرے پرستار تجھ سے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں یعنی دوستوں کے لیے نزدیک ہوں اور دشمنوں کے لیے دور۔
(ست بچن ص۹۲)

یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں کہ خدا کے وجود پر دلیل کیا ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ میں بہت نزدیک ہوں یعنی کچھ بڑے دلائل کی حاجت نہیں۔ میرا وجود نہایت اقرب طریق سے سمجھ آسکتا ہے اور نہایت آسانی سے میری ہستی پر دلیل پیدا ہوتی ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ جب کوئی دعا کرنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی سنتا ہوں اور اپنے الہام سے اس کی کامیابی کی بشارت دیتا ہوں جس سے نہ صرف میری ہستی پر یقین آتا ہے بلکہ میرا قادر ہونا بھی بپایۂ یقین پہنچتا ہے۔ لیکن چاہیئے کہ لوگ ایسی حالت تقویٰ اور خدا ترسی کی پیدا کریں کہ میں ان کی آواز سنوں۔ اور نیز چاہیئے کہ وہ مجھ پر ایمان لاویں اور قبل اس کے جو ان کو معرفت تامہ ملے اس بات کا اقرار کریں کہ خدا موجود ہے اور تمام طاقتیں اور قدرتیں رکھتا ہے۔ کیونکہ جو شخص ایمان لاتا ہے اسی کو عرفان دیا جاتا ہے۔ (ایام الصلح ص۳۱)

یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں کہ وہ کہاں ہے پس جواب یہ ہے کہ ایسا نزدیک ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی نزدیک نہیں جو شخص مجھ پر ایمان لاکر مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ ہر ایک چیز کی کل میرے ہاتھ میں ہے اور میرا علم سب پر محیط ہے میں ہی ہوں جو زمین و آسمان کو اٹھا رہا ہوں۔ میں ہی ہوں جو تمہیں خشکی تری میں اٹھا رہا ہوں۔ (نسیم دعوت ص۸۴-۸۵)

یعنی اگر میرے بندے میرے وجود سے سوال کریں۔ کہ کیونکر اس کی ہستی ثابت ہے۔ اور کیونکر سمجھا جائے۔ کہ خدا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں بہت ہی نزدیک ہوں میں اپنے پکارنے والے کو جواب دیتا ہوں اور جب وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی آواز سنتا ہوں۔ اور اس سے ہمکلام ہوتا ہوں۔ پس چاہیئے کہ اپنے تئیں ایسے بناویں کہ میں ان سے ہمکلام ہو سکوں اور مجھ پر کامل ایمان لاویں۔ تاکہ ان کو میری راہ ملے۔ (لیکچر لاہور ص۱۳)

چاہیئے کہ میرے حکموں کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لاویں۔ تاکہ ان کا بھلا ہو۔
(یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱ نیز پیغام صلح ص۴)

قرآن شریف نے جو کہا ہے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دعا کا جواب ملتا ہے۔
(الحکم جلد ۶ ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء ص۱۲)

اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ یعنی میں توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہوں خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ اس اقرار کو جائز قرار دیتا ہے جو کہ سچے دل سے توبہ کرنے والا کرتا ہے اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کا اقرار نہ ہوتا تو پھر توبہ کا منظور ہونا ایک مشکل امر تھا۔ سچے دل سے جو اقرار کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر خدا تعالیٰ بھی اپنے تمام وعدے پورے کرتا ہے جو اس نے توبہ کرنے والوں کے ساتھ کیے ہیں۔ اور اسی وقت سے ایک نور کی تجلی اس کے دل میں شروع

ہو جاتی ہے جب انسان یہ اقرار کرتا ہے کہ میں تمام گناہوں سے بچوں گا اور دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔

(البدر جلد ۲ ۱۴/۱۳ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۱)

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ کے یہی معنے ہیں۔کہ اگر سوال ہو۔کہ خدا کا علم کیونکر ہوا۔تو جواب یہ ہے۔کہ اسلام کا خدا بہت قریب ہے۔اگر کوئی اُسے سچے دل سے بلاتا ہے۔تو وہ جواب دیتا ہے۔دوسرے فرقوں کے خدا قریب نہیں ہیں بلکہ اس قدر دور ہیں۔کہ اُن کا پتہ ہی ندارد۔اعلیٰ سے اعلیٰ غرض عابد اور پرستار کی یہی ہے کہ اس کا قرب حاصل ہو۔اور یہی ذریعہ ہے جس سے اس کی ہستی پر یقین حاصل ہوتا ہے۔اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کے بھی یہی معنے ہیں۔کہ وہ جواب دیتا ہے۔گونگا نہیں ہے۔دوسرے تمام دلائل اس کے آگے ہیچ ہیں۔کلام ایک ایسی شے ہے۔جو کہ دیدار کے قائمقام ہے۔

(البدر جلد ۳ ۲۹ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جب میرا بندہ میری بابت سوال کرے پس میں بہت ہی قریب ہوں میں پکارنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ پکارتا ہے۔بعض لوگ اُس کی ذات پر شک کرتے ہیں پس میری ہستی کا نشان یہ ہے کہ تم مجھے پکارو اور مجھ سے مانگو۔میں تمہیں پکاروں گا اور جواب دونگا۔اور تمہیں یاد کروں گا۔اگر یہ کہو کہ ہم پکارتے ہیں پر وہ جواب نہیں دیتا تو دیکھو۔کہ تم ایک جگہ کھڑے ہو کر ایک ایسے شخص کو جو تم سے بہت دور ہے پکارتے ہو۔اور تمہارے اپنے کانوں میں کچھ نقص ہے۔وہ شخص تو تمہاری آواز سن کر تم کو جواب دیگا۔مگر جب وہ دور سے جواب دے گا تو تم بباعث بہرہ پن کے سن نہیں سکو گے۔پس جوں جوں تمہارے درمیانی پردے اور حجاب اور دوری دور ہوتی جاویگی تو تم ضرور آواز کو سنو گے۔جب سے دنیا کی پیدائش ہوئی ہے اس بات کا ثبوت چلا آتا ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو رفتہ رفتہ بالکل یہ بات نابود ہو جاتی کہ اُس کی کوئی ہستی ہے بھی۔پس خدا کی ہستی کے ثبوت کا سب سے زبردست ذریعہ یہی ہے کہ ہم اُس کی آواز کو سن لیں۔یا دیدار یا گفتار۔پس آج کل کا گفتار قائمقام ہے دیدار کا۔ہاں جب تک خدا کے اور اس سائل کے درمیان کوئی حجاب ہے اُس وقت تک ہم سن نہیں سکتے جب درمیانی پردہ اُٹھ جاویگا تو اُس کی آواز سنائی دیگی۔ (الحکم جلد ۸ ۳۸و۳۹ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

دعا خدا تعالیٰ کی ہستی کا زبردست ثبوت ہے چنانچہ خدا تعالیٰ ایک جگہ فرماتا ہے۔وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔یعنی جب میرے بندے تجھ سے سوال کریں کہ خدا کہاں ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے تو کہدو کہ وہ بہت ہی قریب ہے۔اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی دعا کرنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کو جواب دیتا ہوں یہ جواب کبھی رویا صالحہ کے ذریعہ ملتا ہے اور کبھی کشف اور الہام کے واسطے سے اور علاوہ بریں دعاؤں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں کا اظہار ہوتا ہے۔اور

معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا قادر ہے جب کہ مشکلات کو حل کر دیتا ہے غرض دعا بڑی دولت اور طاقت ہے۔اور قرآن شریف میں جا بجا اس کی ترغیب دی ہے اور ایسے لوگوں کے حالات بھی بتائے ہیں جنہوں نے دعا کے ذریعہ اپنے مشکلات سے نجات پائی۔انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی جڑ اور ان کی کامیابیوں کا اصل اور سچا ذریعہ یہی دعا ہے پس میں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی ایمانی اور عملی طاقت کو بڑھانے کے واسطے دعاؤں میں لگے رہو۔دعاؤں کے ذریعہ سے ایسی تبدیلی ہوگی جو خدا کے فضل سے خاتمہ بالخیر ہو جاویگا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

معرفت فضل کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور پھر فضل کے ذریعہ سے ہی باقی رہتی ہے فضل معرفت کو نہایت مصفّٰی اور روشن کر دیتا ہے۔اور حجابوں کو درمیان سے اُٹھا دیتا ہے اور نفس امّارہ کے لیے گرد و غبار کو دور کر دیتا ہے۔اور روح کو قوت اور زندگی بخشتا ہے اور نفس امّارہ کو امّارگی کی زندان سے نکالتا ہے۔اور بد خواہشوں کی پلیدی سے پاک کرتا ہے۔اور نفسانی جذبات کے تند سیلاب سے باہر لاتا ہے۔تب انسان میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔اور وہ بھی گندی زندگی سے طبعاً بیزار ہو جاتا ہے۔کہ بعد اس کے پہلی حرکت جو فضل کے ذریعہ سے روح میں پیدا ہوتی ہے۔وہ دعا ہے۔یہ خیال مت کرو۔کہ ہم بھی ہر روز دعا کرتے ہیں۔اور تمام نماز دعا ہی ہے۔جو ہم پڑھتے ہیں کیونکہ وہ دعا جو معرفت کے بعد اور فضل کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے وہ اور رنگ اور کیفیّت رکھتی ہے۔وہ فنا کرنے والی چیز ہے۔وہ گداز کرنے والی آگ ہے۔وہ رحمت کو کھینچنے والی ایک مقناطیسی کشش ہے۔وہ موت ہے پر آخر کو زندہ کرتی ہے۔وہ ایک تند سیل ہے پر آخر کو کشتی بن جاتی ہے۔ہر ایک بگڑی ہوئی بات اس سے بن جاتی ہے۔اور ہر ایک زہر آخر اس سے تریاق ہو جاتا ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲۶)

دُعا خدا سے آتی ہے اور خدا کی طرف ہی جاتی ہے دُعا سے خدا ایسا نزدیک ہو جاتا ہے جیسا کہ تمہاری جان تم سے نزدیک ہے، دعا کی پہلی نعمت یہ ہے کہ انسان میں پاک تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔پھر اس تبدیلی سے خدا بھی اپنے صفات میں تبدیلی کرتا ہے اور اُس کے صفات غیر متبدل ہیں۔مگر تبدیلی یافتہ کے لیے اُس کی ایک الگ تجلی ہے جس کو دنیا نہیں جانتی۔گویا وہ اور خدا ہے حالانکہ اور کوئی خدا نہیں۔مگر نئی تجلی نئے رنگ میں اس کو ظاہر کرتی ہے۔تب اُس خاص تجلی کے شان میں اس تبدیل یافتہ کے لیے وہ کام کرتا ہے جو دوسروں کے لیے نہیں کرتا۔یہی وہ خوارق ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۲)

دعا میں ایک موت ہے اور اس کا بڑا اثر یہی ہوتا ہے کہ انسان ایک طرح سے مرجاتا ہے مثلاً ایک انسان ایک قطرہ پانی کا پی کر اگر دعویٰ کرے کہ میری پیاس بجھ گئی یا اُسے بڑی پیاس تھی تو وہ جھوٹا ہے ہاں اگر پیالہ بھر کر پیوے تو اس کی بات کی تصدیق ہوگی۔پوری سوزش اور گدازش کے ساتھ جب ایک رنگ میں دعا کی جاتی ہے۔حتیٰ کہ روح گداز ہو کر آستانہ الٰہی پر گر پڑتی ہے اور اسی کا نام دعا ہے اور الٰہی سنت یہی ہے کہ جب ایسی دعا ہوتی ہے تو خداوند تعالیٰ یا تو اُسے قبول کرتا ہے اور یا جواب دیتا ہے.... بات کر کے بتلا دیتا ہے.... مکالمات الٰہیہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی زبان پر کلام جاری کر رہا ہے اور وہ ایسی طاقت اور شدت سے ہوتی ہے جیسے ایک فولادی میخ دھنستی جاتی ہے

ایسی لطافت ہوتی ہے کہ گویا خدا کا کلام ہے۔ (البدر جلد ۱ ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۶/۹۱)

دیکھو ایک بچہ جب بھوک سے بیتاب اور بیقرار ہو کر دودھ کے لیے چلّاتا ہے اور چیختا ہے تو ماں کے پستان میں دودھ جوش مار کر آجاتا ہے حالانکہ بچہ تو دعا کا نام بھی نہیں جانتا لیکن یہ کیا سبب ہے کہ اس کی چیخیں دودھ کو جذب کر لاتی ہیں یہ ایک ایسا امر ہے کہ عموماً ہر ایک صاحب کو اس کا تجربہ ہے بعض اوقات ایسا دیکھا گیا ہے۔ کہ مائیں اپنی چھاتیوں میں دودھ کو محسوس بھی نہیں کرتی ہیں اور بسا اوقات ہوتا بھی نہیں لیکن جونہی بچہ کی دردناک چیخ کان میں پہنچی فوراً دودھ اُتر آیا ہے جیسے بچہ کی ان چیخوں کو دودھ کے جذب اور کشش کے ساتھ ایک علاقہ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری چلاہٹ ایسی ہی اضطراری ہو تو وہ اُس کے فضل اور رحمت کو جوش دلاتی ہے اور اُس کو کھینچ لاتی ہے اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ خدا کے فضل اور رحمت کو جو قبولیت دعا کی صورت میں آتا ہے میں نے اپنی طرف کھینچتے ہوئے محسوس کیا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دیکھا ہے۔ ہاں آجکل کے زمانہ کے تاریک دماغ فلاسفر اس کو محسوس نہ کر سکیں یا نہ دیکھ سکیں تو یہ صداقت دنیا سے اُٹھ نہیں سکتی اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ میں قبولیت دعا کا نمونہ دکھانے کے لیے ہر وقت طیار ہوں۔

(الحکم جلد ۵ ۳۲ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا جس نے دعا کی تعلیم نہیں دی یہ دعا ایک ایسی شی ہے جو عبودیت اور ربوبیت میں ایک رشتہ پیدا کرتی ہے۔ اس راہ میں قدم رکھنا بھی مشکل ہے لیکن جو قدم رکھتا ہے پھر دعا ایک ایسا ذریعہ ہے کہ ان مشکلات کو آسان اور سہل کر دیتا ہے۔۔۔۔ جب انسان خدا تعالیٰ سے متواتر دعائیں مانگتا ہے تو وہ اور ہی انسان ہو جاتا ہے اس کی روحانی کدورتیں دور ہو کر اس کو ایک قسم کی راحت اور سرور ملتا ہے اور ہر قسم کے تعصب اور ریاکاری سے الگ ہو کر وہ تمام مشکلات کو جو اس کی راہ میں پیدا ہوں برداشت کر لیتا ہے خدا کے لیے ان سختیوں کو جو دوسرے برداشت نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے صرف اس لیے کہ خدا تعالیٰ راضی ہو جاوے برداشت کرتا ہے تب خدا تعالیٰ جو رحمان رحیم خدا ہے اور سراسر رحمت ہے اس پر نظر کرتا ہے اور اس کی ساری کلفتوں اور کدورتوں کو سرور سے بدل دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۱۷ ۱۰ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۳ و ۴)

دعا ربوبیت اور عبودیت کا ایک کامل رشتہ ہے اگر دعاؤں کا اثر نہ ہوتا تو پھر اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۴۵ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

دعا ایسی چیز ہے کہ خشک لکڑی کو بھی سرسبز کر سکتی ہے۔ اور مردہ کو زندہ کر سکتی ہے اس میں بڑی تاثیریں ہیں جہاں تک قضاء و قدر کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے کوئی کیسا ہی معصیت میں غرق ہو دُعا اس کو بچا لے گی۔

اللہ تعالیٰ اُس کی دستگیری کریگا اور وہ خود محسوس کریگا کہ میں اب اور ہوں۔ دیکھو جو شخص مسموم ہے کیا وہ اپنا علاج آپ کر سکتا ہے اُس کا علاج تو دوسرا ہی کرے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تطہیر کے لیے یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور مامور کی دعائیں تطہیر کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہیں دعا کرنا اور کرانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے دعا کے لیے جب درد سے دل بھر جاتا ہے اور سارے حجابوں کو توڑ دیتا ہے اس وقت سمجھنا چاہیئے کہ دعا قبول ہوگئی یہ اسم اعظم ہے اس کے سامنے کوئی انہونی چیز نہیں ہے ایک خبیث کے لیے جب دعا کے ایسے اسباب میسر آجائیں تو یقیناً وہ صالح ہوجاوے اور بغیر دعا کے وہ اپنی توبہ پر بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ بیمار اور محجوب اپنی دستگیری آپ نہیں کر سکتا۔ سنت اللہ کے موافق یہی ہوتا ہے کہ جب دعائیں انتہا تک پہنچتی ہیں تو ایک شعلہ نور کا اُس کے دل پر گرتا ہے جو اُس کی ساری خباثتوں کو جلا کر تاریکی دور کر دیتا اور اندر ایک روشنی پیدا کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۵-۶)

ساری عقدہ کشائیاں دعا سے ہوجاتی ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اسلام کی صداقت اور حقیقت دعا ہی کے نکتہ کے نیچے مخفی ہے کیونکہ اگر دعا نہیں تو نماز بے فائدہ زکوٰۃ بے سود اور اسی طرح سب اعمال معاذ اللہ لغو ٹھہرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اللہ جلّ شانہ نے جو دروازہ اپنی مخلوق کی بھلائی کے لیے کھولا ہے وہ ایک ہی ہے یعنی دعا جب کوئی شخص بکاء وزاری سے اس دروازہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ مولائے کریم اُس کو پاکیزگی و طہارت کی چادر پہنا دیتا ہے اور اپنی عظمت کا غلبہ اُس پر اس قدر کر دیتا ہے کہ بیجا کاموں اور ناکارہ حرکتوں سے وہ کوسوں بھاگ جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

حصول فضل کا اقرب طریق دعا ہے اور دعا کامل کے لوازمات یہ ہیں کہ اس میں رقت ہو اضطراب اور گدازش ہو۔ جو دعا عاجزی اضطراب اور شکستہ دلی سے بھری ہوئی ہو وہ خدا تعالیٰ کے فضل کو کھینچ لاتی ہے اور قبول ہو کر اصل مقصد تک پہنچاتی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کے فضل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور پھر اس کا علاج یہی ہے کہ دعا کرتا رہے خواہ کیسی ہی بیدلی اور بیذوقی ہو لیکن یہ سیر نہ ہو تکلف اور تصنّع سے کرتا ہی رہے اصلی اور حقیقی دعا کے واسطے بھی دعا ہی کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ دعا کرتے ہیں اور ان کا دل سیر ہوجاتا ہے وہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ کچھ نہیں بنتا مگر ہماری نصیحت یہ ہے کہ اس خاک بیزی میں ہی برکت ہے کیونکہ آخر گوہر مقصود اسی سے نکل آتا ہے اور ایک دن آجاتا ہے کہ جب اس کا وہ دل زبان کے ساتھ متفق ہوجاتا ہے اور پھر خود ہی وہ عاجزی اور رقت جو دعا کے لوازمات ہیں پیدا ہوجاتے ہیں۔ جو رات کو اُٹھتا ہے خواہ کتنی ہی عدم حضوری اور بے صبری ہو لیکن اگر وہ اس حالت میں بھی دعا کرتا ہے کہ الٰہی دل تیرے ہی قبضہ و تصرف میں ہے تو اس کو صاف کر دے اور عین قبض کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے بسط چاہے تو اس قبض میں سے بسط نکل آئیگی اور رقت پیدا ہوجائے گی یہی وہ وقت ہوتا ہے جو قبولیت کی گھڑی کہلاتا ہے وہ دیکھے گا کہ اس وقت رُوح آستانہ الوہیت پر پانی کی طرح بہتی ہے اور گویا ایک قطرہ ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف گرتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

دعا تو ایک ایسی چیز ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے دعا کے ساتھ مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے لوگوں کو دعا کی قدر و قیمت معلوم نہیں وہ بہت جلد ملول ہو جاتے ہیں اور ہمت ہار کر چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ دعا ایک استقلال اور مداومت کو چاہتی ہے۔ جب انسان پوری ہمت سے لگا رہتا ہے تو پھر ایک بد خلقی کیا ہزاروں بد خلقیوں کو اللہ تعالیٰ دور کر دیتا ہے اور اُسے کامل مومن بنا دیتا ہے لیکن اس کے واسطے اخلاص اور مجاہدہ شرط ہے جو دعا ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ عـ۱۳ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

انسان کو چاہیے کہ اس زندگی کو اس قدر قبیح خیال کر کے اس سے نکلنے کے لئے کوشش کرے اور دعا سے کام لے کیونکہ جب وہ حق تدبیر ادا کرتا ہے اور پھر سچی دعاؤں سے کام لیتا ہے تو آخر اللہ تعالیٰ اُس کو نجات دے دیتا ہے اور وہ گناہ کی زندگی سے نکل آتا ہے۔ کیونکہ دُعا بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک موت ہی ہے جب اس موت کو انسان قبول کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو مجرمانہ زندگی سے جو موت کا موجب ہے بچا لیتا ہے اور اُس کو ایک پاک زندگی عطا کرتا ہے۔

بہت سے لوگ دعا کو ایک معمولی چیز سمجھتے ہیں سو یاد رکھنا چاہیے کہ دعا یہی نہیں کہ معمولی طور پر نماز پڑھ کر ہاتھ اُٹھا کر بیٹھ گئے اور جو کچھ آیا مُنہ میں سے کہہ دیا۔ اس دعا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ دعا نری ایک منتر کی طرح ہوتی ہے نہ اس میں دل شریک ہوتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں پر کوئی ایمان ہوتا ہے۔ یاد رکھو دعا ایک موت ہے اور جیسے موت کے وقت اضطراب اور بیقراری ہوتی ہے اسی طرح پر دعا کے لیے بھی ویسا ہی اضطراب اور جوش ہونا ضروری ہے اس لیے دُعا کے واسطے پورا پورا اضطراب اور گدازش جب تک نہ ہو تو بات نہیں بنتی پس چاہیے کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر نہایت تضرع اور زاری و ابتہال کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حضور اپنی مشکلات کو پیش کرے اور اس دعا کو اُس حد تک پہنچا دے کہ ایک موت کی سی صورت واقع ہو جاوے اُس وقت دعا قبولیت کے درجہ تک پہنچتی ہے

یہ بھی یاد رکھو کہ سب سے اول اور ضروری دعا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کی دعا کرے ساری دعاؤں کا اصل اور جزیہی دعا ہے کیونکہ جب یہ دعا قبول ہو جاوے اور انسان ہر قسم کی گندگیوں اور آلودگیوں سے پاک صاف ہو کر خدا تعالیٰ کی نظر میں مطہر ہو جاوے تو پھر دوسری دعائیں جو اس کی حاجات ضروریہ کے متعلق ہوتی ہیں وہ اُس کو مانگنی بھی نہیں پڑتی ہیں وہ خود بخود قبول ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بڑی مشقت اور محنت طلب یہی دُعا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاوے اور خدا تعالیٰ کی نظر میں متقی اور راست باز ٹھہرایا جاوے۔ یعنی اول اول جو حجاب انسان کے دل پر ہوتے ہیں اُن کا دور ہونا ضروری ہے جب وہ دور ہو گئے تو دوسرے حجابوں کے دور کرنے کے واسطے اس قدر محنت اور مشقت کرنی نہیں پڑے گی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا فضل اس کے شامل حال ہو کر ہزاروں خرابیاں خود بخود دور ہونے لگتی ہیں اور جب اندر پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے تو

پھر اللہ تعالیٰ خود بخود اُس کا متکفل اور متولی ہوتا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کسی حاجت کو مانگے اللہ تعالیٰ خود اُس کو پورا کر دیتا ہے۔ یہ ایک باریک سِر ہے جو اُس وقت کھلتا ہے جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے اس سے پہلے اس کی سمجھ میں آنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن یہ ایک عظیم الشان مجاہدہ کا کام ہے کیونکہ دعا بھی ایک مجاہدہ کو چاہتی ہے جو شخص دعا سے لاپروائی کرتا ہے اور اُس سے دور رہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اُس کی پروا نہیں کرتا اور اُس سے دور ہو جاتا ہے۔ جلدی اور شتاب کاری یہاں کام نہیں دیتی خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جو چاہے عطا کرے اور جب چاہے عنایت فرمائے۔ سائل کا کام نہیں ہے کہ وہ فی الفور عطا نہ کیے جانے پر شکایت کرے اور بدظنی کرے بلکہ استقلال اور صبر سے مانگتا چلا جاوے۔ (الحکم جلد ۸ عـ۱۳ مورخہ ۲۴ ر اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۵،۶)

دُعا کے اندر قبولیت کا اثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ انتہائی درجہ کے اضطرار تک پہنچ جاتی ہے جب انتہائی درجہ اضطرار کا پیدا ہو جاتا ہے اُس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی قبولیت کے آثار اور سامان بھی پیدا ہو جاتے ہیں پہلے سامان آسمان پر کئے جاتے ہیں اس کے بعد وہ زمین پر اثر دکھاتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی بات نہیں بلکہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس کو خدائی کا جلوہ دیکھنا ہو اُسے چاہئیے کہ دعا کرے۔

(الحکم جلد ۸ عـ۱۳، مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

اگر دعا اپنے اختیار میں ہوتی تو انسان جو چاہتا کر لیتا اسی لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ فلاں دوست یا رشتہ دار کے حق میں ضرور فلاں بات ہو ہی جاوے گی بعض وقت باوجود سخت ضرورت محسوس کرنے کے دعا نہیں ہوتی اور دل سخت ہو جاتا ہے چونکہ اس کے سِر سے لوگ واقف نہیں ہوتے اس لیے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر جف القلم والی (یعنی مسئلہ تقدیر جس رنگ میں سمجھا گیا ہے) بات ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے علم میں سب سے ضرور ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ فلاں کام ضرور ہی کر دیوے اگر ان لوگوں کا یہی اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہونا تھا وہ سب کچھ ہو چکا اور ہماری محنت اور کوشش بے سود ہے تو درد سر کے وقت علاج کی طرف کیوں رجوع کرتے ہیں۔ پیاس کے لیے ٹھنڈا پانی کیوں پیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان کے تردد پر بھی کچھ نہ کچھ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

دعا عمدہ شی ہے اگر توفیق ہو تو ذریعہ مغفرت کا ہو جاتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ مہربان ہو جاتا ہے۔ دعا کے نہ کرنے سے اول زنگ دل پر چڑھتا ہے۔ پھر قساوت پیدا ہوتی ہے۔ پھر خدا سے اجنبیت۔ پھر عداوت۔ پھر نتیجہ سلب ایمان ہوتا ہے۔ البدر جلد ۳ عـ۱۸،۱۹ مورخہ ۸ تا ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳

جو دعا سے منکر ہے وہ خدا سے منکر ہے۔ صرف ایک دعا ہی ذریعہ خداشناسی کا ہے۔

البدر جلد ۳ عـ۱۸،۱۹ مورخہ ۸ تا ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴

دعا کی مثال ایک چشمۂ شیریں کی طرح ہے جس پر مومن بیٹھا ہوا ہے وہ جب چاہے اُس چشمہ سے اپنے کو سیراب کر سکتا ہے جس طرح ایک مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی اُسی طرح مومن کا پانی دعا ہے کہ جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا اس دعا کا ٹھیک محل نماز ہے جس میں وہ راحت اور سرور مومن کو ملتا ہے کہ جس کے مقابل ایک عیاش کا کامل درجہ کا سرور جو اسے کسی بدمعاشی میں میسر آسکتا ہے، ہیچ ہے۔ بڑی بات جو دعا میں حاصل ہوتی ہے وہ قربِ الٰہی ہے دعا کے ذریعہ ہی انسان خدا کے نزدیک ہو جاتا اور اُسے اپنی طرف کھینچتا ہے جب مومن کی دعا میں پورا اخلاص اور انقطاع پیدا ہو جاتا ہے تو خدا کو بھی اُس پر رحم آجاتا ہے اور خدا اُس کا متولی ہو جاتا ہے اگر انسان اپنی زندگی پر غور کرے تو الٰہی تولّی کے بغیر انسانی زندگی قطعاً تلخ ہو جاتی ہے۔ الحکم جلد ۸ عدد ۱۹، ۲۰ مورخہ ۱۰، ۱۷ جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۶

اسلام سے سچی مراد یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے تابع اپنی رضا کرلے۔ مگر سچ یہ ہے کہ یہ مقام انسان کی اپنی قوت سے نہیں مل سکتا ہاں اس میں کلام نہیں کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ مجاہدات کرے لیکن اس مقام کے حصول کا اصل اور سچا ذریعہ دعا ہے انسان کمزور ہے جب تک دعا سے قوت اور تائید نہیں پاتا اس دشوار گذار منزل کو طے نہیں کر سکتا۔ خود اللہ تعالیٰ انسان کی کمزوری اور اس کے ضعف حال کے متعلق ارشاد فرماتا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا[1] یعنی انسان ضعیف اور کمزور بنایا گیا ہے پھر باوجود اس کی کمزوری کے اپنی ہی طاقت سے ایسے عالی درجہ اور ارفع مقام کے حاصل کرنے کا دعویٰ کرنا سراسر خام خیالی ہے۔ اس کے لیے دعا کی بہت بڑی ضرورت ہے دعا ایک زبردست طاقت ہے جس سے بڑے بڑے مشکل مقام حل ہو جاتے ہیں۔ اور دشوار گذار منزلوں کو انسان بڑی آسانی سے طے کر لیتا ہے۔ کیونکہ دعا اس فیض اور قوت کے جذب کرنے والی نالی ہے جو اللہ تعالیٰ سے آتا ہے۔ جو شخص کثرت سے دعاؤں میں لگا رہتا ہے۔ وہ آخر اس فیض کو کھینچ لیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے تائید یافتہ ہو کر اپنے مقاصد کو پا لیتا ہے۔

ہاں نری دعا خدا تعالیٰ کا منشاء نہیں ہے بلکہ اول تمام مساعی اور مجاہدات کو کام میں لائے اور اُس کے ساتھ دعا سے کام لے۔ اسباب سے کام نہ لینا اور نری دعا سے کام لینا یہ آداب الدعا سے ناواقفی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کو آزمانا ہے اور نرے اسباب پر گر رہنا اور دعا کو لاشے محض سمجھنا یہ دہریت ہے یقیناً سمجھو کہ دعا بڑی دولت ہے جو شخص دعا کو نہیں چھوڑتا۔ اس کے دین اور دنیا پر آفت نہ آئے گی وہ ایک ایسے قلعہ میں محفوظ ہے جس کے اردگرد مسلح سپاہی ہر وقت حفاظت کرتے ہیں لیکن جو دعاؤں سے لاپروا ہے وہ اِس شخص کی طرح ہے جو خود بے ہتھیار ہے اور اس پر کمزور بھی ہے اور پھر ایسے جنگل میں ہے جو درندوں اور موذی جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کی خیر ہرگز نہیں ہے۔ ایک لمحہ میں وہ موذی جانوروں کا شکار ہو جائے گا اور اس کی ہڈی بوٹی نظر نہ آئے گی اس لیے یاد رکھو کہ انسان کی بڑی سعادت اور اس کی حفاظت کا اصل ذریعہ یہی دعا ہے۔ یہی دعا اس کے لیے پناہ ہے اگر وہ ہر وقت اس میں لگا رہے۔

الحکم جلد ۸ عدد ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴

---

[1] النساء : ۲۹۔

دوسرا طریق حقیقی پاکیزگی اور خاتمہ بالخیر کے حاصل کرنے کا جو خدا تعالیٰ نے سکھایا ہے جو دراصل سب سے مقدم ہے وہ دُعا ہے اس لیے جس قدر ہو سکے دُعا کرو یہ طریق اعلیٰ درجہ کا مفید اور مجرب ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[1] تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہارے لیے قبول کروں گا۔ دُعا ایک ایسی چیز ہے جس کے ساتھ مسلمانوں کو دوسری قوموں پر فخر کرنا چاہیے۔ دوسرے مذاہب کو دُعا کی حقیقت کی کچھ بھی خبر نہیں اسی واسطے ان کو دُعا کی کوئی قدر نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی اس میں سخت ٹھوکر کھائی ہے کہ دُعا جیسی شے کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے ہیں حالانکہ یہ فخر اور ناز صرف اسلام کو ہی ہے۔ دوسرے مذاہب اس سے بکلی بے بہرہ ہیں۔ تقریریں ص

دعا اسلام کا خاص فخر ہے اور مسلمانوں کو اس پر بڑا ناز ہے مگر یہ یاد رکھو کہ یہ دعا زبانی بک بک کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے کہ دل خدا تعالیٰ کے خوف سے بھر جاتا ہے اور دعا کرنیوالے کی روح پانی کی طرح بہہ کر آستانہ الوہیت پر گرتی ہے اور اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کے لیے قوی اور مقتدر خدا سے طاقت اور قوت اور مغفرت چاہتی ہے اور یہ وہ حالت ہے کہ دوسرے الفاظ میں اس کو موت کہہ سکتے ہیں جب یہ حالت میسر آجاوے تو یقیناً سمجھو کہ باب اجابت اس کے لیے کھولا جاتا ہے اور خاص قوت اور فضل اور استقامت بدیوں سے بچنے اور نیکیوں پر استقلال کے لیے عطا ہوتی ہے۔ یہ ذریعہ سب سے بڑھ کر زبردست ہے۔

مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ دعا کی حقیقت اور حالت سے محض ناواقف ہیں اور اسی وجہ سے اس زمانہ میں بہت سے لوگ اس سے منکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ان تاثیرات کو نہیں پاتے۔ اور منکر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے پھر دعا کی کیا حاجت ہے؟ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ یہ تو نرا بہانہ ہے۔ انھیں چونکہ دعا کا تجربہ نہیں اس کی تاثیرات پر اطلاع نہیں اس لیے اس طرح کہہ دیتے ہیں ورنہ اگر وہ ایسے ہی متوکل ہیں تو پھر بیمار ہو کر علاج کیوں کرتے ہیں...... جب کہ دوسری اشیاء میں تاثیرات موجود ہیں تو کیا وجہ ہے کہ باطنی دنیا میں تاثیرات نہ ہوں جن میں سے دعا ایک زبردست چیز ہے۔ الحکم جلد ۹ ع۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۵ء ص۲

دعا کرتے وقت بیدلی اور گھبراہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے اور جلد ہی تھک کر نہیں بیٹھنا چاہیے۔ بلکہ اس وقت تک ہٹنا نہیں چاہیے جب تک دعا اپنا پورا اثر نہ دکھائے۔ جو لوگ تھک جاتے ہیں اور گھبرا جاتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں کیونکہ یہ محروم رہ جانے کی نشانی ہے میرے نزدیک دعا بہت عمدہ چیز ہے اور میں اپنے تجربہ سے کہتا ہوں خیالی بات نہیں جو مشکل کسی تدبیر سے حل نہ ہوتی ہو۔ اللہ تعالیٰ دعا کے ذریعہ اسے آسان کر دیتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ دعا بڑی زبردست اثر والی چیز ہے۔ بیماری سے شفا اس کے ذریعہ ملتی ہے۔ دنیا کی تنگیاں مشکلات اس سے دور ہوتی ہیں دشمنوں کے منصوبے سے یہ بچالیتی ہے اور وہ کیا چیز ہے جو دعا سے حاصل نہیں ہوتی؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو پاک یہ کرتی ہے اور خدا تعالیٰ پر زندہ ایمان یہ بخشتی ہے۔ گناہ سے نجات دیتی ہے اور نیکیوں پر استقامت اس کے ذریعہ سے آتی ہے۔ بڑا ہی خوش قسمت وہ شخص ہے جس کو دعا پر ایمان ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عجیب در عجیب قدرتوں

---

[1] سورۃ المومن: ۶۱ [2] الحکم جلد ۹ ع۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۵ء ص۳

کو دیکھتا ہے اور خدا تعالیٰ کو دیکھ کر ایمان لاتا ہے کہ وہ قادر کریم خدا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شروع قرآن ہی میں دعا سکھائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی عظیم الشان اور ضروری چیز ہے اس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں ہو سکتا .... خدا تعالیٰ کی تجلیات اور رحمتوں کے ظہور کے لیے دعا کی بہت بڑی ضرورت ہے اس لیے اس پر ہمیشہ کمربستہ رہو اور کبھی مت تھکو۔ غرض اصلاح نفس کے لیے اور خاتمہ بالخیر ہونے کے لیے نیکیوں کی توفیق پانے کے واسطے دوسرا پہلو دعا کا ہے۔ اس میں جس قدر توکل اور یقین اللہ تعالیٰ پر کرے گا اور اس راہ میں نہ تھکنے والا قدم رکھے گا۔ اسی قدر عمدہ نتائج اور ثمرات ملیں گے تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اور دعا کرنے والا التقویٰ کے اعلیٰ محل پر پہونچ جاوے گا۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کسی کو پاک نہ کرے کوئی پاک نہیں ہو سکتا۔ نفسانی جذبات پر محض خدا تعالیٰ کے فضل اور جذبہ ہی سے موت آتی ہے۔ اور یہ فضل اور جذبہ دعا ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ طاقت صرف دعا ہی سے ملتی ہے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ مسلمانوں اور خصوصاً ہماری جماعت کو ہرگز ہرگز دعا کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہی دعا تو ہے جس پر مسلمانوں کو ناز کرنا چاہیے۔ اور دوسرے مذاہب کے آگے تو دعا کے لیے گندے پتھر پڑے ہوئے ہیں اور وہ توجہ نہیں کر سکتے۔

الحکم جلد ۹ ع۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲،۳

دعا ایسی شے ہے۔ کہ جن امراض کو اطباء اور ڈاکٹر لاعلاج کہہ دیتے ہیں۔ ان کا علاج بھی دعا کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

البدر جلد ۱ ع۳ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲

اصل حقیقت دُعا کی وہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا اور انسان کے درمیان رابطہ تعلق بڑھے۔ یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور انسان کو نامعقول باتوں سے ہٹاتی ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ انسان رضائے الٰہی کو حاصل کرے۔ اس کے بعد روا ہے کہ انسان اپنی دنیوی ضروریات کے واسطے بھی دُعا کرے۔ یہ اس واسطے روا رکھا گیا ہے کہ دنیوی مشکلات بعض دفعہ دینی معاملات میں ہارج ہو جاتے ہیں۔ خاص کر خامی اور کچے پنے کے زمانہ میں یہ اُمور ٹھوکر کا موجب بن جاتے ہیں۔ صلوٰۃ کا لفظ پُرسوز معنی پر دلالت کرتا ہے جیسے آگ سے سوزش پیدا ہوتی ہے ویسی ہی گدازش دعا میں پیدا ہونی چاہیے جب ایسی حالت کو پہونچ جائے۔ جیسے موت کی حالت ہوتی ہے تب اُس کا نام صلوٰۃ ہوتا ہے۔

البدر جلد ۱ ع۸ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۴

اصل راہ اور گُر خدا شناسی کا دعا ہے۔

الحکم جلد ۹ ع۲۴ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹

میرا مذہب بیماریوں کے دعا کے ذریعہ سے شفا کے متعلق ایسا ہے کہ جتنا میرے دل میں ہے اتنا میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ طبیب ایک حد تک چل کر ٹھہر جاتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے مگر اُس کے آگے خدا دعا کے ذریعہ سے راہ کھول دیتا ہے۔ خدا شناسی اور خدا پر توکل اسی کا نام ہے کہ جو حدیں لوگوں نے مقرر کی ہوئی ہیں اُن سے آگے بڑھ کر رجا پیدا ہو۔

ورنہ اس میں تو آدمی زندہ ہی مرجاتا ہے۔ اسی جگہ سے اللہ تعالیٰ کی شناخت شروع ہوجاتی ہے ...... عام لوگوں کے نزدیک جب کوئی معاملہ یاس کی حالت تک پہنچ جاتا ہے خدا تعالیٰ اندر ہی اندر تصرفات شروع کرتا ہے اور معاملہ صاف ہوجاتا ہے .... اکثر لوگ دعا کی اصل فلاسفی سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ دعا کے ٹھیک ٹھکانہ پر پہنچنے کے واسطے کس قدر توجہ اور محنت درکار ہے۔ دراصل دعا کرنا ایک قسم کی موت کا اختیار کرنا ہوتا ہے۔ الحکم جلد ۹ ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۱

دعا اور توجہ میں ایک روحانی اثر ہے۔ جس کو طبعی لوگ جو صرف مادی نظر رکھنے والے ہیں نہیں سمجھ سکتے۔ سنت اللہ میں دقیق در دقیق اسباب کا ذخیرہ ہے جو دعا کے بعد اپنا کام کرتا ہے ...... اس جہان کے لوگ جب فتنہ و فساد کی کثرت کو دیکھ کر اس کی اصلاح سے عاجز آجاتے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو ایسے قوی عطا کرتے ہیں۔ جن کی توجہ سے سب کام درست ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دعا کے ذریعہ سے عمریں بڑھ جاتی ہیں۔ (بدر جلد ۱ ۱۷ مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

واضح ہو کہ استجابت دعا کا مسئلہ درحقیقت دعا کے مسئلہ کی ایک فرع ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص نے اصل کو سمجھا ہوا نہیں ہوتا اس کو فرع کے سمجھنے میں پیچیدگیاں واقع ہوتی ہیں اور دھوکے لگتے ہیں ...... اور دُعا کی ماہیت یہ ہے کہ ایک سعید بندہ اور اُس کے ربّ میں ایک تعلق مجاذبہ ہے یعنی پہلے خدا تعالیٰ کی رحمانیت بندہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے پھر بندہ کے صدق کی کششوں سے خدا تعالیٰ اُس کے نزدیک ہوجاتا ہے اور دُعا کی حالت میں وہ تعلق ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے خواص عجیبہ پیدا کرتا ہے سو جس وقت بندہ کسی سخت مشکل میں مبتلا ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف کامل یقین اور کامل اُمید اور کامل محبت اور کامل وفاداری اور کامل ہمت کے ساتھ جھکتا ہے اور نہایت درجہ کا بیدار ہو کر غفلت کے پردوں کو چیرتا ہوا فنا کے میدانوں میں آگے سے آگے نکل جاتا ہے پھر آگے کیا دیکھتا ہے کہ بارگاہ الوہیت ہے اور اُس کے ساتھ کوئی شریک نہیں تب اُس کی روح اُس آستانہ پر سر رکھ دیتی ہے اور قوت جذب جو اُس کے اندر رکھی گئی ہے وہ خدا تعالیٰ کی عنایات کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب اللہ جلّ شانہ اُس کام کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اُس دُعا کا اثر اُن تمام مبادی اسباب پر ڈالتا ہے جن سے ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ جو اُس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً اگر بارش کے لیے دعا ہے۔ تو بعد استجابت دعا کے وہ اسباب طبعیہ جو بارش کے لیے ضروری ہوتے ہیں اُس دُعا کے اثر سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اور اگر قحط کے لیے بد دعا ہے تو قادر مطلق مخالفانہ اسباب کو پیدا کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات ارباب کشف اور کمال کے نزدیک بڑے بڑے تجارب سے ثابت ہو چکی ہے۔ کہ کامل کی دعا میں ایک قوّت تکوین پیدا ہوجاتی ہے۔ یعنی باذنہ تعالیٰ وہ دعا عالم سفلی اور علوی میں تصرف کرتی ہے۔ اور عناصر اور اجرام فلکی اور انسانوں کے دلوں کو اُس طرف لے آتی ہے جو طرف مؤید مطلوب ہے۔ خدا تعالیٰ کی پاک کتابوں میں اس کی نظیریں کچھ کم نہیں ہیں۔ بلکہ اعجاز کے بعض اقسام کی حقیقت بھی دراصل استجابت دُعا ہی ہے۔ اور جس قدر ہزاروں معجزات انبیا سے ظہور میں آئے ہیں۔ یا جو کچھ کہ اولیائے کرام ان دنوں تک عجائب کرامات دکھلاتے رہے اُس کا اصل اور منبع یہی دُعا ہے۔ اور اکثر دعاؤں کے اثر سے ہی طرح طرح کے خوارق

قدرت قادر کا تماشا دکھلا رہے ہیں وہ جو عرب کے بیابانی ملک میں ایک عجیب ماجرا گذرا کہ لاکھوں مُردے تھوڑے دنوں میں زندہ ہوگئے۔ اور پُشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے۔ اور آنکھوں کے اندھے بینا ہوئے۔ اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے اور دُنیا میں یکدفعہ ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نہ پہلے اُس سے کسی آنکھ نے دیکھا۔ اور نہ کسی کان نے سُنا۔ کچھ جانتے ہو کہ وہ کیا تھا؟ وہ ایک فانی فی اللہ کی اندھیری راتوں کی دُعائیں ہی تھیں جنھوں نے دُنیا میں شور مچادیا۔ اور وہ عجائب باتیں دکھلائیں کہ جو اُس امی بیکس سے محالات کی طرح نظر آتی تھیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلَیْہِ وَآلِہٖ بِعَدَدِ ھَمِّہٖ وَغَمِّہٖ وَحُزْنِہٖ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَاَنْزِلْ عَلَیْہِ اَنْوَارَ رَحْمَتِکَ اِلَی الْاَبَدِ۔

اور میں اپنے ذاتی تجربہ سے بھی دیکھ رہا ہوں کہ دُعاؤں کی تاثیر آب و آتش کی تاثیر سے بڑھ کر ہے۔ بلکہ اسباب طبعیہ کے سلسلہ میں کوئی چیز ایسی عظیم التاثیر نہیں جیسی کہ دُعا ہے۔

اور اگر یہ شُبہ ہو کہ بعض دعائیں خطا جاتی ہیں۔ اور اُن کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تو میں کہتا ہوں کہ یہی حال دواؤں کا بھی ہے۔ کیا دواؤں نے موت کا دروازہ بند کر دیا ہے؟ یا اُن کا خطا جانا غیر ممکن ہے؟ مگر کیا باوجود اس بات کے کوئی اُن کی تاثیر سے انکار کر سکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پر تقدیر محیط ہو رہی ہے مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بےحرمت نہیں کیا۔ اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو یہ جسمانی اور روحانی اسباب بھی تقدیر سے باہر نہیں ہیں۔

مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو۔ تو اسباب علاج پورے طور پر میسّر آجاتے ہیں۔ اور جسم کی حالت بھی ایسے درجہ پر ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نفع اُٹھانے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ تب دوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے یہی قاعدہ دُعا کا بھی ہے۔ یعنی دُعا کے لیے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیّت اسی جگہ جمع ہوتے ہیں جہاں ارادہ الٰہی اُس کے قبول کرنے کا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے نظام جسمانی اور روحانی کو ایک ہی سلسلہ موثرات اور متاثرات میں باندھ رکھا ہے۔ (برکات الدعا صفحہ ۶)

دعا کرنے میں صرف تضرع کافی نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اور طہارت اور راست گوئی اور کامل یقین اور کامل محبت اور کامل توجہ اور یہ کہ جو شخص اپنے لیے دعا کرتا ہے یا جس کے لیے دعا کی گئی ہے اُس کی دُنیا اور آخرت کے لیے اُس بات کا حاصل ہونا خلاف مصلحت الٰہی بھی نہ ہو۔ کیونکہ بسا اوقات دعا میں اور شرائط تو سب جمع ہو جاتے ہیں۔ مگر جس چیز کو مانگا گیا ہے وہ عند اللہ سائل کے لیے خلاف مصلحت الٰہی ہوتی ہے۔ اور اُس کے پورا کرنے میں خیر نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کسی ماں کا پیارا بچہ بہت الحاح اور رونے سے یہ چاہے کہ وہ آگ کا ٹکڑا یا سانپ کا بچہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دے۔ یا ایک زہر جو بظاہر خوبصورت معلوم ہوتی ہے اُس کو کھلا دے تو یہ سوال اُس بچہ کا ہرگز اُس کی ماں پورا نہیں کرے گی۔ اور اگر پورا کر دیوے اور اتفاقاً بچہ کی جان بچ جاوے لیکن کوئی عضو اُس کا بے کار ہو جاوے تو بلوغ کے بعد وہ بچہ اپنی اُس احمق والدہ کا سخت شاکی ہوگا۔ اور بجز اس کے اور بھی کئی شرائط ہیں کہ جب تک وہ تمام جمع نہ ہوں اس وقت تک دعا کو دعا نہیں کہہ سکتے۔ اور جب تک کسی دُعا میں پوری روحانیت داخل نہ ہو۔ اور جس کے لیے دعا کی گئی ہے اور جو دعا کرتا ہے اُن میں استعداد قریبہ پیدا نہ ہو تب تک توقع اثر دُعا امید

موہوم ہے۔ اور جب تک ارادہ الٰہی قبولیت دعا کے متعلق نہیں ہوتا تب تک یہ تمام شرائط جمع نہیں ہوتیں۔ اور ہمتیں پوری توجہ سے قاصر رہتی ہیں۔ برکات الدعا صـ ۱۰-۱۱

سرے سے قبولیت دعا کا انکار کرنا تو خلاف تجارب صحیحہ و عقل و نقل ہے ہاں دعاؤں کی قبولیت کے لیے اس روحانی حالت کی ضرورت ہے جس میں انسان نفسانی جذبات اور میل غیر اللہ کا چولہ اتار کر اور بالکل روح ہو کر خدا تعالیٰ سے جا ملتا ہے ایسا شخص مظہر العجائب ہوتا ہے۔ اور اس کی محبت کی موجیں خدا کی محبت کی موجوں سے یوں ایک ہو جاتی ہیں جیسا کہ دو شفاف پانی دو متقارب چشموں سے جوش مار کر آپس میں مل کر بہنا شروع کر دیتے ہیں ایسا آدمی گویا خدا کی شکل دیکھنے کے لیے ایک آئینہ ہوتا ہے اور غیب الغیب خدا کا اس کے عجائب کاموں سے پتہ ملتا ہے۔ اس کی دعائیں اس کثرت سے منظور ہوتی ہیں کہ گویا دنیا کو پوشیدہ خدا دکھا دیتا ہے۔ تریاق القلوب صـ ۱۵۱-۱۵۲

جب تو دعا کے لیے کھڑا ہو تو تجھے لازم ہے کہ یہ یقین رکھے کہ تیرا خدا ہر ایک چیز پر قادر ہے تب تیری دعا منظور ہو گی اور تو خدا کی قدرت کے عجائبات دیکھے گا جو ہم نے دیکھے ہیں اور ہماری گواہی رویت سے ہے نہ بطور قصّہ کے۔ اُس شخص کی دعا کیونکر منظور ہو اور خود کیونکر اُس کو بڑی مشکلات کے وقت جو اُس کے نزدیک قانون قدرت کے مخالف ہیں دعا کرنے کا حوصلہ پڑے جو خدا کو ہر ایک چیز پر قادر نہیں سمجھتا۔ کشتی نوحؑ صـ ۱۹

یہ ایک سچا اور یقینی امر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعاؤں کو سُنتا ہے اور اُن کو قبولیت کا شرف بخشتا ہے۔ مگر ہر رطب و یابس کو نہیں۔ کیونکہ جوش نفس کی وجہ سے انسان انجام اور مآل کو نہیں دیکھتا اور دعا کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جو حقیقی بہی خواہ اور مآل بین ہے۔ اُن مضرّتوں اور بد نتائج کو ملحوظ رکھ کر جو اُس دُعا کے تحت میں بصورت قبول داعی کو پہنچ سکتے ہیں اُسے رد کر دیتا ہے۔ اور یہ رد دعا ہی اُس کے لیے قبول دعا ہوتا ہے۔ پس ایسی دعائیں جن میں انسان حوادث اور صدمات سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول کر لیتا ہے۔ مگر مضر دعاؤں کو بصورت رد قبول فرما لیتا ہے...

یہ بات بھی بحضور دل سُن لینی چاہیے کہ قبول دُعا کے لیے بھی چند شرائط ہوتی ہیں ان میں سے بعض تو دُعا کرنے والے کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض دعا کرانے والے کے متعلق۔ دُعا کرانے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیّت کو مدنظر رکھے۔ اور اُس کے غنا ذاتی سے ہر وقت ڈرتا رہے۔ اور صلح کاری اور خدا پرستی اپنا شعار بنا لے۔ تقویٰ اور راستبازی سے خدائے تعالیٰ کو خوش کرے۔ تو ایسی صورت میں دعا کے لیے باب استجابت کھولا جاتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صـ ۱۳۲)

یہ سچّی بات ہے کہ جو شخص اعمال سے کام نہیں لیتا وہ دعا نہیں کرتا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی آزمایش کرتا ہے۔ اس لیے دعا کرنے سے پہلے اپنی تمام طاقتوں کو خرچ کرنا ضروری ہے۔ اور یہی معنی اس دعا (اھدنا الصراط المستقیم الخ) کے ہیں پہلے لازم ہے کہ انسان اپنے اعتقاد۔ اعمال میں نظر کرے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کی عادت ہے کہ اصلاح اسباب کے پیرایہ

میں ہوتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی ایسا سبب پیدا کر دیتا ہے کہ جو اصلاح کا موجب ہو جاتا ہے وہ لوگ اس مقام پر ذرا خاص غور کریں جو کہتے ہیں کہ جب دعا ہوئی تو اسباب کی کیا ضرورت ہے۔ وہ نادان سوچیں کہ دعا بجائے خود ایک مخفی سبب ہے جو دوسرے اسباب کو پیدا کر دیتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۵)

بعض لوگ دعا کی درخواست کرتے ہیں کہ میرے لیے دعا کرو۔ مگر افسوس ہے کہ وہ دعا کرانے کے آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ ..... جب تک دعا کرانے والا اپنے اندر ایک صلاحیت اور اتباع کی عادت نہ ڈالے دعا کارگر نہیں ہو سکتی۔ مریض اگر طبیب کی اطاعت ضروری نہیں سمجھتا ممکن نہیں کہ فائدہ اٹھا سکے۔ جیسے مریض کو ضروری ہے کہ استقامت اور استقلال کے ساتھ طبیب کی رائے پر چلے تو فائدہ اٹھائے گا۔ ایسے ہی دعا کرانے والے کے لیے آداب اور طریق ہیں۔ تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے دعا کی خواہش کی۔ بزرگ نے فرمایا کہ دودھ چاول لاؤ۔ وہ شخص حیران ہوا۔ آخر وہ لایا۔ بزرگ نے دعا کی اور اُس شخص کا کام ہو گیا۔ آخر اُسے بتلایا گیا کہ یہ صرف تعلق پیدا کرنے کے لیے تھا۔ ایسا ہی باوا فرید صاحب کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک شخص کا قبالہ گم ہوا اور وہ دعا کے لیے آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے حلوہ کھلاؤ۔ اور وہ قبالہ حلوائی کی دوکان سے مل گیا۔ ان باتوں کے بیان کرنے سے میرا یہ مطلب ہے کہ جب تک دعا کرنے والے اور کرانے والے میں ایک تعلق نہ ہو متاثر نہیں ہوتی۔ غرض جب تک اضطرار کی حالت پیدا نہ ہو اور دعا کرنے والے کا قلق دعا کرانے والے کا قلق نہ ہو جائے کچھ اثر نہیں کرتی۔ بعض اوقات یہی مصیبت آتی ہے کہ لوگ دعا کرانے کے آداب سے واقف نہیں ہوتے اور دعا کا کوئی بیّن فائدہ محسوس نہ کر کے خداے تعالیٰ پر بدظن ہو جاتے ہیں اور اپنی حالت کو قابل رحم بنا لیتے ہیں۔

بالآخر میں کہتا ہوں کہ خود دعا کرو یا دعا کراؤ۔ پاکیزگی اور طہارت پیدا کرو۔ استقامت چاہو۔ اور توبہ کے ساتھ گر جاؤ کیونکہ یہی استقامت ہے۔ اس وقت دعا میں قبولیت نماز میں لذت پیدا ہوگی۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

(حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط صفحہ ۲۳)

حدیث میں آیا ہے۔ کہ قبل از وقت دعاء قبول ہوتی ہے۔ خوف و خطر میں جب انسان مبتلا ہوتا ہے۔ تو ایسے وقت میں تو ہر شخص دعا اور رجُوع کر سکتا ہے۔ سعادت مندو ہی ہے۔ جو امن کے وقت دعاء کرے۔ الانذار صفحہ ۱۶

دعا کے بعد جلدی جواب ملے تو عموماً اچھا نہیں ہوتا۔ توقف کامیابی کا موجب ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۲ مورخہ ۹ جون ۱۸۹۹ء صفحہ ۱)

وحی کے سلسلہ سے شوق اور محبت بڑھتی ہے۔ لیکن مفارقت میں بھی ایک کشش ہوتی ہے جو محبت کے مدارج عالیہ پر پہنچاتی ہے اللہ تعالےٰ نے اس کو بھی ایک ذریعہ قرار دیا ہے کیونکہ اس سے قلق اور کرب میں ترقی ہوتی ہے اور روح میں ایک بے قراری اور اضطراب پیدا ہوتا ہے جس سے وہ دعاؤں کی روح اس میں نفخ کی جاتی ہے کہ وہ آستانۂ الوہیت پر یارب یارب کہہ کر اور بڑے جوش اور شوق کے جذبہ کیساتھ دوڑتی ہے۔

جیساکہ ایک بچہ جو تھوڑی دیر کے لیے ماں کی چھاتیوں سے الگ رکھا گیا ہو بے اختیار ہو ہو کر ماں کی طرف دوڑتا اور چلاتا ہے اسی طرح پر بلکہ اس سے بھی بے حد اضطراب کے ساتھ روح اللہ کی طرف دوڑتی ہے اور اس دوڑ دھوپ اور قلق و کرب میں وہ لذت اور سرور ہوتا ہے جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو روح میں جس قدر اضطراب اور بیقراری خدا تعالیٰ کے لیے ہوگی اسی قدر دعاؤں کی توفیق ملے گی اور ان میں قبولیت کا نفخ ہوگا۔ (الحکم جلد ۵ عـ۲۱ مورخہ ۱۰ر جون ۱۹۰۱ء صـ۴)

قبولیت دعا کے واسطے چار شرطوں کا ہونا ضروری ہے تب کسی کے واسطے دعا قبول ہوتی ہے۔ شرط اول یہ ہے کہ اتقا ہو یعنی جس سے دعا کرائی جاوے وہ دعا کرنے والا متقی ہو . . . . .

دوسری شرط قبولیت دعا کے واسطے یہ ہے کہ جس کے واسطے انسان دعا کرتا ہو اس کے لیے دل میں درد ہو اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ[1]

تیسری شرط یہ ہے کہ وقت اصفیٰ میسر آوے ایسا وقت کہ بندہ اور اس کے رب میں کچھ حائل نہ ہو۔ ....

چوتھی شرط یہ ہے کہ پوری مدت دعا کی حاصل ہو یہاں تک کہ خواب یا وحی سے اللہ تعالیٰ خبر دے۔ محبت و اخلاص والے کو جلدی نہیں چاہیے بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔ (الحکم جلد ۵ عـ۳۲ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صـ۱۳، ۱۴)

دعا ایک ایسی سرور بخش کیفیت ہے کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں کن الفاظ میں اس لذت اور سرور کو دنیا کو سمجھاؤں یہ تو محسوس کرنے ہی سے پتہ لگے گا۔ مختصر یہ کہ دعا کے لوازمات سے اول ضروری یہ ہے کہ اعمال صالحہ اور اعتقاد پیدا کریں کیونکہ جو شخص اپنے اعتقادات کو درست نہیں کرتا اور اعمال صالحہ سے کام نہیں لیتا اور دعا کرتا ہے وہ گویا خدا تعالیٰ کی آزمایش کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ عـ۳۳ مورخہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۰۱ء صـ۱، ۲)

دعا کے لیے رقت والے الفاظ تلاش کرنے چاہییں یہ مناسب نہیں کہ انسان مسنون دعاؤں کے ایسا پیچھے پڑے کہ ان کو جنتر منتر کی طرح پڑھتا رہے اور حقیقت کو نہ پہچانے۔ اتباع سنت ضروری ہے مگر تلاش رقت بھی اتباع سنت ہے۔ اپنی زبان میں جس کو تم خوب سمجھتے ہو دعا کرو تاکہ دعا میں جوش پیدا ہو۔ الفاظ پرست مخذول ہوتا ہے حقیقت پرست بننا چاہیے۔ مسنون دعاؤں کو بھی برکت کے لیے پڑھنا چاہیے مگر حقیقت کو پاؤ۔ ہاں جس کو زبان عربی سے موافقت اور فہم ہو وہ عربی میں پڑھے۔ (الحکم جلد ۵ عـ۳۳ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صـ۹)

دعا کے لیے اصول ہیں۔ میں نے بہت دفعہ بیان کیا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کبھی اپنی منواتا ہے۔ اور کبھی مومن کی مانتا ہے اس کے سوا چونکہ ہم تو علیم نہیں۔ اور نہ اپنی ضرورتوں کے نتائج سے آگاہ ہیں۔ اس لیے بعض وقت ایسی چیزیں مانگ لیتے ہیں۔ جو ہمارے لیے مضر ہوتی ہیں۔ پس وہ دعا تو قبول کر لیتا ہے اور جو دعا کرنے والے کے واسطے مفید ہوتا ہے وہ اُسے عطا کرتا ہے جیسے ایک زمیندار کسی بادشاہ سے ایک اعلیٰ درجہ کا گھوڑا مانگے۔ اور بادشاہ اس کی ضرورت کو سمجھ کر اُسے عمدہ بیل دے دے۔ تو اس کے لیے وہی مناسب ہو سکتا ہے۔ دیکھو ماں بھی تو بچے کی ہر خواہش کو پورا نہیں کرتی۔ اگر وہ سانپ یا

[1] النمل : ۶۳۔

آگ کو لینا چاہے تو کب دیتی ہے پس خدا تعالیٰ سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اور تقویٰ اور ایمان میں ترقی کرنی چاہیے۔

(الحکم جلد ۵ ۴۱ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

وہی دعا مفید ہوتی ہے جب کہ دل خدا کے آگے پگھل جاوے اور خدا کے سوا کوئی مفر نظر نہ آوے جو خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اضطرار کے ساتھ امن کا جویاں ہوتا ہے وہ آخر بچ جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

تم ایسے ہو جاؤ کہ نہ مخلوق کا حق تم پر باقی رہے نہ خدا کا یاد رکھو جو مخلوق کا حق دباتا ہے اُس کی دعا قبول نہیں ہوتی کیونکہ وہ ظالم ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اللہ کا رحم ہے اس شخص پر جو امن کی حالت میں اسی طرح ڈرتا ہے جس طرح کسی پر مصیبت وارد ہوتی ہو تو وہ ڈرے جو امن کے وقت خدا کو نہیں بھلاتا خدا اسے مصیبت کے وقت میں نہیں بھلاتا اور جو امن کے زمانے کو عیش میں بسر کرتا ہے اور مصیبت کے وقت دعائیں کرنے لگتا ہے تو اس کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں جب عذاب الٰہی کا نزول ہوتا ہے تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے پس کیا ہی سعید وہ ہے جو عذاب الٰہی کے نزول سے پیشتر دعا میں مصروف رہتا ہے صدقات دیتا ہے اور امر الٰہی کی تعظیم اور خلق اللہ پر شفقت کرتا ہے اپنے اعمال کو سنوار کر بجا لاتا ہے یہی ہیں جو سعادت کے نشان ہیں درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح سعید اور شقی کی شناخت بھی آسان ہوتی ہے۔

(اخبار البدر جلد ۱ ۵-۶ مورخہ ۲۸ نومبر ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۵)

مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ ان کا خدا دعاؤں کا سُننے والا ہے۔ کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک طالب نہایت رقت اور درد کے ساتھ دعائیں کرتا ہے مگر وہ دیکھتا ہے کہ ان دعاؤں کے نتائج میں ایک تاخیر اور توقف واقع ہوتا ہے اس کا سر کیا ہے؟ اس میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اول تو جس قدر امور دنیا میں ہوتے ہیں ان میں ایک قسم کی تدریج پائی جاتی ہے۔ دیکھو ایک بچہ کو انسان بننے کے لیے کس قدر مرحلے اور منازل طے کرنے پڑتے ہیں ایک بیج کا درخت بننے کے لیے کس قدر توقف ہوتا ہے۔ اسی طرح پر اللہ تعالیٰ کے امور کا نفاذ بھی تدریجاً ہوتا ہے۔ دوسرے اس توقف میں یہ مصلحت الٰہی ہوتی ہے کہ انسان اپنے عزم اور عقد ہمت میں پختہ ہو جاوے اور معرفت میں استحکام اور رسوخ ہو۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر انسان اعلیٰ مراتب اور مدارج کو حاصل کرنا چاہتا ہے اُسی قدر اُس کو زیادہ محنت اور وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس استقلال اور ہمت ایک ایسی عمدہ چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان کامیابی کی منزلوں کو طے نہیں کر سکتا۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ پہلے مشکلات میں ڈالا جاوے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا [۱] اسی لیے فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۴۵ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

اگر قبولیت دعا نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی ہستی پر بہت سے شکوک پیدا ہو سکتے تھے اور ہوتے اور حقیقت میں جو لوگ قبولیت دعا کے قائل نہیں ہیں ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی ہستی کی کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ جو دُعا

---

[۱] الم نشرح : ۷۔

اور اُس کی قبولیت پر ایمان نہیں لاتا وہ جہنم میں جائے گا۔ وہ خدا ہی کا قائل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شناخت کا یہی طریق ہے کہ اس وقت تک دعا کرتا رہے جب تک خدا اُس کے دل میں یقین نہ بھر دے اور انا الحق کی آواز اُس کو نہ آجاوے۔

اس میں شک نہیں کہ اس مرحلہ کو طے کرنے اور اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت سی مشکلات ہیں اور تکلیفیں ہیں مگر ان سب کا علاج صرف صبر سے ہوتا ہے حافظ نے کیسا اچھا کہا ہے شعر

گویند سنگ لعل شود در مقام صبر آرے شود و لیک بخون جگر شود

یاد رکھو کوئی آدمی کبھی دعا سے فیض نہیں اٹھا سکتا جب تک وہ صبر میں حد نہ کر دے اور استقلال کے ساتھ دعاؤں میں نہ لگا رہے۔ اللہ تعالیٰ پر کبھی بدظنی اور بدگمانی نہ کرے اُس کو تمام قدرتوں اور ارادوں کا مالک تصور کرے یقین کرے پھر صبر کے ساتھ دعاؤں میں لگا رہے وہ وقت آجائے گا کہ اللہ تعالیٰ اُس کی دعاؤں کو سُن لے گا اور اُسے جواب دے گا۔ جو لوگ اس نسخہ کو استعمال کرتے ہیں وہ کبھی بدنصیب اور محروم نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یقیناً وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی قدرتیں اور طاقتیں بے شمار ہیں اس نے انسانی تکمیل کے لیے دیر تک صبر کا قانون رکھا ہے پس اُس کو وہ بدلتا نہیں اور جو چاہتا ہے کہ وہ اس قانون کو اُس کے لیے بدل دے وہ گویا اللہ تعالےٰ کی جناب میں گستاخی کرتا اور بے ادبی کی جرأت کرتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض لوگ بے صبری سے کام لیتے ہیں اور مداری کی طرح چاہتے ہیں کہ ایک دم میں سب کام ہو جائیں میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی بے صبری کرے تو بھلا بے صبری سے خدا تعالےٰ کا کیا بگاڑے گا۔ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ بے صبری کر کے دیکھ لے۔ وہ کہاں جائے گا؟

میں ان باتوں کو کبھی نہیں مان سکتا اور درحقیقت یہ جھوٹے قصے اور فرضی کہانیاں ہیں کہ فلاں فقیر نے پھونک مار کر یہ بنا دیا اور وہ کر دیا۔ یہ اللہ تعالےٰ کی سنّت اور قرآن شریف کے خلاف ہے۔ اسلیے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہر امر کے فیصلہ کیلئے معیار قرآن ہے۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کا پیارا بیٹا یوسف علیہ السلام جب بھائیوں کی شرارت سے ان سے الگ ہو گیا تو آپ چالیس برس تک اُس کے لیے دعائیں کرتے رہے اگر وہ جلد باز ہوتے تو کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوتا۔ چالیس برس تک دعاؤں میں لگے رہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان رکھا۔ آخر چالیس برس کے بعد وہ دعائیں کھینچ کر یوسفؑ کو لے ہی آئیں اس عرصہ دراز میں بعض ملامت کرنے والوں نے یہ بھی کہا کہ تو یوسف کو بے فائدہ یاد کرتا ہے مگر اُنھوں نے یہی کہا کہ میں خدا سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ بے شک اُن کو کچھ خبر نہ تھی مگر یہ کہا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ پہلے تو اتنا ہی معلوم تھا کہ دعاؤں کا سلسلہ لمبا ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ نے اگر دعاؤں سے محروم رکھنا ہوتا تو وہ جلد جواب دے دیتا مگر اس سلسلہ کا لمبا ہونا قبولیت کی دلیل ہے۔ کیونکہ کریم سائل کو دیر تک بٹھا کر کبھی محروم نہیں کرتا۔ بلکہ بخیل سے بخیل بھی ایسا نہیں کرتا وہ بھی سائل کو اگر زیادہ دیر تک دروازہ پر بٹھائے تو

آخر اُسکو کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے ۔ (الحکم جلد ۶ ع۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱-۲)

دعا بڑی عجیب چیز ہے مگر افسوس یہ ہے کہ نہ دعا کرانے والے آداب دعا سے واقف ہیں اور نہ اس زمانہ میں دعا کرنے والے ان طریقوں سے واقف جو قبولیت دعا کے ہوتے ہیں بلکہ اصل تو یہ ہے کہ دعا کی حقیقت ہی سے بالکل اجنبیت ہو گئی ہے بعض ایسے ہیں جو سرے سے دعا کے منکر ہیں اور جو دعا کے منکر تو نہیں ان کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ چونکہ اُن کی دعائیں بوجہ آداب الدعا کی ناواقفیت کے قبول نہیں ہوتی ہیں کیونکہ دعا اپنے اصلی معنوں میں دعا ہوتی ہی نہیں اس لیے وہ منکرین دعا سے بھی گری ہوئی حالت میں ہیں ان کی عملی حالت نے دوسروں کو دہریت کے قریب پہنچا دیا ہے۔

دعا کے لیے سب سے اول اس امر کی ضرورت ہے کہ دعا کرنے والا کبھی تھک کر مایوس نہ ہو جاوے اور اللہ تعالیٰ پر یہ سوء ظن نہ کر بیٹھے کہ اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس قدر دعا کی گئی ہے کہ جب مقصد کا شگوفہ سرسبز ہونے کے قریب ہوتا ہے دعا کرنے والے تھک گئے ہیں جس کا نتیجہ ناکامی اور نامرادی ہو گیا ہے ۔ اور اس نامرادی نے یہاں تک بُرا اثر پہنچایا ہے کہ پھر دعا کے تاثیرات کا انکار شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک نوبت پُہنچ جاتی ہے کہ پھر خدا کا بھی انکار کر بیٹھتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اگر خدا ہوتا اور وہ دعاؤں کو قبول کرنے والا ہوتا تو اس قدر عرصہ دراز تک جو دعا کی گئی ہے کیوں قبول نہ ہوئی ۔

مگر ایسا خیال کرنے والا اور ٹھوکر کھانے والا انسان اگر اپنے عدم استقلال اور تلوّن کو سوچے تو اسے معلوم ہو جائے کہ یہ ساری نامرادیاں اس کی اپنی ہی جلد بازی اور شتاب کاری کا نتیجہ ہیں جن پر خدا کی قوتوں اور طاقتوں کے متعلق بدظنّی اور نامراد کرنے والی مایوسی بڑھ گئی ۔ پس کبھی تھکنا نہیں چاہیئے ۔

دعا کی ایسی ہی حالت ہے جیسے ایک زمیندار باہر جا کر اپنے کھیت میں ایک بیج بو آتا ہے اب بظاہر تو یہ حالت ہے کہ اس نے اچھے بھلے اناج کو مٹی کے نیچے دبا دیا اُس وقت کوئی کیا سمجھ سکتا ہے کہ یہ دانہ ایک عمدہ درخت کی صورت میں نشوونما پا کر پھل لائے گا ۔ باہر کی دنیا اور خود زمیندار بھی نہیں دیکھ سکتا کہ یہ دانہ اندر ہی اندر زمین میں ایک پودہ کی صورت اختیار کر رہا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ تھوڑے دنوں کے بعد وہ دانہ گل کر اندر ہی اندر پودہ بننے لگتا ہے اور طیار ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کا سبزہ اوپر نکل آتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اُس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب دیکھو وہ دانہ جس وقت سے زمین کے نیچے ڈالا گیا تھا دراصل اُسی ساعت سے وہ پودا بننے کی طیاری کرنے لگ گیا تھا۔ مگر ظاہر بین نگاہ اس سے کوئی خبر نہیں رکھتی۔ اور اب جبکہ اس کا سبزہ باہر نکل آیا تو سب نے دیکھ لیا لیکن ایک نادان بچہ اس وقت یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو اپنے وقت پر پھل لگے گا وہ یہ چاہتا ہے کہ کیوں اسی وقت اس کو پھل نہیں لگتا مگر عقلمند زمیندار خوب سمجھتا ہے کہ اس کے پھل کا کونسا موقع ہے وہ صبر سے اس کی نگرانی کرتا اور غور پرداخت کرتا رہتا ہے اور اس طرح پر وہ وقت آجاتا ہے کہ جب اس کو پھل لگتا اور وہ پک بھی جاتا ہے ۔ یہی حال دعا کا ہے اور بعینہٖ اسی طرح دعا نشوونما

پاتی اور مثمر ثمرات ہوتی ہے ۔جلد باز پہلے ہی تھک کر رہ جاتے ہیں اور صبر کرنے والے مآل اندیش استقلال کے ساتھ لگے رہتے ہیں اور اپنے مقصد کو پا لیتے ہیں ۔

یہ سچی بات ہے کہ دعا میں بڑے بڑے مراحل اور مراتب ہیں جن کی ناواقفیت کی وجہ سے دعا کرنے والے اپنے ہاتھ سے محروم ہو جاتے ہیں ۔ان کو ایک جلدی لگ جاتی ہے اور وہ صبر نہیں کر سکتے حالانکہ خدا تعالیٰ کے کاموں میں ایک تدریج ہوتی ہے ۔دیکھو یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج انسان شادی کرے تو کل کو اُس کے گھر بچہ پیدا ہو جاوے حالانکہ وہ قادر ہے جو چاہے کر سکتا ہے مگر جو قانون اور نظام اس نے مقرر کر دیا ہے وہ ضروری ہے ۔پہلے نباتات کی نشوونما کی طرح کچھ پتہ ہی نہیں لگتا ۔چار مہینے تک کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا ۔پھر کچھ حرکت محسوس ہونے لگتی ہے اور پوری میعاد گذرنے پر بہت بڑی تکالیف برداشت کرنے کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا ہے ۔بچہ کا پیدا ہونا ماں کا بھی ساتھ ہی پیدا ہونا ہوتا ہے ۔

مرد شاید ان تکالیف اور مصائب کا اندازہ نہ کر سکیں جو اس مدت حمل کے درمیان عورت کو برداشت کرنی پڑتی ہیں مگر یہ سچی بات ہے کہ عورت کی بھی ایک نئی زندگی ہوتی ہے ۔اب غور کرو کہ اولاد کے لیے پہلے ایک موت خود اُس کو قبول کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر وہ اس خوشی کو دیکھتی ہے ۔

اسی طرح پر دعا کرنے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تلوّن اور عجلت کو چھوڑ کر ساری تکلیفوں کو برداشت کرتا رہے اور کبھی بھی یہ وہم نہ کرے کہ دعا قبول نہیں ہوئی آخر آنے والا زمانہ آجاتا ہے اور دعا کے نتیجہ کے پیدا ہونے کا وقت پُہنچ جاتا ہے جب کہ گویا مراد کا بچہ پیدا ہوتا ہے ۔

دعا کو پہلے ضروری ہے کہ اس مقام اور حد تک پہنچایا جاوے جہاں پُہنچ کر وہ نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے جس طرح پر آتشی شیشی کے نیچے کپڑا رکھ دیتے ہیں اور سورج کی شعاعیں اس شیشہ پر آکر جمع ہوتی ہیں اور ان کی حرارت وحدت اس مقام پر پُہنچ جاتی ہے جو اس کپڑے کو جلا دے پھر یکایک وہ کپڑا جل اٹھتا ہے ۔اسی طرح پر ضروری ہے کہ دعا اس مقام تک پُہنچے جہاں اس میں وہ قوت پیدا ہو جاوے کہ نامرادیوں کو جلا دے اور مقصد مراد کو پورا کرنے والی ثابت ہو جاوے

پیدا ست ندا را کہ بلند است جنابت

مدت دراز تک انسان کو دعاؤں میں لگے رہنا پڑتا ہے آخر خدا تعالیٰ ظاہر کر دیتا ہے میں نے اپنے تجربہ سے دیکھا ہے اور گذشتہ راست بازوں کا تجربہ بھی اس پر شہادت دیتا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں دیر تک خاموشی کرے تو کامیابی کی اُمید ہوتی ہے لیکن جس امر میں جلد جواب مل جاتا ہے وہ ہونے والا نہیں ہوتا ۔عام طور پر ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک سائل جب کسی کے دروازہ پر مانگنے کے لیے جاتا ہے اور نہایت عاجزی اور اضطراب سے مانگتا ہے اور کچھ دیر تک جھڑکیاں کھا کر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا اور سوال کیے ہی جاتا ہے تو آخر اُس کو بھی کچھ شرم آ ہی

جاتی ہے خواہ کتنا ہی بخیل کیوں نہ ہو پھر بھی کچھ نہ کچھ سائل کو دے ہی دیتا ہے تو کیا دعا کرنے والے کو کم از کم ایک معمولی سائل جتنا استقلال بھی نہیں ہونا چاہیے؛ اور خدا تعالیٰ جو کریم ہے اور حیا رکھتا ہے جب دیکھتا ہے کہ اس کا عاجز بندہ ایک عرصہ سے اس کے آستانہ پر گرا ہوا ہے تو کبھی اس کا انجام بد نہیں کرتا اگر انجام بد ہو تو اپنے ظن سے ہوتا ہے جیسے ایک حاملہ عورت چار پانچ ماہ کے بعد کہے کہ اب بچہ کیوں پیدا نہیں ہوتا اور اس خواہش میں کوئی مسقط دوا کھالے تو اُس وقت کیا بچہ پیدا ہوگا یا ایک مایوسی بخش حالت میں وہ خود مبتلا ہوگی اسی طرح جو شخص قبل از وقت جلدی کرتا ہے وہ نقصان ہی اُٹھاتا ہے اور نہ نرا نقصان بلکہ ایمان کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے بعض ایسی حالت میں دہریہ ہو جاتے ہیں ہمارے گاؤں میں ایک نجّار تھا اس کی عورت بیمار ہوئی اور آخر وہ مر گئی اُس نے کہا کہ اگر خدا ہوتا تو میں نے اتنی دعائیں کی تھیں وہ قبول ہو جاتیں اور میری عورت نہ مرتی اور اس طرح پر وہ دہریہ ہو گیا۔ لیکن سعید اگر اپنے صدق اور اخلاص سے کام لے تو اُس کا ایمان بڑھتا ہے اور سب کچھ ہو بھی جاتا ہے زمین کی دولتیں خدا تعالے کے آگے کیا چیز ہیں وہ ایک دم میں سب کچھ کر سکتا ہے کیا دیکھا نہیں کہ اس نے اس قوم کو جس کو کوئی جانتا بھی نہ تھا بادشاہ بنا دیا۔ اور بڑی بڑی سلطنتوں کو ان کا تابع فرمان بنا دیا۔ اور غلاموں کو بادشاہ بنا دیا۔ انسان اگر تقویٰ اختیار کرے اور خدا تعالیٰ کا ہو جاوے تو دنیا میں اعلیٰ درجہ کی زندگی ہو مگر شرط یہی ہے کہ صادق اور جوانمرد ہو کر دکھائے دل متزلزل نہ ہو۔ اور اس میں کوئی آمیزش ریاکاری اور شرک کی نہ ہو ابراہیم علیہ السلام میں وہ کیا بات تھی جس نے اس کو ابو الملت اور ابو الحنفا قرار دیا اور خدا تعالیٰ نے اُس کو اسقدر عظیم الشان برکتیں دیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں وہ یہی صدق و اخلاص تھا۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے بھی ایک دعا کی تھی کہ اُس کی اولاد میں سے عرب میں ایک نبی ہو پھر کیا وہ اُسی وقت قبول ہو گئی ابراہیم کے بعد ایک عرصہ دراز تک کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ اس دعا کا کیا اثر ہوا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی صورت میں وہ دعا پوری ہوئی اور پھر کس شان کے ساتھ پوری ہوئی۔ (الحکم جلد ۷ ۸ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱)

شفاعت اعمال حسنہ کی محرک کس طرح پر ہے؛ اس سوال کا جواب بھی قرآن شریف ہی سے ملتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ کفارہ کا رنگ اپنے اندر نہیں رکھتی جو عیسائی مانتے ہیں کیونکہ اس پر حصر نہیں کیا جس سے کاہلی اور سستی پیدا ہوتی بلکہ فرمایا۔ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں تجھ سے سوال کریں کہ وہ کہاں ہے تو کہہ دے کہ میں قریب ہوں۔ قریب والا تو سب کچھ کر سکتا ہے دور والا کیا کرے گا؟ اگر آگ لگی ہوئی ہو تو دور والے کو جب تک خبر پہنچے اس وقت تک تو شاید وہ جل کر خاک سیاہ بھی ہو چکے۔ اس لیے فرمایا کہ کہہ دو کہ میں قریب ہوں۔ پس یہ آیت بھی قبولیت دعا کا ایک راز بتاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت پر ایمان کامل پیدا ہو۔ اور اُسے ہر وقت اپنے قریب یقین کیا جاوے اور ایمان ہو کہ وہ ہر پکار کو سُنتا ہے۔ بہت سی دعاؤں کے رد ہونے کا یہ بھی سرّ

ہے کہ دعا کرنے والا اپنی ضعیف الایمانی سے دعا کو مسترد کرا لیتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ دعا کو قبول ہونے کے لائق بنایا جاوے کیونکہ اگر وہ دعا خدا تعالیٰ کی شرائط کے نیچے نہیں ہے تو پھر اس کو خواہ سارے نبی بھی مل کر کریں تو قبول نہ ہو گی اور کوئی فائدہ اور نتیجہ اس پر مترتب نہیں ہو سکے گا۔

اب یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ ایک طرف تو آنحضرت صلعم کو فرمایا صَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ[1] تیری صلوٰۃ سے ان کو ٹھنڈ پڑ جاتی ہے اور جوش و جذبات کی آگ سرد ہو جاتی ہے دوسری طرف فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ[2] کا بھی حکم فرمایا۔ ان دونو آیتوں کے ملانے سے دعا کرنے اور کرانے والے کے تعلقات پھر ان تعلقات سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں اُن کا بھی پتہ لگتا ہے کیونکہ صرف اسی بات پر منحصر نہیں کر دیا کہ آنحضرتؐ کی شفاعتؐ اور دعا ہی کافی ہے اور خود کچھ نہ کیا جاوے اور نہ یہی فلاح کا باعث ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی شفاعتؐ اور دعا کی ضرورت ہی نہ سمجھی جاوے۔

(الحکم جلد ۷ عـ۹ـ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۳ء صـ۳ـ)

دنیا میں کبھی کوئی شخص کامیاب نہیں ہوا جو جسم اور روح دونوں سے کام نہ لے۔ اگر روح کوئی چیز نہیں تو ایک مردہ جسم سے کوئی کام کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا اس کے سارے اعضا اور قویٰ موجود نہیں ہوتے۔

اب یہ بات کیسی صفائی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہے کہ روح اور جسم کا تعلق جب کہ ابدی ہے پھر کیوں کسی ایک کو بیکار قرار دیا جاوے دعا کے لیے بھی یہی قانون ہے کہ جسم تکالیف اٹھائے اور روح گداز ہو۔ اور پھر صبر اور استقلال سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لا کر حسن ظن سے کام لیا جاوے۔

(الحکم جلد ۷ عـ۱۰ـ مورخہ ۱۷؍مارچ ۱۹۰۳ء صـ۲ـ)

دعا اور اس کی قبولیت کے زمانہ کے درمیانی اوقات میں بسا اوقات ابتلا پر ابتلا آتے ہیں اور ایسے ایسے ابتلا بھی آجاتے ہیں کہ کمر توڑ دیتے ہیں مگر مستقل مزاج سعید الفطرت ان ابتلاؤں اور مشکلات میں بھی اپنے رب کی عنایتوں کی خوشبو سونگھتا ہے اور فراست کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے بعد نصرت آتی ہے۔ ان ابتلاؤں کے آنے میں ایک سرّ یہ بھی ہوتا ہے کہ دعا کے لیے جوش بڑھتا ہے کیونکہ جس جس قدر اضطرار اور اضطراب بڑھتا جاوے گا اسی قدر روح میں گدازش ہوتی جائے گی اور یہ دعا کی قبولیت کے اسباب میں سے ہیں۔ پس کبھی گھبرانا نہیں چاہیے اور بے صبری اور بیقراری سے اپنے اللہ پر بدظن نہیں ہونا چاہیے یہ کبھی بھی خیال کرنا نہیں چاہیے کہ میری دعا قبول نہ ہو گی یا نہیں ہوتی۔ ایسا وہم اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے انکار ہو جاتا ہے کہ وہ دعائیں قبول فرمانے والا ہے۔ کبھی ایسا بھی

---

[1] التوبۃ : ۱۰۴۔ [2] البقرۃ : ۱۸۷۔

ہوتا ہے کہ انسان ایک امر کے لیے دعا کرتا ہے مگر وہ دُعا اُس کی اپنی ناواقفی اور نادانی کا نتیجہ ہوتی ہے یعنی ایسا امر خدا سے چاہتا ہے جو اس کے لیے کسی صورت سے مفید اور نافع نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو تو رد نہیں کرتا۔ لیکن کسی اور صورت میں پورا کر دیتا ہے مثلاً ایک زمیندار جس کو ہل چلانے کے لیے بیل کی ضرورت ہے وہ بادشاہ سے جا کر ایک اونٹ کا سوال کرے اور بادشاہ جانتا ہے کہ اس کو دراصل بیل دینا مفید ہوگا اور وہ حکم دے دے کہ اس کو ایک بیل دے دو وہ زمیندار اپنی بے وقوفی سے یہ کہہ دے کہ میری درخواست منظور نہیں ہوئی تو یہ اس کی حماقت اور نادانی ہے لیکن اگر وہ غور کرے تو اُس کے لیے یہی بہتر تھا۔ اس طرح پر اگر ایک بچہ آگ کے سرخ انگارے کو دیکھ کر ماں سے مانگے تو کیا مہربان اور شفیق ماں یہ پسند کرے گی کہ اس کو آگ کے انگارے دے دے؟ غرض بعض اوقات دعا کی قبولیت کے متعلق ایسے امور بھی پیش آتے ہیں جو لوگ بے صبری اور بدظنی سے کام لیتے ہیں وہ اپنی دعا کو رد کرا لیتے ہیں۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی قبولیت کے زمانہ میں اور بھی درازی ہو جاتی ہے بنی اسرائیل اسی وجہ سے چالیس برس تک ارض مقدس میں داخل ہونے سے محروم ہو گئے کہ ذرا ذرا سی بات پر شوخیوں سے کام لیتے تھے ....

اسی طرح پر قبولیت کی ارض مقدس ان مولویوں کے نصیب معلوم نہیں ہوتی جو آئے دن مخالفت اور شرارت میں بڑھتے جاتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان کو کیا کہا گیا تھا کیا تعلیم ملی تھی اور اب انھوں نے اس پر کس حد تک عمل کیا ہے۔ (الحکم جلد ۷ عـ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱، ۲)

بہت سے لوگ ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ پر الزام لگاتے ہیں اور اپنے آپ کو بری خیال کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے تو نماز بھی پڑھی اور دعا بھی کی ہے مگر قبول نہیں ہوتی یہ ان لوگوں کا اپنا قصور ہوتا ہے، نماز اور دعا جب تک انسان غفلت اور کسل سے خالی نہ ہو تو وہ قبولیت کے قابل نہیں ہوا کرتی۔ اگر انسان ایک ایسا کھانا کھائے جو کہ بظاہر تو میٹھا ہے مگر اس کے اندر زہر ملی ہوئی ہے تو مٹھاس سے وہ زہر معلوم تو نہ ہوگا مگر پیشتر اس کے کہ مٹھاس اپنا اثر کرے زہر پہلے ہی اثر کر کے کام تمام کر دے گا یہی وجہ ہے کہ غفلت سے بھری ہوئی دعائیں قبول نہیں ہوتیں کیونکہ غفلت اپنا اثر پہلے کر جاتی ہے یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بالکل مطیع ہو اور پھر اس کی دعا قبول نہ ہو ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے مقررہ شرائط کو کامل طور پر ادا کرائے۔ (البدر جلد ۲ عـ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹)

اس میں شک نہیں کہ دعاؤں کی قبولیت پر ہمارا ایمان ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے مگر دعاؤں کے اثر اور قبولیت کو توجہ کے ساتھ بہت بڑا تعلق ہے اور پھر حقوق کے لحاظ سے دعاء کے لیے جوش پیدا ہوتا ہے ......

دعا کرانے والے کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ وہ اپنی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ سے صلح کرے اپنے گناہوں

سے توبہ کرے پس جہاں تک ممکن ہو تم اپنے آپ کو درست کرو اور یہ یقیناً سمجھ لو کہ انسان کا پرستار کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ (الحکم جلد ۷ ع۳۷ مورخہ ۱۰ راکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جس سے دعا کرتا ہے اُس پر کامل ایمان ہو اُس کو موجود سمیع۔ بصیر۔ خبیر۔ علیم متصرف۔ قادر سمجھے اور اُس کی ہستی پر ایمان رکھے کہ وہ دعاؤں کو سُنتا ہے اور قبول کرتا ہے مگر کیا کروں۔ کس کو سُناؤں اب اسلام میں مشکلات ہی اور آپڑی ہیں کہ جو محبت خدا تعالیٰ سے کرنی چاہیے وہ دوسروں سے کرتے ہیں اور خدا کا رتبہ انسانوں اور مردوں کو دیتے ہیں۔ حاجت روا اور مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک تھی مگر اب جس قبر کو دیکھو وہ حاجت روا ٹھیرائی گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حاجت روا اور مشکل کشا تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور کوئی اس صفت کا موصوف نہیں۔ قبر سے کبھی آواز کی اُمید مت رکھو برخلاف اس کے اگر اللہ تعالیٰ کو اخلاص اور ایمان کے ساتھ دن میں دس مرتبہ بھی پکارو۔ تو میں یقین رکھتا ہوں۔ اور میرا اپنا تجربہ ہے کہ وہ دس دفعہ ہی آواز سنتا اور دس ہی دفعہ جواب دیتا ہے لیکن یہ شرط ہے کہ پکارے اس طرح پر جو پکارنے کا حق ہے۔ (الحکم جلد ۸ ع۵ مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

دعاؤں کی قبولیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر پاک تبدیلی پیدا کرے اگر بدیوں سے نہیں بچ سکتا اور خدا تعالیٰ کی حدود کو توڑتا ہے تو دعاؤں میں کوئی اثر نہیں رہتا۔ (الحکم جلد ۸ ع۱۹ مورخہ ۱۰رجون ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

دعا میں جس قدر بیہودگی ہوتی ہے۔ اُسی قدر اثر کم ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی استجابت ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً ایک شخص ہے۔ کہ اس کا گذارہ ایک دو روپیہ روزانہ میں بخوبی چل سکتا ہے۔ لیکن وہ پچاس روپیہ روزانہ طلب کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا سوال بیہودہ ہوگا۔ یہ ضروری امر ہے۔ کہ ضرورتِ حقّہ اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کی جاوے۔ (البدر جلد ۳ ع۲۹ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ ایک تعلق چاہتا ہے اور اس کے حضور میں دعا کرنے کے لیے تعلق کی ضرورت ہے۔ بغیر تعلق کے دعا نہیں ہوسکتی۔ پہلے بزرگوں کی بھی اسی قسم کی باتیں چلی آتی ہیں۔ کہ جن سے دعا کرنے والوں کو دُعا کرانے سے پہلے تعلق ثابت کرنے کی تاکید کی۔ خواہ نخواہ بازار میں چلتے ہوئے کسی بے تعلق کو کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ تو میرا دوست ہے۔ اور نہ ہی اس کے لیے درد دل ہی ہوتا ہے۔ اور نہ ہی جوش دعا پیدا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اس طرح نہیں ہو سکتا۔ کہ انسان غفلت کاریوں میں مُبتلا بھی رہے اور صرف منہ سے دم بھرتا رہے۔ کہ میں نے خدا سے تعلق پیدا کرلیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے ایک محویت کی ضرورت ہے۔ ہم بار بار اپنی جماعت کو اس بات پر قائم ہونے کے لیے کہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک دنیا کی طرف سے انقطاع اور اس کی محبت دلوں سے ٹھنڈی ہو کر اللہ تعالیٰ کے لیے فطرتوں

میں طبعی جوش اور محویت پیدا نہیں ہوتی۔ اس وقت تک ثبات میسر نہیں آسکتا۔

(البدر جلد ۳ ۳۲ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۴ء صہ ۳)

دعاؤں میں جو رو بخدا ہو کر توجہ کی جاوے تو پھر ان میں خارق عادت اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دعاؤں میں قبولیت خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے اور دعاؤں کے لیے بھی ایک وقت ہوتا (ہے) جیسے صبح کا ایک خاص وقت ہے اس وقت میں خصوصیت ہے وہ دوسرے اوقات میں نہیں اسی طرح پر دعا کے لیے بھی بعض اوقات ہوتے ہیں جب کہ ان میں قبولیت اور اثر پیدا ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء صہ ۳)

دُعا جو خدا تعالیٰ کی پاک کلام نے مسلمانوں پر فرض کی ہے اِس کی فرضیت کے چار سبب ہیں (۱) ایک یہ کہ تا ہر ایک وقت اور ہر ایک حالت میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر توحید پر پختگی حاصل ہو۔ کیونکہ خدا سے مانگنا اِس بات کا اقرار کرنا ہے کہ مُرادوں کا دینے والا صرف خدا ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ تا دُعا کے قبول ہونے اور مراد کے ملنے پر ایمان قوی ہو۔ (۳) تیسرے یہ کہ اگر کسی اور رنگ میں عنایت الہٰی شامل حال ہو تو علم اور حکمت زیادت پکڑے۔ (۴) چوتھے یہ کہ اگر دعا کی قبولیت کا الہام اور رؤیا کے ساتھ وعدہ دیا جائے اور اسی طرح ظہور میں آوے تو معرفت الہٰی ترقی کرے اور معرفت سے یقین اور یقین سے محبّت اور محبّت سے ہر ایک گناہ اور غیر اللہ سے انقطاع حاصل ہو جو حقیقی نجات کا ثمرہ ہے۔ (ایام الصلح صہ ۱۴)

حق بات یہی ہے کہ جیسے حکیم مطلق نے دواؤں میں باوجود انضباط قوانین قدرتیہ کے تاثیرات رکھی ہیں ایسا ہی دعاؤں میں بھی تاثیرات ہیں جو ہمیشہ تجارب صحیحہ سے ثابت ہوتی ہیں اور جس مبارک ذات علّت العلل نے استجابت دُعا کو قدیم سے اپنی سُنّت ٹھہرایا ہے اسی ذاتِ قُدوس کی یہ بھی سُنّت ہے کہ جو مصیبت رسیدہ لوگ ازل میں قابل رہائی ٹھہر چکے ہیں وہ اُنھیں لوگوں کے انفاس پاک یا دعا اور توجہ اور یا ان کے وجود فی الارض کی برکت سے رہائی پاتے ہیں جو قرب اور قبولیت الٰہی کی شرف سے مُشرّف ہیں۔ (آسمانی فیصلہ صہ ۲)

میں کہتا ہوں کہ دعا جیسی کوئی چیز نہیں۔ دنیا میں دیکھو بعض خرگدا ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہر روز شور ڈالتے رہتے ہیں اُن کو آخر کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو قادر اور کریم ہے جب یہ اَڑ کر دعا کرتا ہے تو پا لیتا ہے کیا خدا انسان جیسا بھی نہیں ؟ یہ قاعدہ یاد رکھو کہ جب دعا سے باز نہیں آتا اور اس میں لگا رہتا ہے تو آخر دُعا قبول ہو جاتی ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ ہر قسم کی دعائیں طفیلی ہیں اصل دعائیں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے کرنی چاہئیں۔ باقی دعائیں خود بخود قبول ہو جائیں گی۔ کیونکہ گناہ کے دور ہونے سے برکات آتی ہیں۔ یوں دعا قبول نہیں ہوتی جو نری دنیا ہی کے واسطے ہو۔ اس لیے پہلے خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کے واسطے دعائیں کرے۔ اور وہ سب سے بڑھ کر دعا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ہے جب یہ دعا کرتا ہے کا نو دہ مُنْعَمْ عَلَیْہِم کی جماعت میں داخل

ہوگا۔ (الحکم جلد ۸ عـ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـ۷)

سب سے عمدہ دعا یہ ہے کہ خدا کی رضامندی اور گناہوں سے نجات حاصل ہو۔ کیونکہ گناہوں ہی سے دل سخت ہوجاتا اور انسان دنیا کا کیڑا بن جاتا ہے۔ ہماری دعا یہ ہونی چاہیے۔ کہ خدا تعالیٰ ہم سے گناہوں کو جو دل کو سخت کر دیتے ہیں۔ دور کر دے۔ اور اپنی رضامندی کی راہ دکھلائے۔ (البدر جلد ۳ عـ۳۱ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۴ء صـ۶)

میں سمجھتا ہوں کہ دعا سے آخری فتح ہوگی اور انبیاء علیہم السلام کا یہی طرز رہا ہے کہ جب دلائل اور حجج کام نہیں دیتے تو اُن کا آخری حربہ دعا ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ[1]..... میں یقیناً سمجھتا ہوں کہ کسرِ صلیب جاں کاہ دعاؤں پر موقوف ہے دعا میں ایسی قوت ہے کہ جیسے آسمان صاف ہو اور لوگ تضرع اور ابتہال کے ساتھ دعا کریں تو آسمان پر بدلیاں سی نمودار ہو جاتی ہیں اور بارش ہونے لگتی ہے اسی طرح پر میں خوب جانتا ہوں کہ دُعا اس باطل کو ہلاک کر دے گی۔ اور لوگوں کو تو کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ دین کے لیے دعا کریں مگر میرے نزدیک بڑا چارہ دعا ہی ہے اور یہ بڑا خطرناک جنگ ہے جس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے ونعم ما قیل

اندریں وقتِ مصیبت چارہ ہائے بیکساں جُز دعائی بامداد و گریہ اسحار نیست

پھر ان دعاؤں کے لیے گوشہ نشینی کی بڑی ضرورت ہے۔ (الحکم جلد ۸ عـ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صـ۵)

فَاعْلَمُوْا اَنَّ الدُّعَآءَ حَرْبَةٌ اُعْطِيْتُ مِنَ السَّمَآءِ لِفَتْحِ هٰذَا الزَّمَانِ۔ وَلَنْ تَغْلِبُوْا اِلَّا بِهٰذِهِ الْحَرْبَةِ يَا مَعْشَرَ الْخُلَّانِ۔ وَقَدْ اَخْبَرَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ اَوَّلِهِمْ اِلٰى اٰخِرِهِمْ بِهٰذِهِ الْحَرْبَةِ۔ وَقَالُوْا اِنَّ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ يَنَالُ الْفَتْحَ بِالدُّعَآءِ وَالتَّضَرُّعِ فِي الْحَضْرَةِ لَا بِالْمَلَاحِمِ وَ سَفْكِ دِمَآءِ الْاُمَّةِ۔ وَاِنَّ حَقِيْقَةَ الدُّعَآءِ الْاِقْبَالُ عَلَى اللّٰهِ بِجَمِيْعِ الْهِمَّةِ وَالصِّدْقِ وَالصَّبْرِ لِدَفْعِ الضَّرَّآءِ۔ وَاِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ اِذَا تَوَجَّهُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ لِدَفْعِ مُوْذٍ بِالتَّضَرُّعِ وَالْاِبْتِهَالِ۔ جَرَتْ عَادَةُ اللّٰهِ اَنَّهٗ يَسْمَعُ دُعَآءَهُمْ

ترجمہ: خوب یاد رکھیں کہ دعا وہ ہتھیار ہے، جو اس زمانہ کی فتح کے لیے مجھے آسمان سے دیا گیا ہے۔ اور اے میرے دوستوں کی جماعت، تم صرف اسی حربہ سے غالب آسکتے ہو۔ تمام نبیوں نے اوّل سے آخر تک اس ہتھیار کی خبر دی ہے۔ اور سب نے فرمایا کہ مسیح موعود دعا اور بارگاہ رب العزت میں تضرعات کے ذریعہ سے ہی فتح حاصل کرے گا۔ جنگوں اور لوگوں کے خون بہانے سے نہیں۔

دعا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ساری ہمت، پورے صدق اور کامل صبر کے ساتھ مصیبت کے دور کروانے کے لیے اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو۔ یقیناً اولیاء اللہ جب اپنے رب کی طرف تضرع اور ابتہال کے ساتھ متوجہ

---

[1] ابراہیم : ۱۶

وَلَوْ بَعْدَ حِيْنٍ اَوْ فِي الْحَالِ وَ تَوَجَّهَتِ الْعِنَايَةُ الصَّمَدِيَّةُ لِيَدْفَعَ مَا نَزَلَ بِهِمْ مِنَ الْبَلَآءِ وَالْوَبَالِ۔ بَعْدَ مَا اَقْبَلُوْا عَلَى اللّٰهِ كُلَّ الْاِقْبَالِ۔ وَاِنَّ اَعْظَمَ الْكَرَامَاتِ۔ اِسْتِجَابَةُ الدَّعَوَاتِ۔ عِنْدَ حُلُوْلِ الْاٰفَاتِ۔

..... قِيْلَ مَا مَعْنَى الدُّعَآءِ بَعْدَ قَدَرٍ لَّا يُرَدُّ۔ وَقَضَآءٍ لَّا يُصَدُّ۔ فَاعْلَمْ اَنَّ هٰذَا السِّرَّ مَوْرٌ۔ تَضِلُّ بِهِ الْعُقُوْلُ۔ وَيَغْتَالُ فِيْهِ الْغُوْلُ۔ وَلَا يَبْلُغُهٗ اِلَّا مَنْ يَّتُوْبُ۔ وَ مِنَ التَّوْبَةِ يَذُوْبُ۔.....

فَمَنْ اَرْهَفَ اُذُنَهٗ لِسَمِعِ هٰذِهِ الْحَقَآئِقِ وَ هَفَدَ اِلَيْنَا كَاللَّهِيْفِ الشَّآئِقِ۔ فَسَاَخْفِرُهٗ۔ بِمَا يَسُرُّ رِيْبَتَهٗ وَ يَمْلَأُ عَيْبَتَهٗ۔ وَهُوَ اَنَّ اللّٰهَ جَعَلَ بَعْضَ الْاَشْيَآءِ مُعَلَّقًا بِبَعْضِهَا مِنَ الْقَدِيْمِ۔ وَكَذَالِكَ عَلَّقَ قَدْرَهٗ بِدَعْوَةِ الْمُضْطَرِّ الْاَلِيْمِ۔ فَمَنْ نَّهَضَ مُهَرْوِلًا اِلٰى حَضْرَةِ الْعِزَّةِ۔ بِعَبَرَاتٍ مُّتَحَدِّرَةٍ وَّ دُمُوْعٍ جَارِيَةٍ

ہوتے ہیں۔ تاکہ کسی موذی چیز کو دور کیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کی عادت اس طرح سے جاری ہے کہ وہ ان کی دعاؤں کو بہرحال سنتا ہے۔ خواہ فوراً۔ خواہ کچھ عرصہ بعد۔ خدائے صمد کی توجہ اس بلا اور وبال کے دور کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ جو خدا کے نیک بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ یہ بات اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑی کرامت آفات کے اترنے کے وقت قبولیت دعا ہی ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ تقدیر مبرم کے بعد اور نہ ردّ ہونے والی قضاء کے بعد دعا کے کیا معنے ہیں تو جاننا چاہیے کہ یہ رازِ الیسا راستہ ہے۔ جہاں عقلیں بھٹک جاتی ہیں۔ اور راہ زن اس پر راہ زنی کرتے ہیں۔ اور اس راستے پر وہ ہی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔ جو حقیقی توبہ کرتا ہے۔ اور توبہ سے گداز ہوتا ہے۔

پس جو شخص میرے بیان کردہ حقائق پر کان دھرتا ہے۔ اور دردمند شوق رکھنے والے انسان کی طرح ہماری طرف آتا ہے۔ میں اس کا محافظ ہوں گا۔ اور اس کی حفاظت ایسی باتوں سے کروں گا۔ جو اس کے شکوک و شبہات کو دور کر دیں گی۔ اور اس کے روحانی خزانوں کو بھر دیں گی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے قدیم سے بعض چیزوں کو بعض چیزوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اپنی تقدیر کو مضطر اور دکھی انسان کی دعا سے وابستہ کیا ہے۔ پس جو شخص دوڑتے ہوئے بارگاہ عزت میں پہنچتا ہے اس کے آنسو بہتے ہیں، اور اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہوتا ہے۔ اور اس کا دل سوز و گداز سے بھرا ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ آگ کے انگارے

مِّنَ الْمُقْلَةِ وَ قَلْبٍ يَّضْجَرُ كَاَنَّهٗ وُضِعَ عَلَى الْجَمْرَةِ - تَحَرَّكَ لَهٗ مَوْجُ الْقُبُوْلِ مِنَ الْحَضْرَةِ - وَ نُجِّيَ مِنْ كَرْبٍ بَلَغَ اَمْرُهٗ اِلَى الْهَلَكَةِ - بَيْدَ اَنَّ هٰذَا الْمَقَامَ لَا يَحْصُلُ اِلَّا لِمَنْ فَنٰى فِي اللّٰهِ وَ اٰثَرَ الْحَبِيْبَ الْعَلَّامَ وَ تَرَكَ كُلَّ مَا يُشَابِهُ الْاَصْنَامَ - وَ لَبّٰى نِدَآءَ الْقُرْاٰنِ وَحَضَرَ حَرِيْمَ السُّلْطَانِ - وَ اَطَاعَ الْمَوْلٰى حَتّٰى فَنٰى - وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى - وَتَيَقَّظَ فِيْ زَمَنٍ نَّعَسَ النَّاسُ - وَ عَاثَ الْوَسْوَاسُ - وَ رَضِيَ عَنْ رَّبِّهٖ وَمَا قَضٰى - وَاَلْقٰى اِلَيْهِ الْعُرٰى وَ مَا دَنَّسَ نَفْسَهٗ بِالذُّنُوْبِ - بَعْدَ مَا اُدْخِلَ فِيْ دِيَارِ الْمَحْبُوْبِ - بِقَلْبٍ نَّقِيٍّ - وَّعَزْمٍ قَوِيٍّ - وَّ صِدْقٍ جَلِيٍّ - اُولٰٓئِكَ لَا تُضَاعُ دَعَوَاتُهُمْ - وَ لَا تُرَدُّ كَلِمَاتُهُمْ - (تذکرۃ الشہادتین صـ۸۱ـ۸۰)

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا

پر رکھا گیا ہے ۔ ایسے شخص کے لیے بارگاہِ احدیت سے قبولیت کی موج حرکت میں آتی ہے ۔ اور اللہ تعالےٰ اسے اس مصیبت سے نجات دیتا ہے ۔ جو اسے ہلاکت تک پہنچا رہی تھی ۔ ہاں یاد رہے ۔ کہ یہ مقام صرف اسی کو حاصل ہوتا ہے ۔ جو فانی فی اللہ ہو ۔ اور اپنے عالم الغیب محبوب کو سب پر ترجیح دے ۔ اور ہر اس چیز کو ترک کر دے جو بتوں سے مشابہ ہے ۔ پھر قرآن مجید کی آواز پر لبیک کہے ۔ اور دونوں جہانوں کے بادشاہ خدا کے سامنے حاضر ہو جائے ۔ اپنے آقا کی اطاعت میں فناء کے مقام تک پہنچ جائے ۔ اور نفس کو تمام خواہشات سے روکے ۔ وہ اس وقت اللہ کے حضور جاگ کر وقت گزارے جب لوگوں پر نیند کا غلبہ ہو اور وسوسہ انداز شیطان ان میں خرابی پیدا کرتا ہو ۔ ایسا مومن جو اپنے رب سے اور اس کی قضا پر ہر حال میں راضی ہو اور اپنے تمام معاملات کو اس کے سپرد کر دے ۔ اور جب اسے محبوب کے دیار میں پاک دِل اور مضبوط عزیمت اور واضح سچائی کے طفیل داخل کیا جا چکا ہو ۔ تو وہ اپنے نفس کو کسی قسم کے گناہ سے بھی میلا نہ کرے ۔ یہ وہ لوگ ہیں ۔ جن کی دعائیں کبھی ضائع نہیں جاتیں ۔ اور جن کی عاجزانہ التجائیں کبھی ردّ نہیں ہوتیں ؛

وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

كُلُوْا ایک امر ہے جب مومن اس کو امر سمجھ کر بجالاوے تو اس کا ثواب ہوگا اسی طرح عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ امر کی بجا آوری سے ثواب ہوتا ہے لیکن اگر ریاکاری سے نماز بھی ادا کرے تو پھر اس کے لیے وَیل ہے۔

(الحکم جلد ۸ عـ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـ۹)

(وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ۔)

اعتکاف میں یہ ضروری نہیں کہ انسان اندر ہی بیٹھا رہے اور بالکل کہیں آئے جائے ہی نہ ..... چھت پر دھوپ ہوتی ہے وہاں جا کر آپ[1] بیٹھ سکتے ہیں کیونکہ نیچے یہاں سردی زیادہ ہے۔ اور ہر ایک ضروری بات کر سکتے ہیں ضروری امور کا خیال رکھنا چاہیے اور یوں تو ہر ایک کام (مومن کا) عبادت ہی ہوتا ہے۔

(البدر جلد اول عـ۱۰ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صـ۷۴)

١٨٩ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

یعنی آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طور پر مت کھایا کرو اور نہ اپنے مال کو رشوت کے طور پر حکام تک پہنچایا کرو تا اس طرح پر حکام کی اعانت سے دوسرے کے مالوں کو دبا لو۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صـ۱۰۵)

ناجائز طور پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ۔ (شہادت القرآن بار دوم صـ۳۵)

---

[1] النساء : ٢٠ ؛ ڈاکٹر عباد اللہ صاحب امرتسری اور خواجہ کمال الدین صاحب سے خطاب ہے۔ ہر دو اصحاب ان دنوں قادیان کی مسجد میں معتکف تھے۔ (مرتب)

تم ایک دوسرے کے مال کو ناحق کے طور پر مت کھاؤ۔ (شہادت القرآن بار دوم ص۳۸)

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

اور گھروں میں دیواروں پر سے کود کر نہ جایا کرو بلکہ گھروں میں ان گھروں کے دروازہ میں سے جاؤ۔
(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۹۶)

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝۱۹۰

یعنی خدا کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ لڑو۔ جو لڑنے میں سبقت کرتے ہیں۔ اور تم پر چڑھ چڑھ کے آتے ہیں مگر اُن پر زیادتی نہ کرو۔ اور تحقیقاً یاد رکھو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (لیکچر مشمولہ چشمۂ معرفت ص۲۱)

اس آیت کا ماحصل یہ ہے۔ کہ جو لوگ تمھیں قتل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اُن کا دفع شر کے لیے مقابلہ تو کرو۔ مگر کچھ زیادتی نہ کرو۔ (لیکچر مشمولہ چشمۂ معرفت ص۲۱)

جنگ صرف جرائم پیشہ لوگوں کے لیے تھا کہ مسلمانوں کو قتل کرتے تھے یا امن عامّہ میں خلل ڈالتے تھے اور چوری ڈاکہ میں مشغول رہتے تھے اور یہ جنگ بحیثیت بادشاہ ہونے کے تھا نہ بحیثیت رسالت جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ؕ
الجزو ۲ سورۃ البقرہ۔ (ترجمہ)

تم خدا کے راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں یعنی دوسروں سے کچھ غرض نہ رکھو اور زیادتی مت کرو خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (چشمۂ معرفت ص۲۳۴)

یعنی جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان کا مقابلہ کرو اور پھر بھی حد سے مت بڑھو کیونکہ خدا تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (جنگ مقدس بحث ۲ جون ۱۸۹۳ء ص۱۷)

اور تم خدا کی راہ میں اُن سے جو تم سے لڑیں لڑو لیکن حد سے مت بڑھو اور کوئی زیادتی مت کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۵-۳۹)

جب بے رحم کافروں کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا خدا نے جو آخر اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے اپنے رسول پر اپنی وحی نازل کی کہ مظلوموں کی فریاد میرے تک پہنچ گئی۔ آج میں اجازت دیتا ہوں کہ تم بھی ان کا مقابلہ کرو۔ اور یاد رکھو کہ جو لوگ بے گناہ لوگوں پر تلوار اٹھاتے ہیں۔ وہ تلوار سے ہی ہلاک کئے جائیں گے۔ مگر تم کوئی زیادتی مت کرو۔ کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (پیغام صلح صفحہ ۴۱-۴۲)

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ جس طرح اور جن آلات سے کفار لوگ تم پر حملہ کرتے ہیں، انہی طریقوں اور آلات سے تم ان لوگوں کا مقابلہ کرو۔ اب ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے حملے اسلام پر تلوار سے نہیں ہیں بلکہ قلم سے ہیں لہذا ضرور ہے کہ ان کا جواب قلم سے دیا جاوے اگر تلوار سے دیا جاوے گا تو یہ اعتدا ہوگا جس سے خدا تعالیٰ کی صریح ممانعت قرآن شریف میں موجود ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔

(الحکم جلد ۹ ع ۷ ۲۴ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

(بقرہ ۱۹۲) وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ○

یعنی قتل کرو انھیں جہاں پاؤ اور اسی طرح نکالو جس طرح انھوں نے نکالا۔ (جنگ مقدس بحث ۲ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۸)

(بقرہ ۱۹۴) وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۗ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ○

یعنی اس حد تک ان کا مقابلہ کرو کہ اُن کی بغاوت دور ہو جاوے اور دین کی روکیں اٹھ جائیں اور حکومت اللہ کے دین کی ہو جائے۔ جنگِ مقدس (بحث ۲ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۸)

یعنی عرب کے ان مشرکوں کو قتل کرو یہاں تک کہ بغاوت باقی نہ رہ جاوے اور دین یعنی حکومت

اللہ تعالیٰ کی ہو جائے۔ اس سے کہاں جبر نکلتا ہے۔ اس سے تو صرف اس قدر پایا جاتا ہے کہ اُس حد تک لڑو کہ اُن کا زور ٹوٹ جائے اور شرارت اور فساد اٹھ جائے اور بعض لوگ جیسے خفیہ طور پر اسلام لائے ہوئے ہیں ظاہر بھی اسلامی احکام ادا کر سکیں۔ اگر اللہ جل شانہ کا ایمان بالجبر منشاء ہوتا ...... تو پھر جزیہ اور صلح اور معاہدات کیوں جائز رکھے جاتے اور کیا وجہ تھی کہ یہود اور عیسائیوں کے لیے یہ اجازت دی جاتی کہ وہ جزیہ دے کر امن میں آجائیں اور مسلمانوں کے زیر سایہ امن کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

(جنگ مقدس (بحث ۳ جون ۱۸۹۳ء)

بعض لوگ جن کو حق کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے جب ایسی تعلیم سنتے ہیں تو اور کچھ نہیں تو یہی اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام میں اگر ہمدردی کی تعلیم ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لڑائیاں کیوں کرتے وہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جنگ کیے وہ تیرہ۱۳ برس تک خطرناک دکھ اور تکالیف پر تکالیف اُٹھانے کے بعد کیے اور وہ بھی صرف مدافعت کے طور پر۔ تیرہ برس تک ان کے ہاتھوں سے آپ تکالیف اُٹھاتے رہے۔ ان کے عزیز دوست اور یاروں کو سخت عذاب دیا جاتا رہا اور جور و ظلم کا کوئی بھی ایسا پہلو نہ رہا جو کہ مخالفوں نے اُن کے لیے نہ برتا ہو یہاں تک کہ کئی مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اُن کے ہاتھ سے شہید بھی ہو گئے اور اُن کے ہر وقت کے ایسے شدید ظلموں سے تنگ آ کر بحکم الٰہی شہر بھی چھوڑنا پڑا جب مدینہ منورہ کو تشریف لے گئے۔ اور وہاں بھی ان ظالموں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جب اُن کے ظلموں اور شرارتوں کی بات انتہا تک پہنچ گئی تو خدا تعالیٰ نے مظلوم قوم کو اس مظلومانہ حالت میں مقابلہ کا حکم دیا اور وہ بھی اس لیے کہ شریر اپنی شرارت سے باز آجاویں اور ان کی شرارت سے مخلوقِ خدا کو بچایا جاوے اور ایک حق پرست قوم اور دینِ حق کے لیے ایک راہ کھل جاوے۔ (تقریریں صفحہ ۲۸)

۱۹۵ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۝

خدا کی محبت متقی کے ساتھ ہوتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔

(الحکم جلد ۴ عدد ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖۛ وَاَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۶﴾

اور تم خدا کی راہ میں خرچ کرو اور دانستہ اپنے تئیں ہلاکت میں مت ڈالو اور لوگوں سے احسان کرو کہ خدا محسنین کو دوست رکھتا ہے۔ (شہادت القرآن بار دوم صفحہ ۳۹)

یعنی خودکشی نہ کرو اور اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کے باعث نہ ٹھیرو اور یہ ظاہر ہے کہ اگر مثلاً خالد کے پیٹ میں درد ہو اور زید اس پر رحم کر کے اپنا سر پھوڑلے تو زید نے خالد کے حق میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ اپنے سر کو احمقانہ حرکت سے ناحق پھوڑا نیکی کا کام تب ہوتا کہ جب زید خالد کی خدمت میں مناسب اور مفید طریق کے ساتھ سرگرم رہتا اور اس کے لیے عمدہ دوائیں میسر کرتا اور طبابت کے قواعد کے موافق اس کا علاج کرتا مگر اس کے سر کے پھوڑنے سے زید کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا ناحق اس نے اپنے وجود کے ایک شریف عضو کو دُکھ پہنچایا......

قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کے لیے قانون قدرت کے مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجالانے سے اپنی جان ان پر فدا کردیں نہ یہ کہ قوم کو سخت بلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پاکر اپنے سر پر پتھر مار لیں یا دو تین رتی اسٹرکینا کھا کر اس جہان سے رخصت ہو جائیں اور پھر گمان کریں کہ ہم نے اپنی اس حرکتِ بیجا سے قوم کو نجات دے دی ہے یہ مردوں کا کام نہیں ہے زنانہ خصلتیں ہیں اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابل برداشت نہ پاکر جھٹ پٹ خودکشی کی طرف دوڑتے ہیں ایسی خودکشی کی گو بعد میں کتنی ہی تاویلیں کی جائیں مگر یہ حرکت بلاشبہ عقل اور عقلمندوں کا ننگ ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا صبر اور دشمن کا مقابلہ نہ کرنا معتبر نہیں ہے جس کو انتقام کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ کیا معلوم ہے کہ اگر وہ انتقام پر قدرت پاتا تو کیا کچھ کرتا جب تک انسان پر وہ زمانہ نہ آوے جو ایک مصیبتوں کا زمانہ اور ایک مقدرت اور حکومت اور ثروت کا زمانہ ہو اس وقت تک اس کے سچے اخلاق ہرگز ظاہر نہیں ہو سکتے صاف ظاہر ہے کہ جو شخص صرف کمزوری اور ناداری اور بے اقتداری کی حالت میں لوگوں کی ماریں کھاتا مر جاوے اور اقتدار اور حکومت اور ثروت کا زمانہ نہ پاوے اس کے اخلاق میں سے کچھ بھی ثابت نہ ہوگا اور اگر کسی میدان جنگ میں حاضر نہیں ہوا تو یہ بھی ثابت نہیں ہوگا کہ وہ دل کا بہادر تھا یا بزدل ہوگا اس کے اخلاق کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۲۰۷، ۲۰۸)

ایک شخص نے دریافت کیا کہ میرے اہل خانہ اور بچے ایک ایسے مقام میں ہیں جہاں طاعون کا زور ہے میں گھبرایا ہوا ہوں اور وہاں جانا چاہتا ہوں فرمایا۔

مت جاؤ۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ پچھلی رات کو اٹھ کر اُن کے لیے دعا کرو یہ بہتر ہوگا۔ بہ نسبت اس کے کہ تم خود جاؤ۔ ایسے مقام پر جانا گناہ ہے۔ (الحکم جلد ۶ ع ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ)

سوال ہوا کہ بعض باتیں واقع میں صحیح ہوتی ہیں۔ مگر مصلحت وقت اور قانون ان کے اظہار کا مانع ہوتا ہے تو کیا ہم لَا تَکْتُمُوا الشَّھَادَۃَ کے موافق ظاہر کر دیا کریں۔ فرمایا۔

یہ بات اس وقت ہوتی ہے جب آدمی آزاد بالطبع ہو۔ دوسری جگہ یہ بھی تو فرمایا ہے۔ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ قانون کی پابندی ضروری شے ہے۔ جب قانون روکتا ہے تو رکنا چاہیئے جب کہ بعض جگہ اخفاء ایمان بھی کرنا پڑتا ہے تو جہاں قانون بھی مانع ہو وہاں کیوں اظہار کیا جاوے جس راز کے اظہار سے خانہ بربادی اور تباہی آتی ہو۔ وہ اظہار کرنا منع ہے۔ (الحکم جلد ۷ ع ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

سرحد کے پٹھانوں کو یہ بھی ایک خبط سمایا ہوا ہے کہ وہ انگریز افسروں پر آکر حملے کرتے ہیں اور اپنی شوریدہ سری سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ اگر ہم کسی کافر یا غیر مذہب والے کو ہلاک کر دیں گے تو ہم غازی ہوں گے اور اگر مارے جاویں گے تو شہید ہوں گے مجھے ان کمینہ فطرت ملانوں پر بھی افسوس ہے جو ان شوریدہ سر پٹھانوں کو اکساتے ہیں وہ انھیں نہیں بتاتے کہ تم اگر کسی شخص کو بلا وجہ قوی قتل کرتے ہو تو غازی نہیں ظالم ٹھیرتے ہو اور اگر وہاں ہلاک ہو جاتے ہو تو شہید نہیں بلکہ خود کشی کر کے حرام موت مرتے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وہ اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور فساد کرتے ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ سخت سزا کے مستوجب ہیں۔ (الحکم جلد ۹ ع ۱۸ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ)

رشوت ہرگز نہیں دینی چاہیے۔ یہ سخت گناہ ہے مگر میں رشوت کی یہ تعریف کرتا ہوں کہ جس سے گورنمنٹ یا دوسرے لوگوں کے حقوق تلف کئے جاویں۔ میں اس سے سخت منع کرتا ہوں لیکن ایسے طور پر کہ بطور نذرانہ یا ڈالی اگر کسی کو دی جاوے جس سے کسی کے حقوق کے اتلاف مدنظر نہ ہو بلکہ اپنی حق تلفی اور شر سے بچنا مقصود ہو تو یہ میرے نزدیک منع نہیں اور میں اس کا نام رشوت نہیں رکھتا کسی کے ظلم سے بچنے کو شریعت منع نہیں کرتی بلکہ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ع ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

کوئی مخالف آزمائے اور آگ جلا کر ہمیں اس میں ڈال دے آگ ہرگز ہم پر کام نہ کرے گی اور وہ ضرور ہمیں اپنے وعدہ کے موافق بچالے گا لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم خود آگ میں کودتے پھریں یہ طریق انبیاء کا نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ پس ہم خود آگ میں دیدہ دانستہ نہیں پڑتے

بلکہ یہ حفاظت کا وعدہ دشمنوں کے مقابلہ پر ہے کہ اگر وہ آگ میں ہمیں جلانا چاہیں تو ہم ہرگز نہ جلیں گے۔ اس لیے میرا ایمان تو یہ ہے کہ ہمیں تکلف اور تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے خدا کے باطنی تصرفات ہیں ویسے ہی ظاہری بھی ہم مانتے ہیں بلکہ اسی لیے خدا نے اول ہی سے الہام کر دیا ہوا ہے کہ آگ سے ہمیں مت ڈرا آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے۔ (البدر جلد ۲ عـ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صـ۳۷۳)

اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ۔ خدا کی مخلوق سے احسان کرو کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صـ۱۱۱)

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کے واسطے پورا کرو۔ (شہادت القرآن بار دوم صـ۳۹)

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ ○

حج میں محبت کے سارے ارکان پائے جاتے ہیں بعض وقت شدت محبت میں کپڑے کی بھی حاجت نہیں رہتی۔ عشق بھی ایک جنون ہوتا ہے کپڑوں کو سنوار کر رکھنا یہ عشق میں نہیں رہتا۔ سیالکوٹ میں ایک عورت ایک درزی پر عاشق تھی اسے بہتیرا پکڑ کر رکھتے تھے وہ کپڑے پھاڑ کر چلی آتی تھی غرض یہ نمونہ جو انتہائے محبت کا لباس میں ہوتا ہے وہ حج میں موجود ہے۔ سر منڈایا جاتا ہے۔ دوڑتے ہیں محبت کا بوسہ رہ گیا وہ بھی ہے جو خدا کی ساری شریعتوں میں تصویری زبان میں چلا آیا ہے پھر قربانی میں بھی کمال عشق دکھایا ہے اسلام نے پورے طور پر ان حقوق کی تکمیل کی تعلیم دی ہے نادان ہے وہ شخص جو اپنی نابینائی سے اعتراض کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ عـ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صـ۳)

حج کے واسطے جانا خلوص اور محبت سے آسان ہے مگر واپسی ایسی حالت میں مشکل۔ بہت ہیں جو وہاں سے نامراد اور سخت دل ہو کر آتے ہیں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وہاں کی حقیقت اُن کو نہیں ملتی۔ قشر کو دیکھ کر رائے زنی کرنے لگ جاتے ہیں۔ وہاں کے فیوض سے محروم ہوتے ہیں اپنی بدکاریوں کی وجہ سے

اور پھر الزام دوسروں پر دھرتے ہیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ مامور کی خدمت میں صدق اور استقلال سے کچھ عرصہ رہا جاوے تاکہ اُس کے اندرونی حالات سے بھی آگاہی ہو اور صدق پورے طور پر نورانی ہو جاوے۔ (الحکم جلد ۷ ع۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

جب سفر کرو تو ہر ایک طور پر سفر کا انتظام کر لیا کرو اور کافی زادِ راہ لے لیا کرو تا گداگری سے بچو۔
(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۹۷)

اور اپنے پاس توشہ رکھو کہ توشہ میں یہ فائدہ ہے کہ تم کسی دوسرے سے سوال نہیں کرو گے یعنی سوال ایک ذلت ہے اس سے بچنے کے لیے تدبیر کرنی چاہیئے۔ (شہادت القرآن ص۳۹ بار دوم)

مومن کو بھی ہر وقت اپنے سفر کے لیے طیار اور محتاط رہنا چاہیئے اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی۔ (الحکم جلد ۴ ع۴۲ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۰۰ء ص۵)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝

گناہ اصل میں جُناح سے لیا گیا ہے اور ج کا تبادلہ گ سے کیا گیا ہے جیسے فارسی والے کر لیتے ہیں اور جُناح اصل میں عمداً کسی طرف میل کرنے کو کہتے ہیں پس گناہ سے یہ مراد ہے کہ عمداً بدی کی طرف میل کیا جاوے پس میں ہرگز نہیں مان سکتا کہ انبیا علیہم السلام سے یہ حرکت سرزد ہو اور قرآن شریف میں اس کا ذکر بھی نہیں۔ انبیا علیہم السلام سے گناہ کا صدور اس لیے ناممکن ہے کہ عارفانہ حالت کے انتہائی مقام پر وہ ہوتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ عارف بدی کی طرف میل کرے۔

(الحکم جلد ۵ ع۴۵ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء ص۲)

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

استغفار جس کے ساتھ ایمان کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں قرآن شریف میں دو معنی پر آیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنے دل کو خُدا کی محبت میں محکم کرکے گناہوں کے ظہور کو جو علیحدگی کی حالت میں جوش مارتے ہیں خدا تعالیٰ کے تعلق کے ساتھ روکنا اور خُدا میں پیوست ہو کر اس سے مدد چاہنا یہ استغفار تو مقرّبوں کا ہے جو ایک طرفۃ العین خدا سے علیحدہ ہونا اپنی تباہی کا موجب جانتے ہیں اس لیے استغفار کرتے ہیں تا خُدا اپنی محبت میں تھامے رکھے۔ اور دوسری قسم استغفار کی یہ ہے کہ گناہ سے نکل کر خُدا کی طرف بھاگنا اور کوشش کرنا کہ جیسے درخت زمین میں لگ جاتا ہے ایسا ہی دل خدا کی محبت کا اسیر ہو جائے تا پاک نشو و نما پاکر گناہ کی خشکی اور زوال سے بچ جائے اور ان دونو صورتوں کا نام استغفار رکھا گیا۔ کیونکہ غفر جس سے استغفار نکلا ہے ڈھانکنے اور دبانے کو کہتے ہیں۔ گویا استغفار سے یہ مطلب ہے کہ خُدا اُس شخص کے گناہ جو اُس کی محبت میں اپنے تئیں قائم کرتا ہے دبائے رکھے اور بشریت کی جڑیں ننگی نہ ہونے دے بلکہ الوہیت کی چادر میں لے کر اپنی قدوسیت میں سے حصہ دے۔ یا اگر کوئی جڑ گناہ کے ظہور سے ننگی ہو گئی ہو پھر اس کو ڈھانک دے اور اُس کی برہنگی کے بداثر سے بچائے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۲۰-۲۱)

جب انسان کے اندر محبت کا چشمہ جوش مارتا ہے تو وہ محبت طبعاً یہ تقاضا کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہو پس محبت کی کثرت کی وجہ سے استغفار کی بھی کثرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا سے کامل طور پر پیار کرنے والے ہر دم اور ہر لحظہ استغفار کو اپنا ورد رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر معصوم کی یہی نشانی ہے کہ وہ سب سے زیادہ استغفار میں مشغول رہے اور استغفار کے حقیقی معنے یہ ہیں کہ ہر ایک لغزش اور قصور جو بوجہ ضعف بشریت انسان سے صادر ہو سکتی ہے اُس امکانی کمزوری کو دُور کرنے کے لیے خدا سے مدد مانگی جائے تا خدا کے فضل سے وہ کمزوری ظہور میں نہ آوے اور مستور و مخفی رہے۔ پھر بعد اس کے استغفار کے معنے عام لوگوں کے لیے وسیع کئے گئے اور یہ امر بھی استغفار میں داخل ہوا کہ جو کچھ لغزش اور قصور صادر ہو چکا خدا تعالیٰ اُس کے بدنتائج اور زہریلی تاثیروں سے دنیا اور آخرت میں محفوظ رکھے۔ پس نجات حقیقی کا سرچشمہ محبت ذاتی خدائے عزّوجل کی ہے جو عجز و نیاز اور دائمی استغفار کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی محبت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۶۳-۶۴)

روحانی سرسبزی کے محفوظ اور سلامت رہنے کے لیے یا اُس سرسبزی کی ترقیات کی غرض سے حقیقی زندگی کے چشمہ سے سلامتی کا پانی مانگنا یہی وہ امر ہے جس کو قرآن کریم دوسرے لفظوں میں استغفار کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ (نور القرآن حصہ اول صفحہ ۲۰)

(مغفرت) لُغت میں ایسے ڈھانکنے کو کہتے ہیں جس سے انسان آفات سے محفوظ رہے اسی وجہ سے مغفر جو

خود کے معنی رکھتا ہے اسی سے نکالا گیا ہے اور مغفرت مانگنے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ جس بلا کا خوف ہے یا جس گنہ کا اندیشہ ہے خدا تعالیٰ اس بلا یا اس گناہ کو ظاہر ہونے سے روک دے اور ڈھانکے رکھے۔ (نور القرآن حصہ اول ص۲۰-۲۱)

انسان کو خدا کی ضرورت ہر حال میں لاحق رہتی ہے اس لیے ضروری ہوا کہ خدا سے طاقت طلب کرتے رہیں اور یہی استغفار ہے۔ اصل حقیقت تو استغفار کی یہ ہے پھر اس کو وسیع کر کے ان لوگوں کے لیے کیا گیا کہ جو گناہ کرتے ہیں کہ اُن کے برے نتائج سے محفوظ رکھا جاوے لیکن اصل یہ ہے کہ انسانی کمزوریوں سے بچایا جاوے۔ پس جو شخص انسان ہو کر استغفار کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ بے ادب دہریہ ہے۔

(الحکم جلد ۶ عنا مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۲ء ص۵)

استغفار کے اصل معنے تو یہ ہیں کہ یہ خواہش کرنا کہ مجھ سے کوئی گناہ نہ ہو یعنی میں معصوم رہوں اور دوسرے معنے جو اس کے نیچے درجے پر ہیں کہ میرے گناہ کے بد نتائج جو مجھے ملنے ہیں میں اُن سے محفوظ رہوں۔ (البدر جلد ۱ عـ۱ مورخہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۰۲ء ص۷)

غفلت غیر معلوم اسباب سے ہے بعض وقت انسان نہیں جانتا اور ایک دفعہ ہی زنگ اور تیرگی اس کے قلب پر آجاتی ہے اس لیے استغفار ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ زنگ اور تیرگی نہ آوے عیسائی لوگ اپنی بیوقوفی سے اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے سابقہ گناہوں کا ثبوت ملتا ہے۔ اصل معنے اس کے یہ ہیں کہ گناہ صادر نہ ہوں۔ ورنہ اگر استغفار سابقہ صادر شدہ گناہوں کی بخشش کے معنی رکھتا ہے تو وہ بتلاویں کہ آئندہ گناہوں کے نہ صادر ہونے کے معنوں میں کونسا لفظ ہے۔ غفر اور کفر کے ایک ہی معنے ہیں تمام انبیاء اس کے محتاج تھے جتنا کوئی استغفار کرتا ہے اتنا ہی معصوم ہوتا ہے اصل معنے یہ ہیں کہ خدا نے اُسے بچایا۔ معصوم کے معنے مستغفر کے ہیں۔ (البدر جلد ۱ عـ۷ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۲ء ص۵۲)

گناہ ایک ایسا کیڑا ہے جو انسان کے خون میں ملا ہوا ہے مگر اس کا علاج استغفار سے ہی ہو سکتا ہے۔ استغفار کیا ہے؟ یہی جو گناہ صادر ہو چکے ہیں ان کے بدثمرات سے خدا محفوظ رکھے اور جو ابھی صادر نہیں ہوئے اور جو بالقوہ انسان میں موجود ہیں ان کے صدور کا ہی وقت نہ آوے اور اندر ہی اندر وہ جل بھن کر راکھ ہو جاویں۔ (البدر جلد ۲ عـ۱۴ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۳ء ص۱۰۶)

گناہ جو انسان سے صادر ہوتا ہے اگر انسان یقین سے توبہ کرے تو خدا بخش دیتا ہے۔ پیغمبر خدا جو ستر بار استغفار کرتے تھے حالانکہ ایک دفعہ کے استغفار سے گذشتہ گناہ معاف ہو سکتے تھے پس اس سے ثابت ہے کہ استغفار کے یہ معنے ہیں کہ خدا آیندہ ہر ایک غفلت اور گناہ کو دبائے رکھے۔ اس کا صدور بالکل نہ ہو۔ (البدر جلد ۲ عـ۲۲ مورخہ ۱۹ جون ۱۹۰۳ء ص۱۶۹)

توبہ واستغفار کرنی چاہیے۔ بغیر توبہ استغفار کے انسان کر ہی کیا سکتا ہے۔ سب نبیوں نے یہی کہا ہے کہ اگر توبہ واستغفار کرو گے تو خدا بخش دے گا۔ سو نمازیں پڑھو اور آیندہ گناہوں سے بچنے کے لیے خدا تعالیٰ سے مدد چاہو اور پچھلے گناہوں کی معافی مانگو۔ اور بار بار استغفار کرو تاکہ جو قوت گناہ کی انسان کی فطرت میں ہے وہ ظہور میں نہ آوے۔ انسان کی فطرت میں دو طرح کا ملکہ پایا جاتا ہے ایک تو کسب خیرات اور نیک کاموں کے کرنے کی قوت ہے اور دوسرے بُرے کاموں کو کرنے کی قوت اور ایسی قوت کو روکے رکھنا یہ خدا تعالیٰ کا کام ہے اور یہ قوت انسان کے اندر اس طرح سے ہوتی ہے جس طرح کہ پتھر میں ایک آگ کی قوت ہے اور استغفار کے یہی معنی ہیں کہ ظاہر میں کوئی گناہ سرزد نہ ہو۔ اور گناہوں کے کرنے والی قوت ظہور میں نہ آوے۔ انبیاء کے استغفار کی بھی یہی حقیقت ہے کہ وہ ہوتے تو معصوم ہیں مگر وہ استغفار اس واسطے کرتے ہیں کہ تا آیندہ وہ قوت ظہور میں نہ آوے۔ اور عوام کے واسطے استغفار کے دوسرے معنے بھی لیے جاویں گے کہ جو جرائم اور گناہ ہو گئے ہیں ان کے بدنتائج سے خدا بچائے رکھے اور ان گناہوں کو معاف کردے اور ساتھ ہی آیندہ گناہوں سے محفوظ رکھے۔

بہرحال یہ انسان کے لیے لازمی امر ہے کہ وہ استغفار میں ہمیشہ مشغول رہے۔ یہ جو قحط اور طرح طرح کی بلائیں دنیا میں نازل ہوتی ہیں۔ ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ لوگ استغفار میں مشغول ہو جائیں مگر استغفار کا یہ مطلب نہیں ہے جو استغفر اللہ استغفر اللہ کہتے رہیں۔ اصل میں غیر ملک کی زبان کے سبب لوگوں سے حقیقت چھپی رہی ہے۔ عرب کے لوگ تو ان باتوں کو خوب سمجھتے تھے مگر ہمارے ملک میں غیر زبان کی وجہ سے بہت سی حقیقتیں مخفی رہی ہیں بہت سے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم نے اتنی دفعہ استغفار کیا۔ سو تسبیح یا ہزار تسبیح پڑھی۔ مگر جو استغفار کا مطلب اور معنے پوچھو تو بس کچھ نہیں ہکا بکا رہ جاویں گے انسان کو چاہیے کہ حقیقی طور پر دل ہی دل میں معافی مانگتا رہے کہ وہ معاصی اور جرائم جو مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں ان کی سزا نہ بھگتنی پڑے اور آیندہ دل ہی دل میں ہر وقت خدا سے مدد طلب کرتا رہے کہ آیندہ نیک کام کرنے کی توفیق دے اور معصیت سے بچائے رکھے۔

خوب یاد رکھو کہ لفظوں سے کچھ کام نہیں بنے گا اپنی زبان میں بھی استغفار ہو سکتا ہے کہ خدا پچھلے گناہوں کو معاف کرے اور آیندہ گناہوں سے محفوظ رکھے۔ اور نیکی کی توفیق دے اور یہی حقیقی استغفار ہے کچھ ضرورت نہیں کہ یونہی استغفر اللہ استغفر اللہ کہتا پھرے اور دل کو خبر تک نہ ہو۔ یاد رکھو کہ خدا تک وہی بات پہنچتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ اپنی زبان میں ہی خدا سے بہت دعائیں مانگنی چاہئیں۔ اس سے دل پر بھی اثر ہوتا ہے۔ زبان تو صرف دل کی شہادت دیتی ہے اگر دل میں جوش پیدا ہو اور زبان بھی ساتھ مل جائے تو اچھی بات ہے بغیر دل کے صرف زبانی دعائیں عبث ہیں ہاں دل کی دعائیں اصلی دعائیں ہوتی ہیں۔ جب قبل از وقت بلا انسان اپنے

دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگتا رہتا ہے اور استغفار کرتا رہتا ہے۔ تو پھر خداوند رحیم و کریم ہے وہ بلا ٹل جاتی ہے لیکن جب بلا نازل ہو جاتی ہے پھر نہیں ٹلا کرتی۔ بلا کے نازل ہونے سے پہلے دعائیں کرتے رہنا چاہیے اور بہت استغفار کرنا چاہیے اس طرح سے خدا بلا کے وقت محفوظ رکھتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ عـ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صـ۴)

استغفار کے معنی یہ ہیں کہ خدا سے اپنے گذشتہ جرائم اور معاصی کی سزا سے حفاظت چاہنا۔ اور آیندہ گناہوں کے سرزد ہونے سے حفاظت مانگنا۔ استغفار انبیاء بھی کیا کرتے ہیں اور عوام بھی۔

بعض نادان پادریوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار پر اعتراض کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اُن کے استغفار کرنے سے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گناہ کا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ استغفار تو ایک اعلیٰ صفت ہے۔ انسان فطرتاً ایسا بنا ہے کہ کمزوری۔ اور ضعف اس کا فطری تقاضا ہے۔ انبیاء اس فطرتی کمزوری اور ضعف بشریت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ دعا کرتے ہیں کہ یا الٰہی تو ہماری ایسی حفاظت کر کہ وہ بشری کمزوریاں ظہور پذیر ہی نہ ہوں۔ غفر کہتے ہیں ڈھکنے کو۔ اصل بات یہی ہے کہ جو طاقت خدا کو ہے وہ نہ کسی نبی کو ہے نہ ولی کو اور نہ رسول کو۔ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنی طاقت سے گناہ سے بچ سکتا ہوں۔ پس انبیاء بھی حفاظت کے واسطے خدا کے محتاج ہیں پس اظہار عبودیت کے واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور انبیاء کی طرح اپنی حفاظت خدا سے مانگا کرتے تھے ...... استغفار ایک عربی لفظ ہے۔ اس کے معنے ہیں۔ طلب مغفرت کرنا۔ کہ یا الٰہی ہم سے پہلے جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں۔ ان کے بدنتائج سے ہمیں بچا کیونکہ گناہ ایک زہر ہے۔ اور اس کا اثر بھی لازمی ہے۔ اور آیندہ ایسی حفاظت کر کہ گناہ ہم سے سرزد ہی نہ ہوں۔ صرف زبانی تکرار سے مطلب حاصل نہیں ہوتا ...... پس چاہیے کہ توبہ استغفار منتر جنتر کی طرح نہ پڑھو بلکہ ان کے مفہوم اور معانی کو مدنظر رکھ کر تڑپ اور سچی پیاس سے خدا کے حضور دعائیں کرو۔

(الحکم جلد ۱۲ عـ۳۴ مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۰۸ء صـ۳)

خدا نے اپنی آسمانی بادشاہت میں فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں دیا...... لیکن انسانی فطرت کو قبول عدم قبول کا اختیار دیا گیا ہے اور چونکہ یہ اختیار اوپر سے دیا گیا ہے اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ فاسق انسان کے وجود سے خدا کی بادشاہت زمین سے جاتی رہی بلکہ ہر رنگ میں خدا کی ہی بادشاہت ہے ہاں صرف قانون دو ہیں۔ ایک آسمانی فرشتوں کے لیے قضا و قدر کا قانون ہے کہ وہ بدی کر ہی نہیں سکتے اور ایک زمین پر انسانوں کے لیے خدا کے قضا و قدر کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ آسمان سے اُن کو بدی کرنے کا اختیار دیا گیا ہے مگر جب خدا سے طاقت طلب کریں یعنی استغفار کریں تو روح القدس کی تائید سے ان کی کمزوری دور ہو سکتی ہے

اور وہ گناہ کے ارتکاب سے بچ سکتے ہیں جیسا کہ خدا کے نبی اور رسول بچتے ہیں اور اگر ایسے لوگ ہیں کہ گنہگار ہو چکے ہیں تو استغفار اُن کو یہ فائدہ پہنچاتا ہے کہ گناہ کے نتائج سے یعنی عذاب سے بچائے جاتے ہیں کیونکہ نور کے آنے سے ظلمت باقی نہیں رہ سکتی اور جرائم پیشہ جو استغفار نہیں کرتے یعنی خدا سے طاقت نہیں مانگتے وہ اپنے جرائم کی سزا پاتے رہتے ہیں۔ (کشتی نوح ص ۳۱)

آدمی کو لازم ہے کہ توبہ و استغفار میں لگا رہے اور دیکھتا رہے کہ ایسا نہ ہو بداعمالیاں حد سے گذر جاویں اور خدا تعالیٰ کے غضب کو کھینچ لاویں جب خدا تعالیٰ کسی پر فضل کے ساتھ نگاہ کرتا ہے تو عام طور پر دلوں میں اُس کی محبت کا القا کر دیتا ہے لیکن جس وقت انسان کا شر حد سے گذر جاتا ہے اُس وقت آسمان پر اُس کی مخالفت کا ارادہ ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے موافق لوگوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں مگر جونہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ خدا کے آستانہ پر گر کر پناہ لیتا ہے تو اندر ہی اندر ایک رحم پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کو پتہ بھی نہیں لگتا کہ اُس کی محبت کا بیج لوگوں کے دلوں میں بو دیا جاتا ہے۔ غرض توبہ و استغفار کا ایسا مجرب نسخہ ہے کہ خطا نہیں جاتا۔ (الحکم جلد ۳ عــ۱۷ مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۹۹ء ص ۵)

میرے نزدیک تو استغفار سے بڑھ کر کوئی تعویذ و حرز اور کوئی احتیاط و دوا نہیں۔ میں تو اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ خدا سے صلح و موافقت پیدا کرو اور دعاؤں میں مصروف رہو۔ (الحکم جلد ۳ عــ۲۳ مورخہ ۳۰ جون ۱۸۹۹ء ص ۵)

استغفار بہت پڑھا کرو۔ انسان کے واسطے غموں سے سبک ہونے کے واسطے یہ طریق ہے۔

(الحکم جلد ۵ عــ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء ص ۱۱)

استغفار کلید ترقیات روحانی ہے۔ (الحکم جلد ۵ عــ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء ص ـ)

استغفار بہت کرو۔ اس سے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اولاد بھی دے دیتا ہے۔ یاد رکھو۔ یقین بڑی چیز ہے جو شخص یقین میں کامل ہوتا ہے خدا تعالیٰ خود اس کی دستگیری کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ عــ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء ص ۱۱)

جو لوگ قبل از نزول بلا دعا کرتے ہیں اور استغفار کرتے اور صدقات دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرتا ہے اور عذاب الٰہی سے اُن کو بچا لیتا ہے۔ میری ان باتوں کو قصہ کے طور پر نہ سنو میں نصحاً للہ کہتا ہوں اپنے حالات پر غور کرو۔ اور آپ بھی اور اپنے دوستوں کو بھی دعا میں لگ جانے کے لیے کہو۔ استغفار عذاب الٰہی اور مصائب شدیدہ کے لیے سپر کا کام دیتا ہے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ[1] اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ اس عذاب الٰہی سے تم محفوظ رہو تو استغفار کثرت سے پڑھو۔ (الحکم جلد ۵ عــ۲۷ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء ص ۱)

---

[1] الانفال : ۳۴

استغفار بہت پڑھا کرو۔ انسان کی دو ہی حالت ہیں یا تو وہ گناہ نہ کرے اور یا اللہ تعالیٰ اُس گناہ کے بد انجام سے بچالے۔ سو استغفار پڑھنے کے وقت دونوں معنوں کا لحاظ رکھنا چاہیے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ سے گذشتہ گناہوں کی پردہ پوشی چاہے اور دوسرا یہ کہ خدا سے توفیق چاہے کہ آیندہ گناہوں سے بچالے۔ مگر استغفار صرف زبان سے پورا نہیں ہوتا بلکہ دل چاہیے۔ نماز میں اپنی زبان میں بھی دعا مانگو یہ ضروری ہے۔

(الحکم جلد ۵ ع۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

مرض دو قسم کے ہوتے ہیں ایک مرض مستوی اور ایک مرض مختلف مرض مستوی وہ ہوتا ہے جس کا درد وغیرہ محسوس نہیں ہوتا جیسے برص اور مرض مختلف وہ ہے جس کا درد وغیرہ محسوس ہوتا ہے اس کے علاج کا تو انسان فکر کرتا ہے اور مرض مستوی کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ اسی طرح سے بعض گناہ تو محسوس ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان اُن کو محسوس بھی نہیں کرتا اس لیے ضرورت ہے کہ ہر وقت انسان خدا تعالیٰ سے استغفار کرتا رہے۔

(الحکم جلد ۵ ع۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

ہم نے تحقیق کر لی ہے کہ استغفار کے یہ معنی ہیں کہ انسانی قویٰ جو کرتوت کر رہے ہیں اُن کا افراط اور تفریط یعنی بے محل استعمال۔ نافرمانی ہوتا ہے تو خدا کا لطف و کرم مانگنا کہ تو رحم کر اور ان کے استعمال کی افراط تفریط سے محفوظ رکھ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کرنی ہے۔ مسیحؑ بھی خدا کی مدد کے محتاج تھے اگر کوئی اس طرح نہیں سمجھتا تو وہ مسلمان نہیں ......

(رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کے متعلق فرمایا۔) اس سے مراد تو ترقی مراتب ہے۔

(البدر جلد ۱ ع۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۳)

اگر استغفار کے یہ معنے ہیں کہ گذشتہ گناہوں سے معافی ہو تو پھر بتلاویں کہ آیندہ گناہوں سے محفوظ رہنے کے لیے کونسا لفظ ہے۔ گناہ سے حفاظت یعنی عصمت تو انسان کو استغفار سے ملتی ہے کہ انسان خدا سے چاہے کہ اُن قوائے کا ظہور اور بروز ہی نہ ہو جو معاصی کی طرف کھینچتے ہیں کیونکہ جیسے انسان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ گذشتہ گناہ اس کے بخشے جاویں اسی طرح اس بات کی ضرورت بھی ہے کہ آیندہ اس کے قوائے سے گناہ کا ظہور و بروز نہ ہو۔ یہ مسئلہ بھی قابل دعا کے ہے۔ ورنہ یہ کیا بات ہے کہ جب گناہ میں مبتلا ہو تو اُس وقت تو دعا کرے اور آیندہ گناہوں سے محفوظ رہنے کی دعا نہ کرے اگر انجیل میں یہ دعا نہیں ہے تو پھر وہ کتاب ناقص ہے انجیل میں لکھا ہے مانگو تو دیا جاوے گا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار مانگا آپ کو دیا گیا۔ مسیح نے نہ مانگا ان کو نہ دیا گیا۔ غرضیکہ طبعی تقسیم قرآن نے کی ہے کہ گناہ سے حفاظت کے ہر ایک پہلو کو دیکھ کر استغفار کا لفظ رکھا ہے کیونکہ انسان دونو راہ کا محتاج ہے کبھی گناہ کی معافی کا

کبھی اس امر کا کہ وہ قوائے ظہور و بروز نہ کریں ورنہ یہ کب ممکن ہے کہ قوائے خدا کی حفاظت کے بغیر خود بخود بچے رہیں وہ کتاب کامل ہے جس نے دونوں قسم کی تعلیم بتلائی اور عقل اور ضرورت خود دونوں قسم کی دعا کا تقاضا کرتی ہے۔ (البدر جلد اول ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۳)

جو شخص دعویٰ سے کہتا ہے کہ میں گناہ سے بچتا ہوں وہ جھوٹا ہے جہاں شیرینی ہوتی ہے وہاں چیونٹیاں ضرور آتی ہیں اسی طرح نفس کے تقاضائے تو ساتھ لگے ہی ہیں ان سے نجات کیا ہو سکتی ہے خدا کے فضل اور رحمت کا ہاتھ نہ ہو تو انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا نہ کوئی نبی نہ ولی اور نہ ان کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ ہم سے گناہ صادر نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ خدا کا فضل مانگتے تھے اور نبیوں کے استغفار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ خدا کے فضل کا ہاتھ ان پر رہے ورنہ اگر انسان اپنے نفس پر چھوڑا جاوے تو وہ ہرگز معصوم اور محفوظ نہیں ہو سکتا اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ۔ اور دوسری دعائیں بھی استغفار کے اس مطلب کو بتلاتی ہیں۔ عبودیت کا سِرّ یہی ہے کہ انسان خدا کی پناہ کے نیچے اپنے آپ کو لے آوے جو خدا کی پناہ نہیں چاہتا ہے وہ مغرور اور متکبر ہے۔ (البدر جلد ۲ ۲۳ مورخہ ۲۶ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷۸)

احمق حقیقت سے ناآشنا استغفار کے لفظ پر اعتراض کرتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ جس قدر یہ لفظ پیارا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اندرونی پاکیزگی پر دلیل ہے وہ ہمارے وہم و گمان سے بھی پرے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عاشق رضا ہیں اور اس میں بڑی بلند پروازی کے ساتھ ترقیات کر رہے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تصور کرتے ہیں اور اظہار شکر سے قاصر پا کر تدارک کرتے ہیں یہ کیفیت ہم کس طرح ان عقل کے اندھوں اور مجذوم القلب لوگوں کو سمجھائیں ان پر وارد ہو تو وہ سمجھیں۔ جب ایسی حالت ہوتی ہے احسانات الٰہیہ کی کثرت آ کر اپنا غلبہ کرتی ہے تو روح محبت سے پُر ہو جاتی ہے اور وہ اچھل اچھل کر استغفار کے ذریعہ اپنے قصور شکر کا تدارک کرتی ہے۔ یہ لوگ خشک منطق کی طرح اتنا ہی نہیں جانتے کہ وہ قویٰ جن سے کوئی کمزوری یا غفلت صادر ہو سکتی ہے وہ ظاہر نہ ہوں۔ نہیں وہ ان قویٰ پر تو فتح حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تصور کر کے استغفار کرتے ہیں کہ شکر نہیں کر سکتے۔ یہ ایک لطیف اور اعلیٰ مقام ہے جس کی حقیقت سے دوسرے لوگ ناآشنا ہیں ...... (الحکم جلد ۸ ۱۵، ۱۴ مورخہ ۳۰ اپریل و ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

جب انسان کے نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ تو خدا اس کا متولی اور متکفل ہو جاتا ہے۔ اور جیسے ماں بچے کو گود میں پرورش کرتی ہے۔ اسی طرح وہ خدا کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ اور یہی حالت ہے۔ کہ خدا کا نور اس کے دل پر گر کر کل دنیاوی اثروں کو جلا دیتا ہے۔ اور انسان ایک تبدیلی اپنے اندر محسوس کرتا ہے لیکن ایسی حالت میں بھی اسے ہرگز مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ کہ اب یہ طاقت مجھ میں مستقل طور پر پیدا ہو گئی ہے اور کبھی ضائع نہ ہوگی۔ .....

انسان کو جو روشنی عطا ہوتی ہے وہ بھی مستقل نہیں ہوتی۔ بلکہ عارضی ہوتی ہے اور ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے استغفار کی ضرورت ہے۔ انبیاء جو استغفار کرتے ہیں۔ اس کی بھی یہی وجہ ہوتی ہے۔ کہ وہ ان باتوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اور ان کو خطرہ لگا رہتا ہے کہ نور کی جو چادر ہمیں عطا کی گئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چھن جاوے۔۔۔ کوئی نبی جس قدر زیادہ استغفار کرنے والا ثابت ہوگا۔ اُسی قدر اُس کا درجہ بڑا اور بلند ہوگا۔ لیکن جس کو یہ حالت حاصل نہیں۔ تو وہ خطرہ میں ہے۔ اور ممکن ہے کہ کسی وقت اُس سے وہ چادر حفاظت کی چھین لی جاوے۔ کیونکہ نبیوں کو بھی وہ مستعار طور پر ملتی ہے۔ اور وہ پھر استغفار کے ذریعہ اُسے مدامی طور پر رکھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اصل انوار تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اور نبی ہو یا کوئی اور سب خدا سے انھیں حاصل کرتے ہیں۔ سچے نبی کی یہی علامت ہے۔ کہ وہ اس روشنی کی حفاظت بذریعہ استغفار کے کرے۔ استغفار کے یہی معنے ہوتے ہیں۔ کہ موجودہ نور جو خدا سے حاصل ہوا ہے وہ محفوظ رہے۔ اور زیادہ اور ملے۔ اسی کی تحصیل کے لیے پنجگاہ نماز بھی ہے تاکہ ہر روز دل کھول کر اُس روشنی کو خدا سے مانگ لیوے۔ (البدر جلد ۳ ع۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء ص۳)

یہ جو فرمایا کہ وہ (بہشتی) ہمیشہ اپنی مغفرت چاہیں گے اس جگہ سوال یہ ہے کہ جب بہشت میں داخل ہو گئے تو پھر مغفرت میں کیا کسر رہ گئی۔ اور جب گناہ بخشے گئے تو پھر استغفار کی طرف کون سی حاجت رہی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کے اصل معنی یہ ہیں نا ملائم اور ناقص حالت کو نیچے دبانا اور ڈھانکنا سو بہشتی اس بات کی خواہش کریں گے کہ کمال تام حاصل کریں اور سراسر نور میں غرق ہو جائیں وہ دوسری حالت کو دیکھ کر پہلی حالت کو ناقص پائیں گے پس چاہیں گے کہ پہلی حالت نیچے دبائی جائے پھر تیسرے کمال کو دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ دوسرے کمال کی نسبت مغفرت ہو یعنی وہ حالت ناقصہ نیچے دبائی جائے اور مخفی کی جائے اسی طرح غیر متناہی مغفرت کے خواہشمند رہیں گے یہ وہی لفظ مغفرت اور استغفار کا ہے جو بعض نادان بطور اعتراض ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیش کیا کرتے ہیں سو ناظرین نے اس جگہ سے سمجھ لیا ہوگا کہ یہی خواہش استغفار فخر انسان ہے جو شخص کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا اور پھر ہمیشہ کے لیے استغفار اپنی عادت نہیں پکڑتا وہ کیڑا ہے نہ انسان اور اندھا ہے نہ سوجاکھا اور ناپاک ہے نہ طیب۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۸۳)

خوب یاد رکھو کہ دل اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اس کا فضل نہ ہو تو دوسرے دن جا کر عیسائی ہو جاوے۔ یا کسی اور بے دینی میں مبتلا ہو جاوے۔ اس لیے ہر وقت اس کے فضل کے لیے دعا کرتے رہو۔ اور اس کی استعانت چاہو تاکہ صراطِ مستقیم پر تمھیں قائم رکھے۔ جو شخص خدا تعالیٰ سے بے نیاز ہوتا ہے وہ شیطان ہو جاتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان استغفار کرتا رہے تاکہ وہ زہر اور جوش پیدا نہ ہو جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ ع۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء ص۱۰)

توبہ استغفار کرتے رہو۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو استغفار کرتا ہے۔ اسے رزق میں کشایش دیتا ہے۔

(البدر جلد ۷ عث مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء صث)

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ یعنی اپنے اللہ جل شانہٗ کو ایسے دلی جوش محبت سے یاد کرو جیسا باپوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ مخدوم اُس وقت باپ سے مشابہ ہو جاتا ہے جب محبت میں غایت درجہ شدت واقعہ ہو جاتی ہے اور حُبّ جو ہر یک کدورت اور غرض سے مُصفّا ہے دل کے تمام پردے چیر کر دل کی جڑھ میں اس طرح سے بیٹھ جاتی ہے کہ گویا اُس کی جُزء ہے تب جس قدر جوش محبت اور پیوند شدید اپنے محبوب سے ہے وہ سب حقیقت میں مادر زاد معلوم ہوتا ہے اور ایسا طبیعت سے ہمرنگ اور اُس کی جُزء ہو جاتا ہے کہ سعی اور کوشش کا ذریعہ ہرگز یاد نہیں رہتا اور جیسے بیٹے کو اپنے باپ کا وجود تصوّر کرنے سے ایک روحانی نسبت محسوس ہوتی ہے ایسا ہی اس کو بھی ہر وقت باطنی طور پر اُس نسبت کا احساس ہوتا رہتا ہے اور جیسے بیٹا اپنے باپ کا حُلیہ اور نقوش نمایاں طور پر اپنے چہرہ پر ظاہر رکھتا ہے اور اُس کی رفتار اور کردار اور خو اور بُو بصفائی تمام اُس میں پائی جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس یہی حال اس میں ہوتا ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صـ۲۱۱ـ۲۱۲ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسے تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اگر مجازی طور پر ان الفاظ کا بولنا منہیات شرع سے ہوتا تو خدا تعالیٰ ایسی طرز سے اپنی کلام کو منزہ رکھتا جس سے اس اطلاق کا جواز مستنبط ہو سکتا ہے۔

(آئینہ کمالات اسلام صـ۶۵)

ایک دفعہ مجھے خدا نے مخاطب کرکے فرمایا۔ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ اَوْلَادِیْ۔ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةٍ لَّا يَعْلَمُهَا الْخَلْقُ۔ یعنی تُو مجھ سے بمنزلہ اولاد کے ہے اور تجھے مجھ سے وہ نسبت ہے جس کو دنیا نہیں جانتی۔ تب مولویوں نے اپنے کپڑے پھاڑے کہ اب کفر میں کیا شک رہا اور اس آیت کو بھول گئے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ۔

(چشمہ مسیحی صـ۵۵ حاشیہ)

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔

یعنی خدا کو ایسا یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے زیادہ اور سخت درجہ کی محبّت کے ساتھ یاد کرو۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۴۱)

تم خدا کو ایسا یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ (نسیم دعوت ص۲۲)

خدا کو ایسا یاد کرو جیسا کہ اپنے باپوں کو بلکہ اس سے بہت زیادہ۔ (نور القرآن نمبر۲ بار دوم ص۴۱)

یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جس طرح پر تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اس جگہ دو رمز ہیں ایک تو ذکر اللہ کو ذکر اباء سے مشابہت دی ہے اس میں یہ سرّ ہے کہ اباء کی محبت ذاتی اور فطرتی محبت ہوتی ہے۔ دیکھو بچہ کو جب ماں مارتی ہے وہ اس وقت بھی ماں ماں ہی پکارتا ہے گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی تعلیم دیتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے فطری محبّت کا تعلق پیدا کرے اس محبّت کے بعد اطاعت امر اللہ کی خود بخود پیدا ہوتی ہے یہی وہ اصلی مقام معرفت کا ہے جہاں انسان کو پہنچنا چاہیے یعنی اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے فطری اور ذاتی محبت پیدا ہو جاوے۔ (لیکچر لدھیانہ بحوالہ الحکم جلد۱۰ ص۳۷ مورخہ ۲۴ / اکتوبر ۱۹۰۶ء ص۳)

تم محبّت سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ خدا کو یاد کرو۔ جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ (یادداشتیں مندرجہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱ نیز پیغام صلح ص۴۷-۴۸)

پس تم خدا کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ پس اس جگہ خدا تعالیٰ کو باپ کے ساتھ تشبیہ دی اور استعارہ بھی صرف تشبیہ کی حد تک ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص۶۴)

ہر ایک ابن آدم اپنے اندر ایک حیض کی ناپاکی رکھتا ہے مگر وہ جو سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے وہی حیض اس کا ایک پاک لڑکے کا جسم طیار کر دیتا ہے اسی بنا پر خدا میں فانی ہونے والے اطفال اللہ کہلاتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ وہ خدا کے درحقیقت بیٹے ہیں کیونکہ یہ تو کلمۂ کفر ہے اور خدا بیٹوں سے پاک ہے بلکہ اس لیے استعارہ کے رنگ میں وہ خدا کے بیٹے کہلاتے ہیں کہ وہ بچہ کی طرح دلی جوش سے خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں اسی مرتبہ کی طرف قرآن شریف میں اشارہ کر کے فرمایا گیا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا یعنی خدا کو ایسی محبت اور دلی جوش سے یاد کرو جیسا کہ بچہ اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ اسی بنا پر ہر ایک قوم کی کتابوں میں اَب یا پتا کے نام سے خدا کو پکارا گیا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کو استعارہ کے رنگ میں ماں سے بھی ایک مشابہت ہے اور وہ یہ کہ جیسے ماں اپنے پیٹ میں اپنے بچہ کی پرورش کرتی ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کے پیارے بندے خدا کی محبت کی گود میں پرورش پاتے ہیں اور ایک گندی فطرت سے ایک پاک جسم انھیں ملتا ہے سو اولیاء کو جو صوفی اطفالِ حق کہتے ہیں یہ صرف ایک استعارہ ہے ورنہ خدا اطفال سے پاک اور لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۱۴۴)

خدا کے ساتھ محبت کرنے سے کیا مراد ہے؟ یہی کہ اپنے والدین۔ جورو۔ اپنی اولاد۔ اپنے نفس غرض ہر چیز

پر اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقدم کر لیا جاوے چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسا یاد کرو کہ جیسا تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ اور سخت درجہ کی محبت کے ساتھ یاد کرو۔ اب یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تعلیم نہیں دی کہ تم خدا کو باپ کہا کرو بلکہ اس لیے یہ سکھایا ہے کہ نصاریٰ کی طرح دھوکہ نہ لگے اور خدا کو باپ کر کے پکارا نہ جائے اور اگر کوئی کہے کہ پھر باپ سے کم درجہ کی محبت ہوئی تو اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا رکھ دیا اور اگر اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا نہ ہوتا تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر اب اس نے اس کو حل کر دیا۔ جو باپ کہتے ہیں وہ کیسے گرے کہ ایک عاجز کو خدا کہہ اٹھے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ رَاَیْتُ رَبِّیْ عَلٰی صُوْرَۃِ اَبِیْ یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے باپ کی شکل پر دیکھا۔ میں نے بھی اپنے والد صاحب کی شکل پر اللہ تعالیٰ کو دیکھا ان کی شکل بڑی بارعب تھی انھوں نے ریاست کا زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے بڑے بلند ہمت اور عالی حوصلہ تھے غرض میں نے دیکھا کہ وہ ایک عظیم الشان تخت پر بیٹھے ہیں اور میرے دل میں ڈالا گیا کہ خدا تعالیٰ ہے۔ اس میں سر یہ ہوتا ہے کہ باپ چونکہ شفقت اور رحمت میں بہت بڑا ہوتا ہے اور قرب اور تعلق شدید رکھتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا باپ کی شکل میں نظر آنا اس کی عنایت تعلق اور شدت محبت کو ظاہر کرتا ہے اس لیے قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اور میرے الہامات میں یہ بھی ہے اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ اَوْلَادِیْ یہ قرآن شریف کی اسی آیت کے مفہوم اور مصداق پر ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝

مومن کے تعلقات دنیا کے ساتھ جس قدر وسیع ہوں وہ اس کے مراتب عالیہ کا موجب ہوتے ہیں کیونکہ اس کے نصب العین دین ہوتا ہے اور دنیا اس کا مال و جاہ دین کا خادم ہوتا ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ دنیا مقصود بالذات نہ ہو بلکہ حصول دنیا میں اصل غرض دین ہو اور ایسے طور پر دنیا کو حاصل کیا جاوے کہ وہ دین کی خادم ہو۔ جیسے انسان کسی جگہ سے دوسری جگہ جانے کے واسطے سفر کے لیے سواری یا اور زاد راہ کو ساتھ لیتا ہے تو اس کی اصل غرض منزل مقصود پر پہنچنا ہوتا ہے نہ خود سواری اور راستہ کی ضروریات۔ اسی طرح پر انسان دنیا کو حاصل کرے مگر دین کا خادم سمجھ کر۔

اللہ تعالیٰ نے جو یہ دعا تعلیم فرمائی ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً اس میں بھی دنیا کو مقدم کیا ہے لیکن کس دنیا کو ؟ حسنۃ الدنیا کو جو آخرت میں حسنات کی موجب ہو جاوے اس دعا کی تعلیم سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ مومن کو دنیا کے حصول میں حسنات الآخرۃ کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور ساتھ ہی حسنۃ الدنیا کے لفظ میں اُن تمام بہترین ذرائع حصول دنیا کا ذکر آگیا ہے جو کہ ایک مومن مسلمان کو حصول دنیا کے لیے اختیار کرنی چاہیئں دنیا کو ہر ایسے طریق سے حاصل کرو۔ جس کے اختیار کرنے سے بھلائی اور خوبی ہی ہو۔ نہ وہ طریق جو کسی دوسرے بنی نوع انسان کی تکلیف رسانی کا موجب ہو نہ ہم جنسوں میں کسی عار و شرم کا باعث۔ ایسی دنیا بیشک حسنۃ الآخرۃ کا موجب ہوگی پس یاد رکھو کہ جو شخص خدا کے لیے زندگی وقف کر دیتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ بے دست و پا ہو جاتا ہے ؛ نہیں ہرگز نہیں بلکہ دین اور الٰہی وقف انسان کو ہوشیار اور چابکدست بنا دیتا ہے سستی اور کسل اس کے پاس نہیں آتا حدیث میں عمار بن خزیمہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے میرے باپ کو فرمایا کہ تجھے کس چیز نے اپنی زمین میں درخت لگانے سے منع کیا تو میرے باپ نے جواب دیا کہ میں بڈھا ہوں کل مر جاؤں گا پس اُس کو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تجھ پر ضرور ہے کہ درخت لگاوے پھر میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ خود میرے باپ کے ساتھ مل کر ہماری زمین میں درخت لگاتے تھے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ عجز اور کسل سے پناہ مانگا کرتے تھے میں پھر کہتا ہوں کہ سُست نہ بنو اللہ تعالیٰ حصول دنیا سے منع نہیں فرماتا بلکہ حَسَنَۃُ الدنیا کی دعا تعلیم فرماتا ہے۔

(الحکم جلد ۴ ع ۲۹ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳-۴)

انسان اپنے نفس کی خوشحالی کے واسطے دو چیزوں کا محتاج ہے۔ ایک دنیا کی مختصر زندگی اور اس میں جو کچھ مصائب۔ شدائد۔ ابتلا وغیرہ اسے پیش آتے ہیں۔ ان سے امن میں رہے۔ دوسرے فسق و فجور اور روحانی بیماریاں جو اسے خدا سے دور کرتی ہیں۔ ان سے نجات پاوے تو دنیا کا حسنہ یہ ہے کہ کیا جسمانی اور کیا روحانی طور پر یہ ہر ایک بلا اور گندی زندگی اور ذلت سے محفوظ رہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا[1] ایک ناخن ہی میں درد ہو۔ تو زندگی بیزار ہو جاتی ہے۔ میری زبان کے نیچے ذرا درد ہے۔ اس سے سخت تکلیف ہے۔ اسی طرح جب انسان کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ جیسے بازاری عورتوں کا گروہ۔ کہ ان کی زندگی کیسے ظلمت سے بھری ہوئی اور بہائم کی طرح ہے۔ کہ خدا اور آخرت کی کوئی خبر نہیں۔ تو دنیا کا حسنہ یہی ہے کہ خدا ہر ایک پہلو سے خواہ وہ دنیا کا ہو خواہ آخرت کا ہر ایک بلا سے محفوظ رکھے۔ اور فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً میں جو آخرت کا پہلو ہے وہ بھی دنیا کی حسنہ کا ثمرہ ہے اگر دنیا کا حسنہ انسان کو مل جاوے تو وہ فال نیک آخرت کے واسطے ہے۔ یہ غلط ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ دنیا کا حسنہ کیا مانگنا ہے آخرت کی بھلائی ہی مانگو۔ صحت جسمانی وغیرہ ایسے امور ہیں جس سے انسان کو آرام ملتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ آخرت کے لیے کچھ کر سکتا ہے اور اسی لیے ہی دنیا کو آخرت کا مزرعہ کہتے ہیں اور درحقیقت جسے خدا دنیا میں صحت۔ عزت۔ اولاد۔ اور عافیت

---

[1] النساء : ۲۹

دیوے اور عمدہ عمدہ اعمال صالح اس کے ہوویں تو امید ہوتی ہے کہ اُس کی آخرت بھی اچھی ہوگی۔

(البدر جلد اول ۱۲ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

توبہ انسان کے واسطے کوئی زائد یا بے فائدہ چیز نہیں ہے۔ اور اس کا اثر صرف قیامت پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس سے انسان کی دنیا و دین دونوں سنور جاتے ہیں۔ اور اسے اس جہان میں اور آنے والے جہان میں دونوں میں آرام اور سچی خوشحالی نصیب ہوتی ہے دیکھو قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اے ہمارے رب ہمیں اس دنیا میں بھی آرام و آسایش کے سامان عطا فرما۔ اور آنے والے جہان میں بھی آرام اور راحت عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ دیکھو درحقیقت رَبَّنَا کے لفظ میں توبہ ہی کی طرف ایک باریک اشارہ ہے کیونکہ رَبَّنَا کا لفظ چاہتا ہے کہ وہ بعض اور ربّوں کو جو اس نے پہلے بنائے ہوئے تھے اُن سے بیزار ہو کر اس رب کی طرف آیا ہے۔ اور یہ لفظ حقیقی درد اور گداز کے سوا انسان کے دل سے نکل ہی نہیں سکتا۔ ربّ کہتے ہیں بتدریج کمال کو پہنچانے والے اور پرورش کرنے والے کو۔ اصل میں انسان نے اپنے بہت سے ارباب بنائے ہوئے ہیں۔ اپنے حیلوں اور دغا بازیوں پر اسے پورا بھروسہ ہوتا ہے تو وہی اس کے رب ہیں۔ اگر اسے اپنے علم کا یا قوت بازو کا گھمنڈ ہے تو وہی اُس کے ربّ ہیں۔ اگر اسے اپنے حُسن یا مال یا دولت پر فخر ہے تو وہی اُس کا رب ہے۔ غرض اس طرح کے ہزاروں اسباب اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ جب تک اُن سب کو ترک کر کے اُن سے بیزار ہو کے اس واحد لاشریک سچے اور حقیقی رب کے آگے سر نیاز نہ جھکائے اور رَبَّنَا کی پُردرد اور دل کو پگھلانے والی آوازوں سے اُس کے آستانہ پر نہ گرے تب تک وہ حقیقی رب کو نہیں سمجھا۔ پس جب ایسی دلسوزی اور جانگدازی سے اُس کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار کر کے توبہ کرتا اور اُسے مخاطب کرتا ہے کہ رَبَّنَا یعنی اصلی اور حقیقی رب تو تو ہی تھا مگر ہم اپنی غلطی سے دوسری جگہ بھٹکتے پھرتے رہے اب میں نے اُن جھوٹے بتوں اور باطل معبودوں کو ترک کر دیا ہے اور صدق دل سے تیری ربوبیت کا اقرار کرتا ہوں تیرے آستانہ پر آتا ہوں۔

غرض بجز اس کے خدا کو اپنا رب بنانا مشکل ہے۔ جب تک انسان کے دل سے دوسرے ربّ اور اُن کی قدر و منزلت و عظمت و وقار نکل نہ جاوے تب تک حقیقی رب اور اُس کی ربوبیت کا ٹھیکہ نہیں اُٹھاتا۔

بعض لوگوں نے جھوٹ ہی کو اپنا رب بنایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہمارا جھوٹ کے بدون گزارا ہی مشکل ہے۔ بعض چوری و رہزنی اور فریب دہی ہی کو اپنا رب بنائے ہوئے ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ اس راہ کے سوا اُن کے واسطے کوئی رزق کا راہ ہی نہیں۔ سو ان کے ارباب وہ چیزیں ہیں۔ دیکھو ایک چور جس کے پاس سارے نقب زنی کے ہتھیار موجود ہیں اور رات کا موقع بھی اس کے مفید مطلب ہے اور کوئی چوکیدار وغیرہ بھی نہیں جاگتا ہے تو ایسی حالت میں وہ چوری کے سوا کسی اور راہ کو بھی جانتا ہے جس سے اُس کا رزق آ سکتا ہے۔ وہ اپنے ہتھیاروں کو ہی اپنا

معبود جانتا ہے۔ غرض ایسے لوگ جن کو اپنی ہی حیلہ بازیوں پر اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے اُن کو خدا سے استعانت اور دعا کرنے کی کیا حاجت۔ دعا کی حاجت تو اُسی کو ہوتی ہے جس کے سارے راہ بند ہوں اور کوئی راہ سوائے اُس در کے نہ ہو اسی کے دل سے دعا نکلتی ہے۔ غرض رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا۔ الخ۔ ایسی دعا کرنا صرف اُنھیں لوگوں کا کام ہے جو خدا ہی کو اپنا رب جان چکے ہیں۔ اور اُن کو یقین ہے کہ ان کے رب کے سامنے اور سارے ارباب باطلہ ہیچ ہیں۔

آگ سے مراد صرف وہی آگ نہیں جو قیامت کو ہوگی۔ بلکہ دُنیا میں بھی جو شخص ایک لمبی عمر پاتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے کہ دنیا میں بھی ہزاروں طرح کی آگ ہیں۔ تجربہ کار جانتے ہیں کہ قسم قسم کی آگ دنیا میں موجود ہے۔ طرح طرح کے عذاب۔ خوف۔ حزن۔ فقر و فاقے۔ امراض۔ ناکامیاں۔ ذلت و ادبار کے اندیشے ہزاروں قسم کے دکھ۔ اولاد۔ بیوی وغیرہ کے متعلق تکالیف اور رشتہ داروں کے ساتھ معاملات میں اُلجھن۔ غرض یہ سب آگ ہیں۔ تو مومن دعا کرتا ہے کہ ساری قسم کی آگوں سے ہمیں بچا۔ جب ہم نے تیرا دامن پکڑا ہے تو ان سب عوارض سے جو انسانی زندگی کو تلخ کرنے والے ہیں اور انسان کے لیے بمنزلہ آگ ہیں بچائے رکھ۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۝

یعنی انسانوں میں سے وہ اعلیٰ درجہ کے انسان ہیں جو خدا کی رضا میں کھوئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی جان بیچتے ہیں اور خدا کی مرضی کو مول لیتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمت ہے ایسا ہی وہ شخص جو روحانی حالت کے مرتبہ تک پہنچ گیا ہے خدا کی راہ میں فدا ہو جاتا ہے خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ تمام دکھوں سے وہ شخص نجات پاتا ہے جو میری راہ میں اور میری رضا کی راہ میں جان کو بیچ دیتا ہے اور جانفشانی کے ساتھ اپنی اس حالت کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ خدا کا ہے اور اپنے تمام وجود کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو طاعت خالق اور خدمت مخلوق کے لیے بنائی گئی ہے اور پھر حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق ہیں ایسے ذوق وشوق وحضور دل سے بجالاتا ہے کہ گویا وہ اپنی فرماں برداری کے آئینہ میں اپنے محبوب حقیقی کو دیکھ رہا ہے اور ارادہ اس کا خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہم رنگ ہو جاتا ہے اور تمام لذت اس کی فرماں برداری میں ٹھہر جاتی ہے اور تمام اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ اور احتظاظ کی کشش سے صادر ہونے لگتے ہیں یہی وہ نقد بہشت ہے

جو روحانی انسان کو ملتا ہے اور وہ بہشت جو آیندہ ملے گا وہ درحقیقت اسی کی اظلال و آثار ہے جس کو دوسرے عالم میں قدرت خداوندی جسمانی طور پر متمثل کر کے دکھلائے گی۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۲-۱۳۱)

یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا کی مرضی خرید لیتا ہے وہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمت خاص کے مورد ہیں غرض وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے اس کی یہی روح ہے جو بیان کی گئی جس کو سمجھنا ہو سمجھے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۸۵)

بعض ایسے ہیں کہ اپنے نفسوں کو خدا کی راہ میں بیچ دیتے ہیں تا کسی طرح وہ راضی ہو۔
(یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱ نیز پیغام صلح صفحہ ۴۸)

بعض مومن لوگوں میں سے وہ بھی ہیں کہ اپنی جانیں رضاء الٰہی کے عوض میں بیچ دیتے ہیں اور خدا ایسوں ہی پر مہربان ہے۔ (نور القرآن دوم صفحہ ۴۴)

اللہ کے بندے جو دین کو دنیا پر مقدم کر لیتے ہیں اُن کے ساتھ وہ رأفت اور محبت کرتا ہے چنانچہ خود فرماتا ہے وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ یہ وہی لوگ ہیں، جو اپنی زندگی کو جو اللہ تعالےٰ نے ان کو دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہی راہ میں وقف کر دیتے ہیں۔ اور اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا۔ اپنے مال کو اس کی راہ میں صرف کرنا اس کا فضل اور اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ مگر جو لوگ دنیا کی املاک و جائیداد کو اپنا مقصود بالذات بنا لیتے ہیں وہ ایک خوابیدہ نظر سے دین کو دیکھتے ہیں، مگر حقیقی مومن اور صادق مسلمان کا یہ کام نہیں ہے۔ سچا اسلام یہی ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں اپنی ساری طاقتوں اور قوتوں کو مادام الحیات وقف کر دے۔ تا کہ وہ حیاتِ طیبہ کا وارث ہو۔ (الحکم جلد ۴ ع ۲۹ مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

البقرۃ: ۲۰۹ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

اے ایمان والو! خدا کی راہ میں اپنی گردن ڈال دو اور شیطانی راہوں کو اختیار مت کرو کہ شیطان تمھارا دشمن ہے۔ اس جگہ شیطان سے مراد وہی لوگ ہیں جو بدی کی تعلیم دیتے ہیں۔
(یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱ نیز پیغام صلح صفحہ ۴۸)

البقرۃ: ۲۱۱ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

وَقُضِیَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ ع

یعنی اُس دن بادلوں میں تیرا خدا آئے گا یعنی انسانی مظہر کے ذریعہ سے اپنا جلال ظاہر کرے گا اور اپنا چہرہ دکھلائے گا کفر اور شرک نے بہت غلبہ کیا اور وہ خاموش رہا اور ایک مخفی خزانہ کی طرح ہوگیا اب چونکہ شرک اور انسان پرستی کا غلبہ کمال تک پہنچ گیا اور اسلام اُس کے پاؤں کے نیچے کچلا گیا اس لیے خدا فرماتا ہے کہ میں زمین پر نازل ہوں گا اور وہ قہری نشان دکھلاؤں گا کہ جب سے نسل آدم پیدا ہوئی ہے کبھی نہیں دکھلائے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ مدافعت بقدر حملۂ دشمن ہوتی ہے پس جس قدر انسان پرستوں کو شرک پر غلو ہے وہ غلو بھی انتہا تک پہنچ گیا ہے اس لیے اب خدا آپ لڑے گا وہ انسانوں کو کوئی تلوار نہیں دے گا اور نہ کوئی جہاد ہوگا ہاں اپنا ہاتھ دکھلائے گا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۴)

(البقرۃ) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاْتِکُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ؕ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ○

لوگوں کا یہ خیال خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جاکر بلا مجاہدہ و تزکیہ ایک دم میں صدیقین میں داخل ہوگیا۔ قرآن کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر راضی ہو۔ جب تک نبیوں کی طرح تم پر مصائب و زلازل نہ آویں۔ جنھوں نے بعض وقت تنگ آکر یہ بھی کہہ دیا۔ حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ○ (س ۲) اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے۔ پھر خدا نے اُن کو قبول کیا۔
(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۳)

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ...... یاد رکھو کہ خدا کی مدد بہت ہی قریب ہے۔
(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۳۴ حاشیہ نمبر ۱۱)

خدا کی رحمت اس ابتلاء کے دنوں کے بعد جلد آئیگی۔ تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ۵۴
(مجموعہ اشتہارات)

(اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ) مسلمانوں کا بہشت صرف جسمانی بہشت نہیں بلکہ دیدارِ الٰہی کا گھر ہے۔ اور دونوں قسم کی سعادتوں روحانی اور جسمانی کی جگہ ہے۔ ہاں عیسائی صاحبوں کا دوزخ محض جسمانی ہے۔
(حجۃ الاسلام صفحہ ۶ طبع دسمبر ۱۹۲۶ء)

خدا تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ بہشت کی نعمتیں فوق الفہم ہیں۔ تمہیں اُن کا حقیقی علم نہیں دیا گیا اور تم وہ نعمتیں پاؤ گے جو اب تم سے پوشیدہ ہیں جو نہ دنیا میں کسی نے دیکھیں اور نہ سنیں اور نہ دلوں میں گذریں وہ تمام مخفی امور ہیں اُسی وقت سمجھ میں آئیں گی جب وارد ہوں گی جو کچھ قرآن اور حدیث میں وعدے ہیں وہ سب مثال کے طور پر بیان کیا ہے اور ساتھ اُس کے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ امور مخفی ہیں جن کی کسی کو اطلاع نہیں پس اگر وہ لذات اسی قدر ہوتیں جیسے اس دنیا میں شربت یا شراب پینے کی لذت یا عورت کے جماع کی لذت ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ یہ نہ کہتا کہ وہ ایسے امور ہیں کہ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے اور نہ کسی کان نے سنے اور نہ وہ کبھی کسی کے دل میں گذرے پس ہم مسلمان لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ بہشت جو جسم اور روح کے لیے دارالجزا ہے، وہ ایک ادھورا اور ناقص دارالجزا نہیں بلکہ اُس میں جسم اور جان دونوں کو اپنی اپنی حالت کے موافق جزا ملے گی جیسا کہ جہنم میں اپنی اپنی حالت کے موافق دونوں کو سزا دی جائے گی اور اس کی اصل تفصیلات ہم خدا کے حوالے کرتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ جزا سزا جسمانی روحانی دونوں طور پر ہوں گی اور یہی وہ عقیدہ ہے جو عقل اور انصاف کے موافق ہے اور یہ نہایت شرارت اور خباثت اور حرامزدگی ہے کہ قرآن پر یہ طعن وارد کیا جائے کہ وہ صرف جسمانی بہشت کا وعدہ کرتا ہے قرآن تو صاف کہتا ہے کہ ہر یک جو بہشت میں داخل ہوگا وہ جسمانی روحانی دونوں قسم کی جزا پائے گا اور جیسا کہ نعمت جسمانی اس کو ملے گی ایسا ہی وہ دیدار الٰہی سے لذت اٹھائے گا اور یہی اعلیٰ لذت بہشت میں ہے معارف کی لذت بھی ہوگی اور طرح طرح کے انوار کی لذت بھی ہوگی اور عبادت کی لذت بھی ہوگی مگر اس کے ساتھ جسم بھی اپنی سعادت تامہ کو پہنچے گا۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۳۰-۳۱)

(۲۱۷) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا ۔۔۔۔۔۔ (الخ) یعنی یہ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو بری سمجھو اور وہ اصل میں تمہارے

لیے اچھی ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو دوست رکھو اور وہ اصل میں تمھارے لیے بُری ہو اور خدا چیزوں کی اصل حقیقت کو جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۶۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

دعا جب قبول ہونے والی ہوتی ہے۔ تو اللہ اس کے لیے دل میں ایک سچا جوش اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات اللہ تعالےٰ خود ہی ایک دعا سکھاتا ہے۔ اور الہامی طور پر اس کا پیرایہ بتا دیتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ[1]۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے راستباز بندوں کو قبول ہونے والی دعائیں خود الہاماً سکھا دیتا ہے۔ بعض وقت ایسی دعا میں ایسا حصّہ بھی ہوتا ہے جس کو دعا کرنے والا ناپسند کرتا ہے مگر وہ قبول ہو جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کے مصداق ہے عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔

(الحکم جلد ۶ عدد ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو اور وہ اچھی نہیں ہوتی ہیں اور بہت سی ایسی ہوتی ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ درحقیقت تمھارے لیے مفید ہوتی ہیں۔ (الحکم جلد ۸ عدد ۱۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

۲۱۸ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

یعنی شہر حرام میں قتل تو گناہ ہے لیکن خدا تعالیٰ کی راہ سے روکنا اور کفر اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو مسجد حرام سے خارج کرنا یہ بہت بڑا گناہ ہے اور بغاوت کو پھیلانا یعنی امن کا خلل انداز ہونا قتل سے بڑھ کر ہے اور ہمیشہ قتل کے لیے یہ لوگ مقابلہ کریں گے تا اگر ممکن ہو تو تمھیں دین حق سے پھیر دیں۔
(جنگ مقدس۔ بحث ۲ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۸)

---

[1] البقرۃ : ۳۸

(البقرة: ۲۱۹) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خدا کے لیے وطنوں سے یا نفس پرستیوں سے جدائی اختیار کی اور خدا کی راہ میں کوشش کی وہ خدا کی رحیمیت کے اُمیدوار ہیں اور خدا غفور اور رحیم ہے یعنی اُس کا فیضانِ رحیمیت ضرور اُن لوگوں کے شامل حال ہوجاتا ہے کہ جو اُس کے مستحق ہیں کوئی ایسا نہیں جس نے اُس کو طلب کیا اور نہ پایا۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد ‌ ‌ ‌ اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۳۴۷-۳۴۸ حاشیہ نمبر ۱۱)

(البقرة: ۲۲۳) وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○

یعنی حیض کے دنوں میں عورتوں سے کنارہ کرو اور اُن کے نزدیک مت جاؤ یعنی صحبت کے ارادہ سے جب تک کہ وہ پاک ہولیں۔ اگر ایسی صفائی سے کنارہ کشی کا بیان وید میں بھی ہو تو کوئی صاحب پیش کریں لیکن ان آیات سے یہ مراد نہیں کہ خاوند کو بغیر ارادہ صحبت کے اپنی عورت کو ہاتھ لگانا بھی حرام ہے یہ تو حماقت اور بیوقوفی ہوگی کہ بات کو اس قدر دور کھینچا جائے کہ تمدن کی ضرورات میں بھی حرج واقع ہو اور عورت کو ایام حیض میں ایک ایسی زہر قاتل کی طرح سمجھا جائے جس کے چھونے سے فی الفور موت نتیجہ ہے اگر بغیر ارادہ صحبت عورت کو چھونا حرام ہوتا تو بیچاری عورتیں بڑی مصیبت میں پڑ جاتیں۔ بیمار ہوتیں تو کوئی نبض بھی دیکھ نہ سکتا، گرتیں تو کوئی ہاتھ سے اُٹھا نہ سکتا اگر کسی درد میں ہاتھ پیر دبانے کی محتاج ہوتیں تو کوئی دبا نہ سکتا اگر مرتیں تو کوئی دفن نہ

کر سکتا کیونکہ ایسی پلید ہوگئیں کہ اب ہاتھ لگانا ہی حرام ہے سو یہ سب نا فہموں کی جہالتیں ہیں اور سچ یہی ہے کہ خاوند کو ایام حیض میں صحبت حرام ہو جاتی ہے لیکن اپنی عورت سے محبت اور آثار محبت حرام نہیں ہوتے۔

(آریہ دھرم صفحہ ۴۳)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ یعنی خدا توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور اُن کو بھی دوست رکھتا ہے جو جسمانی طہارت کے پابند رہتے ہیں۔ سو توّابین کے لفظ سے خدا تعالیٰ نے باطنی طہارت اور پاکیزگی کی طرف توجہ دلائی اور متطہرین کے لفظ سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی ترغیب دی۔ اور اس آیت سے یہ مطلب نہیں کہ صرف ایسے شخص کو خدا تعالیٰ دوست رکھتا ہے کہ جو محض ظاہری پاکیزگی کا پابند ہو بلکہ توّابین کے لفظ کو ساتھ ملا کر بیان فرمایا تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا تعالیٰ کی اپنے بندوں کے لیے اکمل اور اتم محبّت جس سے قیامت میں نجات ہوگی اسی سے وابستہ ہے کہ انسان علاوہ ظاہری پاکیزگی کے خدا تعالیٰ کی طرف سچّا رجوع کرے۔ لیکن محض ظاہری پاکیزگی کی رعایت رکھنے والا دنیا میں اس رعایت کا فائدہ صرف اس قدر اٹھا سکتا ہے کہ بہت سے جسمانی امراض سے محفوظ رہے۔ اور اگرچہ وہ خدا تعالیٰ کی اعلیٰ درجہ کی محبت کا نتیجہ نہیں دیکھ سکتا مگر چونکہ اُس نے تھوڑا سا کام خدا تعالیٰ کی منشا کے موافق کیا ہے یعنی اپنے گھر اور بدن اور کپڑوں کو ناپاکیوں سے پاک رکھا ہے۔ اس لیے اس قدر نتیجہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ بعض جسمانی بلاؤں سے بچا لیا جائے۔ بجز اس صورت کے کہ وہ کثرت گناہوں کی وجہ سے سزا کے لائق ٹھہر گیا ہو۔ کیونکہ اس صورت میں اس کے لیے یہ حالت بھی خدا تعالیٰ میسّر نہیں کرے گا کہ وہ ظاہری پاکیزگی کو کماحقہ بجا لا کر اُس کے نتائج سے فائدہ اٹھا سکے۔ غرض بموجب وعدہ الٰہی کے محبت کے لفظ میں سے ایک خفیف اور ادنیٰ سے حصہ کا وارث وہ دشمن بھی اپنی دنیا کی زندگی میں ہو جاتا ہے جو ظاہری پاکیزگی کے لیے کوشش کرتا ہو جیسا کہ تجربہ کے رو سے یہ مشاہدہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے گھروں کو خوب صاف رکھتے ہیں اور اپنی بدرؤں کو گندہ نہیں ہونے دیتے اور اپنے کپڑوں کو دھوتے رہتے ہیں اور خلال کرتے اور مسواک کرتے اور بدن پاک رکھتے ہیں اور بدبوا اور عفونت سے پرہیز کرتے ہیں وہ اکثر خطرناک وبائی بیماریوں سے بچے رہتے ہیں۔ پس گویا وہ اس طرح پر يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ کے وعدہ سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن جو لوگ طہارت ظاہری کی پرواہ نہیں رکھتے آخر کبھی نہ کبھی وہ پیچ میں پھنس جاتے ہیں اور خطرناک بیماریاں اُن کو آپکڑتی ہیں۔

اگر قرآن کو غور سے پڑھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے بے انتہا رحم نے یہی چاہا ہے کہ انسان باطنی پاکیزگی اختیار کر کے روحانی عذاب سے نجات پاوے اور ظاہری پاکیزگی اختیار کر کے دنیا کے جہنم سے بچا رہے جو طرح طرح کی بیماریوں اور وباؤں کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ کو قرآن شریف میں اوّل سے آخر تک

بیان فرمایا گیا ہے جیسا کہ مثلاً یہی آیت اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔ صاف بتلا رہی ہے کہ توابین سے مراد وہ لوگ ہیں جو باطنی پاکیزگی کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ اور متطہرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ظاہری اور جسمانی پاکیزگی کے لیے جد و جہد کرتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دوسری جگہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا[1]۔ یعنی پاک چیزیں کھاؤ اور پاک عمل کرو۔ اس آیت میں حکم جسمانی صلاحیت کے انتظام کے لیے ہے جس کے لیے کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ کا ارشاد ہے اور دوسرا حکم روحانی صلاحیت کے انتظام کے لیے ہے جس کے لیے وَاعْمَلُوْا صَالِحًا کا ارشاد ہے اور ان دونوں کے مقابلہ سے ہمیں یہ دلیل ملتی ہے کہ بدکاروں کے لیے عالم آخرت کی سزا ضروری ہے۔ کیونکہ جب کہ ہم دنیا میں جسمانی پاکیزگی کے قواعد کو ترک کر کے فی الفور کسی بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ امر بھی یقینی ہے کہ اگر ہم روحانی پاکیزگی کے اصول کو ترک کریں گے تو اسی طرح موت کے بعد بھی کوئی عذاب مولم ضرور ہم پر وارد ہوگا جو وبا کی طرح ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوگا۔

(ایام الصلح ۹۹ تا ۱۰۱)

اسی طرح بیعت میں عظیم الشان بات توبہ ہے۔ جس کے معنے رجوع کے ہیں۔ توبہ اس حالت کا نام ہے کہ انسان اپنے معاصی سے جس سے اس کے تعلقات بڑھے ہوئے ہیں۔ اور اس نے اپنا وطن انھیں مقرر کر لیا ہوا ہے۔ گویا کہ گناہ میں اس نے بود و باش مقرر کر لی ہوئی ہے۔ تو توبہ کے معنے یہ ہیں۔ کہ اس وطن کو چھوڑنا اور رجوع کے معنے پاکیزگی کو اختیار کرنا۔ اب وطن کو چھوڑنا بڑا گراں گزرتا ہے۔ اور ہزاروں تکلیفیں ہوتی ہیں۔ ایک گھر جب انسان چھوڑتا ہے تو کس قدر اسے تکلیف ہوتی ہے اور وطن کو چھوڑنے میں تو اس کو سب یار دوست سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے۔ اور سب چیزوں کو مثل چارپائی فرش و ہمسائے و گلیاں کوچے بازار سب چھوڑ چھاڑ کر ایک نئے ملک میں جانا پڑتا ہے۔ یعنی اس وطن میں کبھی نہیں آنا۔ اس کا نام توبہ ہے۔ معصیت کے دوست اور ہوتے ہیں۔ اور تقویٰ کے دوست اور۔ اس تبدیلی کو صوفیاء نے موت کہا ہے۔ جو توبہ کرتا ہے اُسے بڑا حرج اٹھانا پڑتا ہے اور سچی توبہ کے وقت بڑے بڑے حرج اُس کے سامنے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ رحیم کریم ہے وہ جب تک اُس کل کا نعم البدل عطا نہ فرماوے نہیں مارتا۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ میں یہی اشارہ ہے کہ وہ توبہ کر کے غریب بیکس ہو جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اُسے محبت اور پیار کرتا ہے اور اُسے نیکوں کی جماعت میں داخل کرتا ہے۔

(البدر جلد ۱ عـ۵،۶ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صـ۳۶)

یعنی جو باطنی اور ظاہری پاکیزگی کے طالب ہیں میں اُن کو دوست رکھتا ہوں۔ ظاہری پاکیزگی باطنی طہارت کی ممد اور معاون ہے۔ اگر انسان اس کو چھوڑ دے اور پاخانہ پھر کر بھی طہارت نہ کرے تو اندرونی پاکیزگی پاس بھی نہ پھٹکے۔

---

[1] المؤمنون : ۵۲۔

پس یاد رکھو۔ کہ ظاہری پاکیزگی اندرونی طہارت کو مستلزم ہے۔ اس لیے لازم ہے۔ کہ کم از کم جمعہ کو غسل کرو۔ ہر نماز میں وضو کرو۔ جماعت کھڑی کرو۔ تو خوشبو لگالو۔ عیدین اور جمعہ میں خوشبو لگانے کا جو حکم ہے وہ اسی بنا پر قائم ہے اصل وجہ یہ ہے کہ اجتماع کے وقت عفونت کا اندیشہ ہے پس غسل کرنے اور صاف کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے سے سمیت اور عفونت سے روک ہو گی جیسا اللہ تعالیٰ نے زندگی میں یہ مقرر کیا ہے ویسا ہی قانون مرنے کے بعد بھی رکھا ہے۔ (رسالہ انداز ص۳ مطبوعہ ۱۹۲۶ء وطبع ۱۸۹۸ء ص۶۱)

بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور ان لوگوں سے جو پاکیزگی کے خواہاں ہیں پیار کرتا ہے اس آیت سے نہ صرف یہی پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی توبہ کے ساتھ حقیقی پاکیزگی اور طہارت شرط ہے۔ ہر قسم کی نجاست اور گندگی سے الگ ہونا ضروری ہے۔ ورنہ نری توبہ اور لفظ کے تکرار سے تو کچھ فائدہ نہیں ہے۔

(الحکم جلد ۸ عـ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء ص۱)

یاد رکھو کہ گناہ ایک زہر ہے اور ہلاکت ہے۔ مگر توبہ اور استغفار ایک تریاق ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو توبہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پاک ہو جاویں۔ (بدر جلد ۲ عـ۳۰ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۶ء ص۳)

اللہ تعالیٰ دعا کرنے والے کو ضائع نہیں کرتا۔ جب تضرع سے دعا کرتا ہے اور معصیت میں مبتلا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ یہ شخص بچایا جاوے اور وہ بچایا جاتا ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ۔ (الحکم جلد ۱۱ عـ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء ص۱۰-۱۱)

حقیقی توبہ انسان کو خدا تعالیٰ کا محبوب بنا دیتی ہے اور اس سے پاکیزگی اور طہارت کی توفیق ملتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور نیز اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو گناہوں کی کشش سے پاک ہونے والے ہیں۔ توبہ حقیقت میں ایک ایسی شے ہے کہ جب وہ اپنے حقیقی لوازمات کے ساتھ کی جاوے تو اس کے ساتھ ہی انسان کے اندر ایک پاکیزگی کا بیج بویا جاتا ہے جو اُس کو نیکیوں کا وارث بنا دیتا ہے۔ یہی باعث ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہوتا ہے کہ گویا اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یعنی توبہ سے پہلے کے گناہ اس کے معاف ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت سے پہلے جو کچھ بھی اس کے حالات تھے۔ اور جو بے جا حرکات اور بے اعتدالیاں اُس کے چال چلن میں پائی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو معاف کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد صلح باندھا جاتا ہے اور نیا حساب

شروع ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ عـ۳۸ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۳ء صـ۱)

یہ سچی بات ہے کہ توبہ اور استغفار سے گناہ بخشے جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ سچی توبہ کرنے والا معصوم کے رنگ میں ہوتا ہے۔ پچھلے گناہ تو معاف ہو جاتے ہیں پھر آیندہ کے لیے خدا سے معاملہ صاف کر لے۔ اس طرح پر خدا تعالیٰ کے اولیاء میں داخل ہو جائے گا اور پھر اُس پر کوئی خوف و حُزن نہ ہو گا۔ (الحکم جلد ۸ عـ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـ۵)

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے اور نیز اُن لوگوں سے پیار کرتا ہے کہ جو اس بات پر زور لگاتے ہیں کہ کسی طرح گناہ سے پاک ہو جائیں۔ (چشمہ معرفت صـ۱۶۱)

ایک تو تواب ہوتے ہیں اور ایک مطہر ہوتے ہیں۔ توّاب ان کو کہا جاتا ہے جو بکلی خدا کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور مطہّر وہ ہوتے ہیں۔ کہ وہ مجاہدات اور ریاضات کرتے رہتے ہیں اور ان کے دل میں ایک کیٹ سی لگی رہتی ہے کہ کسی طرح سے ان آلائشوں سے پاک ہو جاویں۔ اور نفس امارہ کے جذبات پر ہر طرح سے غالب آکر زکی النفس بن جاویں۔ (الحکم جلد ۱۲ عـ۴ مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۸ء صـ۲)

۲۲۴

نِسَآؤُکُمۡ حَرۡثٌ لَّکُمۡ ۪ فَاۡتُوۡا حَرۡثَکُمۡ اَنّٰی شِئۡتُمۡ ۫ وَقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ مُّلٰقُوۡہُ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝

اسلام نے نکاح کرنے سے علت غائی یہی رکھی ہے کہ تا انسان کو وجہ حلال سے نفسانی شہوات کا وہ علاج میسر آوے جو ابتدا سے خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں رکھا گیا ہے اور اس طرح اس کو عفت اور پرہیزگاری حاصل ہو کر ناجائز اور حرام شہوت رانیوں سے بچا رہے کیا جس نے اپنی پاک کلام میں فرمایا کہ نِسَآؤُکُمۡ حَرۡثٌ لَّکُمۡ یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں اُس کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ اس کی غرض صرف یہ تھی کہ تا لوگ شہوت رانی کریں اور کوئی مقصد نہ ہو کیا کھیتی سے صرف لہو ولعب ہی غرض ہوتی ہے یا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو بیج بویا گیا ہے اُس کو کامل طور پر حاصل کریں۔ پھر میں کہتا ہوں کہ کیا جس نے اپنی مقدس کلام میں فرمایا مُحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ [۱] یعنی تمہارے نکاح کا یہ مقصود ہونا چاہیے کہ تمہیں عفت اور پرہیزگاری حاصل ہو اور شہوت کے بد نتائج سے بچ جاؤ۔ یہ نہیں مقصود ہونا چاہیے کہ تم حیوانات کی طرح بغیر کسی پاک غرض کے شہوت کے بندے ہو کر اس کام میں مشغول ہو کیا اس حکیم خدا کی نسبت یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اُس نے اپنی تعلیم میں مسلمانوں کو صرف شہوت پرست بنانا چاہا اور یہ باتیں فقط قرآن شریف میں نہیں

---

[۱] النساء: ۲۵، المائدہ: ۶۔

بلکہ ہماری معتبر حدیث کی دو کتابیں بخاری اور مسلم میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی روایت ہے۔
(آریہ دھرم صفحہ ۳۹-۳۸)

تمہاری عورتیں تمہاری اولاد پیدا ہونے کے لیے ایک کھیتی ہیں۔ پس تم اپنی کھیتی کی طرف جس طور سے چاہو آؤ۔ صرف کھیتی ہونے کا لحاظ رکھو یعنی اس طور سے صحبت نہ کرو جو اولاد کی مانع ہو۔ بعض آدمی اسلام کے اوائل زمانہ میں صحبت کے وقت انزال کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور باہر انزال کر دیتے تھے اس آیت میں خدا نے اُن کو منع فرمایا اور عورتوں کا نام کھیتی رکھا یعنی ایسی زمین جس میں ہر قسم کا اناج اُگتا ہے پس اس آیت میں ظاہر فرمایا کہ چونکہ عورت درحقیقت کھیتی کی مانند ہے جس سے اناج کی طرح اولاد پیدا ہوتی ہے سو یہ جائز نہیں ہے کہ اُس کھیتی کو اولاد پیدا ہونے سے روکا جاوے ہاں اگر عورت بیمار ہو اور یقین ہو کہ حمل ہونے سے اُس کی موت کا خطرہ ہوگا ایسا ہی صحت نیت سے کوئی اور مانع ہو تو یہ صورتیں مستثنیٰ ہیں ورنہ عندالشرع ہرگز جائز نہیں کہ اولاد ہونے سے روکا جائے۔

غرض جبکہ خدا تعالیٰ نے عورت کا نام کھیتی رکھا تو ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اسی واسطے اُس کا نام کھیتی رکھا کہ اولاد پیدا ہونے کی جگہ اُس کو قرار دیا اور نکاح کے اغراض میں سے ایک یہ بھی غرض رکھی کہ تا اس نکاح سے خدا کے بندے پیدا ہوں جو اُس کو یاد کریں۔ دوسری غرض خدا تعالیٰ نے یہ بھی قرار دی ہے کہ تا مرد اپنی بیوی کے ذریعہ اور بیوی اپنے خاوند کے ذریعہ سے بدنظری اور بدعملی سے محفوظ رہے۔ تیسری غرض یہ بھی قرار دی ہے کہ تا باہم اُنس ہو کر تنہائی کے رنج سے محفوظ رہیں۔
(چشمۂ معرفت صفحہ ۲۸۰-۲۷۹)

۲۲۵ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝

قرآن شریف کی رُو سے لغو یا جھوٹی قسمیں کھانا منع ہے کیونکہ وہ خدا سے ٹھٹھا ہے اور گستاخی ہے اور ایسی قسمیں کھانا بھی منع ہے جو نیک کاموں سے محروم کرتی ہوں جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی تھی کہ میں آئندہ مسطح صحابی کو صدقہ خیرات نہیں دوں گا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا۔ یعنی ایسی قسمیں مت کھاؤ جو نیک کاموں سے باز رکھیں......

تفسیر مفتی ابو مسعود مفتی روم میں زیر آیت وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ لکھا ہے کہ عرضہ اس کو کہتے ہیں کہ جو چیز ایک بات کے کرنے سے عاجز اور مانع ہو جائے اور لکھا ہے کہ یہ آیت ابوبکر صدیق کے حق میں ہے

جب کہ انھوں نے قسم کھائی تھی کہ مسطح کو جو صحابی ہے بباعث شراکت اس کی حدیث افک میں کچھ خیرات نہیں دوں گا۔ پس خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ ایسی قسمیں مت کھاؤ جو تمھیں نیک کاموں اور اعمال صالحہ سے روک دیں نہ یہ کہ معاملہ متنازعہ جس سے طے ہو۔ (الحکم جلد ۸ ع۲۲ مورخہ ۱۰ ر جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

۲۲۶ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

انسان کے دل کے تخیلات جو بے اختیار اٹھتے رہتے ہیں اُس کو گنہگار نہیں کرتے بلکہ عنداللہ مجرم ٹھہر جانے کی تینؔ ہی قسم ہیں (۱) اول یہ کہ زبان پر ناپاک کلمے جو دین اور راستی اور انصاف کے برخلاف ہوں جاری ہوں (۲) دوسرے یہ کہ جوارح یعنی ظاہری اعضاسے نافرمانی کی حرکات صادر ہوں (۳) تیسرے یہ کہ دل جو نافرمانی پر عزیمت کرے یعنی پختہ ارادہ کرے کہ فلاں فعل بد ضرور کروں گا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ یعنی جن گناہوں کو دل اپنی عزیمت سے حاصل کرے اُن گناہوں کا مواخذہ ہوگا مگر مجرد خطرات پر مواخذہ نہیں ہوگا کہ وہ انسانی فطرت کے قبضہ میں نہیں ہیں خدائے رحیم ہمیں اُن خیالات پر نہیں پکڑتا جو ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔ ہاں اُس وقت پکڑتا ہے کہ جب ہم اُن خیالات کی زبان سے یا ہاتھ سے یا دل کی عزیمت سے پیروی کریں بلکہ بعض وقت ہم اُن خیالات سے ثواب حاصل کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے صرف قرآن کریم میں ہاتھ پیر کے گناہوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ کانؔ اور آنکھؔ اور دلؔ کے گناہوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ وہ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا[1] یعنی کان اور آنکھ اور دل جو ہیں ان سب سے باز پرس کی جائے گی اب دیکھو جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کان اور آنکھ کے گناہ کا ذکر کیا ایسا ہی دل کے گناہ کا بھی ذکر کیا مگر دل کا گناہ خطرات اور خیالات نہیں ہیں کیونکہ وہ تو دل کے بس میں نہیں ہیں بلکہ دل کا گناہ پختہ ارادہ کر لینا ہے صرف ایسے خیالات جو انسان کے اپنے اختیار میں نہیں گناہ میں داخل نہیں ہاں اُس وقت داخل ہو جائیں گے جب اُن پر عزیمت کرے اور اُن کے ارتکاب کا ارادہ کر لیوے ایسا ہی اللہ جل شانہ اندرونی گناہوں کے بارہ میں ایک اور جگہ فرماتا ہے قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ[2] یعنی خدا نے ظاہری اور اندرونی گناہ دونوں حرام کر دیے۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۳۳)

۲۲۷ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ

---

[1] بنی اسرائیل: ۳۷۔ [2] الاعراف: ۳۴۔

فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

جو لوگ اپنی بیویوں سے جدا ہونے کے لیے قسم کھا لیتے ہیں وہ طلاق دینے میں جلدی نہ کریں بلکہ چار مہینے انتظار کریں۔ سو اگر وہ اس عرصہ میں اپنے ارادہ سے باز آجاویں پس خدا کو غفور و رحیم پائیں گے۔ (آریہ دھرم ص ۴۶)

آیت ۲۲۷

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

اور اگر طلاق دینے پر پختہ ارادہ کرلیں سو یاد رکھیں کہ خدا سننے والا اور جاننے والا ہے یعنی اگر وہ عورت جس کو طلاق دی گئی خدا کے علم میں مظلوم ہو اور پھر وہ بددعا کرے تو خدا اُس کی بددعا سُن لے گا۔

(آریہ دھرم ص ۴۶)

آیت ۲۲۸

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○

آریہ لوگ جب اُس اعتراض کے وقت جو نیوگ پر وارد ہوتا ہے بالکل لاجواب اور عاجز ہو جاتے ہیں تو پھر انصاف اور خداترسی کی قوت سے کام نہیں لیتے بلکہ اسلام کے مقابل پر نہایت مکروہ اور بے جا افتراؤں پر آجاتے ہیں چنانچہ بعض تو مسئلہ طلاق کو ہی پیش کرتے ہیں حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ قدرتی طور ایسی آفات ہر یک قوم کے لیے ہمیشہ ممکن الظہور ہیں جن سے بچنا بجز طلاق کے متصور نہیں مثلاً اگر کوئی عورت زانیہ ہو تو کس طرح اس کے خاوند کی غیرت اُس کو اجازت دے سکتی ہے کہ وہ عورت اس کی بیوی کہلا کر پھر دن رات زنا کاری کی حالت میں مشغول رہے ایسا ہی اگر کسی کی جورو اس قدر دشمنی میں ترقی کرے کہ اس کی جان کی دشمن ہو جاوے اور اُس کے مارنے کے فکر میں لگی رہے تو کیا وہ ایسی

عورت سے امن کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے بلکہ ایک غیرت مند انسان جب اپنی عورت میں اس قدر خرابی بھی دیکھے کہ اجنبی شہوت پرست اُس کو پکڑتے ہیں اور اُس کا بوسہ لیتے ہیں اور اس سے ہم بغل ہوتے ہیں اور وہ خوشی سے یہ سب کام کراتی ہے تو گو تحقیق کے رو سے ابھی زنا تک نوبت نہ پہنچی ہو بلکہ وہ فاسقہ موقع کے انتظار میں ہو تاہم کوئی غیرت مند ایسے ناپاک خیال عورت سے نکاح کا تعلق رکھنا نہیں چاہتا اگر آریہ کہیں کہ کیا حرج ہے کچھ مضائقہ نہیں تو ہم ان سے بحث کرنا نہیں چاہتے ہمارے مخاطب صرف وہ شریف ہیں جن کی فطرت میں خدا تعالےٰ نے غیرت اور حیاء کا مادہ رکھا ہے اور وہ اس بات کو سمجھتے ہیں۔ (حاشیہ متعلقہ صـ۲۳ ۔ ل) اور چاہیئے کہ جن عورتوں کو طلاق دی گئی وہ رجوع کی امید کے لیے تین حیض تک انتظار کریں۔ (آریہ دھرم صـ۴۶)

اس سوال کے جواب میں کہ کیا کوئی عورت نبیہ ہو سکتی ہے۔ فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ[1] اور لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَۃٌ عورتیں اصل میں مردوں کی ہی ذیل میں ہوا کرتی ہیں۔ جب صاحب درجہ اور صاحب مرتبہ کے واسطے ایک دروازہ بند کر دیا گیا تو یہ بیچاری ناقصات العقل کس حساب میں ہیں۔

(الحکم جلد ۷ عـ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صـ۹)

عورتوں کے حقوق کی جیسی حفاظت اسلام نے کی ہے ویسی کسی دوسرے مذہب نے قطعاً نہیں کی مختصر الفاظ میں بیان فرما دیا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ کہ جیسے مردوں پر عورتوں کے حقوق ہیں ویسے ہی عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ بعض لوگوں کا حال سنا جاتا ہے کہ ان بیچاریوں کو پاؤں کی جوتی کی طرح جانتے ہیں اور ذلیل ترین خدمات اُن سے لیتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں۔ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور پردہ کے حکم ایسے ناجائز طریق سے برتتے ہیں کہ ان کو زندہ درگور کر دیتے ہیں۔

چاہیے کہ بیویوں سے خاوند کا ایسا تعلق ہو جیسے دو سچے اور حقیقی دوستوں کا ہوتا ہے انسان کے اخلاق فاضلہ اور خدا سے تعلق کی پہلی گواہ تو یہی عورتیں ہوتی ہیں اگر اُنہی سے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں تو پھر کس طرح ممکن ہے۔ کہ خدا سے صلح ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل کے لیے اچھا ہے۔ (البدر جلد ۲ عـ۱۸ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۰۳ء صـ۱۳۷)

۲۳۰۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا

[1] النساء : ۳۵

افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ○

ان تین حیض میں (جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہو چکا ہے) جو قریباً تین مہینے ہیں دو دفعہ طلاق ہو گی یعنی ہر یک حیض کے بعد خاوند عورت کو طلاق دے اور جب تیسرا مہینہ آوے تو خاوند کو ہوشیار ہو جانا چاہیے کہ اب یا تو تیسری طلاق دیکر احسان کے ساتھ دائمی جدائی اور قطع تعلق ہے اور یا تیسری طلاق سے رُک جائے اور عورت کو حُسنِ معاشرت کے ساتھ اپنے گھر میں آباد کرے اور یہ جائز نہیں ہو گا کہ جو مال طلاق سے پہلے عورت کو دیا تھا وہ واپس لے لے۔ (آریہ دھرم ص۴۶)

جب ہم سوچیں کہ نکاح کیا چیز ہے تو بجز اس کے اور کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ ایک پاک معاہدہ کی شرائط کے نیچے دو انسانوں کا زندگی بسر کرنا ہے اور جو شخص شرائط شکنی کا مرتکب ہو وہ عدالت کی رو سے معاہدہ کے حقوق سے محروم رہنے کے لائق ہو جاتا ہے اور اسی محرومی کا نام دوسرے لفظوں میں طلاق ہے لہذا طلاق ایک ایسی پوری جدائی ہے جس سے مطلقہ کی حرکات سے شخص طلاق دہندہ پر کوئی بد اثر نہیں پہنچتا یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی کی منکوحہ ہو کر نکاح کے معاہدہ کو کسی اپنی بدچلنی سے توڑ دے تو وہ اُس عضو کی طرح ہے جو گندہ ہو گیا اور سڑ گیا یا اُس دانت کی طرح ہے جس کو کیڑے نے کھا لیا اور وہ اپنے شدید درد سے ہر وقت تمام بدن کو ستاتا اور دُکھ دیتا ہے تو اب حقیقت میں وہ دانت دانت نہیں ہے اور نہ وہ متعفن عضو حقیقت میں عضو ہے اور سلامتی اسی میں ہے کہ اُس کو اُکھیڑ دیا جائے اور کاٹ دیا جائے اور پھینک دیا جائے یہ سب کارروائی قانون قدرت کے موافق ہے۔ عورت کا مرد سے ایسا تعلق نہیں جیسے اپنے ہاتھ اور اپنے پیر کا لیکن تاہم اگر کسی کا ہاتھ یا پیر کسی ایسی آفت میں مبتلا ہو جائے کہ اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے اسی پر اتفاق کرے کہ زندگی اس کی کاٹ دینے میں ہے تو بھلا تم میں سے کون ہے کہ ایک جان کے بچانے کے لیے کاٹ دینے پر راضی نہ ہو بس ایسا ہی اگر تیری منکوحہ اپنی بدچلنی اور کسی مہان پاپ سے تیرے پر وبال لاوے تو وہ ایسا عضو ہے کہ بگڑ گیا اور سڑ گیا اور اب وہ تیرا عضو نہیں ہے اس کو جلد کاٹ دے اور گھر سے باہر پھینک دے ایسا نہ ہو کہ اس کی زہر تیرے سارے بدن میں پہنچ جائے اور تجھے ہلاک کرے پھر اگر اس کاٹے ہوئے اور زہریلے جسم کو کوئی پرند یا درند کھاوے تو تجھے اس سے کیا کام کیونکہ وہ جسم تو اُسی وقت سے تیرا جسم نہیں رہا جب کہ تو نے اُس کو کاٹ کر پھینک دیا اب جبکہ طلاق کی ایسی صورت ہے کہ اُس میں خاوند خاوند نہیں رہتا اور نہ عورت اُس کی عورت رہتی

ہے اور عورت ایسی جدا ہو جاتی ہے کہ جیسے ایک خراب شدہ عضو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے تو ذرہ سوچنا چاہئیے کہ طلاق کو نیوگ سے کیا مناسبت ہے طلاق تو اس حالت کا نام ہے کہ جب عورت سے بیزار ہو کر بکلی قطع تعلق اُس سے کیا جاوے مگر نیوگ میں تو خاوند بدستور خاوند ہی رہتا ہے اور نکاح بھی بدستور نکاح ہی کہلاتا ہے اور جو شخص اس غیر عورت سے ہم بستر ہوتا ہے اُس کا نکاح اس عورت سے نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ کہو کہ مسلمان بے وجہ بھی عورتوں کو طلاق دے دیتے ہیں تو تمھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو لغو کام کرنے سے منع کیا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ[1] اور قرآن میں بے وجہ طلاق دینے والوں کو بہت ہی ڈرایا ہے۔ ماسوا اِس کے تم اِس بات کو بھی تو ذرا سوچو کہ مسلمان اپنی حیثیت کے موافق بہت سا مال خرچ کر کے ایک عورت سے شادی کرتے ہیں اور ایک رقم کثیر عورت کے مہر کی اُن کے ذمہ ہوتی ہے اور بعضوں کے مہر کئی ہزار اور بعض کے ایک لاکھ یا کئی لاکھ ہوتے ہیں اور یہ مہر عورت کا حق ہوتا ہے اور طلاق کے وقت بہرحال اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وصول کرے اور نیز قرآن میں یہ حکم ہے کہ اگر عورت کو طلاق دی جائے تو جس قدر مال عورت کو طلاق سے پہلے دیا گیا ہے وہ عورت کا ہی رہے گا اور اگر عورت صاحب اولاد ہو تو بچوں کے تعہد کی مشکلات اِس کے علاوہ ہیں اسی واسطے کوئی مسلمان جب تک اس کی جان پر ہی عورت کی وجہ سے کوئی وبال نہ پڑے تب تک طلاق کا نام نہیں لیتا بھلا کون ایسا پاگل ہے کہ بے وجہ اس قدر تباہی کا بوجھ اپنے سر پر ڈال لے بہرحال جب مرد اور عورت کے تعلقات نکاح باہم باقی نہ رہے تو پھر نیوگ کو اُس سے کیا نسبت جس میں عین نکاح کی حالت میں ایک شخص کی عورت دوسرے شخص سے ہم بستر ہو سکتی ہے پھر طلاق مسلمانوں سے کچھ خاص بھی نہیں بلکہ ہر یک قوم میں بشرطیکہ دیوث نہ ہوں نکاح کا معاہدہ صِرف عورت کی نیک چلنی تک ہی محدود ہوتا ہے اور اگر عورت بدچلن ہو جائے تو ہر یک قوم کے غیرت مند کو خواہ ہندو ہو خواہ عیسائی ہو بدچلن عورت سے علیحدہ ہونے کی ضرورت پڑتی ہے ...... گندی عورت گندے عضو کی طرح ہے اور اُس کا کاٹ کر پھینکنا اسی قانون کے رو سے ضروری پڑا ہوا ہے جس قانون کی رو سے ایسے عضو کاٹے جاتے ہیں اور چونکہ ایسی عورتوں کو اپنے پاس سے دفع کرنا واقعی طور پر ایک پسندیدہ بات اور انسانی غیرت کے مطابق ہے اس لیے کوئی مسلمان اس کاروائی کو چھپے چھپے ہرگز نہیں کرتا مگر نیوگ چھپ کر کیا جاتا ہے کیونکہ دل گواہی دیتا ہے کہ یہ بُرا کام ہے۔

(آریہ دھرم صفحہ ۳۶-۳۳)

اگر کوئی عورت اذیت اور مصیبت کا باعث ہو تو ہم کو کیونکر یہ خیال کرنا چاہیے کہ خدا ہم سے ایسی عورت کے طلاق دینے سے ناخوش ہوگا۔ میں دل کی سختی کو اُس شخص سے منسوب کرتا ہوں جو اس عورت کو اپنے پاس رہنے دے نہ اُس شخص سے جو اس کو ایسی صورتوں میں اپنے گھر سے نکال دے ناموافقت سے عورت کو رکھنا ایسی

---

[1] المؤمنون : ۴ -

سختی ہے جس میں طلاق سے زیادہ بے رحمی ہے طلاق ایک مصیبت ہے جو ایک بدتر مصیبت کے عوض اختیار کی جاتی ہے۔ تمام معاہدے بدعہدی سے ٹوٹ جاتے ہیں پھر اس پر کون سی معقول دلیل ہے کہ نکاح کا معاہدہ ٹوٹ نہیں سکتا اور کیا وجہ کہ نکاح کی نوعیت تمام معاہدوں سے مختلف ہے۔ عیسیٰ نے زنا کی شرط سے طلاق کی اجازت دی مگر آخر اجازت تو دے دی نکاح ملاپ کے لیے ہے اس لیے نہیں کہ ہم دائمی تردد اور نزاع کے باعث سے پریشان خاطر رہیں۔ (آریہ دھرم صفحہ ۴۲ حاشیہ)

عورت کا جوڑا اپنے خاوند سے پاک دامنی اور فرماں برداری اور باہم رضامندی پر موقوف ہے اور اگر ان تینوں باتوں میں سے کسی ایک بات میں بھی فرق آجاوے تو پھر یہ جوڑ قائم رہنا محالات میں سے ہو جاتا ہے انسان کی بیوی اُس کے اعضا کی طرح ہے پس اگر کوئی عضو سڑ گل جائے یا ہڈی ایسی ٹوٹ جائے کہ قابل پیوند نہ ہو تو پھر بجز کاٹنے کے اور کیا علاج ہے اپنے عضو کو اپنے ہاتھ سے کاٹنا کوئی نہیں چاہتا کوئی بڑی ہی مصیبت پڑتی ہے تب کاٹا جاتا ہے پس جس حکیم مطلق نے انسان کے مصالح کے لیے نکاح تجویز کیا ہے اور چاہا ہے کہ مرد اور عورت ایک ہو جائیں اسی نے مفاسد ظاہر ہونے کے وقت اجازت دی ہے کہ اگر آرام اُس میں متصور ہو کہ کرم خوردہ دانت یا سڑے ہوئے عضو یا ٹوٹی ہوئی ہڈی کی طرح موذی کو علیحدہ کر دیا جائے تو اسی طرح کاربند ہو کر اپنے تئیں فوق الطاقت آفت سے بچالیں کیونکہ جس جوڑ سے وہ فواید مترتب نہیں ہو سکتے کہ جو اُس جوڑ کی علت غائی ہیں بلکہ اُن کی ضد پیدا ہوتی ہے تو وہ جوڑ درحقیقت جوڑ نہیں ہے۔

(آریہ دھرم حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۳ تا ۴۴)

خدا تعالیٰ نے جو ضرورتوں کے وقت میں مرد کو طلاق دینے کی اجازت دی اور کھول کر یہ نہ کہا کہ عورت کی زناکاری سے یا کسی اور بدمعاشی کے وقت اس کو طلاق دی جاوے اس میں حکمت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ستّاری نے چاہا کہ عورت کی تشہیر نہ ہو اگر طلاق کے لیے زنا وغیرہ جرائم کا اعلان کیا جاتا تو لوگ سمجھتے کہ اس عورت پر کسی بدکاری کا شبہ ہے یا فلاں فلاں بدکاری کے قسموں میں سے ضرور اُس نے کوئی بدکاری کی ہوگی مگر اب یہ راز خاوند تک محدود رہتا ہے۔ (آریہ دھرم نوٹ بر حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۳)

دُنیا میں کوئی فرقہ نہیں جو طلاق کا مخالف ہو کسی نہ کسی ضرورت سے بعض وقت طلاق دینی پڑتی ہے۔ یہ رسم کس مذہب میں نہیں جب مرد و عورت میں سخت مخالفت ہو گی تو بجز طلاق اور کیا چارہ ہو گا۔ (سناتن دھرم صفحہ ۴)

اگر طلاق ایسا امر ہوتا جو کہ کانشنس کے خلاف ہے تو پھر دیگر اقوام بھی اسے بجا نہ لاتیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی ایسی قوم نہیں ہے جو ضرورت کے وقت عورت کو طلاق نہ دیتی ہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۷)

درحقیقت اسلامی پاکیزگی نے ہی طلاق کی ضرورت کو محسوس کیا ہے ورنہ جو لوگ دیّوثوں کی طرح زندگی بسر کرتے

ہیں اُن کے نزدیک گو اُن کی عورت کچھ کرتی پھرے طلاق کی ضرورت نہیں۔ (نسیم دعوت ص۵ حاشیہ)

روحانی اور جسمانی طور پر اپنی بیویوں سے نیکی کرو۔ ان کے لیے دعا کرتے رہو اور طلاق سے پرہیز کرو کیونکہ نہایت بد خدا کے نزدیک وہ شخص ہے جو طلاق دینے میں جلدی کرتا ہے۔ جس کو خدا نے جوڑا ہے اس کو ایک گندہ برتن کی طرح جلد مت توڑو۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۲۵ حاشیہ)

ایک صاحب نے یہ سوال کیا کہ جو لوگ ایک ہی دفعہ تین طلاق لکھ دیتے ہیں اُن کی وہ طلاق جائز ہوتی ہے یا نہیں۔

اس کے جواب میں فرمایا کہ قرآن شریف کے فرمودہ کی رو سے تین طلاق دی گئی ہوں اور اُن میں سے ہر ایک کے درمیان اتنا ہی وقفہ رکھا گیا جو قرآن شریف نے بتایا ہے تو ان تینوں کی عدت کے گزرنے کے بعد اس خاوند کا کوئی تعلق اس بیوی سے نہیں رہتا ہاں اگر کوئی اور شخص اس عورت سے عدت گزرنے کے بعد نکاح کرے اور پھر اتفاقاً وہ اُس کو طلاق دے دے تو اُس خاوند اول کو جائز ہے کہ اُس بیوی سے نکاح کرلے۔ مگر اگر دوسرا خاوند خاوند اول کی خاطر سے یا لحاظ سے اُس بیوی کو طلاق دے کہ تا وہ پہلا خاوند اُس سے نکاح کرلے تو یہ حلالہ ہوتا ہے اور یہ حرام ہے۔ لیکن اگر تین طلاق ایک ہی وقت میں دی گئی ہوں تو اُس خاوند کو یہ فائدہ دیا گیا ہے کہ وہ عدت کے گذرنے کے بعد بھی اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے کیونکہ یہ طلاق ناجائز طلاق تھا اور اللہ و رسول کے فرمان کے موافق نہ دیا گیا تھا در اصل قرآن شریف میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو یہ امر نہایت ہی ناگوار ہے۔ کہ پرانے تعلّقات والے خاوند اور بیوی آپس کے تعلقات کو چھوڑ کر الگ الگ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے طلاق کے واسطے بڑے بڑے شرائط لگائے ہیں۔ وقفہ کے بعد تین طلاق کا دینا اور ان کا ایک ہی جگہ رہنا وغیرہ۔ یہ امور سب اس واسطے ہیں کہ شاید کسی وقت اُن کے دلی رنج دُور ہو کر آپس میں صلح ہو جاوے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کوئی قریبی رشتہ دار وغیرہ آپس میں لڑائی کرتے ہیں اور تازے جوش کے وقت میں حکام کے پاس عرضی پرچے لے کر آتے ہیں تو آخر دانا حکّام اس وقت ان کو کہہ دیتے ہیں کہ ایک ہفتہ کے بعد آنا۔ اصل غرض ان کی صرف یہی ہوتی ہے کہ یہ آپس میں صلح کرلیں گے اور اُن کے یہ جوش فرو ہوں گے تو پھر ان کی مخالفت باقی (نہ) رہے گی اسی واسطے وہ اس وقت اُن کی وہ درخواست لینا مصلحت کے خلاف جانتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی مرد اور عورت کے الگ ہونے کے واسطے ایک کافی موقعہ رکھ دیا ہے۔ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ طرفین کو اپنی بھلائی بُرائی کے سوچنے کا موقع مل سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ۔ یعنی دو دفعہ کی طلاق ہونے کے بعد یا اُسے اچھی طرح سے رکھ لیا جاوے یا احسان سے جدا کر دیا جاوے۔ اگر اتنے لمبے عرصے میں بھی ان کی آپس میں صلح نہیں ہوتی تو پھر ممکن نہیں کہ وہ اصلاح پذیر ہوں۔ (الحکم جلد ۷ ص۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳؁ء ص۱۴)

طلاق ایک وقت میں کامل نہیں ہوسکتی طلاق میں تین طہر ہونے ضروری ہیں فقہانے ایک ہی مرتبہ تین طلاق دے دینی جائز رکھی ہے مگر ساتھ ہی اس میں یہ رعایت بھی ہے کہ عدت کے بعد اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو وہ عورت اسی خاوند سے نکاح کرسکتی ہے اور دوسرے شخص سے بھی کرسکتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے جب تین طلاق دے دی جاویں تو پہلا خاوند اس عورت سے نکاح نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ کسی اور کے نکاح میں آوے اور پھر وہ دوسرا خاوند بلا عمداً اُسے طلاق دے دیوے اگر وہ عمداً اسی لیے طلاق دے گا کہ اپنے پہلے خاوند سے وہ پھر نکاح کر لیوے تو یہ حرام ہوگا کیونکہ اسی کا نام حلالہ ہے جو کہ حرام ہے فقہانے جو ایک دم کی تین طلاقوں کو جائز رکھا ہے اور پھر عدت کے گزرنے کے بعد اُسی خاوند سے نکاح کا حکم دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اول اُسے شرعی طریق سے طلاق نہیں دی۔

قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو طلاق بہت ناگوار ہے کیونکہ اس سے میاں بیوی دونوں کی خانہ بربادی ہو جاتی ہے اس واسطے تین طلاق اور تین طہر کی مدت مقرر کی کہ اس عرصہ میں دونوں اپنا نیک و بد سمجھ کر اگر صلح چاہیں تو کر لیویں۔ (البدر جلد ۲ ع ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۵)

عورت مرد کا معاملہ آپس میں جو ہوتا ہے اس پر دوسرے کو کامل اطلاع نہیں ہوتی بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی فحش عیب عورت میں نہیں ہوتا مگر تاہم مزاجوں کی ناموافقت ہوتی ہے جو کہ باہمی معاشرۃ کی مخل ہوتی ہے ایسی صورت میں مرد طلاق دے سکتا ہے۔

بعض وقت عورت گو ولی ہو اور بڑی عابد اور پرہیزگار اور پاکدامن ہو اور اس کو طلاق دینے میں خاوند کو بھی رحم آتا ہو بلکہ وہ روتا بھی ہو مگر پھر بھی چونکہ اس کی طرف سے کراہت ہوتی ہے اس لیے وہ طلاق دے سکتا ہے۔ مزاجوں کا آپس میں موافق نہ ہونا یہ بھی ایک شرعی امر ہے۔ (البدر جلد ۲ ع ۱۵ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۷)

اگر شرط ہو کہ فلاں بات ہو تو طلاق ہے اور وہ بات ہو جائے تو پھر واقعی طلاق ہو جاتی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ اگر فلاں پھل کھاؤں تو طلاق ہے اور پھر وہ پھل کھالے تو طلاق ہو جاتی ہے۔

(البدر جلد ۲ ع ۲۱ مورخہ ۱۲ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۶۲)

ایک صاحب نے اول بڑے چاہ سے ایک شریف لڑکی کے ساتھ نکاح ثانی کیا مگر بعد ازاں بہت سے خفیف عذر پر دس ماہ کے اندر ہی انھوں نے چاہا کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جاوے اس پر حضرت اقدس ؑ کو بہت سخت ملال ہوا اور فرمایا کہ

مجھے اس قدر غصہ ہے کہ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا اور ہماری جماعت میں ہو کر پھر یہ ظالمانہ طریق اختیار کرنا سخت عیب کی بات ہے۔ چنانچہ دوسرے دن پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ

وہ صاحب اپنی اس نئی یعنی دوسری بیوی کو علیحدہ مکان میں رکھیں ۔ جو کچھ زوجہ اول کو دیویں وہی اسے دیویں ایک شب اُدھر رہیں تو ایک شب ادھر رہیں اور دوسری عورت کوئی لونڈی غلام نہیں ہے بلکہ بیوی ہے اُسے زوجہ اول کا دست نگر کر کے نہ رکھا جاوے ۔ (البدر جلد ۲ ۲۳ مورخہ ۲۶ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷۸)

یہ مرض عورتوں میں بہت کثرت سے ہوا کرتا ہے ۔ کہ وہ ذراسی بات پر بگڑ کر اپنے خاوند کو بہت کچھ بھلا بُرا کہتی ہیں بلکہ اپنی ساس اور سُسر کو بھی سخت الفاظ سے یاد کرتی ہیں حالانکہ وہ اُس کے خاوند کے بھی قابل عزت بزرگ ہیں وہ اس کو ایک معمولی بات سمجھ لیتی ہیں ۔ اور ان سے لڑنا وہ ایسا ہی سمجھتی ہیں جیسا کہ محلہ کی اور عورتوں سے جھگڑا ۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کی خدمت اور رضا جوئی ایک بہت بڑا فرض مقرر کیا ہے ۔ یہاں تک کہ حکم ہے کہ اگر والدین کسی لڑکے کو مجبور کریں ۔ کہ وہ اپنی عورت کو طلاق دے دے تو اُس کے لڑکے کو چاہیئے کہ وہ طلاق دے دے پس جبکہ ایک عورت کی ساس اور سُسر کے کہنے پر اس کو طلاق مل سکتی ہے ۔ تو اور کون سی بات رہ گئی ہے ۔ (الحکم جلد ۱۱ ۱۱ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

جائز چیزوں میں سب سے زیادہ بُرا خدا اور اُس کے رسُول نے طلاق کو قرار دیا ہے اور یہ صرف ایسے موقعوں کے لیے رکھی گئی ہے ۔ جبکہ اشد ضرورت ہو جیسا کہ خدا تعالیٰ نے جو رب ہے کہ سانپوں اور بھچوؤں کے لیے خوراک مہیّا کی ہے ویسا ہی ایسے انسانوں کے لیے جن کی حالتیں بہت گری ہوئی ہیں اور جو اپنے اُوپر قابو نہیں رکھ سکتے ۔ طلاق کا مسئلہ بنا دیا ہے ۔ کہ وہ اس طرح ان آفات اور مصیبتوں سے بچ جاویں جو طلاق کے نہ ہونے کی صورت میں پیش آئیں یا بعض اوقات دوسرے لوگوں کو بھی ایسی صورتیں پیش آجاتی ہیں اور ایسے واقعات ہو جاتے ہیں کہ سوائے طلاق کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا پس اسلام نے جو کہ تمام مسائل پر حاوی ہے یہ مسئلہ طلاق کا بھی دکھلایا ہے اور ساتھ ہی اس کو مکروہ بھی قرار دیا ہے ۔

(بدر جلد ۶ ۳۸ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

شریعت اسلام نے صرف مرد کے ہاتھ میں ہی یہ اختیار نہیں رکھا کہ جب کوئی خرابی دیکھے یا ناموافقت پاوے تو عورت کو طلاق دے دے بلکہ عورت کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ وہ بذریعہ حاکم وقت کے طلاق لے لے ۔ اور جب عورت بذریعہ حاکم کے طلاق لیتی ہے تو اسلامی اصطلاح میں اس کا نام خلع ہے ۔ جب عورت مرد کو ظالم پاوے یا وہ اس کو ناحق مارتا ہو یا اور طرح سے ناقابل برداشت بدسلوکی کرتا ہو یا کسی اور وجہ سے ناموافقت ہو یا وہ مرد دراصل نامرد ہو یا تبدیل مذہب کرے یا ایسا ہی کوئی اور سبب پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے عورت کو اُس کے گھر میں آباد رہنا ناگوار ہو تو ان تمام حالتوں میں عورت یا اُس کے کسی ولی کو چاہئیے کہ حاکم وقت کے پاس یہ شکایت کرے اور حاکم وقت پر یہ لازم ہوگا کہ اگر عورت کی شکایت واقعی درست سمجھے تو اس عورت کو اس مرد سے اپنے حکم

سے علیحدہ کر دے اور نکاح کو توڑ دے لیکن اس حالت میں اس مرد کو بھی عدالت میں بُلانا ضروری ہوگا کہ کیوں نہ اُس عورت کو اُس سے علیحدہ کیا جائے۔ (چشمہ معرفت ص ۲۷۶-۲۷۵)

مجبوریوں کے وقت عورتوں کے لیے بھی راہ کھلی ہے کہ اگر مرد بیکار ہو جاوے تو حاکم کے ذریعہ سے خلع کرالیں جو طلاق کا قائمقام ہے.... اگر عورت مرد کے تعدّد ازواج پر ناراض ہے تو وہ بذریعہ حاکم خلع کرا سکتی ہے۔ (کشتی نوح ص ۷۲-۷۱)

آیت ۲۳۱

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

اگر تیسری طلاق جو تیسرے حیض کے بعد ہوتی ہے دے دے تو اب وہ عورت اس کی عورت نہیں رہی اور جب تک وہ دوسرا خاوند نہ کرلے تب تک نیا نکاح اس سے نہیں ہو سکتا (یعنی ایسے شخص کی سزا یہی ہے جو باوجود ہدایت متذکرہ بالا کے پھر نہ سمجھے اور چونکہ یہ عورت اب اُس کی عورت نہیں رہی اس لیے وہ خاوند کرنے میں اختیار کلی رکھتی ہے)۔ (آریہ دھرم ص ۴۶)

بعض آریہ عذر معقول سے عاجز آکر یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں حلالہ کی رسم نیوگ سے مشابہ ہے یعنی جو مسلمان اپنی جورو کو طلاق دے وہ اپنی جورو کو اپنے پر حلال کرنے کے لیے دوسرے سے ایک رات ہم بستر کراتا ہے تب آپ اُس کو اپنے نکاح میں لے آتا ہے سو ہم اس افترا کا جواب بجز لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ اور کیا دے سکتے ہیں۔ ناظرین پر واضح رہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں حلالہ کی رسم تھی لیکن اسلام نے اس ناپاک رسم کو قطعاً حرام کر دیا اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ایسے لوگوں پر لعنت بھیجی ہے جو حلالہ کے پابند ہوں چنانچہ ابن عمر سے مروی ہے کہ حلالہ زناہ میں داخل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حلالہ کرنے کرانے والے سنگسار کیے جاویں اگر کوئی مطلقہ سے نکاح کرے تو نکاح تب درست ہوگا کہ جب واقعی طور پر اُس کو اپنی جورو بنالے اور اگر دل میں یہ خیال ہو کہ وہ اس حیلہ کے لیے اُس کو جورو بناتا ہے کہ تا اُس کے طلاق کے بعد دوسرے پر حلال ہو جائے تو ایسا نکاح ہرگز درست نہیں اور ایسا نکاح کرنے والا اُس عورت سے زنا کرتا ہے اور جو ایسے فعل کی ترغیب دے وہ اس سے زنا کرواتا ہے غرض حلالہ علماء اسلام کے اتفاق سے حرام ہے اور ائمہ اور علماء سلف جیسے

حضرت قتادہ۔عطا اور امام حسن اور ابراہیم نخعی اور حسن بصری اور مجاہد اور شعبی اور سعید بن مسیب اور امام مالک۔لیث۔ ثوری۔امام احمد بن حنبل وغیرہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین اور سب محققین علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں اور شریعت اسلام اور نیز لغت عرب میں بھی زوج اُس کو کہتے ہیں کہ کسی عورت کو فی الحقیقت اپنی جورو بنانے کے لیے تمام حقوق کو مدنظر رکھ کر اپنے نکاح میں لاوے اور نکاح کا معاہدہ حقیقی اور واقعی ہو نہ کہ کسی دوسرے کے لیے ایک حیلہ ہو اور قرآن شریف میں جو آیا ہے حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ اس کے یہی معنی ہیں کہ جیسے دنیا میں نیک نیتی کے ساتھ اپنے نفس کی اغراض کے لیے نکاح ہوتے ہیں ایسا ہی جب تک ایک مطلقہ کے ساتھ کسی کا نکاح نہ ہو اور وہ پھر اپنی مرضی سے اُس کو طلاق نہ دے تب تک پہلے طلاق دینے والے سے دوبارہ اُس کا نکاح نہیں ہوسکتا سو آیت کا یہ منشاء نہیں ہے کہ جورو کرنے والا پہلے خاوند کے لیے ایک راہ بنا دے اور آپ نکاح کرنے کے لیے سچی نیت نہ رکھتا ہو بلکہ نکاح صرف اُس صورت میں ہوگا کہ اپنے پختہ اور مستقل ارادہ سے اپنے صحیح اغراض کو مدنظر رکھ کر نکاح کرے ورنہ اگر کسی حیلہ کی غرض سے نکاح کرے گا تو عندالشرع وہ نکاح ہرگز درست نہیں ہوگا اور زنا کے حکم میں ہوگا۔لہٰذا ایسا شخص جو اسلام پر حلالہ کی تہمت لگانا چاہتا ہے اُس کو یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کا یہ مذہب نہیں ہے اور قرآن اور صحیح بخاری اور مسلم اور دیگر احادیث صحیحہ کی رو سے حلالہ قطعی حرام ہے اور مرتکب اُس کا زانی کی طرح مستوجب سزا ہے۔ (آریہ دھرم حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۳ ۔ ب ج)

قرآن شریف میں یہ شرط جو ہے کہ اگر تین طلاق تین طہر میں جو تین مہینہ ہوتے ہیں دی جائیں تو پھر ایسی عورت خاوند سے بالکل جدا ہو جاوے گی اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا خاوند اس کا اس کو طلاق دے دے تو صرف اِسی صورت میں پہلے خاوند کے نکاح میں آسکتی ہے ورنہ نہیں یہ شرط طلاق سے روکنے کے لیے ہے تا ہر یک شخص طلاق دینے میں دلیری نہ کرے اور وہی شخص طلاق دے جس کو کوئی ایسی مصیبت پیش آگئی ہے جس سے وہ ہمیشہ کی جدائی پر راضی ہوگیا۔ اور تین مہینے بھی اس لیے رکھے گئے۔تا اگر کوئی مثلاً غصہ سے طلاق دینا چاہتا ہو تو اس کا غصہ اتر جائے۔

(آریہ دھرم نوٹ بر حاشیہ متعلقہ صفحہ ۴۳ ۔ ب)

۲۳۲ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

عورتوں کو دکھ دینے کی غرض سے بند مت رکھو۔ (شہادت القرآن باردوم ص ۳۹)

اگر تم طلاق دو تو عورتوں کو احسان کے ساتھ رخصت کرو۔ (شہادت القرآن باردوم ص ۳۹)

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

جب تم عورتوں کو طلاق دو۔ اور وہ مدت مقررہ تک پہنچ جائیں۔ اور عدت کی میعاد گزر جائے تو ان کو نکاح کرنے سے مت روکو یعنی جب تین حیض کے بعد تین طلاقیں ہو چکیں۔ عدت بھی گزر گئی۔ تو اب وہ عورتیں تمہاری عورتیں نہیں۔ ان کو نکاح کرنے سے مت روکو۔ (آریہ دھرم ص ۴۶-۴۷)

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ ..... وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ یعنی یہ اس کو وعظ کیا جاتا ہے جو تم میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے۔ (شہادت القرآن باردوم ص ۳۴)

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ

بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

یعنی ماؤں کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو دو برس کامل تک دودھ پلاویں اگر وہ مدت رضاعت کو پورا کرنا چاہتی ہیں۔ اور ان کی خوراک پوشاک اُس مرد کے ذمہ ہے جس کے وہ بچے ہیں۔ (چشمۂ معرفت ص۲۰۲)

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ یعنی یہ بات مردوں کے ذمّہ ہے کہ جو عورتوں کو کھانے کے لیے ضرورتیں ہوں یا پہننے کے لیے ضرورتیں ہوں وہ سب اُن کے لیے مہیا کریں اِس سے ظاہر ہے کہ مرد عورت کا مربی اور محسن اور ذمہ دار آسایش کا ٹھیرایا گیا ہے اور وہ عورت کے لیے بطور آقا اور خداوند نعمت کے ہے۔

(چشمہ معرفت ص۲۷۵)

۲۳۴ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور جورُوئیں رہ جائیں تو وہ چار مہینے اور دس۱۰ دن نکاح کرنے سے رکی رہیں۔

(شہادت القرآن بار دوم ص۳۹)

البقرۃ ۲۳۸

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

تراضی طرفین سے جو ہو اس پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور شرعی مہر سے یہ مراد نہیں کہ نصوص یا احادیث میں کوئی اس کی حد مقرر کی گئی ہے بلکہ اس سے مراد اس وقت کے لوگوں کے مروجہ مہر سے ہوا کرتی ہے ہمارے ملک میں یہ خرابی ہے کہ نیت اور ہوتی ہے اور محض نمود کے لیے لاکھ لاکھ روپے کا مہر ہوتا ہے صرف ڈراوے کے لیے یہ لکھا جایا کرتا ہے کہ مرد قابو میں رہے اور اس سے پھر دوسرے نتائج خراب نکل سکتے ہیں نہ عورت والوں کی نیت لینے کی ہوتی ہے اور نہ خاوند کے دینے کی۔

میرا مذہب یہ ہے کہ جب ایسی صورت میں تنازعہ آپڑے تو جب تک اس کی نیت یہ ثابت نہ ہو کہ ہاں وہ رضا و رغبت سے وہ اسی قدر مہر پر آمادہ تھا جس قدر کہ مقرر شدہ ہے تب تک مقرر شدہ نہ دلایا جاوے اور اس کی حیثیت اور رواج وغیرہ کو مدِّنظر رکھ کر پھر فیصلہ کیا جاوے کیونکہ بدنیتی کی اتباع نہ شریعت کرتی ہے اور نہ قانون۔

(البدر جلد ۲ ع۱۶ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲۳)

سوال ہوا کہ جن عورتوں کا مہر مچھر کی دو من چربی ہو وہ کیسے ادا کیا جاوے۔ فرمایا

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اس کا خیال مہر میں ضرور ہونا چاہیے خاوند کی حیثیت کو مدِّنظر رکھنا چاہیے۔ اگر اس کی حیثیت ۱۰ روپے کی نہ ہو تو وہ ایک لاکھ کا مہر کیسے ادا کرے گا اور مچھروں کی چربی تو کوئی مہر ہی نہیں یہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں داخل ہے۔ (البدر جلد ۳ ع۱۱ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

سوال ہوا کہ ایک عورت اپنا مہر نہیں بخشتی۔ فرمایا

یہ عورت کا حق ہے اُسے دینا چاہیے اول تو نکاح کے وقت ہی ادا کرے ورنہ بعد ازاں ادا کر دینا چاہیے پنجاب اور ہندوستان میں یہ شرافت ہے کہ موت کے وقت یا اس سے پیشتر اپنا مہر خاوند کو بخش دیتی ہیں یہ صرف رواج ہے جو مروت پر دلالت کرتا ہے۔ (البدر جلد ۳ ع۱۱ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

البقرۃ ۲۴۶ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اللہ تعالیٰ جو قرض مانگتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی ہے کہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ کو حاجت ہے اور وہ محتاج ہے ایسا وہم کرنا بھی کفر ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جزا کے ساتھ واپس کروں گا یہ ایک طریق ہے۔ اللہ تعالیٰ جس سے فضل کرنا چاہتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

ایک نادان کہتا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (کون شخص ہے جو اللہ کو قرض دے) اس کا مفہوم یہ ہے کہ گویا معاذ اللہ خدا بھوکا ہے احمق نہیں سمجھتا کہ اس سے بھوکا ہونا کہاں سے نکلتا ہے یہاں قرض کا مفہوم اصل تو یہ ہے کہ ایسی چیزیں جن کے واپس کرنے کا وعدہ ہوتا ہے اس کے ساتھ افلاس اپنی طرف سے لگالیتا ہے۔ یہاں قرض سے مراد یہ ہے کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کو اعمال صالحہ دے اللہ تعالیٰ اُن کی جزا اُسے کئی گنا کر کے دیتا ہے یہ خدا کی شان کے لائق ہے جو سلسلہ عبودیت کا ربوبیت کے ساتھ ہے اُس پر غور کرنے سے اُس کا یہ مفہوم صاف سمجھ میں آتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ بدون کسی نیکی۔ دعا۔ اور التجا اور بدون تفرقہ کافر و مومن کے ہر ایک کی پرورش فرما رہا ہے اور اپنی ربوبیت اور رحمانیت کے فیض سے سب کو فیض پہنچا رہا ہے پھر وہ کسی کی نیکیوں کو کب ضائع کرے گا۔ اُس کی شان تو یہ ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ[1] جو ذرہ بھی نیکی کرے اُس کا بھی اجر دیتا ہے اور جو ذرہ بدی کرے گا اُس کی پاداش بھی ملے گی۔ یہ ہے قرض کا اصل مفہوم جو اس آیت سے پایا جاتا ہے چونکہ اصل مفہوم قرض کا اس سے پایا جانا تھا اس لیے یہی کہہ دیا مَنْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اور اس کی تفسیر اس آیت میں موجود ہے مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰ رجون ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

البقرۃ ۲۵۰ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِیْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَیْسَ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِیَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ

---

[1] الزلزال : ۸۔

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

کشفی حالت میں اس عاجز نے دیکھا کہ انسان کی صورت پر دو شخص ایک مکان میں بیٹھے ہیں ایک زمین پر اور ایک چھت کے قریب بیٹھا ہے تب میں نے اس شخص کو جو زمین پر تھا مخاطب کر کے کہا کہ مجھے ایک لاکھ فوج کی ضرورت ہے مگر وہ چپ رہا اور اس نے کچھ بھی جواب نہ دیا تب میں نے اُس دوسرے کی طرف رُخ کیا جو چھت کے قریب اور آسمان کی طرف تھا اور اُسے میں نے مخاطب کر کے کہا کہ مجھے ایک لاکھ فوج کی ضرورت ہے وہ میری اس بات کو سُن کر بولا کہ ایک لاکھ نہیں ملے گی مگر پانچ ہزار سپاہی دیا جائے گا تب میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگرچہ پانچ ہزار تھوڑے آدمی ہیں پر اگر خدائے تعالیٰ چاہے تو تھوڑے بہتوں پر فتح پا سکتے ہیں اُس وقت میں نے یہ آیت پڑھی کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (ازالہ اوہام اول صفحہ ۹۵-۹۷ حاشیہ)

۲۵۱ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ؕ

یعنی اے ہمارے خدا ہمارے گناہ بخش اور جو اپنے کاموں میں ہم حد سے گزر جاتے ہیں وہ بھی معاف فرما پس ظاہر ہے کہ اگر خدا گناہ بخشنے والا نہ ہوتا تو ایسی دعا ہرگز نہ سکھلاتا۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۱۷)

ایک وہ زمانہ تھا کہ تلواروں سے ڈرایا جاتا تھا اور وہ لوگ اس کے مقابلہ پر کیا کرتے تھے خدائے تعالیٰ سے دعائیں مانگتے اور کہتے رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ مگر آج کل تو خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ تلوار سے نہیں ڈرایا جاتا۔ (الحکم جلد ۷ عدد ۳۱ مورخہ ۲۴ راگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

۲۵۲ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۟ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

(وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ الخ) اور اگر خدا صالح لوگوں کے ذریعہ سے گمراہوں کا تدارک نہ فرماتا اور بعض کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین بگڑ جاتی پر یہ خدا کا فضل ہے کہ وہ گمراہی کے پھیلنے کے وقت اپنی طرف سے ہادی بھیجتا ہے کیونکہ تفضل اور احسان اُس کی عادت ہے۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۴۳)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ○

جاننا چاہیئے کہ رفع کا لفظ قرآن شریف میں جہاں کہیں انبیا اور اخیار ابرار کی نسبت استعمال کیا گیا ہے عام طور پر اس سے یہی مطلب ہے کہ جو اُن برگزیدہ لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی جناب میں باعتبار اپنے روحانی مقام اور نفسی نقطہ کے آسمانوں میں کوئی بلند مرتبہ حاصل ہے اُس کو ظاہر کردیا جائے اور اُن کو بشارت دی جائے کہ بعد موت و مفارقت بدن اُن کی رُوح اُس مقام تک جو اُن کے لیے قرب کا مقام ہے اُٹھائی جائے گی جیساکہ اللہ جلشانہ ہمارے سیّد و مولیٰ کا اعلیٰ مقام ظاہر کرنے کی غرض سے قرآن شریف میں فرماتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۔ یعنی یہ تمام رسول اپنے مرتبہ میں یکساں نہیں بعض اُن میں سے وہ ہیں جن کو روبرو کلام کرنے کا شرف بخشا گیا اور بعض وہ ہیں جن کا رفع درجات سب سے بڑھ کر ہے۔

اِس آیت کی تفسیر احادیث نبویہ میں یہی بیان کی گئی ہے کہ موت کے بعد ہر یک نبی کی روح آسمان کی طرف اُٹھائی جاتی ہے اور اپنے درجہ کے موافق اُس روح کو آسمانوں میں سے کسی آسمان میں کوئی مقام ملتا ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس مقام تک اُس روح کا رفع عمل میں آیا ہے تا جیساکہ باطنی طور پر اُس روح کا درجہ تھا خارجی طور پر وہ درجہ ثابت کرکے دکھلایا جائے سو یہ رفع جو آسمان کی طرف ہوتا ہے تحقیق درجات کے لیے وقوع میں آتا ہے اور آیت مذکورہ بالا میں جو وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ہے یہ اشارہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رفع تمام نبیوں کے رفع سے بلند تر ہے اور اُن کی روح مسیح کی روح کی طرح دوسرے آسمان میں نہیں اور نہ حضرت موسیٰ کی روح کی طرح چھٹے آسمان میں بلکہ سب سے بلند تر ہے اسی کی طرف معراج کی حدیث بہ تصریح دلالت کررہی ہے بلکہ معالم النبوت میں بہ صفحہ ۵۱۷ یہ حدیث لکھی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں چھٹے آسمان

سے آگے گذر گئے تو حضرت موسیٰ نے کہا رَبِّ لَمْ اَظُنَّ اَنْ یُّرْفَعَ عَلَیَّ اَحَدٌ یعنی اے میرے خداوند مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ کوئی نبی مجھ سے اوپر اُٹھایا جائے گا اور اپنے رفع میں مجھ سے آگے بڑھ جائے گا۔ اب دیکھو کہ رفع کا لفظ محض تحقق درجات کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور آیت موصوفہ بالا کے احادیث نبویہ کی رو سے یہ معنے کھلے کہ ہر یک نبی اپنے درجہ کے موافق آسمانوں کی طرف اٹھایا جاتا ہے اور اپنے قرب کے انداز کے موافق رفع سے حصہ لیتا ہے اور انبیاء اور اولیاء کی روح اگرچہ دنیوی حیات کے زمانہ میں زمین پر ہو مگر پھر بھی اُس آسمان سے اُس کا تعلق ہوتا ہے جو اس کی روح کے لیے حد رفع ٹھہرایا گیا ہے اور موت کے بعد وہ رُوح اُس آسمان میں جا ٹھہرتی ہے جو اُس کے لیے حد رفع مقرر کیا گیا ہے چنانچہ وہ حدیث جس میں عام طور پر موت کے بعد روحوں کے اُٹھائے جانے کا ذکر ہے اِس بیان کی مؤیّد ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۳۴۳ تا ۳۴۵)

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ اِس جگہ صاحب درجات رفیعہ سے ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جن کو ظلّی طور پر انتہائی درجہ کے کمالات جو کمالات الوہیت کے اظلال و آثار ہیں بخشے گئے اور وُہ خلافتِ حقّہ جس کے وجود کامل کے تحقق کے لیے سلسلہ بنی آدم کا قیام بلکہ ایجاد کُل کائنات کا ہوا ہے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وجود باجود سے اپنے مرتبہ اتمّ و اکمل میں ظہور پذیر ہو کر آئنہ خدا نما ہوئے۔ (سُرمہ چشم آریہ ص۱۸۶-۱۸۷ حاشیہ)

اِس رفع درجات سے وہی انتہائی درجہ کا ارتفاع مراد ہے جو ظاہری اور باطنی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اور یہ وجود باجود جو خیر مُجسّم ہے مقرّبین کے تین قسموں سے اعلیٰ و اکمل ہے جو الوہیّت کا مظہر اتمّ کہلاتا ہے۔ (سرمہ چشم آریہ ص۲۰۸ حاشیہ)

یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اولیاء اللہ کے بھی کئی درجات ہوتے ہیں اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ بعض بعض پر فضیلت رکھتے ہیں بلکہ بعض اُس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ ادنیٰ درجہ کے صلحاء اُن کو شناخت نہیں کر سکتے اور اُن کے مقام عالی سے منکر رہتے ہیں اور یہ اُن کے لیے ابتلا اور ٹھوکر کا باعث ہو جاتا ہے اصل بات یہ ہے کہ ربوبیت کی تجلیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ جو اخص العباد ہوتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ کی تجلی سے مخصوص کیے جاتے ہیں دوسروں کو اس تجلی سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اگرچہ خدا ایک ہے اور واحد لاشریک ہے مگر پھر بھی مختلف تجلّیات کے اعتبار سے ہر ایک کا جدا جدا ربّ ہے یہ نہیں کہ ربّ بہت ہیں ربّ ایک ہی ہے جو سب کا ربّ ہے اور کثرت کا قائل کافر ہے مگر تعلّقات کے مختلف مراتب کے لحاظ سے اور صفات الٰہیّہ کے ظہور کی کمی بیشی کے لحاظ سے ہر ایک کا جدا جدا ربّ کہنا پڑتا ہے جیسا کہ بہت سے آئینے اگر ایک چہرہ کے مقابل پر رکھے جائیں جن میں سے بعض آئینے اس قدر چھوٹے ہوں کہ جیسے آرسی کا شیشہ ہوتا ہے اور بعض اس سے بھی چھوٹے اور بعض اس قدر چھوٹے کہ گویا آرسی کے آئینہ سے پچاسواں حصہ ہیں اور بعض آرسی کے آئینہ سے کسی قدر بڑے ہیں اور بعض اس قدر بڑے ہیں

کہ ان میں پورا چہرہ نظر آسکتا ہے پس اس میں شک نہیں کہ اگرچہ چہرہ ایک ہی ہے لیکن جس قدر آئینہ چھوٹا ہوگا چہرہ بھی اس میں چھوٹا دکھائی دیگا۔ یہاں تک کہ بعض نہایت چھوٹے آئینوں میں ایک نقطہ کی طرح چہرہ نظر آئے گا اور ہرگز پورا چہرہ نظر نہیں آئے گا جب تک پورا آئینہ نہ ہو پس اس میں کچھ شک نہیں کہ چہرہ تو ایک ہے اور یہ بات واقعی صحیح ہے لیکن جو بظاہر مختلف آئینوں میں نظر آتا ہے اُس کی نسبت یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ وہ باعتبار اُس نمایش کے ایک چہرہ نہیں ہے بلکہ کئی چہرے ہیں اسی طرح ربوبیت الہٰیہ ہر ایک کے لیے ایک درجہ پر ظاہر نہیں ہوتی انسانی نفس تزکیہ کے بعد ایک آئینہ کا حکم رکھتا ہے جس میں ربوبیت الہٰیہ کا چہرہ منعکس ہوتا ہے مگر گو کسی کے لیے تزکیہ نفس حاصل ہوگیا ہو مگر فطرت کے لحاظ سے تمام نفوس انسانیہ برابر نہیں ہیں کسی کا دائرہ استعداد بڑا ہے اور کسی کا چھوٹا جس طرح اجرام سماویہ چھوٹے بڑے ہیں۔ پس جو چھوٹی استعداد کا نفس ہے گو اس کا تزکیہ بھی ہوگیا مگر چونکہ استعداد کی رو سے اس نفس کا ظرف چھوٹا ہے اس لیے ربوبیت الہٰیہ اور تجلیات ربانیہ کا عکس بھی اس میں چھوٹا ہوگا پس اس لحاظ سے اگرچہ رب ایک ہے لیکن ظروف نفسانیہ میں منعکس ہونے کے وقت بہت سے رب نظر آئیں گے۔ یہی بھید ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہی کہتے تھے کہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم یعنے میرا رب سب سے بڑا اور بزرگ ہے۔ پس اگرچہ ربّ تو ایک ہے مگر تجلیات عظیمہ اور ربوبیت عالیہ کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رب سب سے اعلیٰ ہے۔

پھر اس جگہ ایک اور نکتہ ہے کہ چونکہ مدارج قرب اور تعلق حضرت احدیت کے مختلف ہیں اس لیے ایک شخص باوجود خدا کا مقرب ہونے کے جب ایسے شخص سے مقابلہ کرتا ہے جو قرب اور محبت کے مقام میں اس سے بہت بڑھ کر ہے تو آخر نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص جو ادنیٰ درجہ کا قرب الٰہی رکھتا ہے نہ صرف ہلاک ہوتا ہے بلکہ بے ایمان ہو کر مرتا ہے جیسا کہ موسیٰ کے مقابل پر بلعم باعور کا حال ہوا۔ پہلے تو وہ مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف تھا اور اُس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں اور تمام ملک میں ولی کہلاتا تھا اور صاحب کرامات تھا لیکن جب خواہ نخواہ موسیٰ کے ساتھ مقابلہ کر بیٹھا اور اپنی قدر کو شناخت نہ کیا تب ولایت اور قرب کے مقام سے گرایا گیا اور خدا نے کتّے کے ساتھ اُس کو مثال دی۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۳۳۲-۳۳۴)

کروڑہا نیک بندوں کو الہام ہوتا رہا ہے مگر ان کا مرتبہ خدا کے نزدیک ایک درجہ کا نہیں بلکہ خدا کے پاک نبی جو پہلے درجہ پر کمال صفائی سے خدا کا الہام پانے والے ہیں وہ بھی مرتبہ میں برابر نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یعنی بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ الہام محض فضل ہے اور فضیلت کے وجود میں اس کو دخل نہیں بلکہ فضیلت اس صدق اور اخلاص اور وفاداری کے قدر پر ہے جس کو خدا جانتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۲۱)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت انسانی فطرت کے انتہا تک پہنچی ہوتی ہے اس لیے قرآن شریف کامل

نازل ہُوا۔ اور یہ کچھ بُرا ماننے کی بات نہیں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یعنی بعض نبیوں کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے اور ہمیں حکم ہے کہ تمام احکام میں اخلاق میں عبادات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں پس اگر ہماری فطرت کو وہ قوتیں نہ دی جاتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات کو ظلّی طور پر حاصل کرسکتیں تو یہ حکم ہمیں ہرگز نہ ہوتا کہ اس بزرگ نبی کی پیروی کرو کیونکہ خدا تعالیٰ فوق الطاقت کوئی تکلیف نہیں دیتا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۲)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○

اللہ جو جامع صفاتِ کاملہ اور مستحق عبادت ہے اُس کا وجود بدیہی الثبوت ہے کیونکہ وہ حیّ بالذات اور قائم بالذات ہے بجز اُس کے کوئی چیز حیّ بالذات اور قائم بالذات نہیں یعنی اُس کے بغیر کسی چیز میں یہ صفت پائی نہیں جاتی کہ بغیر کسی علّتِ موجدہ کے آپ ہی موجود اور قائم رہ سکے یا کہ اِس عالم کی جو کمال حکمت اور ترتیب محکم اور موزون سے بنایا گیا ہے علّتِ موجبہ ہوسکے اور یہ امر اُس صانع عالم جامع صفاتِ کاملہ کی ہستی کو ثابت کرنے والا ہے تفصیل اس استدلال لطیف کی یہ ہے کہ یہ بات بہ بداہت ثابت ہے کہ عالم کے اشیاء میں سے ہر یک موجود جو نظر آتا ہے اُس کا وجود اور قیام نظراً علیٰ ذاتہٖ ضروری نہیں مثلاً زمین کروی الشکل ہے اور قطر اُس کا بعض کے گمان کے موافق تخمیناً چار ہزار کوس پختہ ہے مگر اِس بات پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی کہ کیوں یہی شکل اور یہی مقدار اُس کے لیے ضروری ہے اور کیوں جائز نہیں کہ اِس سے زیادہ یا اِس سے کم ہو یا برخلاف شکل حاصل کے کسی اَور شکل سے متشکل ہو اور جب اس پر کوئی دلیل قائم نہ ہوئی تو یہ شکل اور یہ مقدار جس کے مجموعہ کا نام وجود ہے زمین کے لیے ضروری نہ ہوا۔ اور علیٰ ہذا القیاس عالم کی تمام اشیا کا وجود اور قیام غیر ضروری ٹھہرا اور صرف یہی بات

نہیں کہ وجود ہر یک ممکن کا نظرِ اعلیٰ ذاتہٖ غیر ضروری ہے بلکہ بعض صورتیں ایسی نظر آتی ہیں کہ اکثر چیزوں کے معدوم ہونے کے اسباب
بھی قائم ہوجاتے ہیں پھر وہ چیزیں معدوم نہیں ہوتیں مثلاً باوجود اس کے کہ سخت سخت قحط اور وبا پڑتی ہیں مگر پھر بھی ابتدا زمانہ سے
تخم ہر یک چیز کا بچتا چلا آیا ہے حالانکہ عند العقل جائز بلکہ واجب تھا کہ ہزارہا شدائد اور حوادث میں سے جو ابتدا
سے دُنیا پر نازل ہوتے رہے کبھی کسی دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ شدت قحط کے وقت غلہ جو کہ خوراک انسان کی ہے بالکل مفقود
ہوجاتا یا کوئی قسم غلہ کی مفقود ہوجاتی یا کبھی شدّت وبا کے وقت نوع انسان کا نام ونشان باقی نہ رہتا یا کوئی اور
انواع حیوانات میں سے مفقود ہوجاتے یا کبھی اتفاقی طور پر سورج یا چاند کی کل بگڑ جاتی یا دوسری بے شمار چیزوں
سے جو عالم کی درستی نظام کے لیے ضروری ہیں کسی چیز کے وجود میں خلل راہ پا جاتا کیونکہ کروڑہا چیزوں کا اختلال و فساد
سے سالم رہنا اور کبھی اُن پر آفت نازل نہ ہونا قیاس سے بعید ہے پس جو چیزیں نہ ضروری الوجود ہیں نہ ضروری القیام
بلکہ اُن کا کبھی نہ کبھی بگڑ جانا اُن کے باقی رہنے سے زیادہ تر قرینِ قیاس ہے اُن پر کبھی زوال نہ آنا اور احسن طور پر
بہ ترتیب محکم اور ترکیب ابلغ اُن کا وجود اور قیام پایا جانا اور کروڑہا ضروریاتِ عالم میں سے کبھی کسی چیز کا مفقود
نہ ہونا صریح اس بات پر نشان ہے کہ اُن سب کے لیے ایک محیی اور محافظ اور قیوم ہے جو جامع صفاتِ کاملہ
یعنی مدبّر اور حکیم اور رحمان اور رحیم اور اپنی ذات میں ازلی ابدی اور ہر یک نقصان سے پاک ہے جس پر کبھی موت اور
فنا طاری نہیں ہوتی بلکہ اونگھ اور نیند سے بھی جو فی الجملہ موت سے مشابہ ہے پاک ہے سو وہی ذات جامع صفات
کاملہ ہے جس نے اس عالم امکانی کو برعایت کمال حکمت و موزونیت وجود عطا کیا اور ہستی کو نیستی پر ترجیح بخشی اور
وہی بوجہ اپنی کمالیت اور خالقیت اور ربوبیّت اور قیومیّت کے مستحق عبادت ہے یہاں تک تو ترجمہ اس آیت کا ہوا
اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ اب
بنظرِ انصاف دیکھنا چاہیئے کہ کس بلاغت اور لطافت اور متانت اور حکمت سے اس آیت میں وجودِ صانع عالم پر
دلیل بیان فرمائی ہے اور کس قدر تھوڑے لفظوں میں معانی کثیرہ اور لطائف حکمیہ کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور
مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کے لیے ایسی محکم دلیل سے وجود ایک خالق کامل الصفات کا ثابت کر دکھایا ہے
جس کے کامل اور محیط بیان کے برابر کسی حکیم نے آجتک کوئی تقریر بیان نہیں کی بلکہ حکماء ناقص الفہم نے ارواح اور
اجسام کو حادث بھی نہیں سمجھا اور اس رازِ دقیق سے بیخبر رہے کہ حیات حقیقی اور ہستی حقیقی اور قیامِ حقیقی صرف خدا
ہی کے لیے مسلّم ہے یہ عمیق معرفت اسی آیت سے انسان کو حاصل ہوتی ہے جس میں خدا نے فرمایا کہ حقیقی طور پر
زندگی اور بقاء زندگی صرف اللہ کے لیے حاصل ہے جو جامع صفاتِ کاملہ ہے اس کے بغیر کسی دوسری چیز کو وجودِ
حقیقی اور قیامِ حقیقی حاصل نہیں اور اسی بات کو صانع عالم کی ضرورت کے لیے دلیل ٹھہرایا اور فرمایا لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی جبکہ عالم کے لیے نہ حیاتِ حقیقی حاصل ہے نہ قیامِ حقیقی تو بالضرور اُس کو ایک علّتِ موجبہ کی حاجت ہے

جس کے ذریعہ سے اس کو حیات اور قیام حاصل ہوا اور ضرور ہے کہ ایسی علّتِ موجبہ جامع صفاتِ کاملہ اور مدبّر بالارادہ اور حکیم اور عالم الغیب ہو سو وہی اللہ ہے کیونکہ اللہ بموجب اصطلاحِ قرآنِ شریف کے اُس ذات کا نام ہے جو مستجمع کمالاتِ تامہ ہے اسی وجہ سے قرآنِ شریف میں اللہ کے اسم کو جمیع صفاتِ کاملہ کا موصوف ٹھہرایا ہے۔ اور جا بجا فرمایا ہے کہ اللہ وہ ہے جو کہ رب العالمین ہے رحمان ہے رحیم ہے مدبّر بالارادہ ہے حکیم ہے عالم الغیب ہے قادرِ مُطلق ہے ازلی ابدی ہے وغیرہ وغیرہ سو یہ قُرآن شریف کی ایک اصطلاح ٹھہر گئی ہے کہ اللہ ایک ذات جامع جمیع صفاتِ کاملہ کا نام ہے اسی جہت سے اِس آیت کے سر پر بھی اللہ کا اسم لائے اور فرمایا اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یعنی اِس عالمِ بے ثبات کا قیوم ذات جامع الکمالات ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ عالم جس ترتیبِ محکم اور ترکیبِ ابلغ سے موجود اور مُترتب ہے اُس کے لیے یہ گمان کرنا باطل ہے کہ اُنہیں چیزوں میں سے بعض چیزیں بعض کے لیے علّتِ موجبہ ہو سکتی ہیں بلکہ اِس حکیمانہ کام کے لیے جو سراسر حکمت سے بھرا ہوا ہے ایک ایسے صانع کی ضرورت ہے جو اپنی ذات میں مدبّر بالارادہ اور حکیم اور علیم اور رحیم اور غیر فانی اور تمام صفاتِ کاملہ سے متّصف ہو سو وہی اللہ ہے جس کو اپنی ذات میں کمال تام حاصل ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۲۳،۴۳۰ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔

یعنی خدا اپنی ذات میں سب مخلوقات کے معبود ہونے کا ہمیشہ حق رکھتا ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس دلیل روشن سے کہ وہ زندہ ازلی ابدی ہے اور سب چیزوں کا وہی قیوم ہے یعنی قیام اور بقا ہر چیز کا اسی کے بقاء اور قیام سے ہے اور وہی ہر چیز کو ہر دم تھامے ہوئے ہے نہ اس پر اونگ طاری ہوتی ہے نہ نیند اسے پکڑتی ہے یعنی حفاظت مخلوق سے کبھی غافل نہیں ہوتا پس جبکہ ہر ایک چیز کی قائمی اسی سے ہے پس ثابت ہے کہ ہر ایک مخلوقات آسمانوں کا اور مخلوقات زمین کا وہی خالق ہے اور وہی مالک۔ اور شکل اس قیاس کی جو آیت شریف میں وارد ہے بقاعدہ منطقیہ اس طرح پر ہے (جزاول قیاس مرکب کی) (صغریٰ) خدا کو بلا شرکۃ الغیر تمام مخلوقات کے معبود ہونے کا حق ازلی ابدی ہے (کبریٰ) اور جس کو تمام مخلوقات کے معبود ہونے کا حق ازلی ابدی ہو وہ زندہ ازلی ابدی اور تمام چیزوں کا قیوم ہوتا ہے (نتیجہ) خدا زندہ ازلی ابدی اور تمام چیزوں کا قیوم ہے (جز ثانی قیاس مرکب کی کہ جس میں نتیجہ قیاس اول کا صغریٰ قیاس کا بنایا گیا ہے) (صغریٰ) (خداوند ازلی ابدی اور تمام چیزوں کا قیوم ہے) (کبریٰ) (اور جو زندہ ازلی ابدی اور تمام چیزوں کا قیوم ہو وہ تمام اشیاء کا خالق ہوتا ہے) (نتیجہ) (خدا تمام چیزوں کا خالق ہے) صغریٰ جزاول قیاس مرکب کا یعنی یہ قضیہ کہ خدا کا بلا شرکۃ الغیر (سے) تمام مخلوقات کے معبود ہونے کا حق ازلی ابدی ہے باقرار فریق ثانی ثابت ہے۔ پس حاجت اقامت دلیل کی نہیں اور کبریٰ جزاوّل قیاس مرکب کا یعنی یہ قضیہ کہ جس کو تمام اشیاء کے معبود ہونے کا حق ازلی ابدی ہو وہ زندہ ازلی ابدی اور تمام اشیاء کا قیوم ہوتا ہے۔ اس طرح پر ثابت

ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ ازلی ابدی زندہ نہیں ہے تو یہ فرض کرنا پڑا کہ کسی وقت پیدا ہوا یا آیندہ کسی وقت باقی نہیں رہے گا دونوں صورتوں میں ازلی ابدی معبود ہونا اس کا باطل ہوتا ہے کیونکہ جب اس کا وجود ہی نہ رہا تو پھر عبادت اس کی نہیں ہوسکتی کیونکہ عبادت معدوم کی صحیح نہیں ہے اور جب وہ بوجہ معدوم ہونے کے معبود ازلی ابدی نہ رہا تو اس سے یہ قضیہ کاذب ہوا کہ خدا کو معبود ہونے کا حق ازلی ابدی ہے۔ حالانکہ ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ یہ قضیہ صادق ہے پس ماننا پڑا کہ جس کو تمام اشیاء کے معبود ہونے کا حق ازلی ابدی ہو وہ زندہ ازلی ابدی ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر خدا تمام چیزوں کا قیّوم نہیں یعنی حیات اور بقا دوسروں کی اس کی حیات اور بقا پر موقوف نہیں تو اس صورت میں وجود اس کا بقاء مخلوقات کے واسطے کچھ شرط نہ ہو گا۔ بلکہ تاثیر اس کی بطور موثر بالقسر ہوگی نہ بطور علت حقیقۃ حافظ الاشیاء کے کیونکہ موثر بالقسر اسے کہتے ہیں کہ جس کا وجود اور بقا اس کے متاثر کے بقا کے واسطے شرط نہ ہو جیسے زید نے مثلاً ایک پتھر چلایا اور اسی وقت پتھر چلاتے ہی مرگیا تو بیشک اس پتھر کو جو بھی اس کے ہاتھ سے چھٹا ہے بعد موت زید کے بھی حرکت رہے گی۔ پس اسی طرح اگر بقول آریہ سماج والوں کے خدائے تعالیٰ کو محض موثر بالقسر قرار دیا جائے تو اس سے نعوذ باللہ یہ لازم آتا ہے کہ اگر پرمیشر کی موت بھی فرض کریں تو بھی ارواح اور ذرّات کا کچھ بھی حرج نہ ہو کیونکہ بقول پنڈت دیانند صاحب کے کہ جس کو انہوں نے ستیا ارتھ پرکاش میں درج فرما کر توحید کا ستیا ناس کیا ہے اور نیز بقول پنڈت کھڑک صاحب کے کہ جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے تقلید پنڈت دیانند صاحب کی اختیار کی ہے۔ وید میں یہ لکھا ہے کہ سب ارواح اپنی بقاء اور حیات میں بالکل پرمیشر سے بے غرض ہیں اور جیسے بڑھئی کو چوکی سے اور کمہار کو گھڑے سے نسبت ہوتی ہے وہی پرمیشر کو مخلوقات سے نسبت ہے یعنی صرف جوڑنے جاڑنے سے ٹنٹا پرمیشر گری کا چلاتا ہے اور قیوم چیزوں کا نہیں ہے لیکن ہر ایک دانا جانتا ہے کہ ایسا ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ پرمیشر کا وجود بھی مثل کمہاروں اور نجاروں کے وجود کے بقاء اشیاء کے لیے کچھ شرط نہ ہو بلکہ جیسے بعد موت کمہاروں اور بڑھئیوں کے گھڑے اور چوکیاں اسی طرح بنے رہتے ہیں۔ اسی طرح بصورت فوت ہونے پرمیشر کے بھی اشیاء موجودہ میں کچھ بھی خلل واقع نہ ہو سکے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ خیال پنڈت صاحب کا جو پرمیشر کو صانع ہونے میں کمہار اور بڑھئی سے مشابہت ہے قیاس مع الفارق ہے۔ کاش اگر وہ خدا کو قیوم اشیاء کا مانتے اور کمہاروں سا نہ جانتے تو ان کو یہ تو کہنا نہ پڑتا کہ پرمیشر کی موت فرض کرنے سے روحوں کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ لیکن شاید وید میں یہی لکھا ہوگا۔ ورنہ میں کیونکر کہوں کہ پنڈت صاحب کو قیومیت پروردگار میں جو اجلیٰ ابدیہیات ہے کچھ شک ہے۔ اور اگر پنڈت صاحب پرمیشر کو قیوم سب چیزوں کا مانتے ہیں تو پھر اس کو کمہاروں اور معماروں سے نسبت دینا کس قسم کی بدّیا ہے اور وید میں اس پر دلیل کیا لکھی ہے۔ دیکھو فرقان مجید میں صفت قیومی پروردگار کی کئی مقام میں ثابت کی ہے جیسا کہ مکرر اس دوسری آیت میں بھی فرمایا ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[لے]

لے۔ النور: ۳۶

یعنی خدا آسمان وزمین کا نور ہے اسی سے طبقۂ سفلی اور علوی میں حیات اور بقا کی روشنی ہے۔ پس اس ہماری تحقیق سے جزاول قیاس مرکب کی ثابت ہوئی اور صغریٰ جزثانی قیاس مرکب کا وہی ہے جو جزاول قیاس مرکب کا نتیجہ ہے اور جزاوّل قیاس مرکب کی ابھی ثابت ہو چکی ہے پس نتیجہ بھی ثابت ہوگیا۔

اور کبریٰ جزثانی کا جو زندہ ازلی ابدی اور قیوم سب چیزوں کا ہو وہ خالق ہوتا ہے۔ اس طرح پر ثابت ہے کہ قیوم اُسے کہتے ہیں کہ جس کا بقا اور حیات دوسری چیزوں کے بقا اور حیات اور اُن کے کل مایحتاج کے حصول کا شرط ہو اور شرط کے یہ معنے ہیں کہ اگر اُس کا عدم فرض کیا جائے تو ساتھ ہی مشروط کا عدم فرض کرنا پڑے جیسے کہیں کہ اگر خدائے تعالیٰ کا وجود نہ ہو تو کسی چیز کا وجود نہ ہو۔ پس یہ قول کہ اگر خدائے تعالیٰ کا وجود نہ ہو تو کسی چیز کا وجود نہ ہو بعینہٖ اس قول کے مساوی ہے کہ خدائے تعالیٰ کا وجود نہ ہوتا تو کسی چیز کا وجود نہ ہوتا پس اس سے ثابت ہوا کہ خدائے تعالیٰ کا وجود دوسری چیزوں کے وجود کا علت ہے اور خالقیت کے بجز اس کے اور کوئی معنے نہیں کہ وجود خالق کا وجود مخلوق کے لیے علت ہو۔ پس ثابت ہوگیا کہ خدا خالق ہے اور یہی مطلب تھا۔

(پرانی تحریریں صفحہ ۱۲-۱۴)

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ کہ وہی معبود برحق ہر یک چیز کی جان اور ہر یک وجود کا سہارا ہے۔
(شحنۂ حق صفحہ ۵۴)

یعنی وُہی خدا ہے اُس کے سوا کوئی نہیں وہی ہر ایک جان کی جان اور ہر ایک وجود کا سہارا ہے۔ اس آیت کے لفظی معنے یہ ہیں کہ زندہ وہی خُدا ہے اور قائم بالذّات وہی خدا ہے۔ پس جبکہ وُہی ایک زندہ ہے اور وہی ایک قائم بالذّات ہے تو اِس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص جو اس کے سوا زندہ نظر آتا ہے وُہ اُسی کی زندگی سے زندہ ہے اور ہر ایک جو زمین یا آسمان میں قائم ہے وہ اسی کی ذات سے قائم ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۱۲)

حقیقی وجود اور حقیقی بقا اور تمام صفات حقیقیہ خاص خدا کے لیے ہیں کوئی اُن میں اس کا شریک نہیں وہی بذاتہٖ زندہ ہے اور باقی تمام زندے اُس کے ذریعہ سے ہیں۔ اور وہی اپنی ذات سے آپ قائم ہے اور باقی تمام چیزوں کا قیام اس کے سہارے سے ہے اور جیسا کہ موت اُس پر جائز نہیں ایسا ہی ادنیٰ درجہ کا تعطّل حواس بھی جو نیند اور اونگھ سے ہے وہ بھی اُس پر جائز نہیں۔ مگر دوسروں پر جیسا کہ موت وارد ہوتی ہے نیند اور اونگھ بھی وارد ہوتی ہے۔ جو کچھ تم زمین میں دیکھتے ہو یا آسمان میں وہ سب اُسی کا ہے اور اُسی سے ظہور پذیر اور قیام پذیر ہے کون ہے جو بغیر اُس کے حکم کے اُس کے آگے شفاعت کر سکتا ہے وہ جانتا ہے جو لوگوں کے آگے ہے اور جو پیچھے ہے یعنی اس کا علم حاضر اور غائب پر محیط ہے اور کوئی اس کے علم کا کچھ بھی احاطہ نہیں کر سکتا لیکن جس قدر وہ چاہے۔ اس کی قدرت اور علم کا تمام زمین وآسمان پر تسلط ہے وہ سب کو اُٹھائے ہوئے ہے یہ نہیں کہ کسی چیز

نے اُس کو اُٹھا رکھا ہے اور وہ آسمان و زمین اور اُن کی تمام چیزوں کے اُٹھانے سے تھکتا نہیں اور وہ اس بات سے بزرگ تر ہے کہ ضعف و ناتوانی اور کم قدرتی اُس کی طرف منسوب کی جائے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۶۱-۲۶۲)

تمام مخلوقات اجرام فلکی سے لیکر ارضی تک اپنی بناوٹ ہی میں عبودیت کا رنگ رکھتی ہے ہر پتے سے یہ پتا ملتا ہے اور ہر شاخ اور آواز سے یہ صدا نکلتی ہے کہ الوہیت اپنا کام کر رہی ہے۔ اُس کے عمیق در عمیق تصرفات جن کو ہم خیال اور قوت سے بیان نہیں کر سکتے بلکہ کامل طور پر سمجھ بھی نہیں سکتے اپنا کام کر رہے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ایک ایسی ذات ہے جو جامع صفات کاملہ اور ہر ایک نقص سے منزہ ہے وہی مستحق عبادت ہے۔ اُسی کا وجود بدیہی الثبوت ہے۔ کیونکہ وہ حیّ بالذات اور قائم بالذات ہے۔ اور بجز اُس کے اور کسی چیز میں حیّ بالذات اور قائم بالذات ہونے کی صفت نہیں پائی جاتی۔ کیا مطلب کہ اللہ تعالیٰ کے بدوں اور کسی میں یہ صفت نظر نہیں آتی کہ بغیر کسی علت موجبہ کے آپ ہی موجود اور قائم ہو۔ یا کہ اُس عالم کی جو کمال حکمت اور ترتیب محکم و موزون سے بنایا گیا ہے۔ علت موجبہ ہو سکے۔ غرض اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو ان مخلوقات عالم میں تغیر و تبدل کر سکتا ہو یا ہر ایک نفس کی حیات کا موجب اور قیام کا باعث ہو۔ اس آیت پر نظر کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وجودی مذہب حق سے دُور چلا گیا ہے اور اُس نے صفات آلہیہ کے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ معلوم نہیں کر سکتا کہ اُس نے عبودیت اور الوہیت کے ہی رشتہ پر ٹھوکر کھائی ہے۔ اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن میں سے جو لوگ اہل کشف ہوئے ہیں اور اُن میں سے اہل مجاہدہ نے دریافت کرنا چاہا تو عبودیت اور ربوبیت کے رشتہ میں امتیاز نہ کر سکے اور خلق الاشیاء کے قائل ہو گئے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۸-۱۳۹)

ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یعنی حقیقی حیات اُسی کو ہے اور دوسری سب چیزیں اُس سے پیدا اور اُس کے ساتھ زندہ ہیں یعنی درحقیقت سب جانوں کی جان اور سب طاقتوں کی طاقت وُہی ہے۔ لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ وُہ قدیم سے الگ کا الگ چلا آتا ہے اور اُس کی ربوبیت کا کسی چیز پر احاطہ نہیں اور کوئی چیز اُس سے ظہور پذیر نہیں ہوئی تو اِس صورت میں علم کائنات تو اُسے کیا ہو گا بلکہ محدود چیزوں میں سے وُہ بھی ایک چیز ہو گی جس کا کوئی اَور محدّد تلاش کرنا پڑے گا۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۷۶-۱۷۷ حاشیہ)

خدا تعالیٰ کے دو نام ہیں ایک حیّ۔ دوسرا قیّوم۔ حیّ کے یہ معنے ہیں کہ خود بخود زندہ اور دوسری چیزوں کو زندگی بخشنے والا۔ اور قیّوم کے یہ معنے ہیں کہ اپنی ذات میں آپ قائم اور اپنی پیدا کردہ چیزوں کو اپنے سہارے سے باقی رکھنے والا۔ پس خدا تعالیٰ کے نام قیّوم سے وہ چیز فائدہ اُٹھا سکتی ہے جو پہلے اِس سے اُس کے نام حیّ سے فائدہ اُٹھا چکی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ اپنی پیدا کردہ چیزوں کو سہارا دیتا ہے نہ ایسی چیزوں کو جن کے وجود اور ہستی کو اس کا ہاتھ

ہی نہیں چھوا۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کو حیّ یعنی پیدا کرنے والا مانتا ہے اُسی کا حق ہے کہ اُس کو قیوم بھی مانے یعنی اپنی پیدا کردہ کو اپنی ذات سے سہارا دینے والا۔ لیکن جو شخص خدا تعالیٰ کو حیّ یعنی پیدا کرنے والا نہیں جانتا اس کا حق نہیں ہے کہ اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھے کہ وہ اُن چیزوں کو ان کے رہنے میں سہارا دینے والا ہے کیونکہ سہارا دینے کے یہ معنے ہیں کہ اگر اُس کا سہارا نہ ہو۔ وہ چیزیں معدوم ہو جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا اُس کی طرف سے وجود نہیں وہ چیزیں اپنے بقائے وجود میں اُس کی محتاج بھی نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر وہ بقائے وجود میں محتاج ہیں تو اُس وجود کی پیدائش میں بھی محتاج ہیں غرض خدا تعالیٰ کے یہ دونوں اسم حیّ و قیّوم اپنی تاثیر میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کبھی علیحدہ علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ پس جن لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ خدا روحوں اور ذرّات کا پیدا کرنے والا نہیں وہ اگر عقل اور سمجھ سے کچھ کام لیں تو ان کو اقرار کرنا پڑیگا کہ خدا تعالیٰ اُن چیزوں کا قیّوم بھی نہیں یعنی وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ کے سہارے سے ذرّات یا ارواح پیدا ہوئے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے سہارے کی محتاج وہ چیزیں ہیں جو اُس کی پیدا کردہ ہیں غیر کو جو اپنے وجود میں اُس کا محتاج نہیں اُس کے سہارے کی کیوں حاجت پڑ گئی یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۳۶-۳۸)

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے قرآن شریف نے دو نام پیش کیے ہیں اَلْحَیّ اور اَلْقَیُّوم۔ اَلْحَیّ کے معنے ہیں خود زندہ اور دوسروں کو زندگی عطا کرنے والا۔ اَلْقَیُّوم خود قائم اور دوسروں کے قیام کا اصلی باعث۔ ہر ایک چیز کا ظاہری باطنی قیام اور زندگی انہیں دونوں صفات کے طفیل سے ہے پس حَیّ کا لفظ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت کی جائے جیسا کہ اس کا مظہر سورۃ فاتحہ میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ ہے اور القیوم چاہتا ہے کہ اس سے سہارا طلب کیا جاوے اس کو اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

حَیّ کا لفظ عبادت کو اس لیے چاہتا ہے کہ اس نے پیدا کیا اور پھر پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا جیسے مثلاً معمار جس نے عمارت کو بنایا ہے اس کے مر جانے سے عمارت کا کوئی حرج نہیں ہے مگر انسان کو خدا کی ضرورت ہر حال میں لاحق رہتی ہے اس لیے ضروری ہوا کہ خدا سے طاقت طلب کرتے رہیں اور یہی استغفار ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ...... وہی ایک سب کا رب ہے۔ (ست بچن صفحہ ۸۵)

(مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ) مُشرک لوگ بھی اپنے معبودوں سے عبث طور پر مدد طلب کرتے ہیں جس پر کوئی فایدہ مترتب نہیں ہو سکتا گو کوئی مقرب الٰہی ہو مگر کسی کی مجال نہیں کہ خواہ نخواہ سفارش کر کے کسی مجرم کو رہا کرا دے خدا کا علم اُن کے پیش و پس پر محیط ہو رہا ہے اور اُن کو خدا کے علوم سے صرف اُسی قدر اطلاع ہوتی ہے جن باتوں پر وہ آپ مطلع کرے اِس سے زیادہ نہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

خدا کے اذن کے سوا کوئی شفاعت نہیں ہو سکتی۔ قرآن شریف کی رو سے شفاعت کے معنے یہ ہیں کہ ایک شخص اپنے بھائی کے لیے دعا کرے کہ وہ مطلب اس کو حاصل ہو جائے یا کوئی بلا ٹل جائے۔ پس قرآن شریف کا حکم ہے کہ جو شخص خدائے تعالیٰ کے حضور میں زیادہ جھکا ہوا ہے وہ اپنے کمزور بھائی کے لیے دُعا کرے کہ اُس کو وہ مرتبہ حاصل ہو یہی حقیقت شفاعت ہے۔ سو ہم اپنے بھائیوں کے لیے بیشک دعا کرتے ہیں کہ خدا اُن کو قوّت دے اور اُن کی بلا دور کرے اور یہ ایک ہمدردی کی قسم ہے پس اگر وید نے اس ہمدردی کو نہیں سکھلایا اور وید کی رو سے ایک بھائی دوسرے کے لیے دُعا نہیں کر سکتا تو یہ بات وید کے لیے قابل تعریف نہیں بلکہ ایک سخت عیب ہے۔ چونکہ تمام انسان ایک جسم کی طرح ہیں اس لیے خدا نے ہمیں بار بار سکھلایا ہے کہ اگرچہ شفاعت کو قبول کرنا اُس کا کام ہے مگر تم اپنے بھائیوں کی شفاعت میں یعنی اُن کے لیے دعا کرنے میں لگے رہو اور شفاعت سے یعنی ہمدردی کی دُعا سے باز نہ رہو کہ تمہارا ایک دوسرے پر حق ہے۔ اصل میں شفاعت کا لفظ شفع سے لیا گیا ہے شفع جُفت کو کہتے ہیں جو طاق کی ضد ہے۔ پس انسان کو اس وقت شفیع کہا جاتا ہے جبکہ وہ کمال ہمدردی سے دوسرے کا جفت ہو کر اُس میں فنا ہو جاتا ہے اور دوسرے کے لیے ایسی ہی عافیت مانگتا ہے جیسا کہ اپنے نفس کے لیے۔ اور یاد رہے کہ کسی شخص کا دین کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ شفاعت کے رنگ میں ہمدردی اس میں پیدا نہ ہو بلکہ دین کے دو ہی کامل حصّے ہیں ایک خدا سے محبّت کرنا اور ایک بنی نوع سے اس قدر محبت کرنا کہ اُن کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھ لینا اور اُن کے لیے دُعا کرنا جس کو دوسرے لفظوں میں شفاعت کہتے ہیں۔ (نسیم دعوت صفحہ ۹۰-۹۱)

یعنی کس کی مجال ہے کہ بغیر اذن الٰہی کے کسی کی شفاعت کر سکے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۱۹)

یاد رکھو۔ کہ خدائی کے دعوٰی کی حضرت مسیح پر سراسر تہمت ہے۔ انہوں نے ہرگز ایسا دعوی نہیں کیا۔ جو کچھ انہوں نے اپنی نسبت فرمایا ہے وہ الفاظ شفاعت کی حد سے بڑھتے نہیں۔ سو نبیوں کی شفاعت سے کس کو انکار ہے حضرت موسیٰؑ کی شفاعت سے کئی مرتبہ بنی اسرائیل بھڑکتے ہوئے عذاب سے نجات پا گئے۔ اور میں خود اس میں صاحب تجربہ ہوں۔ اور میری جماعت کے اکثر معزز خوب جانتے ہیں کہ میری شفاعت سے بعض مصائب اور امراض کے مبتلا اپنے دکھوں سے رہائی پا گئے۔ اور یہ خبریں ان کو پہلے سے دی گئی تھیں۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۴۳-۴۴)

خدا کا قدیم سے قانون قدرت ہے کہ وہ توبہ اور استغفار سے گناہ معاف کرتا ہے اور نیک لوگوں کی شفاعت کے طور پر دعا بھی قبول کرتا ہے۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۱۳)

شفیع کا لفظ شفع سے نکلا ہے جس کے معنے جفت کے ہیں۔ اس لیے شفیع وہ ہو سکتا ہے جو دو مقامات کا مظہر اتم ہو۔ یعنی مظہر کامل لاہوت اور ناسوت کا ہو۔ لاہوتی مقام کا مظہر کامل ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا خدا کی طرف صعود ہو وہ خدا سے حاصل کرے اور ناسوتی مقام کے مظہر کا یہ مفہوم ہے کہ مخلوق کی طرف اس کا نزول

ہو جو خدا سے حاصل کرے۔ وہ مخلوق کو پہنچا دے۔ اور مظہر کامل ان مقامات کا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اسی کی طرف اشارہ ہے دَنٰی فَتَدَلّٰی ہ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔[1]

ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدون کامل حصّہ مقام لاہوت کا کسی نبی میں نہیں آیا! ورناسوتی حصّہ چاہتا ہے بشری لوازم کو ساتھ رکھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں یہ ساری باتیں پوری پائی جاتی ہیں۔ آپ نے شادیاں بھی کیں۔ بچے بھی ہوئے دوستوں کا زمرہ بھی تھا۔ فتوحات کر کے اختیاری قوتوں کے ہوتے ہوئے انتقام چھوڑ کر رحم کر کے بھی دکھایا۔ جب تک انسان کے پیرایہ پورے نہ ہوں وہ پوری ہمدردی نہیں کر سکتا۔ اس حصّہ اخلاق فاضلہ میں وہ نامکمل رہے گا۔ مثلاً جس نے شادی ہی نہیں کی وہ بیوی اور بچوں کے حقوق کی کیا قدر کر سکتا ہے اور ان پر اپنی شفقت اور ہمدردی کا کیا نمونہ دکھا سکتا ہے رہبانیت ہمدردی کو دور کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رہبانیت کو نہیں رکھا۔

غرض کامل شفیع وہی ہو سکتا ہے جس میں یہ دونوں حصّے کامل طور پر پائے جائیں۔ چونکہ یہ ایک ضروری امر تھا۔ کہ شفیع ان دونوں مقامات کا مظہر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے ہی اس سلسلہ کا ظل قایم رکھا یعنی آدم علیہ السلام کو جب پیدا کیا تو لاہوتی حصہ تو اس میں یوں رکھ دیا جب کہا فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ[2] اور ناسوتی حصہ یوں رکھا کہ حوّا کو اُس سے پیدا کیا۔ یعنی جب روح پھونکی تو ایک جوڑ آدم کا خدا تعالیٰ سے قایم ہوا اور جب حوّا نکالی تو دوسرا جوڑ مخلوق کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ناسوتی ہو گیا پس جب تک یہ دونوں حصّے کامل طور پر کامل انسان میں نہ پائے جاویں وہ شفیع نہیں ہو سکتا۔ جیسے آدم کی پسلی سے حوّا نکلی اسی طرح پر کامل انسان کی پسلی سے مخلوق نکلتی ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵-۶)

تعجب ہے کہ عیسائی لوگ شفاعت کے لیے عصمت کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں نری عصمت شفاعت کا موجب نہیں ہو سکتی بلکہ شفاعت تب ہو سکتی ہے جبکہ شفیع معصوم ہو اور پھر وہ ابن اللہ ہو اور پھر صلیب پر لٹکایا جا کر ملعون ہو۔ جب تک یہ تثلیث عیسائی مذہب کے عقیدہ کے موافق قائم نہ ہو شفیع نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ عصمت عصمت ہی کیوں پکارتے ہیں کیا اگر کوئی معصوم ان کے سامنے پیش کیا جاوے۔ یا ثابت کر دیا جاوے تو وہ مان لیں گے کہ وہ شفیع ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ عیسائی عقیدہ کے موافق یہ ضروری ہے کہ وہ خدا بھی نہ ہو بلکہ ابن اللہ ہو اور وہ مصلوب ہو کر جب تک ملعون نہ ہولے ہرگز ہرگز وہ شفیع نہیں ہو سکتا پھر ایک اور بات قابل غور ہے کہ جبکہ یسوع خود خدا تھا اور اس لیے وہ علت العلل تھا اور اس نے کل جہان کے گناہ بھی اپنے ذمے لیے پھر وہ معصوم کیونکر ہوا اور گناہوں کا تذکرہ ہم چھوڑتے ہیں جو یہودی مورخوں اور فری تھنکروں (آزاد خیال) نے ان کی انجیل سے ثابت کیے

---

[1] سورۃ النجم: ۹-۱۰ [2] الحجر آیت ۳۰

ہیں لیکن جب اُس نے خود گناہ اُٹھالیے اور بوجہ علت العلل ہونے کے سارے گناہوں کا کرانے والا وہی ٹھہرا تو پھر اُسے معصوم قرار دینا عجیب دانشمندی ہے۔

پھر خدا کا نام معصوم نہیں کیونکہ معصوم وہ ہے جس کا کوئی دوسرا عاصم ہو خدا کا نام عاصم ہے اس لیے جب شفاعت کے لیے ابنیت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے بھی مصلوبیت کی لعنت ضروری ہے تو یہ سارا تانا بانا ہی بنائے فاسد بر فاسد کا مصداق ہے۔

حقیقی اور سچی بات یہ ہے جو میں نے پہلے بھی بیان کی تھی کہ شفیع کے لیے ضروری ہے کہ اول خدا تعالیٰ سے تعلق کامل ہو تاکہ وہ خدا سے فیض کو حاصل کرے اور پھر مخلوق سے شدید تعلق ہو تاکہ وہ فیض اور خیر جو وہ خدا سے حاصل کرتا ہے مخلوق کو پہنچادے جب تک یہ دونوں تعلق شدید نہ ہوں شفیع نہیں ہو سکتا۔ پھر اسی مسئلہ پر تیسری بحث قابل غور یہ ہے کہ جب تک نمونے نہ دیکھے جائیں کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا اور ساری بحثیں فرضی ہیں مسیح کے نمونہ کو دیکھ لو کہ چند حواریوں کو بھی درست نہ کر سکے ہمیشہ ان کو سست اعتقاد کہتے رہے بلکہ بعض کو شیطان بھی کہا اور انجیل کی رو سے کوئی نمونہ کامل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بالمقابل ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل نمونہ ہیں کہ کیسے روحانی اور جسمانی طور پر انہوں نے عذاب الیم سے چھوڑایا اور گناہ کی زندگی سے ان کو نکالا کہ عالم ہی پلٹ دیا ایسا ہی حضرت موسیٰ کی شفاعت سے بھی فائدہ پُہنچا۔ عیسائی جو مسیح کو مثیل موسیٰ قرار دیتے ہیں تو یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ موسیٰ کی طرح انہوں نے گناہ سے قوم کو بچایا ہو بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح کے بعد قوم کی حالت بہت ہی بگڑ گئی۔ اور اب بھی اگر کسی کو شک ہو تو لنڈن یا یورپ کے دوسرے شہروں میں جا کر دیکھ لے کہ آیا گناہ سے چھڑا دیا ہے یا پھنسا دیا ہے اور یوں کہنے کو تو ایک چوہڑا بھی کہہ سکتا ہے کہ بالمیک نے چھوڑایا مگر یہ نرے دعوے ہی دعوے ہیں جن کے ساتھ کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ پس عیسائیوں کا یہ کہنا کہ مسیح چھوڑانے کے لیے آیا تھا۔ ایک خیالی بات ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بعد قوم کی حالت بہت بگڑ گئی اور روحانیت سے بالکل دور جا پڑی۔

ہاں سچا شفیع اور کامل شفیع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے قوم کو بت پرستی اور ہر قسم کے فسق و فجور کی گندگیوں اور ناپاکیوں سے نکال کر اعلیٰ درجہ کی قوم بنا دیا اور پھر اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں آپ کی پاکیزگی اور صداقت کے ثبوت کے لیے اللہ تعالیٰ نمونہ بھیج دیتا ہے (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵-۴)

مامور من اللہ کی دعاؤں کا کل جہان پر اثر ہوتا ہے اور یہ خدا تعالیٰ کا ایک باریک قانون ہے جس کو ہر ایک شخص نہیں سمجھ سکتا۔ جن لوگوں نے شفیع کے مسئلہ سے انکار کیا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے شفیع کو قانون قدرت چاہتا ہے اس کو ایک تعلق شدید خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے اور دوسرا مخلوق سے۔ مخلوق کی ہمدردی

اس میں اس قدر ہوتی ہے کہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے قلب کی بناوٹ ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ ہمدردی کے لیے جلد متاثر ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہ خدا سے لیتا ہے اور اپنی عقدِ ہمت اور توجہ سے مخلوق کو پہنچاتا ہے اور اپنا اثر اس پر ڈالتا ہے اور یہی شفاعت ہے۔

انسان کی دعا اور توجہ کے ساتھ مصیبت کا رفع ہونا یا معصیت اور ذنوب کا کم ہونا یہ سب شفاعت کے نیچے ہے توجہ سب پر اثر کرتی ہے خواہ مامور کو اپنے ساتھ تعلق رکھنے والوں کا نام اور پتا بھی یاد ہو نہو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ شفاعت کوئی چیز نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ شفاعت حق ہے اور اس پر یہ نص صریح ہے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ[1] یہ شفاعت کا فلسفہ ہے یعنی جو گناہوں میں نفسانیت کا جوش ہے وہ ٹھنڈا پڑ جاوے شفاعت کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ گناہ کی زندگی پر ایک موت وارد ہوجاتی ہے اور نفسانی جوشوں اور جذبات میں ایک برودت آجاتی ہے جس سے گناہوں کا صدور بند ہوکر ان کے بالمقابل نیکیاں شروع ہو جاتی ہیں پس شفاعت کے مسئلہ نے اعمال کو بیکار نہیں کیا بلکہ اعمال حسنہ کی تحریک کی ہے۔ شفاعت کے مسئلہ کے فلسفہ کو نہ سمجھ کر احمقوں نے اعتراض کیا ہے اور شفاعت اور کفارہ کو ایک قرار دیا حالانکہ یہ ایک نہیں ہو سکتے ہیں کفارہ اعمال حسنہ سے مستغنی کرتا ہے اور شفاعت اعمال حسنہ کی تحریک۔ جو چیز اپنے اندر فلسفہ نہیں رکھتی ہے وہ ہیچ ہے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اسلامی اصول اور عقائد اور اُس کی ہر تعلیم اپنے اندر ایک فلسفہ رکھتی ہے اور علمی پیرایہ اس کے ساتھ موجود ہے جو دوسرے مذاہب کے عقائد میں نہیں ملتا۔

شفاعت اعمال حسنہ کی محرک کس طرح پر ہے؟ اس سوال کا جواب بھی قرآن شریف ہی سے ملتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ کفارہ کا رنگ اپنے اندر نہیں رکھتی جو عیسائی مانتے ہیں کیونکہ اس پر حصر نہیں کیا جس سے کاہلی اور سستی پیدا ہوتی بلکہ فرمایا إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ[2] یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں تجھ سے سوال کریں کہ وہ کہاں ہے تو کہہ دے کہ میں قریب ہوں۔ قریب والا تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ دور والا کیا کرے گا؟ اگر آگ لگی ہوئی ہو تو دور والے کو جب تک خبر پہنچے اُس وقت تک تو شاید وہ جل کر خاک سیاہ بھی ہو چکے۔ اس لیے فرمایا کہ دو میں قریب ہوں۔

پس یہ آیت بھی قبولیت دعا کا ایک راز بتاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت پر ایمان کامل پیدا ہو اور اُسے ہر وقت اپنے قریب یقین کیا جاوے اور ایمان ہو کہ وہ ہر پکار کو سنتا ہے۔ بہت سی دعاؤں کے رد ہونے کا یہ بھی سِرّ ہے کہ دعا کرنے والا اپنی ضعیف الایمانی سے دعا کو مسترد کرا لیتا ہے اس لیے یہ ضروری

---

[1] سورۃ التوبہ: ۱۰۳ ۞ [2] سورۃ البقرۃ: ۱۸۷۔

ہے کہ دعا کو قبول ہونے کے لائق بنایا جاوے کیونکہ اگر وہ دعا خدا تعالیٰ کی شرائط کے نیچے نہیں ہے تو پھر اس کو خواہ سارے نبی بھی مل کر کریں تو قبول نہ ہوگی اور کوئی فائدہ اور نتیجہ اس پر مرتب نہیں ہو سکے گا۔

اب یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ ایک طرف تو آنحضرت صلعم کو فرمایا صَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ[1] تیری صلوۃ سے ان کو ٹھنڈ پڑ جاتی ہے اور جوش و جذبات کی آگ سرد ہو جاتی ہے دوسری طرف فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ[2] کا بھی حکم فرمایا۔ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے دعا کرنے اور کرانے والے کے تعلقات پھر ان تعلقات سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں اُن کا بھی پتہ لگتا ہے کیونکہ صرف اسی بات پر منحصر نہیں کر دیا کہ آنحضرت ؐ کی شفاعت اور دعا ہی کافی ہے اور خود کچھ نہ کیا جاوے۔ اور نہ یہی فلاح کا باعث ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ؐ کی شفاعت اور دعا کی ضرورت ہی نہ سمجھی جاوے۔ (الحکم جلد ۷ ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲،۳)

دعا اُسی کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جو خود بھی اپنی اصلاح کرتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے سچے تعلق کو قائم کرتا ہے پیغمبر کسی کے لیے اگر شفاعت کرے لیکن وہ شخص جس کی شفاعت کی گئی ہے اپنی اصلاح نہ کرے اور غفلت کی زندگی سے نہ نکلے تو وہ شفاعت اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(الحکم جلد ۷ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷)

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ایک ذکر کیا ہے کہ ایک دیوار دو یتیم لڑکوں کی تھی۔ وہ گرنے والی تھی اُس کے نیچے خزانہ تھا لڑکے ابھی نابالغ تھے۔ اُس دیوار کے گرنے سے اندیشہ تھا کہ خزانہ ننگا ہو کر لوگوں کے ہاتھ آجائے گا۔ وہ لڑکے بیچارے خالی ہاتھ رہ جاویں گے تو اللہ تعالیٰ نے دو نبیوں کو اس خدمت کے واسطے مقرر فرمایا۔ وہ گئے اور اس دیوار کو درست کر دیا کہ جب وہ بڑے ہوں تو پھر کسی طرح اُن کے ہاتھ وہ خزانہ آجاوے پس اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا[3] یعنی ان لڑکوں کا باپ نیک مرد تھا جس کے واسطہ ہم نے اُن کے خزانہ کی حفاظت کی۔ اللہ تعالیٰ کے ایسا فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکے کچھ اچھے نہ تھے اور نہ اچھے ہونے والے تھے۔ ورنہ یہ فرماتا کہ یہ لڑکے اچھے ہیں صالح ہیں اور صالح ہونے والے ہیں۔ نہیں بلکہ اُن کے باپ کا ہی حوالہ دیا کہ اُن کے باپ کی نیکی کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے دیکھو یہی تو شفاعت ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

مذہبی مسائل میں سے نجات اور شفاعت کا مسئلہ ایک ایسا عظیم الشان اور مدار المہام مسئلہ ہے کہ مذہبی پابندی کے تمام اغراض اُسی پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور کسی مذہب کے صدق اور سچائی کے پرکھنے کے لیے وہی ایک ایسا صاف اور کھلا کھلا نشان ہے جس کے ذریعہ سے پوری تسلی اور اطمینان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں مذہب درحقیقت سچا اور منجانب اللہ ہے اور یہ بات بالکل راست اور درست ہے کہ جس مذہب نے اس مسئلہ کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا یا اپنے فرقہ میں نجات یافتہ لوگوں کے موجودہ نمونے کھلے کھلے امتیاز کے ساتھ دکھلا نہیں سکا اُس مذہب کے باطل

[1] سورۃ توبہ آیت ۱۰۳ ٭ [2] البقرہ آیت ۱۸۷ ٭ [3] سورۃ الکہف : ۸۳

ہونے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں مگر جس مذہب نے کمال صحت سے نجات کی اصل حقیقت دکھلائی ہے اور نہ صرف اس قدر بلکہ اپنے موجودہ زمانے میں ایسے انسان بھی پیش کیے ہیں جن میں کامل طور پر نجات کی روح پھونکی گئی ہے اُس نے مہر لگا دی ہے کہ وہ سچا اور منجانب اللہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر ایک انسان طبعاً اپنے دل میں محسوس کرتا ہے کہ وہ صدہا طرح کی غفلتوں اور پردوں اور نفسانی حملوں اور لغزشوں اور کمزوریوں اور جہالتوں اور قدم قدم پر تاریکیوں اور ٹھوکروں اور مسلسل خطرات اور وساوس کی وجہ سے اور نیز دنیا کی انواع و اقسام کی آفتوں اور بلاؤں کے سبب سے ایک ایسے زبردست ہاتھ کا ضرور محتاج ہے جو اس کو ان تمام مکروہات سے بچاوے کیونکہ انسان اپنی فطرت میں ضعیف ہے اور وہ کبھی ایک دم کے لیے بھی اپنے نفس پر بھروسا نہیں کر سکتا کہ وہ خود بخود نفسانی ظلمات سے باہر آسکتا ہے۔ یہ تو انسانی کانشنس کی شہادت ہے اور ماسوا اس کے اگر غور اور فکر سے کام لیا جاوے تو عقل سلیم بھی اسی کو چاہتی ہے کہ نجات کے لیے شفیع کی ضرورت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نہایت درجہ تقدس اور تطہر کے مرتبہ پر ہے اور انسان نہایت درجہ ظلمت اور معصیت اور آلودگی کے گڑھے میں ہے اور بوجہ فقدان مناسبت اور مشابہت عام طبقہ انسانی گروہ کا اس لائق نہیں کہ وہ براہ راست خدا تعالیٰ سے فیض پا کر مرتبہ نجات کا حاصل کر لیں پس اس لیے حکمت اور رحمت الٰہی نے یہ تقاضا فرمایا کہ نوع انسان اور اللہ تعالیٰ میں بعض افراد کاملہ جو اپنی فطرت میں ایک خاص فضیلت رکھتے ہوں درمیانی واسطہ ہوں اور وہ اس قسم کے انسان ہوں جن کی فطرت نے کچھ حصہ صفات لاہوتی سے لیا ہو اور کچھ حصہ صفات ناسوتی سے تا بباعث لاہوتی مناسبت کے خدا سے فیض حاصل کریں اور بباعث ناسوتی مناسبت کے اس فیض کو جو اوپر سے لیا ہے نیچے کو یعنی بنی نوع کو پہنچا دیں اور یہ کہنا واقعی صحیح ہے کہ اس قسم کے انسان بوجہ زیادت کمال لاہوتی اور ناسوتی کے دوسرے انسانوں سے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں گویا یہ ایک مخلوق ہی الگ ہے کیونکہ جس قدر ان لوگوں کو خدا کا جلال اور عظمت ظاہر کرنے کے لیے جوش دیا جاتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں وفاداری کا مادہ بھرا جاتا ہے اور پھر جس قدر بنی نوع کی ہمدردی کا جوش ان کو عطا کیا جاتا ہے وہ ایک ایسا امر فوق العادت ہے جو دوسرے کے لیے اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ ہاں یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہ تمام اشخاص ایک مرتبہ پر نہیں ہوتے بلکہ ان فطرتی فضائل میں کوئی اعلیٰ درجہ پر ہے کوئی اس سے کم اور کوئی اُس سے کم۔

ایک سلیم العقل کا پاک کانشنس سمجھ سکتا ہے کہ شفاعت کا مسئلہ کوئی بناوٹی اور مصنوعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خدا کے مقرر کردہ انتظام میں ابتدا سے اس کی نظیریں موجود ہیں اور قانون قدرت میں اس کی شہادتیں صریح طور پر ملتی ہیں۔ اب شفاعت کی فلاسفی یوں سمجھنی چاہیئے کہ شفع لغت میں جفت کو کہتے ہیں پس شفاعت کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ضروری امر جو شفیع کی صفات میں سے ہوتا ہے یہ ہے کہ اُس کو دو طرفہ اتحاد حاصل ہو یعنی ایک طرف اُس کے نفس کو خدا تعالیٰ سے تعلق شدید ہو ایسا کہ گویا وہ کمال اتحاد کے سبب حضرت احدیت

کے لیے بطور جفت اور پیوند کے ہو اور دوسری طرف اُس کو مخلوق سے بھی شدید تعلق ہو گویا وہ اُن کے اعضا کی ایک جز ہو پس شفاعت کا امر مترتب ہونے کے لیے درحقیقت یہی دو جز ہیں جن پر ترتب اثر موقوف ہے۔ یہی راز ہے جو حکمت الٰہیہ نے آدم کو ایسے طور سے بنایا کہ فطرت کی ابتدا سے ہی اُس کی سرشت میں دو قسم کے تعلق قائم کر دیئے یعنی ایک تعلق تو خدا سے قائم کیا جیسا قرآن شریف میں فرمایا فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ[۵۱]
یعنی جب میں اس کو ٹھیک ٹھیک بنا لوں اور میں اپنی روح اس میں پھونک دوں تو اے فرشتو اسی وقت تم سجدہ میں گر جاؤ۔ مذکورہ بالا آیت سے صاف ثابت ہے کہ خدا نے آدم میں اُس کی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی روح پھونک کر اس کی فطرت کو اپنے ساتھ ایک تعلق قائم کر دیا۔ سو یہ اس لیے کیا گیا کہ تا انسان کو فطرتاً خدا سے تعلق پیدا ہو جائے ایسا ہی دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں سے بھی فطرتی تعلق ہو جو بنی نوع کہلائیں گے کیونکہ جب کہ اُن کا وجود آدم کی ہڈی میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہوگا تو وہ ضرور اس روح میں سے بھی حصہ لیں گے جو آدم میں پھونکی گئی۔ پس اس لیے آدم طبعی طور پر اُن کا شفیع ٹھیریگا۔ کیونکہ بباعث نفخ روح جو راست بازی آدم کی فطرت کو دی گئی ہے ضرور ہے کہ اس کی راست بازی کا کچھ حصہ اُس شخص کو بھی ملے جو اس میں سے نکلا ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ ہر ایک جانور کا بچہ اس کی صفات اور افعال میں سے حصہ لیتا ہے اور دراصل شفاعت کی حقیقت بھی یہی ہے کہ فطرتی وارث اپنے مورث سے حصہ لے کیونکہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ شفاعت کا لفظ شفع کے لفظ سے نکلا ہے جو زوج کو کہتے ہیں پس جو شخص فطرتی طور پر ایک دوسرے شخص کا زوج ٹھیر جائے گا ضرور اس کی صفات میں سے حصہ لے گا۔

اسی اصول پر تمام سلسلہ خلقی توارث کا جاری ہے یعنی انسان کا بچہ انسانی قویٰ میں سے حصہ لیتا ہے اور گھوڑے کا بچہ گھوڑے کے قویٰ میں سے حصہ لیتا ہے اور اسی وراثت کا نام دوسرے لفظوں میں شفاعت سے فیض یاب ہونا ہے کیونکہ جبکہ شفاعت کی اصل شفع یعنی زوج ہے پس تمام مدار شفاعت سے فیض اٹھانے کا اس بات پر ہے کہ جس شخص کی شفاعت سے آدمی مستفیض ہونا چاہتا ہے اس سے فطرتی تعلق اس کو حاصل ہوتا ہے جو کچھ اس کی فطرت کو دیا گیا ہے۔ اس کی فطرت کو بھی وہی ملے یہ تعلق جیسا کہ وہبی طور پر انسانی فطرت میں موجود ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی جز ہے ایسا ہی کسبی طور پر بھی یہ تعلق زیادت پذیر ہے یعنی جب ایک انسان یہ چاہتا ہے کہ جو فطرتی محبت اور فطرتی ہمدردی بنی نوع کی اس میں موجود ہے اس میں زیادت ہو تو بقدر دائرہ فطرت اور مناسبت کے زیادت بھی ہو جاتی ہے اسی بنا پر قوت عشقی کا تموج بھی ہے کہ ایک شخص ایک شخص سے اس قدر محبت بڑھاتا ہے کہ بغیر اس کے دیکھنے کے آرام نہیں کر سکتا۔ آخر اس کی شدت محبت اس دوسرے شخص کے دل پر بھی اثر کرتی ہے اور جو شخص انتہا درجہ پر کسی سے محبت کرتا ہے وہی شخص کامل طور اور سچے طور پر اُس کی بھلائی بھی چاہتا ہے چنانچہ یہ امر بچوں کی نسبت ان کی طرف سے مشہود

۵۱۔ سورۃ حجر آیت ۳۰۔

اور محسوس ہے۔

پس اصل جڑ شفاعت کی یہی محبت ہے جبکہ اس کے ساتھ فطرتی تعلق بھی ہو کیونکہ بجز فطرتی تعلق کے محبت کا کمال جو شرط شفاعت ہے غیر ممکن ہے اس تعلق کو انسانی فطرت میں داخل کرنے کے لیے حوّا کو علیحدہ پیدا نہ کیا بلکہ آدمؑ کی پسلی سے ہی اس کو نکالا۔ جیسا کہ قرآن شریف میں فرمایا ہے وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا[1] یعنی آدم کے وجود میں سے ہی ہم نے اس کا جوڑا پیدا کیا جو حوّا ہے تا آدمؑ کا یہ تعلق حوّا اور اس کی اولاد سے طبعی ہو نہ بناوٹی۔ اور یہ اس لیے کیا کہ تا آدم زادوں سے تعلق اور ہمدردی کو بقا ہو کیونکہ طبعی تعلق غیر منفک ہوتے ہیں مگر غیر طبعی تعلق کے لیے بقا نہیں ہے کیونکہ ان میں وہ باہمی کشش نہیں ہے جو طبعی میں ہوتی ہے۔ غرض خدا نے اس طرح پر دونوں قسم کے تعلق جو آدمؑ کے لیے خدا سے اور بنی نوع سے ہونے چاہیئے تھے طبعی طور پر پیدا کیے پس اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ کامل انسان جو شفیع ہونے کے لائق ہو وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے ان دونوں تعلقوں سے کامل حصّہ لیا ہو اور کوئی شخص بغیر ان ہر دو قسم کے کمال کے انسان کامل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے آدمؑ کے بعد بھی سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہوئی کہ کامل انسان کے لیے جو شفیع ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں تعلق ضروری ٹھیرائے گئے یعنی ایک یہ تعلق کہ ان میں آسمانی روح پھونکی گئی۔ اور خدا نے ایسا اُن سے اتصال کیا کہ گویا ان میں اتر آیا اور دوسرے یہ کہ بنی نوع کی زوجیت کا وہ جوڑا جو حوّا اور آدم میں باہمی ہمدردی اور محبت کے ساتھ مستحکم کیا گیا تھا اُن میں سب سے زیادہ چمکایا گیا اسی تحریک سے ان کو بیویوں کی طرف بھی رغبت ہوئی اور یہی ایک اول علامت اس بات کی ہے کہ اُن میں بنی نوع کی ہمدردی کا مادہ ہے اور اسی کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ بِاَهْلِهٖ یعنی تم میں سب سے زیادہ بنی نوع کے ساتھ بھلائی کرنے والا وہی ہو سکتا ہے کہ پہلے اپنی بیوی کے ساتھ بھلائی کرے مگر جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ ظلم اور شرارت کا برتاؤ رکھتا ہے ممکن نہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ بھی بھلائی کر سکے کیونکہ خدا نے آدم کو پیدا کر کے سب سے پہلے آدم کی محبت کا مصداق اس کی بیوی کو ہی بنایا ہے پس جو شخص اپنی بیوی سے محبت نہیں کرتا یا اس کی خود بیوی ہی نہیں وہ کامل انسان ہونے کے مرتبہ سے گرا ہوا ہے اور شفاعت کی دو شرطوں میں سے ایک شرط اس میں مفقود ہے۔ اس لیے اگر عصمت اس میں پائی بھی جائے تب بھی وہ شفاعت کرنے کے لائق نہیں لیکن جو شخص کوئی بیوی نکاح میں لاتا ہے وہ اپنے لیے بنی نوع کی ہمدردی کی بنیاد ڈالتا ہے کیونکہ ایک بیوی بہت سے رشتوں کا موجب ہو جاتی ہے اور بچے پیدا ہوتے ہیں ان کی بیویاں آتی ہیں اور بچوں کی نانیاں اور بچوں کے ماموں وغیرہ ہوتے ہیں اور اس طرح پر ایسا شخص خواہ نخواہ محبت اور ہمدردی کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی اس عادت کا دائرہ وسیع ہو کر سب کو اپنی ہمدردی سے حصہ دیتا ہے لیکن جو لوگ جوگیوں کی طرح نشوونما پاتے ہیں ان کو اس عادت کے وسیع کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ اس لیے ان کے دل سخت اور خشک رہ جاتے ہیں۔

---

[1] سورہ نساء: ۲

عصمت اور شفاعت میں تعلق | یہ امر ظاہر ہے کہ عصمت کو شفاعت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ عصمت کا مفہوم صرف اس حد تک ہے کہ انسان گناہ سے بچے اور گناہ کی تعریف یہ ہے کہ انسان خدا کے حکم کو عمداً توڑ کر لائق سزا ٹھیرے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ عصمت اور شفاعت میں کوئی تلازم ذاتی نہیں کیونکہ تعریف مذکورہ بالا کے رو سے نابالغ بچے اور پیدائشی مجنون بھی معصوم ہیں وجہ یہ کہ وہ اس لائق نہیں ہیں کہ کوئی گناہ عمداً کریں پس بلاشبہ وہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو معصوم کہا جائے مگر کیا وہ یہ بھی حق رکھتے ہیں کہ وہ انسانوں کے شفیع ہوں اور منجی کہلائیں پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ منجی ہونے اور معصوم ہونے میں کوئی تعلق نہیں اور ہرگز عقل سمجھ نہیں سکتی کہ عصمت سے شفاعت کا کوئی حقیقی تعلق ہے ہاں عقل اس بات کو خوب سمجھتی ہے کہ شفیع کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذکورہ بالا دو قسم کے تعلق اس میں پائے جائیں اور عقل بلا تردد یہ حکم کرتی ہے کہ اگر کسی انسان میں یہ دو صفتیں موجود ہوں کہ ایک خدا سے تعلق شدید ہو اور دوسری طرف مخلوق سے بھی محبت اور ہمدردی کا تعلق ہو تو بلاشبہ ایسا شخص ان لوگوں کے لیے جنہوں نے عمداً اُسی سے تعلق نہیں توڑا دلی جوش سے شفاعت کرے گا۔ اور وہ شفاعت اس کی منظور کی جائے گی کیونکہ جس شخص کی فطرت کو یہ دو تعلق عطا کیے گئے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ خدا کی محبت تامہ کی وجہ سے اس فیض کو کھینچے اور پھر مخلوق کی محبت تامہ کی وجہ سے وہ فیض اُن تک پہنچائے اور یہی وہ کیفیت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں شفاعت کہتے ہیں۔ شخص شفیع کے لیے جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا ہے ضروری ہے کہ خدا سے اس کو ایک ایسا گہرا تعلق ہو کہ گویا خدا اُس کے دل میں اُترا ہوا ہو اور اس کی تمام انسانیت مر کر بال بال میں لاہوتی تجلی پیدا ہو گئی ہو اور اُس کی روح پانی کی طرح گداز ہو کر خدا کی طرف بہ نکلی ہو اور اس طرح پر خدائی قرب کے انتہائی نقطہ پر جا پہنچی ہو اور اسی طرح شفیع کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس کے لیے وہ شفاعت کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ہمدردی میں اس کا دل ہاتھ سے نکلا جاتا ہو ایسا کہ عنقریب اس پر غشی طاری ہو گی اور گویا شدت قلق سے اُس کے اعضا اس سے علیحدہ ہوتے جاتے ہیں اور اُس کے حواس منتشر ہیں اور اس کی ہمدردی نے اس کو اس مقام تک پہنچایا ہو کہ جو باپ سے بڑھ کر اور ماں سے بڑھ کر اور ہر ایک غمخوار سے بڑھ کر ہے پس جب یہ دونوں حالتیں اس میں پیدا ہو جائیں گی تو وہ ایسا ہو جائے گا کہ گویا وہ ایک طرف سے لاہوت کے مقام سے جفت ہے اور دوسری طرف ناسوت کے مقام سے جفت۔ تب دونوں پلہ میزان کے اس میں مساوی ہوں گے۔ یعنی وہ مظہر لاہوت کامل بھی ہو گا۔ اور مظہر ناسوت کامل بھی۔ اور بطور برزخ دونوں حالتوں میں واقع ہو گا۔ (لاہوت / ناسوت) مقام شفیع
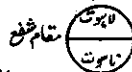
قرآن شریف سے ثبوت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان کامل تھے | اسی مقام شفاعت کی طرف قرآن شریف میں اشارہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انسان کامل ہونے کی شان میں فرمایا ہے دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی[1] یعنی یہ رسول خدا کی طرف چڑھا اور جہاں تک امکان میں ہے خدا سے نزدیک ہوا اور قرب کے تمام کمالات

---

[1] سورۃ النجم آیت ۹-۱۰

کو طے کیا اور لاہوتی مقام سے پورا حصّہ لیا اور پھر ناسوت کی طرف کامل رجوع کیا یعنی عبودیت کے انتہائی نقطہ تک اپنے تئیں پہنچایا اور بشریت کے پاک لوازم یعنی بنی نوع کی ہمدردی اور محبت سے جو ناسوتی کمال کہلاتا ہے پورا حصہ لیا لہذا ایک طرف خدا کی محبت میں کمال تام تک پہنچا پس چونکہ وہ کامل طور پر خدا سے قریب ہوا اور پھر کامل طور پر بنی نوع سے قریب ہوا۔ اس لیے دونوں طرف کے مساوی قرب کی وجہ سے ایسا ہو گیا جیسا کہ دو قوسوں میں ایک خط ہوتا ہے لہذا وہ شرط جو شفاعت کے لیے ضروری ہے اس میں پائی گئی اور خدا نے اپنے کلام میں اس کے لیے گواہی دی کہ وہ اپنے بنی نوع میں اور اپنے خدا میں ایسے طور سے درمیان ہے جیسا کہ وتر دو قوسوں کے درمیان ہوتا ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۵ صفحہ ۱۷۵۔۱۸۱)

ضرورت شفاعت ممکن ہے کہ اس جگہ کوئی شخص یہ سوال بھی پیش کرے کہ انسان کو شفاعت کی کیوں ضرورت ہے اور کیوں جائز نہیں کہ ایک شخص براہِ راست توبہ اور استغفار کر کے خدا سے معافی حاصل کرے۔ اس سوال کا جواب قانون قدرت خود دیتا ہے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے اور کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان بلکہ تمام حیوانات کی نسل کا سلسلہ شفاعت پر ہی چل رہا ہے کیونکہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ کہ شفاعت کا لفظ شفع سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں جفت پس اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ تمام برکات تناسل شفع سے ہی پیدا ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ایک انسان کے اخلاق اور قوت اور صورت دوسرے انسان میں اسی ذریعہ سے آجاتے ہیں یعنی وہ ایک جوڑ کا ہی نتیجہ ہوتا ہے ایسا ہی ایک حیوان جو دوسرے سے پیدا ہوتا ہے مثلاً بکری بیل گدھا وغیرہ اور وہ تمام قویٰ جو ایک حیوان سے دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں وہ بھی درحقیقت ایک جوڑ کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ پس یہی جوڑ جب ان معنوں سے لیا جاتا ہے کہ ایک ناقص ایک کامل سے روحانی تعلق پیدا کر کے اس کی روح سے اپنی کمزوری کا علاج پاتا ہے اور نفسانی جذبات سے محفوظ رہتا ہے تب اس جوڑ کا نام شفاعت ہے جیسا کہ چاند سورج کے مقابل ہو کر ایک قسم کا اتحاد اور جوڑ اس سے حاصل کرتا ہے تو معاً اس نور کو حاصل کر لیتا ہے جو آفتاب میں ہے اور چونکہ اس روحانی جوڑ کو جو پرمحبت دلوں کو انبیاء کے ساتھ حاصل ہوتا ہے اس جسمانی جوڑ سے ایک مناسبت ہے جو زید کو مثلاً اپنے باپ سے ہے اس لیے یہ روحانی فیضیاب بھی خدا کے نزدیک اولاد کہلاتے ہیں اور اس تولد کو کامل طور پر حاصل کرنے والے وہی نقوش اور اخلاق اور برکات حاصل کر لیتے ہیں جو نبیوں میں موجود ہوتے ہیں پس دراصل یہی حقیقت شفاعت ہے اور جس طرح جسمانی شفع یعنی جوڑ کا یہ لازمہ ذاتی ہے کہ اولاد مناسب حال اس شخص کے ہوتی ہے جس سے یہ جوڑ کیا گیا ہے ایسا ہی روحانی شفع کا بھی خاصہ ہے غرض یہی حقیقت شفاعت ہے کہ خدا کا قانون جسمانی اور روحانی اس طرح پر قدیم سے واقع ہے کہ تمام برکات جوڑ سے ہی پیدا ہوتی ہیں صرف یہ فرق ہے کہ ایک قسم کو شفع کہا گیا ہے اور دوسری قسم کا نام شفاعت رکھا گیا ہے اور انسان کو جس طرح کہ سلسلہ تناسل کے محفوظ رکھنے کے لیے شفع کی ضرورت ہے ایسا ہی روحانیت کا سلسلہ باقی رکھنے

کے لیے شفاعت کی ضرورت ہے اور خدا کے کلام نے دونوں کو بیان فرما دیا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے کہ خدا نے آدم کو جوڑا پیدا کیا اور پھر اس جوڑہ سے مخلوق مرد اور عورت پیدا کیے اور ایسا ہی فرماتا ہے کہ خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ پیدا کیا جو آدم تھا جس میں خدائی روح تھی پھر وہ نور آدم سے دوسرے نبیوں میں منتقل ہو گیا اور ابراہیم اور اسحاق اور اسماعیل اور یعقوب اور موسیٰ اور داؤد اور عیسیٰ وغیرہم سب اسی نور کے وارث ہوئے یہاں تک کہ آخری وارث ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے پس ان تمام پاک نبیوں نے جیسا کہ آدم سے وراثت میں جسمانی نقوش پائے ایسا ہی بحیثیت خلیفہ ہونے آدم کے اُس سے خدائی روح بھی پائی پھر ان کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً اور لوگ بھی وارث ہوتے گئے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ا ۵ ص ۱۹۳-۱۹۴)

آخرت کا شفیع وہ ثابت ہو سکتا ہے جس نے دنیا میں شفاعت کا کوئی نمونہ دکھلایا ہو۔ سو اس معیار کو آگے رکھ کر جب ہم موسیٰ پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بھی شفیع ثابت ہوتا ہے کیونکہ بارہا اُس نے اترتا ہوا عذاب دعا سے ٹال دیا اُس کی توریت گواہ ہے اسی طرح جب ہم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کا شفیع ہونا اجلیٰ بدیہیات معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ کی شفاعت کا ہی اثر تھا کہ آپ نے غریب صحابہ کو تخت پر بٹھا دیا اور آپ کی شفاعت کا ہی اثر تھا کہ وہ لوگ باوجود اس کے کہ بت پرستی اور شرک میں نشوونما پایا تھا ایسے موحد ہو گئے جن کی نظیر کسی زمانہ میں نہیں ملتی اور پھر آپ کی شفاعت کا ہی اثر ہے کہ اب تک آپ کی پیروی کرنے والے خدا کا سچا الہام پاتے ہیں خدا اُن سے ہمکلام ہوتا ہے مگر مسیح ابن مریم میں یہ تمام ثبوت کیونکر اور کہاں سے مل سکتے ہیں ہمارے سید و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر اس سے بڑھ کر اور زبردست شہادت کیا ہو گی کہ ہم اُس جناب کے واسطے سے جو کچھ خدا سے پاتے ہیں ہمارے دشمن وہ نہیں پا سکتے اگر ہمارے مخالف اس امتحان کی طرف آ ویں تو چند روز میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ا ۵ ص ۲۰۹)

تمام آدمزادوں کے لیے اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (کشتی نوح ص ۱۳)

جو شخص مجھ سے سچی بیعت کرتا ہے اور سچے دل سے میرا پیرو بنتا ہے اور میری اطاعت میں محو ہو کر اپنے تمام ارادوں کو چھوڑتا ہے وہی ہے جو ان آفتوں کے دنوں میں میری روح اُس کی شفاعت کرے گی۔

(کشتی نوح ص ۱۴)

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔ یعنی خدا کی کرسی کے اندر تمام زمین و آسمان سمائے ہوئے ہیں اور وہ اُن سب کو اٹھائے ہوئے ہے ان کے اٹھانے سے وہ تھکتا نہیں ہے اور وہ نہایت بلند ہے کوئی عقل اس کی کنہ تک پہنچ نہیں سکتی اور نہایت بڑا ہے اس کی عظمت کے آگے سب چیزیں ہیچ ہیں۔ یہ ہے ذکر کرسی کا اور یہ محض ایک استعارہ ہے جس سے یہ جتلانا منظور ہے کہ زمین و آسمان سب

خدا کے تصرف میں ہیں اور ان سب سے اس کا مقام دور تر ہے اور اس کی عظمت ناپیداکنار ہے۔

(چشمہ معرفت ص۱۱۰ حاشیہ)

هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ وہ نہایت بزرگ اور صاحب عظمت ہے۔ (ست بچن ص۸۳)

۲۵۷ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۝

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی یہ دین کوئی بات جبر سے منوانا نہیں چاہتا بلکہ ہر ایک بات کے دلائل پیش کرتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۹۷)

پس نواب صدیق حسن خاں کا یہ خیال صحیح نہیں تھا کہ مہدی کے زمانہ میں جبر کرکے لوگوں کو مسلمان کیا جائے گا خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین اسلام میں جبر نہیں ہے ہاں عیسائی لوگ ایک زمانہ میں جبراً لوگوں کو عیسائی بناتے تھے مگر اسلام جب سے ظاہر ہوا وہ جبر کے مخالف ہے جبر اُن لوگوں کا کام ہے جن کے پاس آسمانی نشان نہیں مگر اسلام تو آسمانی نشانوں کا سمندر ہے کسی نبی سے اس قدر معجزات ظاہر نہیں ہوئے جس قدر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ کیونکہ پہلے نبیوں کے معجزات ان کے مرنے کے ساتھ ہی مر گئے مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اب تک ظہور میں آرہے ہیں اور قیامت تک ظاہر ہوتے رہیں گے جو کچھ میری تائید میں ظاہر ہوتا ہے دراصل وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہیں مگر کہاں ہیں وہ پادری یا یہودی یا اور قومیں جو ان نشانوں کے مقابل پر نشان دکھلا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! ہرگز نہیں!!! اگرچہ کوشش کرتے کرتے مر بھی جائیں۔ تب بھی ایک نشان بھی دکھلا نہیں سکتے کیونکہ ان کے مصنوعی خدا ہیں سچے خدا کے وہ پیرو نہیں ہیں۔ اسلام معجزات کا سمندر ہے اس نے کبھی جبر نہیں کیا اور نہ اس کو جبر کی کچھ ضرورت ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی ص۳۵-۳۶)

ہمیں خدا تعالیٰ نے قرآن میں یہ بھی تعلیم دی ہے۔ کہ دین اسلام میں اکراہ اور جبر نہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ اور جیسا کہ فرماتا ہے اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ[1]۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہفتم ص۱۲۱)

---

[1] سورۃ یونس: ۱۰۰

اسلام نے کبھی جبر کا مسئلہ نہیں سکھایا۔ اگر قرآن شریف اور تمام حدیث کی کتابوں اور تاریخ کی کتابوں کو غور سے دیکھا جائے اور جہاں تک انسان کے لیے ممکن ہے تدبّر سے پڑھا یا سنا جائے تو اس قدر وسعت معلومات کے بعد قطعی یقین کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ اعتراض کہ گویا اسلام نے دین کو جبراً پھیلانے کے لیے تلوار اٹھائی ہے نہایت بے بنیاد اور قابل شرم الزام ہے اور یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے تعصب سے الگ ہوکر قرآن اور حدیث اور اسلام کی معتبر تاریخوں کو نہیں دیکھا بلکہ جھوٹ اور بہتان لگانے سے پورا پورا کام لیا ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اب وہ زمانہ قریب آتا جاتا ہے کہ راستی کے بھوکے اور پیاسے ان بہتانوں کی حقیقت پر مطلع ہو جائیں گے۔ کیا اُس مذہب کو ہم جبر کا مذہب کہہ سکتے ہیں جس کی کتاب قرآن میں صاف طور پر یہ ہدایت ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی دین میں داخل کرنے کے لیے جبر جائز نہیں۔ کیا ہم اُس بزرگ نبی کو جبر کا الزام دے سکتے ہیں جس نے مکہ معظمہ کے تیرہ برس میں اپنے تمام دوستوں کو دن رات یہی نصیحت دی کہ شر کا مقابلہ مت کرو اور صبر کرتے رہو ہاں جب دشمنوں کی بدی حد سے گذر گئی اور دین اسلام کے مٹا دینے کے لیے تمام قوموں نے کوشش کی تو اس وقت غیرت الٰہی نے تقاضا کیا کہ جو لوگ تلوار اٹھاتے ہیں وہ تلوار ہی سے قتل کیے جائیں۔ ورنہ قرآن شریف نے ہرگز جبر کی تعلیم نہیں دی۔ اگر جبر کی تعلیم ہوتی تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جبر کی تعلیم کی وجہ سے اس لائق نہ ہوتے کہ امتحانوں کے موقع پر سچے ایمانداروں کی طرح صدق دکھلا سکتے۔ لیکن ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ کے صحابہ کی وفاداری ایک ایسا امر ہے کہ اس کے اظہار کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں کہ ان کے صدق اور وفاداری کے نمونے اس درجہ پر ظہور میں آئے کہ دوسری قوموں میں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس وفادار قوم نے تلواروں کے نیچے بھی اپنی وفاداری اور صدق کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنے بزرگ اور پاک نبی کی رفاقت میں وہ صدق دکھلایا کہ کبھی انسان میں وہ صدق نہیں آ سکتا جب تک ایمان سے اس کا دل اور سینہ منوّر نہ ہو۔ غرض اسلام میں جبر کو دخل نہیں۔ اسلام کی لڑائیاں تین قسم سے باہر نہیں (۱) دفاعی طور پر یعنی بطریق حفاظت خود اختیاری۔ (۲) بطور سزا یعنی خون کے عوض میں خون (۳) بطور آزادی قائم کرنے کے یعنی بغرض مزاحموں کی قوت توڑنے کے جو مسلمان ہونے پر قتل کرتے تھے۔ پس جس حالت میں اسلام میں یہ ہدایت ہی نہیں کہ کسی شخص کو جبر اور قتل کی دھمکی سے دین میں داخل کیا جائے تو پھر کسی خونی مہدی یا خونی مسیح کی انتظار کرنا سراسر لغو اور بیہودہ ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ قرآنی تعلیم کے برخلاف کوئی ایسا انسان بھی دنیا میں آوے جو تلوار کے ساتھ لوگوں کو مسلمان کرے۔

(مسیح ہندوستان میں صفحہ ۹ تا ۱۰)

قرآن میں صاف حکم ہے کہ دین کے پھیلانے کے لیے تلوار مت اُٹھاؤ اور دین کی ذاتی خوبیوں کو پیش کرو اور نیک نمونوں سے اپنی طرف کھینچو اور یہ مت خیال کرو کہ ابتدا میں اسلام میں تلوار کا حکم ہوا کیونکہ وہ تلوار دین کو پھیلانے کے لیے نہیں کھینچی گئی تھی بلکہ دشمنوں کے حملوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اور یا امن قائم کرنے کے لیے کھینچی گئی تھی مگر دین کے لیے

جبر کرنا کبھی مقصد نہ تھا۔ (ستارہ قیصریہ صفحہ ۸)

تمام سچے مسلمان جو دنیا میں گذرے کبھی اُن کا یہ عقیدہ نہیں ہوا کہ اسلام کو تلوار سے پھیلانا چاہیئے بلکہ ہمیشہ اسلام اپنی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے دنیا میں پھیلا ہے۔ پس جو لوگ مسلمان کہلا کر صرف یہی بات جانتے ہیں کہ اسلام کو تلوار سے پھیلانا چاہیئے وہ اسلام کی ذاتی خوبیوں کے معترف نہیں ہیں اور ان کی کارروائی درندوں کی کارروائی سے مشابہ ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۲۱ حاشیہ)

یہ جہالت اور سخت نادانی ہے کہ اس زمانہ کے نیم ملا فی الفور کہہ دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبراً مسلمان کرنے کے لیے تلوار اٹھائی تھی اور انہی شبہات میں ناسمجھ پادری گرفتار ہیں۔ مگر اس سے زیادہ کوئی جھوٹی بات نہیں ہوگی کہ یہ جبر اور تعدی کا الزام اُس دین پر لگایا جائے جس کی پہلی ہدایت یہی ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین میں جبر نہیں چاہیئے بلکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ بزرگ صحابہ کی لڑائیاں یا تو اس لیے تھیں کہ کفار کے حملہ سے اپنے تئیں بچایا جائے۔ اور یا اس لیے تھیں کہ امن قائم کیا جائے اور جو لوگ تلوار سے دین کو روکنا چاہتے ہیں ان کو تلوار سے پیچھے ہٹایا جائے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۱۶)

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین کو جبر سے شائع نہیں کرنا چاہیئے۔ (اشتہار واجب الاظہار مشمولہ تریاق القلوب صفحہ ۷)

جس کتاب میں یہ آیت اب تک موجود ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کرنی چاہیئے کیا اس کی نسبت ہم ظن کر سکتے ہیں کہ وہ جہاد کی تعلیم دیتی ہے۔ (ضمیمہ رسالہ گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۱۱)

جس کام کے لیے آپ لوگوں کے عقیدوں کے موافق مسیح ابن مریم آسمان سے آئیگا یعنی یہ کہ مہدی سے مل کر لوگوں کو جبراً مسلمان کرنے کے لیے جنگ کریگا یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو اسلام کو بدنام کرتا ہے قرآن شریف میں کہاں لکھا ہے کہ مذہب کے لیے جبر درست ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تو قرآن شریف میں فرماتا ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین میں جبر نہیں ہے پھر مسیح ابن مریم کو جبر کا اختیار کیونکر دیا جائے گا یہاں تک کہ بجز اسلام یا قتل کے جزیہ بھی قبول نہ کرے گا یہ تعلیم قرآن شریف کے کس مقام اور کس سیپارہ اور کس سورہ میں ہے سارا قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ دین میں جبر نہیں اور صاف طور پر ظاہر کر رہا ہے کہ جن لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت لڑائیاں کی گئی تھیں وہ لڑائیاں دین کو جبراً شائع کرنے کے لیے نہیں تھیں بلکہ یا تو بطور سزا تھیں یعنی اُن لوگوں کو سزا دینا منظور تھا جنہوں نے ایک گروہ کثیر مسلمانوں کو قتل کر دیا اور بعض کو وطن سے نکال دیا تھا اور نہایت سخت ظلم کیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔[۱] یعنی ان مسلمانوں کو جن سے کفار جنگ کر رہے ہیں بسبب مظلوم ہونے کے مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی اور خدا قادر ہے کہ جو ان کی مدد کرے۔ اور یا وہ لڑائیاں ہیں جو بطور مدافعت تھیں یعنی جو لوگ اسلام کے نابود کرنے کے لیے پیش قدمی کرتے تھے یا اپنے ملک میں اسلام کو

---

[۱] سورۃ الحج : ۴۰

شائع ہونے سے جبراً روکتے تھے ان سے بطور حفاظت خود اختیاری یا ملک میں آزادی پیدا کرنے کے لیے لڑائی کی جاتی تھی بجز ان تین صورتوں کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس خلیفوں نے کوئی لڑائی نہیں کی بلکہ اسلام نے غیر قوموں کے ظلم کی اس قدر برداشت کی ہے جو اس کی دوسری قوموں میں نظیر نہیں ملتی پھر یہ عیسیٰ مسیح اور مہدی صاحب کیسے ہوں گے جو آتے ہی لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے یہاں تک کہ کسی اہل کتاب سے بھی جزیہ قبول نہیں کریں گے اور آیت حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ[1] کو بھی منسوخ کر دیں گے یہ دین اسلام کے کیسے حامی ہونگے کہ آتے ہی قرآن کریم کی ان آیتوں کو بھی منسوخ کر دیں گے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی منسوخ نہیں ہوئیں اور اس قدر انقلاب سے پھر بھی ختم نبوت میں حرج نہیں آئے گا۔ اس زمانہ میں جو تیرہ سو برس عہد نبوت کو گذر گیا اور خود اسلام اندرونی طور پر تہتر فرقوں پر پھیل گیا۔ سچے مسیح کا یہ کام ہونا چاہیئے کہ وہ دلائل کے ساتھ دلوں پر فتح پاوے نہ تلوار کے ساتھ اور صلیبی عقیدہ کو واقعی اور سچے ثبوت کے ساتھ توڑ دے نہ یہ کہ اُن صلیبوں کو توڑتا پھرے جو چاندی یا سونے یا پیتل یا لکڑی سے بنائی جاتی ہیں اگر تم جبر کرو گے تو تمہارا جبر اس بات پر کافی دلیل ہے کہ تمہارے پاس اپنی سچائی پر کوئی دلیل نہیں۔ ہر یک نادان اور ظالم طبع جب دلیل سے عاجز آ جاتا ہے تو پھر تلوار یا بندوق کی طرف ہاتھ لمبا کرتا ہے مگر ایسا مذہب ہرگز ہرگز خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتا جو صرف تلوار کے سہارے سے پھیل سکتا ہے نہ کسی اور طریق سے اگر تم ایسے جہاد سے باز نہیں آ سکتے اور اس پر غصہ میں آ کر راستبازوں کا نام بھی دجال اور ملحد رکھتے ہو تو ہم ان دو فقروں پر اس تقریر کو ختم کرتے ہیں قُلْ یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ[2] اندرونی تفرقہ اور پھوٹ کے زمانہ میں تمہارا فرضی مسیح اور فرضی مہدی کس کس پر تلوار چلائے گا کیا سنیوں کے نزدیک شیعہ اس لائق نہیں کہ ان پر تلوار اُٹھائی جائے اور شیعوں کے نزدیک سُنی اس لائق نہیں کہ ان سب کو تلوار سے نیست و نابود کیا جاوے پس جبکہ تمہارے اندرونی فرقے ہی تمہارے عقیدہ کی رو سے مستوجب سزا ہیں تو تم کس کس سے جہاد کرو گے۔ مگر یاد رکھو کہ خدا تلوار کا محتاج نہیں وہ اپنے دین کو آسمانی نشانوں کے ساتھ زمین پر پھیلائے گا اور کوئی اُس کو روک نہیں سکے گا۔ (کشتی نوح صفحہ ۶۷-۶۹)

اگر کہو کہ عربوں کے لیے بھی حکم تھا کہ جبراً مسلمان کیے جائیں یہ خیال قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ تمام عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ایذاء پہنچایا تھا اور بہت سے صحابہ مردوں اور عورتوں کو قتل کر دیا تھا اور بقیۃ السیف کو وطن سے نکال دیا تھا اس لیے وہ تمام لوگ جو مرتکب جرم قتل یا معین اس جرم کے تھے وہ سب خدا تعالیٰ کی نظر میں اپنی خونریزی کے عوض میں خونریزی کے لائق ہو چکے تھے ان کی نسبت بطور قصاص اصل حکم قتل کا تھا مگر ارحم الراحمین کی طرف سے یہ رعایت دی گئی کہ اگر کوئی ان میں سے مسلمان ہو جائے تو

[1] سورۃ التوبۃ : ۳۰ ؛ [2] الکافرون : ۲-۳

اُس کا گذشتہ جُرم جس کی وجہ سے وہ قابل سزائے موت ہے بخش دیا جائے گا۔ پس کہاں یہ صورت رحم اور کہاں جبر۔
(کشتی نوح صفحہ ۶۷ حاشیہ)

یعنی دین میں جبر نہیں چاہیئے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۱۹۵ حاشیہ)

یعنی دین کو جبر سے شائع نہیں کرنا چاہیئے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد نہم صفحہ ۸۳)

یَقُوْلُوْنَ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ وَیَقْرَؤُوْنَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ فِی الْکِتَابِ الْمُبِیْنِ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ قَوْلًا خَالَفَ ذَالِکَ وَیُصِرُّوْنَ عَلٰٓی اَنَّ مَھْدِیَّھُمْ یَخْرُجُ بِالْحُسَامِ وَلَا یَقْبَلُ اِلَّا الْاِسْلَامَ۔[۵]
(مواہب الرحمان صفحہ ۸۴)

یہ بات نہایت صاف اور سریع الفہم ہے کہ وہ کتاب جو حقیقت میں کتاب الٰہی ہے وہ انسانوں کی طبیعتوں پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالتی اور ایسے امور مخالف عقل پیش نہیں کرتی جن کا قبول کرنا اکراہ اور جبر میں داخل ہو کیونکہ کوئی عقل صحیح تجویز نہیں کرسکتی جو دین میں اکراہ اور جبر جائز ہو اس واسطے اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں فرمایا لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔
(نور القرآن اول صفحہ ۲)

یعنی دین میں کوئی جبر نہیں ہے تحقیق ہدایت اور گمراہی میں کھلا کھلا فرق ظاہر ہو گیا ہے پھر جبر کی کیا حاجت ہے تعجب کہ باوجودیکہ قرآن شریف میں اس قدر تصریح سے بیان فرمایا ہے کہ دین کے بارے میں جبر نہیں کرنا چاہیئے پھر بھی جن کے دل بغض اور دشمنی سے سیاہ ہو رہے ہیں ناحق خدا۔ کلام پر جبر کا الزام دیتے ہیں۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۲۲۴)

میں نہیں جانتا کہ ہمارے مخالفوں نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ خدا تو قرآن شریف میں فرماتا ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ یعنی دین اسلام میں جبر نہیں۔ تو پھر کس نے جبر کا حکم دیا۔ اور جبر کے کون سے سامان تھے۔ اور کیا وہ لوگ جو جبر سے مسلمان کیے جاتے ہیں ان کا یہی صدق اور یہی ایمان ہوتا ہے کہ بغیر کسی تنخواہ پانے کے باوجود دو تین سو آدمی ہونے کے ہزاروں آدمیوں کا مقابلہ کریں۔ اور جب ہزار تک پہنچ جائیں تو کئی لاکھ دشمن کو شکست دیدیں۔ اور دین کو دشمن کے حملہ سے بچانے کے لیے بھیڑوں بکریوں کی طرح سر کٹا دیں۔ اور اسلام کی سچائی پر اپنے خون سے مہریں کردیں۔ اور خدا کی توحید کے پھیلانے کے لیے ایسے عاشق ہوں۔ کہ درویشانہ طور پر سختی اٹھا کر افریقہ کے ریگستان تک پہنچیں۔ اور اس ملک میں اسلام کو پھیلا دیں۔ اور پھر ہر یک قسم کی صعوبت اٹھا کر چین تک پہنچیں نہ جنگ کے

---

[۵] (ترجمہ) لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے اور آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کو قرآن مجید میں پڑھتے ہیں پھر بھی اس قول کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ مہدی تلوار لیکر نکلیں گے اور جنگ کریں گے حتی کہ اسلام کے سوا کوئی اور چیز قبول نہیں کریں گے اور عدم قبول اسلام کی صورت میں سب کو تہ تیغ کریں گے۔

طور پر بلکہ محض درویشانہ طور پر اور اس ملک میں پہنچ کر دعوت اسلام کریں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کے بابرکت وعظ سے کئی کروڑ مسلمان اس زمین میں پیدا ہو جائیں۔ اور پھر ٹاٹ پوش درویشوں کے رنگ میں ہندوستان میں آئیں اور بہت سے حصہ آریہ ورت کو اسلام سے مشرف کر دیں اور یورپ کی حدود تک لا الہ الا اللہ کی آواز پہنچا دیں۔ تم ایمانا کہو کہ کیا یہ کام ان لوگوں کا ہے جو جبراً مسلمان کیے جاتے ہیں جن کا دل کافر اور زبان مومن ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے کام ہیں جن کے دل نور ایمان سے بھر جاتے ہیں۔ اور جن کے دلوں میں خدا ہی خدا ہوتا ہے۔ (پیغام صلح ص۴۲-۴۳)

قرآن شریف میں ہرگز ہرگز جبر کی تعلیم نہیں ہے۔ (جنگ مقدس ربحث ۴ جون ۱۸۹۳ء) ص۶)

یاد رکھو مہدی کی نسبت جو حدیثیں ہیں جن میں لکھا ہے کہ وہ جنگ کریگا اور خونریزی کریگا۔ ان کی نسبت خود ان مولویوں نے لکھ دیا ہے کہ بہت سی حدیثیں ان میں موضوع ہیں اور قریباً سب کی سب مجروح ہیں۔ ہمارا یہ مذہب نہیں ہے کہ مہدی آئے گا تو خون کرتا پھریگا بھلا وہ دین کیا ہوا جس میں سوائے جنگ اور جدال کے اور کچھ نہ ہو۔ جہاد کے مسئلہ کو بھی ان ناواقفوں نے نہیں سمجھا۔ قرآن شریف تو کہتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ تو کیا اگر مہدی آکر لڑائیاں کریگا تو اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ جائز ہوگا اور قرآن شریف کے اس حکم کی بے حرمتی ہوگی۔ اُس کے آنے کی غرض تو یہ ہے کہ وہ اسلام کو زندہ کرے یا یہ کہ اس کی توہین کرے۔ اگر دین میں لڑائیاں ہی ضروری ہوتی ہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ برس تک مکہ میں رہ کر کیوں نہ لڑے ہر قسم کی تکلیف اُٹھاتے رہے اور پھر بھی آپ نے ابتدا نہیں کی اور ہمارا مذہب ہے کہ جبراً مسلمان کرنے کے واسطے لڑائیاں ہرگز نہیں کی ہیں بلکہ وہ لڑائیاں خدا تعالیٰ کا ایک عذاب تھا اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے آپ کو سخت تکالیف دی تھیں اور مسلمانوں کا تعاقب کیا اور اُن کو تنگ کیا تھا۔ پس یہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ اسلام تلوار دکھاتا ہے اسلام تو قرآن اور ہدایت پیش کرتا ہے۔ وہ صلح اور امن لیکر آیا ہے اور دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں جو اسلام کی طرح صلح پھیلاتا ہو۔ پس یہ غلط ہے کہ مہدی جنگ کرے گا ہمارا یہ مذہب ہرگز نہیں۔ بھلا اگر تلوار مار کر لوگوں کو ہلاک کر دیا اور اُن کے املاک لوٹ لیے تو اس سے فائدہ کیا ہوا جس مہدی ہونے کا ہمارا دعویٰ ہے یہ تو قرآن شریف سے ثابت ہے جیسے موسوی سلسلہ مسیح پر آکر ختم ہوا اسی طرح خدا تعالیٰ نے ایک خاص مناسبت کی وجہ سے اس سلسلہ کو بھی ایک محمدی مسیح پر ختم کیا ہے اور مہدی نام اس کا اس لیے رکھا ہے کہ وہ براہ راست خدا تعالیٰ سے ہدایت پائے گا اور ایسے وقت میں آئے گا جبکہ دنیا سے نور و ہدایت اُٹھ گئے ہونگے۔ پھر ایک لطیف ترباب ان دونوں سلسلوں کی مماثلت میں یہ ہے کہ جیسے مسیح موسوی موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں (صدی) میں آیا تھا یہاں بھی مسیح محمدی کی بعثت کا زمانہ چودھویں ہی صدی ہے اور جیسے مسیح موسوی یہودیوں کی سلطنت نہیں بلکہ رومیوں کی سلطنت میں پیدا ہوا تھا اسی طرح محمدی مسیح بھی مسلمانوں کی سلطنت میں نہیں بلکہ انگلش گورنمنٹ کی سلطنت میں پیدا ہوا ہے۔ غرض ہمارا ہرگز یہ مذہب نہیں ہے کہ مہدی آکر لڑائیاں کرتا پھرے گا اور خونریزی اُس کا کام ہوگا۔ (الحکم جلد ۵ م۲۹ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء ص۳)

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر نوح کی قوم کا اعتراض شریفانہ رنگ میں ہوتا تو اللہ تعالیٰ نہ پکڑتا ساری قومیں اپنی کرتوتوں کی پاداش میں سزا پاتی ہیں خدا تعالیٰ نے تو یہاں تک بھی فرما دیا ہے کہ جو لوگ قرآن سننے کے لیے آتے ہیں ان کو امن کی جگہ تک پہنچا دیا جاوے خواہ وہ مخالف اور منکر ہی ہوں اس لیے کہ اسلام میں جبر اور اکراہ نہیں جیسے فرمایا لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

وہ تمام لوگ آگاہ رہیں جو اسلام کے بزور شمشیر پھیلائے جانے کا اعتراض کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔ اسلام کی تاثیرات اپنی اشاعت کے لیے کسی جبر کی محتاج نہیں ہیں اگر کسی کو شک ہے تو وہ میرے پاس رہ کر دیکھ لے کہ اسلام اپنی زندگی کا ثبوت براہین اور نشانات سے دیتا ہے.... انگلستان اور فرانس اور دیگر ممالک یورپ میں یہ الزام بڑی سختی سے اسلام پر لگایا جاتا ہے کہ وہ جبر کے ساتھ پھیلایا گیا ہے مگر افسوس اور سخت افسوس ہے کہ وہ نہیں دیکھتے کہ اسلام لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی تعلیم دیتا ہے اور انہیں نہیں معلوم کہ کیا وہ مذہب جو فتح پا کر بھی گرجے نہ گرانے کا حکم دیتا ہے کیا وہ جبر کر سکتا ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ ان ملانوں نے جو اسلام کے نادان دوست ہیں۔ یہ فساد ڈالا ہے۔ انہوں نے خود اسلام کی حقیقت کو سمجھا نہیں اور اپنے خیالی عقائد کی بنا پر دوسروں کو اعتراض کا موقعہ دیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے وہ تعلیم اور تربیت کے لیے کرتا ہے چونکہ شوکت کا زمانہ دیر تک رہتا ہے اور اسلام کی قوت اور شوکت صدیوں تک رہی اور اس کے فتوحات دور دراز تک پہنچے اس لیے بعض احمقوں نے سمجھ لیا کہ اسلام جبر سے پھیلایا گیا۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ اس امر کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لیے (کہ) اسلام جبر سے نہیں پھیلا اللہ تعالیٰ نے خاتم الخلفا کو پیدا کیا اور اس کا کام یضع الحرب رکھ کر دوسری طرف لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ[1] قرار دیا یعنی وہ اسلام کا غلبہ ملل ہالکہ پر حجت اور براہین سے قائم کریگا اور جنگ وجدال کو اٹھا دیگا۔ وہ لوگ سخت غلطی کرتے ہیں جو کسی خونی مہدی اور خونی مسیح کا انتظار کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

اب تلوار سے کام لینا تو اسلام پر تلوار مارنی ہے اب تو دلوں کو فتح کرنے کا وقت ہے اور یہ بات جبر سے نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے تلوار اٹھائی بالکل غلط ہے تیرہ برس تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ صبر کرتے رہے پھر باوجود اس کے کہ دشمنوں کا تعاقب کرتے تھے مگر صلح کے خواستگار ہوتے تھے کہ کسی طرح جنگ نہ ہو۔ اور جو مشرک قومیں صلح اور امن کی خواستگار ہوئیں ان کو امن دیا جاتا اور صلح کی جاتی اسلام نے بڑے بڑے پیچوں سے اپنے آپ کو جنگ سے بچانا چاہا ہے۔ جنگ کی بنیاد کو خود خدا تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ چونکہ یہ لوگ بہت مظلوم ہیں اور ان کو ہر طرح سے دکھ دیا گیا ہے اس لیے اب اللہ تعالیٰ اجازت دیتا ہے کہ یہ بھی ان کے مقابلہ پر لڑیں۔

---

[1] سورۃ الصف : ۱۰

ورنہ اگر تعصب ہوتا تو یہ حکم پہنچتا کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ دین کی اشاعت کے واسطے جنگ کریں۔ لیکن ادھر حکم دیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں) اور ادھر جب غایت درجہ کی سختی اور ظلم مسلمانوں پر ہوئے تو پھر مقابلہ کا حکم دیا۔

(البدر جلد اول نمبر ۱۱ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۴)

مذہبی امور میں آزادی ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ کہ دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے۔ اس قسم کا فقرہ انجیل میں کہیں بھی نہیں ہے۔ لڑائیوں کی اصل جڑھ کیا تھی۔ اس کے سمجھنے میں ان لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر لڑائی کا ہی حکم تھا تو تیرہ برس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تو پھر ضائع ہی گئے۔ کہ آپ نے آتے ہی تلوار نہ اٹھائی صرف لڑنے والوں کے ساتھ لڑائیوں کا حکم ہے۔ اسلام کا یہ اصول کبھی نہیں ہوا۔ کہ خود ابتدائے جنگ کریں۔ لڑائی کا کیا سبب تھا اسے خود خدا نے تبلایا ہے کہ ظُلِمُوْا۔ خدا نے جب دیکھا کہ یہ لوگ مظلوم ہیں تو اب اجازت دیتا ہے کہ تم بھی لڑو۔ یہ نہیں حکم دیا کہ اب وقت تلوار کا ہے تم زبردستی تلوار کے ذریعہ لوگوں کو مسلمان کرو۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ تم مظلوم ہو۔ اب مقابلہ کرو مظلوم کو تو ہر ایک قانون اجازت دیتا ہے کہ حفظِ جان کے واسطے مقابلہ کرے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲-۱ مورخہ ۲۳ و ۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

خدا مومنوں کا کارساز ہے اُن کو ظُلمات سے نور کی طرف نکال رہا ہے۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم صفحہ ۵۴۱)

اللہ دوستدار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے اور اُن کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔

(جنگ مقدس رجٹ ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۶)

خدا سے پورے طور پر ڈرنا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنا اور اپنے عمل کو ریا کاری کی ملونی سے پاک کر دینا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ ایسا ہی دنیا کی دولت اور حشمت اور اس کی کیمیا پر لعنت بھیجنا اور بادشاہوں کے قرب سے بے پروا ہو جانا اور صرف خدا کو اپنا ایک خزانہ سمجھنا بجز یقین کے ہرگز ممکن نہیں۔ اب بتلاؤ اے مسلمان کہلانے والو کہ ظلمات شک سے نور یقین کی طرف تم کیونکر پہنچ سکتے ہو یقین کا ذریعہ تو خدا کا کلام ہے جو يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کا مصداق ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۹۲)

بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ بہت نیکیاں کرنے سے انسان ولی بنتا ہے۔ یہ نادانی ہے مومن کو تو خدا نے اوّل ہی ولی بنایا ہے۔ جیسے کہ فرمایا ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (البدر جلد ۴ ۳ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

یعنی اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی ہوتا ہے اور انہیں ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔
(الحکم جلد ۱۰ ۴۲ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

۲۶۰۔ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

عُزیر کے فوت ہونے اور پھر سو برس کے بعد زندہ ہونے کی حجت جو پیش کی گئی ہے یہ حجّت مخالف کے لیے کچھ مفید نہیں ہے۔ کیونکہ ہرگز بیان نہیں کیا گیا کہ عُزیر کو زندہ کر کے پھر دُنیا کے دار الہموم میں بھیجا گیا تا یہ فساد لازم آوے کہ وہ بہشت سے نکالا گیا۔ بلکہ اگر ان آیات کو اُن کے ظاہری معانی پر محمول کیا جاوے تو صرف یہ ثابت ہوگا کہ خدائے تعالیٰ کے کرشمہ قدرت نے ایک لمحہ کے لیے عُزیر کو زندہ کر کے دکھلا دیا تا اپنی قدرت پر اُس کو یقین دلا دے مگر وہ دنیا میں آنا صرف عارضی تھا اور در اصل عُزیر بہشت میں ہی موجود تھا جاننا چاہیئے کہ تمام انبیا اور صدیق مرنے کے بعد پھر زندہ ہو جاتے ہیں اور ایک نُورانی جسم بھی اُنہیں عطا کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی بیداری میں راست بازوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں چنانچہ اس بارہ میں یہ عاجز خود صاحب تجربہ ہے پھر اگر عُزیر کو خدائے تعالیٰ نے اسی طرح زندہ کر دیا ہو تو تعجب کیا ہے۔ لیکن اس زندگی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ زندہ ہو کر بہشت سے خارج کیے گئے یہ عجیب طور کی نادانی ہے بلکہ اس زندگی سے تو بہشت کی تجلی زیادہ تر بڑھ جاتی ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صفحہ ۳۶۵-۳۶۶)

قرآن اور حدیث دونوں بالاتفاق اس بات پر شاہد ہیں کہ جو شخص مرگیا پھر دنیا میں ہرگز نہیں آئیگا اور قرآن کریم اَنَّہُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ[1] کہہ کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے اُن کو رخصت کرتا ہے اور قصہ عزیر وغیرہ جو قرآن کریم میں ہے اِس بات کے مخالف نہیں کیونکہ لغت میں موت بمعنی نوم اور غشی بھی آیا ہے دیکھو قاموس۔ اور جو عزیر کے قصہ میں ہڈیوں پر گوشت چڑھانے کا ذکر ہے وہ حقیقت میں ایک الگ بیان ہے جس میں یہ جتلانا منظور ہے کہ رحم میں خدائے تعالیٰ ایک مُردہ کو زندہ کرتا ہے اور اس کی ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا ہے اور پھر اُس میں جان ڈالتا ہے ماسوا اس کے کسی آیت یا حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ عُزیر دوبارہ زندہ ہوکر پھر بھی فوت ہوا پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ عزیر کی زندگی دوم دنیوی زندگی نہیں تھی ورنہ بعد اس کے ضرور کہیں اس کی موت کا بھی ذکر ہوتا ایسا ہی قرآن کریم میں جو بعض لوگوں کی دوبارہ زندگی لکھی ہے وہ بھی دنیوی زندگی نہیں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۶۵-۶۶۶)

مسیح علیہ السلام کی وفات کے منکر اپنے دلائل میں حضرت عزیر کی زندگی کا سوال پیش کرتے ہیں کہ وہ سو برس مرکر پھر زندہ ہوا۔

مگر یاد رہے کہ یہ احیاء بعد الاماتت ہے۔ اور احیاء کی کئی قسمیں ہیں؛ اوّل یہ کہ کوئی آدمی مرنے کے بعد ایسے طور پر زندہ ہو جاوے کہ قبر پھٹ جاوے اور وہ اپنا بوریا بدھنا بستر وغیرہ اُٹھا کر دنیا میں آ جاوے۔ دوئم یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ایک نئی زندگی بخشے جیسے اہل اللہ کو ایک دوسری زندگی دی جاتی ہے جس طرح پر ایک شخص نے خدا سے ڈر کر کہا تھا کہ میری راکھ اُڑا دی جاوے اس پر خدا تعالیٰ نے اُس کو زندہ کیا یہ راکھ کا اکٹھا کرنا بھی ایک جسمانی زندگی تھی مرنے کے بعد جو زندگی ملتی ہے وہاں تو راکھ کا اکٹھا کرنا نہیں ہے..... بعض آدمی حجۃ اللہ آیات اللہ کہلاتے ہیں بعض وجود ہی نشان ہوتے ہیں بعض کے مرنے کے بعد نشان قائم رہتے ہیں۔

یہ بیان کرنا ضروری تھا کہ اس اعتراض کا منشا کیا ہے جس راہ کو ہم نے اختیار کیا ہے اس کے خلاف ہے۔ ہمارے مخالفوں کا مسیح کی نسبت تو یہ اعتقاد ہے کہ وہ زندہ ہی آسمان پر گئے اور زندہ ہی واپس آئیں گے۔ عزیر کے قصہ سے اس کو کیا تعلق اور کیا مشابہت ہے؟ یہ مشابہت تو تب ہوتی اگر معترض کا یہ مذہب ہوتا کہ مسیح علیہ السلام قبر پھٹ کر نکلیں گے۔ جبکہ اُن کا یہ مذہب ہی نہیں تو پھر تعجب کی بات ہے کہ اس قصہ کو جو قیاس مع الفارق ہے کیوں پیش کرتے ہیں .... غرض اس سلسلہ میں یعنی مسیح کے قصہ میں عزیر کا قصہ داخل کرنا خلط مبحث ہے۔ ہمارا یہ مذہب ہے کہ عزیر کے قصہ کو مسیح کے آنے نہ آنے سے کچھ تعلق نہیں ہے ہاں اگر رنگ سوال اور ہو تو اور بات ہے یعنی عزیر کیوں کر زندہ ہوا؟ ہم اس قسم کی حیات کے منکر ہیں اور سارا قرآن اول سے آخر تک منکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو تجویز بندوں کے لیے رکھی ہے کہ خدا تعالیٰ اُس کے فرشتوں اُس کی کتابوں وغیرہ پر ایمان رکھ کر خاتمہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ فرشتہ ملک الموت آکر قبض روح کرلیتا ہے اور پھر اور واقعات پیش آتے ہیں۔ منکر نکیر آتے ہیں اعمال آتے ہیں پھر کھڑکی نکالی جاتی ہے۔ پھر قرآن کریم کہتا ہے کہ موتیٰ قیامت ہی کو اُٹھیں گے وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ[2] معالم میں لکھا ہے کہ رجوع موتیٰ نہیں ہوتا۔

---

[1] الانبیاء: ۹۶ [2] الانعام: ۳۷

قرآن کریم کے دو حصے ہیں کوئی بات قصہ کے رنگ میں ہوتی ہے اور بعض احکام ہدایت کے رنگ میں ہوتے ہیں بحیثیت ہدایت جو پیش کرتا ہے اُس کا منشا ہے کہ مان لو جیسے فرمایا اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ[1]... قصوں کے حقائق بتانے خدا تعالیٰ کو ضرور نہیں اُن پر ایمان لاؤ اور ان کی تفاسیر حوالہ بخدا کرو..... ہمارے مخالفوں میں اگر دیانت اور خدا ترسی ہو تو عزیر کا قصہ بیان کرتے وقت ضرور ہے کہ وہ ان آیات کو بھی ساتھ رکھیں جس میں لکھا ہے کہ مردے واپس نہیں آتے۔ پھر ہم بطریق تنزل ایک اور جواب دیتے ہیں۔

اس بات کو ہم نے بیان کر دیا ہے اور پھر کہتے ہیں کہ قصوں کے لیے اجمالی ایمان کافی ہے ہدایات میں چونکہ عملی رنگ لانا ضروری ہوتا ہے اس لیے اُس کا سمجھنا ضروری ہے ماسوا اس کے یہ جو لکھا ہے کہ سو برس تک مردہ رہے۔ اَمَاتَ کے معنے اَنَامَ بھی آئے ہیں اور قوت نامیہ اور حسیہ کے زوال پر بھی موت کا لفظ قرآن کریم میں بولا گیا ہے بہرحال ہم سونے کے معنے بھی اصحاب کہف کے قصہ کی طرح کر سکتے ہیں اصحاف کہف اور عزیر کے قصہ میں فرق اتنا ہے کہ اصحاب کہف کے قصہ میں ایک کتا ہے اور یہاں گدھا ہے اور نفس کتے اور گدھے دونوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ خدا نے یہودیوں کو گدھا بنایا ہے اور کتے کو بلعم کے قصہ میں بیان فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ نفس پیچھا نہیں چھوڑتا جو بیہوش ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ یا کتا ہوگا یا گدھا۔

غرض دوسرے طریق پر جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اَمَاتَ کے معنے اَنَامَ کرتے ہیں اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ سو برس چھوڑ کر کوئی دو لاکھ برس تک سویا رہے ہماری بحث یہ ہے کہ روح ملک الموت لے جاوے پھر واپس دنیا میں نہیں آتی سونے میں بھی قبض روح تو ہوتا ہے مگر اُس کو ملک الموت نہیں لے جاتا۔

اور عرصہ دراز تک سوئے رہنا ایک ایسا امر ہے کہ اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو سکتا ہندوؤں کی کتابوں میں دم سادھنے (حبس دم کرنے) کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہیں اور جوگ ابھیاس کی منزلوں میں دم سادھنا بھی ہے۔ ابھی تھوڑا عرصہ گذرا ہے کہ اخبارات میں لکھا تھا کہ ریل کی سڑک طیار ہوتی تھی تو ایک سادھو کی کٹیا نکلی۔ ایسا ہی اخبارات میں ایک لڑکے کی بیس سال تک سوئے رہنے کی خبر گشت کر رہی تھی۔ غرض یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ ایک آدمی سو سال تک سویا رہے۔ پھر یہ لفظ لَمْ یَتَسَنَّہْ قابل غور ہے اور موجودہ زمانہ کے تجربہ پر لحاظ کرنے کے بعد لَمْ یَتَسَنَّہْ کی حقیقت سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے ایک ثقہ آدمی لکھتا ہے کہ میں نے گوشت کھایا ہے جو میری پیدائش سے ۳۰ برس پہلے کا پکا ہوا تھا۔ ہوا نکال کر بند کر لیا گیا تھا۔

اب ولایت یورپ اور امریکہ سے ہر روز ہزاروں لاکھوں تولوں میں لَمْ یَتَسَنَّہْ کھانے پکے پکائے چلے آتے ہیں لَمْ یَتَسَنَّہْ کا اثر تو ہندوؤں کے جوگ پر پڑتا ہے اور آجکل کی علمی بلند پروازیوں کی حقیقت کھولتا ہے کہ قرآن کریم

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۸۵

ہیں پہلے سے درج ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جیسے ہوا کے ایک خاص اثر سے کھانا مرجاتا ہے اسی طرح انسان پر بھی اُس کا اثر ہوتا ہے۔ اب اگر خاص ترکیب سے کھانے کو اُس ہوا کے اثر سے محفوظ رکھ کر زندہ رکھا جاتا ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ ممکن ہے آیندہ کسی زمانہ میں یہ حقیقت بھی کھل جائے کہ انسان پر کھانے کی طرح عمل ہو سکتا ہے یہ علوم ہیں ان کے ماننے سے کوئی حرج لازم نہیں آتا۔

آج کل کی تحقیقات اور علمی تجربوں نے ایسے موزے بنا لیے ہیں کہ انسان ان کو پہن کر دریا پر چل سکتا ہے اور ایسے کوٹ ایجاد ہو گئے ہیں کہ آگ یا بندوق کی گولی اُن پر اپنا اثر نہیں کر سکتی اسی طرح سے لَمْ يَتَسَنَّهْ کی حقیقت جو قرآن کریم کے اندر مرکوز ہے علمی طور پر بھی ثابت ہو جاوے تو کیا تعجب ہے؟ ہوا کا اثر کھانے کو تباہ کرتا ہے اور انسان کے لیے بھی ہوا کا بڑا تعلق ہے ہوا کے دو حصے ہیں ایک قسم کی ہوا اندر جاتی ہے تو اندر تازگی پیدا ہوتی ہے دوسری دم کے ساتھ باہر آتی ہے جو جلی ہوئی متعفن ہوا ہوتی ہے۔ غرض اگر لَمْ يَتَسَنَّهْ والی بات نکل آوے تو ہمارا تو کچھ بھی حرج نہیں بلکہ جس قدر علوم طبعی پھیلتے جاتے ہیں اور پھیلیں گے اُسی قدر قرآن کریم کی عظمت اور خوبی ظاہر ہو گی۔

ہم تو آئے دن دیکھتے ہیں کہ ولایت کے پکے ہوئے شوربے اور گوشت ہندوستان میں آتے ہیں اور بگڑتے نہیں ولایتی ادویات ہزاروں میل سے آتی ہیں اور مہینوں برسوں پڑی رہتی ہیں خراب نہیں ہوتی ہیں۔ مجھے ایک شخص نے بتلایا کہ اگر انڈے کو سرسوں کے تیل میں رکھ چھوڑیں تو نہیں بگڑتا۔

اس طرح پر ممکن ہے کہ انسان کے شباب اور طاقتوں پر بھی اثر پڑے بعض مسلمانوں نے بھی دم سادھنے کی کوشش کی ہے۔ خود میرے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا کہ میں دن میں دو بار سانس لیتا ہوں۔ یہ عملی شہادت ہے کہ ہوا کو سڑنے میں دخل ہے۔ اس قسم کی ہوا سے جب بچایا جاوے تو انسان کی عمر بڑھ جاوے تو حرج کیا ہے۔ اور عمر کا بڑھنا مان لیں تو کیا حرج ہے۔

قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر حکمتیں ایجاد ہوتی ہیں یا تو طبعی طور پر خدا نے قاعدہ رکھا ہوا ہے یا عناصر کے نظام میں بات رکھی ہوتی ہے کوئی محقق دیکھ کر بات نکال لیتا ہے۔ ہم کو اس پر کوئی بحث نہیں ہے۔

ہمارا تو مذہب یہ ہے کہ علوم طبعی جس قدر ترقی کریں گے اور عملی رنگ اختیار کریں گے قرآن کی عظمت دنیا میں قائم ہو گی۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

۲۶۱ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ

بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

یاد رکھنا چاہیئے کہ جو قرآن کریم میں چار پرندوں کا ذکر لکھا ہے کہ اُن کو اجزاء متفرقہ یعنی جدا جدا کر کے چار پہاڑیوں پر چھوڑا گیا تھا اور پھر وہ بلانے سے آ گئے تھے یہ بھی عمل الترب کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عمل الترب کے تجارب تبلا رہے ہیں کہ انسان میں جمیع کائنات الارض کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے ایک قوت مقناطیسی ہے اور ممکن ہے کہ انسان کی قوت مقناطیسی اس حد تک ترقی کرے کہ کسی پرند یا چرند کو صرف توجہ سے اپنی طرف کھینچ لے۔ فتدبر ولا تغفل۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۲، ۵۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قصہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت آپ سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ ارشاد ہوا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تو اس پر ایمان نہیں لاتا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا جواب یہی دیا کہ بَلٰى ہاں میں ایمان لاتا ہوں مگر اطمینان قلب چاہتا ہوں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایسا سوال نہ کیا اور نہ ایسا جواب دینے کی ضرورت پڑی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلے ہی سے ایمان کے انتہائی مرتبہ اطمینان اور عرفان پر پہنچے ہوئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ اَدَبِیْ تو یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے ہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی ایک خوبی اس سے پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیا کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں اس پر ایمان نہیں رکھتا بلکہ یہ کہا کہ ایمان تو رکھتا ہوں مگر اطمینان چاہتا ہوں۔

پس جب ایک شخص ایک شرطی اقتراح پیش کرے اور پھر یہ کہے کہ میں اطمینان قلب چاہتا ہوں تو وہ اس سے استدلال نہیں کر سکتا کیونکہ شرطی اقتراح پیش کرنے والا تو ادنیٰ درجہ بھی ایمان کا نہیں رکھتا بلکہ وہ تو ایمان اور تکذیب کے درمیانی مقام پر ہے اور تسلیم کرنے کو مشروط بہ اقتراح کرتا ہے پھر وہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ میں ابراہیم کی طرح اطمینان قلب چاہتا ہوں؟ ابراہیم نے تو ترقی ایمان چاہی ہے انکار نہیں کیا اور پھر اقتراح بھی نہیں کیا۔ بلکہ احیاء موتی کی کیفیت پوچھی ہے اور اس کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے یہ نہیں کہا کہ اس مردہ کو زندہ کر کے دکھا یا یوں کر۔ اور

پھر اس کا جواب جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ بھی عجیب اور لطیف ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو چار جانور لے یا ان کو اپنے ساتھ ہلا لے۔ یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ ذبح کر لے کیونکہ اس میں ذبح کرنے کا لفظ نہیں بلکہ اپنے ساتھ ہلا لے جیسے لوگ بٹیر یا تیتر یا بلبل کو پالتے ہیں اور اپنے ساتھ ہلا لیتے ہیں پھر وہ اپنے مالک کی آواز سُنتے ہیں اور اُس کے بلانے پر آجاتے ہیں۔ اسی طرح پر حضرت ابراہیم کو احیاء اماتت سے انکار نہ تھا بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مُردے خدا کی آواز کس طرح سُنتے ہیں اس سے اُنہوں نے سمجھ لیا کہ ہر چیز طبعاً اور فطرتاً اللہ تعالیٰ کی مطیع اور تابع فرمان ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

سوال۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو پوچھا رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى اس سے کیا غرض ہے۔

جواب۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا مطلب جس کو سِرّ الٰہی سمجھنا چاہیئے یہ ہے۔ کہ ہر ایک چیز میری آواز سنتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مُردوں کے زندہ ہونے پر کوئی شک پیدا نہیں ہوا کیونکہ ہم تو ہر روز دیکھتے ہیں کہ متعفن پانی اغذیہ میں سے جانور پیدا ہو جاتے ہیں پیٹ میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے کیا وہ پہلے مُردہ نہیں ہوتا۔ پس واقعات سے انکار کرنے والا تو بڑا احمق ہوتا ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تو اصل سِرّ سے واقف ہونا چاہتے تھے پس خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر ایک چیز میری آواز سنتی ہے جیسے پرندے تمہاری آواز سن کر دوڑے چلے آتے ہیں اسی طرح ہر ایک چیز میری آواز سنتی اور میرے پاس دوڑی چلی آتی ہے یہاں تک کہ ادویہ اور اغذیہ جو انسان کے پیٹ میں جاتی ہیں اور ہر ذرہ ذرہ میری آواز سنتا ہے پس یہاں اللہ تعالیٰ ایمان اور معرفت کا یقین دلانا چاہتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کو خالق سے ایک باریک کشش ہوتی ہے جیسے کسی کا شعر ہے ؎

ہمہ را روئے در خدا دیدم	وآن خدا بر ہمہ ترا دیدم

..... غرض اس قصہ میں اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کی تابع ہے اگر اس سے انکار کیا جاوے تو پھر تو خدا تعالیٰ کا وجود بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اخیر میں اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز اور حکیم بیان کی ہے۔ یعنی اس کا غلبہ قہری ایسا ہے کہ ہر ایک چیز اس کی طرف رجوع کر رہی ہے بلکہ جب خدا تعالیٰ کا قرب انسان حاصل کرتا ہے تو اس انسان کی طرف بھی ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے جس کا ثبوت سورۃ العادیات میں ہے عزیز حکیم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا غلبہ حکمت سے بھرا ہوا ہے ناحق کا دکھ نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

(۲۶۲) مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

یعنی خدا کی راہ میں جو لوگ مال خرچ کرتے ہیں اُن کے مالوں میں خدا اس طرح برکت دیتا ہے کہ جیسے ایک دانہ جب بویا جاتا ہے تو گو وہ ایک ہی ہوتا ہے مگر خدا اُس میں سے سات خوشے نکال سکتا ہے اور ہر ایک خوشہ میں سَو دانے پیدا کرسکتا ہے یعنی اصل چیز سے زیادہ کر دینا یہ خدا کی قدرت میں داخل ہے اور درحقیقت ہم تمام لوگ خدا کی اسی قدرت سے ہی زندہ ہیں اور اگر خدا اپنی طرف سے کسی چیز کو زیادہ کرنے پر قادر نہ ہوتا تو تمام دُنیا ہلاک ہو جاتی اور ایک جاندار بھی روئے زمین پر باقی نہ رہتا۔ (چشمہ معرفت ص۱۶۲)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○

یعنی اے احسان کرنے والو اپنے صدقات کو جن کی صدق پر بنا چاہیئے احسان یاد دلانے اور دکھ دینے کے ساتھ برباد مت کرو یعنی صدقہ کا لفظ صدق سے مشتق ہے پس اگر دل میں صدق اور اخلاص نہ رہے تو وہ صدقہ صدقہ نہیں رہتا بلکہ ایک ریاکاری کی حرکت ہو جاتی ہے غرض احسان کرنے والے میں یہ ایک خامی ہوتی ہے کہ کبھی غصہ میں آکر اپنا احسان یاد بھی دلا دیتا ہے اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کو ڈرایا۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۰۹-۱۱۰)

اپنی خیرات اور مروت کو احسان رکھنے اور دکھ دینے کے ساتھ باطل مت کرو یعنی اپنے ممنون منت کو کبھی یہ نہ جتلاؤ کہ ہم نے تجھے یہ دیا تھا اور نہ اس کو دکھ دو کہ اس طرح تمہارا احسان باطل ہوگا۔ اور نہ ایسا طریق پکڑو کہ تم اپنے مالوں کو ریاکاری کے ساتھ خرچ کرو۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۱۱)

رونا دھونا اور صدقات فرد قرارداد جرم کو بھی ردّی کر دیتے ہیں۔ اصول خیرات کا اسی سے نکلا ہے۔ یہ طریق اللہ کو راضی کرنے کے ہیں۔ علم تعبیر الرؤیا میں مال کلیجہ ہوتا ہے اسی لیے خیرات کرنا جان دینا ہوتا ہے۔ انسان خیرات کرتے

وقت کس قدر صدق و ثبات دکھاتا ہے۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ صرف قیل و قال سے کچھ نہیں بنتا جب تک کہ عملی رنگ میں لاکر کسی بات کو نہ دکھایا جاوے۔ صدقہ اس کو اسی لیے کہتے ہیں کہ صادقوں پر نشان کر دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲ مورخہ ۶ مارچ ۱۸۹۸ء صفحہ ۲)

مسلمان وہی ہے جو صدقات اور دعا کا قائل ہو۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۶)

بعض لوگ ایک بات مُنہ سے نکالتے ہیں اور پھر اس پر قائم نہیں رہ سکتے اور گنہ گار ہوتے ہیں۔ صدقہ عمدہ وہ ہے۔ جو اگرچہ قلیل ہو۔ مگر اس پر دوام ہو۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۲۹ مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

اس بات پر بھی غور کرو کہ صدقہ اور خیرات کیوں جاری ہے اور ہر قوم میں اس کا رواج ہے۔ فطرتاً انسان مصیبت اور بلا کے وقت صدقہ دینا چاہتا ہے۔ اور خیرات کرتا ہے اور کہتے ہیں کہ بکرے دو، کپڑے دو۔ یہ دو وہ دو۔ اگر اس کے ذریعہ سے رد بلا نہیں ہوتا تو پھر اضطراراً انسان کیوں ایسا کرتا ہے؟ نہیں رد بلا ہوتا ہے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کے اتفاق سے یہ بات ثابت ہے اور میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا مذہب نہیں بلکہ یہودیوں۔ عیسائیوں اور ہندوؤں کا بھی یہ مذہب ہے اور میری سمجھ میں روئے زمین پر کوئی اس امر کا منکر ہی نہیں جب کہ یہ بات ہے تو صاف کھل گیا کہ وہ ارادہ الٰہی ٹل جاتا ہے۔ (لیکچر لدھیانہ بحوالہ الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

(۲۶۷) اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاۗءُ ښ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ہر ایک بسیط میں جو مرکبات کا اصل ہے کرویت یعنی گول ہونا مشاہدہ کرو گے۔ پانی کا قطرہ بھی گول شکل پر ظاہر ہوتا ہے اور تمام ستارے جو نظر آتے ہیں ان کی شکل گول ہے اور ہوا کی شکل بھی گول ہے جیسا کہ ہوائی گولے جن کو عربی میں اِعْصَار کہتے ہیں یعنی بگولے جو کسی تند ہوا کے وقت مدوّر شکل میں زمین پر چکر کھاتے پھرتے ہیں ہواؤں کی کرویت ثابت کرتے ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۱ حاشیہ)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

اے ایمان والو تم ان مالوں میں سے لوگوں کو بطریق سخاوت یا احسان یا صدقہ وغیرہ دو جو تمہاری پاک کمائی ہے یعنی جس میں چوری یا رشوت یا خیانت یا غبن کا مال یا ظلم کے روپیہ کی آمیزش نہیں اور یہ مقصد تمہارے دل سے دور رہے کہ ناپاک مال لوگوں کو دو۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۱۱)

يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

یعنی خدا جس کو چاہتا ہے حکمت عنایت کرتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اُس کو بہت سا مال دیا گیا۔

(براہین احمدیہ جلد چہارم ص۴۱۰)

یعنی خدا جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اُس کو خیر کثیر دی گئی ہے یعنی حکمت خیر کثیر پر مشتمل ہے اور جس نے حکمت پائی اس نے خیر کثیر کو پالیا سو یہ علوم و معارف جو دوسرے لفظوں میں حکمت کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ خیر کثیر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بحر محیط کے رنگ میں ہیں جو کلام الٰہی کے تابعین کو دئے جاتے ہیں اور اُن کے فکر اور نظر میں ایک ایسی برکت رکھی جاتی ہے جو اعلیٰ درجہ کے حقائق حقّہ ان کے نفس آئینہ صفت پر منعکس ہوتے رہتے ہیں اور کامل صداقتیں اُن پر منکشف ہوتی رہتی ہیں اور تائیدات الٰہیہ ہر یک تحقیق اور تدقیق کے وقت کچھ ایسا سامان اُن کے لیے میسّر کر دیتی ہیں جس سے بیان اُن کا ادھورا اور ناقص نہیں رہتا اور نہ کچھ غلطی واقع ہوتی ہے۔ (براہین احمدیہ جلد چہارم ص۴۴۵-۴۴۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر۳)

یعنی خُدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اُس کو خیر کثیر دی گئی پس دیکھنا چاہیئے کہ ان آیات میں مسلمانوں کو کس قدر علم و حکمت حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص۱۴۴)

آسمانی مال جو خدائے تعالیٰ کے خاص بندوں کو ملتا ہے جس کو وہ دُنیا میں تقسیم کرتے ہیں دُنیا کا درم و دینار نہیں بلکہ حکمت و معرفت ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ہے کہ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ خیر مال کو کہتے ہیں سو پاک مال حکمت ہی ہے جس کی طرف حدیث نبوی میں بھی اشارہ ہے کہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ هُوَ الْمُعْطِيْ یہی مال ہے جو مسیح موعود کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم ص۶۳۳)

اس جگہ حکمت سے مراد علم قرآن ہے سو ایسے لوگ وحی خاص کے ذریعہ سے علم اور بصیرت کی راہ سے مطلع کیے جاتے ہیں اور صحیح اور موضوع میں اس خاص طور کے قاعدہ سے تمیز کر لیتے ہیں۔ گو عوام اور علماء ظواہر کو اس کی طرف راہ نہیں۔

(الحق لدھیانہ ص۹۱ بار دوم)

یعنی جس کو خدا تعالیٰ چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اُس کو خیر کثیر دی گئی حکمت سے مراد علم عظمت ذات و صفات باری ہے اور خیر کثیر سے مراد اسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ[1]۔ پھر ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا[2] یعنی اے میرے ربّ تو مجھے اپنی عظمت اور معرفت شیون اور صفات کا علم کامل بخش اور پھر دوسری جگہ فرمایا وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ[3] اِن دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو اول المسلمین ٹھہرے تو اِس کا یہی باعث ہوا کہ اوروں کی نسبت علوم معرفت الٰہی میں اعلم ہیں یعنی علم ان کا معارف الٰہیہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے ان کا اسلام بھی سب سے اعلیٰ ہے اور وہ اوّل المسلمین ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس زیادت علم کی طرف اُس دوسری آیت میں بھی اشارہ ہے جیسا کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا[4] یعنی خدا تعالیٰ نے تجھ کو وہ علوم عطا کیے جو تو خود بخود نہیں جان سکتا تھا اور فضل الٰہی سے فیضان الٰہی سب سے زیادہ تیرے پر ہوا یعنی تو معارف الٰہیہ اور اسرار اور علوم ربّانی میں سب سے بڑھ گیا اور خدا تعالیٰ نے اپنی معرفت کے عطر کے ساتھ سب سے زیادہ تجھے معطّر کیا غرض علم اور معرفت کو خدا تعالیٰ نے حقیقت اسلامیہ کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور اگرچہ حصول حقیقت اسلام کے وسائل اور بھی ہیں جیسے صوم و صلوٰۃ اور دعا اور تمام احکام الٰہی جو چھ سو سے بھی کچھ زیادہ ہیں لیکن علم عظمت و وحدانیت ذات اور معرفت شیون و صفات جلالی و جمالی حضرت باری عزّ اسمہٗ وسیلۃ الوسائل اور سب کا موقوف علیہ ہے کیونکہ جو شخص غافل دل اور معرفت الٰہی سے بکلّی بے نصیب ہے وہ کب توفیق پا سکتا ہے کہ صوم اور صلوٰۃ بجا لاوے یا دُعا کرے یا اور خیرات کی طرف مشغول ہو ان سب اعمال صالحہ کا محرّک تو معرفت ہی ہے اور یہ تمام دوسرے وسائل دراصل اسی کے پیدا کردہ اور اُسی کے بنین و بنات ہیں اور ابتدا اِس معرفت کی پرتوہ اسم رحمانیت سے ہے

---

[1] سورۃ یونس: ۵۹ ۞ [2] سورۃ طٰہٰ: ۱۱۵ ۞ [3] سورۃ الانعام: ۱۶۴ ۞ [4] سورۃ النسآء: ۱۱۴ ۞

نہ کسی عمل سے نہ کسی دعا سے بلکہ بلا علّت فیضان سے صرف ایک موہبت ہے۔ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ وَیُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ مگر پھر یہ معرفت اعمال صالحہ اور حُسن ایمان کے شمول سے زیادہ ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ آخر الہام اور کلام الٰہی کے رنگ میں نزول پکڑ کر تمام صحن سینہ کو اُس نور سے منوّر کر دیتی ہے جس کا نام اسلام ہے اور اس معرفت تامہ کے درجہ پر پُہنچ کر اسلام صرف لفظی اسلام نہیں رہتا بلکہ وہ تمام حقیقت اُس کی جو ہم بیان کر چکے ہیں حاصل ہو جاتی ہے اور انسانی رُوح نہایت انکسار سے حضرت احدیت میں اپنا سر رکھ دیتی ہے تب دونوں طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ جو میرا سو تیرا ہے۔ یعنی بندہ کی روح بھی بولتی ہے اور اقرار کرتی ہے کہ یا الٰہی جو میرا ہے سو تیرا ہے۔ اور خدا تعالیٰ بھی بولتا ہے اور بشارت دیتا ہے کہ اے میرے بندے جو کچھ زمین و آسمان وغیرہ میرے ساتھ ہے وہ سب تیرے ساتھ ہے اسی مرتبہ کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا[1] (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۱۸۶ تا ۱۹۰)

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کا نام مال رکھا ہے اور حکمت کا نام بھی مال رکھا ہے جیسا کہ فرماتا ہے یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا مفسر لکھتے ہیں کہ اس کے معنے ہیں مَالًا کَثِیْرًا۔ لغت میں خیر کے معنے مال کے لکھے ہیں اور ایک اور حدیث میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بڑی دعوت کی اور ہر ایک قسم کا کھانا پکایا تو بعض کھانا کھانے کے لیے آئے انہوں نے کھانا کھا کر حظ اُٹھایا اور بعض نے اس دعوت سے انکار کیا وہ بے نصیب رہے۔ اب دیکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پلاؤ اور قورمہ وغیرہ پکایا تھا یا روحانی کھانے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ انبیاء اکثر روحانی امور کو طرح طرح کے پیرایوں میں بیان فرمایا کرتے ہیں اور نفسانی آدمی ان کو جسمانی امور کی طرف لے جاتے ہیں۔ بھلا ہم پوچھتے ہیں کہ مسیح آکر درہم و دینار بہت سے تقسیم کرے گا کہ علماء وغیرہ کے گھر سونے چاندی سے بھر جائیں گے لیکن اس کا کہاں تذکرہ ہے کہ وہ لوگ جو روحانی طور پر بھوکے پیاسے ہونگے اُن کی اسی طور سے پوری حاجت براری کرے گا۔ پس اگر یہ تذکرہ کسی اور جگہ نہیں تو یقیناً یاد رکھو کہ یہ وہی تذکرہ ہے جو استعارہ کے رنگ پر بیان کیا گیا ہے۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

علوم ہیں ہی کیا؟ صرف خواص الاشیاء ہی کا تو نام ہے۔ سیارہ۔ ستارہ۔ نباتات کی تاثیریں اگر نہ رکھتا تو اللہ تعالیٰ کی صفت علیم پر ایمان لانا انسان کے لیے مشکل ہو جاتا یہ ایک یقینی امر ہے کہ ہمارے علم کی بنیاد خواص الاشیاء ہے اس سے یہ غرض ہے کہ ہم حکمت سیکھیں علوم کا نام حکمت بھی رکھا ہے چنانچہ فرمایا۔ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۶)

قرآن شریف کو خدا تعالیٰ نے خیر کہا ہے چنانچہ فرمایا وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا اس

---

[1] سورۃ الزمر: ۵۴

قرآن شریف معارف اور علوم کے مال کا خزانہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآنی معارف اور علوم کا نام بھی مال رکھا ہے۔ دنیا کی برکتیں بھی اسی کے ساتھ آتی ہیں۔ (الحکم جلد ۵ ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۷)

جسے نصیحت کرنی ہو اُسے زبان سے کرو۔ ایک ہی بات ہوتی ہے وہ ایک پیرایہ میں ادا کرنے سے ایک شخص کو دشمن بنا سکتی ہے اور دوسرے پیرایہ میں دوست بنا دیتی ہے پس جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ[1] کے موافق اپنا عمل درآمد رکھو اسی طرز کلام ہی کا نام خدا نے حکمت رکھا ہے چنانچہ فرماتا ہے يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ۔ (الحکم جلد ۷ ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

انسان اصل میں اُنْسَان سے لیا گیا ہے یعنی جس میں دو حقیقی اُنس ہوں ایک اللہ تعالیٰ سے دوسرا بنی نوع کی ہمدردی سے جب یہ دونو اُنس اس میں پیدا ہو جاویں اُس وقت انسان کہلاتا ہے اور یہی وہ بات ہے جو انسانیت کا مغز کہلاتی ہے اور اسی مقام پر انسان اولوا الالباب کہلاتا ہے۔ جب تک یہ نہیں کچھ بھی نہیں۔ ہزار دعویٰ کرو اور دکھاؤ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے نبی اور فرشتوں کے نزدیک ہیچ ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

۲۷۲ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اگر تم ظاہر کر و خیرات کو تو وہ اچھا ہے۔ اور اگر تم خیرات کو چھپاؤ تو وہ بہت ہی اچھا ہے۔ ایسی خیرات تمہاری بُرائیاں دور کرے گی۔ (یادداشتیں براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱ و پیغام صلح صفحہ ۴۷)

۲۷۵ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

وہ کبھی پوشیدہ خیرات کرتے رہتے ہیں اور کبھی ظاہر۔ پوشیدہ اس لیے کہ تا ریاکاری سے بچیں اور ظاہر اس لیے کہ تا دوسروں کو ترغیب دیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۱۲)

انجیل میں کہا گیا ہے کہ تم اپنے نیک کاموں کو لوگوں کے سامنے دکھلانے کے لیے نہ کرو مگر قرآن کہتا ہے کہ تم ایسا مت کرو کہ اپنے سارے کام لوگوں سے چھپاؤ بلکہ تم حسب مصلحت بعض اپنے نیک اعمال پوشیدہ طور پر بجا لاؤ جبکہ تم

[1] سورۃ النحل: ۱۲۶

دیکھو کہ پوشیدہ کرنا تمہارے نفس کے لیے بہتر ہے اور بعض اعمال دکھلا کر بھی کرو جبکہ تم دیکھو کہ دکھلانے میں عام لوگوں کی بھلائی ہے تا تمہیں دو بدلے ملیں اور تا کمزور لوگ کہ جو ایک نیکی کے کام پر جرأت نہیں کر سکتے وہ بھی تمہاری پیروی سے اس نیک کام کو کرلیں۔ غرض خدا نے جو اپنے کلام میں فرمایا سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یعنی پوشیدہ بھی خیرات کرو اور دکھلا دکھلا کر بھی۔ ان احکام کی حکمت اس نے خود فرما دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف قول سے لوگوں کو سمجھاؤ بلکہ فعل سے بھی تحریک کرو کیونکہ ہر ایک جگہ قول اثر نہیں کرتا بلکہ اکثر جگہ نمونہ کا بہت اثر ہوتا ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۹)

جیسا کہ تم بعض اپنے نیک اعمال کو پوشیدہ کرتے ہو ایسا ہی بعض اوقات ان کو لوگوں پر ظاہر کرو تا لوگ تمہارے نمونہ پر چلیں کیونکہ انسان کی عادت ہے کہ نمونہ دیکھ کر اس میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ (مکتوبات احمدیہ جلد پنجم حصہ اول صفحہ ۶ مکتوب ۱۱ بنام حضرت سیٹھ عبدالرحمان صاحب مدراسی)

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۝ یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَ یُرۡبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ

اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۝

ایک شخص نے ایک لمبا خط لکھا کہ سیونگ بنک کا سود اور دیگر تجارتی کارخانوں کا سُود جائز ہے یا نہیں کیونکہ اس کے ناجائز ہونے سے اسلام کے لوگوں کو تجارتی معاملات میں بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ حضرت اقدس نے فرمایا کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور جب تک کہ اس کے سارے پہلوؤں پر غور نہ کی جائے اور ہر قسم کے ہرج اور فوائد جو اس سے حاصل ہوتے ہیں وہ ہمارے سامنے پیش نہ کیے جاویں۔ ہم اس کے متعلق اپنی رائے دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہزاروں طریق روپیہ کمانے کے پیدا کیے ہیں۔ مسلمان کو چاہیئے کہ ان کو اختیار کرے اور اس سے پرہیز رکھے ایمان صراطِ مستقیم سے وابستہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو اس طرح سے ٹال دینا گناہ ہے مثلاً اگر دنیا میں سؤر کی تجارت ہی سب سے زیادہ نفع مند ہو جاوے تو کیا مسلمان اس کی تجارت شروع کر دیں گے۔ ہاں اگر ہم یہ دیکھیں کہ اس کو چھوڑنا اسلام کے لیے ہلاکت کا موجب ہوتا ہے تب ہم فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ[1] کے نیچے لا کر اس کو جائز کہہ دیں گے مگر یہ کوئی ایسا امر نہیں اور یہ ایک خانگی امر اور خود غرضی کا مسئلہ ہے۔ ہم فی الحال بڑے بڑے عظیم الشان امور دینی کی طرف متوجہ ہیں۔ ہمیں تو لوگوں کے ایمان کا فکر پڑا ہوا ہے۔ ایسے ادنیٰ امور کی طرف ہم توجہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم بڑے عالیشان دینی مہمات کو چھوڑ کر ابھی سے ایسے ادنیٰ کاموں میں لگ جائیں تو ہماری مثال اس بادشاہ کی ہوگی جو ایک مقام پر ایک محل بنانا چاہتا ہے مگر اس جگہ بڑے شیر اور درندے اور سانپ ہیں اور نیز مکھیاں اور چیونٹیاں ہیں پس اگر وہ پہلے درندوں اور سانپوں کی طرف توجہ نہ کرے اور ان کو ہلاکت تک نہ پہنچائے اور سب سے پہلے مکھیوں کے فنا کرنے میں مصروف ہو تو اس کا کیا حال ہوگا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

ایک نے سوال کیا کہ ضرورت پر سودی روپیہ لیکر تجارت وغیرہ کرنے کا کیا حکم ہے۔ فرمایا حرام ہے۔ ہاں اگر کسی دوست اور تعارف کی جگہ سے روپیہ لیا جاوے اور کوئی وعدہ اُس کو زیادہ دینے کا نہ ہو نہ اُس کے دل میں زیادہ لینے کا خیال ہو پھر اگر مقروض اصل سے کچھ زیادہ دیدے تو وہ سود نہیں ہوتا بلکہ یہ تو هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ[2] ہے۔

اس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر ضرورت سخت ہو اور سوائے سود کے کام نہ چل سکے تو پھر۔ اس پر حضرت اقدس نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے اس کی حُرمت مومنوں کے واسطے مقرر کی ہے اور مومن وہ ہوتا ہے جو ایمان پر قائم ہو اللہ تعالیٰ اس کا متولی اور متکفل ہوتا ہے اسلام میں کروڑہا ایسے آدمی گزرے ہیں جنہوں نے نہ سود لیا نہ دیا آخر ان کے حوائج بھی پورے ہوتے رہے کہ نہ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ لو نہ دو جو ایسا کرتا ہے وہ گویا خدا کے ساتھ لڑائی کی طیاری کرتا ہے ایمان ہو تو اس کا صلہ خدا بخشتا ہے۔ ایمان بڑی بابرکت شے ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ[3]۔ اگر اُسے خیال ہو کہ پھر کیا کرے تو کیا خدا کا حکم بھی بیکار ہے اُس کی قدرت بہت بڑی ہے۔ سود تو کوئی شئی ہی نہیں ہے اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا کہ زمین کا پانی نہ پیا کرو تو وہ ہمیشہ بارش کا پانی آسمان سے دیا کرتا اسی طرح ضرورت پر وہ خود ایسی راہ نکال

[1] سورۃ البقرۃ : ۱۷۴ ✤ [2] سورۃ الرحمٰن : ۶۱ ✤ [3] سورۃ البقرۃ : ۱۰۷ ✤

ہی دیتا ہے کہ جس سے اس کی نافرمانی بھی نہ ہو تب تک ایمان ہیں میں کچھ ہوتا ہے۔ تب تک یہ ضعف اور کمزوری ہے کوئی گناہ چھوٹ نہیں سکتا جب تک خدا نہ چھوڑا دے۔ ورنہ انسان تو ہر ایک گناہ پر یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ ہم چھوڑ نہیں سکتے اگر چھوڑیں تو گذارہ نہیں چلتا۔ دکانداروں عطاروں کو دیکھا جاوے کہ پرانا مال سالہا سال تک بیچتے ہیں دھوکا دیتے ہیں ملازم پیشہ لوگ رشوت خوری کرتے ہیں اور سب یہ عذر کرتے ہیں کہ گذارہ نہیں چلتا ان سب کو اگر اکٹھا کر کے نتیجہ نکالا جاوے تو پھر یہ نکلتا ہے کہ خدا کی کتاب پر عمل ہی نہ کرو کیونکہ گذارہ نہیں چلتا حالانکہ مومن کے لیے خدا خود سہولت کر دیتا ہے یہ تمام راستبازوں کا مجرب علاج ہے کہ معصیت اور صعوبت میں خدا خود راہ نکال دیتا ہے۔

لوگ خدا کی قدر نہیں کرتے جیسے بھروسہ ان کو حرام کے دروازے پر ہے ویسا خدا پر نہیں ہے خدا پر ایمان یہ ایک ایسا نسخہ ہے کہ اگر قدر ہو تو جی چاہے کہ جیسے اور عجیب نسخہ مخفی رکھنا چاہتے ہیں ویسے ہی اسے بھی مخفی رکھا جاوے۔ (البدر جلد ۲ ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

ہمارے نزدیک سودی روپیہ لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ مومن وہ ہوتے ہیں جو اپنے ایمان پر قائم ہوں اللہ تعالیٰ ان کا خود متولی اور متکفل ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے.... عذر رکھ کر معصیت میں مبتلا ہونا یہ سفلی عذر ہے جو شیطان سے آتا ہے ورنہ خدا تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتے تو سب کچھ ہوتا ہے.... غرض مومن کو خدا تعالیٰ ایسی مشکلات میں نہیں ڈالتا۔ جو پڑتا ہے وہ اپنی ہی کمزوری کی وجہ سے پڑتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۰۵)

ایک صاحب نے سوال کیا کہ ریلوے میں جو لوگ ملازم ہوتے ہیں ان کی تنخواہ میں سے ار (ایک آنہ) فی روپیہ کاٹ کر رکھا جاتا ہے پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ روپیہ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور زائد روپیہ بھی وہ دیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے۔

فرمایا کہ شرع میں سود کی یہ تعریف ہے کہ ایک شخص اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو روپیہ قرض دیتا ہے اور فائدہ مقرر کرتا ہے۔ یہ تعریف جہاں صادق آویگی وہ سود کہلاویگا۔ لیکن جس نے روپیہ لیا ہے اگر وہ وعدہ وعید تو کچھ نہیں کرتا اور اپنی طرف سے زیادہ دیتا ہے تو وہ سود سے باہر ہے چنانچہ انبیاء ہمیشہ شرائط کی رعایت رکھتے آئے ہیں اگر بادشاہ کچھ روپیہ لیتا ہے اور وہ اپنی طرف سے زیادہ دیتا ہے اور دینے والا اس نیت سے نہیں دیتا کہ سود ہے تو وہ بھی سود میں داخل نہیں ہے وہ بادشاہ کی طرف سے احسان ہے پیغمبر خدا نے کسی سے ایسا قرضہ نہیں لیا کہ ادائیگی وقت اُسے کچھ نہ کچھ ضرور زیادہ (نہ) دیدیا ہو یہ خیال رہنا چاہیئے کہ اپنی خواہش نہ ہو۔ خواہش کے برخلاف جو زیادہ ملتا ہے وہ سود میں داخل نہیں ہے۔

(البدر جلد ۲ ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۵)

سود کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذاتی فائدہ کے لیے روپیہ قرض دیا جاوے یہ تعریف جہاں صادق آتی ہے وہ سود ہے لیکن جبکہ محکمہ ریلوے کے ملازم خود وہ روپیہ سود کے لالچ سے نہیں دیتے بلکہ جبراً وضع کیا جاتا ہے تو یہ سود کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔ اور خود جو کچھ وہ روپیہ زائد دیدیتے ہیں وہ داخل سود نہیں ہے۔ غرض یہ خود دیکھ سکتے ہو کہ آیا یہ روپیہ سود لینے کے لیے تم خود دیتے ہو یا وہ خود وضع کرتے ہیں۔ اور بلا طلب اپنے طور پر دیتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

ایک صاحب نے بیان کیا کہ سید احمد خان صاحب نے لکھا ہے اَضْعَافًا مُضَاعَفَۃً کی ممانعت ہے۔ فرمایا
کہ یہ بات غلط ہے کہ سود در سود کی ممانعت کی گئی ہے اور سود جائز رکھا ہے شریعت کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے۔
یہ فقرے اسی قسم کے ہوتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ گناہ در گناہ مت کرتے جاؤ اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گناہ ضرور کرو۔
اس قسم کا روپیہ جو کہ گورنمنٹ سے ملتا ہے وہ اسی حالت میں سود ہوگا جبکہ لینے والا اسی خواہش سے روپیہ
دیتا ہے کہ مجھ کو سود ملے ورنہ گورنمنٹ جو اپنی طرف سے احساناً دیوے وہ سود میں داخل نہیں ہے۔
(البدر جلد ۲ عـ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صـ۷۵)

انشیورنس اور بیمہ پر سوال کیا گیا فرمایا۔ کہ سود اور قمار بازی کو الگ کرکے دوسرے اقراروں اور ذمہ داریوں
کو شریعت نے صحیح قرار دیا ہے قمار بازی میں ذمہ داری نہیں ہوتی۔ دنیا کے کاروبار میں ذمہ داری کی ضرورت ہے۔
دوسرے ان تمام سوالوں میں اس امر کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف میں حکم ہے کہ بہت کھوج نکال نکال
کر مسائل نہ پوچھنے چاہئیں۔ مثلاً اب کوئی دعوت کھانے جاوے تو اب اسی خیال میں لگ جاوے کہ کسی وقت
حرام کا پیسہ ان کے گھر آیا ہوگا پھر اس طرح تو آخرکار دعوتوں کا کھانا ہی بند ہو جاوے گا۔ خدا کا نام ستار بھی ہے
ورنہ دنیا میں عام طور پر راست باز کم ہوتے ہیں مستور الحال بہت ہوتے ہیں یہ بھی قرآن میں لکھا ہے وَلَا تَجَسَّسُوْا[1]
یعنی تجسس مت کیا کرو ورنہ اس طرح تم مشقت میں پڑو گے۔ (البدر جلد ۲ عـ۱۰ مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۰۳ء صـ۷۶)

سود کی بابت پوچھا گیا کہ بعض مجبوریاں لاحق حال ہو جاتی ہیں۔ فرمایا
اس کا فتویٰ ہم نہیں دے سکتے۔ یہ بہر حال ناجائز ہے۔ ایک طرح کا سود اسلام میں جائز ہے یہ کہ قرض دیتے
وقت کوئی شرط وغیرہ کسی قسم کی نہ ہو۔ اور مقروض جب قرضہ ادا کرے تو مروّت کے طور پر اپنی طرف سے کچھ زیادہ دے
دیوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے۔ اگر دس روپیہ قرض لیے تو ادائیگی کے وقت ایک سو تک دے دیا
کرتے۔ سود حرام وہی ہے۔ جس میں عہد معاہدہ اور شرائط اول ہی کر لی جاویں۔ (البدر جلد ۳ عـ۳۲ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۴ء صـ۸)

بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ سود لینے کے بغیر ہمارا گذارا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ کیونکر متقی کہلا سکتے ہیں
خدا تعالیٰ تو وعدہ کرتا ہے کہ میں متقی کو ہر ایک مشکل سے نکالوں گا اور ایسے طور سے رزق دوں گا جو گمان اور وہم میں
بھی نہ آ سکے۔ (البدر جلد ۳ عـ۲۵ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صـ۵)

حضرت حکیم نور الدین صاحب نے ایک مسئلہ حضرت اقدسؑ سے دریافت کیا۔ کہ یہ ایک شخص ہیں جن کے پاس
بیس بائیس ہزار کے قریب روپیہ موجود ہے۔ ایک سکھ ہے وہ ان کا روپیہ تجارت میں استعمال کرنا چاہتا ہے اور ان کے
اطمینان کے لیے اس نے تجویز کی ہے۔ کہ یہ روپیہ بھی اپنے قبضہ میں رکھیں۔ لیکن جس طرح وہ ہدایت کرے۔ اسی طرح
ہر ایک شے خرید کر جہاں کہے۔ وہاں روانہ کریں۔ اور جو روپیہ آوے۔ وہ امانت رہے۔ سال کے بعد وہ سکھ

[1] الحجرات : ۱۳

دو ہزار چھ سو روپیہ ان کو منافع کا دے دیا کرے گا۔ یہ اس غرض سے یہاں فتویٰ دریافت کرنے آئے ہیں۔ کہ یہ روپیہ جو ان کو سال کے بعد ملے گا اگر سود نہ ہو تو شراکت کر لی جاوے۔

حضرت اقدس نے فرمایا کہ چونکہ انھوں نے خود بھی کام کرنا ہے اور ان کی محنت کو دخل ہے اور وقت بھی صرف کریں گے۔ اس لیے ہر ایک شخص کی حیثیت کے لحاظ سے اس کے وقت اور محنت کی قیمت ہوا کرتی ہے۔ دس دس ہزار اور دس دس لاکھ روپیہ لوگ اپنی محنت اور وقت کا معاوضہ لیتے ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک تو یہ روپیہ جو ان کو وہ دیتا ہے۔ سود نہیں ہے۔ اور میں اس کے جواز کا فتویٰ دیتا ہوں۔ سود کا لفظ تو اس روپیہ پر دلالت کرتا ہے جو مفت بلا محنت کے (صرف روپیہ کے معاوضہ میں) لیا جاتا ہے اب اس ملک میں اکثر مسائل زیر و زبر ہو گئے ہیں۔ کل تجارتوں میں ایک نہ ایک حصّہ سود کا موجود ہے۔ اس لیے اس وقت نئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

(البدر جلد ۳ ع ۴۲-۴۱ مورخہ یکم و ۸ر نومبر ۱۹۰۴ء ھ)

(بینک کے سود کے متعلق فرمایا

ہمارا یہی مذہب ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہی ہمارے دل میں ڈالا ہے کہ ایسا روپیہ اشاعتِ دین کے کام میں خرچ کیا جاوے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ سود حرام ہے لیکن اپنے نفس کے واسطے اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں جو چیز جاتی ہے وہ حرام نہیں رہ سکتی ہے کیونکہ حرمت اشیاء کی انسان کے لیے ہے نہ اللہ تعالیٰ کے واسطے۔ پس سود اپنے نفس کے لیے بیوی بچوں احباب رشتہ داروں اور ہمسایوں کے لیے بالکل حرام ہے۔ لیکن اگر یہ روپیہ خالصۃً اشاعتِ دین کے لیے خرچ ہو تو ہرج نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام بہت کمزور ہو گیا ہے اور پھر اس پر دوسری مصیبت یہ ہے کہ لوگ زکوٰۃ بھی نہیں دیتے۔

میں دیکھتا ہوں۔ کہ اس وقت دو مصیبتیں واقع ہو رہی ہیں اور دو حرمتیں روا رکھی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ زکوٰۃ جس کے دینے کا حکم تھا وہ دیتے نہیں اور سود جس کے لینے سے منع کیا تھا وہ لیتے ہیں۔ یعنی جو خدا تعالیٰ کا حق تھا وہ تو دیا نہیں اور جو اپنا حق نہ تھا اسے لیا گیا۔ جب ایسی حالت ہو رہی ہے اور اسلام خطرناک ضعف میں مبتلا ہے تو میں یہی فتویٰ دیتا ہوں کہ ایسے سودوں کی رقمیں جو بنک سے ملتا ہے یک مشت اشاعتِ دین میں خرچ کرنی چاہئیں۔ میں نے جو فتویٰ دیا ہے وہ عام ہے ورنہ سود کا لینا اور دینا دونو حرام ہیں مگر اس ضعف اسلام کے زمانہ میں جبکہ مالی ترقی کے ذریعہ پیدا نہیں ہوئے اور مسلمان توجہ نہیں کرتے ایسا روپیہ اسلام کے کام میں لگنا حرام نہیں ہے۔

قرآن شریف کے مفہوم کے موافق جو حرمت ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے نفس کے لیے اگر خرچ ہو تو حرام ہے یہ بھی یاد رکھو جیسے سود اپنے لیے درست نہیں کسی اور کو اس کا دینا بھی درست نہیں۔ ہاں خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ایسے مال کا دینا درست ہے اور اس کا یہی طریق ہے کہ وہ صرف اشاعتِ اسلام میں خرچ ہو۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے جہاد ہو رہا ہو

اور گولی بارود کسی فاسق فاجر کے ہاں ہو اس وقت محض اس خیال سے رُک جانا کہ یہ گولی بارود مال حرام ہے ٹھیک نہیں بلکہ مناسب یہی ہوگا کہ اس کو خرچ کیا جاوے اس وقت تلوار کا جہاد تو باقی نہیں رہا اور خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں ایسی گورنمنٹ دی ہے جس نے ہر ایک قسم کی مذہبی آزادی عطا کی ہے۔ اب قلم کا جہاد باقی ہے اس لیے اشاعتِ دین میں ہم اس کو خرچ کر سکتے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ ع۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

ہمارا مذہب یہ ہے کہ سود کا روپیہ بالکل حرام ہے۔ کہ کوئی شخص اُسے اپنے نفس پر خرچ کرے اور کسی قسم کے بھی ذاتی مصارف میں خرچ کرے۔ یا اپنے بال بچے کو دے۔ یا کسی فقیر مسکین کو دے۔ کسی ہمسایہ کو دے۔ یا مسافر کو دے۔ سب حرام ہے۔ سود کے روپیہ کا لینا اور خرچ کرنا گناہ ہے۔ (بدر جلد ۱ ع۲۶ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

سود کا روپیہ تصرف ذاتی کے واسطے ناجائز ہے۔ لیکن خدا کے واسطے کوئی شے حرام نہیں۔ خدا کے کام میں جو مال خرچ کیا جائے وہ حرام نہیں ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے ہے۔ کہ گولی بارود کا چلانا کیسا ہی ناجائز اور گناہ ہو۔ لیکن جو شخص اُسے ایک جانی دشمن پر مقابلہ کے واسطے نہیں چلاتا وہ قریب ہے۔ کہ خود ہلاک ہو جائے کیا خدا نے نہیں فرمایا۔ کہ تین دن کے بھوکے کے واسطے سؤر بھی حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔ پس سود کا مال اگر ہم خدا کے لیے لگائیں تو پھر کیونکر گناہ ہو سکتا ہے اس میں مخلوق کا حصہ نہیں۔ لیکن اعلائے کلمہ اسلام میں اور اسلام کی جان بچانے کے لیے اس کا خرچ کرنا ہم اطمینان اور ثلج قلب سے کہتے ہیں۔ کہ یہ بھی فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ[1] میں داخل ہے۔ یہ ایک استثناء ہے۔ اشاعت اسلام کے واسطے ہزاروں حاجتیں ایسی پڑتی ہیں۔ جن میں مال کی ضرورت ہے۔ (بدر جلد ۱ ع۲۶ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

اشاعتِ اسلام کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس پر اگر وہ روپیہ جو بنکوں کے سود سے آتا ہے خرچ کیا جاوے۔ تو جائز ہے کیونکہ وہ خالص خدا کے لیے ہے۔ خدا تعالیٰ کے لیے وہ حرام نہیں ہے جیسے میں نے ابھی کہا ہے کہ کسی جگہ کا سکّہ و بارود ہو وہ جہاد میں خرچ کرنا جائز ہے یہ ایسی باتیں ہیں کہ بلا تکلّف سمجھ میں آجاتی ہیں۔ کیونکہ بالکل صاف ہیں اللہ تعالیٰ نے سؤر کو حرام کیا ہے لیکن بایں ہمہ فرماتا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ[1]۔ جب اضطراری حالت میں محض اپنی جان بچانے کی خاطر سؤر کا کھانا جائز ہے تو کیا ایسی حالت میں کہ اسلام کی حالت بہت ضعیف ہوگئی ہے اور اس کی جان پر آبنی ہے اس کی جان بچانے کے لیے محض اعلائے کلمہ اسلام کے لیے سود کا روپیہ خرچ نہیں ہو سکتا؟ میرے نزدیک یقیناً خرچ ہو سکتا ہے اور خرچ کرنا چاہیے۔ (الحکم جلد ۹ ع۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

میرا مذہب جس پر خدا نے مجھے قائم کیا ہے۔ اور جو قرآن شریف کا مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس عیال اطفال دوست عزیز کے واسطے اس سود کو مباح نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ پلید ہے۔ اور اس کا گناہ (استعمال) حرام ہے۔ لیکن اس ضعف اسلام کے زمانہ میں جبکہ دین مالی امداد کا سخت محتاج ہے اسلام کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ جیسا کہ ہم نے مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔ کہ جاپانیوں کے واسطے ایک کتاب لکھی جاوے۔ اور کسی فصیح بلیغ جاپانی کو ایک ہزار روپیہ دے کر

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۷۴

ترجمہ کرایا جائے۔ اور پھر اس کا دس ہزار نسخہ چھاپ کر جاپان میں شائع کر دیا جاوے۔ ایسے موقعہ پر سود کا روپیہ لگانا جائز ہے کیونکہ ہر ایک مال خدا کا ہے۔ اور اس طرح پر وہ خدا کے ہاتھ میں جائے گا۔ مگر بایں ہمہ اضطرار کی حالت میں ایسا ہوگا۔ اور بغیر اضطرار یہ بھی جائز نہیں۔ . . . . ہمارا منشاء صرف یہ ہے کہ اضطراری حالت میں جب خنزیر کھانے کی اجازت نفسانی ضرورتوں کے واسطے جائز ہے۔ تو اسلام کی ہمدردی کے واسطے اگر انسان دین کو ہلاکت سے بچانے کے واسطے سود کے روپے کو خرچ کرے۔ تو کیا قباحت ہے۔ یہ اجازت مختص المقام اور مختص الزمان ہے۔ یہ نہیں۔ کہ ہمیشہ کے واسطے اس پر عمل کیا جائے۔ جب اسلام کی نازک حالت نہ رہے۔ تو پھر اس ضرورت کے واسطے بھی سود لینا ویسا ہی حرام ہے۔ کیونکہ دراصل سود کا عام حکم تو حرمت ہی ہے۔ (بدر جلد ۱ ع۲۶ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۰۵ء ص۴)

ایک صاحب کا خط حضرت اقدس کی خدمت میں پہنچا کہ جب بنکوں کے سود کے متعلق حضور نے اجازت دی ہے کہ موجودہ زمانہ اور اسلام کی حالت کو مدنظر رکھ کر اضطرار کا اعتبار کیا جائے تو اضطرار کا اصول چونکہ وسعت پذیر ہے اس لیے ذاتی قومی۔ ملکی۔ تجارتی وغیرہ اضطرارت بھی پیدا ہو کر سود کا لین دین جاری ہو سکتا ہے یا نہیں۔

فرمایا۔ اس طرح سے لوگ حرام خوری کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں۔ کہ جو جی چاہے کرتے پھریں۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ بنک کا سود بہ سبب اضطرار کے کسی انسان کو لینا اور کھانا جائز ہے۔ بلکہ اشاعت اسلام میں اور دینی ضروریات میں اس کا خرچ جائز ہونا بتلایا گیا ہے۔ وہ بھی اس وقت تک کہ امداد دین کے واسطے روپیہ مل نہیں سکتا۔ اور دین غریب ہو رہا ہے۔ کیونکہ کوئی شئے خدا کے واسطے تو حرام نہیں۔ باقی رہی اپنی ذاتی اور ملکی اور قومی اور تجارتی ضروریات سو ان کے واسطے اور ایسی باتوں کے واسطے سود بالکل حرام ہے۔ وہ جواز جو ہم نے بتلایا ہے۔ وہ اس قسم کا ہے۔ کہ مثلاً کسی جاندار کو آگ میں جلانا شرعاً منع ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے واسطے جائز ہے۔ کہ اس زمانہ میں اگر کہیں جنگ پیش آوے۔ تو توپ بندوقوں کا استعمال کرے۔ کیونکہ دشمن بھی اس کا استعمال کر رہا ہے۔

(بدر جلد ۷ ع۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء ص۷)

جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑتا ہے۔ اسے سزا ملتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے پہلے فرما دیا کہ اگر سود کے لین دین سے باز نہ آوگے تو لڑائی کا اعلان ہے۔ خدا کی لڑائی یہی ہے کہ ایسے لوگوں پر عذاب بھیج دیتا ہے۔ پس یہ مفلسی بطور عذاب اور اپنے کیے کا پھل ہے۔ (بدر جلد ۷ ع۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء ص۵-۶)

اس شخص نے کہا کیا کریں مجبوری سے سودی قرضہ لیا جاتا ہے۔

فرمایا۔ جو خدا تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ خدا اس کا کوئی سبب پردہ غیب سے بنا دیتا ہے افسوس کہ لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے کہ متقی کے لیے خدا تعالیٰ کبھی ایسا موقع نہیں بناتا کہ وہ سودی قرضہ لینے پر مجبور ہو۔ یاد رکھو جیسے اور گناہ ہیں مثلاً زنا چوری ایسے ہی یہ سود دینا اور لینا ہے۔ کس قدر نقصان دہ یہ بات ہے کہ مال بھی گیا حیثیت بھی

گئی اور ایمان بھی گیا۔ معمولی زندگی میں ایسا کوئی امر ہی نہیں کہ جس پر اتنا خرچ ہو جو انسان سودی قرضہ لینے پر مجبور ہو مثلاً نکاح ہے۔ اس میں کوئی خرچ نہیں طرفین نے قبول کیا اور نکاح ہوگیا۔ بعد ازاں ولیمہ سنت ہے۔ سو اگر اس کی استطاعت بھی نہیں تو یہ بھی معاف ہے۔ انسان اگر کفایت شعاری سے کام لے تو اس کا کوئی بھی نقصان نہیں ہوتا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ لوگ اپنی نفسانی خواہشوں اور عارضی خوشیوں کے لیے خدا تعالیٰ کو ناراض کر لیتے ہیں جو ان کی تباہی کا موجب ہے۔ دیکھو سُود کا کس قدر سنگین گناہ ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں۔ سؤر کا کھانا تو بحالت اضطرار جائز رکھا ہے چنانچہ فرماتا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[1] ○ یعنی جو شخص باغی نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اللہ غفور رحیم ہے مگر سُود کے لیے نہیں فرمایا کہ بحالت اضطرار جائز ہے بلکہ اس کے لیے تو ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[2] اگر سُود کے لین دین سے باز نہ آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان ہے۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ جو خدا تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔ اُسے حاجت ہی نہیں پڑتی۔ مسلمان اگر اس ابتلا میں ہیں تو یہ ان کی اپنی ہی بد عملیوں کا نتیجہ ہے۔ ہندو اگر یہ گناہ کرتے ہیں تو مالدار ہو جاتے ہیں مسلمان یہ گناہ کرتے ہیں تو تباہ ہو جاتے ہیں۔ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ[3] کے مصداق پس کیا ضروری نہیں کہ مسلمان اس سے باز آئیں۔

انسان کو چاہیئے کہ اپنے معاش کے طریق میں پہلے ہی کفایت شعاری مدنظر رکھے تاکہ سُودی قرضہ اٹھانے کی نوبت نہ آئے جس سے سُود اصل سے بڑھ جاتا ہے۔ ابھی کل ایک شخص کا خط آیا تھا کہ ہزار روپیہ دے چکا ہوں ابھی پانچ چھ سو باقی ہے پھر مصیبت یہ ہے کہ عدالتیں بھی ڈگری دے دیتی ہیں۔ مگر اس میں عدالتوں کا کیا گناہ۔ جب اس کا اقرار موجود ہے تو گویا اس کے یہ معنے ہیں کہ سُود دینے پر راضی ہے پس وہاں سے ڈگری جاری ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بہتر تھا کہ مسلمان اتفاق کرتے اور کوئی فنڈ جمع کر کے تجارتی طور پر اُسے فروغ دیتے تاکہ کسی بھائی کو سُود پر قرضہ لینے کی حاجت نہ ہوتی بلکہ اسی مجلس سے ہر صاحب ضرورت اپنی حاجت روائی کر لیتا اور میعادِ مقررہ پر واپس دے دیتا۔

(بدر جلد ۷ عـ۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء صـ۶)

دیکھو جو حرام پر جلدی نہیں دوڑتا بلکہ اس سے بچتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے لیے حلال کا ذریعہ نکال دیتا ہے۔ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا[4] جو سود دینے اور ایسے حرام کاموں سے بچے خدا تعالیٰ اس کے لیے کوئی سبیل بنا دے گا۔ ایک کی نیکی اور نیک خیال کا اثر دوسرے پر بھی پڑتا ہے۔ کوئی اپنی جگہ پر استقلال رکھے تو سود خوار بھی مفت دینے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ (بدر جلد ۷ عـ۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء صـ۶)

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۷۴ [2] سورۃ البقرۃ: ۲۷۹، ۲۸۰ [3] سورۃ الحج: ۱۲ [4] سورۃ الطلاق: ۳

البقرۃ: ۲۸۳

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ

جب تم سچی گواہی کے لیے بلائے جاؤ تو جانے سے انکار مت کرو۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۱۴-۱۱۵)

البقرۃ: ۲۸۴

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝

ہمارے نزدیک رہن جبکہ نفع و نقصان کا ذمہ دار ہو جاتا ہے اس سے فائدہ اٹھانا منع نہیں ہے۔
(الحکم جلد ۷، نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

موجودہ تجاویز رہن جائز ہیں۔ گزشتہ زمانہ میں یہ قانون تھا کہ اگر فصل ہوگئی تو حکام زمینداروں سے معاملہ وصول کر لیا کرتے تھے اگر نہ ہوتی تو معاف ہو جاتا اور اب خواہ فصل ہو یا نہ ہو حکام اپنا مطالبہ وصول کر ہی لیتے ہیں پس چونکہ حکام وقت اپنا مطالبہ کسی صورت میں نہیں چھوڑتے تو اسی طرح یہ رہن بھی جائز رہا کیونکہ کبھی فصل ہوتی اور کبھی نہیں ہوتی تو دونوں صورتوں میں مرتہن نفع و نقصان کا ذمہ دار ہے۔ پس رہن عدل کی صورت میں جائز ہے آج کل گورنمنٹ کے معاملے زمینداروں سے ٹھیکہ کی صورت میں ہوگئے ہیں اور اس صورت میں زمینداروں کو کبھی فائدہ اور کبھی نقصان ہوتا ہے تو ایسی صورت عدل میں رہن بیشک جائز ہے۔

جب دودھ والا جانور اور سواری کا گھوڑا رہن با قبضہ ہو سکتا ہے اور اس کے دودھ اور سواری سے مرتہن فائدہ اٹھا سکتا ہے تو پھر زمین کا رہن تو آپ ہی حاصل ہو گیا۔

پھر زیور کے رہن کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا۔

زیور ہو کچھ ہو جب کہ انتفاع جائز ہے تو خواہ نخواہ تکلفات کیوں بناتے جاویں۔ اگر کوئی شخص زیور کو استعمال کرنے سے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ بھی اس کے ذمہ ہے۔ زیور کی زکوٰۃ بھی فرض ہے چنانچہ کل ہی ہمارے گھر میں زیور کی زکوٰۃ ڈیڑھ سو روپیہ دیا ہے پس اگر زیور استعمال کرتا ہے تو اس کی زکوٰۃ دے۔ اگر بکری رہن

رکھی ہے اور اس کا دودھ پیتا ہے تو اس کو گھاس بھی دے۔ (الحکم جلد ۷ عـ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صـ۱۱)

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ اور سچی گواہی کو مت چھپاؤ اور جو چھپائے گا۔ اس کا دل گنہ گار ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صـ۱۱۵)

دل کی مثال ایک بڑی نہر کی سی ہے جس میں سے اور چھوٹی چھوٹی نہریں نکلتی ہیں جن کو سُوا کہتے ہیں یا راجباہا کہتے ہیں۔ دل کی نہر میں سے بھی چھوٹی چھوٹی نہریں نکلتی ہیں مثلاً زبان وغیرہ اگر چھوٹی نہر یعنی سُوے کا پانی خراب اور گندہ اور میلا ہو تو قیاس کیا جاتا ہے کہ بڑی نہر کا پانی خراب ہے۔ پس اگر کسی کو دیکھو کہ اُس کی زبان یا دست و پا وغیرہ میں سے کوئی عضو ناپاک ہے تو سمجھو کہ اُس کا دل بھی ایسا ہی ہے۔ (الحکم جلد ۵ عـ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صـ۳)

۲۸۶ آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ

یعنی رسول اور اُس کے ساتھ کے مومن اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو ان پر نازل کی گئی اور ہر ایک خدا پر ایمان لایا اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور ان کا یہ اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں تفرقہ نہیں ڈالتے۔ اس طرح پر کہ بعض کو قبول کریں اور بعض کو رد کر دیں۔ بلکہ ہم سب کو قبول کرتے ہیں۔ ہم نے سنا اور ایمان لائے اے خدا ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری طرف ہی ہماری بازگشت ہے۔ ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن شریف ان تمام نبیوں کا ماننا جن کی قبولیت دنیا میں پھیل چکی ہے مسلمانوں کا فرض ٹھہراتا ہے اور قرآن شریف کی رو سے اُن نبیوں کی سچائی کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ دُنیا کے ایک بڑے حصہ نے اُن کو قبول کیا اور ہر ایک قدم میں خدا کی مدد اور نصرت اُن کے شامل حال ہوگئی۔ خدا کی شان اس سے بلند تر ہے کہ وہ کروڑ ہا انسانوں کو اُس شخص کا سچا تابع اور جاں نثار کرے جس کو وہ جانتا ہے کہ خدا پر افترا کرتا ہے اور دنیا کو دھوکہ دیتا ہے اور دروغ گو ہے اور اگر کاذب کو ایسی ہی عزت دی جائے جیسے کہ صادق کو تو امان اُٹھ جاتا ہے اور امر نبوت صادقہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ پس یہ اصول نہایت صحیح اور سچا ہے کہ جن نبیوں کو قبولیت دی جاتی ہے اور ہر ایک قدم میں حمایت اور نصرت الٰہی اُن کے شامل حال ہو جاتی ہے وہ ہرگز جھوٹے ہوا نہیں کرتے۔ ہاں ممکن ہے کہ پیچھے آنے والے اُن کے نوشتوں میں تحریف تبدیل کر دیں اور اپنی نفسانی تفسیروں سے اُن کے مطالب کو اُلٹا دیں بلکہ پُرانی کتابوں کے لیے یہ بھی ایک لازمی امر ہے کہ مختلف

خیالات کے آدمی اپنے خیال کے طور پر اُن کے معنے کرتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ وہی معنے جُزوِ کتاب کی سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر انھیں مختلف خیالات کی کشش کی وجہ سے کئی فرقے ہو جاتے ہیں اور ہر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے مخالف معنے کرتا ہے۔ (لیکچر مشمولہ چشمۂ معرفت صفحہ ۶)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۗ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی خدا تعالیٰ انسانی نفوس کو ان کی وسعت علمی سے زیادہ کسی بات کو قبول کرنے کے لیے تکلیف نہیں دیتا اور وہی عقیدے پیش کرتا ہے جن کا سمجھنا انسان کی حدِّ استعداد میں داخل ہے تا اس کے حکم تکلیف مالایطاق میں داخل نہ ہوں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۹۶-۱۹۷)

ہمیں حکم ہے کہ تمام احکام میں اخلاق میں عبادات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں پس اگر ہماری فطرت کو وہ قوتیں نہ دی جاتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کمالات کو ظلّی طور پر حاصل کر سکتیں تو یہ حکم ہمیں ہرگز نہ ہوتا کہ اس بزرگ نبی کی پیروی کرو کیونکہ خدا تعالیٰ فوق الطاقت کوئی تکلیف نہیں دیتا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۲)

جس پر خدا تعالیٰ کے نزدیک...... اتمام حجت ہو چکا ہے وہ قیامت کے دن مواخذہ کے لائق ہوگا اور جس پر خدا کے نزدیک اتمام حجت نہیں ہوا اور وہ مکذّب اور منکر ہے تو گو شریعت نے (جس کی بنا ظاہر پر ہے) اس کا نام بھی کافر ہی رکھا ہے اور ہم بھی اُس کو باتباعِ شریعت کافر کے نام سے ہی پکارتے ہیں مگر پھر بھی وہ خدا کے نزدیک بموجب آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا قابلِ مواخذہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم اُس کی نسبت نجات کا حکم دیں۔ اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ہمیں اس میں دخل نہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۸۰)

ہم کو عقل سے بھی کام لینا چاہیے کیونکہ انسان عقل کی وجہ سے مکلف ہے۔ کوئی آدمی بھی خلاف عقل باتوں کے ماننے پر مجبور نہیں ہو سکتا۔ قویٰ کی برداشت اور حوصلہ سے بڑھ کر کسی قسم کی شرعی تکلیف نہیں اٹھوائی گئی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔ اس آیت سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ایسے نہیں جن کی بجاآوری کوئی کر ہی نہ سکے۔ اور نہ شرائع واحکام خدائے تعالیٰ نے دنیا میں اس لیے نازل کیے کہ اپنی بڑی فصاحت و بلاغت اور ایجادی قانونی طاقت اور چیستان طرازی کا فخر انسان پر ظاہر کرے اور یوں پہلے ہی سے اپنی جگہ ٹھان رکھا تھا کہ کہاں بیہودہ ضعیف انسان ؛ اور کہاں کا ان حکموں پر عمل درآمد ؛ خدا تعالیٰ اس سے برتر اور پاک ہے کہ ایسا لغو فعل کرے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۹-۷۰)

شرائط پر پابند ہونا باعتبار استطاعت ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔

(مکتوبات جلد ۵ حصہ ۲ صفحہ ۶۵ مکتوب ۴۷ بنام حضرت خلیفہ اولؓ)

ہم قرآن شریف ہی کی تعلیم دینے کو آئے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف تو اس لیے بھیجا ہے کہ اس پر عمل کیا جاوے اس میں کہیں نہیں لکھا کہ خدا کسی کو مجبور کرتا ہے[1] (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

قابلیت فراست سے ظاہر ہوتی ہے۔ خدا نے کچھ چھپایا ہے اور کچھ ظاہر کیا ہے اگر بالکل ظاہر کرتا تو ایمان کا ثواب جاتا رہتا اور اگر بالکل چھپاتا تو سارے مذاہب تاریکی میں دبے رہتے اور کوئی بات قابل اطمینان نہ ہو سکتی اور آج کوئی مذہب والا دوسرے کو نہ کہہ سکتا کہ تو غلطی پر ہے اور نہ مؤاخذہ کا اصول قائم رہ سکتا تھا کیونکہ یہ تکلیف مالایطاق تھی مگر خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا

(الحکم جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

جو نبی آتا ہے اس کی نبوت اور وحی والہام کے سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی فطرت میں ایک ودیعت رکھی ہوئی ہے اور وہ ودیعت خواب ہے اگر کسی کو کوئی خواب سچی کبھی نہ آئی ہو تو وہ کیونکر مان سکتا ہے کہ الہام اور وحی بھی کوئی چیز ہے اور چونکہ خداتعالیٰ کی یہ صفت ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔ اس لیے یہ مادہ اُس نے سب میں رکھ دیا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

شریعت کا مدار نرمی پر ہے سختی پر نہیں ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

حواس باطنی میں جس طرح اس وقت فرق آجاتا ہے حواس ظاہری میں بھی معمر ہو کر بہت کچھ فتور پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض اندھے ہو جاتے ہیں بہرہ ہو جاتے ہیں چلنے پھرنے سے عاری ہو جاتے ہیں اور قسم قسم کی مصیبتوں اور

---

[1] یعنی قرآن شریف کی تعلیم تو صاف ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا۔

دُکھوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ زمانہ بھی بڑا ہی ردّی زمانہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی زمانہ ہے جو ان دونوں کے بیچ کا زمانہ ہے۔ یعنی شباب کا جب انسان کوئی کام کر سکتا ہے کیونکہ اس وقت قویٰ میں نشو و نما ہوتا ہے اور طاقتیں آتی ہیں۔ لیکن یہی زمانہ ہے جبکہ نفس امّارہ ساتھ ہوتا ہے اور وہ اس پر مختلف رنگوں میں حملے کرتا ہے اور اپنے زیر اثر رکھنا چاہتا ہے یہی زمانہ ہے جو مواخذہ کا زمانہ ہے۔ اور خاتمہ بالخیر کے لیے کچھ کرنے کے دن بھی یہی ہیں لیکن ایسی آفتوں میں گھِرا ہوا ہے کہ اگر بڑی سعی نہ کی جاوے تو یہی زمانہ ہے جو جہنم میں لے جائے گا اور شقی بنا دے گا۔ ہاں اگر عمدگی اور ہوشیاری اور پوری احتیاط کے ساتھ اس زمانہ کو بسر کیا جاوے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو جاوے کیونکہ ابتدائی زمانہ تو بے خبری اور غفلت کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا مواخذہ نہ کرے گا جیسا کہ خود اس نے فرمایا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

(الحکم جلد ۹ ع۱ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۵ء ص۳)

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ س ۳ر۴۔ اس کے لیے جو اس نے اچھے کام کیے اور اس پر جو اُس نے بُرے کام کیے۔

(جنگ مقدس بحث یکم جون ۱۸۹۳ء ص۷)

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا الخ یعنی اے ہمارے خدا نیک باتوں کے نہ کرنے کی وجہ سے ہمیں مت پکڑ جن کو ہم بھول گئے اور بوجہ نسیان ادا نہ کر سکے اور نہ اُن بد کاموں پر ہم سے مواخذہ کر جن کا ارتکاب ہم نے عمداً نہیں کیا بلکہ سمجھ کی غلطی واقع ہو گئی اور ہم سے وہ بوجھ مت اُٹھوا جس کو ہم اُٹھا نہیں سکتے اور ہمیں معاف کر اور ہمارے گناہ بخش اور ہم پر رحم فرما۔

(چشمۂ معرفت ص۱۷)

لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ جو امر فوق الطاقت اور ناقابل برداشت ہو جاوے اس سے خدا بھی درگذر کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ع۲۳ مورخہ ۲۶ر مارچ ۱۹۰۸ء ص۴)